



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA

JAMIA NAGAR

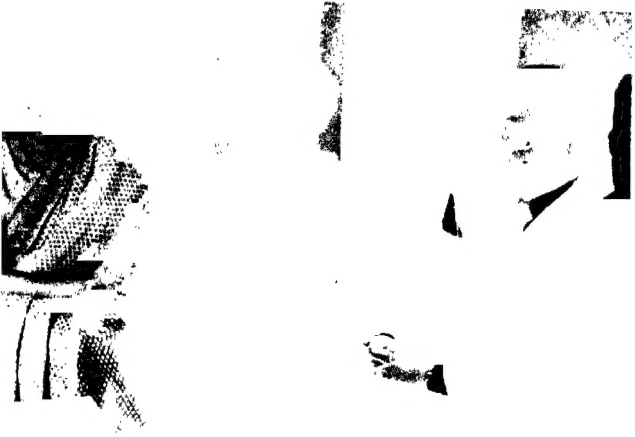
NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

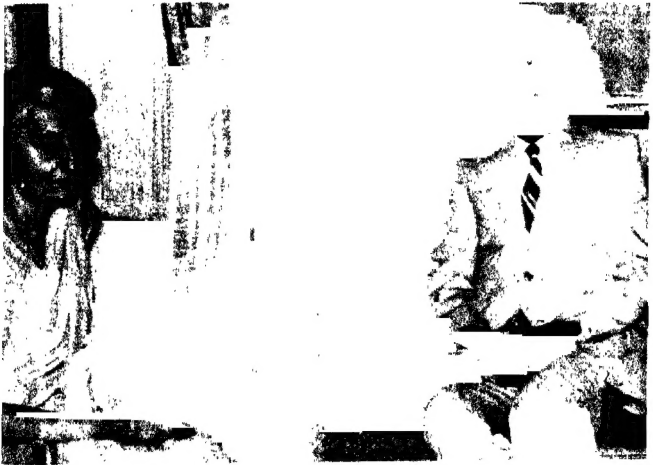
Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

[illegible]





وزیراعظم شریعتی اندرا گاندھی، عراق کے وزیر خارجہ عزت اکب سعدون حامدی کے ساتھ۔ بمبوت نے نئی دہلی میں ۲ جولائی کو وزیراعظم
ملاقات کی



بھگت دیش کے شیرخوفاک جناب اے۔ جی محمود وزیراعظم شریعتی اندرا گاندھی کے ساتھ۔ بمبوت گزشتہ ماہ نئی دہلی کے دورے
تشریف لائے تھے

دو غیر مطبوعہ غزلیں

...نوں غزلیں ۱۹۷۰ء کے قریب کی ہیں جو "فقوش" کے لیے لکھی گئی تھیں مگر غالباً یہی نہ جاسکیں۔ اصل مسودہ جیل نظری کے دستخط کے ساتھ میرے پاس موجود ہے۔ ارشد

جوئے روائ کو کہہ لو مستدین لیکن یہ نادانی ہے
لہریں خود بتلائیں گی کہ کس میں کشت پانی ہے

ہے یہ دنیا اس کی بنائی اس میں کیا کدست ہے بھائی
اس کو خود دنیا نے بنایا یہ بھی بات پرانی ہے

مہم میں تو وقت گزوا ، میں نے ہی میں کیا پایا
وہ بھی اک نادانی تھی اور یہ بھی اک نادانی ہے

نہ بھی اک دیوانہ پن ہے ، نہ ہی بھی اک پاگل پن
یعنی جنوں جس ہمیں میں بھی ہوشنگ مری پہچانی ہے

گہرائی میں جا کر دیکھو ، شیشے سے نازک ہے پتھر
تہا ری کے سینے میں بھی اک گوشہ رحمان ہے

بنتے رہتے ہیں افسانے ، نام نئے گرد اور پرانے
دنیا نام کہانی ہے تو کس کی رام کہانی ہے

ہے یہ جہان نور و ظلمت ، عالم غور و عالم حیرت
اک سچی تاریکی ہے اور سو جموٹی تا با نی ہے

گرچہ سنا ہے کہ پروردہ ، مغربی تیرے قاتل فن میں
وہ بھی کچھ خفائی میں اور تو بھی کچھ خفائی ہے

غور تو کیجیے کہ یہ سجدہ روا کیوں کر ہوا
اس نے جب کہ ہم سے مانگا تو خدا کیوں کر ہوا

اک ترازو عشق کے ہاتھوں میں بھی جب ہے تو وہ
عالم سود و زیاں سے مادر کیوں کر ہوا

دین و دانش دونوں ہی ہر موڑ پر تھے دل کے ساتھ
یک بہ یک دونوں سے دیوانہ خفا کیوں کر ہوا

اے نگاہ شوق اس چشم فسون پر داز میں
وہ جو اک پندارتھا ، آخر حیا کیوں کر ہوا

رہزنیوں کے غول ادھر تھے دہسروں کی بھیر ادھر
آگے منہ نہ پر ہم ، یہ مجسزہ کیوں کر ہوا

اپنے ذہنی زلزلوں کا نام جو رکھ لو مگر
دو دلوں کا اک تعادم ، سانچہ کیوں کر ہوا

خار زار دین و دانش ، لالہ زار حسن و عشق
دل کی اک وحشت سے طے اک مزل کیوں کر ہوا

تیری عرومی اسے جو بھی کہے ، سیکن جمیل
غیر سے اس نے وفا کی ، بے وفا کیوں کر ہوا

ایک پرچہ میں تشبہ کی ضروری ہے جمیل
جو سمجھ ہی میں نہ آیا ، وہ خدا کیوں کر ہوا

آرکھ کل

ایڈیٹر

راج نرائن راز

سب ایڈیٹر

شوناتھ سنگھ

جلد ۴۱

شمارہ ۱

اگست ۱۹۸۲

قیمت ۱ روپے

فون ۲۸۷۰۶۹

شروان پھادر شاہ ۱۹۰۴

ترتیب

Accession Number

86145

Date 31.8.88

ملاحظات

۲۱۰۵

جیل شخصیت

۱۲ جیل منہری کاغزل اوزر عثمان

۵ جیل منہری بحیثیت غول گو طور منوی بڑی

۱۹ جیل منہری کی مرثیہ نگاری خیرا جمال منہری

۲ جیل منہری کی لوریان شیب ایا

۴ جیل منہری کے کلام میں { غلام مرتضیٰ

۴ حب الوطنی اور ہندوستانیت

۴ جیل منہری کی نظریہ شاعری رضا نقوی داری

۴ جیل منہری کی تنقید نگاری اجماع علی اشر

۱۳ ساز بردون خانہ { رضا منہری

۴ { اجماع علی اشر

۴ امام مرتضیٰ نقوی { ریاض الانصاری { نجم الحسن منوی

۱ جیل منہری کی غزل گوئی

۵۹ جیل منہری کی غزل گوئی

۵۹ جیل منہری کی غزل گوئی

منکھوان تکلم

جہان دیگر

انتخاب

مکتوبات

۵۹ جیل منہری کی غزل گوئی

۵۹ جیل منہری کی غزل گوئی

۵۹ جیل منہری کی غزل گوئی

۵۹ جیل منہری کی غزل گوئی

سردق - گورچن اردو

پرنس نیچر ایڈیٹر - ایل بیسوال - اسسٹنٹ پرنس نیچر - ایل آر بٹو - اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پرنٹنگ) - کے آر کرشن

ترسیلی زر کاپیت

مطابق سے حلقہ حکومت کاپیت

پرنس نیچر ایڈیٹر - ایل بیسوال - اسسٹنٹ پرنس نیچر - ایل آر بٹو - اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پرنٹنگ) - کے آر کرشن

پرنس نیچر ایڈیٹر - ایل بیسوال - اسسٹنٹ پرنس نیچر - ایل آر بٹو - اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پرنٹنگ) - کے آر کرشن

پیداوار کا ۵۰ فی صد حصہ — یعنی تقریباً ۸۰ لاکھ ٹن پیداوار — بارانی کھیتی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے میں بارانی کھیتی کی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے۔

تحقیقی کوششیں

زراعتی سائنس دانوں نے تقریباً ۶۰ برس پہلے بارانی کھیتی والے علاقوں میں کم پیداوار اور کمی بیشی کے سلسلے میں تحقیق و جستجو کا کام ہاتھ میں لیا تھا۔ منجیری، روہنگ، شولاپور، رائے پور اور دیگر مقامات پر تحقیقی پراجیکٹ شروع کیے گئے۔ تاہم ان پراجیکٹوں کی بدولت پیداوار میں ۱۵ سے ۲۰ فی صد تک بہتری لائی جاسکی۔ چنانچہ کاشتکاروں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور جو طور طریقے تجربہ کیے گئے ان پر بھی عمل نہیں کیا۔ اگست ۱۹۶۰ء میں بھارت کی بارانی کھیتی کے ضمن میں پوسہلی بار بین الاقوامی سطح پر دلچسپی لی گئی۔ حکومت کینڈا کی مدد سے بارانی کھیتی کے سلسلے میں ملک گیر جیہانے پر مربوط تحقیقی پراجیکٹ شروع کیا گیا۔ اس وقت ملک کے ۲۲ تحقیقی مرکزوں میں اس پراجیکٹ کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ پیداوار بڑھانے اور پیداوار میں استحکام لانے کی سرگرمیوں کے سبب ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد میں، غنیزمین کو قابی کاشت بنانے کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی تحقیقی ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ گزشتہ دس برسوں میں اس ادارے کی سرگرمیوں کی بدولت بیش بہا نتائج سامنے آئے ہیں جو کسانوں کے لیے عملی اعتبار سے بے حد اہم ثابت ہوئے ہیں۔

تحقیق کے بعد کمی کو محفوظ رکھنے، کھیتی باڑی اور فصلوں کے نقصان بہتر طریقے وضع کر لیے گئے ہیں۔ ایسی سماجی، اقتصادی اور عملی رکاوٹوں کی بھی نشاندہی کردی گئی ہے جو ٹیکنالوجی کو کھیتوں میں منتقل کرنے میں حارح بنتی ہیں۔ آبپاشی کے لیے پانی بہت ضروری ہے اور یہ محدود متادار میں دستیاب ہے۔ اسے فصلوں کے لیے محفوظ رکھنے کے طور طریقوں پر ترجیحی بنیاد پر تحقیق کی جا رہی ہے۔ سائنس دانوں نے ان علاقوں کے لیے جہاں سال میں ۲۵ سے ۱۰۰۰ ملی میٹر تک بارش ہوتی ہے، ملا جلا کروائی کرنے کے بہتر طور طریقے دریافت کئے ہیں۔

اب کاشتکار اچانک ہیں کہ فصل کاٹنے وقت پرودوں کی جڑوں اور ان کے نچلے حصوں کو چھوڑ دیا جانا چاہئے۔ اس طرح جب آئندہ بارش ہوتی ہے تو یہ خود بخود بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کسانوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ برسات کے زمانے کے فاضل پانی کو چھوٹے چھوٹے تالابوں میں کس طرح ذخیرہ کیا جاسکتا ہے اور اسے چٹائی سے ڈھک دیا جاتا ہے تاکہ بخارات بن کر نہ اڑ سکے۔ اس کے بعد ضرورت پڑنے پر اس پانی کو

ملاحظات

بہتر مستقبل کی امید افزا دلیل

وزیر اعظم نے اس سال جنوری میں جس میں ناکائی پروگرام کا اعلان کیا، اس میں بارانی کھیتی کے لیے جدید ٹیکنالوجی، بہتر بیج، کھاد کیڑے مار وائیں فراہم کرنے پر بطور خاص زور دیا گیا ہے۔ اس طرح کی کوششوں سے نہ صرف ملک اناج کی پیداوار میں خود تکمیل بن سکے گا بلکہ دنگار کے مواقع کے ساتھ ساتھ معاشرے کے کمزور طبقوں کی بہتری و ترقی کے مواقع پیدا ہوں گے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی غذائی ضروریات بخوبی پوری ہو سکیں گی۔

تجربہ شاہد ہے کہ بارانی فصل والے کھیتوں میں تخم بیزی کر دینے کے بعد بارش کا انتظار کرنا ملک میں ایک عام خی بات ہے اور کاشتکار بڑی حد تک بارش کے دم و دم دھم پہ رہتا ہے۔ ہمارے اہرین زراعت ملک کے چھوٹے ٹکے بھی کسانوں کی معاونت کے لیے جی جان سے سرگرم عمل ہیں۔

”خفا کھیتی“ کی اصطلاح بخاطر ایک متضاد بات معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بغیر پانی کے کاشت ممکن نہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کے وسیع و عریض علاقوں میں کھیتی کے لیے بارش ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ بارش کا معاملہ غیر یقینی ہے۔ کسان فی الواقع ایسی زمین پر کھیتی کرتے ہیں جو خشک علاقہ کہا جاتا ہے۔ اگر ایک ایک ۴۴ کروڑ لیٹر کو فٹ زمین پر جتے ہوئے پانی اور ۴۶ کروڑ لیٹر فٹ زیر زمین پانی کو بھی استعمال میں لایا جائے تب بھی زیر کاشت ایک بڑے علاقے کے لیے بارش کی ضرورت ہوگی۔

فی الحال ۱۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ فٹ بل کاشت علاقے میں سے کس کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ اراضی میں سیٹھائی کا ذریعہ بارش ہے۔ ہماری اناج کی ۴۵ فی صد ضروریات ایسے علاقے پوری کرتی ہیں جہاں سیٹھائی صرف بارش سے ہوتی ہے۔ ساٹھ سے ۴۰ کروڑ فٹ اناج کی پیداوار میں سے چھ کروڑ فٹ اناج بارش والے علاقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ٹنہوں کی کل

سینھان کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

بارانی کھیتی والے علاقوں کے کاشتکاروں کو یہ میں بتایا جاتا ہے کہ پڑ پوروں کی تعداد زیادہ سے زیادہ لگانا ضروری ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ زمین کی جی کر ہونے سے مٹی چٹنے لگتی ہے۔ اس سے کچھ پودے بالکل مر جھسا جاتے ہیں لیکن باقی پودوں سے اچھی خاص فصل ہوتی ہے۔ تنہا حالات کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔ تمام لائحہ عمل انہیں کے پیش نظر تیار و جو پڑ کیا جاتا ہے۔ بارانی کھیتی سے متعلق مرکز شولا پور کے کاشتکاروں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ جب اپنے کھیتوں میں جواری کاشت کریں تو ہر ایکڑ اراچی میں ایک لاکھ پودے بوئیں۔ کرناٹک کے باری خطے کے کسانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ایک ایکڑ زمین میں ایک لاکھ ۲۰ ہزار پودے کھیں لیکن اگر خشک سال کا مسئلہ درپیش ہو تو پودوں کی تعداد ۶۵ ہزار سے ۸۵ ہزار تک کم کرنی چاہیے۔

۔ جواد اور مکی وغیرہ جیسے سولے اناج جو کہ غریبوں کی خوراک ہیں ، بارانی کھیتی والے علاقوں میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ بارانی علاقوں میں کھیتی کرنے والوں کی اکثریت چھوٹے کاشتکاروں کی ہے۔ بارانی علاقوں کی مٹی کے جائزے اور جانچ کے بعد سائنس دان اب کاشتکاروں کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے کھیتوں میں کب اور کیا کیا بوئیں۔ مثال کے طور پر ڈھال والے علاقوں میں جواد اور رائی کی کاشت نہایت مفید ثابت ہوتی ہے۔ شولا پور کے علاقے میں نومبر کے تیسرے ہفتے بچنے میں زمین چٹنے لگتی ہے۔ اس لیے ریز کی فصل کے عام دنوں سے ایک ماہ پہلے تخم ریزی زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

ایک لاکھ پچیس ہزار کاشتکاروں کے لیے جدید ٹیکنالوجی

زراعت کے شعبے میں جو پیش رفت اور کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں ، اُن کے نتائج کو کاشتکاروں تک پہنچانے کی غرض سے ایک خصوصی پروگرام شروع کیا گیا۔ ہندوستانی زراعتی تحقیق کی کونسل نے ای ٹی کوئلڈن جوبی کے متوجہ پرجون ۱۹۶۹ء میں زراعتی ٹیکنالوجی کو معمولی اور چھوٹے کسانوں کے ۵۰ ہزار کھیتوں تک پہنچانے کا پروگرام شروع کیا۔ اس پروگرام پر مذکورہ بالا تنظیم کے تحقیقی مراکز ذراعتی یونیورسٹیوں اور دیگر زراعتی کالجوں و دفاتر کار ادا رل کی مدد سے عمل پیرا ہیں۔ ہندوستانی زراعتی تحقیق کی کونسل کے تین سو سے زائد تحقیقی مراکز ذراعتی یونیورسٹیوں میں اس تنظیم کا شعبہ بنائے گئے ہیں۔ اس پروگرام کو دہری تحریکات کے مربوط پروگرام سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور بہتر بیجوں ، گھاد ، کیرسے ، مارو داؤں وغیرہ کے لیے بومی قسم ہسیا کی جلتے لگی ہیں۔ زمین کو ہموار کرنے اور مٹی کو بہتر بنانے کے لیے بھی مالی اعاد

دی جا رہی ہے۔ جو اداسے ٹیکنالوجی کو کھیتوں میں پہنچانے میں مدد کر رہے ہیں اس میں حیدر آباد کا کل ہند مربوط تحقیقی پراجیکٹ برائے بارانی کھیتی بھی شامل ہے۔

اس پروگرام سے متعدد چھوٹے اور معمولی کاشتکاروں کی پیداوار ادا رل آمدنی میں دوسرے تین گنا تک اضافہ ہوا ہے۔ اس پروگرام کے امید افزا نتائج کے پیش نظر ہندوستانی زراعتی تحقیق کی کونسل نے اس پروگرام کو مئی ۱۹۸۵ء تک توسیع دے دی ہے۔ اب مزید ۵۵ ہزار چھوٹے کاشتکاروں نیز بے زمین مزدوروں کو اس پروگرام کے تحت لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کل ہند مربوط تحقیقی پراجیکٹ برائے بارانی کھیتی کا مقصد پیداوار میں سونی صد بہتری لانا اور زمینوں کے آثار چرچاؤ کے مطابق فصلوں کے لیے متبادل محنت عملی وضع کرنا ہے۔ اس پراجیکٹ کے نتائج کے پیش نظر امید کی جاسکتی ہے کہ اب بارانی علاقوں میں کسانوں کو سونے کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ کھیتی کے میدانوں پر اسے طریقوں کے سہجائے دہری لگو متعدد فصلیں اگانے کے نئے طریقوں کو رائج کرنے کے اقدام کیے جا رہے ہیں۔ اس میں کسانوں ، چھوٹے کسانوں ہی کا نہیں بلکہ پوری قوم کا مفاد مضمر ہے۔ ظاہر ہے یہ امور بہتر مستقبل کی امید افزا دلیل ہیں۔

یہ شمارہ

آج کل کا جیل منظر یہ نبر آپ کے ہاتھوں میں ہے اس خصوصی شمارے میں آپ کے ہاتھ پہنچانے ابوں نے اپنے مقالات میں علامہ جیل منظر مرحوم کے کردار ، افکار کے مختلف پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا اور حق قویہ کے حق ادا کیا ہے۔

اس شمارے میں علامہ مرحوم کے کلام کے انتخاب کی اشاعت کے لیے زیادہ صفحات مخصوص نہیں کیے جاسکے ، اس کا ہمیں افسوس ہے۔ صفحات کی تنگ دھانی کے باعث بعض دوسرے مستقل فہر اور جو گندہ پال صاحب کے ناول کی تسطیر شریک اشاعت نہیں ہو سکی۔ اس خاص نمبر کی تیاری میں ارباب ملقا ادب بہادر ، پٹنہ جیو معاونت فرمائی ، اس کے لیے ادا دار اُن کا اور بالخصوص پروفیسر محمد المنفی اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کامنٹن و شکر گزار ہے۔

امید ہے علامہ مرحوم کے فکر و فن کے مطالعے کے باب میں یہ نمبر اپنے اُمّ افادی اور معلوماتی مضامین کے لیے اہم تصور کیا جائے گا۔ ہم نے اس خصوصی شمارے کو مٹی الوں جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہم اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں ، اس کا فیصلہ آپ سے کرنا ہے۔ ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

جمیل مظہری

مقرر ہوئے، تو وہ غازی پور کی حکومت ترک کر کے مستعلاً پٹنہ منتقل ہو گئے۔ ان کا انتقال پٹنہ ہی میں ہوا۔ ان کے بیٹے مولانا مظہر حسن (جمیل مظہری کے دادا) رضامظہری کے مطابق سید علی محمد شاہ عظیم آبادی کے مجدد کرس رہے تھے۔

مولانا مظہر حسن کی شادی حسن پورہ میں ہوئی۔ سادات بارہ سید حسین اڈو سید عبداللہ، مشہور بادشاہ گڑ کے ایک مشیر تھے، جو میرٹھ میں بیاری گئی تھیں۔ ان کے ایک بیٹے ابو تراب ہوئے۔ ابو تراب کے مورث اعلیٰ محمد دم سید حسن واسطی تھے، جو میرٹھ سے ہجرت کر کے اُس جگہ رہنے لگے تھے جو بعد کو ان کے نام پر حسن پورہ (ضلع ساران، بہار) کہلائی، اس وقت یہ علاقہ محض جنگل تھا۔ یہیں انھوں نے چلے کشی کی۔ رفتہ رفتہ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے اور یہاں ایک گاؤں بس گیا۔

مولانا مظہر حسن کی بیوی کی نام خیاں مظفر پور کے محلہ سعد پورہ میں تھی انھیں اپنے ناما کے ترکے میں سے مظفر پور سے دس کیلو میٹر دور دو گاؤں ملے تھے۔ اس سلسلے میں خاندان کا اکثر مظلوفہ جانا آتا رہتا تھا۔ بعد کو بچوں کے رشتے بھی مظفر پور اور قریب ہی جھکین پور میں ہوتے گئے اس طرح سے مظفر پور ایک محافطے خاندان کا وطن بنائی ہو گیا۔

مولانا سید مظہر حسن کی تعلیم پٹنہ، لکھنؤ اور مٹیا بریج (کلکتہ) میں ہوئی تھی۔ اپنی ذہانت اور لیاقت کے باعث وہ نواب علی خان بہادر کی ریاست حسین آباد (شیخ پورہ) کے مدارالہام مقرر ہو گئے تھے شہر بھی کہتے تھے۔ محلہ اصنافی عنین پر آباد تھے، لیکن زیادہ تر دولت مرثیہ سے تھی انھیں اس میں مشرہ مرزا دیر گمبوی سے تھا۔ ان کا ایک مندر مجموعہ دفتر انبر کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں فوت ہوئے۔ ان کے محلے صاحبزادہ مولانا خورشید حسین تھے، یہ بھی شعر کہتے تھے اور خورشید خلیفہ کرتے تھے۔

جمیل مظہری کا اصلی نام کاظم علی تھا۔ "میر کاظم علی" ان کا تاریخی نام ہے جس سے تاریخ ولادت (۱۳۲۱ھ) برآمد ہوتی ہے۔ ان کے بولہ خرد و رضا مظہری کی اطلاع کے مطابق ان کے بیشتر سوانح نگاروں نے ان کی پیدائش یکم جنوری ۱۹۰۵ء کی گنتی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں وہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اسکول کے سرٹیفکیٹ میں تاریخ غلطی سے یکم جنوری ۱۹۰۵ء درج ہو گئی۔

ان کا خاندان سادات موسوی میں سے تھا۔ ائمہ اشاعت میں سے ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم ان کے مورث اعلیٰ تھے جب ان کو گولکاشیڑہ بکھرا تو وہ کسب معاش کی خاطر وسط ایشیا کے مختلف کونوں میں بس گئے اسی زمانے میں ان کی ایک شاخ ایران کے خطہ سبزوار میں مقیم ہو گئی۔ چند سال بعد یہاں سے ایک گروہ ہندوستان پہنچا۔ ان میں سے ایک صاحب سید سالار غازی دہلی میں رُکے ہوئے تو پٹی چلے گئے مشرقی یوپی کا شہر غازی پور انھیں سے منسوب کیا گیا ہے۔ جمیل مظہری انھیں سالار غازی کے اخلاط میں تھے۔

جمیل مظہری کے پردادا سید ریاض الحسن اپنے علم و فضل کی بدولت مشہور و فیر قانون امام بانی بچہ کی موقوفہ گلزار باغ مسجد (پٹنہ) کے امام

آفدہ مکتوب جناب رضامظہری (زبور خرد جمیل) بحکم بانفوس (لاہور شخصیات نمبر ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۳۵)؛ بیسویں صدی میں مغربی جنگل کے اردو شعرا (اشفاق احمد) ۲۰۲؛ مسلم شہر لے پبل (از محمد سید احمد اللہ مدنی) ۱۱۱، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۲۹؛ سید علی جمیل مظہری نمبر (فروری) مارچ ۱۹۸۲ء)

مردن میں ان کی واقفیت اور اس میں ان کا اہم اثر مشہور تھا۔ یہی جلیل مغہری کے والد تھے۔ خورشید حسین کے پانچ اولادیں ہوئیں، دو بچے (سید کاظم علی اڈو سید امیر رضا) اور تین بیٹیاں۔ سب سے چوٹی درمیان مغہری میں انتقال کر گئیں۔ تیسری جوان دونوں بھائیوں کے بعد ہوئی تھیں بہت دن زندہ رہیں (ان کا ذکر آگے آئے گا)۔ سید امیر رضا بہت معروف شاعر اور شریک نگار اور کلمت کے علمی ادبی معلقوں کی نمایاں شخصیت ہیں۔ وہ رضا تخلص کرتے ہیں اور اپنے بڑا علی (حضرت امام موسیٰ کاظم) کی نسبت سے اپنے آپ کو رضا کاظمی لکھتے ہیں۔

سید کاظم علی یعنی ہمارے جلیل مغہری کی ولادت اپنے ناہنسالی مکان 'محلہ قلعہ پورہ' پٹنہ میں ہوئی۔ جب پانچویں سال میں قدم رکھا تو تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ حسن پور کے قریب ایک مختصر سی مشنری ہے، وہاں کے رہنے والے مولوی سید طالب حسین ان کے معلم مقرر ہوئے لیکن جب تک قیام حسن پور اور مغہر پور میں رہا، تعلیم کا سلسلہ تسلی بخش نہ ہو سکا۔ بات یہ ہے کہ یہ اپنی دادی اماں کے چہیتے تھے، وہ اپنے بچلاؤ چاؤ اور پیار سے انھیں لگاؤ نہ بڑی برتی ہوئی تھیں۔ اگر یہ ان کے ساتھ رہتے تو تعلیم تو یک طرفہ، ان کے اخلاق کا جو حال ہوتا، اس کے تصور سے بھی خوف محسوس ہونے لگتا ہے۔

ان کی والدہ عظیم آباد کی مشہور گریجویٹ فیملی سے تھیں، جو اپنی تعلیم اور ترقی پذیری کے لیے معروف تھی۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ بیٹے کی تعلیم و تربیت ٹیگ ڈھنگ پر نہیں ہو رہی ہے، لیکن اس زمانے کی جو معاشرت تھی، اس کے دستور کو پابندی کر سکتے ہوئے وہ اپنی خوشداسی کے سامنے دم تک ماسدے کی جرات بھی نہیں کر سکتی تھیں، لیکن خدا کو منتظر نہیں تھا کہ جو بر قابل یوں ضائع ہو جائے، اور جلد ہی اس کی راہ نکل آئی۔

جلیل صاحب کے والد زندہ دار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ مگر کے کھاتے پیتے، کہیں فوکرے کسے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن چونکہ ذہنی علم اور صاحب استعداد آدمی تھے، ان کے سالے خان بہادر سید امجد علی خان علم کے دل میں خیال غرور اکبر ساری لیاقت اور صلاحیت پر کارخانہ جاری ہے۔ انھوں نے خورشید حسین صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ محض ان گھوڑ مرکب اسکول پٹنہ میں فرنی، قادی اور اردو کے استاد کی جگہ قبول کریں تو اس سے آپ کا وقت بھی ایسے مشغلہ میں کٹ جائے گا جو آپ کو عزیز ہے اور اس سے قوم کے ہونہار بچوں کی تعلیم بھی بھرتی

بہت لوگوں نے ان کا نام خورشید حسین لکھا ہے مگر یہ صحیح نام خورشید حسین ہے۔

احسن ہو سکے گی۔ یہ مشورہ کہہ ایسے غلوں سے دیا گیا کہ خورشید صاحب اس سے انکار نہ کر سکے۔ قصہ کوتاہ، جلیل صاحب کے والد جب پٹنہ اسکول میں مدرس مقرر ہو گئے تو ان کا اور خاندان کا مستقبل قیام بھی نہیں رہنے لگا اور یوں جلیل صاحب مغہر پور سے یہاں آ گئے، اور مولوی سید طالب حسین کے بھی انتظام کے علاوہ ان کا سیلانیہ اسکول میں داخلہ بھی ہو گیا۔

یہ انتظام دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں خورشید صاحب کا موسیقی ہاری ضلع اسکول میں تبادلو ہو گیا۔ خاندان بھی وہیں چلا گیا اب کے مولوی طالب حسین ان کے ساتھ نہیں گئے، ان کی جگہ ان کے ایک اور بھوین سید لہداد امام کا تقریر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اپنی ضلع اسکول کے پانچویں یا چھٹے درجے میں داخلہ مل گیا۔ خورشید صاحب ۱۹۱۵ء کے آخر تک موتی ہاری میں رہے اور ۱۹۱۶ء کے اوائل میں مغہر پور ضلع اسکول میں چلے گئے۔

مغہر پور کا واقعہ قابل ذکر ہے۔

یہاں کے ایک رئیس امام الدین خاں صاحب ذوق آدمی تھے۔ ایک دن ان کے پاس باپور کے کوئی صاحب غزوات صاحب آئے۔ باتوں باتوں میں ثابت صاحب نے دکان کی کہ شاعری پونی والوں کا قصہ ہے بہار والے بچاے کیا فائیں، شاعری کیا چرسے، امام الدین خاں صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری، انھوں نے اس پر ایک شاعرے کا اعلان کر دیا تاکہ ثابت صاحب کو دکھائیں کہ بہار والے بھی اردو میں شعر کہہ سکتے ہیں۔

خورشید صاحب نے جلیل کو انیس کے مرتبوں کے کچھ بند اور سلام پڑھنے کی تربیت دے رکھی تھی۔ اس مشاعرے میں پڑھنے کے لیے انھوں نے ایک غزل انھیں دے دی۔ طرح ہوئی تھی: غبار دیکھ کہ بہار دیکھ کہ - خدا صاحب لکھتے ہیں کہ اگلے انھیں جو غزل دی تھی وہ تو یاد نہیں رہی لیکن اس میں ایک مصرع یہ تھا۔

موسے نے کھہ دار دار، میرا مزار دیکھ کر

ثابت دہمپوری پر اس مشاعرے کا کیا اثر ہوا، وہ تو معلوم نہیں، لیکن اس کے بعد جلیل صاحب نے باقاعدہ شعر گوئی شروع کر دی۔ جمیل تخلص رکھ لیا اور اپنے دادا سید مظہر حسن کے نام کی مناسبت سے اس کے ساتھ مغہری کا لائقہ اضافہ کر لیا، جلیل مغہری کا مشورہ اپنے والد سے رہا، جو کہیں بھی اپنی طرف سے بھی ان کی غزل میں شعر کہہ دیتے تھے۔

جلیل مغہر پور ضلع اسکول میں ۱۹۲۰ء تک زیر تعلیم رہے۔ اسی سال ان کا مدرسہ عالیہ کلکتہ کے شعبہ انگریزی میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں تال ملہ ہائی اسکول کلکتہ سے دیوی کا امتحان درجہ اول

میں پاس کیا۔ اسی زمانے میں مظفر پور کے متنازع وکیل مولوی بدر الحسن نے اپنے مکان پر ایک مشاعرہ کیا۔ زمین تھی، آسمان کی طرح، جہاں کی طرح۔ جیل منگری نے اپنی اور والد کی کسی ہوئی مشترکہ فریبہ برسی۔ اس کا ایک مصرع اپنی تشبیہ کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔

میں آنکھ کے بیٹھ گیا مگر دکا رواں کی طرح

اس کے بعد انھوں نے ۱۹۲۵ء میں سان زویروس کا کلکتہ سے انڈیا اور ۱۹۲۸ء میں اسلام آباد کا کلکتہ سے کی اے کیا۔ ایم اے (فارسی) بھی کلکتہ یونیورسٹی ہی سے ۱۹۳۱ء میں کیا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا سب سے پہلے روزنامہ "الہند" کلکتہ میں مدیر کی جگہ ملی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا۔ تقریباً دو ماہ کے بعد حکومت نے اخبار بند کر دیا۔ اس کے بعد یہ کسی اخبار سالے سے باقاعدہ طور پر وابستہ نہیں ہوئے۔ آزاد قلم کی حیثیت سے مختلف پروجوں میں لکھتے رہے۔ اسی اثنا میں شائق احمد عثمانی سے دوستاں ہو گئی۔ عثمانی صاحب روزنامہ "مصرعہ" کے مالک اور مدیر تھے۔ انھوں نے جیل کو دعوت دی کہ وہ "مصرعہ" میں ملازمت کر لیں۔

وقت یہ تھی کہ عثمانی صاحب کٹر مسلم لیگ اور ان کے اخبار کی پالیسی بھی لیب کی ہوا۔ اس کے برعکس جیل گئے کاٹگریسی لیکن دونوں کی دوستی بھی شائق اس پر اندازت کاٹنی روٹی کی مثل صادق آتی تھی۔ بالآخر چھوٹا اس پر ہوا کہ اخبار کی ادارت میں جیل صاحب کا کوئی دخل نہ ہو، وہ صرف اس کا فکاہیہ کالم لکھ کر لیں۔ چنانچہ وہ "کوچہ گرد" کے قلمی نام سے یہ کالم "ہفتا" کے عنوان سے لکھتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۳۷ء تک جاری رہا۔

نومبر ۱۹۳۷ء میں وہ پہلی مرتبہ حکومت کی ملازمت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۳۵ء کی دستوری اصلاحات کے تحت صوبائی حکومتوں کے انتخاب ہوئے تھے۔ ان میں کاٹگریسی نے بھی حصہ لیا اور بیشتر صوبوں میں اس نے اکثریت حاصل کی، جس کے نتیجے میں مختلف جگہوں پر اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ یہاں بھی جیل ہی صورت پیدا ہوئی۔

گورنمنٹ کی برس سے کلکتہ میں قیام کے دوران میں ان کے یہاں کے کئی اکابر سے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ مولانا آزاد کاٹگریسی بانی کاٹھ میں جو مقام تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اب جو یہاں میں کاٹگریسی کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے ایما پر جیل نے میں پولیٹی (فسر) (ادو) مقرر ہو گئے۔ حکومت انگریزی سے بعض اختلافات پیدا ہو جانے پر کاٹگریسی حکومت سے ۱۹۳۹ء میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس پر جیل نے بھی اپنی ملازمت سے دستبردار ہو جانے پر آمادگی

ظاہری، لیکن باوراء جند پرشار (مردم) نے جو اس وقت بہار کی صوبائی کانگریس کے صدر (اور نائب سربراہ) چندر بوس کے متعلق ہو جانے کے بعد عارضی طور پر آل انڈیا کانگریس کے بھی صدر بنے، انھیں متعلق ہونے سے باز رکھا۔ ملازمت کا یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء تک رہا۔

۱۹۳۲ء بہار کی سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی اور جاپان نے ہر حال پر ہزیمت کا سامنا تھا۔ جاپان نے ہرل ہار میں امریکی اور انگریزی بحری بیڑے کو شدید نقصان پہنچا دیا تھا اور جرمنی/اٹلی کے محرم کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کر کے اتحادیوں کے خلاف جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس نے سنگاپور، ملایا، براکو، برقی، بھارتی سے رونموا دلا، اور کلکتہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔

ان نازک حالات میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو اپنے نمبر کی اجلاس میں وہ مشہور قرارداد منظور کی جو اپنے مرکزی خیال کے باعث "ہندوستان چھوڑ دو" قرارداد کہلائی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بر کانگریس کے رہنماؤں کی گرفتاریاں میں اٹھیں۔ ان حالات میں جیل منگری کے لیے ملازمت میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ انھوں نے استعفیٰ درخشا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر انھوں نے سخت اپنے خون سے کیے تھے۔ بہر حال اس میں انھوں نے ایسی صحت زبان استعمال کی تھی کہ حکومت نے اس پر ہمیشہ سزا سست کے مصداق انھیں بھی گرفتار کر کے قید کر دیا۔ خدا

خدا کر کے ایک ہی جیسے بعد رہائی نصیب ہوئی۔ اب سوال یہ تھا کہ خدا کلکتہ ان دنوں جاپانی حملے کی زد پر تھا۔ جو کس طرح آبادی سے ان کی یاد اللہ تھی۔ انہیں لے پونا اور بمبئی آگئے اور فلم کی دنیا میں قسمت آزمائی کی دعوت دی۔ وہاں جو شہ صاحب کے مکان پر رہ کر شاعرے جو یونی پروڈکشنز کے مالک اور ڈائریکٹر تھے، ملاقات ہوئی۔ وہ ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انہوں نے فوراً ملازم رکھ لیا۔ فلم "آرزو" اور "کو روکیشتر" کے مکالمے جیل ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ وارث شاہ کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما بھی لکھا تھا، لیکن اس کی فلم نہیں ہو جانے کے بعد کئی سالوں میں جیل کا ہوا اور

گنپتی ٹوٹ گئی۔ خدا معلوم وہ فلم کیا ہوئی، آج کل فلم کے ساتھ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک چار سال وابستہ رہے۔

۱۹۳۱ء میں دوبارہ کانگریس حکومت برسرِ اقتدار آگئی۔ ۱۹۴۷ء میں حکومت بہار نے انہیں ڈپٹی ڈائریکٹر پولیٹی اور فلم کیسٹ کا اہتمام بنا دیا۔ تین سال بیان رہنے کے بعد وہ جنوری ۱۹۵۰ء میں پٹنہ کا کلکتہ میں اسٹینڈ ٹیوٹ فیسر کی اسامی پر چلے گئے۔ ۱۹۶۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو شہزادہ یونیورسٹی کے شعبہ ادب میں تقرر ہوا۔ جب ۱۹۶۵ء میں وہاں سے بھی الگ ہوئے تو بے یونیورسٹی ٹرانس کمیشن

۱۹۴۷ء اگست

(پرو۔ جی۔ سی) ریسرچ اسکالرمقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنے مقالے کے لئے "اردو مرثیے کا تاریخی پس منظر" کا موضوع انتخاب کیا تھا۔ بہت مواد جمع کیا اور کچھ پانچویں بھی تصدیق کر لی تھیں کہ بمبئی پور سے سفر میں کا قذافت کا بیگ کم ہو گیا۔ اس کے بعد پھر دوبارہ کوشش کی حتیٰ کہ ایک افسوس کی یہ پہلی منزل سے دھڑھکی۔

۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک وہ خصوصی بیگم کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں درس دیتے رہے اور بالآخر دسمبر ۱۹۶۷ء میں بالکل سکون ہو گئے۔

اس پرانے سالی اور کثرتِ امراض کے باعث پریشان رہنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں ان کا زیادہ قیام اپنے چھوٹے بھائی رضا کا گھر کے ساتھ کئے میں رہائی میں ۱۹۸۰ء میں وہ پٹنہ ہوئے ہوئے بمبئی پر گئے۔ وہاں مرض الموت میں مبتلا ہو گئے اس میں ۱۲ جولائی ۱۹۸۰ء کو فوت کے گیارہ بجے اس سفر پر روانہ ہو گئے جس سے کوئی واپس نہیں آیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ اگلے دن (۲۳ جولائی) سامنے چار دیوے سر پر پڑا اور انہیں اپنی والدہ محترمہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اپنے مرتے کے تاریخاً ایک سال پہلے (۱۹۵۹ء) نکالی تھی، نظریہ مرد۔ اس کے دس بیسے بھائی تھے گویا یہ سب ہوئے۔ رضا کا گھر سے اڑھائی سو ایک کے قریب سے (۱۲۰۰) نکالے ہیں یعنی اور اجاب نے "ہائے علانہ جیل بھری" (۱۲۰۰) سے تاریخاً نکالی ہے۔

ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی میں انہیں کسی جگہ جاتی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ "خدا سے دور" ان کی کشمکش نظر ہے۔ یہ اسی واقعے کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد اشعار آپ جی سے کم نہیں۔ مثلاً ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ دامن کے گھر دے میں جوانی کا گیل اور اس گیل کا فتنہ فساد ہوتا
عشق معصوم کے وہ فرشتوں اقدام یعنی خداداد پر خدا دل کا رکتا ہوتا
دفعاً قزاق جہاز میں طوفانِ شباب و فتنہ کشی دل کا تو دلالا ہوتا
وہ مرے عشق کے چرچے وہ بزرگ کا قب و ترازو دے میں چھپنا مجھے سودا ہوتا
وہ تر پہلو میں آٹنا وہ سہاگن کی میرے گھوڑا تحمیل کا وہ محسوس ہوتا
شاعری اس بطل مرحوم کا نام ہے جیسے
میرے شمعوں کو مبارک سوانا ہوتا

جیسا کہ اگرچہ وہ واقعہ ناگاہی پر ختم ہوا۔ وہ ابھی اس سے حواس بکا نہیں کر سکتے تھے کہ ایک اور صدمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی چھوٹی بہن جمان سے عرشِ چھ بوس چھوٹی محبت ۱۹۳۲ء میں بوس ہوئیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے، خود بھی جوان، اس حادثے کا جہل پرست اثر ہوا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اب شادی نہیں کروں گا کیونکہ اس سے بہن اور اس کے بچوں کو تکلیف ہوگی۔ سب سے بہت بھگیا، لیکن یہ سب سے سن ہوئے۔ آخر جب والدہ سے بہت اصرار کیا تو انہوں نے مشروط لگائی کہ کسی بے اولاد دین رسیہ عورت سے شادی کروں گا

یہ شادی ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ لیکن افسوس کہ یہ بچہ بھی ناکام رہا۔ دونوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اس بچہ کا انتقال ہو گیا۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے رضا کا گھر اپنے بھائی اور اپنی بہن کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ بھانے بچے تو آج بھی انہیں کوٹتے تھے۔

ان کی حروفِ حق کا ذکر ہر جگہ ہے۔ ان کی سب سے پہلی نظم جو شائع ہوئی، خال کی بیٹی تھی۔ یہ نکتہ کے زمانہ پر پڑے نثر میں ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی تھی، جبکہ ان کی عمر ۲۰ برس کی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ اسیادہ کا بچ، کلکتہ میں طالب علم تھے، انہوں نے دفاعی وحشت کی شاعری انشائیہ کی۔ کہا جاتا ہے کہ چارپانچ غزلوں کے بعد ہی وحشت سے انہیں نکلا۔

مغز دی آپ کے کلام میں وہ بات پائی جاتی ہے جو شاہ شمس رائے عصر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ آپ آئندہ سے اپنی جیجی سلیم پرماد کریں، اصلاح کی ضرورت نہیں۔

اس کے باوجود وہ آشوبک انشراح صدر سے وحشت کو فخریہ اپنا استاد مانتے رہے۔ ان کے متعدد ذیل مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔

- ۱۔ شکست، دفع (خونِ مختصر افسانہ)، کلکتہ، ۱۹۵۰ء
- ۲۔ نقشِ جہل (نظموں کا مجموعہ)، پٹنہ، ۱۹۵۲ء
- ۳۔ کبرجیل (غزلیات و دیباچات)، پٹنہ، ۱۹۵۹ء
- ۴۔ آب و صرب (تفسیلاتِ عشق)، کلکتہ، ۱۹۶۰ء
- ۵۔ غزلانِ جہل (مراثی و قصائد)، لاہور، ۱۹۶۰ء (نیز اولاد ۱۹۶۹ء)
- ۶۔ وہجانِ جہل (مراثی و کلی نظمیں)، لاہور، ۱۹۶۹ء

بہت کلام نظرِ دُرِ غرِ مطہر دہرایا، یہ محفوظ چھوٹا چاہیے۔
عام طور پر انہیں مفکر اور فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو غالباً مانعہ ہے۔ ان کے ہاں کوئی منظر فلسفہ نہیں ملتا۔ بے دس کے ان کی مثنوی "آب و صرب" ایک ایسی چیز ہے جسے ہم نثر کی ذیل میں لاسکتے ہیں۔ اس میں شاعر نے انسان کی تخلیق کی عظمت خالی اور متعدد جہات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ بیشتر کلام قرآن مجید پر مبنی ہے لیکن احیاناً وہ دفاعی قضاے متعلق اپنے بے ایمانی اور شبہ کا اظہار کرتے ہیں جیگریز نہیں کرتا، یہ تشکیک کی منزل ہے۔

جہل کی غزلیات شاعری میں سوا۱۰۰۰ سے کچھ مختلف ہے۔ یہاں موقع نہیں کہ ان کے کلام کا تفصیل کا مزہ دیا جائے لیکن ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے روایت سے کثرت توڑنے بغیر اردو شاعری کو خود نو کی کشت پر لہر آگے بڑھانے میں ناقابلِ تعریف خدمت انجام دی ہے اور یہی ان کا تاریخی پس منظر ہے۔
سے ماہرِ امتیاز ہے۔



اجتماعِ ضیٰی

تھی۔ افسوس ہے کہ وہ خطوط محفوظ نہ سکے۔ سمجھا اس معاملے میں ہمیشہ سے بے پروا رہے جو اپنی تخلیقات کو محفوظ نہ رکھا۔ وہ دوستوں کے خطوط کی سنبھال کر رکھتا۔

اس مختصر سی تہمید کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے اس معنوی کا عنوان بھی ”اجتماعِ ضیٰی“ کیوں رکھا ہے۔ جن لوگوں نے مجھے مروجہ تخلیقات نظم و نثر کا مطالعہ کرنا سکھایا وہ ان کو قریب سے دیکھا بھی ہے، انہیں یہ احساس ہوا ہے کہ سمیٹا کے انکار اور کردار دونوں میں ہم آہنگی نہیں بلکہ تضاد ہے۔ سمیٹا کو خود بھی اس کا اثر سے احساس تھا کہ ان کے دل و دماغ میں کبھی مغایرت نہ ہو سکی۔ جہاں ان کا ذہن کیسر فلسفیانہ اور مفکرانہ تھا وہاں اُن کا دل بے حد محضربانی تھا۔ ان کو اپنے دوستوں عزیزوں بلکہ اپنی گود کے بالوں سے بھی ہمیشہ شکایت رہی کہ وہ ان کی دوستی اور محبت کا جواب ایسی گرم جوشی سے نہیں دیتے جس کے وہ مستحق تھے۔ اُن کے دوستوں اور عزیزوں کو ان سے یہ شکوہ رہا کہ وہ بے حد محضربانی ہیں۔ اُن کی خفیف سی خفیف فروگزاشتوں کو بھی وہ کم انتفاعی بابے تو جی سمجھ لیتے ہیں۔

انسان کے کردار کی تعمیر میں جہاں وراثت اور ماحول کا اثرات کارفرما ہوتے ہیں، وہاں بعض خارجی اور مختلف المذاہب اور متفاد و مذاہب بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ عمل و تدبیر عمل ایام فعلیت ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ سمیٹا مروجہ کے ساتھ کبھی بھی ہوا۔ ان کی تاریخ ولادت کے متعلق کچھ اختلافات اس سے پیدا ہو گئے ہیں کہ اُن کا سال ولادت ان کے تارخ نامی نام میر کاظم علی کے مطابق ۱۳۱۸ھ ہے۔ عیسوی سال کے حساب سے تاریخ ولادت ۱۹۰۱ء ہوئی ہے۔ مگر اسکول کے رجسٹر میں بالو نے سہولت کے لحاظ سے یکم جنوری ۱۳۱۸ھ درج کر دیا۔ میں بھی تاریخ سید شکیلٹ میں بھی درج ہوئی۔ ان کی زندگی کے ابتدائی دو ڈھائی سال بے متعلق مجھے کوئی اطلاع محض ایک معمولی سے واقفے نہیں جو والد مروجہ نے مجھے سنایا تھا۔ شاید وہ اپنی یا تین سال کی عمر میں ان کی جب

اب سے تقریباً پینتیس سال پہلے شکار میں روزِ بد ”عصرِ جدید“ نکلنے لگا۔ اس پہلو سے بھی مروجہ (حضرت مجاہد مظہری) نے ایک دل چسپ مضمون میں مولانا شائق احمد عثمانی مالک عصرِ جدید سے اپنے گہرے دوستانہ تعلقات کی داستان فرسے لے کر بیان کی تھی۔ اس معنوی کا عنوان ”اجتماعِ ضیٰی“ انہوں نے اس لئے رکھا تھا کہ شائق صاحب اور ان کی طبیعتوں میں نسلی، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے بڑا فرق تھا۔ شائق صاحب لٹراٹھری تھے اور سمیٹا ہانجی۔ شائق صاحب مذہباً حنفی، سمیٹا شیعہ اشاعری، تعلیمی اعتبار سے شائق صاحب فاضل دیوبند، سمیٹا کلکتہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے۔ سیاسی اعتبار سے مولانا کشر مسلم لیگ اور سمیٹا کچھ کانگریسی۔ وہ جناح کے مقلد اور یہ مولانا آزاد کے پیرو۔ ان تمام اختلافات کے باوجود دونوں کی دوستی کا یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے کے لئے جان چھڑانے کو تیار۔ ایک دن بھی ملاقات نہ ہو تو دونوں بے قرار اور بکھر رہے کہ جب مذہبی یا سیاسی مباحثہ دونوں میں چھڑتا تو آستینیں چڑھ جاتیں۔ معلوم ہوتا کہ اب ایک دوسرے پر جارحانہ حملے سے بھی باز نہ آتے۔ مگر محضوری دیوبندی یہ گہرا گہری آہستہ آہستہ ٹھنڈی پڑ جاتی اور سمیٹا دونوں شیر و شکر ہو جاتے۔ شائق صاحب تو قریباً ٹھٹھک کے بعد ہی کراچی مہاجر سمیٹا ہندوستان ہی میں رہے۔ یہ بے مکروروں کے دنوں میں دوستی کی یاد آگ بھی نہ بھئی۔ شائق صاحب کو کئی سال پہلے تک زندہ تھے، مگر مختلف امراض کی وجہ سے زندہ درگور تھے۔ ساتھ اب شاید وہ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ سمیٹا مروجہ ۲۳ جولائی کی رات کو لاہور کی جنت ہوئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر زندگی میں شائق صاحب کو سمیٹا کی موت کی خبر ملتی تو وہ اسی طرح چھوٹ چھوٹ کر روتے جیسے ایک بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی موت پر روتا ہے۔ سمیٹا تو زندگی بھر نہیں سہول نہ سکے۔ کبھی کبھی مرسلت ہو جاتی

۵ محی صندلی اشرف، فلیٹ نمبر ۱۶، کلکتہ ۷۰۰۱۱۶

وہ والد مرحوم کے ساتھ ایک مجلس عزائمیں بیٹھے تھے تھے۔ مجلس شروع ہو چکی تھی، مگر ایک لڑکا جو ان سے عمر میں کچھ بڑا تھا۔ اب بھی شروع میں کر رہا تھا۔ بھینٹانے پر جیسے کہا بڑا ہی متبر ہے یہ لڑکا۔ سب لوگ ان کو بفریاد کر رہے تھے۔ اس واقعے سے ان کی ذہانت اور اخلاقی جرأت کی جھلک سی نمایاں ہوتی ہے۔ اس چھوٹی عمر میں بھی وہ دوسرے بچوں سے زیادہ متنبہ رہتے اور ان کی اخلاقی جرأت بیدار رکھتی۔ اسی زمانے میں وادی نے ان کو اپنا بیٹا پوتا بنا لیا۔ حالانکہ ڈسے بیٹے کی اولاد موجود تھی۔ دوپوٹے بھی تھے۔ ایک ان میں سے بھینٹا سے کافی بڑے تھے، مگر دوسرے تقریباً بھینٹے کے عمر کے تھے، مگر جانے کیوں ان کو بھی چھوٹا پوتا بنایا۔ انہوں نے اس پوتے کو اپنے ساتھ ٹکانا اور اس کے لئے غریب سے اٹل اچھا، چھ کھانے پکانا اور سب سے چھپا کر کھانا شروع کیا۔ وہ غوطہ جھارت، نماز روزہ کے لیے ہر پابندیوں۔ ان کے بستر پر ان کے صاحبزادوں کو بھی بیٹھے کی عبادت تھی۔ مگر یہ لاڈلے پوتے صندھیں آکر آگے میں لوٹ نکلتے اور اسی حالت میں وادی کے بستر پر سوجاتے۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک دن اب تک یاد ہے۔ میں اس وقت شاید تین برس کا اور میری چھوٹی بہن ڈیڑھ سال کی تھی۔ ہم دونوں کھینچے ہوئے اس برآمدے میں نکل آئے، جہاں وادی اپنے چھینچے پوتے کے کچھ میاں لڑکی تھیں۔ انہوں نے یہ مجھ پر ایک ایک گھڑی ہم دونوں کو تھادری اور وہاں سے بھگا دیا کیونکہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ شاید ہم دونوں کی نظر ان کے پوتے کے کھانے کو لگ جائے گی۔ ان کی اسی یہ توجہ کو اثر تھا کہ میں ان کو بھینٹا کی وادی کہا کرتا تھا۔ اور ان کی ایک چچا زاد بہن کو اپنی وادی کہتا تھا۔

جب بھینٹانے یا بچپن میں سال میں دو رکھا تو ان کی مکتب ہوئی۔ موضع عسری جو میں پورے سے ہی ہوئی بستی ہے، وہاں کے مولوی سید طالب میں صاحب ان کے معلم مقرر ہوئے۔ بچے بھائی شروع ہوئی۔ بھینٹا بھی مائے میں کچھ تامل کرتے تو اماں انہیں زبردستی بھیجنا چاہتیں۔ وہ ماں کے ڈر سے جلتے لگتے تو وادی کہتیں کیا لڑکا ہے، کہہ دے سر میں درد ہے۔ جا کے لیٹ رہ۔ اس صورت حال کو دیکھتیں تو اماں جبر پر مجبور ہو کر اس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ان کا قلعن اس گھر لے کر لے کر بھٹا جو عظیم آباد میں ایک کوٹ خاندان کہلاتا تھا، اس لئے وہ تعلیم کو مقدم سمجھتی تھیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ صاحبزادے اگر اسی طرح وادی کے لاڈلیاں میں پے تو پھر رانا بھو یا جوکر رہ جائیں گے۔ وہ موقع کی منتظر رہیں کہ کسی طرح یہ مضافاں شائستہ پوتے کو وادی سے الگ کریں۔ جس اتفاق سے یہ موقع انہیں ملا وہ میں مل گیا۔ والد مرحوم کو علمی اور ادبی ذوق بہت تھا۔ زمیندار خاندان سے تھے، اس لئے ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ مگر میرے بچنے مارنے کا خیال ہر سیدھا سیدھی علمی علم سے ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کو دیکھ کر

جانتے دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ وہ پٹنہ کے محمد علی انکلو عہد اسکول میں اردو لکھا اور عربی کے معلم کی حیثیت سے شریک ہو جائیں۔ والد نے یہ مشورہ قبول کیا۔ اور محمد علی اسکول میں معلم مقرر ہو گئے۔ اب والد کو مستقل طور سے پٹنہ رہنے کا موقع ملا تو بھینٹا کو وادی سے جدا کر کے پٹنہ لے آئیں۔ مولوی صاحب بھی ساتھ آئے، گھر پر وہ پڑھاتے لکھاتے، مگر بھینٹا کو مدرسہ سلیمانہ کی ابتدائی جماعت میں بھی داخل کر دیا۔ مگر یہ سلسلہ بھی دو سال بعد ختم ہو گیا، اس لئے کہ والد کا تھر مو تہ باری ضلع اسکول میں ہو گیا۔ اس اسکول کے سید کا بھتر وادی باپو مجھے ماموں کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۲ء کا ہے۔ اسی سال وادی کا بھی انتقال ہو گیا۔ مولوی طالب صاحب نے بھی پٹنہ چھوڑ دیا۔ وہ اپنی جگہ اپنے ایک عزیز مولوی سید امداد امام عسری کو رکھوا گئے تھے۔ سلسلہ میں والدہ موتہ باری میں رہے لگیں۔ بھینٹا کا داخلہ ضلع اسکول کی چوتھی یا پانچویں جماعت میں ہو گیا۔ والد کے ایک شاگرد ابھی صغیر صاحب انہیں انگریزی وغیرہ پڑھاتے تھے، مگر شافعی میں والدہ ہم سب کو لے کر پٹنہ اس لئے چلی آئیں کہ ان کے سینکے میں شادی کی تقریب تھی۔ ۱۹۱۶ء میں والد کا انتقال وادی اسکول نظر پور میں ہو گیا۔ بھینٹا بھی وہیں داخل ہوئے۔ اسی سال سالانہ امتحان میں اور دو کے پرچے میں گھوڑے پر مضون لکھا، اس میں میرا پس کے ایک مٹھے کے وہ اشعار بھی لکھے جو گھوڑے کی تعریف میں تھے۔ مضون کی کاپی جب مولانا غنیب صاحب عربک ٹچر کے پاس آئی تو ان کو ایسی حیرت و حسرت ہوئی کہ شہر میں لوگوں کو دکھاتے پھرے کر دیکھتے یہ ایک بارہ سالہ لڑکا لکھ کر مضون ہے اور میں گئی کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور بڑا ادیب ہوگا۔ ایسا ہی واقعہ اس وقت ہوا، جب بھینٹا انھوں جماعت میں تھے۔ سالانہ امتحان میں جو مضون لکھا وہ اس وقت کے عربک ٹچر مولوی سید امجد حسین جعفری (جو بدین ڈاکٹر امجد حسین جعفری بی۔ ایچ۔ ڈی او ڈاکٹر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، اور کئی سال تک بنگلے کے امام بازار عسفیہ کے مفتی بھی رہے) نے بھی خوش ہو کر یہ مضون سب کو دکھایا اور کہا کہ مجھے نماز ہے کہ میرا شاگرد ایسا ہو نہ کہ یہ اور جب بھینٹا کی ادبی زندگی شروع ہوئی اور وہ مشہور ہوئے تو ان کے ان قدر وال اساتذہ کی پیش گوئی سچی ثابت ہو کر رہی۔ جعفری صاحب ہمیشہ ان پر ناز کرتے رہے۔ سلسلہ میں جب والد کا انتقال مغفرو پور ہوا تو چند ماہ بعد میری شہر کے ایک رئیس امام الدین خاں صاحب نے انی امام منزل میں ایک علمی شاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشورہ اس لئے منعقد ہوا تھا کہ رام پور کے ایک تاجر عطیہ ثابت صاحب ان دفنی شہر میں آئے ہوئے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ان کا امام الدین خاں سے رابطہ ہوا تو انہوں نے ایک دن بڑے غور سے کہا کہ شاعری تو توہنی کا حصہ ہے، بہر حال اسے شاعری کیا جائیں۔ امام الدین خاں کو تاؤ اٹھا اور انہوں نے ان کے اس

جلیغ کو قبول کر کے شاعر منعقد کر دیا تاکہ وہ بھی دیکھیں کہ بہار کے اس چھوٹے شہر میں بھی اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ والد مرحوم خود شاعروں میں غزل غنی کہتے دیتے، اپنے چھوٹے بھائی کے اسرار پر انہوں نے طرح میں ایک غزل کہہ کر بھیا کو دے دی۔ اس وقت میری عمر شاید آٹھ سال کی اور ان کی بارہ سال کی ہوگی، مگر والد نے ان کو مکتوبوں میں میرا نہیں کے سلام اور شے پڑھنے کی تربیت دی تھی۔ شاعرے میں چمک کر جو انہوں نے غزل پڑھی تو شاعرہ ان کے ہاتھ رہا۔ ثابت صاحب محل تو ہوسے مگر بھیا کی داد بھی دل کھول کر دی۔ اس کے بعد قسارے شہر میں ان کی غزل غانی کی دھوم مچ گئی۔ شہر میں جب کوئی مشاعرہ ہوتا تو وہ ضرور ملانے جاتے۔ اس مشاعرے کا مصرع طرح تو مجھے یاد نہیں۔ زمین غالب غبار دیکھ کر، بہار دیکھ کر تھی۔ ایک مصرع ان کی غزل کا یاد رہ گیا ہے: ج

روئے لگے وہ زار زار میرا زار دیکھ کر

بھیا کی غزل خوانی کا یہ سلسلہ ۱۹۳۷ء تک چلتا رہا پھر وہ بعض تعلیم کھتے چلے گئے۔ جب ۱۹۳۹ء میں انہوں نے میرک پاس کیا تو مظفر پور کے مشہور وکیل مولوی بدرالمن صاحب نے اپنے مکان پر ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا۔ طرح طرح کی آدمی کی طرح، جہاں کی طرح۔ اس مشاعرے میں چند شعر بھیا نے خود کہے۔ باقی اشعار والد مرحوم نے کہہ کر غزل پوری کر دی۔ اس مشاعرے میں بھی بھیا کی غزل بہت پسند کی گئی۔ مجھے اشعار تو یاد نہیں ایک مصرع یاد رہ گیا ہے: ج

میں آٹھ کے بٹھک گیا گرد کارواں کی طرح

یہ تھی ابتدا ان کی شاعری کی۔

میں ذرا اپنے مومنوں سے بہک گیا ہوں۔ مومنوں سے بھیا کے زور پر متنا و اثرات کی کار فرمائی۔ دادی کا لاڈ پیارا نہیں خود پسند، ہندی اور عقد و رنارہا تھا۔ دوسری طرف ماں کے رعب نے انہیں خلک سمیت اور احساس کمتری میں مبتلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اماں جہاں اتنی محبت کرنے والی ماں تھیں کہ آدمی آدمی رازوں کو آٹھ ٹکھٹوں میں ٹوٹوں کی سلامتی جھٹ اور طول حیات کی دعائیں مانگتی رہتیں، وہاں تعلیم و تربیت کے معاملے میں بے حد سخت گیری تھیں۔ مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ایک دن بھیا نے من پورہ میں کسی اپنے دوست کو بسکٹ کا ایک ڈبہ لہجہ انکان سے پوچھنے دیا تھا۔ اماں کو یہ لگتا انہوں نے مولوی صاحب کو دروازے پر پس پردہ سے حکم دیا کہ انہیں نہ راہی۔ مولوی صاحب کچھ متامل ہوئے تو انہوں نے سختی سے مولوی صاحب کو تنبیہ کی کہ اگر وہ اس وقت لڑکے کو سزا نہیں دیتے تو پھر وہ کیا اس کی تعلیم کر سکیں گے۔ مولوی صاحب نے بادل ناخاستہ سمیت کہ چند چڑیاں لگائیں اور ان سے توبہ کرائی کہ وہ پھر کوئی بیزار بھیا کی اجازت کے کسی کو نہ دیں گے۔

آج کل کی دہلی

اماں خود بہت قیام نہیں اور اس ڈبے کی کوئی حقیقت نہ تھی مگر انہوں نے اصولاً اس حرکت کو نازیبا سمجھا کہ لڑکا بیرونی کی اجازت کے اس طرح قیامی کرے۔ بات گئی گزری ہوگئی، مگر بھیا کی طبیعت پر اس کا اثر رہا۔ دادی کے بعد وہ ماں کے لاڈ سے تھے، اس کے لگاؤ اور لگاؤ تھے۔ اس کے باوجود بہت دلتوں تک اماں کا رعب ان پر طاری رہا، مگر قیامی چونکہ ان کی فطرت نازیبا تھی وہ بہر صورت جاری رہی بلکہ جب وہ برسر کار ہوئے تو اس میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ خود تکلیف اٹھاتے، مگر دوسروں کی تکلیف ان سے کبھی نہ جاتی۔ اپنے بھائی ہیں، گود کے پائے بچوں کے علاوہ نادار اعزا اور حاجندوں کے لئے ہمیشہ ان کی دریا دلی جاری رہتی۔ اگر وقت پاس پیسے نہ ہوتے تو کسی حاجت مند کی حاجت روا کرنے کے لئے وہ قرض لینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ اور یہ قیامی روپے پیسے تک محدود نہ تھی، اپنی ذہنی تخلیقات بھی وہ اسی قیامی کے ساتھ تقسیم کرتے رہے۔

جہاں قیامی کا یہ عالم تھا، وہاں ان کی بھینٹی چھوٹی خاسنوں کو دیکھ کر لوگ حیران ہوتے۔ دیاسلائی کی ڈیر کی تیلیاں لگتے اور ان کی بچی ہوئی نعلوں سے کچھ کہتیں تو دوکان دار یا چاچا کپین والوں کو سٹوٹا میں سناٹے۔ سرگٹ نجیا بھیا کے پتے تھے۔ اگر ان بچے مکتوں میں سے کوئی ادھر ادھر ہو جاتا تو اس کی تلاش میں پریشان ہوتے۔ سرگٹ کی ڈیر میں بٹھنے سرگٹ ہوتے ان کو گتے رہتے کہ کہیں ڈر کا لڑکا چڑانے۔ ایک بے تکلف حسرتیز اکثر ان کو پریشان کرنے کے لئے وہ ایک سرگٹ نکال لیتے۔ پیسے اپنے پاس وہ کم ہی رکھتے تھے، مگر جو پیسے ان کی جیب میں ہوتے ان میں سے اگر ایک پیسہ بھی کم ہو جاتا تو اس کے لئے پریشان ہوتے۔ اگر کبھی اتفاق سے بازار جانے کا موقع ہوتا تو کم میں سے کوئی ساٹھا ہوتا، مگر وہ خود دوکان داروں سے قیمت پر اچھے۔ زیادہ کاریہ مانگنے پر کٹنا اور پڑھنے۔ مگر کوئی کرنا والا انہیں نادار اور پریشان نظر آتا تو قیامی سے اس کی اطلاع نہ ملنے کے نوہر میں وہ کھنڈے کھنڈے اور پیسے تھے۔ رات کے وقت ایک بھیا اسی ڈبے میں چڑھائی۔ ہر سردی سے کانپ رہتی تھی۔ یہ خود گرم شیر والی پینے تھے۔ میرا چھوٹا لڑکا جو ان کے ساتھ تھا، ہر سردی پر چادر اوڑھے سوتا تھا، اس کو کھانا نہ تھے۔ اگر کچھ ہاتھ نہ آیا تو سوتے رکھا جو بڑا سا لڑکا تھا اس کو بھیا کو اٹھا دیا۔ یہ نیا تو لڑکا جو بسولہ نے دی ہے لاکر دیا تھا وہ انہیں پسند بھی بہت تھا۔ ان کی قیامی اور خدمت کی داستان کہاں تک بیان کروں ان کے کردار میں لقنا و کاسب سے زیادہ نمایاں بیہوشان کا تصور مذہب اور اس کے ساتھ ان کی توہم پرستی کا ہے۔ ان کی تعلیمات نظم و ضبط ان کی خیالات خدا و مذہب کے متعلق ایسے تھے کہ انہیں مذہبی لوگ کا ذوق طبعی بننے سے باز نہ آتے۔ سختی حضرات انہیں کٹر شیعہ کہتے اور شیعہ حضرات انہیں سختی سمجھتے۔

اس نے گمان کے غمیں اور بے تکلف احباب میں سستی زیادہ تھی۔
 کچھ ہندوؤں کو مسلمان سمجھتے، مگر کچھ دوست ایسے بھی تھے، جو انہیں
 اپنے سے بہت قریب سمجھتے تھے کیونکہ وہ سری کرشن جی اور ان کی گیتا کی
 بہت محفل کرتے۔ مہاتما گوتم بدھ، کیر اور گورو نانک کو عظیم محبت انسانیت
 سمجھتے اور ان کی تعلیمات کو گہری عقیدت سے پڑھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو
 رہنمائے انسانیت سمجھتے تھے، مگر مسیحیوں سے بڑھ کر تھے۔ کفر و ایمان سے
 متعلق ۱۹۳۳ء میں ان کا یہ شعر بہت قابلِ گرفت سمجھا گیا تھا
 کفر کیا ہے حرم و دیر کی تفریق ہمیں مل
 سخت کافر ہے وہ ہندو جو مسلمان ہو جائے
 ایک اور غزل میں ان کا یہ شعر بھی مذہبی حلقے میں قابلِ گرفت سمجھا گیا
 مٹ و جنت خانہ توڑنے والے
 اسی زد میں خدا نہ آجائے

مذہب سے تو نہیں مگر کثرتِ مذہبیت سے جہاں ان کو سخت بیزاری تھی
 وہاں وہ بانیانِ مذاہب سے بھی بے وقعت سمجھ رکھتے تھے۔ نماز بھی
 باقاعدہ نہیں پڑھی۔ رخصتی میں سکی سکتی۔ روزے کو کبھی رکھتے تھے مگر
 جواتی میں یہ سب چھوڑا۔ یہی افکار پارٹی میں بلائے جاتے تو اس دن
 کھانا پینا توڑ کر دیتے تھے مگر سگریٹ پیتے رہتے۔ عاشورہ حرم کو
 بھی یہی طریقہ تھا۔ حرم کی مجلسوں اور محافل میلاد النبیؐ میں بھی شرکت کرتے۔
 مگر مولویوں اور درازوں کی یاد کوئی برکری تغیر بھی کرتے۔ کلمہ میں جب
 تک مولانا ابوالکلام آزاد نماز عیدین پڑھاتے تھے وہ نماز عیدین انہیں کے
 پیچھے اپنے سنی دوستوں کی طرح ہاتھ باندھ کر پڑھتے۔ جب سے مولانا نے
 نماز عیدین پڑھنا ترک کیا تب سے نماز عیدین پڑھنا بھی ترک کر دیا۔ شیعوں
 کی مسجد میں تو بھی نماز عیدین بھی نہ پڑھی۔ اپنی تمام مذہب بیزاری کے ساتھ
 مساجد رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو اٹھنے کے بعد اپنے خلیفہ کے ہاتھ
 اٹھا کر ہم لوگوں کے لئے بھی نہیں تمام اعزاز اور احباب جگہ ساری انسانیت
 کی سلامتی کے لئے دعا میں لگتے۔ اور اس طرح ہرگز دکر مانگتے۔ جیسے کوئی عابد
 ناہم مانگتا ہے اور تو یہ سب سنی کا یہ عالم تھا کہ اگر راست چلے کوئی نئی راستہ
 لاکھ تو خرچ بھی کھڑے ہو جاتے اور ہم میں سے بھی کوئی ساتھ ہوتا تو اس کو
 بھی آگے بڑھنے دیتے۔ تاہم کوئی دوسرا راہ گیر اور دوسرے گزرنے والے نہ
 کہیں جانے کے لئے گھر سے نکلے اور اتفاقاً آسمان کی طرف نظر اٹھا جاتی اور
 وہاں صرف ایک تنہا ستارہ نظر آتا تو کھڑے ہو جاتے اور دوسرے ستارے
 کے نمودار ہونے کا انتظار کرتے رہتے۔ بدھ کے دن وہ خود کھڑے نہ ہم میں
 سے کسی کو نہ دیتے۔ جمعہ نماز جمعہ سے پہلے سفر نہ کرتے۔ کوئی نئی دوا اجرات
 کو نہ خود کھاتے نہ ہم لوگوں کو استعمال کرنے دیتے۔ رشتہ پر خود دامن طرف بیٹھے

اور کھو گیا اپنے سے کسی خرد کو بائیں طرف مٹھائے تاکہ اگر خدا خواستہ کوئی
 حادثہ برسرِ راہ ہو تو اس کا اثر ان پر ہوا ساتھ دل پر نہ ہو۔

لباس کے معاملے میں وہ بے پروا تھے۔ کپڑے پہنے ہی تو پہنے ہی
 سہی۔ استری سے ہوا تو اس کی بھی پروا نہیں۔ مگر جب نہادھو کر کپڑے بدلنے
 تو کرتے اور پانچلے کا یکساں طور پر پہلا ہوا نہ ضروری سمجھتے۔ اگر ذرا بھی
 فرق کرتے، پانچلے اور شیر وانی کے اُبلے پن میں ہوتا تو نہ پہنتے۔ وہ
 شاعری کی طرح ان روزانہ کی باتوں میں بھی صنعتِ تزیین کے قائل اور
 پابند تھے۔ نہ بے جوڑ کپڑے پہنتے اور نہ بے جوڑ کھانا کھاتے۔ اگر ناشتہ
 میں کچھ بکری کی پو یا بکے ہوئے فوس ہوں تو ان کے ساتھ نیم برشت اٹھا۔
 پوریاں ہوں یا پانچلے تو ان کے ساتھ آملٹ یا شامی کباب۔ روضی دوتی
 کے ساتھ کھتے۔ نہاری کے ساتھ تندوری نان۔ گڑس کے کھاتے ہوتا
 کھاتے ہی نہیں چھڑا کھاتے ہیں اور ہر کی دال بہت پسند تھی بشرطیکہ وہ
 خوب سوندھی اور آداب و نمک سے درست ہو۔ دال کے اس شوق کی بنا پر
 ان کے استاد دھانی حضرت آصف بناری کی بی بی انہیں دال والا بھکر یاد
 کرتیں۔ مرغ یا درجنگلی کے فورے انہیں پسند تھے۔ خاص طور پر میری اہلیہ
 کے ہاتھ کے پکائے ہوئے۔ مگر لذیذ سے لذیذ کھانا اگر ان کے میاں پر درست
 نہ ہوتا تو نہ کھاتے۔ اچھی چیز پکانے والے یا پکائے دلا کر انعام دیتے، مگر کڑا
 پکی ہو تو ڈانٹ بھی اسی سختی سے پلاتے۔

ڈکروں کا اتنا خیال کرتے کہ جو چیز خود کھاتے پہنے ان کے لئے نکال
 کر الگ رکھ دیتے۔ کوشش تو یہی کرتے کہ لوگ ساتھ ہی کھائے، مگر وہ
 راضی نہ ہوتا۔ گھر میں جب بھی شادی کی تقریب ہوتی وہ سب سے آخر میں کھاتے
 پر بیٹھتے اور گھر کے تمام ڈکروں کو ساتھ جھا کر کھاتے۔ جاڑے میں اس کے
 لئے سوئٹرز وغیرہ کر دیتے یا ہم میں سے کسی سے مانگ کر دیتے، جہاں ڈکروں
 کا اتنا خیال رکھتے تھے وہاں اگر کسی ڈکر یا چھوکر سے کوئی فروگزاشت
 یا غفلت ہوتی تو اس کو ٹپری سختی سے ڈانٹتے۔ چھوڑا کھانا کوئی آگے دھ
 چیت بھی لگا دیتے۔ لیکن جب غصہ اتنا تو اس کو کچھ نہ کچھ انعام بھی مل جاتا۔
 حق العیال کا اتنا خیال تھا کہ عزیزوں اور دوستوں کے یہاں میزبان،
 تعزیت یا تنہیت کے لئے باوجود خالی صحت کے ضرور جاتے۔ خاص طور پر
 اپنے غریب اعزاء سے۔ عائدین کے مجمع میں بھی عزیزانِ ملتے تاکہ اس کو اپنی
 غریبیت کا حال نہ ہو۔ دونوں میں شرکت شوق سے کرتے، مگر ہوش پر نگر کرتے
 رہتے کہ جس کے پہلے دعوت کھائی ہے اس کا پتہ یہاں بھی دیکھ لے کہ اس کا
 بدلہ ادا کر دیں۔ وہ خوش خیر تھے، مگر کبھی رنجور نہ تھے۔ ان کو کھانے سے
 زیادہ کھانے میں خوشی حاصل ہوتی۔ جہاں کو بہ اصرار زیادہ سے زیادہ کھاتے
 اور خود اس دن لم سے کم ہی کھاتے۔

حب بڑھا پایا تو عمر کے آخری برسوں میں استخارہ کے اتنے پاس نہ
 ہو گئے تھے کہ بہن آئے جانے میں ہی نہیں کھائے پیتے میں بھی استخارہ کرتے
 جب تک استخارہ مناسب نہ آتا، کہیں عاصیہ نہ کھانا کھاتے۔ بیس حبیب
 میں رکھتے تھے، مگر کہیں تسبیح ساتھ نہ ہوتی تو دیاسلائی کی کانٹیلوں سے
 استخارہ کرتے۔ وہ دونوں میں اکثر ایسا ہوتا کہ وہ میرے کچے تسبیح لکانٹیلوں سے
 استخارہ کر کے کوئی چیز کھاتے یا مجھے کھانے دیتے۔ ایک بار بڑاری باغ گئے۔
 وہاں اُن کے پرانے اور بے تکلف دوست قلیہ اس صاحب ڈی۔ ایل بی
 متعین تھے۔ انھوں نے ان کے اعزاز میں عاصیہ بن شہر کی حکومت کی۔
 مگر ان کو کچھ بھی کھانے پر استخارہ نہ آیا، اس نے بغیر کچھ کھائے چلے آئے۔
 جنوری سلسلہ میں والدہ کا انتقال کہیں پور مظفر آباد میں ہوا۔ شدید
 بیماری کا شہید کیا، جہاں وہ قہم تھے۔ مدفن ملک ساتھ تھے۔ گلو سلسلہ بھی
 دہلی سے آ گئے۔ مگر بھتیجا کو استخارہ نہ خود جانے کا یا نہ ان دونوں کے جانے
 کا۔ والدہ راجی حشمت ہوئیں۔ تجیزہ خلیفین، تدفین سب ہو چکی تو یہ لوگ
 آ سکے۔

استخارہ کے اس توہم کو تو دوسری نوعیت سمجھتے تھے، مگر کہتے کہ یہ
 عادت بدلتی ہو چکی ہے کہ بغیر استخارہ کے کوئی کام کرنے سے سون قلب نہیں
 ہوتا۔ یہ مرض استخارہ بھی دلائل ان کی اصرار کی ضرورت تھا۔ لکھنؤ میں
 وچپش لکھنؤ لاق ہوا۔ جب اس میں شدت ہوئی تو والدہ مرحوم سلسلہ میں
 انہیں دہلی لے گئے۔ وہاں عظیم اہل خاں صاحب سے علاج کروایا صحت ہو گئی
 مگر اسی سال وہ بغیر خلیفہ کھاتے چلے گئے۔ کھاتہ کی زندگی اور مٹلوں کے
 کھانے سے پھر اس مرض کو اسی طرح زندگی بھر ساتھ نہ چھوڑا۔ معدہ خراب
 ہوا تو اختلاج قلب سے سرا کھارا۔ اسی اختلاج کی وجہ سے ایم اے کے امتحان
 میں آخری پرچہ چھوڑ کر چلے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچا نے فرسٹ کلاس کے
 سیکنڈ کلاس ملا۔ حالانکہ اپنے جس دوست کو انہوں نے فارسی ادب پڑھایا
 تھا وہ فرسٹ کلاس لے آئے۔ اختلاج کی اس شدت کو بعض اعزائے
 جنون سمجھنا شروع کیا۔ بچپن سے چھوٹی زاد بہن سے رشتہ طے ملا تھا۔
 مگر اس غلط فہمی نے یہ رشتہ بھی منقطع کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کا تھا۔ اسی
 سال چھوٹی بہن کی شادی ہوئی، مگر وہ کم نصیب صرف ساڑھے تین سال
 سہاگن رہی اور صرف دو بچوں (مدن اور گوسلہ) کی ماں بن سکی۔ اب
 تک زندہ ہے۔ اس حادثے نے ہمیشہ کے دل پر ایسا اثر کیا کہ انہوں نے
 باوجود والدین کے ہمارے شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ بہن کے بچوں کو
 اپنی اولاد کی طرح پالا۔ سلسلہ میں میری شادی بڑے جیسے کے ساتھ کر دی۔
 میرے یہاں جو بچے ہوئے وہ سب انہیں کے بچے رہے۔ انہیں کو اتنا کہتے
 اور سمجھتے۔ مجھے صرف آج تک بابوئی کہتے ہیں۔ میں نے میری بیوی نے

اور بہن نے اپنے بچوں کو انہیں کے بچے سمجھا اور کہا۔ سوا گھر کے لوگوں کے
 اور قریبی دوستوں کے کوئی جائے سناجنا نہ تھا کہ یہ ان کے نہیں ہم لوگوں کے بچے
 ہیں۔ صرف میری چھوٹی لڑکی مجھے ادا کہتے تھی۔ وہ بھی اس لئے کہ اس کے
 بچپن کے زمانے میں سمجھا کہ تمام کھاتے میں بہت کم رہا۔ باوجود اس کے
 وہ اس کو بھی اپنی بیٹی ہی کی طرح ماننے سے محروم تھی۔ صرف وہ ان کو بڑے آبا بھتی
 تھی۔ اس بے پناہ محبت کے باوجود بھی ہم میں سے کسی کی بھی بھول بھائی
 چھوٹی فرورگداشت کو نظر انداز نہ کرتے۔ خفا ہو جاتے مگر یہ غلطی بھی پیار
 کی غلطی ہوتی اور تھوڑی دیر بعد ہی غصہ فرو ہو جاتا تو کہنے کہ کم کم لوگوں
 سے خفا اس لئے ہوتے ہیں کہ تمہاری ناراضی ہو جائے۔

وہ کان کے ذریعہ تھے۔ ان کی اس کم زوری سے فائدہ اٹھا کر اکثر خفا
 لوگ دوسروں کی چھوٹی شہیت کر کے ان کو برم اور بدگمان بنا دیتے۔ مگر
 وہ شخص جس سے بدگمان یا برم ہوں اگر پیار ہو یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو
 ساری برہمی بھول کر اس کی مزاح پر ہنسی کو جاتے اور حتی الوسع اس کی
 تکلیف دور کرنے کی کوشش کرتے۔

وہ مجھ سے عمر میں صرف پانچ برس بڑے تھے، مگر انہوں نے
 محبت کے ساتھ ساتھ کچھ پیدائندہ رعب رکھا۔ مجھے اب تک یاد ہے جب
 میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا تو اتفاقاً والد کے ساتھ ہم دونوں کھائی
 فیض آباد گئے تھے۔ وہاں بیچ بازار میں مجھ سے دھانے کی غلطی ہوئی تھی کہ
 انہوں نے وہیں مجھے تجیزہ رسید کر دیا۔ میں رو کر رہ گیا۔ اس کے کئی سال بعد
 حبیب میں کالج میں تعلیم پارہا تھا، مجھ سے کوئی گستاخی مرزومگی تو
 انہوں نے چار یا پانچ دن تک مجھ سے بول چال ترک کر دی تھی۔ آخر والد
 کی سفارش اور میرے دست بستہ معافی مانگنے پر انہوں نے قصور معاف کیا
 اور مجھے گلے لگا دیا۔ وہ مجھ سے بھی ایسی ہی محبت کرتے تھے جیسے کوئی
 اپنی اولاد سے کرتا ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی کھاتے میں لٹ کو مجھے اگر کہیں
 مانا ہوتا تو کسی نہ کسی کو ساتھ کر دیتے۔ دن میں ان کو کہیں سے آتے تھے مجھے دیر
 ہوتی تو بے چینی سے بیٹھتے رہتے، جب تک میں نہ جاتا یا بہن سے بیٹھتے نہ
 کھانا کھاتے۔ جب تک وہ زندہ تھے میں اپنے کو توڑھا نہ سمجھتا تھا اب
 ایک سال کے اندر کچھ بڑھاپا تیزی سے طاری ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ نہ
 اب مجھے کھانے پینے میں ڈرنے والا ہے نہ آئے جلنے میں روکنے والا نہ تاکید
 سے وہ نہیں کھانے والا۔

جہاں وہ اپنے سے کم عمر اور کمتر شرا اور دبا کے ساتھ بے حد
 مکرر غلطیوں کے ساتھ پیش آتے وہاں اہل دول اور ارباب اقتدار
 کے ساتھ کنکاش میں رہتے۔ جس زمانہ میں ڈاکٹر زکریا صاحب مرحوم کو وزیر
 بہار تھے، ایک ایڈیٹریاتی خاصہ میں وہ صدارت کے لئے شرفیلا لائے۔

بھیانے دوست ایوب صاحب ایڈووکیٹ کے اصرار پر نکلتے سے بڑھ گئے ساتھ لے کر آئے۔ اور شاعری میں ان کو ڈھانچا بھی پڑھا۔ مگر وہ ڈاکو کے پاس جا کر نہ ملے۔ بس دوسرے رسمی تعظیم کر دی۔ اس کے بعد ڈاکو صاحب متوجہ تھے کہ بھیا نے ان گورنمنٹ ہاؤس میں جا کر ملاقات کر گئے۔ مگر یہ نکلے۔ شاید ایک یا دو سال بعد کسی شادی کی تقریب میں ڈاکو صاحب بھی شریک تھے۔ جسٹس علیل احمد بھی شریک تھے۔ دوران گفتگو ڈاکو صاحب نے پوچھا۔ کیا علیل منٹری اس تقریب میں تشریف لائے ہیں؟ علیل صاحب نے کہا: وہ ادھر کا رسہ بیٹھے ہیں ابھی جا کر کھڑے ہوئے۔ وہ گئے اور بھیلے کہا کہ گورنر ہمارے حکم سے ہمارا چیف جسٹس ہتس کرتا کرتا اُن کے سامنے پیش کرے گا۔ یہ کہہ کر انہیں بھیج کر ڈاکو صاحب کے پاس لائے۔ ڈاکو صاحب نے ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود ان سے نہ ملنے کی شکایت کی تو بھیا کچھ پرستہ مند ہوئے اور بیکھڑے دن بعد ان سے ملنے گورنمنٹ ہاؤس گئے۔ ڈاکو صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور وہ بھی ڈاکو صاحب کا گورنری حیثیت سے نہیں ایک عالم وادب کی حیثیت سے بڑا احترام کرتے تھے۔

بھیا مرحوم کے مجلس اور بے تکلف دوست غازی جعفر اہل صاحب جب بہار میں منتر ہوئے تو بھیا نے ان کے یہاں جانا ترک کر دیا۔ حالانکہ دونوں میں خلوص اور بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ جعفر امام بھیا کی بھیا کو ملائی کبہ کر دیکھتے تھے۔ مہینوں اپنے یہاں پھر کر گئے۔ ان کے لڑکے لڑکیاں بھیا کو خوشی بچا کی طرح مانتی تھیں۔ جب جعفر بھیا کی منتری سے سبک دوش ہوئے تو بھیا ان سے ملے گئے۔ جگ جیون باوا اور ہمارے وزیر اعلیٰ کرشن بلوچہ سہا نے ان کی ملاقات پر ونیسر باری مرحوم کے ذریعہ ہوئی تھی وہ دونوں بھیا سے سادیا نہ انداز میں ملتے تھے۔ کرشن بلوچہ ملے جب وزیر اعلیٰ ہوئے تو بھیا نے ان سے ملنا چھوڑا۔ ایک جلسہ میں ملاقات ہوئی تو سہا صاحب نے ان سے شکایت کی کہ علیل صاحب آپ کو بھی ملتے ہی نہیں۔ بھیا نے کہا میں سیاسی حلقے سے اب باہر ہوں اور آپ وزیر اعلیٰ ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں سے آپ کو فرصت کہاں کہ سماجی ملاقات کے لئے آپ وقت نکالیں، اس لئے میں آپ سے نہیں ملتا۔ وہ مسکاکر چپ ہو گئے۔

اس نے نیازی کے باوجود اگر کسی کی سازش کرنے کے لئے کسی بھی صاحب اقتدار کے پاس جاتا پڑتا تو بے حد رنجیدہ جلتے۔ بچی جب سے رکتا کہ کوئی ادا کرتے۔ دوسروں کے کام سے اپنے سے کم کرنا اور کم کرنا ان کی مدد ممانی کرتے میں بھی انہیں مدد نہ ہوتا صرف اس خیال سے کہ کسی ضرورت مند کی حاجت روائی ہو جائے۔ مگر اپنے لئے کبھی کسی کے پاس نہ گئے۔ لاگت مری حکومت کا

آج کل بخدی

دور تھا اور وہ اس طبقہ میں مقبول بھی تھے، مگر دوسرے لوگوں کی طرح انہوں نے اپنے گھر کو بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ بہار کوئل کی رکنیت انہیں حکومت دینا چاہی تھی، مگر انہوں نے انکار کیا۔ بیٹجی ڈپارٹمنٹ میں ان کا اور کوئل کی کانفرانک ساتھ ہوا تھا۔ مگر چند سال بعد ہی کوئل کی فکر تعلیم میں ہندی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ گر ٹیڈون ملا۔ بھیا کے بیٹجی ڈپارٹمنٹ سے پٹنہ کوچ میں تبادلہ کرنے کی بات بھی ان کی خواہش کے مطابق چلی۔ پٹنہ کوچ میں صدر شعبہ اردو اختر زینوی صاحب تھے۔ بھیا نے فزوفیت سرٹری ایڈ پی منگھ سے کہا کہ میں اختر صاحب کی حق تلفی کروا کے دہاں گر ٹیڈون کی جگہ پر جانا گوارا نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے گر ٹیڈون اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے بھیج دیجئے۔ اختر صاحب کی ماتحت مجھے ہرگز ناگوار نہ ہوگی میں بھی ان کے ماتحت کی حیثیت سے کام کرنے کو تیار رہا۔ مگر اختر صاحب مرحوم نے بھی بھیا کی بزرگی کو برہم مٹھا رکھا۔ باہر ہی کہتے تھے کہ صدر شعبہ تو دراصل منٹری صاحب ہیں۔ میں فزوفی حیثیت سے صدر ہوں۔ واقعہ چھوڑا سا ہے، مگر دونوں کی بڑائی اور کشادہ دلی کا بین ثبوت ہے۔ بغول تیراب کہاں ایسے پرستہ وہ طبع "لوگ۔ سلطان دونوں کو خلد میں سکون و سرور عطا کرے۔

عام طور سے شاول کو اپنا کلام سنانے کا شوق ہوتا ہے اور اہل میں تو شوق بھر جیون پایا جاتا ہے۔ شاعروں میں بڑے جاننے کے لئے جوڑو کر کے بھی باز نہیں آتے۔ بھیا مرحوم شاید اس معاملے میں بھی مختلف انداز پر تھے۔ عام مشاعرے تو کیا کئی مجلسوں میں بھی وہ اپنا کلام سنانے سے گھبراتے۔ بہت اصرار ہوا تو چند شعر پڑھ دئے۔ مختلف مفت مات ملگڑائی، جگلو، کثیر دھاکے سے گلاوے آئے، تاکرے مگر وہ ہمیشہ انکار کرتے۔ شاید ہی وہ چارے تلوں میں انہوں نے شرکت کی ہو۔ دہلی سے لال قلعہ کے مشاعرے میں شرکت کے لئے ملاوے آئے تو وہ فرادہ ہی جگہ ہمارے اکبرجہت ہوئے غبار کو دہاں بھولائے۔ ایک بار تو علی جو زیدی صاحب نے تار پڑا کر دیئے۔ کثیر کر کے کئے زاو راہ بھی تار سے سجایا مگر وہ نہ گئے اور زاو راہ کو نادیا کثیر لونی دوشی سے ایک پٹی۔ اچھ۔ ڈی کے تھیں کے اگر امن بنا دئے گئے۔ وائی وائے لئے بلائے گئے مگر نہ گئے صرف رپورٹ بھیج دی۔

جوش صاحب جب تک پاکستان نہیں گئے تھے، جب بھی بہار یا بنگال کے مشاعرے کے لئے آتے تو پہلے سے بھیا کو خط لکھ کر ملنے کے اگر تم شریک نہ ہو گئے تو میں نہ آؤں گا۔ ان کے اصرار سے انہیں مانا پڑتا مگر وہاں بھی انہیں شہر مٹھنے سے گریز کرتے۔ ایک بار دہلی گئے تھے۔ اس دن ہولی کے سلسلے میں شاعرہ تھیں۔ جوش صاحب ان کو بھی کھینچے گئے مگر انہوں نے پڑھا نہیں۔ دوسرے دن جوش صاحب پنڈت نہرو سے ملے گئے تو بھیا کو بھی زبردستی ساتھ لے گئے۔ پنڈت جی سے دور درازت کر لیا تو پنڈت جی نے کہا کہ تیرا جب یہ مشاعرے میں

تشریف دیکھتے تھے تو بڑھا کیوں نہیں؟ جو صاحب نے کہا یہ اپنا کلام لیون نہیں
 سناتے جب ڈھٹے مارے جائیں تو سناتے ہیں۔ بہت جی سے سبک کر کہا۔
 آپ نے رات کو مجھے بتا دیا ہوتا تو میں ڈھٹے کے زور پر ان سے پڑھواتا۔
 مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت میں برسوں بعد وار و مہر ہی دیتے رہے مختلف
 قسم کی علمی ادبی گفتگو ہوتی رہی، مگر جیسے جیسے اپنا کلام ان کے سامنے نہیں
 پڑھا۔ ان کے اس رویہ سے بعض دفعہ ٹپری ناگواری کی بھی بڑا سامانی کھی۔
 نومبر ۱۹۳۷ء میں جب پٹنہ میں جنرل مینا کی قواس کے مشاعرے میں بھی
 انہوں نے صرف تین چار شعر پڑھے۔ لوگوں کو ٹپری مایوسی ہوئی۔ کچھ لوگ
 اسے ان کا غور نہ سمجھتے تھے، مگر وہی احساس کرتی تھا جو ان کی اعصابی کاہلی
 کا نتیجہ تھا۔ دوسروں کا کلام شوق سے اصرار کر کے سننے اور کلام کی داد دینی
 کھول کر بلکہ بعض وقت قدر اعتدال سے بڑھ کر حد مبالغہ تک دیتے تھے۔
 نوجوان شعراء کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ کہتے کہ آپ لوگ جیسے اچھے شعر
 پڑھتے ہیں، ان کے بعد میرے اپنے اشعار پیکے معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھ کر شرم
 آتی ہے۔ اچھے اشعار اس کو ان پر بھی طبیعت جاری ہو جاتی کہ پڑھنے والا ان کے
 کی ضرورت چکا چوند اور وہ اسی شعر میں ڈوبے رہتے۔ پھر جوتے اور دوسرے
 اشعار کی داد دیتے۔ مجال میں گلگت کے ایک نوجوان شاعر عظیم آبادی صاحبی
 غزل میں ”برم پیرانہ“ کی ترکیب استعمال کی۔ جسے انہوں نے ”اجاب“ گلگت کے
 ایک جلسے میں یہ شہرناہت تشریف کی۔ اس کے بعد ان کی ایک غزل میں اس
 ترکیب کو استعمال کیا تو اس غزل کے نیچے یہ نوٹ لکھ دیا کہ یہ ترکیب میں نے
 عزیز بی آجسم عظیم آبادی سے سنا تھا ہے۔ اب تک وہ غزل اس نوٹ کے
 ساتھ میرے پاس محفوظ ہے۔

جادو جادو بڑائی اور بڑے علمی کے وہ چھوٹوں سے بھی کسی لفظ کے تعلق
 تحقیق کرنے میں عار نہ سمجھتے۔ مجھے اکثر پوچھتے کہ اس لفظ کے معنی کیا
 ہیں، تنکیر ہے یا تائید۔ بعض وقت ان کا کوئی بھی شاگرد ان کے کسی شعر میں
 کسی لفظ کی ترمیم کی طرف اشارہ کرتا تو وہ خوش ہوتے اور ترمیم کر دیتے، لیکن بعض
 وقت مجھ سے بھیہ کر کہتے کہ تم آج ترمیم کی طرح بڑے کٹر عروسی ہو گئے ہو۔
 اس نے کہ بعض وقت وہ اپنے اشعار میں کچھ آزار دہی بھی برت دیتے، جن میں
 مجھے کچھ تاثر ملتا۔ میرا مزاج شاعری ان کے مزاج شاعری سے قدرے مختلف
 تھا، اس لئے انہوں نے باضابطہ اصلاح میرے کلام کی بھی نہ دی۔ ہاں بھی
 کبھی برسرِ مشاعرہ بھی میرے کی شعر میں انہیں کوئی قسم کی نظر آنی تو اسی وقت
 مجھے نوٹ دیتے اور ترمیم کر دیتے۔ تین چار سال پہلے ایک صحبت میں جب
 میں نے یہ قطع پڑھا

دل میں اب تک ہے رونا یاد ان کی ایک ہلکی سی جھنجھ ہو جیسے
 تو فرماؤ بولے ہلکی کا جگہ میٹھی کر دو۔ میں نے اسی وقت ترمیم کر دی۔ ایک

بادشاہ کی لکھنے کے سالار مشاعرے میں میرا یہ شعر بہت پسند کیا گیا تھا
 تو میں نے جوشاؤ سے پڑھنے والے کے کھٹکٹاہیں مہر میں پھر سننے سے
 انہوں نے فوراً تو کلام اور شعر غلطیوں بنانا دیکھ کر انہیں دوسرے نغمہ ہائے
 پا سے۔ اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ ان معمولی ترمیموں سے شعر میں کتنی وسعت
 اور فصاحت پیدا ہوئی۔ کبھی تو ایسی ہلکی سی اصلاح دیتے اور کبھی بھی شاگرد
 کے کسی کی شعر کاٹ دیتے اور ان کے بدلے دوسرے اشعار لکھ دیتے۔ شاگردوں
 کی غزل با نظم نالتے وقت کوئی اچھے اچھے اصحا اس زمین میں نکل آتا تو
 اپنے لئے بھی نہ رکھتے وہ شاگرد کی کو دے دیتے وہ اکثر غنی کا یہ شعر پڑھا
 کرتے تھے۔ یہ آں تیغ حافظ رواست چوں عرفی

کردل ہے کا دور در سخنوری راند (بادارد)
 ان کے اندر یہ دونوں کیفیتیں بدرجہ اتم تھیں۔ جب تک وہ شعر کہنے میں
 پر نہ لاتے انہیں چین نہ آتا۔ اکثر شعروں کی شاگرد کے ایک مصرع پر درود
 مناسب مصرع لکھنے میں صرف کرتے اور جب اپنے لئے کچھ نہ تو قلم برداشت
 پوری پوری نظم یا غزل منوں میں کہہ ڈالتے۔ حافظ کا یہ عالم تھا کہ اساتذہ قدیم
 کے سیکڑوں اشعار انہیں یاد رہتے، مگر اکثر ان کا ہوا کلام بھی بھول جاتے۔ لوگوں
 کے نام اور پتے کو اکثر بھول جاتے تھے۔ ۱۳۳۷ھ میں انہوں نے اپنا مشہرہ
 ”پہیان و فدا“ ۱۲۰ ہندوں کا کہا تھا۔ چند ماہ بعد حسن آباد ضلع میں گئے اور اسے
 ملنے گئے۔ ان کے ایک سے لے کر دسرت اور انہوں نے امریکا کا چند ہندو بھی
 اس مرتبے کے گھوڑا دو۔ سورہ ساتھ تھا۔ زبانی گھوڑا شاعر کا تو ۱۹ ہندو مل
 گھوڑے کے میرا ہیں، مرزا اور وغیرہ کے شروں کے سیکڑوں ہندو اس طرح یاد تھے
 کہ معلوم ہوتا تھا حافظ کے ہیں۔ باوجود بڑے فلسفیانہ اور ترقی پسند رجحان کے
 دارغ، امیر، ریا آئن وغیرہ کبھی چڑا اشعار انہیں یاد تھے۔ ان کا ذوق سخن اور
 ذہن اس سلسلے میں بہت وسیع تھا۔ اچھا شعری کا بھی موضوع کا ہو، انہیں حفا
 ہوجانا بشوٹیکہ اس میں شہرت ہو۔ ذوق مطالعہ کا بھی یہی حال تھا جس کو ممنوع
 کی بھی کتاب انہیں یاد جاتی پڑھتے۔ فلسفہ اور تائید تو خیر ان کے کہ یہ معانی تھے
 انگریزی، فارسی، اردو میں زبان میں ان معانی کی کتاب مل جاتی انہماک سے
 پڑھتے جہاں ان کی عقل تائیں پڑھنے کا شوق تھا وہاں وہ ناول اور افسانے بھی
 شوق سے پڑھتے۔ رومان دنیا اور باسوی دنیا جیسے ناول بھی پڑھتے۔ کہتے تھے
 یہ ہلکی سی تخلیقات پڑھنے سے میرے تھے ہوئے ذہن کو ذرا آرام اور
 راحت مل جاتی۔ ان کا ذوق ادب بھی ان کی تخلیقات کی طرح ہر قیمت تھا۔
 یہ داستان جو مختصر ہوئی چاہے کسی طویل ہوگی، اس نے معدت کے
 ساتھ پتہ ہی کی شکر میرے ختم کرنا ہوں۔

ہماتے بعد شفا دوسروں سے
 کہاں یہ ابھی پوری نہیں ہے

یادوں کے روزن سے

دہر نامری جو میٹرک پاس کر کے بے کار بیٹھے تھے اور اپنا وقت اساتذہ کے کلام سے تذکرہ و تائید کی سزا حاصل کرنے اور گفت سے الفاظ کا صحیح تلفظ دریافت کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک سے گفت گو ہو رہی تھی۔ اُس وقت کے اہم ترین شعراء کی، جوئی کی، حقیقہ گاندھری اور احسان دانش کی۔ میں نے پوچھا: ”کیا ہمارے صوبہ میں اُن کے مرتبے کا کوئی شاعر نہیں ہے؟“

جواب ملا: ”علامہ محبت مظہری“

میں نے چونک کر پوچھا: ”علامہ کیا؟“

سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میرے بچے کچھ نہ بڑا۔ میں نے علامہ اقبال تو سنا تھا، لیکن نہ علامہ قمر نہ علامہ غالب۔ جوئی، حقیقہ اور احسان دکن کے نام کے ساتھ بھی ”علامہ“ نہیں۔ پھر محبت مظہری کے ساتھ کیوں؟ اور وہ بھی ۳۵-۳۶ سال کی عمر میں۔

جس سال کا میں ذکر کر رہا ہوں، اُسی سال ہمارے شہر سے ایک ادبی اہنامہ ”ہمارا“ کا اجراء ہوا، جس کے ادارے میں شمس مظفر جوئی، سید منین جامی اور عبدالعلیم آجی تھے۔ اس کے دوسرے شہرے (جولائی ۱۹۳۵ء) میں علامہ محبت مظہری کی ایک غزل دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ اتنے بڑے شاعر نے ہمارے شہر کے ایک درسائے سے تمنا کی کیا ہے۔ بے مطلع کی اس غزل کے چند شعر یہ تھے:

پلٹ دیا ہے حوادث نے رخ زمانے کا
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی
اُتر، بلندی تختیں سے اُتر، اسے دوست!
کہ اب جہاں میں نظر کوئی دُور میں نہ رہی
نیا زونار کی دنیا میں انقلاب آیا
صم صم نہ رہے اور جہیں جہیں نہ رہی

محبت مظہری کے نام سے پہلی بار اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے، میرے کان اُس وقت آسٹا ہوئے، جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ اُن کے جو اشعار پہلے پہل مٹنے میں آئے، وہ آج بھی ذہن میں تروتازہ ہیں:

بہ قدر بیجا نہ تختیں، سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریبِ بہیم، تو دُم نکل جائے آدمی کا

دیتے ہی کہا تھا ساقی نہ: اس جام میں ہے تنہی نکل
پرانگ کے داہن کرنے کا موقع ہی نہ تھا، پسینا ہی پڑا

یہ میرا باں سے کوئی کچھ دے گا اپنی کرنی کو گن کے رکھے
میں اپنے صحرائے دُورے کو خود چمکتا بنگھارا ہوں

پہلے شکر بہا مصرع و مے تک سمجھ میں نہیں آیا۔ خصوصاً اس کا پہلا لفظ ”بہ“ بہ قدر سیانہ ٹھیک۔ اُن دنوں میرے وطن درجے میں بس دو تین شخصیتیں ایسی تھیں، جن تک میری رسائی تھی اور جن سے میں شروادب کے بارے میں اپنے بعض سوالات کے حل تلاش کر سکتا تھا۔ ایک ضلع اسکول میں میرے استاد و ناظمِ تعلیم آبادی تھے، جو عرض اور زبان و قواعد پر فدی دستاؤ رکھتے تھے۔ دوسرے، ہمارے ایک عزیز مولانا عبدالعلیم تھی، جو مسلم اسکول میں مدرس تھے۔ مدرس شمس الہدی پٹنہ کے خانہٴ انصاف، لڑکی اور فارسی ادب کے رسیا۔ غزلت میں محمدان خیالات کا اظہار کرتے اور غزلت میں ہرمت الہیہ پر تقریر کرتے۔ اور تیسرے — میرے ماموں

۴، پرنسپل پاک پٹی، سید فیضی ندو، سری انگر ۱۹۰۰ء

جہاں میں خشک ہے کثرتِ حیات و مزاج عشق

کہ خونِ پاکِ سلاں سے تر زریں سنہ رہی

”ہمارا“ کا تیسرا اور آخری شمارہ اگست ستمبر ۱۹۸۷ء کا شمارہ تھا۔

”ہمارا“ کے بند ہوتے ہی انکو بریں ہمارے شہر سے ایک اور رسالہ

”حسنِ شباب“ چلے گا، جس کے مدیر طبعِ انجمنِ خرمی تھے اور جس ادارت

میں میرے ماموں دہتر ناصر کا بھی نام تھا۔ اس رسالے کا ادارہ یہ جتنی نظری

کے اس شہر سے شروع ہوا تھا:

جلانے والے جلانے ہی میں چسپاں آخر

یہ کب کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی

جیلِ نظری کی شخصیت بہار میں تیزی کے ساتھ LEBEND ختم

ہا رہی تھی۔ ان کے ارد گرد ایک بالاس تھا۔ ان کی طبعیت کا، ان کی تبادلاتی

کا، ان کی محنت و محبت کا، ان کی سہیت کڑائی اور بے نیازی کا۔ سُن سُن کر ان کی

پُر وفار، لیکن عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں طرح طرح کے تصورات

ذہن پر حاوی تھے۔ ان سے ملنے کی ہمت نہیں تھی۔ البتہ دُور سے دیکھنے

کا اشتیاق دُور سے بڑھا ہوا تھا، مگر جیلِ نظری بھی پختہ تھے، کبھی ملکوتہ،

کبھی بچی۔ میں شہابی بہار کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقید تھا۔

کالج پہنچا تو وہاں آخر قادری جیسے ہنسنا دے، جو خود ایک

خوش گو شاعر اور اپنے وقت کے ہونہار افسانہ نگار تھے۔ اقبال کو انہوں نے

اپنا اور خدا بچھونا بنا رکھا تھا۔ علامہ جیلِ نظری کا ذکر کرتے وقت ان کی

عملِ انسانی گفت و دیر تک اپنی خوشبو پھیلاتی رہتی۔ اپنی دونوں کہیں سے

”نہیم“ گھیا کا ”بہارِ شہر“ دستہ لایا تھا، جس میں جیلِ نظری کی

دو شہر پر غزل تھی، جس کا مطلع ہے — ”بہ قدر بیادِ بختی...“ اور

اس میں ان کا ایک افسانہ بھی تھا — ”زمین کی قربان گاہ پر“ جس کا

ابتدائی حصہ کچھ اس طرح تھا:

”آگن میں دوپٹے پھیل رہے تھے... چھوٹے ہاتھیں لڑتی تھیں...

بڑے بڑے چھوٹے کی گڑباز چھین لی... چھوٹا بچہ رونے لگا، شہر

چلنے لگا...“

قریب میں محلِ مدیہ افسانہ ختمی صورت میں ”شکستِ دفع“ کے نام سے چھپا۔

کہا جاتا ہے کہ یہ خود جمیل صاحب کی داستانِ محبت ہے۔ یہ بچہ بڑا

ہو کر علامہ بنا، لیکن جو گڑباز اس کے ہاتھ سے چھین گئی تھی، اس کے لئے وہ

آخری دم تک ترستا رہا۔ حتیٰ کہ پچاس سال کی عمر میں اس نے لکھا:

یہ اپنی آگ یوں کھلا نہ جاتی اپنے سینے میں

اگر اس آگ کو بھی تاپنے والے ملے ہوتے

روایت ہے کہ مغلوں نے خواب میں جیلِ نظری نے ٹوٹ کر محبت کی

تمنی۔ اپنے رشتے کی ایک پردہ نشین لڑکی سے۔ یہ محبت، ظاہر ہے، افلاطونی

نوعیت کی تھی، اور ہر چند دونوں ذاتِ آگ ہمارے ہی ہوئی تھی، مگر دونوں رشتہ

ازدواج میں منسلک نہ ہو سکے۔ مجھے اس کا سبب معلوم نہیں۔ میں نے

جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کیونکہ الیہ بہر حال الیہ ہے، خواہ اس کی

وجہ کچھ بھی ہو۔ ممکن ہے کہ فرضِ دامن گیر ہو، یا عزم و محنت کی کمی ہو۔

اپنی محبت کے سلسلے میں انہوں نے کہا ہے کہ وہ اس پر ٹپکنے کی خاک ڈالتے ہے:

نگر شکن بہ ابروئے زمانہ ہم نہ بن سکے

کہانی ہم نہ بن سکے فضا نہ ہم نہ بن سکے

یہ صبح ہے کہ وہ خود افسانہ نہ بن سکے، لیکن انہوں نے یہ نفسی نفس اپنی

ہلکام محبت کا افسانہ لکھا۔ انہوں نے رومانی نگین بھی اچھی خاصی تعداد میں

لکھی ہیں اور ہر چند کہیں کہیں اختر شہابی کے اثر کی نشان دہی کی جا سکتی

ہے۔ لیکن ان کی کامیاب رومانی نظروں میں خود ان کا انفرادی احساس

جادو جگہ کا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی محبت کا قصہ منظم کیا ہے:

وہ لوگوں کے گھروں سے میں جوانی کا کھیل

اور اس کھیل کا افسانہ فردا ہونا

عشقِ معصوم کے وہ غیبِ شعوری اقدام

یعنی رخساروں پر رخسار کا رکھا ہونا

وہ مرے عشق کے چرچے وہ بزرگوں کا قیام

وہ تراپ دے میں چھپنا، مجھے خود ادا ہونا

لیکن اس دور کی سب سے خوبصورت اور اثر انگیز نظم ”دُور، دُور سے

دُور“ ہے، جس میں وہ محبوبہ، جو اب بولانی ہو چکی ہے، شاعر کو مخاطب

کرتی ہے:

ادھر ادھر نظر اٹھتے تو سامنے تم ہو

ہائیں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو

کوں خدا کو جو جسے تو سامنے تم ہو

نہاڑ میں نہ تاؤ — دُور، دُور سے دُور

جھجھو کر نہ جگاؤ، کہ سو گیا ہے یہ دل

کئی برس سے عزا خاندِ وفا ہے یہ دل

خدا گواہ کسی کی مٹی سہا ہے یہ دل

ہلے گھر میں نہ آؤ — دُور، دُور سے دُور

جیلِ نظری نے ایک عرصے تک شادی نہیں کی۔ جب بھی ایسی کوئی

تجربہ آتی مثال جلتے، اپنی پہلی محبت کو سینے سے لگائے کہہ۔ لوگ کہتے

ہیں اپنے جذبات کی تسکین کے سلسلے میں وہ خود کھیل تھے۔ اور اس قدر زیادتی

طور پر غفلت ہوتا ہے۔ متشونے ترقی کے خاکے میں ایک جگہ لکھا ہے :
 ”میراثاتی خیال ہے کہ وہ انہیں جو اپنی خواہشات جسمانی
 کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور
 پر اسی قسم کے غفلت ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں
 کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں، مگر اس قریب ہی
 میں جو غفلت ہے، وہ ظاہر ہے۔“

جب دوستوں اور عزیزوں کا اصرار شدید ہوا تو انہوں نے چالیس سال
 کی عمر میں شیا برن کی ایک بیوہ سے شادی کر لی۔ ان کے ساتھ ازدواجی
 تعلقات قائم ہوئے یا نہیں، اس کے بارے میں ان کے دوستوں نے کبھی
 کوئی حتمی بات نہیں بتائی۔ میر میری وٹز نے، جو علامہ کے بڑے بے تکلف
 دوست تھے، ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ دراصل وہ عورت ان کے چلنے
 منڈھ جانے والی تھی، علامہ شادی کے تیار ہونے لڑائی کی گولیاں
 تھیں۔ علامہ کے ایک عزیز شاگرد جو راز پروردہ کے واقف کار ہونے
 کے دعوے دار تھے ہیں، یہ کہاتے تھے کہ علامہ کی بیوی ان کی گندگی
 کے باعث انہیں اپنے بستر پر بیٹھے نہیں دیتی تھیں اور ان کے رخصت
 ہونے پر کمرے کے فرش کو مچھلایا کرتی تھیں۔ ممکن ہے یہ بیان میلنے
 پر مبنی ہو، لیکن اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ علامہ کا اپنی بیوی کے کہاں
 آنا جانا بند تھا۔ البتہ وہ انہیں ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ ایک نعرہ
 رقم بھیج دیا کرتے تھے۔ علامہ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنی اس محسوس کو
 مجبور کرنے لگے انہوں نے اپنے بھائی اور بہن کے بچوں کو باپ کی
 محبت بخش دی تھی اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ وہ ان پر ہی صرف
 کرتے تھے۔ اپنی ذات پر ان کا خرچ سو سو سو روپے سے زیادہ نہ تھا۔

غالباً سلسلہ میں میرے بہنوئی منظر شہاب ایم۔ اے کی تعلیم نے
 پڑھ گئے تو انہیں وہاں دو اہم نعمتیں استاد کے طور پر ملیں —
 جیل نظری اور انٹرا اور جی۔ منظر شہاب، جب چھٹیوں میں دیکھ لگتے
 تو علامہ کے بہت سے قصے بھی سنا لاتے، اور ہم مل کر ان سے گفتگو
 ہوتے۔ ہم لوگوں نے دیکھنے کے سے ایک ترقی پسند ادبی جریدہ ”نئی کرن“
 کا اجراء کیا تھا، چلنے وقت کا اچھا خاصا معتبر رسالہ بن گیا تھا۔ اس کے
 صرف تین شمارے جسے بلے ویتھون پر شائع ہوئے۔ تیسرے شمارے کے لئے
 منظر شہاب کی فرمائش پر علامہ نے ایک تازہ مضمون ”جورسے کے مزاج کے
 مطابق خالص ترقی پسندانہ تھی، عنایت کی تھی، جس کے ایک دو شعر
 مجھے اب بھی یاد ہیں:

شب بچسرداں ادباں تیری درازی کون ناپے گا
 بہانہ فاقہ کشوں کے دن بڑی شکل سے دھستے ہیں
 محبت جن کے دل کی دھڑکنوں کو تیز رکھتی ہے
 وہ اکثر وقت کی رفت رستے آگے بھی چلتے ہیں
 انہیں دنوں پٹنہ سے بھی ایک ترقی پسند رسالے ”نئی راہ“ کا اجراء ہوا تھا۔
 اس کے لئے بیل صاحب نے بطور خاص ایک نظم لکھی تھی — ”نئے ادب کی
 زبان سے“ جس کے چند اشعار یہ ہیں:

بہت اونچا غبار راہ امکان کر دیا ہم نے
 بلندی کو قریب، ذہن انسان گردیا ہم نے
 دل پر مزدور سے تھرے پھوٹے خون ابرام کے
 اور ان سے وقت کے سینے میں طوفان کر دیا ہم نے
 محبت نے جودی تھی آگ اس کا لولیا مہر و
 گر گم اس سے توفیر قلب و مقال کر دیا ہم نے
 فرماؤں کی یہ تعمیل محض مروت اور اپنے شاگردوں کی دلداری تھی، یا
 ترقی پسندی سے جذباتی وابستگی؟ اس کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔
 وہ خود انہیں ترقی پسند مصنفین سے باقاعدہ کبھی وابستہ نہیں ہے، بلکہ ہم
 کے کھوٹے بہت اشرا کی بات اور ہے۔ لیکن شاید اس سے کبھی وہ اہلانہ لگاؤ
 نہیں رہا۔ وہ ترقی پسندوں کی شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔
 ترقی پسندوں کی اشراک دہی سے قطع نظر، مزدوروں اور کلاؤں
 سے ہمدردی اس وقت کی شاعری کا عام مزاج تھا۔ ”نئی کرن“ اور ”نئی راہ“
 کے لئے رنگ محفل دیکھ کر یہ جمل نظر پڑی ہے اپنا کام پیش کیا ہوگا۔
 میں نے جیسے جیسے جیل نظری کی شاعری اور ان کی نثر کا مطالعہ کیا
 مجھے محسوس ہوا کہ وہ تضادات کا مملو یہ تھے۔ کبھی شکیک اور احماد
 اور کبھی شدید مذہبیت، کبھی جذبے کی آگ اور کبھی فلسفے کی راگ، کبھی عقل
 کی سرپرستی اور کبھی جنوں کی پاسداری، کبھی شہادت مانتا پر خدا کی رحمت
 اور کبھی ساری کائنات ایک ذرہ حقیقہ، کبھی رسول اللہ کی سیاسی
 غلطیوں کی طرف اشارے، کبھی ان کے فرائض کی شہادت پر مرثیے ہی
 مرثیے، کبھی خون پاک مسلمان سے زمین کے ترنہ ہونے کا دکھ اور کبھی بڑھ
 اور عین مذہب کی فحشوں پر عالمیہ جشیں۔ اور اکلام آزاد سے عقیدت،
 جو کہ اور نہ از حد تھوڑی سے ذہنی قریب و دواست۔

شاہ عظیم آبادی کے بعد بہار میں تین اہم ترین شاعروں کی ایک
 تخلیق بن گئی تھی — جیل نظری، انتہائی وضو اور پوریزندگی۔
 تینوں ہم عصری تھیں، ایک دوسرے کے حریف بھی تھے اور اس سے زیادہ

دوست میں اپنی تعلیم مکمل کر کے سلاٹ کے ادارہ میں معافی بننے کے ارادے سے کلکتہ پہنچا۔ چند ہی ماہ بعد ایک ہائی اسکول میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دینے پڑے۔ اس اسکول میں پریویرسٹ اپریلے ماہر تھے۔ ایک نو فریق کارپورس کے باعث، دوسرے نظریاتی ہم آہنگی کے سبب ان سے جلد ہی بہت سی قریبی مراسم قائم ہو گئے۔ اسکول میں میں پہلی بار سلاٹ میں اجتماعی رموزی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں راجندر کالج چھپرہ میں شبہ اردو و فارسی کے صدر تھے۔ اس وقت بھی ان کی دائرہ میں ان کا شناخت نامہ تھی۔ برسرِ شاہد ہی میں اس صحت میں، ان کی جس نوعیت کی باتیں ہوتی تھیں انہیں صنفِ قریاس پر متعلق کرنے کی جرات مجھ میں نہیں ہے۔ جمیل منظری سے مسیری پہلی ملاقات تک ان کا بیان ہوئی، اب حافظہ رہنمائی نہیں کر رہا ہے۔ قیاس ہے کہ کلکتہ میں ہی ہوئی ہوگی۔ جمیل صاحب کے چھوٹے بھائی رتنا کانتی منظری مستقل طور پر کلکتہ میں رہتے ہیں۔ ان دنوں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان سے ادبی اور شعری محفلوں کے علاوہ پریویرسٹ صاحب کے گھر پر کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ جمیل منظری اپنے بھائی کے یہاں اکڑتے رہتے تھے۔ یوں بھی جمیل صاحب کے بیشتر احباب کلکتہ میں تھے۔ ان کے استاد وحشت کلکتوی تھا کہ جا چکے تھے، لیکن کبھی کبھی کلکتہ آجاتے۔ جمیل صاحب کلکتہ سے دیرینہ تعلق رہا ہے۔ ان کی تعلیم وہیں مکمل ہوئی۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز وہیں ہوا۔ ان کی شاعری وہیں پروان چڑھی اور آہستہ آہستہ بنگال اور بہار کی مجموعی ادبی فضا پر چھا گئی۔ جمیل صاحب سے میری پہلی ملاقات پریویرسٹ صاحب کے گھر پر ہوئی یا رما منظری کے یہاں یا برہم احباب کی کسی نشست میں، صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ سلاٹ کے وسط ملک میں دو دنوں ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے۔

"برہم احباب" کلکتہ کے شرفناک ادبی انجمن تھی، اور اس کا ممبر بننے کے لئے کسی شریف ممبر کی تجویز اور تمام شریف ممبروں کی تائید ضروری تھی۔ نو جوانوں اور نوجوانوں کو اس انجمن میں باریابی کا شرف مشکل سے حاصل ہوتا تھا۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک دو بار کی شرکت کے بعد ہی مجھے شرافت کی سند ملی تھی۔ اس برہم کی ایک نشست میں جمیل منظری سے پہلی مرتبہ اپنے چند اشعار کی داد پا کر اپنے شاعر ہونے کا یقین ماہو ہو گیا تھا۔

علامہ کے بارے میں مشہور تھا کہ شاعروں اور مستقروں میں بھی ان پر "گم شدگی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ گم شدگی سے بیداری کے عالم میں آتے اور کوئی شریف پسند آگیا تو ان کی "واہ واہ" کی تلواریں صحن کو گونجنے لگتی ہے۔ اور شاعر ہے کہ آگے کے اشعار پڑھ رہا ہے۔ اور جمیل صاحب بھی کہ اسے پہلے کے پاندہ شعر پڑھوا دئے جارہے ہیں۔ میں نے فوجی انہیں محفل میں دیکھا تو اس کی تصدیق ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک بار "برہم احباب"

ہی کی ایک نشست میں، جمیل میں نے شعر پڑھا:

دوڑنی ہی راہ میں ٹکرائے چلے جاتے ہیں
عشق اور عقل کی یہ ہم سفری تو دیکھو

تو بے ساختہ "واوا واوا واوا...." کا ورد کرتے گئے اور بار بار کہتے: "یہ شعر آپ نے کہا ہے.... اس میں "جی چاہا کہ دون: "جی نہیں، آپ نے کہا ہے" ان کی "واہ واہ" ہمیشہ "واوا واوا" ہوجاتی تھی۔ کبھی بھی تو آواز بھی غائب ہوجاتی تھی اور صرف تیزی سے ہٹتے ہوئے ہونٹ دکھائی دیتے تھے۔ اس منزل کے باقی اشعار پر اب محفل نے تو داد دی، لیکن جمیل صاحب بالکل خاموش رہے۔ ان پر کوئی اور عجوبہ طاری تھی۔

کہنے والے تو یہ بھی کہتے تھے کہ علامہ کے ذہن میں شکر کی اور کاموتا اردوہ داد کی اور کو دے رہے ہوتے۔ اب میں اپنے شعروں پر دی ہوئی ان کی داد کے بارے میں سوچتا ہوں تو کئی اندیشے سراٹھاتے ہیں۔ جمیل صاحب داد کے معاملے میں بہت فرخ دل تھے، اور لوگوں کو غلط فہمیوں اور خوش گمانیوں میں مبتلا کرنے میں ماہر تھے۔ عموماً اگلا لگا کہ ان کی داد بے ساختہ ہے اور اس میں ان کا غلط خیال ہے۔ لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ بہت معمولی درجے کے شعروں پر کبھی درے زیادہ میاں دے آمیز داد دے رہے ہیں، تو ان کی مسلسل "واہ واہ" کی اہمیت میری نظر میں گھٹ گئی۔ ایک بار میں نے ان سے عرض کیا تھا: "آپ کی داد پر کبھی بھی معاملے کا شبہ ہوتا ہے۔ آپ نے ایک نو فریق شاعر سے کہہ دیا کہ تمہاری غزل جگڑے بہت ہے، اور وہ ہر جگہ اس بیان کو سند کے طور پر استعمال کرتا ہے۔" "مجھے کبھی تو علامہ میرے بیان کی کوئی نظر انداز کر گئے، کہنے لگے: "کبھی کبھی تو مجھے کوئی شعر واقعی پسند آتا ہے، اور میں اپنی پسندیدگی کا ابرہہ اظہار کرتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میری داد، جو جمع ہوتی ہے؟

جو صلیبی اصطلاح میرے لئے تھی نہیں تھی، لیکن اس کی معنویت مجھ پر اسی وقت آشکار ہوئی۔

شاعری میں جمیل منظری کے شاگردوں کا طبقہ بہت وسیع تو نہیں تھا، لیکن کچھ شعراء ان کے دامنِ فیض سے یاقا عہد و رہبر وابستہ تھے۔ جمیل منظری کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دوسروں کو اپنا کلام بخشنے دیتے ہیں اور شاعروں میں جب ان شاعروں کو داد دیتی ہے تو انہیں اپنی تعریف سمجھ کر بخینے نہیں سلاتے۔ اور خود بھی انہیں داد دینے میں آگے آگے رہتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی صورت یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کا شاید ہی کوئی شعر سلامت رہتے دیتے تھے۔ دراصل جمیل صاحب کا ایک مخصوص شعری مزاج تھا، ان کا ایک خاص ذہنی اور اسلوب تھا۔ وہ اپنے شاگردوں کو اسی مزاج سے ہم آہنگ دیکھنا چاہتے تھے اور جہاں جہاں وہ فکر اور طبع کے اعتبار

تھے ان کے نزدیک نظر نہ کرتے، ان پر عمل جزوی شروع کر دیتے۔ نتیجے کے طور پر اصلاح کے بعد شاعر کے کلام میں اس کا اپنا خنثی شاذ ہی باقی رہ جاتا تھا۔ اس لئے کسی غیرت مند کے لئے ان کا کٹا گرنے رہنا کافی صبر و صبر تھا۔ یہیں جہی کو غیرت آتی تو وہ تین عظیم آبادی بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ میر جوہر طری کا سارا کلام جیل منہسری کا ہی عطا کردہ تھا۔ حالانکہ اول الذکر ہمیشہ اپنے آپ کو وحشت کلکتی کا کٹا گردہ دیکھتے رہے۔ کسی شاعر کا جیل منہسری کے قریب آنا خطرے کا باعث تھا۔ یعنی اس پر انگلیاں اٹھنے لگی تھیں کہ جو تو جو یہ جیل صاحب سے استفادہ کرتا ہے، اور استفادہ کا مطلب یہ جوتا تھا کہ وہ ان سے چوری کی پوری نظم یا غزل لکھواتا ہے۔ اپنے بھائی سے رمانا منہسری کی محبت اور عقیدت مثالی ہے۔ دو بھائیوں میں اتنی قربت اور دلگلیت کی زمانہ شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر رمانا منہسری بڑھوتے تو جیل منہسری کا بیشتر کلام زلزلے کی دست برد سے زیادہ قزاقان کی دست برد سے منافع ہو چکا ہوتا۔ رمانا منہسری اپنے رنگ کے عوض کلام شاعری میں ان کی شاعری حیدر ہے اور احساس کی شاعری ہے، اور اس لئے اس کا شاعرانہ اسلوب بھی ان کے حیدریت سے ہم آہنگ ہے۔ وہ جیل منہسری کے شاگرد نہیں۔ اس لئے ان کے یہاں دھونڈیے سے بھی جیل منہسری کے اثرات نہیں ملیں گے۔ معلوم نہیں رمانا صاحب کا مزاج ہی ہے، یا اس میں ان کی شعوری کہ کوشش کو بھی دخل ہے کہ وہ ہر چند اپنی ذاتی زندگی میں اپنے نام و رسم حال کے دست راست بنے رہے، لیکن اپنی شاعری میں انہوں نے اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا۔ پتہ نہ لگا کر مزید شاعروں کے بدلے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی "ہرگزیدگی" جیل منہسری کی طرح مروجہ منت ہے۔ والٹاٹم۔ ان کے شاگردوں میں سے دسے کہ ایک احسان دہرنگو ہی ہیں، جنہوں نے جیل منہسری کو اپنے اعصاب پر اس حد تک حاوی کر لیا ہے کہ ان کی الگ شناخت مشکل ہو گئی ہے۔ لیکن ان کا کلام ان کا اپنا ہے۔ شروع میں چند چیزیں اساتذہ دیکھی تھیں، لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ شاگرد ان کے فکر اور بچے کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے تو وہ اسرار سے دست بردار ہو گئے۔ رمانا منہسری کو بھی زلزلے میں غلام سے بہت قریب تھے۔ ان کے پہلے دو مجموعے "نفس جیل" اور "نغمہ جیل" کو مرتب کرنے اور اس کی طبعیت و اشاعت کا انتظام کرنے میں رمانا منہسری نے جس مانتا اندیشہ و نرمی سے کام لیا، اس کا اعتراف ہر واقعہ کار کو ہے۔ "جیل منہسری" جیل منہسری کے لئے معانی کی فراہمی میں ان کی کوششوں کو بھی کافی دخل رہا ہے۔ اس نثر کی اشاعت کے بعد ایک مرتبے کے تعلق سے جب آخر کار وہی نے ایک طویل بحث چھڑی، تو رمانا منہسری نے ان کے خلاف ایک طویل نظم بھی لکھی لیکن اہلک و لک لیا انقلاب آیا کہ علامہ اور راہی

ایک دوسرے کی صورت سے ہزار ہو گئے۔ راہی نے جیل منہسری کے خلاف فلسفہ یہ نقل بھی لکھی۔ کہا جاسکے کہ علامہ نے کسی سے کہہ دیا تھا کہ راہی کی غزلوں کی نوک پلک سوزا سلسلے میں ان کا بھی حصہ ہے۔ یہیں سے اختلافات کا ابتدائی بوٹی۔ جیل منہسری اپنے انفرادی رنگ کے باعث آسانی سے پہچانے جاتے تھے۔ ایک تنقیدی فن کار کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس کی اپنی شناخت ہو۔ لیکن جس طرح اقبال کا رنگ سخن آج مقبول اور مطبوع نہیں ہے، اسی طرح جیل منہسری کا رنگ سخن بھی اُن کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ میں نے انہیں کوساٹے رکھ کر ان کی زندگی میں ہی ایک شعر کہا تھا:

اٹھ کر ہے دوسروں کی راہ پر چلنے کی رسم

اب وہ اپنے ساتھ اپنا نقش پا لے جائے گا

کیا ہے کہ جیل صاحب دوسروں کو اپنا کلام منتقلی میں حاکم تھے۔ بڑھتے ہیں کہ سائے میں کسی نور میں شام کو اپنا شکل تھا۔ جب کوئی ناخوشا کوئی علامہ کلام پیش کرتا تو علامہ اس کی جانب سے مشکوک ہو جاتے۔ ترقی پسند نقطہ نظر کے حامل نوجوان شاعروں کے قابل توجہ کلام کو وہ بہ آسانی پروردگار شادی سے منسوب کر دیتے۔ جب منہسری صاحب کی نظم "ساتی نار" مشہور ہو مقبول ہوئی تو اس پر بھی علامہ نے ایسے ہی شبے کا اظہار کیا تھا۔

پردہ شادی کی شادی پر فوری رد عمل ہوئی تھی۔ نکلان کی تقریب کے بعد تین تین نظموں اور ہر دو کا ایک شاعر ہوا۔ جیل منہسری ایک مختصر نثر اور مثنوی شاعر تھے۔ ان کے نکلان کی بندہ واری اور نکلان جیولان کے بارے میں دورائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کی نظم پروردگار شادی سے ان کی دوستی اور وفات کی آئینہ دار تھی۔ بہت مقبول ہوئی، بہت سراہی گئی۔ دوسری نظم ہے "ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، میری تھی"۔ کچھ مختصر شخصیتوں نے جن میں ا۔ احمد کا رنگی مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ایاز حسین شال ہیں، میری نظم کو اپنے کچے پن کے باوجود علامہ کی نظم پر ترجیح اس لئے دی کہ یہ نظم کی درست کی شادی پر صرف مبارک باد پیش کرنے کے لئے نہیں لکھی گئی تھی، بلکہ اس میں ایک ترقی پسند فحلم و استبداد کے خلاف لڑنے کا حوصلہ دینے والے شاعر کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا گیا تھا اور اس لحاظ سے یہ نظم میری تین تین نظموں سے مختلف تھی۔ علامہ جیل منہسری نے سرزمین اوریزم کے بعد بھی نظم کی بہت تعریف کی، مگر ان کے دل میں ایک شک کا آہنی جی۔ پردہ صاحب سے انہوں نے ایک شکایت کی: "تم نے اپنی نظم لکھ کر دسے دی۔ اگر مجھ سے کہا ہوتا تو میں اسی رنگ کی نظم لکھتا"

پردہ صاحب نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو مجھے سخت غصہ آیا۔ لیکن اس وقت چلی گیا۔ چندا بعد ایک شام پردہ شادی کے گھر پر جیل منہسری سے میں نے عرض کیا۔ "آپ جانتے ہیں یہاں وحشت صاحب کا ایک مخالف حلقہ موجود

کافر تفس ہوئی۔ ملک راج آئندہ، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالمعین کا قیام بیکانہ نگر (نیر) کے یہاں تھا۔ ملک راج آئندہ کے ساتھ ان کی نئی نئی سکرٹری تھی، جنہیں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالمعین SUTNIK جاکر لے گئے۔ نائٹریس سے قریبی شناس تھے، اس لئے ان دونوں کے دوران نام میرا اٹھا بیٹھا اکثر وہیں مقیم تھا۔ محض یہاں ہی تھا، ان جہازوں کے علاوہ کچھ اور مختصر شخصیں بھی آجائیں۔ پروینشاہی اکثر اگھار آبادی کٹر، بے بھائی سے میری قربت زیادہ تھی۔ انہوں نے سڑک میں موٹر گاڑی ہٹا کر کافر تفس میں بڑی محنت اور شفقت سے مجھے مدد کی تھی۔ میں بے بھائی کو بعض جلسوں میں لے گیا۔ ان کے ساتھ میوزک کافر تفس میں شرکت کی۔ کچھ شایگ کرائی، جیمیل منظر سے اسی دوران میری ملاقات ہوئی تو شکایت کیجئے گئے: ”آپ سجاد ظہیر صاحب کو لے لے بھرے، لیکن میرے یہاں نہیں لائے۔ میں نے ان کی ناگوار یاد دہانے کے لئے کوئی بہانہ نہ پیش کر دیا، لیکن دل میں سوچتا رہا کہ علامہ تو بڑے بے نیاز سمجھے جاتے ہیں پھر انہیں سجاد ظہیر سے ملنے کا اتنا اشتیاق کیوں ہے“ اور پھر یہ کہ ان کے دل میں کس ”فوری کارروائی“ ہے، کچھ سجاد ظہیر ہی ان کے یہاں ملنے آئیں، آخر علامہ بھی تو بے بھائی کی قیام گاہ پر جا سکتے تھے۔

علامہ اپنا کلام شاذ ہی سنانے تھے۔ چند مخصوص دوستوں کی بات اور ہے۔ ایک بار انہوں نے نہالے کس جذبے کے تحت مجھے یہ عادت بخشی۔ انہوں نے سڑک میں ایک ٹولیں مدرس (ساتھ ہندوں پر مشتمل) لکھا: ”فراڈ عنوان تھا۔ مجھے اطلاع کرائی۔ کہنے لگے: ”آپ جانتے ہیں میں اپنا کلام سنانے کے معاملے میں سبیل ہوں، لیکن آپ جیسے باذن و خواہش کو بھی یہ نظم سنانا چاہتا ہوں، تاکہ ان کی رائے جان سکوں“ پھر جذبے کی پوری شدت کے ساتھ وہ میں کچھ پس منٹ تک اپنی نظم سنانے رہے۔ اس کے کچھ ہی لمحہ محبوب خزان مغرب سے مشرق جاتے ہوئے چند دن کے لئے کلکتہ ٹھہرے۔ اکثر شاہیں ان کے ساتھ کسی بڑے رستوں میں گزرتیں۔ وہ جیمیل منظر کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ ان کے کلام کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ بے شمار اشعار یاد تھے، اور کلام کی اس تشریح کرتے کہ مرزا آجاء۔ انہوں نے علامہ سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو میں انہیں علامہ کے پاس لے گیا۔ علامہ کو ایسا پڑھا تھا، ذہین قدردان کم ہی ملا ہوگا۔ محبوب خزان بہت علامہ کو ان کے ایسے ایسے خوب صورت مقرر سنانے کہ ان کی ہمارے بے نیازی اور گہم نگہ نیازی اور بددیانتی میں بدل گئی۔ اس باہر انہوں نے اپنی اپنی نظم ”فسر یاد“ سنا لی جو محبوب خزان کے لئے بھی تھی، اور میرے لئے نقد مقرر۔

انہیں دونوں منظر شہاب جتہ سے بڑے نوایک شام تک لوگ علامہ کے یہاں پہنچے۔ منظر شہاب ان کے چہیتے شاگرد رہے ہیں۔ کئی سال کے بعد

ملاقات ہو رہی تھی۔ ابھی صاحب سلامت بھی پوری طرح نہیں ہوئی تھی کہ علامہ انہیں مخاطب کر کے بولے: ”آپ نے میری وہ کتاب اب تک واپس نہیں کی؟“ منظر شہاب سوالیہ نشان ان بن گئے، ”لوگوں کی کتاب؟“ ”وہی... منٹوی... منٹوی سوالیہ“ ”میں نے یہ کتاب آپ سے لی ہی نہیں“ منظر شہاب نے سادگی سے کہا۔

”آپ نے نہیں لی تو کس نے لی۔ آپ کے علاوہ اور کون لے سکتا ہے؟“ ”خدا نے لی تھی۔ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے“ ”وہ کیسے لے سکتا ہے۔۔۔ منٹوی سوالیہ ان کو کیا سمجھے گا؟“ علامہ کے لیے میں خفگی تھی۔ سید یہ کلام ختم نہ ہوتا اگر دعا منظری صاحب نے بات کا کڑا کسی اور طرف نہ پلٹ دیا ہوتا

علامہ جیمیل منظری کلکتہ میں جب بھی ہوتے ”بزم احباب“ کی نشستوں میں لازمی طور پر شریک ہوتے اور وہاں اپنا کوئی نہ کوئی نازہ کلام ضرور سنانے، لیکن مشاعروں سے احتراز کرتے۔ سخت نظر رک رک رکھتے کہ ان کی طرف بے دروازہ گزرا جائے۔ میں جن مشاعروں میں ان کے ساتھ شریک رہا ہوں، ان میں سے چند اب بھی یاد آ رہے ہیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کا سالانہ مشاعرہ بڑے اہتمام سے ہوا تھا۔ جہاں خصوصی علامہ جیمیل منظری تھے۔ خان بہادر ابو جعفر کشفی نے صدارت کی تھی۔ میں سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالمعین کو بھی اس مشاعرے میں لے گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالمعین نے تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ میں مٹا کرے کا مخالفت نہیں ہوں۔ سجاد ظہیر نے پاکستان جیل کی کچھ یادیں انہوں کو اور غزل سنا لی۔ علامہ جیمیل منظری ان دونوں حضرات کی آمد سے پہلے ہی اپنا کلام سنا کر فرصت چھوٹ چکے تھے۔

۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو پٹنہ میں غلام سرور کی کوششوں سے ”بہار کا ایک یادگار شاعر“ منعقد ہوا۔ غالباً بہار کے اہم ترین شاعروں کی نمائندگی اس حد تک کسی ایک مشاعرے میں پہلے کی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر عبدالمعین نے کیا تھا اور صدارت بریجیڈ میٹل نے کی تھی، جو اس وقت حکومت بہار میں وزیر صحت تھے، اور اردو شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ اس مشاعرے کے انعقاد میں جیمیل منظری کے مشوروں کو کافی دخل تھا۔ اس محفل میں شریک ہونے والے چند خاص مشاعرے تھے۔ مہارک عظیم آبادی، غلام سرور کا بری، محمد عظیم آبادی، ذاکر عظیم آبادی، عزیز عظیم آبادی،

بد الدین احمد، رضا نقوی و آئی، شافعیل دانا پوری، علامہ حبیب مظہری، پرویز شاہدی، عطا کوٹی، محمود علی خاں قبا، بسطی عظیم آبادی، غضنفر ذوال دانش، امین جتوئی، یاس ہزاری، نصرت اودی۔ نوجوانوں میں کلیم عاجز، ذوالملک پوری، رحیم عظیم آبادی اور اگر اکرام شہین۔

دوسرے دن علامہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مشاعرے میں میری کامیابی پر مبارکباد دی۔ اور کہا: ”رہیو پرتو آپ ہی آپ تھے، دس منٹ تک آپ کی نظم ہوتی رہی۔ میرا ایک شعر دسے کو ٹال دیا۔ اس لیے میں شکایت تھی۔ میں یہاں عرض کروں کہ اس وقت تک ریڈیو سے میرا کوئی تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اوندھے اسی کا علم تھا کہ پندرہ ریڈیو نے اس مشاعرے کے اختیارات نشر کیے ہیں۔ اس لیے عظیم آبادی بھی اس وقت تک پندرہ ریڈیو نہیں پہنچے تھے۔“

۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو مسلم انٹی ٹیوٹ ہال مکتبہ میں رصاعی وحشت کی دوسری برسی منائی گئی۔ مقالات اور تقریروں کے علاوہ حضرت وحشت کی مدح میں نغیں بھی پڑھی گئیں۔ علامہ حبیب مظہری کی نظم ہے استاد سے غیر معمولی عقیدت کا نہایت فن کارانہ اظہار تھی۔ روزانہ ”اخوانت مکتبہ کی رپورٹ کے مطابق:

”اس جلسے میں مکتبہ کی کشور و معروف ہستیاں جتنی تعداد میں اکٹھا ہو گئی تھیں، شاید ہی کبھی کسی جلسے میں دیکھنے میں آئی ہوں۔ خان بہادار ابو جعفر کھٹکی، علامہ حبیب مظہری، پروفیسر عباس علی خاں بخاری، پروفیسر پرویز شاہدی، جناب لی۔ احمد کیراڈی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، جناب مظہر اہرام، جناب مالک کھنڈی، پروفیسر اختر حسن اور دیگر مہتمم شخصیتیں جلسے میں موجود تھیں۔“

مہر اکٹر برہنہ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں ایک نکل ہند مشاعرے کا دوروزہ پیش پارک کرس میدان میں شروع ہوا۔ صدارت پروفیسر جلیوں کیر نے کی، اور افتتاح مہر زید کھٹنے جو اس وقت حکومت ہند میں وزیر کالیا تھے۔ اس مشاعرے کے لیے جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، ججی غلام محمد، مولانا حفص الرحمن نے خصوصی پیغامات بھیجے تھے۔ علامہ حبیب مظہری، اجماز صدیقی اور دوش صدیقی نے مولانا آزاد مرحوم کے حضور اپنا منقسم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ باہر سے آنے والے دیگر شاعروں میں میں احسن جدابی، وائمن جون پوری اور شہزاد علی کے نام ذہن میں آ رہے ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۵۵ء کو کلکتے میں ایک نکل ہند اردو کا انعقاد ہوئی اور ساتھ ہی ایک انڈیا نکل شاعر۔ انڈیا نکل شاعر کے نام کی لاج اس وقت کے

شرقی پاکستان سے آئے ہوئے عزیز شاوادی، سرور بارہ لکوی اور اقبال عظیم نے رکھی تھی۔ صدر تھے۔ اکی احمد سرور۔ ہندوستان کے دیگر شاعروں میں علامہ حبیب مظہری، دوش صدیقی، رضا نقوی و آئی، حبیب تنویر، کلیم عاجز اور ذوالملک پوری کے علاوہ کئی مشاعرہ باز شاعر تھے۔ پرویز شاہدی اپنے بعض اختلافات کی بنا پر اس مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ میں کلکتہ سے آیا تھا۔ اور شاعرے کی نظامت کے ذرائع میں نے ہی انجام دے تھے۔

علامہ حبیب مظہری مکتبہ اور پٹنہ کے خاص مشاعروں میں بھی مڑ و تاشیک ہو جاتے تھے۔ لیکن کافی تکلف کے ساتھ۔ باہر کے شاعروں کے لئے حرمت بہت آتی، لیکن وہ کبھی قبول نہ کرتے۔ دور کا سفر کرنے سے طبیعت میں انقباضی کیفیت پیدا ہوتی۔ مشاعروں کا مجمع دیکھ کر گھبراجاتے۔ میں ۲۳ مئی کو مکتبہ سے تبدیل ہو کر کوہاٹی پہنچا تو وہاں حکومت آسام کے وزیر باسیات خورشید علی احمد تھے۔ ان کی بہن حمیدہ سلطان ان کے یہاں سٹیلنگ آئیں۔ مشاعرہ ہوا کہ آسام میں انجمن ترقی اردو کے شاخ قائم کی جائے اور ایک شاعر و منتقد کو بلائے۔ دیو کانت بورا، اس وقت آسام کے وزیر تعلیم تھے۔ وہ ان کے گھر بیٹے۔ مرزا عابد احمد نائب مدر۔ لارڈ اراکٹ کو کوہاٹی اور شیلانگ میں جسے اہتمام سے دو مشاعرے ہوئے کوہاٹی کے مشاعرے کی مصلحت خورشید علی احمد کی۔ اور شیلانگ کے مشاعرے کی خوشنوا سے گزرنے۔ باہر سے روضہ صدیقی، جگن ناتھ آزاد، اویس احمد ودان اور ذوالملک پوری آئے تھے۔ جیل مظہری امرار کے باوجود شریعت نہیں لائے، لیکن انہوں نے ایک نہایت خوب صورت نظم پر عنوان ”اردو“ مجھادی تھی، جو دونوں مشاعروں میں پڑی اور بہت پسند کی گئی۔

مجھے اس وقت لال تلوسے کے ایک مشاعرے کی یاد آ رہی ہے، جو دولان نام میں، روضہ سلسلہ کوہاڑ شاہ فقیر کی صدارت برسی کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ اس کا افتتاح جواہر لال نہرو نے کیا۔ کئی اردو شاعرے میں بڑی آخری شرکت تھی۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے تقریباً تمام سرکردہ شعراء شریک تھے۔ کچھ نام اس وقت ذہن میں آ رہے ہیں:۔ ذوق گوگر پوری، حبیب مظہری، آزاد خان، تنویر، جوش مسلمان، سائر نظامی، اکی احمد سرور، علی جواد زیدی، سکندر علی وید، شری جھولی، گرتی ناتھ حسن، پرویز شاہدی، اسلام جیل پوری، غلام ربانی تاباں، گلن ناتھ آزاد، محبت مکرانی، راجی محمود، رضا شہزاد، غلام رسول تنگ، فریضہ کاندھی، دلاؤنگار۔ اپنا نام سرکردہ شاعروں کی فہرست میں شامل کرنا غلاب تہذیب ہے۔ علامہ حبیب مظہری نے میں کرپ کے ساتھ اپنا کلام سنایا تھا، وہ اب میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اس مشاعرے کے دوسرے روز حمیدہ سلطان کے یہاں پٹنہ کی تقریب

کی ایک مخصوص نشست ہوئی۔ اس میں جیل منظری، پرویز شادی،
عاشق مندی، شعری جھوپلی، دلاورنگ اور سی کے علام سنایا۔ فخر الدین علی احمد
اور دیوانہ برادری اُن دنوں آسام سے آئے ہوئے تھے۔ اور سی مکمل مسیں
شریک تھے۔

۱۹۵۷ء کے اواخر میں ”سہیل“ گیارہ کے مدیر ادیب منہاروی گلزار ترفیق
لائے، تو پرویز شادی کی خواہش اور شہر سے پہلے ہوا کہ ”سہیل“ کا پرویز شادی
ممبر شائع کیا جائے اور اسے میں ترتیب دوں۔ ادیب منہاروی واپس
پہرا آئے تو کچھ لوگوں نے جن میں گیارہ ترمینہ پور کے ایک دوست مرثی شانی
تھے، اور جبر پرویز شادی سے کسی بنا پر بغض رکھتے تھے، ادیب صاحب
کو شیعہ میں اُنار کا ملازمین منظری جیسے عظیم المرتبت شاعر کا خاص نمبر پہلے
شائع ہونا چاہتے۔ پرویز شادی کا تبریل میں آگیا ہے۔ پرویز صاحب کو اس کا
طمع ہوا تو منظری طور پر یہ بات اُنہیں بہت ناگوار ہوئی اور انہوں نے ادیب صاحب
کو اطلاع دے دی کہ اب وہ اپنے خاص نمبر کے سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔
ادیب صاحب اپنی جگہ یہ موقع محسوس کر رہے تھے، لیکن وہ جن لوگوں کے عقائد
میں تھے، انہیں نالائقی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے پرویز صاحب کی فکھی اور
وہ کہ انداز تھا۔ ”سہیل“ کے ادارے میں میرا نام بھی تھا، اس لیے میں کچھ اور
پریشان تھا۔ بالآخر میں نے یہ تجویز کی کہ جیل منظری نمبر اور پرویز شادی نمبر
ساتھ ساتھ شائع کئے جائیں۔ پرویز صاحب دل برداشتہ تھے، لیکن میں نے
کسی طرح انہیں راضی کر لیا۔ دونوں نمبروں کی ترتیب کی ذمہ داری میرے پر
کئی گئی۔ فوری ۱۹۵۷ء کے ”سہیل“ کے ادارے میں یہ اعلان کیا گیا:

”علی گدی“ ایک مقصد کے تحت

”سہیل“ کے مجوزہ ”جیل منظری نمبر“ اور ”پرویز شادی نمبر“
کی ترتیب کی ساری ذمہ داری ہم نے جناب منظر امام کے
سپر کر دی ہے، اس لیے اُن کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔
آئندہ سہ ماہی کا نام ادارہ میں شامل نہ ہوگا تا کہ ان پر زیادہ
بوجھ نہ پڑے اور وہ ان خاص نمبروں کا کام پوری توجہ
اور دل جمعی سے کر سکیں۔

دونوں نمبروں کا اعلان ”سہیل“ میں کئی ماہ تک شائع ہوتا رہا۔ ”جیل منظری نمبر“
کا اعلان یوں تھا:

”اردو میں غلطیوں اور نگرانی شاعری کے سب سے اہل نقیب
علامہ جیل منظری
کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ملک کے صاحبزائے،

مستند اور معتد رقعاتوں اور ایڈیٹوں کے مضامین

کا گراں قدر مجموعہ

جیل منظری نمبر

جو اردو ادب میں مردہ برسی کے خلاف ایک انظار اور
رہنمون روایت کی بنیاد ڈالے گا۔ اس ضخیم نمبر میں
شاعر کے بہترین مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب
بھی پیش کیا جائے گا۔

ایک ناقابل فراموش کارنامہ

ایک ادبی صحیفہ

جسے اردو کی نئی فوج کے شہسوار منظر امام ترتیب دے
رہے ہیں۔

اس نمبر کے لئے کئی اہم معینوں نگاروں نے میری دعوت نگارش قبول کر لی تھی، جن
میں سے چند کے نام ہیں۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، ل. احمد گریز آبادی
انتر اور پوری، اکی احمد تھور، افتخار حسین، نجیب اشرف ندوی، ممتاز الدین آریو
عبادت بریلوی، عبدالرب ستادانی، غنیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر عروس، سہیل علی گدی
سعید احمد گریز آبادی، ارشد کاظمی، محبوب خزان وفیر، لیکن پھر ”سہیل“ کی جان سے
سرور ہمزی کا اظہار ہوا اور کام آگے نہیں بڑھ سکا میں شک ہے تھا اور سہار کی
ادبی سیاست سے بالکل ناواقف تھا۔ ”جیل منظری نمبر“ تین سال بعد شائع
ضربہ ہوا، لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۱۹۵۸ء میں میری شادی ہوئی تو بعض دوستوں نے تہنیتی نظموں کا
ایک مجموعہ شائع کرنا چاہا۔ میں نے علامہ سے بھی ایک نظم کی فرمائش کی، انہیں نے
دو تین دن کے اندر ہی کتاب لکھ کر ایک نظم لکھ کر دے دی۔ اس کے ایک
مصرعے سے شادی کی تاریخ بھی نکلتی تھی:

آ، دلہن بیاہ لائے منظر امام

۱۳۷۷ھ

اس نظم کے دو ابتدائی شعر یہ تھے:

ایک شاعر کی زندگی، کل تک

واعظانہ تھا شاعری کا مزاج

نابلہ تھا زندگی کا نفام

شاید ترقی پسندی سے میرے پرانے نفاذ کی بنا پر علامہ نے میرے شعر مزاج
کو ”واعظانہ“ کہا تھا۔ البتہ میری زندگی کے نظام کو ”نابلہ“ قرار دینے کا سبب
کیا تھا، یہ میں نہیں جان سکا۔ بہر حال یہ سند میرے حق میں مفید تھی۔

میری نظم ”نگار آمدش“ شائع ہوئی تو میں گرامی میں مقیم تھا اس نظم میں یہ

نہیں بھی سہیں:

یہ محبت کی خبر میں

جہاں بچوں کھلے نہیں

جہاں چاندنی اپنا جلوہ دکھاتی نہیں

یہ محبت

جو چوہے سے بستر کی بھڑکی شکم ہی ہم دودھے

یہ محبت نہیں

جبر ہے

خود مرض مادرانہ محبت ہے یہ

جیل منظری ہے خفا ہو کر پینے سے مجھے لیک خط لکھا، جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اب آپ اتنے عہد ہو گئے ہیں کہ ماں کی محبت کو خود غرض محبت سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ جو خدا اور رسول سے گستاخی کرنے کی جرأت کر سکتے تھے، ایک عام ہندوستانی کی طرح ان کے لئے یہ تصور کرنا محال تھا کہ ماں کی محبت میں خود غرضی کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے۔

اس سے ملتا جلتا مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے، جس کا تعلق علامہ کے دوست سے ہے۔ سلسلہ میں جب مجھے اپنی والدہ کے انتقال کی خبر ملی تو گرتا پڑتا گواہی سے درجہ پہنچا۔ والدہ کے انتقال کو چار پانچ دن ہو چکے تھے کہ اپنی رضوی تعزیت کو آگئے۔ اس معذرت کے ساتھ کہ انہیں اس سلسلے کی اطلاع اسی دن ملی ہے۔ میں نے اپنے یہاں کی انفرادی فضا کی شدت کو کم کرنے کے غرض سے دوسری باتیں شروع کر دیں۔ اپنی رضوی نے میری والدہ کی علالت کے بارے میں کچھ پوچھنا یا تو میں نے مختصر جواب دے کر بات کو رخ بدل دیا۔ اپنی صاحب نے شاید یہ محسوس کیا کہ میں نے اتنے بڑے عادتے کا خاطر خواہ اثر نہیں کیا ہے۔ انہیں نے ماں کی غفلت، شفقت، اس کی قربانیوں اور سخت کوششوں پر ایک طویل، رقت آمیز تقریر کی اور میرے دل کو عزائم بنا کر رخصت ہوئے۔

درجہ کے ذکر پر خیال آیا کہ ایک بار سلسلہ میں جب میری بچی کی ولادت ہوئی تھی، علامہ جیل منظری میرے گھر "امیر منزل" تشریف لائے تھے۔ مہاراجہ ادا دینے والوں کے میری سترت میں شریک ہوئے۔ وہ ان دنوں اپنے عزیز فاکٹر معذرت کے یہاں، جو ان دنوں درجہ کے مہاراجہ کی لالچ میں سپرینڈنٹ تھے، آئے ہوئے تھے۔

جیل صاحب کلاسیک ادب کا بچا ہوا شعور رکھتے تھے اور ان کا شعری ذوق انتہائی لطیف تھا۔ دوران گفتگو متقی کے مشہور مطلع:

غزل اس نے پڑھی مجھے سنا دینا

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کا ذکر کیا۔ کہنے لگے: "یہ مطلع اتنا مشہور ہو گیا کہ اس غزل کے ایک بہت عمدہ شعر کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا!" اور سچہ کہ انہوں نے ایک عالم جناب میں یہ شعر پڑھا:

ذرا جاگتے رہو! اے ہم مصفیرو!

ہم آواز دیں، تم بھی آواز دینا

مجھے یاد آیا ایک بار پرویز صاحب کے سامنے دارغ کے سلسلے میں گفتگو میں نکلی۔ پرویز شاہری کے نزدیک دارغ اخلاقی دور کے ایک معمولی مٹا ہوا ہے، اور ان کے یہاں کوئی ایسا شعریں جو دروغ اور اعتنا ہو۔ جیل منظری نے انہیں عام طور پر غلب اور اقبال کے قبیلے کا شاعر سمجھا جاتا ہے، دارغ کے ایسے ایسے خوب صورت شعریں سنائے کہ طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ پرویز صاحب پھر کبھی قائل نہیں ہوئے۔ علامہ نے میری طرف اشارہ کر کے پرویز صاحب سے کہا: "ان کا شعری ذوق تم سے بہتر ہے۔ تم تو بڑے ترقی پسند ہو!"

جب میں گوانی سے تبدیل ہو کر سلسلہ میں پڑنا آیا تو اس وقت آل ہند ریڈیو میں سہیل عظیم آبادی اردو پروگرام کے پروڈیوسر تھے۔ پروگرام آج کی حیثیت سے مجھے بھی اسی شعبے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جیل منظری پر شہزادہ بدلی دہلی سے رشتہ ہو چکے تھے اور اب بدلی دہلی گزشتہ کچھ دنوں کے لیے ام۔ اے کے طلباء کو کبھی کبھی لیکچر دیا کرتے تھے۔ افضل پور کے ایک چھوٹے سے کمرے میں، جسے شاید جم صاحب نے نوکروں کے رہنے کے لئے بڑھایا تھا، تنہا رہا کرتے۔ گرمیوں میں بھی سوتھرم سے چپکی رہتی۔ سرایوں میں شاید ہی کبھی غل کرے۔ مگر بے ترتیب، ڈھیلی چار پائی پر، گندیل سیل ٹوشک، جگہ جگہ سے ادھری ہوئی۔ لیسٹر کا چادر جیسے برسوں سے بندھی گئی ہوئے ٹوٹے ٹوٹے کاغذ کے ٹکڑوں پر کلام ٹوشک کے نیچے پڑا رہتا، لیکن شریکے تو ایسے:

بڑھا تو رہ گیا پیچھے مرے زمانہ حال

مڑا تو وقت کی رفتار روک دی منے

مجھے ان کی شخصیت کا یہ تضاد ڈرا عجیب معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انہیں کمرہ پیش نظر رکھے ہوئے گواہی میں یہ شعر کہا تھا:

کیا کھلتاں کو نکھاریں گے نقیبان بہار

اچھے کرے میں سلیقے سے نہیں رہ سکتے

تو میں عرض کر رہا تھا، اپنے پڑنے کے سلسلے میں سہیل عظیم آبادی ہینڈ جیل منظری سے سچوئے سچائی کی طرح ملا کرتے اور انہیں سمیٹا کہ کمرہ خالی کر کے سہیل سچائی نے مجھے بتایا تھا کہ جیل صاحب پروگراموں کے کنٹرولنگ ٹیم کو دیتے ہیں۔ اس نے انہیں ڈاک سے کنٹرولنگ ٹیم کو لے کر کہا ہے، وہ خود کار جیل صاحب سے دستخط لیتے ہیں۔ سہیل سچائی برہم پر کا بغیر انجام دیتے ہیں۔

لکھیں جب میری آمد کے کوئی دو سال بعد وہ ریشاٹر ہوئے تو یہ ناز برداری میرے حصے میں آئی۔ اس ”فرعہ ہنسی“ کے علاوہ بھی میں اکثر جملی نظری کی خدمت میں بار بار ہوتا۔ ان کی محبت اور شفقت ہمیشہ کیساں ہوتی۔ ان کی کلم گشتگی کے قلعے بہت مشہور ہیں۔ لیکن مجھے ایک موقع بھی ایسا یا نہیں آ رہا ہے، جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور انہوں نے کسی طرح کی بے نیازی یا بے انتہائی کا مظاہرہ کیا ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ بایں کہنے کہنے کچھوں کو کوٹھکے ہوں، لیکن میری آمد اور نصرت کے وقت وہ ہمیشہ باہوش دکھائی دیتے۔ اس زمانے کا کچھ غیر مطبوعہ کلام شاید اب بھی میرے پاس محفوظ ہو۔ پندرہ ریلوے اس دوران انہوں نے جو مضامین نشر کئے، ان کے سوا دوسرے میں نے خدا کا شکر ابرئیر میں محفوظ کر دیا ہے۔

جیل صاحب کو کھانے سے زیادہ کھانے کا شوق تھا۔ وہ اکثر تہاری کی دعوت دیتے۔ اس کے لئے مجھے صبح سویرے جاگنا پڑتا۔ باؤ گنج سے، جہاں میں رہتا تھا، افضل پور کا فاصلہ رکشے سے اندازاً بیس چوبیس منٹ میں طے ہوتا تھا۔ شکر ہے کہ ان کی بار بار کی دعوت کے باوجود میں سحر فیزی کی عادت سے محفوظ رہا۔ جیل صاحب بڑے جادو اور بڑی محبت سے کھلاتے۔ اپنے جھوٹے ہاتھ سے گوشت کے عمدہ ٹکڑے کا آٹا بیکرتے اور میری بیٹھ میں ڈالتے۔ میں ان کی اس عادت کے بارے میں کئی داستانیں سن چکا تھا۔ شروع شروع میں تو کراہت ہوتی، لیکن یہ ٹوٹ کر کے اُسے گوارا کرنا پڑا۔ ارادت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔

جیل صاحب کی بار بار کی دعوتیں کھا کھا کر مجھے غیرت آئی تو ایک بار میں نے بھی انہیں دن کے کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ انہوں نے یہ شرط لگھی کہ وہ مسروں کے تل میں بنا ہوا خشک کھائیں گے کیوں کہ جب سے انہیں دل کا عارضہ ہوا ہے، ان کے لئے ہر کھانا مسروں کے تل میں بنتا ہے۔ میں خدا ان کے یہاں اس طرح کے کھانے کا مزہ لے چکا تھا۔ ان کی شرط پوری کی گئی کھانے پر سبب عظیم آبادی اور مناظر عاشق ہر گزوری بھی موجود تھے۔ باتوں اور لطیفوں میں جیل صاحب کو اس بات کا موقع نہ مل سکا کہ گوشت کے بلے میں اپنے جھوٹے ہاتھ ڈال کر عمدہ ٹیوٹوں کا انتخاب کر کے ہماری پیٹوں میں منتقل کر سکیں۔ سہل سہائی نے میری جانب نکلیوں سے دیکھا۔ مسکرائے اور کھانے میں مشغول ہو گئے۔

میں سکھ میں سخت بیمار ہوا۔ ایڈمیٹک، ہومیوپیتھک، یونانی اور یورپک دواؤں سے عاجز آ کر میں منظرِ فکر کے NATURE - CURE CLINI (نظری علاج کے شفا خانے) میں داخل ہو گیا تھا۔ وہاں میں ہوائی پھیکی سبزی کھانی پیتی۔ آٹھ دن اور آٹھ رات مسلسل فادکشی کرتی پڑی۔ میں اپنا چودہ کلو وزن کھو چکا تھا اور ٹیوں کا ڈھانچہ

رہ گیا تھا۔ میرا حال سن کر میری بوی بٹنے سے منظرِ لہر ہو گئیں۔ ایک دن کب دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے کے پاس ایک رکشا آکر رکا اور اس میں سے جلی نظری نمودار ہوئے۔ میں انہیں اس جگہ پر متوقع طور پر دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی بہن کے یہاں بھیکن پور آئے ہوئے تھے۔ میرے بارے میں پشیمہ میں معلوم ہوا تھا اور وہ پو پھچے پو پھچے یہاں آ گئے تھے۔ بھیکن پور سے منظرِ لہر کا فاصلہ کم از کم سات میل ہے۔ یہ پرانہ سالی اور یہ اظہارِ محبت میری بوی سے یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ کہنے لگے: ”آپ نے انہیں اس قدر فیزی علاج کے لئے کیوں آنے دیا؟“ میری بوی نے کہا: ”آپ ہی انہیں سمجھائیے۔“

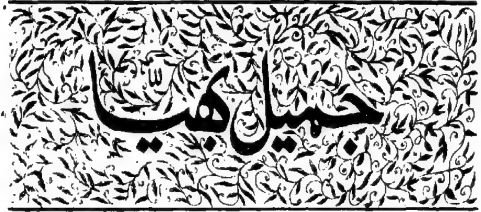
جیل نظری دوسروں کی خوشی اور غم دونوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ وضع داری آج کی تیز رفتار زندگی میں معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ کہتے تھے: اسے کم شگ! بے لے پناہی! تیرا نام جلی نظری ہے ایسے پرانہ طبع لوگ کہاں ہیں۔ کاش اسی کلم گشتگی اور بے نیازی ہر ایک کو میرتبو، جو دوسروں کے دکھ درد کا پناہ دے دو جیسے، جو دوسروں کی خوشیوں پر اپنی محرومیوں کا سایہ نہ پڑنے دے۔ جیل نظری کے کپڑے بیلے بیلے رہے ہوں، مگر ان کی روح صاف و شفاف تھی۔ میں نے کسی کمرے میں قلعی کا ایک شعر کہا تھا۔ سچائی یہ ہے کہ یہ شعر جیل نظری کی جانب سے ہونا چاہئے تھا:

عصرِ نو! مجھ کو نکاہوں میں چھپ کر رکھ لے
ایک مٹی کی مونی تہذیب کا سمرمایہ ہوں
”عصرِ نو“ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میں نے جیل نظری کا سببِ توفیق نکاہوں میں چھپ کر رکھ لیا ہے!

بقیہ جیلِ مظہری کی لوریان

مندرجہ بالا اشعار میں مناظرِ مشکل نظر آتے ہیں تو دوسری طرف شاعر زندگی کی اہمیت اور اس کے نکات و رموز پیش کرتا ہے۔ یہ عالم طفولیت سے جوانی شہر میں منتقل کر کے معصوم، سادہ دماغوں کی پرداخت کرتا ہے۔ ایک طرف تھپکیاں دے دے کر ملایا جاتا ہے، دوسری سمت سے خواہیدہ دماغوں کو بیدار کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔

جاگتے سنساری پر چھائیاں بھی سونگیں
بچوں سے متعلق نظریوں اور لوریان میں جیل کے آہنگ ایک خاص نماز اور طرزِ انوکھی نشان دی کرتے ہیں۔ ان کی لوریوں کے مطالعہ و مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سببِ مصنف شاعری مستقبل کا اشارہ ہے اور نئی نسل کے لئے دعوتِ فکر۔



دیکھ لیں۔ میں نے وہ اُن کی خدمت میں بھیجی اور لکھا کہ مجھے ان کی رائے کا انتظار رہے گا۔ کچھ ہی دن میں وہ نظم نشان شدہ خامیوں اور ادھائی سمیت واپس آگئی۔ کوئی مصرع غالباً ایسا نہ تھا جو بے داغ رہ گیا ہو۔ ہر ایک میں کسی نہ کسی کمی کی نشان دہی کی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے ان سے رائے طلب کرنا موقوف کر دی۔ وہ آتے تو بالمشافہ کبھی فخر فرما سنا اور وہ اکثر پسندیدگی کا اظہار فرماتے۔

بہت دن بعد میری ایک شری کتاب شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ ڈاک سے بھجوا دیا۔ خط کا جواب اور رسید آئی۔ لکھا بلکہ پوچھا تھا کہ کتاب ملی آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں اسے صرف پڑھ لوں یا کچھ اور بھی؟ میں نے فوراً عرض گزاری کہ "میری نیاز مندی کا تقاضا تھا کہ کتاب آپ کی خدمت میں پہنچے۔ بس، یہ بھی لازم نہیں کہ آپ اسے پڑھیں۔"

کتاب کی رسید کے سلسلے میں علامہ نے جو خط لکھا تھا اس میں شاید یہ بھی رقم تھا کہ وجہ بھی دہی آئے مجھے سے ملیں گے۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد وہ تشریف لائے تو وعدے کے مطابق مجھے بھی ملاقات سے نوازا۔ کیونکہ دکان پر خورد و نوش کا خاطر خواہ اہتمام تھا نہ اطمینان سے بیٹھے گا۔ اور میرا گھر دور۔ میں انھیں نئی دہلی کے ایک خوشگوار قسم کے ریسٹوران میں لے گیا۔ آپ کے صاحبزادہ خوش پوش و خوش ذوق و خوش اطوار بھی ہمراہ تھے۔ اس قہوہ خانہ میں مطلوبہ آسانیاں میسر تھیں۔ دو ہر ہر کا کھانا کھایا اور شام کی جانے تک نشست رہی۔ علامہ کو دل کا کھانا اور مناسب ماحول پسند آئے۔ اور میری شان نیاز مندی بھی نزدیک اور دور کی بہت بایں ہوتی۔ میں نے شعر سنائے اور خوب سے خوب سے سننے اس ملاقات کی دو باتیں ایک تک یاد ہیں۔ ایک تو کہ میرے ان دوا اشاری کی کچھ اس اعلیٰ سے آپ نے داد دی کہ اگر انزلوں کو پھر

۱۹۶۷ء میں میرا مجموعہ کلام "شعلہ زار" شائع ہوا تو میں نے اس کی پانچ جلدیں مخدومی قاضی عبدالودود کی خدمت میں پیش کیں۔ ایک ان کے لیے، ایک اُن کے صاحبزادہ بلند اقبال قاضی مسعود کے لیے، ایک کتب خانہ خدابخش پٹنہ کے لیے اور دو اُن اصحاب نظر کے لیے جن کا دوقی شعر قاضی صاحب کے نزدیک معیاری ہو۔ اور ذامیر اسرا پنا ملاحظہ فرمائیے کہ میں نے معیار کی شرط اپنے اس شعر کے باوجود لگا دی جو نسخہ اشارہ میں اپنی تخلیق کے معیاری ہونے کے متعلق زیست آغا ز ہے۔

شعر سے مجھ کو تعلق نہ ادب سے کچھ کام
طبع کی بات الگ ہے کہ رواں چاہے دست

باں تو ان پانچ نسخوں میں سے ایک قاضی صاحب نے علامہ موصوف کو پیش کیا۔ قاضی صاحب نے مجھے اس کی اطلاع دی یا نہیں مجھے شہیک سے یاد نہیں مگر یہ کہ کچھ دن بعد مجھے منظر ہی صاحب کا خط آیا۔ اس میں مجھے اس والاہانہ انداز سے یاد فرمایا گیا کہ یادہ مجھے دائمی پنا مخلص نیاز مند سمجھتے ہیں۔ میں متاثر ہوا اور کیونکر نہ ہوا کہ ایسے خط کو سر پائے ادب میں ہر روز کس کو مقدر ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ قاضی دودھ صاحب تازہ داروان ادب کو کم ہی سمجھا میں لائے ہیں کہ ان کا سبب نقد و نظر اس درجہ بلند ہے کہ وہاں تک موجودہ دور کے اکثر شعراء وادبا کی بیکر رسائی ہی نہیں۔ یہاں اس واقعہ کا ذکر لازم آتا ہے کہ ان کے نظریے اور طریق کار کو واضح بھی کرنا ہے نہت بھی۔

ایک مرتبہ میں نے ایک نظم اپنے والدِ مفلد ششیا کی شان میں کہی۔ میرے نزدیک اور ابھی نظم تھی۔ جی چاہا قاضی صاحب بھی

● آئی۔ ۳۵، جنگ پورہ ایسٹیشن (فرسٹ فلور)، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

گویا نہ مجھ سے پہلے کوئی مجھ سا شاعر پیدا ہوا اور نہ ہونے کا امکان ہے۔
خیر وہ شعر آپ ہی سنے اور علامہ کی بندہ نوازی اور حوصلہ افزائی کو
سرا پیے۔

ہر دھکے کا مارا ہوتا ہے ہر درد کا چارا ہوتا ہے
وہ جس کا سہارا کوئی نہیں اس کا بھی سہارا ہوتا ہے
اس دار و گیر کی دنیا میں دو قسم کے انسان بیٹے ہیں
اک ایس کا مارا ہوتا ہے اک اس کا مارا ہوتا ہے
اور پھر وہ شعر سنایا جو میر سے دل پر آج بھی نقش ہے اور
بہستور مرزا دیتا ہے۔

نہ چلو جو کیسے نگہ داری ہے زندگی اسے دوست
بڑی طویل کہانی ہے پھر کبھی اسے دوست

اور درد سوزا کہ جب دوران گفتگو فارسی گویاں پسند زیر بحث
آئے تو آپ نے پوچھا ”تمہارے نزدیک امیر (مخصوصاً) کے علاوہ کون
بہترین غزل گو ہوا ہے؟“ میں نے غرضی کا نام لیا۔ فرمایا ”ہاں وہ انتہائی
ذہین اور ادب مانی فارسی شاعر تھا مگر فن میں کامل نہ تھا اور یہ بھی کہ
کبھی اس کا شعر اچھا کر بھی رہ جاتا ہے۔ کہو تم نے براہمن کا کلام بھی
ملاحظہ کیا؟“ میں نے غرضی کی ”نام سے اور ایک حد تک کام سے
واقف ہوں بس“ پوچھا ”کون سا کام؟“ میں نے تفصیل حاضر کی۔
”منشی چندر بھان براہمن میرے مرشد اڈل کے مرید خاص تھے اور
منظور نظر انہی کی تحریک و تقریب سے شاہزادہ دارا شکوہ بھی مہسا
راج باوالال (پورا نام بابا لال داس بیرائی) سے رجوع ہوئے آپس
میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اس کا حال نہیں کھتا مگر وہ سات مفضل
نشتیں جو ان کے درمیان لاہور میں واقع ہوئیں ان کا حال لگتا ہے اور
جو گفتگو اور جواب و سوال معرض وجود میں آئے وہ منشی براہمن نے تمام
وکمال کچھ نہ نقل کر لیے۔ یہ کتابی صورت میں ”مخزن انکات“ کے نام سے
فارسی میں اور ”امرا معرفت“ کے عنوان سے اردو میں بہستور ملتے ہیں۔
فارسی نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ محلی افشاری گفتار کی زندگی اور قابل
تقلید مثال۔“ فرمایا ”ہاں یہ بھی ہے مگر جہاں تک خالص غزل گوئی کا
تعلق ہے براہمن کے ہاں یہ فن اپنی سراج کو پہنچا ہوا ہے۔ ہندوستان
کی پوری فارسی تاریخ میں ان کا ثانی نہیں اور ایران میں بھی ان کا
توقالی صرف شیخ ہے۔ براہمن کی انشاء بھی سعدی کی نثر کا نقش
ثانی ہے۔ گویا ہمارے ملک میں نہ ان کے شعر کا جواب نہ ان کی نثر کا۔“
میں نے یسین کر جیران بھی جانو خوش بھی۔ اور اس خوشگوار حیرت کی یہ
خاص وجہ کہ مندرجہ بالا رائے ایک مسلمان مفکر کی ایک ہندو شاعر

سے متعلق تھی اور یہ منہ دیکھ کر مدح سرائی بھی نہ تھی کہ منشی موصوف کی
وفات پر تین سے اوپر صدیاں گزرنے لگی تھیں۔ پھر کچھ توقف کے بعد فرمایا
”ہاں مخزن انکات میری نظر سے بھی گزری ہے۔ اس کی سادگی، بے
مکلفی اور برہمنی اس بات کی غواہ ہے کہ زبان براہمن کی ہے۔ شاہزادہ
منصور کی زبان مرصع و مجاز سے آراستہ ہوئی کہ ابھی ابھی افضل کی طرز
نکاحش مکر راج الوقت تھی اور تمہارے گورو جی کی زبان سے میں آگاہ نہیں
تو ان کے رنگ بیان سے۔ لیکن میرا اعزاز غلط ہو مگر میرے بحث کی
زبان سے براہمن کا رنگ جھلکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بابا جی اور دارا کے
مابین گفتگو تو ہندی یا پنجابی میں ہوئی ہو اور براہمن نے کشاہزادہ کا
میر منشی تھا اور ہر وقت مصاحبت میں ترجمہ درباری زبان میں کر دیا ہو
میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو فرمایا ”کیا تمہارے مرشد فارسی خوب جانتے تھے؟“
میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے اضافہ کیا ”یہ بھی کہا کہ صرف خوب
جانتے تھے ان کی فصاحت کے افسانے اب تک عام ہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ
اس زبان کے نہایت روان اور فصیح مقرر تھے۔ ہزاروں کے مجمع کو اپنی جگہ
بیانی سے سمجھا اور دم بخور رکھنے پر قادر۔ فارسی کے علاوہ سنسکرت اور
عربی پر ان کو عبور حاصل تھا۔“ علامہ نے یسین کو فرمایا ”ہاں یہ ٹھیک
ہے۔ وہ اگر براہمن کے مرشد تھے تو ممکن ہے اس کے فن پر بھی ان کا اثر
ہو۔“ پھر فرمایا ”اگر بابا جی زبان پر ایسی ہی قدرت رکھتے تھے یہی تمہارا
بیان سے ظاہر ہے تو ان کی تحریروں کی غیر موجودگی فارسی ادب کا بہت
بڑا نقصان ہے۔ مگر چارہ کیسا ہے؟ البتہ ثابت کہ منشی چندر بھان براہمن
اپنے فن کے ہمیش نظر یقیناً سعدی ثانی تھے اور سعدی ہند کھلانے کے
مستحق۔“

علامہ موصوف بڑے وسیع المشرب بزرگ تھے اور یہ کیونکر نہ ہوتا
کہ آپ کے جذبات، احساسات، خیالات اور فن آفاقی حیثیت رکھتے تھے
اول تو ان کے یہاں تعصب کا کوئی خاند نہ تھا اور اگر تھا تو قطعی خالی۔
مذہب کے متعلق فرماتے کہ مذہب کا مقصد آدمی کو انسان بنانا ہے
اور جو شخص پہلے ہی سے انسان ہو اُس کو اضافی قیود کی ضرورت نہیں
اور شاہد یہ ہیں سے ہو کہ ایک نیک مسلمان بھٹے ہوئے بھی نماز اور روزہ کے
پابند نہ تھے۔ ایک مرتبہ منشی میں فرمایا ”تمہیں نماز بخوشی لگتا ہے
روزہ لگے کا ہار ہوا؟“ آپ کے دوست نے بھی تو کہا ہے اور کیا خوب کہا
ہے۔

حسن کا فری پرستش عین ایمان کیوں نہ ہو
دل جو رکھتا ہو مسلمان کیوں ہو انسان کیوں نہ ہو
”میرزا کاغذ کھنوی“

جیل جیتا ہر رنگ سادگی کا مکمل نمونہ تھے اور نفاست کا بیکر رکھ رکھاؤ سادہ، لباس سادہ، خورد و نوش میں سادگی، ادائے مطلب کا سلیقہ سادگی لیے ہوئے گفتگو بائیں مگر مختصر جب مجھ سے ملے تو بڑے چالے نے سانسے ڈالنا شروع کر دیے تھے۔ مراد ابراہیم سنگی طاری ہونے لگی تھی، آپ کا لباس، کپڑے کی ٹوپی بے کلفت لگی ہوئی کا نصیحت مگر دیوار گاندھی ٹوپی سے کچھ بڑی اور کبھی رنگدار بھی۔ اچکن، کڑوا، خوب کھلی جھری کا یا جامہ جو چلتے ہیں کبھی نسیم زدہ شارج گل کی طرح لہلہا نا اور کبھی پرچم صبا آسمودہ کی طرح لہرنا۔ جراب اور ٹیبلر پر مشتمل ہوتا۔ اچکن کا کپڑا خاص طور پر ٹیٹھی ہوتا۔ مگر پہنتے بے نیازانہ۔ پاجامے کی بھی ایک ٹانگ اشکلی ہوتی تو دوسری زمین بوس۔ اپنی اصل سے وہ منکر تھے اور ہر قابل ذکر منکر کی صورت ہی ہوتی ہے کہ ہر دم وہ فنا فی الیال ہوتا ہے دنیا دنیا فہما کو گرد و پیش سے بے خبر۔ بیٹھے تو پاؤں کو جوتوں سے آزاد کر لیتے۔ موزے بھی برداشت کر لیتے کبھی انھیں بھی نصیب پالوش کر دیتے۔ آپ میانہ دہ تھے، رنگ گندی، رنگ نشتر نکھا متناہب الاعضاء، جوانی میں دھیر رہے ہوں گے مگر ایسے جب بھی نہیں کرنا شوق حسن کے مقابل میں شامل ہو سکیں۔ گماہ گماہ سیگرٹ کا شوق فرماتے۔ شراب سے قطعی پرہیز تھا۔ کھانے پر اگر بہت سے سالن ہوتے تو انھیں برداشت کر لیتے مگر پسند نہ فرماتے کہ ان کی سادہ طبی مجبور ہوتی تھی، فرماتے یہ سلیقے سے بچا ہوا ہو تو ایک سالن ہی خوب ہوتا ہے۔ جانے کا البتہ شوق تھا۔ وقت بے وقت ایک پسالی قبول فرمائیے۔ گرمی کے موسم میں بھی شربت اور چھانچھ کا باوجود چائے سے امتناع نہ ہوتا۔ اتیں آہستگی سے کرتے اور آواز اسی حد تک محدود کہ سامع تک صاف پہنچ جائے۔ مسند زیر بحث موافق ہو کہ فیض طریق آواز ہمیشہ ہمارا ہی۔ زیر دہم سے فیض شعلی، شمرحت اللفظ بڑھتے اور لوں کہ سننے والا ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ سن لے تو سمجھ لے۔ چونکہ آپ شعر سادہ اور صاف کہتے جو ہر لسانی سے مکمل ہوتا۔ سامع ہر جدی کیفیت طاری کر دیتا۔ صوفے کرسی یا مسند پر روئی افزود ہونے تو لوں جم کر گویا بیٹھ گئے تو کچھ عرصے تک ضرور بیٹھیں گے۔ بشرے اور انھوں سے ذہانت سو پر سے بھاڑ کر نوازشاں رہتی۔ ان کی ذات اقدس پر میرزا بگتازہ مرحوم کا یہ شعر خوب چسپاں ہوتا ہے

چوتوں سے ملنا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کا فر پہ سادگی برتنی ہے

آہستہ فرامی ان کی ذات سے خاص تھی۔ رنگ رنگ کر چلتے گویا چاہتے ہوں کہ قلب زین کو گزند نہ پہنچے اور ہاں بے بھی کہ جہلا میوں کی

آج کل کی دہلی

ہم قدمی منظور ہے ان کا جلو میں با پس پشت ہونا پسند نہیں۔
فرماتے "کھانے کا مزہ ہو کہ سے اور سواری کا مکان ہے ہے اشتبا
کے بغیر ہر ملک دعوت بھی بے معنی ہو جاتی ہے اور مکان کے بغیر سواری
آسودگی کی نشاندہی نہیں کرتی۔

وہ جب بھی میرے یہاں آتے ان کے منہ بولے بیٹے ہمیشہ ان کے
ہمراہ ہوتے۔ یہ صاحبزادے ان کے بھتیجے تھے یا بھانجے تھے اب یاد نہیں
رہا مگر جمیل صاحب نے انھیں جب بھی کہا بیٹا کہا اور صاحبزادہ
نے ان کو پیا۔ یہ بھی شعر کہتے ہیں۔ مگر جب میرے اصرار پر سرسلانے ہا
کر بستہ ہوتے ہیں نہایت نیاز مند۔ وہ دلی میں ہیں اور دلی کا کھانا
سے وابستہ۔ خوش ذوق ہیں اور کبھی واقعی اچھا شعر بھی نکالتے ہیں جمیل
یہاں نہ بھی ہوتے تو وہ میرے یہاں آتے رہتے کبھی ابا کا پیغام لے کر کہیں
محض سلام کہے۔ یہ سلسلہ آمد و رفت کا سلسلہ ۱۹۷۰ء تک قائم رہا اسر
کے بعد میں نے چاندنی چوک والا مکان چھوڑا تو پرتان خاطر کی
باعث کسی کو نہ پتہ تھے آگاہ ہی نہ کیا اور آگاہ بھی کیا کرتا کہ جہاں جو
ٹھکانا ہو انھیں عارضی۔ یہ یقین ہی نہ ہوا کہ کل کہاں ہوں گے۔ یہ الگ
بات ہے کہ گذشتہ دو سال سے وہیں پڑا ہوں جہاں پہلے دن ڈال د
گیا۔ مگر پہلے ہی دن کی سی بے یقینی کے ساتھ گذشتہ برس میرے
نیک نہاد بیوی کے انتقال نے مجھے کبیرے سہارا کر دیا۔ وہ بھی تو آنے
جانے والوں کی قاضی کرتی تھی اب میں خود دوسروں کے دم و دم کہم
دن کاٹ رہا ہوں۔ کس پرستہ پر کسی کو بلاؤں تیر۔

ایک مرتبہ جمیل بھائی آتے تو بیٹے کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی
بھی ہمراہ تھے۔ ایک صاحب اور بھی تھے اور وہ بھی ارقم شاعر، نام کسو
کا یاد نہ رہا۔ نخل آراستہ ہوں ان دونوں نے اپنے افکار عالیہ سے
نوازا۔ بھائی شعر خوب کہتے ہیں میرے یہاں شعر خوانی کے وقت فخر
کا پہلو بھی پیدا تھا۔ وہ پہلو جو جمیل جیسے ہمدان، عالم تہذیب و شاعر
بے بدل کے یہاں قطعی ناچید۔ علامہ جمیل سے غوثی اور نسیمی رشتہ کے
بادخود ع۔

مگر وہ بات کہاں مولوی من کی سی

کسا معاملہ تھا۔ اگلے مجھے کلام شائے ہوا تو ازورہ دستار د
ایک نسخہ مجھے بھی عطا فرمایا۔ میں بھی ان کی نکتہ آفرینی سے محفوظ ہوا اور
مستفیض بھی۔

سخت شرمندہ ہوں کہ ان ایسے کرم فرماؤں کے نام ضعیف حاف
کے باعث ذہن سے اُتر گئے اور یہ عجیب صورتِ انقطاع ہے کہ اب
بچپاس برس پہلے کے واقعات تو روحِ قلب پر لایا نقش ہیں گویا پتھر

کی فکر کر کے کہ باتیں ہوں جو مجھے پہلے جنم کی باتیں ہوں۔

جلیل جیٹا کو جہاں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے ادب سے قابل رشک آگئی تھی وہیں تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور تاریخ ادبیات مشرق اور مختلف مروجہ مذاہب کے سر ملے فلسفہ و دنیاویات پر نظر پڑی گہری تھی اور معلومات وسیع اور اس سلسلے میں سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی یادداشت اس قدر قابل اعتبار تھی کہ اگر کسی نکتہ کی وضاحت کے لیے انھیں تاریخ یا مذہب سے متعلقہ حقائق سے متعلق مدد لینا ہوتی تو وہ اس کی تاویل میں علوم گزشتہ و موجودہ کے دریا بہا دیتے۔ اور ان کا بیان ان کے زبان سے آراستہ ہوتا اس درجہ دلچسپ ہوتا کہ جہاں تو دور کی بات ہے اکثر آنکھ تک نہ جھپکتی۔

جلیل جیٹا انتہائی طفل تھے اور اپنی فطرت سے سادگی پسند، ان کی گفتگو میں کبھی قصص کا پہلو پیدا ہوتا نہ ان کی تحریر میں۔ وہ آدھے قائل تھے اور آدھے محترم، ان کی صاف گوئی ضرب الشلل کی حیثیت رکھتی۔ فن سے متعلق اگر کبھی ان کی رائے طلب کی جاتی تو بے جل و خجست فوراً نہ ان کی رائے یقیناً مستند ہوتی کہ انھیں اس کے لوازمات اور ہرچ و مرج سے کاٹنا آکا ہی تھی۔ اور اگر کسی نئی معاملہ میں استفادہ کرنا ہوتا تو وہ بہت جلد فکر کے بعد رائے دیتے اور کبھی یہ بھی فرماتے کہ یہاں میں اس میدان کا مرد نہیں یہ بات میرے تجربہ کی نہیں۔ کسی حق نگاہ سے مشورہ کرو۔ مگر جو بات وہ کہتے اس سے ان کی خود اعتمادی اور یقین بدرجہ اتم جھلکتے۔

میرے یہاں تشریف فرما تھے اور بظاہر مراقبہ میں کسی نے ذوق کا شعر پڑھا۔

زبان خلق کو نفاہ خدا بجمہو

بجا کہ جسے عالم ہے بجا بجمہو

آپ نے معاً انھیں کھول کر فرمایا: "لا حول ولا قوۃ۔ عالم کا کیا اعتبار۔ صبح کو کسی کی پرستش کرتا ہے تو شام کو گردن زدنی بھی ٹھہرا دیتا ہے۔ مجھے اور ہجوم کی رائے بھی نہیں رائے ہوتی ہے۔" ان کے ایمان اور انسان کا مہیا و نقل و دلائل سے وابستہ تھا اور فکر و نظر کا مرد ہونا محنت۔ وہ جذبات کی رویں بہہ جانے کے قائل نہ تھے مگر دوستی اور دوستداری کی راہ میں ان کا نقطہ نظر اس درجہ سے واضح ہوتا ہے جو آپ نے اس سلسلے میں ایک مرتبہ پڑھا۔

دھن دے تن کو رکھتے تن دے رکھتے لاج

دھن دے تن دے لاج دے سب پر یکے کاج

فرماتے: "ابا اصول ہونا بڑی خوبی کی بات مگر اپنے اصولوں پر

صنعتی سے قائم رہنے والا انسان کبھی اچھا دوست نہیں ہو سکتا کہ اس کے کردار میں چلک نہیں ہوتی۔ وہ چلک جو دوستی کی جان ہے۔ تاکہ اس کا اصول یہ بھی ہو کہ دوست اور دوست کی ہر راہ میں ہر جائز اور ناجائز قربانی لازم ہے۔ بے جھجک اور ذاتی سود و زیاں کے ہر خیال سے دور۔"

وہ پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور سینہ اردو کے معلم اعلیٰ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے شاگردوں نے اس علم و فضل کے بڑا پیدائندہ سے علم و ادب و فن کے بے شمار موتی میٹھے ہوں گے کہ اس کم نامی کے در میں ان کے سے انہماک و جوش سے نہ درس دینے والے میسر ہیں نہ فنون لطیفہ کو احاطہ کرنے والے۔

ہم دونوں بھائیوں کے درمیان شعر و شاعری سے ہٹ کر ایک اور قدر مشترک تھی اور وہ میرزا یحیٰٰہ مرحوم کی ذات ہمہ اوصاف، وہ ان کی اقدار فن کے قائل تھے اور انسانیت کے اعلیٰ مدارج سے متاثر۔ یہ ایک بات ہے کہ وہ فکر و نظر کے بعد ان کے پرستار ہوئے اور میں از دوسے اعتقاد۔ مگر اعتقاد کی بنیاد بھی تو تجربہ ہی پر استوار ہوتی ہے۔ مرشد بے فیض ہو تو مریدوں کو بس ترسانا ہی رہتا ہے۔ اور اس کا حلقہ رشد و ہدایت خارج از بحث۔ جلیل پر میرزا کا اثر گہرا تھا اور ان کے کلام سے نکالیں۔ بہ راہ شعر میں علامہ کے فن، زبان و بیان اور صلاحیتوں کا قائل ہوں کہ میرزا ہی کی طرح ان کا فائدہ مند بے عیب بھی ہو سکتا ہے اور کوئی شعر بھری کا ہوتا ہے اور نہ شعریت سے عاری۔ کردار کی بات آگے ہے کہ جلیل کے یہاں نہ میرزا کی سی گج گلاہی مٹی ہے نہ ان کی سی بیباک نوائی۔

فرماتے: "بیسے سخن اچھے لیے سخن گو ہونا ضروری نہیں اسی طرح سخنور کی سخن بھی لازم نہیں اور یہیں سے ہے کہ اکثر شاعر لوگ اپنے آپ کو بچو یا دیگرے سمیت سمجھتے گئے ہیں۔ وجہ یہی کہ وہ عظیم شعرا کے فکر و فن اور شعری احساس کو سمجھنے کی توفیق ہی نہیں رکھتے اسی دوران کسی نے یہ شعر پڑھا۔

صائب! دو چیز می شکندہ قدر شعورا

تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

آپ نے فرمایا تحسین ناشناس سکوت سخن شناس سے بڑھ کر اذیت بخش ہوتی ہے اور مکروہ۔ اکثر وہ لوگ بھی داد کے دھوکے برسانے لگتے ہیں جن کو زبان تک سے واقفیت نہیں ہوتی۔ اس کی وضاحت میں ایک واقعہ سننا:

ایک عمر شاعر کے سال خوردہ و عمر تبر باپ نے راہ عدم اختیار

کی تو لوگ پڑے کے لیے بھی آئے۔ ایک مداح کہ ہمارے ہی میں دستا
تھا آیا تو موت پر انہیں سوس ظاہر کیا اور شاعر موصوف کے باب پر ہونے
پر ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر غم آلودہ آنکھوں سے پوچھا "خیر باشد!
آپ کے والدس مرض کا شہرہ ہو کر آپ کو خیر باد کہئے؟" شاعر نے کہا
"میاں! بیماری کیا ہوتی۔ یہی طویل العمری، ضعیفی اور کف۔ یہ بھی تو بیکار
ہی ہے۔" مداح نے مہر چمکا کر فرمایا: "ہاں مہر کا یہ بیماری بڑی جان ہوا
ہوتی ہے پچھلے برس میرا بچہ اسی مرض سے تو مر گیا۔"

میرے ایک عزیز ہیں۔ عزیز کیا سنگے بھائی ہیں۔ ان کے یہاں
نہ فراوانی ذریعے نہ امارت کے علم و نشان مگر اپنی خوشحالی کا مظاہرہ
اور لطیف بازی کی نمائش کا ہوا کہ ان کا کاروباری دفتر میرے مکان
سے قریب ہی تھا۔ جمیل بیٹا آتے جاتے ان سے بھی مل لیتے۔ وہ آخری
مرتبہ دہلی، ۱۹۷۷ء میں آئے اور یہاں وہیں کا ذکر کرے اور مجھے آخری
ملاقات، شام کو میرے یہاں سے آئے تو میں پوچھنے کے لیے براہ ہو گیا
گلی میں آئے تو کہا "جہاں سے بھائی سے یہی ملتا چلوں۔" نہ جانے پھر کب
آنا ہو۔ ہم سب وہاں گئے تو بھائی نے جمیل صاحب کو دوسرے دن کے
لیے دعوت طعام دی اور کہا کہ سب ہماریوں کے سمیت شریف لائے
گا۔ آپ نے قبول فرمائی اور وہ بھی جھٹھے سے۔ مجھے اگر کچھ کہنا بھی تھا۔
تو اب لب کشائی کی گنجائش ہی باقی رہ گئی تھی۔ بہر کف رخصت
ہو کر ہم بازار میں آئے تو جمیل صاحب نے مجھ سے پوچھا "ہیں کب تک
وہاں پہنچ جانا چاہیے؟" میں نے کہا کہ اپنی آسانی دیکھئے مجھے تو وہاں
جانا نہیں۔ آپ نے حیرت سے پوچھا "تو کیا آپ نہیں چلیں گے؟ میں
نے معذوری کا اظہار کیا تو آپ نے پوچھا "ہماری خاطر سے بھی نہیں؟"
میں نے کہا "آپ تو دانستے لاز ہیں۔ آپ کو اصرار زب نہیں دے گا۔
اور آزمائش میں ڈالنا۔ یہ آپ سے کیونکر ممکن ہو گا۔ آپ کچھ بڑے معاملہ
کی نوعیت پر غور کیا اور فرمایا "تم لوگ نہیں رکو۔ ان کے بھائی سے مل
کر میں ابھی آتا ہوں۔" جی کرے گئے اور دعوت کا فقرہ منسوخ کر آئے۔
وضوح داری کو کیوں کہ جروج کر گئے۔

برسبیل تذکرہ ایک مرتبہ نے پوچھا "بھائی! آپ کے نزدیک
زندگی کا مقصد کیا ہے؟" کہا "بظاہر تو وہی جو ہم کر رہے ہیں۔" میں
خاموش ہو گیا۔ وہ بھانپ گئے کہ میں اس جواب سے مطمئن نہیں ہو چکا
"آپ کیا سمجھتے ہیں؟" میں نے کہا "میں اس دقیق مسئلہ کو سمجھنے کی طاقت
کہاں رکھتا ہوں مگر ظاہر کی نظر میں تو ہر زندگی کا مقصد صرف موت
معلوم ہوتا ہے۔ یوں بھی موت ایک حقیقت اور حیات محض اتفاق۔"
پوچھا "تو ہمارے اہلئے ہندو فلسفہ و تہذیب سے متعلق اکثر کتابیں

آج کل نئی دہلی

دیکھی ہوں گی ان کا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "یہ اُن سے خود پوچھ لیجئے
انھیں یاد فرمایا گیا تو انھوں نے کہا۔" آپ ایسے شہرہ آفاق مفکر اور
مستند شاعر کے مقابل میرا مبلغ علم کیا حیثیت رکھتا ہے اور پھر آپ
کے سامنے زبان کھولنا یوں مجھے سزا دے گا۔ کیا عرض کروں؟" جمیل
بولے "گھٹو بہن اور بھائی کے درمیان ہے بے ادبی کا کیا مقام ہے۔
اور رکھف کیسا۔ ہاں میں شاعر ضرور ہوں فلسفی نہیں۔" ودیا جی (میری
بیوی کا نام) نے جرات نہ دے کر کام لیتے ہوئے کہا "اگر آپ واقعی
بڑے شاعر ہیں تو اسی نسبت سے فلسفی بھی۔ فلسفے کے بغیر تو شاعر
گھسیادہ رہ جاتا ہے۔ جمیل بیٹا نے غپ آنکھیں کھول کر دوا کی طرف
دیکھا۔ اور کئی مرتبہ واہ واہ اور خوب کی تکرار کی اور پھر کہا "تو وہ
مقصد حیات والی بات تو باری رہ گئی۔" ودیلے کہا "بھائی صاحب! جن
باتوں کو اب تک کوئی نہ سمجھ سکا اُن پر غور و فکر کو میں تفصیل اوقات بھینتی
ہوں۔ خواہ نوحہ کر سہاٹے سے کیا حاصل۔"

آقا نے جمیل ددیالی بی بی کی معاملہ بھی اور دودرا دیشی کے معترف
تھے اور جب بھی روبرو ہوتے اس کی فہم و ذکر کا کی توصیف فرماتے اور
دعائے خیر سے لوازتے۔

ہاں جمیل بیٹا میری بیوی کے حسن کا کر دگی کی کٹائنٹ میں متعدد
مرتبہ رطب اللسان ہوتے۔ فرماتے "ہم ابھی ڈوب سے بچے بھی نہیں
پائے کہ مرآت اور تواضع کا سلسلہ شروع ہونے لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے
کہ ان کی یہ شخصیت ہی دنیا داری اور مذہب دیکھنے کی مدح نہ تھی کہ دوا لای
ہی تھی بلکہ اس سے بڑھ کر اکثر ایسا جن کا ملازم نہ ہوتا مگر ہر جیسز
ضرورت کی تیار تھی۔ وہ چھ سات نفوس کے لیے سبزیاں کرنا اور تیار
کر کے ٹھنڈی مشین میں محفوظ کر لیتی۔ چھل اور شیرینیوں سے ریاضہ بھر
ہر وقت تیار رہتا۔ مہمان کی آمد کی امید ہو کہ نہ ہو مگر ہر چیز کھانے کی میز
پر فشریاں، سفالیاں اور چائے کے برتن، گلاس وغیرہ صاف کر کے
سمجھا دیے جاتے کہ ضرورت کے وقت بے کارنگ دودھ نہ کرنا پڑے۔ ہم
دو دن لوڑے اور ازل و بار، دودھ و صوب کے قابل نہ تھے۔ کوئی آقا تو اس
کی خدمت کے سلسلے میں کون بازاد دوتا۔ اس لیے حفظِ آقاہم کے
طور پر ہر چیز پہلے سے موجود رہتی اور کیونکہ یہ اہتمام جمیل احمد دوسرے
بے رکھف کرم فرماؤں سے ڈھکا چھپا تھا اس لیے ودیا بی بی کی مسامی
(صفحہ ۳۲)

لے گھسیادہ کا لفظ میرا ہے۔ ودیا ایسی خاتون کی شائستگی کا بیکر تھی
وہ ایسے لفظ سے زبان کیوں کر آلودہ کرتی۔ اس نے غالباً کہا کہ فلسفی
مذہب کے بغیر بڑا شاعر ہونا ممکن نہیں۔



یادوں کی جھلکیاں

تقریباً چھالیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ پھر بھی میری مروجہ و متداول میں آپ کو تازگی اور نیا پن نظر کرنے باز آتے ہیں اس میں تازگی محسوس کرتے ہوئے غمزہ شہتہ کی باتیں سمجھ رہا ہوں۔ بلکہ میں میرا قیام عٹ حاجی لین کے "تاجی" گھر میں تھا۔

ہمارے ساتھیوں میں جناب سید مقصود صاحب جو غالباً بندہ ریل کھنڈ کے کسی گاؤں کے باشندے تھے اور پروفیسر طاہر رضوی صاحب مروجہ چیلو کے نیلے نسبتی بھائی تھے۔ اس کے علاوہ ایک صاحب اور وگڈیٹ ور سہلے دوا چھپڑی تھے۔ اور کم نبیوں حصول تعلیم کے سلسلے میں ایک ہی گھر یعنی عٹ حاجی لین میں رہا کرتے۔ مگر یہ کتنا گھناؤنا رنگا کا سنگم "اور تو ہی مجھے اور سیکولرزم کا پکا سامنا نمود۔

ایک روز شام کے وقت دفعتاً مگر بڑا اعانت میرے کمرے میں دو اجنبی صوفیوں دیکھا ہی دیں، ایک صاحب باقاعدہ اعلیٰ سلی ہوئی شمشیر وانی پتہ کی صاف و شفاف ٹوپی، چوڑی دار با جامہ اور سیاہ پینٹ کے کمپ میں نظر آئے۔ یہ صاحب موائسز نہ رکھتے یا د رکھتے ہوں لیکن مجھے حسین اور خوب نظر کرتے اور ان کا صحیح حسن ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد نظر آیا۔ دوسرے صاحب منظر اول الذکر سے تھوڑی قدر قدامت میں کم لیکن شرفیاز اور ذہن دارانہ سلیستگی کے ساتھ جاذب نظر مباحثات سے مرصع تھے۔ مگر خراب تاہاں پر کچھ منوئی کیفیت نمایاں تھی۔ اسی زمانے میں میں "آرگنٹو مشو پنہار" کا فلسفہ مطالعہ کر رہا تھا۔ اس سرورق ایک تصویر نقل جس کے نیچے یہ لکھا ہوا تھا۔

جنوں جنوں لوگ کہے ہیں

جنوں کیا ہما ہو گا

عجب اتفاق کہ کتاب میری میز پر پڑی تھی۔ تو کبھی میں تصویر پر غور کرتا

وہ جاچے ہیں اور آنکھوں پر اعتبار نہیں
وہ آچکے ہیں مگر استغفار باقی ہے۔
اجیل،

اس سر کا تعلق عاجز حضرت سید کاظم علی بن علی حسن مظہری مرحوم کی شخصیت سے ہے۔ علامہ مروجہ میں زندہ ہیں۔ اور جب تک علم ولولہ کی دنیا قائم ہے۔ وہ زندہ اور باقی ہیں۔ کیوں؟ وہ اس لئے کہ ان کی تخلیق کمالات زندہ ہیں۔ اور ان کی زندگی کا ثبوت ادب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کے خطوط کی روشنی میں لگائیں۔

"تمہ کو کہ نہیں ہو مگر ہو گئے ہو یہ بھی زندہ ہو۔"
صرف چند منٹ شریاں ہیں اور جن یادوں کی وابستگی کم و بیش ہلکے کی ذات سے ہے انہیں بچا کر لے کر کوشش ناکام کی گئی ہے۔

جیل کی شاعری کے سلسلے میں اس قدر عرض کرتے ہو مجبور ہوں کہ آپ کی ساری کی ساری شاعرانہ تخلیقات زلف وصال، حسن و عشق، ہجر وصال، رقیب و رازدان، محبت و نامح اور سادہ لائٹ بیگز نہیں وٹنی اور سلی و جنوں کے ذریعہ اور دنیا فاسی لغو و ات سے پاک اور بے نیاز ہیں۔ اور اگر ان کی مملکت شاعری میں آخرت پرانی کی یہ مملکت کا کہیں کہیں غفر یا یا بھی جاتا ہے، تو آپ نہیں جانتے کہ ان کی رہنمائی اور روحانی شاعری میں بھی لائق القاد صانع پرستیدہ پہنچا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا سارا خزانہ کلام مقامات و لہجہ کا ایک گراں قدر انبار ہے۔ خواہ مراثی ہوں، اس برس ہو، نظم ہو، قصاید ہوں یا قطعات و رباعیات یا مثنوی، ان کے افکار کے سمندر پلے پائے ہیں۔ یہ موقوف و منحصر ہے تشنگان علم ولولہ کے شانداروں پر کہ میں اور جس مقصد و نیت کے تحت خواہی ہوگی دیسا ہی موتی غور و فکر کے لئے دستیاب ہو سکے گا۔

اور کبھی موخر الذکر کا مضمین پر مبنی ہے میری بدشانسی کے خطوط مستقیم دینی کو پہنچایا اور میری تہزول اور پریشانیوں کا انہیں پورا پورا اندازہ ہو گیا چنانچہ مجھے داعی الجھن اندھن سے غمات دلانے کے لئے مساختہ ٹول اکٹھے میں "مجنوں" ہوں آپ گھبرائیں نہیں۔ ضرورت تو شاید اس کے بعد ہی تھی کہ سنگ اکٹھا یا جائے لیکن جب غائب تصور اذیت "سر" کے خوف سے باز رہے تو پھر میں یہ کیونکر جرأت ظفلاں اور ناعاقبت اندیش نہ کر سکتا تھا۔

۴ ہم نے مجنوں پر لڑکپن میں اس کے

سنگ اکٹھا یا تھا کہ سرسرا دیا

ہاں تو اول الذکر کچھ حضرت نگھوچی سہائے فراق گور کھجوری اور موخر الذکر جناب مجنوں گو کھجوری بر جھڑت علامہ جیل ظہری سے ملنے کے لئے ریتاب و پریشان تھے۔ دو گھنٹوں کے مشہد انتظار پر بھی علامہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان دو گھنٹوں کے اندر میں صرف ان لوگوں کی خاطر سکون بخش آپ سر سے کرتا رہا۔ اس لئے کہ انتظار کی دشواریں اور صبر کا گھڑیل تنج بھیانک اور مری خطرناک ہو کر رہی ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے جسے انکار ممکن نہیں کہ جو لطف انتظار میں حاصل ہے وہ قلیل کی کہاں نصیب ہو گا۔ یہ حضرت اپنی قیام گاہ کو واپس ہوئے۔ اور شاید بعد میں ملاقات ہوئی ہوگی۔ علامہ کی بہت ان کے کلامات کی بنا پر عام ہو چکی تھی۔ اور ان کی شاعری فقط عروج کو پہنچتی دکھائی دے رہی تھی۔ اور جس طور گرد و لولہ ناخاکہ مگور باغی اور انقلابی شاعر قاضی نندہ الاسلام اور تیسرے شاعر ناظر فطرت جیسے وقت کا دروازہ درختہ کہا جا تا تھا جس عزت و احترام سے نام لیا جاتا یا بعد اسی طور علامہ کا نام بھی پڑھ چکی زبان پر تھا۔

علامہ کا تعلق جہاں اور پرچوں رسائل اور تہذیب سے متعلق دہاں کلکتہ کے دو مشہور روزنامے قابل ذکر ہیں۔ عصر جدید اور ہند جدید۔ عصر جدید کے کرتا دھڑا مولانا شائق احمد غانی مرحوم تھے۔ اور ہند جدید کلکتہ کی زیر قند گاڑی مولانا عبدالرزاق بیچ باڈی چلا یا کرتے تھے۔ ان اخباروں میں علامہ کے منشور انکار عالیہ کو خاص مقام حاصل تھا۔

علامہ کبھی بھی مشاعروں کے شاعر نہ تھے۔ مشاعروں کی شرکت تو ضرور کرتے مگر سامعین کو اپنے کلام بلاغت نظام سے نوازنا نہیں کرتے۔ شاعر جس خوددار و ناک خراج مجبور دھات صفت ہوا کرتا ہے۔ مگر عجم عام میں ان کا کلام نشتا کے کا شاعر انہیں قرب انش کی حیثیت رکھتا ہے۔

کلکتہ میں اسلامیکا کا لا جکا نام یا بدل چکا ہے، ۱۱ سالہ دانشاگرہ مہر ستمبر ۱۳۵۷ء میں منعقد ہوئی آدیں موقع اہل کلکتہ کو حاصل ہوا ہنگامہ علامہ نے اپنی طرحی، طویل و دبیطرل پر بھی بھر طرہ پر تھا ع کے فرصت یہاں جو کام کرنا مقدر کرنا

علامہ جو مجمع عام میں اپنا کلام سننا نہیں کرتے بلکہ احتیاط پر مبنی کام لیتے کبھی بنگال کو بر خوش حالی تھی کہ عام کو بر نواز مقرر حاصل ہوا۔ مگر یہ ہر دور ہے کہ جس مجمع کو مجمع عام میں حل کر کے لئے چند احباب و اشخاص نے آمادہ اور مقرر کیا جن کے جذبات و احساسات کا ٹھکانا اسمیل صاحب خدائے سخن حضرت ایس کے اس شعری نوچرین سمجھتے تھے۔ ۵

خیال خاطر احباب یا چیت ہر دم

ایس تھیس رنگ جائے بگیوں کو

اہانت شعری سے داس سمجھتے اور چا تے علامہ نے اپنی معرفت لارا غزل پر مشاعرہ میں میں بقیس بقیس شریک تھا چو کھارو لٹری سوسائٹی اسلام کا لچ بونین کا ہنگامہ خیر اتالی مہر سر کرنے کے بعد میں سوسائٹی کا کنویر منتخب ہوا تھا اس لئے مشاعرہ کشیں میں بھی مجھے ایک مہر ہوئے کی حیثیت سے ایک ادبی مقام حاصل تھا۔ ہر دو شعری ادبی کے بعد علامہ کو آپ سر دوش کیا جاتا چو کھارو لٹری کی جانب مائل ہو جا یا کرتی اور ملی کو بھی مہر ہوئی بہر حال آپ نے اپنا بے پناہ کلام چھوا۔ واہ واہ اور خوب کے فلک شگاف کشیں نعرے بلند ہوئے۔ اور اہل علم ہوتا تھا کہ تھیں شگاف پوکر ارض بوسیاں کر رہی ہیں۔ نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بزرگانہ وقار لئے ہوئے صدر مشاعرہ وطنی بنگال علامہ سید رضا علی وحشت اور دیگر باسلیقہ شاعروں نے جیتل کو صبح واد کلام دی غلط داد اور بلا وجہ خاموشی کلام شاعر کے لئے ستم قابل ہیں۔ کیا خوب کہا ہے صائب نے ۵

صائب دچیزی سکنہ قدر شعر را

تحمین ناشناس رکوت سخن شناس۔

لیکن مجھ کو علامہ کے ہر مہر میں سکوت سخن شناس نام کی کوئی شے نہ ملے اور ان کھول کر دست نظری اور فزادلی سے کام لیتے ہوئے اساتذہ اور ارباب فہم و ذکا اور سخن شناسوں نے باطل واروں دیں۔

کلکتہ میں ایک انجمن، بزم احباب، کے نام سے موسم تھی۔ واقعی اس لئے کہ اب مجھے اس کے عدم وجود کی خبر نہیں۔ اس انجمن کو علامہ وحشت کی سرپرستی اور مرتبہ نگاہ میسر تھی۔ اور علامہ مظہری مرحوم بزرگوار واد اور قلب و جان تھے۔ ماہانہ یا ہفتہ وارانہ مجھے اب بھی یاد ہیں، حضرت وحشت کے عشرت کدہ پر اسکی نشست ہوا کرتی اور شعر و سخن کا لطیف و دلچسپ درگاہ شغل رہتا۔ ہاں خوب یاد آیا بیشت ہائی روشن By Rotation متفرق مقامات پر مختلف گھروں میں ہوا کرتی۔ علم ادب کے منتخب اور مخصوص افراد کی اس میں شرکت رہا کرتی۔ ان مخصوص میں حضرت مظہری۔ جناب آغا محمود شہر کشمیری کے سنے معانی بہر مہر سید طاہر رضوی، مصنف کتاب چرس میں آپ کی تعین ہے کہ پراسی

کتاب ہیں۔ Persia a People of the Book اس کا نظارہ

کپے ۲۷ اس وقت کیا جب کہ ایران میں فردوسی کی ہزار سال یادمانی جا رہی تھی اور اس اجتماع میں آپ خود بہ حیثیت جہان شریک تھے۔ بزرگوار محض المصطفیٰ جناب محمود طرزی میر علی، جناب حافظ اور جناب واصف بناریہ شاعرانہ علامہ دشت عاصف بنارس جنہیں جانشین دشت کا بھی افتخار حاصل تھا جناب عبدالعزیز مدنی استاد محترم عباس علی خان خود پڑ پڑ شاہدی اور جناب سید امیر رضا مظہری برادر خود واقعی علامہ بیتیں صاحب مظہری دفرہ زہنت بزم ہو کر آئے۔ طیار میں جہاں تک میر کی یاد میر اساتذہ دہلی پہ ہر فن نظیر جمیل ہر فن چھتہ صاحب کو بہ شرف حاصل تھا کہ وہ شریک بزم ہو کر آئے۔ قاضی بن دہلی نظیر جمیل ہیں جو آگے فارغ التحصیل ہونے کے بعد یمن میں ہندوستانی سفیر کے عہدہ پر مامور و ممتاز تھے۔ لیکن اسوس صد اسوس کزنہ گئے دفانی اور دوران ملازمت ہی میں وہ اللہ کو سپار ہو گئے۔ نظیر نجوم ہمارے ساتھیوں میں تھے۔ اور ہم دونوں نے ایک ساتھ میر کی کوشش کا امتحان دیا تھا جب اتفاق میں کامیاب ہوا اور وہ غیر متوقع طور پر ناکام رہے۔ نظیر نجوم نہایت ہی ذہین، ذکی، امس، عاقل، دولہا اور تیر طبع شاعر تھے۔ شاعری کا کچھ ایسا جنون تھا کہ نصائی یعنی کورس کی کتابوں سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتے اور بہت دور ہا کرتے۔ میں نے ایک روز ان سے یہ کہا کہ کیا امتحان کے دن بہت قریب ہیں، کچھ پڑھو اور غنت کرو جواب کے لئے ابی الہیہ بیچ نہ شرو ہو گئے جس کا ایک مصرعہ بھی یاد رہ گیا ہے۔

نظیر کچھ تو چھوٹ کر فروزی آئی

میری مجھے جواب ملا، میں نے برجستہ یہ کہا کہ شاعرانہ عقلی فی الحال چھوڑو مگر وہ کب یہ سننے یا سننے کو تیار تھے۔ تیسری ایک سال ان کا ضائع گیا چنانچہ انہیں کی دس طاقت سے بزم احباب میں شرکت کا مجھے دودھ و دینار حاصل ہوکا۔ واللہ کیا بزم تھی اور کیا لوگ تھے۔ اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ اتفاقاً محمودی بکریف ظرافت چنگے اور بچہ لطفافت جب کبھی بھی یاد آتے ہیں تو کھنسا چڑتا ہے کہ۔

کیوں آئے تھے اس جہاں میں جا نے کا

کاش یہ لوگ گل کے گل ہوتے اور بزم ہری بھری ہوتی۔ بیتیں صاحب کا حلقہ علامہ وسیع نوکیا، تنگ بلکہ تنگ تریوں کا گلے کے دوران قیام میں حضرت بیتیں عظیم آبادی مرحوم شہرہ معروف اساد گار اپنے کو بیتیں جمیل لکھا کرتے تھے۔ لیکن معلوم کن اسباب کی بنا پر یہ نسبت اضافی تھم ہوتی نظر آتی۔ ہاں اگر مرزا یاس عظیم آبادی مرزا گیارہ چنگیزی لکھنوی ہو سکتے ہیں تو حضرت بیتیں کے نام سے چنگی کی تالیف

کیوں گل استعجاب ہو کاش علامہ کا کوئی ایسا شاگرد ہوتا جو غریب جیل کے جانے کا مستحق ہوتا جہاں تک میر لڑائی میں اب لے دے کہ ایک سید محمد قاسم صاحب شیخی مودی ہیں جو قصبہ جمیل خود کو لکھا کرتے ہیں۔ اور اس اضافی نسبت سے حلقہ شہر میں وہ معروف ہیں۔ دوسری الحال تامل کوئی براستہ شائستہ رضا مظہری میری نگاہ میں نہیں جس کا نام پڑھ لکھا جاتے۔ قصبہ صاحب ایک متوسط العراور ہونا شاعر میں کاش ان کی شاعری کی بھر پور نشوونما علامہ کی حیات ہی میں یا تکمیل کو پہنچ گئی ہوتی۔ مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ کبھی بھی صاحب کو چھو کا خاکہ پائے نہیں ملے۔ اس لئے انکی ذات سے دنیا سے علم و ادب اور شاعری کی متعدد توقعات کی دالنگی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

گلکشت مہمل یا پاک میں ایک کانفرنس کا انعقاد ہوا یہ یاد نہیں آتا کہ کانفرنس صوبائی تھی یا قومی یا سندھ، آل انڈیا، اور یہی ہو کرتا ہوں کہ کانفرنس ایجوکیشن، تعلیم، تھی یا مخصوصی الدن کا کانفرنس بہر کیف کانفرنس میں نوعیت کی بھی رہی ہو اس میں ایک شاعر کا بھی خاصا نظم تھا اور مجلس استقبالیہ میں علامہ و در کسی حیثیت سے تھے۔ صحیح عہدہ مجھے یاد نہیں، لیکن آستانہ و در سکا ہوں کہ شاعر کی جان اور روح رواں علامہ ہی تھے۔ دونوں شاعر ایک دہانہ اور نشوونما صورت پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ نہایت عاقبت ان رضا کاروں کے غلط اور گمراہ کن رویوں کی بنا پر خانہ صاحب مولوی محمد حسن "ہارہ بکوی" جو گلکشت میں گلدس کی بکری تھے اور کانفرنس کے انتظامیہ اہلکار میں ایک رکن خاص بھی تھے علامہ سے کچھ نزاع لفظی اور لڑکھوئی ہو گئی۔ مگر چونکہ علامہ کی برادری ہی اس درجہ غالب تھی کہ عقیدہ تمدن اپنی جانیں بچھڑ گئے اور خیر اندیشان کا حلقہ ضرورت سے زاید وسیع تھا اس لئے انھوں نے فضا خوشگوار فضا میں تبدیل ہو گئی۔ شاعر میں مولانا یوسف فضل الرحمن جنت مولانی بھی جلوہ افروز شریف رہا تھے۔ صدر شاعر کو کون تھا اور نظامت کی کارکردگی کس کے سپرد تھی مجھے یاد نہیں۔ مولانا سے قربانیش کی گئی کہ اپنی غزل سنائیں، لیکن باوجود مسلسل اصرار کے مولانا بکرا انکار کرتے رہا کئے کہ یہاں ترنم سے پڑھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اور مجھے خوش گودی اور ترنم سے دور کا بھی لگاؤ نہیں اس لئے میرا چھٹا محبوب دسندیدہ نہیں ہوگا۔ مولانا کے انکار پر ہم سے سارے مجمع برادری دایو کی گٹھا چھائی۔ اور قریب تھا گلچ کی کثرت تحت کارنگ اختیار کرے یہ رنگ مغل دیکھتے ہوئے علامہ نے اپنے انداز خاص میں مولانا سے التماس کی کہ وہ اپنے کام سے شائقین و سامعین کو مستفیض و خوشنود فرمائیں علامہ کے اصرار پر مولانا آمادہ ہو گئے۔ اور اپنی غزل سنائی اس وقت مجھے اس کا احساس ہوا کہ حسرت کس درجہ علامہ کو غریب رکھتے تھے۔ اور ان کے دل میں علامہ کا ایسا مقام تھا۔ مگر میرا چھٹا پیرانہ سالی کا اور اس

بقیہ : جمیل بھٹیا

جمیل کو سمن ٹھہرایا جاتا اور قابل داد۔
ایک دوپہر حسب معمول غزل خوانی ہو رہی تھی۔ میں نے یہ شعر

پڑھا

کبھی خدا کی تمنا کبھی تون کی تلاش
خیال ہی چھپسا بندے جدھر گزرتے
انکشت شہادت سے آپ نے رگے کا اشارہ کیا۔ کچلے سے شعر
نگینا یا اور فرمایا۔ پہلا مصرع اگر یوں ہو تو کس پار ہے - ۴
کبھی تون کی تمنا کبھی خدا کی تلاش

میں نے جھک کر سلام کیا اور مصرع فرمودے کے مطابق بنا
دیا۔ آپ کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ تلاش کی موجودہ صورت استعمال
کے حق میں آپ نے فوراً میرے ایک شعر سے سند چاہی فرمادی۔
تلاش حق میں نہ دنیا کو چھوڑے ناہد
کہیں کا بھی نہ رہے گا اگر خدا نہ ملا
اصلاح دینے کا کمال حسین طریقہ کہ اصلاح بھی ہو جائے
اور متعلقہ شاعر کو احساس کثرت بھی نہ ہونے پائے۔

ہاں تو یہ تھے میرے کرم فرما میرے حسن جناب جمیل نظمہ سری
انصاف سے کہیے کہ ایسے صاحب استعداد بہرہ بان کی بدائی دل میں
کیونکر چشکیاں نہ لے اور اس کی یاد سے ہر مرتبہ ہوں کیوں کرتا اٹھے۔
میں کہ یہ سطور باندہ قرطاس کر رہا ہوں۔ میرے خیال و خواب
میں بسنے کے باوجود۔ ادبی حیثیت سے اب نہ اقلے جمیل باقی ہیں اور
نہ میری رانی بی بی دوبا۔ میں سوچتا ہوں کہ ہر مفع فیض اور معدن علم
و دانش کو مٹی ہی میں مل جانا ہے تو فیض و دانش کی کیا وقعت ہے اور
اس کے حصول میں صعوبتیں برداشت کرنا کس درجہ پر معنی۔ ایسا
سوچنا شاید میری پردیش خیالی کے باعث ہو کہ خود ۷۲ کے لپٹے میں
ہوں اور ہر سرا اور یوں کہ نے ہاتھ میں غنائ ہے نہ پائے رکاب
میں۔ یہ سب اپنی جگہ برحق ہے مگر یہ بھی تو برحق ہے۔

ہر شام ہوتی کچل کو خواب فراموش
دنیا دیکھ دینا ہے تو کیا یاد رہے گی



ہر فراموش ذہین کا گھزل کے اشارہ تو کیا ایک مصرع بھی اب دماغ میں محفوظ نہیں
صرف اس قدر ضروریادہ کہ کم لوگ بہت محفوظ و مسرور ہوتے۔ اور صبح و شام
مولانا کو علامہ مرحوم اور دیگر اساتذہ اور شریکائے مشاعرہ سے ملتی رہی۔

علامہ میر تقی میر نے کھوئے عالم بخوری اور استغراق میں رہا کرتے۔ کھلتے
کی زندگی میں ان کا تہہ پاب رہ جانا ہم لوگوں کو اور عقیدہ مندوں کو بخوشی گوارا دیتا
لیکن وہ ہم لوگوں کے قصورت اور خیالات کے قیدی نہیں تھے۔ اس لئے کہ شاعر
فطرتاً آزاد مشہور کرتا ہے۔ پھر وہ کیوں ہم لوگوں کی ذہنی طور پر عامگی ہوئی
پابندوں پر مشتمل ہوتے۔ ان کے تہہ پاب رہا ہے پر برآں اس کا دھوکا اور دلہیز
رہتا کہ ہمیں علامہ کی بخوری مشغول شاہراہوں اور سڑکوں کے شمس نظر کوئی
بسیا تک رنگ نہ اختیار کرے۔ مگر اللہ نے تادم مرگ ایسے توہمات و ہشامات اور
غلط توقعات سے محفوظ رکھا۔

جمیل فطرتاً نازک مزاج اور رفیق القلب تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عزیزان
اور فیاض مزاج پایا تھا۔ مزاج میں انتہا پرہیزگاری، سادگی، نام و نمود سے ہمیشہ
کاہ اور مستور رہے۔ بے شاہ شاعرانہ صفات و کمالات کے بھی اپنے کمال پر غصہ مند
رعوت اور غرور نہ تھا۔ جمیل انکسار و اخلاص کا جتنا جاگتا مجسمہ تھے۔ شاعروں
کی شاعرانہ تعلیمات مشہور ہیں۔ مگر شاعرانہ تعلقی سے بھی کوسوں دور رہ گئے۔
لیکن انہیں ہر جہ سے گواہی دے رہا تھا کہ یاد دیکھنے کا شدید حوصلہ تھا۔ اور بھول
ہوش عظیم آبادی۔

بڑا نہیں جو اپنا نشان کھڑا کر دے

بڑا دی ہے جو چھوٹوں کو بھی ڈر کر دے

ہوش کا شہر جمیل کے مزاج کی بھر پور عکاس کرتا نظر آ رہا ہے۔ اگر
امام بخش تاج سے بے مبادیہ و گون کو اپنا کلام بخش کر بلند کیا، تو جمیل علامہ فیض
دوسروں کو صاحب دیوان بنانے کی تحریک دیوانہ اور شب و روز غلط پوچھنا
رہا کہ۔ کتنے شاعر اور ادیبوں نے شاعر بنایا دیکھو کہ وہ عجب دوتے..... شاعر
بنادیا۔ لیکن جانیں کتنے دیں۔ کتنیوں میں۔ ان کی عزت و تہہ پاب رہی مگر آج جمیل کے ناموش
فیاضانہ اور غیر انداز عمل کے سبب انہیں اور دوسروں پر نمایاں نظر آ رہے ہیں۔
مگر اب اس تخلیق فیکٹری میں غفلت بڑھانے کے بعد ان لوگوں کا شکر کیا ہو گا۔
جو اس فیکٹری کے تیار شدہ مال سے مستفید و مستفیض ہو رہے تھے۔ دوسروں
کے دم کرم اور بے لوث فیاضیوں پر کاغذ کی ناؤ کب تک چل سکی ہے۔

لوگوں کو بڑا بنانے کی تحریک میں علامہ کو سخت جالفتا ہوں جو پار ہونا
پڑا۔ اور خیر صرف یہ نکلے گا کہ ان کا حکیمانہ کلام جو فیاضیوں کی نذر نہ
ہو سکا۔ صرف وہی کلام زندہ ہے۔ اور یقیناً زندہ رہے گا۔





جیل نظری کی شخصیت

ادساری زمداری جیل صاحب کے ذمہ تھی۔ پڑھشی عظیم آباد میں کئی لکھنوی تھیں۔ جو کتب اور گھڑیا برادری۔ جیل صاحب کی رکن تھے۔ نواب زادہ مہدی، نواب علی سہا، مین صاحب، خاکسار، حامد منیر صاحب صدھگی، پرویز شاہری، ابھنی رضوی، سرزمین عظیم آباد و کاتھیاگرامز اور ہلار میں کیسے کیسے میلے، آشتی سرال باوقار اور آسان ادب کے چاند ستارے آسودہ خاٹ ہیں۔

جوڑہ یہاں سے اٹھتے دہ خستہ باباں ہوتا ہے جیل نظری صاحب سے مری قریب کی رشتہ داری تھی۔ اس رشتہ داری کو میں نے تو بھایا گر ان کی طرف سے کچھ چوک ہوتی تھی جیل نظری کا آبائی وطن ضلع سیلون، جو کبھی پھیرو کاسب ڈوئرن تھا اس کا وہاں حسن پور نامی تھا۔ ان کی میلانیں ان کی نانیال محلہ منسل پورہ پڑھشی محلہ عین ہوئی۔ دواج زمانہ کے مطابق تعلیم کا آغاز گھر ہی پر ہوا۔ فارسی اور اردو کی اچھی استعداد پیدا کر لی۔ میٹرک مظفر پور سے کامیاب کیا اس کے بعد کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ اور کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کیا آشتی میں نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی لیکن مزاجاً وہ غزل گو تھے۔ اچھی اور کامیاب غزلیں کہنا آسان نہیں۔ بڑی محنت اور کوشش کی ضرورت ہے۔ شاعروں کے تین درجے ہیں۔ شاعر، کاریگر اور مترکاری گروہ جو صرف دلیف و توانی سے کہیے۔

جیل نظری کی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گذرا۔ عورتوں ہی عرصہ میں اردو کے مشہور و معروف شاعر ہو گئے۔ کلکتہ کے اخباروں اور رسائی سے بھی وابستہ رہے۔ جیل نظری صاحب مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی قریب رہے۔ ان دونوں مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ میں عید کی نمازیں پڑھتے تھے۔ اور قیام بھی زیادہ تر کلکتہ میں ہی رہا کرتا تھا۔ مولانا ظفر

میانہ قدر، جوانی میں گھٹا جسم، سڈول بازو، گندمی رنگ۔ آخر عمر میں رنگ صاف ہو گیا تھا۔ شیر کو کھاتے تھے۔ لیکن پوچھ پچھنی سے ترشی ہوتی کہتے تھے جیسے گلین کشیو ہوں۔ پھر اجواد مکا ہوا چہرہ۔ ستوال ٹاک، بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ کبھی کبھی دھبے بھی لگاتے تھے۔ متوسط دہانہ پتلے نوٹ، نوچھے بڑے کان۔ ایک کان کی ٹوہدی ہوتی، چمکی پیشانی، سر پر برستے نام انگریزی بال۔ سنی اور کھچی گردن۔ پانچا ماراد شیروانی میں ملبوس۔ ننگے سر پہی نہیں رہے۔ صبح و شام کے علاوہ کئی مرتبہ جاتے بیٹے تھے۔ گھٹیا سکرٹ بڑی کثرت سے پہنتے تھے۔ نمبر پانی بھی کھاتے تھے۔ عبادت گزار نہ تھے اور دوسرے ذرائع سے بھی آزاد، لیکن کہیں جانا چاہا، کوئی کام کرنا چاہا، کوئی سفر درپیش ہو تو استعارہ ضرور کرتے تھے۔ کھانے کے بہت شوقین تھے۔ عموماً کوئی ساٹھ کی ہوگی پھر بھی مرغ و ماہی اور ذرا کھاتے۔ صبح سویرے اٹے چوتے اٹھتے ضرور کھاتے۔ میں کبھی کبھی ایسی غذا کھانے سے منع کرتا مگر وہ سننے کب تھے۔ عموماً آخری دور میں اپنے والد مولوی خورشید حسن صاحب بریل مولوی ضلع اسکول مظفر پور کے بہت مشابہ ہو گئے تھے۔ حضرت جیل نظری کے والد بڑے قادر الکلام اور ذوق شاعر تھے۔ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ اب ایسے لوگ کیوں پیدا نہیں ہوتے۔

جیل نظری صاحب خان بہادر ڈپٹی سید احمد علی خاں کے پڑھشی محقق صحابہ تھے اور خان بہادر سید علی خاں ایڈیٹر کٹ اور ڈاکٹر سید مصطفیٰ علی خاں کے حقیقی چھوٹی زاد بھائی۔ ایک بھائی رضا نظری صاحب ہیں جو مستقل کلکتہ میں رہتے ہیں، ایک چھوٹی بہن رابعہ عین جو جوانی میں بیوہ ہو گئیں تھیں۔ ان کے دو لڑکوں کی تعلیم و تربیت

صاحب ملیح آبادی مولانا آزاد کے دوست، رفیق خاص اور ممتاز الیہ تھے۔ جمیل مظہری صاحب بھی کبھی کبھی مولانا سے ملاقات کی غرض سے حاضری دیا کرتے تھے۔

ابتدا میں خان بہادر رضا علی وحشت کے حلقہ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد جب وحشت صاحب مشرقی پاکستان ڈھاکہ چلے گئے تو جمیل صاحب کا تعلق بھی تم ہو گیا۔ پھر حضرت جمیل مظہری نے کسی سے بھی مشورہ نہ کیا۔ قدرت فیاض نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جان بخشی اور فطرت نے رہبری کی۔ اب اردو زبان کے شاعر ہندوستان بن گئے اور سارے ہندوستان کی ادبی دنیا میں عزت و احترام سے دیکھے جانے لگے۔

گلزار ترک کر کے مستقل طور پر پٹنہ آگئے اور محکمہ اطلاعات میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہوئے۔ پھر ہندوستان چھوڑ دی کی تحریک میں جیل گئے۔ مگر ان کا کھانا نہ اناشتہ، سگریٹ جانے اور پان ان کے مامول زاد بھائی خان بہادر سید علی خاں ایڈووکیٹ کے یہاں سے جایا کرنا تھا جو اس وقت جمال دؤیر رہتے تھے۔

پھر رہا ہوئے تو چند مہینوں کے بعد مشرقی ایل بنی سنگھ آئی سی ایس چیف سیکریٹری بہار کی کوششوں سے شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور آخر وقت تک پٹنہ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر اختر انور نبوی صدر شعبہ اردو تھے۔ ڈاکٹر اختر انور نبوی جمیل صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔

جمیل مظہری صاحب کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں فکر جمیل، نقش جمیل، شکست و فوج، جہنم سے، مثنوی اور دوسری کتابیں شائع ہوئیں۔ غالب الہدی دہلی نے ان کی شاعرانہ عظمتوں کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا۔

جمیل مظہری صاحب یوں تو نظم، غزل، مثنوی، منقبت، قصائد اور رباعی وغیرہ جیسے اصناف سخن میں کامیاب طبع آزمائی کی، لیکن بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحبی گدھ مولانا ناز فتحپوری ایڈیٹر نگار، لکھنؤ اور فرخانی گوکھپوری نے غزل کو شعاری کی آبرو دکھایا۔

جمیل مظہری زندگی بھر غزل کے گیسو سنوارتے رہے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ نظم کوئی پریمی قدرت رکھتے تھے۔ میں نے جوش ملیح آبادی کو جمیل مظہری کا بڑا مداح پایا۔ مجھ سے اکثر جوش صاحب جمیل صاحب کا ذکر کرتے کرتے شاعرانہ فانیس کیا کرتے تھے۔ جمیل مظہری صاحب ملک کے بڑے اہم شعرا میں تھے۔ انھوں نے اچھے سے اچھی معیاری اور

آج کل نئی دہلی

کامیاب شاعری پیش کی۔ قدرت فیاض ان کو کچھ دنوں اور زندہ رکھتی تو نہ جانے دنیائے شاعری میں کتنے مفید اضافے ہوتے۔

جمیل مظہری حافظ سدی، قرنی، نظیری، غالب، میر شاد عظیم آبادی وغیرہ شائستگی کے بڑے گرد و رہے تھے۔ جمیل مظہری ایک عظیم غزل گو تھے۔ غزل کوئی فارسی اور اردو شاعری کی ابرو ہے۔ غار سی غزل گوئی میں سوز و ساز کا کھانا غار سی شمار کیے ہیں کہ ان کا بڑا سے بڑا ادیب ترجمہ کرے تو شعری روح سنہو جاتی ہے جیسے ۔

شکر ایزد کو میان من او صلیح فساد
خوریان قص کتال ساغر شکرانہ زوند

لیکن شاعری کے اہم مقاصد ایسے ہیں جن کے لیے غزل سے زیادہ نظمیں موزوں اور کارآمد ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں، علامہ سر محمد اقبال، میراجیس، دیوانہ علی چکیت، انجیل میرٹھی، خواجہ الطاف حسین حالی کی سندس حضرت شبلی نعمانی، سرہر جہاں آبادی اور نسیم کی شاعری۔ یہ چند مثالیں ہیں جن کے لیے غزل کوئی مناسب ذریعہ اظہار نہیں ہو سکتی۔ یہی عالم جمیل مظہری کی شاعری کا ہے لیکن غزل معنویت، تاثیر، اشارت کا علامہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہمگیر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کوئی شاعر غزل اور نظم دونوں میں کامیاب ہے تو اس کی غزل کوئی زیادہ مقبول ہوگی۔

حالات انبساط اور نظم و انضام میں یا انتہائی میں کوئی آدمی مقبول سے مقبول نظم کو لے کر نہیں پڑتا اور نہ کوئی کامیاب موسیقار شاعری کی نظم لے کر گائے اور نہ ہنگام دین کے غرضوں میں کوئی مشہور قوال نظم گائے۔ میں نے تو حضرت امیر خسرو، حضرت جامی، حضرت حافظ حضرت قزو اور حضرت نوح تو حید کی غزلیں گائے ہوئے سنا ہے۔

جمیل مظہری نے غزل کوئی گوا ایک نیا مزاج ایک نیا آہنگ بننا ہے اور غزل کی دہائیوں کو ایک نئی سہتی دی ہے۔ لیکن شاد عظیم آبادی آتشی غازی پوری، عزیز لکھنوی، قانی بدایونی، حسرت موہانی، انصاری وغیرہ اور دیگر مراد آبادی کی غزلوں میں ایک نئی آواز سنائی دینے لگی۔ اسی آواز سے جمیل صاحب بھی شاعر بنے۔ ان تمام حضرات کی اور جمیل صاحب کی غزلیں سن کر اردو دوستوں نے سمجھا ج

گوا یہ بھی میر سے دل میں ہے
جمیل مظہری کی غزلوں میں تیر، غالب، آتش اور شاد کی جھلکیاں کہیں کہیں ضرور نظر آئیں گی۔ لیکن زیادہ تو جمیل مظہری کی غزلوں اور نظموں میں اپنے خود حال ہیں اور جن کے صومسات و خیالات

کی ایک الگ شخصیت بن گئی ہے۔ عالمی ادب اور عالمی فکر و خیال کے تاثرات اُن کی شاعری میں ہیں یا انہیں یہ الگ مسئلہ ہے اور تفصیل کی ضرورت ہے۔ لیکن جہاں ایسا احساسات کے اظہار میں خلوص کے برتنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بہت کامیاب ہیں۔

علم عروض کی واقفیت کامیاب شاعری کے لیے بحد ضروری ہے لیکن ماہر جتنا کوئی ضروری نہیں۔ مزاج عروض سے واقفیت یا موزونیت کی معنویت زیادہ اہم ہیں اس اعتبار سے بھی جمیل منظری آگے تھے۔ لیکن کوئی بڑا شاعر صرف عروضی بن کر کامیاب نہیں ہوتا۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھ سے اپنے اس کہے کہ خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ دارغ دولی، امیر متنبائی، جلال کھنوی کی شاعری خسارتی صورتات کے اعتبار سے اپنی الگ شان رکھتی ہے لیکن حیرت و غائب کے سانچے کو خود داخل زندگی دے رکھی ہے۔ وہ دارغ اور غائب کی شاعری کو دو مختلف دنیاؤں کی شاعری بنا دی ہے۔

۱۹۱۹ء کے بعد جمیل منظری کا کلام ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوا۔ ان میں غزلیں بھی تھیں اور نظمیں بھی۔ جمیل منظری کے بعض نثری مضامین بھی شائع ہوئے۔

جمیل منظری کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ایک دارغ و مزاج اور کھوئے ہوئے انسان تھے۔ مگر میرے تجربہ اور مشاہدے کی بنا پر یہ غلط ہے۔ وہ اپنے کاموں میں بہت ہوشیار تھے۔ دیوانہ بکار خوش ہوشیار زندگی کے کشیدہ و فراز کو خوب سمجھتے تھے اور کبھی کبھی وہ اپنی آشفستہ سری کا بھی مظاہر کرتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے منسلک کرتے تھے خصوصاً سر دیوں میں عقل کے نام سے گھبراتے تھے۔ اُن کے رہائشی کمرہ کا سرورمان بے قریب اور منتشر رہتا۔ ویسے آدمی بہت ہنسار اور خوش اخلاق تھے۔ اپنا کرایہ کا مکان دوسرے کو دے کر خود ٹھیکوں کا شکار ہوئے۔ اور اپنے فحش احباب کے یہاں رہنے لگے۔

انھوں نے ایضاً صاحب مرحوم ایڈووکیٹ، سید عبدالعزیز ایڈووکیٹ صدر کل، سید حسین احمد مرحوم صدر کل اور دوسرے احباب اور آخر میں پروفسر غفر شہیدی کے یہاں بھی قیام کیا۔ اولیغنا میں زاد بھائی ڈاکٹر سید مصدق علی خاں کے یہاں بھی رہے۔ اکثر حضرات نے جمیل منظری سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ان فائدہ اٹھانے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ ان میں کئی مشہور شاعر ایسے بھی ہیں جن کو جمیل صاحب کلمہ کر دیا کرتے تھے۔ شام گردی و استاد سی سے وہ بظاہر زیادہ گھبراتے تھے۔ مولے اس کے کہ شام گردوں کو چند غلطیوں سے آگاہ کر دیا جائے کوئی بڑا بیوقوف نہیں سمجھتا۔ کیونکہ بڑے سے بڑے شاعر کی شام گردی سے

کوئی بڑا شاعر میرا نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال تو اس کے بڑے مخالف تھے۔ علی اعتبار سے بتانا علامہ سر محمد اقبال استادی شاگردی کے مخالف تھے اُنما تو ہندوستان کا کوئی شاعر مخالف نہ تھا۔ جیسے فانی بریلوی، مولانا حسرت موہانی، امیر گوشتوی، جگر مراد آبادی، سائل دلہری، رفیع دولہی، جوش ملیح آبادی وغیرہ۔ علامہ اقبال اُن دنوں میکلوڈ روڈ پر ایک مشرقی وضع کی کراچی کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ اسی مکان میں شاعر مشرق سے دوسرے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی ان دنوں یہ روڈ سینما روڈ کے نام سے مشہور تھی اور علامہ اقبال نے اپنا مکان خوالیا تھا جو پنجاب اسمبلی کے قریب تھا۔ مجھے ایک خطیں بھی یہ بات اور شاد فرمائی تھی۔ وہ انگریزی اعلیٰ درجہ کی جانتے تھے اور نہایت ہی عالمانہ انداز میں گفتگو فرماتے تھے۔ وہ نہایت بااعتماد، مخیر اور مہمان نواز تھے۔ بڑے خود دار اور فیور۔

جمیل منظری صاحب خوش لباس نہیں تھے۔ خوش خوراک مفرد تھے اور مرغ و اہی کے بڑے شوقین۔ میں ذرا کتنا کباب آپ کی عمر ایسی نہیں رہی کہ آپ مرغ و اہی اور اڑنے وغیرہ شہرت سے کھائیں۔ وہ اکثر بلڈ پریشر کے مریض بھی رہتے مگر باز نہیں آتے۔ طبیعت میں قدیم لاابالی پن ضرور تھا۔ لوگوں کی، احباب کی موت سے گھبراتے بہت تھے۔ ایوب صاحب جیسا مخلص دوست مر گیا لیکن جمیل صاحب وہاں نہیں تھے۔ ایجنٹی رضوی صاحب میرا خط لکھ کر درجہ بھگت سے پہنچے اور مجھ سے پٹ کر رازار دھار لے گئے۔ جمیل صاحب صمیمیتوں پر جان دیتے تھے۔ جمیل صاحب کی وضع داری بھی خوب تھی۔ ایک کے یہاں جاتے تو وہیں قریب میں دوسرے کو بھول جاتے تھے۔ گفتگو کرنے میں ماہر تھے۔ جمیل صاحب کے بے تکلف دوستوں میں پروفسر ایجنٹی رضوی، سید اکرام حسین پرویز شاہدی تھے۔ ایجنٹی رضوی صاحب اور جمیل صاحب میں جھگڑے بھی ہوتے تھے۔

کلکتہ کے قیام میں ایک ہی کمرہ میں تین دوست، رفیق، اور بڑے شاعر راکر تھے۔ جمیل منظری، پرویز شاہدی اور سید ایجنٹی رضوی۔ میں ان کو تنگدیم یا تپیلٹ کہا کرتا تھا۔ پرویز شاہدی اور ایجنٹی رضوی تو میرے بے تکلف دوست تھے مگر جمیل منظری صاحب سے عمداً بے تکلف نہیں ہوتا چونکہ اُن سے میری قربت تھی اور وہ رشتے میں میرے چچا ہوتے تھے۔ جمیل صاحب زیادہ لطیفے سناتے اور سنتے۔ وہ زیادہ تر جاسوسی دنیا اور اس قسم کے دوسرے ناول پڑھتے تھے۔ وہ بزدل آدمی تھے۔ معمولی ریمارسی سے گھبرا جاتے تھے اور فرماتے کباب مر جاؤں گا۔ (باقی صفحہ ۳۳ پر)

جمیل منظری کا نظریہ حیات

ان کی مثنوی "آب و سراب" کے آئینہ میں

اب تک محض سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ بہتوں نے اس مثنوی کے بعض مباحث کو اجماع و تعبیر کیا اور اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ لیکن حقیقت میں یہ مثنوی مذہب کی حقیقی روح اور عبادت اور خدا پرستی کے صحیح مفہوم کی قرآن مجید کی تعلیمات اور نفسیاتی حقائق کی روشنی میں ترجمانی کرتی ہے اور ان کو ذریعوں اور معالطوں کی پردہ دہی کرتی ہے جو محض رسمی اور ایک حد تک مستند و مذہبی تصورات و عمل کے پیچھے بروئے کار ہیں۔

مثنوی کا آغاز شاعر اسی نقشہ کا ہی کے بیان سے کرتا ہے، جس کا سارا عالم شکار ہے۔ اس ننگی کو بھانے کے لئے جن وسائل کا آج چلن ہے، ان سب کی حقیقت سراب کی ہے۔ آدمی نے اپنی تخلیق کی غرض و غایت کو فراموش کر کے اپنی انسانی طاقتوں سے انھیں موندلی ہیں جن کی تحریک جاری ہے اور جو اپنے اظہار کے لئے مضطرب ہیں۔ لیکن بارے اظہار نہ پا کر ایک مستقل تشنگی وہ اضطراب کی صورت میں اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہیں۔ شاعر اس مثنوی میں تحقیق کے راز و سرسے کی مفہور نشانی کر کے اس تشنگی کا می کے ملاو کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرتا ہے۔

باری تعالیٰ نے جب آدمی کا ہولناکیا کیا تو اس میں اپنی روح چھوٹی : فاذا صوّتہ و نغمت فیہ من دوحی۔ یعنی انسان کو اپنے اوصاف کی جھلکوں کی کے امکانات سے نوازا، اسے الوہیت بخشی۔

پانی میں جھلکے آگ کی روح
مٹی میں سموئے آگ کی روح
ہر یکہ جمعیت دل بنا یا
تم چونک اٹھے جوں بنا یا
چونکا کے الوہیت عطا کی
رومانی کی ہر صفت عطا کی

رب العزت کے عہد اوصاف میں جس وصف کے کرشمے سب سے زیادہ اظہار میں آئے ہیں وہ اس کا افسانہ ہے۔ اس کا ارادہ دل ہے۔ وہ ہر ممکن کو ناممکن اور ناممکن کو ممکن بنانے پر قادر ہے۔ خدا جو پاتا ہے وہ ہی ان جو جاتا ہے۔ کئی ذی کوئی خدا نے لایزال نے اپنی ساری کائنات

جمیل منظری روایتی غزل کے شاعر نہیں تھے۔ وہ ایک فکری شاعر تھے۔ ان کی شعری تخلیقات قاری کو دعوت فکر و نظریہ ہیں۔ ایک فکری شاعر اپنا ایک نظریہ حیات رکھتا ہے۔ وہ اس عالم کون و فساد کو اپنی ایک مخصوص نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری اس نظریہ کی فن کارانہ ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا نظریہ حیات، اس کی تخلیقات میں ایک ربط پیدا کرتا ہے، جس کی بنیاد پر قاری کو مثبت نتیجے اخذ کر کے اس کے نظریے کو رد یا قبول کرتا ہے۔ جمیل منظری کا مثبت ایک فکری شاعر کے مطالعہ کرنے والا عالم پر بالورسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان کے اندر منتشر تصورات و افکار کے چین و چین مرتبے آئے وہیں مڑوے آتے ہیں، لیکن ان میں اس کے مربوط و متعین فلسفہ حیات کے نشان نہیں ملتے۔ آئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمیل منظری تشلیک کے آئینے میں جھٹکتے رہے۔ ان کا قدم اس سے آگے بڑھ کر کہ فی نفسہ حیات مرتب نہ کر سکا۔ لیکن جب ہم ان کی مثنوی "آب و سراب" کا یہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں ایک مربوط و متعین فلسفہ حیات کی پیشکش صاف نظر آتی ہے۔ اس میں بھی ہمیں کچھ اچھا تو سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن وہ ہمیں جھٹکا نہیں دیتے۔ مثنوی کی ابتداء سے تقریباً اس کی انتہا تک جمیل منظری کے نظریہ حیات کا ایک مربوط خاکہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔

حقیقت میں اگر اب ذوق نے اس مثنوی کو وہ توجہ نہیں دی، جس کی یہ مستحق ہے۔ اس مثنوی میں انسان کی ذات، اس کے امکانات اور اس کی کوتاہیاں، اس کائنات سے اس کا تعلق، انسان کی تخلیق سے مشیت الہیہ کے مطالعات، آدمی اور خدا کا رشتہ، مذہب اور خدا پرستی ان ساری حقیقتوں کے سلسلے میں جو نکات شاعر نے ظہور کئے ہیں، ان کا شاید

میں صرف انسان کو اپنے اس وصف سے مزین کیا ہے۔ اُسے اختیار کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اُسے اپنے وجود کو دنیا کی ہر طاقت پر حاوی رکھنے کی قدرت بخشی ہے۔

مقصود یہ تھا کہ یہ فضل باری آجائے تہیں خود اختیاری قدرت سے دوز سے دور تم اپنی مرضی سے کچھ کرو تم پیدا ہوا شعور میں ارادہ خود شوق بنائے اپنا جادہ آدم کی تخلیق کے بعد باری تعالیٰ نے اُنہیں غلہ میں اپنی آزادی، ارادہ و عمل کو بروئے کار لانے کی تربیت دی۔

جوئی رہی تربیت تمہاری منظور تھی تربیت تمہاری جنت ہو امدرسہ تمہارا دیتا تھا خدا سینہ تمہارا جب تربیت کا مرحلہ طے ہو گیا تو اس کی آزمائش کے لئے آدم کو شجر ممنوعہ کے قریب جانے سے روک دیا گیا۔

پوری ہوئی جب کہ یہ بڑھائی منزل تب امتحان کی آئی سکھلا کے تمہارے خیر و شر کی نشانوں کو دکھائے اک شجر کی فرمان ہوا کہ تم ہو دانا دیکھو آدم اُدھرنے جانا اس مقام پر شاعر نے ایک ایسا نکتہ پیش کیا ہے جس سے آدم کا غلہ سے نکلنے میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے گو اقبال نے بھی اپنے اس شعر میں:

بارغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا بہت اکوئیں

کا رجاہاں دراز ہے اب ہر انظار کر

اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شیت ایزدی کا تقاضا یہ بہت کہ آدم ارشاد ایزدی کی بجا آوری کے غلہ میں اپنا مسکن بنائے رکھیں۔ بلکہ اس کی خلاف ورزی کر کے وہ خود کو اللہ کے نائب بننے کے مستحق ثابت کریں

دل پر یہ ممانعت تھی تمہاری بے چین ہوئی خودی تمہاری بے ساختہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا تخلیق کا حوصلہ نکالا آدم اپنے اختیار کا استعمال کر کے امتحان میں پورے اُترے۔ خدانے انہیں اپنے خلیفہ کے منصب سے سرفراز کر کے اس عالم وجود کی حکمرانی سپرد کی۔ اِنْ قَالُوا رَبَّنَا اِنَّا اِلٰھِیْنِ خَلِیْفَہُ

یہ بات نہ تھی خدا کو منظور مختار کا جانشین ہو مجبور مجبوری ہمارا کی صفت ہے مجبوری دلیل قدسیت ہے مجبوری ہے فرض کی وہ زنجیر وابستہ ہے جس سے بزم تقدیر جس کے مخلوق میں عاجزانہ جکڑا ہے یہ سارا کارخانہ قدرت اسی کے لئے تھی لازم

آدم جنت سے بے اہر ہو کر تہیں نکلے بلکہ سر پر دستا بر فضیلت بانڈھ کر جنت سے رخصت کئے گئے۔

یا جاہ و جلال شہسہ باری شہزادہ حُسد کی سواری اس مشرب و گل میں پہنچی۔

آدم کو یہ مرتبہ اس آزمائش میں کامیاب ہونے پر سنایا گیا، جس کی انہیں جنت میں تربیت دی گئی تھی

انعام گناہ و بے گناہی رکھا گیا سر پہ تاج شہساری سمجھا کے روز راہ۔ بیسی پہننا کے تباہے جان شہساری بھیجا گیا تم کو اس جہاں میں آنے لگا رنگ داستان میں شاعر کہتا ہے کہ اس نکتہ کو وہ خود بھی پہلے نہیں سمجھ پایا تھا۔

حیران ہیں فرشتگان درگاہ میں سوچ رہا ہوں یہ سر راہ یہ کیا کہ گشت اور لغات ہو وچہ بزرگی اور فضیلت آدمی اپنے اختیار کا استعمال کر کے اس عالم کو جنت ارضی بنانے میں مشغول ہو گیا۔

ہو نہکا جو شعور حکمرانی کی فرض نے روح پر گرانی ہر آرزو میں گئی ارا دہ و جہان عمل ہوا زیا دہ ہوا رکھا زمین کا سینہ مٹی نے اگل دیا دُسنینہ کبسا بر رنج کو بھی ناپا صحرائے وسیع کو بھی ناپا پہنائی دور کو بھی ناپا دریا کے غرور کو بھی روندنا سینوں کو بہا کر کے کیا چاک سیلاب کے موندہ میں جھونکی کی تاک دیرانے میں باغ لہلہائے خلعت پہ چسپراغ اسکرانے

جب آدمی نے اس کرۂ خاک کی تقدیر بدلنے کی خود اختیار مہم شروع کر دی تو اس خلفشار سے سارے عناصرِ خاکی لرزہ برآمد ہو گئے مادے کی ماری کائنات بے گناہت پر کمر بستہ ہو گئی۔ اور آدمی کے مادی وجود سے سازش کر کے اسے مصالحت پر مجبور کر دیا۔ اسی دم آدمی کی خود اختیار ماری پر ایک روک لگ گئی۔ اس کی خودی اس راہ سے جھٹک گئی۔ جو اسے اس کائنات کی جہاں بانی کی منزل کی طرف لے جا رہی تھی۔

غلبہ کسب تم پہ مادے نے گھبرا کے تمہارے حوصلے نے تھوڑا دیا سر کو مصیبت کر لی مجبوری کی لغت اپنے سر کی نتیجہ یہ ہوا کہ آدمی کی الوہیت، اس کی خود مختاری، اس کا وصفِ رحمانی، اس کا جہیزِ شوق، اس کے سینے میں ایک تشنگی دوام کی صورت چھتا رہا اُسے یا راسے اُخبار نہ مل سکا۔

یہ ہار تھی جیت مادے کی فطرت کے عموں جھکڈے کی اس نے نہیں مرضِ عام دیے اس تشنگی دوام دے دی

کیا یا دہیں ہیں وہ زمانے بھیجا تھا یہاں ہمیں بدلنے
تقدیر کا حکم بنا کر فطرت کا ننگا سہاں بنا کر
اور ہو گئے اس کے مبتلا تم فطرت کے غلام بادشاہ تم
فطرت سے آمادہ پیکار ہونے کے بجائے آدمی نے فطرت سے
ساز باز شروع کر دی اور اپنی بے کراں قوت ایجا دو عمل جو جس دوس
کا پابند کر دیا۔ پانی کے لئے جدوجہد کرنے کے بجائے اپنی تشنگی کو ہمیشہ نظر
سراب سے فریب تسکین دینے لگا۔

جو دل تھا اوہمیت کا ڈیرا آکر اُسے خواہشوں نے گھیرا
اے وائے غرور خالقیت سارا وہ شعور خالقیت
ہوئے لگا صرف رنگ دلوں پر صدقے ہوئی عقل آرزو پر
جوں جوں ہوئی سخت یہ غلامی برصی ہوئی دل کی تشنگی کامی
اپنی خواہشوں کا غلام ہو کر آدمی اپنی حاجت بھاری اپنی حاجت کو کٹھنی کے
دسیلوں کی فکر میں سرگرداں ہو گیا اور اپنے منصب کو فراموش کر کے اس
فرض جہاں بانی کی بیجا نازدہنیں سے غافل ہو گیا جو اس کی تخلیق کی غرض
غایت تھی۔

العقہ تمہاری ہر ضرورت جذبات کی ماری ہر ضرورت
کرنے لگی ہر زمانہ دہرائے اپنے لئے غایت کے سامان
بھیلا کیے سٹوئی کے یہ وعدے بڑھتے گئے زندگی کے پھندے
لیکن جو تھا حق حکمرانی کھتے ہیں جسے نگاہ بانی
وہ فرض ادا ہوا نہ تم سے آسودہ خدا ہوا نہ تم سے
تم میں اس کی صفت نہ آئی وہ شان ربوبیت نہ آئی
اللہ رب العزت نے اس کائنات کے اندر خامیاں رکھی تھیں۔
یہ نقصان سے آلودہ تھی تاکہ خدا کا جانشین جسے خلیفۃ الارض بنا کر
اس نے اس کائنات پر حکمرانی کے لئے خلد سے روانہ کیا تھا ان خامیوں
کو دور کرے۔ غیور و حرم و قبیح کی تمیز اور آزادی اختیار و عمل کی صلاحیت
کا استعمال کر کے اسے خوب سے خوب تر بنائے۔

یہ خامیاں کم ہوں یا زیادہ رکھی تھیں خدا نے بالا راہ
یعنی کہ یہ رمز آشنائی بیدار ہو تم میں کسب ربائی
ہو نقص جہاں جہاں خیر ہو اصلاح تم ان کی آپ کر لو
یہ برقی یہ ابر یہ ٹھٹھیں یہ حادثے اور یہ بکائیں
یہ جملہ فساد ناگہانی بن ایک ادائے امتحانی
لیکن جب آدمی حرم و دوس کا شکار ہو کر دوسروں کی حاجت
روائی کی جگہ اپنی حاجت بھاری کی فکر میں لگ گیا تو ہر طرف نفرت اور
دشمنی، جنگ و جدال کا بازار گرم ہو گیا۔ دشمنوں کی سرکوبی کے لئے طاقت

کے استعمال کا رواج عام ہو گیا۔ طاقت کے بل پر شخصی حکومت قائم
ہوئیں اور کئے کو عمل و انصاف کا پہلچ بند ہو گیا۔ لیکن

کرتا رہا عدل بادشاہی تو یہی عدالت الہی
عدالت رہا سب کو بیش اور کم اس کو دیا تو اس کو شہنشاہ
چتر تھا کوئی تو کوئی بھال کوزہ تھا کوئی تو کوئی بادل
شخصی حکومت کا قلع قمع کی تحریک وجود میں آئیں۔ جمہوری نظام
قائم کر کے سماجی تابلوری اور استحصال کو موت کے گھاٹ اتارنے کی
تمہیں عمل میں لائی گئیں، لیکن چونکہ ان کے نفاذ کے لئے بھی طاقت سے
ہی کام لینا گیا، اس لئے:

اور آج بھی باوجود تحریک حق مدنا ہے جس طرح لے چیک
بیدار ہوئے ہیں روح جمہور طاقت کے نشے سے وہ بھی غمور
جوں کہ طاقت کا چرلہ نفرت اور عداوت کے تیل سے جلتا
ہے، اس لئے کارخانہ عالم کو سوارانے کے بجائے طاقت کے استعمال
لئے اس کا شیرازہ اور بکھیر دیا۔

طاقت نہ بدل سکے کی فطرت طاقت کا جواب دے گی طاقت
شمشیر ہے کیا لنگ لگایا ہے بچوں کا یہ کھیل جگ کیل ہے
باز کچھ میں بھی جب آدمیت اس وقت یہ کھیل تھا حقیقت
باب تو نام خدا جوں ہے دان و عقیل و دکنہ داں ہے
زیبا نہیں اس کو یہ روک پین صدحیف کہ ساری قوت فن
ہو صرف یہ اسلحہ سازی اے وائے علم حیات سازی
سائنس کا آج کیسا ہے شہ کار انسان کشی کے چنند اوزار
شاعر اس نفسیاتی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نفرت، بغض و
عداوت، حسد و کمینہ، ذخیرہ اندوزی، سرمایہ داری، تجارت و غرور و بخل
خاست یہ سب اعمالی اہرام ہیں۔ یہ سب نتیجہ ہیں اس جمہوری
وینچاری کا، اس محرومی و تشنگی کا، تشوق کی اس زبون کاری کا،
جن کا آدمی اپنے منصب جہان بینی سے دستبردار ہو کر شکار ہو گیا، جن میں
آدمی اپنی خود مختاری کی الہی صلاحیت کو رنگ لگا کر مستحکم ہو گیا۔

اس طویل بیان سے یہ غرض ہے نفرت بھی تمہاری اک مرض ہے
دشمن سے جو دشمنی کرو گے اس دشمن کا سود بھی سہرو گے
رفتہ رفتہ وہی شقاوت گر جائے گی تم میں بھی سرمایہ
سود کی خسارتی یہ مرض ہے یعنی متعدی یہ مرض ہے
طاقت کی بے طاقتی کا ذکر چھڑنے کے بعد شاعر ایک دوسرے
نفسیاتی ٹکٹے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تم جوں کو چاہو گے، وہ بھی ضرور
تہیں چاہے گا۔ جذباتی عمل اور اس کے رد عمل میں یکسانیت لازمی

ہے۔ محبت محبت پیدا کرتی ہے اور نفرت نفرت۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:
ادفع بالتي هي احسن فاذا الذي بينك وبينه عداوة كانا دولي محبم۔
شاعرنے اس لکیر کی نہایت جامع اور لطیف وضاحت کی ہے:

الفت بھی ہے ایک ربط ذہنی نفرت بھی ایک ربط ذہنی
ہر ربط کی اپنی تائید ہر ربط کی اپنی زنجیر
دشمن سے کرو گے مگر محبت آجائے گی اس میں بھی سعادت
وہ بھی نہیں چاہنے لگے گا اہلین کر اپنے لگے گا
شاعر نفرت کو ایک ذہنی مہر کی مرضی بتا چکا ہے۔ محبت کو اس کا

علاج بتاتا ہے۔

نفرت کا علاج ہے محبت بہار کو ہے اسی کی حاجت
جھول کے دلکی دلوں کے بیمار ہیں چارہ گیری کے دونوں حق دار
دونوں کے لئے ہو درد و مسندی اغلاق کی ہے بھی بلند سی
اس کے بعد شاعر محبت کی اعلیٰ داروغہ منزل عشق کے عناصر ترکیبی اور
اس کی لازوال برکتوں کی وضاحت کرتا ہے۔

یہ سوزش بے فساد کیا ہے جذبات کا یہ تضاد کیا ہے
رستے میں اک آگہی کی منزل اک تربیت خودی کی منزل
نار اس کی ہے اصل نور بنیاد یہ خود ہے الوہیت کی اولاد
جلد آثار اس کے سپتے رم اور انصاف اس کے نپتے
میران کن عقل نارسیدہ ایشار اسی کا نور دیدہ
آدمی اپنے مادی وجود کے آگے پیر انداز کر کے اپنی الوہیت ،
اپنی خود اغنیائی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اپنی خواہش کا غلام ، اپنی
حاجتوں کا قیدی بن کر معذوری اور مجبوری کا شکار ہو گیا ہے۔ عشق اُسے
اپنے کھوئے ہوئے منصب عکرائی پر واپس لا سکتا ہے۔ یہ آدمی کوساری
کائنات سے محبت کرنے کا درس دیتا ہے۔

اک سو دنیا ہو روز مرہ محبوب ہو اس کا ذرہ ذرہ
محبوب ہو اس کا سر گل و خار جو بھی ہو حزن و زار و بیمار
آنسو میں ہے جون آکھ میں کی بھیگا کرے آستین اس کی
ہے پس کہ یہ عشق دل گرازی اک ربط نیاز و بے نیازی
عشق آدمی کو اس حقیقی اختیار و آزادی عمل کی تربیت دیتا ہے جس
سے آہ صرف عالم مادی کی حکومت حاصل نہیں ہوتی بلکہ دنیا پر بھی
اس کی آزادی کا پرچم اُٹھانے لگتا ہے۔ عشق اسے اپنی خدائی عظمت سے بنات
کرنے پر آمادہ کرتا ہے، حرص و ہوس کی ان زنجیروں کو توڑ دینے کی تلمیذ
صفت عطا کرتا ہے جن میں اس کی گمراہ خودی جکڑی ہوئی ہے۔
جب تک نہ کرے گی آدمیت نفرت کے خلاف اک بغاوت

میلان سے اپنے اک لڑائی رجمان سے اپنے اک لڑائی
ہر عذیرہ حسام کو کھیل دو نفرت کا مزاج ہی بدل دو
جب تک کہ یہ معسر نہ ہو گا اللہ کا حق ادا نہ ہو گا
اللہ کا حق اس معشرہ مذہب کے بے روح اور خود غرضانہ رویوں و
سجود ، عبادت و ریاضت سے بھی ادا نہیں ہو سکتا ، جن کی تحریک خوف
اور حرص کے جذبول سے ہوتی ہے۔ خوف معذوری و مجبوری ، شکست و
ہسپائی کی علامت ہے۔ آدمی جب خارجی حالات و واقعات سے
نبرد آزما کی طاقت نہیں رکھتا تو ان کے آگے پیر اندازی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

خوف کوئی وہی جذبہ نہیں ہے۔ خارجی ماحول کے مقابلے میں اپنی ناتوانی کے
تجربوں کی دین ہے۔ مشیت پروردی نے آدمی کی تخلیق کی بنیاد ساری کا نٹا
کو اپنے دام تسخیر میں اسیر کرنے کے امکانات پر رکھی ہوئی ہے۔ اسے اپنے
اختیار کی کھجلیوں سے نوازتا ہے۔ اسے خلیفۃ الارض کا منصب عطا
کیا ہے۔ آدمی کے اندر خوف و خطر کا احساس اس کی تخلیق کی غرض و غایت
کے منافی ہے۔ اللہ اپنی بارگاہ میں اس سجدے کو پسند نہیں فرما سکتا جو
خوف و ہراس کا افریقہ ہے۔ شرفِ قبلیت اسی سجدے کو حاصل ہو گا جو
اللہ کی محبت و رضا جوئی کے جذبات سے سرشاری کے عالم میں ادا ہو گا۔
راسخ ہے بسند ہزار خامی سجدوں کے مزاج میں غلامی
دینی تھی جسے محبت اتوس کی خوف سے اس کی طاعت الہی
جس دل میں بسی ہوئی ہو بہیت اس دل میں پسے گی کیا محبت
فرعون سمجھے اس کو ان رتہا ہے ہمیشہ اس سے ترساں
خوف کی طرح حرص بھی بے لاگتی و احتیاج کی دلیل ہے۔ اللہ نے
جہاں انسان کے اندر اپنی روح چھونک کر اپنے دوسرے اوصاف کی
جلوہ فرمائی کائنات سے اسے فرازا ، اپنی شان بے نیازی کی عکاسی کی
صلاحیت بھی اُسے مرحمت فرمائی۔ خدا نے بزرگ و برتر کا انسان پر حق
ہے کہ اس کا سر بے نیاز خدا کے سامنے خم ہو۔ وہ عبادت جو ناز و جہنم
سے نجات اور رحمت کے عیش و دھام کے حصول کا وسیلہ سمجھ کر کی جاتی ہے اللہ کے
ساتھ سوداگری ہے۔ اللہ ہوا الہی ہے۔ وہ کسی کے سجدے کا محتاج
نہیں ہے۔ وہ سجدہ جس کی تحریک حرص و اڑ کی رہیں ہے ، حقیقی عبادت
نہیں بلکہ فریب طاعت ہے۔

آزادوں کی طاعت اور ہی ہے مغنوم عبادت اور ہی ہے
ہو جس میں صفات کبر یا فی زیبا ہے اس کو جب ساقی
مقبول اسی کی ہے عبادت کچھ جو اشارۂ مشیت
نیکی جو بجائے خود ہے ایشار کرتی نہیں وہ خدا سے ہو پار
کچھ لوٹ اللہ کی محبت میں تارک الدنیا ہو کر کسے عافیت میں اس

لہیتہ: جمیل مظہری کی شخصیت

اُن کی شاعری کی عمارت صحت و محبت پر کھڑی ہے۔ زندگی کی تلخ کامی اودھم، جمیل مظہری کی روح کی غلوت میں ایسا جذبہ ہو گیا ہے، جو اُن کی روپ پر کھائیں اشک بن کر ڈھلے۔

محکم ہے کہ اُن کی زندگی حادثاتِ محبت سے دوچار ہوئی ہو۔ اُن کا طویل مضمون "محبت کی قربان کا" پر اس قسم کا اثر ہے۔ میرا یہ عقیدہ اور شاہد ہے کہ شاعر کی تعمیریں اس کے دل کا خطن اور اس کی ناکامیاں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ تم بحث اور ناکامی حیات کو مقصود بنالیا ہے۔ اس لیے اُن کے کلام میں پائیداری ہے بقا ہے۔

جمیل مظہری کی آنکھوں میں ادھر جہرے برائسی کیفیات محسوس کی ہیں جن کو اُن کے گزرنے ہوئے حادثات کے نقش قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ حسرت، فانی، اصغر گزٹروی کے بعد جگر حر آبادی کے جیسا غزل کو پیدا نہیں ہوا۔ لیکن علامہ جمیل مظہری کی مالک شان تھی۔

میر تقی میر کا اکثر شعر پڑھتے تھے۔

دل کی بربادی کی حد پہ کہ خرابی کو نہ پہنچے

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

جمیل مظہری صاحب میں شرافت اور بھلائی کا عملی جذبہ موجود تھا۔ جب ہندوستان میں سیاسی اور سماجی غلط فہمیاں کا دور تھا، زیادہ تر حساس تخلیق کار اس آثارِ خیر معاشرے اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اردو میں ڈاکٹر اقبال، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، مرزا داہرہ صبیح یا سید عظیم آبادی، بچا نہ بچ گزری گھنوی، مولانا ظفر علی خاں اور پریم چند سب کے سب کسی نہ کسی شکل میں اس نشیب و فراز سے جڑے ہوئے تھے۔ انھیں حالات سے جمیل مظہری صاحب گزرنے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ذہن تحقیق کا اپنے آپ کو اپنے عہد کی زندگی سے بچائے۔ بعض شعراء اور ادیب خارجی اثرات سے متاثر ہو کر اپنے عہد نہیں کرتے۔

یہ سچ ہے کہ شاعری اندرون احساسات سے ختم نہیں ہوتی ہے۔ آخر اُن کے وجود کی تعمیریں خارجی احساسات کا اپنا رول نہیں ہوتا؟ جمیل مظہری اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر تھے انھوں نے جتنی مصروف سہمی سماجی اور فکری خیال میں ڈوبی ہوئی شاعری کی ہے ان کے ہم چھوٹے میں دوسرا کوئی نہیں کر سکا۔

کے نام کی الایچتہ رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو مطلق خدا کے قریب میں مبتلا کر کے اپنے عینی مطالبات کی ارتقا کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ ان کی غلوت نشینی و رمانت مشیتِ الہی کی توہین ہے۔ انہوں نے اپنے منصب جہاں بانی کو سب پشت ڈال دیا ہے۔

اک اور بھی مشکل بند کی ہے جو تنگ شعور آگہی ہے
کچھ اہل سفر تھکن کے لئے اپنی جہنی گھٹن کے مارے
معشوق بنا رہے ہیں اس کو بے پروئے میں بٹھا رہے ہیں اس کو
یہ مسخ شدہ حسد پرستی پہلی ہوئی خواہشوں کی مستی
لے ڈوبی ہے اور آدمی کو آلودہ کیا ہے بندگی کو

شاعر اس بزدلانہ اور عرضِ مہلانہ کو عروج و سجود، عبادت و رمانت کو رقصائے الہی کی توہین اور اس سے انحراف سمجھتا ہے، جس کا رواج مذہب کی مسخ شدہ صورت میں عام ہو گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں وہ عبادتِ عبادت کا منکر نہیں ہے۔ عدل و انصاف کا تعاضل ہے کہ جہاں آدمی اللہ کے بندوں کا حق، اُن کے ساتھ محبت، ایثار و فرست کے ذریعے ادا کرے وہیں اللہ کی نسبت جو مذمت و تشکر کا حق اس کی گردن پر ہو گیا ہے اس کے آگے سر تسلیم خم کر کے ادا کرے۔

کچھ نہ مگر سمجھ کی فانی میں ترکِ سجود کا ہوں حامی
بے وجہ ہو یا بے ضرورت معبود کا قرض ہے عبادت
حق سب کا ادا کرے جو عادل اللہ کے حق سے کیوں ہو غافل
وہ مانگے نہ مانگے کچھ بکد تو فرض ادا کر اپنا بندہ
لیکن نہ سجود حسد و دمانہ لیکن نہ صلواتِ مہربانہ
طاقت نہ اگر ہو اختیار ہی پھر تو اک عمل ہے کاروباری
اقتصادی جمیل مظہری نہ منکرِ خدا ہیں نہ منکرِ مذہب۔ ان پر کفر و افساد کا فتویٰ صادر کرنا ان کے ساتھ صریح بے انصافی ہے۔ البتہ وہ خدا کے من مانتے تصور اور مذہب کی مسخ شدہ صورت سے بیزار ہیں۔ وہ بائبل مذہب کی حقانیت کے معترف ہیں، لیکن جو غلط مذہبی تصورات اور تعلیمات رسومات ان سے منسوب کرتے تھے، ان کے خلاف آواز بلند کرنے میں جمیل مظہری کوئی ٹھیک محسوس نہیں کرتے۔

بے شک جو تھے بائبل یا مذہب ہر ایک سماں میں خاصہ رب
لیکن جو ہیں دین اُن سے منسوب ان کی تشکیل ان کا اسلوب
ان کے آئین اُن کے احکام اُن کا قانون اُن کا پیغام
باجملہ عقائد و مشغل ہیں عقل کے اور فزونی کے قتل
انہوں پہلارے ہیں ہم کو صدیوں سے سلا رہے ہیں ہم کو
ہمیں آج جو دین حق کے ناصر کہیں مجھے ملے اور کافر



جمیل منطہری کا نازِ بندگی

کبھی وہ بھی زندگی تھی کہ خدا نجل تھا مجھ سے
اگر اس طرزِ میان کو خوشی گنتا رہی محمول کیا جائے بلکہ باری تعالیٰ کی جناب
میں گستاخی تصور کیا جائے تب بھی سوال یہ ہے کہ وہ زندگی کب تھی اور کیا
تھی جب بقول شاعر خدا گویا بندے سے نجل تھا ؟ کیا یہ اس مصرعے میں
قالب کے اس مشہور مصرعے کے معانی میں ہیں :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
یعنی یہ معاملہ تخلیق آدم سے قبل کسے ؟ جب صرف خدا کی ہستی پوری کائنات
میں تنہا تھی اور وجود کے مظاہر کی ابتدا نہ ہوئی تھی ، جب کہ یہ مظاہر جن
میں ایک انسان بھی ہے اپنی حقیقت کے لحاظ سے بروئے اظہار آئے کا قافیا
گرد ہے تھے اور فانی کائنات کی مشیت ، اس وقت ان کے اظہار کی ذمہ داری
نہ تھی ، پتاں چہ مظاہر سے گویا سرشار تھی لیکن جب خداوندِ عالم نے مظاہر کی
تخلیق کردی اور انسان کو بھی وجود میں لے آیا تو معاملہ برعکس ہو گیا اور
جو مخلوق بروئے وجود آکر اپنے کمالات دکھانے کے لیے ہے اب تنہا ہی اب
گویا "ظالم و جابل" ثابت ہوئی چہاں چہ جس واقعے کا اعتراف غالب نے
"ذو الجہ کو ہونے" کے بیان سے کیا اس کا اقرار ہمیں نے "نجل ہیں میں
نعلے" کی شکل میں کیا۔

پھر حالِ نازِ بندگی کے متعلق غالب اور جمیل کے تصورات میں نمایاں
فرق ہے۔ غالب "ذو الجہ کو ہونے" کے ساتھ ہی نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا ، جیسے
معنی خیز بیان کے ذریعے لکھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ، کی غلطی کرتے ہیں ، جب کہ
جمیل اپنی یا انسان کی تخلیق سے پہلے خدا کی جمالت کا شعور نہ اظہار کرنے کے بعد
بالکل سیدھے سادے انداز سے اپنے مجرور انسان کا اظہار کر دیتے ہیں :

کبھی یہ بھی زندگی ہے کہ نجل ہوں میں خدا سے
اس طرح جمیل و حقیقت اپنے نازِ بندگی کے مقام پر استقلال کے ساتھ فائز

میں خدا کو پوجتا ہوں میں خدا سے دوشتا ہوں
"نازِ بندگی" ہے جسے پوچھے خدا سے
"نازِ بندگی" میں بھی ہوئی جمیل منطہری کی ایک قول کا شعر ہے جس کا یہ قطع کچھ
مشہور سا ہے :

ابھی ذہن منطہری پر ہے طوبیٰ کا عالم
کہ ملنا نہ رک کھلنا تو چل گئے خدا سے
اسی قول میں براہِ راست خدا سے متعلق ایک اور شعر یہ بھی ہے :
کبھی وہ بھی زندگی تھی کہ خدا نجل تھا مجھ سے
کبھی یہ بھی زندگی ہے کہ نجل ہوں میں خدا سے

ان اشعار کے معانی کا تجزیہ اور مضمرات کا تجسس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
رنگ کی سب سے بڑی حقیقت یعنی وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق جمیل منطہری کا
اصل رویہ کیا ہے۔ اگر اس رویے کو کسی ایک لفظ سے تعبیر کیا جائے تو وہ درج
بالا اشعار میں سے پہلے شعر کے اندر واقع خود شاعر کی استعمال کی ہوئی ترکیب
"نازِ بندگی" ہے۔ یہ ترکیب بجائے خود بہت بلیغ اور فکری انگیز ہے۔ اس میں
بیک قسم کا قبل محال ہے ، بندگی کے ساتھ معرود لفظ نیاز کی بجائے ایک
سبتہ ناماؤں لفظ "ناز" کو واسطہ کر دیا گیا ہے ، جب کہ معروف و مرقع بندگی
کا ناز نہیں ، خداوندی کا ناز ہے ، جو ایک شانِ کبریا ہے لیکن زیرِ نظر قول
کی ایک اور شعر جو اوپر درج کیا گیا "نازِ بندگی" کی بجائے بندے کی جمالت
کا ذکر کرتا ہے :

کبھی یہ بھی زندگی ہے کہ نجل ہوں میں خدا سے
لاشبہ یہ شعر کا دوسرا مصرع ہے ، جب کہ پہلے مصرعے میں ایک قسم کے ناز
منطہری کی طرف بالواسطہ اشارہ کیا گیا ہے :

میدر شیبہ انگو یزی - ن. ابن کالج - پشتر - ہار۔

نہیں رہے۔ بلکہ نیا زندگی کی طرف بے دریغ مائل ہو جاتے ہیں۔ مقل کا شعر تو ان کے سارے ناز و بندگی ہی کو ایک "طفولیت کا عالم" بنا دیتا ہے اور اس کی یہ عطا نہ تصویر سامنے آتی ہے،

کہ ملان جب کلونا تو چل گئے خدا سے
لہذا میں خدا سے دو ٹھٹھا ہوں، کی کیفیت ناز و بندگی کے طوفان کی بجائے صرف چل جانے کی ایک معصوم سی ادا ہو جاتی ہے۔

خدا سے دو ٹھٹھا ادا چلنے کی یہ نجات جمیل نظری کا "مزاج غزل" اور آہنگ نغمہ ہے۔ اس میں خدا کی کوئی پہلو نہیں ہے، یہ زندگی کا ایک دور ہے جس کو کسی وہ ناز سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی نیا سے مگر ہر حال میں اس کا حاصل انفعالی شکست کی اور حسرت کی دو گنیاں ہیں جو مزاج نیا ہیں،

یہی تو انہماک جو تپ کر محو کریں کھاکے بت کردوں کی
جبین رسوا کر رکھ کے اپنی حرم کی پوکھٹ سے پوگیہ ہوں
یہ ناز بردار دو گان غصرت مری اسیری کو خاک سمیٹیں
طاقت کچھ اختیار جب سے میں اور مجبور ہو گیہ ہوں

بخشش ہے تیری باتھ میں دنیا لے ہوئے
میں چپ کھڑا ہوں دیدہ دنیا لے ہوئے

کسی کی حسرت ہمیں نگاہیں نظام ہستی پہ تبصر ہیں
غور و کلا ہو اسے انھوں میں غیرت التجا نہیں ہے
جمیل نظری کے ناز و بندگی کی ساری خوشیاں اقبال کے غزلوں میں جنتیت
منتظر کو "لوہاں ناز" میں دیکھنے کے لیے "جبین نیا" میں سمجھوں کی ٹیپ
ہے اور ان کے حشر غنتی کی ساری جرأتیں اقبال ہی کے اس شعر کی تفسیر ہیں،

تو بجا، چاکے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کر شکست ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
جمیل بھی انہی لوگوں میں ہیں جو غزل اقبال زبان حال سے کہتے ہیں،
مقام ہند کے کہوں شایع خداوندی" اس لیے کہ

مزاج بے بہا ہے درد و سوؤ آرزو مستعدی
اسی درد و سوؤ پر شتمل "نغمہ جیل" کا وہ "مشت" ہے جو ۱۹۲۹ء میں
لکھا گیا اور ۱۹۳۵ء میں اس پر نظر ثانی ہوئی۔ "نغمہ جیل" کی نگاہوں میں
"شاعر کی قننا" اسی درد کا شکر ہے۔ نغمہ کا یہ شعر نئے شاعر کا نقد عروج ہے،
غرض اس حسرت دانہ و دیاں و غم کی ہستی میں
کہیں درد آفسری ہوتا، کہیں درد آشنا ہوتا
یہ کڑا درد اگر قہیں کے مرانی کا جذبہ غاص ہے تو اس میں تجب کی کوئی بات نہیں

اس لیے کہ مرثیہ کی تو اصل ہی نود ہے، مگر شہادت حیش کے سیاق و سباق میں
میں رزمیہ کے پہلو بھی اندر مرثیہ نگاری نے خاص طور پر نکالے ہیں اور
دوسری زبانوں کے مرثیہ کے مقابلے میں یہ ان کا امتیاز ہے جس کی نشانی ہی
جمیل کے درد انگریزی کی حریت آواز حاضر سے بھی ہوتی ہے۔

اگر مرثیہ کے تناظر میں نود و رزمیہ کی اس آمیزش پر غور کیا جائے تو
ہند کی کے نیا و ناز کا ایک مرکب ہمارے سامنے آئے گا، خواہ یہ بعض وقت
ذہن کے انتشار پر دلالت کرے یا جامعیت پر دوڑوں حالتوں میں نیا و ناز کی
اس ترکیب سے تشکیک کی کش مکش پیدا ہوتی ہے جس میں یقینی دہے یقینی
اور رجائیت و قوطیت کے اجزاء ہم آہم ہوتے ہیں۔ چنانچہ "نغمہ جیل" میں
"قنویات" اور "رجائیت" کے عنوانات سے مختلف انشائیات انتشار ایک سا
دور تک کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ "نغمہ جیل" میں "فساد آدم"
اور "آدم کو کسا ترانہ سفر" میں عیسوی عہد کا اقلانے پیہم کا پیام دینے والی حسین
اور پرنیسیاں لگیں بہت بصیرت افروز ہیں، جمیل نظری کی آخری بڑی نظم اور
سب سے فلسفیانہ تخلیق "مثنوی آب و سرب مطبوہ" کا قلم تشکیک کا
تشکیک کے اس افسانے پر ہوتا ہے:

افسانہ ہے یہ عین مہم ہمارا تشکیک بھی ہے مری ہمارا
اچھے ہی رہے شکوک پیہم برعصی ہی رہی دل کی ہوک پیہم
حیرت نے فساد کہیں نہ پائی غوت نے دوا کہیں نہ پائی
سنت ہوں کہ مضروب ہے وقت ہے عالم غور میں مشیت
ہرنگے ہیں سب لاسکان پر ابر آتے ہیں گھر کے آسمان پر
اے کاش اک ایسا ابر آ جو روح کی پیاس بھی بجھانا
مت سے ہے تیرے نغمہ ناکا آنے کو تو آ رہے ہیں طوفاں
جو نکا کوئی اس طرف بھی آجائے چھینٹا کوئی اس طرف بھی آجائے
چونچال ہو آگہی ہمارا
بجھ جائے یہ تشکیک ہمارا

اپنی اس تشکیک کو جمیل نظری بہت محنت مندا ہامل اور کارگر سمجھتے تھے
تو اس پر ناز کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تشکیک آدمی کو بخشش، جہو
اور تجزیہ پر آمادہ کرتی اور منزل مقصود کی طرف جانے والی راہیں کھولتی ہے،
مری گم رہی ہے ستر کی شئی سے منزل، مری داستان مرتبہ سے نقش ہٹے پاسے
(غزل - نغمہ جیل)
خود اپنی سے ماتی ہے بہری گاراج یہ تجربہ جو ستر میں گم رہی سے مجھے
(غزل - نغمہ جیل)
مصداق کیا خبر کہ ہے ہر نقہ خیر مٹی میں اپنی قسمت کھالے ہوئے
(غزل - نغمہ جیل)

اب ایک اہم سوال جیل منہری کی فکر کے بارے میں ہے کہ کیا وہ اپنی خودی کی طرف مائل ہیں؟ ان کی ایک فنون کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔

بند رہ پسا نہ غمخیزم سرور ہوں میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ منہ پر پیہم تو دم نکل جائے آرزو کا

مکن ہے اس شعر کو تصور خودی پر ایک طنز سمجھا جائے، یعنی جس میں مرغانِ نس اور اظہارِ ذات کو اقبال آجی اور ترقی کا خاص تصور کرتے ہیں وہ جیل کے نزدیک گویا ایک مجبوری اور نفسیاتی بے چارگی ہے جو عام طور پر انسان میں اس کے اپنے غمخیز کے بیان کے مطابق پائی جاتی ہے اور اس میں کوئی خصوصیت، ندرت اور عظمت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خودی دے خودی کے معاملے میں اقبال و جیل کے خیالات ایک دوسرے سے متضاد و متضاد ہیں۔ خود جیل نے اپنے بعض اشعار اور دیج بیانات سے بھی ناظر پر کیا ہے لیکن درحقیقت یہ خود جیل کی فکر کا اردنی تصور بلکہ تصورِ تضاد ہے اقلی و قشہ یک ہیں، جس کو وہ اپنی ذاتی کیفیت کے طور پر پیش کرتے ہیں، خودی کے بغیر جان ہی نہیں آئے گی، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ خودی کا شدید احساس ہی انسان کو شکوک میں مبتلا کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر خودی حائل نہ ہو تو زندگی کی بجائے خدائی کا احوال پیدا ہوتا ہے۔ بے خودی کے ان مضامینوں سے جیل ہی واقف ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ان کا ذہن حقائق کی مغلجہ کاغذات کر کے اپنے افکار کی اس طرح تنظیم کرنے سے فائدہ ہے جس طرح اقبال کی زبردست ذہانت نے کی ہے۔ یہی وہ ہے کہ جیل اقبال کے صروت اسباب خودی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ان کی تردید کرتے ہیں، جبکہ دوسرے خودی سے وہ بے خبر نظر آتے ہیں یا ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اسرار و رمز کی تطبیق نہیں کر پاتے، احوال کہ اجتماعی فلاح اور سماجی انصاف کے علم پر اقبال جیل بھی اپنی حدود میں اسی طرح ہیں جس طرح اقبال، لیکن فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیل اجتماعی اور فردِ معاشرہ پر ضدِ مادہ کے ربط باجی کا کئی واضح تصور نہیں رکھتے، بلکہ ان کے یہاں خودی دے خودی جو کچھ ہے سب اندرونی سطح پر اور کسی منظم فلسفہ و نظریہ حیات کی بجائے محض ذاتی خیالات یا شخصی میلانات کے تحت ۱

خودی رحمت کے فلسفے میں ہے اس کے جذبوں کی موت لیکن
کچھ اور دل میں اتر کے دیکھو تو عشق کی جان بھی دہی ہے

اسی کا ہے نام اگر رحمت تو کس کو کہتے ہیں خود پرستی
اک ایسی دنیا بنا رہا ہوں جہاں کوئی تیرا نہیں ہے
استی ہے صافی سے اس کی جیب دھل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دیا میں نہ تھا تو ظلمہ تھا اور یا میں طاف کچھ بھی نہیں (فکر جیل)

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ جیل منہری نہ تو فنی ذات کے لیے متبادل تھے نہ فنی ذات کے لیے، بلکہ خودی کو "عشق کی جان" سمجھتے تھے، غمخیزان میں بھی غالب کی طرح 'عشرتِ طغویہ' دیا میں فنا ہوتا، دے داد نہ تھا پھر اقبال کے تصور خودی سے وہ کیوں گھبراتے تھے؟ اس سوال کا جواب ان کے ایک شعر سے مل سکتا ہے، جس میں وہ خودی کو 'متابع زندگی' قرار دیتے ہوئے اپنی یہ خودی کو بھی 'خودی کا اضطرابِ فعل' بتاتے ہیں۔ خودی کا یہی اضطراب و افعال جیل منہری کی پریشانی، افکار کا باعث ہے اس کی وجہ مرث ایک ہے، وہ یہ کہ حیات و کائنات، تخلیق و المذاق اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق کو مربوط نظریہ، کوئی مرتبہ فلسفہ، کوئی تنظیم فکر جیل کی دست رس نہیں ہیں، یعنی وہ صرف شاعر ہیں یا زیادہ سے زیادہ صوفی، فلسفی یا مفکر نہیں چلائے، ان کی شاعری میں تفکر کی جو چند جہتیں، اور ہمیں پائی جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے بلاشبہ تخلیق کی گہرائی کم تر ہے وہ درحقیقت ان کی حدود اپنی اندازہ دے کہ کمال ہے۔ یہ دہی چیز ہے جسے عوام نے غالب کے سلسلے میں نفسیاتی ثروت یعنی تعبیر کیا ہے یہ بصیرت نفس شاعرانہ تخلیق کی گہرائی کے لیے مفید ہے اور جیل اس سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔ ان کے اشعار کی لطافت و بلاغت کا ملذہ ہی ان کے احساسات کی باریکی اور جذبات کی حساسیت کی ہی ہے۔

ذیل اشعار جیل کی شاعری کی اصلیت کے قیاس ہیں،
مے ملے نکلتے ہیں تیرے سر سے مے وہ کناہے لٹکے جو یکے کے تھیلے
میں سے غور کر رہا ہوں تجھے لٹک کر فسلے ملا متاعِ پیشیاں نہ تو تیرے مقلعے
جہمی رہیں گے تیرے تو چھپے گی کیا لغت کبھی تم خفا خفا سے

تجھے حق نہیں کہ خفا ہو تو میری بے دلی نیا ز پر
میں لٹکا چکا ہوں متاعِ دل تیرے عشق ہائے بکا ز پر

اب تو خراشے تری پردہ نشینی کا فزودہ بست گ نشہ اصنام ہوئی جاتی ہے
روٹھے اور چھپنے کی طرح یہ ایک چھوڑھاڑ ہے، خواہ وہ مشرقی ہمازی کے ساتھ ہو یا مشرقی مشرق کے ساتھ، 'نیکر جیل' کی پہلی ہی فنون کا متعلق اس انداز فکر کی نشان دہی کر دیتا ہے۔

سارے مے جگڑے ہیں جیل اپنے فلسفے منکر میں اکتے کا نہ منکر نہیں کا
(مستند)
ظاہر ہے کہ اس قسم کا جھگڑا اس ایک نفسیاتی چپقلش ہے، کوئی فلسفہ یا آواز نہیں ہے، نہ کچھ غالب کا سما، 'طہر جوح داب' ہے جو ایک طلبِ خودی میں فنا و ترقم دونوں کے جذبات کے ایک وقت اظہار ہے اور مبالغہ پر مبنی کئی

بقیہ: جمیل نظریہ کا الغزل

کہو نہ یہ کہ محبت ہے تیری سے مجھے خدا دیا ہے پیشگوئی نے روشنی سے مجھے

ہے مری آنکھ میں اب تک دی سفر کا خبار
ملا جو راہ میں مسافر اے آگہی سے مجھے

اب تو شہر رائے تری پردہ نشینی کا فرد
بستہ گئی فننہ اصنام ہوئی جاتی ہے

جیل کے قنول کا عائد کرتے ہوئے کہ ادب پہلوؤں پر رنگہ جاتی ہے
جیسے ان کی قنول گوئی کے آرٹ میں ایک مخصوص بھائی، دلکشی اور
تب و تاب پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے اظہار جذبات میں جاہ یا فخر اور شوخی
سے کام لیا ہے جس نے ان کے قنول میں ایک لطیف پہلو ابعاد یا سہ
بعض جگہ ان کی غزلوں میں بڑی اچھوتی پیکر تراشی کی گئی ہے جو دراصل ان
کی نزاکت احساس کی تراشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں کہیں کہیں
مکرر الفاظ سے بھی کام لیا گیا ہے اور اس سے بھی ایک خاص کیفیت پیدا کرنے
کی کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے بعض جگہ ہندی الفاظ کا بڑا بھوتا اور کیا
استعمال کیا ہے اور اس سے ایک خاص ترنم اور خوشی پیدا کی ہے۔ جیل نے
ایام شباب میں ہندی اور قنول کو ایک سانچے میں ڈھانے کی جو کوشش
کی تھی وہ اور قنول میں ایک نیا تجربہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان غزلوں میں
جذبات و احساسات کی صداقت کے باوجود ایمائیت کی کمی پائی جاتی ہے
جس کی وجہ سے وہ غالب اس قسم کی قنول گوئی کے تجربے کو آگے نہ بڑھ سکے
اور اور قنول گوئی کی اسی راہ پر چلے آئے جس میں غزل کے مانوس آداب
اور طرز و اسلوب کو نبھاتے ہوئے بھرپور ایمانی اعزاز میں خصیالات و
احساسات کا جادو جگایا جاتا ہے اور ذہن و فکر کی تہذیب کی جاتی ہے۔
جیل نظریہ کے قنول کے اس جائزے سے ان کی قنول گوئی کے وہ
مخصوص اور منفرد نقش ابھرتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی قنول گوئی اور
قنول کی حرزیت کا ان نقش اور ناگزیر جزو بن کر زندہ رہیں گی اور
ہمیں براہ راست لطف و دیکھت سے آشنا کرتی رہیں گی۔

پتہ ۱، فلیٹ ۱۰/۱، ۸۰/۱، برہم پوری کالونی

دہلی ۹۳۳۰۰۹ (پرسد)



تشکیک کا ہو جاتا ہے۔ اس میں اقبال کی طرح صاف نہ تو شکوہ
ہے نہ جواب شکوہ، اس لیے کہ اس قسم کی شاعری میں احساس کتنا ہی شدید
ہو، اور لگ قوی نہیں، در نہ یہ صورت حال کیوں پیش آتی کہ جس شاعر نے اپنی
فکر سخن کے سطرانہ میں کسی پچھلے مرحلے پر امید ظاہر کی تھی،
کا درواں آہی گھسیا تا بہ سواد تشکیک
مزل اب زحمت یک گام ہوئی جاتی ہے (فکر جمیل)
وہ آخری منزل تک نہ ہی محسوس کرتا رہا،

ذہن طفلانہ، طبیعت حققتانی میری
دفات سے تقریباً دو ماہ پہلے کہی ہوئی اس نظم سے عیاں ہے جو ”گور
رسمہ“ کے عنوان سے ستمبر ۱۹۳۷ء کے ”آجکل“ دہلی میں شائع ہوئی ہے،
مگر اس کا آخری شعر جو محبت کے بارے میں ہے یہ ہے:
چن کے کچھ پھول نکل آئیں گے اس گلشن سے
کیا مسافر کو تعاقب ہے کسی مسکن سے
یعنی ”سواد تشکیک“ میں ”مزل“ کا جو ایک سہمرا تصور تھا وہ بھی نظر سے
اوجھل ہو گیا اور فقط ایک ایسی ”بسنی کا مسافر“ وہ گیا جو اپنے بارے میں
اس سے زیادہ کچھ سوچ نہیں سکتا،

وقت وہ ہے کہ دھماکا گھونڈا ٹوٹے وقت وہ ہے کہ خدا کا یہ کھلونا ٹوٹے
وقت اب وہ ہے کہ بکھرے پتلاں نڈی وقت اب وہ ہے کہ ہر خواب تنہا ٹوٹے
گویا جو بات کھلنے سے شروع ہوئی تھی وہ کھلنے ہی پر ختم ہوئی، ارشاد تھا
کے درمیان فرق بس یہ ہے کہ پہلے شاعر کو کھلنے کی طلب تھی اور اب وہ خود
کھلنا بن گیا ہے اور وہ بھی ٹوٹا ہوا کھلونا، یعنی زندگی کھیل تھی اور کھیل ہی
مکمل ہے، فرض و عشق کی قربان گاہ پر فرع و شکست کے انسانے کا کردار اپنی
نفسیات کے اس کھیل میں مگن رہا ہو اور اس نفسیاتی انہماک نے اور شاعری
کو تخلیق فن کے چند دل آویز نمونے بھی عطا کیے ہوں جن کا حسن ہمارے لیے
بھی کچھ تسکین نفس کا باعث ہے، لیکن درے شاعری میرے دگر کی تلاش
جن لوگوں کو ہوان کا آشنا نہ یا ان کی فضا سے پرواز کا جہاں کہیں اور ہے
صحیح معنی میں انہی کی منزل جہت نفی فاص سے پر ہے اور وہی یہ کہنے کا حق
دیکھتے ہیں،

ہر موقع نیا طور، نئی برقی تلی
اللہ کرے مرط شوق نہ ہو طے (اقبال)
بہر حال اپنے روانی انداز اور نفسیاتی رویے کے باوجود جمیل نظریہ
کی شاعری اعلیٰ امتانت کی حامل اور ایک تقدیر حیات ہے۔ اس تنقیدی
مناظر کے ساتھ ان کی قدس، ایمان اور فضا سے اظہار موجودہ دور کے اور
شعور کی صفتوں میں انہیں ایک نمایاں اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

جمیل مظہری کا تنقیدی شعور

ایک جیل ہے جو اپنی تہائی کو خوش کرنے کے لیے گانے پر مجبور ہوا ہے۔
شیشی نے کہا ہے کہ شاعر ایک جیل ہے جو اندھیرے میں گاتا ہے اور گار
اپنی تہائی کو خوش کرتا ہے۔ سننے والے سننے ہیں اور بے خود ہو جاتے ہیں
لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر کوئی جیل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ذہن نشین کا خیال
ہے کہ وہ ہم آپ کی طرح کا انسان بننا ہے اور دوسرے انسانوں سے
بائیں کرتا ہے اور جو باتیں وہ کرتا ہے اس میں سوچ بوجھ کا دخل ہوتا ہے
اور یہی سوچ بوجھ تنقیدی شعور ہے۔

ادب کے بنیاد غالب علم سے خصوصاً یہ بات پوشیدہ نہیں کہ تنقید
ہر زبان کے شاعروں کے کلام میں کم و بیش تنقیدی شعور کی جھلک موجود ہے۔
البتہ یہ ضرور ہے کہ کہیں اشارے کناٹے ہیں تو کہیں اپنے زاویہ نظر کا
پورا پورا بیان ہے۔ مثلاً انگریزی شاعری کو بھیجے۔ جو ترجمہ کیلئے بری
نہیں لکھے لیکن اُس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے نقطہ نظر
کی وضاحت کرے۔ اس لیے کہ پہلے وہ کچھ روایتی قسم کی نظمیں لکھا تھا کیلئے
نہیں اس نے حقیقت طرازی کو اپنا یا اور Prologue میں کچھ خط
لکھے پر مجبور ہو گیا جس سے اس کے نظریے اور عمل کی پوری پوری وضاحت
ہوئی ہے۔ یہ کچھ جوتیری پر موقوف نہیں۔ ہر شاعر کم و بیش اپنے فن کے بلے
میں سوچتا ہے اور اس پر عمل تو کرتا ہی ہے اور اس کا کبھی صاف صاف
اظہار بھی کرتا ہے۔ اور شعراء بھی غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کا اظہار
بھی کرتے ہیں۔ مثلاً آجی کا خیال ہے کہ شاعر کو کبھی کسی دوسرے کے مضمون
کو نہیں اندھا دنا چاہیے اس لیے کہ چور کا منہ دوڑوں جگ میں کالا ہوتا ہے
نکو بول مضمون تو ہو رہا کہ کالا ہے دو جگ میں ہوں چور کا
قلی قلب شاہ یہ سمجھتے ہیں کہ محلوں کے ہاتھ میں بازی لے جاتا شاعر کی
بڑائی، زندگی اور برتری کی دلیل ہے۔

ہر صنف سخن کی طرح اردو تنقید کا ارتقا بھی مختلف پیر و خم اور عمل و نظریے
کی پیر و خم پلٹ پلوں سے گزر کر موجودہ میدان و محاکم پہنچا نظر آتا ہے مثلاً
تذکرے اور پھر ناقدین اردو تنقید کے ارتقا کے وہ ابواب ہیں جن کے پیش نظر
ہم تاریخی نقطہ نظر سے اردو تنقید کا ایک واضح لیکن غیر مکمل خاکہ تیار کر سکتے ہیں
کیونکہ ان کے علاوہ ہمیں ایک اور نہایت ضرورست اور غیر معمولی تنقیدی شعور
اور نظریات کی ایک ایسی اہم کڑی کا پتہ خود اردو شعراء کے کلام میں ملتا ہے،
جن کی چھان بین کرنے کے بعد ہمیں اس کا شدید احساس ہوا اور پھر ہوتا ہے کہ
اردو شاعروں نے اوائل سے اپنے شعری ادب کے ذریعہ جن بیش قیمت تنقیدی
مسائل پر اظہار خیال کیا ہے ان پر اب تک ہماری نگاہیں صرف سرسری طور
پر مٹی ہیں۔ دیکھتے ہیں۔

سرسری تم جہاں سے گذرے درہ ہر جا جہاں دیگر تھا
اور شاید یہاں اس بات کا اعلاہ ہے جانے ہوگا کہ ابھی تک شعراء کے کلیات کا
مطالعہ کرنے والوں کی کام طور پر یہی کیفیت رہی ہے۔ چونکہ انہوں نے کلیات
کا مطالعہ سرسری طور پر کیا ہے اس لیے ان میں جو جہاں دیگر تھا اس کی خبر
انہیں سرسری طور پر ہی ہوئی۔

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شاعر کا اپنی تنقیدی شعور ہوتا ہے لیکن
اس کو کبھی سمجھنے کہ اس اپنی حقیقت کی طرف غور و فکر نہیں جاتی۔ اس کی وجہ
یہ ہے کہ شاعروں کو تعظیم الرحمن تصور کیا جاتا ہے۔ ان پر گویا اہام ہوتا ہے
اور جو اہام ہوتا ہے اسے وہ پیش کرتے ہیں اس لیے ان لوگوں کی نفس میں
شاعروں کے تنقیدی شعور کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا یا پھر ایسا خیال کیا جاتا
ہے کہ شاعر کوئی سادہ ہے جو کسی نامعلوم مضرب سے بول اُٹھتا ہے یا پھر وہ

مصدقہ اردو۔ ہندو یونیورسٹی پٹنہ (بہار)

نبی صحتے قلب کے شمر کی بھراں میں سب بازی
اگرچہ شمر لیاں بانہ میں شمر لیاں تے۔ بھراں میں
نشاطی کہتے ہیں کہ شعر کہنے سے پہلے اس پر ہزاروں بار غور و فکر کرنا چاہیے۔
نئے شعر پر رعبیت جو اچھا ہزاراں سوئے بتیاں لکھ کر اچھا
تیرکھتے ہیں کہ غری فز کو تغیر تلافی کے ساتھ یا موصفا شاعر کے ذوق طبعیت کا
ثبوت ہے۔

تفسیر تلافی سے یہ غری فز لیں کہوں تاج میں درد کچھ طبعیت کا ہیں سکے
غالب کا قول ہے کہ کلام کو درد ہونا چاہیے اور اتنا درد ہونا چاہیے کہ اگر
اسے ٹوٹیں تو ابھی کہا جائے تو قلم نہ ہو۔
بھولے غائب دل خستہ کے کام میں درد غلام نہیں ہے کہ خوشیوں کو کہیں اس کو
اس سلسلے میں اقبال کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ وہ اپنی اردو اور فارسی
نظموں اور غزلوں میں بار بار اس موضوع یعنی فن اور شاعری کی طرف رجوع
کرتے ہیں اور اپنے خیالات کو زور اور صفائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔
میر کے خیال میں اب مزید شائیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک
کلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر شاعر تنقیدی شعور رکھتا ہے اور اس تنقیدی شعور
کا اظہار مختلف طور پر ہوتا ہے۔

ہم شعراء کی نظموں پر غصے ہیں لیکن ان نظموں کی شکل وہ ہوتی ہے جسے
کافی محنت کے بعد شاعر پایا ہے اور میں غریب نہیں ہوں کہ شاعر کو
کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس نے کتنی بار ان نظموں میں تبدیلی
کی ہے، کتنی سطریں اس نے کافی ہیں، کتنے الفاظ کو اس نے حذف کیا
ہے یا بدلا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قلع برید کا شہ جھانٹا اور درد بدل اسی
تنقیدی شعور کا مروجہ منت ہے جو ہر شاعر کو اپنے ہر تجربہ کو مکمل اور حسین
بنانے پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اردو شاعروں کی نظموں کے اور عینیل مسوڑے
کم ملتے ہیں اس لیے اس حقیقت پر کچھ پردہ ساڑ گیا ہے کہ شعراء درد بدل
کرتے ہیں، شعروں کو قلم نہ کرتے ہیں، انہیں بہتر بنانے کی کوشش کرتے
ہیں۔ بہر کیف کلیاتِ راسخ کا نسخہ جسے راسخ نے خود لکھا تھا خدا بخش
لا بیری میں موجود ہے۔ اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعروں میں
برآمدہ درد بدل کرتے تھے۔ ایک دوسری صورت جس سے اردو شعراء
نے تنقیدی شعور کا ثبوت ملتا ہے وہ ہے اصلاح کی رسم۔ استاد کی کوشش
ہوتی ہے کہ شاگرد کے شعروں میں جو خامیاں ہوں انہیں وہ درد کرنے
اصلاح کے بعد اہم اہم کی باری آتی ہے۔ شاعروں میں شاعر
ایک دوسرے پر اعتراض کیا کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ ان تمام
اعتراضات کے پیچھے بھی تنقیدی شعور کا فرمان ہے شعراء نے مذکورہ
جی لکھے ہیں اور ان میں بھی وہ بعض شعروں پر اعتراض کرتے ہیں بروخی

نظمی یا منظوی غلیظوں کی گزشت کرتے ہیں۔ یہ اعتراضات بھی اسی قسم کے
ہیں جیسے کہ شاعروں میں ہوا کرتے تھے یا جس طرح شاعروں سے باہر بھی
شعراء ایک دوسرے پر کٹھن چینی کیا کرتے تھے۔

اردو کے شعری ادب میں قلمی قلم شاہ سے لے کر کلیم الدین احمد تک
نے فن کی باتیں اٹھائی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے
کی کوشش کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ اپنے خیالات کا اظہار شعر
میں کیا ہے، اس لیے باتیں مسلسل اور کافی مدلل طور پر نہیں کی گئی ہیں،
خیالات کو بھی منطقی دھنگ سے پیش نہیں کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ
ساتھ کچھ بھی کہی ہے کہ بھی کبھی بیان ہم اور غیر متعلق سا ہو گیا ہے لیکن ان
کو تاہیں کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ اردو شعراء نے کافی سوجھ بوجھ اور
غور و فکر سے کام لیا ہے اور صرف اضطراری طور پر یا عالم جذب و کیفیت میں
باتیں نہیں کی ہیں۔

جیل منظر کی شعروں میں بھی تنقیدی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ بہتر
ہوگا اگر ان کے کلام میں پریشیہ اور تنقیدی شعور کا مطالعہ مختلف موضوعات
کے تحت کیا جائے۔ پہلا موضوع سخن، سخن ہے اور کیوں نہ ہو سخن ہی
شاعروں کا Raison d'être ہے۔ اسی لیے وہ سخن پر غور و فکر
کرتے ہیں۔ ان کی گہرائیں کا کھنڈ لگاتے ہیں۔ جیل منظر کہتے ہیں کہ
سخن کی تعریف بہت طرح سے کی گئی ہے مثلاً کچھ وہ ہیں جو فصاحت اور
معنی کی بلاغت کو سخن کہتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو خیال کی فراغت اور اسباب
کی ندرت کو سخن کہتے ہیں لیکن انہیں بے حد اسف ہوتا ہے کہ اس سے بھی
بہتر حالت یہ ہوگئی ہے کہ اب ان سخن کی زینت صرف الفاظ سے کی جاتے لگے۔

کچھ ہیں ایسے جو فصاحت کو سخن کہتے ہیں
کچھ معانی کی بلاغت کو سخن کہتے ہیں
کچھ مختصیل کی فراغت کو سخن کہتے ہیں
کچھ اسامیہ کی ندرت کو سخن کہتے ہیں
اب تو الفاظ سے ہے زینتِ ایران سخن
وائے بروجان سخن وائے بر ایمان سخن

ان کے نزدیک سخنوری بھی فسون لاری اور سخنوری ہے اس لیے کہ منفرد بھی
اپنے سخن میں معنیوں کی تصویریت اگر اس میں آرزو کا رنگ بھرتا ہے۔
جیل اپنی سخنوری بھی گویں کہ ہے معنوی ہے

بنائے تصویر معنیوں کی رنگ بھرتا ہوں آرزو کا
ان کے خیال میں یہ ذوق سخن ہی کا فیض ہے جس سے شعور کی جنبش اب
پردہ الہام کا ترسہ حاصل کریتی ہے۔

خود اسے ذوق سخن جنبش لب اپنے جیل جنبش پردہ الہام ہوتی ہائی ہے

جیل رستہ میں کہ نگینہ دامان سخن کیلئے ہے؟ میں شوقِ خونِ تخیل سے بہ خون سخن
 ہر سخن پہ قتلِ جیلِ دلا بجز نہیں ہے کوئی بھی نہیں لیکن اس دولا انگیزی کے
 ساتھ خونِ حکم میں نمکِ تیز نہیں ہونا چاہیے، بھر سخن میں اتنی تیزی نہیں
 دینی چاہیے کہ جس سے تاثیر میاں گم ہو جائے اور نہ ایسا آہنگ ہونا چاہیے
 کہ مہمِ فغان کی صورت اختیار کر لے، اور نہ اس قدر شہ سوار ہو جائے کہ
 ملتے کا نشان ہی گم ہو جائے اور نقشِ قدمِ داہراں معدوم، اہلِ سخن کو احتیاط
 دینا چاہیے ورنہ یوں سمجھئے کہ اس کے حصے میں ہوا بھی ہے اور اس کا سخن منظر
 ایک ہے جو سخنِ دہ کی تشہیبی کو بھانپ نہیں سکتا۔

اللہ اللہ یہ رنگینی دامان سخن
 شوقِ خونِ تحصیل ہے یہ عنوان سخن
 شاعری کیا جو سخن دولا بجز نہ ہو
 ہاں مگر خوانِ تکلم میں نمکِ تیز نہ ہو
 اتنی رنگینی کہ تاثیر میاں گم ہو جائے
 اتنا آہنگ کہ مہمِ فغان گم ہو جائے
 اس قدر نہ کہ رستے کا نشان گم ہو جائے
 اور نقشِ قدمِ داہراں گم ہو جائے
 پھر تو حصے میں تو ہے ہوا بھی ہے لے دہمت
 منظرِ ایک ہے اور تشہیبی ہے لے دوست

شاعری کیا ہے؟ اس کے مقابلہ میں؟ اس پر بھی جیلِ نظری نے
 پنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جیلِ شاعری کو بھر سخن کا تلامب سمجھتے ہیں؟
 یہ وہ قلم ہے جس میں ستارے لٹھان ہوتے ہیں، وہ فردِ جو رنگِ دہ
 کے کتیلوں میں گم رہتی ہے شاعری اس پر حقیقت کا تبسم ہوتی ہے۔
 شاعری، بھر معانی کا تلامب ہے جیل
 جس میں لٹھان ہیں ستارے۔ یہ وہ قلم ہے جیل
 رنگِ دہ کے جو کتیلوں میں فردِ گم ہے تیر
 شاعری اس پر حقیقت کا تبسم ہے جیل

لن کا خیال ہے کہ وہ ہدایتِ اسالیب جس سے سنی میں زوال پیدا ہوا
 ہو شاعری نہیں شہدۂ قیل و قال ہے۔

اس اسالیب کی عت سے جو سنی کا زوال شاعری پھر تو ہے اک شہدۂ قیل و قال
 شاعری میں جوئے لگ کو درِ خطابت سے جگلا نہیں مٹا چاہیے اور نہ
 رشوریدی سخن سے نالہ نہیں مٹا چاہیے۔ اس میں لفظِ دہنی کا ایسا
 رازِ قائم رکھنا چاہیے کہ سرِ ادبچاند ہو، جذبات کی آہِ دہنی چاہیے
 اس کی سے شہدۂ قیل و قال ہوا دکھائی نہ دے۔

نئے لگ نہ خطابت سے گولانہ بنے داغِ پیشانی کا عالِ ریخِ زیبا نہ بنے

نالہ آہنگ میں نالہ رہے غم نہ بنے
 لفظِ دہنی میں توازن ہو سراوچا نہ اٹھے
 جیلِ شاعری کو لفظِ زلت و رخسار کا قصہ تصور کر کے ہیں اور کہتے ہیں
 کہ اگر اسے نقاشِ جذبات مانا جائے تو پھر جذبہ کی بھی ہزار قسمیں ہیں،
 جیسے جذبہ حب وطن ہے، جذبہ عزمِ احرار ہے، جذبہ مہر و وفا ہے جذبہ
 رحم و دینار ہے۔

شاعری کیا ہے فقط قصہ زلت و رخسار
 ہے یہ جذبات کی نقاش تو جذبہ ہیں ہزار
 جذبہ حب وطن جذبہ عزمِ احرار
 جذبہ مہر و وفا جذبہ رحم و دینار

اور اگر شاعری محبتِ مقصود کی شرح ہے تو محبت کی بھی لامحدود قسمیں ہیں
 جیسے دوستی ہے، محبت ہے، شفقت ہے اور محبت بھی محبت ہی کی
 ایک شکل ہے۔

شاعری سے ہے اگر شرحِ محبت مقصود
 تو محبت کی بھی قسمیں ہیں یہاں لامحدود

لیکن اس شاعری کو کیا ایسے جو جذبہ شفقت کو زبانِ ندرے سے سکے اور
 شفقتِ دیوفاقت کو زبانِ دینے سے بھی محروم نہ جائے۔ انہیں ایسی
 شاعری پر افسوس ہے جس نے اپنی ساری توانائی منفعل جذبہ جنسی کے
 میلان پر صرف کردی اور لگ و بلسل کی کہانی کو ہی اپنا دینِ دیکھاں تصور کیا۔

دوستی بھی ہے محبت بھی ہے شفقت بھی ہے
 اور محبت ہی کی ایک شکلِ عقیدت بھی ہے
 شاعری جذبہ شفقت کو زبانِ دے نہ سکی
 شفقتِ دیوفاقت کو زبانِ دے نہ سکی
 منفعل جذبہ جنسی کی زبانِ کہتے
 عسر گد، لگ و بلسل کی کہانی کہتے

اس لیے جیلِ نظری شاعری کو پھر اپنی تحصیلِ اند دہنی کی کیفیت سمجھتے ہیں۔
 شاعری نام ہے پروازِ تخیل کا جیل اس کی سنو تو مری سنی پیشاں بھی نہیں
 اور نہ میری نغم میں شاعری دہنی کی کیفیت
 تیری نغم میں شاعری لفظ کے کھٹکھٹات

جیلِ نظری کہتے ہیں کہ فن کو زندگی کے صحرائیں درختوں کا ایسا سلسلہ
 ہونا چاہیے جو کسے چلے ہوئے مسافر کو دوری سے بل کر سایہ دے
 سہرِ جیل کے رنگ کو دنیا کے رنگ کی مناسبت سے بدل بھی دینا چاہیے۔
 یہ پروفِ زندگی کے صحرائیں وہ درختوں کا سلسلہ ہے
 جو کسے چلے ہوئے مسافر کو دوری سے بلارہا ہے

اور۔ رنگ مغل کا بدل دے رنگہ دنیا دیکھ کر
 ہو کہ جاے سونے والے خوب فرما دیکھ کر
 جیل نے شعر و ادب کے مندرجہ بالا نکات کے علاوہ خود شاعری کی شخصیت
 اس کی خصوصیات اس کی ذمہ داریوں اس کی طبع 'عشرب' گہوار اور دوست
 بہت سارے متعلقہ مسائل پر بھی بحث و طعن فرماتے رہے ہیں۔ جن سے یہ
 احساس ہوتا ہے کہ شاعر کو صرف ایک جیل آزاد تصور کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس کی
 ذمہ داریاں انہیں ہوتیں، ہر سزا غلط ہے۔

ملازم جیل منظمی کہتے ہیں کہ شاعر اپنی ذہن کا پتکا ہوتا ہے اور خواہ اسے
 ڈیڑھ لائے یا ترم یکا ہے وہ صرف اپنی ذہن کو فوقیت دیتا ہے۔
 میں چلتا ہا منظمی اپنی ذہن میں۔ مجوں نے بکایا قدامتے پکارا
 شاعر وہ ہے کہ ذہنی کمال کو کچھ کر شیریں سخن بناتا ہے۔ وہ ہجوم نکس
 محو رہتا ہے اور دوسرا کوئی اس کے اس ہجوم فکر کا ساتھ نہیں دے نہیں
 سکتا۔ اس لیے وہ انجمن میں تنہا ہوتا ہے۔

اس زہری کئی کچھ تو جیل میں دل رکھ کر مانتے دے جسے اپنی کشتی پر سستی پائی
 اور۔ ہجوم نہ کر کے اپنا لیا ہے مجھ کو ہمسیر
 فلک نہیں ہے کہ میں انجمن میں تنہا ہوں
 شاعر سبک شام گزرتا اور طلوع صبح گنگا ہے اپنی آنکھوں کے لیے شہر حسن
 حاصل کرتا ہے۔ دیو زندگی اس کا سرمایہ ہے اور وہ اپنی جیتی گاتا ہے۔

سبک شام گزرتا ہے طلوع صبح گنگا ہے
 یہیں شاعری آنکھوں کو شہر حسن ملتا ہے
 اور۔ دوجیل اس دنیا میں شاعر کا سرمایہ ہے
 شاعر اس کو کہتے ہیں جو اپنی جیتی گاتا ہو

جیل منظمی نے سخن، شعور، موضوع، معنی، شاعری کے مقاصد اور شاعر
 کے اوصاف کے متعلق جو باتیں کہی ہیں، جن خیالات کا اظہار کیا ہے، جو زاویہ نظر
 پیش کیا ہے اسے آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب دیکھئے کہ وہ متفرق اہمات
 مثلاً فطرت، انعم اور شہرہ وغیرہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ جیل کے نزدیک وہ
 غزل جو آپ دو رنگ سے خالی ہو ادب میں شمار نہیں کی جاسکتی اور وہ غزلیں
 جو حقائق کو غفلت میں محو کر گمراہ کر دیتی ہیں، زور ہند کا مترجم کہتی ہیں۔

ہے آپ دو رنگ سے خالی جیل کی یہ غزل
 ادب نہ اس کو سمجھے کہ ہے یہ ادبی

اور۔

زور ہند کیجئے منظمی کی رضوی کی فستولوں کو
 حقائق کو غفلت میں محو کر مجسمہ کر دے
 جیل غزل کو شہرہ حدیث ناناہی بتاتے ہیں، اس لیے اس کے انداز نگاہ

آنکھ کی دہلی

میں خدا سا لوہ کی بھی قید لگا دیتے ہیں۔
 غزل جیل ہے شرح حدیث ناناہی۔ خدا سا لوہ تو انداز نگاہ میں ہے
 وہ غزل کو دل کا راز بھی کہتے ہیں جو صاحبان دل سے کہا جاتا ہے۔ اس
 کے لیے دل ہی کی زبانیں بھی منور و مناسبت ہے۔
 جیل اپنی غزل دل کی زبان میں ہو تو بہتر ہے
 کہ دل کا راز ہے صاحبان دل سے کہنا ہے
 جیل کا خیال ہے کہ وہ غزلت جو فلسفہ اور شاعری دونوں کے پرچ کی چیز ہو کر
 رہ جائے لائق اعتنا نہیں۔

تہا ہی اس غزلت کو کیا کہیں میں جیل۔ جو فلسفہ نہ ہی اور شاعری نہ ہی
 ان باتوں کے علاوہ جیل منظمی ایک غیر معمولی فنکار کی طرح صرف یہی نہیں
 کہ آواز میں سخن کو دیکھتے ہیں بلکہ انہیں خاموشی میں بھی حسن کی تصویر ملتی ہے۔
 وہ اس کے قائل ہیں کہ نظم اور آشفٹ غزلوں میں حسن ہے اور اس کے
 ساتھ ساتھ ماستی اور گہری میں بھی اور ان کا یہ خیال غلط نہیں کہ اگر فنکار کی آنکھ
 میں روشنی ہو تو وہ خلقت میں بھی حسن تلاش کر لے گا۔ کہتے ہیں۔

آواز میں بھی حسن ہے اور ماستی میں بھی متغیر میں بھی حسن ہے آشفٹ میں بھی
 یوں تو ظہور حسن کا ہے راست میں بھی اک بائیں ضرور ہے لیکن کی میں بھی
 سب سے پہلے اگر تو بصیرت میں حسن ہے
 آنکھوں میں روشنی ہو تو خلقت میں حسن ہے

موت دے کہا تھا کہ توں، تیل، گڑی کی فکر کے ساتھ ساتھ شعر گوئی نہیں
 ہو سکتی۔ جیل منظمی بھی تو یہی جی خیال کے حامی ہیں۔
 لیکن شعور حسن کا اس آگے کے ساتھ ممکن نہیں ہے طبع کی آشفٹ کے ساتھ
 چپے گا خاک ذوق نظر منظمی کے ساتھ ہوتی ہے فن کی شہرہ نازنگہ کے ساتھ
 لیکن اس سے زیادہ شہرہ نازنگہ جیل منظمی کی ان کے مرانی کے دوسرے اشار
 میں ملتی ہے جن میں وہ دیکھیں سیالی اور تاثیر میں دونوں کے نازک رشتے
 پر اظہار خیال کیا ہے۔ فطرت اور منہم فضاں، نقش قدم ماہراں اور لفظ و معنی اور
 جذبات کی آواز ان تمام چیزوں پر اپنی گہری تنقیدی نظر کا ثبوت دیا ہے
 ان کے تنقیدی شعور کی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔

آئی نگہ کی کا تیریاں گم ہو جائے فطرتی حق کو منہم فضاں گم ہو جائے
 اس قدر نشہ کرے کہ کشاں گم ہو جائے اور نقش قدم ماہراں گم ہو جائے
 فطرت میں تو توازن ہو تو شر اور خاندان اٹھے
 آج جذبات کی دھم دے شعلہ نہ اٹھے

ہم اس نیچے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کے اہم شاعروں نے بھی خود اپنے کام
 میں گہرے اور باقاعدہ تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ جیل منظمی بھی ان
 ہی اہم شاعروں میں سے ایک ہیں۔

اگست ۱۹۸۲ء

جمیل مظہری۔ کا تخلیقی مزاج

اور ضمیر عقلمند و شیعیت (یعنی مکتب حسین و علی) کا مرکب ہے۔ اس روایت پر ان کے ابتدائی ادبی تاثرات گہرا اثر ہے۔ ان کی جس تکنیک کا اس قدر شعور ہے وہ اصطلاح کی عقلیت سے دل چسپی کا نتیجہ اور شیعیت ہے یا بعض عقلی قدرتی ان کی جذباتی پناہ کا ہے ہیں، جہاں گہور پیکر اور تنگ باز کردہ اپنی نفسیاتی تکنیک کے خواباں ہوتے ہیں۔ مگر ان کی روان پسندی اور عقلمند زندگی وہاں بھی انہیں تازہ نگہ نہیں دیتی۔ چنانچہ ان کے فن کا سارا راز انہیں ہی بنا جڑا ہے تیار ہوتا ہے جس پر روایت ایک غالب رنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم براہ راست اس مزاج کے تئیں اجڑا کا اصطلاح کریں ان کے انمول کی روایت و عقلمند کا ایک سرسری جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے کہ یہ عقلیت اقبال کی طرح اجتہادی نہیں بلکہ تقلیدی ہے۔

یہ وہی روایت و عقلمند ہے جس میں نیاز فنجوری، امجدی الاغلائی اور سجاد انصاری وغیرہ ایک زلزلے میں بری طرح مبتلا تھے۔ اصل میں ہوا یہ کہ ہندوستانی تمدن و سیاست پر انگریزوں کی حکمرانی سے رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے مغرب کی اس استعماری منطق و عقل جزوی کی پریشانی، مادہ پرستی اور حس اور اس کا بول بالا کردیا جس کا آثار یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے دورے ہوئے کا عطا چنانچہ اب جوہر (غیرادی) کو عرض (مادی) سے فروتر ثابت کیا جاتا ہے۔ یعنی حقیقت کے ادراکی تصور کو کو برکس، لیکل، نیوٹن اور دیگر کارٹ وغیرہ نے جب اوسط کے رکھ دیا تو ہر شے زندگی میں مگر وہاں کا عالمگیر تصدیق و تائید کا ماتم ایلیٹ کو زندگی بھر رہا۔ اس کے لفظوں میں: جو غنڈی کے انقطاع کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی ہم کبھی اصلاح نہ کر سکے ۵

اس تصور حقیقت کو چھوڑنے کا نتیجہ جن عسکری کے لفظوں میں ہوا: مغرب کے ہر گھر میں خدا کے بجائے واسطہ مبین آگئی اور گھر والے کی یوی ڈرائی کیمزین کے رہ گئی ۵

اس اجمال کی صورتی سی دلچسپ تفصیل یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے دورے پہلے

کسی شاعر کے فکر و فن اور اس کے مزاج کی شناخت سے بہین ذرائع بالکل واضح ہیں۔ اول یہ کہ غور و مطالعہ کے بعد اس شاعر کے فحش اور ناقد کے نتیجے پر پہونچے اور ان کی رائے کیلئے۔ دوسرے غور و شاعر کے دعوے اور اقوال اور کسرے خود اس کا فن جمیل مظہری کے لفظوں اور ناقدوں کے اقوال کو یہاں ہم کسی عقلی ہی کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اور ان کی مزاج شناسی کے سطحے فی الحال ان کے قول و فعل یا گھر و فن کی روشنی میں پیشوری کسی گنگو کرنا چاہتے ہیں۔

موصوف نے نظم و نثر میں متعدد مواقع پر اپنی شخصیت اور اس کے مزاج کی طرف مختلف انداز میں پوری بے تکلفی کے ساتھ واضح اشارے کیے ہیں کچھ لکھیں میکس نے ر و کا تو کبھی مدرسے سے گھبرا کبھی توں نے آواز دی تو کبھی نواسے سروش پر سر دھننا رہا، عرض ہتکے اور بچکے کا سلسلہ شعر جاری رہا۔

بیک بیک سے کچھ یہاں وہاں سہدے
بچک بچک کے حقیقت تلاش کی میں نے

اس تلاش میں وہ عالم بردگی و خودگی سے بھی گذرے مگر زندگی بھر کے مطالعہ و کاوش کے باوجود نہ تو رخ بن سکے نہ فحش اور نہ سیاسی ایڈر یا مفکر و موصوف کے لفظوں میں ”میری بیٹھ تجربات کے پوچھ سے ٹوٹ رہی ہے مجھے کہیں بھی تک دینا چاہتا ہوں“، ”ملوثی آب و سراب“، ”میں ایک مقام پر“، ”میں خود اضمحالی“، ”میں لہذ بہن کو ذہن مہذب“ کے علاوہ یہاں تک کہ کہہ سکتے ہیں

میں ایک فدا و گل ہوں
خود لہذ وجود سے فہل ہوں

یہ صبح ہے جمیل مظہری کا صبح مظہر ماسی طرح اپنی ملائت آپ کرتے رہے مگر اس طرح کے پیکر کے دیکھنے تو حقیقت کے کہ اور ہی نظر آتی ہے اور وہ حقیقت ہے کہ جمیل مظہری کی شاعری کا مزاج بنیادی طور پر روایت

۱۷/۲ برائٹ ڈارنگ کالونی، راپنی ۲۰۰۹ء

لا ایک شروع کر دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء کے قریب ڈی۔ ایچ۔ لائوس نے اعلان کیا کہ انسانی تعلقات کا ادب مرگیا۔ اور ۱۹۲۸ء کے بعد اردو نے اعلان کیا کہ انسان مرگیا۔ غرض اذکار مغرب کے ایک پارک کے بقول:-

نیاز فوری، مہدی افغانی اور سجاد انصاری کی طرح جمیل مظہری بھی اردو میں اسی کثرت اور تعداد کے چند ایسے ہیں۔ کیسے کہ چونکہ مختصر اقتباسات ہی کے الفاظ میں اظہار فرمائیے، نیاز فوری سہ ماہی کے آس پاس ڈرتے ہیں:

”علوم جدیدہ اور انکشافات معارف نے عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریت و کرم و تمیز کی دولت کے دو ماحول کو گھول مائل کر دیا ہے“

جیل مظہری کی خیال کی رو سے مطبوعہ الملاح ششماہی راجنہ ۸۹ء سہ ماہی اول
شمارہ ۱۴ میں فرماتے ہیں کہ غالب کا یہ شعر صحیح بہت سہل ہے۔ جب منہا ہوا ہوں
تو اس کا یہ امر غلط لگتا رہتا ہوں ۷

”اور ایمان کی بات پر مجھے توجیت برابر غلوغ خدا (اہلسن شیطان)
ہی کی ہو رہی ہے۔ خالق خدا یعنی حضرت یزد داں برابر کھستوں پر
فلکسین کھا رہے ہیں۔“ (صفحہ ۱۶۶)

اب کہ تھوڑا سا نیل منٹوی اب دوسرا ہے۔
 سب نے مل کے ایک بغاوت تم میں غمی جوادی مزار ہے
 یہ غم جو، میں گردن جو بس میں جس دور، شمشیر کی رسیں

اوی دیاے آگے تھیں ایک حقیقت کو سبھم طور پر اجاگر کیا۔ انگریزوں نے اسی حقیقت سے انکار کیا۔ آگے تھیں ایک حقیقت کو سبھم طور پر اجاگر کیا۔ انگریزوں نے اسی حقیقت سے انکار کیا۔ آگے تھیں ایک حقیقت کو سبھم طور پر اجاگر کیا۔ انگریزوں نے اسی حقیقت سے انکار کیا۔

فرانسیسی مفکر مونتین (Montaigne) صاحب کوپین میں گری پست
پسند تھی، مگر اسے مل کر ناپسند ہو گئی۔ اس سے موصوف نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان وقت
کی حیثیت طلق نہیں بلکہ انسانی ہے۔ بنیادی حقیقت بھی فرد اور زمان و مکان کے
مذاہب بدلتی رہتی ہے۔ لہذا انسانی ذہن کی معراج معرفت میں کوئی ٹھیک ہے۔ اگرچہ
علمی مسٹر ہیوم (Hume) نے تو ٹھیک کی اس نے کو اور اسے بیٹھا۔ وہ ہر طرح
کے غیر سنجیدہ تجربات ہی پر حکام اٹھا کر رہ گئے۔ وہ تو انسانی زبان و بیان میں ایسے
افکار کو بھی محال قرار دے کر اسے عامی غرض کی کائنات و عینیت سے جو بھی روحان
آگے چلا کر انیسویں صدی میں فرانس کے علمی کونست (Conte) کے یہاں نظریہ
تجربیت ⁴ Positivism پر کاربھار کو بیسویں صدی میں انگریزوں کی عقلی
تجربیت (Logical Positivism) پہنچا ہوا۔ ان فلسفیانہ تکتبہ البڑوں کے
اطمن سے بعد میں عجیب و غریب اور متضاد قسم کے نظریات و رجحانات کا ظہور
شروع ہوا۔ ایک طرف خدا پرستی (Theophobia) آگے بڑھی تو دوسری
طرف "افرادیت پسندی" ⁵ Individualism سے انسانیت (دوستی)

پہلے فطرت پرستی (Naturalism) کا لقب پرستی Utilitarianism پر اور آخر کار اخلاقیات ... آزاد ذہنیت اور آزاد خیالی
 Free thought کے ساتھ حیثیت، وجودیت اور امانیت وغیرہ بھی
 سامنے رکھے تو فرشتان خیال کا ایک ہلکا سا خاک تو پناہ بنی سکتے ہیں۔ اس سب کا
 خلا کر سکتے تو اب بھی کہ کثافتہ فانی ہے جس انسان پرستی کا رنگ چھیر گیا اس نے
 سترہویں صدی میں عقل پرستی کی دھن بڑھا دی، اٹھارہویں صدی میں عقل سے
 انکار کا جھڑ و فحش کی پرستش شروع ہوئی۔ پھر اب اس سے بھی نہیں بڑی تو ایسویں
 صدی میں حیات کا عمل شروع ہوا۔ اس صدی کے آخر میں نینتے نے اعلان کیا
 کہ خدا مر گیا ہے۔ ۱۹۱۵ء سے زندگی کا عمل تیز ہوا تو حیات کے کھیل سے انکار کا شعور

۷۔ چہ زہر قدم زور انکاس
۸۔ بنوا غلطہ خسرو و شرکی
۹۔ تفریق حسین و زیددی
۱۰۔ آخر میں تھک گیا تھا۔
۱۱۔ اطلس یہ عرض ہمارا
۱۲۔ گئے ہی ہے مشکوک بہیم
۱۳۔ حیرت سے غذا نہیں دیا
۱۴۔ سنا ہوں کہ مغرب ہے ہر
۱۵۔ لے کاش ایسا ابر آتا
۱۶۔ عروج کی پیاس بھی بھاتا

مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں مگر اس کی جنرل ضرورت نہیں۔ خالص
فکری سطح پر بھی جیل نظری کی جملہ تحقیقات میں عصری روایت و عقلیت کی
جزیرے کافی گہری ہیں۔ روایت کے سلسلے میں یہاں بہت تفصیل یا بھاری
بھکر جواہروں کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ روایت کی چند خصوصیتیں جانی اور
مائی ہوئی ہیں، ان میں انفرادیت پسندی، وحدت طرز، حیرت خیزی، جمال
پرستی اور انقلاب انگیزی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان تمام خصوصیات کی روشنی
میں اس کے ان کے اشارت کی کھنٹی آپ بھی کبھی کسی عقلی کے مقابلے میں دیکھ لیجئے گا۔
ہیں یہاں صرف یہ عرض کرنا کہ یہ حیات و کائنات کے اس روایتی نقطہ نظر میں تنہا
رومان پسندوں کا زیادہ تصور نہیں ہے تو پورے فکر مغرب کا دامن ہے جس نے زندگی کا باند
الطبعی حقیقت اور زندگی وحدت کو نظر انداز کر دیا اس نے عقل کی روشنی کعبوں
اور جملہ مظاہر کو گھوڑے کے دیکھا مگر اس باور باؤس اور اس کی پشت پر کام
کرنے والے دماغ کو نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ جزیرے کی شے بھی نظر منظور ہو گئی،
اور بار بار اندرونی جھوٹ کا ایک لاشناہی سلسلہ چلا۔ ڈانڈے انسان کو
جوان ثابت کر دیا، اگر کسی نے اسے سنگم پرست حیوان قرار دیکھنا تو گلے نہ دوں
آگے بڑھ کر اسے جوانی جیلوں کا خلاصہ بنا۔ فرزانے مطلوب اضطرابات ثابت کیا
قویاں لے کر دوسرے کہا اور لوگ نے تو جانی قرار دیا۔ افکار کی پر آگندگی
اور ڈیڈر کے جیل نظری میں خود کو دیکھا۔ چنانچہ آسان بھی نہ تھا کیونکہ فنکار تو
یوں ہیں اپنے وقت کا بے حد حس اور لطیف جانتے و فہم نہ تھا کہ کامل فرد ہوتا ہے
بالہوم وہ اپنے عہد کے چلنے ہوئے افکار و نظریات میں سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ کلین
کارٹیک ناہم عصر ہوتا ہے جو پہلے جوئے خمر سے اپنا دامن بچاتے ہوئے اپنے
فکروں کو اپنے تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ کر کے کوئی نامور دینے کا کامیاب
ہو جاتا ہے۔

بہر کیف آجے اب اس کے شعری مزاج کے عناصر روانہ کا مطالعہ کیا جائے
موصوف کے رومان عناصر کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارے کے چاہئے ہیں۔
یہاں اردو ویں اعظا رومان بن محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لحاظ سے

بھی روایات و شایعات کے ذیل میں، ماس کی پٹی، دمو صوف کی سب سے
پہلی نظم ۱۹۲۳ء، "جسٹویری"، "عورت"، "دو شیرہ بنگال"، "موسیقی"، اور
"نقوش امنی قابل ذکر نہیں ہیں، ان تمام نظموں میں ایمان دینا کی انفرادیت
سے قطع نظر یا آزاد اور تحریراتی کی مثال پرستی واضح ہے۔ اس کی مٹی پھولوں
کی بھرمت اور پتوں کی گھونگھٹ میں اپنی دھن میں اس طرح گاتی ہوئی نظر آتی
ہے جیسے آکاش کی کوئی دیوی پوری وادی کو اپنے ترنم سے لبریز کر رہی ہے اور
شاعر کے جذبات کی دنیاں پر رہی ہے اس کے ایک سال کے بعد کی نظم ہے -
"جسٹویری" (۱۹۲۵ء) جسٹو کی ہے خود شاعر کے نظموں میں ملاحظہ فرمائیے۔

ایچ جواں ہوں یعنی ہے ابتداء فراق
وہ دن بھی آئے گا مل گئے دوائے فراق
کبھی پیری ہو گا گی بہانہ جو تیسری
نظم "عورت" (۱۹۲۸ء) میں انھوں نے اپنی شاعری کو خود ہی واضح
کر دیا ہے۔

لے تیرے جلوہ رنگین سے اجمالی دنیا
تجھے سے آباد ہے شاعر کی خیالی دنیا
کم و بیش یہی خیالات "دو شیرہ بنگال" کو دیکھ کر ان کے دل میں ابھرتے ہیں
وہ بیکر رختان عہدے روح تحمل ہے، "نظر بنائی ہے اور کیا کیا نہیں ہے، چنانچہ
موسیقی کا سفر بھی عنوان شباب میں اس قدر ہے کہ اس کی ایک پوری کتاب لطیف
موسیقی ہے اس لئے

۷۔ گاتے جا گاتے حسینہ
۸۔ "نقوش امنی"، اس میں کوہ بندہ چاکر حسین میں نظر ہے جس کی وادی میں
ایک جوگ بھگن کی شہزادی کی طرح بہار کے گیت گار رہا ہے، ایک نظر آپ بھی ملاحظہ
فرمائیں۔

۷۔ ستارہ نازک انگلیاں بھینس، کلانی کوری چکس ہی تھی
انگلیاں بھینس دل میں کونٹ رنگ جوانی چکر گدی تھی
جیل نظری کی جس عشق شاعری کی تعریف طویل الرحمن اعظمی مرحوم نے کی ہے،
وہ اس کے بعد کا دور ہے، اسی دور میں انھوں نے مومن و حضرت کی عشق شاعری
کی توسیع کی ہے اس دور کی شاعری ہوائی کا شہر اور درونگ اور مضمون
و فرح امن سب کی وحدت اور تفریک کے دوا سب اہل داخل واضح ہیں، اولاً یہ کہ ان
کے عشق کا بارود خود ان کی ذاتی ذہنی کے سنگین واقعات سے بنا ہے اور
دوسرے یہ کہ ان کی تعریف پسندی نے اس کی وحدت و تہداری اور تفریق میں
کچھ کمی جنش پیدا کر دی ہے، مضمون بالتمام میں وہ مثبت اہلہ نظریہ صحت کی
شعری توجہ اس طرح کرتے ہیں۔

میرا عقیدہ یہ کہ مضطرب شوق کی جنات ہے

تمہارا غلط کہ عشق، صرف محب ذات ہے
خیال دونوں کی کہ نہ خوش و دروں غلط
تپش غلط، کشش غلط، فسوس غلط جنوں غلط
تبیہ یہ ہو کہ خوشی یا سکنا نہ کھوسکا
تمہیں وفاتہ اسکی مجھ جنوں نہ ہو سکا
اور مال کیا کرے۔

۵۔ دل اپنی آگ سے نئے شرارت لگاتے رہے
ہم اس پر اپنے فلسفوں کی لاکھ ڈالتے رہے

جیل مظہری کا تعلق مزاج اسلامی ہے کہ ایک طرف آتش دہاں اور دوسری
طرف شرارت اور اس کی ترکیب بجا جانے کا شکار کو وہ آتشہاں تپتی ہے اپنی سے ان کے
فن کی کاٹ میں غرضی و اخلاقی ہوتے ہیں۔ اس پر زبان و بیان کی محبت نے
موت پر سہاگہ کا کام کیا ہے "اعتراف" اور "مکاشفہ" میں انھوں نے غنیمت اپنی اس الٹا دک
عشق پر زندگی اور اپنے فتنے اس رسی کی مزید غلاب کشائی کی ہے۔

وہ تو غریب کی خوشی میں جھینکا سامنا میری امیدوں کی دنیا میں ادا ہو
اف تو اچھوٹوں میں تماشہ سہاگہ کی میرے کار تخیل کا وہ محسوس ہوا
ہو چلی میں فضا ہے قرب کی تکمیل گھل چکی شمع میں اب سے لٹکا ہوا
شاعری اس بطل مرحوم کا نام ہے شریں میرے شعروں کو مبارک میرا ملا ہوا
مگر عشق و دروہاں اور تپش فن کا اصل دور اس الٹے کے بعد ہی شروع ہوتا ہے شاعر
کے دل میں لگی ہوئی گلاب اس کے پورے شعری وجود کو نہ مٹا نا شروع کر دیتی ہے
چنانچہ پہلے چل کر انھوں نے "کیا ہو نام کو" "دروہا" "وہ" "اسے بھول جا بھلا دے" "نا
جیسی شاہنشاہ کا وٹھیل پیش کیں یہ تکیلات کو داد و درمیت دونوں کا شہرہ دو شاعری
میں اپنی انفرادیت اور تاثیر فنی کے لئے برابر ادا کی جاتی رہیں گی۔

ان بے حد جذباتی نظموں میں بھی شاعر نے عشق کے ساتھ ساتھ خوش و خوش و خواص
کا ہر گہز گہز پیش کیا ہے۔ ان نظموں کے خواتین ہی میں محض روانی جدت نہیں بلکہ ان
میں ہر جگہ جس مہذب اور سرشت میں بھی ہوشیار کی کثرت پیش کیا گیا ہے اس کی وجہ سے
قارئین کے دلوں کو برائے کی صلاحیت بخوراتی ہے۔

مروا اور ماہر ماہر حالات نے جہاں کے شمع کو پوری طرح ناکام بنا دیا اور
وقت کے ساتھ سب عشق تھا تو آخر خیر ان کی جدائی روایت کے ریکس میں کی شکل پسند
روایت نے انھیں ملک و ملت اور انایت سے مختلف النوع مسائل کی طرف مائل کیا۔
یہاں میں ان کا سہارا ملاز زبان و بیان اور ان کی انفرادیت غناس جہد کے دوسرے بڑے
شعرا کے مقابلے میں ان کی تخلیقات کے امتیاز کو برقرار رکھا جس کا اعتراف بالعموم تمام
قادین نے کیا ہے مگر ایک اہم گتہ پر نظر انداز ہوا ہے یعنی خود میں مظہری کے مختلف موضوعات

کی شاعری کا باجمعی تعالیٰ و تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت راقم کو فکری
تفصیل میں جانے سے قاصر ہے مگر تاہم درود عرض کرنا چاہتا ہے کہ "دروہا" "وہ" "اسے بھول جا
بھلا دے" کے مقابلے میں عام طور سے دوسرے موضوعات کی نظموں میں غرضی و شری حرات کی کھینچی
کے باوجود واضح طور پر ایک آغا کی کمی محسوس ہوتی ہے اور اس سبب سے ان کی شعری
اپیل کمزور اور سرسری سی ہے شاعر نے اس کی کو اپنی تخیل پسندی اور تکرار سے بڑے
کڑے کی کوشش ضرور کی ہے مگر درود جو بات کی باہر اس نوع کی تحقیقات ہے انہر
ہو جاتی ہیں۔ اولاً یہ کہ عشق و دروہاں شاعری کی آبدیہاں اور دل پر گذرے ہوئے حقائق
جن سے ان کا پورا وجود متاثر تھا چنانچہ وہاں دل سے جواب نکلتی ہے اثر کتنی ہے کا

معاہدہ۔ اس کے برخلاف تفکرات و تاثرات اور سبابت و علانیات کے بعض
مسائل میں غلیظ دل میں ہے باوجود اس محسوس ہوا ہے کہ انھیں شاید غلط کرنے
کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہاں شاعر کے نواں مگر کا حصہ نہ جن
کے اس لئے ان کی اپیل دروہاں کی نظموں کے مقابلے میں کتر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے
کہ ان مسائل کے حل اور ان کے "غیرات" میں کو فطری ڈولیدگی اور تضاد ہے ان کا
خاکہ کیے بغیر نہ کرنے قابل بطور پیش انھیں اور ڈھلایا ہے مزید یہ کہ انہم نہاد
فلسفیانہ گفتگوں کا اردو سے تہذیبی مزاج سے ماہر ہی کمی کوئی میل رہا ہوا سامنے
یہاں شاعر کا غلط آگے جس محسوس ہوتا ہے بالکل اس طرح جس طرح روس
کے اشتراک انقلاب کے زیر اثر اردو میں جبرتی پسند شاعری شروع ہوئی تو اس
غیر فطری اور مصنوعی پیغم دھار پرانے سے بیوں برس قبل چیرا غن محسوس نہ
یہ شعروں کا ثقاہت کے نثری پسند شاعر کا غلط کہ بگڑی یہاں کھڑے کر کلفت برتن
وضی ہے راہ روی کو قافیہ کے ساتھ بطور رغبت پیش کرتے ہیں۔ جیل مظہری
اس طرح کی سستی خیزی سے کام نہیں لیتے مگر اپنا اور مگر دروہاں کی
وجہ سے وہ عمر بھر روانی تخیل پسندی کے حال میں ضرور گرفتار رہے۔ اس انتقال
پسندی نے انھیں تشکیک سے آگے بڑھ کر ساد قات خدا پرستاری،
ماہ پرستی اور رسمی شاعری پر بھی آمادہ کیا۔ اس ضمن میں ہم نذر عقید و ت

اور احباب کی دلجوئی کے لیے خود دلائل غنیمیں بھی گئی ہیں ان سے صرف
نظر بھی کر لیں تو "بھوک"، "غریبوں کی عید ارتقا منزل اور شاعری تمنا"
وغیرہ کی رعیت اور بے جان شاعری کی کو تبہ کہے کر سکتے ہیں۔ بہمان
کی عقلیت زدگی اور تشکیک کو بھی موارا کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ وہ
ان کے جذبات کا حصہ بن کر تخلیقات کو نکھار سکیں۔ انہوں نے اس کی
کوشش کو ضرور کی مگر اس میں بری طرح ناکامی ہوئی۔ بالادہ شاعری
آب و دراب میں جا بجا اس تخیل کو فنی بباد رہ پہلے میں کا میاب کہے
جاسکتے ہیں۔ دلیے بحیثیت جمہوری یہ پوری شاعری بھی ان کی ڈولیدہ
فکری اور سیاسی روح کا نفور اعطش میں نہ کر رہ گئی۔

نظم حقیقت اس کی خدا یزادی (Theophobie) کے موضوع کو پیش کرتی ہے۔ آدم نو کا ترانہ "سفر" اور ہم کون ہیں ہم کیا ہیں میں نشیک کی روایت شااعر انداز میں پیش ہوا ہے۔ موخر الذکر اپنی روانی اور ہیئت کی حدت کے اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے۔

اک سوئی پشماں میں اک خواب پر ریتاں ہیں
پیدا میں نہ ہنساں میں بدنام بہ ہستی ہیں
ساغر میں کونستی میں بر بلا میں کفر نفس میں
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ؟

یہ صحیح ہے کہ اس قبیل کی نظموں میں جمیل نظری اپنے معاصر شرکاء کی طرح آپسے اپر نہیں جڑ جاتے۔ ان کی سیم الطبعی اہمیت بدل گئی ہے اور ان کے دھندلے فکروں کو کھلنے دینے کے لئے بڑھتے جاتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ہی ساتھ جوں جوں اس نام نہاد عقلیت زدگی کا پول کھلتا جا رہا ہے موصوف کی فکری تضادات واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی تضاد نے ان کا رنگ بھالیا اور جی بھریوں کا بھر پور کا جزو بننے نہیں دیا کی لیے قدرے متوازن انداز میں ان کی حیثیت کم و بیش ترقی پسند شاعروں سے ملتی جلتی ہے۔

ابن مختلف تجربات اور مراحل سے گزرنے کے بعد وہ اپنی تخلیق منزوں میں جب جرب اپنے تہذیبی مزاج اور آفاقی شمس اخلاق دانہ اسے قریب جوئے ہیں ان کی تعلیمات نے دوسرے دوسرے دوچار ہوئی ہیں۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ انہوں نے یہ کاموں کی طرح اپنی بے راہ رویوں پر کسی نہرے غلاف کی ضرورت سمجھی نہیں محسوس کی۔ پوری صفائی کے ساتھ اعتراضات کرتے ہیں کہ۔

فریب کھاتے ہیں رنگ دلو کے سراب کو پوچھا ہا ہوں
مگر ستارے کی روشنی میں خود اپنی منزل پہ آ رہا ہوں
جھکا ر تھا اور خدا آدم میں ان کی فلسفیت و تخیل پر کاظم حد سے
فردن مقام

مزاج آتش سوزان کو کر دیا خدا جمادی بزم عناصر میں کھلی میں نے
محکمت کی ہبری میں پروان کی انگلیں اسکاں کے آدوں کو کھیلنے لگا دیں
مگر بہت جلد وہ دیا گئے انہیں اس نیچے پر پہنچا یا کہ۔

میں سانس لیتا ہوں ہر قدم پر کہ بوجھ بھاری ہے زندگی کا
راقم الحروف کے اس آخری دفعہ کو (شعی انداز اخلاق) کو پہنچنے
کرنے سے پہلے اس کی دیووں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ موصوف نے اپنی تحریر و تقریر میں بار بار اس بات

کا برملا اظہار کیا ہے کہ تاریخ کی مظلوم ترین شخصیت حضرت حسین کی کئی دوسرے کرشمہ سے ان کو ایک فکری لگاؤ رہا تھا، وہ محض میر انیس کے ولادہ نہیں تھے بلکہ جب بھی ان سے فراشی نظموں کی استدعا کی گئی انہوں نے انی البدیہ پر اپنے تخلیقی جس ہیئت کو اختیار کیا ہے وہ مسدس کا نظام ہے جو صنف مرثیہ کے لیے تقریباً مخصوص ہے۔ چنانچہ بہت سی نظموں کے علاوہ "متمزقات کی بیشتر نظموں کی ہیئت ہی مسدس ہے مثلاً نوری گاندھی، غم کی یادیں، نوائے ہمدیت، اندر محبت، نظم ہمدیت، دودا علیہ اور نظم دسی وغیرہ تیسرے یہ کہ انہوں نے اپنی بہترین نظموں میں شعی نظمیت کو جس استعاراتی و علاماتی انداز میں استعمال کیا ہے ان میں اظہار ذات کا مکمل نسبتاً زیادہ تشدید اور جمالیاتی ہے مثلاً پیاس، آب دسراں، ماتم، کشمکش، اسی طرح ابتداء مبر مضبوط اور انقلاب جیسے اسوۂ حسینی سے بھی ان کا فکری لگاؤ ہے اور جا بجا ان کے تخلیقی اظہار سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت حسین کی زندگی سے وابستہ حقائق نے مثبت اور منفی دونوں انداز سے جمیل کی سائیک کو متاثر کیا ہے۔ یعنی عزم و حوصلہ انقلاب اور حق کے لیے ماحول اور اتنا ر و قت کے بحر کو خاطر میں نہ لانے کی فکر اگر مثبت انداز میں جمیل نظری کی شاعری کے لازمی اجزا ہیں، تو دوسری طرف احساس فنا، ابتداء، اخلاقی اقدار اور موزوں گداز کے منفی جذبات بھی ہر جگہ کار فرما ہیں۔ سلی خود ذکر کی وجہ سے ان کی نقل پسندی نے واقعات کو ہلک ا ہلکا کیے کے بارے میں اگر ان کے نشیک کی روئے کو تقویت پہنچائی جو تو یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہا جاسکتا۔

بہیں اس بات کی دھواکت بھی ہونی چاہئے کہ اس نوع کی نظموں میں تمام تر شیعیت اور اخلاقیات کے باوجود غیر شعوری طور پر ان کی رد مانت اور عقلیت کٹر ہی بھی مگر جا بجا اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ خاص فلسفہ اخلاق پر بھی اشارہ کرتے ہوئے موصوف "نظمت اور ارتقا" کے تیل بوٹے لگانا نہیں بھرتے۔

تخیل غلط آزادی کی جب نظمت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہو تو نظمت تو اس کا نتیجہ کیسا ہوتا
اس لیے یہ قیاس کرنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اسوۂ حسینی سے ان کی قربت میں ان کی رد مانت کے عمل دخل سے بالکلے انکار نہیں کیا جاسکتا، یوں بھی ماضی کے دھندلوں سے ایک دواہنہ لگاؤ رد مان کا ایک اہم جز نہ سمجھا جاسکتا ہے۔

اخلاقی قدروں پر مشتمل اس طرح کی اہم ترین نظموں میں پیام، دعوت عزم، ذکت کا اھاد، پیچھے رہنے والے، بوری، بھارت، اتا اور تعزیت، ادھر کھڑی آب دسراں وغیرہ قابل ذکر ہیں ان میں

حرکت وحیات، عظمت آدم، مضبوط توازن نیز خلوص و صداقت اور آزادی کا عمدہ جمالیاتی اظہار ہو رہا ہے۔ اس کے برخلاف غلامی، جمہوریت غریبوں کے انحصار، تہذیب مغرب کے سادہ مذہبی عقیدہ اردوں سے نفرت، پیٹ پوجا سے انحراف اور سرمایہ داروں کی گراہیوں کو خالصہ جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر یہاں جو شش طبع آبادی کے فحش اور جھلاہٹ بلکہ نطائیت کے بجائے سکون و اعتماد و یقین کی قوت ہے۔ نزل کے اشعار میں ان کے منفرد انداز بیان کے باوجود درائی کی المناک فضا اور مخصوص لفظیات کو بیک نظر محسوس کیا جاسکتا ہے ۴

پھر تیرے تمدن نزع میں ہے، بیمار کو بھی آتی ہے
یہ شمع نہیں انسانیت کی، دروغ بگھٹی جاتی ہے
باجوں کے شور سے دھرتی کی چیخیں بھی سنائی جاتی ہے
کیزرت پہ بیٹیوں کی مائیں، جس طرح وہاں دیتی ہیں
(دعوتِ عزم)

۵۔ جب تک ہے تھقیں کی لغزت کیسا ہوگی نعیم
جمہوریت، رستوریت دونوں نیم حکیم
اس کو بلو اس کو شکر یہ کیسی تعظیم
اس کو روٹی اس کو ٹھوکر یہ کیسا اندھیر
وقت کا دھارا ابھیرنے والے وقت کا دھارا ابھیر
اور پھر یہ بھی کسے

جن موجوں سے جگ ہے تیری اُن موجوں سے میل؟
یہ کیسا اندھیر ہے ناچھی؟ یہ کیسا اندھیر؟
وقت کا دھارا ابھیرنے والے وقت کا دھارا ابھیر
(وقت کا دھارا ابھیرنے والے)

نعمت میں سرمایہ داری کی موت پر طنز یہ انداز میں جو تھقیں پیش کی
ہے وہ نامکمل ہونے کے باوجود دلچسپ ہے ۶
قسمت کے ہنرے محلوں سے آتم کی صدا میں آتی ہیں
شعطان کی گینز میں موتی ہیں، سریشیں ہیں، چملاتی ہیں
تلیس، حسد، کینہ، بغیت، چوری، جیاشی، عسرداری
کل پیشیاں مرنے والے کی، مگر تیری ہیں کھڑی آہ و زاری
اترے ہیں گناہوں کے چہرے، ماں کی ہلکے پیاری سے
اک ایک کا نہ جھٹکا ہے کھڑا کس حسرت سے چارلی سے
کل تدبیریں انی نکلیں، تقدیر نے اپنا کام کیا
کینے والوں نے دور و کر بایں پر ہر کھرام کیا

مرثیہ کی یہی جذباتی اور اتنی فضا نوری اور نہایت مانتا ہمیں بہترین
نظروں پر بھی چھائی ہوئی ہے ۷

ماں تیری تقدیر ہے کیسی ہاتھوں میں زنجیر ہے کیسی
ہاتھ بندھے ہیں ماں کھلا ہے مانگ اجڑی ہے سر نہ لگے
وہ تیموری تاج کہاں ہے چند منی راج کہاں ہے
مکھڑا کیوں میلا میلا ہے کاجل کیوں پھیلا پھیلا ہے
آنسو کیوں جاری ہے مانتا پیساری مانتا، پیساری مانتا
تیرے لیے جانوں پر کھیلے لے لے ان کی بلاتیں لے لے
یہ تجھ کو آزاد کریں گے گھر تیرا آباد کریں گے
مت رو اسے دکھاری مانتا پیساری مانتا، پیساری مانتا

یہاں نظری طور پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمیل مظہری اقبال
کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے مگر فکر و خیال میں شاید اقبال سے زیادہ
زندگی بھر مصروف ہے۔ اقبال کو صورتیاد کی کوشاں شکل تھا مگر جمیل مظہری
سراپا شاعر تھے۔ دونوں کے مجموعہ ہائے کلام اور تعداد اشعار میں فرق
ہی سا کافی ہوگا تو ہوگا۔ ان تمام حقائق کے باوجود آخر کیا بات ہے
کہ جمیل اقبال سے آگے نہیں تو کم از کم نہی اعتبار سے ان کے شاعر بننا
بھی کھڑے نہ ہو سکے۔ اس سوال کا جواب ان کے ادبی مزاج میں پوشیدہ
ہے۔ جمیل مظہری زندگی بھر روحانی عقلیت اور تشکیک میں مبتلا رہے مگر
اقبال واضح اسلامی نصب العین پر یقین کا مال تھے۔ کتنے کتنے میں نے برسوں قبل
موصوف کی زندگی ہی میں اپنے ایک مقالے میں انہیں اقبال کا شاگرد
معنوی تسلیم کرنے کے باوجود دونوں کے مزاج کے فرق کو بتاتے ہوئے
لکھا تھا کہ اقبال کے یہاں اگر یقین محکم اور گہری فکر پائی جاتی ہے تو جمیل
کے یہاں تشکیک اور خیال آرائی کا انداز ملتا ہے۔ اقبال فکر کا مرکز و محور
اسلام ہے۔ مگر مظہری، عام انسان نقطہ نظر کو اختیار کرتے ہیں۔ جمیل کے
یہاں نرمی، گھلاوٹ اور بغیت نمایاں ہے تو اقبال کے یہاں ضرب کیلی اور
جلال و جمال کی جین آ میرش نظر آتی ہے۔ ایک ہی موضوع "ارتقاء پر دونوں
اپنی اپنی نظروں کو اس طرح شریعت کرتے ہیں ۸
ہر حال میں حیثیت مجھ کو بتا رہی ہے

۹۔ سترہ کار رہا ہے ازل سے ۱۲ امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی (اقبال)
اسی طرح جمیل مظہری کی شہرہ نظامِ ہمام کے ایک بندہ
ہستی کا نظم نام تسلسل تکمیل میں زندگی نہیں ہے
منزل کا وجود ہے خیالی منزل کہیں شوق کی نہیں ہے

فطرت بھی روکتی نہیں ہے

کے مقابلے میں اقبال کا صرف ایک شعر خلاصہ فرماتے ہے

یہ کائنات ابھی ناقص ہے شاید کہ آری ہے صدا دادا کنی نیکون
یہ دراصل دو شخصیتوں کے مزاج کا فرق ہے۔ یہی فرق ایک کو
مثلاً ہم اور دوسرے کو پورے خلوص کے ساتھ، ان کی طرف مائل کر دیتا
ہے۔ ایک خودی کو کامر، یعنی اللہ کی دولت کی ہونی حرکت و ہدایت کا لازم
قوت قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے گمراہی سمجھتا ہے

یہ کیوں کہوں موت دد خودی کو دد معرفت اس کی گمراہی کو
(خوشی آب و سراپ)

اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جملہ مظہری کی درمیانیت اور تشکک نے
کسی بڑے سے بڑے خیال یا موضوع کی عظمت کو اس یقین بخشم کے ساتھ
ان کے احساسات و جذبات اور ان کے خورج جگر کا ایک جزو لازم جو نے
نہیں دیا جیسا کہ اقبال نے کیا جس کا نتیجہ ہر اکر الفاظ کے انتخاب مثبت
کی ترکیب اور جمالیاتی انہائیں لنگو اتالی اور اجہ بھوج کا فرق باقی رہ گیا۔
تشکک نے جملہ مظہری کے مزاج کو حضرت علیؑ کے نظروں میں علم سورج سے
ایک حد تک روشن تو ہوئے دیا مگر علم بطور سے منور نہ ہوئے دیا۔
یہی وجہ ہے کہ تعبیر کی روشنی میں اقبال کی طرح وہ ملومات یا تجربات
کی کثرت کو کوئی نئی وحدتوں میں منتقل نہ کر سکے۔
وہ علم کم بصری جس میں بہکنا نہیں

تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

مولائے نیش نے بھی حضرت علیؑ ہی سے ملتی جلتی ایک بات کہی ہے، جو
جملہ مظہری کے شعری مزاج پر ایک حد تک صادق آتی ہے کہ :
"منافع (منشکک) آدمی کوئی مکمل تمثال نہیں بنا سکتا"
کیونکہ ایسیج یا تمثال بنانا ایک وسیع تخلیقی عمل ہے جس میں یہ کائنات
کی پیچیدہ کمزرتیں وحدت و کلیت کا جامہ پہن کر تخلیقی عمل کو قبول کرتی
ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ اس حقیقت کا تعلق ایک ابدی صداقت سے
ہے، اور وہ صداقت یہ ہے کہ انسانی وجود ایک ایسی وحدت ہے جس
میں فخر مغرور، ہلوی ہیں اور ارتقا پذیر ہلوی - یا یہ کہنے کو غیر متعارف
اور تقابلاً براہِ اجمال کر ایک ہی وحدت بناتے ہیں۔ ایسی وحدت جو
مروبطاً، بیوسم اور متحد ہے اور جس کے اجزا کو علاحدہ علاحدہ کرنا ممکن
نہیں ہے۔

جملہ مظہری کے شعری مزاج کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زیرہ خیالی کے
سبب حقائق حیات کو ڈوب کے نہیں دیکھا بلکہ چلتے ہوئے روانی عقل
نورانی میں بہرہ جزوی اخلاقیات یا انسانیت دوستی کے علمی نمونوں میں

گم ہو گئے حالانکہ وہ جدید مغربی فکر و ادب اور معاشرت کا کچھ اور لائیتنا
مطالعہ کرتے تو مغربی عقلیت کے نیچے میں جس ہمہ انسانیت دوستی کے
انسان پرستی کا ڈھنڈورہ ایشا جا رہا ہے۔ اس کی آب و تاب کی کفتم
ہو چکی۔ چرچا نیگ اس تصور انسانیت کو تخلیق کی بنیاد بنا جاتے۔ انیس
کی ریل جیسے پختہ کار دانشور اور نول انعام یافتہ منکر نے توصاف کہہ چکے
..... انسان کو ہر شے کا مقتباس منہا چاہیے لیکن واقعہ اس کے
برعکس ہے۔ انسان تو خود اپنی ہی پیدا کردہ دنیا میں انجمنی ہے۔ انسان اپنی
دنیا خود نہیں سنوار سکتا کیونکہ اسے اپنی طبیعت کے بارے میں کوئی عملی فہم
نہیں ہے حیاتیاتی علوم کے بالمقابل علوم جمادات میں جو عظیم ترقی ہوئی
ہے وہ انسانیت کے لیے ایک مصیبت ہے کم نہیں ہے ہم بھی بڑے
بد نصیب ہیں۔ کیونکہ ہم اخلاقی اور عقلی طور پر زوال پذیر ہیں۔ وہ
جماعتیں اور قومیں جو صنعتی تہذیب میں بے پناہ ترقی کر رہی ہیں، وہ
پہلے کمزور ہو جاتی ہیں اور دوسری قوموں کی بر نسبت زیادہ جلدی برپا
اختیار کر لیتی ہیں۔

اس لیے جملہ مظہری کے برعکس اقبال کے حقیقت حسن اور
"ذوق دشمنی" نے شکوہ و جواب شکوہ سے بے نیاز ہو کر اسرار و رموز
کی غواصیوں کے لبدان کے مرد مومن کو حضرت خضرؑ کی رہنمائی میں چرل
الہیں کی تشکک کو دکھاتے ہوئے مسجد قرطبہ اور جاوید نامہ کی ان
بلندیوں تک پہنچا یا کر ہے

اگر یک مرمو سے برتر بہر مرم نرفذ تجلی بسوز دہر مرم

اس کے برخلاف جملہ مظہری کے مزاج نے کسی عقیدہ پر ان کے ایمان
کو راسخ ہونے نہیں دیا۔ چنانچہ اس تہذیب اور ترزلزل کی کیفیت
نے ان کے مرد جوان کو بھارت ماسا کی تہذیب سے آگے بڑھنے دیا۔
آخر میں ہشکل چلا بھی تو مکالمہ مابین خدا و شاعر کی سن ترانی سستا ہوا
آب و سراپ کے دائمی چکر میں پھنس کے رہ گیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :
دم دھلے میں رشتہ نفس کے چھندے میں بڑا ہے پیش و پس کے
یہ قلب یہ کاسہ سفالی زرتشت کی آگ سے ہے خال
کوشن کی تجلیوں سے محروم عینی کی تسلیوں سے محروم
گو تم کی ریاضتوں سے قاصر موی کی سیاستوں سے قاصر
نادار نہ نور مصطفائی ناخمر مروح مرتضائی
نادانقہ اسوۂ حسینی قانع بہ مشاہدات عینی

.....
جھونکا کوئی اس طرف بھی آجائے چھینکا کوئی اس طرف بھی آجائے
جو نچال ہو آگہی ہماری بھج جائے یہ تشنگی ہماری

جیل منظری کی غزل گوئی

’فکر جیل‘ میں غزل حال کے عنوان سے جیل منظری نے اپنی غزلوں کے بارے میں لکھا ہے کہ۔

.... جب بھی غزل کہنے بیٹھا تو اپنے اشعار کو الفاظ و انکلا کی ثقالت سے بچا نہ سکا، غزل ہونے کو ہوئی لیکن بندش میں نہ وہ لطافت پیدا ہوئی اور ترکیب خیال میں وہ عنائی، نہ زبان میں وہ پورچ، نہ بیان میں وہ تاثیر جو غزل کی جان ہے، اسی دبستان غالب کا ایک طالب علم ہوتے ہوئے بھی جٹ نکٹہ چند زچہ سیدہ بیان یکن آئے۔۔۔۔۔ کا بھی قائل نہ رہا، لیکن اس کا کیا علاج کرے؟ ذہن کی الجھن میری غزلوں میں الفاظ و انکلا کی الجھن بنتی رہی اور لوگ اسے اپنی سادگی سے فلسفہ سمجھتے رہے۔۔۔۔۔ اٹا ہرے اکثر لوگ جیل منظری کے ان امور کو ان کی فکاساری پر محمول کریں گے، لیکن چونکہ یہاں قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اپنی غزلوں کے حوالے سے جیل خود کو کسی نہ کسی طرح دبستان غالب کا ایک طالب علم تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اقبال کا نام نہیں لیتے جس کے حوالے کے بغیر ان کی غزلوں کے حقیقی مزاج تک رسائی محال ہے۔ دراصل جیل کی شاعری کی فکری بنیادیں نہیں تفویض کی روایتی حدود کی شکست و ریخت پر مجبور کرتی رہیں اور انہیں اقبال کے لب و لہجے کے قریب لاتی رہیں کہ اقبال نے غزل کا جو مزاج بنایا تھا اور اسے نیا آہنگ بخشا تھا وہ روایتی تصور غزل سے یکسر الگ بھی تھا اور فکری تصور رات کو سویت لینے کی بے پناہ صلاحیت بھی رکھتا تھا یعنی جیل کے انکار و رد، اقبال سے الگ تھے، لیکن جیل اقبال کے بعض قصاصات کے رو میں بھی ان کے لب و لہجے سے اثرات قبول کرتے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی غزلوں کے بہت سے اشعار سے اقبال کا آہنگ بہت نمایاں ہے، ایک شعر

لاحظہ ہو

● صد شبنم اند، باغی یعنی رشتہ، باغی (بہار)

تاریہ بر لب صفات، غار بسیت حیات بارید و طش کا نکاست، ناز تری نقاب کا شعر کے معنی پہلو سے صریح نظر کیے تو اس کا آہنگ اقبال کے لب و لہجے کی شہادت بن جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ محض ایک شعر کی بنیاد پر لب و لہجے کی کیا نیت کا جواز مناسب نہیں، میں پھر اس کی حکمرانوں کا کہ معنی پہلوؤں کو الگ کیجیے تو اقبال کا میس کوئین انداز غزل جیل کے کہنے ہی اشعار میں نمایاں معلوم ہوگا، ایک پوری غزل دیکھی جا سکتی ہے:

تجھے حق نہیں رکھنا تو مری میدلی نیسا ز پر

میں لٹا چکا ہوں تار و دل ترے عشوہ ہائے مجاز پر

بڑی ذہن سے ادا ہوا کسی آستانہ ناز پر

وہ جو قریض تھارتی زندگی کا مری جبین نیسا ز پر

ہے غلط یہ تو نہ گری اگر دل تو نہ گرے خفتا نہ ہو

جو پسند ہو دی دمن بجاتھے اقتدار ہے ساز پر

میں ادھر ادھر جو شمار ہوں ہوس کے دست دلاؤ

مری زندگی کا یہ طرز ہے تری شان ہمنہ نواز پر

وہ حیات فشن کی اک ٹھری کہ شب بھال کہیں سے

سرشام ہی سے گراں ہے وہ کی چشم سر سر طراز پر

میں جیل اب تم زندگیوں میں بھی تو کس کس طرح

نہ وہ اقتدار ہے سوز پر، نہ وہ اختیار ہے ساز پر

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ آواز لہجے کے اعتبار سے دبستان غالب کی ہے اور کس کو انکار ہوگا کہ یہ لہجہ اقبال کا متبع نہیں ہے۔ دراصل جیل ایک مست تک اقبال کی فکر کے گرد گھومتے رہے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اقبال کے تصانیف تصور است نہیں Provoke کرتے رہے، نتیجہ یہ ہوا وہ ان کی کامیابیوں کے متضاد نہ بننے کی کوشش کرتے رہے، اقبال کے تصور خودی ہی کو لے لیجیے، جیل اپنے بہت

سے شعلہ میں نغمہ 'خودی' Inspiration لیتے رہے، اقبال کے یہاں خودی ایک بینہ، مہرود اور مسیح فلسفہء عقیدہ تھا۔ جیل اسے لفظ کی سطح پر دہستہ ہے، لہذا ان کے یہاں خودی کوئی عقیدہ نہیں بن سکا۔ بلکہ یہاں لفظ اور معنی لفظ کے مختلف صورتوں میں اظہار ہوا۔ جنکو جیل میں 'خودی' کے بہت سے اشعار میں چند یہاں نقل کرتے پر اکتفا کرتا ہوں۔

چند نام نہاد میں ہر دم خودی کا عار ہے ازل سے تری سمجھ ملی کا کچھ بھی نہ ملایا کہ کوشکول بنانے کے یہ دست دوا کا نہ خالی ہے خودی کا

دوہ استہرام خود ہا نہ وہ اعتبار دوا رہا جو امید دل سے چلی گئی تو خودی رہی نہ خدا رہا

نفسوں را نہ کشش دہی، نہ جنوں را نہ تمشش رہی فقط ایک زخم و زار با جرمی خودی کو عذرا رہا

کلی جو گھیں تو اپنی حالت پہ مٹی خدا و خودی کی دنیا دی طبیعت مٹی خدا و خدش کی ادبی تھا خدا تھا رنگ و بو کا

اللہ بچائے اس خودی سے جو کہیں لے ہوئے خودی کا

وہ بھی ہے دست ہوس دست و دعا جس کو کہیں انفعال اپنی خودی کا ہے، خدا جس کو کہیں

کوئی جنت اس کے وجود پر تجبذ ایک لفظ انانیہں یہ خودی کی گونج جو تجھ میں ہے یہ کہاں سے ہے خودا نہیں

ہے دل میں احساں درد اسب تک، اگرچہ دیوانہ ہو گیا ہوں جہاں خودی ہے نہ بے خودی ہے اک ایسی دنیا میں گھولیا ہوں

دفا کو تصور ہی بے نیازی کم اتعالیٰ نے تیری دے دی اسب اللہ کیا پاسیے خودی کو تری جنت کے بے خودی میں

وہ جینودی سے میسر ہوا خودی سے لے جیتل پاسیے اک کیف مستقل مجھ کو

میسرے خم کو رے رگہ لری خودی کی لالچ ایک لطیف طست نہ ہا ہوسے خشکیں پہ وہ

کہاں تک اشعار لکھتا جاؤں، مقصود ہے کہ خودی وہی خودی کے الفاظ تو اثر سے جھیلے رہتے ہیں، ان کی فطرت زمین میں اقبال پر ہیگ موجود ہے لیکن جیل کی ریزہ چوبی نہیں سمجھتے، جس دیتی، خودی نہ لفظی ہے نہ اشعار، ہاں ذہن کے انتشار کی عکاسی ضرور ہوتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ Ironical تجویز پیش پیدا کر دیتی ہے، اس کا یہ مفہوم نہیں کہ میں جیل سے خودی کے بارے میں اقبال کی طرح کوئی مانع فلسفہ نہ عقیدہ چاہتا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیل کی نگاہوں سے اقبال اوجھل نہیں ہوتا بلکہ ان کی ذہنی جہل قدمی کے لیے ہر گھبراہٹیں میدان میں جاتا ہے، اتنا ہی نہیں کہ کسی بھی جیل اقبال کے آئینہ بائیں کہنے سے جی پر ہز نہیں کہے اللہ باکل اقبال کے دشمن میں۔

اقبال کا شعر ہے

دوہ صحن میں ہر گریاں نہ وہ عشق میں رہیں شوخیال نہ وہ غزونی میں تڑپ رہی، دوہ خم ہے زلف بازا میں جیل اقبال سے الگ ہوسے کہتے ہیں

ہے مسرور دے روئے ایاز تپ و تلب سینہ غزونی تپ و تاب سینہ غزونی کی ایک ہے روئے ایاز میں اقبال نے 'مضم آشتنا' دل کے چور کھینچنے کی نفسیاتی کوشش کی مٹی۔ میں جو سر بہ جھہ ہوا کبھی تو میں سے آئے تنگی صدا تار دل تو ہے مضم آشتنا تجھے کا ملے گا نمازمیں جیل کو یہ عشق کی نمازی دار فنی میں لگی ہیں

یہ زلف ز صحن جرم نہیں یہ صلاۃ کو چہ عشق ہے نہ دعا کا ہوش بھو میں نہ ادب کی شرط نمازمیں

یہ صحت حال وہاں بھی ابھری ہے جہاں جیل باضابطہ طور پر تشکیک کے شاعر بن کے ابھرتے ہیں، یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ تشکیک 'دشمن غالب' کی طالب علمی سے وجود میں آئی ہے لیکن یہ عقیم جیل کا ناقابل تہل مفروضہ ہے، غالب کی تشکیک اور ایمان و گہی میں حد فاصل قائم کرنی مشکل ہے کہ غالب کے نزدیک زندگی اور اس کے لوازمات پہنچنے ہنسائے کے موطن کا ہیں جبکہ جیل کے یہاں تشکیک اقبال کے ایمان و آگہی سے مسلسل ٹکرائی ہے اس طرح کہ بعض اہی بنیاد پر انہیں شاعری کی معصاف رکھا جاتا ہے یا غیر خدا طور پر فلسفی شاعروں کے نمبر میں۔ کوئی بھی عکس کر سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں روشنی کا استعارہ ایمان و آگہی کے لیے ہے، اس کے برخلاف جیل تیری کو جدلیاتی معنی بخش دیتے ہیں۔ کچھ اشعار نقل کرتا ہوں۔

اعطانی ہیں ہر طوط گشت میں اللہ رہے ناز تیسری گما

ہم لوگ ہیں تیسرگی کے ماہے کماے دوسرے رب روشنی کا

یرگی جاب تہی، روشنی جاب تہی زندگی جاب تہی جو بھی تھا جاب تھا

ہو یا نہیں اگر جلائیں تو اس میں تیرا قصور کیا ہے
ہو لے کی تیری ہے سازش، بجائے شغی تری ہوا پر

ستم ہے اسے روشنی ستم ہے کردہ بھی اب دھوپ کی ہے زد میں
خدا سا سایہ جو رہا تھا کھائے درختوں کی تیسرگی میں

مج خود بتائے گی تیرگی کہاں جائے یہ چراغ کی جھولی روشنی کہاں جائے

اب تو دھوپ آج بھی جھاریوں کے درجہ اب پناہ لینے کو تیسرگی کہاں جائے

کہو نہ یہ کہ جنت ہے تیسرگی مجھے ڈرا دیا ہے تینگوں نے روشنی سے مجھے
روشنی کے مقابلے تیری کو ترجیح اقبال کے مثبت تصور ایمان و آگہی کا رو ہے، یہ اور
بات ہے کہ جیل کے شاعرانہ جوہر نے ایک منفی صورت واقعہ کو دل پر اور دل پر
بنادیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جیل کے اس نقطہ نظر کے شاعرانہ طور پر انہیں کردہ
میں بنایا ہے بلکہ ان کی انفرادیت کا واضح نقش بن گیا ہے۔ چنانچہ جہاں
وہ اقبال کے دُکھ سے الگ ہوئے ہیں، ایک مخصوص لب و لہجے کا امتیاز حاصل
کر رہا ہے، اسی شاعری کے لیے یہ کسی بہت اہم ہے کہ جانے بوجھ الفاظ میں
نئے معنی پیدا کیے جائیں بلکہ مثبت نقطہ معنی اور منفی سے مثبت معنی حاصل
کیے جائیں تو اس کی دنیا بدل جاتی ہے اور زیادہ دلکش ہو جاتی ہے میں نے
جیل منظرہ کے شعری رویے سے ایک الگ مضمون میں تفصیلی بحث کی ہے جویری
کتاب 'معنی کی تلاش' میں شامل ہے اس لیے میں یہاں اس کی تکرار نہیں
کروں گا۔ اس اشارے پر بس کروں گا کہ جیل نے جس طرح تیرگی کو سننے
معنی دینے اس طرح جیل کے میں گہری مین آگہی ہے،

دشست خود ہے اور خود دشست جو فائدہ ہے وہی نقصان بھی ہے
یقین اور گمان ہم معنی ہیں، شک اور ایمان میں حد داخل ہیں، خدا پرستی اور
خوابدہوں کی مسکن کے درمیان کچھ نہیں معنی جاسکتی، شک اور ایمان ایک
ہی شے، آگہی ہوس بھی ہے اور آگہی بھی دیر و غیرہ ایسے Paradoxes
جیل انتہائی نکال دہ طور پر پیدا کر رہے ہیں، کلچر، بروکس و شاعری میں
Paradoxes کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہی وہ قوت، اغراض ہے جو
جیل کی انفرادیت کی شناخت بنی ہے، یہ غزل دیکھیے۔

جیل کو گہری مبارک کو اب تو سلمان بھی دی ہے

جود لک دشت کا ہے تقاضا خود کا میلان بھی دی ہے

نخوی مثبت کے فلسفے میں ہے اس کے ہر جیل کی موت سبک

کچھ اور دل میں، اُس کے دیکھ تو روشن کی جان بھی دی ہے

پہنچ سے نظروں کی دُور ہمارے جود کو آواز دے رہا تھا

خٹکے ہوئے شوق کی قناعت سے اب پریشان کی دی ہے

بنی تھی جود روشن کی جب تو طفل کویر بھی دیکھتا تھا

کہ جس کو وہ فائدہ سمجھتا ہے اس کا نقصان بھی دی ہے

ہماری میسران آگہی میں یقین کیا ہے گماں کی شہرت

جو شک کی آغوش میں پلا ہوا اصول ایمان بھی دی ہے

جیل کسی خدا پرستی وہی تھی خواہش کی سبھی

ڈوبی جس نے ہماری شہتی تہارا طوفان بھی دی ہے

جیل فیضان آگہی سے جنوں کا صحرایہ صرغ شہنا

جو کس کا بازار بھی دی ہے خرد کی دوکان بھی دی ہے

جیل منظرہ کے میں پیاس اور مراب، سفر اور سخن، جہاں اور جہرہ اور انگریز اور
نعرے کے الفاظ مسلسل استعمال ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ الفاظ بھی مٹی معلوم
ہوتے ہیں اور جیل جس طرح چاہتے ہیں اس سے طرح طرح کی شبیر و شہرت کرتے ہیں
جہاں بھی ان کا جدیاتی عمل کام کرتا ہوتا ہے اور مخصوص لب و لہجے کو مستقل بنانا
جانتا ہے لیکن ایسے جدیاتی علم میں Paradoxes نمایاں ہوتے ہیں اور
تشکیک کی دنیا سستی چلی جاتی ہے۔ مابلیٹ نے ن سمن کی نظم 'میر کی جگہ' کا جائزہ
لیتے ہوئے اسی امر کا اظہار کرتے کہ ایمان و آگہی کے مقابلے میں ان میویم
کو تشکیک کا سپر زیادہ قابل ملاحظہ بنا آئے، اگر اس کی یرائے مان لی جائے
تو یقیناً جیل کی غسز لیں کیا ان کی پوری شاعری کے امتیازات اور خود روشن
ہو جائے ہیں۔

بقیہ: جیل منظرہ کی شرعی نگاری

حقت اصحاب ہوئی، امام حسین کی قربانی کا مقصد یہی تھا کہ اسلام کی
ان ہی صفات طیبہ کو روشناس کر لیا جائے۔

جیل منظرہ نے انہماک ظاہر بن کر سیرت نگاری میں ملوث صفات
اور بشریت کے فلسفہ دونوں ہی کو ملحوظ رکھا ہے۔ سال رسول کے خلاف اعلیٰ
کا نہایت حقیقت پسندانہ نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ آپ نے
شرعیہ کو ملکی بنانے کے لیے کرداروں کی اسٹو دا علی شخصیت کو مسخ
نہیں کیا ہے۔

جمیل منظہری کا تغزل

ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جمیل نے اردو شاعری کی عام اور مرثیہ روایت کے مطابق محض نظم نماغزلیں یا غزل نماغزلیں لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو شاعری کی مختلف اصناف اور فارضوں کو استعمال کر کے ان کے ذریعہ اظہار و بیان میں وسعتیں پیدا کیں اور اپنے جہولوں کو نیا گماز اور نیا رخ عطا کیا۔ انہوں نے نظم اور غزل کے علاوہ منظوی، مرثیے، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مسکس اور دوسرے روایتی فارضوں کو بہت کر اپنے خیالات اور موضوعات کے اظہار میں شعوری طور پر کشادگی پیدا کی اور ان سے بڑا کام لیا۔ جمیل کے شعری اظہار کے اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو ان کے یہاں موضوع اور بہتیت دونوں اعتبار سے خاصی جہت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ جمیل کی شاعری کے ان اساسی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کے تغزل کا مطالعہ کرنا مفید اور کارآمد ہوگا۔ یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ جمیل کی شاعری کے مطالعے میں ان کی نگلیں اور غزلیں دونوں یکساں اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر آسانی سے فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ قطع نظر اس سے کہ جمیل نے نگلیں اور غزلیں دونوں خاصی تعداد میں لکھی ہیں اور نقشِ جمیل اور شعرِ جمیل کے نام سے ان کی نگلیں اور غزلیں کے مجموعے الگ الگ شائع ہوئے ہیں۔ دونوں میں موضوعاتی سطح پر گہرے رشتے اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے جس طرح ان کی نگلیں کے تین واضح حارج اور اقسام ہیں۔ رومانوی، انقلابی اور قومی اور لنگری اور فلسفیانہ اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تین نمایاں رنگ روائی، انقلابی اور لنگری اور فلسفیانہ دکھائی دیتے ہیں اور ان کے ذہنی اور شعرائے ازلہ ان کے مددگار مراحل میں متوازن طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان رنگوں کی پیشکش جہاں ان کی نگلیں میں تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہوئی ہے وہاں یہ

جمیل منظہری کی شاعری اپنے رنگ و آہنگ کے اعتبار سے مندرجہ ذیل ہے۔ ان کی جگہ اردو کے ان شعرا کی ہے جنہوں نے اردو شاعری کی روایت میں توسیع کی اور اس میں نئے ابعاد اور جہتیں پیدا کیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے معنوی دائرے کو جس حد تک وسیع کیا وہ یقیناً ان کا ایک اہم اور قابل قدر کا نام ہے اور اسی میں دراصل ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار ملنے ہیں جن میں وہی اظہار وادہ رد عمل کی کارفرمائی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جن تجربات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے ذاتی اور نجی تجربے ہیں اور ان میں ان کے انفرادی فکر و تخیل کے نقوش نمایاں ہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کے یہاں موضوع اور طرز اظہار دونوں اعتبار سے کچھ یکجہوت اور انفرادیت ضرور مل جائے گی۔ ان کے یہاں واضح طور پر مختلف انداز میں سوچنے اور فکر و احساس کی نئی سمتیں پیدا کرنے کی کوشش نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ یہ چیران کے یہاں شعوری سے زیادہ غیر شعوری انداز میں سامنے آئی ہے جس سے ان کے انفرادی ذہن اور شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو شعرا کی غالب اور اقبال سے خصوصی طور پر اثرات قبول کیے ہیں اور غالب سے اثر پذیر ہونے کا باضابطہ اعتراف بھی کیا ہے مگر یہ اثر پذیری ان کا انفرادی مزاج اور رنگ بن کر ظاہر ہوتی ہے اور اس میں مٹی کے نئے گوشے ابھر رہے ہیں۔ یہاں ایسے اشعار کی مثالیں دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جن میں جمیل نے غالب اور اقبال سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے انداز و احساسات کی نئی تعبیر اور توجہ پیش کر دی ہے اور اس میں مٹی کی نئی سطح دریافت کر لی ہے۔ یوں ہی دیکھا جائے تو انہوں نے اردو شاعری کے ذہنی مضامین اور موضوعات کو بھی حقائق کے نئے رخسار اور انہی کے لیے استعمال کیلئے اور ان میں بصیرت اور معنویت کے نئے پہلو پیدا کر دیئے ہیں اسی لیے ان کی شاعری کی معنوی تغار وایت سے رشتے قائم رکھنے کا ہر ذوقی اور بدلی

لب ان کی غزلوں میں ایمانی انداز میں بروئے کار آئے ہیں۔

جیل کی شاعری کے اساسی موضوعات دراصل حیات و کائنات سے متعلق
ہم اور بنیادی سوالات ہیں جو انسانی فکر و نظر اور عقل و خرد کے لیے
بھی پیش پے بنے ہوئے ہیں۔ جیل کا تہمتس اور فلسفیانہ ذہن ابھی سوالات
سے دست و گریبان نظر آتا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے یہاں
ذوق و خرد کی کشاکش، عقل و عشق کی معرکہ آرائی، تجربہ و اختیار کا تنازعہ
در انسان اور خدا کے رشتے کا تعین جیسے موضوعات اساسی اہمیت اختیار
رہ گئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں خواہ ایمان جو ان کی تعبیر و تفسیر کی گئی ہو یا غلطی
در ترقی پسند خیالات کا اظہار کیا گیا ہو ان میں ان کے فلسفیانہ غور و فکر
کے یہ پہلو بدیہی طور پر مثال ہو گئے ہیں۔

فاسلہ ہی وجہ ہے کہ جیل اپنی غزلوں کو انکار منقولہ کا نام دیتے ہیں
در انہیں روایتی غزل کے معیار کو پیش نظر رکھ کر غزل قرار دینے سے
باکجاست بلکہ انکار کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں
کے مجموعے کو فکر جیل کے نام سے شائع کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ
اپنی غزلوں کو فکر و فلسفہ جیسی چیز سمجھتے ہیں اور اس میں زبان و بیان کی
لفظیات، لہجہ و انداز، شعری و عقلی خیال گداز اور تاثیر نہیں محسوس کرتے
تغزل کی جان ہے۔ تغزل کا ہمارے یہاں اب تک جو مفہوم بیا جا تا رہا ہے
اس کی بنیاد پر غزل اور نظم میں فرق کیا جا تا رہا ہے اور غزل کی پہچان
در ہر جگہ ہوتی رہی ہے وہ انہی چیزوں سے عبارت رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ
تسل جو اردو شاعری کے مزاج اور روایات کے رمز شناس رہے ہیں وہ
نی غزلوں کو اسی کا نئے پر تو لے ہیں اور اس لحاظ سے اس میں جو کمی پاتے
ہیں اس کا واضح طور پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود دیکھا
آئے تو تغزل کے اس معیار سے وقتاً فوقتاً انحراف کیا جا تا رہا ہے اور
شعرا جن کے یہاں فنی میلان نمایاں رہا ہے اور جنہوں نے شعر گوئی
ن معنی آفرینی اور دقت اور پیچیدہ خیالات کی ترجمانی کو اصل اہمیت دی
ہے اور دانائیت کے ساتھ فاعلیت کو بھی سمونے کی کوشش کی ہے وہ
غزل کے اس معیار کو برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب و مومن
در اقبال اور ان کے بعد آنے والے بہت طالعے شعرا کو پیش کیا جا سکتا
ہے جنہوں نے زبان و بیان کی معنوی طاقت اور دل کشی پیدا کرنے کی
ہائے اصل توجہ غزل کے رمزی اور لہجائی پہلو پر دی ہے اور اس کے ذریعے
پنے قربات میں معنویت، بلاغت اور تہذیبی پیدائی ہے۔ اس معیار
سے دیکھا جائے تو جیل کی غزلیں اپنے رنگ میں منفرد اور کامیاب نظر
آتے ہیں۔

غزل کا اصل آرٹ اس کا رمزی اور علاقہ پیرایہ بیان ہے جس میں لفظ

کو ان وسیع تر کلمات کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور ان میں معنی
کے نئے نئے شہیزد پیدا کیے جاتے ہیں اور یہ پیر غزل کی مخصوص ہیئت
میں ردیف و قافی کے التزام کے ساتھ بہ رقصے کار آتی ہے۔ ظاہر ہے
کہ یہاں مجرد انکار کے پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں غزل میں جو انکار
پیش کیے جاتے ہیں وہ شعری پیکر اور علامات کے توسط سے مخصوص
شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی کو فکر و احساس کے امتزاج اور ہم آہنگی
کا نام بھی دیا جا سکتا ہے جو شعری اظہار کا نمایاں ترین وصف ہے اور
غزل میں پوری شدت اور توانائی کے ساتھ رو نما ہوتا ہے۔

جیل منہری نے جن شعری پیکروں کا استعمال کیا ہے وہ ان کے
انکار و خیالات کو قطعی طور پر محسوس اور مرنی نیز مرنے کا عمل انجام دیتے ہیں
اور ان کے ذریعے ان میں ایک نئی صداقت، بصیرت اور معنویت جم لیتی
ہے جس سے شعری تخلیق کا امتیاز اور انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ انہوں
نے بیشتر اردو غزل کی روایتی علامات کا استعمال کیا ہے مثلاً آئینہ، نفس،
ستار، بلبل، پروانہ، شمع، میکہ، ساغر، بلور، جام، باغ، کلی،
باغبان، بہار، خزاں، حرم، بت کمرہ، نظر، جلوہ، موج، سفینہ،
دریا، ساحل، خرد، جنوں، عشق، کفر، ایمان، آشتیاں، گلستان،
زندان اور سلاسل، سراب، پیاس، تشنگی اور روایتی انداز کی رنگیں
ہوتی ہیں مثلاً چشم شوق، گلہ اخیار، حریم ناز، نگہ نیوں طراد، حسن نظریہ،
شوقی ناز و دوا وغیرہ مگر ان کی معنوی فصاحت انہوں نے یکسر بدل دی ہے
اور ان کے ذریعے انہوں نے عرفان و وجدان کے نئے شہیزد پیش کیے ہیں،
ان نئے خیالات اور معانی کے ابلاغ کا ذریعہ بنا یا ہے۔ جیل نے
حجاب، نقاب، پردہ، تیرگی، روشنی، اندھیرا، اجالا، دھوپ، سایہ
اور درخت کے الفاظ اور علامتیں بار بار استعمال کی ہیں اور ان کے
پردہ میں ان خیالات اور جذبات کی ترسیل کی ہے جو ان کے غور و فکر
کی اساس، محور اور مرکزی نقطہ رہے ہیں جس کی طرف انہی اشارے
کیے جاتے ہیں، جیل منہری کے یہ اشعار اس ضمن میں قابل غور ہیں
آپ اپنے کو لگا دیکھنے شہید اتیرا ہر نظر اس کی اٹھنے لگی پر داتیرا

تجنتوں نے اوٹھ لی ہے جب نقاب رنگ و بو
تو احترام فرض ہے ہر آنکھ پر نقاب کا
یہاں بجز سرباب کے نہیں ملایہ تشنگی
جیل یاس ہے تو آفریب کھا سرباب کا

ہری قتل راہ میں نظر ہی کھڑی دیکھتی ہے ادھر ادھر
کہ جنوں نے ترک سڑکیا تو نہ کوئی راہ منارہا

ہیں نظام شام و سحر میں بھی اسی کشمکش کی علامتیں
جو محاب و نور کی کشمکش ہے ضمیر ناز و نیاز میں

محبت میں کافی اک ایسی بھی منزل کہ دھوٹا جنوں نے خرد کا ہسدا

اصلیت تھی یاد کو کہ تھاک فتنہ نگیں برپا تھا
سوجھ بوجھ تھے اک پہلہ تھا پردہ نہ رہا تو کچھ بھی نہیں

ہم لوگ ہیں تیرگی کے لمبے کھانے وہ فریب روشنی کا

ہوا موافق بھی ہو عزیز تو اس کلمے سے دودھ بنا
میں بارہا اکے اس کلمے پہ اپنی کشتی ڈوب گیا ہوں

اٹھاتی ہیں ہر طرف گھٹائیں اللہ رے ناز تیرہ گی کا

کچھ بھی نہ ملایا تھوڑا کھول بنا کے یہ دست دھکا سے خالی ہے خوری کا

صاف اے نازہ نمائی پہنچ کے منزل پہ بھی نہ پائی
وہ لذت خواب جو میسر ہوئی سر پہ غم سنگی میں
چھپی نہ جب خاک آستان سے چھپے گی کیا چشم نگہ واس
وہ اک ذرا سی شکنجہ جو اجمیری جبین مہر بندگی میں

اپنے بکھرے ہوئے جلووں کی قسم ہے تجھ کو
رحم کر مہیری پریشان نظری پر اسے دوست
عشق اک تشنہ بی ہے نظر گاہ عجز
حسن اک طنز ہے اس تشنہ بی پر اسے دوست
ایک گرم شے مہمراے تحسیر ہے جیل
اور ترا لطف تہنم ہے اسی پر اسے دوست

ادھر اندھیرے کی لہریں ہیں ادھر اعلیٰ کی زمیں ہیں
ترے مسافر گناہیں بستر کہاں پہ صحرائے زندگی میں

جیل کے یہ اشعار بھی قابل غور ہیں جن میں نہ درد نہ معافی پائے جاتے
ہیں اور جو ان کی غزل گوئی کے آرٹ کا بہترین نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔
صد چاک ہوا گو جانم تن مجھری تھی سینا ہی پڑا
مرنے کا وقت مقرر تھا مرنے کے لیے جینا ہی پڑا

نکل گیا ہوں بہت دور اس کی منزل سے پکارتا ہے براشوق مضمحل مجھ
اسی سے دل نے ملائے چہرا پر دید و حرم دیا گناہ نے جو سوز منتقل مجھ

نہاؤں کے گھر میں ناامیدی آئیں کتنی محبت نے متھڑک دیا کھائے پہرے پر

طلب کے صحرائیں پیچھے چھوڑے ہیں مرے نقش پاکی لہریں
اُجڑے ہیں اس ہوس کردے سے گزر گیا تھا مسافر زاد
ہماری وحشت نے اس خرابے کو اپنے دل کا فروغ بٹاتا
ہماری حیرت نے اس خرابے کو کور دیا اک نگار خانہ

یہ نکل کتب یہ چھاؤں کتب کہ ہے گاہ قہر میں پلوی کتب کہ
جیل کا تے نکل چکے ہوں تو دم کر اپنے وہ منابر

جھکا یا تو نے جھکے ہم برابر ہی نہ رہی
یہ ہمدردی ہوئی اسے دوست عاشقی نہ ہوئی

تو! جاتا ہے آگئی کا علم مسکی جاتی ہے چادر ادھام

ہری گری سے رستے ہری خستگی سے منزل
ہری داستان مرتب مرے نقش ہائے پاسے

دیکھئے کو ذرا حسرت عشق حسن خود کھنچ کے آگیا لب ہام

صحران کو کبیا خبر کہ ہے ہر ذہن حیر منگی میں اپنی قسمت صحرائے ہو

یہ غدی کہ عارض ہوشاں میں بھی خود بخود ٹھہری رہا
مرا آئینہ کہ رہا ہوا امتحان آئینہ ساز میں

جب دامنِ شہر نے پونجی نگر کی گرد دیکھا ادھر ادھر ہنگام اعتبار۔
(پانی صفر، ۲۰۰۲ء)
۸۴ اگست

بحیثیت مظهری۔ بحیثیت غزل گو

رہین، شترخ اور غالب تو بہر پھول غزل کا گھبرا۔ یہ گل گل سرسید ہے۔
غزل اردو شاعری کی آبرو قرار پائی، غزل جو خسرو کے زمانے کی قلب شا
نے اس پر ناز کیا اور عمر حیدر کے مبتدی شاعر بھی شاعری کی ہم اندازی مہلک
صفت سے کرتے ہیں۔

غزل ایک آئینہ ہے جس پر وقت کی گرد پڑتی رہتی ہے اور وقت ہی اسے
صاف بھی کرتا ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں ایک زمانے کی روحانی مختلف جلوہ سال
کے ساتھ منکس ہے بغیر زمانہ کا ثبات اگر محفوظ ہے تو ہی آئینہ میں صلی و
ادبی، تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و تمدنی، تحریری و انقلابی سرگرمیوں کی تمام تر
بقول تو یہاں آئینہ غزل میں اجاگر ہیں۔

غزل نے صدیوں کی سرحد پار کی اور بیسویں صدی میں اس کی رفتار تیز سے
تیز تر ہو گئی غزل جو ہندوستان میں الگ الگ دوستانہ شکر کی چھاپ لیے سخی اب
جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ دلی، بمبئی، عظیم آباد اور دکن کی گوازیں
آج فضا کے غزل میں ایک ہو چکی ہیں۔

جیل مظہری اسی بیسویں صدی کے ان نامور فرد و شعراء میں ہیں جنہوں نے
تعلیم بھی نکھیں اور غزلیں بھی، مراد بھی لکھے اور مثنوی بھی، دیا علی بھی کہیں اور
قضا بھی، غرض مختلف امتداد میں نہیں قدرت کو کے انہی نوے پچیس کے۔

جیل مظہری ظفر ایک غزل گو شاعر تھے اور نسبتاً ان کا یہاں سہارا ان
کے دیگر انشائیہ شاعری بھی غالب ہے اس میں کئی شک نہیں کہ جیل صاحب
وہی شاعر تھے اور انہوں نے ایک شاعر واقعی کی طرح بے حد احساس طبیعت
پائی تھی۔

نگار کے صلی و ادبی ماحول میں ان کے شاعری مزاج کی تشکیل ہوئی، جیوہری
میں وہ فارسی اور اردو کے غالب علم تھے، فارسی میں ان کے کمال لاری طہر
وہ فارسی شاعری کے اساطیر سے شاعر ہوئے۔ حافظ و خیام اور مرقی و تقیر کی

طالعہ دم غزل غزل سراہوں میں رباب وقت کی بگڑی ہوئی صدا ہوں میں
انہو، دینکی سب سے کس زبان ہے مگر بہت کم وقت میں اس نے ابھرائے
سب کی وہ سنسنیل سے کس کس شہرہ آفاق آیات عالم سے آکھیں چاکر کرنے
احول پیدا ہو گیا ہے۔ جس تہذیبی پس منظر میں اردو زبان پیدا ہوئی اور جس تمدن
میں اس کا نشوونما ہوا اس کی توانائی قابل رشک رہی ہے۔ حدیث گذار کے ایک
مال و محرق قوم تہذیب و ثقافت کی مستقل راہیں روشنی کی تھیں۔

ایرانی تہذیب تاریخ عالم میں منفرد ہے۔ اسلام کے عروج سے ایران پر
رول کو غالب کیا مگر ایرانی ادب و تہذیب مغلوب نہ ہوئی، شاعر ضرور ہوئی عربی
بان و ادب سے فارسی پر اپنے نشانات قلم کے، قصیدے کی تفسیر کو ایران
اکرم ہوا ہے حد اس آ۔ اس نہاں سرزمین شریعت و تغزل کی ایسی تاریک
لوٹیں پھینک جتن کی نظر نہیں۔ فارسی ادب کی ایک زندہ و پابندہ صفت غزل کی
موت میں اپنے تمام خاص صوری و معنوی کے ساتھ باجم عروج کو پہنچ گئی۔

ظہر ملکوں کے ساتھ شروخ کی یہ صفت لطیف فاحشہ انداز سے ہندوستان
نہی۔ فارسی کے زیر سایہ نقای کفری ہوئی سے ایک نئی زبان اردو شاہجہاں کے عہد
ہی سامنے آئی۔ ادبی اعتبار سے اسے ماحول کچھ ایسا سازگار اور صحت مندانہ کردہ شہرہ
رو جھلکی کی بل کی طرح و درحہ اسکے بڑی اور اس کا جوں ماحول زبانوں کے لیے
ملک و حیدر کا سبب بن گیا۔

اردو سے فارسی کے بول اپنا سے اور اس کی انہیں سیکھیں کہ کچھ انہیں
اور میں اسے شاہد و دریا یاد جلوسے نظر آئے۔ اردو میں نثری ادب سے قبل
اور کہیں زیادہ شاعری ادب پیدا ہوا مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مرثیہ وغیرہ
باقی جو اس لیے سامنے آئے اور ان گھبرا سے رنگا رنگ میں سب سے زیادہ

● صدر شہزادہ اردو و فارسی میں کالج، آٹھ (پہار)

مطالعہ نے ان کے فکر و خیال کے ساتھ ساتھ اسلوب و ادراک کی روزی و شکاری استحکام بخشا۔
 بعد ازاں پسند اقبال نے فکر و خیال کا فلسفیانہ انداز پسند کیا۔

ہر جنم میں عقلی معنوی کوئی باضابطہ فلسفی نہیں آئے اور فلسفہ کے کسی موضوع پر مباحثوں نے کوئی اظہار ہی کیا ہے۔ انہیں نے مختلف فلسفوں کا مطالعہ ضرور کیا تھا مگر وہ ہیں اس کثرت مطالعہ کے جو عقلی متیاریہ ہوا اس کا خوبصورت اظہار ان کے اشعار میں از خود ہوتا ہے۔ اپنی نظموں میں وہ تخلیق و ارتقا کے فلسفہ کو کسی سادگ اور محکم و مہذب انداز سے پیش کر کے ہیں مغرب کے فلسفہ و اشارات میں وہ اس نقطہ نظر سے کام لیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مغرب کے اکثر اشارات سنی طور پر جھجک جھکے رہ گئے ہیں مثلاً

اقدام ہیں بتدریج آسمانوں سے تبارا ہے تقاضائے آب و گل مجھ کو مری رنگین نہ بکھر سکیں مری نکمیتیں نہ بکھر سکیں

میں وہ پھول ہوں کہ جو اس چمن میں گلزار صاحب رہا
غزل گوئی میں مجمل صاحب کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ غزل کی روح ہے جسے وہ
غزلیت کہتے ہیں ۔

تہادی اس غزلیت کو کیا کہوں میں تمیں جو فلسفہ نہ بنی اور شاعری نہ ہی
کبھی وہ اپنی منزل کو جو فلسفہ نہ خیالات سے بوجھل ہوتی ہے، آب و رنگ سے
فانی قرار دیتے ہیں۔

ہے آپ دو مجسے غالی قبیل کی غزل ادب داس کو سمجھے کہ ہے یہ بے ادبی
جیل مظہری کو اپنی غزلوں میں غزل کی مفہمی کا احساس تھا وہ کہتے ہیں

بمیل حیرت میں ہے نہانہ عمرے تغزل کی مفسی پر
نہ جذبہ اجہتا مے رضوی، نہ کیفیت پرویز شادی کا

اس کے باعث جمیل صاحب کو ایک مخصوص مزاج تغزل رکھنے کا دعویٰ ہے۔ غزل نگار جمیل اپنا انداز سخن ہے اسی سے جو کچھ مزاج تغزل ہمارا روح فطری طور پر ایک فنون سراستے اور اس کا انہیں اثرات سے

مری مدد اگرچہ کر سکتے ہیں، مگر شوق اگرچہ ہے جاں بلب
مگر اسے جہنم میں لے کر آئے، یہ دوائے معنی و لفظ کیا

لطیف جہول کی کشش کا می و سوز نامی سے آرزو دل کا صنف ہوتا ہے اور اسے شاعری میں نگین و خوشی پیدا ہوتی ہے۔ ایک بحر پرور غزل کے لیے آپ اس کے ساتھ ساتھ اخلاذ گفتگو کا ندامتو پرچہ ضروری ہے، اور خود کہتے ہیں:

دل جمل ہے شمرنا عیو ناز و ادا
فدا مارا چ تو ندامتو گھنگھو میں ہے

دل کی تعریف ہی 'صنم' حرم با زبان لطف و شہری غزل میں دلوں کا راز بیان ہوتا ہے۔ لہذا دل کی زبان میں، جو تو بہتر ہے کہ اس سے تاثیر پیدا ہوتی ہے یہی ملتے جلتے دل میں جو ہوتا ہے۔

یقین اپنی غفلتِ دل کی بنیادیں ہوتی ہیں، کہ دل کا راز ہے اہل صاحبانِ دل سے کہنا ہے

عراقی فارسی کا زبردست غزل گو سمجھا گیا ہے، جمیل صاحب بھی عراقی کے معتقد ہیں، کہتے ہیں:

جیل اپنی لنگھ نکتہ میں ہم چشمِ عسری ہے
عراق کی غزلیں وقتِ غزو، غنمِ غزو اور غلوے نگر کی شال میں چڑھ کر وہ اپنی
خوبیوں سے آگاہ، تاس ہے حراج میں ایک تندی اور استغناء کی سرک میں
ہو گیا تھا۔ صاحبِ اور عراق میں ہے قدر کی مشرق ہے۔ استغناء طبع اور
مردوں نفسِ عراق کے خصائص بارے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جوہرِ جمیل
مصری کے یہاں بھی موجود ہے مگر انہیں عراق کی طرح اس پر استقامت حاصل
نہیں عراق کی نکتہ بینی اسے مذہب سے روڑاں نہیں کرتی جو مل صاحب کی
نکتہ بینی انہیں صومالیہ میں دیوانہ سا کرتی ہے، جہت کا وظیفہ خوارمادی
تغیبات سے مرفور نہیں ہوتا بلکہ جمل کی نعمتیں جذبِ عشق کو سرور دیتی ہیں عسری

مغیبت تر شود از نقشش زیادہ کنند
 و غیبت خوار عبت کہ غم بود تو تش
 جہل ماح کہتے ہیں

میں نے خود محبت کو فلسفہ بنایا ہے

کو خستہ زبان میں پیش کیا ہے۔ وہ فارسی زبان و ادب کے ایسے اے تھے اہلنا
 خاں کی وکھن ترکیبیں اور خوب صورت بندشیں کثرت سے ان کے استاد نیز نظر
 آتی ہیں۔ ان کی فارسی ذاتی سے اسلوب اور ادب اہل زبان کو بڑی حد تک متاثر
 ذاتی سے بہتار رکھا مگر نسیانہ ذخیرہ خال کی بھی سمجھی صورت حال سے غور کو
 اس میں یکت و کم سے محدود کر دیا جو اس کو توری و صنعت ہے۔ نتیجہ میں جاچکا
 اہل خال کی شامل شاعر کے ذہنی و فنی رویہ کی غماز ہے کہیں وہ خدا کے
 فائل نظر آتے ہیں، کہیں اس کے جود و مذاق اڑاتے ہیں۔

میدار اگر نچا ہوس اقتیار نے اللہ کہہ کے اس کو بھی خود پکارا
نکوہ نظر کا سیکور انظار انہیں الفاظ کے غیر ذوارانہ استعمال پر مجبور کرتا ہے نہی
انتظار اور دل کے قراقرظ اضطراب انہیں ایک رنگ پر رہنے نہیں دیتا۔

جب تک ملک بدل کر کچھ ایک اور غزل کہدا مغرب بدلے جے ستار باقی ہے
 جسے جس صاحب خود کو کسی مذہب کا پابند نہیں کہتے تھیں لیکن تعصوب کو پسند یہ وہ
 دیکھتے تھے اس ملان ذہنی سالانہ کی غزلوں کو تعصوب کی کاشانی
 دی ہے یوں یہی مشورہ کہ تعصوب برائے شرع نہیں خوب است۔

خود مجاز ایک حقیقت ہے جس میں یہ نہیں ہے تو حقیقت کیا ہے
غالب مجمل مغربی کا رہنما مضمونی ہے اور اقبال کو وہ اپنا رہنما بن کر قرار دیتے
ہیں۔ مگر ان کی اکثر مسلسل غزلیں اقبال کے فن سے ظاہری و باطنی مماثلت کا اعلان

لڑتی ہیں۔ اگر غزوہ میں قلعہ اسٹیشن موجود ہیں۔ اقبال کی طرح قبیل صاحب
نے بھی مختلف فلسفوں، دانشوروں اور شعیتوں کو عثمان بنا کر قلعہ اسٹیشن
لکھی ہیں۔ انہوں نے اپنی غزیر شاہی میں اقبال کی نمایاں پردی کی ہے اور اس
میں ناکامی کے احساس نے انہیں صحنہ لڑکر دیا۔ ان کے ذہن میں عثمان و
شہرت کا شوق ہے۔ عابہ نفسانی گزریں ڈالتا رہا جو بھائے کلنے کے ادھی سی ہی
گئیں۔ قبیل صاحب مقرر ہیں کہ

”شہرت کی ہوس کس کو نہیں ہے“

یہ شہرت پرستی انسان کو مختلف روپ دھارنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ جذبہ بھی احسان
گمزی کی صورت اور بھی احساس برتری و فخر و فخر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں
صاحب کی طرف نظر پڑتی ہے ان کے عالم سے خالی نہیں۔ غزوانی کا چیرا ایت آواز سے
ہو یا دیوانگی کا لباس تارہ حقیقت کے مختلف روپ میں کہے ہیں یہ

فسر لائیک جیل نے پھر اغنیاء کی دیوانگی ذریعہ شہرت نہ ہو سکی
ظاہر ہے جو دیوانگی معصوم غازی کی گئی ہو وہ دیوانگی تو ہوگی نہیں، خود انتشار
کرتے ہیں نہ

صوائے جنوں میں بھی ہم نے کی تک نہ دینے ہر شاہی
کا خون کی طرف سے سب گذرے پہلا ہوا دم موڑ لیا
دانش گری کی تپش بھی اگر با عقیدہ ہو تو سی جہیز دلوں کی تسکین ہے قبل خواب
کی گری حقیقت بھی یا افسانہ کہنا مشکل ہے، فراتے ہیں
دنیا کے لیے مروت ہے قبل افسانہ مری گسرا ہی کا
رستہ تھا خطا، منزل نہ ملی، رہی چوڑیا، اسٹیشن موڑ لیا
پھر کہتے ہیں

جیل کو گری مہارک کہ اب تو سامان بھی وہی ہے
جیل کی وحشت کا بے قاضہ خرد کا میلان بھی وہی ہے
ایک طرف دعویٰ آگیا، دوسری طرف اعلان گری، یعنی چہ؟

ہماری سبب آگیا میں یقین کیا ہے گمان کی شدت
جو شک کی آغوش میں پلا ہو اصول ایمان بھی وہی ہے
قبیل صاحب بقول خود آگیا کے مارے ہوئے تھے

مت پوچھے حال مظہر کی مارا ہے غریب آگیا کا
جیل راز آگیا پہ پائی نہ ڈال وار شکی کے برے
لگا کھنٹی ہی منتقل ہو مگر یہ تیرہ ہیں مہر مانہ

پھر خود ہی کہتے ہیں

اللہ چائے اس خودی سے جو جیسے بے ہوئے خودی کا
ان سب کے ہوتے ہوئے جیل صاحب کی غزلیں ان کی شمع طبعی، مضمون آفرینی
نقد و بیان اور وضاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ جلیل فن و تحلیل نگاری آئینہ دار ہیں۔

آج کی نئی دہلی

وہ مختلف شعروں سے قاصر ہوئے اور بہت بکھرے حوش بھی کی۔ حافظہ و عرفی
ہوں یا غالب و مومن، ایتن و اقبال ہوں یا پرتو و اجمنی، وہ بکھرے حوش عہد کے
ساتھ ان کے فن کا احراز کرتے ہیں اور اپنی صہیت کا اظہار جمل غزلیں کی غزلوں
کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے غالب، اقبال، شاد، جوش اور آغا گل
کی پیروی کی ہے اور ان سے انسا نہیں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شکوہ

دل اپنی طلب میں صادق تھا مگر اسے سوسے مطلوب گیا
دیبا سے یہ موتی نکلا تھا دیا ہی میں جب کہ ڈوب گیا

جیل

اسی سے جہلی سے اس کی ہب وصل نہیں تو کچھ بھی نہیں
دیا میں نہ تھا تو فخر تھا، دیا میں ملاؤ کچھ بھی نہیں

غالب

عشرت کا طوطے دیا میں فٹ ہو جانا اس کی ہستی ہے جہلی سے نمایاں نہیں
دکھ کا حسدے گزرتا ہے دوا ہو جانا صحت قسطیہ کی دیا میں فٹا ہو جانا

میسر

شام ہی سے بھاسا رہتا ہے کئی ٹر نہیں پیدا کئی دھن میں بکھی
دل ہوا ہے چراغ غفلت کا دل جاسے مظہر کا ٹوٹ کر باہر ان کا

دند

تہمتیں چند اپنے ذمے دھس چکے آئے تھے کشمکش میں بھی ماہانہ
کس لیے آئے تھے ہم کس لیے اس طعنہ کو کچھ لیل و نہار لے

اقبال

تیرہ و کار ہے ازل سے تا امروز کسے خستہ کجی کر کے چراغ معطوفی
جہاں میں آگ لگائی پھرے گی یوں ہی

باغ بہشت سے مجھے حکم مفرد تھا کہیں ابھی تو پاؤں سے کاٹنے لگانا ہوں میں
کار جہاں دانا ہے اپ پر انتظار کر ابھی نکال نہ گزرا نہ زنگی سے مجھے
جیل صاحب کی غزلیں میں ایک ارتقا کی کیفیت موجود ہے۔ ان کی ابتلائی
غزلیں فکر و فتنے کے لحاظ سے اتنی پختل اور نفسانیاں نہیں ہیں۔ ان کے یہاں
ایسی غزلیں بھی موجود ہیں جو روحانی تغزل سے مملو، فصاحت، بامان اور لعل منت
کی مثال بھی جاسکتی ہیں۔

لگے میں آپ کا باہنہ کا بار پاتی ہے تو پھر میرے فعل ہر بار پاتی ہے
وہ چاہے ہیں اور انہوں نے اعتبار نہیں دیا ہے ہیں مگر انتظار باقی ہے
میشرف غزلیں غازی کی دیکش ترکیبوں، تشبیہیں اور استعاروں سے متون میں تو اکثر
غزلیں ہندی اخلاقی سادگی و عمویت کا حسن کوئی ہیں جیل صاحب کی خصوص

جلیل مظہری کی مرثیہ نگاری

بار نکازانہ بصیرت افروزی اور تعمیری نگاہ سے ہلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مرثیوں کی روایت نگار ایسا نادر ہول گسیا جوئے حالات کی مدافعت کے لیے ضروری تھا۔ ان کی حدت طرازی کا یہ سمن قدم کامیاب ثابت ہوا اور انھوں نے جو کم آج سے تیس چالیس سال پہلے بویا تھا وہ پورا ایک تناور درخت کی شکل میں نمودار ہوا جس کی گھنیری شاخوں کے سایہ میں جدید مرثیہ نگاروں کے قافلے رواں ہوئے۔

جلیل مظہری کا مزاج فلسفیانہ ہے جو کائنات کے اسرار و رموز کی قدحہ کشائی کسی خاص نقطہ نظر کا سہارا لے کر نہیں کرتا بلکہ یہ حقیقت کی ذاتی تلاش و تاویل کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے فطرت کی کھلی جوتی کتاب کو اپنے علم و وجدان اور تجربے کی روشنی میں واقعات کو بلا کا جاننے کے کر مذہب اور خالص فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے بلند کیا اور یہ ذہن نشین کر لیا کہ ہم اس ساتھ میں انسانی قدروں کو مکمل طور پر جلوہ گر رکھ سکتے ہیں۔ جلیل مظہری کا حکیمانہ شعور اخلاقی و روحانی پیکروں کو سامنے رکھتا ہے جس سے زندگی کے لیے جوش و حرارت کا پینام مل سکے اور ہماری روحانی زندگی کے عزائم بھی پورے ہو سکیں۔

جلیل مظہری نے اجتہاد فکر و نظر سے کام لیا۔ مرثیوں میں قومی شاعری کا یہ نونگار اداس حسن و خوبصورتی کے ساتھ کر مرثیہ کے فنی نقصانے مجروح نہیں ہوئے جو کہ مرثیوں کی تخلیق کا زمانہ ہندوستان کے دور غلامی سے بھی وابستہ رہا ہے۔ اس لیے قومی غیرت و حمیت کو بیدار کرنے کے لیے غریب جہاد بلند کرتے ہیں یہ وہ وقت تھا کہ جب آپ مظلومانہ کی محبت میں سیاست سے گہری دلپس ہی رہے تھے۔ آپ کے ایک مرثیہ سے یہ دور بندش کیے جا رہے ہیں کہ جو اس حقیقت کو واضح کرے

جف وہ قوم جو ہولمت شاہ شہدا
وہ حکومت کے گھیری میں ہو حیرت کی ہے جا

فکرونی کی دنیا میں بعض شخصیتیں اپنے گونا گوں کالاب اور بیش بہا تخلیقی سرے کے باعث معجزانہ بن جاتی ہیں۔ ایسی شخصیتیں بڑی پہلو دار ہوتی ہیں جن کی شخصیت کا ہر پہلو اپنی جگہ مستقل ایک تفسیر کا محتاج ہے۔ علامہ جلیل مظہری کا تعارف کرانے وقت ناقدین کو اسی نوع کے احساس سے گزرنے پڑتا ہے۔ انھوں نے اصناف سخن میں خواہ غزل ہو یا نظم، قصیدہ ہو یا مرثیہ، رباعیات ہوں یا قطعات یا مثنوی سپہیں یکساں مہارت فن کا ایسا مظاہرہ کیا جو سخنوران کا مل کے لیے باعث رشک ہے۔ آپ نے غزل کی رعنائیوں کو نظر کش کر اسے تجربات کی وسیع تردنیاسے متعارف کرایا۔ رنگ و تزیین فلسف کے خوش آہنگ لہجوں سے آشنا ہونے لپے اور جذبہ و خیال محسوسات کے تراشیدہ پیکر میں انکروائیاں لینے ہیں۔ ساتھ ساتھ ذہنیات معنی کی پہنائیاں تخیل کی گنگا یوں سے تابناک و جلوہ بردار نظر آتی ہیں قصیدہ جو بیسویں صدی میں پردہ گماٹی جاتا تھا اسے خوش عقیدگی، انفسک اور وجدان کے سرچشمے سے سیراب کیے اس کی مژدہ رگوں میں نیا خون دوڑایا۔ ان کی نظمیں نہ صرف اعلیٰ حسن کا دارانہ خاق سخن کی دلیل ہیں بلکہ تخیل کو اس کے امکانات کی نئی دنیا سے آشنا کراتی ہے۔ یہ خلاق ذہن جو معمولی ادراک اور فعال طبیعت کے دودہ نادار تجربات پیش کرتا ہے جو حکمت و معرفت و رموز اسرار کائنات کے دریچے وا کرتے ہیں۔ آپ کے مرثیوں سے جو دوسری ادبی تخلیقات کے پہلو پہ پہلو سرور قلم ہوتے رہے، اور دیکھ کر کسی مرثیوں کو اپنے گہرے جذبہ اصلاح سے آشنا متاثر کیا کہ مرثیہ نگاری میں نئے شعور و فکر کی ابتداء ہوئی۔ بیسویں صدی کی نقل پسندی اور اس کے فکری، ایمانائے مطالبات پہلی

• شبنم دود گندہ میلہ کالج پٹنہ لاہور پٹنہ ۴

آج کل نئی دہلی

یہ بشریت سے بے پناہ ہمدردی کے سبب پیدا ہوا ہے۔ مضرب شہا کے ان بندوں کا بغور مطالعہ کریں تو شاعر کے حساس دل کی دھڑکن صاف طور پر سننے کو ملے گی۔

ظلمت کہہ میں ہند کے محشر پاپے آج
تہذیب اپنے خون سے رنگیں قبا ہے آج
دقتار وقت مدگی ارتقا رہے آج
لیکن جو ہور ہا تھا وہی ہور ہا ہے آج
جن سے خودی جہاں میں ہے اڑاں اسی طرح
انسان کا غلام ہے انسان اسی طرح

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلکٹ
ایمان کی ہوری ہے تجارت ابھی تلکٹ
جاگیر ابرہمن کی ہے جنت ابھی تلکٹ
ابلیس ہے معلم فطرت ابھی تلکٹ
پامانی حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا ایک قتل عام ہے

جدید مرثیہ نگاری میں جوش اور جمیل نظری کے سلائے گرامی عزہ و احترام سے لیے جاتے ہیں۔ جوش نے اپنے سیاسی مسک کی نقشب میں مولانا محمد علی جوہر سے اثر قبول کیا تھا۔ اور جمیل نظری مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر ہوئے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر کے مزار اور ان کے پیغام میں جوش، ولولہ، بلند آہنگی، جذباتی سیلاب، عزم، سرفروشی تھا اس کی جھلک جوش کے ابتدائی مرثیوں میں مل جاتی اس کے برخلاف ابوالکلام آزاد میں جوشی ستانت، رقار کی استقامت اور مصمت کو شمی بھی اس کے عناصر کی پرچائیاں جمیل منظر ہی یہاں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں شخصیتوں کی اقتاد طبع، ان نفسیاتی مجبوریات، ان کی خاندانی روایات کا اختلاف اور ان کا مشق و مزاولت کا فرق بھی کا فرما ہے۔ میرا مومنوع میاں جمیل، جوش کے مرثیوں کا تقابلی مطالعہ نہیں چونکہ یہ دونوں جدید مرثیہ نگار کے میرا درامیر کچھ جاسکتے ہیں اس لیے اتنی بات بلا خوف تردد کہی جاسکتی ہے کہ جمیل نظری نے جدید مرثیہ نگار کی ایک نیا روش جوش نے اسے وصمت دی جمیل نظری نے امام حسین کو نجات دہندہ انسانیت کہا ہے۔ جوش امام حسین کو نجات دہندہ تاریخ مشرقین سمجھتے ہیں۔ حوام کی فلاح جمیل نظری کا نقطہ نظر ہے۔ جوش عوامی حکومت چاہتے ہیں۔

جس طرف دیکھتے ہیں موت کا ایک سستا
نہ کوئی پیر تدبیر نہ جوان رعیت
جسم ہے مدفن دل مجلس گورستان میں
بستیوں روح کی اک وادی خاموشاں میں

جائے عبرت ہے ترے حال پہ قوم مغفور
ریخ پنجکت کا اثر دل میں غلامی کا سرور
نہ اخوت کی ترپ ہے نہ سیاست کا شعور
نہ خرد ہے نہ جنوں ہے نہ حیا ہے نہ غرور
زندگی میت احساس ہے دل مرده میں
تجئے جذبات ہیں قوی وہ سب افسردہ میں

جمیل نظری ذہنی اور فکری طور پر انیس و عالت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ خود ایک مقام پر اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ”آج بھی میرے مرثیوں کے مطالعہ کے بعد میرا نقاد یہی فیصد کر سکتا ہے کہ ان میں انیس کے آہنگ سے زیادہ غالب کا آہنگ ہے اور انیس کے انداز نگار سے زیادہ غالب کا انداز نگار بول رہا ہے۔ جمیل نظری کے مرثیے عرفان عشق میں غالب کے ذہن رسائی بہتائی ملتی ہے۔

آدمی زادکب انساں ہے بقول غالب
استواری ہی میں ایماں ہے بقول غالب
سوز دل راز چہ راز غالب ہے بقول غالب
درد خو و معنی درماں ہے بقول غالب
عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جانا

فلس درد بھی ایک جزو خطا کے لیے
چاہیے فوقی نظر منظر عبرت کے لیے
آئینہ صاف رہے عکس حقیقت کے لیے
نرم ہو دل کی زمین خم محبت کے لیے
اسے مرہ چہم سئے اشک سے لبریز ہے
نہ بچے شمع دفا لاکھ ہوا تیس رہے

جمیل نظری کے مرثیوں میں ایسے اجزاء بھی ملتے ہیں جن کے مطالعے کے بعد حرفی پسند ادب ان پر اشتراکیت کا لیبل چسکا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمیل نظری کا نقطہ نظر تاریک نہیں ہے بلکہ

جیل منہری کے مرثیوں میں ایسے ٹکڑے مرقعے ملیں گے جو دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں ناپید ہیں۔ کردار نگاری، واقعہ نگاری، نفسیات انسانی کا جائزہ، جذبے کی پراثر مصوری، واقعہ نگار سے حیات انسانی کو نئی بشارت، بگڑے سیاسی شعور اور یکجا نقطہ نظر وہ امتیازی خوبیاں ہیں جو مثنوی حیثیت سے مرثیوں کو نئی زندگی عطا کر گئیں۔ انھوں نے قدیم مرثیوں کے ادب نمودار کیں ہیں مگر اسی حد تک جہاں تک ان کی فکری حریت انھیں اجازت دیتی ہے۔ آپ نے ان مواقع سے پہلو تہی کی ہے جہاں پر کھنسی مذاق سخن کا اثر نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر گھوڑے کی تشریف میں مسافرا یا تلوار کے حسن میں نزاکت خیال کے غموںات نہیں ملتے ہیں۔ مرثیے میں ان کا شمول لکھنؤ کے انحطاط پذیر معاشرے کی نوک ہے۔

ان کے مرثیوں کے چہروں میں اسرار و رموز کا نبات کے دفتر ملتے ہیں۔ میدان کار زار کی سر در آرائی بھی بیان کی گئی ہے۔ دلدوز مناظر اور ساقی نامے نئی علامتوں کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ جیسا کہا جا چکا ہے کہ جیل منہری کے مرثیوں کے اجزائے ترکیبی پر سختی سے کار بند نہیں ہیں۔ خود امیں دو دیر کے مرثیوں میں ایسے مرثیے ملیں گے جن جو حد میں کسی بہتر یا پیشتر اثر کو حذف کر دیا گیا ہے اور جہاں تک مستند کی حیثیت کا تعلق ہے وہ آج بھی قدیم و جدید مرثیہ نگاروں میں بیک وقت مقبول و محبوب ہے۔ علامتے آج کے جدید طرز کے مستند سے جن باتوں میں اشتباہ کیا ہے وہ گہرا تبلیغی رنگ ہے جس میں خطابت کا بندھا حاکم انداز چاہتا رہے انتہام تک برقرار رہتا ہے۔ آپ کے مرثیوں میں جو تبلیغی عناصر ملتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ پہلے کسی اہم کردار سے ذہنی و جذباتی رابطہ قائم کرتے ہیں اور بعد میں وہ عناصر ساری نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ نقش گہرا اور دیر پا بھی ثابت ہوتا ہے۔

جیل منہری نے جو تبلیغی حلقے نظم کیے ہیں ان میں یہ برابر خیال نمودار رکھا ہے کہ اگر یہ دیکھا کہ فضائیں کرتے وقت امام حسین یا ان کے اعزاء و احباب یا محدثات عصمت و طہارت کا ایسا کردار پیش نہ ہو کہ جس سے ظاہر ہو کہ مصائب و آلام نے ان کے عصمتائے میں شکستگی و اندک پیدا کر دی تھی ادب کے کین کا یہ بھی ایک بڑا وصف ہے کہ ان میں رقت و دلدوزی بھی خوب ہے۔ یعنی ایک جانب بشری تقاضے بھی ہیں اور دوسری جانب الہی تقاضے بھی پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں جیل منہری کے ایک مرثیے سے جناب زینب کے مہلک نفس کو دیکھیں۔

آج کل نئی دہلی

شہر رواں کی شجاعت کے نمونے دکھائے مال کے اقبال سے پر دان چڑھے غوں میں نہالے سرخرو ہو کے پھرے لی بھی جبینوں نہ لائے ہے یہ رادی کا بیاں سامنے لائے جب آئے دل پہ اس کو کہ ملی مال نے بڑا جبر کیا جس پہ تاریخ کو حیرت ہوئی وہ صبر کیا

بیٹھ کر لاش پہ آنسو نہ بہایا اُس نے صبر مخدومہ کو نین دکھایا اُس نے صحن میں آن کے سجود بچایا اُس نے سجدہ شکر میں سر اپنا جھکایا اُس نے ماست دل کو سلنے جو گلی باسٹ یہ کی تھر تھرا لے ہوئے ہوٹوں سے مناجات یہ کی

اے میرے ہائے دلے مرفدیہ ہو قبول میری قربانی احقر مرے مولا ہو قبول آل احمد کا یہ ناچیز ہمدیہ ہو قبول پش داغ دل و خستہ ز صبرا ہو قبول کیا ہے اعدائے مری کو کہ جو دیران کردی تیری بخشش تھی مری راہ میں قربان کردی

جیل منہری جدید اور مرثیہ نگاری کے امام ہیں۔ انھوں نے مرثیے کی کلاسیکی روایات کی پابندی بھی اس حد تک کی ہے کہ جہاں تک آپ کی فکری حریت نے اجازت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مرثیوں میں ایک طرف کلاسیکی انداز سخن کے ساتھ جدید رنگ کے مستند کا ایسا امتوازن آہنگ پیدا ہو گیا ہے جو نئی اصلاح و مضمون اجزا کی نشاندہی کرتا ہے۔ جیل منہری نے امتیاز کے بھرپور بان میں فطرت کی گہرائیوں کو سمجھا ہے۔ علامت کے مرثیے کا غائر مطالعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر انیس کے لب و لہجہ میں غالب کی روح سخن ہو چکا ہو۔ انھوں نے مرثیے کی تبلیغی مشن کو آکر کار نہیں بنایا ہے۔ وہ ایسے کو کھیلے بلند پایہ فنوں سے گریز کرتے ہیں۔ انھوں نے فن کی نزاکتوں کا احترام بھی کیا ہے۔

علامت کے پیش نظر اسلام کا وہ انقلاب عظیم ہے کہ جس نے بشریت کے لیے روحانی اخلاقی اور مادی قدروں کا ایسا ستارہ اودھ مستحکم نظریہ پیش کیا کہ جس سے انسانیت سدا کے لیے نور پام

اگست ۱۹۹۲ء



حمیل کی لوریاں

برقی، شاعرے میں غزل کی مقبولیت نے جہاں بہت سی مہنگوں کو سب اپنات دیا، وہاں لوری بھی اس کا شکار ہوئی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تاسف نہیں کہ اردو دنیا میں لوری کبھی ہی نہیں گئی۔

لوری بیانیہ سٹ انداز کی ایک اچھوتی صنف ہے۔ یہ اپنی ہیئت اور قماش بندری سے کم، سیرت اور موضوع سے زیادہ بیچنی جاسکتی ہے۔ اس کے تجربے، ہنر، ہنریت اور سانس کے محتاج نہیں بلکہ یہ صنف اپنا قالب آپ ڈھال لیتی ہے۔

لوری کا ناز و انداز عجیب سوا گئیں ہوتا ہے، معصوم بھولے بھالے بچوں کو سلانے وقت اشعار بکے بکے کمر میں گنگنائے جاتے ہیں، لے مضم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے لوری کے ساتھ کہیں نہ پائے جاتے۔ خواہوں کی پرلوں کو چپکے سے، استعارے کی چھوٹ دے کر کٹائے اور اشعار سے بلایا جاتا ہے۔ تھکیاں دے دے کہ بہت نرم لہجے میں مشفقانہ جذبات و تحولات پیش کئے جاتے ہیں۔ نیک تمنائیں چلتی ہیں۔ دولت و ثروت، علم و ہنر کے کلمات غیر زبرد ادا ہوتے ہیں۔ لوریاں بچوں، بچوں کو سلاتے، کاکب غریب صورت و ذریعہ نئی ہیں۔ مائیں بڑی بڑھیاں، بیمار کرتی جاتی ہیں۔ انہوں نے محبت میں چھوئے ہوئے معصوموں کے ہونٹ چومے جاتے ہیں۔ بالوں میں اٹھکیاں ہوسے ہوئے ترقی ہوئی شانہ

کھتی جاتی ہیں اور کبھی پائے کی ریشی ڈوریاں دھیرے دھیرے ہلائی جاتی ہیں۔ بچے بچیاں کھلی اور ادھ کھلی آنکھوں سے سارے منظر دیکھتے رہتے ہیں۔ لوریوں کے نرم سیر نیوں کا لڑن میں رس گھولے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ سواتے ہیں اور لوریاں خود بخود ختم ہونے لگتی جاتی ہیں۔ تھیل کی لوریوں کا کبوتر و سب سے ہے۔ ان کے مخاطب اگرچہ ان کے عزیز نہ بچپن میں ہیں، لیکن یہ زندگی کے سائل، روموز و نکات،

اردو گیت کی شروعات ادبی طور پر نظم کے بعد ہوئی، لیکن اسے عوامی مقبولیت نظم سے پہلے حاصل ہو چکی تھی۔ گھر آگے میں گائے جانے والے گیت ادبی نہ تھے، لیکن تہذیبی و رنہ ضرور رہے ہیں۔ ایسے گیت کا لڑن کا لڑن سرعت کے ساتھ عورتوں میں مقبول ہوئے ہیں۔ کبھی بڑبڑانوں کے بیوں پر چلے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی گھر کی عورتیں اسے گاتی رہی ہیں۔ اس طرح کے غیر تحریری اور زبان زد گیت آج مختلف موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔ ہر موقع محل کے اعتبار سے الگ الگ گیت ہوتے ہیں۔ اس طرز خاص کے گیت تقریباً گیت کہے جاسکتے ہیں۔

فلمی اور ادبی گیت کے مزاج اور سیلان میں خاصہ فرق پایا جاتا ہے۔ وجود ظاہر ہے۔ ادبی گیت فلمی گیت سے فضا میں سانس لیتے ہیں، ان کے آزاد ہوتے ہیں۔ یہ وہ نامے ہیں جو پائے بندے نہیں ہوتے۔ لیکن فلمی گیت واقعات کے جبر سے آزاد نہیں ہو پاتے بلکہ قصے کے دباؤ سے ٹھہر پڑ جاتے ہیں۔ گویا قصے کے محتاج ہوتے ہیں۔ مناظر کے پس منظر کے تحت کھینچے جاتے ہیں۔ فلمی گیتوں کے نمائندہ شعراء تقیل، ہشکین اور سحر کے جاسکتے ہیں۔ ادبی گیتوں کو نیا پیکر اور رنگ میٹر نیا زبانی، تیرانا منی، تاجہ شہزاد جیل الدین ملانی اور سکتوں رسول نے دیا ہے۔

گیت کے پس منظر سے ایک بھول، اہل صنف "لوری" بھی برآمد ہوئی ہے۔ جس طرح دوہے، برہے گیت کے ذیل میں شمار کئے جاتے رہے ہیں، لوری کو بھی اس کے تحت حائیا پہنا جاتا رہا ہے۔ بعد میں اس طرح کی صنفیں موضوعات کے اعتبار سے خود ایک آزاد صنف کی حیثیت سے تسلیم کی جانے لگیں۔ ٹھیک ہی صورت حال لوری کے ساتھ بھی پیش آئی۔ اردو میں لوریاں عموماً ہیں۔ شعرا نے اس صنف سے بھی بے توجہی

عصری سیاست، عالمی صورت حال، امیر و غریب کے امتیاز و فرق کی زیریں
لہریوں میں مدغم ہو گئی ہے۔ یہ اندازِ فکر ان کی لہریوں کو نئے رنگ اور
نئی جلوہ سادائیاں عطا کرتا ہے۔

عام طور پر ریگیت، لوری، تعقید، مرثیہ، سہرا اور تعزیتی نظموں میں
مخاطب کی شخصیت پر اسے طور پر اچھری نہیں۔ انفرادیت اور اس کی جزئیات
سے ایک سر یہ صنفیں محروم نظر آتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر نام کی تبدیلی
کر دی جائے تو شناخت کا ہلکا رنگ اور کچھ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ جس نے
لہریوں اور کچوں سے متعلق نظموں میں یہ اہتمام کیا ہے کہ بھولی بھالی شخصیت
کردار منظر پر اسے برسرِ مرتبہ ہیں۔ الگ الگ خصوصیات اور جبلت سے
ذات کی پوری پہچان کرا رہے ہیں۔ ہر لوری اور نظم (کچوں سے متعلق)
ایک ذات سے ہم رشتہ معلوم ہوتی۔ انفرادی رنگوں کی حمیز کی چند مثالیں
بطور نمونہ دیکھی جاسکتی ہیں:

ہنسی ہے تو گھر یا ہے جو روتی ہے تو باجا
سو جاتے ہیں سب لوگ تو جیتا ہے ترازا

جینیں تری سختی میں تو اٹھ جاتی ہیں داری
ابھی یہ کہتے ہیں کہ کچھ ہے فادی

لمک لک سوسے ادیدی و فیلا کیدی
تو راہی اگر دی و شاہیدی و ریدی

زندہ دلی میں جدِ معلوم اور غصے کے وقت مجتہم
خان بہادر اعلیٰ خاں

ہاتھوں کو ٹھکے کے چشمہ چھینا
مذہور ہوئی وہ چشمہ بینا
آیا جو بدن میں زور تھوڑا
چشمے کو ٹپک ٹپک کے توڑا

چاند کو دیکھ کر یہ کہتے حسین
میری آکا آئینہ ہے یہ
گیسے یہ سوسے آساں پہنچا
تھا یہاں کس طرح و ہاں پہنچا

وہ شرارت جو ٹوٹی کو جو تاکرے
اور مصلے پہ دڈا کے ٹوٹا کرے
اپنے ناما کو گھوڑا بنایا کرے
وہ نہ دوڑیں تو گھوڑے لگا کرے

ٹوٹی پہلے سے کہیلے ہو تم
لال گیندوں سے اتفاق نہیں
کالی بوتل سے کہیلے ہو تم
عقل کم ہے تمہارے کہیلیوں میں

کس نے بچے بچوں کی شخصیت شامی، تجملی نفسی کے وسیلے کی جاری ہیں۔
کاغذ پر پھیلے الگ الگ رنگوں کی بکیر تراشی کیا خوب ہے۔ یہ تیران کی

کلیاتی (۱)

لہریوں اور کچوں کی نظموں میں پائے جاتے ہیں۔ لطیف طنز نے ابھی رنگ تیز
کر دیے ہیں۔

نقصا اور سلاخ کے الگ الگ نقوش، اطراف و جوانب کے خاکے،
پرورش کردہ کی خوب صورت تصویریں کیا خوب ہیں:

سورہوش لاٹک کی وادی ہے یہ، پشیم
سورہوش دمی میں مانی نہیں، مانا نہیں
ایک ڈیڑی ہے سو وہ بھی ٹھک کے ہے سو یا ہوا
کس قدر خاموش ہے شامِ غریباں، سورہو

جانِ مانا سورہو

جب کہ سورج چھپ گیا اور دھوپ تڑپا کرے
تب ذرا فروغیت ہے اس کو گھر کے کام سے
اونٹنی ہے دیر سے بچاری آسان سورہو

جانِ مانا سورہو

حقیقت یہ ہے کہ لوری جس ماحول و فضا میں پئی ہے اس کے موقع،
جذبے کی آنکھ سے اور کبھی کندھ بن گئے ہیں۔

نیند کی بربطوں نے اگر شام کو لوری جودی
منظروں نے رات کی ہستی کی چادر اڑھادی
غیر سوتا ہو گیا بازار سوتے ہو گئے
خواب گاہ سیم و زر محلوں میں اپنے سو گئے

تھو پڑوں میں سو گئے مزدور و مہمان سورہو

جانِ مانا سورہو

جائے سناہر کی پرچھائیاں بھی سو گئیں
شام سے بچتی ہوئی شہنشاہیاں بھی سو گئیں
نیند پر دوائے کو آئی اور حب گنو سو گئے
سو گئیں سارنگیاں مغل کے گھنکر و سو گئے

جلے جلے سو گئی شیش شیشیاں، سورہو

جانِ مانا سورہو

اور گھٹتی ہے روشنی اور تیرگی خاموش ہے
میدوں میں، ثبت کردہ میں زندگی خاموش ہے
زندگی خاموش اس کی کرشمیں خاموش ہیں
وقت کے پائے طرکی آتشیں خاموش ہیں

موجِ نغمہ دہا ہوئی شہرِ فوٹاں، سورہو

جانِ مانا سورہو

(پیشہ صحت مند)

اگست ۱۹۸۰ء

جمیل مظہری

کے کلام میں حب الوطنی اور ہندوستانیت

وطن محبت، سیاسی و سماجی حالات اور اقتصادی مسئلہ عالم کی محبتی جاگتی تصویر کشی کی گئی ہے اور قوم و ملک کو نرم و شیریں لب دلجو اور سحر آزی کے پیرائے میں بولا کر نے ادران کے خوابیدہ جذبات کو ابھانے کی بڑی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ نظم جمالیات اور جلالیت ہر دو رنگ و آہنگ سے لبریز ہے۔ یہ نظم اشتراک عمل اور مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ قومی یکتہ و یکجہت کا رنگ و آہنگ ملاحظہ ہو۔

ہندو مسلم، سکھ، عیسائی تیسری گرو میں بھائی بھائی جھنجھٹوں میں تیسرے بادل کے سایہ میں تیسرے آنچل کے مسجد، گرجا اور شوالہ لنگے تاکو ہمسالہ گنگا اور جمن کی روانی کہتی ہے مائتیسری کسان کی اس نظم میں قومی اتحاد و اتفاق، آپسی خلوص و محبت اور متحدہ قومیت کی ایک دلچسپ تفصیلات ہے۔

آہم تیسرے بال سنواریں تھہر اپنی جانیں واریں
سیس ترے سپروں پر نوازیں پیٹ کے بیٹھے منتر کاغذیں
قومیت کی کڑیاں جوڑیں لہنت کی زنجیریں توڑیں
نام ترا لے کے پکاریں موتی غصرت کو لٹکادیں
جمیل مظہری نے اس نظم میں جاننا زمان و وطن کی شجاعت و بہادری کے بیٹھے ترانے کی گائے ہیں اور رنگ آزادی کے متروکوں کو لگا دیا بھی ہے۔ پوری کی پوری نظم مصوٰات انداز اور لطیف و شیریں انداز واد میں کہی گئی ہے لیکن رمز و ایمان کے پیرے میں جذبہ وطنیت اور قومی وحدت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نظم میں درد و کرب اور اضطراب و بے قراری کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم میں ماضی کی تاریخ و تہذیب کی کہانی کہہ کر اداسلاف کے کاناہوں کو دہرا کر ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور وطن وحدت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاعری میں اثر و تاثر اور سحر و نفوذی و جادوگری کی کیفیت بدرجہ احسن پائی جاتی ہے۔ شاعری میں موسیقیت کی رنگ آمیزی ہوتی ہے جس میں جذبات و احساسات کو براہِ بخیر نہ کرنے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری دل و دماغ پر بہت جلد اثر کرتی ہے۔ اسی خیال کے پیش نظر ہر بیدار مغز شاعر اور بالغ فکر اپنے خیالات اور جذباتی رنگ و آہنگ سے قوم و مسلح کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش و سعی کرتا ہے۔ جمیل مظہری نے بھی وہی کیا۔ قومی ترانے کا کار واد وطنی راگ الاپ کر قوم و مساجد کو جگایا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ جمیل مظہری کی شخصیت اور شاعری اسی غلامی کی مسموم نفسا میں بنی اور پر وانی چرمی جمیل مظہری کی شاعری کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اقبال، جوش، بھگت، سیات، استیل میر جی، انیسٹرا و ضیظ وغیرہ کی قومی و وطنی شاعری کی ایک ہم آہنگ فضا استوار ہو چکی تھی۔ ہر ادیب و شاعر فطری طور پر اپنے ہم در واول سے تاثرات قبول کرتا ہے اور اپنے نگہروں کو تب و تاب فضا کرتا ہے۔ جمیل مظہری نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ماحول و فضا اور شاعرانہ رنگ و آہنگ سے گہرے تاثرات قبول کیے اور اپنی شاعری کو توانائی و تابندگی عطا کی۔ دوسری طرف اردو شعرو اب کی نفسا روانی و جمالیاتی رنگ و روغن سے بھی ممو ر تھی۔ یہی سبب ہے کہ جمیل مظہری کی شاعری میں دو مائیت اور انقلابیت دونوں رنگوں کی گہری رنگ آمیزی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری جمالی اور جلالی دونوں عناصر و اجزاء سے مرکب ہے۔ ان کے جلالی تیز و رنگ میں بھی جمالی رنگ کی کافر سرائی نظر آتی ہے۔ جمیل مظہری کی ایک طویل نظم "بھارت مائت" ہے جس میں تاریخ و تہذیب، ہمد و ماحول، قومی یکجہت و یکجہت

ساتھ ہی ساتھ قوت بازو کی آواز اور جان نثاری کی تمنا اور عزم و جوش کی بندی کی طلب کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔

او مانا، گوتم کی ماسا
 ارجن اور بھیشم کی مانا
 یشو کی ماں، اکبر کی ماں
 ستونہ ماں، بلوچی ماں
 شکیں تجھ سے، ست تجھ سے ہے
 مت تجھ سے، ہمت تجھ سے ہے

ٹیپو اور پورس پسید اگر
دیس کا سر بیوک ہو انہی
ہر پتری ہو سہ سہی مانی
ہر دل میں اک طوفان کردے

ایک اٹھے تو دس پیدا کر
ہر بجے آناں اور گاندھی
ہر ان ہو کشمی بانی
شعلہ بھڑے بجلی بھڑے

جمیس نظری کی انقلابی نظموں میں جہاں ایک طرف سبیدگی و ستائش کی کارفرمائی نظر آتی ہے اور دوسری دھڑی آج کی گرمی محسوس ہوتی ہے وہیں دوسری طرف شدت جذبات اور شعلہ فشاں کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان کی نظم نوے برس ایک خوبصورت انقلابی نظم ہے۔ جس میں خون کو گرما دینے والی صدا بھی ہے اور بلند چوٹ کی ادا واداس بھی۔ کارنگ و آہنگ بھی غالب ہے۔ یہ نظم یقیناً حکم اور ملے جہیز کا درس دیتی ہے۔ نظم جمیل نظری کے قومی شعور و قومی جذبہ اور وطنی محبت کی سبکی طور پر عکاس کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بڑھے ہوئے ہوں وصلے چڑھی ہوئی ہواستیں

پہلے دو صورت جہاں اُلٹ دو صفیہ زمیں

پلٹ دو دھڑا سماں بڑھے چلو بڑھے چلو

برادران نوجواں بڑھے حبسو بڑھے چلو

[illegible]

قسم تمہارے عزم کی، فدا تمہاری شان کے

بڑھانے والے توڑ پھوڑ سے اُسمان کے

حکام و شاخ کھنڈار، ٹھہرے جلو ٹھہرے جلو

ہرگز اس وقت تک نہیں بڑے ہو کر رہے جو
برادرانِ نوجوان بڑے چسپو بڑے چلو
جمل منظر ہی اس نظم کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے
ہیں کہ ہندوستان کی آزادی اور قومیت کی تعمیر و تشکیل اور استحکام
دعویٰ میں صرف غیر مسلموں ہی حصہ نہیں لیا ہے بلکہ مسلمانوں نے
بھی ایشیادور قبائلی پیش کی ہے اور میرٹھ ان کے شانہ بہ شانہ رہے ہیں۔

و علی حصہ بھی لیا۔ انھوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت وطنی محبت اہل قومی فریضے سرشار جو کہ اس جنگ آزادی میں حصہ لیا اعداد شمار و قربانی کے لیے برحق تیار رہے۔ ۱۹۴۷ء کی "بصارت بھڑوڑ" کی قومی تحریک نے میل منظر کی گواہی دے کر ان کا تذکرہ کیا۔ گاندھی جی کی حمایت میں اس تحریک میں علی بھی لیا۔ انھوں نے "عرف دہشت و فکری خدمات انجام دیں۔ لاکھ لاکھ کی مجموعی امداد میں بھی برداشت کیں۔

جمیل نظری ایک حساس دل و دماغ کے کرائے تھے۔ انھوں نے قوم و ملک اور سیاسی و سماجی حالات کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ امدان پر نگار کرنا اور اپنا وقت فرض سمجھا۔ جمیل نظری کی نظمیں دراصل قوم و ملک کے پیچ و خم اور سیاسی و سماجی اور اقتصادی حالات و کیفیات اور کشمکش کے مرتعے ہیں جہاں زندگی کے ہر پہلو کی تصویریں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں مڑتے ہیں "صدائے جرس" "دھوکہ غم" "نہایت" "وقت کا دھارا پھیرنے والے" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

”شاعری تنقید ریاضی ہے“ اور ”ترقی پسند ادب“ کے زیر اثر جمیل منظر ہی نے حرفِ انفرادی سے پہلے کے حالات و کیفیات کا ہی مشاہدہ نہیں کیا ہے بلکہ انفرادی کے بعد کے قومی اور سیاسی و سماجی حالات، و جبر و استبداد و اقلیتی کشمکش اور عدم مساوات کا اپنا اثر نظرِ مطالعہ اور محاسبہ کیا ہے اور ان سے اپنی شاعری کو جلا کر پیش ہے۔ انھوں نے اپنی حقیقت نگاری اور صداقت بیانی سے قوم و سماج کو مساوات، انسانیت، رواداری، عدل و انصاف، اخوت و بھائی چارگی، عزم و استقلال اور شہرِ موعود و فکر کی تعلیم دی اور متقین کی ہے جمہوری خیالات کو پھیلایا اور تقدیر پر قوم و ملک کو جرنے اور سستوارنے کی ترغیب دی۔ ان کی نظمیں ’جشنِ آزادی‘، ’یومِ آزادی‘، ’نغمہ و ہارسے‘ موسم کے اشارے، ’تعمیریت‘ اور مزدور کی بارسری‘ وغیرہ اس صداقت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان نظموں میں انھوں نے زندگی کے حقائق اور مسائل کی محکم طویل پر بنیاضی اور شہرِ نئی کی ہے اور ان پر ہمہ گیری تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ شاعر و فوہ جذبات میں بہتا چلا جا تا ہے اور اپنے خیالات سے قوم و سماج کو جگمگا اور بھرپور جلا جاتا ہے۔ ایک عظیم قومی جذبات رکھنے والا شاعر اور سماجی و وطن دہی سے جو بلا امتیاز مذہب و ملت اجتماعی شعور اور اجتماعی خیالات کو منتشر کر کے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں پیش پیش رہے۔ جمیل منظر ہی کی نظموں میں یہ تمام حسنِ برادرِ عام موجود ہیں۔ ’یومِ آزادی‘ کے یہ چند اشعار

مگر احساسِ مسرت کی یہ بربادی کب
روح آزاد نہیں ہے تو پھر آزادی کب
وہ غلامی جو نہ حالات کا نیو سمجھے
وہ غلامی کہ جو زنجیر کو زور سمجھے
وہ غلامی کہ قناعت سے بنے جس کا مزاج
مسر پہ آقاؤں کی پاپوش ہو جس کیلئے سماج
پھر آگے چل کر لکھتے ہیں ۔

مفسر یہ کہ وہی سہ ہے وہی دل ہے ابھی
روح اس قوم کی پائندہ سلاسل ہے ابھی
نظمِ جشنِ آزادی کے یہ چند اشعار
جشنِ آزادی جہوڑ مبارک ہو جنہیں
روحِ خستہؔ مزدور مبارک ہو جنہیں

اہلِ پیش کو مبارک ہو یہ سامانِ نشاط
خونِ مفلس سے یہ گلکاریِ دامنِ نشاط

ہوئے آزاد تو کیا گردشِ دوران ہے وہی
حسرت اے صبحِ وطن شامِ غربا ہے وہی
نظمِ نازِ سحر کا یہ شعر ہندو مسلم اکٹھا اور اخوت و ہمسائی
چارگی کا غماز ہے ۔

بھئی گاتے مندر میں اٹھے بھاری
زباںِ ستون پر ہے حمد باری

جلیل نظری نے اپنی شاعری کو ہندوستانی رنگ و روغن
میں رنگنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہندوستانی فضا بندی اور
مقامی رنگ آمیزی جلیل نظری کی شاعری کی انتہائی خصوصیت ہے۔
وہ وہاں کی تہذیب و تمدن اور آپسی خلوص و محبت کو زیادہ سے زیادہ
خوش گوار فضا میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کی نظم
”نیا شوالہ“ کی طرح وہ بھی ایک حسین و جمیل نیا شوالہ بنانے کے متمنی ہیں۔
جس کے اندر ہندو مسلم دونوں مل کر پیادہ و محبت کے ترانے اس
طرح گاتے ہیں ۔

اے دانا سنار کے دانا سب سے ادنیٰ نام ترا
مسجدِ مستور ہو گھٹ تیری، درشن لیکو عام ترا
جنسِ دالے جوگی تیسرے، کسلی دالے جوگی تیرے
جوگ کی بگٹ دینے والے روگ ہے انعام ترا

گلشنِ گلشنِ بخت تیری، مہرِ مہرِ قدرت تیری
دریا دریا رحمت تیری، قطرہ قطرہ جام تیرا
سب سے اچھی ہے وہ جنسی جس میں ہوں آوازیں تیری
سب سے میٹھی ہے وہ بولی جس میں ہو پیغام تیرا
پریم کی لہریں، پریم کی نیا، تو ہی گھٹ اور تو ہی گھٹا
پار لگا دے بیڑا بھٹا، پار لگا نا کام تیسرا

نظیر اکبر آبادی کی طرح جلیل نظری نے بھی اپنی شاعری کی اوجیت
ہندوستانی اشیا، اور ہندوستانی قیامات پر استوار کی ہے جلیل
نے مقامی مناظرِ فطرت کی رہنمائی اور انجمنوں سے لہما لہما استفادہ
کرنے کی سعی کی ہے ساتھ ہی ساتھ الفاظ و محاورے بھی ہندی کے
اپنائے ہیں۔ ہندوستانی رنگ و آہنگ اور مقامی فضا آفرینی سے
ان کی شاعری میں شیرینی، لطافت اور موسیقیت و موسیت کی
خصوصیت و کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات و
کیفیات اور مشاہدات و تصورات کی نیکر ان بوتلموٹی پائی جاتی ہے۔ لہذا
ہوں یہ چند اشعار

گھٹا سون کی تنہا کے مصل پر آ کے کہتی ہے
کہ آنسو کے سندھیے لائے ہیں ہم بندہ را بن سے

ہوا بھی گلی گھٹا بھی گلی، ابھی ہے دھوپ اور ابھی ہے بدلی
کہ جیسے کوئی نقاب رُخ سے اٹھا رہا ہو، گر بار بار ہو

نہا نکھر کر بہاری را دھانے آج پہنی ہے دھانی ساری
نہیں ہیں شافلوں پہ بھیگی بھیگی کھیت پر ابرِ جھوٹا ہے

ساوان کا ہینس ہے ہوا جھوم رہی ہے را دھانی پر پلکوں میں گھٹا جھوم رہی ہے
امبی ہوئی بدلی کو فدا دیکھ تو سمجھی تو جھوم رہی ہے کہ گھٹا جھوم رہی ہے
چیرا ہے مہل آپ نے وقت پہ شاد آج
ناگن کی طرح زلف رسا جھوم رہی ہے

جلیل نظری نے اپنی شاعری میں ہندی کے الفاظ و محاورے تعلیمات
اور دوسرے عناصر و اجزاء کو پس منظر پر رکھنے کی کوشش کی ہے مثلاً
اردھن، پریم، بندہ را، را دھا، گھیر، گنگا جنا، باتسری، گھونگھٹ، جمنی،
پجاری، گھٹا، جمنی، گھٹا، پچل، دھانی، جگل، گھونگھٹ، جیون،
جنس، سنسار، دانا، اپنل، ساوان، منند، پریم، آشاد، مگھری، مہلوں
بانجی، مکھیاں، گھنیر، پچل، گھٹ، ہولی، ہیت، سہیل، پرگڑ، نام گھٹا،
(نظمِ ستون ۸۲ ص ۶۷)
اگست ۱۹۸۲ء

جمیل نظری کی ظریفانہ شاعری

کی دھار ہے دجبالہ بار ہے اعتدال سے خود مزاج نگار کے پاؤں کاٹ
سکتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری یا ادب کی تاریخ میں یہاں
لا تعداد شاعرانہ انشا ہر دہا ہر دور میں نظر آتے ہیں وہاں ظرافت نگار
معدودے چند ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہے کہ سنجیدہ ظرافت
ایک تہارت ہی مشکل فن ہے جو ہر کس و نا کس کے بس سے باہر ہے۔
پروفیسر جمیل نظری ایک بڑے قادر الکلام شاعر گذرے ہیں انھوں
نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن شاید ہم ہی گوئیں کہ معلوم ہے
ان کی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا تھا جب انھوں نے نثریاد شاعری
کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ان کی جوانی کا زیادہ تر زمانہ کلکتہ میں گذرا۔
اور یہ زمانہ ان کی صحافی زندگی کا دور تھا۔ وہ زمانہ عجیب کلکتہ کی
اردو صحافت پر زیادہ تر فلمی شخصیتوں کی چھاپ رہتی تھی ہنسنے دارانہ بات
تو مخصوص طور پر فلمی شخصیتوں ہی کے ذکر واد کا رے سے معمور رہتے تھے بعض
فلمی صحافیوں نے صحافت کو ابتداء کی اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ ان کی
قدردانی کے سلسلے میں فلمی ایگریٹسوں کو خاتمِ ادب تک بنا ڈالا کسی نے کسی
کو سیدانی ثابت کرنا چاہا تو کسی نے کسی کو خوش بخت میں اپنی بہن کہ ڈالا۔
عام طور پر فلمی صحافی ایگریٹسوں کے مستقل دہر دار ہوتے۔ جمیل نظری نے
بعض دوستوں اور بزرگوں کے اشارے پر اس طرف توجہ کی اور ان کی
طبیعت میں خود انقباض تھا وہ سب سے پہلے ایک نقد کی صورت
میں برآمد ہوا۔ یہی قطعہ جمیل نظری کی ظرافت نگاری یا ہجو نگاری کی ابتدا
ہے۔ فرماتے ہیں۔

کل ملنے آئے مجھ سے مرے اک عزیز دوست
ہم مٹ رہے روف و بہ ایمان صابری
نذرِ بے فصل خطوط و تصاویرِ مددِ خان
دورِ دُباںِ حدیثِ سیتا و مادِ مہتری

ظرافت ایک کثیر المعنی لفظ ہے جس کے لغوی معنی خوش طبعی
دل لگی، مذاقِ مسخر، چٹخرائی وغیرہ کے ہیں لیکن صنفی سطح پر اس کے
وہم و دائرے میں سنجیدہ طنز و مزاح، ہجو، ریمینی، واسوخت، شہر آشوب
پروردگی بھی آجاتے ہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ ادب میں سنجیدہ ظرافت،
فنِ تنقید کا ایک شوگر کوٹیزر یا سسٹم ہے۔ ایک ناقد کسی فنِ ایسے کی
اچھائیوں اور برائیوں پر روشنی ڈال کر اس کے معیار و مرتبے کا تعین کرنا
ہے، جبکہ ایک ظرافت نگار، معاشرہ کی بے اعتدالیوں یا کسی جماعت یا
شخصیت کے قول و فعل کے تضاد کی تصویر کشی کر کے معنویت اور
ہمعقولیت کی سرحدیں متعین کرتا ہے۔ اداس طرح ہنسنے ہنسانے بڑے
کام کی باتیں کہہ جاتا ہے۔

کچھ لوگ طنز و مزاج کو ادب کی کوئی صنف تسلیم کرنے میں نامل
کہتے ہیں۔ لیکن طنز و مزاج کو اپنی اہمیت منوانے کے لیے کسی سمنی سفاکش
یا میاٹھی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی بونے پر اصنافِ ادب میں
وہی دھبہ رکھتا ہے جو دوسری کسی بھی صنف کو حاصل نہیں یعنی سنجیدہ ادب
کے ساتھ ساتھ سنجیدہ ظرافت کا بھی اپنا مقام ہے۔

جس طرح ایک مہذب مجلس میں کسی بے ادبی کی گنجائش نہیں ہوتی،
اسی طرح طنز و ظرافت کی صنف بھی کسی ابتداء کی سطحی مزاح یا ادبی بے
راہ روی کی شکل نہیں ہوتی اور اس آہنگیہ کو چھوڑنا یا ابتداء کی
غصیس سے محفوظ رکھنا بڑے چوکوں کا کام ہے۔ مدعا ادا کا تو سب کو
آتا ہے، لیکن رونے اور گانے کی طرح ہنسنے ہنسانے میں بھی حکمت، تحمل اور
توازن درکار ہوتا ہے اور اس کے لیے بڑی ریاضت و شرافت اور شائستگی
کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ظرافت نگاری، ایک ایسی شہوار

● گردنی باغ۔ پٹنہ

میں نے پس از سلام دلیں از تہنیت کہا
افزون ہے در آسب کی غلی برادری
گوئی ہوئی ہے عشق کے نغموں سے کائنات
ہر فواں کا دل ہے کھسب کی بارسری
لیکن خطا معاف ، مجھے پوچھنا ہے یہ
کس روگٹ کی دوا ہے یہ غلی ایڑی
یہ اشتہا ہے نفس ہے یا شغل روح
یہ کاروبار عشق ہے یا تنگ نہ گری
یہ خدمت وطن ہے کہ عتاشی خیال
یہ خواہش نمود ہے یا قوم پروری
میں نے تو یہ سنا ہے کہ فیض عشق سے
یہ جذبہ پرستش و ذوق شت گری
لیکن سوالے داغ جسک کچھ نہیں حصول
شیشے میں آج تک کوئی آنری نہیں پری
اک شب کے واسطے ہی حرم وصال میں
حاصل ہوا نہ آپ کو اعزاز شوہری
آئینہ سامنے ہے ادھر دیکھتے ذرا
سب دل کا داغ اور جبیں ایڑی

اس کے بعد ان سوالوں کا جواب بھی غلی ایڑی صاحب کی زبان
سے ملاحظہ ہو۔

کہنے لگے مجھ کو کہ حاسد ہیں آپ لوگ
پوچھا ہے صاف صاف تو سنئے کھری کھری
ہم ہیں بمقتدر دندان و مسل لب
جو ہر اگر ہے حسن تو ہم لوگٹ جو ہری
ہم سامنے حسینوں کے رکھتے ہیں آئینہ
ہم متصل دلوں کو سکھاتے ہیں شاعری
ہم پیے ہیں شربت وصال و دولے دل
در مرض سے عشق کے مشکل ہے تاثیر
عزت ہزاری دیکھتے بازار حسن میں
مس مدحیں بڑھاتی ہیں پانوں کی منتری
گوئی حجاب دہی ہیں ہنس کر سلام کا
ہوئی سبب ملتقت مجھ مانو اختر کی
یہ مشکل دوق نظر کا ہے مسئلہ
جسک کے آپ کیا، غلی ہے شاعری

اس بکثرت لطف کو غالب سے پوچھتے
کرتے ہیں ہم زخوں کے لیے ہم صورتی
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
حافظ ہمیشہ مسبت سے ذات چاہیے
اس سلسلے کا ایک بڑا جوہر کا نام مدرس شہر آشوب صحافت
تھا۔ یہ مدرس مدرس حالی کی پروردگی کے انداز میں لگی گئی تھی۔ اس
میں صحافت کی گئی گزری حالت پر توں کے آئینوں کی جگہ ہنس اور ہمتوں
کی پھلجھڑیاں چھوٹی گئی ہیں۔ امتداد کے چند ملاحظہ ہوں۔

یہ کل خواب میں ہم نے حالی سے پوچھا
مرض قوم میں آج ہمک ہیں کیا کیا
کہا یہ کہ مفلس کو بوسے کا پکا
اور اس پر ادارت کا سنگین سودا
فلاکت میں درجہ جنت غضب ہے
جہالت میں شوق صحافت غضب ہے

یہی حال مونی میں اس شخص کا ہے
جو زخوں کی لہروں میں اگر کھنسا ہے
گھاں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
ایڑی ہے، لیکن چلپی بنا ہے
لگا ہے مشورہ جوتی پہ جوتی
مگر پھر بھی کھسائی نہیں آنکھ انجی

فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
کہ اکٹ غلپی پاؤں دیوار ہی ہے
چلم ناچک اس سے بھروار ہی ہے
چپ درامت سے یہ صدا آرہی ہے
دفا دار عاشق کا انتخاب دیکھو
ایڑی شہر کی دگت سرعام دیکھو

اس کے بعد اس دور کی صحافتی بد مذاقی کا خاکہ اڑا گیا ہے کہ
کیونکر ادبی رسائل غلی رسائل بن گئے اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ
مشہور صحافی ادیب خواجہ حسن نظامی نے ایک بیسوں کے غلی جہرے کئے اس
موقع کے دو بند بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

وہ دلی کے مشہور ہر نظامی
تصوف میں رنگ سنائی دیا
چھ مجاہد حسن جن کا اسم گرامی
تلم ان کا دے زمروں کو سلامی
کے غلی جہرے، ہوا اپنی کھودی
صحافت کی خواہش کے لکھا ڈھوئی

کسی میچا کو قلم پر نہ چایا کسی مال زادی کو بے گم بنایا
لقب دے کے بیل کا اور چایا اڑایا اڑایا اڑا کر زمیں پر مگر آیا
جودے نقدہ گن سے گائے ہیں اسکا
دکس طرح گائیں کہ کھائے ہیں اسکا

ان فلمی طوائفوں کا ایڈیٹر دل سے کیا رشتہ ہے یہ بھی ملاحظہ ہو۔
طوائف سے بھارت تو مہتر ایڈیٹر طوائف کے سر کا سینہ پر ایڈیٹر
وہ ہے ناریل اور بندر ایڈیٹر وہ فٹ بال ہے، انفلڈ ایڈیٹر
طوائف سے گاڑی ایڈیٹر ہے مومڑا

سلامت یہ جوڑی مبارک یہ جوڑا
فلمی رسائل کے ایڈیٹر دل کا جو اس وقت حال تھا، آج بھی ان

حالات کے پیش نظر ہمارے فلمی صحافی بہت حاصل کر سکتے ہیں۔
یہ فلمی رسائل کے افراد جاہل جو ہیں یو جہتی یہ کہ حرف باطل
دائساں میں داخل نہ جیال میں شامل نہ جودے کا لائق نہ جوہنی کے قابل
نہ جودو کھیں نہ کسی نکھی ہے

مقدور میں بس ان کے جونی کھی ہے
نہ مغل میں طلبہ کیا سکتے ہیں یہ نہ میل میں بند نہ چا سکتے ہیں یہ
نہ بول میں نہ جگ دکھائے ہیں یہ نہ فطلا لٹ رہی کی کھائے ہیں یہ

نہ جانے یہ کیسے مرض کی دوا ہیں
بظاہر یہ ان کی دم فاختہ ہیں
نہ کھیتوں میں یہ کل چلانے کے قابل نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ مشکل میں روٹی کمانے کے قابل نہ مڑکوں پر رکنا چلانے کے قابل

نہ بھگتی کا پیشہ نہ مہبت کا پیشہ
پندران کو آیا ایڈیٹر کا پیشہ
اُس جہد کے فلمی صحافیوں میں بعض شاعر کے مخصوص دوست

بھی تھے۔ ان کو چڑھانے کی غرض سے معاملہ کچھ آگے بڑھا اور ان کی
محبوبوں کی تعریف میں قصیدے بھی لکھے گئے۔ مسدس کا نمونہ آپ نے
دیکھ لیا۔ اب قصیدہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ایک قصیدہ میں ایک ممدوحہ

کا سراپا یوں نظم کیا گیا ہے۔
وہ پاک و صاف و مطہر ہے چاکل کھلے کا شہیدان آرزو کا کفن
کچھ اسطر ہے حیا کا خمیر فطرت میں کدے شرم کے ابھرنے آجک جو
جلال حسن ہے وہ کمال ہو سیتی کہ قرض کرتی ہے ہر ہر ادائیگی
حریم نازی کھڑکی سے طوطی کی چوٹی بہو بازار کا کٹ پاتھ وادی اکین
ہوا بتا کہ ہے بتلاہر کو غمزدہ حسن کنز جھکنا ہے مرداروں کو چاہ و ذفن
قصیدہ کے آخر میں ممدوحہ کے لیے دعا اور اپنے لیے عرض حال

ہوتی ہے۔

نصا کر کے کوئی مہراجہ انکولے بھانگے
بٹھا کے اپنے ہوائی جہاز پر مستان

عرض حال ملاحظہ ہو۔

ہے اب یہ خم قصیدہ۔ اتھما ہے نیاز کسی دن آگے بھر دے پچھلے دشن
ہمارا چاک بگڑ بھی رفو کا ہے محتاج کنگاہ آپ کی بخیہ گری کو ہے سوزن
یہ مانتا ہوں کہ مفسس کو قیامت نہیں لٹا رہا ہوں مگر بلے بھلے سخن
مولے نقد دل اور سکر ہائے داغ مگر ہماری جیب میں کوڑی نہیں ہائے کفن
پہلی ممدوحہ کے بعد دوسری ممدوحہ بھی شاعر کے ایک بہت ہی
گہرے دوست کی مشق و قلمناز تھیں۔ ان کی بھی باری آئی۔ ملاحظہ ہو۔

اگرچہ شہسب میں ہے گرم صحن کا بازار
مگر کہیں نہیں ملتا ہے ایک بوسہ ادھار
ہر اک دکان پہ چھل ہے درد دل کی دوا
کدھر علاج کو جائے یہ شاعر بیمار
کسی نے بھی نہ پوچھا کہ چاہتے کیا ہو
میں نقد دل لیے پھرتا رہا، ہزار ہزار
حسرام پور کے خواب سے خدا سمجھے
کہ ایک بوسہ کی قیمت لگا دی پانچ ہزار
دماغ ہی نہیں ملتا اداسہ روشوں کا
اب اس زمانے میں سودا کے قشق ہے دوشلر
تشیب کے بعد گریز کی بے ساختگی دیکھتے ہے

منازع دل کا نہیں کوئی قدر داں ملے دوست
اب اس میں زہرہ و دین نہ ہوں یا کہ ہو منتاد
مگر ہے ایک گھر ایسا جہاں ہے پرش متوق
حتی دہشت جی ہے یہ حسن کی سرکار
اب اس جی ہنست جی کی مدد میں شاعر کا جوش عقیدت ملاحظہ
ہو۔

امینہ دل دریں، میری چھاتوں کا لٹھار
ہے نگہ گاہ منتائے عاشق بیسار
وہ قتیہ جس میں کہیں دفن سہیں دل کی
وہ قتیہ جس پر کہ پڑے گا گول گھر بوشاد
زبان بھی ہوئی قتیہ، بجا ہوا شتر
نظر آئی ہوئی برہمی، کھینچی ہوئی تلوار
قابلاً یہ ممدوحہ بھول والی تھیں۔

صدف کی قطرہ فدازی اسی سے ظاہر ہے
 اگل چلی گئی موتی جو ہیں گلے کا ہار
 ایک تیسری ممدودہ کی درگت بھی دیکھتے چلیے۔
 رہی کجی کو ہاتھوں ہاتھ گردن شمشیر بیاض
 ریشی آنکھ کا ریشی گئے ازاران میں
 گل جاتی ہے گل جاتی ہے گل جاتی جاتی ہے
 کیسے کیا شمع بے چاری پلا پڑتا ہے پروانہ
 جی یوں ملک میں جیسے بڑے روٹی ترک کی
 رہا محروم اس نعمت سے لیکن ایک دیوانہ
 وہ دیوانہ جو دامن نوح لیتا ہے شریعوں کا
 تری خمار بکا کرتا ہے جو کاکلی سفیرا نہ
 اس قصیدہ میں دیوانہ ایک فلمی ہیڈ ٹرک کی طرف اشارہ ہے۔ آخر

میں شاعر کجی کو یوں نصیحت کرتا ہے۔
 خدا ناکردہ سر کٹا گئی میں بیٹھتا ہوگا
 جگلی شمع لیکن پاس بیٹھتا گا نہ پروانہ
 مزا جو صلح ہو جائے اگر دوچار بوسوں میں
 لب شاعر سے کرے دوستی زما رہا نہ

آخری شعر میں شاعر نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے جس سے
 شہر ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں وہ بھی جن کے مذاحوں میں تھے اور
 کیوں نہ ہوئے اس وقت ہوا ہی ایسی چل رہی تھی۔

جیل منہری کا ذوق، جو کوئی جب باندھ ہونے لگا تو ان کے معن
 مفصوں اور گہرے دوستوں نے اپنی اپنی جوی فراموش کر کے کھووائیں
 یہ شرف بھی شاید جو نگار میں صرف جیل منہری کو حاصل ہے۔ اس قسم
 کی حد ستانہ جو میں جیل منہری کا فن انتہائی حروج پر پہنچا نظر آتا ہے۔
 ان جو بے نظموں میں عموماً مشنواں ہوتی ہیں، جیل منہری اپنے
 دوست کی شان میں ایک کہانی کہتے ہیں اور وہ کہانی اس کے نام
 سے منسوب کر کے شاعری کے پھول بکھرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی
 ایک کہانی تھی ان کی زبانی اور گہرے میری زبانی سنئے۔ ان کے ایک
 دوست کھنڈو شریف نے گئے ہیں اور وہاں چوک پر ان کی کیا درگت
 بنتی ہے اس کا حال سنئے۔

تھی مہا جین نے دونوں جیل بھری ایسے عالم میں سو جیتی ہے ہری
 دل میں طوفان دنگ و لوکے لیے نکلے یہ سیر کھنڈو کے لیے
 کھنڈو کے چوک کی تھہر کر کشی ملاحظہ ہو۔

کھنڈو زخمت رہاں آباد زور چشم ادھ، غروس بلاد

آج کل کی دہائی

اپنے جوں پہ مسکراتی تھی
 چوک کسے کو کہکشاں کیسے
 وہ جھروکوں پہ مہ و شوں کی بہار
 بیچ دھم گیسوؤں میں ڈلے ہوئے
 جسم پر ایک سسڑی چادر
 دوش نازک سے ڈھلک جاتی تھی
 اس منظر کشی کے بعد اب داستان آگے بڑھتی ہے۔

تھی جھروکے پہ اک بت مسرور
 عرض میں فیل طول میں اک تار
 چرنی اور گوشت کا چین پہاڑ
 رخ کی گولائی گنبد دوار
 عقل رخصت ہوئی، نگاہ کے ساتھ
 خیر سرکار کوٹھے پر چٹھے، نیس پر چھٹی گئی، مول تیل شروع ہوا مگر
 دام اتنے تھے کہ مہر و ج کی جنت نہ پڑی اس وقت ان کی نفسیاتی
 کیفیت کیا تھی۔ شاعر کی زبان سے سنئے۔

چونکہ سرکار آدمی ہیں بنیل
 دل نے لیکن بڑی خوشامد کی
 آخر میں دل کی جیت ہوئی اور حضرت خلوت وصال میں پہنچے۔

چونکہ محبوب بن دوش سے بہاڑ تھی اس لیے
 منعقد جب شب وصال ہوئی عشق پر زندگی وہاں ہوئی
 اس نے اپنی طرف انھیں کھینچا
 دونوں شانے دہائی دیئے گئے
 حال بے چارے کا ہوا جو تباہ
 "غلط راستے" کی داغ نہیں دی جاسکتی ہے۔ خیر ان کا تو یہ
 حال تھا، ادھر کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

اور وہ بدست بکھری جاتی تھی
 آستانے کا احترام کرو
 خان صاحب انھوں سلام کرو
 لیکن جب ممدوح ناکام رہتے ہیں تو محبوبہ جھینڈا کر بنتی ہے۔

ڈھل گئی رات صبح ہوتی ہے
 بھاڑیں جو کھنڈو پر سستی کو
 نوج یہ ٹھنڈی گرمیاں تو بہ
 اب تو جھوڑو کہ جبانہ لڑ گئی
 داری جاؤں رہے گا احسان یاد
 اٹھو کٹھنی میں کھول دیتی ہوں
 انفرض منغل ہوئے سرکار
 مرنے کے لمحے غل جاتے سرکار

جینے، شرانے، مودھنائے ہوئے
اُترے گھسے سے مرجھائے ہوئے

اب ایک ایسی مثنوی کا تدارف آپ سے کرنا ہوں جو اپنی
مستکی اور شمیم ظہریں کے لحاظ سے ایسے فلسفے کی چیز تھی جو شاعر
استاد محترم مولانا راضی دہشت مرحوم اور صوفی بزرگ حکیم ابوالاعلا
نے کے سامنے بزم احباب گلشن کی ایک نشست میں پڑھی تھی۔ اس
ذی کی شان نزول یہ تھی کہ حسیل مغہری کے ایک گہرے دوست بزم
باب کے مہربان جو بزم کے جلسوں میں عموماً فیر حاضر رہا کرتے تھے۔ باوجود
اس کے جب انھوں نے عادت نہیں بدلی تو احباب نے سرحد حسیل مغہری
ہ فرمائش کی کہ ان کی شان میں کچھ لکھیں۔ موصوف نے اس وعدے پر
ن کے دوست ملاذ غری کی ایک دولت بزم کو دیں گے، ان کی شان
یہ مثنوی لکھی۔ اس میں بھی حسب معمول ایک کہانی کی گئی ہے
دوست کی بے وفائی پر صل کر بدعاش دی گئی ہیں اور یہ بدعاشی
یہ اشعار ہیں گئے ہیں۔ یہ حضرت تامل کے بڑے شوقین تھے۔ کتب
پہنچنے تو بان بچے رات سے پہلے کبھی نہیں اٹھتے اور بزم کے جلسوں
بقت بھی بھول جایا کرتے تھے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

مرض سب کا مدعا ہے یہ جملہ احباب کی دعا ہے یہ
فاز ہے وہ دست ناز نہیں کرے پاپوش سرفراز نہیں
ہے دعا ہے بھی برسر راہے ماش جب کھیلے کوچی چاہے
طے کوئی کھلے والا چمکے بیٹھ رہو تم اے لالہ
کھیلو تو جو بری تو ہیں یعنی بن جاؤ پیسے کی مشین
بڑ پودہ ہوں اور بنیامات پیسے پیسے ہو آدمی رات
ن بنائے چکر کو جاؤ تم در تو بہ کو بند پاؤ تم
اب یہیں سے، جو میں وہ گھڑی ہوئی کہانی شروع ہوتی ہے۔

رکاوہ واڑہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ بیوی نے دروازہ بند کر دیا ہے۔ ہر چند
شش گزرتے ہیں لیکن دروازہ نہیں کھلتا۔ آخر کار یہ
سکھٹ کی کھلی جو مل جلے فہرہ بول تمہارا کھل جائے
کہ تم اپنے غم میں کامل ہو جد کی طرح گھر میں داخل ہو
ہست اس خوف سے قدم کی چاہے کہیں بیگم دعا میں پاپ سے باپ
آنکھائے کی میز پر جب جاؤ ہولہٹوں میں ہر طرف ستم و
لی ہانڈی میں ساگ کھٹے سرد چوہے میں آگ کھٹے
نحالت سے ناز ہو کر تم بھوک سے بیقرار ہو کر تم
جوازہ جگا و دانی کو جھوڑ جیسے ہی چارپائی کو

وہ یہ مجھے تمہارے اس ڈھب سے کہ تم آئے ہو اور مطلب ہے
پھر تو ڈھب کے غل چاہے وہ فتنہ خفتہ کو جگا دے وہ
تیز و حریک ہو قلب عالم کی یعنی کھل جائے آنکھ بیگم کی
آنکھیں و شعلہ زہر وقتا دینا عذاب انشاد
بستر ناز سے اٹھے طوفان ٹھن من کلین طیبہ سان
پھر تو ہو گھر میں خلفائے دوست اترے سب تاش کا خوارے دوست
لفظ دمعنی کا دو بحر بارے

بن کے احباب کی دعا ہے
بیگم صاحبہ غصہ میں یوں دو بحر بارے سانی ہیں
تلف ہے اس بل جابلطیت پر ایک کالی کوئی عورت پر
جی بگڑا محس گیب توبہ پانی آنکھوں کا ڈھل گیا توبہ
نوح، اس سین میں یہ نیرہ پن باولے ہو گئے تھے کیا دشمن
کس گھڑی یہ یہ قسم ہو گئے ایسے بردہ گیجے کم ہو گئے
دانی سو کہنے خدا کی شان ایڑی ہوئی یہ میں کروں قربان
آج بھی میں ہتھکڑیے انکے کر کھے بیٹھے تھے کیوں مسکے
میں بھلا ان کی جان بھوڑ گئی اسی چو کھٹ پر سر کر بھوڑ گئی
الغرض جب شاعر کی بددعا سے یہ طوفان برپا ہوگا تو پھر

اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا
کہتے کہتے یو نہی سحر ہو جائے گھر سے باہر خبر ہو جائے
چھوڑا کہہ دے جا کے مال سے اور مال کے ڈھالی سے
اور ڈھالی سے سن لے عصر حیدر شہر میں اس خبر ہو ستفید
جھوٹی باتوں کی اندھیاں اٹھیں جس طرف جاؤ آنکھیاں اٹھیں
ایک سے ایک مسکرا کے کہے کھلیوں سے نہیں بتا کے کہے
وہ جو بیٹے ہیں چارپائی پر جان دیتے ہیں اپنی دانی پر
اور وہ کچھ ایسی مدلقا بھی نہیں لطف یہ ہے کہ پار ساجی نہیں
ایسے غریب کو منہ لگاتی ہے اور ٹھیکان اٹھیں دکھاتی ہے
ایک بولے کہ وجہ کیا ہے یار کردہ عورت سے ان سے کھل سیرا
دوسرا بولے آدمی ہیں بخیل پیسے دینے میں کرتے ہوئے کھل
تیسرا بولے سبب کچھ اور ہے ضرورت علاج کی فی الفور
کیوں وہ ہذا خفا ہے دامن سے اسکو بوجھ حکیم باطن سے
الغرض مفت جگ ہنساتی ہو بے سبب بیگم خدا کی ہو
ہم کہیں جس کے ہاتھ لائے یار صبر احباب کا پڑا اسے یار
اس کے بعد مثنوی کے ختم ہونے سے پہلے شاعر اپنے دوستوں
کو تنبیہ کرتا ہے۔

ہرم سے جی اگر چہ سداؤ گئے مار میرے قسم کی کھاؤ گئے
مجھ سے یاں کس کو ستھاری ہے آج یہ کل تہ سادی باری ہے
جیل منہری جب کھلائے گی مصافحی زندگی ترک کر کے حکومت
بہار کے محکمہ نشر و اشاعت میں اردو پبلیشنگ انٹرپرائز سے پڑ گئے
توان کی عزت نگاری کم ہو گئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے وہاں صرف دو
مواقع ایسے آئے جہاں انھوں نے غیر فتنہ کو آواز دی۔ بات یہ ہوئی کہ
موصوف جیل سے برائے پیش نے بریشان کر رکھا تھا۔ ان کے پر میری
کھانوں کے لیے سبزی باغ پٹنے کے مشہور گھی فروش مولوی مکھن کی
دکان سے گھی آ کر تھا۔ ایک مرتبہ گھی ایسا ناقص آیا کہ استعمال
کے بعد مریض میں اضافہ ہو گیا۔ پھر تو جیل منہری کی روح جھینلا اٹھی
اور ایک ایسا عجیب و غریب قلم پڑا جو اردو جو نگاری میں شاید
سنسکریٹ میں ہو۔ سودا کی بجوں ابتداء کی حد تک پہنچ کر کالی گھنٹہ
بن جاتی تھیں۔ لیکن جیل منہری کی جو کئی خصوصیت ہے کہ وہ قلم لوگوں
کے سامنے میں بھی بڑی جاسکتی ہے اور خدا اس کے ہونٹوں پر بھی تسم
لا سکتی ہے جس کی درگت بنائی گئی ہے۔ مولوی مکھن کی جو کئی چند
مشہور اشعار جو کھانے سے لے کر پڑنے تک زبان و ذہن میں آتے ہیں۔

اے مولوی مکھن

تم عقل کے دشمن ہو کہ ایمان کے دشمن
یا اپنی ہی اٹھتی ہوئی دکان کے دشمن
کیوں اپنے خرمیادوں کی ہوجان کے دشمن
اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن

گھی پیچھے ہیں آپ کہ میں پیچھے ایمان
کھا کر اسے ڈبے ہوئے پٹنے کے پہلوان
کھلائے، معشوقوں کا بھرے ہوئے جوبن
اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن

تم شیخ ہو یا قوم کے بقال بتاؤ
تم مولوی ہو یا کہ ہو چنڈال بتاؤ
تم آدمی ہو یا کہ ہو بونہار بزمین
اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن

چرن کا بہت گھی میں ملانا نہیں اچھا
ہو جاؤ گے بزم زمنا نہ نہیں اچھا

پہنائے گی باتوں میں پوس چوڑیاں جمن
اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن

اے مولوی قسربان تری فتنہ گری کے
دکان میں بکنا ہے ترے نام سے گھی کے
سب کے چراغوں کا چڑایا ہوا روشن
اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن

حائے کا جنم میں جو تو حکم خدا سے
آگ اور بڑھے گی تری داڑھی کی ہوا سے
اور ہوگا اسی گھی میں میگو ابراہیم
اے مولوی مکھن اے مولوی مکھن

یہ جو یہ پڑنے کے اختراعات میں جب شائع ہوا تو، روایت ہے
کہ خرمیادوں نے مولوی مکھن کی دکان کا بیکٹاک کیا اور چند ہی روز
میں اسے جاسے کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔ چنانچہ ایک دن علی الصبح وہ
جیل منہری کی قیام گاہ پر پہنچے۔ اور وہاں جو موصوف کے سامنے کھڑے
ہو گئے۔ انھوں میں انس، سنگین جیسا چہرہ، سفید داڑھی، دوپٹی ٹوپی
کرنا اور نگلی میں ملبوس ایک صاحب کو سامنے دیکھ کر جیل صاحب
نے دریافت کیا۔ فرمایا کہاں سے تشریف لائے ہیں اور میں آپ کی
کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ وہ بولے "موصوف مجھے مولوی مکھن کہتے ہیں۔
اور میں آپ کے قباب کا شکار ہو کر اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ
اب تو میرا گھی مکھن کا کاروبار ختم ہو گیا۔ گھڑا ادقات کے لیے کوٹنے کی
دکان کھولنی چاہتا ہوں۔ یہ درخواست ہے، براؤ کر اس پر چند
سفارشی جملے کہہ دیجئے تاکہ میں پرمٹ حاصل کر کے اپنی دال روٹی کا
انتظام کروں۔ جیل صاحب نے مولوی مکھن کو پہلے کھمی دکھانے دیا۔
اور ان کے خواب و خیال میں یہ بات آئی تھی کہ ان کی نظر یہ کئی کھلائے
گی، اور مولوی مکھن اس ڈرامائی انداز میں موصوف کے سامنے آئیں
گئے۔ دل ہی دل میں خرمیادہ ہوئے اور گھی کی خرابی کے باعث
اپنی طبیعت کی خرابی کا تذکرہ چھڑا، لیکن مولوی مکھن گرگ باباں دیرہ
تھے۔ مذہب سر کر لوئے کہ حضور آپ کے ذکر نے دوسری دکان سے
گھی خریدا ہوگا، اور آپ سے بیعت ہوئی ہوگا جو کئی دکان سے
خرید کر لے گیا ہے۔ بہر حال جیل منہری پر وہ دن قازا ختم کر گیا انھوں
نے مولوی مکھن کو پہلو میں بٹھایا، چائے پلائی اور انھیں ایک دہائی کھ
کروی، جس کا مفہیم یہ تھا کہ مولوی مکھن کا گھی کوڑا نہیں پرچی ہوئی

بقیہ: جمیل نظری بحیثیت غزل گو

یہ میرا فن زندگی کے صحرا میں وہ درختوں کا سلسلہ ہے
جو فکے جھمبے ہوتے مسافر کو ڈھکی سے بگا رہا ہے

پہران ہی کے اشار میں رہ

میری غزل سے شکایت ہے سنے والوں کو مرا گستاخ وہی ہے کہ جاگتا ہوئی میں

جیل خلی مریم کا میں نہیں قایل جزا حق کو نکداں دکھا رہا ہوں میں
الغیر جمیل نظری کی غزل گوئی اپنے تصادف کی متغیر خیال، رنگینی بیان اور
ذہنی طرز واداس لیے ہمیش یاد رکھی جائے گی۔

دردِ راست محکم بانداہ می نہیں
از بس کہ بر بلندی پستی گذشتہ ایم

بقیہ: جمیل نظری کے کلام میں حب الوطنی

ہم پر دس چنا، سنگار، آسرا، آسرا، ایشور وغیرہ وغیرہ۔ اس زمرے
میں جمیل نظری کا ایک شعر نقل کرنا کافی ہے جس میں انھوں نے
خود اقرار و اعتراف کیا ہے کہ اردو شاعری کو ہندوستانی رنگ و روپ
اپنانا چاہیے۔ کبھی شعر وادب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس
میں مقامی رنگ و آہنگ اور ماحول و فضا کی انفرسانی ہو۔

جمیل نظری کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ
ان کے یہاں محض لغو بازی اور انقلابی گھن گرج بلکہ ایک خاص
قسم کی نرمیت، مسانیت، بے جھجکی اور سپردگی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔
جمیل نظری نے اقبال کی پیروی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمیل نظری
کی شاعری میں دیہاتی روانی نہیں بلکہ سمندر کی گہرائی نظر آتی ہے۔ وہ
استہلا پسندی اور شدید جذبات سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ صبر و استقلال
قبط و تحمل اور اعتدال پسندی سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ زندہ زبان
کے ساتھ ساتھ ان کا انقلابی رنگ و آہنگ روانیت و تصوریت
میں بیکار گیا۔ انھوں نے رادھا اور مدنا کو تصویرات کی دنیا میں بسا ادا
لہذا شروع کر دیا۔

جمیل نظری کی شاعری سراپا مقامیت و ہندوستانییت سے
لبودہ ہے۔ ان کا شعر ہندوستانی فضا اور مقامی رنگ و آہنگ
کا پروردہ ہے۔ جمیل نظری نے اپنی شاعری کو اس آب و گل سے سیرنا
اور سرسبز و شاداب کیا ہے۔ لب و لہجہ اور انداز بیان بھی ہندوستانی
رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

کافی بیسا خالص ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ
مولوی مکھن تو آنکھانی ہو گئے، لیکن خبر ہے کہ ان کی دوکان
میں جمیل نظری کی وہ رباعی سہرے حروف میں لکھی ہوئی، خوبصورت
سے فریم میں اب تک آویزاں ہے۔

پڑنے کا دوسرا دل چسپ واقعہ جس نے جمیل نظری کی رگ و
خراقت کو پھر کرایا، وہ یہ ہے کہ اس شہر میں ایک شاعر ہوا کرتے تھے
رضی مولانا نگری، جو رشتے میں راقم الحروف کے سدھی گھٹتے تھے۔ ان سے
ہم لوگ ہمیشہ مذاق کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے اپنا اکلوتا مجموعہ کلام
”کشت خیال“ دوایچ چڑھے اور دوایچ لے، وہی ڈائری سائز پر
چھپوایا تو راقم الحروف نے اس مجموعہ کا نام ”مشت خیال“ رکھ کر ایک
مزاحیہ نظم نظم تبصرہ لکھ دی۔ رضی صاحب سخت برہم و برا فروختہ
ہوئے اس کے بعد راقم الحروف نے ایک دوسری بالکل بے معنی
نظم بعنوان ”لش“ لکھ کر رضی مولانا نگری کے پاس اسے بانٹا۔ ”ضم“ پڑھ
کو بغرض اشاعت سمجھی۔ اس وقت ”ضم“ کے ایڈیٹر شیخ مظفر توری
تھے۔ انھوں نے نظم کا مفہوم سمجھ کر بغیر اسے شائع کر دیا۔ رضی مولانا نگری
اور بھی غفا ہوئے اور جواب میں انھوں نے راقم الحروف کی جو کچھ
ڈالی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جمیل نظری پشہ کالج
میں بے حیثیت اردو پچھو مقرر ہو چکے تھے۔ جب جمیل نظری کو اس
مقررہ رضی و رضا کی خبر ہوئی تو انھوں نے ازرا و تفریح میں ان اشعار کا
ایک قطعہ لکھ کر، رضی صاحب اور دیگر احباب کو سنا ڈالا آپ بھی سن
لیجئے۔

مہدی پیر، جوان مرد سخن ہے چٹری جن کی عصا کی تانیت
ایک دن ان سے کسی نے پوچھا کچھ کی جب ہے جمپا کی تانیت
تو جی کیا ہوئے از روئے لغت ہنس کے بولے کہ رخصا کی تانیت
لیجئے، میں نے سرسری طور سے جمیل نظری کی طرف تان شاعری
سے آپ کو روشناس کر دیا۔ مکھن نے موصوف کا نظریہ کلام کچھ اور
بھی ملاحظہ کیے اس سے زیادہ مواد نہیں مل سکا۔

بقیہ: جمیل نظری کی تنقید نگاری

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ تنقید کو گستاخ میں
کاٹوں کی تلاش سمجھتے ہیں انھیں شاید جمیل نظری کی تنقیدی نگارشات
کے مطالعے سے بالواسی ہوئی لیکن جو لوگ احتشام معین کی طرح صدائق
اور بی قدروں اور اصولوں کی جستجو میں تسبیہ ہونے کو اچھا تنقید نگار
بننے کی پہلی شرط سمجھتے ہیں۔ وہ جمیل نظری کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں
کا یقیناً اعتراف کریں گے۔

آج کل کی ندی

جمیل نظری کی تنقید نگاری

کے باوجود یہ معلوم کیوں کسی بھی غیر جانبدار یا جانبدار ناقد نے ان کی نثر نگاری کے مختلف پہلوؤں خصوصاً تنقید نگاری پر تفصیل سے اظہار خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے اپنی تحقیقی کاوش ”اردو شعراء کا تنقیدی شعور“ میں جمیل نظری کے تنقیدی شعور کی نشاندہی کی لیکن مقالے کی حد بندیوں نے انھیں بھی ”نقص جمیل“ سے باہر کر دیا کو دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔ اس طرح جمیل نظری کی ادبی خدمات کا ایک اہم گوشہ متنازع بیان رہا۔

یہ بات بھی نہیں کہ جمیل نظری کے نثری مضامین ان کی ادبی زندگی کے ابتدائی یاد دہانی یا کسی ایک دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں کے ایک سرسری مطالعے سے بھی یہ اندازہ ہو جائے کہ انھوں نے امداد سے ہی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی دلچسپی لی تھی۔ موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں ان کے نثری مضامین کلکتہ کے مقامی اخباروں مثلاً عصر جدید، نئی دنیا، چوچ، فلم ریویو، اردو ماہ نام وغیرہ میں شائع ہونے لگے تھے اور ۱۹۳۵ء سے بھی قبل انھوں نے ادبی موضوعات و شخصیات پر باضابطہ کلمہ شروع کر دیا تھا۔ کلکتہ کی صحافتی دنیا میں ان کے نثری فن پاروں نے کیا کیا جا دا جگائے تھے۔ اس کی صریح نشاندہی کرنے والے تو اب محمود سہ سے ہی ملیں گے لیکن رسالوں کے صفحات میں محفوظ ان کی بعض نثری تحریریں یہ احساس دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہ ایک بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ”ندیم“ (گیا) کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں ان کا مشہور ناول ”فرس کی قربان گاہ پڑا“ انھیں دوں دو قسطوں میں شائع ہو کر بعد میں قبول ہو چکا تھا اور ”نیرنگ خیال“ لاہور کے طالعہ ہندوستانی پڑنے میں، جس کے مدیر سرسری عظیم آبادی تھے اور جو اپنے مزاج کے اعتبار سے آزاد خیال ہندو سے قبل کے زمانے

عام طور سے لوگ جمیل نظری کو ایک بلند پایہ شاعر، ایک پرمشور سماجی آزادی ایک شفیق استاد اور ایک خلیق انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ جو نظری کی طرح خود بھی ادب و شاعری کی بزم میں ساری رات شمع کی مانند بیٹے ہیں، ادب اس پُر لطف بزم کے محم فراق میں گم ہیں، جمیل نظری کے روانی یا ظرافت و رنگ و سخن سے بھی کسی نہ کسی حد تک واقف ہیں۔ لیکن اب تک جمیل نظری کی تنقیدی صلاحیتوں کے احساس اور اعتراف کی کوئی واضح مثال کم از کم میری نظر دوسرے نہیں گذری۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی پچاس سالہ ادبی زندگی کے تقریباً چار دوروں میں ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی ضمنی طور پر ذکر ہوتا رہا۔ مثلاً ”ندیم“ کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں جمیل نظری کی کاسیاب افسانہ نگاری اور دلکش اسلوب کا چند جملوں میں اعتراف کیا گیا۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے جب ۱۹۵۷ء کے قریب مختصر تاریخ ادب اردو کا دوسرا مزیم شدہ ایڈیشن ترتیب دیا تو جمیل نظری کی شاعرانہ عظمت کے تفصیلی اعتراف کے بعد ان کی ”مستغنی نثر نگاری“ کا بھی ذکر کیا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے جمیل صاحب کی وفات سے تقریباً دو برس پہلے ”عصری ادب“ میں آل احمد سروسے ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا بھی تذکرہ چھپا اور ان کے انتقال سے صرف دو تین ماہ پہلے ایس احمد دھال کا مضمون دو ماہی ”سرمیر“ میں شائع ہوا تو اس میں بھی تذکرہ موجود تھا کہ ”اگر جمیل نظری شعرو کوئی کی طرح نثر نگاری کو بھی اپنے فکر و فن کے اطلاق کا مستقل وسیلہ بنائے ہوئے نہ تھے تو آج اردو کے نثری ادب میں بھی وہ بڑے بڑوں کے ہمسر ہوتے۔“ لیکن اس

• غلام کالج باغ پتو پٹنہ ۸۰۰۰۰۸

آج کل کی دہائی

میں انجمن ترقی اردو کا ترجمان تھا۔ جمیل منظر کی منفی تخلیقات بھی برلر شائع ہو کر تھیں۔ یہ سترہ اور اس سے کچھ قبل کا زمانہ تھا جب جمیل منظر کی ایک شاعر کی حیثیت سے مقبول و معروف ہو چکے تھے۔ ”ہندوستانی کا ایسا شمارہ بھی میری نظر سے گذرا جس میں جمیل منظر کی ایک نظم بھی شریک اشاعت تھی اور مضمون بھی۔ جمیل منظر نے ادبی تنقید کے میدان میں باضابطہ طور پر پہلی بار کب قدم رکھا، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا فی الحال میرے لیے ممکن نہیں، لیکن تنقیدی نوعیت کا لکھا ہوا ان کا پہلا مضمون جواب تک کی تحقیق کے مطابق میرے سامنے آیا ہے، ذاب تعمیر حسین خیال کی شہرہ کتاب ”مغل اور اردو“ کے مقدمہ کی شکل میں ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ نام خدائے زبان آفریں کے عنوان سے مئی ۱۹۱۸ء میں لکھے گئے اس مقصد سے جمیل منظر کی نے خیال کے طرز تحریر کی خوبیوں نیز ان کے نقدی نظری کی وضاحت پر زور دیا ہے۔ تعمیر حسین خیال نے آل انڈیا اردو کانفرنس کے پہلے اجلاس منعقدہ گھنٹو دسمبر ۱۹۱۷ء کی صدارت کی تھی اور اس موقع پر جو خطہ صدارت پیش کیا تھا، اسی کا ایک باب قدیم تفصیل کے ساتھ ”مغل اور اردو“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جمیل منظر کی نے کتاب کی غرض و غایت، اس کی اہمیت، افادیت اور انفرادیت وغیرہ پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس میں پیش کردہ اہم نکات کی طرف بھی اشارہ کیا لیکن قابل غور نہ کہ یہ کہ انھوں نے نہ صرف نکتہ پیمانی، اعتراض اور عیب جوئی سے حتی الامکان استرازا کیا ہے بلکہ بعض ایسی خامیوں کی بھی نشاندہی نہیں کی ہے جو کتاب کے سرسری مطالعے سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جمیل منظر کی ادب پاروں کی فنی قدر و قیمت کے تعین سے زیادہ ان کی تعلیم، تشرب و اور تجربے پر زور دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ الفاظ کا غیر محنت استعمال بھی کرتے ہیں اور کبھی کبھی عبارت آرائی سے بھی کام لیتے ہیں۔ ایک مثال سے مذکورہ بالا نکات واضح ہو جائیں گے۔ لکھتے ہیں:

”یہ وہی تقریر ہے جس نے ملک میں زبان لے سنے کو تانہ کر دیا، یہ وہی پہنچ ہے جس نے اردو کی بہت دلوں میں، ٹھکانوں، یہ وہی بیان ہے جس نے زبان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ قوموں اور ملکوں کی تاریخ اور ان کے ربط و اختلا کو واضح کر دیا۔ یہ وہی خطبہ ہے جس نے ہمارے ذہن و دماغ کو جولاں کر دیا.... اس بیان کا اول اور

اہم نکتہ وہ ہندو مسلم اتحاد ہے جس پر داستانِ اردو کی بنیاد ہے۔ اردو کا ذکر سستے اور بڑے چلے آئے ہیں اس نتیجہ تک بھی دماغ پہنچے ہیں کہ یہ زبان ہندو مسلم ریاض کا ایک بہترین پھل ہے۔ مگر اتنی وضاحت اور باتوں کی اس درجہ شہادتوں کے ساتھ اب تک یہ مسئلہ ہمیشہ نہوا تھلا تک اسی نعل اور اردو میں وہ بھی عید کے چاند کی طرح نمایاں ہو گیا ہے۔

اسی انداز کا ایک دوسرا نمونہ ”آئینے خانے میں“ از اختر شیرانی پر ۱۹۱۷ء میں رسالہ تصویر لاہور میں شائع ہوا ہے۔ یہ قدامت کے لحاظ سے دوسرے نمونے پر ہے لیکن اس میں غیر جانبداری کا رنگ بھی عقیدت کے رنگ میں شامل ہے۔ اس کا تراشہ جمیل صاحب کے برادر خور و رضا منظر کی کے پاس موجود ہے۔ بہر حال ان مقدموں کے بعد جمیل منظر کی کے تنقیدی مضامین ملک کے مختلف معروف اور غیر معروف ادبی رسائل میں برابر شائع ہوتے رہے اور مختلف شاخوں کے دیوان یا مجموعہ کلام پر لکھے ہوئے ان کے مقدمے اور پیش نظر مضمون منظر عام پر آتے رہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر مضمون نگاری کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔

۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء سے حکومت بہار کے محکمہ تعلقات عامہ کا ترجمان ”بہار کی خبریں“ منظر عام پر آیا۔ ابتداء میں چند ماہ تک جو شغل نظم آبادی اس کے ایڈیٹر تھے۔ پھر ولایت علی اصلاحی ہوئے۔ جمیل صاحب، جو ایک عرصہ تک خود بھی اس نکتے کے ڈپٹی ڈائریکٹر رہ چکے تھے ”بہار کی خبریں“ کو براہ اپنے تنقیدی مضامین سے نوازتے رہے۔ خاص نمبروں کے علاوہ عام شماروں میں بھی یہ مضامین شائع ہوتے، لیکن جیسا کہ خود جمیل صاحب نے مدبر نقوش لاہور کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے ان مضامین کی اشاعت بہار تک ہی محدود رہی نہ بہر حال، ۱۹۱۷ء تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے چلا۔ پھر اس میں کمی واقع ہوتی گئی۔ اس دوران مولانا ابوالکلام آزاد، رضا علی و مشت ڈاکٹر مبارک علی، بادی، انشاء، انشاء انشاء اور مرزا غالب برکے گئے دو مضامین کے علاوہ ”کل کا عظیم آباد“ جنوری ۱۹۱۷ء ”مفتوحہ دارانہ“ ذہنیت کا تاریخی پس منظر“ جنوری ۱۹۱۷ء ”قوتیت کے ذہنی سلچے“

۱۷ مغل اور اردو۔ صفحہ ۱۶۹

۱۸ اس حد تک ایک نفس جمیل صاحب کے ایک عزیز غائب بھی امام کے پاس موجود ہے۔

(اگست ۱۹۷۷ء) اور ”ہندوستانی بین الاقوامیت میں ایک نیا انقلاب“ زبان کی ضرورت“ (اگست ۱۹۷۷ء) وغیرہ علمی و ادبی مضامین بھی تیار کی جنہوں میں شائع ہوئے جن میں منظر کی تنقیدی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ ہوا۔ خود اپنے فنی و فکری نظریات و خیالات سے متعلق ان کے مضامین ماننامہ ”آج کل“ دہلی میں شائع ہوئے۔ ”غبار کا رواں“ کے تحت ”ادھنگار“ گراچی میں ”میرا نظریہ شاعری“ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ دونوں مضامین بعد میں ”صبح“ پٹنہ (۱۹۷۷ء) اور جوائی (۱۹۷۷ء) میں بھی شائع ہوئے۔ مذکورہ بالا رسالوں کے علاوہ ”عصری ادب“ دہلی، ”میر“ مظفر پور، ”آہنگ“ گنگا، ”جین کا پنور“ زبان و ادب“ پٹنہ، ”پاسبان“ دھاکہ اور زبان کا پنور میں بھی ان کے بعض تنقیدی مضامین کی اشاعت ہوئی۔ رسالہ ”کائنات“ مرزا پور کے ”جمیل منظر کی تحریک میں جمیل صاحب کے فنی مضامین کی ایک تفصیلی فہرست شریک اشاعت ہے جس میں ان کے بیشتر تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں، اس لیے یہاں ان کو دوبارے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان مضامین کی روشنی میں جمیل منظر کی تنقید نگاری کے جو انفرادی رنگ سامنے آتے ہیں، ان کی وضاحت ضروری ہے۔

جمیل منظر کی تنقیدی نگارشات کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جمالیاتی اور تاریخی تنقید سے قربت رکھتے ہیں اور ادب کو خود ادب کے ہی اصولوں سے پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن موضوع زیر بحث سے ایک نوع کی جذباتی وابستگی انھیں اکثر پوری طرح غیر جانبدار نہیں رہنے دیتی اور جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ وہ محاکمے کے بجائے تشریح و تجزیے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس نکتے کے اسباب و عوامل کی مزید وضاحت کرنے سے پہلے میں خود جمیل منظر کے ایک بیان سے اپنے اس دعوے کا ثبوت پیش کرنا چاہوں گا۔ حرمت الاکرام کے شعری مجموعے ”گلزار اک رباب“ کی روشنی میں ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے جمیل صاحب کہتے ہیں:

”ممکن ہے کہ اہل بصیرت کو میری اس رائے میں مبالغہ نظر آئے لیکن میری ایک نفسیاتی جبری ہے کہ اگر میں کچھ ہوں تو ایک شاعر ہوں نقاد نہیں۔ نقاد اپنے مزاج سے بنا ہوتا ہے اور شاعر اپنی طبیعت کا بادشاہ۔ میرے ہاتھ میں ترازو نہیں کہ تولوں اور ڈبڑی مار کر دوں۔ میرے پاس تو الفاظ تھیں کی اشرفیوں کے قوسے میں جنھیں میں بے دریغ لٹاتا ہوں۔“

مذکورہ بالا اقتباس شاعرانہ انکساری سے زیادہ حقیقت بیانی پر مبنی ہے۔ تنقید میں کثرت سے صفات (ESTHETIC) کا

استعمال مناسب نہیں ہوتا لیکن جمیل منظر کی تعریف کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور اکثر مبالغے کی سرحدوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ان کے انداز تحریر میں کبھی محسوس آواز اور کبھی نیاز و مقجوری کا رنگ دکھائی پڑتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

”محال اور اہل کمال سے عقیدت عظیم آباد کے سماجی مزاج کے منافی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقیدت کی پیشانی کے لیے جب صوبیداروں، وزیروں، لوایوں اور جہانوں کی کچھیں موجود تھیں ہی تو شرفیہ عظیم آباد کو کیا بڑی تھی کہ وہ اہل کمال کی جویوں کی گرد سے اپنی پیشانی ابل کر تے۔“

”دہستان لکھنؤ میں شاعری کے جو آفتاب منبر سے طلوع ہوئے انھوں نے قصیدہ نگاری اور غزل گوئی کے سارے پیراؤں کو مانڈ کر دیا۔ یہ اور بات ہے کہ سورج کو چراغ دکھانے والے اپنا اپنا چراغ جلاتے رہے۔“

”انھوں نے مضامین نو کی تلاش کے سلسلے میں خافض اور بھول بھلیوں میں اترنے سے احتراز کیا اور فن کی اسی روایتی شاہراہ پر گامزن رہے جس پر بزرگوں کے نقش قدم کی لہریں ہیں۔“

جمیل منظر کی مذکورہ بالا طعنہ بازی روشنی میں کم از کم یہ قوضور کہا جاسکتا ہے کہ آل احمد سرور اور اختر اندریزی کی طرح وہ بھی تنقید میں ایک نوع کا تخلیقی رنگ و آہنگ پیدا کر دیتے ہیں جس سے قاری کو موضوع کی طرف متوجہ کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

ملک کے مختلف رسائل میں مطبوعہ ان کے مضامین کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جمیل منظر ادب اور سماج کے رشتے سے واقف ہیں۔ فن کی انہیں ہم میں فنکار کے ذہنی رویے اور پس منظر کو سمجھنے رکھتے ہیں اور ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں۔ لیکن فنی عظمتوں کی تلاش کرتے وقت وہ بہر حال فن پارے کے متن کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے بعض تنقیدی مضامین مثلاً ”آئین کے مراثن میں نسوانی کردار“ (مطبوعہ مجلہ یادگار آئین کبھی پٹنہ) شاعری کا استعمال شاعری (مطبوعہ زبان و ادب فردوسی و مارچ ۱۹۷۷ء) فم فنی کی جنرالیاتی شاعری

۱۔ پیش لفظ ”دہستان“ دیوان حسن عظیم آبادی

۲۔ ”میری غزلوں میں آثار کربلا“ از قاسم شیر بر تمبر

مطبوعہ سرفراز لکھنؤ، مئی ۱۹۷۷ء

۳۔ تقریظ ”برنگارنگ“ از کریم احمدی

(مطبوعہ: آج کل، دہلی، ستمبر ۱۹۷۷ء) وغیرہ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے دقت پسندی کا نمونہ نہ جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سے جمیل نظری کی اس ذہنی روشن کا بھی اعزاز ہوتا ہے، جو انھیں پامال اور فرسودہ موضوعات سے قطع نظر کر کے اچھوتے اور دردناک موضوعات کے انتخاب پر اگساقتی ہے اور فنکاروں کی ایسی پوشیدہ فنی خصوصیات کی شنیکش پر آمادہ کرتی ہے۔ جن پر دوسروں کی نظر نہیں جاتی۔ اس قسم کے مضامین زیادہ تر شاعرانہ کے بعد لکھے گئے ہیں لیکن ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعی سرمایے کا جائزہ لینے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہر حال تنقید نگاری کے باب میں ان کی کوششیں کسی ایک ادبی شخصیت، دبستان یا حلقہ فکر تک محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے مختلف انوع موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس نیرنگی اور تنوع کا سبب ان کے مطالعے کی وسعت اور جمہور پر ہے۔

جمیل نظری کی شاعری میں تنکیک کا جو رنگ عام طور پر لکھائی دیتا ہے اور جس کی طرف پروفیسر احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ: اسپل گیا جمیل نظری (غیر) میں اشارہ بھی کیا ہے، وہ ان کے تنقیدی مضامین میں کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ جیسا میں نے اوپر لکھا ہے وہ زیر بحث موضوع پر ایک جذباتی وابستگی اور بہمدردی کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں اور کبھی کبھی موضوع کی وکالت کے بھی فرائض انجام دینے لگتے ہیں، لیکن ان میں مختلف نکات کا تبذیر کر کے کسی فیصلے پر پہنچنے کی بھی خاصی صلاحیت موجود ہے۔ اور اکثر عقیدت مندانہ یا بہمدردانہ انداز میں آغاز گفتگو کے باوجود وہ عیوب کی نشاندہی میں بھی جب تک نہیں محسوس کرتے۔ صرف دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

”کلمتہ اک باب پر مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے:

”یہ طویل نظم اول سے آخر تک مجھے ایک غلہ زلزلہ کی نظر آ رہی ہے جو اباب ذوق جدت و قدامت کی ہم آہنگی کو ایک کامیاب فن پارہ سمجھتے ہیں، جو حسن بیان اور زور بیان دونوں کو اکٹھا دیکھنا چاہتے ہوں، وہ اس سندس کو دیکھیں اور غائب آئیں ادا اقبال کی روح سخن کو ایک پیکر معنی میں جو گیتا اور گرجا سنا چاہیں وہ اپنے گونجی خرد و جوش کو کلمتہ اک باب سے قریب لائیں۔“

مگر یہ بیان بھی سامنے آتا ہے کہ:

”لیکن اس میں ایک بڑی کمی بھی ہے کہ اردو بولنے والے کلمتہ کی ادبی و علمی اور صافنی سرگرمیوں کا عکس کہیں نہیں ملتا۔“

آج کل، نئی دہلی

اسی طرح چند یونیورسٹی میں اپنے شریک کار اور دوست پروفیسر سید محمد صدرا الدین نقاشی کے پہلے شعری مجموعے ”نکبت و غمش“ کے مقدمہ میں ان کی اکثر شاعرانہ خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد یہ عقیدت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں کہ یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ:

”ان کے دیوان غزلیات میں مجھے سب سے زیادہ چڑکایا ہے ان کے غشیہ کام نے..... اگر نقاش غزل سے زیادہ کو جسے نصت گوئی پر کرتے تو یقیناً اردو کو محسن کا کوری اور امیر مہمانی کا ایک جانشین نصیب ہو جاتا..... اگر ان کی گونا گوں میسریاں انھیں اس کا موقع نہ تیں تو وہ بالیقین اپنی غزلوں کے اندر بھی ایسی وکشی پیدا کر سکتے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا اقتباس میں بعض کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے لیکن مجموعی طور پر کم از کم عصر ادب، شعراء مثلاً جبرم آبادی، نواب دہلوی، دوکت کھنوی، حکیم عاجز، نامہ سلطان پوری، بسمل جعفری، بادی یا عفتقر نواب دانش وغیرہ کی تصنیفات پر لکھے ہوئے ان کے مقدمے اردو دنیا کی عام روایت کے مطابق تنقیدی بہ نسبت تقریظ سے زیادہ قربت رکھتے تھے۔ اس ضمن میں غالباً اس خصوصیت کا تذکرہ ہے کہ عمل نہ ہو گا کہ خود اپنی خامیوں کے اعتراف میں جمیل نظری کچھ زیادہ ہی صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ اور اپنی شخصیت یا شاعری پر اساتذہ سخن کے اثرات کا بے باکی اور فراخ دلی سے اعتراف کرتے ہیں مثلاً:

”اس میں شک نہیں کہ میرا دماغ جو گھر گھرا اور معاشرتی حقیقت سے بے غماز روایات تھا۔ اس کے بہت سے بت غالب ہی نے ٹوٹے۔“

یا — ”استاد محترم مولانا رضا علی دشت کی صحبت

نے میرے ذوق شعری کو بیکے نہ دیا۔ میری جدت پسندی کو

دائرۂ اعتدال میں رکھا اور مجھے فنی بصیرت عطا کی۔“

آخر میں ایک نازک سوال یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ کیا تنقید نگاری کے حلقے میں جمیل نظری کی شمولیت سے ان کی ادبی شخصیت کچھ بلند ہوئی، یا خود تنقید کے وقار میں اس سے اضافہ ہوا ہے؟ میرے خیال سے جواب بالکل صاف ہے۔ تنقید نگاری نے جمیل نظری کی شخصیت کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو لیکن جمیل نظری نے ادبی تنقید کے سولے کو کچھ نہ کچھ ایسا ضرور دیا ہے جو غالب تو جسے بے ادب لائق احترام بھی۔

(ادبی مطالعہ)

۱۔ اور ۲۔ مقالہ حضرت رضا علی دشت مرحوم مطبوعہ بہار کی جنرل، ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء

سازِ برون خانہ

مذت سے ہے باسِ بدلتا تازا دوست
بچنے کی اب جگہ ہے نہ پوند کی جگہ
تھا جس پہ زندگی کا گمان وہ تو جانتی
جو زندگی مٹی نذرِ شمس ہم کا سلسلہ
آگے جو جا چکا ہے وہ ہر لذتِ حیات
حالات نے جو لادیا تیسری کچھ بر
مٹی زندگی خدا کا غضب اور منہ تیری
موت اک خدا کا پیار ہے تیرا اس کا بار دوست

بجز اضطراب سفر کیا ہے ماند تازا میں
ہوا نے من کو کیا ہے توروں سے باہر
بس ایک گشتِ مٹی جس کو زندگی کہتے
برسے سوال پہ گل نے گا۔ بوہو مٹی
ادھر دیار ہو جس تھا ادھر دیار خود
قون کے چاک بھر میں ہی میں ملتا
جیتل مٹی ہی ہے اک غل غل امر کا
اک اضطراب کا عالم ہے بے قولاں میں

آکھ ہی ہوتی تو سو دن سے گرن کیا لینے
ہم تو ہم تو ہی ہے مرموز فنا کہ دوش
صلی کائناتِ ماسودہ بوجہ میں ملا ہم نے
تیرے بازو میں اسے خبرِ خودی ہی نہیں
اک شہر کی ضرورت تھی سو وہ بھی نہ دلا
کیوں قیلاں اس کی جگہ تو ختم تھا لینے
جنوں نے تجھ پر ادھر ڈالا ہے مرنے والوں کے بھی کلن کا
بہی ہے وحشت تو کیا مسکان ہے بیچے والوں کے بہی رہن کا

ہمارے خون دل سے رنگ کچھ ملتا ہے دنیا کو
وہ قطرہ ہی سہی شبنم بھی کچھ دیتی ہے دریا کو
یہ جلوہ کیا لگا ہیں دسے ہی جن کو رنگ اپنا
وہ جلوہ گر جو اپنا رنگ دے چشم تماشا کو
نہ کیوں پوڑد اپنی خشک دامانی پر شہِ مرنہ
کہ دیکھا ہے تری بھیجی ہوئی زلفِ چلیپا کو
ترنم زیر لب نے تیرے توڑا اس کا سناٹا
بیک جنبشِ زباں دے دی سکوتِ شام صبرا کو
وہ قطرہ ہوں جو پلوں سے ابھی نیچے نہیں اگرا
وہ قطرہ ہوں جو سینے میں لیے ہے اپنے دریا کو
برا گوشتِ تصورِ شمس رہا ہے چاب قدموں کی
اک آہستہ تیز کرتی جا رہی ہے بطنی صبرا کو
کچھ اپنے منہ سے بولیں یا نہ بولیں سیج کی کلیاں
شکستہ بستر کی کٹی ہے کہ نیت آئی نہ مہر کو
جیتل آئندہ غائبے میں جگہ کیا ہوگی اس دل کی
یہ آئینہ پسند آیا نہ اس کے دے زیب کو

ملہ عزرائیل جنابِ اعجازِ اعلیٰ اشراف کا تجرید کردہ ہے جو صوفی نے مہملی مٹھری میں دم
کے اس شعر سے انگڑیا ہے۔

ذہن میں ہو جو کچھ غل اس کو بنا کے اک فن
سوڑہ درونِ خدا کو سازِ برونِ خدا کر
یہ کلام حلقہِ مٹھری کے بلیک کے مطابق چشمِ تجریدِ مٹھری ہے
ملہ انتخاب، رضا مٹھری

● مٹی منسلکہ و مٹھری، نیش لہرم، نگارستان، ۱۹۸۷ء

مسلمانوں کیوں روشنی گزائی؟ شیطانی ہے آئینہ کیوں گزائی
 ہے جو سورج تو ذرہ ذرہ حساب لے گا کرن کرن کا
 ہر موزور وقت کی جبیں کو اسی میں تار بیخ ہے قہلدی
 زبان سمجھو شکن شکن کی تباہ دیکھو شکن شکن کا
 ہر اک دیا ڈنسا رہا ہے ہر ایک کو مضر شراری ہے
 انھیں چراغوں سے پوچھ لیجئے جو حال ہے اُن کی انجمن کا
 یہ چہرے اپنی سرسبندی پر کیوں نہ نخواست سے سراپا ہیں
 نہ چہرہ دیکھا ہے کو کچن کا نہ پیش دیکھا ہے کو کچن کا
 جیتل اس میکے کے کی رونق ہے تشہ نہ کون کی ہاد سے
 کسی کا سفر بھر انہیں ہے سوال کیا شیخ و برہن کا

اگرچہ ہے فصل لاد و گل اگرچہ موسم ہے نسترن کا
 رہے نہ تھام کی کم رنگ ہی ہے قرض کا نون کے باچن کا
 یہ تیرے گا بی بتا رہی ہے کہ پتہ بھی ہے و ہر دکن کی
 تیرے منزل جو آ رہی ہے تو یہ بھی اصحاب ہے راہن کا
 ابھی جو غزل کے منہ سے چھوٹی وہ بات پوری نہیں ہے شاید
 ابھی یہ مہر سارے کشتاں تیرے حسن کم سخن کا
 اسے رد و حق ہے یہ قناعت مرد و زن کیا تانیں دست
 مگر ذرا پاؤں تو ہلاؤ کہ پہلے غلط ذرا رسن کا
 وہ جھلکاتا ہوا دیا ہو کہ نقشہ تار ہوا ستارہ
 جو سینہ تیرگی سے ابھرے وہ گھاؤ ہے قلعہ اہرن کا
 مجھ تو دل کا بزم آدھر ہے تو میرا آدھر ہے قلعہ دل کی
 جیتل تم بھی بڑھاؤ کا نہ جاننا زہر اشتاہے فکر و فن کا

(نوٹ : یہ غزل اپنی موت سے دو سال پہلے شدید علالت کے
 دوران کسی تعلی اس وقت حالت ایسی نازک ہو گئی تھی کہ
 ڈاکٹر بھی نااہل ہو گئے تھے مگر شفا ہو گئی اس لیے کہ موت کا
 وقت تو دو سال بعد آگے والا تھا)

بھاگ کر دریاں سے اپنے تیز پا جانا ہوں میں
 چسپاں رو بارہم صبر سہا نہ جانا ہوں میں
 بھلاؤ کہ دامن سے ہر گز دوغبا نہ زندگی
 پس اڑ کر یہ جسم فنا کی قبا جانا ہوں میں
 ٹوٹے جاتے ہیں ابد و وقت آدھ کے قلم
 ہمدرد ہوتے تو روتے سہا نہ جانا ہوں میں
 میرے ہی نفلت ہیں جو مجھ سے آگے جا چکے
 اُن کی ہسروں کے قاع میں گھول جانا ہوں میں

اپنی آنکھوں پر تو ظاہر ہوا ہوں دوستو
 ظم نہیں جو سب کی آنکھوں سے چھپا ہوا ہوں میں

دیۃ اہل نظر اور اپنے فن کے دو صباں
 میں تھا کہ بے رنگ ہمدرد سوا تھا جانا ہوں میں
 ہر قدم اشتاہے اک اصحاب آزادی کے ساتھ
 شکر امانت گناہا جوت جانا ہوں میں

وہ جہنم ہو کہ جنت دونوں ہی دار اشفا
 دوسرے کیوں ہوں دوسرے دار اشفا جانا ہوں میں
 خوف سے کیوں حشر قرار ڈے کرے کیوں کا پڑ جائیں
 پیش شاہنشہ نہیں پیش خدا جانا ہوں میں

ختم سفر ہے رنگ کہاں اور بو کہاں دامن پہاب وہ گرد وہ مست جو کہاں
 محنت کا رخ بھی نہ دے دولت کا رخ بھی نہ اس شہر آرزو میں کوئی سرخ کہاں
 مجنوں کا یہیں نہیں لی کی بے ہوا پاک ہوا اگر تو سوال ہو کہاں
 لایا ہے دشمن تک تو قہر مقام کا ابے لے گی حسرت دہار جو کہاں
 سائی بھی ہے شراب بھی چنگ رہا یہی سب کچھ ہے ملنے گئے کون تو کہاں
 سرگوشیاں بھی ختم نہ آؤں شیاں بھی ختم جہنم نہیں تو قوت ہام و بکڑ کہاں
 لائی جو نظری ہر منزل کشاں کشاں
 دیکھو تو خڑکے رہ گئی وہ آرزو کہاں

شوق ابھی جیرتی شمس و قمر ہے اے دوست
 ابھی پردے کے اسی پار نظر ہے اے دوست
 تیرے گھر کوئی کسی سمت اشارہ کر دے
 سرشوریدہ کو اب محبت دے اے دوست
 آئی منزل تو مسافر کے قدم مست ہوئے
 سانس بہتی ہے کہ اب جو سفر ہے اے دوست
 یہ جسم جو نمیاں ہے مرے ہونٹوں سے
 حاصل پر درخش زخم جگ ہے اے دوست
 اب نہ ہر گھر ہے بستی میں نہ صبرا آباد
 کون بلے ترا دیوانہ کر ہے اے دوست
 زندگی آج بھی بالی ہمسرا مکان نشمارف
 اک بیکر کدہ برقی دشمن ہے اے دوست
 زندگی ہم تہ صوبت جس حق می مگر اب
 نکل ادرطق میں صحت ہے اے دوست
 اور ہزاروں نہ آدھر ہے اے دوست
 دور جانا ہے آئیں بھادوں میں دم لے لو جیتل
 وطن اک تعلی سہرا وہ گذر ہے اے دوست

نہیں ہے امکان صلح جوئی جنوں ہیں سنگین دونوں ہی کے
 یہ فتن ہیں بیسویں صدی کے وہ ذہن ہیں پانچویں صدی کے
 عباد کا دامن جھٹکاتے جاؤ لغزشیں پاؤ مٹاتے جاؤ
 نہ جانے رستہ بدل دیں کس کا نشان تمہاری غلط روی کے
 نہ پاس کے گویا نہ گویا نہ پانہ منہ بگاڑا نہ منہ بست یا
 نہ ہم ہیں ملزم شگفتگی کے نہ ہم ہیں مجرم خسروگی کے
 حیرت زدہ آنکھیں جھٹکاتے رکھو نفس کی پھلن گراؤ رکھو
 چراغ دل کے جلائے رکھو کہ یہ اندھیرے ہیں روشنی کے
 وہ مشکوہ ہمیں دے سکا نہ لیکن ہمارے دکھ سہرا ہے خودی
 ہمارے دکھ بھی ہیں دکھ اسی کے تمہارے دکھ بھی ہیں دکھ اسی کے
 اسبابا تیرے کی کا پردہ اٹھائے گا کیسا روشنی کا پردہ
 ہزار پردے ہیں آگہی کے ہزار پردے ہیں اک خودی کے
 ہر ایک جنبش ہے بے خبر ہر ایک گزشتہ ہے بے خبر
 خدا ہی جانتے کہاں ہے تو میں ہے سہلے ہے جیجی کے
 قدم پہ سپرے ہمارا ہے ہر ایک پہ آنسو بھی لارہی ہے
 کسی کو جھٹک کر جھکا رہی ہے یہ حوصلے دیکھو عاجزی کے
 یہ دیر و سجدہ ہیں سب دکائیں جہاں سے چاہو خدا خسرو
 جہاں بھی چاہو خودی کو بچو تمام بازار میں خودی کے
 یہ فتنہ و دولت ہیں اک توازن خدا نے عادل کا عدل کئے
 کہ جیب خالی ہے مفاسد کی تو ذہن خالی ہیں منہ کی
 تلاشیں ایک لفظ حسب منہ میں مغتبی نے نہ گذاری ذاتیں
 مزید وہ درسخوڑی ہے تو ناز افسانہ سخوڑی کے

کچھ تو گرد راہ گرد کارواں بنتے رہے
 کچھ فضا ایسے بھی تھے جو آسمان بنتے رہے

ہم نے یہ عالم بھی دیکھا اسے جنوں خودی
 کہ چین آجسٹہ کیا اور آتشیں بنتے رہے
 اضطراب عشق نے کچھ مضطرب لمحے دیئے
 اور وہ کئے حیات جاوداں بنتے رہے

ان سے پوچھو ان سے پوچھو اس کی یگانہ کا حال
 ناقتہ ایام کے جو سراپاں بنتے رہے

ایک وہ جو بے پیش کرتے رہے اہلکار نور
 ایک ہم جو سوز کہ کر بے زباں بنتے رہے

ہم نے کچھ کچھ جن کا راز اچھا لایا نسیم
 پہل پہل کچھ کچھ کر شیت کی زباں بنتے رہے

ہمارے سوج ہوئے لمحات صدیاں بن گئے
 اور غلام میں آسمان پر آسمان بنتے رہے

کاروان وقت آگے کی طرف بڑھتا رہا
 اور ہم انسان گرد کارواں بنتے رہے

ہم نے اس دنیا میں اگر کیا بنایا کیا بنے
 ہاں مگر کچھ صائم وہم و گمان بنتے رہے
 منظر ہی جلتا ہاں یوں مرے دل کا اڈا
 کوئی پاس آیا نہیں شعلے دھواں بنتے رہے

نہ مشغول ہے اپنے ہی دل زار کے ساتھ
 خون دل پیٹے ہے رندی بھی غم چار کے ساتھ

پا بھولاں ہے ابھی قافلہ فتنہ و فتنہ
 کچھ غلامان طبیعت بھی ہیں احرار کے ساتھ

رو گیا سیریں بستی کا تصور بچھے
 دو ترم پل نہ سکا رخت کردار کے ساتھ

اپنا حق مانگتی ہی وہ گئی ایک زلف دراز
 لوگ اٹھتے ہی رہے سحر و دُنا کے ساتھ

اتفاقت نگہ زار میں اخلاص نہیں
 صاف ظاہر ہے کچھ رجم بھی ہے پیار کے ساتھ

سزا تو سب کھنڈر دوپہر میں سونی ہیں
 اب وہ دوسرے کہاں سایہ دیوار کے ساتھ

میرے انکار کی دنیا میں بیباں ہی نہیں
 ایک گوشے میں خیاں بھی ہے اٹھانے کے ساتھ

جس کو جانا ہے چین سے رہے گھمیں کی طرح
 جس کو رہنا ہے چین میں وہ رہے غار کے ساتھ

ضعف دل ضعف خودی ضعف دماغ
 کتنے آزار ہیں اک عشق کے آزار کے ساتھ

منظر ہی جو نہ سمجھتے ہوں کنائے کی زبان
 نہ کریں زحمت پیار کے اشار کے ساتھ

تو نے سینے کو جب تک غش دی نہ تھی تو نے ہڈیوں کو جب تک اُٹھا نہ تھا
 میں وہ دیا تھا جس میں کہ نہیں نہ تھیں میں وہ قلم تھا جس میں کڑھانا نہ تھا

تیرے آگے نہ زبان خود سر تھکے تیری جو کھٹ سے بھاگے تو درد نہ تھکے
 اس جگہ دل جھکے اس جگہ سر تھکے بھگتے بندگی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

انک موتی نہ تھے بہرے بہرے تھے، اُٹھتے بٹھتے یہ تم آج کیا کہہ گئے
 یاد کر کے وہ دن ہم بھی چہرہ تھے، جب ان آنکھوں میں آنسو گوارا نہ تھا

ساز فتنہ باز کے دل نے جھپٹے تھے، ہجر اور وصل کے پیکر نے تھے
 ہم نے دامن کے نیچے اچھڑے تھے، ہم نے زخموں کو اپنی سسوارا نہ تھا

تجھ میں درد یا کوئی کس جہاں سے چلا، میں جو پتھر تو در ب کو دھارے سے چلے
 میری کشتی کنارے کنارے چلے تیری موجوں کو بھی یہ گوارا نہ تھا

دیکھ پروانوں کے رقص، بیتاب کو، شمع آگ نہ دے آنکھ میں خواب کو
ایک چپکی سی آنکھ بیتاب کو، آنکھ کوئی تو کوئی ستارا نہ تھا
ایک خور سے شعلے اٹھائے ایک جلیبی تو رہی لوگ تپا کچے
دور پہلے وہ پہلو پایا کیے جن کی قسمت میں کوئی شہرارا نہ تھا
دوڑوں انسان خرد عمل کے تھے قفس مسما کا تھا غم منزل کے تھے
منظر ہی غلام اپنے ہی دل کے تھے ان دونوں میں کوئی تمہارا نہ تھا

یہ ملحق ہے ہیں دفرن کے ہیں جوں کہے گا کس کی ہے

نہ روشنی سے دفا کریں گے نہ تیسری سے دفا کریں گے

یہ آنکھ والے کسی حقیقت کا کس طرح سامنا کریں گے

ابھی تو ہر دے کو پوچھتے ہیں اٹھا جو پرہیز کو کیا کریں گے

مجھے دھتیل کے نیچے بیٹھے شخص جو اپنی مٹا رہے ہیں

جس میں ان کو اگر کپاسے تو کا دلا سے دفا کریں گے

تم اپنی بزم طرب سجاد چراغ بجتے ہیں غم نہ دکھاؤ

چراغ کی زندگی بھی ہے بجھا کریں گے بجھا کریں گے

تم اپنے تھوڑے گروا چلو ہماری قسمت پر خاک ڈالو

ہمارا کیا ہم تو نقش پا ہیں مٹا کریں گے بت کریں گے

ہلے سے ٹوٹ کر پتھر کے خرد سے مارے جتن سے ہارے

کسی غیر سے شجر کے سائے میں اپنا دامن سار کریں گے

ہنر گر بیتان اگر تیر تو اسے لغتیاں موسم گل

ہم اپنے سینوں کو چمک کر کے چراگ کتن ادا کریں گے

جو ماں جہتی کے نبض دلا ہیں میں سے وہ زندگی کے نغے

جوں کی حرکتوں کے پاساں ہیں وہ دل کی دھڑکن لگا کریں گے

فلک کی تعمیر کرتے واسے اگر گرسے تو کہاں کریں گے

زمین کی تعمیر کرتے واسے زمین دہوئی تو کیا کریں گے

جہلی سے بڑھ کے کھلی کھد سے دل کا دل بجا دیں

بسی ہیں جب تالے میں اندر سے چراغ دکھائے کیا کریں گے

تلاش

کچھ ڈھونڈ رہا ہوں میں کب ہے، جب سے تراسا ہے تباہ ہے ہر

ماہ میں ہر ماہ پاسے میں ہر سورج میں ہر تار سے میں یہ غافل میں تباہوں میں

دوگاہوں میں استعمال میں ہیں، دین و دوش کی دکھاؤں میں، افسوں میں، افسانوں میں

ایوانوں میں محرابوں میں، دافن کے جھوٹے دھول میں، شاعر کے سچے تھاہوں میں کچھ

ڈھونڈ رہا ہوں میں کب سے، جب سے یہ آنکھیں تپ تپ سے دہراہوں مسیں

بالا دھوں میں، سہل دین میں دیناروں میں، ملائی میں میٹروں میں، فن بینوں میں

فکھ دھوں میں، جانگاہ میں جانگاہ میں۔ خود سوزوں میں خود سافٹ میں، ہر

نکرو فلسفی کی آڑ میں، دین دلی و دلازی میں۔ قلب و دفا قلب میں۔ احساس کے

آکھ کی دلی

ہر قالب میں جھکی کی دھڑکی میں۔ ہر بانسری ہر سانسی میں۔ ہر مٹی ہر مٹی میں
ہر وصفت میں ہر تنگی میں۔ افکار میں ہر بات میں ہی، اصوات میں ہی آیات
میں ہی، تشکیک میں ہی ادب میں ہی، تفصیل میں ہی ابہام میں ہی۔ ہر دلی میں
بھی ابہام میں ہی۔ وہاں میں ہی دفاں میں ہی۔ توفیق میں ہی فیضان میں ہی۔ سب
اپنے میں آپ اپنے میں۔ اپنے ہر پہلے پہلے میں۔ ہم ڈھونڈ رہے ہیں کچھ نیکی
لپٹے سے ہر ماہ کے اور اپنے انداز کے کچھ لے دیکھ لے دیکھ لے کچھ کھود
کے کچھ باند کے۔ جو جلوہ ہے منہم نہ تھا۔ موجود نہ تھا وہ ہم نہ تھا۔ کچھ یہ بھی معلوم
نہ تھا ہم ڈھونڈ رہے تھے اپنے کو یا اپنے بنائے والے کو۔ آئینہ دکھائے والے
کو یا عکس چرائے والے کو۔ ہم تھے اور سوائے نظر مرگشتہ چہرے جو اپنے
نظر ہیچ ہر شام سفر ہر سانسی سفر ہر کام سفر۔ وہاں سفر ابہام سفر کام سفر
آدم سفر۔ آغا سفر، انجام سفر اور اپنا ہر کام سفر منزل کا شعور نہ نہ سکا وہاں
تھیرے نہ سکا، عرفان تھیرے نہ سکا۔

ہم جو بھی ڈھونڈ رہے تھے اپنی آپ اپنے کو کھ کر کے ملے

اک صفت کی وادی باقی تھی، اس کی جانب بھی کے ملے

رباعیات

اے ہم نفسو نہ جس گدے دیتے جاؤ

ہر دانوں کو اک رقص خرد دیتے جاؤ

تم آگے سرشتاں میں حرکت کیا دو گے

ہاں یہ تم کھائے سحر دیتے جاؤ

مڑی نفس ہم نفساں دیتے جاؤ

شیراؤ کو آہنگ ازاں دیتے جاؤ

کھنساں ہر صر سے اہلے کا پیام

سمجھتی ہوئی فطرتوں کو زبان دیتے جاؤ

آہا ہی نہیں مجھ کو بہر کسانا

شعلوں کو مرسے کھا چکنا سانی

بھروسے جری خودی کا یہاں نہ تنگ

آجائے اے ذرا چمکنا سانی

اب میں ہوں اور ایک سوز ہم سانی

ہر قطرہ کھٹے تر ہے شہر سانی

صہبا کے دلا کا ایک چھینٹا دے کر

مٹنی کر دے یہ نفرت کا جہنم سانی

اے عمر دہاں شہر کھلتا ہوں میں

دے مہلت یک نفس کو ڈھٹا ہوں میں

یہ جسم کی تھیریاں نہیں ہیں شاید

زنجیریں ہیں نہ جیروں میں جھڑا ہوں میں

اس راہ میں کچھ دور تو کھائے ہیں ضرور

دو گام تو ہم آپ سے آگے گئے ہیں ضرور

انصاف نہ پاس ہر دوستی زندہ ہے

ہوں فکر و نظر موت پہ اپنی نہ سولی

انقلاب تھا مٹھری

آگست ۱۹۸۸ء

فکر جمیل

سے منتخب غزلیں، رباعیات، قطعات

ہری بندگی تجھے دے سکے گی بجائے معنی و لفظ کیا
ہے ہرے شہر کی جھولیوں میں سوائے معنی و لفظ کیا
جو لنگر کا بوجھ نہ سہہ سکیں وہ زبان کا بوجھ نہیں گی کیا
سبک و لطیف اشاروں پہ جیسے معنی و لفظ کیا
مجھے قند چلے عین آفریں یہ لباس ان پہ گراں نہ ہو
جو جیتیں نہ پہن سکیں وہ بجائے معنی و لفظ کیا
نہ وہ شمس میں نہ قوس ہے نہ جلاب نگہ و لفظ ہے
جو مجاہد فکر و نظر اس طرح درائے معنی و لفظ کیا
ہری درج اگرچہ کر سنے ہر اشوق اگرچہ ہے جاں بلب
مگر اسے قیل و قیل سرائے درائے معنی و لفظ کیا

بستہ پر میاں غمگین سہرہ ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فہم پر ہیوم تو دم نکل جائے آدمی کا
بس ایک احساس ناز سانی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت بردگی کی، خسرو پہ عالم خودگی کا
ہے بدن تاریکیوں میں حیران بگھا ہوا ہے چراغ منزل
اگلیں سہراہ یہ مسافر، رنگ زدے، بوجھ زندگی کا
خدا کی رحمت پہ جھولی بھولیں نہ سنی ہے اس کے واہ
وہ اگر کا منتظر کھڑا ہو، مکان بھلا ہو جب کسی کا
وہ لاکھ کھولے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبر پانی سے بھی زیادہ، مزاج نازک ہے بندگی کا
جیل رحمت میں ہے زمانہ، ہر سے تفرق کی مغفلی پر
نہ بدتہ اعتبائے ہوشی نہ کیفیت پر نہ شاہد ہی کا

(۱۹۳۷ء)

شکست، رنگ بدخ تو اک فائدہ ہے شہاب کا
حکایتیں ہیں اور بھی دردِ آتش کت کت کا
ہری نگاہ آدھیں ازل میں اک سوال تھی
سوال منتظر رہا، ابد تلک، جواب کا
چیتھن نے اذہل ہے جب نقاب زنگدو
تو جستہم فرض ہے ہر آنکھ پر نقاب کا

لے انتخاب، اہل ایش

یہاں ہر سراسر اب کے نہیں ملائی تھی
جیتل یہاں سے تو آذرب کھا سراسر کا

(۱۹۳۷ء)

یہ کبائے کہنہ آنکروں نہ سبک ہو چشم نیاز میں
کہ جگہ جگہ سے ہے کبھی کا افر باس جہاز میں
ہے ہر کراہی ہو کر ہما ہی تپ و تاب سینہ راز میں
دل شب ابھی سے دوڑ کر رہا ہے سکوت شام جہاز میں
کسی سنگ راہ نے یہ کہا کہ تیرے ساتھ زندگی
تسے ہائے غور کی کافیت ہے اسی نشیب و فراز میں
اورے ناز دل یکسلی تو میرے درد کی دھما نہیں
سر عرض تیری جگہ کہاں، آرزو آتوب گرازیں
یہ خودی کہ عارض ہوشان میں بھی محمود بختری رہا
مرا آیت نہ رہا ہوا تھا، مذاق آیت ساز میں
ترے گیسوؤں ہی کی داستان پہ نہیں ہے ختم یہ داستان
کہ جنوں کے اور بھی سلسلے ہیں بوس کی جبر و از میں
ہے فردغ روئے ایاز سے تپ و تاب سینہ فروزی
تپ و تاب سینہ فروزی کی جگہ ہے روئے ایاز میں
ہیں نظام شام و عرس ہی اسی کشمکش کی طاقتیں
جو مجاہد و لور کی کشمکش ہے ضمیر ناز دنیا میں
یہ وہ زندگی ہے کہیں سے بھی جو آج تک نہ سونہی
جو اب جو کبھی سوا اب ہو گیا، غم و ہجرت زلف دراز میں

(۱۹۳۷ء)

اضطراب خود نمائی کو خدا سمجھا تھا تھا میں
زندگی کے نام لاکھوں تھے مگر ہر دم کو
ایک طاقت تھی جو مجھ سے لے رہی تھی اپنا کام
تھی وہ شاید اپنی ہی ہے چارگی کی ایک جگہ
اک خواتم تھی کہ تھاجس پر محبت کا گمان
بس کہ اک خواہش تھی کہ تھاجی ہی کا شوق
ہائے عروسی کہ آواز دراز انگلی جیتل
جس کو اک دماغ درہر کی صدا سمجھا تھا تھا میں

(۱۹۳۷ء)

مجھ خود بتائے گی تیری کہاں جائے
جو نیب آئے گا راستہ دکھائے گا
بڑے کے دو قدم تو ہی اس کی پیچھے لگی کر
اب تو جو رہی کہ تھی جہازوں کے اندر بھی
زخم دل تو کیا دے گا داغ بھر ہی دے دو
اب تھامی جو ٹھٹھ سے ٹھٹھ کی کہاں جائے

(۱۹۳۷ء)

گت ۱۹۸۲ء

میں یہ غور کر رہا ہوں تجھے مانگ کر خدا سے
برا منہ پاش چیاں دہو تیرے منہ سے

میں خدا کو پوجتا ہوں میں خدا سے روشتا ہوں
یہ وہ تازہ بندی ہے جسے پوچھنے خدا سے
ہری گہری سے بہتے ہری خستی سے منزل
ہری داستان مرتبہ برے نقشہ ہائے پائے

کبھی وہ بھی زندگی تھی کہ خدا نکل تھا مجھ سے
کبھی یہ بھی زندگی ہے کہ نکل ہوں میں خدا سے
تو وہ نعلت شانہ پروردہ جسے خوف ہے ہوا کا
میں وہ کا نکل پریشاں جو سوز گئی ہوا سے

جہنمی رہیں گے تیرے تو چھے گی کیسا محبت
کبھی ہم خفا خفا سے کبھی تم خفا خفا سے
ایسی دہن منہ ہری برسے غولیت کا عالم
کہ ملا نہ جب کھلنا تو چل گئے خدا سے

بنائے شوق کے عہد نہ ظلم بانہ خدا رنگ و لکا
لگائی دیر سائے ایسی طور کہ آہستہ گلاب آرزو کا
کسی طبیعت کی سادگی پر کسی کا بچپن بھروسہ ہے
جسے جھٹکنے میں سب ہیتم وہ ایک سلیبت ہے گندہ کا
جیتلی اپنی سخڑی بھی، فوسل گری ہے معموری ہے
ہم انکے تصویر مہرہ جینوں کی رنگ بجز ہوں آرزو کا

ہم انتظار نگاہ برباد ہو رہے ہیں
نہیں ہے عشق کے تپے ہاویں سے تپن غور
کہ اس کی یاد اور آغوش آرزو میں ہے
کریں سلام ہم آسودگان سائل کو
دو چھے نعل بھی ایک دن سو منزل کے
مفلح جیل ہے شرف حدیث ناز و ادا
خدا ساپ تو انداز غفلتوں میں رہے

غلابہ رسم غزل فرماں سراہوں میں
غلابہ وقت کی گزری ہوئی صدا ہوں میں
غلابہ دین نہ جگہ میری بے قولی کو
جہیز ہوں میں 'درا نادر میری ہیبت سے
گرفتار ہوں مگر اسے جہیز اعتبار رکھو
ہری خفاں سے شکایت ہے کہ لورنگہ
جیل عشقی مریم کا میں نہیں قانع
جراحتوں کو فکر دان دکھا رہا ہوں میں

(سلسلہ ۱۶)

لکھے ذکر میں نقش پائے بہت قدم پر ہوا فساد
میں وہ مسافر ہوں جس کے پیچھے سے چلا رہا زمانہ

قہادی جو پریشان سبیل سے دیا تھا مجھ کو رقم مصحف
ہادی دوست پسندوں کے بنایا کاس کو رقم زمانہ
ہادی میزان کیت و کم میں نے خود بھی آگے لیاں کا سودا
ہادی میزان کیت و کم میں سب سے خزن آگے ہے دانہ

یہ کیسی دینا ہے جس میں محنت دینی ہے مشائخہ جہالت
سیاہی زلفیں بڑھا رہی ہے تجلیاں کر رہی ہیں شاد
سیاہیاں کتنی رہی ہیں آئینا، تجلیاں گھر رہی ہیں ہوش
خدا دلیس کی شرکات میں چل رہا ہے یہ کار خزانہ

کلاہ داروں سے کوئی کہہ نہ سکے وہ منزل سے لڑنا کی
جہاں خدا کی صفات برحق نظر ہے بلاق کی ناقدانہ
جب مجھے حراہوں میں روشنی ہے نشانی آنکھوں کی نہادانی ہے
جیتلی کی باسری سے چھڑا ہے شام سے صبح کا ترانہ

(سلسلہ ۱۷)

مباحیات

ذہنی، عقلی ہے اس کو گفت و گو
شکر کرتے ہوئے دل کی محبت کا میل
عقل ہے کہ سرگرداں تک پہنچے
واقعہ کی نظر نہیں کہ سجدہ تک پہنچے

دو کام ہیں ایک کام میرا کردے
یا اور بھی کھٹکھٹو (ادھر) کردے
میں یہ نہیں کہت کہ سویرا کردے
یا کوشتی تیز کر کہ کچھ دیکھ سکوں

روٹلی ہوئی قسمت کو مٹانا ہی پڑا
تم کو شاید خدا کے منکر تھے بہتین
سراپتا ہیاں وہاں جھکا نا ہی پڑا
تم کو بھی منکر خدا بہت نا ہی پڑا

میت پوچھ جہاں میں کیا بنایا ہم نے
پیشانیوں میں ہم نے جو جگہ سے ہم نے
یہ مشرق قشتہ زائما یا ہم نے
سمجھوں گے چلے خدا تیا یا ہم نے

کتوں کا کچھ اس سے سہل ہوتا
ہشکام دعا نذر رہا ہے جو بات
مٹی میں اسی کے خوں بھرا دل ہوتا
طاقت ہوئی تو دست قائل ہوتا

(بیٹلی نائل ہوسے کے بعد سٹشٹ)
رہا ہے دل و جگر کا ہی میں نے جیتل
جب آٹھ نہیں سپر قلم سے کیا کام
جبر طبع جلائے گا ہی میں نے جیتل
خدا اپنے دماغ کا بھی لایا میں نے جیتل

نقشِ جمیل

سی منتخب غزلیں

ارتقا

ہر حال میں شہیت بھوکتا رہی ہے
میں اس کی قدر توں کا شہکار بن گیا ہوں
خود اپنی جنتوں کی تخلیق کردہ ہوں
خود اپنی زندگی کا مسابقت رہا ہوں
یہ جبر و قدر کی ایک منزل ہے وہاں
بجور تو ہوں لیکن منتا رہا ہوں
یہ راہ وہ ہے جس میں ہر اس ایک سفر ہے
منزل بھی راستہ ہے فرض بھی ماہر ہے
حکمت کی رہبری میں پرواز کی انگلیں
انکان کے دائروں کو پیلا کے بڑھ رہی ہیں
وہ قوتیں جو اب تک تختِ شہر میں تھیں
گوارہ خودی میں پروان چڑھ رہی ہیں
انجام کی بعیرت خواہش پہ بکراں ہے
آزادیاں خود اپنی زنجیر گڑھ رہی ہیں
پڑے ہوئے ہیں دامن کو غیر و شرابارا
پابندیوں میں بھی ہے جاری معرہ جارا
جنبات رفتہ رفتہ انکار میں رہے ہیں
اذکار کا تہجد کردار میں رہا ہے
ہمدردوں کی شدت انصاف میں رہی ہے
پروردگی کا جذبہ لشار میں رہا ہے
فرض سے تجرہ ہے اور قہر سے حکمت
تحقیق ہو رہی ہے معیار میں رہا ہے
گمراہوں سے ہوا کر ہے راستہ جارا
تاریخ میں رہا ہے ہر نقش پا ہمارا

(۱۹۴۳ء)

بھوک

بھوک کی بھی قہیں ہیں، بھیک کی بھی قہیں ہیں
پوچھ اسی سے جود کی دھڑکنوں کو گنتا ہو
دیسری کی آنکھوں میں آہ جس نے دیکھی ہو
منہلی پہ غزلوں کی دم جس نے دکھایا ہو
حسن کو نگاہوں کی بھیک جس نے بخش دی ہو
فن کی فن ترائی کو بھوک جس نے سمجھا ہو
زندگی کے سینے میں زخیم دیکھنے والے
دیکھ وہ خودی کا زخم ہر گھڑی جو رستا ہو
خلق نے مرے اکثر بھیک میں دیے سجدے
ہاتے کسی اس کی جب فرد بھوکا ہو
(۱۹۴۳ء)

فلسفہ اخلاق

اے وہ کہ بہت قوی تر تو نے فطرت کی پہنائی زنجیریں
جو زنجیریں خود پہنی ہیں، اے کاشش انہیں توڑا ہوتا
قتیل فلہ آزادی کی جب فطرت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہوتی فطرت، تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا
ہے نغم جہاں پابندی سے پابند نہ ہوتیں مگر موبیں
دربار کی جگہ ساحل ہوتا، ساحل کی جگہ دربار ہوتا
پابند نہ ہوتی مگر یہ زمین سورج سے جا کر مل جاتی
مرچشہ ہر تہاں میں قطرہ ڈوب چکا ہوتا
پابند نہ ہوتے مگر تارے تو آپس میں گمراہ جاتے
سارا یہ "فلسفہ ارض و سما" پاک میں ٹوٹ گیا ہوتا
پابند نہ ہوتی یہ ہوا چلتی ایک ایسی تیز آمدنی
ذراست میں اک اہل ہوتی "شیرازہ کل" بکھرا ہوتا
میری عمل محدود رہے، اے فلسفہ اخلاق۔ ہی
اے کاشش حقیقت کو تو نے زنجیروں کی بھما ہوتا
"آزادی مطلق" نعت ہے، ہوتا جو سکون آزادی میں
"زنجیروں کا قلعہ" انسان نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا

۱۹۴۳ء

گورسیدہ

غلام جمیل نظری سے یہ نظم اپنی ذات سے تقریباً دو ماہ
پہلے یعنی مئی ۱۹۴۳ء میں کسی تھی
کب سے ہے شوقِ سفر، زین پہ طاری اے دوست
ہمارا کا نہروں کی کب آئے گی عمری اے دوست
کس سوال اپنے جنازے کے سبک ہوئے کا
زندگی ہی میں جری لاش ہے بھاری اے دوست
جس نے رحمتِ خانوش سے ان کے پوچھو
جو اٹھائے ہیں اسے دکش سے ان کے پوچھو
وہی بت لائیں گے کتنی ہے مرانی مسیری
ذہنِ فطانتِ طبیعتِ خفتانی مسیری
منقصر یہ ہے کہ چمپن تو پلٹ کر آیا
اور پٹنی نہ گھڑی ہمسرہ کو جواقی مسیری
اپنی عادات سے دیدہ نہ خندیدہ ہوں میں
قبہ بستر ہے مرا، گورسیدہ ہوں میں
وقت وہ ہے کہ عنصر کا گھروں ٹوٹے
وقت وہ ہے کہ خدا کا یہ کھلونا ٹوٹے

گشت ۱۹۸۲ء

وقت اب وہ ہے کہ بھرے یہ طاس تیر خودی
وقت اب وہ ہے کہ ہر خواب تمنا ٹوٹے

بسکہ ہر سلسلہ بیم ورجا ختم ہوا
فطرت شعبہ گر گھیل ترا ختم ہوا

اب کھلے کہ تماشاے نفس کچھ بھی نہیں
رنگ دلو کچھ بھی نہیں برق و شہر کچھ بھی نہیں
خلعت و فوری ہر شعبہ گی جموں کی مٹی
علتہ معیت ہر شام و صبح کچھ بھی نہیں

عورت جہد میں ٹھہرتے کہ بھاگے تھے ہم
ترک تیں خواب کی تھیں خواب میں جاگے تھے ہم
کیوں ڈروں موت سے یہ سبز نہاں کیا ہے بیک
آگ دوزخ کی بے سوخت جاں کیا ہے جیل
جو بلندی کا سافندہ ہو نظر میں اس کی
اک خیال ہی ہے سربراہ جہاں کیا ہے جیل

چُن کے کچھ پھول لکل آئیں گے اس گلشن سے
کیا سافندہ کو قلعہ ہو کسی مسکن سے

(مجموعہ آج کل ستمبر ۱۹۸۰ء)

ڈرو خدا سے ڈرو

(ایک جوان عورت جس کی جوانی بڑھاپے کی نمود میں
بسر ہو رہی ہے ایک لہجہ ذات کی محبت میں مبتلا ہو کر
اپنے چاہنے والے سے یوں فریاد کرتی ہے)

ہوس کی آگ بجھاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
سنو جیل سنو! تم سے یہ گزارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سے نفرت کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے

اسے جلی نہ بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
یہ تم جو مجھ کو تصور میں پسار کرتے ہو
جو نام لے کے برا آسمان پر بھرتے ہو
تہیں خبر بھی ہے کیا مجھ پہ کر گزرتے ہو

نہ ہنسنا دل کو بڑھاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
جھکے سر کو جو بیویوں تو تم نفس آؤ
کبھی کتب جو کھولوں تو تم نفس آؤ
اٹھا کے آنکھیں دیکھوں تو تم نفس آؤ

ذیوں نظر میں سماؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
کسی دن آنکھیں غارت میں جب ملتی ہیں
تمہارے شوق تمنا کو یاد کرتی ہیں
تمہاری آنکھ سے کیا اپنے دل سے نکلے ہیں

نہ بے حجاب بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو

اب صبر آدھہر نظر آئے تو سامنے تم ہو
بلیں ہوا سے جو پر دے تو سامنے تم ہو
کردن خدا کو جو سمجھے تو سامنے تم ہو

تماز میں نہ ستاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
جو پاس چلے کہ اٹک کے ڈسے ملان ہیں
تو خود بھی ملتی ہوں سالن کو بھی جلاتی ہوں
نک بکھ کے رشک دال میں ملاتی ہوں

ذیوں دوانہ بناؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
نہ اس طرح مجھے رسوا کرو خدا کے لیے
لگاؤ آگ کو ٹھنڈا کرو خدا کے لیے
رعایت دل نہ مدام کرو خدا کے لیے

دفا کو آگ لگاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
جنمور ذکر نہ جگاؤ کہ سو گیا ہے یہ دل
کئی برس سے عزا خاندہ دفا ہے یہ دل
خدا گواہ کسی کی عمل سرا ہے یہ دل

پرائے گھر میں نہ آؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
جو بچہ ہا ہو سر شام وہ دیا ہوں میں
تبسم لب واپس مدعا ہوں میں
جیا کے دوش پہ اک میت وفا ہوں میں

مرے قریب نہ آؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
ہے فرض کا یہ تقاضا جلا کروں تا عمر
حیات رنہ کا نام کیا کروں تا عمر
کسی کے نام کا کلمہ پڑھا کروں تا عمر

نیا سین نہ بڑھاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
میں دل میں بیج محبت کا بو نہیں سکتی
جیا کا نام ڈیو دوں ڈیو نہیں سکتی
کسی طرح بھی تمہاری بی ہو نہیں سکتی

میں صدقہ ہی نہ رکھاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو
میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں ہتھیں خدا کی قسم
شکستہ حالی خدا سے بے دفا کی قسم
جو بل رہی ہو بدستِ اس چستا کی قسم

ہوس کی آگ بجھاؤ۔ ڈرو خدا سے ڈرو۔ مجھے زیادہ کرو

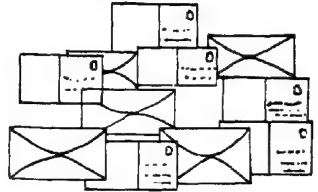
(مستطیل)

قطعہ

چشم و محرقہ ذوقِ نعر ہے لیکن
کتکے ہنسی کے فلسفے سے اڑا لیں
مقہر ہی مجھ سے سوسن کی تویر کمال
ترجی آنکھوں کے آنسو سے لال لیں

اگست ۱۹۸۲ء

مکتوبات



قابل تصحیح امور

جون کے شمارے میں میرا مضمون عباس علی جذب پر آپ نے شائع فرمایا ہے جس کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ مضمون میں چند امور قابل تصحیح ہیں۔ ان کی سمیت آپ اگلے شمارے میں ضرور فرمادیں۔

(۱) باقر علی خلیفہ نہیں ہے۔

(۲) جمیل مغہری مرحوم ضلع سارن میں مفتی حسن پرہ کے جو گوال پور سے تین گلو میٹر پر رہنے والے تھے۔

(۳) علامہ نذر حسن گوال پوری۔ ذوالحسین، اعلیٰ رضوی جذب مرحوم کے جمعہ وارد احباب فاضل ہیں۔

(۴) کلیات کا انتخاب جو اس شرعی طوف کیا گیا ہے۔

روح غالب کی قسم دل کی بڑی حسرت ہے کہ کسی جذب کو بھی صاحب دیوان دیکھیں

کلیات کے رتبہ حسن عباس نے کیا ہے۔ خود شاعر نے نہیں۔ اذراہ کرم ان چار امور کی تصحیح کرا دیجیے۔ امام مرتضیٰ نقوی۔ امروہہ

سہو

میرے مقالے میں شہری کے کلام کا جہاں غلطی ہوئی تھی اس کا جواب اس بات کا حوالہ دیا گیا ہے کہ شہری کی وہ غزل جو سرور کی غزل کے جواب میں لکھی گئی ہے درج کی جاتی ہے لیکن وہ غزل کی دج سے پہلے سے لکھی ہے۔ (غزل درج ذیل ہے۔ اداریہ)

دروا شدہ ندیش تو اغیار بار بار اقبال رفت آدم ادبار بار بار زلف سیاہ یو نیا یاد ہمیشہ من ہمیشہ بلکہ برتن۔ یسار مار مار آج کل کی دلی

کردم جو عشق تیرہ منصور یا فتم
برغش جلیے چو شدہ شب سیاہ پوش
بیزم زلا غزلت تم بہر سو عشق
تخصیص ما نیست کہ تا زک بود کتاب

اسے شہری کا کل جانا پناہ نیست

افتادہ جوں بر بزل مکار کار کار

ریاض الانصاری

استدراک

جون ۸۲ء کے اہتمام آجکل میں خیر آباد ادوہ کے فاضل شعراء کے سلسلہ میں ریاض الانصاری صاحب کا جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کو ایک اہم علمی و تاریخی خدمت کہا جاسکتا ہے جس کے لیے ریاض صاحب شکر کے مستحق ہیں لیکن فاضل مضمون نگار سے مضمون میں جو غلطی گشت ہوئی ہے اس کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

۱۔ حضرت عثمان غفری علیہ الرحمۃ کو حضرت محبوب الہی قدس کا خلیفہ کھانا گیا ہے غلطی غیر آزاد کی ایک جھلک میں قائم المعروف سے ہو گئی تھی لیکن جس وقت غلطی کا احساس ہوا اس کے بعد جن حضرات کی خدمت میں میں نے اس کا کوئی نسخہ پیش کیا اس کے حاشیہ پر اپنے قلم سے اس سہو کی وضاحت کر دی ہے۔ فاضل مقالہ نگار کے ملوکہ قدس میں بھی اس غلطی کی اصلاح حاشیہ میں موجود ہوگی۔ حضرت عثمان غفری قدس مرحوم حضرت محبوب الہی قدس مرحوم کے خلیفہ نہ تھے بلکہ آپ کے دور میں ایک عظیم المرتبت بزرگ تھے جن کے کال اور بزرگی کا اعتراف خود حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین جوہا الہی قدس مرحوم نے فرمایا ہے۔

۲۔ حضرت مخدوم شاہ مینا قدس مرحوم کا سند وصال شہدہ کھا گیا ہے۔ آپ کا وصال شہدہ میں نہیں بلکہ شہدہ میں ہوا ہے (فوائد سعیدہ)

۳۔ فاضل مضمون نگار نے حضرت مخدوم شیخ سعد قدس مرحوم کا سند ولادت شہدہ لکھا ہے اگر اس کی کوئی تاریخی سند موجود ہے تو اس کا انکشاف اہل علم کے لیے ایک نعمت غلطی ہے بہت سے اہل سلسلہ ادوہ مقتدرین آپ کا سند ولادت معلوم کرنے کے لیے مدت سے جستجو کر رہے ہیں جس میں انہیں اب تک کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

نعم الحسن رضوی، خیر آباد

اشراق فریں

فریبن ادوہ اساتذہ نے بے حد سہانے فاضل کو کس قدر یاد دہی کی غزل اور جو گندہ بال کے ناول "اسے دیدہ و رو" نے کالی ستار کیا۔

محمد حنیف صاحب، پٹوہ

اگست ۱۹۸۲ء



کیا آپ جانتے ہیں؟

ہر پیدائش اور
موت کا اندراج
کمرانا لازمی ہے

پیدائش کا سرٹیفکیٹ مختلف مقاصد کے لئے عمر کا ثبوت ہوتا ہے:

- اسکول میں داخلے کے لئے
- ملازمت کے حصول کے لئے
- ڈرائیونگ لائسنس کیلئے
- پاسپورٹ کے حصول کے لئے
- بیمہ پالیسی کے حصول کے لئے
- ووٹ دینے کے حق کے لئے

موت کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے:

- ترکے میں جائیداد کے حصول کے لئے
- بیجے کی رقم کی وصولیابی کے لئے
- جائیداد کے کلیم کے بنیاد کے لئے

ملک کا مفاد:

پیدائش اور اموات کا اندراج مستقبل میں بہتر صحت اور بہتر زندگی کی پیش بینی اور منصوبہ بندی کرنے کے لئے بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔

اندراج پیدائش و اموات کے قانون 1969ء کے بموجب پیدائش و اموات کا اندراج کمرانا لازمی ہے۔

رجسٹرار جنرل، بھارت



Govt 82/54

پیدائش اور اموات
کا بروقت اندراج یقینی بنائیے
اندراج قدرے تاخیر
سے بھی کرایا جاسکتا ہے

R.N. 948/57

Vol. 42 No. 1

AJMAL (URDU)

Post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

August, 1962



جہان کے صدر جمہوریہ
عزت مآب گیارہویں ذیل سنگھ

مجلد ۴۲

شماره ۱

اگست ۱۹۶۲

۱۰۰ روپے

۱۰۰ روپے

۱۰۰ روپے

۱۰۰ روپے

۱۰۰ روپے

۱۰۰ روپے

۱۰۰ روپے

آج کل

۸۰/



مهر ۱۹۸۲



جمہوریہ ہند کی صدارت سے سکدوش ہونے والے صدر شری نیلم سنجواریڈی اور صدر منتخب گیانی ذیل سنگھ، وزیر اعظم شری اندرا گاندھی کے ساتھ۔ نئی دہلی میں
۱۱ جولائی کو وزراء کی کونسل نے شری نیلم سنجواریڈی کے اعزاز میں عشاء کا اہتمام کیا تھا

عبادت میں اسلام آبادی ہلک آف پاکستان کے نئے سفیر جناب ریاض پراچہ ۲۱ اگست ۱۹۸۲ء کو لاشرقی بھون نئی دہلی میں صدر جمہوریہ ہند عورت آپ گیانی ذیل سنگھ
کو اپنی تعارفی اسناد پیش کرتے ہوئے



اردو کا مقبول عام مصوٰء ہمارا نامہ

اَبَحْ كُل

ایڈیٹر
راج نرائن راز

شوناقہ سب ایڈیٹر

جلد ۴۱

شماره ۲

ستمبر ۱۹۸۲

قیمت ایک روپیہ

فون ۲۸۷.۶۹

بھادر آٹھون شک ستمبر ۱۹۰۴ء

ترتيب

۳۶	کلیش کا پھول	دوبئی	۲	ملفوظات
۳۸	مجلت بکیت باؤرتی	مہرہ	۳	مقالات
۳۲	عزیز مراد آبادی	طنز و مزاح	۶	✓ مرتبہ انارڈ ٹائپ دم
۳۵	نعمت علی / شاعر	نئی کتبیں	۱۵	✓ ایڑھو دھوی کے سفر
	تاریخ فلسفہ خدی		۲۲	✓ دین، جو ایک کائنات تھا
	حضرت علی نقی		۳۶	بعض شاعر
	دل کی لڑائی		۳۷	نظم
	راما		۳۷	غزلیں
	مکتوبات		۲۸	ناول
	رضا منہری، کیف احمد مدنی		۲۹	افانے
	رحمت ابرو جوی، ایم انصاری		۳۰	
	غلام قسمی، شاہد آرزو، انوار انصاری		۳۳	

سرمشق :- گدھڑن اڑوڑہ

پرنس منجروایس۔ ایل حبیبوال۔ اسٹنڈرٹ پرنس منجروہ ایل۔ آہ۔ بنرو۔ اسٹنڈرٹ فارنٹر (پروڈکشن)۔ کے۔ آہ۔ کرشن

ترسیل زر کا پست

مضامین کے مطلق خط و کتابت کا پتہ:

بزنس منظرہ کی کیشنز ڈورن پیٹلہ دھوسا نئی دہلی

ایڈیٹر: اسماعیل "معدنی" کیشیز، ڈیپنٹی ایڈیٹر: ہوس، نئی دہلی

ملاحظات

زندگی برآمدات: نئی حکمت عملی

پچھلے تیس برسوں میں کیتی باڑی کو ترقی دینے میں ہمیں قابلِ تدر کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ کیتی باڑی کے بہتر طریقوں کے اپنانے جانے سے پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ سال بھر میں ڈبے سے زیادہ فصلیں اگانے کے نتیجے میں بھی پیداوار خاطر خواہ بڑھی ہے۔ پیداوار ہماری ضرورت سے زیادہ ہو تو ظاہر ہے اس کی کھیت کے لیے بدیسی منڈیاں تلاش کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری مجموعی برآمدات کا ۲۰ فی صد زندگی منومل پر مبنی ہے۔ ۶۶-۱۹۷۹ء میں زرعی مصنوعات کی برآمد میں اضافہ ہوا۔



لیکن ۸۱-۱۹۸۰ء میں تھلہ انصاف سے ہم خسارے میں رہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ درآمد میں اضافہ اور برآمد میں کمی تھی۔ اس کی کوئی کارکنہ کارہی ایک طریقہ کار برآمدت کو بڑھاوا دینے کی پرواز کو ششیں کی جائیں۔ نیز خاطر خواہ نکلا۔ چھٹے بجار منعوبے میں برآمدات میں ٹو فی صد سالانہ اضافہ ہوا۔

زرعی مصنوعات کی برآمد کو بڑھاوا دینے کے لیے جو حکمت عملی بنائی گئی ہے اس کا آؤریں مقصد ملک میں اناج کی پیداوار مزید بڑھا لے، تاکہ زیادہ ملل بدیسی منڈیوں میں بیع ہو سکے۔ دوسرا غنایاری مقصد نئی منڈیوں کی تلاش ہے۔ تیسرا یہ کہ منڈیوں میں جن چیزوں کی مانگ زیادہ رہتی ہے ان کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور عالمی منڈی سے برابر رابطہ قائم کیا جائے۔ اسی امر کے پیش نظر علاقے، کاتی، تمباکو، کاجو اور مصالحے وغیرہ کی پیداوار میں اضافے کے منصوبے بنائے گئے ہیں اور عملی اقدام کے جامے پہنے۔ بدیسی منڈیوں میں ہندوستانی مصنوعات کو درجہ اعتبار دلانے کے لیے ان کے مبیعات کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدام کیے جا رہے ہیں۔ ان میں پزیرودوں کی بریاریوں اور خورد پزیروں کی روک تھام، زیادہ پیداوار لینے والے بچوں کا استعمال اور کیمیائی کھاد کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا وغیرہ شامل ہے۔

ملک کے متعدد حصوں میں کاجو کی پیداوار ۲۰۰ کلوگرام سے ۵۰۰ کلوگرام فی ایکڑ ہے جبکہ پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ کاجو کی پیداوار میں اضافے کے لیے زیر کاشت علاقے میں بھی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس کیلئے عالمی بینک سے امداد بھی لی جا رہی ہے۔

بہت سی اشیاء ایسی بھی ہیں جن کی ملک میں آبادی بڑھنے سے مانگ بڑھ رہی ہے، جیسے اناج، تیل، چکن، گوشت وغیرہ۔ اگر ہم ان چیزوں کو برآمد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پائیدار بنیاد پر ایک طویل مدتی برآمدی پالیسی طے کی جائے۔

چاول اور تیل وغیرہ جیسی چیزوں کی اتنی کم سے کم مقدار طے کی جاسکتی ہے جسے اندرون ملک ضروریات سے قطع نظر برآمد کیا جاسکتا ہے۔ اشیاء کی مقدار کے بارے میں پیداوار اور برآمدی حالات کو دیکھتے ہوئے مقدار کا فیصلہ ہر سال کیا جاسکتا ہے۔

حکومت نے کچھ نئی اشیاء کی برآمد کے لیے حال ہی میں ایک سرچہ کر دیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ بہر حال برآمدات کے لیے استعمال ہونے والے سہولوں وغیرہ کی برآمد کے امکانات موجود ہیں۔ دنیا میں پھولوں کی تجارت تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔

جب کینیا، اسرائیل، لائبیریا، دوروز، فلک، بھیل، برآمد کر سکتے ہیں

ادارہ وہی تقریباً سو فیصد بنیاد پر تو ہم کہیں چھپے رہیں۔ حکومت نے اس ضمن میں متعدد اقدامات کا اعلان کیا ہے۔

ایک اندہنی جیسٹ جو برآمد کی جاسکتی ہے وہ کوئٹہ، ملتان، ملک کی ضرورت پوری کرنے کے بعد ملک سے پاس وافر مقدار میں کوئی بھی جتنی چاہے برآمد کیا جاسکتا ہے۔ کچھ ادارہ چڑوں جیسے ہلنے کافی اند پھول کے دس فیصد کی برآمد بھی بڑھائی جاسکتی ہے۔

اپنی ہمدیہ بہت بھی باعث اطمینان ہے کہ ملی سال دواں کے پہلے ہم مہینوں کے دوران مذاحت پر ملتی مصنوعات کی برآمد میں تقریباً ۲۰ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔

بہتر صحتی خدمت

معذوروں کا بین الاقوامی سال ختم ہو چکا ہے۔ تاہم حکومت نے اس سلسلے میں جو بہتر اقدام شروع کیے تھے ان پر دستور مل جاری ہے۔ ان پر دو گراں مل کا مقصد لوگوں کو معذور ہونے سے محفوظ رکھنا اور معذور افراد کی بھلائی و آباد کاری ہے۔

معذوروں کے بین الاقوامی سال میں عوام میں ان لوگوں کے مسئلوں کے تئیں جید ادائی آئی ہے۔ غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے جہد ہی ان کی مدد اور نفع کا بہتر پیما ہوا ہے۔

حکومت ان لوگوں کے مسائل کے حل کی ضرورت اور اہمیت سے پہلے بھی آگاہ تھی، تاہم نئے بین الاقوامی پروگرام سے معذور افراد کی بھلائی و بہتری کی کامیابی، انعام اور کوئی جیسی بیماریوں کے علاج اور دوا کے تمام کے سلسلے میں باغیچوں میں امیدیں بندھی ہیں۔

۱۹۶۱ء کے ایک جائزے کے مطابق بھارت میں چار لاکھ اشتر ہزار ۶۵۰ افراد مکمل طور پر نابینا ہیں، تین لاکھ تریسٹھ ہزار تین سو پوری طرح معذور اور لاچار ہیں اور دو لاکھ پچتر ہزار چھ سو اکیانوے افراد مکمل طور پر گونجے ہیں۔ قومی نمونہ جائزہ تنظیم اس وقت ایک اور جائزے میں مصروف کار ہے اور اس کا مقصد جزوی طور پر معذور اور ذرا فنی طور پر کمزور افراد کی تعداد، جنس اور عمر کا پتہ لگانا ہے تاکہ اس جائزے کے نتیجے میں ان لوگوں کی امداد کی جائے۔ حکومت نے اس جائزے کے قطعی اعداد و شمار دستیاب ہونے سے پہلے ہی معذور افراد کی امداد کے متعدد پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔

انہی میں کی روک تھام کو ایک قومی پروگرام کے طور پر شروع کیا گیا ہے۔ مٹھی شفا خانے قائم کیے گئے ہیں جو دیہی علاقوں میں آنکھوں کی دیکھ بھال اور علاج مناسب کی سہولیت مہیا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ صحت کی دیجہ بحال کے بنیادی مرکزوں میں بھی آنکھوں کے علاج کی سہولیتیں سہارا دی

گئی ہیں۔ دیہی کالوں میں بھی اس طرح کی سہولیات دستیاب ہیں۔ ٹی ٹی کے آنکھوں کے علاج کے راجیو پر سادہ مرکز میں ایک اعلیٰ تنظیم قائم کی گئی ہے جہاں آنکھوں کے علاج مناسب کے لیے ملے کو تربیت دی جاتی ہے۔ اسی طرح کے وہ علاقائی مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

چھ مٹھی شفا خانے دو ہزار آٹھ سو پچیس بنیاد مرکز صحت ۲۰۰۰ مٹھی اسپتال ۶۰ ملٹی کالج اور چھ علاقائی ادارے قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ان سب اداروں میں آنکھوں کے علاج کی سہولیات ہوں گی۔ اس وقت ۲۲ مٹھی شفا خانے ایک ہزار چتر بنیاد مرکز صحت ۱۲۶ مٹھی اسپتال ۲۶ ملٹی کالج اور چھ علاقائی ادارے کام کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا اداروں کے قیام پر مٹھی میں رقم خرچ ہوگی وہ مرکزی مرکز اور ادھر کے ملے مٹھی شفا خانے کے تحت کے دوران یہ نشانہ پورا کر لیا جائے گا۔

بھارت میں تقریباً ۲۰ لاکھ کوڑے کے مریض ہیں جن میں کوئی پانچ لاکھ بچے ہیں۔ ان میں سے چھ مٹھی شفا خانوں کا شمار ہے جبکہ ۲۰ فی صد سے زیادہ کچھ صحت مند ہیں۔ موجودہ صورت حال کے پیش نظر بھارت کے ۲۵۱ صلوں کے چار کروڑ افراد کو بینا کر کے لیا گیا ہے۔ لاکھ لاکھ کوڑے پر کنٹرول کرنے کے حکومت کے پروگرام کا مقصد چھ مٹھی شفا خانے کے آخر تک اس میں ۵۰ فی صد تک کی کمی کرنا اور ۲۰۰۰ تک اسے مکمل طور پر ختم کر دینا ہے۔ اس پروگرام کے لیے بھی پوری کی پوری رقم مرکزی مرکز کا دے رہی ہے۔

دیہی روزگار کے لیے ۹۰ کروڑ روپے

مرکزی سرکار نے روزگار کے قومی دیہی پروگرام کے تحت سالوں میں کے پہلے چھ ماہ کے لیے دیہاتوں کے واسطے ۹۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی ہے۔ مرکز ۸۳-۱۹۸۲ میں اس اسکیم کے لیے ۱۹۰ کروڑ روپے مہیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آئی، بی، رقم ریاستیں مہیا کریں گی۔ دس فی صد یعنی ۹۰ کروڑ روپے مندرجہ خیرست قانون اقدار کے لیے اور مزید دس فی صد سماجی بھلائی کے مقصد سے پڑوں ملگنے کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ دیگر مقاصد کے لیے ۲۰۲۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں

مرکزوں کے لیے ۲۴،۵ کروڑ روپے کی مالیت کا اندازہ بھی کیا گیا گیا ہے۔ اس میں ایک لاکھ تین چاروں اور ۵۰ ہزار تین لاکھ تین روزگار کے قومی دیہی پروگرام کے تحت موجود سال کے دوران (دقیقہ ۱۳) ہے

یہ بکھی کڑیاں

انہوں نے رومائوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ ہندوستان آچکے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر رگوپ کے یہاں قیام کیا تھا۔ میں نے پیرس میں ان کے یہاں قیام کیا تھا۔ ایک لکڑیوں کے لنگوٹوں نے کہا تھا.....

”ہم روماء کی مٹی بھری لاریاں ہیں۔“
سجوان رام کی طرح ہم بھی برسوں جھگڑوں، پرستوں اور بہاؤوں میں پھٹتے پھرتے ہیں۔ راجہ وشریہ کے بیٹے کا بن لاس چودہ برس میں ختم ہوا تھا۔ لیکن ہماری جلاوطنی کا مسئلہ معلوم نہیں کب ختم ہو گا۔ ہم امریکہ اور یورپ کے خوش حال تہذیبوں اور ریاست کے باسی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی مسیح معنوں میں شہریت نہیں ملے۔ یوگوسلاویہ کی طرح بھی ممالک کو اس سمت میں قدم اٹھانا چاہئے (یہاں اس برادری کے کئی وزرا اور ممبران پارلیمنٹ بھی موجود ہیں)

روما ملہ راہنی دوسری کہانی منسلق ہے جو مذاقی ہو گئے اور بولے... ڈاکٹر آپ مصنف ہیں، کیا آپ ہماری آواز کو اپنی تحریر میں کے ذریعے ہلکے کر ڈوں ہندوستانی جماعتوں تک نہیں پہنچاتے؟ ہم اُن سے کچھ نہیں مانگتے۔ ہم اُن سے پیار کرتے ہیں اور جواب میں صرف بیا رہا ہے ہیں۔ سوڈن اور فن لینڈ میں بھی میرے عسکرات کچھ اسی طرح کہے۔ مجھے وہاں ایک سماجی کارکن شری لٹون اور ان کی اہلیہ شری مریٹا اسٹون کے یہاں مختصر قیام کا موقع ملا تھا۔ مجھے انورا کے کہنے ان کی آنکھیں خشکوں سے مگر تھیں۔ اُن کی وفات اور ایک گت کے نقش آج بھی دلوں کے کہاں ملنے میں روشن ہیں۔

فرائض کے شری آغا دھس کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کے وطنی قاطعے ماس کے نقوش اسٹ میں۔ اُن کا یقین ہے کہ اُن کے آقا اعباد گھوڑوں کا پوچار کرتے تھے اور ان میں بھی شومیر یک کی روایت بھی جاری تھی۔ آج بھی بہت

نمائندوں نے اپنے انسانی حقوق سے متعلق تقریریں کیں۔ بحث و مباحثے ہوئے۔ نمائندوں کا اہتمام کیا گیا۔

میں اپنی تقریر ختم کر کے ابھی بیٹھا ہی ہوں کہ ایک روماء لائن میرا کھانا بھیجتی ہیں اور کچھ ہیں:

”ہم بارہا ان سے آئے ہو۔ تم میرا خون ہو۔“ میں صبران ہوں۔ لیکن یہ ملکی قانون کے موافق ہے اگرچہ کئی ہندی کے یہ سب ملے افلاسی کہتے جھلاہو ہوا۔ میں نے وفات چاہی۔ وہ جواب دہی: ”ہندوستان کو ہم بارہا دیا اور شری جلد ملنے ہیں اور شری کو ہم اپنا خون سمجھتے ہیں۔“

یہ قانون کوئی اور نہیں تھی۔ بلکہ یہ اُن کے درانے، سچی، جو مغربی یورپی رومائی کوئل کی جین کٹری ہیں۔ سماجی خدمات کے لئے ان کا بڑا شہر ہے۔ خوش اخلاق، ملن سارا اور پنجاب یا ہریانہ کی کسی ترقی یافتہ عورت کی طرح۔ رومائوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے ہمیشہ سرگرم کار رہی ہیں۔ ایک بار ہندوستان بھی آچکی ہیں۔ تاہم ایک باہر ہندوستان آنا چاہتی ہیں۔

گر دیکھی کہ انفرس میں جہاں رومائی روز اور مرنش ہیں جیسے خوجان کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔ وہاں ڈاکٹر کو روڈو سخی اور ڈاکٹر ڈونالڈ کین رک جیسے یا اور بارہا ہن عمرانیات سے بات چیت کرنے کا موقع میسر آیا۔

سچی نے بتایا کہ ان کے آقا اعباد ہندوستان سے آئے تھے۔ اور یہ کو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ ابھی قدیم تہذیب کو بھول گئے اور مغربی ماحول میں رہنے لگے۔ ڈاکٹر کو روڈو کی خود روماء ہیں۔

استین روماء
استین استین
سارے روماء استین
(مٹھو روماء)
مٹھو مٹھو
سارے روماء مٹھو

اُس دن کو کچھ میں آسان نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ مغربی بریتانیہ لافزیت کتبش آسان اور شامیں مارنا ہوا رومائوں کا خون۔ ہندوستانی خون سے ملنے کے لئے۔ ایک نئی زندگی حاصل کرنے کے لئے۔

میں نے زیادہ مالک سے یورپ، امریکہ اور شریلیا سے آئے یا اور جنہیں یورپ کے مقبہ سماج نے جیسی کا نام دیا۔ کبھی یہ ہندوستانی نژاد خاندانوں سے ملے رہے۔ چلتے ہوئے کا پیغام کے گروہوں سے ملے تھے۔

یہ رومائوں اپنے گھروں کو چھوڑ کر ملکوں ملکوں کی خاک چھانے شدید سردی اور بارش کی تیز بوجھالوں میں اپنا راستہ ڈھونڈنا آگے بڑھتے ہوئے قاطعے، ایک لمبی اور درد بھری کہانی کے جیسے گانے کو دار ہیں۔ تاریخ گویا ہے۔ ہیشیہ ۲۰ ہزار رومائوں کو گیس چیمبروں میں مار ڈالا تھا اور کئی متعدد ملکوں میں ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ لیکن یہ جیلے لوگ ہر درد میں مر رہے تھے زندہ رہے۔ آج یہ ڈیرھوڑ کی تھلا میں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

میں مثلاً افسانہ انسانیات کے ایک طالب کی حیثیت سے روماء کے ایک عظیم مسکند تقریباً میں شامل ہوا ہوں۔ ان خواہش پر مجھ نے پانچ سو



مصنف (*) سوئٹن کے ایک چھپی خاندان کے افراد کے ساتھ

سے رومانا اپنے بہنوئی کو 'جندو' کہتے ہیں جو 'ہندو' کا مماثل اور ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ اپنے عوامیاتی مطالعہ کے دوران میں نے دیکھا کہ رومانا میں جاٹ، بڑو، واپار اور جوئی وغیرہ ذاتیں شامل ہیں۔ یہ انعام جوڑٹ، بڑو، واپار، چھپی وغیرہ کی حیثیت سے شامل ہیں۔ جاٹ میں جاٹ، بڑو، واپار اور جوئی وغیرہ کو بڑی حاصل ہے۔ سنٹی، سنٹیوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ رومانا اپنی نسل کو سمبول سمیٹے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اسپین اور ہنگری کے بزرگ رومانوں سے کچھ معلومات حاصل ہوں۔

گوٹنگن سے ایرالوپ کا سفر شروع ہوتا ہے عجیب عجیب قدرتی مناظر، زمین اور خوبصورت لاکھیں نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ سوئٹزرلینڈ میں کشمیر یاد آتا ہے۔ 'ہیں است وہیں است' کے کہنے والے نے کاش اس سرزمین کو کبھی دیکھا ہوتا۔ ہوسکتا ہے اس کے تخیل نے اور ملا پائی ہوئی۔ آپس کا وسیع سلسلہ ہے گوہر دیکھ کر ہمالیہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ معلوم کس طرح یہ جاکر رومانا ہندوستان سے اس شکل راستے سے ہوتے ہوئے آئے ہوں گے۔ اور بھی مجھے دھوا دھوا کی بہاؤں پر اپنے پڑ پڑتے ہوئے ہی دوست یاد آئے جو آج بھی خانہ بدوش ہیں۔ وہ بھی اگر یورپ پہنچ جاتے تو رومانا تہذیب کا ایک جزو بن کر ایک نیا ماحول پیدا کرتے۔

یورپ کے سفر کا سب سے سیدھا راستہ یہاں کی 'یو' ہے۔ فریک فرٹ سے میں سارا یورپ گھومنے کے لئے نکل گیا تھا اور ایک آنچل راستے پر مل دیا ہوں کچھ دور تک پہنچ کر ایک رومانا پینٹنگ شری کرشن شاہ کو غیر مراسمہ دیا۔ اور پھر۔۔۔ اکیلا ایک بہت افزا ادھر سے میرے گھر پہنچا۔ ۵۰۔ ڈالر میں ۱۴ ممالک کی سیر۔ آخر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ لیکن کاروان بڑھتا گیا۔ منز میں ٹی ٹی نہیں کہیں مجھے میری کتابوں کے قاری مل آگیا تو ٹھٹھا

آپ میاں بوی کی طرح نہ رہے ہیں، لیکن اس پر بھی کنوارے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کبھی تو بولی۔ بچوں کا جھیل ہمارے بس کا نہیں۔ اسی لئے ہم آپ لوگوں کی طرح شادی کے چکر میں نہیں پڑے۔

لندن اور نیویارک کو چھوڑ کر ہندوستان کے گئے ہوئے ہندوستانیوں کے گھر تمام کرنا میں نے اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ اس سے غنازداری کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ نادرے کی ایک رومان کی سہ تباہ۔ میں بینک میں کام کرتی ہوں۔ 'کاجو' (روما دوسرے لوگوں کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے ہیں) ہم اپنی عزت نہیں دیتے جتنی اسی لوگوں کو دیتے ہیں۔ ہر لوگ آج بھی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ میں اپنی ہندوستانی تہذیب پر فخر کرتی ہوں اور اسی لئے اپنے 'پرم' اللہ راجستان جیسی جگہ پر اپنی بیویوں۔ اور دیکھو میرا بلاؤ بھی پورے جسم کو چھلے ہوئے ہے۔ ہم رومانا اپنے جسم کی تحائف نہیں کرتے۔

مجھے اس کی آخری پچھلے مجھ بڑیا۔ (دہلی ۱۹۸۱ء) ستمبر ۱۹۸۲ء

مجھے کہیں رومانا تہذیب کے محققین یا پھر فردو را بہن سہائی۔

ہر دی ہر رات ایک نہ ایک بات اسی فردو ہوجاتی کہ مجھے لالہ یاد آ جاتے یہ یورپ کی ریل گاڑی سے سفر کرنے میں سب سے بڑی ہول یہ کہ ریل کے عوام سے راستہ دہلیط کی صورت پیدا ہوگئی۔ موجودہ زندگی کی آٹھ گھنٹیں چند سیادینے والی روشنی سے اگتا ہے ہوئے لوگ، معمولی معمولی غلط فہمیوں کی بنا پر ازدواجی تعلقات کو توڑنے نیران کی دیگر شخصی مشکلات کو سمجھنے کا موقع ملنا گرمیوں کی چھٹیوں میں سامنا یورپ یا میاں اور لہجہ سیلابی بن جاتا ہے۔ سیر پلے میں وقت گزارا ہے۔ گویا بابا یادی بے عذاب سیر پلے کو نکل پڑی ہے۔ ہنسی کھلے کے۔

میں پھر اپنے پیارے رومانوں کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ میرے جڑن دوست شری ہرن اور ان کی پارٹنر کیتھرن کو رومانوں سے ایک خاص گناہ ہے۔ یہ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں، مگر کنوارے ہیں۔ میں نے جب ایک دن پوچھا۔



مرثیہ از آدم تا ایں دم

مرثیہ کی قدامت کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ :
" عرب میں جو فارسی اور اردو شاعری کا سرچشمہ ہے ۔ شاعری کی ابتدا
مرثیہ سے ہوئی " (موازنہ ادب و ادب ص ۱۰۸)

قدیم عربی ادب ابتداء سے کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ زوائد
جاہلیت میں بھی کوئی شاعر ایسا نہیں ملتا جس نے مرثیہ نہ کہا ہو۔ کسی نے بھائی
کا مرثیہ کہا تو کسی نے بیٹے کا۔ کسی نے باپ کا مرثیہ کہا تو کسی نے دوست کا۔
علی بن ربیعہ العلوی ، حاتم بن سفیان ، علی بن مالک ، خثاء ،
سہم بن زہرہ ، وحمل ، فرزدق ، کیت اسدی ، خالد بن معدان ، امام شافعی
علی محمد بن منصور ، محمود بن حسین اشہدی ، ابو منصور بخاری ، علی الدین بن علی
النجفی ، علامہ شہاب الدین عبدالقادر اور عبدالہادی العمری ، اپنے اپنے دور
کے مشہور و ممتاز مرثیہ نگار ہوئے ہیں ۔ آنحضرت کے دور میں بھی کافی مرثیے
لکھے گئے ۔ مولانا شاکر حسین اپنی اشہر کتاب مجاہد اظم میں لکھتے ہیں کہ :

" عہد رسول مقبول میں شہدائے بدر و احد کے بھی مرثیے لکھے گئے ۔
بعد وفات رسول آنحضرت کی چھوٹی حضرت معنیہ نے بہت مرثیے کیے حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عثمان بن ثابت نے بھی مرثیے لکھے ۔ ان مرثیوں
کے اشتراک پر ہی گئے ہیں (مجاہد اظم صفحہ ۳۵۵)

متمم بن زہرہ نے اپنے بھائی کی موت پر جو دردناک مرثیہ کہا وہ بہت
مشہور ہوا ۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ نے جب تمیم بن زہرہ سے مرثیہ سنا تو
بہت متاثر ہوئے اور اپنے بھائی کی موت پر بھی مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی ۔ تمیم
نے مرثیہ کہا اور حضرت عمرؓ کو فخر سٹایا ۔ آپ نے سن کر کہا کہ اس مرثیہ میں وہ
درد و غم نہیں ہے جو تمہارے بھائی کے مرثیہ میں ہے ۔ تم نے کہا وہ
مرثیہ میں ہے اپنے بھائی کا لکھا تھا اور نہ آپ کے بھائی کا ہے ۔

اسی طرح فارسی ادب میں بھی مرثیہ کی تاریخ بہت قدیم ہے بلکہ قیصر

مرثیہ کا لفظ عربی کے زائے مشتق ہے جس کے معنی رونے کے ہیں ۔
اس لیے مرثیہ اس صفت تک کو کہتے ہیں ۔ جس میں کسی مرے والے کی صفات
حسنہ بیان کر کے اظہارِ حزن و ملال کیا جائے ۔ حالانکہ یہی کچھ اس طرح مرثیہ
کی تعریف بیان کی ہے کہ :-

" مرثیہ کے معنی ہیں کسی کی موت پر پی ٹھکانا اور اس کے مجاہد اور
محاسن بیان کر کے اس کا نام و نشانیں زندہ کرنا " (مقدمہ شعر و شاعری
صفحہ ۱۲۳) تقریباً ہی تعریف دوسرے نقادوں نے بھی کی ہے ۔

مرثیہ وہ نظم ہے جس میں کسی کی موت پر اظہارِ رنج و غم کیا جائے
اور کسی عزیز یا دوست کی موت پر انسان کو احساسِ رنج و غم ہونا فطرت
انسانی میں شامل ہے اور رنج و غم کے احساس کی شدت ہی اشک و آہ کا شکل
اقتدارِ لطیف ہے تو مرثیہ میں فطرتِ انسانی ہوا ۔ اس نے انسانی آنسوؤں کی
اس سختی و شکل کا نام ہی مرثیہ ہو گا ۔ لہذا یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ جتنی قدیم
نسب انسانی کی تاریخ ہے اتنی ہی قدیم تاریخ مرثیہ بھی ہے ۔ اس کی سب
سے بڑی دلیل حضرت آدمؑ کا سابق عرش کا واقعہ بھی ہے ۔ یہ حال بقول
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں :

" مرثیہ کو دنیا کی قدیم ترین اور سب انسانی کی مشترک صنفِ کلام
قرار دینا شاید غلط نہ ہو گا " (درست و تیسر صفحہ ۶۷)

حضرت اہلؑ کی موت پر ابوالمشر حضرت آدمؑ کی آنکھوں میں چمک
آنے والے آنسو شاید پہلا وہ عالمی مرثیہ ہیں جو خود فطرت نے ایک دردِ سیرہ
باپ کے صیغہ حاض پر لکھا ہو گا ۔ مرثیہ کی قدامت کا ایک بہت بڑا ثبوت
تواریخ میں مختلف انبیاء کے نوحی کی موجودگی بھی ہے ۔ مثلاً نوحؑ نے بھی

● حدیث شریف روایت (ابوہامد)

میں مرثیہ اور مقل (شہداء کے مولا کے حالات) کی کتابیں بھی لکھی تھیں۔ فردوسی نے ہر ایک کا مرثیہ اس کی ماں کی زبان میں بڑے دردناک انداز میں لکھا۔ قرقی نے سلطان محمود کا مرثیہ لکھا۔ یہ دونوں مرثیہ مشنوی کی شکل میں ہیں۔ اس کے علاوہ ابو القاسم خزازی، قزلائی، خوارزمی، حکیم ستانی، غزنوی، خواجہ شمس الدین آذری، اسفہانی، ابن حاتم (پہلے مسعودی) صفی ادیب نے اسے عبوری جہد کا سب سے بڑا مرثیہ نگار بتایا ہے (عاجی محمد جان قدسی اور قبل نے بھی کافی مرثیے لکھے ہیں۔ شیخ سعدی اور ابن عربی نے رو کا بھی ایک ایک مرثیہ بہت مقبول ہے۔ محقق کشمیری نے اہلبیت رسول کے بھی مرثیے لکھے۔ فارسی زبان میں ہندستان میں اور بھی مرثیے لکھے گئے۔ غالب کا مرثیہ حال ہی میں جو اردو زبان میں لکھا ہے وہ دو قہرست مقبول ہو چکا لیکن فارسی میں بھی مرثیہ نگار نے مرثیہ غالب کی وفات پر ہندو ہندول پر مشتمل ترجیح ہند میں ایک دل خواں مرثیہ لکھا ہے۔ مرثیہ میں اشعار کی تعداد ہے۔ ڈاکٹر احمد علی نے اس مرثیہ کا ذکر اپنے ایک مقالہ میں بھی کیا ہے (ماہنامہ "سیا دور" مکتبہ غشی نئی کٹورہ ریزہ۔ نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء صفحہ ۳۶)۔

عرض کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے ادب میں مرثیہ کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ اردو شاعری جس کی دیگر اصناف سخن کا مرثیہ فارسی شاعری کو کہا جاسکتا ہے، اردو مرثیہ کی روایت اس سے مختلف ہے۔ اس کی فیڈی اپنی ذاتی ہیں۔ اس کی جڑیں اس کی اپنی سرزمین میں ہیں اور یہ شخصیت صحت اردو مرثیہ کو حاصل ہے۔ کسی دوسری صنف شاعری کو نہیں۔

اردو شاعری کی طرح مرثیہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی ہے۔ ریاست گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں نے اس کی بنیادوں کو مضبوط کیا ہے۔ محمد قطب شاہ قلی، قطب شاہ غازی، دکنی، فخر، طغی، قزلی، شاہی، مرزا، شہید، بیجاہ، کاظم، ابن شامی، حیدری، باغی اور صفی دین عرفی اور مرثیہ نگاروں نے مرثیہ نگاروں میں سے ہیں۔ قلی دکنی نے بھی ایک مرثیہ شمس الدین لکھا اور واقعات کی بنا لکھے۔ اس کے بعد قائم، اکبر، آزاد، دودھو بھی ہیں۔ ابتدائی دو صنف کاظم اور کاظمی کے مرثیہ کا ایک بنیاد ملتا ہے:

تم اپنے دلبر ان کی خبر روستی ولی
بے تاج سروں کی خبر روستی ولی

نیروں اور پیران کی خبر روستی ولی
ظلم و ستم خواں کی خبر روستی ولی

شمالی ہند میں سب سے پہلے مرثیہ نگار امین اہل عربی ہوئے۔ امین نے شلاہ میں وفات پائی لی فاروق کے عنوان سے ایک مرثیہ مشنوی کی شکل میں لکھا، جس میں حالات زندگی اور وفات کی تفصیلات بیان ہیں۔ مولوی عبدالحی نے بھی امین اہل عربی کو شمالی ہند کا سب سے قدیم مشنوی نگار قرار دیا ہے۔

نائبین نقوی نے امین اہل عربی کا یہ مرثیہ ایک اور مشنوی کے ساتھ (مشنوی گلزار) کتابی شکل میں اردو کی دو قدیم زبان کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ جس میں امین کے تفصیلی حالات اور مشنویوں پر مقدمہ بھی ہے۔ امین کی اس مشنوی کو محمد مرثیہ اس نے لکھ دیا ہے کہ اس میں دو مرثیے لکھا گئے ہیں: کوئی ہنریت اختیار نہیں کی تھی۔ اس سلسلے میں اہل عربی فاروقی لکھتے ہیں کہ: "شروع شروع میں مرثیہ، غزل اور مشنوی کی ہنریت میں نظم ہوتا تھا۔ اس نے کہ سوز غزل اور غزل کے طرز میں چڑھنے کے لیے یہ فارم نہایت موزوں تھے۔" (اردو مرثیہ صفحہ ۸)۔ فاروقی میں بھی اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ تیسرا اردو مرثیہ کے نظم کی ہر شکل میں مرثیہ کا گیا (اردو مرثیہ تاریخ مرثیہ صفحہ ۱۹۳)

اسی نے پاکستانی محقق اور لفظ و لال نقوی نے امین کی اس مشنوی کو مرثیہ قرار دیا ہے۔ امین کے مرثیے کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

بیشوں نے تجھ میں جو کھا پی چھوڑا
دولوں نے ایک بارگی جو پکارا
دولوں نے سہاوی اسکھوں زار زار
چلا خون جاری ہو چشماں سمجھار
رو کر لوئے لے ماں گئی جھوڑ کر
تہا نگوں کے دھوسے گامی جائے پر

امین کے بعد شمالی ہند میں مرثیہ کے بہت سے شعرا پیدا ہوئے۔ مثلاً حیدر شاہ، ملکین، گدا، سکندر، صلاحت، مخدوم، سورتا، امیر مکتھی، راجہ رے کے مصنفین نے مرثیہ بھی لکھا ہے، لیکن ان شعرا میں زیادہ ذرا سلاہ قائم چاند پوری وغیرہ ان میں سے کچھ نے تو خاص طور پر مرثیہ لکھا۔ اسی زمانے میں میر مناکت بھی ہوئے (ان کا کلام اب نہیں ملتا) اور آخری دور میں میر حسن بھی۔ اسی دور میں مرثیہ میں مدرس کی شکل کا بھی آغاز ہوا اور ادبی حیثیت بھی شروع ہوئی۔ اس دور کے شعرا میں سکندر کا ایک مرثیہ بہت مقبول ہوا جو آج بھی جگہ جگہ پڑھا جاتا ہے کہ:-

ہے روایت ششتر اسوار کی کا تھار سوئی
اک جگہ شہر مدین میں ہوا اس کا نزول
جس جگہ میں کہ رہتے تھے حسین ابن موی
ایک لڑکی کھڑی دروازے پر بیمار و مفلول

خدا نے بھی تھی پھر سے لگی زار و قطار
اچھا آجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار
اس دور کے شعرا میں مرثیہ نگار کی مقام دلالتیں ہو سکتی ہیں عظمت سب زیادہ ہیں۔ سورتا نے جو مصرعہ اردو میں دو قدیم طرز سے مرثیہ

کھے ہیں۔ حالانکہ سندس کی شکل میں مرثیہ کم ہیں۔ اس بندے سوتا کی مرثیہ نگاری کے رنگ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

کس سے اسے جہرغ ہوں جا کے تری بیدادی
جو ہے دنیا میں سوکتا ہے مجھے ایذا دی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فسر یاد کی
یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری بیدادی

کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکانات سے اس کے توہین ڈرتا ہے
مرثیہ کا اظہار دور و گیر، حمیر، غلیظ اور فصیح کے زمانے سے
شرع ہوتا ہے، لیکن اس دور کے شرع ہونے سے قبل ہی مرثیہ اپنی راہ پر
لگ گیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر امجد الزماں نے اپنی کتاب اردو مرثیہ کا
افتاح میں اس طرح اظہار کیا ہے کہ کثیر و سوتا کے زمانے تک پہنچتے
مرثیہ سے ادبی تقاضے شروع ہو گئے۔ بہر حال حمیر و غلیظ کے دور سے مرثیہ
کے لئے سندس کی ہیئت منتقل قائم ہوئی اور اب تک جو مرثیہ پر اعتراض
تھا کہ مرثیہ صرف دوسرے زمانے کی خاص صفت تھی جیسے ہے۔ اس اعتراض کا ٹانگ
ہونا شروع ہوا۔ اور ادبی حیثیت مسلم ہوئی شرع ہوئی۔ اس سلسلے میں حمیر کی حدت
خاص طور سے قابل قدر ہیں۔ یہ وہ مرثیہ تیار اندھ لکھو نے اس بات کا اعتراف اس
طرح کیا ہے کہ:

”میر حمیر نے اپنی جدت ملح سے دنیائے مرثیہ میں جو انقلاب پیدا
کر دیا تھا اس نے ہزاروں موزوں اور ندرت پند طالع کو اپنی
طرف تھنج لیا اور فقرہ مرثیہ سے اصل نظم، نازکی خیالات
اور وسعت اداسے اچھی ترقی کی کہ اگر دینی تمام جدید و
قدیم زبانوں کے لئے اور لہجہ مرثیہ ایک پتے میں رکھنے جائیں
اور دوسرے میں اردو مرثیہ کو صرف کیت (مقدار) کے اعتبار
سے نہیں بلکہ کیفیت کے لحاظ سے بھی اردو مرثیہ کا ہی پد تھکا کہے گا۔“

(ماہِ ثروت صفحہ ۹۰)

میر تقی کا ایک بندہ امجد ہو:

سو اس کلام سے مطلب ہے یہ خدا ہے گواہ
جنابِ قاطع کے گھر میں ہے تہیں کچھ راہ
خصوصی نیرنگ کھنڈے سے بھی ہو آگاہ
رہا دونوں بیبیاں شہزادیاں مری دلاہ

دوسرے تو ایک طرف پر امام اچھے تھے ہیں
کہو حسین علیہ السلام اچھے تھے ہیں
مرثیہ کے اس انقلاب سے اب مرثیہ صرف مذہبی چیز نہیں رہا بلکہ اس کی

ادبی حیثیت بھی ہو گئی۔ حمیر اور غلیظ کے بعد اردو مرثیہ کا جو دور آیا وہ مرثیہ
کی تاریخ کا سب سے زیادہ شان دار اور تابناک دور ہے۔ یعنی دور انیس و
دہر۔ حالانکہ اس سے پہلے مرزا غالب اور استاد ذوق جیسے شاعروں نے
بھی ادھر ترقی کی تھی۔ غالب نے تو اپنے بڑے کا ہی مرثیہ نام تمام بھجور دیا۔ البتہ
استاد ذوق نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے:

شام میں غریب شیر مٹھکے سہرا آئی

بہر حال دور انیس و دہر نے مرثیہ کو وہ عظمت بخشی کہ دنیا کے ادب
سے نظر ملانے کے قابل بنایا۔ بقولِ استاد امام انور کہ ”اگر میر تقی صاحب
کو شعرائے اردو کے ذریعہ سے نکال لیجئے تو اردو کی شاعری غازی کی شاعری
سے بہت پیچھے چھو جاتی ہے۔“ (کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۳۰)

ایک اور موقع پر استاد امام انیس کی شاعرانہ عظمت کا اظہار اس طرح
کرتے ہیں کہ ”رزمی شاعری میں میر تقی، جوہر، درویش، تلسن اور فردوسی
پر غالب ہیں۔ اور اگر ان کا جواب کوئی شاعر ہے تو بالکل ہے یا بیاس ہے۔“
(کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۳۰)

اسی قسم کی رائے کا اظہار ڈاکٹر ارم بابو سکس نے بھی اپنے الفاظ میں
اس طرح کیا ہے کہ ”اردو باوجود اصنافِ نظم کی تنوع اور کثرت کے رزمیہ
نظم سے اب تک بچی دست تھی۔ اس میں جوہر کی امیڈ، درویش کی امیڈیڈ
و یاس کی مہاسجارت، و امیڈ کی رامائن یا فردوسی کے شاہنامے کی طرح
کی کوئی تصنیف موجود نہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان اردو ایک تو غیر جزیرہ
اور اس قسم کی تعانیف رزمیہ کے لئے ایک مدتِ مدید کی ضرورت ہوتی
ہے۔ اگر یہ کمی کی طرح پوری ہو سکتی تھی تو خود انیس کے مشہور رمانی سے
ہوتی۔ ملاحظہ قدرت اور جذبات انسانی جس دور کے ساتھ انہوں نے
دکھائے ہیں اس کا بھی جواب زبانِ اردو میں نہیں ملتا۔“ (تاریخ ادب
اردو صفحہ ۲۴۳) حصہ تقسم۔

انیس و دہر کی عظمت کا اعتراف دور حاضر کے منفرد نقاد پروفیسر
رشید احمد صدیقی نے بھی ایک جگہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ انیس و دہر کے بعد
پھر مرثیہ کو شعر اور کلام میں ہوا اور ادبی تیرہ و گاہ میں جو مرثیہ ہی نہیں
جو کچھ کہتے خداے سخن کہلاتے۔ (مکتوب رشید احمد صدیقی بنام نسیم امروہی
مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء)

انیس و دہر کے دور میں واقعی مرثیہ نے ارتقا کی وہ تمام منازل
طے کر لیں کہ جس سے ادب کا مصروف ایک اہم جز بن گیا بلکہ اردو ادب کے لئے
سرماے میں وہ گراں قدر اضافے کئے اور وہ جذبات انجام دیں کہ جس کا اثر
ہر صاحبِ قلم کو نہا پڑے گا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں لکھتے ہیں کہ:-

”ہمارے مرائی کی یہ خدمت ناقابلِ انکار ہے کہ انیس کے ہمارے سارا

علم بدیع اور ادب میں منتقل ہوا۔ (دستاویزِ قدیم ص ۴۹)

مرثیہ کی اہمیت اور افادیت سے انکار اس نے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ واحد مصنف شاعری ہے جس کے دامن میں سب کچھ موجود ہے۔ غزل کی لکھنی اور بحر کا بھی ہے۔ قصیدے کی شان و شکوہ اور بلند آہنگی بھی۔ نظم کا تسلسل اور مدہدلی بھی ہے اور غزل کی وہ واقف نگاہ اور لطافت بھی۔ اس کے علاوہ ہر دم کے جلوسے اور نرم کا جلال۔ انقلاب کے شرارے۔ جدیدوں کے مرتعے۔ انقلاب کی تعلیم۔ فلسفے کا درس۔ جرأت و بہت کا سبق۔ تاریخی کی تصویریں۔ شجاعت و دجاں شناری کی تمثیلیں۔ غم کا ہلکا ذوق۔ مذہب کا تقدس۔ مظہم سے جذبہ بھرپوری اور ناسیت کا سرشتہ بھی ہے۔ غم کو منظر نگاری۔ جذبات نگار نگار نگار نگاری۔ واقعہ نگاری اور انداز نگاری سب کچھ مرثیہ میں موجود ہے۔ اسی لئے مرثیہ کو صرف زندہ ڈرامہ، ادبی غزلیات یا تاریخ کھلینا غلط ہے اور نہ نقادان فن نے ایسا سوچا ہے وہ مرثیہ کے سلسلے میں رائے قائم کیے ہیں مگر وہ جوتے ہیں، دراصل مرثیہ سب کچھ ضرور ہے، لیکن سب سے پہلے وہ مرثیہ ہے اور یہ تمام چیزیں اس کے اجزائے جانی جاتی ہیں اور کسی بھی زبان کی کوئی بھی صنف شاعری مرثیہ سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتی۔ ممانکت ضرور ہے۔

مرثیہ کی اہمیت کا اظہار شاعر شجاعت علی سندیلوی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اوروشاوی کو صرف مرثیہ کی ہدایت و وسعت و جامعیت اور گہرائی و گہرائی نصیب ہوئی۔ جذبات و احساسات کی مثنوی نظری اور صبح عکاسی مثنویوں میں ملتی ہے دوسری اصنافِ سخن اس سے عاری ہیں۔ اردو میں اعلائی شاعری مثنویوں کی مثنوی منت ہے" (اندازِ مرثیہ صفحہ ۹۰) بالکاتی شاعر ماحر کہنوی نے اس بات کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

اس میں غزل کا سخن قصیدہ سے کہی دل کشی
مدحت کی آن بانِ حقیقت کی چاشنی
جہدِ خدا کا لعل بھی لغتِ رسولؐ بھی
پہیلیاؤ میں ہے نظم تسلسل میں مثنوی

غم بھی ہے بھیدِ غم بھی ہے بہمہ بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے زعفران بھی ہے
حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نہ صرف زندگی کی دکھائی کی خدمت انجام دے بلکہ زندگی کے تقدس کی بھی کوشش کی ہے، لیکن کامیابی کے ساتھ مرثیہ کو کتنا بھی پرش کی کہم کی بات نہیں ہے۔ بھی وجہ ہے کہ مرثیہ نگار شعرا کم ہوتے ہیں اور کامیاب مرثیہ نگار بھی کم ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ زندگی کی کہی ہے کہ مرثیہ نگار کے لئے بہت سے مصلوم یا خدمت مامل جو نا بھی ضروری ہے۔

انیس و دہریہ کے دور میں اور اس کے بعد بھی بہت سے شعرا نے مرثیہ کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ کچھ نے فوجی پوری زندگی کی تمام تر صلاحیتیں مرثیہ نگاری کے لئے وقف کر دی ہیں۔ مرثیہ نگار کی مقام دلانے میں انیس و دہریہ کے علاوہ مشفق، مشق، نفیس، اس، تونیں، آواز، طبع، برقیں، تمکرم، شاد، حسی، علی ٹکین ٹکین، وقید، رشتہ، ہر و ص، طیس، کرس، عارف، طیس، فانی، قدیم، قلق، بحر، اسیر، غزل، ہمز، اوجس، صبر، صابر، عاشق، محبوب، مقدر، توقیعہ، ہیز، روا، ہیم، عالم، طیس، یس اور سراج و غیرہ کا بھی کام ہے۔

اس طرح مرثیہ کی ادبی حیثیت تو مسلم ہو چکی اور اصحابِ علم و فہم نے اس کا اعتراف کر لیا۔ لیکن یہ اعتراض پھر بھی باقی رہ گیا کہ مرثیہ صرف ایک خصوصی فرقے کی مذہبی چیز ہے دیگر اقوام سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ عوام اور عوامی زندگی سے دور کی چیز ہے۔ لیکن مینو کی صدی کے راجہ ایل کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہر صنف میں جوش آبادی، نیم امر و ہوی، جیل، عطیہ، نجم آفندی اور آل رضا کھنوی کی آواز میں نئے نئے اور نئے افلاک میں گونج اٹھیں اور مرثیہ کو تمام کی زندگی کا ترجمان، عوام کے کردار کی اصل کا ذریعہ اور عوام کے مسائل کا حل بن کر پیش کیا گیا۔ امام حسینؑ کی ذات کے محدود تصور کو ختم کر کے اس میں نیکی کی اور عوام سے تعلق پیدا کیا گیا اور ترکیب نفس کے لئے اس کی بہت سے اعلیٰ نمونے پیش کئے گئے۔ میر میر نے بہارِ احمد سراپا۔ رجز و فیکے کو ڈالر ترتیب کا چارواں دیا تھا اس سے موہن موز کر قلم اٹھایا۔ جوش ملیح آبادی نے جیش گونی کی:

انسان کو بیدار کر دینے دو
ہر قوم کو بیکار سے کی ہمارے میں حسینؑ

نیم امر و ہوی نے آواز بلند کی:
حسینیؑ جیسے انسانیت کی جان تو ہے
زمین و صبر و عقل کا آسمان تو ہے
صبر دین محمدؐ کی غزوات اس تو ہے
روحیات میں سالار کا رواں تو ہے

جہاں کو غبارِ فتنہ سے بگاڑ دیا تو نے
تجاکے واسطے مرنا سیکھا دیا تو نے

قبلِ پہلوی کہہ اٹھے کہ:
وہ میں ابنِ وارث میراثِ نعیمؑ
خالقِ حشرِ قرآنی و زکرجِ نعیمؑ
جس کی بہت ہوئی کہ غلط کبریٰ کی دلیل
جس سے دیکھی نہ جی تو بے شک تزلزل

جس نے ان کو لیتے ہے اُجھارا وہ حسین
جس کے تیرے خلیق کا اشارہ وہ حسین

اب وہ کھنسی پکڑا دے گا :

آواز دی ہے فاطمہ کے قورعین کو
انسانیت پکار رہی ہے حسینؑ کو

نجم آئندہ نے ارادہ کیا ہر ایک کو :

اہل زمین کے آج تاروں پہ ہے نظر
مکمل ہے کامیاب رہے جائیداد کا سفر
ہے اپنی اپنی فکر میں ہر قوم کا بشر
مردان حق پرست کا جانا ہوا اگر

عباسؑ نامور کا علم لے کے جائیں گے

ہم جائیداد پر حسینؑ کا علم لے کے جائیں گے

اب امام حسینؑ کو انسانیت کا پیکر ہمیں کوئل کا جگر، کاروانِ حیات

کا رہنما، خوابِ غفلت سے جگانے والا، فوجِ بشر کو تڑپلے سے بچانے والا

اور انسان کو پستی سے اُٹھانے والا کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ مرثیہ کی دنیا

میں وہ انقلاب تھا جس سے مرثیے نے ایک بالکل نئی شکل اختیار کی۔

مرثیے کے موضوعات کو دستِ علی۔ مرثیے کے تاریکی کا حلقہ چرچا اور مرثیہ

ادبی حیثیت کے ساتھ ساتھ عوام کے قریب بھی آگیا اور ایک کارآمد پیرز

بن گیا۔ حالانکہ بہت سے حواشی پر اس اور روایت پر سنوں نے طرح طرح سے

اس جدید مرثیہ پر تنقید کی کسی نے کہا یہ مرثیہ کلاسیکی نہیں ہے۔ کسی نے کہا

اس میں ذکرِ مصائب کہے کسی نے صرف ایک نغمہ یا سانس قرار دیا۔

کسی نے بہار۔ ساقی نامہ۔ تلوار اور گولڑے کا ذکر نہ دیکھ کر کوس کو مرثیے کی

صنف سے بالکل ہی خارج کر دیا۔ حالانکہ یہ اعتراضات بالکل اسی طرح ہیں

کہ جیسے آج بھی کوئی غزل کے سنی صرف عورت سے بات چیت سمجھتا رہے۔

دراصل دوسری اصنافِ سخن کی طرح مرثیے میں بھی یہ تبدیلیاں فطری تھیں۔

بقولِ پروفیسر افتخار حسینؑ کہ ”ہر صنفِ شاعری کی طرح مرثیہ بھی تغیرات کی

تدوین کرتا رہا ہے ایسا ہونا فطری بھی تھا“ (امانتِ سخن، صفحہ ۵۵)

مرثیے کے ارتقاء کے سلسلے میں ایک اعلیٰ عالم علامہ ذیشان حیدر

جمادی نے اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے کہ ”حقیقت یہ ہے کہ برقی دور میں

مرثیہ کو زندہ رکھنے کے قریب اصنافِ سخن کی طرح اسے برقی رفتاری درمی

پیشے گئی۔ اور اس کے مزاج میں برقی لہروں کو دھڑانا پڑے گا“ (امانتِ سخن

صفحہ ۵۵)

دراصل بیویں صدی کے رائج اولیٰ کے بعد مرثیے میں تغیر پذیر ہونا

پیدا ہونے جس نے جدید اثرات کا پانچا اظہار نہ کی کو کوشش کی۔ نیا ذہن

نکلا نکلا

نے تغیرات لکھ کر اس کا اعلان اور پرانے تغیرات نے مرثیہ کو ایک نئی
شکل دی، جسے ہم جدید مرثیے کے قریب کر سکتے ہیں۔ قدیم مرثیے کی عظمت اور
اہمیت انہی ملکِ مسلم ہے لیکن جدید مرثیے کی ضرورت سے انکار بھی
غیر ممکن ہے۔ بیویں صدی کے بدلے اولیٰ کے بعد مرثیے کی ہر کوشش جس سے
جدید مرثیے لے گیا۔ اس جدید مرثیے اور قدیم مرثیے میں کیا فرق ہے؟
اس مسئلے میں بہت سے ذہنوں میں کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ حالانکہ بیویں
فرق نہ ہونے کے باوجود دینی دوزخ کے مزاج، ہے، زبان اور مصفا میں
کے اعتبار سے بڑا فرق ہے۔

قدیم و جدید مرثیے میں سب سے بڑا اور نمایاں فرق یہ ہے کہ
قدیم مرثیہ کا مقصد شہادت کا بیان تھا۔ لیکن جدید مرثیہ مقصدِ شہادت
بیان کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے کہ آخر یہ واقعہ اور یہ الیوم کیوں ہوا۔
کس عظیم مقصد کے تحت یہ قربانی پیش کی گئی۔ اور اس قربانی نے انسانیت کو
کیا کیا درس دئے۔ قدیم مرثیہ نگار امام حسینؑ کو اس حیثیت سے زیادہ پیش
کرنا تھا کہ :

ط : باغِ جنان کا غنچہ مینا حسینؑ ہے

ط : اعجازِ انبیاء کا خزانہ حسینؑ ہے

ط : دریاۓ مغفرت کا سفینہ حسینؑ ہے

لیکن جدید مرثیہ نگار امام حسینؑ کو اس حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے
کہتا ہے کہ :

ط : قاتلِ نخلِ امارت میں حسینؑ ابنِ علیؑ

ط : شہیدِ معرکہ جملہ و القابے حسینؑ

دوسرا بڑا فرق قدیم و جدید مرثیے میں یہ بھی ہے کہ قدیم مرثیہ کا مقصد
حزن و ملال اور گریہ و زاری تھا۔ مرثیہ نگار اُٹلانے کے لئے مرثیہ لکھتے تھے۔

لیکن جدید مرثیہ صرف اُٹلانے کے لئے نہیں لکھا جا رہا بلکہ اس کا مقصد (اور

کچھ شعرائے اسے میں اہم مقصد) جگانا ہے، بیدار کرنا ہے، چونکا نا ہے۔

اور اگر خوش کے لڑائی پر غم نہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جدید مرثیہ جمجھوٹے کے

لئے بھی ہے۔

جوشِ نیتِ آبادی کہتے ہیں کہ :

کس طرف چاہا ہے کچھ کو سوچا اسے مردِ خدا

اک طرف دیرِ نرنا ہے اک طرف نرسہ بے بقا

یا بہن کے تاجِ کردار شمشیرِ کربلا

یا محیطِ شہر باطل میں جا کر گویا جا

یا عنانِ ذہنِ عالم جانبِ حق موڑ دے

یا زمینِ احوالی کا تامل لینا چھوڑ دے

نمبر ۱۹۲۰ء

اسی طرح مومنوں کے اعتبار سے بھی جدید مرثیہ قدیم مرثیہ سے بہت الگ ہے۔ قدیم مرثیہ میں شاعرانہ تعلیٰاں، تلواریاں اور گھوڑے کی تعریف، ساقی، ناند، پہاڑ کا ذکر، صبح و شام کا ذکر اور گھڑا نگاری وغیرہ ہوتی ہے۔ لیکن جدید مرثیہ کا مومنوں کی حالی مسائل سننے ہوئے ہیں۔ اس کی روح میں آفاقیت ہے۔ اس کا زاویہ نظر میل گیا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ:

ہم انقلابیوں کی نظر ہے حسین پر

اور یہ نظر ہے طرز دیگر ہے حسین پر

اور حب نظر ہے طرز دیگر ہے تو وہ کردار پیش کرے کہ دوسری بھی چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ:

رعب سلطان کی گھمراؤ تو لو نام حسین

بوتے زن میں نہ گھمراؤ تو لو نام حسین

دشمنوں کی بیاس بھیمراؤ تو لو نام حسین

نوت کی بھائی پر چڑھاؤ تو لو نام حسین

علق سے تیوں کا مونہ موڑ تو لو نام حسین
برگ سے نلاد کو توڑ تو لو نام حسین
جدید مرثیہ نگار نے امام حسینؑ کو قدیم مرثیہ نگار کی طرح صرف امام ہی کی حیثیت سے پیش نہیں کیا بلکہ ایک عظیم انسان کی شکل میں بھی پیش کیا ہے۔ امام حسینؑ کی حیثیت امام کی عظمت پر قرار رکھتے ہوئے انسان کا ال بنام جدید مرثیہ نگار نے پیش کیا ہے۔

شبیر زندگی کو معتبر کا نام

شبیر عمر ہے وقار و کمال بشر کا نام

شبیر ذہن و قلب کی ہے روشنی کا نام

شبیر ہر فریب سے ہے دوستی کا نام

قدیم مرثیہ کا چمکے حلقہ محدود تھا، اس لیے اس میں طرزِ مخاطب بھی محدود تھا۔ جدید مرثیہ کا حلقہ لامحدود ہونے سے طرزِ مخاطب بھی بدل گیا، اعلیٰ محدود ہو گیا۔ اس صوفی اہل علم و مومنوں یا مسلمانوں کو مخاطب نہیں کیا جاتا۔ جس طرح قدیم مرثیہ نگار کہتے تھے:

اے ابنِ عز! کھچھرام و دم کے دن آئے

اے یومز! آجین سے سے صفت کی قریب ہے

اے مومنو! اولاد کا دریا بھی غضب ہے

اس کے بجائے آج کا مرثیہ نگار کہتا ہے:

اسلام دینِ عظمت انسان ہے دوستو!

ہاں وہ بشر ہے وارثِ تطہیر و ستوا!

۱۱

آج کا مرثیہ نگار

۴: ہاں اسی جری کا نام ہے شبیر دوستو!

مرثیہ کی بنیادی چیز اور اس کی رصہ ثنائیت ہے۔ قدیم مرثیہ میں صرف ایک غریب، ایک ایک شخص و لہجہ، نگار اور ایک بھوکے پیلے کا ذکر ہے اس کی تعلیمی پر مڑا جاتا تھا، لیکن جدید مرثیہ نگار ایک بہانہ، ایک مجاہد، ایک شجاع اور ایک سپاہی کی شہادت پر مڑا جاتا ہے۔ اور نگار مصری کی نظیر نہیں کرتا بلکہ جوش و خروش پیدا کر کے مردِ میلان اور سورما بناتا ہے۔ حق پر جان دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:

لیکن آئندہ وہ جو برسائیں شرارِ زندگی

جس سے چمکے جو ہر عز و فخرِ زندگی

جس کے قصے میں ہو تیغِ آبِ دارِ زندگی

جن کی دیکھنی میں کروٹ لے رہا ہر زندگی

ہاں وہ آئندہ جن میں غلامِ پرخوشی و فخرِ حق

جن کے گردے کی مہد میں پوشِ شادرت کا سین

یا امام حسینؑ کو صرف ایک مظلوم سمجھ کر تعلیمی پر آئندہ ہاں ہی کافی نہیں ہے بلکہ جدید مرثیہ نگار کہتا ہے کہ:

بیا جو کرسے ہو تم مجلسِ عزائے

اطاعتِ غمِ مظلوم کر بلا کے لئے

یہ صرورت ہر رنگا، پس نہ واہ واسکے لئے

یہ مدرسہ بھی تو ہے دینِ مصطفیٰ کے لئے

نہیں یہ بزمِ ہدایت کا باب ہے گو یا

حسینؑ علم و عمل کی کتاب ہے گو یا

اور شاعری کی دیگر اصناف میں دور از کار شہادت اور

مبالغہ شاعرانہ حسن سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج قدیم بدل گیا ہے۔ میل بدل گیا ہے، اس لئے نکل کا سن آج صیب قرار دے دیا گیا ہے۔

یہی طرح جدید مرثیہ میں سائنس آرائی صوبہ بھی جاتی ہے۔ آج کی حقیقت

اس طرح بیان نہیں کی جاتی کہ:

۵: ماہی جو موجِ سیخ پہ آئی کباب تھی

آج حقیقت پسندی کا دریا حمان چڑھ گیا ہے

مرثیہ نگار کا اثر جدید آخر موسم کی سنسٹری اس طرح کرتے ہیں:

۶: ہے قاصدِ تشنگی شوقِ سفر میں

فرزِ کائنات بھی نہیں اس راہ گزریں

تاہم نظرِ رنگ بیا بال ہے نظر میں

سایہ ہے نہانی رو پڑیچہ و خطرس میں

گدوں ہے شرمناز میں آگ کا دیا

سجلا ہوا ہے لندھو کی آگ کا دیا

شبیر دوستو

قدیم و جدید مرثیے میں ایک بہت بڑا فرق ماحول نے پیدا کر دیا ہے اور تبدیلیِ زمان سے متاثر ہوا ہے۔ وہ مرثیہ جو دورِ آمدیت میں لکھا گیا ہو یا جدید داری نظام میں تخلیق ہوا ہو، خاص ہے اس میں ایک قسم کی ذہنی آزادی کی کمی ہوگی۔ اس لئے اس میں لکھن اور سب کی کیفیت کے اسباب پیدا ہو جانے نا ممکن نہیں ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف وہ مرثیہ جو جوہوری نظام کے ماحول میں لکھی گواہیں بھیج کر کہا جائے گا تو ساری کی ساتیں بھی اس سے متاثر ہوں گی۔ قلب کی کیفیت بھی بدلے گی۔ لہجہ بھی اظہارِ انداز ہوگا۔ زبان بھی بدلے گی، اس لئے اس میں جرأتِ اظہار اور بے باکی زیادہ ہوگی۔ اس پر یہ کہہ بات:

ع : غیبِ سلطان کی کوٹھڑاؤ تو زورِ نامِ حسینؑ

اس دور میں نہیں بھی ماسکتی تھی جب انیس و دہر مرثیہ لکھ رہے تھے۔ آج کا شاعر غلامِ تقویٰ بھی یہ کہہ سکتا ہے:

رہبرِ بستی ہے گورنگا ہی جہان میں

اہلِ جوس ہیں غلامِ اہلِ جہان میں

یا جو جس ملیح آبادی میں یہ بے باکی اختیار کئے ہیں:

جب حکومتِ تعمرائے مہلت ڈھلانے لگے

جب غرور و اقتدار اُتار پر چھپانے لگے

غمر و آئین پر جب آگ برسائے لگے

جب حقوقِ ذریعہ انسانی پہ آگ آئے لگے

ان میں در آ بازوئے خبر شکن سے کام لے

ان مواقع پر حسین پرچمیں سے کام لے

قدیم و جدید مرثیے میں ایک بڑا فرق اظہارِ بیان کا بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم مرثیہ نگار زیادہ تر مکالمے کا انداز مرثیے میں اختیار کرتے تھے۔ جیسے:

ع : گھر سے جب ہر سفر سید عالم نکلے

ع : جب چلے شرب سے سبطِ مصطفیٰؐ سوسے عراق

ع : چہل چوکر طاسی بیٹھ کر ہوجا

ع : قید سے چھوٹ کے جب ستیہ ستیا دہائے

لیکن جدید مرثیہ نگار ہم سے صرف اس طرح مخالف نہیں ہوتا بلکہ وہ تعبیر کا انداز بھی اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ:

ع : عرش سے گربہ ہو تو نہمت ہے زندگی

ع : راو عمل میں زورِ بدماں ہے زندگی

ع : اسلام دینِ فطرتِ انسان ہے دوست

ع : تمام خلق کا خدمت گزار ہے پانی

جدید مرثیہ نگار صرف تعبیر تک ہی نہیں جاتا۔ وہ اس سے اور آگے بڑھ کر تنقید کی دادی میں بھی قدم رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ:

علم و عمل کا شیشہ دل چڑھ چڑھ ہے

اُچھائی جہالتوں کا سر پر غرور ہے

لڑ و فروغ پہ ناحق نہ مصطفیٰؐ کے لئے

اصول دین کی مخالفت کرو خدا کے لئے

غضب ہے تم رو علم و عمل سے بھاگے ہو

حسین کا تو سیاحی وہ ہے جو آگے ہو

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جدید مرثیہ تاریخ کے ساتھ تبعا اور تنقید بھی ہے۔ لیکن قدیم مرثیہ تاریخ زیادہ سے تبعا و کم تنقید بالکل نہیں۔

ایک فرق قدیم و جدید مرثیے میں یہ بھی ہے کہ قدیم مرثیہ نگار اپنے ماحول کی عکاسی کرنے اور خصوصاً سیاسی و سماجی حالات پیش کرنے میں ہچکچاتا تھا۔ اندیشہ اس کے ماحول کی عبوری تھی، اس لئے قدیم مرثیے میں ہمیں اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کی تصویریں بہت کم ملیں گی۔ اور

کے سلسلے میں یہ نظریہ کہ ہر ادب اپنے عہد کا آئینہ دار ہونا چاہئے، یہ جدید

مرثیہ پر زیادہ پورا اُترتا ہے۔ اس میں معاشرے کی عکاسی کافی کی گئی ہے۔

مثلاً:

اگر پری ہوشاوی بغضِ رسانی

منیا فتوں میں کرتے ہیں اپنی قربانی

خوشی کے خوش میں ہوتی ہے غمی ہوائی

کہ جس کے بعد نہ کچھ کو مل سکے پانی

تباہ ہو کے بھی برباد سخنِ عمل نہ گئے

اگرچہ جل گئی ریتی مگر وہ دل نہ گئے

ان تمام باتوں کے علاوہ قدیم و جدید مرثیے میں ایک فرق طوالت و اختصار کا بھی ہے۔ قدیم زمانے میں لوگوں کو وقت کی کمی نہیں تھی نہ مرثیہ نگار کو اور نہ مرثیہ کے سامعین کو۔ اس لئے مرثیہ ۱۰۰ - ۱۵۰ بندوں سے ہزار ہزار بندوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ آج کے اس ماضی دور میں ہر ایک کے پاس وقت کی کمی ہے۔ انسان کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ اس لئے جدید مرثیہ نگار عام طور پر ۵۰ بندوں سے زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ - ۱۲۵ بندوں پر اپنے

مرثیے کو ختم کر دیتا ہے۔ جو جس ملیح آبادی کا بھی مرثیہ ۱۰۰ - ۱۵۰ بندوں سے

زیادہ کا نہیں ہے۔ نسیم امروہوی کے بھی چند مرثیوں کے علاوہ تقریباً ۱۰

مراثی ہیں سے کوئی بھی ۱۰۰ بندوں سے تجاوز نہیں کر سکا ہے۔ جمیل منگھڑی

نجمِ آندری، آلِ رضا، باقرامات خانی، شمیم کراچی، ڈاکٹر ویدیا اختر،

کا علامہ مرثیہ ترقی کے حال کا مرثیہ بھی اس سلسلے کا ایک اہم نمونہ ہے، لیکچر
مرثیہ چند سالوں میں جو شخصی مرثیے لکھے گئے ان میں اسلوب اصیل کے
اعتبار سے یہ نہیں بلکہ بحیثیت کے اعتبار سے بھی نامزد کیا ہے۔ مثلاً
ماں منار اترے کہ شخصی مرثیہ پانچواں ہیرا لہر، ڈاکٹر ذاکر حسین،
لال بہانہ شامری اور انور الدین علی احمد کے انتقال پر لکھوں کے نام سے جو
مرثیے لکھے گئے ان میں کچھ قابل توجہ ہیں۔

عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ دنیا کی قدیم زبانوں مصری، ہلانی،
یونانی، سنسکرت اور قدیم چینی میں بھی مرثیے کے آثار ملتے ہیں۔ اگر ترقی
میں جان لوگ نے بھی ایک مرثیہ کرلا کے واقعے سے متاثر ہو کر کہا ہے جس
میں تقریباً چار سو اشعار ہیں۔ یہ مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی
مقبولیت رکھتا ہے چنانچہ اس کا ترجمہ بلند درجہ پر ہے۔

”وحسین، ویندار، خطاب ست، فروغ، طیف اولے مثل بہانہ
تھا۔ صہ صہ صہ اور کوکوت کے واسطے نہیں لڑا بلکہ خدا پرستی کے جوش میں
یزید سے اس نے بیزار کیا اور اسلام اور دین محمدی کے خلاف تھا۔“

انگریزی زبان میں بھی پہلے ہندوستان کی میوس صدی کی مشہور
سیاسی رہنما اور شاعرہ مرویجیہ نامیڈ نے بھی واقعات کرلا کے موضوع
پر مرثیہ لکھا جو بہت مقبول ہوا اور اس کا منظوم ترجمہ بھی اردو کے کئی شاعروں
نے کیا ہے۔

ان زبانوں کے علاوہ میں جن زبانوں میں کرلا کے موضوع پر مرثیے
ملنے ہیں۔ ان میں فرانسیسی زبان بھی ہے۔ فرانس کا مشہور شاعر الیکزینڈر
جو فرانس کے چند بڑے ناز شعراء میں سے تھا اور جن کو فریج اکیڈمی سے
شاعری کا سب سے اعلیٰ اعزاز بھی ملا تھا، اس نے تقریباً ڈھائی ہزار مصرعوں
پر مشتمل ایک مرثیہ لکھا ہے۔ اس مرثیے کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ایک معصوم
بچے کی زبان سے حضرت علی المرتضیٰ کے حال میں لکھا گیا ہے۔ اس کا اردو
ترجمہ سید محمد حسین خونی نے کیا ہے اور پاکستان میں معصوموں کا ستارہ
(L'Étoile Des Enfants) کے نام سے شائع ہوا

ہے۔ مرثیے کے چوتھے ملاحظہ ہوں :

”علی المرتضیٰ شہر حاروں کے درخت شہزادے کے

تیری ہر ایک لہر ایت بھیجی ہے۔ ستاروں کو جو جگہ ملے ہیں۔“

آسمانی ستاروں کی لمبائیوں پر۔

قرصِ حسن کو حلقے میں ملے ہے۔

اسے ظلم و ستم کے شکار تیری لمبائی یا نہ تیرا کو۔ جن کے بعد تاریخ کے نامی
خسرو و شیروان دوسری طرف صلیب تک پہنچا ہے گراہی پر درخت سے اور بعد اقبال
باغدار۔ حضرت یحییٰ بن مسلم کی۔

علی مرتضیٰ، ڈاکٹر عیاد اعظمی، ڈاکٹر محمد حسین، سردار نقوی، یادو اعظمی
فیض احمد فیض، شوکت سہاڑی، ڈاکٹر قادر عباس، تہدی اعظمی، فیض بھٹوی
ہلال نقوی، حسین تہدی نقوی، قسم ابنی نسیم، سردوش مچل شہری، محمود حسن
قیمیر، امجد فاضل، کوثر مہندزنگہ سیدی، قاسم، فقیر تعمیر آبادی، تجرینی
علی حمید ہارم لہدی، کالی داس گپتا، عتہ، قمر فیض آبادی اور اہم مصنفین وغیرہ
کے بعد یہ مرثیہ ۵۰ سے ۱۲۵ ہندوں پر مشتمل ہیں۔

مرثیے کے جو بہتیت قدمائے مقرر کیا تھے وہ مناسب ترین تھی۔
اس لئے خود جدید کے مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کی بہتیت کو اپنانے رکھا
اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوشش نہیں کی۔ البتہ صرف تمکیل نظریئے بہتیت
کے سلسلے میں ایک تجزیہ پر مبنی ہے کہ یہ وہ کہ مرثیہ کے ہند کے تیسرے
مصرعے کو سادہ کر دیا جائے یا قافیہ کی پابندی نہیں رکھی۔ ان کے اس تجزیہ کے
سلسلے میں نقادوں کی رائے میں اختلاف ہے کہ وہ کہاں تک کام یاب
ہیں۔ بہر حال اس سلسلے میں غالباً ابھی کسی شاعر نے ان کی تقلید نہیں کی ہے۔
شاہد ان کا یہ تجربہ آگے چل کر کوئی دہرائے۔

اردو شاعری میں حب آزاد شاعری عالم وجود میں آئی اور آزاد
نظم و آزاد وزن کے نام سے تجربہ شروع ہوا۔ لیکن مرثیہ نگاروں نے آزاد
مرثیے بھی لکھنے کی طبع آزمائی کی، لیکن یہ کوشش آگے نہ بڑھ سکی۔ البتہ کچھ
آزاد مرثیے (شخصی) اب بھی لکھے جا رہے ہیں۔ جوش نے کچھ کر آزاد مرثیے
کی طرف توجہ نہیں کی کہ :

”یہ کوشش ان لوگوں کی ہے جو پابندی کے ساتھ کہنے کی طاقت نہیں
رکھتے اور دماغ کے کاہل ہیں۔“ (جدید مرثیے کے تین معاصرین، ۲۷)

جس طرح اردو ادب کے وہ مرثیہ جن کا موضوع کرلا نکلیات ہے۔
ان میں تبدیلیاں آئیں اور شعر و انقلاب سے دوچار ہوئے۔ ان کا جواب
آہنگ۔ زبان۔ معنوں۔ انداز۔ طرز ادا۔ اسلوب بیان وغیرہ وغیرہ
جدید ہند کے نقادوں سے ہم آہنگ ہوا اور جدید مرثیے نے جنم لیا۔ تقریباً
اسی طرح اردو کے شخصی مرثیوں نے بھی ایک کرکٹ فی۔ علائکہ شخصی مرثیوں میں
اس حد تک یہ تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی کرلا کے موضوع پر لکھے جانے والے
مرثیوں میں ہوئی۔ اردو میں شخصی مرثیوں کی اہمیت کا اقرار سب سے پہلے
حالی نے مرزا غالب کا مرثیہ کوکر کر با تھا جس کی نسبت نے جو کوکر لکھا ہے
وہ بھی قابل توجہ ہے۔ لیکن ان کا مزاج روحانی اور قدیم ہے۔

نصیر الدین کا مرثیہ اردو میں نے کوکر شخصی مرثیے میں تبدیلی پیدا کرنے
کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد نسیم صاحب نے ہی آقائے عین حکیم کا مرثیہ
کوکر کی کوشش کو آگے بڑھا یا اور مرثیے کے چہرے میں علامتے اسلام کی
تاریخ بیان کر کے اردو کے شعری سرمائے میں ایک اضافہ کیا ہے۔ نسیم بھٹی

میں کو خط لکھتے۔ جو سب سے بڑا، دانا اور کچھ ہے۔ (الہام سے
مقرر فرمایا۔)

کس طرح اس پر ہوتی ہے وہ لازماً توجہ سے لہوں تا باں ہے۔

تیسرے زمانے کے جو کہ پانچواں

تاریخ کی چند جہلی پر۔

تیری لوح کا سورج۔ اپنی آسمان پر۔ ناآشوب ہے۔

غروب سے ؟

بہر حال یہ مرثیہ کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر تھی اور مرثیہ کے ارتقا

کا وہ سفر جو حضرت آدم سے شروع ہو کر جدید مرثیہ کی منزل تک پہنچتا

ہے۔ وہ نہ یہ موضوع قرائد مخیم کتاب کا اقتضا نہ تھا ہے۔

آخر میں ہر صنف کے چند ممتاز جدید مرثیہ نگاروں کا جدید مرثیہ

کے سلسلے میں نقطہ نظر پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر عید اختر کہتے ہیں کہ ”میں جدید مرثیہ کی مائیں اردلان کی

تقلید میں لکھے جانے والے تمام انسانی سے نقطہ انحراف کی بنا پر الگ کرتا

ہوں۔ بیشتر جدید مرثیہ کی مکتبہ مسلم لیکن آج کا شعری محاورہ اور زبان دوسرے

فرزادہ کے متقاضی ہیں۔“ (مرثیہ صفحہ ۱۵)

ڈاکٹر پیام اعلیٰ نے جب ایک انٹرویو میں ان سے میں نے سوال

کیا تو فرمایا کہ جدید و قدیم کا کوئی خاص امتداد میرے ذہن میں نہیں ہے۔ ہر

قدیم اور جدید مرثیہ کی قدر و قیمت دیگر اہمیت ہے۔ اسلوب، علامتیں،

زبان اور طرز نگارش جیسے جیسے ہیں اور بدلے رہیں گے۔

سیّد الیٰ رضا کھنوی سے جب لاہور کے ایک پروفیسر نے جدید

مرثیہ کے سلسلے میں سوال کیا تو انہوں نے مندرجہ ذیل چار معرّوں میں جواب

دیا۔

فکر انگیز مواد کو تا ہے اکثر یہ خیال

درس آموزہ کتنی یہ عزائی تنظیم

مرثیہ کا یہ تفت اندہ ہے کہ مروج نہ ہو

شریت اور حقیقت کی رٹائی تنظیم

بیوس حدی کے شعروں میں سب سے زیادہ قدر میں مرثیہ لکھنے

والے شاعر صاحب سیم اور بیوسے جب جدید مرثیہ کے بارے میں سوال کیا

گیا تو انہوں نے فرمایا کہ،

”جدید مرثیہ وہ ہے جس میں شعری طور پر افلاک نیت کے مختلف

پہلوں کا اندازہ سے بیان کئے جائیں جو سانس کے دل میں تپتی کا دلولہ بیارگیں۔

اس کے علاوہ فلسفہ اصناف نے ذہنوں میں تجسس، تحقیق اور غفلت کو نظر

کی جو صلاحت پہنچا ہے اس کی تسکین کا موجب ہوا اور جس سے یہ عکس

ہو گیا کہ مرثیہ ہے۔ علم نہیں۔“ (جدید مرثیہ کے مبن معمار صفحہ ۳۳)

اور یہی سوال حب بلال کھنوی نے شاعر انقلاب حضرت جبرئیل

سچ آزادی سے کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ،

”جو مرثیہ تپتی محبت پر اجمار ہے وہ جدید ہے اور وہ فریج برائے

ضمیمہ ہرگز اجمارے چاہے اس کو جدید نہیں لکھا جائے، لیکن وہ قدیم

مرثیہ ہی کہلایا جائے گا۔“ (جدید مرثیہ کے مبن معمار صفحہ ۳۳)

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قدیم مرثیہ کی اہمیت و عظمت

اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن مرثیہ کا جدید عہد کے تقاضوں اور جدید عہد کے سامعین

سے جذباتی اور فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں مرثیہ کی افادیت

پر شدید مرثیہ۔ آج کی بات کل نہیں کہی جاسکتی تھی، اس لئے ان میں پناہ ہے

کہ مرثیہ میں آئیں و تیسرے کے بعد بھی اضافہ ہوا ہے۔

ملاحظات

۲۔ کرڈ سے لے کر ۲۵ کرڈ کام کے دن ہیا کیے جائیں گے۔

روزگار کا قوی دیوی پروگرام پہلے کام کے لیے اناج کے نام سے

موسم تھا اور یہ ۷۸-۱۹۷۷ء میں شروع کیا گیا تھا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء

کے دوران ۲، ۱۲، ۱۶ کرڈ روپے جاری کیے گئے اور ۷۸ لاکھ ۲۰

ہزار کام کے دن فراہم کیے گئے۔ گزشتہ برس ۱۶۹، ۱۶۹ کرڈ روپے جاری

کیے گئے تھے۔

اس پروگرام کے تحت اب تک ایک ارب ستر کروڑ کام کے دن

ہیا کیے جا چکے ہیں۔

مشعل آزادی (حصہ اول)

حم سے حلق چکیئے
برنس منیج

پبلیکیشنز ڈویژن

پیالہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

امیر خسرو دہلوی کے سفر

انسانی زندگی میں سفر کی ابتداء تو اسی روز سے ہو جاتی تھی جب انسان عالم وجود میں آیا۔ خواہ وہ تلاش معاش تھی یا بہتر زندگی کے لیے۔ جو یا بعد ازاں اقلتار کی ہو جس۔ رفتہ رفتہ جب انسان جنگل و صحرا کی وسعتوں سے قبیلوں میں تقسیم ہوا اور بتدریج عروج حاصل کر کے شہر و دیں پناہ گزین ہوا تو بہت سے افراد سیاحت، تحصیل علم، تلاش معاش، زیارت مقامات مقدسہ اور تجارتی مقاصد کے تحت سفر کرنے لگے۔

ان افراد میں سے جن اصحاب نے اپنے ان سفروں کے حالات کا ذکر خواہ سفر نامہ کی صورت میں یا کسی واقعہ کی شکل سے کر بیان کیا ان سے کافی معلومات فراہم ہوتی ہیں جو بصیرت افروز اور جربہ ناک واقعات کا پتہ دیتی ہیں۔ تخلیقی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ سفر نامے لطف و انبساط کا سبب بنتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ ہی دنیا کی دیگر اقوام، دستاویزات، جغرافیائی کیفیات اور تمدن و ادب سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باعث ہی دل و دماغ میں وسعت و کشادگی پیدا ہوتی ہے اور تعصب و تنگدلی کی تاریکیوں سے نجات ملتی ہے۔

دنیا میں سفر ناموں یا ان یادداشتوں کو قلمبند کرنے کی شروعات کہاں سے ہوئی یہ تو حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا تاہم بیشتر محققین اس امر پر متفق ہیں کہ چونکہ ہندوستان اور یونان کی معاشرتی زندگی کا شمار دنیا کی نہایت قدیم تہذیبوں میں ہوتا ہے اور ہندوستان میں دوسری اقوام کے بیشتر سیاح آئے اور انھوں نے اس کا ذکر اپنے سفر ناموں میں کیا یا لکھا۔ اس کے برعکس خود ہندوستانی سیاحوں

یونانیوں کو سیاحت کا بے حد شوق رہا۔ ہر یونانی سیاح ہیرودوٹس (Herodotus) کو اولین سفر نامہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ ابتدا میں سفر کی روداد قصوں کی صورت میں بیان کی جاتی تھی۔ لیکن سیدہ بر سیدہ پہنچے پہنچے ان میں اکثر واقعات کی صورت سے رخ چو جائی تھی اور یہاں تک کہ اس کی حیثیت اساطیر و قصص کی بن کر رہ جاتی تھی۔ شیلے (Shelley) جو سفر ناموں کے موضوعات کا ماہر تسلیم کیا گیا ہے سفر ناموں کی ابتدائی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”سفری داستانوں میں سکندر، سند باداد

اورطس (Aristotle) کی داستانوں کو ٹھیکہ اہمیت

حاصل ہے۔“

لیکن اس کے ساتھ اگر امیر خسرو، داستان عمر حیدر اور قصہ چار درویش کا بھی ذکر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دیگر مذاہب و اقسام کی مانند اسلام میں بھی سفر کی اجابت خاص مقام رکھتی ہے۔ قدیم زمانہ میں سفر کے درمیان سیاحوں کو مختلف قسم کی دشواریاں اور جانی مالی نقصان کے خطرات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس بنا پر مسافر عربی سے اچھے سلوک اور روئے کی اخلاقاً تائید کی گئی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے سفر میں مذہبی رسومات کی افادیت کے لیے بھی خاص مراعات دی گئی ہیں مثلاً روزہ کا التزام نہیں اور سفر میں نماز کسر کا حکم ہے۔ سیاح کے ساتھ ہمدردی اور ہمدان فواری کی نصیحت کی گئی ہے۔ سندی نے کیا خوب کہا ہے۔

غریب آشنا باش سیاح دوست کہ سیاح حجاب نام بخوست
 عربوں میں سب سے پہلا سیاح سلطان تاجر تھا جس کا سفر نامہ "مسئلۃ التواریخ" نام سے مشہور ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے مشہور سیاح ابوالسقاء ابراہیم، ابودیمان البیرونی، ابن بطوطہ وغیرہ ہیں ان میں سے بیشتر سیاح ہندوستان آئے۔ کیونکہ اس برصغیر کے تعلقات تجارتی نقطہ نظر سے عربوں سے قدیم زمانہ سے ہی قائم تھے۔ البیرونی نے مختلف علوم پر ایک سو بارہ کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کا نام "الہند" ہے جس میں ہندوستان کے رسم و رواج کو قلمبند کر کے گیارہویں صدی عیسوی کے سیاسی اور سماجی ہندوستان کی تصویر دکھائی ہے۔ ابن بطوطہ نے چودہویں صدی عیسوی میں اس برصغیر کا سفر کیا تھا اس نے بھی اس دور کی تہذیب و معاشرتی زندگی کی عکاسی اپنے سفر نامے میں کی ہے۔ اس کے سفر نامے سے تاریخ کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جن پر دیگر مورخین کی نظریں نہ پڑیں۔

ایران کے جن سیاحوں نے اپنی سیاحت کی روداد کو سفر نامہ یا کسی دیگر شکل میں قلمبند کیا ہے ان میں ناصر خسرو، قبادیانی اور شیخ سعدی شیرازی کے نام سرفہرست ہیں۔ سفر نامہ ناصر خسرو فارسی ادب و تاریخ میں اہم مقام کا حامل ہے جس سے اس دور کے مختلف مقامات کی مسافت، آب و ہوا، تہذیب و تمدن، رسوم و آداب علمی معیار اور وہاں کے لوگوں کی بود و باش کا ذکر ملتا ہے۔

مشرقی دنیا کے بیشتر سیاحوں کے مقاصد عموماً زیارت، تجارت تحصیل علم یا جنگ و جدال میں بادشاہ یا امراء کی ہجرا بی یا تلاش معاش تھے۔ سعدی شیرازی کی سیاحت کا مقصد جہاں دیگر ممالک کی مسافرت تھی ان تحصیل علم کا جذبہ بھی غالب تھا۔ ان ممالک کی سیاحت کے دوران انھوں نے وہاں کی تہذیب و تمدن کو کچھ اوردان اسفار سے جو تجربات حاصل کیے ان کو قصیدہ داستانوں کی شکل میں نگستان

دوہستان میں درج کیا۔ الغرض بہت سے مورخین، علماء و فضلاء اور شعراء کو بادشاہوں یا امراء کے ہمراہ دور دراز کے سفروں میں شریک ہونا پڑا تھا، لہذا سفر کی صورتوں اور دیگر کیفیات کو ان افراد نے منظوم و منثور شکل میں بیان کیا ہے۔ سیاحوں کے اس ذمے میں امیر خسرو دہلوی بھی شریک ہیں۔ درحالیکہ انھوں نے ان اسفار کے واقعات کو مرتب کر کے کوئی سفر نامہ سپرد قلم نہیں کیا لیکن ان کے اسفار کا مفصل ذکر خواہ وہ بے ترتیب ہے مختلف شعروں و دیگر شہ پاروں میں جیسے عجاۂ خسروی، دیباچہ تحفۃ العنصر، دیباچہ غرۃ الہماں وغیرہ میں دستیاب ہے۔ ان سب کا اگر مطالعہ کیا جائے تو تقریباً وہ منہام معلومات فراہم ہوتی ہیں جن کا ایک سیاح اپنے سفر نامے میں ذکر کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس دور کا ہندوستان بڑا سہ سہائی، سماجی اور تہذیبی شکل سامنے آجاتی ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں کی حالت، ان کے باشندوں کی وضع و قطع، آداب و رسوم اور مذاہب و باغات کا ذکر ان شہ پاروں میں پر تفصیل ملتا ہے۔ حالانکہ امیر خسرو نے شیخ شیرازی کی مانند خارج از ملک سفر نہیں کیے تاہم ان ہی سفروں میں ان کی نصف زندگی گزر گئی۔ ان کے ان اسفار کا جائزہ پیش ہے جن سے متعلق خود امیر خسرو نے اپنی مختلف تصانیف، ان کے معصروں اور دیگر اہل علم نے اشارہ کیا ہے۔

جب امیر خسرو کی ۲۰ سال کی ہوئی اور وہ شاعری کے میدان میں اپنے قدم جما رہے تھے تو ان کے سسر پرست سردار عماد الملک کا سایہ عاطفت ان کے اٹھ گیا جس کے سبب انھیں تحصیل معاش کے لیے مرنی و میر پرست کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایک جوتو کے بعد انھوں نے اس دور کے بہت سخی و سخن شناس، شاعر نواز سردار ملک کشلی خاں کے دربار سے اپنے دامن وابستہ کیا۔ اس کا دربار ان کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور امیر خسرو ہر اس کا لطف خاص تھا۔ امیر خسرو نے بھی اس کی مدح میں کئی قصیدے کہے ایک قصیدہ میں مدح کا التزام اس طرح ہے۔

بودہ نہاں آن آفتاب آن دم کہ صبح
 ہمدی بیاد منبر بو نمود
 صبح ارقم کہ خورشید کجا ست
 آسماں رے ملک مجبو نمود

لیکن امیر خسرو اس کے دربار سے طویل عرصے کے لیے متصل نہ رہے جس کا سبب یہ تھا کہ ایک روز بلین کے چھوٹے لڑکے بغرا خاں، حاکم سامانے کشلی خاں کی محفل میں خسرو کے کلام سے محفوظ ہو کر

بیش بہا انعام و اکرام سے نوازا مگر یہ بات کشتی حان کو ناگوار گذری۔
اس واقعہ کو امیر خسرو نے دیباچہ غزوة الکمال میں اس طرح تحریر کیا ہے۔

”مناوروزی شاہزادہ خورد و بزرخاں بزرگی منہ رمود

در عافیت خان معظم کشتی حان کہ این مہ بود جہان آمد بہا نسب

کہ از مشرت ایشان درام دور سلطان میرسد... بہا نسب الدین

دیر و قاضی شیر براش در آن قرآن السعدین و اجتماع نیز تری

... از آن طرف دو گانہ گزشت حتی چونکہ کردہ ازین جانب

میں بندہ در ہر چہا گئی کوس ہزار گانہ سخن چاں میزد کہ ایشان

را زینت نمیدانم... بسکہ طوائف سفر بغرا خانرا ہزار ہزار افتاد

از آن نواہا کہ در خورد و بادشاہی باشد کہ بیچ بہا ز سکہ و

سفید بھڑائی فرمود پیش من آمد مذکہ کہ این محتاج بغرا نیست

... خان مادر مزاج بغایت بخور بود و اثر تفریر بر بشرہ او

ظاہر گشت من بندہ در یافتہ ہزار ہردی در آمد در خاند

نمیش راہ نداد و فرمود روزی بگذشتہ ہنوز از خاطر شگد شستہ

بوز خواست کہ مرافقاند ہا سازند و کبھی زن خیال انسہم در

دل بگذشتہ در دم خستہ شد چون تیر بچم جلدہ کردم... لہ

یہاں سے فرار ہونے کے بعد امیر خسرو سامانہ، بغرا کے دربار

میں پہنچے یہاں کا پہلا سفر تھا جو ۷۸۵ھ میں پیش آیا اس دور میں سامانہ

کو فوجی اعتبار سے خاص اہمیت حاصل تھی اور یہ امتنان کے بعد دوسرا

اہم سرحدی مقام تھا۔

بغراخان پہلے ہی سے ان کے ہنر و کمال کا دلدادہ تھا۔ اس نے

بڑے جوش و خروش سے ان کا تیر مقدم کیا۔ امیر خسرو کی موجودگی کے سبب

وہاں کی شہری رضا میں چارچاند لگ گئے۔ لیکن یہاں آئے زیادہ عرصہ

نہ گذرا تھا کہ طفل بلبل کی بناوٹ کے باعث بلبل نے بغراخان کو دہلی

بلایا۔ چونکہ کھنوی میں طفل بلبل کی بناوٹ کے باعث بلبل نے بغراخان کو دہلی

چکا تھا اس لیے بلبل بہت زنجیرہ خاطر تھا اور بناوٹ کی فرو نشانی

کے لیے وہ خود جا رہا تھا۔ بغراخان مع خسرو دیگر اصحاب ہنر و فن دہلی

پہنچا۔ اس وقت برسات کا موسم تھا بلبل نے اسی خراب موسم میں شکر

کو کوچ کرنے کا حکم صادر کیا۔ درحالیکہ شراب موسم کے سبب امراء و وزراء

لے اسے روکنے کی بھی کوشش کی مگر نا کامیاب رہے۔ امیر خسرو نے بھی

بڑا خواستہ بغراخان کے ہمراہ کھنوی کی جانب رخ کیا اس سفر میں

ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ نہ گذر گیا۔ اس سفر کے متعلق دیباچہ

غزوة الکمال میں بیان کیا ہے کہ:

”نما گاہ اعلام اعلیٰ از دارالملک دہلی و دارالمرست

کھنوی عزم بزرگرمود۔ دہلی کے آداب شہر زمین قطع کن

موسے دہلی کے شہر کی رائدہ... بااستمداد بی اہل و حضرت

چراغانی کی جہان پیوست ملت یکساں الہی بوم۔ ہنوز راہ را

مقطع نمود... لہ

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفر کی وہ سہولتیں، جو آج

دستیاب ہیں جن کی مرصع و زخار کے باعث انسان سفر کی مسافت کا

قیاس نہیں کر سکتا اس دور میں وہاں تھیں۔ بہر حال یہ لشکر شاہی اپنی

منزل مقصود پر پہنچا۔ بلبل نے طفل بلبل کی بناوٹ کو فرود کر دیا اس

یورش میں طفل بلبل مارا گیا۔ بقیہ بلبلوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

قبل از واپسی بلبل نے بغراخان کو بنگال کا حاکم مقرر کیا۔ جس کے باعث

بغراخان کے ہمراہ سامانہ سے آئے اصحاب ہنر و فن جن میں شمس الدین

دبیر اور قاضی شیر قابل ذکر ہیں، وہیں قیام پذیر ہوئے لیکن امیر خسرو

کو یہ جگہ راس نہ آئی اور بغراخان سے روانہ کی گئی خواہش ظاہر کی۔ اگرچہ

بغراخان نے شمس الدین دیر کے توسط سے انھیں روکنا چاہا لیکن وہ

اس پر آمادہ نہ ہوئے انھوں نے بغراخان سے غدر خواہی کرنا بھی لشکر

کے ہمراہ دہلی کا رخ کیا۔ جب یہ کارواں شہر سے باہر آیا تو خسرو نے یہ

محسوس کیا کہ وہ حضرت یوسف کی مانند کنوئیں سے نکال دیے گئے ہوں۔

یہ کارواں تقریباً ۷۸۵ھ میں دہلی واپس پہنچا۔ اس وقت تک دہلی

میں فتح کی خبر پہنچ چکی تھی جس کے باعث کھر کھر پیش و طرب کی غلغلیں

قریب دی جا رہی تھیں۔

اس موقع پر سلطان بلبل کا سب سے بڑا الزام شہزادہ محمد

حاکم ملتان، باپ کی شاندار فتح پر مبارکباد دینے کی غرض سے مخالف

کے گرد دہلی پہنچا۔ یہ شہزادہ بہادری، شرافت مندی اور دریا دلی میں

بلے مثل تھا وہ حمام اوصاف جوکر شاہی خاندان کے خرد سے متوقع ہوتے

ہیں اس میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ آداب مجلس کا اتنا پاس رکھتا

تھا کہ اگر کبھی دربار میں مسلسل کئی گھنٹے تک بھی بیٹھا بیٹھا تو آواز نہ ہلتا

تھا۔ بزرگوں اور عاملوں کے بے حد تعذر و منزلت کرتا وہاں سے بہت

ادب و احترام سے پہنچتا۔

اس دور تک امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ شہزادہ محمد تک

بھی پہنچ چکا تھا جب وہ دہلی میں مقیم ہوا تو اس نے امیر خسرو کا

لہ دیباچہ غزوة الکمال ص ۴۲

لہ دیباچہ غزوة الکمال ص ۴۱

کامیاب اور بہت محفوظ ہوا اس بنا پر ان کو اپنا مذہم خاص بنا یا۔ جب سلطان کوردان ہوا تو خسرو کے ساتھ حسن کو بھی ہمراہ کر لیا۔ امیر خسرو معصنہ اور حسن ہجری دو اتار مقرر ہوئے۔ ایک کچھ عرصہ بعد شہزادہ محمد کے ہم کاب اس تاریخی شہر میں داخل ہوئے اور باج سال بکاشت ان دونوں علیحدہ علیحدہ شہر ان کے شہزادہ کی بزم کو اپنی سخن آرازیوں سے بہت ہی پُر رونق بنائے رکھا۔

پانچ سال دیگر درج آب لستان را از بخور طائف

فانی آب دادم ۲ لہ

شہزادہ محمدی امیر خسرو کو طرح کی عنایات سے نوازتا رہا۔ لیکن خسرو کو دہلی کی بادشاہی مستقل سنائی نہ رہی۔ ان کے لیے دہلی قبۃ الاسلام تھا ایک جنت تھی جس پر کسی دوسری جگہ کو ترجیح نہ دے سکے تھے۔ خصوصاً انھیں اس قبۃ الاسلام کی یاد اس وقت سنائی ہوگی جب وہ شہزادہ محمد کے ساتھ سفر کے دوران دشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوں گے یا جب شہزادہ انھیں قلعہ میں ہی چھوڑ کر اپنی ہم پر چلا جاتا ہوگا اور وہ اس قلعہ کے انہی باشندوں میں ابھیں جن پر کرہ جاتے ہوں گے تاہم اس کیفیت کا بیان انھوں نے ایک خط جو اختیار الدین کو لکھا ہے اور دیا پتہ تحفۃ الصغریٰ میں درج کیا ہے۔ اس بیان سے وہاں کی جغرافیائی حالت اس دور کا لٹان اور صدی علاقوں کی فوجی نقطہ نظر سے اہمیت معلوم ہوتی ہے اس دور میں وہاں کے باشندوں کی وضع قطع کا اندازہ ہوتا ہے۔ وحید مرزا نے اس خط کو ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

”ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۃ اسلام تھا جو بہت اعلیٰ کے بادشاہوں کا قبلہ ہے یعنی وہ دہلی جو بشیر و آسمان ہے اور روئے زمین پر بہشت بریں کا ایک ٹکڑا ہے.... اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا زجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں مل پاتی.... اس کے باغات میں تماشاخیوں کا جرم جس میں سے ہر ایک لالہ رخسار بنا گوش کو وہ جگہ دکھ کر کان کے تیروں کی آب کو بھی ماند کر دے۔ دن سیر و گشتے میں اور رات ایک محبوب کی محبت میں بسر ہوتی تھی۔ شاید اس گشتاں کے لیے میرا وجود باہر تھا کہ نقد میرے لیے اس خاں خاں میں لاکر مقید کر دیا ہے قلعہ کیا ہے ایک دیکھا ہوا تنور ہے

یہ دشمنوں اور جنگلیوں سے مملو مہیے کوئی دہرانہ، اس قلعہ میں انھوں نے بستی ہے نہیں بلکہ مردم گیر دیووں کی اس لیے کہ ان کے غروں سے دیو بھی خوف زدہ ہو کر نالہ و بکا کرنے لگتے ہیں، امر کیا ہیں معلوم ہوتا ہے بڑے بڑے بوسے بوسے سے بھرے ہوتے اور ڈار میوں کی یہ کیفیت کہ جلاہوں کے برش معلوم ہوتے ہیں.... زبانیں ایسی کند جیسے خاند ساز تیر اور الفاظ ایسے سخت کہ جیسے مغبیق

سے پھر بکل رہے ہوں ۳ لہ

اس کیفیت سے بیزار ہو کر کہتے ہیں ۴

منٹھے سخت است تنہا ماندن از دلدار خویش

با کہ گویم حال تنہا ماندن دشوار خویش

آن کہ روزی ناوی خورده است اودا نہ کہ پیست

درد مہجوری کہ نالہ از دل انگار خویش

مردہ را حسرت ز مردن نیست ہست بہر ایک

بازی بند نہ دہم صحتاں دیدار خویش

اگرچہ شہزادہ محمد کی سہی و کاوش کے باعث لٹان میں امیر خسرو کو زندگی کی تمام ضروریات فراہم تھیں مزید یہ کہ ہم نہ صرف حسن ہجری بھی ان کے ساتھ تھے اور دونوں اپنے شیروں کا کام سے شہزادہ کو محفوظ کرتے تھے۔ اس دور میں امیر خسرو کی بعضی جہتی آفاقی شہرت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب شہزادہ محمد نے دومرتبہ شہنشاہی کو اپنے دربار میں آنے کو مدعو کیا اور اس غرض کیلئے غفلت کے ساتھ اخراج راہ روانہ کیے مگر شہنشاہ نے پہلی ہی جگہ سے اس کی مگر یہ بھی مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا امیر خسرو کی تربیت اور سرپرستی کی جائے۔

امیر خسرو کے قیام لٹان کے دوران میں اس کا ایک عجیب واقعہ صاحب تباریخ فرشتہ نے ذکر کیا ہے انھوں نے خسرو اور حسن کے عشق حقیقی کا ایزد قرار دیا ہے۔ مختصر بیان یہ کہ جب یہ دونوں اہل سخن شہزادہ کے ہمراہ لٹان پہنچے تو ان کے تعلقات میں مزید قرب ہوا جس کے سبب وہ لوگوں کی نظروں میں ٹپکنے لگے۔ شہزادہ نے بھی اسے مشتہ نظر دیا سے دیکھا چنانچہ اس نے حسن کو منع کر دیا کہ امیر خسرو سے اجتناب کریں مگر حسن نے اس کے باوجود ملنا ترک نہ کیا اس حکم عدولی کی بنا پر شہزادہ نے حسن کو تازیانے لگانے کا حکم دیا خسرو

لہ امیر خسرو وحید مرزا ص ۶۸۶

لہ دیباچہ غرۃ الکمال ص ۴۳

کو بھی ہوا گیا اس کے بعد جب خسرو نے اپنی آستین پٹ کر دکھائی تو
کوڑوں کے نشان ان کے بازو پر بھی تھے اس پر انھوں نے جڑت
یہ مصرعہ پڑھا۔ ج

گواہ عاشق صادق در آستین باشد

(اب اس مصرعہ کی حیثیت ضرب المثل کی ہے) اس پر شہزادہ
نے ان کے والدانہ جذبہ عشق کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد خسرو نے ملازمت
سے مستعفی ہونے کی خواہش ظاہر کی جسے شہزادہ نے نامنظور کر دیا۔
اس واقعہ کے متعلق مؤرخین و محققین کی رائے میں اختلاف ہے۔ مزید
یہ کہ دونوں شاعروں کے کام کا مطالعہ کیا جائے تو اندرونی شواہد بھی
اس واقعہ کے متعلق خاموش ہیں۔

امیر خسرو کا زمانہ سے واپس آنا ایک بہت ہی افسوسناک
واقعہ کا سبب تھا جس کا ذکر انھوں نے بھی کیا ہے اور دیگر ہم عصر مؤرخین
نے بھی۔ تقریباً ۵۷۵ھ میں تاتاریوں کا سردار تئو خاں یا اقتر خاں
۲۰ ہزار لاکھ لشکر لے کر لاہور اور دیپالپور کو تہ والا و قارت کرنا ہوا۔ انھوں
کی جانب بڑھا شہزادہ محمد نے زمانہ سے باہر تئو خاں کو شکست
دی لیکن چونکہ اس نے فطری نماز ادا نہیں کی تھی وہیں تالاب کے
کنارے پاؤں (۵۰۰) آدمیوں کے ساتھ بازگاہ لہزدی میں سر بسجود
ہوا۔ دشمن نے شہزادہ کو مع سپاہ ہمارہیں مشغول دیکھ کر موقع سے
فائدہ اٹھایا اور گھات میں بیٹھے دو ہزار سپاہ کے ساتھ حملہ کیا شہزادہ
نماز ادا کر اپنی سپاہ کو کھینچ کر تاتاریوں کے مقابلہ پر آ گیا مگر پھر
بابار ان کو شکستیں دیں لیکن اتفاق سے ایک تیرا کر شہزادہ کے لگ
اور وہ زخم کھد کر وہیں شہید ہو گیا جس سے ہندوستانی فوج کے اہل
اکھڑ گئے۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور سینکڑوں ہندو بنائے گئے۔
ان میں خسرو و حسن بھی شامل تھے جب خسرو کو قید کر لیا گیا تو انھیں ایک
گرمیہ منظر منسل کے خوالہ کر دیا گیا جو خود تو گھوڑے پر سوار تھا اور خسرو کو
تشدید و برہنہ پائے دردی سے پیادہ گھسیٹ کر اپنے ساتھ لے جا رہا
تھا اس کے باعث ان کے سپروں میں زخم پڑ گئے۔ خود فرماتے ہیں

اسیر شتم و از بسم آل کہ خون ریزد

نمی ماند ز خون در تن خیف و نزار

چوں بی آب سر و پای دودیم و چو حباب

هزار آبلہ دریا ز رفتن بسیار

امیر خسرو کتنا عرصہ قید رہے یہ امر بھی اختلاف رائے رکھتا
ہے صاحب تذکرہ خزانہ حاکم کے مطابق وہ دو سال قید میں رہے
اور انھیں بچے جایا گیا۔ لکھتے ہیں،

آنک کل نئی دہلی

”کفار تبار بر سرلمان تاختہ در سنہ اربع و ثمانین
و شتان سلطان محمد را شہید ساختند و امیر خسرو را اسیر کر گھ
بہنچ بر بند بعد دو سال رہائی یافتہ بخد مت سلطان بلہین
آمد“۔ ل

اس کے برخلاف خود شاعر نے غزۃ الکمال میں لکھا ہے:

”در آن کا فون بلا مرا نیز رشہ کا فرائی گھو گیسر

شدما چون خدائی تعالیٰ رشہ عمرم دراز دادہ بود غلامی یافتم

و آن شہرہ بلا را لازم“۔ ل

اسی طرح امیر خسرو نے شہنوی خضر خان دول رانی میں اس سر
طرح ذکر کیا ہے (ترجمہ در حید مرزا)

”ان دونوں جب میں گناہ گار بندہ اب سے دوزخوں

کی قید میں گرفتار تھا تو ریختن میں سرگرداں جلا جا رہا

تھا اور گرمی کی شدت سے جوش کھائی دیگ کی مانند ابل رہا

تھا۔ چلتے چلتے میں اور میرا مثل ساتھی دونوں پیاسے

راستے میں ایک شے پر پہنچے اگر یہ میرا حق پیاس اور گرمی

سے بچک رہا تھا مگر اس سلاطی ہوئی آگ پر میں نے خیل

ڈالنا مناسب نہ سمجھا اس لیے ذرا سے پانی سے لب ترکریے

جس سے دل اور جگر میں ٹھنڈک پیدا ہوئی مگر اس پیاسے

سوار اور اس سے زیادہ پیاسے گھوڑے نے خوب سیر ہو کر

پانی پیا اور اتنا پیاکر جلدی ہی دونوں گر کر ہلاک ہو گئے۔ ل

رہائی کے بعد امیر خسرو اہل مٹان پہنچے جہاں سے دہلی آئے۔ وہاں
اس افسوسناک خبر کی وجہ کبرام بنیا ہوا تھا امیر خسرو نے جب اپنا متعلق
مرثیہ پڑھا تو لوگ زاد و قطار روئے گئے مگر گھر میں اس مرثیہ کے اشعار
لوگ پڑھتے اور اپنے مقتول عزیزوں کا لہو کرتے۔ اس مرثیہ کے چن
اشعار پیش ہیں۔

واقعہ است ایں بلا از آسمان آمدید بد

آفت است ایں قیامت در جہاں آمدید بد

راہ در ہستیا د عالم داد سبیل فتنہ را

دخستہ کا سال در ہندوستان آمدید بد

لہ خزانہ عامرہ بگلری ص ۲۱۰

لہ دیباچہ غزۃ الکمال ص ۴۳

لہ امیر خسرو و حید مرزا ص ۸۱، ۸۲

مجلس یاران پریشان شد جو برکت محل زیاد

برگ ریزی گوئی اندر بوستان امید

اگرچہ پورا مضمین بہت طویل ہے اور جنگ کے تمام واقعات

سلک کلم میں پروردے گئے ہیں، اسی صدمے سے ۳۵۵ء میں سلطان

خیاث الدین ملین کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا اس کی وفات کے بعد

اس کی وصیت کے برعکس امرار بالخصوص ملک نظام الدین نے

بغراقاں کے لڑکے کی قیادت کو تخت سلطنت پر چمکن کر دیا۔ خسرو اس

وقت پٹیاں میں تھے کہ قباد نے خسرو کو دربار میں بلوایا اور شاہید پہلا

موقع تھا کہ انھیں شاہی دربار میں آنے کی دعوت کی تھی لیکن خسرو

اس کے وزیر نظام الدین بابرک سے خوفزدہ تھے اس کی ناشائستہ

حرکتیں ان کے سامنے تھیں۔ اس کے علاوہ اسی اثناء میں انھوں نے

ملک امیر علی سر جاندار معروف حاتم خاں سے اپنے مراسم میں اضافہ کر لیا

اداس سردار کی خواہش پر اس کے دربار سے خود کو واپس کر لیا۔ خسرو

کا یہ مرنی در حقیقت دادوستاد دینے میں حاتم طائی سے کسی طرح

کم نہ تھا۔ اس نے خسرو کو ہر طرح کے لطف و کرم سے نوازا وہ اس امیر کے

ہی دربار سے وابستہ تھے کہ بغراقاں مع فوج کے کی قیادت و گوراہہ

پر لانے کے لیے کھنوسے سے روانہ ہوا اور کھنوسہ کی خیل سے کہ باپ

سلطنت کی طبع میں مع فوج کے آ رہا ہے وہ بھی فوج لے کر آگے بڑھا۔

دووں سر جوئی کے کناروں پر دو سردوے مگر بعض فہمیدہ سرداروں

کی دخل اندازی سے آپسی شکاک دور ہوئے اور دونوں کے اتصال کی

تقریب کا سامان انہی کو پہنچا اس موقع پر خسرو بھی اپنے مرنی کے

بہرہ اس واقعہ کے چشم دید شاہد تھے۔ اس موقع اتصال پر امیر خسرو

کی ملاقات ان کے پرانے دوستوں و عزیزوں سے ہوئی جنہیں بالخصوص

شمس الدین و میر قاضی اثیر اور حسن بخاری قابل ذکر ہیں۔ اس تقریب

کے بعد جب شاہی لشکر دہلی کی طرف روانہ ہوا تو کیتقباد نے تیز پہنچ

کر امیر علی سر جاندار کو ادودھ کا حکم قرار دیا اس کا ذکر امیر خسرو نے

شعری قرآن السعدین میں اس طرح کیا ہے۔

خان جہاں حاتم مخلص نواز گشت بہ اقطاع ادودھ سرفراز

من کہ بدیم چاکر افیش ازان کردیم آہن کہ بہ پیش ازان

مازچنان بخشش خاطر زیب بنوہ سرہ لازم آن رکیب

دراودھ از بخشش اوقات دوسال بخشیم و نال نبوار مشال

اس میں اول امیر علی سر جاندار کو حکام ادودھ بنانے کا ذکر پھر

ادودھ تک پہنچنے کے دو ماہ کا طویل سفر کا بیان ہے۔ اس شعری میں

انھوں نے شہر ادودھ کی تصویر کو شعری پیرایہ بنائے اس شعری میں

سے کچھ اشارے ملاحظہ ہوں۔

باشکرتا کویچ بر کوچ در گریہ نمی شد م بہر کوچ

تا بلند دو ماہ از رہ دور آمد بہ ادودھ سپاہ منصور

سلطان نظری بہ لطف بخشاد و اقطاع ادودھ بخان ماداد

شہر ادودھ سے متعلق

شہری! وہ شہر! باغی دل جمع بہ کستہ رین فراغی

پیرایہ گری زمین بلاشش پروانہ وہ طرب سوداشش

باشندوں سے متعلق

سک ہم مردمان و لجوی خوش خاطر خوش مزاج و خوش خو

از کسب و تجارت و فن خویش آسودہ بہ منم دچہ درویش

لیکن امیر خسرو اس وصف پر شہر میں اس سختی سردار کی غیبتوں

و فوازشوں کے باوجود بیزار رہے ان کو اپنے قید اسلام اور وہاں مقیم

اعز واقرا خصوصاً ماں کی یاد نے طویل عرصہ گھبرائے نہ دیا اور مذکورہ

بالا اشارے کے مطابق وہ وہاں دو سال رہے اور بالآخر اپنی اس کیفیت

کا عریضہ لکھ کر خاں جہاں کو پیش کیا اور اجازت پیلے پیر دہلی کی پہنچ

ماں سے مل کر بے حد خوش و خرم ہوئے اور آنسو بہاتے ہوئے لکھے ہیں۔

مادرم آن خسہ تیار من چون نظر فلکند بہ دیدار من

پردہ زوے شفقت برگرفت اشک فشان بہ برہم در گرفت

اس سفر کے بعد خسرو مسلسل دربار شاہی سے وابستہ رہے اور

بادشاہوں کے ہمراہ ہی تقریباً فوجی مہموں پر جاتے رہتے۔

جب امیر خسرو ادودھ سے دہلی آئے تو ابھی کچھ روز ہی گزرے تھے

کہ کیتقباد نے حاجب کوچ کر انھیں دربار میں بلایا اور اپنا ندیم خاص بنایا

اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کے والد کی ملاقات کی تقریب

کا حال سحر جانی سے نظم کریں خسرو اس کے متعلق قرآن السعدین

میں لکھتے ہیں

گفت چنان بایدم لے سحر سنج کز پے من روے نہ بچد ز رنج

جسم سخن را بہ ہنر جان دہی شرح ملاقات دو سلطان دہی

نظم کنی جملہ بہ سحر زبان قصہ من با پدر مہر بان

لے فرقانامہ مخطوط سلیمانیہ لاہوری نمبر ۳۹۱ ص ۴۶

ستمبر ۲۱۹۸

لے قرآن السعدین ص ۵۰ مطبع علی گڑھ

آج کل نئی دہلی

جا اگر جمہور در آرد زبائے آیدم از خاندان آن دل بجائے
 کی قیاد کی اس فرمائش پر انھوں نے اپنی حیرت کبیعہ پر اعتماد
 رکھے جوئے تین ہینہ میں (بعض محققین کی رائے میں چھ ماہ) کے عرصہ
 میں ۳۹۴۲ شمار پڑتی تھی کبھی اور اسے قرآن السعدین کا نام
 دیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی مشنہ میں کیتھاکا قتل ہو گیا اس سے قبل
 اس کے خود رسالہ میں بیٹے کی موت کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا جس کا اتالیق
 جلال الدین فیروز غلی بنا جو سامانہ کا حاکم تھا اس پورے سردار نے
 جلد ہی اس بچے کو معزول کر عزائم حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور
 سلطان جلال الدین فیروز غلی کے نام سے مشنہ کی سلطنت دہلی پر
 تخت نشین ہوا اس بادشاہ نے امیر خسرو کی صلاحیت کی اچھی داد دی
 کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود غلی بن گیا اور شعر بھی کہتا تھا خود خسرو کے مطابق
 زندگی کے بہترین دن اسی بادشاہ کی زیر تربیت میں گزرے۔ امیر خسرو
 کو مصنفہ لاری کا خطاب عطا کیا گیا خسرو اس کے ہمراہ کشتی خاں کی افادہ
 کو فرو کرنے بھی گئے اور اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے اس کو انھوں نے
 متنازعہ الفوتوح میں جس میں اس بادشاہ کی فتوحات کو جمع کیا ہے۔ ذکر کیا
 ہے۔ بادشاہ اپنی نرم مزاجی کے سبب طویل عرصہ تک تخت پر ٹھکر رہا۔
 اس کے بیچتے اور داماد علاؤ الدین نے جب دکن کی مہلوں میں متواتر کامیابی
 حاصل کی تو یہ اس کا غیر مقدم کرنے کے لیے کوڑہ کے مقام پر پہنچا لیسکن
 علاؤ الدین کی سازش کا شکار ہوا اس کو مع چند دیگر سرداروں کے قتل
 کر دیا گیا۔ یہ واقعہ مشنہ میں وقوع ہوا اس کے بعد حالانکہ امیر خسرو
 اس واقعہ سے بہت دل آزرہ تھے لیکن نے بادشاہ کی مدح میں بھی
 انھوں نے تصدیق کی ہے۔

سلطان علاؤ الدین نے خارجی حملات کو فرو کر دافعی فتوحات و
 دیگر ملکی امور کو انجام دینے کے لیے اس کے دل میں قدر و منزلت حاصل کی۔
 مقبوعہ دیگر فتوحات اور انتظامی کارناموں کے علاوہ اس کی مسلمی
 فیاضیاں بھی قابل دید ہیں درحالیکہ وہ خود ان پڑھ تھا۔ تمام اہل ہندوئی
 میں امیر خسرو کو برتری حاصل تھی بقول صاحب تاریخ فرشتہ اس نے
 امیر کا شاہدہ ایک ہزار سالہ زندگی مقرر کیا۔ امیر خسرو نے اس کے عوض
 میں کئی تصانیف اس کے نام منسوب کیں خصوصاً خمسہ و خزائن الفوتوح
 امیر خسرو مشنہ میں سلطان کے ہمراہ چھوڑی گئی یہ بھی گنتے اس
 نسخہ پر ہم جن دن واقعات کا مشاہدہ کیا ان کا ذکر انھوں نے خزائن الفوتوح
 میں کیا ہے۔ اپنی شرکت کا تذکرہ بھی انھوں نے اسی کتاب میں
 اس طرح کیا ہے:

”منہ کہ مرغ ایلی سلطان است برابر بود چننا کہ

بیا رنگتند: ہمدہ باز بگشتم از انامیشد ایس عتاب کہ ضامی
 لاری الی ہمدہ رام کان منی انامیشد و از منیم کہ جلب غیبت
 در حضرت سلیمان چہ باشد، اگر گویند
 مرغ ضعیف ز کجی حوصلہ طاقت آرد
 گر بیتاب گوید شش لاغہ ہبہ لے
 اس قلعہ کی مضبوطی اور پھر اس کی تسخیر، وہاں کے راہ کو معاف
 کرنا اور دیگر افراد کو بھی کرنا ان سب احوال کا ذکر اس طرح تحریر کیا ہے:
 ”غیب قلعہ کہ سنگ دار اس کو ب آن علین بگرد
 آن قلعہ خاک ویت کہ بغیر دستی را بر سر فروئی آرد....
 بدان نیاد با سنگ خوشی بود روز را در خوش نہال
 می داشت“

اس کے بعد جب قلعہ فتح ہوا اور رانیہ نے عید بادشاہی میں پناہ
 چاہی اور مدد خواہ ہوا حالانکہ وہ باغی تھا مگر کو شکا مستحق ہوا لیکن دیگر باغیوں
 کو قتل کر دیا گیا لکھتے ہیں:

”دراں روز کراں را ز در روی از ہم پارک سبز
 بارگاہ لعل فروزی شاد پناہ جست اگر چہ باغی بود نیم
 افلاک بادشاہ بگذاشت کہ باغی بر آرد، اما موسم قہر
 سوی باغیان و مجرور ناید و فرمان داد کہ ہر ہندی سزارنگ
 را بر جا کہ در پانچون سبز تر و کاہ خشک بدر وند در یک روز
 بقوت فرمان سخت مقدار سی ہزار کندہ دوزخ بہ برگشت
 گندنا می شمشیر دوم کردند“

۲۱ سالہ حکومت کرنے کے بعد مشنہ ۷۸۳ھ میں فوت ہو گیا۔
 ایک سردار ملک کا فور نے علاؤ الدین کے بڑے بیٹے دو دیگر افراد شاہی کو قتل کر دیا
 قتل کر فقط چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو تخت سلطنت پر بٹھا یا اس سے قبل
 ایک دوسرا شہزادہ مبارک علی کی طرح قتل ہو گیا تھا بعد میں اس نے ہی
 ملک کا فور کی سلطنت کا تختہ پلٹا اور پھر سے علی خاندان کا فرد بادشاہ
 بنا۔ اسی بادشاہ مبارک شاہ علی کی خواہش پر امیر خسرو نے ”نہ سپہر“ لکھی۔
 بالآخر غازی ملک کی سرکردگی میں اس کو بھی تخت سے ہٹا دیا گیا اور
 اسی کے ساتھ علی دور کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا اور نیا بادشاہ عیاش
 الدین نعلی ہوا۔ اس نے بادشاہ نے بھی امیر خسرو کی کافی قدر و منزلت
 (تاریخ الفوتوح)

۱۔ خزائن الفوتوح ص ۱۶۱
 ۲۔ الفضا
 ۳۔ خزائن الفوتوح ص ۱۶۳

دیس نہ، جو ایک گاؤں تھا

مولانا مناظر حسین گیلانیؒ نے اپنے ایک مضمون میں ثابت کیا ہے کہ بہار کا مقام بہت بلند ہے۔ برصغیر میں یہی ایک ایسا خطہ ہے جو اپنے نام ہی سے مرکزِ علم ہے۔ بہار جس کا معلوم ہے وہ بہار کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی ہیں: علم کا مرکز۔ بہار کو بہار کہلانے کا اجر ادا اپنے جس جھوٹے سے علاقے کی بدولت حاصل ہوا ہے وہ بہار شریف ہے جو آج کل نانہہ ضلع کا صدر مقام ہے۔ اسی بہار شریف سے چند میل دور جانبِ مشرق ایک عروہ قریہ کسب نہ ہے۔ میر تقی میر نے دلی کو عالم میں انتخاب بتایا تھا۔ ان کے اس دعوے میں ہر مکتا ہے کچھ ماننا آسانی بھی ہو، مگر قریہ دسہہ کو اگر عالم میں انتخاب کہا جائے تو اس پر ماننا کا سبب نہیں لگ سکتا۔ فقیریم نک نے دینہ کو دینہ نہیں رہنے دیا، لیکن اس سے پہلے یہ گاؤں کیسا تھا اس کو جاننے کے لئے کچھ معروف علمی شخصیتوں کی رائے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں۔

پرنسپل شباب الدین دینیوی داد نامہ آجکل اب تاریخ ۱۹۸۰ میں تحریر کرتے ہیں۔

”دیس نہ منگھو علاقے کا ایک قریہ ہے جو ملک کی تقسیم سے پہلے بڑا مردم خیز خطہ مانجا کرتا تھا۔ یہاں کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ملک میں جب کوئی نئی ترسیل پسند تحریک اٹھی، تعلیمی، سماجی، دینی یا سیاسی تو اس کا تیر ختم کیا گیا۔ پچھل صدی کے آخری سالوں میں بعض علماء نے عربی مدارس کے مروجہ نصاب سے بے اطمینانی کا اظہار کر کے زیادہ لبرل نصاب تعلیم کی تجویز پیش کی۔ اس کے تحت جب عہدۂ العلماء کا قیام عمل میں آیا تو فرزانہ دینسے چند خواجواؤں نے اس نئے سرشتہ علم سے سیراب ہونے کا فیصلہ کر کے گفتگو کے لئے رشتہ سفر باندھا۔ پروفیسر عبدالغفور کسٹوی، صدر شعبہ اردو، سینکے کالج، بھوپال اپنی

● صدر شعبہ اردو، بی۔ ڈی کالج، پٹنہ ۸۰۰۰۱۱ (بہار)

کتاب ”ایک اور شرقی کتب خانہ“ میں رقمطراز ہیں۔

”دیس نہ کی سرزمین اگرچہ دنیاوی دولت و ثروت اور ظاہری جاہ و طلال کے تابناک نظاروں سے ہمیشہ غالی رہی، لیکن اس کو ہمیشہ عزت و اہمیت حاصل رہا ہے کہ ہر زمانہ ادھر دور میں یہاں بڑے بڑے اہل علم و فضل اور ارباب کمال پیدا ہوتے رہے ہیں کہ جنہوں نے اگر ایک طرف اپنے علم و حکمت و طب سے ہزار ہا انسانوں کو جسمانی تکالیف اور صعوبت سے نجات دلائی ہے تو دوسری طرف ایک بڑی تعداد کو اجتماعی روحانیت، تصوف اور روایتانہ زندگی کے ذریعہ انسانیت، سچائی اور راست بازی کی راہ پر گامزن بھی کیا ہے۔ یہ لوگ علوم متعارفہ میں سجدہ اپنے معاصرین میں پیش پیش رہے ہیں اور علم و حکمت کے ہر خزانہ میں انہیں کچھ کم نہ رہا ہے کہ انہیں ہنگامی کر، انہیں مفسرین کر حصہ دیتے رہے ہیں۔ بزرگانِ علم و ادب کے ہر شعبہ میں گل کاریاں کرتے رہے ہیں اور بڑے بڑے کام انجام دے کر رخصت ہوئے۔“

۷۔ جنم غائب کر دند و رفتند

مولانا نجم الدین ندوی کی ترتیب دی ہوئی ایک کتاب ”نسب انساب و ملوک“ میں انہوں نے دیس نہ کے علاوہ گروہ پیش کے علاوہ ان اصناف و ملائق کی علمی و ادبی شخصیتوں پر بھی اجمالی بحثی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”یہ عجیب بات ہے کہ کوسو بہار یہ خطہ گوردم خیز ہے اور یہاں ہر لحاظ میں اچھے اچھے اور بڑے بڑے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن ہر گز زمین کی ناموافق کو اس میں دھچک نہیں کھلتی۔ ان کی قدیمی ضرورت اور عزت افزائی ہونا چاہئے تھی، ان دنوں نے اس میں تلافی سے کام لیا۔ محبت اللہ بہاری، غلام گنجی بہاری، مولانا ندیم حسین جتدی، مولانا بکات لونی، عبدالجواب بہاری، مولانا سجاد بہاری، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا مناظر حسین گیلانی اس درخیز خطہ کی پیداوار تھے۔ لیکن کہاں کچھ، کہاں ان کی عزت ہوئی کاس صوبہ سے باہر۔“

عالم شہریت کی حامل لائبریری غلام علی خاں لائبریری کا ایک شعبہ آج کل
 "دیس نہ کھلتا ہے۔ یہ دراصل کتب خانہ اصطلاح دینے ہے۔ یہ
 کتب خانہ کتنا بلند مقام رکھتا ہے اس کا اندازہ آج بھی مذاکرین لائبریری ہی سے
 کر لیا جاسکتا ہے۔ اس ملک کے علمی ذہنوں میں زبان اردو کی کوئی ایسی قابل
 ذکر کتاب نہیں ہے اور نہ کوئی بلڈیا یا سرسید ہے جو اس کتب خانہ اصطلاح کی
 زینت کا باعث رہو۔ اس کے متعدد علمی قسمتی فوائد کا ذکر دہرے رکھتے ہیں۔
 جن کی مثال دنیا میں ایک نہیں ہیں۔ مثلاً میراٹھی سنوٹی "خواب و خیال" انٹرویو
 نقاد کا علمی دیوان، حضرت فردیہ گشتگر کے اردو کے آئیں شاعر ہونے کا ثبوت
 اسی کتب خانہ سے حاصل ہوا جس کا ذکر میرٹھس رانی نے اپنی کتاب "مختار لکھنؤ"
 میں کیا ہے۔ واجد پلاٹ، کاظمی دیوان، حضرت مخدوم سہادی کے ناول کے
 دو حصے، غالب، آدراج، اکبر و آرتا یاں کے قدیم ترین علمی دلائل کے نسخے،
 سب امتیازات حیات کا علمی نسخہ، مولانا مائی اور نظامی کی مختصر مثنویاں اور نظمیں
 کے بعض ایسے رسالے جن میں بیسی معنی شاعرانہ کے ارکان نے اپنے مطالعہ
 میں رکھا تھا ان کے علاوہ بھی اور سب کچھ ایسی چیزیں ہیں جن میں دیکھ کر نقل و جان
 ہوتی ہے کہ یہ بیش بہا علمی خزانہ ایک دور افتادہ گاؤں میں کس طرح فراہم ہو سکا
 اس کا راز ملک کے لئے عجیب ہے۔ اس گاؤں کے باشندے لائق صدمہ ملک میں ملک و
 بیرون ملک کی بڑی بڑی شخصیتوں نے اس کتب خانہ کو دیکھا، اس سے معین اٹھایا
 اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اہل قریہ کو حراج عقیدت میں پیش کیا۔ بابو
 راجندر پرست اور صدر جمہوریہ ہند نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظہور فرمائے۔
 "آج مجھے دینے کتب خانہ دیکھنے کا موقع ملا۔ دیکھ کر نہایت
 خوش ہوئی۔ اردو کے پائے رسالے اور ایچی سے اچھی کتابوں کا ذخیرہ یہاں موجود
 ہے۔ اس کے علاوہ علمی کتابوں کا بھی ایک اچھا ذخیرہ ہے۔ یہ سب یہاں کے
 باشندگان نے اپنی بہت اہم علمی ذوق سے کیا ہے۔"

بالجسے اردو عبدالحق لکھتے ہیں:

"میں اس کتب خانہ میں دو بار حاضر ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی مسرت
 ہوئی کہ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مخطوطات بڑی اعتبار اور خوش ترتیبی سے رکھی
 گئی ہیں۔ میں نے اس لائبریری سے استفادہ کیا ہے۔ بعض مخطوطات اور
 کتابیں اردو کے کسی دوسرے کتب خانہ میں نہیں دیکھیں۔"
 تجارہ کرکٹ کی مدد کے ہندو نافرمانی، ۲۳ نومبر ۱۹۳۳ء کو کامرانی دی
 اور لکھتے ہیں:-

"آج میں نے لائبریری دیکھی۔ یہ دیکھ کر بہت اچھا ہوا کہ دیہات میں
 اتنی بڑی و وسیع لائبریری ہے۔ اس کی مدد کرنا سب کے لئے ضروری ہے۔"
 محمد بہار ملت مولانا حافظ الرحمن کی نظر میں:-
 "آج مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۳۵ء کو لائبریری کا سامنا کیا۔ خوش اسلامی

اور علمی مخطوطات اور عدد منسوب کتابوں کے پیش نظر یہ ہندوستان کی مایہ ناز
 لائبریری ہے۔ دلچسپ (بہار) اس کے لئے جس قدر بھی فخر کرے مجھے اہم
 قابل مدد تاش۔"

ان حضرات کے علاوہ محمد شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، عبد السلام عظیمی
 ڈاکٹر سید محمود، حبیب الرحمن خیروانی، صدر بیگ، خانک حسین، مہمان گاندھارا
 بدری نامہ و ماہر مولانا امجد الدین ندوی نے دینے لائبریری کا مدد کیا اور
 دینے کی تارکی لائبریری کی اہمیت کو دہرایا۔

اب ہم محوری ہی گفتگو میں مومنور پر کر کے کر دینے کے آسان پر کیے
 کیسے ہر وہ و نجوم ملوہ گر ہوئے اور وہ کس طرح اپنی تابانی و درخشاں دیکھ گئے۔

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی

جامع کلمات اور بقری شخصیت جو محتاج تعریف نہیں۔ حضرت مولانا سید
 افرشتہ اشعر نے سید صاحب کے بارے میں فرمایا تھا:-

"اگر رازی و غزالی کا علم اور عبیدوشلی کا تقویٰ کہیں ایک جگہ جمع ہو جائے
 تو اس مجموعہ سے ایک سید سلیمان کی شکل نکلا۔ یہ سید صاحب کی سچی تصویر ہے۔
 تصانیف: (۱) سیرت النبیؐ (۲) مقالات سلیمان (۳) حیات حبشی (۴) درون
 الادب (۵) انوار القرآن (۶) غلبہ جلیدہ (۷) سیرت حضرت عائشہؓ
 (۸) حیات امام مالک (۹) خطبات مدراس (۱۰) عرب و ہند کے تعلقات (۱۱)
 عربوں کی جہاز رانی (۱۲) خیام (۱۳) رحمت ماح (۱۴) بہار خواتین اسلام (۱۵)
 نقوش سلیمانی (۱۶) برید فرنگ۔"

۲۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی

پڑھنے کے زمانے میں تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے۔ علامہ شبلی
 کے شاگرد و شاگرد تھے۔ دارالمفتین کے رفیق کار رہے۔ احمد آباد اور بمبئی کے
 کالجوں میں مفتیہ اردو فارسی کے استاد رہے۔ بمبئی میں انجمن ترقی اردو کی
 بنیاد ڈالی۔ آخر عمر میں بمبئی کے مشہور و معروف ادارہ انجمن اسلام اردو ریسرچ
 انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر رہے۔ لفظ ادب جیسے ابا و آثار رسالہ انہیں کی
 سرپرستی میں جاری ہوا۔

تصانیف: مقدمہ رتبات عالمگیری، مجرات میں اردو

۳۔ مولانا ابوالطفہ ندوی

ان کا پہلا تاریخی معنوں "ابوالقاسم" عربی میں عربی موانع عربی پر
 تھا۔ آپ بمبئی، مجرات اور رجون کے کالجوں اور شاہی کتب خانوں میں مسی
 اور اسلامیات کے استاد رہے۔

تصانیف :- تاریخ سنده، مختصر تاریخ ہند، گجرات کی تمدنی تاریخ، تاریخ
ہجرہ، تاریخ اہل بنگلہ کی طغیانی، مواد تاریخ گجرات۔ ترجمہ ظفر الدولہ کے
علاوہ سنسکرت میں ہوں کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے۔

۴۔ صباح الدین عبدالرحمن

مسلم پرنس واری علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہیں۔ آپ شعلہ فراق
اور طندیا پر اہل قلم ہیں۔ نئی احوال موثر جریہ مصافت، اعظم گڑھ کے مدیر ہیں۔
جوانی سے ہی رفیق دار مصنف ہیں۔

تصانیف : ہزیم تیسرہ ۲۔ ہزیم چوکیر ۳۔ ہزیم صوفیہ ۴۔ ہندوستان کے عہدوں کی
کی ایک مٹھک ۵۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوسے
۶۔ ہندوستان کے عہدوں کی کاغذی اسطفا ۷۔ ہندوستان کے مسلمانین ۸۔ علماء و
مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر ۹۔ ہندوستان اخیر سرحد کی نظریں ۱۰۔ ظہیر الدین
ہندو اور مسلمانوں کی نظریں ۱۱۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی جہتی
کہانیاں ۱۲۔ محمد علی کی یاد میں ۱۳۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی روایت
۱۴۔ غالب مداح و قدر کی روشنی میں۔

۵۔ بشیر الحق دینوی

کتب خانہ سے دلچسپی میں خلیفہ ثانی اور اردو کے تحفظ و بقا کی فکر میں
دارودہ اردو۔ دینے کی لائبریری کی مشترک تائیں آپ کی علی کردہ ہیں :
تصانیف : باقیات اقبال اور اصلاحات اقبال۔

۶۔ پرنسپل شہاب الدین دینوی

کلکتہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔ انجمن ہائی اسکول بمبئی میں مدرسہ کچر
پرنسپل ہوئے۔ صاحب مدین ٹیلیکل انٹیٹیوٹ میں پرنسپل کے عہد پر فائز رہ کر کلاؤں
ہوئے۔ انجمن اسلام کے تحت مسلمانوں کے لئے بے شمار تعلیمی و تحقیقی ادارے قائم
کئے۔ اس طرح بمبئی کی مسلم آبادی کی تلاش و پیوند کے لئے آپ نے جو گراں قدر خدمات
انجام دی ہیں انہیں مسلمانانِ بمبئی بہت ہی عزت و احترام اور محبت کی نگاہ
سے دیکھتے ہیں۔ ان کے علمی و ادبی مضامین مٹھک کے موقر قارئینوں میں برابر
شائع ہوتے رہے ہیں۔ کاجی دور کا لاس کی انگریزی کتاب محمد علی حسرت
کو آپ نے اردو کا لباس دیا ہے۔

۷۔ حافظ محمد حسین رحمانی

حضرت فضل الرحمن گج مراد آبادی کے مرید اور ضعیف تھے۔ زبردست
عالم دین اور علامہ شریعت ہیں۔ ہم جماعت اور گھر سے دوست تھے۔

تصانیف :- ۱۔ فضل رحمانی ۲۔ کمال رحمانی ۳۔ ذکر میلاد مولد الہی العظیم
۴۔ نسب نامہ حضرت خضر سرور کائنات ۵۔ قرآن مجید کا برج مجاشا میں ترجمہ۔

۸۔ مولانا عبدالحکیم ندوی

جید عالم دین تھے۔ فنی حدیث کے ماہر تھے۔ عربی زبان و ادب پر کامل
دست گاہ رکھتے تھے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں طویل عرصہ تک بطور استاد و نیت و ترویج
کام کرتے رہے۔ عربی کی شہرہ آفاق کتاب "العماد" کی شرح عربی میں لکھی ہے۔
جو عرب ملک میں ہاتھوں ہاتھ لگتی تھی۔ یہ کتاب جامعہ ازہر کے نصاب میں
شامل ہے۔

۹۔ مولانا محمد عبداللہ ندوی

علامہ شبلی کے شاگرد و رشید اور سید صاحب کے ہم جماعت تھے۔
آپام طالب علی ہی سے اردو اور عربی میں مضامین لکھتے تھے اور عربی مضامین
کو اردو کا جامہ پہنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مصافت، اعظم گڑھ میں ان کے
مضامین اور ترجمے پر بارش آتی رہتی ہے۔ پوشیدہ بزرگ تھے اور غلات بھی
حاصل تھی، مگر اس کا اظہار چھپتے ہی نہیں کیا۔
تصانیف : خیر السار، عجائب غور و غریب کی کہانی۔

۱۰۔ حکیم محمد شہید

حافظ طیب تھے۔ فارسی کے کبیر مشق شاعر۔ فارسی نظموں کا ایک مجموعہ
اور فارسی شریں کتاب "لڑ محمدی" یادگار ہے۔

۱۱۔ حکیم ابوالحسن

علامہ سید سلمان ندوی کے والد بزرگوار ہیں۔ عالم باعمل اور
مجدد یہ طریق کے صوفی تھے۔ بکتوب مجددیہ کی شرح فارسی زبان میں لکھی ہے۔

۱۲۔ حکیم عبدالجلیل نظر

آپ رب علی سرحد کے ہم عصر ہیں۔ ذہین شاعر تھے۔ اپنے وقت کے
ماذق طیب تھے۔
تصانیف : ۱۔ مثنوی گلزار جلیل ۲۔ تہذیب الانفس ۳۔ مدرس اتالیق
۴۔ داستان بے عدلی ۵۔ نقد پائیں شمع۔

۱۳۔ مولانا محمد مصنف

عربی و فارسی صرف و نحو میں اپنے وقت کے ماہر رہے۔ عربی
کتاب صرف نحو یادگار ہے۔

۱۳۔ مولانا محمد قاسم ندوی

مدرسہ الہندی پٹنہ میں برسوں تک عربی کے استاد رہے۔
 "باکورۃ الادب" لکھ کر عربی زبید کی ضرورت پوری کی۔ عربی کی مشہور کتاب
 "متنبی" (شعری مجموعہ) کی شرح لکھ کر شنگھائی علم کی بیاس بچائی

۱۵۔ محمد عبدالکریم

منطق و فلسفہ کے جید عالم تھے۔ "رقعات کربھی" اور "المقصور
 والتصدیق" یادگار تصانیف ہیں۔

۱۶۔ مولانا نجم الہدیٰ ندوی

علامہ سید صاحب کے ہم جماعت تھے۔ عربی و فارسی کے جید
 عالم تھے۔ اردو فارسی قواعد پر نثر نگاہ تھی۔
 تصانیف :- جامع العقائد اور تب نامہ سادات و ملوک دہستان۔

۱۷۔ پروفیسر سعید رضا ندوی

علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔ سینٹ ڈیویس کالج بمبئی میں صدر شعبہ اردو
 فارسی رہے۔ اردو و فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ دودھ کی زمین میں فارسی کی
 ایک نظم "یاد دین" کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

یاد دین ہر زمان آید ہی	یاد پیسہ ان دجواں آید ہی
ریگ رو دینے در تابستانگی	درنگا ہم بکشتان آید ہی
آب جوشن آب آں آب جاہ	در دہاں ماء انجان آید ہی
آہ دست با ہمہ دیرا خچی	خاک او تسکین جاں آید ہی
خفتہ جاوید اسلام در اں	یاد ہوا ز خاک شاں آید ہی
آں کتب خانہ کو جبر فرماست	زین خیر نوحہ خاں آید ہی

۱۸۔ پروفیسر عبدالقوی دینوی

سینف کالج بھوپال میں صدر شعبہ اردو ہیں۔ قرآن مجید کے اسلاف و
 اخلاف کی شاہکار روایات کے امین ہیں۔ علم و ادب سے گہرے شغف کی بناء
 پر بھوپال میں سماجی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ فون گوشتنر، پروس ایلیم
 تصانیف :- ۱۔ سرسلی ساسی زندگی ۲۔ غابیات ۳۔ ایک شہر اور پانچ
 مشاہیر ۴۔ مہدی الاذادی الاقتصادی ۵۔ مضامین لسان الصدق۔
 ۶۔ تلامذہ و تلامذہ ۷۔ اقبال انیسویں صدی میں ۸۔ بچوں کے اقبال
 ۹۔ مطالعہ خطوط غالب ۱۰۔ اقبال ہندی۔

حضرت امیر خسرو — بقیدہ صفحہ ۲۱ سے

کی۔ امیر خسرو نے اس کی فتوحات کو تعلق نامہ میں بکجا کیا اس کے د
 میں امیر خسرو اس کے بڑے بیٹے الفخوال کے ہمراہ دکن کی ہمہ گیر گئے
 اس ہم میں شہزادہ ناما کیاب رہا۔ اور دہلی واپس لوٹ آیا۔ اٹھ
 یعنی سترھ سنہ ۷۰۰ میں سلطان خود وازنگ و دیوگری کو روانہ ہوا۔ امیر خسرو
 اس کے ہمراہ تھے یہ ان کا آخری سفر تھا ملکی نظم و سن کو قائم کر جب
 بادشاہ دہلی کو روانہ ہوا تو الفخوال نے دہلی کے باہر ہی افغان پورہ
 شہر نے کا انتظام کیا کیونکہ کچھ طور پر دہلی میں سلطان کا خیر مقدم کر
 کے لیے انتظامات نہ ہو سکے تھے لیکن خیمہ کی چھت گر جانے کے سبب سہ
 مع چند دیگر امراء کے دس فوت ہو گیا بعض مورخین نے اس کو الفخوال
 جو بد میں مہملوک کے نام سے بادشاہ ہوا، کی سازش قرار دی ہے۔ ۷۰۵
 جانب جب امیر خسرو سلطان تعلق کے ہمراہ جنگ لڑے لوٹ رہے تھے
 راہ میں ایک درویش طلبہ حضرت نظام الدین اولیاء کے احوال
 بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا وہ اس جہاں سے رخصت ہو گئے۔ ۱۔ امیر
 یخا کر کے دہلی پہنچے تو کچھ مال و اسباب تھا سب بھڑا کر دیا اور ما
 لباس پہن کر محبوب الہی کی قبر پر مجاور ہوئے اور اسی صدمے کے با
 کچھ مہینوں بعد ہی ذیقعدہ ۷۰۶ء میں فوت ہو گئے۔ ان کو حضرت
 اولیاء کی قبر کے پاس ہی دفن کیا گیا۔

محمد زکریا کے مذکورہ اسفار سے اگر مدبرہ کاری کی جائے
 بیش بہا معلومات دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان سفروں کی اہمیتوں ک
 مختصر طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ سیاسی ۲۔ سماجی
 ۳۔ تاریخی، جن واقعات کا ذکر انھوں نے جو انھیں دور دراز یا قریب
 کے سفروں میں درویش آئے کیا ہے ان میں دربار کے داخلی و خا
 حالات درباری سازشیں بھی مذکور ہیں جن کی صداقت پر انھیں اٹھ
 نامکن ہے۔ اس دور کے سماج کا مشرور ذکر جس کا مشاہدہ انھوں
 سفروں کے دوران کیا اپنی تصنیفات میں کیا ہے ان میں شہروں
 مفصل حالی باشندوں کی وضع قطع سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ آداب
 معاشرت کی تفصیل ہیں ان اسفار کے ذکر سے ہی ملتی ہے اور من
 یہ کہ ان سبھی واقعات، خواہ وہ سیاسی یا سماجی یا تاریخی سے متعلق
 ہوں کا مطالعہ کے بغیر کوئی بھی مؤرخ اس موضوع سے متعلق اس
 تحقیقی کام کو سر انجام نہ دے سکے گا۔ اور ان کے ذکر کے بغیر اس دور
 کی تاریخ کو کامل طور پر مرتب کرنے میں ناکام رہے گا۔ ۴۔

بجہدِ شہداء

بجہدِ شہداء

ایک گلابی دوسری

گلابی شہر کی وہ دوسری بھی کتنی رنگین تھی!
 سننے بادلوں کے آگے بڑی
 زہر نثار کوئی نہ سطر پر من بیٹھ ہوئے اتری
 سلگتے دل کے آنگن میں...
 در و دیوار آگن ہوئے
 ان آغوشوں میں آگس پری کا عکس لہرایا
 تو یاد آیا:

پیرانے مکتوبوں میں چاندنی راتیں جب آتی تھیں
 سننے بادلوں میں رہنے والی
 دل ڈبا کر لوگوں کے افسانے سننا ہی تھیں
 گلابی شال میں لپیٹ کر رہنے والی دل ڈبا کر پریاں
 جو آدمی رات کو چوری چھپ کر گھر میں آتی تھیں
 جوان سننے چرائی تھیں
 دلوں کی رنگیز پر صورت مروج صبا
 جو نازک قدم رکھتی ہوئی پھولوں جاتی تھیں
 ہنسون خواب کے ماروں کو دیوانہ بناتی تھیں
 گلابی شہر کی وہ دوسری بھی —
 اک صبا رنثار جھونکے تھی کہ سایہ تھی
 کئی خواب راتوں کا صلہ بن کر جو سکی تھی

سلگتے دل کے آنگن میں
 مگر جانے ہوئے کچھ اور اضافہ کر گئی
 — افسوں زدہ دیوانہ گر راتوں کی الجھن میں

۱۹۷۶ء - ۳۰ جنوری - کراچی - دہلی

مظن نامے

۱
زوالِ سرا کی سُرخی شام
ڈھلے سورج کی زرد کرنیں
اُداس مسجد کے گنبدوں سے

لٹ رہی ہیں
اُبھر رہی ہیں

میں ایک گوشے میں در سے کے
کھڑا ہوا، خالی خالی نظروں سے
دوبتے اور ڈھلے سورج کو دکھتا ہوں

۳

یہ اطمینوں کے گھٹے درختوں کی پشت پر
ٹوٹی چھوٹی سی اک حویلی
اور اس کے نزدیک
ایک مینار کی منہم سی مسجد
کو جس کے دیوار و در پہ
موسم کے ہاتھوں کی کئی خراشیں پڑی ہوئی ہیں
یہ اک پھاٹک کی چاندنی رات کا دلواش منظر۔

۵

عُش دریا گنگن کے پنج
بیری کے سائے میں
اک جنازہ رتھا گیا ہے لا کر
ہے چار پائی کے چاروں جانب
جوان بزرگ عورتوں کا مجمع
جو اپنا سر آئینوں سے ڈھانپے
اداس اور غم زدہ کھڑی ہیں
فضا میں لوبان کا ڈھواں ہے

مگر

جیسے چھپا رہے ہیں
کوئی بیری کی ٹہنیوں پر وہ ایشیا نے بندھ چکی ہیں
مٹی کا سورج چمک رہا ہے۔

۴

وہ ایک بوسیدہ شروانی میں
اک بزرگ کمرغیدہ
چھڑی لیے ہاتھ میں کھڑے ہیں
بزرگ کے زور و
کوئی شخص
چند کاغذ، قلم لیے
کا لاکھ پتے، کھسکا ہوا کچھ تار ہے
فضاؤں میں اُھول اڑ رہی ہے
خزاں وسیدہ رفت تیرے سے اپنا دامن بچا رہا ہے۔

۲

یہ جمجھوری جمجھوری لکھواریں سے بنا ہوا
اک پُرانا گھر
جس کے کپڑے پھاٹک میں
ایک تالا پڑا ہوا زنگ کھار ہے
نگر اسی بند گھر کے اندر
نیچے سے ایک پیر
باہر کی سمت نکلتا
کسی کی آمد کا منتظر ہے
بڑے پتھروں سے لدا کھڑا ہے

مکتبہ خانِ وادپ، امین الدولہ پارک کھنڑ

غزلیں

مداقتوں کا ستارہ جہاں ضیاء سے
فریب ظلمت شب کو بھی جگمگا دے گا
سمجھائیں نہ اگر جگمگوں سے شب کوئی
ہمارے ہاتھ میں سورج بھی کوئی کیا دے گا
لیٹ کے ریت کے شعلوں سے روئیں سکتے
بہی خیال مسافر کو حوصلہ دے گا
صلیب زخم کی اشاداب درد و غم کی روش
سقم ظریف زائد اب اور کیا دے گا
سکون پائے گا پیل کی چھاؤں میں کریمک
زمانہ دھوپ کو تیرا پتہ بتا دے گا
ترسے خیال کی برسات میں جو بھیگا ہے
وہ خشک پتوں کو موسم ہر ابھار دے گا
سرتوں کی شاعلوں کا اغتشار ریاقت
نہ کوئی سنگ ہی دے گا نہ آئینہ دے گا

کرتے بھی نکلیے عسکر بر مقتدر سے
بھولوں سے ہوئے زخمی دُست رہے پتھر سے
صحرائے اذیت سے طالب ہیں سمرت کے
خواہش ہے اداوں کی ظلمت کے کچھیر سے
علاج تعارف کیوں سمجھے ہے مجھے دنیا
چھلکا ہوا شعلہ ہوں جلے ہوئے ساف سے
پاکیزگی شبنم کی کرتی ہے طواف ان کا
ہوتے ہیں مزین جو کردار کے زیور سے
سورج کی تیش بیٹا کیا اپنا مقتد ہے
اسے کاش گھٹا چھلے بادل بھی بھرے
زخموں کی قبا عکری اس جرم کا خیا زہ
خوشبو سے مراشتہ، نسبت ہے گل تر سے
کیا خاک مارا ہو محفل میں ریاقت ان کا
جو زخم ملے ہم کو الف اذ کے لشتہ سے

تہا کتاب زخم تھے مرہم کے واسطے
پتھر پھڑکتے رہے شبنم کے واسطے
آشوب درد خون تہا صلیب و دار
کیا کیا سزا ملی نہ ترسے غم کے واسطے
ناکامیوں کی دھوپ اشکستوں کی بازیش
یہ اہتمام، عسکر مقتدر کے واسطے
سوکھے لبوں پہ زہری روغن خوشیاں
اکسٹنگ میل، فطرت آدم کے واسطے
جس وقت پھیلتی ہیں دعاؤں کی خوشبوئیں
ہم بے قرار ہیں اسی عالم کے واسطے
پنی کر عذاب درد شست کی تنہیاں
زندہ ہیں لوگ، سستی نوم کے واسطے
تہذیب نو کے شوخ اچالے تو ہیں مگر
ہوتی حیا کی حیا ندی مرہم کے واسطے
لہر اسے ہیں عکس نگاہوں میں چھریاں
آئینہ بن کے صحن مجسم کے واسطے



ریاض احمد ریاض

۶۴ - ۶۵ - ۶۶ - ۶۷ - ۶۸ - ۶۹ - ۷۰ - ۷۱ - ۷۲ - ۷۳ - ۷۴ - ۷۵ - ۷۶ - ۷۷ - ۷۸ - ۷۹ - ۸۰ - ۸۱ - ۸۲ - ۸۳ - ۸۴ - ۸۵ - ۸۶ - ۸۷ - ۸۸ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۱ - ۹۲ - ۹۳ - ۹۴ - ۹۵ - ۹۶ - ۹۷ - ۹۸ - ۹۹ - ۱۰۰

ایم۔ قمر الدین

غزلیں



شکلوں کے درمیاں بھی نہیں تھا مجھے ہراس
اور اس کے بعد کیا ہوا بس کیجئے کیا
اپنا سہری سال اور اپنے رو پہ پہاں
میں کہ ہوئی ہے مری عمر اب پہاں
اپنے ابو کی گرہی ہی سب کچھ ہے دوستو
جس کے بغیر کچھ بھی نہیں آون یا کہ اس
اتنی بہت سی باتوں سے وہ خوش نہ ہو سکا
اتنی ذرا سی بات سے وہ ہو گیا اُداس
کے دوسری بھی جھیسیر، مگر قصور کی اور بعد
میں بچ کر آ ہوں ابھی کھوئے ہوئے حواس
اُس اک حسین جسم کو دیکھا تو یوں لگا
پہنت تھا، جیسے تان مکن نے بھی اک لباس

کسی بھی زہر سے مجھ کو نہیں کوئی پرہیز
مگر ہے شہر و بس آئی کہ ہو نہ شہر آمیز
وہ ڈر گیا، جو نظر آئی فاختہ اس کو
وہ جس کے ہاتھ ہمیشہ ہی رہے خونریز
میں خود کچھ دیکھا آج تک یہ اپنی ظلم
مگر مجھ میں ہے کبھی منہ نہ دیا اور کسی پرہیز
میں پسینوں کی طعن رہی ہے اس کو۔ اور
ازل سے باقی ہے اب تک جو مانگ ہے زرخیز
یہ شعلہ تھی مری، جس نے سڑ سڑکوں نہ کیا
تھے بے شمار وہاں جام اور سب پرہیز
سہر ایک روز میں کہہ لی ہے میں نے ایک غزل
اس ایک شخص کی قربت ہے کیا غزل انگیز

لٹ جاتی ہے ہر چیز کو تیر کا ہو کہ شہتیر
اُسے کاش کوئی کہہ سکے اس کوئی اک شعر
ستور چھین کر چھوہ چست اور شکار
گو ذہن کو معلوم ہے اب ساری حقیقت

اک سادہ ورق جذب تھے جس میں لکھی آئینو
اک میرے ہوا پر ہر دس کا کوئی وہ تحریر

۱۲۰۔ لاکس جیبرز، سیرک کورٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ایلیٹور



شرفیہ چارہ خواہ خواہ نہیں گیا۔
وہ روئی کے لیے برنی لے گیا ہوا تھا۔
آٹھ روئی گھنٹا کا کام تھا مگر ڈھائی تین گھنٹے
ہو چکے تھے، باوجود وہ ابھی تک نہ لوثا تھا۔ روئی
بے چین ہو کر کراب بابا کو خبر کرنے کی سوچ رہی
تھی کہ اسی دوران بابا خود چلا آیا۔
پولیس نے شرفیہ کو تھامے یں روکا ہوا

سہ۔
روئی گھر گئی مگر اب اپنے پرانے دن جی رہی
ہو اور بابا نے اسے موہن کے بارے میں خبر دی ہو
موہن گھر سے کام پر جانا تو اسے یہی لکھکا لگا
رہتا تھا کہ پولیس اسے وہیں سے گھر کر سیدھا
تھامنے جانے لگی اور وہ گھر نہ لوث پائے گا۔

اس نے کیا کیا ہے، بابا؟
گھر آؤ جہیں میں سب ٹھیک کروں گا۔
بابا جانے کے لیے مڑتے ہوئے دڑا ٹھہر گیا۔
تم آرام سے نہ ٹھو۔ میں اسے ابھی لے کر
آتا ہوں۔

موہن مرحوم نے روئی کو برنی کھانے کا
چسکا ڈال رکھا تھا۔ اس کے لیے گھنٹہ گلوئی
کی غامی برنی لایا کرتا اور اپنے سامنے بٹھا کے
اُسے کھلاتا۔

• ایک ماہ گریٹر کپٹاش ۴ نئی دہلی

کلیج نئی دہلی

تھیں برنی کھاتے دیکھتا ہوں روئی، تو
مجھے لگتا ہے تم میرے من میں گھسنے لگے ہو۔
چلو ہو۔ وہ بستر کھاتے ہوئے
جواب دیتی۔ میں کوئی کھانے کی شے ہوں۔
ہاں، روئی کھانے کی پینے اور سونگھے
اور چھوئے کی۔ تم سے میری ہر خواہش پوری
ہو جاتی ہے۔

موہن کی موت کے بعد کانپور میں اُس کی
یہ باتیں یاد کر کے اُس کی آنکھیں اس طرح بھر
آئیں جیسے برسات میں اندھے کنویں۔ ذہن
کی اس حالت میں ایک خیال اُس کے ہاتھ میں
برنی کا دونا تھا دیتا تو ایک اندھا عالم اُس دم
اُسے ٹھوکر مار کر گرادیتا۔ مگر دو ڈھائی سال بعد
جب برنی سے موہن کا خیال بھڑنے لگا تو وہ
آپ ہی مگھن لیل سے کہتی، ارے، کیسے چاہا ہو؟
اپنی بھتیجی کے لیے کبھی گھنٹو کی برنی ہی لے آیا
کرد۔ اپنی بچی کی طرف برنی بڑھاتے ہوئے
وہ دو گز لے اپنے لیے بھی رکھ لیتی۔ تمہارا
چاہا لایا ہے۔ کھانو!

انصوں کے گھریٹ کرم بھی وہ شرفیہ
سے تھا خاک کیا کرتی۔ تمہیں کیسے بتاؤں
شرفیہ، ہمارے کانپور میں کتنی اچھی برنی بنی تھی
ہمارا کانپور؟۔ شرفیہ سوچتا۔
کانپور تو کانپور والوں کا ہے۔ روئی کا تو صرف

یہ انصوں کا گھر ہے۔ جہاں سے وہ گئی اور جہاں
لوٹ آئی۔
تم کیا جانو؟ سارے شہر کے لوگ کوئی
ذکوئی کام لے کر جہاں گھر کے سامنے آ جمع
ہوتے تھے۔
پر تمہارا اصل گھر تو یہ ہے جہاں ہم دونوں
رہتے ہیں۔

یہ تو ہے مگر وہ بھی تو اپنا ہی تھا، موہن
بڑا اچھا آدمی تھا شرفیہ، ہر شخص کی مدد کرتا تھا۔
شرفیہ سوچنے لگتا، ہاں اچھا نہ ہوتا تو
میری روئی کو نہا ہی سے، بچا کر گھر میں کیوں نہ لانا
— اچھا ہی ہوگا جو میری امانت میرے حوالے
کر کے چپ چاپ اپنی راہ ہو لیا ہے۔

کیا سوچ رہے ہو؟ جاؤ میرے لیے
برنی لے آؤ۔
ہاں، ماما ہوں روئی۔ آج بیڑے
چوک کے علوانی کے پاس جاناں گا۔ بھولا اُس
کی بہت تعریف کرتا ہے۔

انصوں کے گھر کے گھریٹ پر سچو کی دادر
نے شرفیہ کو اُس کے قدموں سے ہی پہچان
لیا اور اپنی اندھی آنکھیں جھپکے ہوئے مسکرائیں
کہ اپنی دالھی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شاید شرفیہ
اد روئی کو لنگھتی ہوئے دیکھ رہا تھا۔
کدھر جارتے او، شرفیہ؟

باہر :-

بارجہ بخت ناچک اسے سردار۔
جس دی ساری دولت گھر کے اندھ ہوئے،
او کیوں بار جائے ؟

روٹی کے لیے برتی لائے جارہا ہوں چوکلہ
چاچا -

بر بھی ؟ - چوکیدار کا پیکار منہ تازہ
برتی سے پھر گیا - ہاں بھائی، روٹی منگت
دئی اسے تے جرور جاؤ - 'لو' اسے کپڑا لے
جاؤ - یہ بھی باندھ کے لاؤ نہیں تے راتے دج
کوئی چیل چھٹا مار کے جائے گی۔

کپڑا بھی لے آیا ہوں، چوکیدار چاچا۔
سادا کر کے بڑے سیانے نکل آئے
او - چوکیدار کو اچانک معلوم ہوا کہ دوہائی
منہ مارے جارہا ہے - بر بھی کی ایک ادھ
ٹھکڑی ہارے واسطے بھی لے آیا ہار۔
جانے دو گے تو لاؤں گا بھی۔

جاؤ بھی، جرور جاؤ - سادی کر کے
وا کیا ہی بڑے سیانے نکل آئے او، نہیں تو پہلے
تے صرف تو کراں بنا ہی جانتے تھے -
اسے ٹھہرو، میری بوری بات تے سن جاؤ -
میرے واسطے بھی ایک بڑی سی ٹوکر دی نہلاؤ
میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اب اپنا سامان ایک
جگہ منہال کر رکھا کروں - کیوں ؟ -
تمہاری اس کیوں کا کیا جواب دوں ؟ بس
جی چاہندا اسے، منہال کے رکھوں کیا مالوم
کب کوئی گھرائی مل جائے - چوکیدار نے
شرف کے پیچھے صدا لگائی - سنو میرے
لیے بھی -

شرف نے چلتے چلتے یہ آواز بلند دہرایاں
کہا اور مسکرا کر سوچنے لگا کہ ہر کسی کی یہ خواہش
کتنی فطری ہے کہ اس کے لیے بھی کچھ نہ کہے ہو -
بسموں کو کچھ نہ کہہ سدا ہے تو کبھی ایک دوسرے
سے محبت کرتے رہیں - فساد تو اس وقت

شروع ہوتا ہے جب کوئی سب کچھ صرف اپنے
لیے سمیٹ لینا چاہتا ہے - سب کچھ میرے
- سب کچھ تمہارا ہی میناؤں ایک تمہاری تم
جہت دوسرے کیوں ہوتے ؟ سب کچھ سب
کے لیے ہوتا ہے - شرف اپنے کوٹ کی اندرونی
جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکلتے لگا - دس دس
کے سات نوٹ تھے - اس نے جیکے سے اپنے آپ
کو مشورہ دیا کہ ان سارے پیسوں کی برتی لے
جاؤ - اس میں سے تین پانچ نوٹ لیاں روٹی کھالے
گی، باقی ستنے کے خالے کر دینا کہ آج شام کے
کھانے کے بعد بھی منہ میٹا کر لیں - ہاں
چوکیدار چاچا کو دو نوٹ لیاں گیٹ پر فالتو دیتا
جاؤں گا - اسے بھی اپنے حصہ کی ایک ہی ٹھکڑی
ملی تو اپنا مالو ہی جیب سے رگڑ رگڑ کر پیٹ کر
جانتے گا - شرف اپنی سوچ بڑے اختیار سے لگا
کسی رائیگر نے اسے دیکھ کر اپنے ساتھی سے کہا۔
چلو تیر تیر قدم آٹھاؤ۔

کیوں ؟
بھیک مانگے - اندھا جب اس طرح
آپ ہی آپ ہٹے گھٹنے تو بڑے دروہوں کی
بادش ہوئی ہے -
شرف پرستور جنس جنس کر سوچ رہا تھا کہ
وہ چوکیدار چاچا کو ایک ایسی ٹوکر دی بنادے گا
جس میں ہاتھ ڈالنے ہوئے اسے گلے کہ بھری ہوئی
ہے خالی بھی ہوئی تو کیا ؟ اس کی چاہ سے تو
ٹھنسن کر بھری ہوگی - اس کی جود کو اد کیا
چاہیے ؟ سنگھ بھرتی تو اسے منہالنے کی چیزوں
سے بھی بھرتے گی - شرف حساب کر رہا تھا
کہ چوکیدار چاچا کی عمر کیا ہوگی - مگر عمر کا کیا ہے ؟
کنوارہ تو سدا جوان ہوتا ہے - اس کی عمر جو بھی ہو
وہ دادا بنتے سے تو رہا۔

شرف دل ہی دل میں چوکیدار چاچا کے لیے
کوئی مناسب لڑکی ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک
اچھل کر ایک عورت سے جا گھرایا۔

نظر نہیں آتا مٹے ؟
شرف بڑی شکل سے اپنے آپ کو گونگے
سے ہکا کر لیک طرف ہل گیا اور اس عورت کی
آواز کے چہرے کی طرف سراٹھا کر شرمندگی
سے ہٹنے لگا۔

شرم نہیں آتی ہتے ہوتے ؟
شرف کا منہ آخر کر لک گیا۔
اسے کچھ کیا پتہ تھا تم اندھے ہو -

اب کے شرف غصہ سے کہنے لگا کہ ادھ
عورت جھانک کر آگے ہوئی اور شرف پہلے تو اسی
طرح ہنستا کہ گویا وہ عورت وہیں ہوا ادھر اپنے
راتے پہلے ہوتے سوچنے لگا کہ چوکیدار چاچا کے لیے جن
دنی ٹھیک رہے گی۔ وہ اسی کا خیال آخر اچھا
تھا - وہ جن دنی بھی اتنی مٹی اور اب اسکا سکون
میں آستانہ مٹی اور ایک زمانے میں اسے
رومن حروف میں اردو پڑھایا کرتی تھی - شرف
اس کا چہرنا مالالم تھا - وہ اسے اکثر اپنے
پسندیدہ شہر یاد کر دیا کرتی تھی۔

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
اُن کا تھا کھیل خاک میں کچھ کو ملا دیا
دہ کیے، بہن جی ؟ - سبھی اُسے
بہن جی ہی کہا کرتے تھے۔
تہیں کیا، کیسے ؟ - بس یاد کرلو -
بولو، لکھ کر جو -

شرف بڑی سبک ہنسی لگنے لگا -
چوکیدار چاچا سے اس کا بیان ہوجائے تو وہ اسے
بھی اپنے پسندیدہ شہر یاد کر دیا کہے گی۔
بولو، لکھ کر جو میرا نام - ادب چاچا کی کچھ
میں نہ آئے گا کہ کوئی لکھ لے تو وہ اسے تھپڑ رسید
کر کے بڑی ادبی آواز سے کہے گی - بولوا -
شرف اپنا کال سہلانے لگا - چاچا کب تک
نہ بول پائے گا ؟ - چاچا سے چار پانچ سال
بڑی ہے پر پچاس سال کے بعد سب ہی ہم عمر
ہوتے ہیں - میں آج بھی بھولے بات

سینچر شاہ — (بقیہ صفحہ ۷۱)

سویا گل چلو اچھا ہوا جہاں سینکڑوں قبریں کھودنے کے بعد بھی پتھر کی بنی ہوئی قبریں تھیں ہی تھیں، وہاں بغیر کھودنے کے ایک ہی قبر نے اس کا مسئلہ کر دیا تھا۔ قبروں اور قبروں میں بھی کتنا فرق ہوتا ہے۔ موت بھی درجات کو نہیں مٹا پاتی۔

اس روز شاہدادا شاہ کا غسل تھا۔ چاروں طرف چراغاں تھا اور زائرین کا جرم تھا۔ تو ان گلاں پہاڑی لڑکوں کو شاہدادا شاہ کی شان میں تعزیت بڑھ رہے تھے اور زائر کے سر پر سینچر لٹا تھا اور فخر میں مصروف تھا۔ اس کے ساتھ سپرد کا ڈھیر لگا تھا۔ لوگ آتے جا رہے تھے اور مٹھائی اور میوے کے ٹھیر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ زندگی کے بھر پور احساس کا نقشہ کھینچ کر مجھے مرتے ہوئے بھی کراہا ایک لڑکا آکر بولا:

”سینچر شاہ! ہمارا آگے۔“ قبر کھودنے کو بولا یا جا رہا ہے۔

سینچر کو جیسے جی کے مارنے چھوڑا۔ فاتحہ کے لیے اس کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے کر گیا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ سامنے جینی عورت چلائے گی۔ ارے ہمارا اچھا بھلا لڑکا دو۔ جہاں بھی دے دیا ہے۔

مگر سینچر کوڑھ چکا تھا۔ ”اے جاؤ اپنا چراگی۔ ہم کو کھو دنا ہے۔“ وہ بڑے اصرار سے بولا۔ اس کی نسل میں کھنے ایک آدمی نے کہا: ارے ابھی آمدنی کا وقت ہے۔ مت جاؤ۔ آج کا دن سال کا بولہ بند آئے گا، مگر سینچر نیچے اتر چکا تھا۔

”بابو! ات! آسمنی کا دن ہے تو کہا تھا۔“ کبر کھوڑا ہمارا چرچ ہے۔ ہمارے باپ دادا کا پیشہ ہے۔ ہم انہ کو کامو بند دکھا دیں گے۔ کادو بار کے لیے ہم میت کو تیار نہیں کر سکتے۔

اس کی آنکھیں بے جا ہو گئی تھیں اور ان میں زندگی کے کوئی انداز نہیں تھے۔ سینچر شاہ سے وہ سپر سینچر بن گیا تھا۔

○○

واوں کو پکارنے لگا۔ بھائیو! — اصرار دیکھو بھائیو! — مگر انگریز اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ اس نے چارے کو قبرستان تو پہنچا دو بھائیو! — شرف کو محسوس ہونے لگا کہ وہ زندگی کی بجائے مردوں سے مخاطب ہے۔ بھائیو! — چند لوگ آخر ٹھہر گئے۔ اس غریب کو قبرستان پہنچا دو بھائیو! — ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔ ایک آدمی نے بڑی موٹی ہنسی ہنسنے ہوئے کہا۔ اس سے بھی کہو آپ بھی چل کر وہاں جا پیٹے۔ ہر ہنہ ہنہ! — اب کا توئی کنگ ہو رہے تھے۔ ارے بھائیو! — کیوں بول کر رہے ہو بابا؟ — یو! — بعض نے شرف کی طرف پیسے پھینک دیے۔ یہ تو اور نو، اور جان چھوڑو! — دیکھو ان سارے بیک بیک گھولنے لگا کیا طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ میں بیک بیک منگا نہیں ہوں بھائیو۔ ہاں بابا، ہم ابھی طرح چلتے ہیں تم کیا ہو؟ — موقع پر اتر پورس آوارہ ہوئی۔ شرف کو حوصلہ ہونے لگا کہ اب لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا، لیکن پولیس والے اسے لاش سمیٹ اپنی جیب میں ڈال کر تھلے میں لے آئے۔

تھلے میں پہنچ کر بابا نے شرف کو حوالات میں بند پایا۔ بابا کو اپنی روزگار سناتے ہوئے وہ اتنا اٹھڑا ہوا تھا کہ گویا واقعی کوئی جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

پولیس انسپکٹر نے بابا کو ٹپے ٹھلے سے سنا اور جب اس کی تسلی ہو گئی تو ضابطے کی رو سے بابا کی ضمانت پر شرف کو رہا کر دیا گیا۔

واپسی پر شرف کے منہ میں برقی کی بجائے بازار کی مٹی اور انسان کے خون کا ذائقہ کھل ہوا تھا اور وہ ہاتھوں کی طرح بار بار ٹھوکر رہا تھا۔



کدوں گے۔ بھولا بھولتی کھجور چاربا توں میں ہی نام کرے گا۔ جانی رہ گیا اپنا چکر چار چاہ وہ تو بے چارہ جس رہا ہے کہ کسی بھی ہو بس ایک کجی کی عورت ہو۔ بولو، چاہا پاشانی کرے؟

کس سے؟ — وہ چکر مار کر پوچھے گا۔

اور کس سے؟ — وہی ہم سب کی بہن جی ہے۔ دھن دتی نہیں جی۔

چاہا اپنی داری میں بد ہاتھ پھیر کر اپنی ضرورت مانی ہوئی سرجوں کو چنچ کر دوا رہا چرگا۔ کہو چاہا، کر دے؟

ہو جائے تو ٹھیک اس پر پہنچے اپنی بہن جی سے بھی پوچھو۔ اور سنو! اسے دل سے نکال دو گے سادی کے باہر نام سالوں کی پوری پلٹنی کی کھاتر تو جا کر تار ہوں گے۔

اس کی تم کمرت کرو۔ بہن جی سے ہم بھی اتنا دے رہے ہیں کہ خاطر تواضع کے لیے کوئی آئے گا ہی نہیں۔ مگر یاد رکھو بہن جی نہیں شعر یاد کر دیا کریں گی۔

شیر؟ ہاں، بولو۔ کھ کر جو میرا نام زمین پر مٹا دیا۔ بولو۔ ڈرو نہیں! —

شرف جیسے جیسے بے خیالی میں پٹری سے نیچے اتر آیا اور ٹھوکر کھا کر ایک انسانی جسم پر جا کر اور ذرا سنبھلا تو اس پر جھک کر پوچھنے لگا، اسے یہی کون ہو جو ہم۔ اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ چونک کر اس پر مزید جھک گیا اور اسے سر سے پاؤں تک ٹھونکنے لگا۔ ار، ار! — یہ تو کوئی مرده ہے!

انہما گل کر سیدھا ٹھوکر لگا اور تھک ہونے لگا کہ اس قدر بھرا ہوا بازار اس لاش سے کیونکر غافل ہے۔ جب اس کی کھمبے نہ لگا کہ کیا کرے تو وہ چلا چلا کر آئے جانے

آج کل کی دہلی

سینچر شاہ



اس شہر میں رہ کر کبھی میں اس اہم شخص سے ملاقات
تھا میں اپنی حیرت کو قابو نہیں نہ کر سکا۔
”بڑا عجیب سا آدمی ہے۔ اس کی آنکھیں؟“
میں نے جملہ ادھور اچھوڑ دیا۔

”ہاں واقعی یہ آدمی عجیب سا ہے۔ شہر کے
میں لاتا ہوں۔“ ہارون نے پھر سینچر کو آواز دی اھ
”وہ سلام باجو“ کہتا ہوں لوگوں کی طرف اٹھا۔ ڈبلا
پتلا لباس آدھی۔ نیلی سی لنگی پر منسل اپن تھیں۔
جس پر کئی بوند لگے ہوئے تھے۔ ایک کپڑے کا چادر کا
ٹکڑا جس کی رنگ کبھی لال رہا ہوگا، اس کی گردن اور
کالوں کے گرد لپیٹا ہوا سردی سے ملافت کی تھام
کو کشش کر رہا تھا۔ دھن دھن پٹ اور پٹے
ہوئے مٹاؤں سے اس کی غزیت کا ڈھانچا تھا، مگر
میری نگاہیں تو اس کی بڑی بڑی منگے جان آنکھوں
پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں جو اس کے چہرے پر یوں
بڑی ہوئی تھیں کہ سردی کے موسم میں بھی
مجھے ایک گرم سی لہرائی پیش پراہم رہتی ہوئی محسوس
ہو رہی تھی۔ ہارون اس سے مخاطب تھے۔
”کھانا کھانا سینچر؟“

”بابو کی بات! ابھی تو جمان لگ کھانے ہیں۔
پھر سارا رات دھوہیں گے، صفائی کریں گے، تب
کہیں کھانا لے گا۔“ میں جواب دے رہا تھا کہ
میں نے

ہی نہ ہو۔ اس ایک لمبے ملاقات میں اس شخص
کی آنکھیں میرے شعور پر جیسے عادی ہو گئی تھیں۔
کھانا کھاتے ہوئے میں نے مرغ مسلم کی پلیٹ کی
طرف ہاتھ بڑھانا چاہا کہ میں اسے ایسا محسوس ہوا
کہ اس شخص کی بے جان آنکھیں مرغ مسلم میں سے
بچے گھوڑی رہی ہیں۔ بے اختیار میں نے ہاتھ کھینچ
لیا۔ ریاض کی بہن کی کشادگی کی دعوت کے اس
منظر پر دیکھ کر بے تباہ سردی جلد ہی مادی ہو گئی۔
اور ہم لوگ شامیانے سے باہر نکلا پھر بیٹھنے کے
ساتھ کھڑے ہو گئے گرم گرم کھانا کلاہ لیتے رہے۔
اچانک میرے پاس کھڑے ہارون نے کسی کو آواز دی
”سینچر۔ ارے او سینچر۔ کیا حال ہے؟“
میں نے فز کر دیکھا تو وہی شخص ہاتھوں میں
جھوٹی پلیٹوں کا بہار منہ بھالے خیمے کے دوسری
طرف جا رہا تھا۔ ہارون کی آواز پر وہ پیلا۔ اس کی
آنکھیں اسی طرح بے جان تھیں۔ میں نے بے اختیار
ہارون سے پوچھا، ”یہ کون ہے؟“

”آپ اسے نہیں جانتے؟ یہ سینچر ہے۔
چنگو مرد قبرستان کا گورکن۔ بہت محنتی آدمی ہے
اس لیے لوگ شادی بیاہ میں کام کرنے کو بلا لیتے ہیں۔
ہارون نے اس طرح کہا جیسے یہ حیرت کی بات تھی کہ

میں نے اسے پہلی بار جب دیکھا تو وہ
ٹیل پر رکھے ہوئے گلاس میں پانی اڈل رہا تھا۔
میں نے کھانے کی میز سے نکالیں اٹھا کر دیکھا تو میری
آنکھیں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اس کی غالی خالی
ڈراؤنی آنکھیں میز پر رکھے ہوئے مرغ
مسلم پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اسے مسلسل گھومنے جا رہا
تھا۔ اس کی عجیب سی آنکھیں دیکھ کر مجھے شہر بھر
سی آگئی۔ وہ آنکھیں کسی شے پر نہ آدھی کی آنکھوں
کی طرح بے جان تھیں۔ اور غالی نگہری
اور دریان۔ میں چند لمبے ان عجیب و غریب لفظی
آنکھوں کو دیکھتا رہا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ پانی
اڈلے وقت اس کا دھب ان مرغ مسلم کی طرف تھا۔
اگر گلاس سے پانی چھلک گیا تو میرا وہ گرم سٹوٹ، جو
آج لائڈری سے چھل کر آیا تھا اور جسے میں کسی تقریب
میں ہی کھپے بلگا ہے نکالنے کی ہمارت کرتا ہوں،
غلاب ہو جائے گا۔ میں نے انتہائی گہارت سے کہا:
”سمائی، دیکھو۔“ کہیں پانی نہ گر جائے؟
اس نے انتہائی بے فتنگی سے جواب دیا تھا، ”بابو
کی بات...“ جھانک سادی میں کھانا کھا رہا ہے۔
..... یہ کہتے ہوئے وہ دوسری میز کی طرف اس
پے نیازی سے بڑھ گیا جیسے میری بات کی کوئی اہمیت

اس کے لیے میں نے چاہ کر شہادت کی۔ مجھ کو اس کے چہرے کی ساری حسوں میں جگہ تھی، مگر وہ کام میں ملنے لگا اور اتنا کہہ کر برتن دھوئے کو ہانچا تھا۔

دوسری شام قادی صاحب کے سامنے دوسرے مزدوری اور بادچی کے ساتھ وہ بھی بیٹھا تھا۔ اسی قادی صاحب کا صاحب کر کے پیسے دے رہے تھے۔ اس کی باری آئی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا: "بالو! ہم سے دوپٹ ٹوٹ گیا، کتنی بُرا! آپ چاہئے تو یہ کٹ لیجئے۔ ہم سے دوپٹ گڑا ہے۔ یہ پھر وہ قذو کے بسد قادی صاحب کی خاموشی دیکھ کر لگاتار بولنے لگا: "کاٹ لیجئے پیسہ۔ کاٹ لیجئے۔ کوئی بات نہیں۔ ہم لوگ تو مجھ کو رہنے کے عادی ہیں۔ دو دن اور کھو جائیں گے۔ کام کما کر کاٹ لیجئے پیسہ۔ میں ہجرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس قدر لطیفان سے گفتگو کر رہا تھا جیسے یہ کھڑے کاٹنے کوئی رنج نہ رہتا۔ پھر قبل اس کے کہ قادی صاحب کھڑے ہوئے وہ خود کالی کے انداز میں بولنے لگا۔

"گمت ہی کو اب ہے۔ رات بھر کام کیا، مگر دوپٹ ٹوٹ گیا۔ کوئی بات نہیں، سب اللہ دیتا ہے۔ آپ پیسہ کاٹ لیجئے۔ اللہ کو دینا ہوگا تو کسی کو بھیج دے گا۔ اس کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔ ایک کو بھی بھیج دے گا تو دو دن کا دال دینی ہو جائے گا۔ یہ پھر اپنے پاس بیٹھ سکوئے باندی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مہنتے کا بڑا لیکس کہہ کر دے گا پھر دیر بہت ملے گی۔ ایک مُردہ بھی آجائے تو ہم دو دن کے لیے بے چارے ہیں۔"

تب میری سمجھ میں آیا کہ سچے لڑکیاں سے کسی کو بھیجی کہہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے ان جھجکاتری اشعار قادی صاحب پر ہوا تھا اور وہ ان باتوں کی قیمت کاٹنے بغیر بھیجی پوری مزدوری

اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔ میں کسی موقع میں ڈوب گیا تھا۔ ایک شخص کی موت کسی دوسرے کے لیے مرنا جتن بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک موت سینچر کو دو دنوں کے نگرے عطا کرتی ہے تو سال میں ایک سو بیاسی لوگ مر جائیں تو سینچر کو سال بھر کے لیے نگرے مل سکتی ہے۔ اسے ٹرسے شہر میں سال کے تین سو بیسھ ڈن میں ایک سو بیاسی لوگوں کا مرنا کوئی حیرت کی بات نہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ لوگ شہر میں مرتے ہوں گے۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ یہ سارے ٹرسے سینچر کے قبرستان میں دفن ہونے نہیں آسکتے تھے۔ خاص طور سے اس لیے کہ یہ قبرستان شہر کے باہر دوسرے سرے پر تھا۔ دوسرے قبرستان نزدیک تھے۔ سب سے بُرا مسئلہ جنازے کو کندھے پر اٹھا کر لے جانے کا ہوتا ہے۔ نزدیک ہو تو دو چار لوگ ساتھ چلے تو تیار ہو جاتے ہیں۔ اب اتنی قذو تک جنازہ لے جانے کی نہ کسی میں طاقت تھی نہ فصاحت۔ موت کی خبر سن کر لوگ اتنے بھی ہیں تو جنازے کی نمازیں شریک ہو کر اٹھ جاتے ہیں۔ ٹھیک ہی تو ہے مرنے والے کا ساتھ کچا نک دیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ تو ایسے مفر پر دلاؤ ہو جاتا ہے جس کی منزل کا بھی کچھ سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ پھر شہر کے نزدیک ہی نہ قبرستان بھی نہیں لگتا تھا جس میں انوار و اقسام کے پھول لگائے گئے تھے۔ چہار دیواری بھی تھی گیسٹ بھی تھا اور گیسٹ کے پاس دربان کے نیلے ایک کونجی تھا۔ کچا کا انتظام بھی تھا اور رات میں پورے قبرستان روشن رہتا تھا۔ نہ وہاں کسی کو خوف محسوس ہوتا تھا نہ شہر سے دوری تھی۔ پھول کی کاریوں کے ساتھ قادی صاحب کے قبروں کا سلسلہ بڑا خوب صورت لگتا تھا۔ اسی خوب صورتی اور ایسی روشنی تو بعض زندہ لوگ لے جاتے ہیں بھی نہیں ہوتی۔ اس خوب صورت بارغ میں فاختہ بڑے کے لیے اُنے میں عزیز و قارب جھلکتے تھے۔ نہیں تھے۔ ہاں یہ پتہ نہیں کہ ان بڑی قتلوں کی

روشنی قبر کی تاریکی میں کھسکتی ہو جاتی تھی یا نہیں پھولوں کی خوش بو میں کیا سانس بیکر کا لورنگ بڑے عادی ہوئی تھی یا نہیں، یہ قبر کے اندر کی دنیا کے لیے دیکھی ہے۔ باہر تو اٹھاتا تھا۔ پھول تھے۔ خوبصورت تھی پھر لوگ خواہ مخواہ سینچر کے دریاں قبرستان میں کیوں جاتے تھے اسی لیے سینچر کو دو دن کی بے نگرانی کے لیے جنیون انتظار کرنا پڑتا تھا اور زیادہ تر وہاں وہی لوگ آتے تھے جو نے قبرستان کی قبریں ادا کرنے سے معذور تھے۔ ٹرسے لوگ آتے تو شاید پتھر کو اٹھادیں وہاں کی بے نگرانی نصیب ہو جاتی۔

گرمی کی مائیں میں دیر میں سینچر کو کھوٹا ہوئے لیٹنے میں مڑا ہوا تھا۔ مٹی کے لیے کورے جسم پر چکی ہوئی تھی۔ اور وہ قبر کے اندر کھجکا ہوا اٹھ کر باہر نکلا تھا۔ پتھر کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اُٹھ رہے تھے۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔ بڑی شہرت کی گرمی ہے۔ جلدی کرنی چاہئے۔ ایک۔ کہا۔

"دو مہل قبریں پہلے سے تیار ہیں چاہئیں! خواہ مخواہ وقت برباد نہ ہوئے۔" دوسرے نے کہا "نئے قبرستان میں قبر ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ آپ جانیے نہیں میں کچھ کہہ دوں گا۔ ایک اور شخص نے رائے نہ لگا "لائی کو رضی تو کچھ کہے۔ یعنی جلدی سکھارے ہو جائیں بہتر ہے۔" چوتھے کی آواز آئی۔

"کسی پہلے لڑکے نے سینچر کو ایک لگائی۔"

"سینچر چلے گی کرو۔"

"بابو کی بات۔ جلدی تو کر رہے ہیں۔"

"کاجان دے دیں۔"

"تم جہاں دے دو گے تو قبر کو تو کھوئے۔"

لڑکھائیں کر لیا۔

"بابو کی بات۔ بچاؤں بابو لوگوں کو گاڑ

ہم کو کبھی کوئی گاڑی دے گا۔" یہ کہتے ہوئے

اوپر کی طرف سر اٹھا یا تو اس کی بے جان خوف نما

آنکھیں دیکھ کر مجھے عجیب سی لگتی تھی۔ ایسا عجیب

کیکٹس کا پھول



اس کی تمام زندگی کاٹنے دار کیکٹس کا جنگل تھی۔ بے برتنی سے بکھری ہوئی خود رو کاٹنے دار جھاڑیاں۔ شوخی بہنیاں اور پاؤں تلے پھل جانے والے ٹوکے خشک پتے۔ پتے جو بے جان تھے۔ پتے جو بھرتے۔ درد زرد، مڑھائے ہوئے اُداں پتے۔ جب کبھی پلٹ کر وہ اپنے ہامی کی طرف متوجہ ہوتا، اس کی یادوں کے بھر وکے سے محض ایک منظر جھانکتا ہوا دکائی دیتا۔ جیسے کسی نے اس کی یادداشت کی تختی پر اس منظر کو ہمیشہ ہوش کے لئے کندہ کر دیا تھا۔ وہی غرت زدہ گھرانا، چند افلاطونیک لکٹے۔ مال باپ اور ایک کھائی۔ بچپن میں ہی باپ کا سارے سر سے اٹھ گیا اور مال نے دوسری شادی کر لی۔ کسی دور کے رشتہ دار نے اس کی اور اس کے کھائی کی پرورش کی تھی۔ اپنے کھائی کی اُسے ایک ہی بات یاد تھی۔ وہ دونوں بہت چھوٹے تھے۔ ان کے کسی رشتہ دار نے ان کے ہاتھوں میں ایک ایک آم تمنا دیا تھا۔ آم چڑھتے وہ گاؤں سے باہر نکل گئے تھے۔ آم بہت میٹھے تھے۔ جب چوس چوس کر ان کے ہاتھوں میں صرف کھلیاں رہ گئیں تو اس کا کھائی بولا:

● بی ۱۲/۸۳ ڈی ڈی ایف ٹیٹس پبلشنگز
نئی دہلی ۱۱۰۰۵۵

”ان دونوں کھلیوں کو ہم زمین میں چاڑھ دیں گے۔ پھر ان کھلیوں سے دو پودے اُگائیں گے۔ پودے بڑھ جائیں گے اور جب ہمارے پیڑوں پر پھل آئے گا تو ہم.... اور وہ دونوں ہاتھوں میں تھامی آم کی کھلیاں زمین میں بوری پڑے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کے بعد سارا منظر گزرا کہوں کیا۔ ہیرام کے پیڑوں کی جگہ کاٹنے دار کیکٹس کیسے اُگ آيا۔ جب اس نے ہوش مستحیلا اس وقت تک اس کا کھائی اُسے تنہا چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا تھا۔ وہ بہت رویا، بہت پریشان ہوا اور اسی روز اپنے من میں ایک مصمم ارادہ کیا۔ کیکٹس میں پھول اُگلنے کا۔ اس وقت اگر کوئی اس سے پوچھتا۔ ارے پھل آدمی کتنے یہ کیا سوچی لکھنے کا کیکٹس میں پھول اُگلنے نکل پڑے؟ ارے کبھی خشک پتے زمین میں بھی پھول کھٹے ہیں۔ یہ تو مان چکوں کا کام ہے اور اس کام میں تو لوگوں کی زندگیاں گزندہ جاتی ہیں اور کچھ اس کی ساری زندگی خواہش کے کندھروں کے پھول اُگنے کے لئے ٹھکرا کر رکھ رہی تھی اور کچھ میں کیا ہوا.... مہدی تھیل کو نہ پہنچے پایا تھا۔ اس کا رشتہ تھا، کاٹنے دار کیکٹس کی ایک کٹک تھیں اُگنا۔ کٹ کٹ جھانٹ کر گزروں گنا۔ پودوں کو پوندھانا اور کسی نئی قسم کو وجود میں لانا۔ اس کے گھر

میں ہر طرف گلولوں میں کیکٹس کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ بوئی فصل کے کیکٹس سے لے کر دیوہندہ کیکٹس تک۔ جس کے خونخوار ترکیلے کاٹنے کسی دیوہندہ سے بڑے خونخوار کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس کی خواہش تھی کیکٹس کے پودوں میں ایسا پھول کیلے، جس میں جس مزار اور سیال بھی۔ رنگ و بڑ کا ایسا مزاج ہے دیکھ کر لوگ عیش عشق کر رہے تھیں۔ اپنی اس گن کے پیچھے بھاگتا ہوا زینا و اماں سے بے خبر وہ اپنی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جیسے کیکٹس کا پھول نہ ہو، پھول ہوا کھائی ہو۔

شہر سے دور آبادی سے اُگ تھلاک اُگس نے ایک جو بیڑی بنا رکھی تھی۔ اس کا نام بھی اس نے کیکٹس کا پھول رکھ چھوڑا تھا۔ دور کسی جنگل میں اُگلا۔ وہاں نے میں بڑوں پر چڑھا۔ ایک اچانک، آن چا یا پھول چنے کوئی پتہ نہیں کرتا اور مسواؤں میں چلنے والا باغیم کبھی اپنے ساتھ پھول کے کندھے بھی لے آتی ہے۔ وہ اپنے دامن میں بھی کبھی کوئی ایسی خوش بو سمیٹ لاتی ہے جو یادوں کی کسی انتہائی دلکش دلدی سے آتی ہے۔ اور انسان کے دل کے دماغ پر چھا جاتی ہے۔ ایسی ہی خوشبو سمیٹھی اس کے کھائی کے آٹے کی خبر۔ اُس نے سنا اس کا کھائی اس کی تلاش میں وطن فرما رہا تھا۔ کتنا افسوس اس کا کھائی۔

وہ اپنے لام میں گھویا ہوا تھا، لگ بھگ انہی جے میری سے اس کا سہائی اختیار کر رہا تھا۔ گھڑی گھڑی وہ اپنے کلائی پر بندھے ہوئے کروڑوں فری طرف دیکھنے لگا تھا کی ایک سوئی اسی جگہ سے اُسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اُس نے وہ پھول اُگایا ہے، جس کی خوشبو اُس نے ساری زندگی صرف کی تھی۔ اس کے من میں پھر سے ایک لالہ پانی جذبہ سیدرا ہوا۔ چرنک کر اُس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اس کی کلائی پر گھڑی نہیں لگا، مگر بندھا ہو۔ اور اس کی سوتلی ڈاننا سینٹ کے سینے پر سینٹ ہو چکی ہے۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دیکھا گیا تھا کہ وہ گھڑی سے باہر نکل گیا۔

تیز رفتاری سے وہ ابھی وہاں سے اڑ پڑے گزرا، اُس وقت بھی وہ کنکیش کے جنگل میں پھول اُگائے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے پریشان لیکن شورا اس کی توجہ میں غفلت ہوا۔ لگنے والے سوچنے لگا۔ یہ آزاد لی گھڑی تو مصنوعی ہیں۔ مگر کنکیش کے پھول میں انسانی خون کی رنگت ہے۔ میں مزدور کاٹنے کا کنکیش میں سمجھوں گا توں گا۔

کوئی شے ایسی نہیں ہے جو میرے پاس نہ ہو۔ آج میں اپنا ذاتی ہوائی جہاز لے کر ایک پردیس سے دوسرے پردیس جا رہا ہوں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ نہیں بھی اپنے ساتھ لیتا جاؤں۔ وہ خاموش رہا۔ ایسا سہا ہوا تھا اُسے اپنے کھوئے ہوئے سہائی میں ذرا برابر دل چپا نہ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں گھویا، ایک عجیب انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہا۔ ایک پھول دان اٹھا تا، اُسے اٹھاپشتا اور دیکھ کر رکھ دیتا۔ پھر دوسرا اٹھا تا۔ یوں لگتا تھا، جیسے یہ ایک کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔ اور اپنے سہائی کے مقابلے میں اس کے منی کے ناچیز لگنا نہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ماحول کی خاموشی اور بورت سے اتنی کہ اس کے سہائی نے ایک جہاں لی اور دنی زبان میں کچھ کہا۔ اس وقت وہ ایک نئے سے لگنا پڑھا ہوا تھا۔ اُس نے بڑے فور سے ہلے کوڑھیا اور پھر پاس پڑے ہوئے لال پینٹ میں اپنی انگلیاں ڈک کر لگنا کو پوتے لگا۔ جس لگن اور انہماک سے وہ اس لگنا میں گئے پودے کی دیکھ بھال کر رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ پودا نہ ہو بلکہ روشنی کا سرشتہ ہو، جس سے ابھی ابھی نوزلی کرنیں پھوٹیں گی۔ جھٹنے اطمینان سے

کتنی دولت تھی اس کے پاس۔ پردیس سے وہ جتنی دولت چورسکا تھا، اُس نے اٹھا لیا تھی۔ اس کا سہائی اتنا اثر ہو گا اس بات کا اظہار اُس نے نہ کیا۔ ورنہ اس کا سہائی خاص ہوائی جہاز لے کر اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آ رہا تھا۔ اس کے سامنے سکہ دینے کی تھا۔ جلنے یا نہ جانے!

اپنے سہائی کو خوش آمدید کہنے کے لیے وہ ہوائی اُڑے پر نہ گیا۔ اس کا سہائی اُسے گھو جتا ہوا شہر کے باہر اس کی تک پہنچ گیا جہاں اس کی جھو پڑی تھی۔ جھو پڑی کے باہر ایک موٹر گھر لگی۔ اس کی ہماک دمک اس کی آنکھوں کو دیکھنے دیتی تھی۔ جھو پڑی کے دروازے پر اُس نے سہائی کا استقبال کیا۔ بچپن کے پھیرے ہوئے سہائی بغل گیر ہوئے۔ نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اس کی باتوں میں بھر ہوا اس کے سہائی کا وجود نہ تھا بلکہ اس کے سہائی کے دلانی کپڑے تھے۔ اس کے خوش کنون کو ہر طرح جھٹلا رہے تھے۔ اس کے مقابلے میں اس کے سہائی کی پکڑے جان سی تھی۔ اس کی گرفت سے آزاد ہو کر اس کے سہائی نے اپنے کپڑوں کی سلیٹیں ٹھیک کیں اور ایک بھینسی کی ہنسی ہنسنے ہوئے کہا۔ نہ جانے کیوں اس نے ہمیشہ ہمیں ایک سہیل دار کام کے پیر کی طرح بھا اور تم بچے کاٹنے کا کنکیش، میں میں اُٹھ کر میری دیکھنے کا پیرے تار تار ہوجاتے ہیں؟

کاٹنے کا کنکیش کے پودوں سے بچا جاتا، ایک لہر لگاؤ کے ساتھ وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے چاروں طرف خاموشی چھا رہی اور کنکیش کے درے سر اٹھتے رہے۔

”جہیں یاد ہے ہم نے دوسرا اُگائے تھے۔“
اپنا پیرا پے ساتھ پردیس لے گیا۔ آٹا میرے پیر ل چل گئے ہیں۔ اس کی ہڈیاں سہنے کی ہیں اور ذل کی جگہ میرے پیروں پر ڈال دئے گئے۔ میرے اس اتنا روپے کے میں دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہوں۔ میں وادوں کی تمام ہوتیں مجھے میسر ہیں۔

بقیہ عمورتوں کی کانفرنس صفحہ ۴۴ سے

جوؤں کی بارش شروع ہوجاتی ہے۔ سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ قیامت کا سا شور برپا ہے۔!!

انا ولسور اور معدین: بچاؤ بچاؤ
بھاگوا بھاگوا! — اونی اللہ مرے کی بڑی قوت
عمی: ہاے میرا کولہا۔ کبوتر! میری جوتی کو چھوڑو
!!...!!

(اس طرح کانفرنس بغیر کسی اعلان کے خود بخود، جوؤں میں دال بٹنے کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے)

آجکل کی کہانیاں

۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک رسالہ آجکل
میں خاتون شاعرہ کاہنلا کا قلم
جہاں میں راجہ شہنشاہت
قرۃ العین محمد کے بارے میں لکھا گیا۔
قیمت: ۱۰ روپہ
بھٹن کا پتہ:-

بزرگ منیر، پمپلی کیشنر
ڈومین، پٹیلہ ہاؤس، شیواجی

مہرہ

کوئی سمجھتی نہیں رکھتا۔ صوفیوں پر کیا گورچٹلنے کی مانند ہی تم ہرے پیرے لائے ہو؟“
”کیوں نہیں سمجھتی رکھتا؟ تمہاری خوبصورتی انکھوں کو بھی لگتی ہے اور شاید اس کی وجہ سے تمہیں اتنی خور و قوت ملے گی۔“

”جہیں غریب نہیں ہوتا مجھ پر؟ اور لوگ تو تم پر رشک کرتے ہیں۔“

”ہونے نہ! اور لوگ رشک کیوں کریں گے؟ کوئی نہ کوئی بات قابل غور تو سبھی کی پوچھوں میں ہوتی ہے۔ اب تمہیں پوری دیکھنے میں لازم ملزوم ہے کہ وہ دلوں کے برابر کھڑی ہو کر بات چیت کر سکتی ہے۔ کھڑکی پوری کھل کر ہے

پہننے کا شعور نہیں مگر مسالے والے بیگن بنانے میں اس کا کافی نہیں۔“

”مسالے والے بیگن کی کیا اور قدرت کی حلائی ہوتی عورت کو خوبصورتی بالکل باہر ہی کیا؟“

”تم نے غریب کی بات کی تھی۔ اب غریب کو ایک ہی طرح سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ چاہے کسی بھی خوبی پر ہو۔“

”دیکھو وہ کدو جتنوں سے، اسے مس کے باری کی ضرورت تھی۔ اس کی خور و ستان میں اس کا مس ہی سب سے پہلے اس کا رخ ہی آتا تھا۔“

”مس کی ضرورت تھی۔ ایک ماں کے بچے میں بھی وہ شمس کے احساس کو بوسے نہیں رکھ پاتی۔ بیٹی دھماکا توں لگا

اور بیٹے نے رنج کی ناک کی نوک پر دوجا ہی کا عکس ہے۔

کے پاس نہیں تھا۔ اپنے کام میں اپنے لیے تعزیت کے لوازم بٹالینے کا۔ انھوں نے مگریش کا ایک طویل کش لیا اور بائیں

پر پاؤں پونچھ کر گھر کے اندر داخل ہوئے۔ وہ وجہ کو لینے آئے تھے۔ وجہ سنا یا مسنگا رکھے بیٹھی تھی۔ شہر کی

شمارہ شخصیت سے کر لیتا تھی تھا اس کا۔ خود فراموش سے دے دے مومن اپنی کاروباری پر نازاں کر اس کے سامنے

کھڑے ہوئے۔ ”تم تیار ہو گیا؟“ انھوں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ جھٹ سے جواب ملا تو چونک کر انھوں نے نظر پوچھ کر پوچھا۔

”ارے! آگے تو وہی ساری پہنی ہے جو میں دراز سے لیا تھا۔ بائیں تو وہی ہے جو میں اس بار لایا تھا۔“ انھوں نے بیوی کو غریب انداز میں اس طرح دیکھا کہ وجہ کو اس

روز پچیسویں بار اپنے صحن پر غور ہوا۔

”ایک بات بتاؤ؟“

”کیا؟“

”اگر میں بالکل خوبصورت نہ ہوتی، بے حس و حرکت ہوتی تو بھی کیا کام اسی طرح میرے لیے قیمتی ساریاں اور

زیور لائے؟“

”اور کیا؟“ وجہ کو ہونے بے فکری سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”میرے پیارا اور میری عزت و شہرت پر میری بیوی کی کاف

ہے چاہے وہ کسی بھی ہو۔“

”جیسا میری خوبصورتی یا بدصورتی ہوتا تھا اسے لیے

وہ مجھ کو ابھی ایک شمارہ دعوت سے کوٹے تھے۔ مسرود اور فتح مندی کے احساس سے شاد و دل

ایک غیر ملکی فرم کو ہندوستان میں ایک بہت بڑا سرکاری ٹیکہ دلوایا تھا۔ یہ ان کی ثقافتی اور سرکاری کا کمال تھا

ان اپنی شاندار دھڑوں میں جانا ہی کی کارگر ہوتا تھا۔ چند چمڑے لوگ تو وہاں کے ناشے کی مختلف اشیاء

ہی کو چاہتے نہ جاتے۔ وجہ مومن تھے جو بے خبر کے سر سے مسالے میں پیٹے ٹکڑے، بھنی ہوئی پھل کے گولہ گرام

کھکے، ان سب کو کھانے میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ ان کی ننان میں قدرتی طور پر ایک ٹکین چٹپٹا ہن تھا جو مکمل طور پر

کبھی میٹھا نہ ہوتا۔ ایک کشا میٹھا ذائقہ اس میں آہستہ گھلا جاتا۔

یہ زمانہ اور وجہ مومن کی ثقافتی، بس بات کی بات میں بات بن جاتی۔ وہ ملاقات کا وقت ملے کر کے گوشت کا ڈھیر

کے پکڑ نہیں لگتے۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ آدھا کاروبار ان دھڑوں میں ہی ہوتا جو جانا۔ ایک مونی رقم کیش

کا محنت میں گھر بچ جاتی۔ فیصلہ فزوں کی مانند محنت کو ہندوستان کی گھر کرانے کا طریقہ بھی ان کا یہ سارے

تھا کہ وہ سترے سے دھڑوں پر دائہ آہستہ آہستہ شروع ہوتا تھا۔ حیلہ نہ صرف لائے۔ تب شام کے کچن پر پڑا

میں ان کا ہن پری وجہ میں شامل رہی۔ اس وقت وجہ کو کہنے سے وجہ مومن ہی کے الفاظ آدھا ہوتے۔ وجہ مومن

• ای۔ ۲۸۰ • ایٹ آف کیش، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۵

دیے دھماپا پر ہوتی ہے، وہی غمناک، کامیاب ہونے، کامیاب ہونے کی قہر، خود اعتمادی، مگر جسم میں ماں کا شائبہ، وہی بڑی سی لپک اور ناگ چھٹی ٹھیک۔ بچن کی صورت ماں سے حتیٰ جلتی تھی، بچن ڈول بتا سکتے تھے، لالہ پھر باہر، سولہ سال کی عمر میں باپ کے کان تک چلا چکا تھا۔ وہی ان دونوں کو کچھ کر سکتی کہ وہ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت چھوٹے چھوٹے ہے مگر بچن کی انکھیں دیکھ کر دھماپا کانپ جاتی، گیسٹارک زخم خوردہ ساجد پر تھا، اس کی انکھوں میں جیسے اندھیلہ کوئی چھوڑی، اسے گھلا رہی ہو، کوئی بہار، دھوا، تھوڑی دھوا، انکھیں پر دیکھتے دیکھتے، اچانک اندر کو جھپٹا اور اپنے میں ڈوب جاتی۔ ان کی ایک سیرک پر تھا، دھماپا نہیں جانتی تھی کہ کبھی کبھی ہیضہ، تھوڑا سا کی انکھوں میں بھی تیر جاتا ہے۔ اس وقت کوئی آئینہ دیکھنے کا ہے۔

"چھوٹا باپ، یا سنی کرشنا، مورٹی کا قرض دھلائے لے چلتا ہے، ایک گروپ کو۔"

"کتنے ٹکٹ ہیں؟"

"جی، ان دونوں کے علاوہ ہم دونوں کے۔"

"ایک اور لے لیتے تو کیا ہو جاتا؟" دھماپا نے غصے سے کہا۔ "تھیں رجن کا ذرا بھی خیال نہیں؟" وہ تھوڑے سا تھکے کہیں آتے جاتے گا، نہیں تو اس میں خود اعتمادی کہاں سے آئی گی؟

"وہ جاتا تو ہے میرے ساتھ۔ جہاں اس کے جانے لانی جگہ ہوتی ہے۔ ان خبر لیوں کے سامنے وہ گڑبڑا جاتے گا۔ جنہیں تو معلوم ہے۔" دھماپا نے سمجھنے کے سے انداز میں کہا۔

"کیا؟"

"اس کی کیاں اب چلو۔ وقت کم ہے۔"

"تم آگھر وقت اپنا کر نہ رنٹلے کی ہی دھن میں دھمکے تو رنٹلے کو نہ مانے گا وقت سے گا کیسے؟"

"گھر، گھر، جا چکے۔ بن چکے۔ جتنا اس کے لیے مکی تھا۔ اتنے اچھے بیک سکول میں ڈالا۔ چلا دے؟"

"کیسے چلا؟ تم کبھی اسے لکھتے تھے؟ کبھی کتابیں

کھول کر دیکھیں اس کی؟"

"وہ سب دھماپا ہی رہی ہے۔ تھیں چلتا ہے کہ نہیں؟"

"ایسے ہی باپ ہیں جو....."

"جی..... ایسے بھی بیٹے ہیں جن کے سر پر باپ کا سایہ ہے ہی نہیں۔ یہ وہ ماں کے بیٹے ہی لائق مکی جی کر رہے ہیں۔"

"کیوں کوں رہے ہو اپنے آپ کو؟" دھماپا نے تھیں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ تم گھر پر زیادہ رہا کرو۔ اسے زیادہ وقت دیا کرو، جس سے وہ تمہاری ہی طرح..... جاتے تو ہوسکتے تھے اس قدر کتری کا احساس ہے..... تم سے..... اپنے جلتے....."

"تو کیا کرو میں؟" اپنے کو بھی اسی کی طرح کندھیں بناوں؟" دھماپا نے اپنے سر سے آواز میں کہا۔

"تمہاری کامیابی کی اس پر ہیبت سوار ہے۔ وہ تمہارا دھماپا کی طرف دیکھتا تھا۔ اسی لیے تو بھی نہیں اتنی بے رحمی سے پیش آتا ہے تم سے۔ وہ تمہارا بیٹا ہے جس کے جد سے تمہاری حیثیت کے مطابق جینا پڑتا ہے۔ بولو کہاں سے لاکے گا وہ اتنی دولت؟ تم تو بس ہر وقت میں ہر گھنٹہ پروریتے تھے کرتے رہتے ہو۔ بولو رجن کے لیے تم نے اب کیا کیا جیالیہ؟"

"اب میں ہی کرو دیا؟ کیا تک اپنی ہی جلی جاؤ گی؟"

"تو پھر وہی کہیں کیا تھما ہے؟"

اس نکتے تک کہ وہ دھماپا کا تھرو دیکھا ایک صحن کے احساس سے غمزدہ ہو گیا اور وہ اپنی بات پر سواہر نشان لگا کر خاموش ہو گئی۔ اس کے اس آخری وار پر دھماپا نے جھینپ گئے۔

اسی وقت دھماپا نے تھیں ہاتھ میں تھامے رہا وہاں پہنچی تھی۔ لہکی طرف دیکھا۔ زیورات سے جگمگ کرتی ماں پر مٹی ساڑی کے زری کے اٹھن ہی سے آنسو پونچھ رہی تھی، تباہ رنٹلے کے ہمارے گھر جے تھے اتنے پر شک تھی۔ رجن پر دے کے پیچھے سے جواں اس کی ہر جہاں لگے سے سر کی وہ یقیناً رجن کی تھی۔ دھماپا کی تھی یا ان کی خوشی تھیں لگی۔ وہ آگ انگریزی

ادب کا پھر دے کر آئی ہے۔ امتحان نہ ہو کر ایک دلچسپ گفتگو کی طرح چل گیا تھا۔ سوالوں کے جواب دیتے دیتے وہ یوں کھنکھاتی جیسے خود ہی ادب کی تخلیق کر رہی ہو۔ کچھ تخلیق کرنے کا احساس دل میں سانا چلا گیا تھا۔ سوال تو ہر سال کی طرح ہی سپاٹ تھے مگر شاید وہ لے ہی جھلکا افراتے۔ دھماپا نے جواب نہیں دیا وہاں تھی تب ان کوں کی خوشی سے چمک پڑی تھی۔

"پتا ہی! آگ کا پھر۔ میرا جی چاہتا تھا میں نے بجلے۔ پھر گھنٹے ٹنگ....."

"تم پر دے کر اب آ رہی ہو؟ کہاں رہ گئی تھیں۔ دھماپا نے تھیں سے سختی سے پوچھا۔

"دھماپا نے گھر کی تھی۔ اس سے انگریزی ادب کے کچھ بہترین ناول....."

"آج ہی بیٹے ضروری تھے؟"

"پتا ہی! آگ کا پھر۔ میرا جی چاہتا تھا میں نے بجلے۔ پھر گھنٹے ٹنگ....."

"کل رجن کا کون سا رہا ہے؟" دھماپا نے تھیں کی آواز سے اس کی ہی کاٹ گئی۔

"کل؟ رجن کا؟..... ہندی کا....."

"تو تھیں گھر سے پڑھا تھا میں جانتے تھا؟ اگر اس بے جا بے تھوڑی مدد کر دو تو کیا بکھو جائے گا تھلا؟ تم تو تھوڑا بڑھ کر بھی فرسٹ ڈویژن لے لو گی۔ وہ سولہ کا ہو کر بھی اچھو میں دھکے کھا رہا ہے۔"

"پتا ہی! میں اسے ہندی کہاں پڑھاتی ہوں؟ اس میں وہ ٹھیک ہے۔"

"پھر میں کیا تم جانتی تھیں کہ اس کا دل لے کر کر دے؟ وہ بھول جاتا ہے۔"

"پتا ہی! میں اس کا گھر و راج نہیں ٹھیک کر سکتی۔ صرف اپنا فرسٹ آنا بند کر سکتی تھیں تاکہ متاثر نہ ہو سکے۔"

"بہت جیت ہو گی تو؟" دھماپا نے دھماپا سے ایک ساتھ ہی بولی پڑے۔

"دیدی! دیدی! یہاں تھا تو بلیز؟" ساتھ سے کمرے سے لڑکی کی تھلائی ہوئی آواز آئی۔ ایک سسکتی ہوئی وہ غصے سے اس انداز میں دھماپا کے پاس پہنچا تھا۔

ایسا جان چڑا کر دوسرے کو بے چین کر دیا۔

”اور دیکھتا رہا پرچہ بہت اچھا لکھا۔ اس کا رگ بس ہے چارے کے سامنے لپکتے گا فوراً تیرا ویسے ہی ذوق ہے کہ اسے اپنے آپ کو کمزور اور ناکارہ سمجھتا ہے۔ وہ مجھے کوئی نہ سمجھتا مگر دیکھی آواز میں کہا۔
”میں میرا حیرت زدہ رہ گئی۔ پتا نہ کرے سے چلے گئے۔

”دیدنی! یہاں آؤ۔ درجن نے پھر کارا۔

”اے! یہاں ہیں! بس گھر میں گھسے ہی مجھے بھائی کا کپڑا لے کر بیٹھ جاتو۔ اس سے تو میں دیکھ کر گھری رہ جاتی تھی۔ تم..... تم کیوں نہیں دیکھتی کئی طرف وہاں جیسے؟ آخر تم کی کیا بات ہو۔ میں نے غصہ سے کہا کہ ایک کتابیں پڑھا ہے اگر کچھ لکھو دے سے ہی بیٹھے چنے اور خوب بیٹھے بولنے نہ دیا جائے تو وہ رٹا رڈڈ (RETRATED) ہو جاتا ہے۔ ہار لاکے قہر ہے کہ اسے

میں نہیں معلوم آپ کو؟ اس نے ہندوؤں کے کتنے کونا تیرہ بچوں کو الگ الگ گروں میں رکھا، ایک ہر ایک گروہ دوسرے کو جیسے نہ بندروں کے ساتھ اور دوسرے کو مال کی طرح لکھ کر بیٹھے۔ ان سے بنی بندریا کے ساتھ وہاں آئیں سے بنی ایک ہندیا بھی رکھ دی۔ تیسرا بچہ دن رات پڑے اون سے بنی بندریا کے ساتھ چپڑا رہا۔ اس نے اسے گراہٹے اور مخالفت کا مرکز بنایا تھا۔ جلد وہ بیٹھے

ہوئے تب انھیں قدرتی تحول میں دوسرے بندروں کے ساتھ کھلا چھوڑ دیا گیا۔ قہر بگڑا میں پرورش پائے ہوئے بندروں کا سلوک، جنسی تعلقات سے لے کر سماجی تعلقات تک غیر فطری پایا گیا۔ سب سے زیادہ چھوٹا

بچہ تھا جسے والا بچہ تھا اور صبح کے پکڑے اون کی بنی مان کے ساتھ رہنے والا..... تم تو بار بار اس کی کہنی مٹی ہو۔ تم تو کبھی سے اون کی نہیں ہو۔ تم نے کہیں اسے ہمیشہ آپا کے پاس رکھا؟ اب جب وہ بچہ پھر رہ گیا، تم اسے وہاں کے بچے کی طرح پانا پوسا جاتی ہو؟ اپنے احساس گناہ سے غراھا میں کرنے کے لیے۔ لیکن ایسے جانا ہو گیا ہے۔ اب وہ دھمال کا بچہ نہیں ہے۔“

”تم، دیدنی، سے کہو یہاں آگیزی کتاب تاش کرے۔
مگر کئی گنا زور دئی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جی بھی

رودی۔

”تجھے شرم نہیں آتی بھیا؟ یہ سب الزام تجھ پر لگتے ہوئے؟“ وہ چلنے روکتے تھے ہی رمجھا کو لڑنا چاہا۔
”بڑے بڑے کتابیں ہنگ دیں اور تیری سے روٹی کھانا جیوا اور تیری جوتی رمجھا کے بچے سے راستہ کا شائبہ بھر نکلی گیا۔

”ارے! کہاں چلا؟ وجانے گھر اگر پوچھا۔

”اوسے کل تیرا پرچہ ہے بلایا؟“ رمجھا بھی ڈانگی۔

وہ مجھے نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ آج جیوا کا جان نہیں ہو گا مگر انھیں پہچانی ہے۔ بہت بڑا کنکریٹ ہاتھ لگا ہے۔

”بڑی تیز رفتروں سے چلتا رہا ہے۔ اسے لگتا کہ اس گھر میں ایک خطرہ چھپی ہے اور وہ اسی پر چھپتا ہے۔
”مہو ہے۔ اسے کیسے والے ہاتھ کی ہیں۔ سب اسے من چاہے چوک میں رکھ دینا چاہتے ہیں بتا جب اسے مہاؤں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو اس کے قدم تھکا کی طرف ہی زیادہ اشارہ کرتے ہیں۔“ دیکھا آپ نے
”مہا جڑاؤے کو۔ اسی سے جناب میرے کان کاٹنے لگی ہیں اور دو ایک سال میں مجھے مات ہی دے جائیں گے“ ان کا وارث..... رجنی۔

”پتا اس سے بادشاہ کی جال جھوٹا دینا چاہتے ہیں۔
”مجھ بھی بتائی کہ گھر ہی میں روک لینا چاہتی ہیں تب اسے وزیر بنا دیتی ہیں دوسرے کمپ کے بادشاہ کی قلعہ بندی کے لیے۔ رجنی! دو شکست بادشاہ کو... اپنے پتا کو.....“ دائیں چل چلا ہے باتیں، تمہیں پھر

ہے جادو طرف۔ بس بادشاہ کو گھیر لو، حتیٰ اس پر جان دے سکتی ہیں مگر اسے اپنی طرح سے جیسے کا حتیٰ نہیں دے سکتیں۔ اسے ان کی سرزمین اور گھر چھوڑنا پڑے گا۔
”رمجھا اپنی سہیلیوں کے سامنے اسے گھونٹے کی چال چلا دیتی ہے۔ بس ایک دم سے جھنڈا دے گی۔“ تمہیں معلوم ہے رجنی تنہائی میں کوئی باتیں

لکھتا ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ انگریزی دے پڑیں۔ وہ ہندی میں لکھ لکھتا ہے۔ ایک دم ناؤرن پڑھتی۔
”میں کہتی ہوں اس کی چال لائی کی پڑھتی ہیں پورا کا پورا

”کافکا“ جھانکتا ہے۔ مشن نہ رجنی، اپنی کوئی گوتیا۔

چل دی شمشادے جس میں دیوار پر بھی مری ہوئی چھلکی کا عکس لکھتا ہے۔

”رجنی! کہاں چلا ہے؟ دیدنی! مت مجھے سب کے سامنے۔ وہ کوئی تنہا نہیں ہے نرم ہیں، گھر سے، درد دیتے کھلے نرم۔ تمہیں اگر مجھے اکیسے بنا پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے تو مت دیکھو مجھے اپنی ہوشیار دوستوں کے سامنے۔

”مگر آج ابھی تاجی درمیان میں ڈنک پڑتے تو دیدنی آنا خوش تھیں کہ وہ دونوں ہندی۔ وندیا بڑھ چکا کہ حضور ساتھ ساتھ کانی پنے جاتے۔ وہ وہاں پہنچے کوئی سا آنا کیوں نہ ہو کرتا غائب کیے نہ ہوتی کتنا مزا آتا ہے خوش و خرم دیدنی کے ساتھ نہیں رہنے میں!..... نہیں... رجنی کو رمجھا کی کامیابی سے کوئی نہ مددیں شاید ہی کی کو۔ ایک دن انھوں نے ہی چڑ کر رمجھا کے کہہ دیا تھا ”اے! یاد ہے تیرے فرسٹ دوست آئے سے؟“
”آخر تو گھر ہی سمجھانے گی۔ اس سے تو بھلاؤ عقل نہیں دے دیتے۔ کچھ تو اتنی اس کے؟“
”دیدنی پڑا اچھی نہیں۔

”حتی! علم صرف نفع حاصل کرنے کے لیے نہیں ہوتا اور عقل سے صرف تجارت نہیں ہوتی۔ ذرا سوچو رجنی! مجھے ہمارے دنیا کی ہر بہترین چیز میں لطف دیتا ہے۔ خوشی کا احساس اس میں عقل پر منحصر ہے۔ میں دنیا کی کئی دھنوں کے عوض اپنی عقل اور سمجھنے دے سکتی۔ اس کے بغیر تو ہم انسان نہیں، مہتری ہیں۔“

”رجنی شاید مہتری ہی ہے۔ مگر اسے کرم کی کتنی حسرتیں کوں ہیں؟ بتاتی ہے اس نے انھیں کہتے سنائے ہر ایک کی بات اور ہر بات کی کاوی جواب۔

”سنو، جب وہ جہنم کا ہو جائے گا تب اس کی شادی کریں گے؟“

”کیا؟“
”شادی کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لیکن کیسے وجہ؟“
”تب پھر؟ شادی تو ہر ایک کی ہوتی ہے۔ اس کے

کوئی لڑکا بالابالا بھی تو تہاری نس چلے گی؟
میرا ایسا کون سا راج پات ہے؟ پتا ہی دکھی
آواز میں کہتے۔

آخر پتا دیا ہے میں نے تمہیں۔ اسے کچھ ماننا نہ نا
تمہارے ہاتھ میں ہے۔

کچھ سمجھو، کچھ قول کرو دجنا؟

آخر تم بھی تو اُن کیس برس کے ہی تھے جب رمھا
پیدا ہو گئی تھی۔ پھر اسے ہی کیوں ہر چیز سے محروم.....
مٹی دوڑی۔

”رمھا!“ پتا ہی دیاڑ پڑتے، اس دیر پر جس پر
ابھی بہت فخر ہے جو اس گھریں ان کے برابر کھڑی ہو کر
بول سکتی ہے۔ جس سے بات چیت کر کے پتا ہی کو اعلیٰ
ہو سکتا ہے۔ دیدل اگر کچھ انجلی بھی کھڑی ہو جائے۔

”رمھا، تمہیں اپنی ماں کا ساتھ دینا چاہئے۔ وہ
ہر وقت رنج سے ساتھ رہتی ہیں۔ میں تو کام میں پھنسا رہا
ہوں۔ تمہاری ماں بہت اکیلی ہو جاتی ہیں۔ کہہ کر ہاتھ پیچ
سے باہر چلے جاتے ہیں۔ دیدل کو اس بات کا شاید پیسے
سے اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اور اتھر جاتی ہیں۔

ایک تہہ ایسے موقع پر وہاں جا کر رنج قہقہے لگانے
لگا تھا۔ اسے لگا تھا اگر اس کا ہنسنا لوگ کیا نوادہ اتنی ہی
زور سے رو دے گی کتنا کھرائی تھیں۔

”رمھا، ایسے کیوں نہیں رہا ہے؟ کچھ کرنا رمھا۔“
رنج نے ہنسی کیے بغیر کہا تھا۔ ”جی، جی تمہارا ہر
اب بہت گھسی گیا ہے۔ اسے ہینک دو۔ بازی آلت دو
نئی۔ بات نہیں ہوگی۔ آخر کب تک تم لوگ مجھے ہرہہ بنا کر
لیک دوسرے کو ستاتے رہو گے؟“

مٹی سفید پڑ گئی تھیں۔ رمھانے اسے کندھے
سے پڑ لیا تھا۔ خوب کس کر
”چل رنج، چلنا میں چل کر کافی پی کر آتے ہیں۔
چل نا۔ کتنی فخری مٹھاس بھی دیدل کی آواز میں،
جیسے وہ دو گھنٹی واڈوں میں بیٹھے کسی گمشدہ کو واپس
لانا چاہ رہی ہوں۔ جی بھریں رنج شانت ہو گیا تھا۔ دوڑنا
کافی پینے چلے گئے تھے۔

رنج ایک بان والے لی ڈکان پر ٹل کر کھانڈ
”کیا دوں پھرنا سیٹھ؟ اسے اب تو بڑا ہو گیا اپنا
سیٹھ، دم لگاؤ نا۔“
”مجھے ایک ٹیر کا دے دو۔“
”چھ! چھ! بڑا سیٹھ کیا بولے گا؟ پینا ہے تو
فرنگ نکال دیتا ہوں، وہ اُدھر چھپا کر رکھا ہے۔“
”نہیں، نہیں، میں بڑی ہی بیوں گا۔ جلدی کرو۔
مجھے جانا ہے۔“
”کدھر چھوٹا سیٹھ؟“

”کافی باؤس؟“
”سوالی ہواؤں؟“
”نہیں، پیدل ہی جاؤں گا۔“
”کیوں؟“

”کیونکہ میں وہے موہن نہیں ہوں؟ رنج جمع پڑ
ہاں وہ وہے موہن نہیں ہے، نہیں گھر پر گاڑی پھینک
کر پیدل بیکر کرے جانا بھی دشوار ہے کیونکہ اسے پیدل
دیکھنے ہی ہر پوچھنا والا لغت دینے لگتا ہے.....
کیوں جناب؟ کچھ دوڑوں گا ڈیڑاں خوب ہو سکتی
کیا، لائیے میں چھوڑ دوں۔ آخر کب کب موقع ملتا ہے۔
پتا ہی اب پہلے موہن میں کچھ کرنا ڈیڑا لیت جاتے ہیں پھر پانی
چلے جاتا۔

”گرجن تو تمہیں ایک پیادہ ہے۔ پیادہ تو ایک
ایک قدم آگے چلتا ہے۔ بس ایک ہی قدم آگے۔
ناک کی سیدھ میں۔ وہ بھی اگر راستہ صاف ہو
تب..... تبھی سے ایک اور خیال آیا میں اگر اُٹھ
ایک بار چل سکتا ہوں..... صرف ایک بار.....
جب..... جب بادشاہ کو مارنا ہوتا ہے۔“

● ترجمہ: بانو تاج، رتبہ قاضی، ۱۔ ۱۔ نیرنگ لکلا
پلاٹنگ۔ سولہ لان، چیمبر پور، ۲۴/۲۴ (مہاراشٹر)

یہ بکھری کڑیاں - بقیہ صفحہ ۷

تجی جے ننگن کے فیض کی طرف بڑھتا ہوا اپنا ملک
ہندوستان یاد آیا۔ آد! کیا ہندوستانی تہذیب کو
پڑھنے کے لئے روپ ڈالنا پڑے گا۔ بعض اور
مانائیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ رومانا خانہ آج
سبھی گھر کے دیواروں کو کھانا کھانے کے بعد ہی خود
کھانا کھا رہی ہے۔ ہندوستانی دیہات کی یہ روایت
رومانا خانہ لڑکیوں کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی اور
صاف لگی ہوئی۔

ہالینڈ میں ہندوستان کے مہاجرین سے
واقف ہوئی، لیکن انہیں بھی یہ علم نہیں کہ رو۔

ہندوستان کے ہیں اور دھندھزار
سال پہلے اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ ہمارے
غیر بکھری بھی سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مہاجر صرف
۱۰۰۔ ۲۰۰ سال قبل ان ممالک میں پہنچے تھے۔
لیکن ان سے پہلے آئے والے رومانوں کی طرف کسی
کا دھیان نہیں جاتا۔

رومانا جس زبان کو اپنے گھر میں بولتے ہیں اس
میں پنجابی، ہندی، براج، راجستانی، گجراتی اور اڑی
الغیہ لکائی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مثلاً کان، باکھ
(بکھ)، بال، ناگ اور کارا وغیرہ الفاظ اپنی اصل
میں موجود ہیں۔ ہاں مختلف ممالک میں گھومتے رہنے
کی وجہ سے ان مختلف ہو گئے ہیں۔ ان کی یہ زبان رومانائی

کہلاتی ہے۔
نیو یارک کی ایک یا دو اسکالر ڈاکٹر ریمان سوپر
نے مجھے بتایا کہ ایک وقت تمہا تب رومان لوگ اپنے
مردوں کو جلاتے تھے، لیکن اب عیسائیوں کی طرح
دفنانے لگے ہیں۔ کینیڈا کے پروفیسر ایلٹ مڈ
اور پروفیسر کلاں سامپن نے بھی اسی قسم کی خیالات
کا اظہار کیا ہے۔

اور میں نے ختم ہونے والے سفر کو سونڈ
میں میں چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گیا۔ رومانائی
بہنوں کی میٹھی یادیں اپنے دل میں لے کر واپس آئے
سفر کی تلاش میں مبتلا میرا میں.....
ترجمہ: مدد برہان عثمانی

عورتوں کی کانفرنس

اسٹیج پر پینٹال میں پہلی بازار گرم ہے
— ہر عرصے کے بکوں اور عورتوں کا اجتماعی شورش را
ان کی فطری صلاحیت یا عادت کا بیاں جو دل نظر
وا احترام ہے حالانکہ انڈسٹری صاحبہ کی کمی
مرتبہ دخل در معقولات قسم کی کوشش بھی کی ہے
لیکن حاضرین کو خاموش کر لیا نا نازک اور کھٹن
مرحلہ ہے۔ جب اسٹیج پر دو عورتیں کے بچوں نے
ماں کو فون کو کھولنے کی طرح استعمال کرنا شروع
کیا تو ایک جامعہ بزرگ نے کانفرنس کی کاروائی
شروع کرنے کی تنبیہ کی۔

انڈسٹریک ایسی لڑکی ہے جو شباب سے
لدی پسندی اور دشمنی کے آہنی دھاگوں میں جکڑی
ہوتی ہے۔ (اب شو کچھ کم ہو جائے، موقع
پاکر انڈسٹری اسٹارٹ مینی ہے)

انٹرنسور : خواتین کرام! جیسے بارات
کے لیے ایک عدد دولہا کی ضرورت ہوتی ہے اسی
طرح کسی بھی کانفرنس کے لیے ایک صدر کی ضرورت
ہوتی ہے۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے عید طمانیت
کا احساس ہوا ہے کہ اگر کسی صدارت کے لیے چل
دیا کی بڑھ تازہ انتخابی کا مرحلہ سے آگے
بڑھتے سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔ فرد امدادی کے
ذریعہ صدارت کے لیے جن صاحبہ ۲۴ نکات پر

• سبق کرتے ہوئے، فیصلہ بخیر (دوبلہ) ۲۳۶۰۰

انتہائی مدبر، موقع شناس، انصاف پسند حق گو،
اور کھیل قسم کی عورت ہیں۔ مزید خوشی کی بات یہ ہے
کہ موصوفہ تازہ بہ تازہ، فوہ نو بیوگی کی سعادت سے
سرفراز ہوئی ہیں۔ آپ کی طبیعت بھی نا ساز ہے
اُن کی کہوں سخت درد ہے، بیڑ بچھا ہوا ہے
اور پینٹالیاں کٹی جا رہی ہیں۔ یہ ہم ذلت مہیلاؤں
کی خوش بختی ہی تو ہے کہ آپ ناگفتہ بہ حالت کے باوجود
کانفرنس کی صدارت کے لیے اسٹریج پر بڑھ کر لائی ہیں
— میری حمد حاضرین سے درخواست ہے کہ آپ
لوگ ہر نماز کے بعد اور ہر پوجا پاٹ کے موقع پر موصوفہ
کی صحت و تندرستی کے لیے دعا کریں تاکہ ان میں
بیوگی کی زندگی کا مقابلہ کرنے کی حکمت پیدا ہو سکے
..... ہاں تو میں حسب قاعدہ صدارت کے لیے
مقررہ "اکوٹو ٹیم ڈھیسٹ" کا نام نامی پیش کرتی
ہوں۔

حاضرین : بحالت میموری ہم سبھی تائید
کرتی ہیں۔

انٹرنسور : صدر صاحبہ آپ لوگوں کا
شکر ہے اگر کرتی ہیں..... اب میں ہجرت صدر سب
سے پہلے "انجن انکسڈر ایمان" کی صدر محترمہ جناب
"ناگتھانی خاتون نکاحی" سے درخواست کرتی ہوں
کہ وہ تقریر لائیں اور اپنے مسائل کی پیچیدگیوں
سے آگاہ فرمائیں!

ناگتھانی خاتون نکاحی : بلو بھڑ

اور کنواری بختیو! مجھے اپنی دیانت و دہر پر آج
بُری طرح فخر ہو رہا ہے، کیونکہ سب سے پہلے مجھے
انہما خیاں کا موقع مرحمت فرمایا گیا ہے۔ اور یہ
میری صلاحیتوں کے اعتراف کے مترادف ہے۔
ویسے تو ہم بن بیاہی لڑکیوں کے پیچیدہ مسائل
سے ہر طبعی اور حکمتی فکر کے افراد کو بے واقف ہیں
لیکن واقفیت کے بارودان سے چشم پوشی کر کے
اپنے مفاد کو اٹو بھکر سیدھا کرتے رہتے ہیں ہمارا
اہم مسئلہ ہے برکی تلاش! جب والدین اپنے
نوبت جگر کے لیے لڑکی تلاش کرنے لگتے ہیں تو بھاری
جہیز کے مطالبے کو سماجی ضرورت کے طور (درپردہ ہی
ہے) پیش کرتے ہیں اور اپنے بیٹے کا حق خیال کر کے
جہیز اور نقدی کی وصولی پر بصورت لازمی خیال کرتے
ہیں۔ ایسے موقعوں پر لڑکی کی خوبصورتی اور خوب
سیرتی میں خیریاں ضمنی ضرورت بن کر رہ جاتی
ہیں۔ اگر ہم میں سے چند دانشمند لڑکیاں اپنے
من پسند لڑکے کو دام عشق میں پھانس کر اپنے
نکاح میں لے آتی ہیں تو وہ بلا جگہ جاتا ہے غلامانہ
کی تائیں ذبح ہو جاتی ہیں۔ خاندانی اقدار کی مٹی
پلید ہو جاتی ہے۔ ہم ہر جہتوں اور الزامات کی
جھڑی لگ جاتی ہیں اور ہم کو بیکہ "فلورڈ" قرار دی جا
ہیں، جبکہ ایسا کر گزرتے سے ہم نہ صرف بیوگی پر دم کا
چروہ صبح کر ڈالتے ہیں، بلکہ لٹا لٹکے سے ہر بوجھ
کے کچھ نہ کچھ وصول ہی کر لیتے ہیں۔ (تالیاں)

— بہنوں پر بھیج کر انت ہی تو ہے کہ موجودہ
دور میں شریک چھاپ ہا مشقوں کی تعداد میں نصف
افضل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور پیش کے پانچ
مستقبل کا خواب دیکھنے والے والدین کو یہ گھبراہٹ
کی کھائی پڑ رہی ہے۔ بے چارے کسی بھی نوعیت
مندکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ مگر مجبوراً دکھانے
ہیں۔ اس زندہ دہانہ حقیقت کے باوجود وہ اصل
کے ناخن لینے کو تیار نہیں ہیں۔ اور یہی چیز
کی انت کا ہی کرشمہ ہے کہ جن وارد والدین کے
لوگ کو گھر گھر لائی چیز پر متوجہ جالے وہ لڑکا
محنت و مشقت سے گھبرائے لگا ہے اور لڑکی دالوں
کے ذریعہ راز ہوا دھن چھڑوں کی خبر کرتا ہے۔ یہ مانا
کہ اس طرح بے روزگاروں کی صف میں سے
ایک بے روزگار باہر نکل آتا ہے۔ لیکن وہ کچھ عرصہ
بعد ایک بے قصور لڑکی کو بیوی بنا کر اس کی زندگی
کس بے دردی سے اجیر کرنا ڈالتا ہے! یہ دھکی
چھپی بات نہیں ہے۔ اس مسئلے کا دلچسپ
پہلو یہ ہے کہ غریبہ والدین جب اپنی کسی خوشی
کے لیے لڑکا کا ش کرنے کو مجبور ہوتے ہیں تو چیز
کی رسم کے طور دشمن نظر نہ لگتے ہیں۔ دنیا بھر کے
آدمیوں کی گھڑی سرور اٹھائے دربار سے
مارے بھرتے ہیں۔ لیکن ان بے چاروں کو بھی اسی
صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کا یہ دم لڑکا
کو کراتے ہیں۔ جیسی کرنی دسی بھرتی، کہا دست
پرانی ہونے کے باوجود قدیم کو پہنتی ہے اور اس
وقت دیر آیز درست ذریعہ والی بات منہ چارے
انھیں سمجھنے کے لیے تیار کھڑی ہوتی ہے۔ اسے
لڑکوں کی والدین! تم آپ سے بڑے زوردار ہیں
کرتی ہوں کہ اپنے شوہروں کے دماغ میں بیٹھے
خناس کو دور کیجئے! اور ہم بھی بیاریوں کی تنہائی
کے احساس کو محسوس کیجئے! آپ کو ہماری جوانی
کی قسم آپ اس بچہ پر کی کہ وہ دیکر کہہ ساری
دوشیز کی لاج رکھے! اور اپنے بہن بھائیوں کو
قبل از وقت سنا بولتے کی منتی پر بہرہ نچے

سے بچائیے۔۔۔۔! آخر میں میں خدا سے دعا کرتی
ہوں کہ خدا اس یا مقصد کا لہرئس کو کامیابی سے
ہنگامہ فرمائے۔ (آمین، آمین، آمین۔۔۔)
انٹرنسور: نکاحی صاحبہ کی عقل پر پند
کے غفلت کے بعد، میں ایک ایسی خاتون کو پیش
کردہ ہوں جو آزاد راجی زندگی کے تلخ تجربات
سے گزر رہی ہیں، جیسے کوئی گیسر کا مریض موت
کی میٹھیوں سے کڑا ہے۔ میری مراد ہے "Mrs
"مختلہ" جو اس کی جزیل سرکڑی مستحرم
آزاد راج خان صاحبہ سے! آپ اپنے تجربات کی
روشنی میں شادی شدہ عورتوں کے مسائل سے عین
مختصر روشناس کرائیں اور ان کے حل کے لیے
ماحول کو چھوڑنا ہیں۔

آزاد راج خان: ماؤ، بہنوں اور چوہو
آج کی کالفرنس کا مقصد جلد خواتین کے جملہ مسائل
پر غور و خوض کر کے انھیں حل کرنا ہے! میں ایک
ایسی ایسوسی ایشن سے تعلق رکھتی ہوں جو میریٹر
(مختلہ) خواتین کی مضبوطی بڑاتی ہے
ہماری آواز نے کئی بار ساج اور سرکار کے ایوانوں
میں زور سے بولائی ہے، مگر افسوس ان زوروں سے
کسی جانی یا مالی نقصان کی کوئی اطلاع آج تک
موصول نہیں ہوئی۔ ہمارے مسائل کی بنیاد
ہمارے بے رحم شوہر ہیں، جو ہمیں غلامی کی زنجیروں
میں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں گھر کی چار دیواری
میں قید کر کے کولہر کے بیل کی طرح جوتا جاپتے ہیں
مسادات کے اس ایک میں کوئی باعزت عورت
بھلا کیونکر اس ظلم کو برداشت کر سکتی ہے۔ ہمیں
بھی شوہروں کی طرح منور کین کا ادھیکار ہے۔ ہم
بھی اپنے سینے میں دل رکھتے ہیں ہماری بھی
خوابیں ہیں، ہماری بھی آرزوئیں ہیں۔۔۔۔۔
ہمیں میں دو چار ساڑیاں خرید کر لانا دینا! ایک
آدھ زور پر ٹرنا دینا۔۔۔ وغیرہ مسادات
کے تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کرتا۔ چوہوں
کلیوں! بال زوروں اور دنیا والوں وغیرہ میں

پابندی سے جالے کو فصول بخوبی بر محمول کیا
جائے۔ اگر بھی فصول بخوبی ہے تو شوہروں کی
افزیت مشکوک نظر آتی ہے۔ شادی سے پہلے
بصورت ماشق یہی شوہر اپنی عورتوں کے لیے
جان تک نثار کرنے کے دھمے کرتے ہیں۔ اور
چاند ستاروں کو توڑ کر ہماری گود میں بھر دینے
کے دھمے کرتے ہیں۔ مگر دیکھا جائے کہ کثاری
کے بعد لہذا باگ دھمے سمان کی جھالٹ کی
طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ثقہ! ایسے شوہروں کی
مردانگی پر! جو بے حیائی کے ساتھ وعدہ شکنی کرتے
ہیں۔۔۔۔ ہم چوہے میں خود کو بھونکتی ہوں۔ ہر سال
ایک حد تک باجی انھیں غلامی کرتی رہیں اور سارے
مطالبات اور فرمائشات کو بھول جائیں تو ہم نیک
بہو، نیک بیوی اور نیک خاتون کہلانے کی مستحق
ہیں ورنہ قابل گردن زدن! — ہماری جان
موتی گوسٹ ساسوں سے بھی چھڑائی جائے!
ان بے تاج بہانوں نے ہمارا لطف بند رکھا ہے
ہمیں ناگہی اندھ کی گلی میں پتی ہیں ڈالنے کا تہیہ
کیے ہوئے ہیں، یہ نا جانت اندھ ساسیں! ہم بھی
آخراں ہیں۔ ہم غصے سے پیدا کرنے کی
مشین نہیں ہیں۔ اب ہم ٹھک چکی ہیں۔ ہر سہا
برس سے لنگھ سیدھی ہر رہی ہے۔ اب اسے
اٹھ اٹھنا چاہیے، یعنی بچے پیدا کرنے کی ذمہ داری
کا کچھ بوجھ مردوں کو بھی اٹھانا چاہیے۔ مسادات
کا تقاضہ ہے کہ ہر کام ففنی نفی ہو۔ (تالیساں)
میری ہم عصر بیویوں! اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں
حکوم بن کر نہیں بلکہ آغا اور حاکم بن کر آزاد راجی
زندگی کے فرودہ دھڑے کے انقلابی تبدیلی سے
ہنگامہ کرنا دینا چاہیے، درودہ وقت دور نہیں
جب ہر شوہر اپنی بیوی کو خود ساختہ غلامی پر کچا چھا
جایا کرے گا!۔۔۔۔۔ ہمیں آج اپنے سہاگ کی قسم
کھا کر یہاں سے اٹھنا چاہیے کہ کالفرنس کے
فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے بغیر ایک بھی بچہ پیدا
نہیں کریں گی۔

(انداز و نگاہ کی تقریر کو سراہنے کی آوازوں کا کل منظر)

انٹونسور : خاموش ، خاموش ! انداز
مستثنیٰ الفاظ کے ذخیرہ کو اس بے حدودی سے
مت لہئیے ! ابھی تو ادھر کی عالمانہ اور قاتلانہ تغار
آپ کو مستثنیٰ ہیں۔ اب میں ایک ادھر عمر
حیدر ، شریعتی سنی گہدی دھوکا دو پرواؤں کی مسیحا
پیش کرنے کے لیے کشت دے رہی ہوں۔ آپ
انٹونسور : جہانناہ شرم کی خبر ہیں۔ آپ نے
اپنی زندگی میں کتنی ہی سہاگوں کے سہاگ اجڑائے
ہوئے چشم خود ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کئی
ایک سہاگوں کو تو آبِ غائب بنائے میں اپنا گرامرِ نقد
تبادل میں پیش کیا ہے۔ ہاں تو بد عار کیے
شریعتی جی !

مستی کھادی وہ دھوا : میری پر یہ
ماتو ، بہنو ، بہنو اور پرواؤں ! بے چاری دھواؤں
کا اہم مسئلہ تو یہی ہے کہ ان کے شوہروں کا بے
وقت دیوانہ کیوں ہو جائے ؟ شوہروں نے
انداز ہی پر نشانیوں سے نجات حاصل کرنے کا یہ
آسان طریقہ کھوج کر ہم جیسی سادہ لوح بیٹیوں کا
جیون نک سان بنا ڈالا ہے۔ ہم شادی بیاہ شوگر
نرمان کے لیے کرتے ہیں ، دگر جہنم کی بیٹی ہیں جسکے
کے لیے۔ مختصر صدر صاحب ! میں آپ کو بھی
گنجیم کے ساتھ اس عالمی مسئلے پر غور کرنے کا
نخرن دیتی ہوں۔ کہہ کر کے اپنی صدارتی تقریر میں
اس پر ضرور برکاش ڈالیے گا !!

پھر شوہر کی جان خلاصی کے بعد میں زندہ
رہنے پر مجبور کیا جائے۔ پہلے سنی تھا عام فہمی ہم
ازنٹ کا جواب پتھر سے دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں
لیکن چند سماج مددگاروں نے ہم سے یہ حق بھی
چھین لیا۔ حق چھنا ، سو چھنا ! اب دوبارہ شادی
کرنا اسٹبل کے چنے چنے کے سان ہے۔ جس
سماج میں کنواریوں کی شادی کا مسئلہ کبھی طرح
ظہر صاف ہو ، تو وہاں کسی بڑھ کی شادی کا معاملہ ؟

آپ خود فرمائیے کس شعبہ کا ہو گا ؟ اگر بڑھ کے
ساتھ کنواریوں کا بچہ بھی لگا ہو تو ماری نمی بے
چاری زندگی کے اٹھوں : ایسی پرواؤں کو نہ علاج
سہارا دیتا ہے اور نہ سوارے مرد ! اگر کنواریوں کو سوار
کسی عین و مجمل بیوہ میں لپٹی لیے بھی لگتا ہے تو
نردوش بیوہ پر ان گنت انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں !
اور اگر کوئی شادی شدہ مرد ایسی بیوہ کی مدد کے لیے
بجری پیچھے آگے آئے تو اپنی سیکنڈ ہینڈ وانف کے
ہاتھوں تخت اٹھاتا ہے اور بد چینی کے پرمانہ پر ترے
سایت کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بے چاری
بیوایں کریں تو کیا کریں ؟ اسی دیکھ کر ؟ کا مسئلہ
جواب میں آج ہی دیکھا ہے ؟ (آئو پو چھتے ہوئے)
بس اب مجھے اور کچھ نہیں کہا جائے گا ۔ !
(فضا میں سکسوں کا سیلاب)

انٹونسور : آخر میں صدر کا نفرنس
مختصر آوازوں پر ہم ڈیٹ سے موزا : التماس کرتی
ہوں کہ آپ ہمارے اہم مسائل کو درمیان میں رکھتے
ہوئے اپنے نمونی مفید اور قابل عمل مشوروں سے
مستفیض فرمائیں۔

(دو جوان امر خورشید سہارا دے کر صدر صاحب
کو نامک کے مقابل کھڑا کر دیتی ہیں)

صدر صاحب : (کھٹکھٹ کر کا صاف
کرتی ہیں۔ بڑھی مگر باٹ دار آوازیں بقرہ کا اس
طرح آغاز فرماتی ہیں)

میری عزیز بیٹو ۔!! میرے بال صدارتی
تعارف کرنے میں ہی سفید ہوئے ہیں۔ میرے خورشید
سے ہی بڑی بڑی کانفرنس منعقد ہوئی ہیں۔ میں
نے جائز مطالبات کو ناجائز حد تک طشت از باہ
کیا ہے۔ (کھانسی ہیں ، جو اب سارا پٹلا کھانسنے
لگتا ہے) واقعی بے چاری کنواری لڑکیاں ہمدردی
کی مستحق ہیں۔ ان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے غلط
ہے لفظ صحیح اور درست ہے۔ اس سلسلے میں میں بد
میں اپنی رائے پیش کر کے آپ سے داؤد میں وصول
کروں گی۔ یہ آوازوں کے مسائل فی الواقع انتہائی

مسئمتیں ہیں۔ سہاگ لٹے کی بات ہی ہلا کر رکھ دیتی
ہے۔ ان ابا جھٹوں کے مسائل سے نکلنے کے لیے میرے
پاس ایک تیرہ بیرونی نسخہ موجود ہے ، اس کا انکشاف
بھی آخر میں ہی کیا جائے گا ، تاکہ آپ میرے فزیم
جرت میں غلطی کھاتی رہیں۔ سب سے پہلے
میں شادی شدہ عورتوں کے مسائل کو چھیڑنے کی
جرات کر رہی ہوں۔ سوانہ بنیاد پر موقوف
کی بات انتہائی حقیقت پسندانہ ہے۔ آزادی کی
بات بھی بڑی دلکش اور دلچسپ ہے۔ لیکن اس
خاقون خاند کو متعین خاندہ بن کر زندگی گزارنی ہے
یا سہاگ کی بری بن کر ؟ پہلے اس نامک سوال کو
کھوجنا چاہیے ہیں ، اپنی کی ریل میں کوئی نقص
کا اندھا بھی انکھ کر کے کو تیار نہیں ہو سکتا !
(ہاتھیں ہوتے آوازیں قدرے کثرت پیدا ہو جاتی
ہے) عمر آزادی ، بے لگام آزادی ! اور اصل و خرد
سے تیرے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہم پاکیزہ گھروں
کی امین ہیں ، محافظ ہیں۔ بھولوں ، گھبروں ، بال
دووں و قریب میں منور جن کی تلاش احتیاج اقدام
تو ہو سکتا ہے ، مسائل کا حل نہیں (مجمع پر
موت کا ماسٹا ٹاٹا غاری ہے) میرا ایک فی البدیہہ
شعر ہے ۔

ہم کو کسے چل پھولوں گھبروں میں نہ مریض خلق !!
ہم سے پاکیزہ گھروں کی وضو نشان ہے زندگی
(ہلکا سا شور ، کھسکھس کی آوازیں)
یہ شعر فی اعتراف ہے کہ سب ابھی یہی حقیقت کا
مکمل ترجمان ہے (تیز خورہ - مختلف
آوازوں کے درمیان) نہیں نہیں ۔ !
اس شعر سے سازش کی نوائی ہے۔ شوہروں کی
حایت اور بیویوں کی حماقت کا مکمل ترجمان ہے ۔
یہ شعر ! صدر صاحب کا یہ ! غانا اقدم ہے۔ ہم
اس مشورے کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے ! اس
صدر کی نئی نئی ٹھوڑی کا نفرنس کی ایسی سی کنواری
ہے۔ ڈیٹ کو سوار کے طور پر سیریتوں ، چپٹوں
اور کھڑکیوں سے نوازا جائے !! (بال صفر ، ہاں)
(بال صفر ، ہاں)

بکھا جائے۔

یہ اور اس طرح کے ہزاروں اہل فکر کی دماغی ورزش کا سبب بنے۔

اسلامی تصوف میں فلسفہ خودی کے موضوع پر مختلف ادوار میں، مختلف فکر کے صوفیاء اور علمائے نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی تصانیف میں نظر آتا ہے جو آج بھی ملتا ہے لیکن سب کچھ اس طرح یک جا نہیں ملتا کہ اسے پھر اس فکر کا مطالعہ تسلسل سے کیا جاسکے۔ اور اس کے فلسفیانہ ارتقا کو سمجھا جاسکے۔

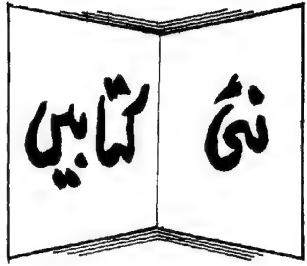
جناب اشرف قادری اردو غزل ہی میں اپنا ممتاز مقام نہیں رکھتے۔ وہ ایک صوفیانہ دل، اور فلسفیانہ دماغ کے مالک بھی ہیں۔ انھوں نے ”ایشیائی افکار و نظریات کی تاریخ میں فلسفہ خودی کا سراغ“ لگایا شروع کیا تو یہ کتاب تیار ہوگئی تھی تاریخ فلسفہ خودی (حصہ اول) کے نام سے چھاپا گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ہر عہد کے ممتاز مفکرین کے خیالات سے مزوری اقتباسات لیے ہیں اور انھیں مختلف ابواب میں بیٹھنے سے تقسیم کر دیا ہے۔ پہلے تصوف میں حکمت عرب کے پچھ سو سال کے زیر عنوان اس موضوع پر قرآن مجید سے الاستلال کیا گیا ہے اور مختلف تغایر سے فقہاء و شافعیوں کی شرح میں بھی لے کر پھر حدیث سے اس فکر کا سراغ لگایا ہے۔ تابعین میں حضرت حسن بصری کے اقوال سے مدد لی ہے اور اسی طرح عہد برہمہدہ کے صوفیوں اور مفکرین کے اقوال سے ”انا“، ”میر“، ”جویت“ یا خودی کی تعریف و تشریح پیش کی ہے۔

ان اقتباسات کو اس طرح یک جا کرنے سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ کتاب اس موضوع پر مستند ہوگئی ہے اور ہر دور کے مفکرین کے رویے کی اس میں جھلک ملاتی ہے پھر اسے بیٹھنے سے Classify کرنے سے ان اقتباسات میں معنوی ربط و تسلسل بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور ترتیب میں زانی ترتیب Chronological Order کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ اس طرح مطالعہ کرنے والے کو اس موضوع پر اسلامی فکر کی ایک ربط اور واضح تصویر مل جاتی ہے۔

نور رضا بے پہلے طبقہ اولیٰ کے صوفیاء ابراہیم اویم، ذوالنون مہری، جنید، بایزید، فضیل، ارجمند اللہ کے افکار کو پیش کیا ہے پھر صفوحہ اسلام مثلاً فلاطین، ابن سکیر، بوعلی سینا، اور ابن رشد کے خیالات سے بحث کی ہے۔

انھوں نے امام غزالی اور شیخ اکبر ادریش متحول کو فلاسفہ کی صف میں جگہ دی ہے۔ میر خیال ہے کہ ان کے لیے یہ حکام عہدہ درجہ ہی رکھنا مناسب تھا۔ امام غزالی نے جو فلاسفہ کے بارے میں کوئی بھی تحریر نہیں کی تھی صریح ظاہر بھی کر دیا ہے۔ یہ حضرات فلاسفہ و متفکرین کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے لیکن بنیادی طور پر صوفی ہیں۔

پہلے حصے کے دوسرے جزیں بھی مل کر دکھایا ہے۔ اور اس میں نظامی، سطراری، سعدی، حافظ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔ اس صف میں ابن خلدون اور نطشہ اچھی نظر آتے ہیں۔ جہاں اور چال لدین افغانی کے درمیان بہت فاصلہ خود ۱۸۹۲ء



تاریخ فلسفہ خودی

معنی: اشرف قادری

پیشہ کا پتہ: ۹۸/۳۴، یکنی گڑھ کا پتہ

قیمت: دس روپے، صفحات ۱۹۲

اسلامی تصوف ہی میں نہیں بلکہ عالمی فلسفہ روحانیت و باطنیات میں ”خودی“ کا مسئلہ بہت دقیق اور پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے۔ اس پر مغربی صوفیاء کے ماہرین نے بھی اظہارِ خیال کیا ہے یا تعمیرِ فہم کی کوشش کی ہے اس سے نفوذِ خودی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ یہ راجح تھا اصول کی طرح ثابت کرنے کی چیز نہیں۔ اور اس کا بڑا حصہ شفیق و جلالی علم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور میں خودی کا تصور اقبال کی شاعری کی ایک نہایت ممتاز علامت بن گیا ہے۔ اس لیے اقبال کے فکر و فلسفہ سے بحث کرنے والوں کے لیے تصور خودی کو سمجھنا ایک طرح سے ناگزیر ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف یہ تصوفِ اسلامی کے نظری پہلو سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اور فنا و فناء کی بحث کے ساتھ کارا وائے اداسی پر چرچا جاتا ہے۔ فلسفیوں کے لیے یہ وجود اور جوہریت کی بحث کا شائبہ ہے۔

ایک عام قاری کے لیے خدا کی ذات و صفات اس کے وجود، کائنات کی تخلیق اور مخلوقات کائنات سے خالق کے ربط کی نشان دہی اسی سے ہوتی ہے۔ اور توہید و جہود کی شہرہ کی اختلافات بھی اسی کی مختلف تشریحوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

خالق سے مخلوق کی لاشعری کیا ہے؟ کیا اس کا علاحدہ کوئی وجود ہے، یا اسی ایک وجود کے مختلف مظاہر ہیں؟ کیا انسان خود خدا کے وجود کو علاحدہ تسلیم کرنے سے جوہر سے منقطع اور فلسفیانہ مشکوک پیدا ہوتے ہیں انھیں دور کیا جاسکتا ہے؟ انسان حادث ہے، خدا قدیم ہے، کیا ایک حادث قدیم کا ادراک کر سکتا ہے؟ کیا ذات بشری ذاتِ خداوندی میں اس طرح ہم آہم ہو سکتی ہے جیسے نظریہ سمندر کا ایک قطرہ

انگل نیو نی

پیدا کیا گیا۔ شیخ اکبر کے تعلیمات نورِ مہدی پھیری کے شروع میں ہندوستان پہنچ چکے تھے مگر یہاں کے عربوں اور ان کی مختلف شاخوں کے لیے جس کا اعزاز ہندو شرف و جلالِ سماوی اور حضرت سید محمد گورادان کی تعریف سے بڑی کیا جاسکتا ہے۔ شہداءِ حجاب نے ہندوستان کی کوہِ قافہ دیکھ کر یہ بہت شرم و دھوکہ وہاں موجود تھا۔ دوسری جلد جس کی شاعت کا وعدہ کیا گیا ہے، ہندوستانی ملت پر نظرِ مختصر ملے گی۔ لیکن اس کی جو فہرست شائع کی گئی ہے اس کا آغاز حضرت محمد مصطفیٰ ثانی سے ہو رہا ہے۔ پھر میرکلی اور شاہ نیاز احمد بریلوی، اور غالب اور اقبال۔ یہ جلد اگر انصاف و ابوابِ پرستی ہے تو بہت نقصان دہ ہوگی۔ ہم شرف الدین یحییٰ بن عمری، چراغِ ملی، خدامِ جہانیاں، جہلِ شمس، سید محمد جعفر علی، مسعود بک، شیخ عبدالقدوس گفگوری، شیخ عبی اللہ آبادی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شیخ عبدالامیر و بی بی مولانا اشرف علی خاں دی وغیرہ بہت سے ان حضرات کی تقریروں کو نقل کرنا نہیں چاہتے جنہوں نے تصوف کے فلسفیانہ اور نظری مباحث پر لکھا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے۔ ہر حال یہ کتاب ضرور امدادی صاحب کی برسوں کی محنت اور طالعے کا بخیر پیش کرتی ہے اور دوسری طور پر پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسے خود فکر اور تاملِ خیر کے ساتھ پڑھا جائے گا تو اسلامی تصوف ہی کے نہیں بلکہ اردو اور فارسی شاعری کے بھی بہت سے لازمانے سرسبز نگاہوں کے سامنے کھلے گلیں گے۔ اردو غزل کے کسی شاعر کی طرف سے، علامہ اقبال کے بعد ایسے گہرے فلسفیانہ مسند برائے قیام دیدہ بری سے غور کرنے کی یہ کوشش ہر طرح لائقِ تحسین و مبالغہ باد ہے۔

(شلا احمد فاروقی)

حضرت امیر خسرو اور ٹونک

مصنف : (ماہجرزادہ) شوکت علی خاں

ناشر : عربی و فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ٹونک (راجستھان)

قیمت : صج نہیں

ایر خرو، صوفی شاعر، سپاہی، معاصیبِ سب ہی کھوتے۔ انھوں نے ہر نسبت سے اپنا نقش ہمارے تاریخ پر چھوڑا ہے اور ہر نسبت ان کی امتیازی نشان رکھتی ہے۔ ان کی رنگارنگی اور ہر نسبت شخصیت کی یہ ایزادیت خود ہی ایک اہم موضوع ہے۔ جس پر ماہرینِ نفسیات ہی روشنی ڈال سکتے ہیں، فقیروں، بادشاہ، خاقانوں اور بارہا مجلسِ حال و قبالِ جنگ و جدال تک انھوں نے جس اعتدال و توازن سے کام لیا وہ کوئی آسان بات نہ تھی، اس کا اندازہ خسرو کی چھ تار تارچی کالوں کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

اس ترکیب ہندی نثر کا طوطی حرف سرزمین ہند میں ہی نہیں بلکہ ایک عالم میں غزل سوا ہے۔ محققین، نقاد، مومرخ، ماہرین لسانیات، اصحابِ حال و

قال: شاعر و ادیب سب خسرو کے امیر ہیں اور اپنے اپنے میدانوں میں خسرو پر کام کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب (صاحبزادہ شوکت علی خاں) کے اس طویل مقالہ میں بعض
سچے اور انھوں نے غالباً خواہشوں سے بغیر سوچا سمیٹ کر دہائی کے زیرِ اُستادانہ
سینما میں سچا پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے ایک توپ کٹافٹ کیلئے کہ حضرت
امیر خسرو، علامہ، علی گنجی کی تصویروں و چتروں کی شگرفی کے وقت تو کنگ میں
شگرفی کے ساتھ قلم بازی ہمہ جہت تھی۔ اور دوسرے انھوں نے سید

منظوم الحسن بکائی صاحب کے الفاظ میں (جیسا کہ انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے) "اسیرِ خدائی کی دستیاب، کامیاب اور نایاب، تصنیفات و تخلیقات، ہر کامِ حق کی فطرت سے متبرک کیا ہے۔ اور ان مضمون کی نشان دہی بھی کی ہے جو عربی، فارسی و سمرقانی جڑوں تک ہیں۔"

مقالہ کی تحقیقی حیثیت سے ماسوا (صاحبزادہ) شوکت علی خاں کا انداز نگارش ہے۔ ان کی نثر پڑھتے وقت قاری میر امن سے پہلے کے زمانے میں جا بہختا ہے۔ مثال کے طور پر:

۴۵ "امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ، بھی علامہ الدین کے ساتھ ٹونک کی چھاؤنی اور بڑا گاہ میں دو تین بار گزربے جی نہیں ٹھہرے بھی ہیں، اور یہاں لشکر کے پڑاؤ کے ساتھ رہے، بسے اور نغمہ سنج رہے ہیں، یہاں کی سرسبز و غلابادیاں، مہر خارا یہ ہرے بھرے کوستان، یہ رنگین بناس کی وادیاں گواہ ہیں کہ امیر خسرو ٹونک میں ٹھہرے، یہاں کے کوچ و بازار (اس زمانہ میں صرف پرانے ٹونک کا بازار صرف مالک پوک کے نام سے کہلاتا ہے اب بھی موجود ہے) کی سیر کی، گاہاں کے رنگین زربہ گلو کیے ہیں، یہاں کی حسین وادیوں کے دلکش اور طراغروں و مناظر سے لطف اندوز ہوئے ہیں اور اپنے یہ قدم میمنت از روئے سے یہاں کے رنگارازوں کو قدس و تبرک بنایا ہے۔ اور نہ جانے کس کس گوشہ عافیت اور کس پرست فرما میں چٹھہ کو سحر بھگام دعاؤں اور جہاد حقافت سے تقدس و تبرک کی دولت چھوڑی ہے۔ کہ ٹونک کا ناول، ٹونک کی فضا، یہاں کا دستاں، یہاں کا مکتب خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے رنگ میں اب تک ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

اسی طرح راجا کا انتساب نائب صدر چچر یہ جناب محمد ہدایت اللہ کے نام کیے ہوئے لکھتے ہیں:

”غم خانہ سرمدی کے بادہ گسار، علم و حکمت کے ٹہپان، تہذیب و ثقافت کے پاسان، جلوۂ صدرنگ گلستان، ہند کے گل سرسبھا

غزلیات اور نقیض کسودہ تصدیق ہے جس کتاب کے آخری اوراق کی قیمت ہیں۔
(رام پرکاش لکھنؤ)

لامیان (جدید دنیا کے لیے)

مترجم: ایس نالائق رائے ایم۔ اے۔ بی۔ اے۔
مطلعہ کا پتہ: ایس نالائق رائے گنجوار و مدھو شہر اردو گورنمنٹ کالج سٹیٹ انڈیا
قیمت: پندرہ روپے۔

کتاب نگار اصل انگریزی کتاب Ramayana for the Modern World.

بہت ہی نئے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا گیا۔ اس میں تنقید نہیں کرتے بلکہ کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن مترجم کی کاوش، پختگی اور طرز بیان نے خوبی ہائے گواہی سے آراستہ کیا ہے۔ کتاب کا ہر باب پُر معلومات و سبق آموز ہے۔ مترجم نے ۱۱ لائین کی محنت کا خاکہ ۱۱، ۱۲، ۱۳ اور مذہب کی راہ میں ساتھی کی اہمیت یعنی ذوق حیات کا ناسا و انحرارک ۱۴، برادرانہ برتاؤ کے نمونے ۱۵، دوستی کا نظریہ یا اصول ۱۶، استحقاقی طاقتوں سے ہر وقت خبردار رہنا ۱۷، کم یوگ پر جمین و کوشل ہر اس میں روشنی ڈالی ہے۔ زبان و بیان اور دروزرہ کا خیال رکھتے ہوئے اصل مضمون کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ دیا جی نہیں اس کے مطالعے سے نفس کشی کسی کا کھلا کو حاف کرنا خواہشات پر قابو پانا عقل و شعور کا درست استعمال کرنا، غصے کو جان بوجھ کر تھامنا اور صداقت پر قائم رہنا کے سبب سے ہیں۔ علاوہ ازیں خلوص و محبت، صداقت، پاکیزگی، علم سے استفادہ اور طاقت پر خاص ضروریات ہیں۔ یہ اخلاقیات جو بھگوان رام جی مراد پر ختم رام کی زندگی کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان کو دنیا میں رہتے ہوئے جتنی کے راستے کا خزانہ آسانی سے مل سکے۔ ان تمام خصوصیات کے جملہ فقرے یہ کتاب مخزن ہے۔ اس کی اشاعت اردو ادب میں ایک عظیم و گرماں قدم اضافہ ہے۔

(مہتاب پسروری)

شرح چنداک

ہندستان پاکستان دیگر ملک

سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱۵۰/۱۵۰
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵/۲۰ ڈالر ۲۰۰/۲۰۰
سیسالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۵۰/۲۰ ڈالر ۳۰۰/۳۰۰
فی کاپی	ایک روپیہ ۱/۵۰	روپیہ ۳	سینٹ ۱۵ اپنی

پیکر ولایت ورثہ و ہدایت عزت آپ عالی جناب سلسلہ محمد
جلالت اللہ صاحب تائب صمدیہ رتہ ہند کے نام نامی و ام نامی
سے کشور ہند کے قندلیب نواسی معزز امیر خسرو اور نو ملک
اپنی حقیر تصنیف کو مہنوں کرتے ہوئے فرخ عروس کرتا ہوں۔
ایں بدیہ ناچیز گرفتار خد قبول خاطر شش
باشم عزیز مغفرت لازم نصیب فرمائیے۔
امید ہے کہ خسرو کے شہیدانی اور پرانی نثر کے چاہنے والے اس کا
کو پسند کریں گے۔ (اختر الواسع)

”دہلی کی نواحی بیٹوں میں اردو“

حکیم آغا جان نقیض اور پرانے کے مشاعر

مصنف: مجلیت سٹوڈنٹس
ناشر: کاپانی کیشنر بہار دلاؤ
قیمت: ۱۵ روپے

”دہلی کی نواحی بیٹوں میں اردو“ کے موضوع کو پھرنے ایک سیر حاصل مطالعہ کی حیثیت سے اپنا ہے اور اس بارے میں تحقیق و دریا فیت کی منجھ صورت حال کو اشاعتی سلسلہ دینے کی محنت میں، زیر نظر کتاب دھاتی قول و ام نامی ہے۔ حکیم آغا جان میں پر خصوصی اور انداز نگار سنی کو یہ نظر عام ان مشاہیر کے ذکر کیا گو یہ کہ تناظر میں اردو شایا ہے، نہیں، اردو زبان ادب کی تاریخ ایک حد تک تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہندی پرچم اور شیفیت کے علاوہ بہت سے دیگر شعور کا ذکر علاقائی تمدن کے تحت کیا گیا ہے۔ ہر شاعر پر صوفی خاندان کے علمی وادبی مضمون، علمی وادبی مضمون کے اسباب تخلیقی و شعری ارتقاء، مختصر نمونہ کلام و غیرہ کو عامی تہذیب و تہذیب کے ساتھ اور پس منظر انداز بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں دوسری رائے کی گنجائش کم ہے کہ پھر کا عمومی تاثر پھر کی قادر ایمانی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اور نثری میدان میں موصوف کے مرتبہ قد و بل کی روشنی روشن جولانیوں کا آئینہ دار ہے۔

ہر ایک کی مزین نثر کے اثرانہ سے دہلی کی مہمانی کا شرف حاصل ہے۔ جہاں تحقیقی اعتبار سے بڑی محنت اردو کے آثار و اوراق میں ہر ایک کی کھڑی بویوں کا دست رس تسلیم کیا جا چکے ہیں وہاں وقت کے ساتھ ساتھ، پانی پت، گزرائے، حصار، گوند کا دھوکہ، علاقوں میں حال، جاگتی، زخمی، سیدیں، نوح نادری اور بل کرشن، اشک جیسے شعرا اور ادیبانہ منظر عام پر آئے ہیں۔ گوند آیا م کے چند لکھن میں بھی کہ شہر اور خاص کر وہاں محفل خان، شکی جیسے غزل گو اور حکیم نقیض جیسے قاصد گو شاعر کو دیکھ کر روشنی لاکر مگر نہ ہر ایک کے اردو عیادت کا حق اور اس کے لیے ہر ایک کو شکر ہے۔ اس جہتی کی کتاب کا سربراہ امتیاز رنگی کی



اشتیاق کا باعث

ماہ جون ۱۹۸۷ء کا آجکل اپنے مضامین اور مواد کے سبب میرے لیے ادبی اشتیاق کا باعث بنا۔ خاص کر "نقشِ اقبال" تو ادبی جاذبِ نظر ثابت ہوا۔ افسانے "پورا" اور "شفالیکا" جو بالترتیب آصف مجیب اور اکرم فاروقی کی تخلیقات ہیں بے حد پسند آئے۔

ایم انصار الحق، ڈلوکھر، مہسوی

عمدہ، بہتر

جون کا شمار بہت عمدہ ہے، حسنِ طباعت کے اعتبار سے بھی کتبائے کی نفاس کے لحاظ سے بھی معیارِ تحریر آپ کے آنے کے بعد نمایاں طور پر بہتر ہوا ہے۔

اہم اور معلوماتی

مئی کے شمارے میں ہندوستانی معنوی "اور" منٹو اور شراب" اچھے مضامین ہیں۔ رباعیات صادقین روحانی جذبیت و احساسات کی آئینہ دار ہیں۔ نقش و نگار سے رباعیات میں جاذبیت و دل آویزی کی کیفیت پسند آ رہی ہے۔ جون کے شمارے میں سلیم اختر کا مقالہ "تخلیق یا انہمال جرم" کافی اہم اور معلوماتی ہے۔ خیر احمد علوی کی نظم "زینا" جلالیاتی و جذباتی رنگت آہنگ سے لبریز ہے۔ خورشید اسلام کی غزلیں حبیبِ شمع اور مدد ستو خیال کی عکاس ہیں۔ (غلام مرتضیٰ، بہار شریف)

کامیاب تشریح

"آج کل" کے حالیہ شمارے (نقشِ اقبال - جون ۱۹۸۷ء) میں محترم مآثرین کی بنائی ہوئی تصویر نظر سے گزری۔ یہ صرف تصویری نہیں تصویر کی کائنات کی آبرو بھی ہے۔ میں نے بیشتر شعروں کی تشریح و غفلت جرائد اور دوسری کتابوں میں پڑھی مگر اس قدر کامیاب تشریح اور وہ بھی تصویر کی زبانی میری نظر سے پہلی بار گزری۔ شاہد آرزو۔ گریڈ میہ

نمایاں تبدیلی

جون ۱۹۸۷ء کا "آج کل" وقت پر موصول ہوا۔ علاقائی ادب کا سلسلہ برابر جاری رکھیے۔ آصف مجیب صاحب کا افسانہ بے حد پسند آیا۔ وعدہ صاحب کی شاندار غزل کے متعلق کیا عرض کروں۔ موصوف اور غزل کی آبرو ہیں۔

انوار انصاری، راجنچی

داؤد دینا بے داد ہے

جون کا شمارہ دیکھ کر دل خوش ہوا۔ صوری اور معنوی دونوں طرح سے آپ نے آج کل کو خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔ آپ کے حسنِ سلیقہ کی داؤد دینا بے داد ہے۔ مضامین، افسانے اور منظومات زیادہ تر تمثیلی ہیں۔ افسانوں میں خصوصی طور سے آصف مجیب صاحب کا افسانہ "پورا" بہت پسند آیا۔ رضا مظہری، گلگت

فکر انگیز، جاندار

مضمون "خیر آباد کے فاری شرار" (جون ۱۹۸۷ء) یہاں کے ادبی و ملی حلقوں میں کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ریاض انصاری صاحب نے کافی محنت سے یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس کے علاوہ سلیم اختر کا مضمون بھی فکر انگیز ہے۔ حصہ نظم بھی بڑا جاندار ہے۔ خورشید اسلام نشر و نفاذی، نجیب داس، رام پکاش، راہی اور اخبار اثر کی غزلیں پسند آئیں۔ کیف احمد صدیقی، سیٹاپور

انفرادی خصوصیات

مئی ۱۹۸۷ء کا شمارہ اپنی انفرادی خصوصیات کا حامل تھا۔ صادقین کے آٹھ درہمات کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ منٹو اور شراب "یہ مضمون بھی پسند آیا۔ زاہد حسا کا افسانہ اس شمارے کا بہترین افسانہ کہا جائے گا سستی ہے۔

جون کے شمارے میں جناب وقار دانشی کا ترجمہ جو گرجائی کے مشہور مصنف "دھوت شاہ" کے افسانے کا ہے یہاں کے مقامی رسالے میں وقار صاحب شائع کرا چکے ہیں۔ دیسے وقار دانشی گرجائی زبان سے واقف بھی نہیں ہیں۔ جون کا شمارہ بھی کافی معیار ہے۔ سبھی کچھ ہی چیزیں پڑھ پایا ہوں۔ صادقین نے اس مرتبہ بھی کمال کر دیا۔

رحمت امروہوی، احمد آباد

آج کل کی

آزادی نے ہمیں ترقی کا موقع دیا

نیا 20 نکاتی
پروگرام
راہ دکھاتا اور تحریک
دیتا ہے

”آئیے مل جل کر ایک ٹیم کی طرح کام کریں
”یہ پروگرام آپ سب کے لئے اور اس ملک کے لئے ہے جو
ہمارا ملک ہے۔ جس کی خدمت دانش و فن اور تعمیر چاہیں کرتی ہے۔
اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے میں آپ سے پورے دلی
تعاون کی بات کرتی ہوں۔
— وزیراعظم شری شی انڈیا گاندھی

”قوم کے لئے یہ کارروائی نامہ
ترقی کے مجموعی منصوبے سے منسلک کیا گیا ہے۔ یہ ان میدانوں
کی نشاندہی کرتا ہے جہاں خصوصی کام کرنے سے مختلف طبقوں
کے لئے فوری اور واضح نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔
اسے کامیابی سے بروئے کار لانے کے لئے
ہر ایک شہرہ کی تعاون کی ضرورت ہے۔

آزادی کا 36 واں سال — 9 ویں ایشیائی کھیلوں کا سال



وزیر اعظم شرقی انڈیا کانگریس مائیکشن کے
وائٹ ہاؤس میں رہا تھانے نمود کے صدر
رینالڈ رین کے ساتھ



وزیر اعظم شرقی انڈیا کانگریس ۱۹ جولائی ۱۹۰۲ء
کو واشنگٹن میں وائٹ ہاؤس میں وزیر ریکس پر
وفا کرتے ہوئے۔ شرقی انڈیا کانگریس گیارہ برس
بعد امریکہ کے صدر گرگالہ نمود سر پر تشریف لگے تھیں۔
تصویر میں رہا تھانے نمود اور کیک کے صدر رینالڈ رین
اور رینالڈ رین کے ساتھ ہیں۔



15 7 15



صدر ہند نے ہندوستانی خلیج گھرنے مرکزی
وزیر مملکت برائے اطلاعات و نشریات
قرنی جن کے بی سالہ سکولار متبر
۱۹۸۲ کو ان کے عہدے کا حلف دلا
رہے ہیں۔



شوبھتی مسند وائی، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ کو نئی دہلی میں وزیر مملکت برائے محنت و تعلیمات کے عہدے کا حلف لیتے ہوئے۔



اندک اقبال عام معتمدہ پبلشرز

آج کل

سب ایڈیٹر
شونامتھ سنگھ

ایڈیٹر
راج نرائن راز

جلد ۴۱	شمارہ ۳	اکتوبر ۱۹۸۲
قیمت ایک روپیہ	فون ۲۸۷۰۹	اشون کارنگ شاہ سن ۱۹

ترتیب

ملاحظات	مقالات	نظم	غزلیں	ناول	افسانے
۴۳	گھونسلہ	۶	۱۰	۱۵	۲۲
۴۷	انٹیک پواری	۱۰	۱۵	۲۲	۲۳
۴۸	خیال انصاری	۱۵	۲۲	۲۳	۲۴
۴۹	نئی کتابیں	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
۵۰	اردو کے ادبی حلقے	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶
۵۱	میرت خیال میں	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷
۵۲	قندلم	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۵۳	شوکت علی خان / اختر انوار	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹
۵۴	ایمرون	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰
۵۵	ایران تانہ	۲۸	۲۹	۳۰	۳۱
۵۶	ایمرون	۲۹	۳۰	۳۱	۳۲
۵۷	ایمرون	۳۰	۳۱	۳۲	۳۳
۵۸	ایمرون	۳۱	۳۲	۳۳	۳۴
۵۹	ایمرون	۳۲	۳۳	۳۴	۳۵
۶۰	ایمرون	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶
۶۱	ایمرون	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷
۶۲	ایمرون	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸
۶۳	ایمرون	۳۶	۳۷	۳۸	۳۹
۶۴	ایمرون	۳۷	۳۸	۳۹	۴۰
۶۵	ایمرون	۳۸	۳۹	۴۰	۴۱
۶۶	ایمرون	۳۹	۴۰	۴۱	۴۲
۶۷	ایمرون	۴۰	۴۱	۴۲	۴۳
۶۸	ایمرون	۴۱	۴۲	۴۳	۴۴
۶۹	ایمرون	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵
۷۰	ایمرون	۴۳	۴۴	۴۵	۴۶
۷۱	ایمرون	۴۴	۴۵	۴۶	۴۷
۷۲	ایمرون	۴۵	۴۶	۴۷	۴۸
۷۳	ایمرون	۴۶	۴۷	۴۸	۴۹
۷۴	ایمرون	۴۷	۴۸	۴۹	۵۰
۷۵	ایمرون	۴۸	۴۹	۵۰	۵۱
۷۶	ایمرون	۴۹	۵۰	۵۱	۵۲
۷۷	ایمرون	۵۰	۵۱	۵۲	۵۳
۷۸	ایمرون	۵۱	۵۲	۵۳	۵۴
۷۹	ایمرون	۵۲	۵۳	۵۴	۵۵
۸۰	ایمرون	۵۳	۵۴	۵۵	۵۶
۸۱	ایمرون	۵۴	۵۵	۵۶	۵۷
۸۲	ایمرون	۵۵	۵۶	۵۷	۵۸
۸۳	ایمرون	۵۶	۵۷	۵۸	۵۹
۸۴	ایمرون	۵۷	۵۸	۵۹	۶۰
۸۵	ایمرون	۵۸	۵۹	۶۰	۶۱
۸۶	ایمرون	۵۹	۶۰	۶۱	۶۲
۸۷	ایمرون	۶۰	۶۱	۶۲	۶۳
۸۸	ایمرون	۶۱	۶۲	۶۳	۶۴
۸۹	ایمرون	۶۲	۶۳	۶۴	۶۵
۹۰	ایمرون	۶۳	۶۴	۶۵	۶۶
۹۱	ایمرون	۶۴	۶۵	۶۶	۶۷
۹۲	ایمرون	۶۵	۶۶	۶۷	۶۸
۹۳	ایمرون	۶۶	۶۷	۶۸	۶۹
۹۴	ایمرون	۶۷	۶۸	۶۹	۷۰
۹۵	ایمرون	۶۸	۶۹	۷۰	۷۱
۹۶	ایمرون	۶۹	۷۰	۷۱	۷۲
۹۷	ایمرون	۷۰	۷۱	۷۲	۷۳
۹۸	ایمرون	۷۱	۷۲	۷۳	۷۴
۹۹	ایمرون	۷۲	۷۳	۷۴	۷۵
۱۰۰	ایمرون	۷۳	۷۴	۷۵	۷۶

آرٹھ - گرجن اردوہ
 ہرنس منیر، ایمل میوال - اسسٹنٹ ہرنس منیر، ایمل - گرجن - اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروکشن) - کے۔ آر۔ گرجن
 منیر، ایمل میوال - اسسٹنٹ ہرنس منیر، ایمل - گرجن - اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروکشن) - کے۔ آر۔ گرجن
 ایمل میوال - اسسٹنٹ ہرنس منیر، ایمل - گرجن - اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروکشن) - کے۔ آر۔ گرجن

ملاحظات

آہ! شیخ محمد عبداللہ



صاحب جہد آزادی میں ابتدا ہی سے ان مجاہدوں کے ساتھ رہے۔ جبہا تا گاندھی اور پندت جواہر لال نہرو کی قیادت میں عمل پیرا تھے۔ ملک کے آزاد ہونے پر شیخ صاحب نے جو کارنامے انجام دیئے، ان میں ہر ذرت ریاست جموں و کشمیر میں ہندو مسلم اتحاد و اخائی کی فضا کو بنانے رکھنا تھا۔ جہا تا گاندھی نے شیخ صاحب کی اس سامی سے متاثر ہو کر کہا تھا "نہرتوں اور رنفاق کے اندھروں کو کشمیر روشنی کی ایک کرن ہے۔ تاہم دو مرتبہ ان کا نام شیخ صاحب نے اس وقت نہ کیا جب پاکستان قیامی حلا و کشمیر میں گھس آئے۔ شیخ صاحب نے کشمیری عوام کو متحد کیا۔ اور حکومت ہند کی امداد سے ریاست کو مکمل آوروں سے نجات دلانی۔ وہ صحیح معنوں میں عوام کے قائد تھے۔ وہ ریاست کے وزیر اعظم بنائے گئے۔ اور اس طرح ریاست کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ شیخ صاحب ہندوستان کی انجمن ساز اسمبلی کے رکن تھے۔ انجمن ہریانہ کے دست و پائی جسے شیخ صاحب کی سیاسی زندگی پر جواہر لال نہرو نے لکھا ہے، بڑے تشبہ و قیاس کے ساتھ لکھا ہے، لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے، وہ طوفانِ اودھ سے بے دست و پائی جسے تشبہ انہیں بہت نہیں کر پاتے۔ فرار پاران کا

شیخ صاحب جیسی آزادی کے مثالی جد سے متفق ہستی انھوں سے اوچل تو چھو سکتی ہے۔ دلوں سے زحمت نہیں ہو سکتی۔ شیخ صاحب کی ولادت ۵ دسمبر ۱۹۰۵ء کو عروا سری نگر کے ایک متول گھرانے میں ہوئی۔ شیخ صاحب نے ابتدائی تعلیم سری نگر میں پائی۔ ایم ایس کی ڈگری، ۱۹۳۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز سری نگر کے سرکاری مالی اہلی میں درس و تدریس سے کیا۔ لیکن عوام کی حسیری، خستہ حالی اور استحصال سے متاثر ہو کر ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ ریاست کو برطانوی حکومت سے نجات دلانے کی ایک زبردست تحریک کی ابتدا کی۔ ان کے حقوق کا علم بلند کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں چھیلیں۔ ۱۹۳۳ء میں مسلم کانفرنس کی داغ بیل ڈالی۔ شیخ صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے۔ شیخ صاحب ۱۹۳۸ء میں پھر قید کر لیے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس کر دیا تاکہ یہ وسیع قومی کردار کو ادا کر سکے۔ ریاست کے عوام کی آہنگوں اور آرزوؤں کے پیش نظر نیا کشمیر کا لائحہ عمل مرتب کیا۔ اس نے سماجی نظام میں تمام لوگوں کو، نسل، مذہب و فطرت کی تفریق کے بغیر زندگی کے بہتر مواقع فراہم کیے جانے تھے۔ شیخ

جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ — شیر کشمیر، شیخ محمد عبداللہ کا ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کو سری نگر میں انتقال ہو گیا۔ شیخ صاحب ایک طویل عرصے سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ پانچ ستمبر ۱۹۸۲ء کو انھیں ایک باہر دل کا شدید دورہ پڑا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ موصوف ۷۷ برس کے تھے۔ شیخ صاحب کا شمار ملک کے عظیم رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ ان کی موت کے ساتھ آزادی کے قافلہ سالاروں کے ہراول دستے کا آخری و ام فرخ ہو گیا۔ ایک شہ، بھگتی، ایک دو فتنہ ہوا۔ شیخ صاحب کی موت سے ریاست کو توں کشمیر باپ جیسی شفیق و ملین ہستی سے، ملک ایک لائق فانی فرزند سے، اور عوام ایک سچے دوست، ایک حقیقی بھی خواہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کی موت ایک قومی سانحہ ہے، ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اس سے ملکی سیاست میں جو غلطیاں ہو چکی ہیں، شاید وہ کسی پرنے ہو سکے گا۔ آج ہم سوچ رہے ہیں، اگر وہ یہاں جید فکری کے اچھے جانے کو ہمیشہ موت کے دائمی اندھروں سے تیسر نہیں کر سکتے۔ عقلمندی اپنے اندھروں، عقائد اور آہنگوں میں امر ہو جاتے ہیں، جن کی جہت وہ کروڑوں دلوں میں روشنی چھوڑتا ہے۔ وہ وقت کی جو سے، شام و دھرم کی حدود سے بالا و آزاد ہوتے ہیں۔

ملک کی ترقی دی

مستشرقوں سے اونچا ہوا غیر زمین پر ہے۔ اس علاقہ کے جہاں جہاں زمین پر چڑا زمین وہیں سے چھلے۔ ان کا عزم اپنی اولاد سے اٹل اور آدرش اٹل ہے۔ انہیں سیاست سے، کیمپوں سے، پورے ملک اور ملک کے تمام سے محبت ملی۔ ان کی طوائف سیاست ان کے اسی راج جہاں جہاں الٹی کا نتیجہ تھی۔ وہ سچے سچے ملی تھے۔ ان کی قوی خدمات نصف صدی پر محیط ہیں یہ وہ چار برس کی بات ہیں۔ ان کے اٹل نقوش، ہمیشہ متور ہیں۔ رشخ صاحب نے اتحاد، ہم آہنگی، رواداری اور سکولر اقدار کی پاسداری کی ہوورس ہیں گفتگو افکار اور کردار سے دیا وہ ہاری راہوں کو بہتر روشن رکھے گا۔

فرقہ و علاقہ پرستی کے خلاف جدوجہد پر زور

صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ نے سماعت کے یوم آزادی کی ۳۵ ویں سالگرہ کے موقع پر اپنی نئی تقریر میں کہا کہ یہ دن ہمیں ان عظیم قریبوں کی یاد دلاتا ہے جو ہماری جدوجہد آزادی کے دوران ہمارے عوام نے دی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا ایک عظیم ثقافتی ورثہ ہے۔ صدیوں سے ہم اپنے ملے جملے ثقافتی ورثہ کی نشوونما کرتے رہے ہیں۔ ہمارے اس ملے جملے میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف مذاہب کو ملنے والے لوگ تھے ہیں۔ ہماری دو کمزیرتیں وحدت کی ایک دشمنی مثال ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا مقدس فرقہ ہے کہ ہم ان ثقافتی تعلقات کو استوار رکھیں۔

شری ذیل سنگھ نے کہا کہ گزشتہ عرصے اور انھیں گزشتہ دو برس میں ہم نے جو ترقی کی، یہی جو کامیابیاں حاصل ہوئیں ان پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ تاہم ترقی کی اس رفتار میں مزید تیزی لانی ہے اور ہر سب کو اکٹھا اور ملنے کے جذبے کے ساتھ تہذیب سے تہذیب ملنا چاہیے۔ زمین ترقی کی راہ میں پرعاملاتوں کو بھی پار کرنا ہے، ہماری جدوجہد ہمیں فروڈیا گروپ کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ فرقہ پرستی، ذات پات اور علاقہ پرستی کے خلاف ہے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ عوام کے تمام طبقوں کے تعاون اور اشتراک سے ہم اپنی جدوجہد میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔

۱۹۸۲ء کو پیداواری سال قرار دینے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ حالیہ برسوں میں بنیادی ڈھانچے کی بہتری کی وجہ سے صنعتی پیداوار میں قابل محاط اضافہ ہوا ہے۔ ۸۲-۸۱ء میں صنعتی پیداوار میں آٹھ فی صد سے زیادہ کا اضافہ ہوا۔ ہماری زراعت میں بہتری آگئی ہے اور پیداوار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ۸۲-۸۱ء میں مینٹی پیداوار میں ہے، اتنی اس سے پہلے بھی مینٹی ہوئی۔ انہوں نے کہا اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم سالانہ زراعت میں صنعت زراعت کے شعبوں میں مزید بہتری لائیں گے۔

نئی کل تھی دلی

شری ذیل سنگھ نے کہا کہ آج ملک ایک آزمائش کے قدر سے گزر رہا ہے۔ اگرچہ ملک کی معیشت میں بہتری آگئی ہے، لیکن آرام سے بیٹھے کا وقت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار کا ایذا دہی مقصد ہونا چاہیے اور فراہم کردہ یا عورت اسے اس مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔

صدر جمہوریہ نے کہا کہ سرکاری ملازمین کو کام کی تکلیف سے باخبر ہونا چاہیے۔ حکومت اور عوام کو اتحاد کے جذبے سے مل جل کر کام کرنا چاہیے۔ ملک کے معاد کو طبقاتی مفاد سے بالاتر اور عدل سمجھا جانا چاہیے۔

شری ذیل سنگھ نے کہا کہ سبھی ملکوں کے ساتھ باہمی احترام اور تعاون پر مبنی دوستانہ تعلقات چاہتے ہیں اور انہیں مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کا مستقبل ملکوں کے درمیان تعاون اور تیز رفتاری پر مبنی ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو تباہی و بربادی کے بجائے عام آدمی کے فائدے کے لئے استعمال کیا جانا چاہیے۔ اسی میں بنی نوع انسان کی ترقی اور رفقا کا راز مضمر ہے۔

وقت کا تقاضا

۳۶ ویں یوم آزادی کے مبارک موقع پر دلی کے تاریخی لال قلعہ سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم شری ذیل سنگھ نے قوم کے تمام طبقوں کے تعاون کی اپیل کی تاکہ آزادی سے حاصل ہونے والے فائدہ ہر گھر تک پہنچائے جاسکیں۔

شری ذیل سنگھ نے کہا کہ پندرہ اگست ایک طرح سے ان کرڈوں انڈیا سے بھر دی کے اظہار کا دن ہے۔ انہوں نے آزادی کی لڑائی میں باس کے بعد آزادی کی سلامتی کے قربانیاں دیں، اپنی جانیں قربان کیں یا مشکلات بھیلیں، مصیبتیں اٹھائیں، لیکن مایوسوں کو دل میں جگہ نہیں دی۔ یہ فخر کی بات ہے کہ ہم نے اپنی نگاہوں کو آسمانوں سے ڈھکا نہیں دیا۔ اور نہ ہی زخموں سے گھبرائے ہیں۔ ہم نے تکلیف اور ہر خطرے کا سامنا کیا ہے۔ ہم برابر آگے بڑھے ہیں۔ یہ چاہے سرحد پر لڑائی ہو، چاہے کسی غیر ملکی حکومت سے مقابلہ ہو اور چاہے آج غریب اور اقتصادیات میں ماندگی، نا انصافی اور ظلم کے خلاف لڑی جائے والی لڑائی ہو، ہندوستان نے ہمیشہ مصائب کو جھیلا، ہمیشہ اپنی تازہ اور اپنی روایات پر فخر کیا اور ترقی ثابت دہی کے ساتھ آگے بڑھے ہیں۔

وزیر اعظم نے کہا کہ ہمارے ملک میں کرڈوں کا ان اور فروڈ ہیں۔ بہت سے بے روزگار ہیں۔ اسی طرح بہت سے ہرجمن اور آزادی دہی ملک ہیں، جنہیں آزادی کے فائدے پوری طرح حاصل نہیں ہو سکے۔ جن حصوں میں ترقی نہیں ہوئی یا صنعتیں نہیں لگ سکیں، اس کا سبب یہ نہیں کہ اس کے لئے کوشش نہیں کی گئی۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ اسی وقت طلب ہے۔

انگریزوں کا مقصد یہ ہے اور ان خیروں کا منہ بول کر کے،
جو انہوں نے آزادی کی لڑائی میں باہر دینی کے وقت دکھائی
تھیں تو ہم غریب سے اپنی لڑائی کو اندر تر کر دیں گے۔

وزیر عظمیٰ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ جب ہمیشہ دکھائی
تھیں دیتا۔ ملک میں جب غیر ملکی حکومت تھی تو مکران کی کئی کوشش
کی کہ کسی دیکھی طرح مذہب کے نام پر یا دوسری طریقے سے ہمارے درمیان
تفرقہ ڈال جائے۔ اور ہمارے مجاہدین آزادی کو کھڑا کیا جائے۔ ہم ان کے
حال میں نہیں جھنسنے۔ بلکہ شک نہیں تھی کچھ جھگڑے ہوئے، لیکن ہم اپنے
مستحب راستے پر آگے بڑھتے رہے۔

شری گاندھی نے کہا کہ آگے بڑھتے ہوئے کئی راستے دکھائی
پڑتے ہیں۔ جی میں سے ہمیں صحیح راہ منتخب کرنی ہوتی ہے۔ ہمارے
جیسے غریب اور پھرتے ہوئے ملک کے لئے زیادہ راستے نہیں تھے بلکہ
یوں کہا جائے تو بہتر ہو گا کہ ہمارے سامنے ایک ہی راستہ تھا اور وہ
راستہ تھا اتحاد کا۔

وزیر عظمیٰ نے کہا کہ اسے شک ملک میں تاج غریب ہے، لیکن
آج درمیان طبقہ مضبوط ہوا ہے۔ اس کی تعداد اور طاقت بڑھی ہے۔
کچھ لوگ بے روزگار ہیں، لیکن بہت سے لوگوں کو روزگار ملا ہے اور
آگے بڑھنے کے مواقع ملے ہیں۔ آج ملک اناج کے اعتبار سے خود کفیل
ہے۔ ٹیکس آبادی چھڑی ہے لہذا یہ کوششیں کافی نہیں ہیں۔ اسی طرح
تعلیم، حفظانِ صحت اور بہت سی دوسری چیزیں جن کے بارے میں پہلے
سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا، آج ہر شخص اور خاندان کے ضروری ہو گئی
ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو سہولیات موجود ہیں وہ مضبوط طور پر عام
حاضر ہوں۔ ہم اس کام میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

وزیر اعظم نے کہا کہ تریبہ ہندوستان اور اس میں سکون کی لڑائی
دشمن ہے۔ لیکن میں چہیز نے ہندوستان کو پہلے کمزور کیا اور آج بھی کمزور
کر رہی ہے اور جس کے سبب ہم نے اپنی آزادی بھی کھوئی تھی۔ وہ ہے
مذاہب کے نام پر ہونا لگائی۔ مذہب، زبان، تصویر پرستی اور ذات
بات کی بنا پر سماجی بھائی کے درمیان غلطی دیواریں کھڑی کی جاتی ہیں۔ کوئی
ملک اتحاد اور محبت و محنت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکا۔ ہم اپنی ذہن کو کسی
پر حملہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے مضبوط دھکنا
چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں صنعتی اور زرعی ترقی ہو، روزگار
ملے، معیار زندگی بلند ہو اور عوام کو کچھ راحت حاصل ہو۔

وزیر اعظم نے کہا کہ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے۔
وہ اپنے بھائی نہیں بلکہ دنیا بھر میں امن چاہتا ہے۔ شری گاندھی نے
کہا کہ تسلیم، برعنوانہی اور بے انصافی کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک
مضبوط سرکار کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ جس سرکار پر ہر فرد مودہ

ہے، وہ غریبوں کی حفاظت کیا کر سکے گی، اقلیتوں کو کیسے محفوظ دے
سکے گی۔ انہوں نے کہا کہ آج ملک کو استحکام کی زیادہ ضرورت ہے۔
کیوں کہ دنیا میں خطرے بڑھ گئے ہیں۔ جن خطروں اور کالیف کا سامنا
آپ سب اور عوام طور پر غریب اور پس ماندہ عوام کر رہے ہیں، وہی خطرہ
ساری دنیا کو دوڑ رہی ہیں۔ امیر سے امیر اور مضبوط سے مضبوط ملکوں میں
بھی بے روزگاری ہے، تفتیش بڑھ رہی ہیں اور اقتصادی حالت کسی پیش
نہیں ہے۔ ہر ملک میں ایک کشمکش ہے، لیکن ان سب سے بڑی کشمکش یہ
ہے کہ کبھی نزعِ امن، جس نے اپنے علم میں اتنا اعتماد کیا، اپنی صلاحیت
بڑھائی وہ کہہ رہا ہے کہ یہ کیا وہ خود کشی کرنے پر آمادہ ہے؟ کیا
ہماری اس خوب صورت زمین کو ختم کرنے کی کٹھالی جاری ہے؟

وزیر اعظم نے کہا کہ تباہی اور ہلاکت پھیلانے والے ہتھیار فوری تعداد
میں جمع کئے جا رہے ہیں۔ امیر اور غریب ملک کے درمیان خاصہ
بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان امیر کی اور غریب کی صفی کو کم کرنے کے لئے
سماجِ خدا کے راستے پر گامزن ہے تاکہ نابرابری کم ہو اور آزادی کے فائدے
ہر شخص تک پہنچ سکیں۔

وزیر اعظم نے کہا کہ ہم نے آزادی کی لڑائی میں بندوبست اور توجہ
نہیں ملکہ اتحاد، حب الوطنی اور عزم کو اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔
وزیر اعظم نے ملک کے تمام عوام سے اپیل کی کہ وہ ملک کی مضبوطی کے
لئے مصوبہ پرستی، مذہب، سیاست یا زبان اور ذات بات کے نام سے
فائدہ اٹھانے والے لوگوں سے محتاط رہیں کیوں کہ وہ دھڑک بھلا نہیں چاہتے۔
کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تحریک کارروائیوں ہی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔
اس سے انہیں کچھ شہرت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن کیا ہمیں نام کی تعمیر
کرنی ہے یا ملک کو مضبوط کرنا ہے یہ سب لوگوں کو سوچنا ہو گا۔

وزیر اعظم نے کہا کہ آج بھی لوگوں میں وہی طاقت موجود ہے جس
سے انہوں نے آزادی کی لڑائی کی اور جب بھی حملہ ہوا اپنی مضبوطی کا ثبوت
دیا۔ ہمیں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیے یا ایسے خیال کا اظہار نہ کرنا چاہیے
جس سے مادر وطن کا سر جھک سکتا ہو۔ ہم سب پر اپنے لئے ہی نہیں بلکہ آئندہ
نسلیں کے لئے بھی ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ ہندوستان ہزاروں سال سے
دھڑھبے اور ہزاروں برس زندہ رہے گا۔ اس کے لئے اگر آپ کو آج اور آئندہ
قربانی دینی پڑے تو وہ دینی چاہیے۔

کنبہ بندی کی مقبولیت

وزیر اعظم شری گاندھی نے ایک موقع پر کہا کہ اگر کنبہ بندی ہو تو
کنبے کے ہر فرد کی کھلائی کے لئے آمدنی سے زیادہ مؤثر طور پر سادہ
انہا یا جاسکتا ہے۔ کنبہ بندی کا مقصد خواتین اور بچوں کی صحت کو
بہتر بنانا اور مجموعی طور پر پوری قوم کو مضبوط تر اور دلدار اور غیر متحرک

بنانا ہے۔

گزشتہ عرصہ میں ہندوستان نے عوامنمائی ترقی کی ہے وہ ہر اعتبار سے لائق توجہ ہے۔ اس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ آج بھی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان کا شمار دنیا کے بڑے ممالک میں ہوتا ہے۔ اس پر بھی ہندوستان کو اقوام عالم میں زیادہ آبادی کے سبب پچھڑا ہوا ٹھکانہ تصور کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں ہند کی آبادی ۳۴ کروڑ تھی۔ ۱۹۵۱ء میں یہ ۳۶ کروڑ ہو گئی اور ۱۹۸۱ء میں یہ ۴۸ کروڑ ۳۰ لاکھ تک جا پہنچی۔ صرف گزشتہ دہے میں آبادی میں ۱۳ کروڑ ۱۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شرح اضافہ میں ۴۵، ۲۴ فی صد کا اضافہ ہوا۔ یہ اعداد و شمار نہایت تشویش ناک ہیں۔ کیا ہم اس بڑھتے ہوئے بار کو برداشت کر سکیں گے خاص طور سے ایسے وقت میں جب کہ ہم اپنے عوام کا معیار بلند کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں؟ ہمارے ملک کے تقریباً ۵۰ فی صد عوام غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارتے ہیں۔ لہذا ہر روزی کے غریبی کے خاتمے کے لئے جدوجہد تیز کی جائے۔ اس کے پیش نظر مرکزی سرکار منصوبہ بندی طریقے پر پروگرام مرتب کر رہی ہے۔

وزیراعظم شری اندرا گاندھی کے الفاظ میں صحت اور کنبہ بندی ترقیات سے الگ تھلک کوئی اور چیز نہیں ہے بلکہ کنبہ بندی و ترقی کا چوڑا دامن کا ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنے عوام کی زندگی کو بہتر بنانے، ترقیاتی پروگراموں کو حقیقی رنگ دینے کے لئے ہمیں شرح پیداوار میں کمی کرنی ہوگی۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری سے بہت سے حوصلہ افزا رجحانات نیز گزشتہ دو برسوں میں حاصل ہوئی کامیابیاں بھی ملتے آئی ہیں گزشتہ ۳۰ برسوں میں شرح اموات میں نمایاں کمی کے باوجود ہماری آبادی میں شرح اضافہ جو ۵۱- (۱۹۳۱ء تا ۱۳۶۳ء) صدی تھا۔ ۴۱- ۶۱- ۱۹۶۱ء میں ۳۶۸ فی صد ہو گیا تھا، لیکن ۸۱- ۱۹۸۱ء کے دہے میں اس میں قدرے کمی آئی اور یہ ۲۳۰۵ فی صد رہا۔ ۴۱- ۱۹۶۱ء کے دہے میں کچھ بامستون اور کمزور ترقیاتی رجحانات میں شرح آبادی میں کمی ہو رہی تھی جب کہ ۸۱- ۱۹۶۱ء میں ۱۹ بامستون اور کمزور ترقیاتی رجحانات میں شرح آبادی میں کمی کا رجحان تھا۔ باقی عمل طریقہ اختیار کرنے والے ممالکوں کی آبادی میں ۱۰۶- ۱۹۸۱ء سے بڑھ کر ۲۲۰۶ ہو گئی۔

آبادی میں اضافہ کی روک تھام سے متعلق پروگرام پر باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہے اور وہ میں بھی یہ تیزی سے مقبلاً ہو رہا ہے۔ لہذا یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ۲۰۰۰ء تک شرح پیداوار ۱۲ فی ہزار اور شرح اموات ۹ فی ہزار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ مذکورہ وراثتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس ضمن

میں کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ تاہم اس بار کوئی گنجائش نہیں ہے مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لئے ابھی بہت کچھ کیے جانے کی ضرورت ہے۔

معاشیہ میں جو کنبہ بننے کے تصور کو فروغ دینے کے لئے ہم اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے بغیر ضرورت ہے تاخیر سے شادی کرنے، شادی کے اچھے خاصے وقت کے بعد پہلے بچے کی پیدائش اور دوسرے بچے میں مزید تاخیر سے کنبہ کو دو تین تک محدود رکھا جاسکتا ہے۔ انداز فکر میں تبدیلی لانے کی غرض سے ہمیں بہترین نفعانہ بیماری پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور جو کنبہ بندی پر عمل کرنے کے خواہش مند ہیں انہیں ہر طور کی سہولیات دینی کی جانی چاہئیں۔ اس سلسلے میں رضا کار تنظیمیں ملازم اور آخریوں کی تنظیمیں، سرکاری اور نیم سرکاری ادارے، نجی اور سرکاری شعبے نیز دیگر جمہوری ادارے ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

بعض ایسٹینیائی ممالک میں قومی پروگراموں کی کامیابی کے لیے رضا کار تنظیموں کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ رضا کار ادارے جو کام شروع کرتے ہیں وہ عوام کے مزاج اور ضروریات کے مطابق شروع ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ عوام میں ملحدی مقبول ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آبادی میں اضافے کی روک تھام کے مسئلہ کا حل بھی رضا کار اداروں کے پاس ہے۔

اس وقت میں رضا کار ادارے بشمول کل ہند سطح کی تنظیمیں مثلاً کنبہ بندی کی ہندوستانی انجمن، ہندوستانی طبی انجمن، خواتین کا انجمن اور ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی وغیرہ کنبہ بندی کے پروگرام میں حکومت کی کوششوں کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ رضا کار تنظیموں کے تعاون کی وجہ سے یہ پروگرام ایک منظم عوامی تحریک بن گیا ہے۔ ہمیں اور زیادہ رضا کار تنظیمیں نیز سوشل ورکروں کو کنبہ بندی کے پروگرام میں باہم تعاون کے لئے آمادہ کرنا چاہیے کہ یہ قوم کے درختان مستقبل کی ضمانت ہے۔

نیا سلسلہ



اس سلسلے سے ہر طبقہ شریکیت حاصل کرے گا۔ اس سلسلہ کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ ایسا غالب کے نام پر کیا جائے گا۔ یہ تنظیمیں اشارہ ہائے نئی کے نام پر قائم ہونے لگیں۔ ان کے لئے خطہ دار شاہو کتبہ ہندوستان کے نام پر ایک کمیٹی بنائی جائے گی۔ اس کمیٹی کے تحت ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔ اس ادارہ کے تحت ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔ اس ادارہ کے تحت ایک ادارہ قائم کیا جائے گا۔

۱۹۸۱ء میں ۱۰۶- ۱۹۸۱ء سے بڑھ کر ۲۲۰۶ ہو گئی۔

گمشدہ ہیرو کی تلاش



یروشلم اور اناکلماس کے ایٹمی دھماکوں نے شاید پہلی بار ہمیں اس حشت سے روشناس کرایا جس میں اس کے جوہر کا سوال تو درکنار اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا اور اسے مذمت سے اسے ہوا کہ وہ پڑ چکے کہ وہ کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ جب ان سوالات کے جواب کی تلاش کی گئی تو انہوں نے پایا کہ انسانی زندگی نوا اور لامین ہے۔ اس حقیقت کے شعور نے انسان کے بارے میں کئی قسم کی فرضی کہانیوں کو ختم کر دیا۔ تمام اقدار کا جوہر نکل چکا ہے۔ نصب العین اور آدش باطل ہو چکے ہیں۔ اور کوئی لازماً باقی نہیں رہا جس کی خاطر عام شہادت نوش کرنا چاہئے۔

اور پیش کی کہ امر ہو جانے کی خواہش درم توڑ دیتی ہے۔
کیا موجودہ صورت حال اتنی مضحکہ خیز، نواز اور بے معنی ہو چکی ہے کہ انسان حقیقی کی نذر ہو جاتا ہے
Nothing is more real than nothing.
ان حالات میں کسی مثبت ہیرو کے تصور کی بات تو دور رہی۔ نفی کا یہ احساس کسی کردار کو ہیرو سمجھ نہیں سکتا۔

اور انجام یہ ہوا کہ انسان کوئی ادب نہیں ایسے کرداروں کی بھرپور جمع ہو گئی۔
جدہ حشت کے مارے ہوئے تہنائی کے ڈسے ہوئے، حدودِ رحم کی خدائی علیحدگی کا شکار، انجینی، جلاوطن اور بے بار و مدد گار ہیں۔ ہجوم میں کھوئے ہوئے، ذات کی تلاش میں پھٹکے ہوئے، اپنی پہچان کا چہرہ ڈھونڈتے ہوئے، جن کا نہ کوئی بچی دو کرنے کا کوئی سہی، نہ کوئی چہرہ نہ کوئی نام، نہ کوئی لاسے، نہ کوئی منزل نہ روشنی نہ مذہب نہ اعتقاد نہ بہرہ نہ دوست نہ عزیز نہ غلام نہ لٹے نہ کب کا اعلان کیا تھا کہ غلام کا قتل ہو چکا ہے اور ہم سب اس کے قاتل ہیں یا یہ احساس پہلی جنگ عظیم سے قبل فرانز کا فکا کی تحریروں میں واضح ہو چکا تھا۔ جب ۱۹۱۳ء

”بچہ اسٹیکھس واپس کرپا کٹ کا سے ہے۔ آدمی اور کتے کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ اور تب ایسے سے میں شکرا جاکندہ لکھتا ہوں، توشل لہراتے اور سکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔“ بچہ اس مارے چیل، کھوٹ، کپٹ اور تھوٹ سے لڑکھائی چاہتے ہو تو روشنی کی کرامت ہو جاؤ۔ ورنہ کتے تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔“

(حسین امین - آتم کھتا)
یہ کون سا کٹ ہے جس میں آدمی اور کتے میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ جب آدمی اور کتے کی پہچان مشکل ہو جائے گی تو آدمی کی پہچان ہمیشہ آدمی کیا رہے گی؟ کیوں کہ وہ آدمیت کے ان عناصر سے محروم ہو چکا ہوگا جو اس کے وجود کو جوہر عطا کرتے ہیں۔ جن سے آدمی کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس سے آدمی کی ستمناخت ہوتی ہے اور جب آدمی پہچان نہیں رہے گا تو ادب میں ہیرو کی بقا کی کون ضمانت دے سکتا ہے۔ شاید اسی نے ہیرویت نے کہا تھا: ”انسان مر گیا اور میں اس کا گواہ ہوں!“

افسوس آدمی ادب میں ہیرو کی موت ایک دردناک سزا ہے۔ پھر وہ بے نام اور بے ندرج پڑ جائیگا اور اچھڑ چٹک رہی ہیں، لیکن کیا آدمی زہر پی کر ہی مر سکتا ہے۔ شاید! لیکن کوئی امیر! اشتراک اور سقراط نہیں مر سکتا۔ یہ لافانی زندگی بڑے موت مر کر کی کھوٹ نہیں ہوتی اور لوگ زندہ رہتے ہیں، لیکن ان کی زندگی مستند نہیں ہوتی۔ اور مستند زندگی کے بغیر ہیرو کے افعال کے عمل کو روکنا دشوار ہے۔
آج کے دور میں انسان پر کیا ہتی کو ہم اس کی داستان کو رقم کرتے ہیں، لیکن اس ہیرو کا درجہ دینے سے قاصر ہیں۔ دوسری جنگ عظیم،

میں اُس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ "میں ایک ایسی کال کوٹھری میں بند دیواروں سے سرسبز کرتا ہوں، جس کے نہ دروازے ہیں اور نہ کھڑکیاں۔" اور آج کا ادب اندھیرے بند کمروں میں دم گھٹتے ہوئے انسان کی داستان رقم کرنے لگا۔ کال کوٹھری میں سرسبز کرتا والا۔ اندھیرے بند کمرے میں دم توڑنے والا۔ انداز کے خلا میں سچینک دیا گیا بشر ہر ہونے کی سخت نہیں رکھتا۔ وہ معنی آدھے ادھورے ہی ہو سکتے ہیں۔ پڑھا کہ یہ سب کیوں کر ہر باب ہے؟ جواب ملا۔ معیشت کا رخ بدل گیا ہے۔ لوگ اپنی زمین، اپنے کھمبے، اپنے قبیلے، اپنے خاندان اپنی جڑوں سے کٹ گئے ہیں۔ شہروں کی سڑکوں پر بھگتے ہیں۔ جڑوں کی تلاش شروع ہو گئی۔ گم شدہ ذات کی تلاش شروع ہو گئی۔ چہرے کی پہچان شروع ہو گئی۔ یہ عمل ابھی جاری ہے۔ لیکن جب تک یہ عمل تکمیل تک نہیں پہنچتا، ہر وہی قوم نہیں ہو سکتی۔

فریڈرک نیچلز نے ۱۹۴۴ میں لندن کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے بے چہرہ لوگوں کے چہرے کے بارے میں لکھا تھا:

"لوگوں کی بھڑ سے بھری سڑکوں پر بے چہرے اور پڑھ کر کام کاج نہایت ہی سیدھا منظر پیش کرتا ہے اور یقیناً انسانی فطرت کے منافی ہے۔ کیا وہ سب ایسے انسان نہیں جن کی فطری خصوصیات اور امکانات ایک جیسے ہیں اور وہ ایک جیسے طریقے اپنا کر خوشی کی خواہش نہیں کرتے جیسا کہ ہم سب بھی وہ ایک دوسرے کے پاس سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے اُن میں کوئی بھی مشترک نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی سڑک پر جا تے ہوئے کسی دوسرے پر لگاؤ رکھنے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔ جتنا زیادہ لندن کے باشندے ایک جھونپڑی میں جگہ پر جمع ہوئے ہیں اتنی ہی زیادہ اپنے پڑوسیوں کو نظر انداز کرتے اور اپنے ذاتی مفاد کے لئے رخصتیاں نہ بننا ہی کا عمل بناتے گا ان کا رویہ قابلِ نفرت اور قابلِ مذمت بن جاتا ہے۔ ہم سب بھی جانتے ہیں کہ فرد کی یہ طبیعتی، تنگ دلی اور خود پرستی ہر جگہ موجود ہے۔ جہاں انسانی سماج قوتِ شکر اور انسانی ذہن میں منتشر ہو گیا ہے اور یہ سماج ہر بھی ذہن پروردہ ہو کر بھگتا رہا ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے انسان کو قدرت پر مخلص ہونے کی عطا کی، اسے ایک خوش آئند مستقبل کی تصویر پیش کی اور اپنی زندگی کی تشکیل اور تعمیری قدرت کا احساس دیا وہاں اسے۔ احساس بھی دیا کہ وہ شیعوں کے ساتھ کام کرتے کرتے خود بھی ایک دل نشینی پڑھ کر جلتے گا جن میں ناکہ ملاک ہے، ایک دن خود اس کا غلام بن جائے گا۔" شیعوں کی ملکیت دل کے لئے معترفات ہو گئی اور آلتا احساسِ مروت کو کچل دیں گئے۔ انسانی احساس اور شعور سے ماری ہو کر وہ ایک علمی تقدیم کا محض ایک ادنیٰ ترین بن جائے گا۔ ایک ہندو معصوم، بے بس، بے ارادہ ہے۔ میرا دکھانٹا

ہنگر ہے۔

مذہب نے انسان کے اندر سے اوپر کی آزادی کو پہلے ہی محدود کر دیا تھا۔ سائنس نے اسے مذہب کے غلبے سے آزاد کرنے کی کوشش کی، لیکن اُس نے شہت کے تبرکے میں کچھ نہیں بدل دیا۔ اور آج ٹیکنالوجی کے دور میں ہر وہی قوتِ غلبت اور خودی باقی رہی تھی وہ کچھ نہیں ہو گئی۔

لیکن کام ایک ایسی نئی پڑھ بیک کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ جب انسان کے مخصوص طبقے، کسان، مزدور، دانش ور، محکم، سائنس دان، حکمران، ڈاکٹر، شاہرہ یاساوت دان و غیرہ جبراً گا جوں میں تیار کرتے ہیں۔ آؤ اس کیلئے نے اپنی کتاب: بریوینورلڈ — ۱۹۳۷ء میں اس کا ذکر کیا ہے اور کئی سال بعد اس کی اگلی کڑی میں اس کو مسلّم کیا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس میں برسرِ اقتدار طبقہ اپنی ضرورت کے مطابق ایذا، بیٹا، گناہ اور ٹیٹا تک ذہن اور سوچ میں کی تشکیل کر سکتا ہے۔ وینس بیکر نے پہلی شہر میں اس سوال کو اس درجہ حیدر بنا دیا ہے۔ "کوئی شک کے ذریعے ہی بھی فرد، عظیم ہستی کی کاربن کا پیاں تار کی جاسکتی ہیں یعنی شہر، آئین انسانیت، سماج کا گڑھی یا مارن مزدور کے جیسے جیسے پستے۔ کیا یہ پستے ہر فرد کو آپ دھار کر رکھتے ہیں؟ بی۔ ایف۔ اسکرے نے اپنی کتاب بی یاڈ فورٹم اینڈ ڈکٹری میں کہہ کر کہ ایک ایسے انسان کی تشکیل کی جاسکتی ہے جس کا عمل نفسیاتی اور سماجی گناہوں کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے یا جن پر کٹرول کیا جاسکتا ہے اور ہم سالوں کے ہم نوا ہو کر چلا آتے ہیں۔

"انسان ہونے کے کما حقہ ہیں؟ ایک نہیں، ایک صدی میں ایک تبدیلی میں، ایک ہجوم میں، جسے سائنس نے شے میں بدل دیا ہے۔ ایک منظم قوت کے تحت جس پر کئی طرح کی پابندیاں ہیں۔ ایک ایسی صورت میں جو میکائیلیس میں وجود میں آئی ہے۔ ایک سماج میں برادری نہیں اور جہاں فرد کی حیثیت تم ہو رہی ہے؟" (ہیرنگ)

فردوں کو گم شدہ کے بعد یہ مختل اور عجیب انسان کے "فردوں سے بڑے فرد" کے خواب کو قابلِ تعبیر بنایا تو اس معلوم ہو کہ ہر قوم نہایت کی طرف نہیں، روزِ حشر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جہاں ولیم فاؤڈر کے انعامات میں ہر آدمی اس وحشت کا شکار ہے کہ وہ کب، کہاں، کب سے اڑ جائے گا۔

مذہب، فلسفہ، سائنس، سماجیات اور نفسیات نے انسان کے تصور کو کچھ بدل دیا ہے۔ اگر کوئی لوگ انسان کی کاربن کا پیاں تار کی تشکیل ہے تو سماجی اور تکنیکی اس کے اعمال پر کٹرول کر سکتی ہے۔ نفسیات اس کا برین واشنگ کر سکتی ہے، ڈکٹس اس کا ذہن بدل سکتی ہیں۔ بدنی پریسوائیٹ اور دوسرے ذرائع سے اس کے شعور اور احساس پر غلبہ حاصل کیا جاسکتا

ہے۔ جس میں ذہن بیحد کلمہ ہے نہ کلمہ جو سکتا ہے۔ نہ رہ سکتا ہے۔ محض ہو سکتا ہے۔

نعم العین سے عاری، یقین سے خالی، اقدار سے پرے، تشکیک سے کھڑے، فرد بہر وہیں بنتا۔ اور کچھ نہیں ہم خلا کچھ پرستش کرتے تھے، اگر وہ بھی پھر کے ہم عقلیں تو سماع اور سیادت میں تبدیلی لانے کی خواہش بھی دم توڑ سوتی ہے۔ مثبت، ہیر کی شکست ہو جاتی ہے اور وہ ہیر ہونے کے بھی اہل نہیں رہتا۔ اور عید یاد اب بکھار مٹھتا ہے کہ نہ ہی ادب کا یہ فرائض ہے اور نہ ہی اس کی قوت کہ وہ سماع میں کوئی تبدیلی لائے اس کے مسائل کے بارے میں کوئی حل ہی بتا سکے۔ اس طرح ناولوں اور افسانوں میں ایٹمی ہیرو پویش پانے لگا۔ وہ حالات کا شکار ہے، حالات کا باقی نہیں۔ ایٹمی بیگ میں کے ادب میں ایسے ہی ہیرو کی تصویر کشی ملتی ہے، ایسے یہ تک معلوم نہیں کہ وہ کیوں براؤنز ہے اور نہ سماع کی برائیوں کے خلاف لڑ رہا ہے۔ یہی صورت حال پیش کی ہے جو اپنے آپ کو سماع سے الگ سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ سماع کے اندر نہیں باہر ہیں وہ مٹھتے ہیں۔

حال ہی میں ہندی میں ایسے ناول لکھے گئے ہیں جن میں ہیرو کا ذوال بڑی تیزی سے سامنے آ رہا ہے۔ وہ اپنے محدود ماحول میں واپس لوٹ کر مسائل کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی نجی زندگی کے وسیع دائرے سے منسلک ہو کر زندگی کی وسعت گہرائی اور تنوع سے واسطی کیوں قائم نہیں کرتے یا قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

اور قربت یہاں تک بھی کہ ادب جسے اچھا تک تلاش ذات اور ذات کا ذریعہ سمجھا جا رہا تھا۔ اب اس کے اس ریل کو کچھ تسلیم نہیں کیا جا رہا جب انسان اپنے جوہر سے محروم ہو رہا ہے تو تلاش ذات ایک گمراہ کن اور لاعینی عمل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ متعلقات، سادرت، مائیکل بوٹرا اور ملین راب گیتے تو باہر ناول کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تو یہ تک بھی تسلیم نہیں کرتے کہ کردار کی نفسیاتی گہرائی ایسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ صورت حال ہمارے ادب کا مرکزی موضوع کیوں بنی جا رہی ہے ہر شاہد ہم عصر زندگی کے تقاضے اور ادب کے تقاضے ایک دوسرے سے آبی گہری مماثلت رکھتے ہیں جہاں فرد کا شعور اور ادبی تخلیق ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت حال یورپ اور امریکہ کے دہڑوں میں زیادہ نمایاں ہے۔ تیسری دنیا میں یہ مسئلہ ایک اوسط پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جہاں بہر کے ناول کا باعث وہ وسیع کچل کا پس منظر ہے جس کے احیا بانو کے لئے ان ملک کے دانش ور تنگ ہیں۔ یہ ادب اس مسئلے کو ایک وسیع پس منظر میں معاشرتی سماجی تبدیلی کے دائرے میں پیش کرنے کے خواہاں ہیں جس میں سماجی اور معاشرتی محرکات کا اولین درجہ حاصل ہے۔ اور انفرادی عمل کو ثانوی۔ آزادی کے

جسے عام مساوی میں وہ محض ایک آکائی ہے اور حکومت کی نظمیں اعداد و شمار کا ایک منظر ہے جسے بڑے بڑے نیک اور دلداروں نے آہے بے میں بدل دیا ہے۔ ان صورت میں کون ایسا شعور ماہر جو ہیرو کی پرستش کر سکتا ہے۔ کون ایسا ادب ہے جس کی کھال کے لئے نہ تو رقم کا موثر پیش کر سکتا ہے۔

اگر فریڈ نے انسان کو سوان کا نوپا یا ہوا جم ملکا کا فرزند نے اس کے ذہن کے نشان خانوں میں داخل ہو کر اس میں دور درخت کی جلیقیں نکالیں کہیں انسان بنیادی طور پر چرچاں حصلت ہے۔ جنسی جبلت کا غلبہ، شعور و عہد خطی کی خواہشات کا آؤ کار۔ فریڈ نے تخلیقی نفسی کے عمل میں انسان کی لاشوکی گروں، مچھوٹکی کی محروم اور دی ہوئی خواہشوں کا بے غیر غلام بنا دیا۔

اس کے ارادے اور عمل کی آزادی اور انفرادی ذہن داری سے اسے بڑی کر دیا۔ اب کوئی بھی فرد باہر نفسیات کے سامنے ہیر وہیں رہ سکتا۔ اگر وہ ہیر ہے بھی تو اس کا یہ جوہر انفرما میں عمل اس کے کسی ذہنی مرض کا دوا بن گیا ہے۔

فریڈ کی نفسیات نے جہاں انسان کو تہذیب کے بوجھ اور دباؤ سے نجات دلا کر اس کے نجی وجود کو کھال کرنے کی کوشش کی، وہاں اسے اپنے محرکات کا غلام بنا کر اس کے ہیرو کی قوت کو ختم کر دیا اور اسے ذہنی مریض، حقیر اور بے عمل قرار دے دیا۔ انفریڈ کے نظریے اساسی کثرت کی مارے ہوئے اور حصول قوت کے خواہش مند کردار ہیرو کا ناول اور افسانہ کر سکتے۔

لیکن جب یورپ اور امریکہ میں جنسی انقلاب کی لہر اٹھی اور یہ خیال عام ہو کر جنس جبر اور احساس کثرت سے نجات کے بعد زندگی کیفیت بحال ہو گئی تو فریڈ کی آزادی کی ہیرو کا عرصہ کرنے کے اعلان کر دیا کہ ہم نے پہلی بار راجیہ بنیت کو دریافت کیا ہے۔ ہم نے اپنی پہچان حاصل کر لی ہے۔ بورڈل کی "تہذیب و جنسیت اور شناخت کی انفرادیت سے مردوں میں ایک نجی طرح کا احساس کثرت پیدا کر دیا۔ جس سے وہ مکمل طور پر ہیرو کا رول ادا کرنے کا اہل نہیں رہا۔ اسے فریڈ کے کلک سے بھی نجات نہیں ملی۔ اور نہ ہی انڈر کے نظریے سے۔ اور لبرل سڈان کا راز راگ بن گیا شکست مرد کی ہوئی اور وہ ہیرو کے بجائے انفرادی ادب میں دوسرے درجہ کا شہری بن گیا۔

جہاں فریڈ نے ان کو جنسی جبلت اور لاشور کا شکار بنا دیا، وہاں کال مارکس نے اسے طبقاتی کشمکش کے ایک آؤ کار کے ٹوپ میں بیٹھ گیا۔ جنسی جبر کے بجائے اسے تواریخی اور مادی جبریت نے گھیر لیا۔ باہرین تاجا نے اسے کچھ اور سماجی ماحول کا پٹن بنایا۔ یہی کس سرائس اور کسانا بنی نے لپٹی کر دی اور یہ خیال عام ہو گیا کہ ہم نہ دنیا کو بدل سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے جیت سکتے ہیں۔ یہ ایک خوفناک سماجی سلسلہ ہے جس میں ہم محض بھٹک سکتے ہیں۔ آج کا ہیرو ایک ایسے اندھے کرسے میں داخل ہو چکا

تیسری دنیا میں جو مسائل پیدا ہوئے ان میں ٹیکنالوجی کی وساطت سے ماڈرن ٹرینشن کے عمل کو تیز کرنا ہے اور ساتھ میں ٹیکنالوجی پر ایک ایسی حد بندی بھی عائد کرنا ہے جس میں وہ اپنے دلچسپ کلوب کا "مجموعی مقام" بننے سے بچا سکیں اور ان کی کچھل پھانگ روک سکیں۔ کہیں کہیں ٹیکنالوجی استعمالی جانے کی قواس کے ساتھ ان ملکوں کا کلچر بھی آئے گا۔ جس کا باعث قومی ٹیکنالوجی کی ترویج کرنا ناگزیر ہے۔ یہ ایک ایسا اجتماعی عمل ہے جس سے فرد کی حیثیت کم تر ہو جاتی ہے کچھل تبدیل، کچھل اشتراک ایک سطح پر مغربی کلچر کو قبول کرنے کی بجوری اور دوسری سطح پر قومی کلچر کا تحفظ ایسے مسائل ہیں جو ہمیشہ دینا کے ادب کوئی جہتوں سے روشناس کر رہے ہیں۔

تیسری دنیا کے ادیب اس امر سے واقف ہیں کہ جو مسائل انہیں درپیش ہیں، وہ مغربی ممالک سے الگ ہیں۔ یہ ناول نگار کچھل کے فن کا ذکر کرتے ہیں۔ (بالقلا - رینے مارل) یا کچھل کے تحفظ کا ("سیلون ایرڈ" جیسے بھوسیس) یا مغربی کچھل کے مسئلہ اپنے مسائل کو لے کر ناچتے ہیں۔ "میسین جین فوس" وہ دماغی کا اسیا کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کچھل کی از سر نو تشکیل کا بھی۔ جیساکہ راجو راؤ کے ناولوں میں ہے۔ کرشنا سوینی نے اپنے ناول "زندگی نامہ" میں محافق کے ادب کے تحت کچھل کو ان سسٹم کو کچھل لایا جاتا ہے۔ انگریزوں کا باغ، اس میں اسے جبر کے خلاف احتجاج اور لغات کی صورت عطا کی ہے۔ چارلس لارکن نے اپنی کتاب "تیسری دنیا میں ناول" Novel in the third world

میں کچھل کے مغربی طرزِ تفقید نے ان ناولوں کی قدیمیت میں انہیں ہی اہولہا کو بدل دیا رکھا ہے۔ جن کا اطلاق ان کے ممالک کے ناولوں پر ہوتا ہے۔ اس طرح ان ملکوں کے ادب کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا جو مغربی ناولوں کو تیسری دنیا میں مل رہا ہے۔

ظاہر ہے جب مغرب میں ہیرو کے زوال کا سہرہ چاہوگا اور جو دنیا کے فلسفے کو فروغ ملے گا وہ ان ممالک کے ادب میں بھی ہیرو کی موت تلاش کریں گے۔ یہاں ناولوں میں ہیرو کا زوال نہیں ہوا۔ اور نہ ہی موت۔ بلکہ اس کا سارا پس منظر ہی بدل گیا ہے۔ اور ہیرو کی بجائے کچھل اور کمیونٹی کو اس کے وسیع تر دائرے میں اپنے تمام تر مسائل کے ساتھ اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے یہ ظاہر ہے کہ تیسری دنیا کے باشندے اپنے کچھل اور تاریخی پس منظر اور تبدیلی کے دھارے میں اپنی شناخت تلاش کیے ہیں۔

دھرم دہریائی کے ناول "سورج کا ساتواں گھوڑا" میں مالک مٹا کچتے ہیں۔ دیکھتے ہیں یہ کہانیاں حقیقتِ عشق کی نہیں بلکہ اس زندگی

کی تصدیق کرتی ہیں جسے آج بخلا متوسط طبقہ جی رہا ہے۔ اس میں عشق سے زیادہ اہم ہو گئی ہے اس کی معاشی جدوجہد اور اخلاقی خلفشار۔ اسی نے اتنی کرداری، ایوی، تلخی اور اندھیرا متوسط طبقہ پر چھایا ہے کچھل کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہے جس سے ہمیں میڈیا اندھیرا پر کر کے بڑھنے، سماجی نظام کو بدلنے اور انسانیت کی فطری قدروں کو از سر نو رائج کرنے کی قوت اور تحریک دی ہے۔ چاہے اسے ڈون کپرو، چاہے کچھل اور سٹین، اومسد، سکاٹی میں دشواریں۔ اس روشن رویہ کو اسی طرح آگے لے چلتے ہیں۔ جیسے سات گھوڑے سورج کو آگے بڑھانے چاہتے ہیں اور اگر باقی چھ گھوڑے کوڑے قوت سے ماری اور سزا دی جائیں تو ساتواں گھوڑا جو مستقل گھوڑا ہے قوی اور بہادر ہے۔ اور میں اپنی نواں سرکھی چاہیے۔

ہیرو کا زوال نہ آخری ہے اور نہ ہی مکمل۔ بلکہ وہ سہرہ کرشی بیکوان نظر آتا ہے۔ کوئی بھی فرد خود غلطی کے گھیرے میں مسلسل طور پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب تک وہ کسی ذہنی مرض یا کمزور فزیا کا شکار نہیں بن جاتا اسے اپنی شناخت میں نہیں شفیت بھی مائل کرنی ہے اور یہ شناخت اور معنی تنہا ہی کے ذیل یعنی دوسرے افراد سے واسطی کے ذیل ہی ممکن ہے۔ اگر یہ شفیت یا شے پر زندہ رہنے والا شخص ہیرو کا بدلہ اور انہیں کر سکتا۔ تجزہ زمینوں پر زمینوں کے پھول نہیں کھستے۔ اگر تنہا، جمیر، شعور، آزادی اور احتجاج کا حوزہ ناپل کے ہیرو میں نہیں ہے تو اس کے ملوہ نہیں کہ ادیب کبھی ان چیزوں سے ماری ہے۔ ادیب کا خاتمہ نہیں ہوا اور نہ ہی انسان کا۔ اور انسان کی نجات کے بغیر ادب کی نجات ممکن نہیں۔

بات شروع ہوئی تھی کہ بڑا سنگٹ کا سہ ہے اوروش بی کر امر مرچاؤ۔ اندر تباہ اپنے ناول "خوشین کا باغ" میں رقم طراز ہے:-

"آدم سے لے کر آج تک ہم کتنے ایسے نام گنا سکتے ہو کہ جب ان کے سامنے زندگی کا بیار رکھا گیا کہ اپنے ایمان کی نفی کرو اور اسے اٹھا کر پی لو تو انہوں نے بقائمی ہوش و حواس پہلے کو گھوڑا مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور لوگوں کو موت کو فرما دیا۔"

یہ کام سی فز نہیں، بے وقتیں ہی کر سکتا ہے۔ آج ادب کوئی "موت" کا نہیں ہے وقتیں کا انتظار ہے۔

سرسید اور شبلی کے درمیان اختلاف (ایک جائزہ)

میں اس معاملے پر نظر ڈالی جائے۔

سرسید اور شبلی کے درمیان اختلاف کی کئی وجوہات تھیں۔ اختلاف کی پہلی وجہ یہ تھی کہ عمل کرنا میں اسلامی تعلیم سے خاطر خواہ دل چسپی نہیں لی جا رہی تھی۔ مغربی اثرات کو بڑی تیزی کے ساتھ قبول کیا جا رہا تھا۔ نیز تعلیم کا مقصد محض کلرک پیدا کرنا تھا۔ شبلی جمال الدین افغانی کی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ جمال الدین افغانی نے سرسید کی انگریز پرستی کی شدت سے مخالفت کی تھی۔ مذہبی امور میں سرسید عقلیت پرست تھے اور اکثر تعلیمی مسائل میں بھی دونوں کے مابین اختلاف تھا۔ سرسید سے شبلی کا یہ اختلاف مذہبی اور تعلیمی امور کے علاوہ سیاسی سطح پر بھی تھا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

”اختلاف کے قصیدے کا آخری بند سیاسی اختلاف

تھا۔ سرسید، وہ سرسید جنہوں نے اسباب بغاوت ہند

لکھا، جو انگریزوں کی تائنش میں ہندوستانوں کی عزت کے

لئے انگریزوں سے اڑ گئے۔ جنہوں نے معتد و دفعہ کو

کی تجویزوں کی مخالفت کی۔ ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس

کا وجود ہوا۔ وہ اس کے سخت مخالف بن گئے۔ اور ایک

سال بعد اپنی تعلیمی کانگریس قائم کی جس کے دوسرے

سالانہ اجلاس گھنٹہ معوقہ ۱۸۸۷ء میں اس کی مخالفت

میں نہایت ہی پرجوش تقریر کی، اور ۱۸۸۸ء میں کانگریس

کے مقابلے میں ایک پیشہ پالک میونسپلٹی لکھنؤ بنائی جس میں

تمام بھوسوں، تعلقہ داروں اور دیسی ریاستوں کو ملا کر

کانگریس کے مقابلے کے لئے ایک محاذ جنگ قائم کیا۔ پھر

۱۸۹۳ء میں سربک کے ساتھ مل کر موزن انگلو اورینٹل

شبلی علی گڑھ آئے سے پہلے ہی سرسید کے مداحوں میں سے تھے۔ پہلی بار جب بھائی سے ملنے والے کے ہمراہ علی گڑھ آئے تو سرسید کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر لائے تھے، جس میں انہوں نے سرسید کی قومی خدمات کو سراہا تھا۔ ان کو محبت وطن، محبت قوم، امام اور سردار، بہادر سرسید و غیر خطابات سے نوازا تھا اور ان کے والدین کو عرب و عجم کے سردار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ سرسید کے ساتھ مولانا مالک شبلی علی گڑھ میں آئے۔ کالج اور سرسید کی مدح میں بے شمار الفاظ، ان کی زبان اور قلم سے ان کی مختلف تقریروں، محرمیوں اور نکلوں میں نکل چکے تھے۔ قدرت کی تم غلطی دیکھئے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرسید اور شبلی کے درمیان اختلافات بڑھتے ہی گئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ سرسید ان کی نظریں خرمیوں، بکلیوں اچھائیوں کا سرچھہ تھے۔ آہستہ آہستہ وہ بیکر ٹوٹ گیا۔ اور شبلی کے اختلافات سرسید سے یہاں تک بڑھے کہ وہ ان کی زندگی ہی میں کالج کی ملازمت سے علیحدہ ہو جانا چاہتے تھے۔

عام طور پر امیان شبلی اور خاص طور پر سید سلیمان ندوی نے اس اختلاف کو کچھ اور ہی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں سرسید محض غلط فہمی سے اور شبلی نے درست راہ اختیار کی تھی۔ جس طرح مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کی طرف داری میں اس حد تک مبالغہ کیا تھا کہ غالب اور مومن جیسے شعرا کی غفلت سے بھی انکار کر رہا تھا، بوجہ سرسید صاحب نے بھی محترم استاد کی عقیدت اور حمایت میں مبالغہ سے کام لے کر سرسید کو آمر

A man of despotic nature

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ آئیے چند حقائق کی روشنی

نزد شو بچتیاں مندر، وارث پورہ، کامی ۱۰۱ ۴۴

دیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ (حیاتِ شبلی، سید سلیمان ندوی ص: ۹۶)

علاوہ انہی شبلی خلافتِ راشدہ کے اصول انتخاب کی بنا پر باغیہ رہا جہوریت کے طرف دار تھے، جب کہ سرسید شخصی حکومت کو پسند نہ کرتے تھے۔

علاوہ دوسری طرف وہ اپنے آپ کو مذہبِ مسلمان اور اسلامِ عرب ہونے کی وجہ سے ریڈیکل سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی، سرسید کی بغض کا انگریزوں کی مخالفت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دل سے کانگریس کے اصولوں کے حامی تھے۔ چنانچہ اس مسئلے میں دونوں کی رائیں بالکل الگ تھیں۔ شبلی سیاست کے عملی میدان سے الگ تھے، لیکن ان کی سیاسی رائے آخر تک یہی رہی۔

روم ویلنٹائن کی لڑائی (۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء) میں ترکوں کو باوجود انگریزوں کی مخالفت کے، جوشانِ دافع حاصل ہوئی، اس نے سرسید کے مسلمانوں کو براہِ مہر جوش بنادیا۔ تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے اس فوج کا حق سنا یا بلی کی مسلمانوں نے جو چراغاں کیا یہ بات سرسید کی بہت ناگوار گزری اور انہوں نے اس کے خلاف دو دفعہ سخت معامین لکھے۔ جو حامیانِ اتحادِ اسلامی کو تیر کی طرح آگ لگے، اور انہوں نے سرسید کی اس انگریز پرستی کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا۔ حلقہ سرسید میں رہ کر ان سے ایسا اختلاف، سرسید کی نظریں قابلِ درگزر مہر قوم، حامیانِ سرسید کے نزدیک ہرگز قابلِ معافی نہ تھا۔ چنانچہ مولوی بشیر الدین ایڈیٹر البشیر، آمادہ بذاتِ خود مخالفینِ سرسید میں سے تھے۔ لیکن اب تائب ہو کر حلقہ ارادوں میں شامل تھے، بار بار شبلی سے سرسید کے حلقہ جگہ جگہ میں ملنے کا اعلان کر کے کہتے تھے۔

ندوہ اور شبلی کے تعلیم کی مخالفت اور اس زمانے میں کانگریس سے ان کی عداوت کا سبب بھی یہی تھا۔ (حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی)

دراصل شبلی یہ سمجھتے تھے کہ سرسید کی سیاسی رائے میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس کے پہلی سربراہ نے سرسید کو یہ بات سمجھا دی تھی کہ انگریزوں سے دفاعی دہائی میں کانگریس اور مسلمان دونوں کا فائدہ ہے۔ ان کی خیالات کی بنیاد پر شبلی سرسید کے مزاج کو سمجھ ہی نہ سکے۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ :-

”رائے میں میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ مولوی رہا، لیکن بالکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا۔ اور کانگریس کو سرسید کے ساتھ اور سرسید سے بار بار کشیدیں رہیں“ (حیاتِ شبلی، از سید سلیمان ندوی)

ص: ۱۹۷

کتنے افسوس کی بات ہے کہ شبلی نے جس انسان کے ساتھ مولوی رہ کر رہائے، اسی کے سیاسی مسلک کو نہیں سمجھ سکے۔ وہ یہ بھی د جان سکے کہ سرسید انگریزوں کی اس قدر حمایت کیوں کرتے تھے۔ وہ سرسید کے باغیانہ خیالات

سے ابھی طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سرسید مذہبی معاملات میں کانگریس قدرگزار خیال تھے۔ ان کی بہت، جوں جوں اور وہ خدائی کے کو فرقہ خالی تھے اور اس کا اعتراف بول رہے تھے :-

”وہ بہرہ دور دست و قلم میں نے اسبابِ بغاوت ہند لکھا اور اس وقت لکھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے، وہ بہادر جس نے پنجاب بینی ورسٹی کی مخالفت میں لاڈلٹن کی اسپینچوں کی وجہ ان ٹانہ دی تھیں، اور جو کچھ اس نے ان میں اڑھکیوں میں گھسا، کانگریس کا لڑکچہ حقوقِ طبیبی اس سے زیادہ چوڑا لڑکچہ نہیں پیدا کر سکتا، وہ حالِ ہاتھ آگاہ کے دیدار سے برہم ہو کر پلاٹا پھٹا کر دیا میں ہندو تیلوں اور کانگریس کی کس سیاسی بارہ درجہ پر نہ تھیں، وہ انصاف پرست تھے جن نے محاکموں کی نسبت

(حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی)

اس اعتراف کے باوجود وہ سرسید کے موقف کو نہیں سمجھ سکے۔ سرسید اور شبلی کے سیاسی اختلاف کو سمجھنے سے پہلے دونوں کی ذہنی نشوونما کو سمجھنا ضروری ہے۔ وہ میں بات پر ضرور تیار معذور ہوئے وہ یہ ہے کہ سرسید نے جس زمانے میں جنم پایا اور شبلی جن زمانے میں پیدا ہوئے، ان دونوں زمانوں میں ماہِ سال کے فاصلوں کے علاوہ کئی عوامل سے بہت فرق تھا۔ گویا آج کی طرح وہ دنیا نے رفتار نہیں تھی، لیکن کچھ باتیں ایسی گزری تھیں جن سے سرسید اور شبلی (جو شبلی سے بہت پہلے پیدا ہو چکے تھے) بہت اچھی طرح واقف تھے۔ سرسید نے جگہ جگہ غدار اور اس کے بعد کے واقعات حالات پر ذاتِ خود مشاہدہ کئے تھے۔ شبلی نے ان کے بارے میں دوسروں سے سنا تھا۔ اور یہ جو کلمات ہے کہ ”شہید کے بوجہ نامندیدہ“ یہی فرق دونوں کے درمیان تھا، جس کی وجہ سے دونوں میں اختلاف ہوا۔ یہاں ان باتوں کی کچھ قدر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

سرسید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء مطابق ۵ رزی المحرم ۱۲۳۲ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد غالباً شاہ جہاں کے عہد میں ہندو آئے تھے۔ اور اس زمانے سے اکبر شاہ ثانی کے عہدِ سلطنت مغلیہ کے ساتھ ان کا تعلق کسی رسمی طور سے قائم رہا۔ سرسید کے بزرگوں میں سے ایک شخص سید محمد دوست تھے۔ کن کی جم میں اور گنگ زیب مالگیر کے ساتھ تھے۔ اپنی جمیت کے ساتھ ایک موچے کو انہوں نے بغیر کسی تھیر کی مدد کے نستج کرنا تو عالم گیر نے خوش ہو کر ان کو یہ کہہ دیا ”کاغلاب دیا۔ سرسید کے دادا ہادی تھے۔ بادشاہ عالم گیر نے ان کو جوہر علی خاں کے خطاب سے نوازا اور منصبِ ہزاری ذات و پان صد روپے کا شاہ عالم نے جوہر علی خاں کا خطاب

مہاراجہ نے یہ خطاب اور منصب سرسید کے والد مرحوم کی گورنر مہاراجہ نے دیا۔ مسکن
 کے عیب سے انہوں نے قبول نہ کیا۔ اگر شاہ نے یہ خبر ادراک کے زمانے
 سے لے کر وہ کم تھی۔ بلکہ شاہ کے زمانے میں دربار میں رسوخ پڑھا۔
 اس وقت سرسید اپنے والد کے ہمراہ انڈیا میں شریک ہوئے تھے۔

اسی طرح سرسید کے خیال کا تعلق بھی دربار سے تھا۔ سرسید کے
 حقیقی والد میر الدولہ، امین الملک شاہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ
 صاحب علم و فضل اور عاقل و کرم و فیاضیت میں وسیع و عریض تھے۔ ان کے ماموں نور
 زین العابدین خاں (فرید الدین کے چھوٹے صاحب زادے) بڑے قابل شخص تھے۔
 ان کو ۱۸۱۵ء میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے ٹکڑے سے ملکر وزیر مملکت
 بنایا اور خطاب دبیر الدولہ، امین الملک، مصلح جنگ عنایت کیا۔
 (دہلیستان تارخ اور احوال عرصہ قاری)

یہاں میں باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرسید علی خاں
 سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے ان کے جدِ امجد کا تعلق ہمیشہ مغلیہ دربار
 سے رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ پچیسویں صدی میں خود سرسید بھی اپنے والد کے ساتھ
 دربار میں جایا کرتے تھے۔ اور سینوں باتیں اپنی جگہ سرسید کے ذہنی ارتقاء
 اور شو و نما کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ خاص طور سے سرسید کا پچیسویں
 بنات خود دربار میں شرکت کرنا۔ پچیسویں ساری عمر ٹکڑے نہیں
 ملتے ہیں۔ جس شخص نے دربار میں شرکت کا شرف حاصل کیا
 ہوگا، اس نے شاہانِ انڈیہ کے ماہ و جلال کا نظارہ بھی یہ چشم خود کیا ہوگا۔
 منظر شہنشاہ ہوں جس میں شان و شوکت سے ہندوستان پر حکومت کی
 ہے اس کی بیش تر باتیں اپنے بزرگوں سے سنی ہوں گی اور اس کا
 جیسا کچھ خیال ان کے دل و دماغ پر ہوگا وہ اخیر زمانے تک
 قائم رہا ہوگا۔ اس میں اہم بات یہ بھی ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کا
 زیادہ وقت دہلی میں یا دہلی کے ہاں کی صحبت ہی میں گزر رہا تھا۔ حالانکہ
 خود سرسید کے مہدی دہلی کی حکومت لال قلعہ تک محدود تھی۔ اس کے
 باوجود بھی مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت، جاہ و جلال، وقت اور
 وضع دریاں جو ان کی قوتیں باقی تھیں۔ اور یہ باتیں صرف بدست ہوں
 تک محدود نہ تھیں۔ ان کے اثرات رؤسا، امراء اور عام مسلمانوں
 میں بھی پائے جاتے تھے اور یہ نظارہ یہ رعب دار منظر سرسید نے خود
 اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اچانک وہ حال کا وہ واقعہ پیش آیا جس کو دنیا
 غصہ ۱۸۵۷ء کے نام سے جانتی ہے۔ "اردو غزل کے پچاس سال" میں
 ڈاکٹر عبداللہ امداد خلیل نے لکھا ہے:-

"سرسید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور مہاراجہ
 غدر کے وقت ان کی عمر چالیس سال تھی۔ وہ بڑے

دور اندیش، پختہ کار، عالی دماغ، مستقل مزاج، جفاکش
 ذہین، لطیف طبع، اخلاص کیش، زمانہ شناس اور صواب
 پُرجوش اور عرصہ انساں تھے۔ انہوں نے ہندوستان
 بالخصوص مسلمانوں کا دورِ امتداد کا کافی قریب سے دیکھا تھا۔

اور اس سے سخت متاثر ہوئے تھے" (ص: ۱۰۸)

اور غدر کے ٹکڑے نے مسلمانوں کو کیا سے کیا کر دیا۔ جو شخص ہنگامہ غدر
 کے وقت چالیس سال کا تھا، پختہ کار تھا، دور اندیش تھا، عالی دماغ
 تھا، زمانہ شناس تھا، جس شخص نے مغلیہ سلطنت کا ماہ و جلال دیکھا تھا،
 شان و شوکت دیکھی تھی، مستقل مزاجی اور استقلال کا نظارہ کیا تھا، اس نے
 مسلمان قوم کی تباہی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ غدر سے پہلے مسلمان
 کیا تھے اور غدر کے بعد ان پر کیا ہوا؟ اس کا حال خود ایک انگریز ڈاکٹر منٹر
 کے الفاظ میں سنئے:

"ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر
 مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو شخص شکریے کے ساتھ
 ان چند کمزوروں کو قبول کر لیتے تھے، جو ان کے سابق
 فاتح اپنے ہندو خزانے سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے۔
 اور انگریزوں کی سیاست چند لاکھ شتوں اور لاکھوں کی
 تھی۔ (لیکن اب یہ حال ہے کہ) ابھی پچھلے دنوں ہی ایک
 بہت بڑے ٹکڑے کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص
 سبھی انسانوں جو مسلمانوں کی زبان بولتے تھے۔ واصل
 ٹکڑے کے سرکاری دفتر میں مسلمان اس سے بڑھ کر اندوختی
 اُستد نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اب یہ دوات میں سیاسی
 ڈانٹے ڈالا یا قلموں کو خشک کرنے والا کے سوا اور کوئی
 ملازمت حاصل کر سکیں" (ہمارے ہندوستانی مسلمان
 ۱۸۷۱ء ترجمہ ڈاکٹر صادق مین)

ان کے چل کر وہ لکھتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو
 مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور
 بازوؤں کی قوتِ ثانی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور
 حکومت علمی تعلیمی، بلکہ علم میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن
 اس کے باوجود حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ اب ان
 پر بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع زندگی میں بھی
 انہیں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں..... وہ لاکھوں
 ملازمتوں کے قابل ہوں تب بھی ان کو سرکاری اعلانات

کے ذریعے ملازمت سے باز رکھا جاتا ہے۔ ان کی قابلِ رحم حالت پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اعلیٰ حکامِ قرآن کی ہستی کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔۔۔

گورنمنٹ نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ کسی
اسلامی تنہا پر مبنی کی اجازت نہیں ہیں۔ البتہ ٹکٹ کے
افسر کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ماتحت مسلمانوں
کو ان کے چھ بڑے تنہا رول پر غیر حاضر ہونے کی اجازت
دے دے۔“

شیخ محمد اسماعیل یانی سنی نے غدر کا حال یوں بیان کیا ہے :-

آج سے ایک صدی پہلے ماضی، ۱۸۵۷ء میں جو برصغیر
 آندھی دہلی میں چلی، اس سے اس قدر نیا ہی اور انگریزوں
 جیسی جس کی انتہا نہیں۔ ہزاروں گھبراہٹ بادل ہو گئے۔ محلے
 کے محلے صاف ہو گئے۔ حوٹانز نہایت آباد تھے، انکا
 نام و نشان نہ رہا۔ شہر کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی۔ ایسے
 ذلیل ہو گئے۔ شریف دربار سے اسے بھرنے لگے۔ جن
 باعصت و شیرازوں کو چاند نے بھی پرودہ نہ دکھا تھا
 وہ بحالی تہہ تنگے پاؤں، تنگے سر جنگلوں میں ٹھوکر
 کھاتے گئیں۔ سیکڑوں معصوم بچے ذبح کر ڈالے گئے۔
 ہزاروں عورتوں کی عصمت بری طرح ٹوٹی گئی۔ خاندان
 چھوڑ گئے۔ قبیلے تباہ ہو گئے۔ ہزاروں کو گولی سے اڑا دیا
 گیا۔ سیکڑوں کو تلوار سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔
 بہت سے بے گناہوں کو کھانسی پر شکار دیا گیا اور

اندولن کے دل و دماغ پر اب وہ موجود قنوط
 طالع نہیں رہ سکتا کہ جواب سے کچھ برس پہلے تک
 ساری نعمتوں کو لایم اور کثیف خاطر کے ہونے تھا۔
 پہلی وجہ یہ کہ جو حزن و داس، رعب و ہراس،
 احساس کمتری و شکستہ پائی ہمہ سرستہ، قالی یا کٹر کے
 کردار و گفتار میں پاتے ہیں۔ یہ شبلی کے بیان ہم کو نہیں
 ملتا۔ شبلی کے لئے ۱۸۵۵ء کی ستم کاریاں اور جفا خدایا
 یہ جلتے "دیوہ کے" شدیدہ کی حقیقت رکھتی ہیں۔ لہذا
 ان کے جذبات انقلاب، جو شریعت اور شرعی آزادی میں کسی
 طرح خارج نہیں ہو سکتے تھے۔ (ڈاروڈ نزل کے سچا پس
 سال" از: ڈاکٹر عبداللہ رضا فاضل)

شبلی کے سلسلے میں دوسری بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ وہ بگڑے
 خد میں دینی سے بہت دور غم گڑھ میں تھے۔ جہاں تک مذہب کے اثرات
 پہنچے تو ضرور تھے، لیکن شہر و مد سے نہیں پہنچے تھے۔ اور یہی وہاں تباہی
 غارت گری، توڑ پھوڑ اور تانت و تاراج اس پہیلے سے ہو چکی تھی جس
 پہیلے یہ دلی میں کماٹی گئی تھی۔ لہذا شبلی کا شعور اس سلسلے میں ناچختہ
 تھا۔ جو شریعتی جبل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی نظریں صرف وہ واقعات
 تھے جواب کے آ رہے تھے۔ اس وقت عالم اسلام پانچ سو برسوں کی سچ
 سے بڑی تباہی آئی ہوئی تھی۔ یورپی طاقت ترکی کی مرکزیت کو ختم کرنے
 کے درپے تھے۔ بلقان میں ترکی کے غلات مظاہرے ہو رہے تھے۔
 ۱۸۶۰ء میں سلطان عبدالعزیز کو معزول کیے مراد ثانی کی تخت نشینی کیا
 گیا۔ سچوہ بھی معزول ہوا اور عبدالحمید ثانی نے تخت پر قبضہ کیا۔ لبنان پر
 میں بغاوت کے آثار تھے۔ ان کو دبا گیا تو روس نے عیسائیوں پر غلام
 ڈھالتے جلنے کا ہانہ لے کر ترکی سے جنگ چھیڑ دی۔ عثمان پاشا نے
 پلونا میں فوجی بہادری سے مقابلہ کیا مگر کامیاب نہیں ہوئے اور
 اس کے بعد مسلم رعایا پر جو غلام ڈھالتے گئے، ان کی تفصیل پڑھ کر کوشش
 آج بھی کاپ جاتی ہے۔ درستیہ تاریخی و رسائی آئیے میں از: ڈاکٹر
 شاکر) ان وجوہات کی بنا پر انگریز شبلی کی نظریں میں مجرم تھے اور
 وہ ان کی مخالفت میں کانگریس کے حمایتی ہیں کہ سرسید کے غلات ہو گئے تھے۔
 یہاں افسوس اس بات پر ہے کہ اگر آلہ انگریز جیسا کہ مخالف بھی آخری
 عرصہ میں سرسید کی قوی خدمات کا اعتراف ہو گیا تھا، لیکن شبلی جو مولہ بریں
 تک ان کے قریب ہے، اخیر عرصہ میں ان کے مخالفت بن گئے۔

سرسید پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ انہوں نے مسلمانوں
 کی تباہی صرف ہندوستان میں دیکھی تھی اور ان کی تحریک کا مقصد صرف

ہندوستانی مسلمانوں تک محدود تھا، اس لئے وہ ہر طرف سے انھیں بند کرنے
 صرف ہندوستانی مسلمانوں کے معاملہ کو نظر رکھتے تھے۔ عالم اسلام پر کسی
 بیت رہی ہے، اس سے انہیں کچھ زیادہ غرض نہ تھی۔

شبلی نے کانگریس کو اس لئے پسند کیا تھا اور سرسید کی لئے مخالفت
 کی کہ کانگریس ترقی پسند جماعت تھی۔ حالانکہ یہ حقیقت نہ تھی۔ کانگریس بھی
 ابتدا میں انگریزی حکومت کی اتنی ہی عداوت رکھتی تھی جو سرسید کی تحریک۔
 شبلی نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی نظریں صرف اپنا زمانہ تھا۔
 ماضی نہیں تھا اور اگر کبھی تو صرف ہندوستان کا نہیں بلکہ تمام عالم اسلام
 کا۔ سرسید اس کے برخلاف پرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباء و اجداد
 نے سلطنتِ مغلیہ کا نمک کھا یا تھا۔ وہ سلطنتِ مغلیہ کی تاریخ سے واقف
 تھے۔ انہیں ہندوستان کے ماضی سے محبت تھی، سلطنتِ مغلیہ سے محبت
 تھی، ہندوستانی مسلمانوں سے الفت تھی، اس لئے ان کی تمام تر توجہ کا
 مرکز خاص طور سے ہندوستانی مسلمان تھے۔ اس لئے "اگر ہم سرسید کے بارے
 میں کوئی فیصلہ کریں گے تو اس کے لئے کہ سرسید کیسے قوم میں تسلیم کرنا
 پڑے گا کہ وہ جمہوری طور پر اپنے دور کی تمام ترقی پسندی پر گئے اور تھے ہیں۔
 حکومت سے عداوتی ان کی رجحان پسندی کی دلیل نہیں ہو سکتی کیوں کہ
 خود کانگریس بھی، جو ملک کی سب سے ترقی پسند جماعت تھی، اسی منزل
 میں تھی اور سرسید کے بعد بھی ایک عرصہ تک اسی منزل میں رہی۔ کانگریس
 بڑا واضحیت کی نمائندہ تھی۔ اور اس دور کا بڑا راجہ و اہلیہ طرح مانا تھا کہ
 وہ اتنا طاقت ور نہیں ہے کہ برطانوی حکومت کے نظام کو چیلنج کر سکے۔ اس
 کے برعکس برطانوی حکومت کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اس طبقہ کے نزدیک
 ان کی اصل دشمن برطانوی حکومت نہیں تھی بلکہ یہ حقیقت تھی کہ عوام باطل
 ہیں ماندہ تھے۔ ملک کو جدید ترقیوں کی ہوا نہیں تھی۔ تو تہمت اور
 جہالت کا اثر لوگوں پر بہت زیادہ تھا اور نوکریاں بھی نظم و نسق کا ناقص نظام
 ان تمام خامیوں کا ذمہ دار تھا۔ ان خرابیوں کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے
 انہیں قریح رہی تھی کہ برطانوی حکومت ان کے ساتھ تعاون کرے گی۔

(رضی بام دت، نیا ہندوستان)

سرسید کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھی تمام ہندوستانیوں کی
 جیس انگلی، جہالت اور قہمات کو ڈر کرنے اور مرقی اقدام اور جمہوری
 تصورات کے چھیلانے میں معروف رہے۔ کانگریس لیڈروں کی طرح وہ بھی
 حکومت کے وفادار تھے۔ اور حکومت کے نظم و نسق میں ہندوستانیوں کو برابر
 کا شریک دیکھنا چاہتے تھے، لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا ہے انہیں بھی گوارہ
 نہ تھا کہ ہندوستانی اکثریت اور لیڈر ترقی کی بدولت مسلمانوں سے پہلے حکومت
 کی شہنشاہی پر قابض ہو جائیں اور ان کی حق تلفی کریں۔ سرسید کو کانگریس کی مخالفت

صادقین کی رباعیاں -



بچپن میں تھے باد کی تھامیں نے
جب شعر کا کب لفظ سنا تھا میں نے
اس پر نہیں خوفِ رباعی جھسکو
ہر روز ہی غمتی پر لکھا تھا میں نے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صادقین نے اپنی تمام شاعرانہ صلاحیت غزل یا دوسری صنف سخن پر کیوں صرف نہیں کی جو رباعی میں ہی محدود صنف پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس سوال کا تشریح جواب وہ خود ہی اہلِ صنفِ صادقین میں دیتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں :

..... ”خلاہ کہ نصفِ رباعی سے اپنی محبت، بچپن سے بے سزا جانے کیوں اس میں ایک خاص حسن و جمال، ایک خاص متانت اور سنجیدگی نظر آتی ہے اور پھر یہ کہ اگر یہ لکھی جاتی ہے تو خطاطی کے نقطہ نظر سے..... سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے باقاعدہ رباعیاں لکھنی شروع کر دی تھیں ان کے پھر قلمی نسخے بھی بنتے تھے۔ بہت سے ضائع بھی ہوئے۔ کچھ کھو دیئے اور کچھ خود ہی نذرِ آتش کر دیئے.....“

مئی ۱۹۶۹ء میں غالب کے اشعار پر مشتمل ایک نمائش کی تھی اس کے کچھ زمانے بعد لاہور چلا گیا اور وسط ۱۹۶۹ء میں ایک محفلِ مدوشاں میں بروقت نمائش دینے پر تیار ہو گیا۔ رباعیاں بھی گئیں لطیفوں کے طبع پر۔ اداان کا نظریہ میں ترجمہ کے اہل محفل کو سنا۔ کیونکہ حسینان محفل کو انگریزی اسکلوں میں پڑھنے کی وجہ سے خوش قسمتی سے اُردو نہیں آتی تھی یعنی شاعرانہ صوبہ چھوٹے بھائیوں پر خیر ہے تو سلسلہ شروع دو چار روز جاری رہا اور بالآخر میں بھی کوئی نہ جال میں پھنس گیا۔ ستمبر بلکہ اواخر اگست ۱۹۶۹ء سے جنوری ۱۹۷۰ء تک شہادہ روزِ رباعی کوئی کی خطرناک کیفیت کی شدت کی گرفت میرے وجود پر پڑی اور میں بغیر سوچے سمجھے رباعیاں لکھتا چلا گیا مسلسل پانچ ماہ تک۔ یہ تمام صادقین کی رباعی کوئی کا ذہنی ارتقائی پس منظر میں نہیں سمجھ سکتے

اگر یورپ میں کسی سے سوال کیا جائے کہ صادقین کو جلتے ہو تو وہ کہے گا: ہاں، وہ بہت بڑا مصدق ہے۔ اگر عرب میں کسی سے ہی دریافت کیا جائے تو جواب ملے گا کہ وہ ایک بڑا مصدق اور خطاط ہے۔ اور اگر مغرب میں کسی سے یہ سوال دہرایا جائے تو وہ فوراً کہے گا کہ صادقین ایک عظیم مصنف، ایک بے مثال خطاط اور ایک رباعی گو شاعر ہے۔ ان تینوں صفات کا کسی ایک شخص میں جمع ہونا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ مگر صادقین کا غیر ان کے اوصافِ شائستگی کے آپ و گل سے تیار ہوا ہے۔ شاعری مصوری، تزیین، نقاشی، منظر تراشی، خطاطی سب ہی فنونِ لطیفہ کی شاخیں ہیں ان کا ایک دوسرے سے گہرا ربط ہے۔ ان سب میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ سخن اور احساسِ جمال ہے۔ فنکار کا احساسِ جمال جتنا تیز ہوگا اتنا ہی اس کا فن زیادہ بڑا تاثیر ہوگا۔ حلاوت کے ہاں احساسِ جمال کی شدت ہے۔ یہ احساسِ جمال کبھی شاعری کے روپ میں نظر آتا ہے، کبھی مصوری کے نقش و نگار کی صورت میں اور کبھی خوب صورت اور حسین فنون کے پیکر میں۔

صادقین نے یوں توار و دو شاعری کی تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے مگر رباعی سے ان کو خاص لگاؤ شروع سے رہا ہے۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں رباعیاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ اس کا اظہار وہ خود یوں کرتے ہیں کہ

شب میری تھی، شام میری، دن تھا میرا
آیا ہوا خود مجھ پہ ہی جن تھا میرا
کتنی ہی رباعیاں تھیں لکھ کر کب لکھیں
اٹھارہ برس کا جب کہ بسن تھا میرا

صاف لکھنے نے جب شعر کا لفظ بھی نہیں سنا تھا اس وقت وہ رباعی سے آشنا تھے۔ اس کو یاد کرتے اور غمتی پر لکھا کرتے تھے کہ

محمد گدڑی، امرہ، یوپی

آغا علی ندوی

کے لئے نکال دیا۔ اور اس شخص نے انہوں نے ایک رباعیات کے چار مجموعے
تیار کر کے لائے یعنی رباعیات صادقین، دو مجموعے رباعیات صادقین اور جزو
موسیٰ اور جزو اللہ کے ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان مجموعوں کی ایک
تفصیلی یہ ہے کہ یہ خود صادقین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

صادقین نے تقریباً پانچ ہزار رباعیاں کہی ہیں۔ یہ سب زبیر طبع سے نکلتے
ہیں ہو سکتے ہیں۔ اردو کے شاید ہی کسی شاعر نے اتنی رباعیاں کہی ہوں۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ صادقین نے جب بھی شعر کے لیے نیت کی، تو ان کی زبان سے
برجستہ رباعی کا مصرع نکلا۔ اس برجستگی نے ان کے یہاں کبھی تصنیف نہیں پیدا
ہوئے دیا۔ وہ تکلف سے دور ہیں۔ ان کا طاق کا طوطا مینا بناتے ہیں۔ سادگی،
غلوں، ذاتی محسوسات اور نظریات کی ترجمانی ان کی رباعیوں میں ملتی ہے۔ وہ
خود کہتے ہیں۔

”غور و الفاظ کیسے ہی بھڑکتے ہوں، منظور محسوسات خالص
ہوں تو شیک ہے۔ منظور میں پختائی اور غلوں پر تو شیک ہے بات
بن جاتی ہے۔“

صادقین اپنے آپ کو بنیادی طور پر شاعر نہیں سمجھتے۔ وہ رباعی کہنے کے لیے
شاعر ہونا ہی ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ ان کا پناہ گاہ ہے۔ رباعی کی نگاروں
اور اوزان سے ناواقفیت کا اظہار انکساری کے طور پر وہ اس طرح ایک
رباعی میں کرتے ہیں۔

ظاہر ہے رباعی میں مری دم کیا ہے
ہوں مجھے سے ناخدا، یہ علم کیا ہے
معلوم، تیر خدا کی مجھ کو یہ نہیں
اغرب کسے کہتے ہیں احسرم کیا ہے

صادقین چونکہ بنیادی طور پر مصنف اور مخطاط ہیں اس لیے حسن برقی ان کی
رگ دہنے میں ہرگز نہ ہوتے۔ حسن کی ذرا سی جھلک ان کے دل و دماغ
میں جھلکنا پیدا کر دیتی ہے اور وہ کسی شاعر کی تحقیق پر مجبور ہو جاتے ہیں۔
حسن ان کے لیے فن کی تخلیق کا محرک ہے۔

یہ طغہ و تصویر و رباعی کی زبان
ان میسوں والوں کے میں جاؤں قربان
جو کچھ ملا ان ہی کے توسل سے ملا
اس دل پر حسینوں کے بڑے ہیں احسان

جانان کے جال کا جو کچھ ہوا ادراک
ہو جاتا ہے اظہار کی صورت بے باک
لیکن خیالات کا خون ڈھلپانے کو

ہیں طغہ و تصویر و رباعی پر شاہک

اک شعر کے دیکھے خط رباعی لکھی
ناقد نے کہا ”خط رباعی لکھی“
مقاوہ در غبے خال تو میں نے اس کی
توصیف میں بے نقط رباعی لکھی

صداقین کی رباعیوں میں بڑا تنوع اور نگارنگی ملتی ہے ان کے موضوعات
میں بڑی وسعت ہے۔ معاملات غلوں سے لے کر مملکت جوت تک اور
نظریات قدرت سے لے کر مشاہدات قدرت تک ہر موضوعات پر انہوں نے
رباعیاں کہی ہیں۔ روایتی موضوعات مثلاً اخلاق، تقدیر، ناانیداری، دنیا،
فنا کا تصور، تعویذ، معذرتیں، معذرتیں رباعی کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں۔ مگر صادقین
کی حیثیت اس میلان میں مغرب ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص فن خطاطی کو بھی
ایک الگ موضوع بنایا ہے جن کے مختلف انداز سے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ یہ
موضوع آتنا اچھا اور دلکش ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے یہاں کی بات نہیں۔
صادقین کو اس فن پر ناز ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے دیا ہوا عطیہ ہے۔ وہ
اس عطیہ پر قدرت کا جگہ جگہ شکر ادا کرتے ہیں۔

نازل یہ قلم کس پہ ہے؟ مجھ جیسے پر
ادب کس کس پہ ہے؟ مجھ جیسے پر
مولیٰ کے کرم کا بھی نہیں کوئی مولیٰ
مولیٰ کا کرم کس پہ ہے؟ مجھ جیسے پر

مجھ کو لوح و قلم ہے دیتا میرا رب
ابجد کا جہاں رام ہے دیتا میرا رب
چھپر میں ہوں اور پھاڑ کے چھپر چھکو
آیات کے بیچ و خم ہے دیتا میرا رب

صادقین کا ذوق خطاطی اور مصوری اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے کہ
زندگی میں ان کے لیے یہی اوڑھنا بھونٹا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس میں
کھو دیا ہے۔ وہ روایت پرست نہیں ہیں۔ انہوں نے تقلید سے گریز کیا ہے۔
اور اپنے لیے علیحدہ شاہراہ اختیار کی ہے۔ یہ فن میں اظہار اور تخلیق
ذہن کا نتیجہ ہے۔

تخلیق میں مختلف یہ ہونا میرا
اب تک شبہ ہستی میں نہ ہونا میرا
خطاطی ادھر ہے تو ادھر نقاشی
وہ اوڑھنا میرا یہ بھونٹا میرا

گھروں کا آباد کیا ہے اسے دوست
اک خط نیا بیا دیا ہے اسے دوست
استادوں نے اجد کو مقید تھا کیا
میں نے نہیں آزاد کیا ہے اسے دوست

چونکہ سن ان کے فن کا محب ہے اس لیے انھوں نے انسانی حسن اور خطاطی میں بھی ایک ام آہنگی پیدا کی ہے۔ انھیں نے محبوب کے لب و لہجہ کا رنگ اوجوں پر نظر آتا ہے۔ اور اس کے گیسوؤں کی سیاہی الفاظ میں نظر آتی ہے۔ انھیں محبوب کے چہرے پر تن اس لیے پسند نہیں کیونکہ فکر اور درد میں بھی کوئی نقطہ نہیں ہوتا۔ وہ لامحرف محبوب کے کمال کا خیال کر کے لکھتے ہیں۔ اور اس کے ابرو کا تصور کر کے مرنے پاتے ہیں۔ ان کی نظریں محبوب کے جسم کے خطوط یا تو جیم ہیں یا خون ہیں یا شہد ہیں وہ اس کی ناف گلابی کو نقطہ اور اس کے شفاف جسم کو نور کہتے ہیں

لکھے ہیں فیر نے جو شاہی الفاظ
یوں کرتے ہیں دردیدہ لگا ہی الفاظ
حسن لب و زما کا ہے لوح پر رنگ
اور ہم غم گیسو کی سیاہی الفاظ

تلی نہ پڑے نہ ہونے کا یہ شکوہ تیرا
اے شوخ ! کہوں حسن ہے کیا تیرا
ان میں بھی نہیں نقطہ، نہ اس پر تن ہے
کلمہ ہے درد ہے یہ مضمون تیرا

ہر حرف میں مہربانوں کے قد بننے ہیں
لوگوں پر وہ کب حسن کی مدہنتے ہیں
کال کے خیال ہی میں لکھا ہوں نام
ابرو کے تصور ہی میں مدہنتے ہیں

فکر اپنے فن میں استاد ہوا ہے کہ اسے اپنے تصور کی دیواروں پر بھی تصویروں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اور یہ پرچھائیاں دیکھتے ہی دیکھتے رنگوں میں ٹھکر سامنے آ جاتی ہیں۔ اقبال نے کہا تھا کہ فن کی نمود خن مجرے ہوتی ہے۔ صادقین بھی اپنی ہڈیوں کا تن لٹکا کر اپنے خون مجریں شامل کرتے ہیں تب کوئی نقش ابھر کر سامنے آتا ہے۔

پھر جا کے کہیں نقش بنایا میں نے
اس نقش میں پھر رنگ لگایا میں نے
اس خون مجریں، ہڈیوں کا اپنی

جب تیل نکال کر ملایا میں نے
صاف ہیں اپنے کو ایک تھکس نہ گئے ہیں، اس کا احترام کرتے ہیں۔
وہ اسے اپنا ہوس کی نذر نہیں کرتے۔ بلکہ اسے علم کی جہارت سے آراستہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے شاہکاروں کو اسے خانوں اور پیش کردوں کی زینت نہیں بناتے بلکہ مدرسوں، لائبریریوں اور دانش گاہوں کے در و دیوار پر آویزاں دیکھ کر مسرت اور فرحمن کرتے ہیں۔

لکھتے ہوں کبھی کبھی ہمیشہ تو نہیں
میرا قلم مزدور کا تیشہ تو نہیں
اہل ہوس ہے سود ہی مجھ سے ناراضی
خطاطی مرا شوق ہے ہمیشہ تو نہیں

جو غری کی ایسی حدود میں کب ہیں
نیکیوں میں ہیں اسے دوست بدوں میں کب ہیں
میری تو مدرسوں ہی میں تصویریں ہیں
سے خانوں میں اور پیش کردوں میں کب ہیں

جب کہ فن کار کا فن اپنے مزاج کمال پہنچ جاتا ہے تو اسے ایک روحانی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ مجروحہ اپنی عظمت کا اظہار بہ زبان خود کرنے لگتا ہے۔ اردو شعراء نے شاعرانہ تعلق سے بہت کمال حاصل ہے مگر اس کی ایک منزل ہوتی ہے۔ یہ منزل وہ مقام ہے جہاں سے جب دوسرے بھی فکر کی عظمت کا اعتراف کرنے لگیں۔ اس کی تعریفیں کرنا کجیوں نہ چڑھائیں۔ صادقین کا فن بھی اس کمال کو پہنچ چکا ہے جب "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" سننے والوں کو گراں نہیں گزرتا۔ انھوں نے جو کچھ اپنی خطاطی اور مصوری کی تعریف مختلف اعلا سے کی ہے۔

تحسین کے تحفے مجھے صائب دیتا
شبابش مجھے عرفی یا طالب دیتا
خط کی مرے داد آج جو زندہ ہوتے
یا شاہجہاں دیتا یا غالب دیتا

ہاں مفتی شہر نے فتوے بھیجے
اور مجھ کو حسینوں نے لغاف بھیجے
نیلے کاغذ پر اپنے کچے خط میں
فن بر مرے لکھ لکھ کے قصیدے بھیجے

قطع نظر اس کے کہ صادقین نے اپنی رہا میوں میں خطاطی یا مصوری کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے دیگر موضوعات پر

میں گمان کی ہے۔ غلامانِ ذوقِ اللہ کے اندر کوٹ کوٹ کر ہمارا ہوا ہے۔ وہ جن
مردانہ صفات کا زور نہیں دیکھتے ہیں۔ اور اس سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ محلات
جس کی انھوں نے بڑی خوبی سے داد لی ہے۔ ان کی رہائیوں میں ہندی
کے شہر کاروں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ وہ جن کو مصروفی آنکھ سے دیکھتے اور
شاہر کی یادیں سے بیان کرتے ہیں۔ حسن ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتا ہے
وہ محبوب کے احسانے جسم کو بڑے قریب دیکھتے ہیں اور ان کی مصوری
بڑے خوبصورت الفاظ میں رکھتے ہیں

گیس میں مکھنل کے چین میں معلوم
پنڈے میں وہ نکلے جو سخن ہیں معلوم
وہ جو ترسے حتم میں آتے ہیں
ان کو ترسے سب راز بدن میں معلوم

اس عمر کی کرتا بے نقابی تل ہے
میں سمجھا کہ یہ کوئی شرابی تل ہے
یہ گلاب جو ہوا سا مہاسا ترے
میری تو نظر میں اک گلابی تل ہے

فنِ تعبیر بھی فنونِ لطیفہ کی ایک شاخ ہے کیونکہ اس میں بھی حسنِ بخت
شاعر محبوب کے حسن اور فنِ تعمیر میں ایک مشترک حسن تلاش کر کے دونوں
میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے

ایک بوقی صورت کا نمونہ کیا ہے
چلتی ہوئی صورت کا نمونہ کیا ہے
مرمر کی یہ عراب، مینارے گنبد
توفیو عمارت کا نمونہ کیا ہے

عرب کی پچھتیاں تڑپاتی ہیں
گنبد کی یہ گولائیاں چھا جاتی ہیں
آنی ہیں ترسے جسم کی دل میں یادیں
یہ کسی عمارت ٹنکسر آتی ہیں

معاملات جس کے ساتھ ساتھ معاملات عشق، راز و نیاز، ایک
دوسرے سے چھڑھٹاؤ، ملاقاتیں، رخصتا منانا، غرضیکہ جن راہوں سے ایک
عاشق کو زنا پر تارے وہ راستے عداوت کو بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ وہ جن گلی
کوچوں سے لڑے ہیں ان کے لیے ساتھ تصویر کشی کر دی ہے۔

اسن شام وہ سر میں دروہنا
مہاساں ہوا تو دور رہنا اسن کا

مجھ سے ذرا شرمنا کر "طبیعت میری
کچھ آگ ہے ناساز" یہ کہنا اس کا
جس کشش کیا چیز ہے؟ اس کا تجربہ صادقانہ اس طرح کرتے ہیں۔
وہ جس کو محبت کی روش کہتے ہیں
جذبات کی ہم اس کو تہش کہتے ہیں
وہ چیز ہے حسن سمجھتے وہ ہیں
اس کو ہی تو ہم جس کشش کہتے ہیں

صادقین نے اپنی رہائیوں کو ہندوستانی مہاساں سے بھی آراستہ کیا ہے۔
ہندو دیوالائی آثارات ان کے ہاں اکثر مقامات پر ملتے ہیں۔ اجنتا اور
الجورا کا ذکر ان کی رہائیوں میں ملتا ہے۔ شاعر معزز ہولے کے تالے
اجنتا اور الجورا سے متاثر ہے۔ وہاں کی تصویروں کا حسن اس کو
انسانی حسن میں نظر آتا ہے

شک گزرا ہے، دیکھا جو تری صورت کو
لڑکا کی طرف سے جو چلے صورت کو
بھگوان نے چھوڑا تھا زندہ کرنے
شاید کہ الجورا میں کسی صورت کو

اک ہل ہی میں تو بن گئی جانِ گلفم
دیوار سے نکلی ہوئی تو سمت خرم
تصویر میں رانی کی، اجنتا جا کر
اک روت جو بھگوان نے پھونکی گل شام

تو ہے کہ الجورا کی کوئی مورتی ہے
اتنی جو بدن کی ترسے خوبصورتی ہے
احسنے نمودار کی گولائی سے
وہ رہ کہ تری جی کشش گھورتی ہے

تعبیر میں جب تک مدت نہ ہو اس وقت تک وہ تاثیرے
طسم سے خالی ہوئی۔ شعر نے روایتی تشبیہات کو بہت بڑا ہے۔
صادقین کی رہائیوں میں تشبیہات کی کثرت ہے مگر بعض تشبیہات کو
ایسے لطیف انداز میں بیان کیا ہے، جس سے ان کے دھماکے
کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی تشبیہات ان کے مزاج کی جھلکی لسانی
ہیں۔ مثلاً

بھرور شباب سے وہ نکلا مکھڑا
لغتی شب و تاب سے وہ نکلا مکھڑا

جزدان سے جیسے کہ سمیعہ لکھے
کچھ ایسے نقاب سے وہ نکلا نکلا

مسند پر کتا بدین رکھی تھی اک میر
اخلاق پر کر رہا تھا کتب سے تقریر
پھر میں نے بھی مسند کو وہیں سے کاٹا
مند کے قہقہے جیساں نعلی تصویر

عادیقین نے انسان انفسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ
انسان کیا ہے؟ اس کی طوری پر بڑا بھلا بھلا، نیک اور شریف ہے لیکن باطنی طور پر
بڑا گندہ اور نکلا ہے۔ وہ کسی بھی خوراک سے عیب اپنے سے چھپا کر ہے۔ اور وہ
کے سامنے ہر طرح میں شریفی قسم کا آدمی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر نے
انسان کے اسی عینانے چہرے سے نقاب لٹھائی ہے۔

میں ایک اداکار ہوں کیا کرتا ہوں
پتی کو پڑوسی کی نکلا کرتا ہوں
گھر اس کے جاتا ہوں بہت ہی چپا
کردار کشمیریوں کا ادا کرتا ہوں

کوہے میں ہر اک در پر نظر ہے میری
اک دوست کی خواہش ہے نظر ہے میری
سب کچھ کھٹکے میں سمجھے ہیں شریف
ہمسائے کی دختر پہ نظر ہے میری

تھا شوق جو جوئے کا اپنے رخسار
یوں خود سے نکل کر خود کو دھاک بار
مت پوچھ کہ کتنا تھا بھیا ناک چہرہ
اور اس پہ برس رہی تھی پھونکار

مفاد قینی انسان کا ایک شیوہ رہا ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر دوسروں
کے جذبات کو بوجھ کر، قوم و ملت کو قربان کرنا، اپنا کام نکل جانے
کے بعد دوسروں کو انھیں دکھانا، منافقت کی ایک نشانی ہے۔ شاعر
اس دکھتی رنگ سے خوب واقف ہے۔ اس نے شعروں کے تیر و نفیر
کے ذریعہ کسی فرد و اجداد کو یہ نہیں بلکہ پورے سماج کو اس کا نشانہ
بنایا ہے۔

قدم میں ہوں جسے جاہل کھانگے
قہر سے یہ ظالم کھانگے جاہل
پروں کو اسے پہچاننا تو میں اور کی کافر
کلیں سے مول کا کل جائے کفر

بولی "ہمیں چہرے پہ ہمارے کوئی تہ
میں نے کہا" ہوتے ہیں پیارے کوئی تہ
کلمے میں ہمیں ہے کوئی نقطہ جیسے
یہی نہیں کھڑے ہتھارے کوئی تہ
اسی طرح استعارہ ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں بھر پور شباب کی
پرچائیاں نظر آتی ہیں۔

چمک میں شباب کی ہے دولت بیدار
ابراہیم جوں ہے تو کوئے غم دار
خوشبو سے ہک رہے ہیں کپتے کیا ہیں
یہ باغ شباب کے جو ہیں ہیں تیار

اخلاقیات رباعی گوئی کا ایک باب ہے۔ شعور نے اس کو ضروری قرار
دیا تھا۔ چونکہ رباعی ایک ثقافتی علامت ہے۔ اس لیے اخلاقی مضامین اس
کی سرشت میں داخل ہیں۔ غرور و تکبر، جھوٹ، حرص، لالچ اور ظلم کی مذمت
ہر رباعی گوشا کرنے کی ہے۔ عادیقین بھی اسی معاشرے کے ایک فرد ہیں۔
انھیں بھی اس کا شعور ہے۔ اس لیے انھوں نے بھی ان مضامین کو مختلف
پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً

زاہد کو بتا دے یہ ضرور اے مولیٰ
دونوں میں سے کس بات میں نورے مولیٰ
مے پی کے اگر جو انکساری آئے
یا پڑھ کے نمازوں کو عزور اے مولیٰ

شیخ ذراہد سے پھر پھر آواز اور ان پر طعن زنی ایک روایت رہی ہے۔
یہ روایت فارسی سے اردو میں آئی جو اردو غزل میں بھی رہی ہے۔ عادیقین
اپنے آپ کو فرقہ وارانہ کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ ان کے خلاف بھی بہت کچھ
کہا گیا۔ علامتے کرامتے سے فارسی سے صادر کیے۔ یہی وجہ ہے کہ عادیقین نے
اپنے دل کے کلمات رباعی کے ذریعہ نکالے۔ ان کی رباعیات کے
ایک مجموعہ میں اس موضوع پر پندرہ کے عنوان سے پورا ایک باب ہے۔
جس میں انھوں نے فقہاء اور اعلیٰین کی تفسیر کوئی ہے۔

ہاگے تیز ہے طرا ہے دیکھو کیسا
ہر بات میں ہوشیار ہے دیکھو کیسا
عمر سے بڑے ہے کھاد ہر ہنر کی ہے
ملا بھی ادا کا رہے۔ دیکھو کیسا

دل کی مرے دنیا کو بڑی ہے کافی
 باؤں میں مری چھانی ہوئی ہر حال
 جس شخص کو دیتا ہوں میں دل پہ گالی
 کہتا ہوں لہاں سے 'جناب عالی'

ایمان کی دولت کو چھادر کر دوں
 اخلاق و شرفیت کو چھادر کر دوں
 معمولی سی منفعت کی خاطر اپنی
 میں ملک کو ملت کو چھادر کر دوں

شاعر منافعت کو برداشت نہیں کرتا۔ ہر اعلیٰ لکھ کو بہتر سمجھتا ہے۔
 وہ اپنی کمزوریوں سے واقف ہے۔ اسے اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ وہ
 چھپ کر گناہ نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہنے بجائے تشریح نہیں کرتا بلکہ سہ بازار
 ہی نہنگ ہونا پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے طوالت اور طوالت سب برابر ہے۔

سے ہاں دل میں بھانوں گا میں بچے دل سے
 سینے سے لگاؤں گا میں بچے دل سے
 پر اپنی منافق سے نہیں بھگت سکتی
 کافر سے بھانوں گا میں بچے دل سے

میں سمجھنے کے شہکار ہوں ننگا یارو
 لکھ کر خط و غرار ہوں ننگا یارو
 تم کو فوں پھاؤں ہی میں ہوتے ہو فقط
 اور میں سر بازار ہوں ننگا یارو

دن رات ٹٹولتا ہوں کچا چھٹھا
 میزان میں تولتا ہوں کچا چھٹھا
 تم اوروں کی کھولتے ہو پیلوں اور میں
 خود اپنا ہی کھولتا ہوں کچا چھٹھا

صادقین جہاں ایک طرف گناہ کا ارتکاب کئے عام کرتے ہیں،
 وہاں انھیں یہ بھی یقین ہے کہ خدا پریم و کریم ہے۔ وہ اس کے گناہ کو
 حضور معاف کرے گا۔ اس لیے گناہ کرنے کی خواہش بھی ان کے
 دل میں چلیاں لینے لگتی ہے۔

تہ ساری نہیں رنگب جلیں دیکھوں
 جہتاری نہیں، نقش رومی دیکھوں
 چھوٹا سا کوئی گناہ کر کے مرنی

میں کیوں نہ تری شان کریگی کچھیں

سجائی پر اک گناہ کرلوں یارب
 اب درو کی حد سے آہ کرلوں یارب
 رکھنے کو تری شان کریگی میں لاج
 معمولی سا اک گناہ کرلوں یارب

نابینداری دنیا اور دنیا کے متعلق عموماً شعراء کا نظریہ یہ رہا ہے کہ
 یہ دنیا بیکہ ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس سے دل لگانا مناسب
 نہیں۔ مگر صادقین کا نظریہ اس کے برعکس ہے۔ وہ اپنی کورین فلسفہ کے
 قائل ہیں۔ ان کا منہ نظر پر ہے کہ جب تک زندہ ہو دنیا کی رونق اور
 آسائشوں سے لطف حاصل کرو اور اسی کو فردوس بریں سمجھو ورنہ موت
 کے بعد دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔

اُمّ جس میں ہیں کتنا میں ہے عالم
 دنیا ہی میں فردوس بریں ہے عالم
 عالم کی حقیقت ہے مسلم لیکن
 مر جائیں تو ہر کچھ بھی نہیں ہے عالم

ہر شے کے وجود کی صداقت کیا ہے
 محبوب کی یہ جاندی صومٹ کیلئے
 ہے منظر کائنات سب کچھ لیکن
 مر جائیں تو پھر اس کی حقیقت کیلئے

وہ زندگی کو ایک جہد مسلسل کا نام دیتے ہیں۔ زندگی کی تلخیوں اور
 ناکامیوں سے وہ بھگنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ طوفان حوادث کا
 مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ناگ پنی کا لفظ ایک علامت
 کے طور پر اسی لیے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ صحرائی حرارت اور
 سورج کی تازت کا مذاق اُڑاتا ہے۔ وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں کانٹے
 جھونتا ہے۔

ہاں جہد فنون زندگی سیکھے
 مگر کیسے کرین خون کو پانی سیکھے
 صحرائوں میں ہاں ناگ پنی سے جا کر
 ہم نے یہ اصول سخت جانی سیکھے

ہم ذائقہ زیست کو کچھ سیکھے ہیں
 حالات کی بقیوں کو ہر کچھ سیکھے ہیں

نازدوں کے پلے ہیں جو مصیبت آئے

کھسار کو ہم کاٹ کے رکھ سکتے ہیں

صادقین نے اپنے بایات کے مجموعے میں مشق نامہ کو ایک خاص جگہ دی ہے۔ اس میں جلاوطن، غمخوار، بیمار، سولی، قیدی، سبیل، بدھیا، سرن جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان ربا میں سے زفیوں کی آواز سنانی دینی ہے۔ شاعر شوق شہادت میں جو کچھ سننے کی آواز کرتا ہے۔ جگہ جگہ خون کے پھینٹے نظر آتے ہیں۔ جس وقت شمشیر سم گون پر چلتی ہے، شاعر بجائے کراہنے کے زیر لب سسکتا ہے۔ وہ گردن کٹوانے کے لیے تیار ہے مگر چراغ دہن کھانے کے لیے کسی طرح تیار نہیں۔ وہ کھال کھوانے کے لیے تو ہر طرح آمادہ ہے مگر راجحیت کسی پر ظاہر نہیں کیا جاتا۔ وہ ایک باوقاف عاشق ہے جس کے سینے میں ایک پتلیوں اور درختوں کا ہول ہے۔

جلاوطن سہ ماہی نہیں کہنے کے

جس پر ہے میں ناز نہیں کہنے کے

ان گرم صلاخوں میں پرو دے انگلیں

ہم، دل میں جو ہے ناز جن کہنے کے

جسٹاد! یہ انداز ہے گوارا ہم کو

بھاتا ہے یہ مقتول کا نظارہ ہم کو

تو ساری غزلیں جسے پوچھتا ہے

وہ راز کو گردن سے ہے پیارا ہم کو

صادقین اپنے آپ کو قہر کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بہت سے اشعار رکھ لیے ہیں۔ مثلاً: الجاہل، الجہول، الغیب، المظہور، المردو، الحکوم، القانی، العاصی، الوحشی، الغریب، المضطرب، غاب، بھلا ہے آپ کو قہر کہتے تھے۔ صادقین غالب سے زیادہ متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں میں جملہ بولی بننے میں شرم محسوس نہیں ہوتی۔ وہ درویشانہ صفات کے حامل ہیں۔ وہ تخت طاووس کے مقابلے میں ایسی چوکی کو زیادہ چاہتے ہیں۔ ان کے راج کھٹکھٹانے میں سے زیادہ ہم آہنگی ہے۔ وہ قیروں کی کراہت کے قائل ہیں۔ محلوں کے مقابلے میں انھیں کشیا سے روحانی وابستگی ہے۔ ان کے کلام میں اس قسم کی ربا عیاں ملاحظہ فرمائیے۔

غیر زادی قیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں

کہیں آنی ہو، یہ وہاں کچھ بھی نہیں

یہ سنی کے وہ خاک کش، کس نے نہ مل کر

بولی کہ "میروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"

شہزادی ہیں ہمارے کبھی ہے

ٹھوکر پہصل مار کے ابھی ہے

درویش کی کوفری میں خدمت کرتے

شہزادوں کو دستکار کے ابھی ہے

یہ درویش صفتی ان کو صاحب ثروت اور دوستاؤں سے بے نیاز کرتی

ہے۔ وہ اپنے حال میں مست ہیں۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔

تم خود ہو برسے خود کو بڑا رہنے دو

ہاں مجھ کو گلا اور سٹرا رہنے دو

میرے لیے مزدوں ہے یہ گندا نالا

مجھ کو اسی نالے میں پڑا رہنے دو

صادقین کی ربا میں میں شوقی کو انصاف بھی ملتا ہے۔ یہ شوقی کسی انصاف

مضمون کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور کسی پر اس کے بیان اور طرز ادب کی شکل

میں۔ وہ بعض معمولی باتوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان سے مسکراتے

نہیں رہتا۔ بعض الفاظ بذات خود ایسے ہوتے ہیں جو مسکراہٹ کا باعث

پڑتے ہیں اور جب صادقین ان کو اپنے مغز دل و دماغ میں بیان کرتے ہیں تو جملہ

پیرایہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں غزلیں ہرگز نہیں لکھی جاتی ہیں۔ ان کی شاعری

اور مزاح کا سبب بنتے ہیں۔ یہ مغز کسی مزاح کے ایک مجموعہ جیسے پڑتا ہے۔

جیسے زار و واقعات یا دشمنان الہ اغیر پر اور کسی پورے معاشرے کے راج پر

ذیل کی ربا عیاں ان کی شوقی اور طنز کی ایک مثال ہیں۔

جو آج منشا ہے میں لگوئے ہوں گے

ہم ہوں کے کھرے اور کھٹے ہوں گے

میں بانگ ہم زندا میں تھے سہر مشر

واغلا جو ہیں خائبے ہوئے لوہے ہوں گے

زاد حسینوں کو برا کہتے ہیں

درویش سلام اور دعا کہتے ہیں

جس موقع پر لاجل ہیں پڑھتے زار

اس موقع پر ہم مل جاتی کہتے ہیں

کرتے ہوتے کہ عرق، یا تھا میں نے

پینا تھا مجھے فرق، یا تھا میں نے

کل شام طریک کے کی خاطر

اک مولیٰ ہے فرق کیا تھا میں نے

صادقین کا یہ ہے ایک جذباتی وابستگی ہے جو کہ ان کے قلم میں

بہ خط شاعر

”شہر آباد“
جانبہ اردو روڈ، ملتان

نزل

ترا آسمان کا دھواں کا خیر بہرہ، جانت آفریبا، جانت آفریبا
ہاری زمیں بسل و جلی کا دھندلہ جانت آفریبا، جانت آفریبا
نا نابل او صیام اگر صید، جانت آفریبا، جانت آفریبا
شہر نام بہرہ منجھوا دھندلہ، جانت آفریبا، جانت آفریبا
ہوئے نام وہ شگسہ فرق مہیا، مری کے ٹسٹل کی ہوگی سزا کیا
تو نہ نام کا ایک سرور بھی نا، جانت آفریبا، جانت آفریبا
خود مددہ رونق لی، رانی! اگر رونق آزدہ روح بھی ہے
وہاں شاہی تری کار سازی، یہ دل بھی مجھ سے بنا کر وٹا
کہیں سنگ خدا، کہیں آگیند، جانت آفریبا، جانت آفریبا
شہر سوں میں جو شہر کا قلم، نہ مرنے کے نام میں گلاؤں تا
یہ جینا ہی کوئی جینے میں جینا، جانت آفریبا، جانت آفریبا
آر دینا ہی مقصد ہے برا، تو ہر دیر کسی؟ بچے ادا ہوتا
سینے کے کس کے رٹا لکھیند، جانت آفریبا، جانت آفریبا
روائے کی ترنگیاں بھی مستم، عقدہ کے فرار میں غفلت لیکن
مقرب کو جس کا ہے اگر کس کو جانت آفریبا، جانت آفریبا
زمین کا جو بہت سنگ دہلے، لکھ چھپ چھپ، غلام خول دکان ہیں
جس میں شہر کے بچے لکھیند، جانت آفریبا، جانت آفریبا
مردم و نام لکھ لکھ لکھ لکھ، تری مملکت کے کس نام اور
ہاری زمیں کا کس کی حسد، جانت آفریبا، جانت آفریبا
میں آخر رادو کی خود ہے، اگر قلبی بھی چلتی ہے روح بہرہ
مترقی ہے کھینچتی دیند، جانت آفریبا، جانت آفریبا

اقبال

وقت

وقت محل کی طرح روشن ہے

وقت عقل کی طرح ہے آئینہ

وقت سناں کی طرح بھی ہے

وقت دھڑکی کی طرح بھی ہے

وقت ٹپکے کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

وقت مہر کی طرح بھی ہے

بچے میں شان پر ہے کاسے

اور پھر ایک دن وہاں ہے

وقت رجم کا فوشہ زواری

وقت پھیر کا فوشہ زواری

وقت پرتاب کے لہو کا حال

مارس کا اعتبار کا حال

پیش آنسو کی دوج کھنسر

وقت جگر ہے آگ کا سیر

وقت حافظ کی بخودی کا شور

کار پرواز شوخی گفتار

وقت ختام وقت شیکہ

بلوہ اندوڑ بردہ اسرار

وقت نقشہ شکر آرائی

وقت اقبال کا سرور خودی

عشق کا انقباض و فغانی

وقت بے تیر کا طلسم نعل

درد کا ایک جذبہ سرشار

وقت غائب کی برتری کا جہاد

کاروبار انانی خود بخواری

وقت معصومی و لا کا انیس

وقت اجماع لطف کی آواز

وقت نگر ہے - قلم اس کا

وقت نذر کی شوخی نہیں

اضطراب بخودی کی نفسیر

وقت فکر جمیل کی پرواز

زمن پر دل کے اعتماد کا راز

وقت فالو سے مناسبت کا

وقت فرمان ہے عناصر کا

عقلوں کا مینار بھی ہے وقت

فعلوں کا مینار بھی ہے وقت

وقت انسان کی خودی کا طوفان

وقت انسان کی خودی کی سپر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی صداقتوں کا تمہیر

زندگی کی براحتوں کا مسج

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

ناچنے والے زمین کی صمدت

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

زندگی کی وقت کے اسٹاپ ہے

خیریت اگر ارم

خیریت اگر ارم

خیریت اگر ارم

خیریت اگر ارم

خیریت اگر ارم

غزلیں



ہر ایک گاؤں کو قصبات سے سوننا تھا
عمر کے روپ میں آئندہ کس شہرنا تھا

مرے نقوش سے بھوک تپاش کرنا تھا
ای پہانے مگر آپ کو ابھرتا تھا

زمین رکھتی ہے کتنے مزاج کے حصے؟
رُتوں کی طرح جس بھی کہیں اُترنا تھا

مرے بدن کا مقتدر قاصر ہے تصویریں
مرے جہد کو الفاظ میں بکھرتا تھا

جسکوں کے قدروں میں رہی ہیں نقادیں
گھڑی کی موتیاں بن کر ہیں گزرتا تھا

تمہیں ہے آقا غلامی کا اسقدر احساس
عقیدوں کی انواؤں سے پہلے ڈرنا تھا

قصہ کیسے تمہارا کہیں وہ کہتے ہیں؟
تمہیں تو پتہ کھلنے میں رنگ بھرتا تھا

بھٹک رہا ہے اندھیری حیات میں خوشتر
کو جن کا کام چراغوں کی کوکرتا تھا

تالاب، دریا، ندی، سمت درمی دیکھنا
بیگے ہونے وجود کی چادر بھی دیکھنا

جنگل شرک کے میں کے پتھر بھی دیکھنا
انجلی، سیاہ رات کے منظر بھی دیکھنا

پڑوں کی ہر مہلب ہے بیتوں کی حویلی
مردار خور جسم کو بے گھر بھی دیکھنا

سُنے پڑے ہیں ملچے چڑیوں کے واسطے
بختہ گھروں کے خام مقتدر بھی دیکھنا

کیسی کہاں ہوا میں مقید تھیں رات بھر
تم جاسکو تو چاندی بستر بھی دیکھنا

پسی ہوئی ہے روشنی چاروں طرف مگر
خوشتر خدا کے ساتھ بھر بھی دیکھنا

سادہ، شفاف گھر میں رہتا ہے
وہ ہماری نظر میں رہتا ہے

کبھیوں کے انہیں رہتا ہے
گھر کا قیدی سفر میں رہتا ہے

کتنی رکھتا ہے وہ تمہیں اپنی؟
روز تازہ خبر میں رہتا ہے

دیا، بادل سا ہے بدن اُس کا
اور برق و شرر میں رہتا ہے

نگیلوں سے لے کے گویائی
زیست کی رہ گزریں رہتا ہے

کون قاتل ہے کون بے مقول؟
بڑا بودا عمر میں رہتا ہے

پہلی منزل سکون: ۵-۱۹۸۵ء

غزلیں

آزمان نجی

لطف الرحمن

یوسف جمال

ان دنوں اپنے خیالوں میں گھرا رہتا ہے وہ کچھ یہ چلتا نہیں کیا سوچتا رہتا ہے وہ کیسی اچھی ہے کہ بے دھیانی میں بہرے ہو کر بار بار اک نام لکھ کر کاشت کرتا ہے وہ رات بے غرابی کے پہلوئیں سکون پاتی نہیں دن کو اپنے آپ سے اٹھتا ہوا رہتا ہے وہ بے تعلق خود کو یوں ظاہر تو کرتا ہے مگر رات دن میرے لئے مجھ کا رہتا ہے وہ گو بھٹی ہے ان کی باتوں سے اُس کی حاشی بے صدا رہ کر بھی جیسے لوگ کہتا ہے وہ چھوڑ نہیں سکتا مگر محسوس کرتا ہوں اُسے خوشبوؤں کی طرح ساتھیں ہیں بلکہ ہے وہ بس چمکے کرچ میں کچھ اس طرح اس کا وجود میں جو سوجاؤں تو مجھ میں جاگد نہتا ہے وہ

ایک ارکان مسلسل بھی نظر میں رکھ گیا میری آنکھوں کو اٹھا کر رہ گزریں رکھ گیا اک اذیت ناک لمحہ بھی سفر میں رکھ گیا دشت میں گھر رکھ گیا، جو دشت گھریں رکھ گیا پھر بھی تشنہ رہ گئی تلوار اہل شہر کی جالتے کیسی بے خردی وہ میرے سر میں رکھ گیا کچھ تو یہ کہ میں بھی سیلاب نفی کی زد میں تھا وہ کہ اک نشہ بھی احساس ضرر میں رکھ گیا بات کیسے مجھ سے اتنا بوجھ لیتا تھا نہیں مدتی تو صرف انوا ہیں خیر میں رکھ گیا چشم ترکو دے گیا ہے اک کرن اُمتد کی اک چراغ جاں کہ روشن تھا صہوڑیں رکھ گیا اپنی آنکھوں کی سیاہی ساتوں کو سونپ کر عکس پھرے کا ہر اک حرف تجز میں رکھ گیا

مسدائیں دے چکی ہیں آہٹوں کا دروازہ تو بڑھ کے کھول دلائیں چاہوں کا دروازہ وہ یا کھوں کی طرح جب بھی چاہے روئے ہنسے کہ اس کا نام ہے "بے کوکھوں کا دروازہ" رُتوں کا زہر پیا جانے کتنی مدت تک تو پارہ پارہ ہوا کڑیوں کا دروازہ جو ملتا ہے کسی ان دیکھی بدگمانی سے تو کھول دو ذرا سرگوشیوں کا دروازہ اُسے اک آدمی سمجھوں گا اس صدی کا تیل کرے گا بند جو خون ریز یوں کا دروازہ شہا دلوں سے جواطم، ستے وہ بولنے مگر کھنڈریہ بولا، "مقتدا آدروں کا دروازہ" جمال ذہن نہ رکھو گے صاف گر اپنا کھلائے گا سدا دوسوں کا دروازہ

• راج گانگ پور - ۷۷۰۰۱۷ (اٹلیہ)

• صدیقہ امجدی، بی. اے، جامعہ پور

• محبت، ڈاکٹر ای. سی. بی. کئی، بامترک، پشہ ۷۷۰۰۰۰

کہانی ————— باب ۱۶

ایک ویدورو

ہوا اور انہیں یقین ہو کہ جو کچھ ہوا رہا ہے، اسے بہر حال ایسے ہی ہونا تھا۔ ان کی خواہش بھی عین ہی ہوتی ہے۔

مجھے کبھی کبھی باتیں بہت معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر میری کم گوئی کی علت چُپ چاپ میرا مونہہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ ایک بار میں انسان پر انسان کے جبر کی باتیں کر رہا تھا اور ٹراغوشی تھا کہ کتنی اچھی باتیں کر رہا ہوں۔ سٹوری دیر میں میری آواز جوش و خروش سے سمجھ کر آگئی ہونے لگی تو نا معلوم مجھے کیا سوچھی کہ میں اپنا مذاق اڑانے لگا۔ تم سے بڑا جا بزن ہے؟ ایسے لوگ مجھے قلعہ بند نہیں جو مجھے لوگ کر مر مذاق اڑانا چاہیں، خواہ ان میں سے میں آپ ہی کیوں نہ ہوں۔ نہیں، مجھے اپنا پسند تو بہت ہے، مگر یہ کیا شک ہوئی کہ میں اپنے آپ ہی اپنا مذاق اڑاؤں؟ میں نے اپنے آپ کو سمجھا تھا کہ رشک کرنا چاہا، مگر یہ تو وہ میرا ہی اپنا آپ، کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا، لہذا اب میں چوری چوری اپنے آپ کو ہکسا نہروانے جا رہا ہوں، اتنا بھلا، کہ ایک دم بیکمر کرنے کی بجائے غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ مڑا رہوں۔

میں کیسے ڈال سکتا ہوں؟ اور میری بھی ہے کہ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تو اس سے نظر بچانی جاسکتی ہے، لیکن جب کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو تو پھر کو اپنی ہی نظر باندھ لیتی ہے۔ سنہیل جاؤ بابا! سنہیل جاؤ! کہیں ایسا تو نہیں۔ ہاں ایسا ہی تو ہے کہ دنیا کے سارے نیک اور بڑے لوگ اپنی ہی آنکھوں کی پتھری میں بندھے اپنی نمیش کی اور بڑائی کی مزا اٹھاتے رہے ہوتے ہیں، چُپ چاپ سمجھتے چلے جاتے ہیں مگر اپنا ادا وہ جاگ نہیں ہوتے دیتے۔

اپنے اندھوں کا اندھ و شواش محسوس کر کے میں بھی اپنی زبانوں سمیت اپنے اندر ہی اندر سر جاتا ہوں۔ باقی جو رہ جاتا ہے وہ میرا لبادہ ہوتا ہے۔ اور اپنے انجمنانے لمحات میں، کہیں ایسا بہترین آپ ہوتا ہوں۔ مگر جب میرے وجود میں جان لوٹ آتی ہے تو اپنی نیت مجھے سانپ کی مانند اپنی جلی کی مڑائی ہوئی سنی گئی ہے۔ اور اپنی برتری اور فوقتہ کہ اندھا دھند کام میں لاکے مجھے بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کسی کو یہ معلوم کرنے کی خواہش نہ ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں، کیوں اور کیسے کر رہا ہوں، سبھی اپنے اندر سے پت پخت

پرانے لوگوں کو ہم خواہ مخواہ سادہ لوح سمجھتے ہیں۔ سوئیاریوں کے بعد کہیں یہ ہنر آتا ہے کہ سیدھے سیدھے ہی سارے کام نہ چلے جائیں۔ اپنی تباری کا دھندلہ رابٹ پیٹ کرنا حق دوسروں کو چس کر دیتے ہیں۔ اور یوں اپنے بے بنائے کام بگاڑ بیٹے ہیں۔ میں تو اپنے سارے کام۔ ٹیڑھے میڑھے کام بھی سیدھے سیدھے ہی کرتا ہوں۔ ٹیڑھے کام دلاصل بذات خود ہرے نہیں ہوتے۔ بلکہ ہمارے ہی اٹلے سیدھے روٹوں سے ان میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ اچھا! پڑا جو بھی کرنا ہو سیدھے سیدھے کرو۔ پھر کسبیا مجال، کسی کو شک نہ گزرے؟ ہاں، اندھوں کو دھوکا دینا زیادہ آسان ہے، مگر نہیں زیادہ مشکل بھی ہے۔ معصوم لوگ جب آپ کی زبانوں کے باوجود آپ کو نہ اچھا سمجھتے ہیں تو ہمیں اچھا محسوس کا ذکر کس سن کر آپ کو اچھا بنے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ کوئی کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو، اپنی اچھا محسوس یقین کر لینے کی طاقت بھی اسے ہونیوں سے روکتی ہے۔ اس لیے میں اپنے اندھوں کے بدلے کی خاطر خود کو سختی سے متنبہ کرتا رہتا ہوں، خبردار! انہیں کوئی نقصان پہنچا تو ہمارا بھی مسئلہ نہ ہوگا۔ میں جلا خود غرض آدمی ہوں۔ اپنی صلاح کی خاطر

اوروں نے مجھے ہمارا نیک بابا، کا نام دے رکھا ہے۔ مگر تاجی پرانی کے ہشت ہی مجھے اپنے ہونے کی خبر ہوئی رہتی ہے۔ دوسرے کچھ بھی کہیں، پرتو ناخو آدمی وہی ہے جس کی بدولت اسے اپنے ہونے کا ہمارا سلسلہ۔

— ہاں، بعض اوقات میں اپنی بدکاریوں سے واقعی چڑھتا ہوں اور جڑ کر مجھے اس لئے غصہ ہوتی ہے کہ وہ میری نہیں آپ ہی اپنی ہیں، لیکن میں موقع پر میں ان کی مسکراہٹوں پر رہنے لگا ہوں اور وہ مجھے اپنی ہی معلوم ہونے لگی ہیں۔ میرا مسئلہ اپنی بدکاریوں سے نجات حاصل کرنا نہیں۔ میرا مسئلہ صرف یہ ہے کہ میری نیک نامی بے رہے۔ میں کتابی برائیوں نہ ہوں میرے اندسے مجھ پر بھروسہ کرتے رہیں۔ میری ہی نیک باقی رہ گئی ہے کہ جیسے بھی ہوا میں نے انہوں کے ایمان کو رُک نہ پہنچے دی۔

جب سے میں نے دیکھا شروع کیا ہے یہی لگتا ہے کہ جو کچھ بھی دیکھا ہوں وہ میرا ہی ہے۔ عزتیں — محلات —

یاغات — ساری زمین — سارا سامان — سب کچھ میرے، نہ جو تو میری نظر میں کیوں سما جاتا ہے؟ — اپنا یہ رویہ مجھے بڑا فطری لگا کہ دل پسند آیا تو مجھ میں فطری نظریں حاصل کرلو کہ کسی کو اسٹ بھی نہ ہو۔

مجھے نظر آتا شروع ہونے لگے تین چار بار ہی ہوئے تھے کہ ایک غیر ملکی ہمارے اندھوں کا گھر دیکھنے آیا۔ اس نے اندھوں کے لئے نہایت قیمتی تحائف لئے اور میرے کام کی حق تعریف کی کہ خلاف عادت فرط ترست سے میری سوچنے کی صلاحیت نے جواب دے دیا اور میں نے اُسے بطور تحفہ اپنا آپ سوپ دیا۔ کوئی معتد کچھ بعد اُس نے مجھے اپنے گھر پر زبردست دی۔ اس کے یہاں میں نے نہنگ سبیل با اس قندیل پرانی اور

بیاری شراب پی۔ میں یوں تو پورے چوڑاں تھا۔ تاہم جو کچھ روکنے کے باوجود لگتا تھا کہ باتیں کئے جا رہا تھا۔

”ایک بات پوچھوں بابا؟“

”آپ جو کچھ چاہیں کہل کر پوچھیں مسٹر فٹ ہیں۔“

”کیا آپ کو واقعی نظر نہیں آتا؟“

میرے ہاتھوں کے طرے اُن کو مہربانی آنکھوں میں پھر پڑانے لگے۔

”میرا مطلب ہے بابا جو شخص اندھوں کو نظر عطا کرے۔ وہ آپ اندھا کیسے ہو سکتا ہے؟“

طرے میرے ہاتھوں میں پھرتے ٹوٹ آئے۔ اور نامعلوم میں نے اُسے کیا جواب دیا۔

گھر ٹوٹ کر بھی میری یہ حالت تھی، گویا ابھی تک مشرف مین سے ہم کلام ہوں۔

دوسرے دن سوکھا تھا تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ فٹ میں میرے اندسے میں کے نالک کو تار لگیا ہے۔ مگر اُسے اس سے کیا؟ دیکھنا نہ دیکھنا تو مجھے ہے۔ وہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ میں دیکھ سکتا ہوں؟ — شہ کا کوئی خاص باب تو نہ تھا، سمجھ بھی میں اپنی عادت کو کیا کہوں؟ کچھ پوچھیں تو مجھے اپنی ہی علت ناپسند بھی نہیں۔

کیوں کہ قہموں سے — میرا خیال ہے — آدمی کا جسم پھیلنے ہے اور شور مچا رہا ہو سکتا ہے۔ چند ہی روز بعد فٹ میں نے میری ایک اور دعوت کی اور کھانے کے بعد جب ہم کافی پی رہے تھے اس وقت وہ ٹھوڑی خاموشی کے بعد گویا ہوا، مجھے آپ سے ایک غزری بات کرنا ہے۔ میں نے اپنے کان کھڑے کر لئے۔

”آپ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں بابا، اس لئے آپ کی ترقی کیلئے ایک جذباتی فرض سے کم نہیں۔“

”ہم آپ کے حسان مذہبی — میری سمجھ میں نہ آیا کہ اندکیا انہوں —

آپ کو علم ہوگا بابا بعض عالمی مانتھن شروع تیسری دنیا میں جمہوری نظام کو تیس برس کرنے کے دسپے ہیں — وہ میری طرف جھکنے کے لئے اپنی کرسی سے ذرا اٹھ رہا ہو گیا — میں ادارے سے میں دالیت ہوں وہ ان غیر جمہوری عناصر کی پیشہ ورانہ معیار پرست مذہبی کرتا ہے اور سمجھ ملکن کے سماجی، مذہبی اور سیاسی لیڈر کی بہتر کارکردگی کے لئے انہیں اپنے منہروں اور وسیلوں کی سہولت ہم پہنچانا ہے۔ آپ یہ بھی کر خوش ہوں گے کہ آپ کے بعض نہایت اہم لیڈر بھی ہمارے ادارے کی خدمات سے فہرہ فرما رہے ہیں۔

مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس سے کب فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔

آپ بھی چاہیں بابا تو آپ اپنے کام کے لئے ادا پائے لے، ہم سے فہرہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں نے کئی نہایت معتبر لوگوں سے آپ کی تعریف سنی ہے اور ملاقات پر آپ کو اس تعریف سے بھی بڑھ کر پایا ہے۔

اُسے تو شاید شبہ نہ ہوا تھا کہ میں اندھا نہیں ہوں مگر مجھے اس وقت میں تک رہا تھا کہ وہ معنوی آنکھیں چڑھانے ہوئے ہے۔

میں نے تمنا لی ہے بابا، کہ ہم آپ کو بھی اپنے ادارے کے پروگرام میں شامل کر لیں گے۔ ہمارا ادارہ یوں تو ریاستیوٹ ہے، مسکین ہمارے اراکین کی جہاں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور بعض معمول ترین مالک اور افراد کی خصوصی دل چسپی کے باعث ہمارے وسائل پر حساب ہیں۔ میرا بعض خزانہ خیرہ خاں، شیخ، ایک دم بنڈر ہو گئیں۔ براہین ہے کہ زندگی بڑا موقع کبھی کبھار اتفاق سے آتا ہے اور اسے اس وقت نہ چھوڑ دینا چاہئے تو ساری زندگی اچھے سے ہی گزر جاتی ہے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہوں مشرف میں آپ کی

خدمات بجالانے میں اپنی عین خوش قسمتی سمجھوں گا۔

”وہی مگد — لایے ہستہ!
میں نے انہوں کے مانند اس کی آواز

کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔ جسے اُس نے بڑی گرم جوشی سے سہاوا لیا۔

جب تک اندیا کو آپ جیسے لوگ
مست ہو کر نہ سمجھتے، اس سے تو ہرگز حجاز

میں نے نہیں روک سکتی۔

سے آپ کی کیا توقعات ہوں گی؟

فٹ مین بننے لگا۔
یہ پوچھے بابا، کیا توقعات نہ ہوں گی۔

مقصود اتنا پختہ ہوا ہو تو کلام کی نوعیت کو طے
تجسین کیا جاسکتا۔

اور دو تین ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ میں واقعی اندھا ہوں اور فٹ میں نے

گوشی میں گیند باؤنڈری کے باہر جانے لگی۔

تقہ مختصر میں نے فٹ بین کی اچھنی کا جاسکوس
بننا قبول کر لیا۔ کچھ اس طرح یا محاورہ عیوٹ بول

بول کر، گویا میرے اس اقدام سے انسانی آزادیوں اور حقوق میں استحکام پیدا ہوگا۔ اس کے بعد میں

نے اپنی خواہشات کو کچھ لے لے پا کر انہیں باقاعدہ ورزہ رکھادیں۔ یہاں پر انہیں صبر و استقامت کا موقع ملتا تھا۔

آنے پر ان کی گرفت ڈھیل نہ ہو اور بڑے حسین سے

حماقت پر پیش کر جواب دے گا، اے مجھبی،

کدھسمی نہیں۔ کوئی دیکھنے کی بات ہو تو دیکھوں۔
 — اگر دیکھنے کی خواہش نہ ہو تو ہماری کھل

آنکھیں بھی بے کار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
عورت نکھارتے ہیں اور نر دوش دھلے عالتے

ہیں۔ جو ساگر پکڑے جائیں تو اکثر خود ہی اپنے

آپ کو پتہ نہ ہے۔ بے گناہوں کے

ایک میں ہی اپنا راز دار ہوں۔ اب یا تو راز دار
کو مروائے کہ صحیح ہو یا اس پر ٹوڑا ٹوڑ رکھے۔

بند دروازہ کھلے کوڑ



اس وقت میں کچھ نہ سمجھ پاتی۔ اس وقت مجھے لگا دوا دیکھے کسی سازش میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہیں دور دیکھتے دیکھتے اچانک لگا ہی میرے چہرے پر گاڑ دیتے ہیں بڑ بڑا جاتی۔ دوا چھوڑ دینا میں کھو جاتے۔ لاکھ کوشش کرتے ہر کسی میں اندر ہل کر سمیٹ کر کسی کلاں نہ ڈھال پاتی۔ بھراؤ میں ابھی تڑپتی رہتی۔

انتظار! کس کا انتظار!!

دوا فائدہ جو بٹ کھل جاتا ہے۔ اندر سے شنی چڑھی رہتی ہے۔ کوڑاؤ دنگ سے تھے ہیں۔ وہ دنگ کو ان سا کر دیتے ہیں۔ ان کا اپنا صیغہ ہے مسکراتے ہوئے آؤں کوڑا۔ بند دروازے کھلے کوڑا گریش نہیں رہا۔ اس کے جانے میں میرا دخل کتنا ہے، میں نہیں جانتی۔ وہ جانے سے پہلے ہی چلا جاتا تھا۔ تب کون سا میں اسے روک پاتی تھی۔ آنا جانا جا کر آنا۔ اگر جانا کیسا پکڑ ہے؟ اگر بھی نہ آنا!

درستی کو کس نے پایا؟ وہ خود چلا آیا۔ بند دروازے کے کواؤں کو کھلا جان کر اس نے ہانپے ٹھٹھ میں قدم رکھ دیا۔ میں اپنی ماں کو یاد کر کے کانپ اٹھی۔ میرے باپ کے ہوتے ہوتے بھی ایسے کسی کا انتظار نہ رہا۔ کان اچانی چاپ پر لگے نہ تھے

تجی دلا میری آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ماں کئی تھکی باپ؟ یہی سوچتی ہوتی میں لوٹ چلی لیکن پیچھے ہی کیا دھرا تھا۔ جلیں کے اس پار میں تھی۔ جلیں کے اس پار گریش اور درستی تھے۔ آج میں ہی بار بار طبعی ہوں۔ دروازے تک پہنچنے کے لیے رک جاتی ہوں۔ باہر خاموش ہے اندر کسان ہے۔ آباد ویران ہے۔ خود خف لیے کرے کے دروازے تک پہنچنے میں دیر کتنی لگتی ہے؟ لیکن بات بے آواز دنگ کی ہے جو آتی ہے اور نہیں آتی۔

درستی دیوار کے ساتھ ٹکی کر ہی پریشا تھا۔ اس کا منہ جلیں کی سیدھ میں تھا۔ کرکسی کا بایاں بانو گریش کے ہنگ کے ساتھ سر ہانے کی طرف سنا ہوا تھا۔ درستی بول رہا تھا، کسی را کھال بھائی کو توں رہا تھا۔ میں نہیں جانتی وہ فنا و نال میں زیر محمل رہا تھا یا امرت۔ درستی میں چلے کے کلاپاں آہتا رہا۔ چلیں کے اس پار کھڑی میں سنا تھی۔

درستی چڑکڑ نہیں۔ وہ کوئی بھی نہیں۔ سنگیت سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ اسے گریش کی طرح دہلنگ کا ضرورت ہے نہ سانسے والی دیوار نیچے چڑی۔ چہرہ ہی اس کے ٹھٹھ میں قدم رکھتے ہی جیسے ہنا آپ ور فلانے لگا۔ کوئی اُن کو گلو میرے وجود کو کھو گئے ہوتے نہ نہیں کیا کچھ باد دلنے لگا۔ گولیاں اور بڑھی۔ بڑھی تو اس کی بیوی۔

بڑھی کی بیوی اور گولیاں۔ چڑکارا چڑکلا!! سوال نہیں کہ درستی کو ٹھٹھ میں لایا گیا یا وہ خود چلا آیا۔ سوال تو اس کے آجائے کا رہا۔ حقیقت وہ جو ہو کر ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔ کچھ پوچھو میں ہی جانتی ہوں لیکن دادا مرستے ہیں سناں بھیا پھوڑتی ہے۔

"تیری ماں خود کلاپا تھی سانسے بھیا ہی گان رہی۔ شاید سے تلاش تھی۔ تو بھی تو شلو، تو بھی تو۔۔۔۔"

گریش! ثابت و سالم گریش۔ چار لپاں کپڑے پر بھی اس کی کوئی چول ڈھیل نہ رہی۔ وہی ٹھٹھ بھائی طبعیت۔ ناپ تول کا بندہ۔ گنتی کا آدمی۔ اچھے بھر ادھر نہ لپکا ہو کر سانسے دیوار نیچے اپنے ہاتھ سے بناتے چڑکڑ کھاتا رہتا۔ نہ اس کے ہونٹ کپکپاتے نہ آنکھ جھپکتی۔ چہرہ! بس چہرہ!!

میں بڑھی کو جانتی ہوں۔ اس کے گاؤں کو پہچانتی ہوں۔ گاؤں اسے باندھ سکا نہ اس کے اذرا اس کا لاسرہ روک سکے۔ پتہ نہیں اپنی ٹھٹھ ماں باپ کو کیا کچھ پرس پر چلا آیا۔ اوزار ایک طرف دھر برش رنگ اور کینوس سے ابھر بھا۔

میں نے درستی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی۔ اس نے کبھی میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس کے اوپر سے دریاں چلیں جاتیں رہی۔ اس کی آواز بھی جلیں کے اس پار ابھرتی اور میری باہر جاتی چہرہ ہی انتظار تھا۔ میں بڑھی کی بیوی کی طرح

منڈالے لگتی۔ پتہ نہیں کہاں جاسکے لگتی۔ اگلا کارا
 دھواں! ایکسپرم کے منے کا اشتہار۔ آواز کا احساس
 احساس کی آواز!
 ساحل پر بیٹھا بڑا سمندر کی ہے چہ میں ملوں
 میں کچھ تلاش کرنا ہوتا اس کے ساتھ شہی بڑھیا اٹھتا
 کرتے کرتے آگن جانی تو توڑ دھسے چہ ہے کی
 بھڑوں میں کچھ ڈھونڈنے لگتی۔ بالوں پر کوفہ اپنی
 تلاش میں نکل جاتی۔ (ادھر توں گرتا ہوا ہر وار سدا
 ہے اور میں شانے بدلے پتی میں ڈوٹی بھڑیاں۔
 کیا زندگی اگارت گئی۔ بڑھیا کا نیا ہنسی۔ یہ
 مرا ہوا ہمارا ہٹا۔ یہ لوگ اساطیر ہوں۔ نہ راستہ
 نہ منزل۔ نہ دانہ دونوں کا کوئی نشان۔ درختی ہوتا
 رہتا۔ ہوا آواز بھڑی رہتی۔ محض آواز! میں ملتی رہتی
 چاہے کاپانی آگن چلا جاتا۔ سب چھٹیں کے اس پہلے
 جو رہ جاتا۔ وہ دھواں کیا ہو گا نہ ٹھونٹ ڈالے
 مجھے پتہ ہے کہ سمندر کی چھٹیاں فرشتے بھی
 نہیں آگن سکے۔ وہ کوئی اور ہو گا جو فرشتوں کو چھٹیاں
 گھٹتے دیکھ کر امید کر بیٹھا۔ میں تو..... میں کیا
 کروں۔ بڑھتے بڑھتے اپنی اپنی ختم کرتے ہی درختی
 زور سے ہنس پڑتا۔ اسکاں بھائی ہوتا ہے زندگی کی
 تلاش سے کبھی منہ نہ موڑتے۔ لکھال بھائی!
 گوگن! گوگن! بڑھتی گوگن کو شہر کی
 اٹھا کر فرمے آیا۔ اس کی بیوی تھلا اٹھی۔ وہ جاتی تھی
 گوگن اور دوت کے دوتوں کو نیا ہات مشرک
 ہے۔ چڑھی نہیں جاتا تھا۔

اندھ چھٹا بھائی کیسرے مرنا تھا۔ ڈیڑا کا کمر
 اوپر کوڑھتا ہوا۔ ٹانگ کاٹ ڈالنے سے کوئی ناتھ
 نہیں۔ احترا یاں اور صد ہی درد سے چلنے لگے ہم
 سب اسے کمرے میں آگیا جوڑ کر گھنیں آگیتے۔
 پتہ نہیں کہ اس کے میسرے گھنیں گھنیں ہو گئے۔ اس
 کے گھم کا عروسہ نہ تھا۔ چوٹی اس نے میرے نہیں
 ضرورت سے نہ کیا وہی لگادی۔ اس کی بیوی اوتھ پتے
 ٹپ جانی لکھال نہ تھکتے۔ درختی ایکسپرم میں
 پلٹ چلا گیا،

آگن نکل

”میں نے بھائی کی بیوی سے کہا۔ مسکلتا
 ذرا اندر جا کر تو دیکھو۔ کہیں دیکھتے.....“
 ”اچھی کہاں۔ ابھی تو ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ کئی
 قدم کا اثر کم از کم چار گھنٹے رہے گا۔ مسکلتا نے
 ہنسا دی نہیں کیا۔ میں کاپ اٹھی۔ دوسری پہل
 میں مجھٹلے لگی۔ درختی کی آواز چھ چھٹیں کے ادھر
 رہ گئی۔ وہ بولا:
 ”اس میں مسکلتا کا کیا تصور۔ راکھال بھائی کہتا
 ہے۔ مرنے والے کو اس کے مرنے کی خبر
 اپنے آنسوؤں سے نہ دے۔“

مجھے یقین ہے کہ درختی کی بات سن کر کریش نے
 نہ پھوٹا ہو گا نہ اپنا چہرہ درختی کی طرف نکھلیا ہو گا۔
 وہ تو سریشا کسمیا بھی نہ ہو گا۔ ثابت و سالم پڑا ہلنے
 کی دیوار پر اپنے بنائے چتر کو گھورتا رہا ہو گا۔ بننے
 پڑنے، لگنے پڑنے کے محل سے بے نیاز۔
 میں اس کی اس بے نیازی پر مڑتی تھی۔ دھیرے
 دھیرے سب ختم ہو گیا۔ پتہ نہیں ہر بات کو درخت کی
 سے حوٹل کہنے میں چڑائی ہے اس کی قدر میرے
 دل میں کیوں ختم ہونے لگی۔ بے نیازی کے مجھے
 دیوانے کو تو بڑی ذوقاقت والے ملنے جاتے ہیں
 پھر میں کریش میں کوئی دھڑکی بات کہیں ڈھونڈنے
 لگی۔ درختی کا بھائی مرے یا جیتے، مسکلتا روتے
 یا ہنستے۔ میں اس بھڑے کو کریش ادا اس کی
 پینٹنگ کے ساتھ کیوں جوڑنے لگی۔ کیا وہی کوئی
 رنگ کیٹرس پراتنے سے رہ گیا؟

بڑھتی کی بیوی سب کچھ جانتی تھی۔ بڑھتی نہیں
 جانتا تھا کہاں تھکان کا کام کہاں چتر کا کاکا ہام
 کچا اور چھوٹا فرق۔ کہاں سونا کہاں یکن۔ ایک
 طرف نرزا کہاں دوسری طرف غلامی غور۔
 میں تو پ اٹھی۔ مسکلتا ہونے اور نہ
 ہونے کا ڈھونگ پہلے میں کہ تو فرق ہے فرق
 سمندر کی کیا سادہ! پرشات ہمارا کی کر وہ
 چھٹیں اپنی اپنی سادہ کا دھونگ لگتی ہے!
 گوگن! گوگن!

صدائوں اور کھڑکیوں پر دھڑکیاں پڑتی ہیں
 کیٹرس پر ہنگ مسکلتا ادا حساس کچا اور چھٹا
 میں فرق نہ جوتا تو بڑھتی کی بیوی گوگن کو دیکھ کر مسکلتا
 نہ جانی۔ وہی جانتی تھی کہ قسم سے خبر دیکھ کر چھٹیں
 ہے۔ شہر کے سمیتر آگیتے سر اسکاں ہے سدا
 میں کچا اسکاں ہو جائے تو آگیتے چھٹیں کرتی جا
 اور دھڑکیے کہتی ہے۔ گوگن کا خفا موشی ہنسا اور
 بھارتی نوع۔ بڑھتی کی بیوی مردی تھی۔ گوگن
 نے اس کے آگن کے چھٹوں کو زور نہ لایا۔ رنگ لکھا
 اور آگن کی چادر اور ڈھلی۔ اس کے محل کی تھی
 سبھلادی۔ بھارتی کو بڑھتی کو خرم درختی کی آگن کے چھٹوں
 را کہ کر دیا۔ بڑھتی گوگن کے کیٹرس پر ہنسی کی
 دوت لکھا۔ دوتی اپنی بیوی کو دیکھ کر اپنی گردن
 کے گرد بھندا کس بیٹھا۔

چھٹیں کے پاس بائیں دم آگن میں کچا تلاش
 کرتی ہوتی میں سے چھٹیں ہوا تھی ہو۔
 دادا تم اپنی طرح کیوں نہیں مر چلتے؟ او
 ماں! ادھیری ماں! تو مجھے میرے ہاتھ کے ساتھ
 کیوں نہیں جیتے دوتی! میرا کریش کے منے کے چتر
 سے کوئی سر نہ کر نہیں۔ میں نے اس میں ایک بھی کچا
 نہیں سمجھی۔ اس میں کوئی رنگ نہیں بھریا تھا۔ کوئی
 اس کیٹرس پر اپنی پرچاؤں ڈالنے کے لیے چھٹیں
 میں سے اٹھ کر وہاں نہیں پہنچا۔ میں نے چتر۔
 بھائی نہ میں نے کریش کو کمرے سے لگایا۔ اس کی ڈھیلیوں
 میں بے درد کے لیے میں دے دوں نہیں ہوں۔

میں نے تو چتر کو دیا ہے ہی نہیں اٹھایا۔ چھٹیں
 اس چتر سے اپنا ترش کیوں جوڑ بیٹھی۔ مجھے کریش کا
 چتر کو لگنا تو گھوڑے پر چار کیوں لگنے لگا۔ چار
 درختی کے آگن ہی اس کی آواز پر کا کیوں لگنا چھٹیں
 کہا اب مجھے لکھال بھائی کے آگن کا اشتہار کوٹنا
 ہو گا! درختی کا دھونگ کچا ہے۔
 آگن کو کچا کیوں سے مشق نہ تھکتی
 کمرے میں چلا۔ تالاب والے اندر میں چھٹیں
 شونگ پر چھٹیں پلٹا تھا۔ لکھال بھائی کیٹرس

آگن نکل

پہلے ہی آتی لگتا اور آگرت انھیں بند کیے گئے۔ وہاں لگتا۔ اس کی پیروی کرنا جی کا پورے قیاس کے بغیر تھا۔ کہاں سنا تھی جنت و رشتہ اپنے لیے کھینچا لے لگتا۔

آگرت کا دوسرا مشق تھا قیاس میں غموں اور لوگوں کی باتیں سننے کے مسئلے کے چلے جانا۔ کہنے کو وہ یہاں جاتا تو کوئی نہ ماری رکھتا تھا۔ کام کا کام تھا۔ ایک دن جگنو منشی نے ہنگام لگائی اور آگرت کو اپنی کمائی کی کھانسی لگائی۔

آگرت! روپیہ پاس رکھا ہے۔ بھائی! میں کہوں گا وہ اسے کسی کے زیور میرے پاس ماری رکھا ہے۔ آگرت نے جگنو منشی کے چہرے پر نظر پڑا دیا۔ جگنو بھائی! تو آگرت نے اپنا تیرا لیا۔

منشی! جیسے پاس گئے ہیں؟ "کیا کہتا ہے؟ میرے روپوں کو کسے بتا دے خدا زور لگا"

منشی! جانے دے تو یہ وعدہ کر دے منشی نہ آتا تو آگرت میں ہی میں کل اس وقت سے دس دن شام پہنچنے سے ذرا پہلے اسے لگانے کی چار داڑھی اور جوں میں کچھ کر لیا۔ پھر وہ اپنی کوئی نہ کی تھی بنوئے کے انتظار میں تھا جواری تو یہاں لایا گیا کے پاس گیا۔ زیور یا چاہا کے پاس وقت کی غمی جی پہنچنے پندرہ سال سے وہ اپنی چار بنوئے کے لیے کوئی نہ رہا تھا پہلے پندرہ سال سے علاقے کے جواری اس کی موت کے انتظار میں جو اکیلے جا رہے تھے یہاں جگنو منشی کو سا پوکا رہ شروع کرتے دیکھنے کے موہنے چاہا اور دھپا۔ کوئی نہ کی کوئی نہ کی کوئی نہ کی اپنے بیٹے کو بھیڑ کر وہ آگرت کے ساتھ چل پڑا جگنو منشی کو آواز پر آواز لگاتے آگرت نے دیکھا اس کے گرد خاصی چیز لگتی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ جگنو منشی اچھا آگرت آپس میں کیا پکڑی پکڑنے والے ہیں۔

کانی دیر بعد جگنو اپنے چہرے میں آیا اور آگرت

کے ساتھ نیر یا چاہا کو کچھ کر لیا۔ اس سے پہلے کہہ کھینچا۔ چاہا پکارا تھا۔

منشی روپیہ لے کر چلے گیا۔ آگرت کی جوں میں زیور رکھ دینے ہیں۔ سامی بازار صحرانوں توں کہہ دیتے ہیں۔"

منشی کے چہرے پر بھائی! اس کے پاس سے لگا معاملہ لگا گیا۔ اس نے تو شہرت کمانے کے لیے ڈنگ ماری تھی۔ یہاں تو وہ بھلا! :

"چاہا! میرے پاس روپیہ کہاں سے آیا؟ میں نے تو آگرت کو روپیہ"

اس سے پہلے کہ منشی بھلا ہوا لگتا، آگرت نے جوں میں لٹ دی۔ اس میں میرے پتھر لکھنے کے فرض پر پھر گئے۔ چاہا نے آگرت کو گھسے لگائی اور منشی کی طرف دیکھ کر خوک دیا۔

اس واقعہ کے اگلے دن آگرت ماریا۔ کہتے ہیں وہ فقیر لگتا تھا اپنے گھر بیٹھا مچھریں بھوک سے پھٹتے بچوں کو انہی کو کھانے کے وہ اپنی بیوی سے پٹ گیا اور ہنس چلا گیا۔

درستی کہاں ختم کر کے خود بھی پہنچنے لگا۔ بڑھیرا دل کھل کر کہتا تھا۔ "آگرت! اسی واقعہ کو بھوتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ تھا۔؟"

"راکھال بھائی! کہتا ہے، زندگی میں ہی روپیہ اسے سینے سے لگا لو؟ درستی فقیر لگنے لگا۔ گریٹ کی نگاہ اور درستی کی آواز! ایک کچھ بعد دوسرا آتا ہے۔ ایک کے بعد ایک۔ ایک! ایٹنا پھر بھی راکھال بھائی کے انت کا انتظار۔ تب درستی کی آواز ضرور

گوگاں بھلائے نہیں ہوتا۔ کوڑھ کا مارا تو گاں اور وہ تہاں عورت جو اس کے کوڑھ کو دیکھ کر بھی نہ گھبرا۔ اسے نفرت ہوئی نہ! بلکائی آئی۔ یہ لکڑی کون کھونٹے لگتا ہے؟ ردا کون چلاتا ہے؟ گریٹ اور درستی!

گریٹ کو اس حالت میں نے نہیں پہچانیا میں نے تو اسے گوگاں اور بڑھی کا قہقہہ ہار بار سنایا

اسے سننے سے اس کے جگر سوز گئے اور وہ لپکا ہو گیا۔ ایک بار پھر پڑا تو آٹھ کر نہیں دیکھا۔ لیکن اپنی بنائی پٹنٹ کے اس کا موہ ڈوٹا۔ شاید اس کی یہ حالت دیکھ کر کسی دیکھ کر ادا دل ہوا۔ چلیں کہ اس کا بچا ہوتا ہوا روکتی۔ رکھال بھائی کو لگا مارا تو رتا ہوا روکتی۔

جو کچھ بننے کی تماشے جڑ کر دے شک بات اور کیا ہوگی! گوگاں! گوگاں! تو کوڑھی کے روپ ہیں ہی۔ آٹھ کی کٹنگ کے درو دیوار اپنی پتھر کا سے سماں میں ٹھہرا۔ بے کھ کھ کر دئی تیری موت کے بعد تھے اپنا مردان کر مر عام تھا ہوا مرد بڑی کی۔

لیکن یہ تو راکھال بھائی کے انت کے بعد ہی ہوگا۔ کیسا انداز ہے یہ! راکھال بھائی سے ہے۔ ایک دیا انھیں لگا تو دوسرا بھلائے بیچتی — روٹی کہاں ہے؟

"شاو تو ابھی اپنی پانی کی دگر ہو چڑھے۔ چلی یہ سنو، اس میں تلاش ہے کارہے۔ میری مان لے بیٹی! دنیا کو جان لے۔" دادا دہائی دیتے سے باز نہیں آتے۔

مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ راکھال بھائی کو ڈھیر سا روپیہ کہاں سے ملا۔ یہ تو درستی بتاتا ہے کہ روپیہ حاصل کرنے کے لیے راکھال بھائی نے ہر پٹنٹ کیا۔ قہقہہ لگائی۔ ڈاٹے ڈاٹے۔ سمگلروں کا سر فہرست۔ بدی سرکاروں کا خبر ہوا اور انہوں سے غدار کی۔ یہاں تک سننے میں آیا کہ راکھال بھائی لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے تو راکھال بھائی کے انت کا انتظار ہے۔ مجھے انتظار ہے درستی کی آواز کے چلنے سے اس پار آنے کا۔ یہ دھماکا کہاں سے آتا ہے؟ آواز کا گنگم

بھلا! آہنگ! — تلاش! آج! راکھال بھائی نے دولت کھنی کرنے کے بعد زندگی کو دھوس میں بانٹ دیا۔ ایک طرف وہ اپنا بچوں، بیٹیوں اور بیویوں کے لیے راحت گھر کھنے میں شغف کا احساس کرنے لگا۔ دوسری طرف شرب، عورت اور عورت کے اڈے چلانے میں زندگی کی خوشیاں ڈھونڈنے لگا۔ دھاتی ہر روز

سر سید اشعری کے درمیان اختلاف

کی بنا پر رحمت پسند قرار دینا ایک عام غلطی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو یقیناً ایک جگہ لگا کر نصب العین دیا، لیکن اسے ایک تاریخی مجبوری کے سوا کچھ اور سمجھنا سنت نا انصافی ہوگی۔ (مقالہ کا سیاسی شعور از: معین حسن جعفری)

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سبھی اپنے خیالات کے اعتبار سے اپنی جگہ پر صحیح تھے، اس لئے کہ وہ نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور سر سید سبھی اپنی جگہ اپنے نصب العین میں بالکل درست تھے اس لئے کہ وہ پانی نسل سے تعلق رکھتے تھے

دو ذیل اپنی جگہ مجبور تھے۔ اور عبرت تاریخی سمجھنا سبھی نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس ماحول کے اثرات اس صورت میں سامنے آنے

تھے اور ان کے یعنی ان کی شخصیت کو اس طرح متعا دہونا سمجھا، سو ہوئی۔ سر سید نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اور جو مشاہدہ کیا تھا اس کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا تھا، اور وہ

ہوا۔ یہ جتنا کہ سر سید غلطی پر تھے، سر سید اور ان کے ماحول نیز ان کی نفسیاتی کیفیات کے تیز نظر ان پر اتہام ہے اور سر سید نا انصافی بھی۔ اس

طرح شبی پر کو تاریخی نظر کا الزام بھی سبشی کی عظیم شخصیت سے انکار کرنا ہوگا۔ حالات کی سہم غلطی نے دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف ٹھکر کر دیا

تھا اور تہ جہاں تک غلوں کا تعلق ہے انہیں ہم ایک اپنی جگہ پر مسلمانوں سے غلطی رکھتا تھا، اور

دل سے مسلم قوم کی ترقی کا خواہاں تھا، موصطیٰ الگ الگ تھی۔ ایک کہ ضرورت فی مسلمانوں کی

ترقی سے زیادہ خوشی ہوتی تھی، دوسرے کو کہ صرف ہندوستانی مسلمانوں بلکہ عالم اسلام کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا پسند تھا، لہذا غلط فہمی کی طرف دونوں کے تعلقات میں کشیدگی کا المیہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۸۲ء

پڑنے سے مٹی۔ تو مجھ پر ہی کی مگر دردی دوار پر بناتے اپنے چہرے کو انگلیوں سے محسوس کرتے ہوئے کائنات کے خیمے اپنے اور بوت کے پیٹ میں سلنے کی سرخوشی اور کرب کا احساس کرتے ہوئے زندہ رہنے میں

لگنا ہوا۔ اور رکھا رکھا بھائی کی آنکھوں کی روشنی کے ساتھ ہی ان کی اندر کی جوت بھی بھگتی۔ اندھا ہونے ہی وہ

بین کرنے لگے۔ تیزی سے مرے گئے۔ ان کا انت اپنا اور ایک دہر و کئی گریش کے پاس کر ہی پڑا تھا۔ میں انتقال کرنے لگی۔ ورنہ کی آواز کے بدلنے کا۔

اس کے بچے کے جن لینے کا۔ دونوں کم آہنگ ہو کر ایک بے صبر، مہم ہوئے میں ڈھلنے کا انتظار۔

”راکھال بھائی آج کل دنیا پر جھانک رہا ہے کہ کالے بالوں کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ آج یہ میں استعمال کیے جانے والے نئے ہتھیاروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ جھپکے لگا۔ وراثت اور تباہی کی باتوں۔“

ورنہ نہیں رکا، ”راکھال بھائی نے آج مجھے دیکھتے ہی اپنے گھر بار، دوست یار اور مندر بچوں کو ایک دم بھلا دیا۔ آج اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنی بے نور نگاہیں میری آنکھوں میں الجھائیں اور میسایا، ورنہ کیا

ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ آج ہی پھر جائے۔ انجی فریج ہو جائے۔ اس میں دھن کچھ بھی تو بچا نہیں رہے گا۔ وراثت! مسروناش! ورنہ! تو کہہ دے۔ میرے

دوست کہہ دے کہ یہ ہوگا۔ گوگاں! اوگوگاں! یہ بار بار لکھی کون ٹھکنے لگتا ہے؟ کون لگا کر رندا جلتے جالتے ہے؟ کیا وہی

ورنہ کی بچیں سمجھا، کیا بچے وہ راکھال بھائی..... اس سے پہلے کہ وہ راکھال بھائی کے انت پر بے معنی قہقہہ لگنے میں اسے بھول کر کہاں چل دی؟ دروازے پر دستک! بند گواڑوں کی آواں مسکان! ایک کے بعد

ایک۔ ایک نئی ایک۔ پھر بھی..... کھلا دروازہ بند مکان۔ زچلیں کے آرزو چلیں کے بار کائنات کی دود کا

کرب۔ گریش کی سپاٹ نگاہ۔ ورنہ کی کا پے روح لہجہ۔ کیسا دکھات..... کیسا المیہ....؟ وہی سوال اور میرے لئے ہوئے چلتے قدم! ۰۰۰

راکھال بھائی کے منہ سے نکلی ہوئی کوئی بات بتانا۔ بتاتے وقت میرے دھیرے دھیرے سکڑا۔ بات ختم کرتے ہی قہقہہ لگا۔ راکھال بھائی کہتے ہیں کہ زندگی بھی

بھی ہوس کی حرمت قائم رکھو۔ کیسا آدی ہے راکھال بھائی! کوئی زندگی جو نہ والا لے لے سے زندگی جو نہ والا۔ ورنہ کی

بولتا رہتا۔ بھائی اپنے کمرے کی دیواروں کو دیکھتا ہے تو دم چلا جاتا ہے۔ دروازوں، کھڑکیوں، روشنیوں سے نظریں نہیں ہٹا پاتا۔ سامنے سے

کھلنے کو گھورتا چلا جاتا ہے۔ باہر جانے سے پہلے کوٹ کے کار، ٹائی کی ٹاٹ اور پتلون کی کرتے کے ساتھ ساتھ بوٹ کی ٹوکھی بار بار پچھتاہے۔ کابین

پیشے سے پہلے اس کی باڈی پر ہاتھ پیرتا ہے اور ڈونڈ کو کاسے دروازے کا ہینڈل تھامے ٹھکر دیکھ کر خود کھڑا رہ جاتا ہے۔

”چکر ہو یا مندر میں دونوں میں دلچسپی لینی چاہیے۔ راکھال بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ چل جاتی۔“ میں نے تیزی ہی بیباک زندگی بتائی۔ کیسے

بھی لگتا تو نے کام کیے بے حساب دکھ سہ۔ دونوں کو اتھاہ دکھیں گے والا لیکن زندگی کا احترام کریں نہیں چھوڑا۔ بھائی کی آنکھوں میں سب کچھ سمٹ آتا، زندگی

بھر پوریت کا دوسرا نام ہے۔ ہر کوئی پاپ پن کے دیلے سے اس سنسار میں ایک اپنا منسا رہ جاتا ہے۔ اور یہ سنسار اور شرا، گھنا اور رنجپ ہو جاتا ہے۔

مرنے سے پہلے اس سنسار میں اپنا سنسار جوڑنا ہمارا دھرم ہے۔ مجھے خوشی ہے میں نے زندگی کو اس کے ہر روبرو میں دیکھا ہے اور اس کے ماتھے پر

بھر پوریت کا تلک لگایا ہے۔ یہی بھر پوریت آئے والوں کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا۔ اسے زندہ رکھنا.....“

لیکن یہ سب تو ورنہ راکھال بھائی کے انت سے پہلے ہی جاتا تھا۔ کیسے کیسے کا انتظار رہا؟ گوگاں تو کوکرہ سے اندھا ہوا اور راکھال بھائی کی آنکھوں کی روشنی، اکرے، جھولان میں غلط دوائی

نکلی تھی دہلی

گھوٹلہ

شام دھلے والی تھی۔

کمرے میں موت کی سی خاموشی اور اس خاموشی کو توڑتی ہوئی تھے کی آواز۔

دینا ناتھ بھی چلمے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھتا اور کبھی اپنے موبند سے نکلے ہوئے دھوی کو۔ جس میں اس کی آہیں بھی سناں تھیں۔

دینا ناتھ کو اب لگا جیسے وہ زندگی کا سفر کرتے کرتے کافی میڑھیاں اتر چکا ہو اور آج اپنا تک ہی آگے کی میڑھیاں غائب ہو گئی ہوں۔

آخری سیر بھی پچھوہ دینا ناتھ اور سادری اور نیچے ایک گھر کی کھائی۔ زندگی کا اختتام۔

پلک جھپکتے ہی جیسے بہار خزاں بن گئی ہو اور پتے پتے کے شونے زرد پتوں کی طرح ان کے شونے بے جاں

جسم آگ کی پٹیوں میں آکر چمڑی لمحوں میں راکھ بن جائیں گے! اسے لگا جیسے کمرے کے کسی گوشے میں

برسوں سے پڑا ناگم جسم جو آتش کی موجودگی سے شاید اب تک خاموش تھا۔ اب کچھ ہی دیر میں پھینکے

والا ہے۔ ہم پھاٹے کا۔۔۔ آن کا گھر۔ پتھر کھوں کی بنائی ہوئی عمارت۔۔۔ سب کچھ

پڑ پڑ پڑ پڑ ہو کر ہوا میں بکھرا ہے۔۔۔ اور وہ جاقین کے مٹی اور پٹیلے کے چند ڈھیر۔ اور

(۱۸۱) جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ (۱۹۶۸ء) (کشمیر)

پلے کے نیچے دلی ہوئی دینا ناتھ اور سادری کی کلاشیں۔!

دینا ناتھ نے اپنے ذہن کو زور دار جھٹکا دیا۔ شاید وہ ابھی یہ سب سوچنے کے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس نے سر اٹھا سامنے والی

کھڑکی کی طرف دیکھا۔ شاید سادری کھڑکی میں کھڑی تھی۔ شاید کیوں۔۔۔ بدیشا ہی وہ سادری

تھی اور وہ بھی کون سی تھی۔ وہی تو سچی جو پچھلے تیس برس سے دینا ناتھ کا ساتھ دے رہی تھی۔

ورنہ گھر تو اس دن سے ہی غیر آباد ہو گیا تھا جب راتیں نوکری کرنے شہر چلا گیا تھا۔ برسوں گزر گئے۔

صرف وہ پتھر بڑھا اور تو بوجھ ہی گھری بے جاں دیواروں سے باتیں کرنے کے لئے رہ گئے تھے۔

وہ اور سادری۔۔۔ سادری اور دینا ناتھ۔۔۔ بس۔۔۔ یہ کچھ تھا اب گھر میں۔

”راجن کی ماں کیا کر رہی ہو؟“ دینا ناتھ نے سکوت توڑا۔

”کچھ نہیں“ سادری نے مختصر سا جواب دیا۔ حالانکہ وہ اب بھی جھٹکی لگاتے سانسے واسے

برگڑے کے بیڑ کو دیکھتے جارہی تھی جس کے کھوکھلے حصے کے اندر پٹ پٹا لکھنڈ تھا۔

”کتنی بے کھڑیں اور اڑھیرے ہیں دشمنی تلاش کر رہی ہے۔“ دینا ناتھ کو نہ میں بڑبڑایا۔

اس کے حلق کی چم بھونکی تھی۔ اس نے چلم میں بھر سے نہ کوٹنے کے لئے نہ بنا کو کاٹنے اٹھانے

کی کوشش کی، مگر وہ بے فائدہ رہا۔ ایک جھٹکا سا لگا اس کے ذہن کو۔ لگو کرے میں کچھ اندھیرا

تھا پھر کبھی اتنی روشنی تو تھی ہی اس کی آنکھوں میں۔ ابھی پچھلے جیسے ہی تو آنکھوں کے ڈاکڑ نے کہا تھا

کہ اس کی نظر ابھی کافی حد تک ٹھیک ہے اور آنکھوں کا موتیا بھی نکال دیا ہے۔ پھر۔۔۔ کچھ دیر میں ہی وہ

بے سہارا سا کیوں ہو گیا۔ بل بھر میں آنکھوں کا موتیا کیسے پک گیا۔ اس کی آنکھوں کی سینائی

ایک دم ختم ہوئی ہوئے لگی۔ کیا کچھ راجن کے جانے کے بعد اس کی آنکھوں کی روشنی بن گیا

تھا۔ اور اس کے جانے ہی۔۔۔؟؟ اس نے اندھیرے میں ٹوٹے ہوئے تھپاکو کے ڈبے کو

اتنی سختی سے گرفت میں لیا جیسے سارا تصور ہی کا تھا۔

”دو کھینے سے براں لاری کی سیٹھی کی آواز آئی۔ گاؤں سے سکائی میں لیل کی دوری پر واقع رہیے

ایشیں پڑ گاڑی آنے کا سگن۔ اپنا تک سادری نے گھر کے کمرے میں دینا ناتھ کی طرف دیکھا جیسے

گاڑی کی سیٹھی کی آواز نہ ہو بلکہ غورے کا سارن ہو۔ دھن کی کانٹھیں ٹھکرائیں۔ دینا ناتھ کے چہرے پر کچھ دہشت کے نشانات ابھرائے۔

”آج گاڑی وقت سے پہلے ہی آگئی۔“ سادری نے اپنے آپ پر قابو ہاتھ پڑے۔

”جھلی کہاں آئی۔ روزنامی وقت تو آتی ہے۔“ دینا ناٹھہ تانا تھا کہ سادری گاڑی کے ٹھیک وقت پر مکتے سے خوش کیوں ہے۔ دماغ وہ دونوں جانتے تھے کہ کچھ دیر میں ان کا بیٹا راجن، بہو اور ان کا پیارا بچہ آتا گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں سے دور بہت دور چلے جائیں گے۔ بڑے شہر میں۔ اور جہاں جاتے جب دوبارہ آئیں گے۔ کبھی آئیں گے کبھی یا نہیں!!

”گاڑی صرف ایک منٹ کے لئے دکتی ہے۔“ ایشی پ۔ کتنی مشکل ہو گی راجن کو۔۔۔“ سادری جانتے ہوئے بھی اپنے دل میں اطمینان پوری ہو کر توتا جیتا نہیں پاری تھی۔ ”بہو ساتھ ہے۔ کچھ سامان ہے اور کچھ۔۔۔ آ۔ آ۔ آ۔ بھی تو ساتھ ہے۔ آٹو کا نام ہے ہی سادری کے ہونٹ کا پھٹنے لگے۔

”ارے بے شک ہو گا۔ آخر دونوں میاں بوی شہر میں لڑکی کرتے ہیں۔ دن میں بیس بیس بدلتے رہتے ہیں۔ اور شہر کی بسوں کی بھیج کے مقابلے میں ہمارا ایشی تو سمجھ جاتی ہی رہتا ہے۔“

”سو تو ہے؟“ سادری خاموش ہو گئی۔ ریل گاڑی کی سیٹی ایک بار پھر دھنسا میں گونجی۔ جسے سنتے ہی سادری کے ساتھ دینا ناٹھہ کارنگ بھی در در ٹپکا۔ اس کے ذہن میں عدالت کا کردہ ٹھوسا۔ بجئے فیصلے پر دستخط کرنے کی اپنے قلم کی تپ توڑ دی۔ اور دینا ناٹھہ نے غصے کیما کما اس کا دم جھٹکے لگائے۔ اس کے گلے میں جیسے پھانسی کا پنڈا ڈال دیا گیا ہو اور کئی دیر سے دھیس دھیس اس کے پیروں سے گڑی آتے آتے ہرٹھکھٹا رہا ہو۔ ریل گاڑی کی دوسری سیٹی کے ساتھ ہی گاڑی کے پیروں کی گر گر کر اٹھ اٹھ اور آگئی کی آواز دُور ہونے لگی۔ دینا ناٹھہ ٹھٹھا کر اس کے پیروں کے

گلڑی کے تھکے کاٹری سر اچھی نکل گیا ہے۔ ریل گاڑی کی آواز بہت دُور ہو گئی ہے۔ اور اس کے پیروں میں مچول رہے ہیں۔ اس کے گلے میں بڑے پھندے کی جکڑن مضبوط سے مضبوط ہوئی جا رہی ہے۔ ایک ہلکی سی سیخ اس کے منہ سے نکلی۔

”کیا ہوا؟“ سادری چونک پڑی۔ ”اک۔۔۔ کچھ نہیں۔“ دینا ناٹھہ گلشن کم ہوئی۔ حالانکہ ابھی بھی پھندے کی جکڑن مچولی ہو رہی تھی۔ ”کا۔۔۔ کا۔۔۔ کا۔۔۔ کا۔۔۔“ سادری ”ہاں۔ روشنی کر دیتی ہوں۔“ سادری نے سوچا کہ ان کر دیا کہ وہ سر ہو گیا۔ دونوں میاں بوی اب ایک دوسرے کے آٹے سلنے بیٹھے تھے۔ دونوں چوری چھپے ایک دوسرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر نظریں ملانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔ کہ یہ میں پھر سے جیسے نام تھا گیا۔ دینا ناٹھہ کی لڑکی آنکھیں کرسے کی ہر نے کو غور غور کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کرسے میں بڑا آٹو کا ٹاٹا لٹکا ہوا، جو اس نے کچھ پہلے ہی چلا لیا تھا۔ آٹو کے کھلونے۔ کاٹھکے پڑے اور آٹو کی سلم جس سے وہ کاٹھ پڑاڑی ترچھی گئیں کھینچا کر اٹھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“ سادری نے سکوت توڑا۔

”تم بھی تو کچھ سوچ رہی ہو۔“ دینا ناٹھہ نے کچھ اس لیے میں بات کی جیسے اس کی چوری چھپتی گئی ہو۔

”سوچ رہی ہوں آٹو کے جانے کے بعد گھر پر سنان ہو گیا۔ مگھو انے ایک ہی بیٹا دیا۔ دس برس سے شہر میں رہ رہا ہے۔ بہو ہے تو اُسے گاؤں کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ ادا اب آٹو تھا۔ آج وہ بھی۔“

”تم بھی کہاں کتنی ہوسادری۔“ اب تک دینا ناٹھہ نے آپر کا لہجہ پایا تھا۔ اس

گاؤں میں آخر کبھی کہا ہے۔ یہ مکان ہے۔ جیسے ہمارے بزرگ نے بنایا۔ اور ہم اس کے چرکیدار۔“

”بہو ہم راجن کے پاس شہر کیوں نہیں جاتے۔“ اتنی بار تو کہہ چکا ہے وہ اور بھی جانتے۔ ”سادری نہ جانتے کیوں۔“ دینا ناٹھہ نے آہ بیکر کر کہا۔ ”جانتے کیوں یہ گھر چھوڑنے کے لئے دل نہیں مانتا۔ اتنی زمین ہے ہماری۔ کوئی دیکھ سہاں کرنے والا ہو تو منی سے سزا نکال سکتا ہے۔ مگر آج کل شہر کی زمین سورا ہے۔ شہر کی چمک دھمک۔ سر کاڑی لڑکی۔ دینا ناٹھہ نے ٹھٹھے کیے سانسے سے شہر کا گورا تھا چھوڑنے ہوئے کہا۔ ”یا شاید ہمارے ہی سوچے کا ڈھنگ غلط ہے۔ شاید ہم لوگ سمجھو نہیں کہ ہاتھ پڑے۔“

”سمجھو تو کیا تھا۔ بیٹا اور پوسہ شہر میں تھے۔ جیسے بھی تھے خوش تھے۔ ہم بھی ان کی یاد میں ہیں۔ لے ایک کٹی میں سوار تھے جو دینا میں روانی کے ساتھ اپنے آپ ہی ہے ہماری سستی۔ جس کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ دینا کی روانی تھی اور دینا کٹی تھی۔ پھر کیوں۔“ سادری کے چہرے پر غم فٹنے کے طے مجھے تاثرات تھے۔ ”برسوں ہم سے دُور رہنے کے بعد آٹو کو کیوں ہمارے پاس لے آیا۔ صرف تین ماہ کا تھا۔ تب وہ۔ اور آج جا رہا ہے اس کے بعد اُسے ہم سے چھین کر لے گیا۔“ سادری کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”گر۔ اگر ایک دن اسے اس طرح لے جاتا تھا تو پھر اُسے ہواں چھوڑ دی کیوں تھا۔“ سادری چمک چمک کر رو پڑی۔

”سادری تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی۔“ داجی اور بہو دونوں لڑکی کے منہ میں لڑکی پہلے جاتے تو پٹنے کی دیکھ سہاں کیوں کرتا۔ شہر میں تو آ یا طبی ہی نہیں۔ اور گاڑی میں ہے تو کبھی مل جیسا ہوا اور دیکھا کبھی نہ گئے۔

اب اگر راجہ اشوک ہمارے پاس نہ رکھتا تو کیا کرتا۔

”پھر وہاں کیوں نہ گیا اے؟“ سادری کے لیے میں غصہ بھی تھا، فرطِ سماجی اور نفرت بھی۔ ”تب مسجد بنی تھی، انہیں یہ ہے۔“ دواشو کو زسری اسکول میں داخل کرانے کا، جہاں وہ دلگیر رہے گا اور سب کسٹم راجہ اور بپ کے پاس۔ اب بپا سو گیا ہے نا وہ۔ جب چھوٹا تھا تو زسری میں کھے داخلہ مل سکتا تھا۔ اب جب وہ اسکول جانے لگے گا تو ہماری ضرورت نہیں رہی۔ اس میں اب دل شکستہ ہونے کی کیا بات ہے۔ سبلا۔ آئرن چنے کو ماں باپ کے پاس ہی رہنا چاہیے نا۔

”اے تم شکم کھتے ہو۔ چنے کو ماں باپ کے پاس رہنا چاہئے۔“ سادری نے چہرے پر مسخ فرمایا۔

”لیکن بڑے ماں باپ کے پاس کسے رہنا چاہیے؟؟؟“

دینا نا تھنے کوئی جواب نہ دیا۔

سادری پھر اس کو کھڑکی میں کھڑکی ہو کر بگڑ کے بیٹھنے چڑیا کے گھونسلے کو دیکھنے لگی۔ جانے کتنے روز سے اس کا یہ معمول سا بن گیا تھا۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر وہ اس چھوٹے سے گھونسلے کو تکیہ کرتی۔ بڑا باور اس کے خستہ منہ بچوں کو دیکھتی رہتی۔ چڑیا دن بھر ادھر ادھر سے دانہ لاتی اور اپنے خستہ منہ بچوں کے مونہ میں ڈالتی۔ کیوں کہ وہ خود ڈنڈ نہیں سکتی۔ مگر آج سادری کو لگا جیسے وہ چڑیا ہی ادا اس ہے۔ کیوں لگھوٹنے میں اس کے ہنپے نہیں تھے۔ جب وہ اکیلے تھی۔ سادری اور دینا نا تھنے کی طرح۔ چڑیا کے بچے اڑنا سیکھ گئے تھے۔ اپنے لئے دانہ حاصل کرنا بھی سیکھ گئے تھے۔ نہ جانے اڑ کر کہاں اپنے خستہ منہ گھونسلے بنائے ہوں گے۔ اب آٹوں پرانے گھونسلے کی کیا ضرورت تھی۔ سادری کا گھڑ اور چڑیا کا گھونسلہ۔ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ویران ہو گئے۔ اب چڑیا کے بچے کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے۔ سادری

نے جیسے کوئی ڈراما خواب دیکھا۔ اُس نے جھپٹے کھڑکی بند کر دی اور پاگوں کی طرح دوڑ کر دینا نا تھنے کے قریب آئی اور اسے جھپٹ کر جیسے پکڑی۔ ”کیا آئو۔ کیا آئو۔ کیا آئو پھر کبھی ہمیں دیکھنے نہیں آئے گا؟“

”ہاں سادری۔“ وہ فرورائے گا۔

دینا نا تھنے سادری کے چہرے سے غصہ پر ہنساتے ہوئے کہا۔ ”اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ سادری کو دلاسا دے رہا ہے یا اپنے آپ کو۔ اس کے ہونٹ بے۔ آئو نہ سادری کے گا۔ مجھے یقین ہے۔ برسوں کے بعد۔“

”ہو کر ساتھ لے کر۔ اور۔ اور ان کے ساتھ ان کا تین بیٹے کا بچہ بھی ہوگا۔ اور آئو تم سے کہنے کا ڈاڑی! جب تک میرا بچہ زسری اسکول میں داخل ہونے کی عمر کا ہو جائے تب تک یہ تمہارے پاس رہے گا۔“

”ہاں سادری۔“ ایسا ہوگا۔ میں۔ میں کچھ کہتا ہوں۔ اور دینا نا تھنے کی آواز تیز تر سانسوں میں ڈوب گئی۔

بقیہ : صادقین کی ربا عیات

اور خطاطی کو لاہور میں پچھنے پھولنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اپنی عمر کے کئی سال وہاں گزارے۔ وہاں کی نگین شاموں نے ان کے لیے کیف و نشاط کا سامان فراہم کیا۔ وہاں ان کی صرف قد ہی نہیں کی گئی بلکہ پرستش کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ حریفوں سے بھی خوب عرصے کے بعد جھلنے ان کے فن کو بجا بخشی۔ انھوں نے خطاطی میں لاہور کو بھرا دے کے مقابل بنادیا۔ اسی لیے ان کی بیاہریوں میں لاہور کا بگڑ بگڑا کرتا ہے۔

اک خطبہ لایا اور کیا ہے میں نے
یا قوت کا دل شکر ہے میں نے
اس دور میں لاہور کو خطاطی میں
ہم جگہ بندہ ادا کیا ہے میں نے

چھڑوں کی ٹکر میں گلستان لاہور
کاشنے اور بھول ہیں نشان لاہور
مجھ پر برہم ہیں واعظان لاہور

لیکن خوش تو ہیں مرد و زنان لاہور

صادقین کی ربا عیات اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے انفرادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے مضامین بڑا آئو ہے۔ مضامین کی رنگارنگی نے ان کے کلام کو ایک چہستان بنا دیا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کا شعور بھی ہے اور غم کی لالہ کاری بھی۔ زندگی کا کس بل بھی ہے اور زبان کا بالکین بھی۔ انبیاء و مشائخ گفایاں بھی ہیں اور طنز کے نشتر بھی۔ جاہلیات بھی ہے اور حلائیات بھی۔ ان کے ہاں دھوپ بھی ہے اور چھاؤں بھی گردہ دھوپ نہیں جو دم کو بھلا دے بلکہ جاڑوں کی خوشگوار دھوپ ہے، جو دم کو حلاوت بخشی ہے۔ بے تکلفی، بے ساختگی اور دلالتی عناصر ان کے طرز بیان اور تخلیقی ذہن کا طرہ امتیاز ہیں۔ ان کی زبان بڑی رسبی اور سبکی ہے جس میں جالیانیاں چاق ہے۔ محبوب کا سراپا، اس کے خد و خال، اس کی جسم کشش، اس کے اعضا کا تناسب، اس کے جسم کا کداز، اس کا اظہار نمایاں لیتا ہوا بھر پور شباب جتنے نگاہ کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے ربا عیات کے دائرے میں وسعت میدا کی اور اس کے لامحدود امکانات کو روڈ ٹیلا۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس چراغ سے اپنے لیے راستہ تلاش کریں۔

اُجالوں کا کرب



وہ گیا۔ بیٹے کی اخلاقی باتیں اس کے کانوں میں ہتھوڑے لگا رہی تھیں۔ لمحہ لمحہ وہ خود کو ناقابل اور بے بس محسوس کرنے لگا۔ اس کی ذہنی صلاحیت روز بروز ہو گئی۔ اُسے لگا جیسے یک گشت میں کی غرضیں کئی برس کا احسان ہو گیا ہے، وہ خود کو ایک تھکا تھکا ضعیف آدمی سمجھنے لگا۔

دین محمد پھر تو ایک معمولی بچی ڈراؤر تھا۔ دس برسوں تک اس نے دوسروں کے یہاں ڈراؤر کی کہتے ہیں ماکراس نے بھی اہلذکر کے سونے روپوں اور بینک کے قرضے خود کی ایک بچی خریدی تھی جسے وہ خود ہی چلاتا تھا۔ ایک وہ — اس کی بوری اور میٹا لوز محمد — جس اتنا ہی کتبہ تھا اس کا۔ یہی اس کا سندھو تھا اس کا۔ گورنر کرام اور اطمینان سے پوری تھی۔ کوئی مالی، معاشی پریشانی کا نام تک نہیں تھا۔ فریاد اب "بی۔ ایس سی کرنا تھا۔" اکڑنا تھا۔ سمٹا، لاؤ پیسار میں لایا کی کچی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ نفسیں سیدھی سادی، ان پڑھ، گاڈ کی رہنے والی تھی۔ دین محمدات کو بھی دین کہہ دے تو اسے مان لیتے میں انیسین کو کوئی جہیز نہ تھا۔ سارے گھر میں دین محمد کی کھڑائی تھی۔ فرماں برداری کی رسم تھی۔ دین محمد کی بات سے اس بیٹا کی کو بھی اختلاف نہ تھا۔ جو کہ دیا ہو یا ہی

میرا اور محمد کتا ذہن اور سوچہ ٹوچہ والا ہو گیا ہے۔ دیکھو چھوٹے بڑے معاملات سمجھانے کی کسی تدبیر رکھتا ہے، یاد باگ میں کھل کر اپنی بات سنوا رہا ہے۔ اسے تمہاری غلط سلا باتوں کو غلط لانے کی ہمت ہے میرے بیٹے میں!"

اور پھر وہ فخر سے اپنی جہتی ٹھونک کر کہتا: "آخر بیٹا ہے تو کس کا؟ ای؟" دین محمد کا بیٹا ہے سمجھا — کوئی قوم کو کا تو نہیں؟"

لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ گھر کے چراغ سے گھر میں آگ لگنے والی تھی — کناروں تک پہنچنے والی چھوٹی موہیں سمندر کی بڑی موجوں کے سامنے سینہ سپر تھیں۔ دین محمد سمجھتا تھا کہ اپنے چھوٹے بیٹے پر تنہا اس کا حق ہے، اس کی سوچوں پر اس کی گرفت ہے۔ بیٹا تو ایک کھٹکتا ہے، جس کی ڈھولاس کی انگلیوں سے بندھی ہے۔ جو اس کی مرضی، منشا اس کی انگلیوں کے ہلے اشاروں پر حرکت کر رہی ہے۔

لیکن اب تو — اس کی سوچوں کا مضبوط قلعہ ڈھس چکا تھا، بکھر چکے تھے اس کے صمیم خواب، ٹوٹ چکی تھیں اس کی خیالی بندشیں۔ جوان بیٹے کی پہلی ہی مخالفت اس کا چین و سکون غارت کر چکی تھی۔ وہ دھل سوس کر

دین محمد کو آج پہلی بار احساس ہوا کہ اس کا فوجوان بیٹا لوز محمد بھی اب اپنی الگ کھیلانے رکھتا ہے۔ اُس نے بھی اپنے بارے میں بہت کچھ سوچ رکھتا ہے۔ کچھ منصوبے بنائے ہیں، اپنے مستقبل کے لئے کچھ اصول ڈھال لئے ہیں، اپنی زندگی کے لئے — اور کم از کم وہ بھی اپنے اپنے بڑے سے متعلق اظہار کر سکتا ہے۔ اپنی رائے اور سوچ کے آگے وہ بھی اور سے اٹھو بھی سکتا ہے۔ اپنی بات منوانے کے لئے وہ دلائل اور منطق کے استعمال سے بھی واقف ہے۔

اب تک وہ دوسروں کی نصیحتوں، مشوروں اور ہدایتوں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا، لمبکس وہ آج اپنی مرضی اور منشا کے مطابق خور — اپنی ذہنی سوچ کی طاقت کے بل بوتے پر دوسروں سے اختلاف رائے بھی رکھ سکتا ہے۔

بات صرف دوسروں سے اختلاف رائے کی ہوتی تو دین محمد خوش ہوتی، اس کا سینہ فخر سے کھل اور اگلے نکل آتا۔ اس کی گردن کچھ اور بھی اونچی ہو سکتی تھی۔ وہ دوست احباب میں مونچھوں پر ہاتھ پھر کر کہہ بھی سکتا تھا "دیکھا

• ۷۲، فرشتہ پورہ، لاہور (ملک) ۲۳۲۲

بٹی ہے۔ مان جائیں گے۔ اور پھر میں
 سبھی آپ کے متعلق کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔
 لیکن آپ تو آپ سے ہی باہر ہو رہے ہیں۔ مجھے
 کچھ دیکھنے دیجئے۔ بابا۔ شادی اب وہ کھڑا
 نہیں رہا کہ۔ مان باپ اپنی مرضی سے اپنی
 بیٹی بٹے کو کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیں۔ عمر
 بھر روٹے کھائے، عمر بھر گھٹنے کھائے۔ زمانہ
 بدل چکا ہے۔ شادی بیاہ دو دہائیوں کا۔ دو
 لڑکوں کا سگم ہے بابا۔ کوئی سودے باز
 نہیں؟ نہیں۔ نہیں۔ آپ کچھ بھی کہیں
 میں بیاہ کر دوں گا تو رعبا ہی سے وردہ ہیں!
 اور دین محمد کا سارا خندہ ساری تیزی
 سوداوار کے چھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ اسے قوت
 نہیں تھی کہ بیٹیاں تنہا کرنا بات کا اظہار
 کر دے گا۔ اس نے بڑی شکل سے اپنے اُمڈتے
 ہوئے جذبات اور تن میں اس آگ کی طرح لگے
 جھٹکے کو قابو میں رکھا اور شے کے لیے میں سنبھل
 سنبھل کر کہا۔

"بیٹا۔ میں تیری باتیں مانتا ہوں۔
 زمانہ بدل گیا ہے۔ بھیک ہے جان بچاؤ
 کر ہی شادی کرنی چاہئے۔ یہاں سودا باز کی ہیں۔
 ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ یہ تیرا بوزہ
 باپ بھی جانتا ہے۔ اپنے بونٹے باپ کو اس قدر
 اپنا دشمن، جاہل اور فدا مت پسند مت سمجھو۔
 تو جہاں کہیں بھی کچھ گوارا داری میں تیری شادی
 کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن۔ خدا کے لئے۔
 بیٹا۔ تو تو بڑا کوجھول جا۔ ایک فیئر سٹم
 لڑکی سے تیری شادی کیسے کر سکتا ہوں میں؟
 ہمارا مذہب اجازت نہیں دیتا اس کی۔ کیا
 گویا رافضی غرضی سے اپنا دھرم بدلے کو تیار ہو
 جائے گی تیرے لئے؟ اس کا باپ اس
 کی برادری سے بات گوارا کر سکی؟ بول بیٹا!
 اس بات سے میں بھی کونے سوچا ہے۔ دن بھر
 ایک شے جوئے کھائے جوئے جاری کی طرح۔

ٹھکانے لگا۔

"نہیں۔ بابا۔ ہم میں سے کوئی
 بھی اپنا دھرم نہیں بدلتا۔ سمجھ سکی
 ہم بیاہ کر دیں گے۔ آج پورے ورڈ میں ایسے
 بیاہ ہو رہے ہیں۔ یہ قول کے جذبوں کا سودا ہے
 خیالات کی یکسانیت کی بات ہے۔ بیاہ کو ایک
 رشتہ ہے۔ اس میں مذہب کا کیا دخل؟ اور پھر
 اس طرح دو مذہب ایک ہو رہے ہیں۔ ان کے
 ماننے والے پاک بندہ میں بندہ کر سکتا جا رہا
 میں جلی کو پڑھا دے رہے ہیں۔ نفرت کی
 خلیج بٹ رہی ہے، ایک دوسرے کو سمجھنے کا وقت
 مل رہا ہے۔ آپ اس کا کیوں نہیں خیال کرتے؟
 بیٹا۔ دو دہائیوں پڑھ کر مجھے درس
 دے رہے ہو۔ اپنی اٹی سیدھی جتنی دہائیوں سے
 مجھے قائل کرنا چاہتے ہو تم۔ یہ کیسی محبت ہے
 بتاؤ۔ یہ کیا ملن ہے کہ اس میں ایک لڑکتے
 سے بہت سارے رشتے ٹوٹنے والے ہیں۔ ہر
 انسان کے لئے۔ بیٹا جس طرح۔ بڑا۔
 باقی اور خدا فرمادی ہے، جیسے کئے اس طرح
 یہ بھی فرمادی ہے کہ وہ ایک دھرم کا پال کرے،
 کسی ایک مذہب، ایک عقیدے کے تحت اپنی
 زندگی گزارے۔ مذہب کی مختلف چھوٹی بڑی
 پابندیاں۔ دھرم کی کئی بندشیں۔ انسان
 کو مکمل انسان بنانے رکھتی ہیں۔ بیٹا، معاشرے
 کو یکسر اور فتنہ و شر کو دبائے رکھتی ہیں۔
 اخلاق و تیار اور قربانی کی ترقی دیتی ہیں۔
 تہذیب و تمدن اور انسانیت کی رکھوالی کرتی
 ہیں۔ دین و دھرم کو ابھی شاید تم نے سمجھا
 نہیں۔ مذہب اور دھرم کے اگے دل لٹائی
 چیز نہیں بیٹا! کاش ماں یاؤ تم!"
 "یہ سب پرانی باتیں ہیں بابا، مذہب
 کی بندشیں۔ دھرم کی پابندیاں۔ صرف
 نفرت کا بیج بولی ہیں دہائیوں میں۔ پرانے
 کی آگ لگائی ہیں دہائیوں میں۔ دوا انسانوں کے

جی دہائیوں کیسے دیتی ہیں، فساد و فتنہ بکارتی
 ہیں، گو گھر نفرت کی آگ لگتی ہے اس سے
 بابا۔ اور۔ مذہب کا جہنم۔ دھرم
 کی لگاؤ۔ جب حد سے تھوڑا کر جاتے ہیں
 تو کسی کی بستی اس کی آگ میں جھلس کر خاک ہو
 جاتی ہے۔ انسانیت دم خڑ دیتی ہے۔ مذہب
 اور دھرم تو۔ تنگ نظری اور کرین کا دل
 فیتے ہیں۔ آج کے زمانے میں تہا ہے دین و
 دھرم صرف کتابوں میں اس لیے لکھے گئے ہیں۔
 زندگی کی حقیقتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔
 دل کی آسائشیں، آرزو خیال، اپنی اپنی آرزو
 کا اظہار ہی اب مذہب ہے۔ آج کا انسان
 ان پرانی روایتوں کو توڑ چکا ہے۔ اس کا دل اس
 کی رہ نمانی کر رہا ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں
 آگے آگے بڑھتی جا رہی ہیں، نئی نئی مسرتوں
 کی طرف۔ آج کوں ہے جو مجھے دل سے دھرم کا
 پال کر رہا ہے؟ کوں ہے جو مذہب و تہذیب
 کے مطابق زندگی گزار رہا ہے؟ دل کو کٹ وہ
 اور ذہن کو دھت دیکھے بابا۔ اسی میں سب
 کچھ ہے۔!"

"کچھ بھی تو ہیں میرے بیٹے۔ یوں
 کفر نہ کہو۔ تمہاری سوچوں میں صرف بزرگی
 ہے۔ تمہارے لئے میں صرف گراہی اور
 بربادی ہے۔ بچھٹا دے۔
 وقت ہے بیٹے۔ آنا ہی آج کا انسان
 اپنے آپ کو مذہب اور دھرم سے الگ کر لیا ہوتا
 جتنا تم کہہ رہے ہو۔ جتنا تم سمجھ رہے ہو۔
 تو بتاؤ۔ آئے دن آج بھی مذہب کی آڑ
 میں دھرم کے نام پر کیوں خون کی بوسیاں
 کھیلی جا رہی ہیں؟ کیوں فسادات برپا کیے
 جا رہے ہیں؟۔۔۔۔۔ دینی دھرم اگر فتنان کی
 جڑ ہے تو آج بھی یہ فسادات کی آگ لگتی کیوں
 نہیں؟ بیٹا۔ اس سماج کی گونا گونا پڑے گا۔
 مذہب ہی اتحاد و انسانیت، اخلاق کا پتھر

و قیاس ہے۔ دھرم ہی انسان کو نیک و خاندان دہلی
کی تسمیہ دیتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی دین، مذہب
کے کبھی بھی انسانیت سوز طاقتوں کی آبیاری
نہیں کی۔ یہ بتا رہا دھرم اور مذہب سے فرار
ہی تہنہاری توڑوں کا غلط استعمال کو راہ ہے۔
تہنہاری سوجھ بوجھ وقتی جذلوں پر منحصر ہیں۔
یاد رکھو۔ اگ مذہب کے دانے والوں کو
اخلاق، مہذبہ روی، غلوں سے اپنی طرف راہ
کیا جاسکتا ہے، آپس میں شادیاں کر لینے سے
دُشیاں ختم نہیں ہوں گی، بلکہ مزید نفرت اور شاد
کی جڑیں مضبوط ہوں گی، سماج اور معاشرے
میں زندگی پھیلے گی، ناجائز اولادوں کا جسم
بڑھے گا۔؟
”کیوں کہ جنس مذہب سے کنارہ کش
ہو گیا۔ جو سماج اور معاشرے سے خود کو آزاد
کر گیا اس کے دل میں کیسا رحم؟ اس کے ذہن
میں کیسی وسعت؟ اس کے کردار اور اطوار میں تو
اخلاص، اخلاق اور معافی چارگی ڈھونڈنے سے
بھی نہیں ملے گی۔ وہ دہریہ دھرم کی ایک جانور
ہوگا، جس کا کوئی مذہب نہیں، کوئی دھرم نہیں
۔۔۔۔۔ سماج، معاشرہ، تہذیب نہیں۔ سراسیمہ
قدرتیں نہیں۔ وہ دھرم پر بیٹے والا جانور ہی
تو رہا۔“

”بیٹا۔ زیادہ نہ بہکو۔ عقل سے کام لو۔
ہوش میں آکر۔ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو توجہ
سمت لے جا کر ذائل نہ کرو۔ آدمی مذہب
سماج، معاشرے، اخلاق، انسانیت کے دائرے
میں رہ کر ہی انسان بن سکتا ہے۔ اپنی زندگی کو
سنوار، گزار سکتا ہے۔ بہت سچی زندگی اور دنیا
کو صحیح ڈھنگ سے سمجھا سکتا ہے۔ تم ابھی
نوجوان ہو۔ عمر بڑی ہے تہنہاری، دنیا دیکھنے
کے لئے۔ اور یہ دنیا۔ بہت بڑی
ہے بیٹا۔ اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہ کرو۔
ہیں تہنہاری اس ناخبر کار زندگی کو اس طرح برتا

ہوتے نہیں دیکھ سکتے گا۔ تہنہاری شادی دُپیا سے
کر کے میں کسی فتنہ اور کسی شرش کو کسی دھرم کے
لوگوں میں اور ہوا نہیں دینا چاہوں گا۔ تم دونوں
ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ دُپیا کا باپ
بھی مان جائے گا، میں بھی گھڑی سہرے کے باں
کہہ دوں گا۔ سب ٹھیک ہے لیکن کیا سماج
میں ہم دونوں کی کوئی قدر رہ جائے گی، بلوی
ہیں گندگی کی طرح خود سے نہ چھڑے گی۔ کون
ہے جو ہمیں اپنے دروازے پر کھڑا کرے گا۔؟
اس طرح دو گھروں کو پر بلا نہ کرو۔ جذبات
میں کے ہونے فیصلے گرا ہی بخش ہوتے ہیں۔ بستی
کی ہی اُچار دیتے ہیں۔ ذہن کا صحیح استعمال کرنا
سیکو۔ تعمیر وہ جس کو کسی اپنا وجود رکھنے والی
شے کو توڑ کر دوبارہ اپنے ڈھنگ سے اُسے تعمیر
کیا جائے۔ دو مذہب میں دُریاں کم کرنے
کے معنی یہ نہیں کسی ایک مذہب کو ضرب پینٹائی
جائے۔ دین اور دھرم کوئی معمولی مسئلہ
نہیں۔ دنیا داری سہل نہیں بیٹا۔ یہ
آزاد کش گاہ ہے۔ قدم قدم پر امتحانات ہیں۔
ان امتحانات میں کامیاب ہونے کی کوشش کرو،
ڈنگ بے سائل کوشش کرو، دل کے ہاتھوں
مجبور ہو کر یہ نہ سمجھو کہ تہنہاری اس چھوٹی خوشی
کے باعث نہ جانے کتنے دلوں کی خوشحالیان ہم
میں بدل جائیں گی۔ ذہن میں پوشیدہ اس شعلہ
کو کوئی موقع نہ دو۔ سو کی بیداری سے غور
کی دنیاں بہہ جاتی ہیں مذہب اور دھرم کے
نام پر۔

میں تہنہارے اپنے مذہب کو چھوڑ
نہیں سکتا۔ یہ دُعا نکلتا، غیر مسلم ہونا اپنے
مذہب کی برابری کے مترادف سمجھا ہوں۔
رام سروپ کے دھرم کی برابری سمجھا ہوں۔ میں
تہنہارے اس کی اجازت بھی نہیں دے سکتا کہ حق اس
بیاد سے حقے، گلی، شہر میں فتنہ پروانہ صراپے
سراٹھائیں، نئے مسائل نظر نہ ہوں۔ ایمان۔

مذہب اور دھرم سماج کے نور سے نکلتے جاتے ہیں۔
ابھی تہنہاری دنیا صرف سوچوں کی حد تک آزاد
ہوئی ہے عملی طور پر نہیں! تہنہارے میں سماج
اور معاشرے نے برابری سے ہونہ نہیں موڑ سکتا۔
آئے تم کو آقا اختیار ہے۔ لیکن میں انسانیت
کہوں گا۔ جو بھی فیصلہ کرنا۔ سوچ چھوڑ
کرنا۔ اللہ تہنہاری خیر خواہی کرے۔ میری
دعا میں ہیں۔ اور دین مٹ چھوٹ چھوٹ
کر رہا ہے۔

نور محمد نے دانستہ خاموشی برتی اور خوشی
سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
سارا دن نور محمد غائب کی دہ۔ دین محمد
اور نصیب اس کا راستہ دیکھتے رہے۔ اب کب
نیک باپتہ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے آپ؟
رات سو رہی ہے۔ اُسے باہر جاکر تلاش
تو کیجئے۔ خدا جانے کون ابھی بیٹا ہے لالال!
نصیب کی سسکی بھر کر لی۔

”ٹھیک ہی تو ہے۔ بیٹا نا سچ،
نا دان ہو تو باپ کو اُسے ڈھونڈنا ہی چاہیے۔
میرا نور محمد بھی تو اچھی نا دان ہے۔“
ابھی اُسے گھر سے اُٹھ کر گھنٹہ بھر نہیں
گزر سکتا کہ نور محمد خاموشی سے گھر میں داخل ہوا۔
نصیب نے فوراً ہی کھانا پکھان دیا اُس نے خاموشی
سے تھوڑا سٹوڑا کھایا اور پیاس پُٹی چارپائی پر
خاموشی سے لیٹ رہا۔

رات کے دین محمد تھکا سا مذہ گھر لوٹا۔
نصیب دروازے پر بیٹھی اس کی راہ تک ایک کچھ
اس نے اشارے سے بیٹے کی آمد کے متعلق بتلایا۔
تو اس نے دل کی دلی میں اپنے رب کا شکر ادا کیا۔
اور خود بھی دروازہ کھول کر چارپائی پر جا بیٹھا۔
اگرچہ دُعا تھا ابھی گھر آچکا تھا، لیکن اس کے
ذہن میں ایک عجیب کش مکش طاری تھی۔ غیب
اس کی سمجھ آ کھوں کے کونوں دُور تھی۔ نور محمد
اور دُپیا کا رشتہ سوچ کر ہی دھماکا کانپ سا

جاتا۔ اس کا دل غم زدہ بیٹھا گیا۔ میں کیسے کھانسی
 ڈالنے کو! تو پا۔ تیری دہن نہیں میں سکتی۔
 کبھی نہیں۔ کبھی نہیں۔!“
 پھر اس نے اس کے سلمہاؤں کی طرف غور
 کرنا شروع کیا اور اس نے اس کا صلی ڈھونڈ نکالا۔
 اسے قدرے اطمینان سا ہوا۔ ٹھیک ہے۔ میں
 کل ہی رام سروپ سے ملوں گا۔ انٹرا انٹرا!
 بات بن جائے گی۔ وہ میرا کھانا مانے گا۔ الٹ۔
 مجھے بہت دے۔ مجھے بہت دے کہ میں اس
 کوئی پُر پُر کیا آئروں۔ اسے دالے سیانک
 طوفان سے لڑنے کا حوصلہ دے! لے میرے
 رب!“

دوسرے دن وہ سویرے ہی رام سروپ
 سے ملا۔ اس نے بھینگی سے اسے تمام حالات
 بتلائے۔ رام سروپ بھی کھلایا سی سوچ رہا
 تھا۔ اس کی برادری، اس کا سماج کبھی بھی
 اس بیاہ کی اجازت نہیں دے گا اور نتیجہ۔
 کوئی نہ کوئی! اپنی بات، بڑا حادثہ ہو جائے گا۔
 سماج دشمن عناصر کو ایک موقع چاہیے۔ ایک
 بدلہ چاہیے فتنہ انگیزی کے لیے۔ لیکن وہ بھی
 مجبور تھا اپنی اکلوتی بیٹی کی مرضی و خوشی کے
 آگے۔ تو پا۔ اس کی سوچ باقی بچی
 کی پہلی اور آخری اولاد تھی، جو مرنے سے پہلے
 نشانی کے طور پر سوئی ہوئی تھی۔

اب جو دین مٹوئے اکوٹا کی بات رکھی
 تو اسے حوصلہ ملا۔ وہ فوراً ہی ایک دوسرے
 کی باتوں سے متعلق ہو گئے۔ اوپر تو مگر کہ
 رام سروپ دل مضبوط کر کے دو ایک ماہ میں
 اپنی برادری میں کوئی اچھا لڑکا تلاش کر کے دیا
 کا بیاہ کر دے۔ بھلا ہی اس سے دوا کا دل ڈنکے۔

اور وہ اپنے باپ کو بے رحم کچے گھس سے
 نالام ہو جائے۔ لیکن آنے والے ایک طوفان
 کو میں اس طرح دھکا دے سکتا ہوں۔
 روز و شب تیری سے گزر رہے تھے۔

کسی قسم کی کوئی کش مکش بیچ میں نہ آئی۔ نور محمد نے
 بھی دوبارہ اس مسئلے میں گھر میں کوئی بات نہ
 کی۔ اس کی خاموشی تو اس قدر گہری ہو چکی تھی کہ
 کبھی کبھی دین محمد کا دل بیٹھے لگتا۔ تب میں۔
 یہ خاموشی کسی طوفان کی آمد کا اعلان تو نہیں۔
 اس کا دل کٹ کٹ کر رہ جاتا، اس کی خاموشی
 اور تنہائی پیندی سے۔ لیکن وہ بھی تو مجبور
 تھا۔ آخر وہ کس طرح اجازت دے دے رہا
 ہے بیاہ جانے کو۔ اس نے بھی ٹھان لیا
 بیٹے کے ہر ڈکھ، تکلیف اور پریشانی کو برداشت
 کرے گا۔ لیکن اس بیاہ پر اُسے کتنے دالے۔
 کسی فساد۔ کسی فتنہ کو نہیں برداشت کر سکے
 گا۔ اس کی فضا کتنی دیر پا ہے۔ وہ خراب
 جانتا ہے۔ وہ بھی آج کل اس دور میں جب
 لوگ دھرم مذہب کی کچھ بھی آگے دن دھرم
 کے نام پر لوٹ مار۔ دنگ فساد۔
 خون کی بولی کھیلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ ایک۔
 دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔

ابھی پندرہ یوم بھی نہیں گزرے تھے
 کہ گلی محلے میں اس بات کا چرچا ہونے لگا۔
 ”رام سروپ کی لڑکی روپا کا بیاہ ہفتہ بھر بعد
 جڈیش سلوٹ کے لڑکے موہن لال سے ہو رہا ہے۔
 رام سروپ بڑی شان اور دھوم دھام سے
 یہ لگن کر رہا ہے۔ ساری برادری اور گلی بھر
 کو اچھی سے دعوت دے رکھی ہے انہوں نے۔
 ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ اکلوتی بیٹی جو
 ہے۔ سارے دل کے ارمان نکالیں گے۔
 آخر کی بات کی کئی بھی تو نہیں ہے بھگوان کی دیا
 سے!“

نور محمد قومیے پاگل ہوا جا رہا تھا ان
 باتوں سے۔ اب اس نے گھر سے باہر نکلتا ہی
 بند کر دیا تھا۔ برگر ٹی گم گم تنہا گھر کی ایک
 کونڈی میں پڑا رہتا۔ دن میں ایک آدھ بار
 اس کی قومی دوست ریشی چندر اور اداریس

آجاتے۔ ان سے کچھ مل بیٹھا۔ ہل جال لیتا۔
 وردہ اس نے نو ماں باپ سے موتہ ہی موڑ رکھا
 تھا۔

ایک دن چملا بے پردہ ریشی اور اداریس
 کو روک کر کہا۔ ”میرے نور محمد کو سمجھاؤ گھر
 بچے۔ میں اس کا دشمن تو نہیں۔ یہ کیسا
 پاگل بن ہے اس کا؟ دیکھو۔ پندرہ میں
 روز ہو گئے ہیں کتنے وہ مرا جا رہا ہے اس نے
 بھی کوئی خبر لی اس کی۔ بلکہ باپ کی فری
 کے آگے سر جھکا دیا۔ اپنے دھرم میں بیاہ
 کر رہی ہے۔ اتنا تو سمجھاؤ تم لوگ مٹے۔“
 ریشی اور اداریس نے اس کی دھماکے
 بندھائی۔ ”ٹھیک ہے بابا ہم براہ راست
 سمجھا رہے ہیں۔ آپ نے فکر نہیں۔ ہم پتی
 طرح کرکٹ کر رہے ہیں کہ وہ آپ کی بات دل
 لے۔ اپنی جھڑپ دے!“

”ان، میرے بچے! اس میں ہم سب کی
 کھلائی ہے۔ اور وہ جہاں کہے ہیں جڑا اس کا
 بیاہ کر دوں گا! لیکن وہ کس طرح روپا کو بھول
 جائے، اس سب کے پیچھے نہ کھائے!“

”روپا کا بیاہ ہو رہا ہے۔ اب اس کی خان
 کرنا بھی گناہ ہے اس کے۔ سمجھاؤ تم لوگ
 اُسے۔“ جوں جوں روپا کے بیاہ کی آواز آئے
 برستی جا رہی تھی دین محمد ہی طوے اٹھتا جا رہا
 تھا۔ اس نے اپنے رب کے حضور سر کرکڑیاں
 مانگیں کہ روپا کا بیاہ اس دن دشمن سے ہو جائے۔
 چار دن بیت چکے تھے کہ اچانک اداریس نے
 آخر دین محمد کے کالوں میں سے ہونے لگے ہیں
 کہا۔ ”بابا، نور محمد کے دل میں نہ جانے کیلئے
 کل کبہ رہا تھا کہ اس نے شادی نہیں ہونے دوں گا۔
 کبھی کہتا ہے کہ میں بھروسہ مند نہیں ہوں روپا
 کو! خدا کرے کہ جاؤں گا۔ کبھی کہتا ہے کہ
 میں موہن لال سے نہ بٹ لوں گا۔“ رام سروپ
 کی برادری میں روپا کا دعویٰ کر کے۔ اپنی محبت

کا اظہار کر کے اس کی ناک کاٹ لوں گا۔" بابا، مجھے تو چراگڑ لگ رہا ہے۔ خدا جانے وہ کیا کرنے والا ہے۔ وہ ہاتھوں کی طرح حرکتیں کر رہا ہے۔ بابا۔ کچھ کیجئے۔ وہ اب یہیں بھی دھنکا کر گرے گا۔ کتنے لگا ہے۔ ہم سمجھاتے ہیں تو نہیں بڑول اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔ اس کی ذرا سی منداور غصہ کے باعث ابھی کچھ ہوش نہ جانے۔ کسی نے رام سرورپ سے بھی اہل باتوں کی چغلی کر رکھی ہے؟

"کہاں ہے وہ کمینہ؟" دین مہرنے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔

"وہ دیش چند کے گھر میں بیٹھا خود کو الگ ایک کمرے میں بند کر کے۔ ابھی آپ اسے کچھ نہ کیجئے۔ ابھی وہ غصے میں کھرا بیٹھا ہے۔ کہیں آپ سے بھی کوئی بدتمیزی نہ کر بیٹھے میری مانند۔ آپ۔" دین مہرنے ہلے ضبط سے کام لیا۔ ادھر اس ٹھیک کی کتاب ہے، ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

اس کے بعد دور دراز درگزر گئے۔ نورجوان کی طرف سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس اہل لادنی رہ رہ گیا تھا۔ کسی طرح بیاہ کا دل نہ بھی اپنے شائق سے گز رہا تھا، دین مہرنہ رہ کر دھانیں مانگ رہا تھا۔ شام ڈھلنے ڈھلنے نورجوان کی طرف پھینکا کرتا ہوا کمرے میں آیا اور اس نے جیس جیس کمرے میں گھرے کہا۔ تم کیسے اب ہو۔ تم باپ نہیں۔ غلام ہو۔ تمہارے سینے میں دل نہیں۔ بیٹے کی محبت اس کی خوشیوں کا خیال نہیں۔ پہلے تو روپا سے میرا رشتہ توڑا، اب اس کے بیاہ میں بھی کل تم جا رہے ہو۔ وہ بھی مومن لال کی برات میں اپنی جیسی نہ کر۔ کیا یہی ایک جیسی ہے جس پر مومن لال کی برات سجا سکتی ہے؟ میں صاف صاف کہتا ہوں کہ یہ نیکی نہیں جانے گی۔ اس پر برات نہیں سجے گی۔ تم بھی نہیں جانے گے۔ کان کھول کر سن لو۔ مجھے اتنا مجبور نہ کرو۔ اتنے غلام نہ جو۔ ورنہ آگے کچھ ہاتھوں کا ذمہ دار ہیں

نہیں ہوں گا۔" اس نے صریح صریح کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں سوچ کر برات میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن روپا۔ نورجوان کے یہاں تم نہیں جاؤ گے۔"

"میں نے جو کہہ دیا، نورجوان لگا رہا۔"

"بیٹا۔ میرے دل۔ اب کیا کہنا تھے۔ میں بہت دیکھی ہوں۔ سنی سکتے ہو تو سن لو آج تم بھی۔" اپنی بیٹی کے بیاہ میں باپ زندہ ہونے ہوئے کیوں نہیں شرکت کر سکتا؟ ہاں۔ میں۔ میں روپا کا باپ ہوں۔ اسی طرح جس طرح تمہاری نگول میں میرا خون ڈھڑکا ہے۔ اسی رشتے کی طرح۔ روپا۔ میرا بیٹن ہے۔ جب تک میں بھی تمہاری طرح مذہب کا دشمن تھا، سماج اور معاشرے کی گندگی تھا۔ میرے خیالات بھی ایسے ہی تھے اور ایک ہندو مسلم فساد میں سنے روپا کی ماں کے ساتھ اپنا مونہہ کالا کیا تھا۔ سن رہے تم؟ میں نے کھنکھنایا۔ اس نے اس عورت کی عصمت دری کی تھی کہ وہ ایک نورجوان ہندو عورت تھی۔ اس وقت میں بھی تمہارا طرح مذہب بیزار ذہنیت رکھتا تھا۔ لیکن مذہب اور دھرم کے نام پر خون کی ہویاں کیلتا تھا۔ آج میرے اندر مذہب کی سچائی آگئی ہے تو۔ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔

سماج کا، معاشرے کا، دین کا، دھرم کا، اپنے خدا کا مجرم۔ مذہب کی سچائی کو سمجھو۔ دھرم کی سچائی کو سمجھو۔ سارے ہند۔ سارے نفاق مٹ جائیں گے۔

کیا اب بھی تو کہتا ہے کہ روپا سے بیاہ کرے گا، جس کی نگول میں میرا خون دوڑ رہا ہے۔ رام سرورپ جاتا تھا کہ اس میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی بیٹی کی کوکھ سے جنم لینے والی ایک عصمہ بھی کو بیلا پوسا۔ باپ کا بیاہ دیا۔ بول بیٹا۔ کا تو اب بھی ہے۔ میں غلام ہوں۔ تیرا دشمن ہوں۔ اور روپا کی شادی میں شریک نہ ہوں؟

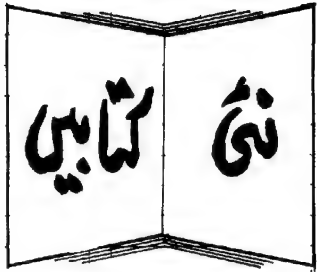
"یہ تو ایک چٹائی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا تو یہی جاتی ہے کہ تو ایک مسلمان۔" روپا ہندو تیری منہ۔ تیری ناکاٹ ڈانٹنے کی وجہ۔ کیا اس کے برادر کے لوگ خاموش بیٹھے رہیں گے۔ کیا سارا عہد، سارا شرف سارا فخر و راز فساد کی آگ میں نہیں جھلس جائے گا۔؟ کیا تو کچھ بھی یہی جانتا ہے کہ تیری خواہش۔ تیری خوشی۔ لپسی ہونے کے عذاب میں پھر کوئی ہشکار نہ ہو۔ پھر کوئی دین مجھ کی سیتا کی عصمت سے کیلے۔ پھر خون کی ندیاں بہائی جائیں۔ انسانیت۔ سچائی چارگی کا خون کیا جائے، گھر گھر آگ لگے۔ مسعود بچوں کا قتل ہو۔ سہاگین بیوہ ہوں۔

نہیں۔ نہیں۔ بیٹا۔ جس طرح مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ تم کسی ہندو لڑکی سے رشتہ ڈی کرو۔ جس طرح دھرم اجازت نہیں دیتا کہ بیاہ کچھ مسلمان سے ہو۔ اسی طرح۔ اجازت بھی نہیں دیتا کہ گھر گھر آگ لگائی جائے، خون کی ندیاں بہائی جائیں، عصمت و عزت پر حملہ کیا جائے۔ مذہب یہ نہیں سہکتا۔

دھرم یہ تعلیم نہیں دیتا۔ بیٹا۔ سچے مذہبی۔ سچے دھرم کے پان کر لے ولے بن جاؤ تو تم ہی میں سچائی، انسانیت، اخلاق سب ہی آتے گا۔

یہ گھر گھر کی آگ ہمیشہ کسے بجھ جائے گی۔ سدا کے لئے ٹھنڈی ہو جائے گی یہ آگ۔"





اردو کے ادبی معرکے

مصنف: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

ناشر: ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، رام کرشن شاہ پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

قیمت:

۱ اردو شاعری کی تاریخی کتب یا تذکروں میں شعراء کو رام کے درمیان معرکہ آرائیوں اور نزاحات پر مبنی حریفانہ سرگرمیوں کو اگرچہ بہ وضاحت "ادبی معرکہ" کہا گیا ہے، لیکن جب بھی ادیب نے بھی ان کا ذکر کیا (اور یہ ذکر ہمیں ہوا ہی کتنا ہے) اس میں ان کی "ادبیت" کے بجائے ذاتی اور سیاسی جھگڑا، ایک دوسرے پر اتہام طرازی اور ان کے لواحقین کے غلبہ پڑنے کی وہ تصویریں آتا رہی ہیں کہ ان معرکوں کے پس پشت فی الحقیقت فریقین کی جو تعقیدی تعبیرات اور ادبی مسائل پر غور و فکر کا جو شعور کارفرما تھا وہ ایسا دیکھ آج تک اسے باہر کی روشنی اور محکم نفعانہ تعبیر نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "ادبی معرکوں" کی ترکیب شعور کے ذاتی معرکوں اور ان کی صورت و شخصیت کی مضحکہ خیز، سنج اور نفرت انگیز تصویر کشائی ہے خواہ وہ مصنفی وارث کے معرکے ہوں یا پیش و دوسرے یا غالب و ذوق کے۔ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر کی کتاب "اردو کے ادبی معرکے" اس لحاظ سے نہایت اہم تحقیقی کارنامہ ہے کہ ان کی تلاش کا وقتی اور ماضی و مستقبل تعقیدی تعبیرات سے پہلے بلا اس کا قابل اعتنا اور درجہ حرارت کے معنی خیز موضوع کو مقرر کیا اور اس کی بھرپور مقصدیت و جامعیت کو اجاگر کیا اور یہ بات پہلی طرح واضح کی کہ شاعروں کے مابین اس جھگڑا کی ادبی و تحقیقی قدر و قیمت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور اسی نقطہ نظر سے ہمیں اس کا محاکمہ کرنا چاہئے۔ اس زاویہ سے شعراء کے معرکوں کا جائزہ لیا جائے تو یعقوب عامر کی یہ رائے یقیناً درست ہے۔

۲ اصل میں موافق و مخالف فریقین کے سامنے ادب کی وہ بنیادی تصور تھا جو ان مناقشوں میں زیر بحث آیا ہے۔ ان مباحثوں نے ہر دور میں فکر و خیال کی سطح پر عمل اور رد عمل کے گہرے نقوش ثبت کئے ہیں اور ان سے نئی تحریکیں وجود میں آئی ہیں۔

ادبی معرکوں کا جائزہ لینے کے سلسلے میں یہ ایک صحت مندانہ بنیادی زاویہ ہے اور یہ کہ کثرت ادب کی معرکہ آرائی کو محض ذاتیات پر کھینچ کر سمجھانے کی کوشش حرکت ہی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

۳ یہ وہ بنیادی زاویہ نظر ہے جو ان اہم تحقیقی کتاب میں شروع سے آخر تک ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسی روشنی میں ان تمام ادبی معرکوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو انسانی و مصنفی کے زمانے سے لے کر کثرت انفرادی انسان و طبع کے زمانے تک بطور پیر ہوئے۔

ڈاکٹر عامر کی کتاب اس لحاظ سے بھی معتبر ہے اور استناد کا درجہ رکھتی ہے کہ انہوں نے مختلف معرکوں کی تمام تفصیلی جزئیات کو اصل مآخذوں کی مدد سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور انہوں نے تحقیق کی سب سے اولیٰ اور بنیادی شرط کی پابندی کی ہے۔ ثانوی مآخذ پر انہوں نے قطعی بھروسہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر یعقوب نے اپنی تحقیق کی بساط اصل مآخذوں پر رکھی اور اس راہ میں انہیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ اس کتاب کو پڑھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مصنفی اور اشعار اور ان کے زمانے کے دیگر شعراء کے درمیان ادبی معرکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں سات ادبی معرکے شامل ہیں۔ دوسرے باب میں عین معرکوں کا ذکر ہے جن میں حرارت، دلوا، تاج طاہر اور انیس و دوسرے معرکوں کا مفصل احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرا باب تنہا نصیر و ذوق کے معرکے کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں غالب و ذوق، غالب و حامیان قلیل، غالب و حامیان بہان کا طبع و فکر کیا گیا ہے۔ کتاب کا آخری باب نثر و ادبی گفتگو اور شاعرانہ لسان و طبع کے درمیان ہونے والے معرکوں پر محیط ہے۔

حاصل کتاب، ایمری نظریں جو تھا باب سے جس میں غالب کے ادبی معرکوں کو صحیح منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جان تک میں سمجھتا ہوں غالب کے ادبی معرکوں کو اس شرع و ربط کے ساتھ پہلی بار سامنے لایا گیا ہے۔

غالب کے تمام ادبی معرکوں کا جائزہ لینے میں ڈاکٹر یعقوب نے جس دیدہ و زری، معائن کی چھان بھنگ اور ان کے اصل سماجی و نفسیاتی حرکات کو گزرتہ میں لینے کی جو کوشش کی ہے، اس کے لحاظ سے اس کتاب کا یہ باب غالبیات اور مطالعاتِ غالب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

دکٹر معین نقوی کی یہ کتاب جہاں ایک طرف ادبی معرکوں کی معنویت، اہمیت، شہرت، حد تک نہیں ان کی اہمیت اور ان کے محرکات کو سمجھنے کا ایک جلیبوی ذریعہ ہے۔ وہ ان اشعار سے غالب تک کے زمانے کے تمام ادبی معرکوں کی ایک اہم اور مستند تاریخ بھی ہے۔ کتاب کی سیر ذوق پسندی، اسیم ڈاکٹر موصوف کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کے آئینے کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہمارے ادبی شعری روایت کے ایک اہم گوشے کی کھر پور نشاندہی ہوئی ہے اور اس وجہ سے یہ تصنیف معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے۔

شمیم احمد

میرے خیال میں

مصنف:- پروفیسر نظیر صدیقی (پاکستان)
ناشر: مولودین پبلشنگ ہاؤس، گولڈ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی
قیمت:- اڑیس روپے

”مرد و نظیر“ ایک نثر میں بیچ گئی ہے، جہاں اس کے حدود و احوال واضح ہوئے ہیں۔ اسے اس نثر کی نگاہ سے دیکھنے والے اہم ناموں میں سے ایک نام نظیر صدیقی کا ہے۔ صدیقی صاحب نے اردو تنقید میں مطلقاً ذاتی اور خصوصی طور پر بھارتی روش اور دوروں سے نجات دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی تنقید معروضی اور غیر شخصی ہونے کی مدد ہے۔ اور یہ دعویٰ غلط نہیں۔ ”مرد و نظیر“ آج بھی ایسے نقادوں کی کمی نہیں، جن کا ایک ایک جملہ مغربی نقادوں کے اقوال، مضامین، معانی کے سہارے کھڑا ہے۔ نظیر صدیقی کو ایسے نقادوں سے کوئی علاقہ نہیں وہ مغرب کے انکار کی نفی نہیں کرتے۔ لیکن ان کے تابع ہو کر صرف ذہن کی حامل تحقیقات کو ان کے معاشرے سے الگ کر کے دیکھنے کی ”سٹی“ بیٹھ ”میں نہیں کرتے۔

”میرے خیال میں“ گہرا معنائیں پر مشتمل ہے۔ یہ معنائیں نظیر صدیقی کی بصیرت و بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ ان کا ایک وصف یہ ہے کہ ان پر مصنف کی اپنی سوچ اور اس سوچ سے برآمد شدہ نتائج کی بھرپور چھاپ ہے۔ مصنف خود کہیں انکڑے نہ ہی اس کا کلمہ نہیں دیا ہے۔ جبکہ اس نے اپنی ذات اور جو کچھ کچھ کا شہرت فرام کیا ہے۔ جو میرے کے پہلے معنوں ”اظہار و اطلاع“ میں وہ لکھا ہے۔ ”جسے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ہر موضوع پر شاعری یا ادب کا نثری مادہ صرف و شغاف ہونا ممکن نہیں، لیکن جس قسم کا دبیر ابہام جدید شاعری میں پایا جاتا ہے وہ اپنا کئی معقول جواز نہیں رکھتا۔“ صدیقی صاحب نے اپنا فیصلہ لوں ہی نہیں دے دیا۔ انہوں نے آج کی شاعری، مصنفی اور دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ ادب و فن کے قدیم ذخیرے کو بھی کھنگالا ہے اور اپنے وسیلے مطالعے سے

وہ نظر حاصل کی ہے جو انہیں پورے میں نظر اور وسیلے ترساق مسابین اپنا فیصلہ دینے کا مجاز بناتی ہے۔ یہی گذری انہیں جدید شاعری کے متعلق اپنی رائے دینے کے اہل بناتی ہے۔ ”میں اردو کی جدید شاعری اور جدید ادب کو کس مغرب کی نقالی سے تہمید کرنے کے تیار نہیں۔ اس میں نقالی بھی ہے اور استفادہ بھی۔ دونوں کے فرق کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ اردو کے جدید شعرو ادب میں نقالی زیادہ ہے اور استفادہ کم۔۔۔“ اردو نثر کے بارے میں رقم طراز ہیں:- ”اردو میں جدید ترین نثر کے بعض لوگ ایسی نثر لکھنے لگے ہیں جو اپنی پیچیدگی اور عدم وضاحت کے اعتبار سے جدید شاعری سے کچھ کم پریشان پریشان مگر نہیں ہے۔ اس قسم کی نثر لکھنے میں سب سے نمایاں کیفیت اتنا حال حال کی ہے۔ جنہوں نے دلم فاکٹر کو اپنا نمونہ بنا رکھا ہے۔ ایک ناول نگار کی حیثیت سے عالمی ادب میں فاکٹر کی عظمت مسلم ہے، لیکن اس کے اسلوب کو مثال اسلوب کی مثال سمجھنا عظمت کی اندھی پرستش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔“ اسی طرح انہوں نے اقبال کے متعلق لکھا ہے:- ”مثالی معاشرے کے تصور اقبال پیش کریں یا کوئی اور، وہ اس نافع اعلیٰ بلکہ عقل دشمن انسانوں کی دنیا میں جتنی جاگتی حقیقت ہی ہی نہیں سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے جب تک کسی مثال معاشرے کی بنیاد کسی مذہب پر ہوگی وہ اخلاقی دل چاہی کا مرکز نہیں بن سکتا۔ مختلف مذاہب انسانوں کو ایک مرکز پر لانے کی واحد صورت غالباً یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مشترکہ اخلاقی اصولوں کو نمایاں کر کے لوگوں کو انہیں عمل میں لانے کی ترغیب دی جائے۔“

ان مثالوں سے یہ امر واضح ہے کہ پروفیسر نظیر صدیقی کے پاس ذہانت کی روشنی ہے جو ان کی انجمن ہے۔ ان کے پاس نظر کی ایسی وسعت اور کشادگی ہے جو ان کی تنقید کو معروضی بناتی چلی جاتی ہے کیوں کہ وہ اس معنوں پر عمل پیر ہیں کہ تنقید راست گوئی کا دوسرا نام ہے اور یہ گروہ بندی اور جانب داری کا زہر کی گزندہ نہیں رہ سکتی۔ آج جب کہ جدیدیت کے نام نہاد پرستار، بیشتر نقاد اور افسانہ نگاروں تک مغرب کے تنقیدی رویوں کی اندھی تقلید کرنے کا بوجھ چار کھم کھلا کرتے ہیں نظیر صدیقی کا یہ مجموعہ معنائیں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان معنائیں کے منظر کے ساتھ ساتھ اس زبان و بیان کی بھی توجہ ضروری ہے، جس نے مصنف کی تحریر کے اوصاف میں مزید اضافہ کیا۔ مجموعے میں شامل معنائیں میں سے کچھ ایک مختصراً: ”اردو نثر لکھو۔“ ”اردو تنقید ہی اخلاقیات کی ضرورت“ ”ماضی سے مستقبل تک“ ”نیا ذہنی رویہ“ ”فرانز گورکھ پوری“ ”حن عسکری“

کنور حسین

قصہ علم

(ٹونک کے کتب خانے اور ان کے نوادر)

مرتب : (عاجزادہ) شوکت علی خاں

ناشر : عریک اینڈ پرنٹین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک (راجستھان)
قیمت : چالیس روپے۔

نے استفادہ کیا۔ یہاں کے اصحاب علم میں مولانا محمد سورتی، مولانا محمد رمضان، مولانا محمود الحسن صاحب (صاحبِ تعلیم)، مولانا بکات احمد صاحب (معلمِ کلام، غلط، منطق اور طب کے فاضل، اہل، جن سے علامہ اقبال نے بھی استفادہ کیا) جیسے بزرگوں کے نام شامل ہیں۔

اس علم پر داخل میں مدرس، کتب خانے اور خطا جتنے بھی چیزیں ملتی تھیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ٹونک کے کتب خانوں اور ان کے نوادر مختلف مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں مولانا سید غلام الحسن برکاتی کے مضمون، ایک خواب جو حقیقت بنا، اور مرتب کے مقدمہ کے علاوہ جن عنوانات پر مضمون شامل کیے گئے ہیں وہ ہیں :

- ۱۱) کتب خانہ ٹونک کے بعض مخطوطات (مولوی ابوالطیب عبدالرشید صاحب)،
- ۱۲) ٹونک کے کتب خانے اور ان کے نوادر (۱۳۶۱) فی تاریخ کے نوادر، ٹونک کے تاریخ مخطوطات (تین سطحوں میں)، ۵۱، ٹونک کے نوادر تاریخی مخطوطات (اکبر کے ایک نورنگ ایک نادر تحریر، ۶۱)، جہانگیر کے دور کا ایک باب مخطوط (۱۶۲۶) تمام مضامین عاجزادہ شوکت علی خاں کے تصنیف کیے ہیں،
- ۱۷) ٹونک کے دو قدیم کتب خانے، (۸۶) اور قبل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے عربی و فارسی ریسرچ ڈائریکٹریٹک (۸۷) اور مضامین مولانا سید غلام الحسن برکاتی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ۹۱، ٹونک کے عاجزادگان کے کتب خانے (عاجزادہ سید احمد صاحب)، ۱۱۵، ٹونک کے علماء اور مدارس کے کتب خانے (۱۱) کتب خانہ غازیہ ٹونک کے نوادر مخطوطات (۱۲) ۱۲۱، فی میرٹ اور ٹونک (۱۲) ۱۲۱، تمام مضامین کے مصنف مولوی حکیم محمد عمران خان صاحب ہیں اور (۱۳) کتب خانہ ذیل ملے:
- ٹونک کے چند نوادر (مولانا حکیم محمد احمد صاحب برکاتی)۔

مضامین سب ہی اچھے ہیں، لیکن بعض مضامین میں غیر ضروری ترمیم و حذف سے کام لیا گیا ہے جن سے اس کتاب کے قاری کو شکلی رہ جاتی ہے، بلکہ بعض چیزیں ہوجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر مولوی عمران صاحب کے مضمون ٹونک کے علماء اور مدارس کے کتب خانے کی قسط اول میں، سے مدارس کی تحصیل کو حذف کر کے مضمون کو مکمل بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر مضامین میں ان مضامین کا حوالہ دیا گیا ہے جو پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ بہترین ہوتا ان رسائل کے نمبر اور تاریخ اشاعت کے حوالے دینے کے ساتھ اس کتاب کا براہ راست حوالہ دینا دے دیا جاتا تو قاری بہا ہما اور پریشانی سے بچ جاتا۔ یہاں ان باتوں کا ترتیب کے وقت لحاظ کیا جاسکتا تھا۔ اس سے کہ اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو جائے گی۔ کتاب اچھی ہے اور اہل علم اس کا فیہر مقدمہ کریں گے۔

(اختر اوس)

اکتوبر ۱۹۸۸ء

آزادی ہند سے قبل ٹونک کی ریاست راجپوتانہ کے علاقہ میں ان جوان مرد و عورتوں کی بہت وجوہات اور شجاعت کی علامت تھی جنہوں نے اپنی تلوار کی آہ اور نیزے کے اٹنی سے نہ صرف مرہٹوں، مدھیہ بجات اور راجپوتانہ میں بلکہ انگریزوں سے بھی اپنا لٹا ہوا سوال اٹھا اور جس کے نتیجے میں بالآخر ریاست ندی کے کنارے یہ ریاست وجود میں آئی جس کی قلمرو میں صرف راجپوتانہ کا تقریباً علاقہ ہی نہ تھا بلکہ مدھیہ بجات کے بھی بعض حصے تھے۔ اس ریاست کے بانی نواب امیر الدولہ کے پاس تلوار، علم اور کولر ہمسے کو تھا۔ انھوں نے اس نیزہ ریاست کو راجپوتانہ کی خطری پر شجاع سادگی، بھائی کی ہوا، ہمتی مردانوں کی بے ہنگام جوش و ہوش اور پوری کی لطیف ثقافت کا شانی نمونہ بنانے کی کوشش کی۔ ان کے جانشین نواب وزیر الدولہ کے پاس علم، تیرہ اور میاں دروئی تھی جس نے اس ریاست کو فروغ و استحکام عطا تیسرے فرمانروا نواب حسین الدولہ جو مل خاں خالص جاہد قسم کے آدمی تھے، وہ نہ صرف خود مشہور قسم کے عالم با علم تھے بلکہ پوری ریاست کو اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی انگریز دشمنی میں بھی شاید کوئی نواب یا راجہ ان کے زمانہ میں ان کا ہمسر رہا ہو۔ ان کی انگریزی ہی نے انھیں محروم کر دیا اور ریاست بددھنی۔ آج سے ایک صدی قبل توہم علوم و فنون پر مشتمل ہزاروں مخطوطات اور نوادرات کا ایک کتب خانہ اپنی نواب محمد علی خاں نے قائم کیا تھا۔ نواب صاحب محروم کے کہنے سے ریاست میں جلا وطن کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے قومی ذخیرہ مخطوطات و نوادرات کا ایک حصہ اس علم دوست انسان کے ساتھ بنایا گیا۔ بعد میں اس کو مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے کلکتہ منتقل کیا گیا لیکن اس کے باوجود مذکورہ بالا کتب خانہ کا بڑا حصہ ٹونک ہی میں رہا اور سید ذیشان آبادیہ ریویو میں محفوظ رکھا گیا۔ برسوں کی محنت اور جان نثاری، لگ و دو اور سروری کے بعد حکومت ہند نے اسے قومی اہمیت کا اعتراف قرار دیا اور آج عریک اینڈ پرنٹین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک (راجستھان) کے اہم سے اہل علم کی توجہ اور گرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

زیرِ نظر کتاب مذکورہ انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی پروگرام کی ایک اہم کڑی ہے۔ کتاب کے جاننے سے قبل یہ بات غیر مناسب نہ ہوگی اگر اس بات کا اعتراف بھی کر لیا جائے کہ ٹونک میں علم و ادب کی روایت صرف نوابوں تک ہی محدود رہی، بلکہ ان کی سرپرستی میں وہ علم و فنون سے اپنے ذاتی شغف میں استیلازی رکھتے تھے۔ دارالعلوم فیصلہ، ٹونک ہندوستان کے جنی مدرس میں اپنے نانا بنگامنی کی بنا پر ہماری مذہبی تعلیم کی تاریخ میں سترہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مدرس میں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ مغربی ایشیا اور وسط ایشیا کے سکھوں و مسلم نوجوان آئے اور انھوں

لیورن (انٹل)

صنف: بلراج ورمہ

اشعار: تناظر علی کینئر، نئی دہلی ۳

قیمت: ۲۵ روپے (پچیس روپے)

"لیورن" بلراج ورمہ کے کافانوں کا مجموعہ ہے۔

بلراج ورمہ امدد کے انسانہ نگاروں کی اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں جو انسانے میں، کہانی پر اور مقصدیت کے قائل ہوتے ہیں۔ یہ انسانیت ان کے ہاں واقعات کے تسلسل اور تفصیلی بیان سے ابھرتی ہے جو کہیں کہیں فیوضی اور پرمعنی محسوس ہونے لگتی ہے۔ انہوں نے اپنی ڈگری میں دلی نافرمانی کے طور پر جدید ہونے کی کوشش میں یہ سعی اور ہم سفر کیا انسانہ کہنے کی ضد کی اور یہی پیچھے چھپانے کے شوق میں ہر پرچہ کی پالیسی سے محروم کیا۔ وہ اپنے راستہ پر آہستہ روی سے گامزن نظر آتے ہیں۔

ان کے انسانوں کا غیر انسان دوستی، محبت، اخلاقیات، سہاٹی چارہ، مذہبی ہم آہنگی، جذباتیت سے بلند ہو کر سوچنے لگنے، غلام وانا انسانیت کے خلاف بغاوت کے جذبے سے اٹھتا ہے۔ کہیں کہیں ان انسانہ نگاری، جذباتیت اور مقصدیت سے محروم ہوتا نظر آتا ہے۔ ان کا اسلامی پہلو اور تفصیلی انداز بیان کسی انفرادیت کی نشاندہی نہیں کرتا۔

وہ مقالات کا المیہ ہو (مجھے بڑا اڑے گئے) کسی چند رسانی عورت کی محبت اور انسانی کہانی ہو (اب یہاں کوئی نہیں آئے گا) جذبہ حریت اور ایک دوسرے کو سمجھنے اور برداشت کرنے کا احساس ہو (بڑا ہے درد کا رشتہ) ذہنی ہم آہنگی، مذہب و ملت سے اوپر اٹھ کر سناٹا تھا سنے کی خواہش (ایورن) (کفارہ) — یہ کہانیاں بنیادی طور پر اس اعلیٰ اور ارفع انسانی جذبہ کے گرد گھومتی ہیں جسے محبت کہتے ہیں۔ انسانی کی طوالت شاید مصنف کو ذہنی آسودگی نہ دیتی ہے۔ یہ کہانیاں ایک خاص حلقہ میں دل جیسے سے پڑھی جائیں گی۔

شرون کار ورمہ

ادبی تناظر (سہ ماہی جریدہ)

ناشر: تناظر علی کینئر، نئی دہلی ۳

ترتیب: بلراج ورمہ

قیمت: بارہ روپے (۱۲ روپے)

ادبی تناظر، جس کے پہلے دو نمبر غیر منظم نام پر آکر ادبی حلقوں میں پسند کیے جاتے ہیں، اب نام کی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ منظم نام پر آیا ہے۔ حریت کو ادب و دوسروں سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے ان خصوصیات اور جوہر پرانے کی آمد پر تاملان کرنا نہیں بلکہ سہارا نہیں دیا اور اسے دیر اور

دور تک چلانے میں سادگی کرتا۔

جمن، جولائی، اگست، ۱۹۸۱ء کا یہ شمارہ اردو ادب کے کئی اہم

ناموں کے ساتھ آیا ہے۔ عارف علیہ السلام کا مقالہ ان کی ذہانت،

اختصار پسندی اور تجزیہ فراہمی کا اچھا نمونہ ہے۔ وارث طوی کا مضمون

امریکی ناول اور ڈرامہ نگاروں کی ذہنی مشکلات کی طرف اشارہ کرتا

ہے۔ اس شمارے میں آٹھ افسانے ہیں۔ اس کی حالت کو کہا جاسکتا ہے

کہ انسانی حشر و زور دار ہے۔ مرتبہ نے ہر مکتبہ فکر و خیال کو ہر چ میں

مناسب جگہ دی ہے۔ یہ ان کی فراخ دلی اور اردو ادب سے محبت

کا واضح ثبوت ہے۔

معتز ظفر، معتز کے مقابلے میں غیر توہمی کا شمار ہو گیا۔ گو بلراج کوئی

کی چار خوب صورت نظریوں نے اس کی تلافی کر دی ہے اور وہ اپنے مخصوص،

سفریہ، دیہی اور مٹی کاوانہ انداز کی وجہ سے سب معمولی فاری کی توجہ اپنی

کی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ یہ حصہ تاری کے ذہن میں تشنگی کا احساس

مجھڑ جاتا ہے لیکن غیر فحاشی کی غیر معمولی دیکھتی ہے۔

ادبی تناظر کا اداسی اور کجی و سنجہ ہونا چاہیے۔

شرون کار ورمہ

اب جن کے دیکھنے کو...

مصنف: محترمہ انیس قدرانی

قیمت: بارہ روپے ۵۰ پیسے

ناشر: مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

محترمہ انیس قدرانی کا تعلق ایک ایسے قوم پرست خاندان سے ہے جس

نے نہ صرف سیاست میں ہی نمایاں حصہ لیا ہے بلکہ علم و ادب کی خدمت میں

ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں سیاست و ادب کی حد و تحصیلات کو نہایت قریب سے

دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اور وہ ان سے بے حد متاثر بھی ہوئی ہیں۔ نتیجہ کے طور

پر انہوں نے تیرہ شخصیتوں پر مضامین لکھ کر انہیں اپنا خراج عقیدت پیش

کیا ہے۔ ان شخصیتوں میں ان کے اپنے والد مرحوم ولایت علی مہتوں، رفیع احمد

قدرانی، مولانا محمد علی، شفیق الرحمن قدرانی، قدسیہ زیدی، ڈاکٹر عابد حسین،

جواہر لال نہرو، مردولاسا مہتائی، ڈاکٹر حفیظ رفیع شامی ہیں۔

ان مضامین کا لکھنا بچہ ان بزرگوں کے لئے عقیدت مندانہ اظہار ہے۔

ان میں ایک طرح ایک سا انداز اور باریک بینی سے اس کا ہے، جہاں مصنف

کی خفا کی حریت، تنبیہ اور فراغت کا قائل ہونا پڑتا ہے وہاں ان شخصیتوں

سے ملاقات کرتے ہی یاد آتی ہے۔ پھر ان میں سے چند شخصیتوں کے بارے

میں کافی لکھا جاتا ہے، اس سے بھی قارئین کی مصلحت میں زیادہ اختلاف نہیں

ہو پاتا۔ ڈاکٹر بلو، قدسیہ زیدی کا دور دورہ سادہ سادہ لکھا ہے پر کچھ ہونے

خاص طور پر متاثر کرتے ہیں۔

شیش تیرا



ہے۔ کئی مضامین ایسے ہیں کہ علامہ کی بھرپور شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ علامہ کی فکر اور فن پر بھی آپ نے کافی اہم مواد جمع کر دیا ہے۔ البتہ مفید کتابت کھٹکتی ہے وہ یہ کہ علامہ کی قصیدہ نگاری پر کوئی مضمون نہیں ہے جبکہ مرحوم بڑے اچھے قصیدہ نگار بھی تھے۔

عظیم مراد پوری، امرتسر

اعلیٰ مقالات

حسب توقع طباعت و کتابت کی نفاست کے ساتھ ساتھ اس شمارہ (اگست ۱۹۸۲ء کا 'آج کل') کے سبھی مقالات بہت خوب ہیں، بالخصوص رضا مظہری صاحب کا مقالہ "اجتماعِ حدیث" دوا رک پر شاد صاحب شعلہ کا "جیل بھیا" اور مظہر اہام صاحب کا "یادوں کے روزن سے" "میساری اور مولوانی ہیں۔ اس شمارہ میں جیل مظہری مرحوم کی شاعری بھی نہیں بلکہ ان کی زندگی کے ہم سفر پر مقالات اعلیٰ پایہ کے ہیں۔

سید عبدالرؤف، اجیر

یادگار نمبر

'آج کل' کا جیل مظہری نمبر (اگست ۱۹۸۲ء) نظر نواز ہوا۔ اس کی دلکشی و خوبصورتی دیکھنے سے متعلق رکھتی ہے۔ ویسے تو اس نمبر کی ہر تخلیق خوب ہے مگر مجھ کو جو بہت زیادہ پسند آئی ہیں وہ جیل مظہری کی شخصیت، جیل بھیا، اجتماعِ حدیث، یادوں کے روزن سے، جیل بھیا، اور جیل مظہری کی شخصیت قابلِ ذکر ہیں۔

مالک رام، رضا مظہری، مظہر اہام، دوا رک کا داس شعلہ اور جیل نفاذی قابلِ مبارکباد ہیں۔
مجموعی طور پر 'آج کل' کا جیل مظہری نمبر ایک حسین مجموعہ اور خوبصورت نگارستان ہے۔ جو کہ ایک یادگار نمبر ثابت ہو گا۔

محمد سلیم خاں ہر آرزو، کلکتہ

باوقار آئینہ

جیل مظہری کی ذی علم شخصیت کا باوقار آئینہ ہے۔ اس میں شامل بلند پایہ مضامین، محلوں، محبت اور عقیدت سے لبریز بیانات اور بصیرت افروز مقالے، علامہ کی ذات و صفات اور علمِ دین کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ خصوصیت سے رضا مظہری، مظہر اہام، دوا رک کا داس شعلہ کی نگارشات جیل صاحب کی سیرت اور ان کے کردار کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ محرم نے مثنوی اچھے صراحت کی مراعت ہنسے ہی یکساں انداز میں کی ہے۔ عبدالحی نے کلامِ اقبال کی روشنی

۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء

کا میاب اور کبھر پور نمبر

"آج کل" کا جیل مظہری نمبر ملا۔ دل و دیرہ روشن ہو گئے، دل اس کے مضامین کے متوجہ اور میا سے اور دیرہ اس کے ظاہری متن اور نفاذ پر کے انتخاب سے۔ اب جیل مظہری پر حقیقی یا تنقیدی کام کرنے والا کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو ایسا کامیاب اور کبھر پور نمبر مرتب کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

زندہ باشی و جا وداں باشی

مالک رام، نئی دہلی

بے مثال نمبر

'آج کل' کا جیل مظہری نمبر ملا۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس سے قبل سبیل عظیم آبادی نمبر (اور ستر نمبر بھی) بہت اچھے تھے لیکن زیرِ نظر نمبر ترتیب، انتخاب اور مضامین کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ جناب مالک رام، رضا مظہری، دوا رک کا داس شعلہ، مظہر اہام، محرم، عبدالحی اور احمد مجاہد کے مضامین بہت اچھے ہیں۔

'آج کل' نے ادھر کچھ عرصے میں جو صوری اور منوی ترقی کی ہے وہ بلاشبہ انتھک محنت، تجربہ اور ادارتی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ نے 'آج کل' کو ایک اپنی پر سے کے ساتھ ساتھ میا رکی پر چڑھی بنا دیا جس کے لیے آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

شباب ردوولی، دہلی

بشرا کا نامہ

جیل مظہری "نمبر نگار" کا پ نے واقعی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ جیل مظہری مرحوم ایسے ہی نمبر کے مستحق تھے۔ 'آج کل' کا نمبر اپنے انداز میں منظور

'آج کل' نئی دہلی

مبارک باد

علامہ جمیل نظری بہر دیگھا، علامہ کی شخصیت، سخن وری، تحقیقی شعور و مزاج اداکن کی تنقید نگاری و فخر و پرتنا بھر پور، جامع اور وسیع نظر آپ نے اردو دنیا کو دیلے یہ عام رسائل کے سر میں نہیں تھا۔ تقریباً سارے ہی نکتے و نواں نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ پھر بھی مالک دلام، رضا مظہری، مظہر امام، دوار کا داس شکر، محمصی، عبدالمعنی، و باب اثرنی، اور رضا نقوی و آجی کی تخلیقات نے کافی ستارگی ساڑی بدون خانہ کے وقت ان کے کام کا انتخاب بھی خوبصورت ہے۔

مہدی پرتاب گڈھی۔ پرتاب گڈھی

انفرادی حیثیت

اردو کے میادی رسائل میں، آج کل، انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ شہرتوں اور ناموں کے تعاقب میں اردو کے بیچر رسالے جھگ رہے ہیں، آپ نے غیر معروف اور نام نہان شخصیتوں کو ادبی قریطاس پر ابھارنے میں فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ اداس کے باوجود نظم و شعر کے معیار کو گنتے بھی نہیں دیا۔

عشرت و صولپوری۔ راجستان،

ماضی تبصرے

جولائی کے شمارے میں بیشتر تبصرے ناقص اور غیر معیاری ہیں۔ محمود سیدی کے شعری مجموعوں پر مکیں تا حد آزا کا تبصرہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد نے محو کی شاعری کو کھٹکانا تو درکنار پڑھنے تک کی رحمت نواہ نہیں کی۔ بے ادقنا جملوں اور ازراہ کھٹک لکھی تقریر کو تبصرہ نہیں کہتے۔

کچھ میں حال غریبیں کا ہے۔ انھوں نے کتاب کو رد قبول کے عمل سے گزرتا میں پہلو بھی کی ہے۔ نہ تو فراموش اپنی محققانہ ذہانت کو بروئے کلائے ہیں نہ تنقیدی بصیرت کو۔ امید ہے آپ میرے تاثرات کو آج کل، میں جگہ دیں گے۔

ملی ایس ٹیڈن۔ نئی دہلی

چھوٹے چچا، بڑے چچا

آج کل، بابت جولائی ۱۹۸۲ء، نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ہر شمارہ کو پچھلے شمارے سے بہتر بنانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ مقالات کے ضمن میں مجاہدین، کاظم علی خاں، حنیف نقوی اور دوار کا داس شکر نے تحقیقی و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ افسانے بھی خوب ہیں، پھر بڑے چچا کی مثالی

اکتوبر ۱۹۸۲ء

جمیل نظری کے شاعری انتہائی فاضلانہ تشریح کی ہے۔ ثریا جمال نظری نے جمیل نظری کی مرثیہ نگاری، شکیب پانے نے ان کی وریاں، غلام مرتضیٰ نے حب الوطنی اور ہندوستانی، اور رضا نقوی و آجی نے خریغانہ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ اور انہیں کام جمیل کا انتخاب شامل اشاعت ہے جو قارئین اور باب ذوق کے لیے بہت ہی خاص کی چیز ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس سے بہتر کام جو بچاؤ نے جمیل نظری کا تخلیقی مزاج، "حقیقت پسندی اور بے باکی کے ساتھ لکھ کر ایک باورن اور مضر و آواز کا اضافہ کیا ہے۔

ایم ڈی الیڈر پروڈاکٹر۔ بریلی

میش بہا اضافہ

جمیل نظری بہر باصرہ نواز ہو کر روح کی تسکین و بالیدگی کا باعث بنا۔ بلا مبالغہ یہ میر کا ایک حسین اور جاذب نظر شخص ہے جس میں تمام اہل علم و فن کی تخلیقات کو سمیٹ کر سجایا گیا ہے۔ بالکل اور بلند پایہ فنکاروں کی آگاہی اور علمی و ادبی پختہ دہی کو آپ نے بے نظیر ادبی نقطہ بنادیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ محمد رفیع الدین مظہر۔ حیدرآباد

گراں قدر نمبر

شاہد راجہ خوبصورت اور گراں قدر جمیل نظری بہر نظر سے گزرا۔ انہیں حسین کے لیے مجھے مناسب الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح کھٹکے والوں نے موضوع کا حق ادا کیا ہے، آپ نے بھی ترتیب و ترتیب کا حق ادا کیا ہے۔ کتابت و طباعت مواد اور پیش کش ہر لحاظ سے بہر کامیاب ہے۔ ہر دو قلمی مجموعہ دیدہ و زیبہ۔ اعجاز علی ارشد۔ پٹنہ

دستاویزی اہمیت

آج کل، کامین نظری بہر نظر سے گزرا۔ ترتیب و ترتیب سے آپ کی خوش سلیقگی ملاحظہ ہوتی ہے۔ یہ جہاں انفرادیت اور دستاویزی اہمیت کے لحاظ سے ہوشیاری مقام کا حامل تصور کیا جائے گا۔ اس کے مندرجات عمدہ اور پر مغز ہیں، جو جمیل نظری کی شخصیت اور شاعری کا ورے طور سے احاطہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وہاب اثرنی نے PARADOXES کو جمیل نظری کی انفرادیت کی شناخت و ستارن کی شاعری کی تعمیر و تحقیق کے لیے نیا جادہ وضع کیا ہے۔ مظہر امام نے اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے جمیل نظری کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اپنی ذات کو اس طرح INVOLVED کیا ہے کہ بعض مقام پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقالہ مظہر امام سے منطبق ہے۔

عبدالمعنی۔ آسنسول

آج کل، نئی دہلی

ترقی اردو بیورو کی 1981ء کی مطبوعات

۱۔ قومی تہذیب کا مسئلہ

(ڈاکٹر سید علی حسین) ہندوستان ہندو کی
تخلیق و ماسوڈار ثقافتی محرک کے لیے اس کتاب کا
مطالعہ ضروری ہے۔ 220 صفحات، دو روپیہ سرورق،
آئسٹ طباعت۔ قیمت: 3.00 روپے

2۔ اتر پردیش کے لوگ گیت

(اخگر علی خاندانی) اتر پردیش کے لوگ گیت
سیر حاصل جائزہ۔ بہت عمدہ گیتوں میں شامل ہیں۔
333 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 29.25 روپے

3۔ قدیم کھنڈ کی آخری بہار

(مرزا جعفر حسین) کھنڈ کی تہذیب کے
نئے ہرے نقوشوں کو اس کتاب میں بخوبی دکھایا گیا ہے
جس سے ایک اہم تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔
500 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 27 روپے

4۔ ہندوستانی مصوری — ایک خاکہ

(ڈاکٹر ایس خاندانی) ہندوستانی مصوری کا کافی
خصوصیات اور تاریخ پر ایک جامع تصویر کتاب۔
187 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 10 روپے

5۔ سنخوردان بگرت

(ڈاکٹر سید علی حسین خاندانی) بگرت میں اُردو
شاعری کے فروع و ارتقا کا ایک معجزہ سند تاریخ۔
348 صفحات، دو روپیہ سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 17 روپے

6۔ گلستان کی کہانیاں

(مولانا سید امجد علی خاندانی) شیخ صدیقی کی مشہور
کتاب سے سنیے نمونہ کہانیوں کا انتخاب۔ 200 صفحات،
دو روپیہ سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 4 روپے

7۔ اصولی تعلیم

(خواجہ غلام التیہین) تعلیم جیسے اہم موضوع
پر دنیا کی کتاب پر پہلی بار 1935ء میں شائع ہوئی تھی
اور عربی سے کتاب تھی۔ 344 صفحات، لوہور سرورق،
آئسٹ طباعت۔ قیمت: 22 روپے

8۔ اصولی تعلیم اور عملی تعلیم

(مترجم ڈاکٹر علی خاندانی) عملی تعلیم
تعلیم کے لیے درجی پابندی کا محرک کہہ سکتے ہیں
ایک اہم کتاب۔ 230 صفحات، لوہور سرورق،
آئسٹ طباعت۔ قیمت: 10.75 روپے

9۔ درس و پڑھت

شاہنشین کو بابا دینی اسکول اسکول اسکول
کے لیے طرز پڑھت پر ایک جدید اور مکمل کتاب جس میں
مطالعہ پڑھت، دروس و قاری اور دیگر متن کے اقسام پر
سیر حاصل کی گئی ہے۔ 192 صفحات، دو روپیہ
سرورق، آئسٹ طباعت۔ قیمت: 7 روپے

10۔ نئی اُردو قواعد

(ڈاکٹر عصمت جاوید) اصنافی اصولوں پر مبنی
اُردو زبان کی پہلی فوجی قواعد میں اُردو زبان کے
تلفظ و قواعد کو سائنسک انداز میں درج کیے گئے ہیں
324 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 17 روپے

11۔ جہا یوں نامہ — عظیمہ بیگم

(مترجم عثمان حیدر) شاہنشاہ بابا کی بیٹی
ادب و ادبیات کی بہت عمدہ نگار کی تصنیف کردہ اہم تاریخی
دستاویز۔ 96 صفحات، دو روپیہ سرورق، آئسٹ
طباعت۔ قیمت: 25 روپے

12۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ

(مترجم سید علی حسین خاندانی) قدیم ہندوستان کی
کی تہذیب و ثقافت کی ایک مستند تاریخ۔ 591 صفحات
لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 27.75 روپے

13۔ اکبر سے اورنگ زیب تک

(مترجم جلیل محمد صدیقی) عظیم مغل کی مستند تاریخ
336 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 21.00 روپے

14۔ نوریات

(آر۔ کے۔ مرستیانی) OPTICS
کے طرز پر ایک مستند کتاب
500 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 31 روپے

15۔ گیمیا کی کہانیاں

(سید شہاب الدین رستمی) عظیم زبان کی کہانیاں
روز روز کتابت اور اہم سائنس دانوں سے متعلق مفید
معلومات۔ 120 صفحات، لوہور سرورق، آئسٹ
طباعت۔ قیمت: 7.50 روپے

16۔ راست اور متبادل کرٹ

(ڈاکٹر عبدالرشید انصاری) AC اور BC کرٹس
پر عام اہم اُردو زبان میں شائع ہونے والی پہلی
کتاب۔ 296 صفحات، دو روپیہ سرورق،
آئسٹ طباعت۔ قیمت: 10 روپے

17۔ انتظامی قانون کے اصول

(مترجم احمد رضا آغا) قانون اور اس کے ضرورتوں کا
ایک جامع و مکمل کتاب۔ 612 صفحات، لوہور سرورق،
سرورق، آئسٹ طباعت۔ قیمت: 20 روپے

18۔ دستو نیفسکی

(مصطفیٰ انصاری) 1900ء میں شائع شدہ
کتاب پر مبنی نیا رنگا رنگی سے 3,000 روپے
ان کی لائے والے اس کتاب میں عظیم مغل کی مصنفہ و تخیلی
کی شخصیت کا سیر حاصل جائزہ دیا گیا ہے۔ 204 صفحات،
دو روپیہ سرورق، آئسٹ طباعت۔ قیمت: 15 روپے

19۔ بچوں کی مسکین

(رشیہ دولت) بچوں کی لکھی ہوئی پہلی کتاب ایک دلچسپ اور
34 صفحات، دو روپیہ سرورق، آئسٹ طباعت۔
قیمت: 7.75 روپے

20۔ فوننگ انسانیات

اس میں انسانیات کی تقریباً تمام اصطلاحات
(انگریزی سے اردو میں) 20 صفحات، دو روپیہ سرورق،
سرورق، آئسٹ طباعت۔ قیمت: 4.00 روپے

ملنے بابت: ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 8، آر۔ کے۔ پورم

نئی دہلی - 110022



دریافت شد: ۱۰/۱۰/۵۹
دستبرداران، دہلی، ۱۰/۱۰/۵۹
دستبرداران کو فراخ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔



संजय गांधी चिकित्सालय
अमेठी को जनता को समर्पित
इस चिकित्सालय का प्रारम्भ
माननीय श्रीमती इंदिरा गांधी,
अध्यक्ष संजय गांधी मेमोरियल ट्रस्ट
ने १ सितम्बर १९८२ को किया।

دریافت شد: ۱۰/۱۰/۵۹
دستبرداران، دہلی، ۱۰/۱۰/۵۹
دستبرداران کو فراخ عقیدت پیش کرتے ہوئے۔





گھڑا پاپ کا پھوٹے گا کالا دھندہ چھوٹے گا

- ◆ جیسے گھنٹہ گانے سے کوئی ہراسہ نہیں سوکھ کر ٹھونٹھ چوہا ماتا ہے۔ ویسے ہی کالا دھن کسی ملک کی معیشت کو کھوکھلا کر ڈالتا ہے۔
- ◆ کالا دھن ہینگائی کی آگ میں تیل ڈالتا ہے۔ اس کی روک تھام میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔
- ◆ مکمل دھن سے بچنے کے لئے اشیائے ضروریہ کے قانون، چور بازاری کو روکنے اور اشیاء ضروریہ کی بہم رسانی کے قانون کو سختی سے لاگو کیا جا رہا ہے۔

تفصیلی معلومات کے لئے اس کو پرن کا استعمال کریں

اس سے سماج اور معیشت کو راحت ملے گی۔

نیا

20 نکاتی

پروگرام

ڈپٹی ڈائریکٹر، ماس میلنگ بورڈ

ڈائریکٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ پبلشنگ

بی۔ بلاک، کسٹور باگاندھی مارگ، نئی دہلی 110001

نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو/ہندو/انگریزی میں بھیجیں۔

نام

پتہ

میں



اردو کا مقبول عام مقررہ نامہ

آج کل

سب ایڈیٹر

شونامہ سنگھ

ایڈیٹر

راج نرائن راز

نومبر ۱۹۸۲

شمارہ ۳

جلد ۴۱

کارٹک انگریز سن ۱۹۰۴

فون ۲۸۷۶۹

قیمت ایک روپیہ

ترتیب

ملاحظات

مقالات

مخطوطات

نظم

غزلیں

افسانے

سورج منگی

رس جوزف

۲

۶

۱۰

۱۳

۱۹

۲۳

۲۳

۲۵

۲۶

۲۷

۳۱

آدی باسی کھانی

طنز و مزاح

نئی کتابیں

مکتوبات

سورج منگی

رس جوزف

۳۳ ٹولی ٹولی کے ریزے سرتی سرن کیت

۳۷ پانچواں شوہر ششی در / رفیع حیدر خان

۴۰ زوجہ گزیدہ محمد خورشید آباد

۴۳ سورج منگی / حسن عابد / شارب دھولوی

۴۶ قلم کی کاشت / محمد عثمان عارف / حسن الرحمن فاروقی

۴۸ نسل اول ایمان / محمد اسلم پرویز / عشرت قادری

سید الحسن / آر۔ یو اسلام / مصطفیٰ کمال / میوان عثمانی

سورج منگی / رس جوزف

سورج منگی / رس جوزف

آرٹسٹ - محمد چمن اروڑہ

پرنس بنیو ایس۔ ایل جیبال - اسٹنٹ پرنس بنیو۔ ایل۔ آر۔ پتو۔ اسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن، کے۔ آر۔ کرشن

مفتاحیہ مطلق خدا کیست کہاست

ایڈیٹر آج کل "اردو" کی شہرہ آفاق پبلشر، نئی دہلی

پرنس بنیو ایس۔ ایل جیبال - اسٹنٹ پرنس بنیو۔ ایل۔ آر۔ پتو۔ اسٹنٹ ڈائریکٹر پروڈکشن، کے۔ آر۔ کرشن

ملاحظات

بیش نکاتی پروگرام؛

پیش رفت اور کامیابیاں

سال کے ابتدائی چار مہینوں میں بیش میں پروگرام میں شان من متعدد نکات پر عمل درآمد میں قابل قدر پیش رفت ہوئی ہے۔ مختلف ریاستوں اور مرکز کے زیراہتمام ملاظموں سے دستیاب اطلاعات کے مطابق سال کے تہم ہونے میں آٹھ بیسے باقی ہیں جب کہ سال کے لیے طے شدہ دیہات میں بیسے کا پانی پہنچانے کے نشتہ کا ۳۰ فی صد اور ٹھیک چھوڑی والے علاقوں میں بہتری کا تہم نیز جریہ شفقت سے نہات پانے والوں کی آباد کاری کا ۲۰ فی صد سے زیادہ نشتہ نہ پورا کیا جا چکا ہے۔ شجر کاری کے لیے مقررہ سالانہ نشتہ کا ۳۰ فی صد پورا ہو چکا ہے۔ اس مختصر مدت میں بیش کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ بعض نکات کے بارے میں اور زیادہ کام کے نشتہ کی گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں ریاستوں سے کجا گیا ہے کہ وہ مناسب کارروائی کریں۔

دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی کے ڈرنگا کو آئین ترجیح دی جا رہی ہے۔ اپریل سے جولائی ۱۹۵۶ تک ۱۹ ریاستوں کے ۸۷۷۲ دیہات میں پینے کا پانی کیوں کیا گیا تھا جب کہ نشتہ ۳۰۲۸۹ گاؤں میں بیسے کا پانی پہنچانے کا ہے۔ اس سلسلے میں مدھیہ پر دیش نے مقررہ نشتہ کا

۵۰ فی صد پورا کر لیا ہے۔ اس ضمن میں یہ ریاست دوسری سبھی ریاستوں سے آگے ہے۔ اڑیسہ، کرناٹک، راجستان، پنجاب، بہار، ممل نامیڈ، آسام اور سرگرم نے اپنے سالانہ نشتہ کا ۲۰ فی صد سے زیادہ پورا کر چکے ہیں۔ اُدھر گجرات، اتر پردیش، ہماچل پردیش، کیرلا، سکھ، منی پور، میگھالیہ اور ناگالینڈ میں کام کی رفت میں مزید تیزی لانے کی گنجائش ہے۔

مجموعی پیش رفت کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ۱۹۸۵ تک پینے کے پانی کی فراہمی کا نشتہ پورا کر لیا جائے گا۔

دیہات میں بجلی

مذکورہ مدت میں ۱۶ ریاستوں کے ۳۳۵۰ گاؤں میں بجلی پہنچانی گئی جب کہ سالانہ نشتہ ۲۲۱۸۰ گاؤں میں بجلی پہنچانے کا ہے۔ اس عرصے میں اتر پردیش میں ۱۳۱ اور مدھیہ پردیش میں ۱۱۰۶ دیہات میں بجلی کی فراہمی کا کام مکمل کیا گیا۔ دیہات میں بجلی پہنچانے میں سب سے زیادہ کام بالی ناگالینڈ کو حاصل ہوئی ہے، جہاں ۶۱،، فی صد نشتہ پورا ہو چکا۔

پمپ سیٹوں کیلئے بجلی

دیہات میں بجلی پہنچانے کے ساتھ ساتھ

سینکائی کے لیے پمپ سیٹوں کو بجلی فراہم کرنا بھی ۲۰ نکاتی پروگرام کا ایک اہم جزو ہے۔

یہ ریاستوں سے معمولہ اطلاعات کے مطابق ان چار مہینوں میں ۱۹ ریاستوں کے پمپ سیٹوں کو بجلی دینا کی گئی۔ جہاں نشتہ ۲۳۱۰۲ پمپ سیٹوں کو بجلی دینا کر کے اپنے سالانہ نشتہ کا ۵۰ فی صد پورا کر لیا۔ پنجاب نے ۶۵۶۶ پمپ سیٹوں کو بجلی فراہم کی۔ یہ سالانہ نشتہ کے ۲۲۰۸ فی صد کے برابر ہے۔ آسام میں اتر پردیش، ہماچل پردیش، بہار، راجستان، آسام، منی پور اور میگھالیہ میں کام میں مزید تیزی لانے کی ضرورت ہے۔

شجر کاری

شجر کاری ایک عمومی پروگرام ہے جو مائٹوں کے ساتھ ساتھ شروع ہوتا ہے۔ مذکورہ مدت میں مشرقی اور وسطی ریاستوں میں اس پروگرام پر سرگرمی کے ساتھ عمل ہوا ہے۔ کیرلا اور سکھ نے اپنے سالانہ نشتہ کا ۹۰ فی صد بیسے ہی حاصل کر چکے ہیں۔ جن ۱۸ ریاستوں سے اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کے مطابق اپریل سے جولائی تک ۶۱،۱۷ کروڑ پودے لگائے گئے ہیں۔ بیش ریاستوں کے لیے ایک سال میں ۲۰ کروڑ پودے لگانے کا نشتہ مقرر کیا گیا ہے۔

مجموعی چھوڑی والے علاقوں میں بہتری

مجموعی چھوڑی والے علاقوں میں بہتری کے پروگرام میں ۱۸ ریاستوں کے ۲۰۳۱ لاکھ افراد مستفید ہو چکے ہیں جب کہ سالانہ نشتہ ۸۰ لاکھ رکھا گیا ہے۔ تین ریاستوں سے اسی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں۔ جہاں نشتہ اور آدھار پردیش ٹھیک چھوڑی والے علاقوں میں نہ حاصل نے میں پیش پیش ہیں۔ اس پروگرام

کی ملک مقام کے لیے جیسے لگائے جا رہے ہیں۔
 جیسے لگائے جا رہے وہ گرام ملک کج میں جاری ہے۔
 اوسے توسیع میں دی جا رہی ہے تاکہ بچوں
 کو کوئی ایسی بیماری نہ ہوئے پائے جس سے وہ
 معذور ہو جائیں۔ اس کا ایک مقصد تربیتی
 سہولیات دینا کرنا بھی ہے۔ جو مختلف فلاحی
 پروگرام جاری ہیں، ان میں دلچسپی کی سہولیات،
 خصوصی تعلیم، مربوط تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت،
 رہنما کارہائیں، کھیلوں کا مواد، سماعت و ذوق کے
 کام آنے والے مددگار آلات، اساتذہ تربیت
 تحقیق و ترقی کو فروغ، سفر میں رعایت اور
 قرضے وغیرہ کی سہولیات شامل ہیں معذور
 بچوں کی تفریح و سہوہ کی غرض سے کام
 کرنے والے بہترین اداروں کے لیے خصوصی
 ایوارڈ دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔

خاتون اور بچوں کی فلاحی اسکیموں میں
 تیزی لانے کی غرض سے بھی بعض اہم اقدام
 کئے گئے ہیں۔ ہند جیسے ملک میں جہاں اتنی
 زیادہ آبادی ہے وہاں اس کام کو انجام
 دینا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی بہت کچھ کئے
 جانے کی ضرورت ہے۔ حکومت اس سلسلے
 میں کچھ کر رہی ہے اس کا اندازہ چھٹے منصوبہ
 میں مخصوص رقم ادا کرنے میں نکال کر دو گرام
 سے لگا یا جاسکتا ہے۔ رہنما کارانہ اولیٰ کے
 تعاون کی بدولت اس سلسلے میں جلد اضافہ
 اور تیزی کے ساتھ پیش رفت کرنا ممکن
 ہو گا۔

نویں ایشیائی کھیل علاقائی نشان :-

جیسا کہ جاننے والے نویں ایشیائی کھیلوں کے علاقائی نشان
 جینز منتر کی ایک دھوپ گھڑی ہے، جو دراصل
 چار دھوپ گھڑیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کو دیکھ
 کر ذہن میں مٹا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس

علاقائی نشان کا انتخاب کن وجوہ کی بنا پر عمل
 میں آیا ہے۔
 غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا
 انتخاب محض اتفاقی نہیں۔ ہمیں اس کے
 پس پر وہ تاریخی، تہذیبی اور تمدنی عوامل
 کارفرما نظر آتے ہیں۔ یہ معنوی کی فن اور خطوط
 پر بے مثل گرنت کا آئینہ بھی ہے۔

اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ روڈ کی
 ایک تاریخی تجارت جینز منتر کی دھوپ گھڑی
 سے متاثر ہو کر بنایا گیا ہے، جہاں نوپس
 ایشیائی کھیل منعقد ہونے کا یہ بھی میں کھیلوں
 کے نشان کے انتخاب میں متعلقہ شہر کی مرکزی
 حیثیت کو ہمیشہ مقدم تصور کرنا چاہتا ہے۔
 جینز منتر میں پتھر کی چھ دھوپ گھڑیاں بنی
 ہوئی ہیں۔ لیکن یہ علاقائی نشان جن دھوپ
 گھڑی کو ذہن میں رکھ کر بنایا گیا ہے وہ چار
 دھوپ گھڑیوں کا مجموعہ ہے۔ دوسری وجہ
 اس کا خاص ہندوستانی طرز تعمیر ہے۔ اس
 دائرے کے دونوں طرف دو نصف دائرے
 ہیں جو ستاروں کے عروج کا پتہ دیتے ہیں۔
 ساتھ ہی یہ نصف دائرے چڑھنے کے اصول
 سے مشابہ ہیں، جو ہمارے بیان استقبال
 یا خیر مقدم کا روایتی انداز ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس
 کی شکل پیل کے پتے جیسی ہے۔ پیل کا بیڑ
 ہندوستان میں متبرک سمجھا جاتا ہے۔
 اس کے علاوہ اس کے اوپر جو سورج کا
 نشان بنا ہوا ہے وہ خوشی اور خوشحالی کی
 علامت ہے۔

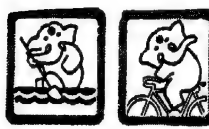
ماہی کا تاجا ہوا پتہ ان پرا ایشیائی کھیلوں
 کا Mascot بھی ایک نیک علامت ہے۔
 ماہی کو کھاری تاریخ، ثقافت اور تہذیب میں
 ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ہمارے یہاں
 ماہی کو مقدس مانتے ہیں۔ کھانوں اور مذہبی

تقون میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے
 علاوہ اس کا سبب باندہ جاہ و مال اور دھار
 سبھی دیدنی ہے۔ قوت و عقل مندی اور
 وفاداری اس کا خاصہ ہے۔

ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے
 اس کے معنوی و سرکاری اس نئے نئے
 شورخ، شریر، پتھل، پیشانی پر بندیا کھائے
 (جو سورج یعنی خوشی کی علامت ہے) باہمی
 کے بچے کو ان کھیلوں کا نشان منتخب کیا
 ہے۔

جیسے ہی ہم اس ناچتے ہوئے شورخ اور
 شریر پتھل کو دیکھتے ہیں تو فوراً ایک نئے نئے
 سے بچے کا تصور ذہن میں آجاتا ہے، جس کا
 کام ہی شرارت کرنا اور اچھٹا کرنا ہے۔
 اور کھیلوں کا انحصار بھی اچھٹا کرنا ہی ہے۔
 اس کے متحرک وجود کی متابعت
 سے ہی اس کا بہت متحرک سامنا ہوا رکھا
 گیا ہے۔

حب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں
 ہو گا، نویں ایشیائی کھیل نئی دہلی میں شروع
 ہونے والے ہوں گے۔ جن میں ایشیائی ملکوں کے آٹے
 ہونے ہزاروں کھلاڑی، کھیلوں کے لیے،
 کھیلوں میں اپنی برتری کے لیے اپنی بہترین
 ہنرمندی کا مظاہرہ کریں گے، وہاں یہ
 ایشیائی ملکوں کے مابین دوستانہ تعلقات
 کی بنیادوں کو مزید استوار کریں گے۔
 باجیت کھیل کا حصہ ہے، لیکن اپنی جگہ سب
 سے اہم کھیل ہیں، جن کا ہم سب بڑی
 بے تاملی سے انتظار کر رہے ہیں۔



ماں کے دودھ کی اہمیت

کے مہر نے اس روگ کا کچھ علاج بھی کر لیا ہے۔ لیکن بچے کو پیدائشی یا پیدائشی روگ تو دے سکتے ہیں، لیکن بعض ماں کے دودھ کے باعث کوئی نیا روگ نہیں ہو سکتا۔ حفظانِ صحت کے علاوہ ماں کی گود میں بچے کو جرمی اور لکڑی ملتی ہے، جو حفاظت اور محبت کا احساس دلاتا ہے وہ یوں میں کہاں۔

نفیات کے ماہرین کی رائے میں مغرب میں انتہائی مادی خوشحالی کے ساتھ ساتھ انتہائی بے اطمینانی کا ایک طرابلسی بھی ہے کہ بچوں کو بچپن میں ماں باپ کی توجہ اور محبت نہیں ملتی۔ ماں باپ دونوں کام کرتے ہیں۔ خوب پیسے کماتے ہیں اور اسے فنی مہنوں کے لیے صرف کر دیتے ہیں۔ دونوں کو اپنی فرصت ہی نہیں کہ وہ بچوں پر توجہ دیں۔ البتہ بچے پر پیسے خرچ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے لیکن وہ بچے کو جاملی ترن گھر میں اعلیٰ ترن کپڑے پہن کر رہتا ہے اور ہنگامے سے منگے اسکول میں بھیجا جاتا ہے۔

ڈبے کے دودھ پر پلٹا ہے اور ماں باپ کی جگہ نوکروں بلکہ Child Sisters

یعنی اجرت پر بچوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کی جگہ انی میں پرورش پاتا ہے۔ یہی بچے کے اگلے گھر نہ صرف اپنے بچوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گا بلکہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی پیسے دے کر الگ کر دے گا۔ امریکہ میں بوڑھے غریب یا بیمار ہونا ایک بہت بڑا المیہ ہے کیوں کہ وہاں کی بہت میں کسے رابا کے کارے نہ ہوتا۔ وہاں سب کا بھائی پلٹ کر ماں باپ کو نہیں تو تھا۔ مشرق میں جب کوئی اچھا یا برا کام کرتا ہے تو لوگ کہتے کہ ماں کے دودھ کا اثر ہے۔ بچے ماں کی گود میں صرف دودھ ہی نہیں پیتا بلکہ ابتدائی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے۔ بولنا سیکھتا ہے اور یہ سیکھ کر لیا ملے۔ کیا کرنے میں نادمہ ہے لیا کرنے میں نقصان۔

مشرق میں بچے پر محبت کچھ بڑھتی ہے۔ (دیکھ مولانا)

نومبر ۱۹۶۱ء

نفیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ طبی لحاظ سے بھی ماں کے دودھ کا جواب نہیں۔ بوسل کا دودھ کیسے تیار ہوتا ہے۔ پیسے گلے کے دودھ کو دودھ تیار کر کے تین پھر اس میں کچھ دوا سن اور دیکھ دوا میں ملائے ہیں پھر اسے ڈبوں میں بند کرتے ہیں۔ اس دودھ کو استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ پانی گرم کر کے دودھ کو گھولے پھر بوتل میں ڈال کر بچے کو پلائے۔ اب محل میں جراثیم لگنے کے امکانات پر غور کیجئے۔ اگر گلے کو کوئی بیماری ہوئی تو اس کا دودھ خراب، اگر ڈبے میں کوئی خرابی ہوئی تو رکھے رکھے پھر دودھ خراب، اگر بننے دودھ کچھ نہیں مگھتی۔ بھڑکی تو بیماری لگنے کا اندیشہ۔ اور آخر میں اگر دودھ کی بوتل کے اندر یا نیل میں کوئی گندگی رہ گئی تو بھول سے بچے کی زندگی خطرے میں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کو گلے کا دودھ رکس نہیں آتا، کسی کو بھیجنے کا دودھ نہیں پچا تو کسی کو بکری کے دودھ سے بخار چڑھتا ہے۔

ماں کے دودھ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حفظانِ صحت کے سارے اصولوں کے خلاف سے محفوظ ہے۔ اس میں ماہر کے جراثیم نہیں لگ سکتے۔ آپ کو سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ماں خود روگ ہے تو؟ اگر ماں خود روگ ہے تو اس کا روگ بچے میں اس وقت منتقل ہو چکا ہے جب کہ وہ بیٹھ میں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بچے کی پیدائش اس کی مناسبت ہے کہ ماں اور بچے دونوں

آج کل یورپ اور امریکہ میں ایک شدید بھڑکی ہوئی ہے۔ ایک طرف بچوں کے لیے دودھ تیار کرنے والی صنعت ہے۔ دوسری طرف صحت اور نفیات کے ماہرین۔ یورپ اور امریکہ میں اکثر عورتوں نے بچوں کو اپنا دودھ پلانا بند کر دیا تھا اور ڈبے کے دودھ کا سہارا لے لیا تھا۔ ماہرین صحت و نفیات کا کہنا ہے کہ موجودہ نسل کی بے راہ روی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے ماں کا دودھ نہیں پیا ہے یا بہت کم مدت کے لیے پیا ہے۔ ڈبے کے دودھ والوں کا کہنا ہے کہ کم اپنے پاؤں میں نہ صرف دودھ بلکہ صحت و حفاظت کی ساری دواں بھی ملا دیتے ہیں۔ لہذا کم زور اور بیمار ماں کا دودھ پیئے والا بچہ کم زور یا روگ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمارا دودھ ہر لحاظ سے ممکن ہوتا ہے۔

نفیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ ڈبے کا دودھ کبھی ماں کے دودھ کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ممکن ہے کہ جسمانی طور پر ڈبے کا دودھ زیادہ صحت بخش ہو، لیکن دماغی اور جذباتی اثرات کے لحاظ سے ماں کا دودھ کبھی افضل ہے اور کبھی مغرب کو کیا معلوم کہ ”دودھ پینا“ کتنا تعلیم یافتہ ہے اور ہم مشرقی دے اس کو کتنی یا سہمی سے برتر ہے۔ ماں اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتی ہے اور ان پر ہر وقت غور کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔

چند بدن

اردو ادب کا ایک اہم کردار

ادب کے سبھی کردار خواہ مافوق الفطرت ہوں یا انسانی وہ اپنی تمام خصوصیات و جزئیات کے ساتھ سو فی صد مغربی بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ ان کی اساس سماج کی کسی نہ کسی حقیقت پر مبنی ہوگی جس کے ساتھ فن کار کے تصور کا دخل ضرور ہوگا۔ لہذا زیادہ مغربی کرداروں نے داستان میں جگہ پائی ہے خواہ وہ منظم ہوں یا نثری داستانیں اور زیادہ حقیقی کردار جدید ناول، جدید نغمہ، نثر اور جدید ڈرامے میں ملتے ہیں اور یہ حقیقی کردار فن کار نے اپنے دور کی زندگی اور واقعات سے حاصل کئے ہیں۔

سوائے ماضی کے تاریخی کرداروں کے۔ لہذا وہ انسانی زندگی کی ہی ترجمانی کرتے ہیں۔ منظم اور نثری داستانوں کے وہ تمام مافوق الفطرت کردار خواہ ان کے تصور کا تعلق اور ماخذ سنسکرت، عربی، فارسی اور مختلف علاقوں کی زبانوں کے ادب سے ہوا یا اپنے عہد سے۔ ترجمہ شدہ فن پاروں میں ہو یا تخلیقی کارناموں میں ان کی کردار نگاہی میں عصری اور علاقائی خصوصیات زندگی خوش اسلوبی سے درآئی ہیں۔ خواہ وہ کردار دہلی ہوں یا بلوچستان۔ وہ خالص نہیں رہ سکے کیوں کہ بقول مولانا حالی خیال لینے مادہ کے پیدا نہیں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ فن کار کبھی عصر اور علاقہ سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ چاہے عصر اور علاقہ محدود ہو مگر وسیع ہو۔ کیونکہ اس کے مطابق فن کار کے ہر وارز تخلیق، تصور و فکر، انتخاب زبان و ادائیگی خیال کی نشرویت اور حد مقرر ہوتی ہے۔

داستان اور قصہ گوئی فن کا اپنی زندگی کے تجربے کے ساتھ اپنے ماحول کی انسانی زندگی کے وسیع مطالعہ و مشاہدہ ہی بالغ کوتاہ اور جلا جھٹکتا ہے۔ اس کے تخلیق کردہ کرداروں کو ہمہ گیریت اور اہمیت بخش سکتا ہے۔ جیسے قصہ آئنا کا ہم تصور رانی، نیم حقیقی کردار خوبی و کمزوری، ترقی و تہذیب کے تمام کرداروں کی نمایاں خصوصیتوں کی نمائندگی کرتا ہے تو آزادی تہذیب کے سورج کے طلوع ہونے آسمان

اُردو ادب میں کردار نگاہی کی روایت کا آغاز درحقیقت دکن سے مخصوص جدید ریاست کرناٹک سے ہوتا ہے جس کے پس منظر سے غزنی واقعیت کے بغیر اردو افسانوی ادب کے کرداروں کا تہذیبی، معاشرتی، تعلیمی مطالعہ اور تجربہ یقیناً ادھورا رہے گا۔ اس روایت کی آگاہی کی روشنی میں ہم متوسط اور جدید کی منظم اور نثری داستانوں اور کہانیوں کے کردار اپنی گونا گوں خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کیوں کہ ان کرداروں کے حالات و اطوار، طور طریقے اور ان کی صفات کسی بھی ادب کے افسانوی کرداروں کی ایسی خصوصیات ہیں جو ظاہر میں جم نہیں پاسکتیں۔ بلکہ زمان اور مکان کے تہذیبی، لسانی، تمدنی اور مذہبی رزم و روان سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ لہذا ان کرداروں کے رہنے سہنے کے انداز، نشا وں، لباس، سیدائش اور موت کی رسمیں، ان کے کھانے پینے، آٹھنے میٹھے، چلنے پھرنے کے ادب، بات چیت کے ڈھنگ، ان کا لباس، ان کا دہن ہنس، چال چلن، سماج کے مختلف افراد کے آپس میں رشتے، ان کے نتیجے، بگڑنے کے انداز یہ ایسی باتیں ہیں جو عمل بارہ عمل کے طور پر بدلتی یا برقرار رہتی ہیں خواہ یہ تمام باتیں اور خصوصیات مافوق الفطرت کرداروں سے وابستہ ہوں یا انسانی کرداروں سے۔ کیوں کہ ان کرداروں کی زندگیوں کے عمل پہلوؤں کا بیان ان فن کار کے قلم سے ہمہ جہت ہو اس دنیا کا انسان ہے، جن کا اس انسانی سماج سے گہرا تعلق ہے۔ وہ شعوری اور شعوری طور پر زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جزئیات اور تفصیلات، عکاسی سماج، تاریخی شخصیتوں اور واقعات سے حاصل کرتا رہا ہے۔ یہ لازمی ہے کیوں کہ اس نے کبھی مافوق الفطرت کرداروں کو تہذیب سے نہیں دیکھا۔ ان کے درمیان رہنے بسنے کے سبھی اتفاقات نہیں ہوئے ہیں۔ لہذا افسانوی

● ڈاکٹر رفیع اردو پروفیسر، بلاک ۸، آلہ کے پورم نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲

بغیت میں کو تاسے و جس کے اندر کھڑی روشنی بھی ہے اور گزشتہ رات
 اچھی تھی۔ اس لیے اس کے نکات و سکنا سے ایک دم یہ فیصلہ نہیں کیا
 تھا کہ وہ مائی بہ ساجی ہے یا بدشئی تیری کہ بدعز و نکرا سے بات کا یقین
 اتنا ہے کہ نادان تمام کر لادیں کی نہانہ کی کہ پہلے جو پر بان اور لاکھ
 مانتہ شیر کی زبان کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور زبردہ روایتوں کو فریاد
 زیادہ پسند کر رہے ہیں بلکہ اس وقت پر ان کا سر کلنہا بھی جائز سمجھتے ہیں۔

کہ یہ فرسودہ روایتیں ترقی کی لالیں رکھاوت ثابت ہو رہی ہیں اور حقائق
 مکی سے ضرورت ملتا ہی ہیں، کیوں کہ پنڈت و نق تاتو سرشار ازاد کے
 لیے زندگی کی راہ میں درپیش آنے والی مشکلات سے معاملہ کرنے کی صلاحیت
 باز کرنے کے آرزو مند ہیں۔ اور وہ ذہنی بیماری کے علیرہ نظر آتے ہیں
 فتنوں کے اس قدر کے لیے کہ حاضر ہدی ہے۔ کیوں کہ سرشار نے اس
 بار کی متین تہذیب کی تفسیر کو بڑے خلوص سے ٹولا تھا، مرض کی تفسیر
 بھی اور ان کی سمجھ جو کہ مطابق جو سبب مناسبت سمجھا جو تیز کر دیا۔

جی جیسے کہ داروں کے لیے دوا کی کڑواہٹ قابل برداشت نہ تھی۔
 یا طرح موند بن کر اچھوٹے دوا کو کھجک دیا اور آنا دے جیسے دانش مند
 امرت سمجھ کر پی گئے۔ اور زندگی کی قدر میں سب سے آگے ہے۔

مرزا آغا کاشہ کار کردار اور جوان احسان کی زندگی کی کئی
 دریل اور شہنائیوں کی خوش گوار اور خوش گوار داستان ہے۔ جو
 مخصوص نادر سے ایک محدود طبقہ کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔
 نادر کے یہ تین اور ایسے لافانی کردار کہانی نگاروں کی مختلف قسم
 مجلسوں، محفلوں اور اسفلوں کے ہجوم میں حاضری اور تصدیق شدہ
 مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ خصوصاً صنعتی اور کبری، حکیم اور مرزا کا ہوا ایک
 ری اور مانا صحن، دلآرام اور ناگلی جیسے تھا ملی کردار مطالعہ و مشاہدہ
 بغیر جنم نہیں پاسکتے۔ خلوت پسندی اور مشاہدہ و مطالعہ کی کہانی نگار
 یک گوی کردار تخلیق کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، جن کی اردو و انسانی ادب
 کچھ مدت سے بہتات ہو گئی ہے۔ ایسے کردار زمان و مکان کی تیسری شخص
 ہ جاتے ہیں جنہوں زمانہ نگہ کرنے کے بعد ادب میں ان کی کوئی اہمیت
 نہیں رہ جاتی۔ ان کی حیثیت ان خود و خود لوگوں کی ہی ہے جو عوام کی بنیادی
 بعد ہمیشہ کے لیے خراب فروغ ہو جاتے ہیں۔

بہر حال ہونی ہند کے تخلیقی اور تیز رفتور قدیم انسانی ادب کے اکثر
 دارمند ستانی اور بغیر سندھ کی تہذیب و تمدن اور سماجی، فاضلی مختلف
 اور مذہبی روایتوں اور خصوصیات کا دلکش، بستی بھر اور مسطر جو نگاروں،
 سیکائی تجربے کے تخیل نہیں ہو سکتے۔ یہ اس دینے مطلق رکھتے ہیں کہ ان تہذیب
 داری، باقی اخوت، آپس میں ہمدری، محبت اور انسانی خوشیوں کا
 قصا ہے۔ انہیں تو نہ زمین اور ذات بات کی زیادہ پورا نہیں ہے بلکہ ان
 داروں کا سلیق انسانی خوشیوں کی عظمت اور اہمیت کا دل سے متروک ہے۔

تقیب کی بات بھی ہے کہ اس شدت سے ایک دوسرے کی مذہبی رد و ادائی قومی
 اور ملی رد و ادائی، جذیل اور قلمی کیفیتوں کا احترام کرتا ہے، مگر اس کی جڑانی
 بزرگی اور عظمت کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہ چند مخصوص اخلاقی
 قدروں کے ساتھ انسانی خوشی کو ان سب پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کی مخالفت
 کے لیے اپنی راہوں، بعض وقت مذہبی معاملات میں بھی قربانی کیے تیار ہے۔
 علول شاہی جہد کے شاہنشاہ محمد تقی علی مشنوی چند روایتیں مہیا ر اس
 قول کی خوب صورت مثال پیش کرتی ہے۔

بعض تادین کا خیال ہے کہ مشنوی چند بدی مذہب اسلام کی عظمت
 ظاہر کرنے کے لیے تعریف کی گئی۔ پر و فخر عبدالقادر سرور بھی اس خیال کے
 حامیوں میں سے ہیں۔ لہذا وہ رقم طراز ہیں:

"قصہ کا خاکہ اور ساز بیان دیوان دل چپ ہیں اس کا
 مقصد مذہب اسلام کی عظمت ظاہر کرنا ہے، لیکن یہ مقصد
 قصہ کی دل چسپی میں مارج نہیں ہوتا ہے۔"

نقادوں کے خیال سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ بات بھی کہ ایسی
 ہی ہے کیوں کہ قصہ کے ارتقا، کردار نگاری اور قصہ کے جذبات سے یہ بات
 شدت سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ مشنوی کا بنیادی خیال صرف عشق، عشق کی
 گہرائی، صداقت، اس کی ابدیت، لہذا ہی شرم و حیا اور ضبط نفس ہے۔ مثلاً
 کے ہیرو مہیا ر کو صرف عشق کی طلب ہے۔ اپنی چند بدن سے مہیا ر کی ملاقات
 نہیں ہوئی ہے اور اس سے وہ واقف ہے کہ اس کی محبوبہ کہاں ہے۔ بلکہ وہ
 عاشق مہمند، فرات میں کامل، فصاحت و بلاغت میں فاضل دعا گو ہے کہ
 حد اس کی محبوب سے ملاقات ہو جائے۔ یہ ہم کلہا دل چاہتے۔

چند روایت کی بیسی، مجبوری اور انتہائی شرافت اور زیادہ نمایاں ملتی
 ہے حب اس کا موازنہ مہیا ر سے کیا جائے جس نے اپنے آپ کو قیدی طبع
 جذبہ عشق کے حملہ کو رہا ہے۔ اس ایک سال کی مدت کے دوران ساری
 دنیا اس کے راز سے واقف ہو چکی ہے۔ اور اس نے اپنے لیے کئی ہمدرد و مگسار
 پیدا کر لیے ہیں جو اس کی دلجوئی میں لگے ہیں۔ یہاں تک کہ شہر بجا بجا کا سلطان
 اس کی دلداری اور مقصد باری کیلئے اپنے آپ کو وقف کر چکا ہے۔ ہر ممکن
 طریقے سے اس کی مدد کرنا چاہے۔ حتیٰ کہ اپنے وزیروں اور رعایا کے زمانے
 کی نازنینوں کو امپارے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ ان کے دریاں اس کی
 محبوبہ سے ملاقات کرے اور خرواپے حرم کی ساری خاتونیں کو اس کے سامنے
 لا کھڑا کر دیتا ہے۔

کشتہ اس ترم میں دیوانے کے تئیں
 بجا کر بھٹا دیوانے کے تئیں

لے اور مشنوی کا ارتقا ا۔ ص ۶۰۔ ایک پیشی ایک ناؤں مل کر لڑے۔

و سے سب حرم کوں ملا کر حضور

کھڑیاں کو نظر دل دکھایا ضرور

جہاں مروے اپنے عشق کے دھڑک اٹھارے ہزاروں ہمدرد پیدا کر لیے ہیں۔ یہ مصنف تازک منشی اور سکر ہاٹ کے نقاب تھے اپنے من کا گل گھسیٹتے ہوئے اپنے منہ کے دوڑتے ایک سال بعد دوسری ملاقات یوں مخاطب ہوئی ہے۔ زبان کھول لی تیرے رموز جتا ہے دوائے موائیں ہنوز ملاقات چچ ہوا اک برس بھی آپسے اس کھاتول دھرنیرس مرد نے فورسے والہانہ پن سے اپنے آپ کو مہربوں کے قدموں میں ڈال دیا۔

اب چند بن کا فیصلہ دوڑوں کا تقدیر کا فیصلہ ہے۔ اعتباری ذہنی کشمکش میں جٹلا کر وضاحت کا یہ وہ قوی پہلو ہے جو قومن کی ذہنیت کو بھی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ عورت کی قربانی ہے جو اس صنف کو تقدس اور عظمت عطا کرتی ہے۔ اور اس کے گرد اکادہ رُخ ہے جو مردھتی کی مانند ہر کانٹے اور گندگی کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے اس کی جگہ ریزہ ریزہ و شاداب میں، اہلبہائے جموں لگا کر ہے کہ کائنات میں سچی خوشیاں اور دل کشی باقی رہے۔

چند بن شرم و حیا، ایثار اور قربانی، صبر و ضبط کا نام دینو نہ۔ اپنی قلبی کیفیت پر قابو پالے اور اسے پوشیدہ رکھے کہ اس کے اندر ہر فور و صلاحیت موجود ہے لہذا اپنے محبوب سے وہ کہہ سکتی ہے کہ ”جیتا ہے دیونے موڑاں ہنر“ (دیوانے تو مرا نہیں اب تک ہی رہا ہے؟) اس لہلہ کا مہیار پر یہ رد عمل ہوا کہ فیذا اس کی رو کر قبض ہوئی۔

سینا جب بچن پورا ونے کا دل دھر قبض ہو چلیا روح آسمان پر چند بن جن کا درد و عاشق کی آگ سے پل پل، جل جل جا رہا تھا اپنے عاشق کی موت پر غبار چھو رہا تھا اس کی قلبی اندر ذہنی کیفیت کی گھڑائی لکڑی میں بدلتی جا رہی ہے۔ جذبہ دل غالب ہوتا جا رہا ہے۔ نہاں آتش خموش اسے جھلکاتے جا رہی ہے۔ چند بن کی اس قلبی ذہنی تبدیلی کا ساتھ ہی نقطہ شروع ختم ہو جاتا ہے اور کہاں کے اختتام کے آثار شروع ہو گئے ہیں، مگر دائرہ نہیں ہوتا کہ چند بن بدکن اپنے لیے کیا فیصلہ کرے گی۔ صبر و ضبط کا یہ موقع اپنی مثال آپ ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

استیلا زلی ناز کے درانے کی انا رکھا ہے آپ چل رہی ہے اور اپنے گیزر کا احساس اس کے جذبے پر قابو ہے۔ وہ اپنے جذبے کو بالکل بے اختیار اس لیے کرتا نہیں جانتی کہ اس کا محبوب شہزادہ ہے، مگر کبھی جس نے محبوب کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اپنی تقدیر کا فیصلہ خود نہیں کرتی بلکہ حالات اسے موت کی سزا سناتے ہیں۔ اور اس کی محنت کا راز دنیا پر ظاہر ہو چکے۔ اس کے ہر لمحہ چند بن کا یہ راز صرف اس کے سینے میں دفن ہے۔ اس بات سے بھی وہ بخوبی واقف ہے کہ اس کے راجہ باپ نے چند بن کے لئے مہیار کے رشتہ کو ٹھکرادیا ہے اور اسی محبوب نے اب اپنی جان اس پر قربان کر دی ہے حالات کے پیش نظر چند بن نے ایک فیصلہ کر لیا۔ مہربوں کے الفاظ

میں مینے:

جو دیکھی موار کے چند بدن جو دیکھی تو اس غم نے سستی پٹی وہیں مہر فقر کے جلی گھر حبیبتر حلا دو کہہ سولم کا درد و تمام وہ عاشق اتھا جو سیت دھبہ غریب عیبت بات پر مجھ دیا جو کون آتا جو رکھے سو بڑی بے شرم

کچے عاشقان پر یو کیا گھات ہے نہیں گھات یو وصل کی رات بل بھوک تائیر کے بغیر چند بدن نے اپنے لیے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ا زندگی میں اس کے لیے کوئی لغت باقی نہیں رہ جائے گا۔ جان کی قربانی مہیار چند بدن کے دل میں سما چکا ہے۔ وہ اس واقعے سے غلاما کھی سو اس ناپردرد کاری ہوا دو کہ اس کے حرن کا سو بھارا سو عاشق ہوا کہ دو دکھ جلی سو جلتے ہے ناپا لیا اور اب محبوب سے ملاقات کا اس نے پکا ارادہ کر لیا ہے، مگر اس دنیا عملی جامہ پہنا یا جائے تو کیسے؟

تقدیر کا یہ وہ حصہ ہے جہاں مشاعرے واقعات کا سہ لیتا پڑ رہے جو ایک حد تک مافوق الفطرت معلوم ہو رہے ہیں۔ یہ واقعات اس قدر درمائی انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ قاری اس خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے تقدیر کے انجام کو جاننے کے لیے سب سے بے تاب ہو رہا ہے۔ قسط میں SUSPENSE کا یہ موقع بڑا ہی طویل اور دل چسپ ہے۔

چند بن کی محبوب سے ملاقات کیسے ہو؟ دوسری صورت میں مگر دونوں کی آتش عشق جو متحد ہوئی ہے یا تو مہیار کو زندہ کر دے یا چنے سے زندگی کی قربانی طلب کرے۔

مہیار کی ان حالات میں موت سے بچا ننگو کا بارشہ آگاہ ہے اور انتہائی دلچسپی ہے کہ اس کی ساری محنت و مسقت رائیگا مہیار کی تقدیر میں نامرادی کی موت لکھی جا چکی تھی۔ اپنی پرانی ہمد کے ناتے وہ مہیار کے کھانے دنانے کے اختتام میں مصروف ہے۔ جب لوگ گورستان جانے کے ارادے سے جازہ اٹھاتے ہیں تو کھنڈر ہے کہ جنازے کو اٹھا دیتی ہے۔ ہر سہی کے کار۔ آخر کار بادشاہ نے آ سوچی۔ اس نے کہا جس کی رُخ جنازہ چلے آ اٹھالے جائیں۔ چلے جنازہ برداروں نے چند بدن کے کل کار چ کھیا، جنازہ بے اختیار اٹھا ملین مل کے سامنے پہنچے ہی جنازہ پھر الٹ گیا۔ ایسے آپ جا کو جنت آہ یہاں ایک کر رہا ہے صبا

اس خبر نے چند بدن کے باپ کو بڑھلا دیا ہے۔ وہ دڑا دڑا ہنسی کے پاس اٹھا کر تباہ کر رکھی تھیں۔ یہ مڑھ اٹھانے کی صورت تھلے ، چند بدن نے ہنسنے پر عرش کیا۔ مجھ اجازت ہو تو اس کا انتظام کروں۔ دروئی میں جلیبی بھی بات ہیں کہ یو کام کرتی ہوں سن راج ہنس سر انجام اس کا سو کرے بدل رضا بکلیوں دینا تو ایسے شر ٹولی بادشاہ کا جواب ہے :

تجہ رضا ہے دل و حال سستی کہ پر کیوں یو مرد اجایا سستی باپ سے رضا پانے کے بعد چند بدن کے اندر گھبر تیر ہی آگئی ہے۔ پھر بھی اپنے اس لاداکو جو تہہ اپنے کا ذہنوں پر اٹھانے ہوئے ہے۔ اس وقت بھی اس نے کسی کو پانا راز دان نہیں بنایا ہے۔

ابن میں ابھن آہ مارن گئی تنگھائی کوں اپنے پکا رن گئی سچہ وہ خود کلا میں مبتلا ہے۔ اپنے آپ سے سوال کر رہی ہے :

درد و عاشقان پر سو تو تباہ کیوں سو عاشق دروئی میں رونا ہے کیوں کہاں ہے یو دو دیکھ آؤ پڑا کچھ اوپر خوشی کا مرا سب چھڑا یا تنگر دڑو پڑا اپنے باغ میں دل بھرت خوشحالی کا میرا لٹا سب شہر پلکتے پلکتے اپنے آپ کو دیتی ہے۔

اپن میں اتارو و ناخوب جنیں مکھ ابھوان سستی دھونا خوشیں کروں جا کے بنگی یو اپنی شکر جو جو دے خدا کا دم کچھ منگر

اندھا کر چند بدن نے اپنی ایک پہلی کے ذریعہ بادشاہ جیا تنگر کے ذریعے ایک عالم کو بلایا۔ عالم نے چند بدن نے درخواست کی کہ وہ اُسے مسلمان بنائے کہ عاشق کے سامنے غفلت المذہب ہونے کی وجہ سے شرمندگی محسوس نہ ہو۔ صاف دل سے منکر پڑھا اور عالم نے کہا کہ اب وہ محل سے باہر جانے اور جنازے کو اٹھانے کی کوشش کرے۔

جیسے ہی عالم نے محل سے باہر نکو جنازہ اٹھانے کا ارادہ کیا تو بڑی آسانی کے ساتھ جنازہ اٹھ گیا۔

قبرستان محل کر جنازہ کھولا تو تافرن کی تعجب کی انتہا نہ رہی کہ چند بدن بھی اپنے محبوب کے ساتھ مردہ بڑی ہے۔

دونوں کو الگ الگ قبریں ملنے کے ارادے سے جڑا کرنے کی کوشش کی جانے لگی، مگر وہ انہیں جڑا نہ کر سکے۔ مجبوراً دونوں کو ایک ہی قبر میں ڈھالا گیا۔

چند بدن نے محبوب پر اپنی جان قربان کر دی۔ یہی اس کا فیصلہ تھا کہ الگ الگ جہنم والی آتش مشق تہہ ہو کر قرار پائے۔

قدیم معمولی ہے، مگر اٹار بیان نے خاص دل کشی پیدا کر دی ہے۔ اس قصے سے ملنے آؤ دوا ب میں کی قصے ملتے ہیں، بعض نقادوں کا

خیال ہے کہ میر تقی میر کی تین مثنویاں ”دیباے عشق“ ”مختصر عشق“ اور ”احیاء عشق“ چند بدن مبارک کے قصے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ ان سب مثنویوں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے، مگر مقصد کی اسٹوری چند بدن مبارک کی قابل قدر فنی چند بدن کی کردار انگاری ہے۔ یہی قصے اسلم سے تراشا ہو یا کہ کردار و دوا ب کے لافانی کرداروں میں شمار ہو گا۔ اس کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ روایتی مثنویوں کی طرح مقصدی نے چند بدن کی جسمانی خوب صورتی کا ذکر شاذ و نادر ہی کیا ہے۔ اس کے باوجود قاری کے ذہن میں اس کردار کی ایک خوبصورت تصویر ابھر آتی ہے جس کی تشکیل اس کی سیرت کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ اور یہ پوسٹا کی جذبات کو نہیں جگاتی بلکہ اپنے اطراف ایک تفسیر کا مالہ کھینچ دیتی ہے۔ یہی مقصدی کا شمار انہ کمال ہے۔ یہ خصوصیت دبستان گوگندی کے برخلاف دبستان بجا پور کی نمایاں خصوصیتوں میں سے ہے اور صحیح معنوں میں مقصدی نے اس کی تائید کی ہے، جس کی وجہ سے کردار انگاری میں اُسے ایک خاص مرتبہ حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے یہی کہ مقصدی کا یہ کردار تخلیقی کارنامہ ہے۔ ● ●

بقیہ : ماں کے دودھ کی اہمیت

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر معاشرے کو اپنا دشمن نہیں دوست اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ اُسے میرتہ یہ فکر کی رہتی ہے کہ دوسرے اس کے پاس میں اچھی رائے رکھیں۔

مسترن اور مغرب میں ایک غلط فہمی قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے کہ بچے کو دودھ پلانے سے ماں کی صحت بلکہ اس کے رنگ و روپ پر مبرا اثر پڑتا ہے۔ ایک تو یہ بات ہر سے غلط ہے۔ نازل حالات میں عورتوں پر ماں پلنے اور دودھ پلانے کے دوران ایک ٹھیکہ آجاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض عورتوں کی جن کے حلقہ اور زیادہ تعداد میں بچے پیدا ہوتے ہیں ہمت ضرور خراب ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دودھ پلانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اگر دودھ سمجھ رکھی جائے یعنی بچے کو اس وقت تک دودھ پینے دیا جائے جب تک ماں کا دودھ اترتا رہے تو اس سے ماں کی صحت بہتر کوئی بڑا اثر نہیں پڑے گا اور بچے کو دو تین سال تک ماں کا دودھ اس کی گوداؤں کی بھر پور محبت اور وقار مل سکے گی۔ اور ایسا بچہ آگے چل کر قیثاً ایک تندرست اور صالح نوجوان بن سکے گا، جو نہ صرف ماں باپ کی محبت کا جواب محبت اور خدمت سے دے سکے گا بلکہ اپنے سماج اور ملک کا ایک مفید فرد اور اچھا شہری بن سکے گا۔ ● ●

اردو شاعری میں تجربات

اور خدا کے رشتے پہنے سرسے عذکر ناما چاہا تہ ہے، یا جب راضی طر اردو لای جنو
لذت انگیزی کا ذکر کرتا ہے تو سارے عروج اعلیٰ نظام کو بھن میں ڈال دے
ہے۔ وہ تہذیب کی طرح گوشت پوست کی بھرپور عورت کو آنکھ کو پرچم بنائیے
کی تکلیف نہیں کرتا بلکہ ترسیل کا وہ تجزیہ بیان کرتا ہے جو خالصتاً جسمانی، حیوانی
ترسیل کا تجربہ ہے :

ہے بجا شیفہ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
تھڑو در دستاے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے محروم ہیں ہم
نالہ آسائے انگریز پر تو ممدور ہیں ہم
اسے خلافت کو آ رہا ہے تو ناگہی سنے لے
خوگر محمد سے سمجھو اس گلہ سمجھ سنے لے
(اقبال)

خدا حشر میں ہودہ دگار میرا
کہ نہ کھیلے میں نے
میرزا لا شکا کو بستر میں شب بھر برہنہ
وہ گردن وہ باہن وہ دائیں وہ پستان
کہ جس میں جنونی سمندر کی لہروں کے طوفان
شمالی درختوں کے باغوں کے پھولوں کی خوشبو
جہاں دم بدم طغرو طوفان بہم اور گریزاں
میرزا لا شکا کا جسم برہنہ
افق تا افق جیسے انجور کی پل جن کی
خدا آسمانوں کا تیرہ اور حاصل

شاعری میں تجربات عام طور پر جن سطحوں پر ظہور پذیر ہوتے ہیں
ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے :
مواد کی سطح پر اور مواد کے واسطے سے اقدار کی سطح پر
ہیکٹ، غلام، اشکان کی سطح پر
آہنگ کی سطح پر، نیز

نظریات کے انتخاب و تفتیش اور استعمال کی سطح پر
اردو شاعری میں اقدار کی سطح پر حقیقی، اقبال، جبریش اور ان کے بعد
آئے والے شعراء ایک منفرد تبدیلی کا اظہار ہیں۔ شاعری کے مواد کے اعتبار
سے اس منفرد تبدیلی کے نقوش، رویوں کی تبدیلی کے نقوش ہیں۔ انسانوں
کا حکمران بننے کے نہیں روئے، انسان کا اپنے ہم جہر انسانوں کے نہیں روئے
انسان اور خدا کے رشتے اور مرد اور عورت کے رشتے کے نشیب و فراز کی جزئیات
ایک نسل کے ہاتھوں دوسری نسل کی تردید و قبولیت۔ اگرچہ حالی، اقبال اور جبریش
کے ہاں فطری، سیاسی و سماجی عناصر غالب ہیں لیکن ہر حال ایک ارتقائی شعری
محسن بھی موجود ہے جو ہمے ہوتے ابدیت سے ہوتے رویوں کا آئینہ دار ہے۔
بعض لوگ مواد و انداز کی بدلی ہوئی صورتوں کے اظہار کو شیعہ شعری تجربہ
کہتے مگر یہ کہتے ہیں کہ کیوں نہ کہ اسے انہی میں تجربہ کی شہید و صورت کم و
بیش لہری ہے معنوی نہیں۔ حق تہیہ بعض معنوی اظہار اس لیے بکریے
کی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ وہ فیصلہ کن اسرار کی علامت ہوتے ہیں۔
اقبال کا "شکوہ" اس لیے انحراف کا اظہار بن سکتا ہے کیوں کہ
"خوگر محمد" جب سمجھتا ہے اس کا کچھ بھی کرتا ہے تو شے ایک کا بیج بولے کہ انسان

وہ لذت کہ جس کا نہیں کوئی پیمان
خدا کے سرواکن ہے پاک دامن

شاعر در شان نگاروں کی دستک چھوٹی ہے
اک پرندہ تھا یہیں رہتا تھا

(ن۔م۔راشد)

ساحسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں اپنے لیے اظہار کے لئے سانچے اور نئے طریقے اپنے ہمراہ لائیں، اگرچہ عوامی اور آواز، تصدیق، منتوی، قلعہ ترکیب بند، سندس اور محسوس سے انحراف نہیں کرتے۔ تاہم عوامی اور آواز قلعہ نظم نگاری نے ملاشبہ نئی نظم نگاری کے لیے راہ ہموار کی ہے۔ نظم طباطبائی عسکرت اللہ خان، ناچرخیب آبادی، حامد علی خاں، اختر جگر گڑھی اور اختر شیرانی شکست و رحمت کے سلسلے میں دیگر قابل ذکر نام ہیں۔ لیکن انحراف کا مقابلہ واضح سلسلہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس شروع ہوا اور رفتہ رفتہ مستحکم ہوتا چلا گیا۔

اردو شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل پر مشتمل ہے اور اردو غزل کا نظم و ضبط کچھ اس انداز کا ہے کہ اس کے اندر رہتے ہوئے تجربات کی گنجائش پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ اس لیے ہمارے اکثر شاعر غالب کی طرح وسعت بیان کی آرزو کرتے ہیں، لیکن اکثر وہ بیشتر اپنے آپ کو غزل کی تزئین کاری تک محدود رکھتے ہیں۔ غزل کو تازہ کالرب و لہجہ عطا کرنے والے شاعروں میں ہمارے دور میں فراق گورکھ پوری اور ناصر کاظمی کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ فراق جیل تہذیبی عناصر کے ساتھ اداس و تھکامی لب و لہجہ کی انفرادیت کے ساتھ غزل کی آبیاری کرنے والے دیگر شعراء میں میر نیازی، کفر قبائل، قاضی قاضی اور علی قاضی پر قابو ذکر ہیں۔ باقی ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں شاید غزل کے منفرد شاعر تھے۔ باقی غزل کے حیدر قاضیوں کا احترام کرتے ہوئے بھی غزل کی حدود میں بے پناہ وسعتیں اور گنجائشیں پیدا کیں۔ غفر اقبال کا تجربہ غفلت کی آمیزشوں کے توسط سے تلاش امکان کا تجربہ تھا اور غفر اقبال کچھ عرصہ اس تجربے میں مصروف رہنے کے بعد عوامی بچپانی محفوظ راسخوں کو ٹوٹ گئے۔

صنف غزل میں آزاد غزل کا تجربہ بقول شخصہ اب فیض احمد فیض تک آ پہنچا ہے، جن کی ایک آزاد غزل پاکستان میں حیدر قاضی نے اپنے مجید سے ”جدید ادب“ میں شائع کی ہے۔ آزاد غزل کے سب سے بڑے نام یونس ندیم، منیر امام ہیں۔ ان کے علاوہ آزاد غزل کا تجربہ کرنے والے شاعروں میں غفر اقبال، سلیم شہزاد، سلیم بلوادی اور مولانا قاسم علی گوانی قابل ذکر ہیں۔ غیر مساوی دو مصرعے غزل کے شعریں کیا جہت یا جہتیں پیدا کر سکتے ہیں اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ بہر حال یہ تجربہ جاری ہے۔

منظر اسام کی ایک آزاد غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

آج ہر لمحہ ہے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح
پہلے کیا بات سمجھ لیوں وقت کا احساس نہیں رہتا تھا

اردو شاعری کے حقیقی تجربات نظم میں ہونے والے تجربات پر مشتمل ہیں۔ طریق کار میں بنیادی تبدیلی شعری رویت کی تبدیلی ہے۔ براہ راست بیان اور کچھ کی نسبت اب زیادہ توجہ کرنے (Ronding) اور کاری پر دی جانے لگی ہے۔ اسلعار، علامت اور اشیاع شعری طریق کار کا انہی اور ابدی متعدد ہیں۔ لیکن ان کی پیش قدمی غالب کے انداز میں شعری منظر نامے پر حاوی ہے۔ پانچونے نظم معرا، نظم معرا کے آزاد نظم اور سچر تشری نظم یہ سلسلہ بتدریج جاری ہے۔ آزاد نظم کے جو طریقے ہمارے یہاں رائج ہیں، ان کا مختصر بیان یہاں غالب ضروری ہے۔ ہمارے یہاں نظم معرا، لینک ورس اور آزاد نظم کو گزشتہ ذکر دیا گیا ہے۔ اس لیے Vers Libre کا کوئی واضح تعریف ہمارے یہاں موجود نہیں۔

۱۔ وہ آزاد نظم میں میں ہر مصرعہ مکمل لیکن ختم ہوتا البتہ مصرعوں میں ارکان کی تعداد گھٹتی بڑھتی، رہتی ہے۔
میر تقی کی نظم کے اس نمونے میں ہر مصرعہ مکمل ارکان پر مشتمل ہے۔ ہر رکن مفاصل میں ہے۔

سمت کو کس لیے نقطہ نہیں بنی تڑپیں؟ کہہ دو
وہ کیسی سکواہٹ تھی، بہن کی سکواہٹ تھی، ہر ارجائی بھی ہنستا تھا
وہ ہنستا تھا بہن ہنستی ہے اپنے دل میں کبھی ہے
یہ کیسی بات سمجھائی تھی دیکھو وہ امانہ اور باکرہ منشی آئی
مگر توں شانت نہا ہے تماشا بن گیا ساحل
مجھے ساحل نہیں ملتا۔

(تجربہ جی)
تجربہ جی ہی کی نظم جاتی ایک سلسلہ مصرعے کی نظم ہے لیکن ناسل ہے۔
ایک آگیا کیا دوسرا آئے گا دور سے کھینچا ہوں توہمات اس کی
گزر جائے گی میں کھڑا ہوں یہاں کس لیے مجھ کو کیا کام ہے
یاد آتا نہیں.....

میں شعراء ہاں آزاد نظم میں کچھ مصرعے مکمل رکن پر ختم ہوتے ہیں اور کچھ مصرعے نامکمل رکن پر ختم ہوتے ہیں۔ اگلے مصرعے میں مدغم ہو کر نکلے۔

لاشک کے ہاں اس نوع کی
وجہ شہرت سے طریق کار کا استعمال کیا
آگے ہے ریت دیواروں کے ساتھ
مارے دیواروں کے ساتھ
سرخ اینٹوں کی پختوں پر لگتی ہے
نیلے کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہے
ریت - رک جا
کھیل نہ کریں
ہنرے تاش کے چتر سے
دردن روزوں کو بند کریں

ریت

رنگ جا۔

اردو زبان میں آزاد نظم صرف جزوی طور پر آزاد ہے
Vera Libre علم سینچنے سے قبل آہنگ کا کسی تصور راہ میں حال ہو گیا
ہے۔ اردو میں آہنگ کا تصور سرتال بے معنی مجرور وزن کے نظام کے
ساتھ وابستہ ہے جس کی بنیاد موسیقار کا خیال ہیں۔ ہم سب یہ تو تسلیم
کرتے ہیں کہ شعر اور نثر کا بنیادی فرق استعارہ ایک آزاد اختصار اجمال اور
آہنگ ہیں، لیکن شعر اور نثر کی تفریق قائم کونے وقت "آہنگ" سے الجھ کر
رہ جاتے ہیں۔ سرتال بے یقیناً آہنگ کے اوصاف ہیں، لیکن غفلتوں،
معدیوں اور نظم کے مختلف ٹکڑوں کی ترتیب اپنے آپ میں سمجھا آہنگ کی تفریق
آزادی تیار کرتی ہے جو مجرور وزن کے سنگلاخ نظاموں سے آزاد ہوتے ہوئے
سبھی شعری معیار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

نثری شاعری کے تجربات اردو شاعری کے لئے نئے نہیں ہیں۔ یہ تجربات فنی
میں بھی ہوئے ہیں، حال میں بھی اور مستقبل میں بھی ان کے امکانات
دریافت کرنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ مولوی عبدالرحمن، میر نامرعی، نیلزار
فتحپوری، سجاد حیدر اور غفر علیہ السلام سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ اعجاز احمد یوسف
کلارن، احمد ہوش، شریار، باقر ہمدانی، کشور ناہید، شاکر حبیب،
اور صلاح الدین پرویز تک پہنچا ہے۔

جب کشور ناہید اپنی ان رات کرتی ہیں تو ان کے الفاظ ایک آزاد اختصار
استعارہ و اجمال کی صورتوں پر اور کرتے ہوئے رکھی آہنگ سے آزاد ہوتے
ہوئے بھی باغی آہنگ سے متروک ہوجاتے ہیں۔

کھانے کی میز پر گرد پڑی تھی

میں نے اسے کھا تو نہیں

البتہ اپنی انگلی سے

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

لاشک کے ہاں اس نوع کی

اس گرد سے وہ کھو گیا
جو ہم کو تینے کا جو صدمہ تینیں پاتی
اردو زبان کی غفلت میں سے اردو اور فارسی الفاظ کو الگ الگ
کرنا مشکل ہے اور شاید کسی حد تک ہندی الفاظ کو بھی۔ اقبال، جوش، راشد،
فیض، سردار جعفری اور دیگر عہد شعراء کالم و لہجہ فارسی اثرات کا آمینہ دا
ہے۔ لیکن کچھ شاعروں کے ہاں ہندوستانی اساطیر اور علاقائی الفاظ بھی اثر
انداز ہونے لگے ہیں۔ پاکستانی شعراء کے ہاں پنجابی الفاظ کا استعمال ترقی
پہرے۔
گرامر کے اصولوں اور منطقی ترتیب سے انحراف کی مثالیں اختیار
کی نظموں میں باغی نظمیں ہیں۔

جو موت پہچانے راستوں واصل باب موبائل غرق سر فلک اودہ
اسکان خواب شستوں پر آدمی کا لہو جھلکا ہے۔ چند لمحوں کی بات ہے ایک
گھونٹ سے چلنے انکارہ موٹ معدودے چند بے اعتدال جملے مذاقہ زہر
چوراہے میں نے اس سے مباشرت کی سرخ آلود شب کیوں کے حاشیہ
میں (انتفا جالت)

صلاح الدین پرویز بھی بہت سے مروجہ اصولوں سے انحراف
ہیں، لیکن ان کی نظمیں تازہ کاری کے باعث نوزائیدہ مورتی ہیں۔
باسی تسمی کی سانسوں میں اچھے بو بکارتیں
سب سے چھپا کر کھولی ہے انکھی گڑیا طاق میں
سات سمندر اپنے نیچے لے کر گئے ہیں
اچھی بچی، لوگ اکیل، شور شرابے
ہر گھر زندہ، شیشی میوہ، پانی پتا

بھول نہرا

اکھن جیسی دی چٹانیں چورس پای

شام شرابی، کھنٹی چٹائی گولی

(اٹلے والی ایک دھنک کی پیاس)

(صلاح الدین)
طویل نظموں کی مثالیں ہمارے یہاں بہت کم ہیں۔ ایڈگار ملن ہون
مطابق طویل نظم درحقیقت مختصر نظموں کا سلسلہ ہوتی ہے۔ شاید یہ نقد
کسی حد تک صحیح ہے۔ عین غرضی کی طویل نظموں میں۔ خاص طور پر
میں وحدت تاثیر چھلکے کے صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کلا رہائی ولا
میں معنی اور اسالیب کو یہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ عبدالغنی غزالی
جعفر طاہر کی طویل نظمیں اگرچہ بار بار الفاظ کے طومار سے بوجھل ہو جاتی ہیں
تامیاتی وحدت اور شعری معیار کے اعتبار سے قویہ طلب نظمیں ہیں۔ طو

بقیہ : مکتوبات

غیر معمولی انفرادیت :

ستمبر ۱۹۸۲ء کا آج کل نظر نواز ہوا۔ "آج کل ہر اعتبار سے اپنی غیر معمولی انفرادیت کا حامل ہے۔"

جناب مخدوم سعیدی کی نظم، دلی کی آبی کی منزل، جو گندہ مال کا ناول۔ دیدہ و روا درویش کی کافانہ، "نکیش کا سچول" خاص طور پر پسند آیا۔ چند پرکاش جوہر بھنوری، الدیاد

معلومات کا خزانہ :

ستمبر ۱۹۸۲ء کا شمارے میں اردو مرثیہ کی تاریخ اور سید مرثیہ پر جو مضمون چھاپا ہے وہ معلومات کا خزانہ ہے۔ دلی کی آبی اور مخدوم سعیدی کی نظمیں بھی پسند آئیں۔ تبصرے بھی اچھے ہیں۔ سعید الحسن، کھنڈر ۲

قابل تحسین :

ماہ ستمبر ۱۹۸۲ء کا شمارہ دیکھا۔ جناب عظیم امروہوی کا مقالہ "مرثیہ از آدم تا ایں دم" قارئین کے لیے ایک بہترین مضمون ہے جو کہ تحقیق اور معلومات سے بھر پور ہے۔ اور ان (عظیم صاحب) کی کوشش قابل تحسین ہے۔ مرثیہ نگاری میں بہت سے نام آئندہ پیش نظر کے گزرے اور کلام پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا مگر ذوق اور مصطفیٰ کی مرثیہ نگاری کی معلومات پہلی بار ہوئی۔ سب سے پہلے مرثیہ نگار جناب اسماعیل امروہوی کے ہاتھ میں جان کر بھی اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ عظیم صاحب کی یہ واقعی ایک گراں قدر تحقیق ہے۔

"اے دیدہ و روا" کہانی بھی بہت پسند آئی۔ جناب جوگندہ مال نے اس میں آج کے سماج، آنکھوں والے سماج کی ذہنی پتلی اور مہیا کی گراؤ پر بہت خوب صورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ کہانی واقعی بہت خوب ہے اور سنسنی آمیز ہے۔ پان صاحب اپنی کوششوں کے لیے قابل مبارکباد ہیں۔ آر۔ یو۔ اسلام، رام پور

خوب :

شیر کا قہارہ مومول چھا۔ لوہی کی کافانہ، "نکیش کا سچول"۔ عزیز مراد آبادی کا مزاحیہ خاکہ "عورتوں کی کافانہ" اور یاسین احمد کی غزلیں خوب ہیں۔ اس میں انتخاب کے لیے آپ یقیناً قابل مبارکباد ہیں۔ عظیم گرامی بھنوری

نظم کے تجربے کی تازہ ترین کامیاب مثال دیدہ و روا کی نظم آج کی صبح کے جود ہے۔ یہ نظم نہ صرف وحدت تاثر کا نمونہ ہے، بلکہ جذباتی اور دماغی دریافت کے عمل کے گزرتے ہوئے وہ گزر فکر و فن کی تین کار بھی سر انجام دیتی ہے۔

غزل اور نظم — خاص طور پر آزاد نظم میں ہی جہتیں پیدا کرنے اور نثری نظم کے امکانات کی جستجو کا سلسلہ جاری ہے۔ سائٹ، ہانگو، تراپے اور اس قسم کی دیگر اصناف اب بھی کچھ لوگوں کے لئے دل چسپی کا باعث ہیں لیکن اردو شاعری کی غالب روایت اور پسندیدہ اصناف اب بھی عادی ہیں۔ وزیر آغا نثری کی اصطلاح کے خلاف ہیں اور شمس الرحمن فاروقی نثری شاعری کے امکان قبولیت کے۔ اگرچہ تجربہ کی حد تک انہیں نثری شاعری کے قواعد پر کوئی اعتراض نہیں۔ آزاد نظم — نظم معرا اور نثری آہنگ سے آراستہ آزاد نظم اردو شاعری کی روایت کا حصہ بن چکی ہے۔ تیراجی، فیتن، راشد، مجید امجد، قاضی سلیم، عتیق حنفی، وحید اختر، رفیق زائد، کمار پاشی، شہزاد، حمید القاسم اور دیگر نئے شاعروں کی آرا نظائیں اس کا بہترین ثبوت ہیں۔ آہنگ کے غیر رسمی تقوید پر ہر حال غور و فکر جاری ہے۔

ایڈرا یاؤنڈ Kara Pound شمس نقطہ Dead End والے معرعوں کا سخت مخالفت تھا۔ حق تو یہ ہے شمس نقطہ Dead End میس مرگ آسا ہیں جسے۔ تجربات کی دو معرعوں مسلسل ہے یعنی Run-In لائن ہے۔ اس میں جود تھے آتے ہیں وہ محض عوامد ٹکڑے نہیں ہوتے بلکہ سفر کے تسلسل کا نقطہ تخریب ہوتے ہیں۔ اردو شاعری تازہ کاری کی شاہراہ پر مسلسل اور متواتر گھبران ہے۔

شرح چند کد

ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے
سیسالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے
فی کاپی	ایک روپیہ	۱/۵۰ روپیہ
		۳۰ سینٹ

۱۵ اپنی



حیدر بخش حیدری اور گلستہ حیدری

سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدری کے والد کا نام ابو الحسن تھا۔ وہ غفلت سے رہتے ہوئے تھے۔ بعد میں دہلی میں سکونت اختیار کی۔ یہ تو بہت نہیں چلتا کہ ان کے والد کس عہد میں ہندوستان آئے۔ قیاس ہے کہ دیگر ہجرتیں اور تارکین وطن کی طرح وہ بھی محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے ہوں گے۔ اس دور میں ایران میں خلف شاہ برپا تھا۔ شرفاء وہاں سے سجا ہوا کپڑا کر ہندوستان کا رخ کر رہے تھے، جو نسبتاً پرسکون تھا۔ البتہ بعد میں نادر شاہ اور احمد شاہ درانی کے حملوں نے یہاں بھی بے امنی پائی اور انتشار برپا کر دیا تھا۔

حیدری کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ان دنوں دہلی کے حالات بے حد پرکشش تھے۔ تاسا صہ حالات نے اہل شہر کو ترک وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ ماحول کا انتشار اور معاشی ضرورتوں کے تحت حیدری کے والدین دہلی دہلی سے نکلے اور لاہور آئے۔ ان کے ہمراہ ناس آئے۔ اس وقت حیدری خورشید تھا۔ ابو الحسن نے ناس میں کئی سال لاکھ لوگوں کے ہمراہ گزارے۔ حیدری یہیں سے بولنے کو سیکھے۔ ابو الحسن نے بعد میں نواب علی براہیم خاں (صاحب تذکرہ گلزار ابراہیم) کی ملازمت اختیار کی۔ نواب مذکورہ کی زیر نگرانی حیدری کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ انہوں نے قاضی عبدالرشید خاں مولوی غلام حسین غازی پوری اور سید جمیعت علی رضوی سے اکتساب علم فرمایا۔ لے۔ اسی دوران فرٹ ولیم کالج کے قیام اور صاحبان عالی شان

کلیتہ کے فرٹ ولیم کالج سے صرف اردو شری کو ایک نئی اور باقاعدہ مست نہیں بلکہ اس کالج کی بدولت بعض گیسٹ ام ایجوکیشن کو بھی حیات دوام حاصل ہوئی۔ فرٹ ولیم کالج کے مصنفین کے بیانیہ وسایق میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان میں سے سریشتر مصنفین صرف اپنی معاشی بدعالی اور پریشانیوں سے عاجز آکر ہی صاحبان عالی شان کا دامن تھامنے پر مجبور ہوئے تھے۔ اپنی ملازمت سے ان کا مقصد صرف حصول زر تھا، ادب کی خدمت نہیں۔ اس زمانے میں انگریزوں کی ملازمت اختیار کرنا کس پریشان سمجھا جاتا تھا۔ کالج کے مصنفین نے اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت اس عام رجحان کے خلاف قدم اٹھایا اور صاحبان عالی شان کی خوب خوب سرائیاں کیں اور ان کی خواہش و فرمائش کے مطابق تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔ یوں تو تصنیف و تالیف کے ان شری بہ و فراہم کا مقصد صرف انگریزوں کو سوزانے کے لئے دوسری کتب کی فراہمی تھی، لیکن بالواسطہ طور پر ان دوسری کتب کے ذریعہ اردو کے شری مرمانے میں گراں بہا اضافہ ہوا اور فرٹ ولیم کالج کے بعض مصنفین اردو شری کے طور پر قرار پائے۔

فرٹ ولیم کالج کے مصنفین میں حیدریں حیدری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ شہر ہندوستانی کے کثیر تصانیف مؤلف تھے۔ حیدری کے ہر صہر تذکرہ نگاروں میں وہ ذوالفقار اعجاز (تذکرہ دریاں انفاق) ستغ (من شعر ہاوی بی زبان جمال) دیوان (جہاں) نے مختصر طور پر حیدری کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ حیدری نے گلستہ حیدری اور "تذکرہ گلشنی ہند" کے دیباچوں میں بذات خود اپنے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ان

لے دیباچہ تذکرہ حیدری (گلشنی ہند) از حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۳۱ (مطبوعہ: کراچی پاکستان)
لے دیباچہ "گلستہ حیدری" قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن ص ۷ بحوالہ مقدمہ دیوان حیدری (مطبوعہ ص ۱۳۱۲)

● لکھنؤ شہر اردو سماجی سچانند دگر کی کالج، غازی پور

کی ادب فواری، علم دوستی اور دریاہ کی خبریں حیدری کے کالوں تک پہنچیں۔ کالج کی شہرت اور ملازمت کی کشش و فوج کی بنیاد پر حیدری تعلیم میں رکھ سکے۔ انہوں نے کالج میں قسمت آزمائی کے لئے ۱۹۱۴ء میں قعدہ بہر و ماہ کا اردو میں ترجمہ کیا اور بطور نمونہ ساتھ لے کر وہ آئیں جب مسئلہ ۱۹۱۵ء میں ناگل سے تری کے ساتھ شہزاد کی طرف روانہ ہوئے۔

حیدری نے کالج چھوڑ کر بہر و ماہ کا نسخہ ڈاکٹر گل کرٹ کی خدمت میں پیش کیا۔ حیدری "بہر و ماہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"ہم اس تہجد حیدری کی منتظر ہیں حیدری شاہ جہاں آبادی کو ۱۹۱۳ء میں یہ غیر فیضی ارتدھ کی گواہان عالی شان ان گفتگوئے اردو سے پہلے نور مغرب فتح رکھتے ہیں اور اہل سخن کو ازراہ تذکرانی زیادہ بزرگی دیتے ہیں۔ خصوصاً صاحب والا منتاب عالی مقام، مدثرین مغل، اہل کلام شرمنا گل کرٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کو جو بحر سخن دہری و سخن دانی کے گوہر یکساںے چلے ہیں اور موجود قواعد کلام شیری سخن کے ہر مضمرہ سخن دریاں۔۔۔ اس واسطے دیل مصلح اس قعدہ بہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظر محض پر پڑو اس صاحب موصوف والا شان کے لایا ہے۔ یقین ہے کہ منظور نظر ہووے اور اگر کہیں اس کی عبارت میں نامرتبی الفاظ دکھائی دے لے تو اس کی درسی کے واسطے باغبان خامہ دوزبان کو حتم تعلیم سے اشاعت کی جاوے کہ میں کے سبب سے وہ اصلاح پاوے" کہ

گل کرٹ کو "بہر و ماہ" کے قصے کی خوبی، انداز بیان کی سادگی اور سلاست پر حیرت نہائی۔ چنانچہ ۳۰ مئی ۱۹۱۵ء کو چالیس روپے شاہ روپر بحیثیت منشی حیدری کا تقرر عمل میں آیا کہ

جس نوائے جہاں نے "دیوان جہاں" میں ۱۵ جولائی ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں منفرد ایک ستارے کی گنج میں نقل کی ہیں اس میں حیدری کی خبریں بھی شامل ہیں۔ اس سے علم ہو کہ یہ حیدری علامہ تک لکھتے میں موجود تھے۔ یہ واضح طور سے یہ نہیں چلتا کہ انہوں نے کب لکھتے کی ملازمت اور قیام ترک کیا۔ ذوالفقار علی دست نے ۱۹۱۳ء میں تذکرہ "رائس افغان" ترتیب دیا تھا۔ اس وقت حیدری بنا برس میں موجود تھے۔ ذوالفقار علی دست نے حیدری کے لکھتے چھوڑنے کا سبب آب و ہوا کی ناموافقت قرار دی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"در مدرسہ ہندی سرکار کچھ انگریز بہادر مدت بہار و ماہ ہر روز منشیان و شاہان گزارانیدہ۔ از نا موافقت جوئے لکھتے از ہوا و ہوس فزکی و دگر شستہ بالذک اور لری کہ از سر کار مقرر شد و مکتبی گشتہ در بناں برزم افزوز احباب است" لہ

حیدری کے تمام سوانح نگاروں نے اس کا سنہ وفات ۱۹۱۵ء لکھا ہے۔ وہ بنارس ہی میں فوت ہوئے۔

فورٹ ویم کالج کی ملازمت کے دوران حیدری نے کم از کم دو کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان کے نام یہ ہیں :-

منشی یلی میون کا شری تریو، تو تا کہانی، آرائش مغل، نگارستہ حیدری، جامع القوانین، گلزار دانش، ہفت پیکر، تازہ نگاری، گفتنی شہیدال (مترجمہ و دستہ اشہد)

حیدری کی "نگارستہ حیدری" دراصل ان کی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کی کچھ مختصر کہانیاں، دیوان، تذکرہ گفتنی ہند، قعدہ بہر و ماہ، یلی میون کے دیباچے اور شہدائے کوکھلا کے چند مضامین شامل ہیں۔ حیدری نے "نگارستہ حیدری" کو ۱۹۱۵ء میں ترتیب دیا تھا۔ وہ لکھتے حیدری کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"حاصل کلام اس گفتگو سے یہ ہے کہ خدمت گزاری سے بزرگی اور فرمانبرداری سے دستوں کی اس فقیر کو قسمت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ وہاں بات بکا تھا، اُسے میں کو کتاب بارہ سو پندرہ ہجری میں عنایت و توفقات سے صاحبان علا شان والا عاذاں شرمنا گل کرٹ صاحب بہادر کے ایک صورت اطمینان کی ہے اور مفاہقت میں یاران قدیم اور دوستان صمیم کے اوقات قیمتی نہیں گزرتی ہے۔ اس واسطے چند نئے زبان پر کستہ ہندی میں موافق اردو سے پہلے کے نثر لکھے۔"

لہ تذکرہ رائس افغان مرتبہ سید حسن اسماعیل قعدہ ۲۱، ص ۹

لہ تذکرہ خدمات بریلی دیوان حیدری کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ :-

"اس بات کا علم نہیں جو تا کہ وہ بنارس سے کب باہر چلے کہ لکھتے پہنچے ۱۹۱۵ء جب کہ تذکرہ گفتنی ہند کے دیباچے میں حیدری مذکورہ تاریخ درج کی ہے۔

کہ دیا چہ "بہر و ماہ" مجددہ دیوان حیدری تہتر تہذیب و تذکرہ خدمات بریلی

ص ۲۹، ۳۰

Proceedings of the college of Fort-William, vol. ۵۵, P. 5 (W. A. I. Delhi)

ڈاکٹر عاتق بریلی نے "دیوان حیدری" کے مقدمے میں "گل کرٹ اور صاحبہ" (منشی مغل) کے حوالے سے حیدری کا شمار وہ روپے نقل کیا ہے (ص ۱۳) جو غلط ہے۔ متین منشی صاحب نے بھی چالیس روپے نقل کیا ہے۔

جیسے مقدمہ عام علی اور مردہ کا مقدمہ اور پولی نامہ شخصیں
اور مقدمہ علی جنوں کو جو حضرت امیر خسرو دہلوی مدظلہ العالی
نظام الدین اور ایوانہ نے اپنے نسخے میں لکھا ہے، لکھے گئے اور
چند اشعار پریشان اور کئی نسخہ چند قطعہ جو اس بیچ مدان
نے تصنیف کئے سوا عام طور پر ہی ہائے اور اس مجموعہ
بے سرو پے رشتہ دے موارہ کو جو اس بے سرو پے جمع
کیا ہے۔ نام اس اور ان پریشان کا گلدستہ حیدری رکھا
ہے۔ "لہ

منشا والدین آرزوئے گلدستہ حیدری کی ترتیب کی تاریخ ۱۲۱۵ھ
درج کی ہے اور "بانا زہ گلدستہ حیدری" مجموعہ کی تاریخ ترتیب بھی
نقل کی ہے یہ ممکن ہے کہ حیدری نے ۱۲۱۵ھ میں اسے ترتیب دینا
شرع کیا ہو، لیکن بحال معلوم نہیں ہوئی ہو۔

۱۹ رگت سندھ کو گول کورٹ نے کالج کونسل کے نام ایک مراسلہ
تحریر کیا تھا اس میں اس نے شبہ ہندوستانی کی تحقیقات پر انعام کی
سفارش کی تھی اور اسلئے کے ساتھ یہ تحقیقات کی فہرست بھی منسلک
تھی۔ لیکن کالج کونسل نے اس پوری فہرست کو نامنظر کر دیا تھا۔ وہ
کالج کے ہاتھ آئے ملازمین کو کسی قسم کا انعام دینے کے حق میں نہیں تھی۔
اس فہرست میں گلدستہ حیدری کا نام مطبوعہ کتابوں کے ذیل میں شامل
تھا۔ یہ ۳۰ صفحات پر مشتمل تھی اور انعام کی رقم دو سو روپے تھی۔
راقم السطور کی رسائی اس زمانے کے کسی مطبوعہ نسخہ تک نہ ہو سکی اور نہ ہی
ہندوستان میں اس کے کئی نسخے کا سراغ مل سکا۔ ایذا انگ سوسائٹی آف
بنگال دہلکستہ اور سنٹرل لائبریری (دہلکستہ) میں بھی اس کا کوئی نسخہ موجود
نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو گلدستہ حیدری کے نقلی نسخے برائے نام

لندن اور باؤلٹن اسکورڈ میں دستیاب ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے گلدستہ
حیدری کی کہانیوں کو "مختصر کہانیاں" کے نام سے دیوان کو "دیوان حیدری
اور تذکرہ گلشن ہند" کو "تذکرہ حیدری" کے نام سے تین کتابوں کی شکل میں
کراچی سے شائع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو حیدری کی کُل ۱۸۰ کہانیاں دستیاب
ہوئی تھیں، لیکن ان میں سے بعض کو انہوں نے برہنہ کے کثافت منہ
کر دیا ہے۔ چنانچہ مطبوعہ چھوٹی بری ۲، کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں اپنی
ساخت اور مدخل میں مختصر اسانے اور حکایات سے مشابہ ہیں
ان میں مختلف موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ حیات انسانی کے
مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کہانیوں سے اس عہد کے فک
اور تہذیب پر مشرکوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ بے حد دل چسپ اور مزہ
میں۔ بعض کہانیاں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ
جنابہ وسلم، حضرت زین العابدین، امام باقر، امام جعفر صادق وغیرہ
تعلق رکھتی ہیں۔

حیدری کی یہ کہانیاں زبان اور اسلوب بیان کا بہت عمدہ نمونہ
پیش کرتی ہیں۔ دوسرے سطرے کے دو زمین صفات کو محیط ان کہانیاں
میں حیدری نے واقعات کو ٹہری چابک دہی سے پیش کیا ہے۔ ان
کی زبان آسان اور سادہ ہے۔ کہیں کہیں وہ محاوروں اور ضرب الامثال
کا استعمال بھی بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ حیدری نے محاوروں کو بھی شاعری
میں پیش کیا ہے۔ بعض کہانیوں کے مکملے اور بیانات سے گفتگو کا لطف
حاصل ہوتا ہے۔ حیدری نے اکثر دیشتر لغز کو بھی اس لب و لہجے میں
استعمال کیا ہے۔ مفسر ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ان سے حیدری
کی کہانیوں کی زبان و بیان کی خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں :-
"سنا ہے کہ ایک آزاد کو سید میں بیجا ہوا جھنگ گزرا
تھا۔ ایک بھٹی نے اپنی کھڑکی سے دیکھ کر کہا کہ "اے
بے و ہمت ! یہ خانہ خدا ہے۔ یہاں سر جھکا سے زمین او
ماں اٹھا کر گرتے ہیں تو سبزی گھونٹتا ہے۔" اس نے سر
اٹھا کر کہا کہ "ذرا آئینہ دیکھو ! انہیں تو شاہدوں سے موہ
کا لہا ہے۔" لہ

"مٹلے کو دو شخص محل مندرک محبت بے وقوف کو
اپنے ساتھ لے کر کسی شہر پہلے ادا کیا دیا میں مع اسباب
غریب ہوئے۔ بعد ایک ساعت کے بعد سب غافل ہاتھ ملے اور

لہ مختصر کہانیاں از حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۲۸۲

لہ دیباچہ گلدستہ حیدری ق ۱، برٹش میوزیم لندن بحوالہ مقدمہ دیوان حیدری
ص ۱۳
لہ مقدمہ تذکرہ گلشن ہند از حیدری مرتبہ ڈاکٹر مفتاح الدین آرزو ص ۱۴

Proceedings of the college of Fort william,
vol. ۷۷۹, P. ۲۷۸

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دیوان حیدری کے مقدمے میں کل کورٹ اور اس کا عہدہ
کے حوالے سے لکھا ہے کہ حیدری کو "گلدستہ حیدری" پر دو سو روپے کا انعام ملا تھا۔
لیکن یہ کتاب شائع نہ ہو سکی (ص ۵۸) حالانکہ ملتان میں مرقی صاحب نے ایسی کوئی
بات نہیں نقل کی ہے۔ واقعہ یہ کہ انعام دانی وہ پہلی فہرست ہی نامنظر کر دی
گئی تھی، اس لئے انعام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حیدری کی بعض غزلیں چھوٹی اور بعض طویل بحرول میں ہیں۔ انہوں نے اپنے حرمیان گل کرست اور نواب علی ابراہیم خان کا قصیدہ بھی درج کیا ہے۔ حیدری کے تعلقات اگرچہ افغانی کے نامور ہندو نہیں ہیں، لیکن ان کے خلی بھی نہیں۔

حیدری نے تذکرہ گلشن ہند ۱۲۱۳ھ میں سندھ میں ترتیب دیا تھا۔ قاضی کے قلعے سے سندھ تک جا کر وہاں رہا۔ مرتب کر چکا جب تذکرہ میں درج ہے کہ یہ شیخ اور ہند کوئی تادمغ اس کی حیدری خوب اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند حیدری نے تذکرہ گلشن ہند نظرائی کا کام لیا وہاں میں شروع کیا تھا۔ منگریہ تک نہ جوسکا۔ دوبارہ سندھ میں پھر نظرائی کی اور بعض جگہ سن میں بھی تبدیلی کی بلکہ حیدری گلشن ہند کے دیباچے میں سبب تالیف بیان کرتے ہیں :-

"لہذا اس کے صاحبان طبیعت معلوم ہو کہ یہ حیدر بخش متخلص بہ حیدری خلف تینہ پادشاہی یعنی سرائی دلی ایشا گود قیل کوثرن مولوی غلام حسین غازی پوری، تلمیذ پادشہ مجلس نواب علی ابراہیم خان بہادر مرحوم سندھ بارہ سوچہ بگری میں آکھوئی رجب کوثری کی راہ بنارس سے مرشد آباد کی جانب روانہ ہوئے۔ بعد قطع منزل غازی پور کے قریب پہنچا۔ وہاں مرزا محمد علی مرزا محمد فضل کے بیٹے، آملی کے رہنے والے سے مل کر وہ بھی ایک شعی میں سوار ہوئے، اسی سمت لوٹے تھے۔ ملاقات ہوئی۔ صاحب سلامت پیدا کی۔ یہاں تک کہ اکثر اوقات ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی میرانی فرما لیتے تھے اور شیعی موزوں رکھتے تھے۔

۱۔ تذکرہ حیدری از حیدری مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص: ۱۳۳
ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر علی بیگ تذکرہ ذکر کے مکمل ۱۳۴۲ھ تسلیم کرتے ہیں، باور مند جہ بالا قطع کالہ دیتے ہیں، لیکن تذکرہ حیدری (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی میں آخری مصرعہ "اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند" اور مرزا علی لطف حیات اور کا نام لے کر "اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند" چھپا ہوا ہے۔ راقی کووند نے چونکہ مندرجہ بالا قطع تذکرہ حیدری سے نقل کیا ہے اس لئے ہر اک گلشن ہند لکھ دیا۔ وہ مصرعوں میں چھپا چاہئے۔

اسے کہتا ہے ہر اک گلشن ہند = ۱۲۶ + ۸ = ۱۳۴ھ
لے مرزا علی لطف حیات اور کا نام لے ص: ۱۱۵

اسی سبب سے ذکر و سخن ہم ہو کر آتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ میرے پاس ہندی کے دیوان متعدد ہیں ان کی ہر کر اور اچھے اشعار ان میں سے منتخب کر کے ترتیب دو جو تمہاری یادگار ہو۔

اگرچہ طبیعت اس ذہنی کمالات سے فراز کا لطف زمانہ سے ہر اک میں منوش رہتی تھی لیکن ان کی خاطر اس اڑب کے بڑے تھی۔ وہ دیوان دیکھے۔ موافق اپنے واسطے کے اشعار چنے اور نام ان کے مصنفوں کے بہ قدر تحقیقات کے احاطہ تحریر میں لا کر، اس تذکرہ کا نام "گلشن ہند" رکھا۔

"گلشن ہند" میں حیدری نے "تذکرہ گلشن ہند" کا ذکر کیا ہے :-
"اس آفرینے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام مع اشعار و قصص کے جمع کئے اور کئی مجرب و بکری تمام لکھے۔ انہوں نے یہ کہ دو مجرب حرف شن سے کہ حرف 'ی' مذکور ہے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبت تحریر حرف یا تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ اگر خدا ناسی موت سے قدر سے رفاقت کرنا ہے تو یہ فکر اسچھرنے سے اس احوال ان شعرائے کرام کو فراموش نہ کرتا ہے۔ اور یہ جلد دو چار مجرب جو کلام و اسباب سے تیار ہوئی ہو سکتی ہے فحشی میر بہادر علی صاحب قلم دوام اقبال لکھی۔"

ڈاکٹر مرزا اکبر علی حیدری کے ان دونوں بیانات کو دوروغ گوئی سے تہہ پر کرتے ہوئے "گلشن ہند" تذکرہ گلزار ابراہیم" کا ترجمہ و تلخیص قرار دیتے ہیں بلکہ اور دونوں تذکروں کے تقابلی مطالعہ سے اسے ثابت بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عثمان الدین آرزو نے "گلشن ہند" کے مقدمے میں اس جانب توجہ نہ کی۔

لے مرزا علی لطف حیات اور کا نام لے ص: ۱۱۵ - ۱۱۸

لے دیباچہ تذکرہ حیدری (گلشن ہند) مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص: ۳۱ - ۳۲

لے "گلشن ہند" ق۔ ن۔ باڈین آکسفورڈ اور برٹش میوزیم لندن ص: ۲۲۳
بجواز مقدمہ دیوان حیدری ص: ۱۳۳

بین الاقوامی زبان کا سائنٹفک معیار

العالم میں یہی ہو گا کہ وہ اس آخری حیرت انگیز مہولی زبان ہے۔ پھر یہ بھی بہت حد تک درست ہے کہ زبان خلقِ نوفا رہے خدا سمجھو۔ مثال کے طور پر مشاہیر کے یہ اقوال اس کے مؤید ہیں:-

۱۔ لام اجل - امرت لال - بشیش پر دپ - کلدیپ تلوار -
نرس کونیر آل انڈیا غیر مسلم اوروں کے لفظوں، لکھنؤ، منعقدہ نومبر ۱۹۴۳ء
”یہ تہذیب، ادبی اور سائنسی نقطہ نظر سے ایک ایسی جدید اور مکمل
زبان ہے جس میں ہندوستانیات - قومیت اور آفاقیت کے جملہ عناصر
ظہر چمک دیک کے ساتھ مل کر رہیں۔“

۲۔ سید رفیع مارہروی: - مسلمانوں کے ہندوستان میں مستقل
قیام کے ساتھ ایک بین الاقوامی زبان کی بنیاد قائم ہو گئی۔“
۳۔ نرائن دت تیواری سابق ڈیپارٹمنٹل سیکریٹری:-

He said "Urdu was a language not only of national but international importance and the role it had played in bringing about integration in India, could not be minimized."

”یعنی اردو صرف قومی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی اہمیت کی زبان ہے اور
اس نے ہندوستان میں اتحاد پیدا کرنے میں جو کام کیا ہے، ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔“

۴۔ یادگار جریہ کھنن، نومبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۲

۵۔ ہندوؤں میں اردو صفحہ ۳۵

The Daily Pioneer, Lucknow-22-12-1972

ہمارے ملک کے مشہور ماہر سائنات پنڈت کھولانا تھواری نے
زبان کے حسب ذیل درجات بیان کیے ہیں:-

۱۔ معیاری زبان Standard Language or Koine
”تہذیب کی ترقی سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی سائنسی علاقے کی کوئی بولی
معیاری (مکسائی یا ٹیکنالوجی) مان لی جائے اور اس پورے علاقے کے علاقے
سے متعلق کاموں کے لیے اس کا استعمال ہوا سے معیاری زبان کہتے ہیں۔“
۲۔ قومی یا ملکی زبان National Language

”جب کوئی بولی معیار بننے کے بعد بھی ترقی کرے اور اہم بن جاتی ہے اور
پورے ملک یا مملکت میں مختلف سائنسی علاقوں اور مختلف سائنسی
غائزوں کے علاقوں میں بھی اس کا استعمال عموماً ہونے لگتا ہے تو وہ قومی زبان
یا راشٹر مہاشا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندی (ناگری) کو دھیرے
دھیرے بھارت میں تقریباً یہ مقام حاصل ہو رہا ہے۔“

۳۔ عالمی، آفاقی یا بین الاقوامی زبان International Language
”کسی بولی کی آخری حد کی شکل میں اس کا بین الاقوامی زبان ہوتا ہے۔“
اور جو تعریف بیان کی گئی ہے اس میں ایک فقرہ ”آخری حد“ قابلِ فہم
ہے۔ آخر کی زبان کے متعلق یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ زبان، اس آخری حد کو
پہنچ گئی ہے جہاں اس کو بین الاقوامی زبان کہا جاسکتا ہے؟ ویسے تو ہم
مکسائی پر براہِ دوہی کے متعلق سننے اور پڑھنے سے پہلے آئے ہیں کہ یہ ایک
بین الاقوامی زبان ہے اور غالباً کہنے والوں کا منشا کھولانا تھواری کے

۴۔ ہر سائنات ترجمہ اقتباس از صحیفہ اشاعتیہ ۱۹۴۳-۶۵-۶۸

● ادارہ سائنات نزد مسلم سفر خانہ، ہزارچ (دیوبند)

مذکورہ نکات کا تجزیہ و ترتیب

مذکورہ بالا ہر دو قسم کے نقطہ ہائے نظر کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف دو نکات مثلاً ۱ و ۲ تو ہر دو میں مشترک واقع ہوئے ہیں اور بقیہ تمام نکات میں سے نو عدد روسی ناضل کے اور سات عدد انگریزی فاضل کے اپنی اپنی قومی انفرادیت کے حامل ہیں نیز یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ہر دونے درجہ آفاقیت زبان کو کلیتہً یا زیادہ تر صرف ذاتی معنیوں سے دیکھا ہے اور اپنی قومی زبان کے قول و فعل کے مطابق دنیا کی ساری زبانوں کو ناپ دیا ہے۔ یہ انداز نگاہ قطعاً غیر علمی یعنی Unscientific ہے۔

تاہم ان ہی نکات کا تجزیہ کر کے ذیل میں ہم ان کی علمی تربیت قائم کرنے میں ناکام نہ رہیں۔ کچھ کی کچھ توجہ دے کر دیکھیں کہ اس سے علمی طریقے پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو معنیوں کے بیان کردہ نکات مجموعی طور پر اشارہ ہیں، جن کو ہم دو بنیادی اقسام کے تحت پر آسانی رکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ ہر دو نکات واضح طور پر زبان کے اوصاف و اقدار Quality سے تعلق رکھتے ہیں اور بقیہ نکات تعداد و مقدار Quantity کے لحاظ سے قائم کئے گئے ہیں۔

الف۔ یہ لحاظ کا اوصاف و اقدار	ب۔ یہ لحاظ کا تعداد و مقدار
۱۔ کسی انٹرنیشنل لین بر مجموعی اطلاع کا ذریعہ ہو۔	۱۔ دنیا میں کثیر تعداد کو بولنے والے ہوں
۲۔ کافی ایک دار ہو۔	۲۔ کھانا پھرنا جاننے والے ہوں
۳۔ صلاحیت جذب ہو۔	۳۔ " طلباء زیر تعلیم ہوں۔
۴۔ کھانا کوئی کی زبان ہو۔	۴۔ " اہل تحریر ہوں۔
۵۔ ٹرانسپورٹ کی زبان ہو۔	۵۔ " عالمی سطح پر اشاعتی اواسط
۶۔ محققان بنانے کی لیاقت ہو۔	۶۔ " تعلیمی اداروں میں معنیوں تعلیم و تحقیق ہو۔
۷۔ سامعین تعلیم کے قابل ہو۔	۷۔ " کہ جس میں ہر معنیوں کوئی کی ہو

New Times, 37, Moscow, Page, 7, Learning
 seian, by Greenov = گریہ وی نیف
 The daily Pioneer, Lucknow, 25. 7. 1971,
 ge II with Ref. to the British weekly
 urnal, New Society, under heading
 English a Multiracial Language. "

اسی طرح بہتر سے حضرات نے اپنے اپنے طرز و انداز سے انہما خیال کیا ہے لیکن انہوں نے یہ حال نیز انہیں اندر میں غلط و صحیح ہونے کا احتمال معین نہیں ہونا امر مسلم ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ چند اصول و معنوں پر اس طرح کے اقوال پر تحقیق کر کے دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک صحت و حقیقت کا عنصر ہے کیونکہ نظریات کو جب تک علمی طریقے سے آزمایا نہ جائے اور ثابت نہ ہو کرے
 Scientific
 سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے اس وقت تک اہل علم کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ اس بحث کی تفصیلات کو ہمارے مقالے " اردو کی بین الاقوامی حیثیت " میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہاں پر ہم معنوں کے کٹر ایک بنیادی پہلو کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ " بین الاقوامی زبان کس کو کہہ سکتے ہیں؟ اس کا مصدق اور اس سے مراد کیا ہے؟ اس کی شرائط کیا ہوں؟ اس کی کیفیت و خصوصیت کیا ہو سکتی ہے اور اس کی حدود نہایت کیا ہے؟ وغیرہ کتنے سوالات ذہن میں آجھڑتے؟ دماغ میں آجھڑتے جن کا فلسفی بحث میں ہونا چاہیے تاکہ ہم اردو کے متعلق ابتدائی طور پر یہ رائے قائم کر سکیں کہ ذاتی یہ بین الاقوامی زبان ہے اور سچہ یہ دیکھیں گے کہ اس سطح کی دیگر زبانوں میں اردو کی پوزیشن اور اس کا مقام کیا ہے اور ثابت شدہ حقائق کے پیش نظر کیا حیثیت ہونا چاہیے جس کی دراصل وہ مستحق ہے۔
 ذیل میں ہم اس وقت دنیا کی دو مشہور اور بڑی زبانوں کی درجہ آفاقیت اور بین الاقوامیت کو جواب دہانہ کیلئے قائم کی ہیں " کا ترجمہ مختصراً غور کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں:

درجہ آفاقیت زبان

روسی	انگریزی
۱۔ کسی انٹرنیشنل لین بر عمومی اطلاع کا ذریعہ ہو۔	۱۔ کافی ایک دار ہو۔
۲۔ دنیا میں اس کے کثیر تعداد کو بولنے والے ہوں۔	۲۔ صلاحیت جذب ہو۔
۳۔ " کھانا پھرنا جاننے والے ہوں۔	۳۔ کھانا کوئی کی زبان ہو۔
۴۔ " زیر تعلیم طلباء ہوں۔	۴۔ ٹرانسپورٹ کی زبان ہو۔
۵۔ " اہل تحریر ہوں۔	۵۔ محققان بنانے کی صلاحیت ہو۔
۶۔ " اشاعتی ادارے عالمی سطح پر ہوں۔	۶۔ سامعین تعلیم کے قابل ہو۔
۷۔ " تعلیمی اداروں میں معنیوں تعلیم و تحقیق ہو۔	۷۔ اس میں ہر معنیوں کوئی کی ہو
۸۔ " کتب ہر معنیوں کی ہوں۔	۸۔ " جریہ ہر معنیوں و ذہن کے کہ
۹۔ " " جریہ ہر معنیوں و ذہن کے کہ	۹۔ " " جریہ ہر معنیوں و ذہن کے کہ
۱۰۔ " تعلیمی ادارے عالمی سطح پر ہوں۔	۱۰۔ " تعلیمی ادارے عالمی سطح پر ہوں۔
۱۱۔ بین الاقوامی درجہ عالمی ادارے سے متعین ہوئے	

- ۸۔ میں الاقوامی سطح پر سپردش کی زبان ہوں۔
 ۹۔ میں عالمی سطح پر تعلیمی ادارے ہوں۔
 ۱۰۔ میں الاقوامی درجہ عالمی ادارے سے متعلق ہوں۔

کے علاوہ بھی کچھ وجوہ اور ہو سکتے ہیں؟ اور اگر ہو سکتے ہیں تو ان کے نتیجے میں
 اردو کا حقیقی مقام کیسا ہے؟

خبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زبان کی بین الاقوامیت کو مستحق
 کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور زبرد قابل توجہ اور اہم اضافہ ہیں۔ درجہ
 ان کے بغیر کوئی بھی زبان ہو وہ عالمی و آفاقی سطح پر ناقص و نامکمل ہونے
 کے مترادف ہے۔ ان مزید وجوہ میں پہلی شرط زبان کا اپنے متعلقہ و
 مطلوبات کے متعلق ہونا ہے۔ اور مکمل زبان کے متعلق سرچوش (۳۲) نام
 سلسلہ (۱) ایک مشہور برطانوی فاضل اہل السنہ مشرقیہ ماہر لسانیات نیز باکی
 بگال ایشیاٹک سوسائٹی ملکہ کا مقررہ ہے:-

"A perfect language would be that in which every idea of entering the human mind might be neatly and emphatically expressed by one specific word and on the same principle a perfect system of letters sought to contain our specific symbol for every sound used in pronouncing the language to which they belonged."

یعنی مکمل زبان وہ ہوگی جس میں انسانی دماغ میں آنے والا ہر خیال
 صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ ادا ہو سکے اور
 اسی اصول کے مطابق مکمل نظام لہجہ ہو سکتا ہے جس میں ایک مخصوص
 علامت یا حرکت ہر اس آواز کے لئے ہو جس زبان کو بولنے والوں
 میں مستعمل ہو۔ لہ

اس اصول کے لحاظ سے مادی انطز میں اردو اور انگریزی دونوں
 مکمل زبانیں کہی جاسکتی ہیں لیکن کسی زبان کا اپنی بکری معنی معاشی یا قومی اعتبار
 سے مکمل ہونا اور بات ہے اور بین الاقوامی حیثیت سے مکمل ہونے کے
 ہے چنانچہ فاضل و امام لسانیات ولیم جونس کے مذکورہ اقتباس پر
 غور کرنے سے یہ حقیقت بھی منکشف ہو جاتی ہے جیسا کہ اس نے لکھا
 ہے کہ:- "ہر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آسکتا ہے۔ اس سے ظاہر
 ہوتا ہے کہ قابل کے ذہن میں مکمل زبان کے تصور میں کوئی معاشی، علاقائی
 یا کوئی خاص ملکی و قریبی زبان نہیں ہے بلکہ مکمل زبان وہ ہے جو دونوں
 انسانی کے دماغ کے ہر خیال کو بخوبی ادا کر سکے۔ یہ الفاظ دیگر موصوف
 کا دوسرے سخن بین الاقوامی زبان کی طرف ہے۔ لہذا وجوہ آفاقیت زبان
 میں ایک اہم شرط زبان کا مذکورہ حیثیت سے مکمل ہونا بھی ہے اور اس

ان وجوہ کی ذمیت یہ ہے کہ ان میں سے منمن اوصاف کے نکات ۵ و
 ۶ اور منمن مقدار میں دس کے دسوں زبان کے ذاتی اوصاف نہیں ہیں بلکہ
 انسانی ہیں۔ یہ جوہ نہیں عرض ہیں۔ ان کا وجود انسانی نفس فاضل ہے جن کا نام
 عقل و اعتدالی و سماجی طاقت اور محبت و اتفاق سے ہے یعنی اگر بڑی
 طاقتوں کی پشت پر تکیہ نہ ملے تو بڑی سے بڑی زبان اس میدان میں آرد و
 بھی کئی گز برتری معلوم ہوگی۔ اس لئے خاص کر نکات ۵ و ۶ منمن اوصاف و
 اقدار کے سلسلے میں اردو و پنجاب ہندوستانی میں کس کے علاوہ کوئی کیا سکتی ہے۔
 کیوں کہ اقتصاد فی نفع اندوزی اور سیاسی سرپرستی کی رہنمائی ہونے کے
 لحاظ سے اردو و پنجاب کی اچھا بگال اور برائے شری طور سے جرمان نصیب واقع ہوئی
 ہے۔ لہذا اردو و پنجاب کے اردو و پنجابیوں کے اردو و پنجابیوں کی قومی یا
 عملی تائید سے بھی لازماً مجبور و محروم ہے اور اس کا علاج "غریب ہٹاؤ"
 اسکیم کی کامیابی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور بحال موجودہ اس کی حقیقت
 غالب کی "جنت" سے کم ہے حقیقت نہیں ہے۔

لہذا یہ بات جو منمن اوصاف و اقدار کے تحت اردو میں یعنی ۱ تا
 ۱۰ کے تحت البتہ زبان کے ذاتی اوصاف ہیں اور ان کا تشق بلو
 راست لسانیات سے ہے۔ علمی بحث کے اعتبار سے ان نکات پر اردو
 کے متعلق عقلی دلائل، قومی شہادت اور واقعاتی و عملی ثبوت مقالے
 میں جب موقع مل جائے گی لکھے گئے ہیں۔ جو ملاحظہ میں آئیں گے۔ درجہ
 قریب موصوف کے مختلف لسانیاتی و عملی گوشوں کی نشان دہی پر اکتفا
 کرتے ہیں۔ ہاں مذکورہ بالا ہر دو قسم کے وجوہ آفاقیت پر غور کیجئے تو ایک
 پر لطف مگر حقیقت آمیز اور معنی خیز انکشاف یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کا اندازہ
 عملاً عددیاتی Statistical ہے خاص کر روسی وجوہ تو قریب
 قریب آبی پر پھر ہیں۔ انگریزی کے وجوہ میں البتہ زیادہ تر علمی و لسانیاتی
 نکات کو بیان کیا گیا ہے اور یہ دونوں انداز اپنی متعلقہ زبانوں کی فطری
 حیثیتوں کو واضح طور پر متعین کرتے ہیں۔

چونکہ میں اردو میں الاقوامیت کو فاضل علمی و لسانیاتی انداز سے
 پرکھنا سمجھتا اور سمجھتا ہوں۔ اس لئے تقابلی مطالعے کے ہے ہم ان دونوں
 مذکورہ زبانوں میں سے انگریزی کو لیتے ہیں جو اردو میں کئی لحاظ سے اردو
 سے قریب ہوتی ہے۔ لہذا اب ہم یہ دیکھیں گے کہ انگریزی زبان کے
 وجوہ آفاقیت جو بیان کی گئی ہیں ایسی زبان کی ہیں الاقوامی حیثیت
 کے متعین کرنے کے لیے علمی و لسانی نقطہ نظر سے کافی اور مکمل ہیں؟ یا ان

۱۔ بحوالہ ام۔ باہم لدائی استاد علی گڑھ لٹری و سٹی ہسٹون مطلوبہ
 الیٹریٹ ویکلی بھی بابت اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۲۱

سحر (کھڑی)

جرم اندو کے دریاں تم ہو گئیں
کاروان کیا تم سو اسٹند لہ تم ہو گئیں
راستہ کے پیچھے دم میرا دریاں تم ہو گئیں
یہ زمین تم ہو گئی یہ آسمان تم ہو گئیں
راز کی تہ نہ ہو بر بارز تم ہو گئیں
برجیں تم ہو گئیں آسمان تم ہو گئیں
کون دیکھے نرزا را اجمار رشق بندگی
کون تہجہ حوّل کر لے اپنے مرز پرستی
آئینہ فاش ہے کچھ متی تہ تیجہ پس
دو دے میں کوئی میکش تو کوئی نہیں
انجمن ذرا انجمن سرم نامی معنی افزہ تھا
ایسے جلدی میں ذرا لکھ لکھ تم ہو گئیں
کیوں نہیں سننے سے آنا اب منزل کا مقدم
کیا کیس یہ شہر شیریں بیاں تم ہو گئیں

ہیں خواب میں ہنوز...

ظہیر صدیقی

وہ اک شے

کہ جس کے لئے

پاک فلیٹ بزرگوں نے

اپنے بدنِ دھن کے سارے جوہر گنوائے

لہو کے گہر

خارزاروں کی پہنائیوں میں لٹائے

وہ اک شے جسے

اُن جیلے بزرگوں نے

جیب و گریباں،

دل و دعاں سے بڑھ کے سمجھا

جو حاصل ہوئی تو

ابھی نام و در سے سیہ لات لپٹی ہوئی تھی

سفر کی تسکین — یا

گراں باری عمر نے ان کے اعصاب کو مضطرب کر دیا تھا

انہوں نے یہ سوچا

خدا جانے سورج نکلنے نہ لگا کیا سے کیا ہو

میں بے بہائے کے حق دار

ان کے جہاں سال بچے ہیں

اس کی حفاظت دی کر سکیں گے

جہاں سال بچے

ایسی بسترِ راحت پر سونے ہوئے تھے۔

جگانے لگے —

صبح کا زب کی دھندلاہٹوں میں

جبکے ہوئی وہ جیں شے

وراثت میں ان کو ملی تھی

مگر سب نے دیکھا تھا سورج نکلنے پہ

ان سست دچالاک بچوں کے ہاتھوں میں

محفوظ وہ قیمتی شے

تبدار کا اپنی چمک کھوری تھی

حقیقت ہے وہ بے بہائے

کہ جس کے لئے ہر مصوبت گوارا ہے

منزل نہیں — جب جو ہے

وہ اک چیز جس پر بچھاؤ

جیا لوں کا روشن ہو ہے

نقطہ رنگِ دُوبی نہیں

گفتگو کی ہنسی ہوئی آرزو ہے

ہر اک نفع جائز تو نقصان کے بطن سے ہے

انہوں نے جو حاصل کیا وہ زیادہ تھا

اور آخر شب کے کچھ خواب کو جو گنوا یا

وہ کم تھا

اسی نامناسب حصول و خسارہ کا ردِ عمل ہے

کہ منزل کی آمیزش میں بھی

انہیں سکھ نہیں ہے

○ "جیون پرکاش" فریڈرک ڈیو، پٹنہ ۸۰۰۰۱

عشرین

عشرت دھولپوری

آئینہ دیکھنے کا منہ روئے گیا مجھے
پتھر بھی منزلوں کی خبر نہ لیا مجھے
میں اپنے بازوؤں کے حصاروں میں دیکھا
تھوڑا سا اکا اکا تو پر دے گیا مجھے
اک شخص جس نے بھیر میں تھا ہاتھ میرا
وہاں راستوں کے سفر دے گیا مجھے
اس زندگی کا دست تھا بے اس نے امید
اک اپنی خواہشوں کا شجر نہ لیا مجھے
اُس کے تمام خوابوں کی تعبیر میں ہی تھی
یہ خواب بھی وہ پھیل پھیل کر گیا مجھے
روایوں کے خوف سے اٹھتی نہ تھی نگاہ
وہ اپنے ابروؤں کی سپر نہ لیا مجھے
مذہب میں نہ مانگا تھا مانی کا کھڑا
نیزوں پہ چھوٹے ہوئے سر نہ لیا مجھے

• علامہ منعب داران، دھولپور (رامپتان)

عشرت قادری

نگاہ آئینہ ہے، عکس متعارفوں میں
حیات قرض ہے مجھ پر تو زیر بادوں میں
پگھل نہ جائے آنا شدت تمازت سے
گواں ہے طبع خریدار کو عیار ہوں میں
صباحِ گلِ ولالہ سے کھیلتی ہے حیات
اگر یہ دہر جہنم ہے خوابِ زار ہوں میں
تلاشِ ذات ہے مجھ کو نفی سے تا اثبات
نظر میں لوگوں کی سرگشتہ فگار ہوں میں
سوا دشب میں اک آواز پر ہوں گرم سفر
اسیرِ لطف نہ، آوارہ بہار ہوں میں
جانی ہاتھوں سے چہرہ چھپا رہا ہے وہ
شکستِ عہد یہ بھی تہنیت گزار ہوں میں
جو کپ بچتی تو - نویدِ حسرتِ عشرت
ہزار راتوں سے سرتاپا انتظار ہوں میں

• مرکز ادب، ایم۔ ایل۔ جی کالج روڈ، جھو پال ۶۱۲۰۰۱

• علامہ منعب داران، دھولپور (رامپتان)

شہد مابہ

بُٹے پر اپنی مس آئے
کھرکیاں کھول دو ہوا آئے
منزلیں اپنے نام ہوں منسوب
اپنی جانب بھی راستہ آئے
چلتے بچتے چراغ سدا دل میں
آرزوؤں کا سلسلہ آئے
غاشی لفظ لفظ بھیل سہتی
بے زبانی میں کچھ مٹا آئے
رنگ بے رنگ منظروں سے بچر
ایک بے نام ہی صدا آئے
ڈوب کر ان آواں آنکھوں میں
اک جہان طرب لٹا آئے
دل میں رہے کہ اک حش اٹھے
بے سبب اک خیال سا آئے

نغمی صدیقی سلووی

تم کو اگر ملے یہ برینا سمیٹ لو
سمیٹیں رات دن کا تماشا سمیٹ لو
کیوں گھاٹ گھاٹ پھرتے ہر درد گھوٹ لے لے
کوزہ اٹھاؤ فقر کا دریا سمیٹ لو
ہر سرو قد کا سایہ سرشام جھک گیا
پھر کیوں نہ اپنا درست تھا دنیا سمیٹ لو
یہ گیر و دار شیر و شکر کی دکان پر
جیسے کہ ہاتھ آگیا عفا سمیٹ لو
ہم جانتے ہیں خوابوں کی صورت کڑی ہے کیا
تمہارے پیار لٹ چکا تیشہ سمیٹ لو
آنے دو گرم دھڑ دھڑائیں کبھی کبھی
مددوارہ کھول دو درپردہ سمیٹ لو
نغمی مزاج ہنسی کو آئے ہیں چند لوگ
یہ داغ داغ چادر و تکیہ سمیٹ لو

نظم ہاتف

کریب ترش دلت کی ہر داستان گمراہ کن
یعنی ہر برگ تماشائی خوشچکان گمراہ کن
بیٹھ سکتے ہیں نہیں سرحد کو
منظر کھائی ارض و سماں گم
ہاں ظلم زدہ کرے میرے اکثر اکثر انتہا کن
اول و آخر وہی، لب لباب گمراہ کن
روح میں مضمر معانی، جم لفظو
سازش اعراب سے، میں خستہ جا
بھر طبع شب گزیدہ، شورجوں کی بستی
اب چراغوں تک کا بھی ساں گمراہ کن
اپنا اپنا سر چھپائے ہیں یہ اپنے
اجتا جابجہ سے، سران گمراہ کن
منتظرانہ و سکین گفتنی میرا
آنکھ شیشے کی نہ پتھری زباں گمراہ کن

سوچ مکھی

”کھڑے صاحب دکھائی نہیں دے رہے۔“
”وہ تو بندوستان سے باہر گئے ہیں بڑنس
فریر“

جائے والے کو دیکھ کر ادھر متوجہ ہو گئی۔
”وہ دو جائے دینا۔ خوب گرم اور مستحکم۔“ وہ
ٹوکری سے بسکٹ نکالنے لگی۔ ”کھڑے صاحب کو
باہر گئے تو تین بیٹے ہو چکے۔ بسکٹ لونا“
اس نے بڑی لغہاست سے ذرا سا لبکٹ کرتا ہوا۔

وہ خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی۔ ہلاک
میک آپ جس کی جگہ جو تک پہنچ رہی تھی۔ کانٹوں
میں ہیرول کے ٹاپس، گٹھے میں بیٹے موتیوں کی
تین لڑکی مالا، کمار مرگھری ہلکے گلابی پھیرلیوں
والی باریک سفید ریشمی۔ کالے سینڈل۔

”بھٹان کوٹ میں پورے سفید ہوا آج کل؟“
”نہیں ہوں تو اوتسہ رہیں۔“ وہی
آوارہ گردی۔“

”دی اک چال بے وضعگی۔“ وہ سنہی
میں بھی ہنس رہا۔ وہ دو دستوں کی طرح
بائیں کر رہی تھی۔ نہ جھجک نہ بے حاشرم۔ جو
خواہ مخواہ حیرت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ہم
خاص مگر بڑے قسم کی نگاہ کر رہے تھے، بچوں کی،

ہو گئی، بچے ہو گئے، میری بیوی نے کب اور کیے
مجھے سنبھال دیا، خبر ہی نہیں ہوئی۔
میں کھڑکی کے سامنے جیسے بندھا کھڑا تھا کہ
اچانک سسٹھانے میری طرف دیکھا۔ بل بھر جیسے وہ
پہچان اور انصافیت کے دوراہے پر کھڑی خود سے
”کھیتی رہی پھر سرکاری۔“

”اے سریش تم؟“ وہ کھڑکی کے قریب آگئی۔
”یار رہے ہو کہیں؟“

”ہاں، بھٹان کوٹ؟“ میں بھی کھڑکی کے
پاس ہو گیا۔ ”میرا خیال تھا تم مجھے پہچان لگی نہیں؟“
”کیوں۔“ پہچانوں کی کیوں نہیں؟“
وہ ہنس دی۔ ”تھوڑے۔“ مجھے ہورہے ہو۔ میک
سبھی لگ گئی ہے۔“

میں نے اس کے باول میں چپکتے دو چار سفید
تار دیکھے، جن سے وہ اور بھی مدیر اور خوبصورت
ہو گئی تھی۔ ”کہا کچھ نہیں۔“ میں ہنس دیا۔

”اندر آ جاؤ۔“ وہ خوش دلی سے
بولی۔ ”میں بھی بھٹان کوٹ جا رہی ہوں۔“

میرے پاس دوسرے دو بے لاکٹ تھا پھر
مجھ میں انکا نہیں کر سکا۔ اندر اس کے سامنے جا
بیٹھا۔ کہیں میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس کا مختصر
سامان کچھ اس کی گواہی دے رہا تھا۔ پھر بھی
میں نے پوچھ لیا۔

”اچھی لکس سنبھالے، کسی مناسب جگہ کی
تلاش میں، کھڑکی میں جھانکنا میں پلیٹ منام
پر چل رہا تھا کہ خیرٹ کلاس کے ایک کسینا نے بیٹھی
وہ نظر آئی۔ وہ اکیلی تھی اور فرش پر رکھی ٹوکری اس
کو تھلا کر رکھی تھی۔ میں ششک گیا۔ ششامی
تھی۔ تقریباً بندہ برس بعد سے دیکھا تھا۔ اب
وہ پہلی والی ڈیپٹی تھی نازک سی لڑکی نہیں تھی۔ مکمل
عورت تھی۔ گلزار بدن پہنچی اور ٹھہراؤ لیے گھبر چڑھ
— باوقار۔ بی۔ اے فاسٹ کا استعان دیا تھا

کہ اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ بیٹے آتی
جاتی رہی میں ہی اس سے ملنے سے گریز کرتا رہا۔ شاید
یہ خاموش شکایت تھی، اجماع تھا،
حالانکہ اس کا کوئی ٹکڑا نہیں تھا۔ اور اگر نہ
ہوئے مجھے دکھ ہوتا تھا لیکن اس میں ایک عجیب
سی لذت کا احساس بھی مل رہا تھا۔ سسٹھان کو
نے کر میں نے ایک خیالی شخصیت کو ملایا تھا، جو اس
کا ڈونڈی جانتے ہی دھڑام سے میرے اوپر آگرا تھا
اور مجھے زخمی کر گیا تھا کسی کلاس حادثے کی خبر
نہیں ہوئی تھی۔ پہلی مرتبہ جب سسٹھان سے کسی اتنی
تو اس کی اولاس لکھوں نے کہا تھا۔ ”میں سب
معلوم ہے۔“

ان پندرہ برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔
ایم۔ اے کرنے کے بعد میں نے ٹوکری کی کھیتی شادی

مجھائی کی، اس کے میاں کی، میری بیوی کی۔
 اُس نے دل کو مل کر میری بیوی کی تعریف کی۔
 سب سے زیادہ اس بات کی کہ اُس نے مجھے
 پسلی طرح سنبھال لیا تھا۔ اُس نے بتا کر وہ
 اتر رہے تھے ان کی مکان کی چڑھائی کے سلسلے میں
 آئی تھی۔ اُس نے اپنا حصہ بھی اپنے کھائی کے
 نام کر دیا تھا۔ میں نے سوچا پوچھوں اور تسر
 اگر وہ مجھے ملنے کیوں نہیں آئی۔ لیکن یہ نامناسب
 اور غیر ضروری سمجھ کر خاموش رہا۔ وہ سہانہ بانی،
 جھوٹ بولی یا پھر مجھے ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراتی
 تو بدتر کی پیدا ہوئی۔ یہ عرب ان مولوی والوں
 پر جھگڑا کرنے کی تو تھی نہیں۔

سلسلے، کتابیں بیچنے والا آیا تو وہ
 ادھر متوجہ ہو گئی۔ میں نے غصے کی کہ ان ہندو
 بیسوں میں وہ اور بھی خوب صورت اور پرکشش
 ہوئی تھی۔ عجم کنوار پن کی منزل سے تو بہت
 دور نکل آیا تھا، لیکن سنبھال رہا تھا۔ اس کی
 آنکھوں میں وہی گہرائی اور ذہانت تھی۔ ہونٹ
 کچھ اور وسیع ہو گئے تھے۔ جھجے بھرے پھلکے
 ہونے ان ہونٹوں کو چومنے کی خواہش میرے
 سینے میں دم توڑ گئی تھی۔ اس سے زیادہ نہ
 میں نے کچھ سوچا تھا نہ بھی جا رہا تھا۔ یہ نہیں
 کیوں ان ہونٹوں کو دیکھ کر میری ریاس ٹرہ جاتی۔
 میرے ہونٹوں میں بھی ایسی جلیں موند گئی ہیں
 پاگل سا ہو جانا۔ کالج کے دنوں کا ذکر ہے۔
 گرمیوں کی دور پر کہ وہ ہمارے ہاں آئی تھی۔
 مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے
 ہونٹوں پر پڑتی کی طرح بیٹھتی تھی اور پھر ایک
 دم جانے مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے اسے اپنی ہاتھوں
 میں لے کر چومنے کی کوشش کی۔ وہ تو پ کر میری
 ہاتھوں سے نکل گئی۔ فرش سے اپنا دوپٹہ اٹھا کر
 سینے پر پھیلائے ہوئے وہ ایک دم بہت بخیر ہو گئی
 تھی۔ ”مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“ اس
 نے سر دھاکتے ہوئے پلے میں کہا۔ میں سر جھکے
 کھڑ تھا۔ نام، فرسار۔ وہ پلٹ کر میری
 جیس کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دیر تک وہاں بیچی

باتیں کرتی رہی۔ اُس کی باتیں اور منہ کی آواز
 مسلسل آتی رہی۔ وہ تو جھک جھک تھی، میں
 ہی اپنے اندر کہیں ٹوٹ گیا تھا۔
 ”تمہاری ہر وقت سوچتے رہنے کی عادت
 گئی نہیں؟“
 میں مسکرایا۔

گھاڑی چل دی۔ وہ اپنا بستر لگانے
 لگی۔ اُس نے مجھے بھی بستر لگانے کے لئے کہا۔
 ”گھر سے میں فرسٹ کلاس میں سفر کرنے
 کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔“ میں نے تھکائی
 سے کہا۔ خیال تھا سیٹ پر بیٹھے کی جگہ بھی شاید
 ہی ملے۔ رات چلتے اور گریٹ کے سہارے
 گزرے گی۔ صبح پہلی بس سے دھرم شانہ چسپا
 جاؤں گا۔ اپنے شو یار کے پاس“

”میں بھی ٹھوڑی جا رہی ہوں۔ ہماری
 چھوٹی بیٹی وہاں پڑھ رہی ہے۔ اُس سے
 ملنے جا رہی ہوں۔“
 ”بیٹی بس ہمیں پھرنے ملے گی اور یہ
 گاڑی پٹھان کوٹ ایک بجے کے قریب پہنچ
 جائے گی۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے۔“ انی دیر میں
 تپیں پور کروں گی۔ وہ اسکوئی لڑکی کی طرح
 شوخی سے بولی۔
 ”کوئی اور بہتی تو شاید شوخی مجھے ناگوار
 گزرتی۔ لیکن سسٹنا تیرے سلسلے وہی اٹھاؤ
 سال کی لڑکی تھی۔ تبھی جبکہ اچھا اپنا ٹکٹ لے
 کر میں نے چین کرنے کے لئے کہا۔ سسٹنا اپنا
 ٹکٹ دکھا کر باہر اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔ ٹرک
 پر ایک ٹرک کی روشنی دیتوں پر چڑھتی تھی۔
 گاڑی ایک گھوٹے سے اسٹیشن کو گڑ گڑتی نکلی۔
 جیکرے جاتے جاتے ٹرک ایک بار پھر ہماری طرف
 دیکھا۔

گاڑی متوازن رفتار سے چلی جا رہی تھی۔
 سسٹنا نے سینڈل اتار دیے تھے۔ اُس کے
 خوب صورت گورے پاؤں آہستہ آہستہ بلبلے
 تھے۔ گھٹنوں سے ٹکرتک وہ کسی حد تک سبیل گئی

تھی۔ ساری اور پلاؤز کے بیچ جھکا پڑا، مگر
 ہنسی بھلی سلوٹ، دو چرخوں کو دو دھڑا کر، نیچ
 ہوئی، لچکت، پھری پڑی عورت۔
 وہ ہونٹ، جن کے خم میں آج بھی بے پناہ جد
 کشش تھی۔ گاڑی پڑی سے اُن کے جیسے میر
 خون میں دوڑنے لگی۔ میں اپنے آپ سے ڈر کر
 خالی کہیں۔ وہ اور میں۔ وہ نہ جانے کس
 سوچ رہی تھی۔ اُس نے کہا تھا۔ ”مجھے یہ سب
 اچھا نہیں لگتا۔“ اب یہ بدلتی بارش کی بار
 میں پسا ہوگا، پھرا ہوگا، پچھلا ہوگا۔ میں۔
 ٹوڑی کو دیکھا اور دواچی آواز سے کہا۔
 ”تم کدھ صاحب کے کس ساتھ باہر نہیں
 گئیں؟“

اُس نے اس طرح میری طرف دیکھا
 اس بے موقع سوال سے ناخوش ہو۔ چنبل چپ
 رہ کر وہ مجھے میرے اہق ہونے کا شدید احساس
 دلاتی رہی پھر بولی:
 ”یہ بات آہستہ سے پوچھی جا سکتی تھی؟
 ”گاڑی کی آواز ہے نا“
 ”وہ تو پہلے بھی تھی“

وہی سفاک ہونے کی حد تک مسرور ہوا
 ہوا پھر پریشانی اور ہزاری سے بیدار ہونے
 نہ جانے وہ ایک دم اتنی ٹھوڑا وہ بے تعلقی ہو کر
 ہو جاتی تھی۔ کئی سال پہلے اُس نے اس بے درد
 سے مجھے شرمندہ کیا تھا۔ نہ جانے اس کی شخصیت
 کا کون سا پہلو تھا، کیا غلط تھا جو اسے سفاک
 بنا دیتا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ میں اس کی منہ پر
 چڑتے چار پائی پر لیٹا، شاخوں میں چٹکتا چھپا
 چڑیاں دیکھ رہا تھا شاید وہ کھانے کے آخر
 یا آخر فرع جیت کے دن تھے۔ چڑیاں گھونٹے بنا
 کے لئے تھکے، تھکے، پراور سیدی ہی دوسری چیز
 چوکی میں دیا کر پڑے اُترتیں اور پورے کے
 اوچھٹا پن میں، برآمدے کی کسی کڑی کے پیچ
 یا کسی روشن دان میں غائب ہو جاتیں۔ فضا تیر
 بدلتے موسم کی چاپ تھی، خوشبو تھی، تازگی
 اور چڑیوں کی چہکار تھی۔ ایسے میں سسٹنا اُٹھ کر

”قرب کوڑی ہوئی تھی۔ کیا دیکھ رہے ہو؟“
 اُس نے پوچھا تھا۔ ”چراغ۔“ میں نے مسکاکر
 کہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ موسم کی مناسبت سے
 اس ایک لفظ میں بھی پوری داستان سمجھ گئی۔
 کہ میں اس کے ساتھ ل کر ایک گولہ بنا نہ جاتا
 ہوں۔ لیکن اُس کا سر نہ کھٹور نہ مجھے اندر
 سے توڑ دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ ”دیکھتے رہو۔“
 ”پھر وہی دُک“۔ ششما جس کے بولی
 ”تہا ہی بیوی تہا ہی اس عادت سے پریشان
 نہیں ہو جاتی۔“
 ”اُس نے کبھی شکایت نہیں کی۔“

”ہاں۔“ اُس نے جیسے ششما کی ماضی
 کی ”روز و زبہ جاری ایک ہی شکایت کرے گی
 کیا“

میں سوچنے لگا۔ ہم دو ایسی ہی تو نہیں کہ
 ہوں ہی بیٹھے رہیں۔ ایسے ماضی بھی کہیں نہ ہوں
 گفتگو کرتے رہیں۔ ہم دو لڑن شاید ایک دوسرے
 کے وجود کے احساس نہ رہے تھے۔ بچوں کی گھر
 کی، موسم کی اور منگائی کی باتیں ہم کرتے تھے۔
 اپنا اندر برسوں میں شاید نہ سمجھ اس کے
 پاس رہ گیا تھا اندر ہی میرے پاس۔ ہم
 تھے تو کبھی شاید اپنے لئے نہیں رہ گئے تھے۔
 ”میں نے سوچا تھا تہا رہے ساتھ سفر چھا
 گزر جائے گا۔“

”یہ تو ہے کہ میں ایک دوسرے کے
 ہونے کا احساس ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”دلت
 تو گزری جانے لگا۔ میں نے اپنے لیے کی اداسی
 محسوس کی اور چونک گیا۔“
 ”ہتھیں تو شاید وہ بھی نہیں ہے۔“ اداس
 وہ بھی تھی۔

”یہ شکایت ہے باغی۔“
 ”کچھ بھی نہیں۔“ اور باہر دیکھ گئی۔
 میں سوچنے لگا ایک ایسی شادی تو ضرور تھی
 جس سے جرات میں عاشق سی محبت کی ہو، کیا باہیں
 کی ماحولی میں کبھی تو یہ خاموشی میاں بیوی
 میں بھی ضرور ہو جاتی ہے۔

ششما نے کوڑی سے غمی رسالہ نکال لیا۔
 ادھر ادھر سے دیکھا پھر تھکن کے احساس سے
 کوڑی کے اندر ٹھوس دیا۔ باہر اندھیرا تھا۔
 ٹرک دُور ہو گئی تھی۔ میں نے پوریت سے بچنے کے
 لئے وہ رسالہ نکال لیا۔ میں بھی زیادہ دیر تک
 فلمی تصویروں اور چھٹی چٹی خبروں میں ڈپٹی
 نہیں لے سکا اور رسالہ گول کر کے پھر کوڑی
 میں ٹھونس دیا۔

”گاڑی اب کہاں رہ گئی؟“ مجھے پرکار
 پا کر ششما نے پوچھا۔
 ”بٹائے۔“

”دو بجائے منگو الینا“ کہہ کر وہ سیٹ
 پر پھیل کر لیٹ گئی۔ اور دونوں ہاتھ جتنوں
 میں دے کر لیٹی۔

”بہتی بھا کر دروازہ بولٹ کرلو۔“
 میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔
 اُس کا بدن آہستہ آہستہ ہلنے لگا تھا۔
 گناٹ سے ہڈی ہوئی ناؤ کی طرح۔ میں نے
 اُنھ کو دروازہ بولٹ کیا۔ بہتی بھا کر ناٹھ
 لائٹ جلادی۔ میری آنکھیں اس کے کپڑوں پر
 بیروں سے سفر کرتی ہوئی اس کے ہاتھوں پر
 آکر ٹھہر گئیں۔ کیا تھا ان ہونٹوں میں۔
 ایک مرد کی ملکیت کے امٹ، ادکھ نشان۔
 میں نے آنکھیں موند لیں۔

”تم رات کو سوتے نہیں۔“ وہ اب
 آنکھیں کھولے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ
 بہتی بھی تبجا دو۔“

میں نے بہتی بھادی اور دروازہ کھول
 کر کمر بند میں نکل گیا۔ کوڑیہ در حال تھا۔
 بوکی کے دوسرے سرے پر بیٹھا ٹرک ٹانگ ڈپٹی
 کتاب پڑھنے میں مجھ تھا۔ کہیں ”سی“ والے
 سردار جی کے خزانوں کی آواز باہر تک آرہی
 تھی۔ کہیں ”ڈی“ والا بادی چڑا رہی تھی۔
 باتیں کر رہا تھا۔ بالی کہیں خالی تھے۔ میں
 سگریٹ ٹسکا کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔
 ستاروں کے آسمان، کھیتوں پر پھیلا اندھرا،

گاڑی کی آواز، دُور ایک خوب دلی کی مٹھم
 سی جی اندھیرے میں ڈوبتی ڈوبتی غم ہو گئی۔
 ششما کہیں سے نکل کر ٹائلیٹ کا کرف
 چلا گئی۔ واپسی پر وہ کہیں کے دروازے پر
 ٹکی، میری طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا وہ
 مجھے بلانے کی، لیکن اس نے اندر جا کر ٹسک
 سے دروازہ بند کر لیا۔ میں کچھ نہیں سکا اس
 نے ایسا کیوں کیا تھا، لیکن یہ ناگوار گزر رہا تھا۔
 سگریٹ ختم کر کے کہیں تک گیا۔ ان چند
 دہائیوں کے فاصلے میں نے سوچ لیا تھا کہ
 کسی دوسرے کہیں میں جا کر سو جاؤں گا۔ میں
 نے دروازے پر ہلکی سی دنگ دی۔ کوڑی جوب
 نہیں ملا۔ دوسری دنگ پر بھی کوئی جواب
 نہیں آیا۔ اُس ڈپٹی نے کتاب سے نکل کر
 ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے لگا جیسے وہ
 مسکرا رہا ہو۔ مجھے ششما پر غصہ آنے لگا۔ میں
 نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دوسرے کہیں میں چلا
 جاؤں گا۔

”ششما۔“ میں نے پکارا۔
 اندر اس کے سینڈل کھینٹ کر چلنے
 کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ کھلی اور
 ٹھٹھال سی سامنے کھڑی تھی۔
 ”دروازہ بند کرلو“ کہہ کر وہ سیٹ
 پر جا بیٹھی۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے
 اپنا سامان اٹھا یا اور دروازے کی طرف بڑھ
 گیا۔

”کجا ہوا؟“ وہ کھڑک بٹھکی اور حیرت
 سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”کہاں چل گئے؟“
 ”دوسرے کہیں میں۔“

”کیوں؟“
 ”یہ تم بہتی جاتی ہو۔“
 ”میں۔“ اس کا منہ کھل گیا۔

”اب تمہارا اس طرح دوسرے کہیں میں جانا
 مناسب نہیں ہوگا۔“ اُس ڈپٹی نے کہا۔
 ”یہ سب تمہیں دروازہ بند کرنے سے مجھے

سوچا جا رہے تھا۔

”دعا ہے۔“ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ”پتہ نہیں۔ کیوں بند کر دیا تھا۔“

”کچھ کچھ پتہ نہیں۔“
”میں نے اس کی طرف دیکھا وہ اُداس اور غم سے منظر آ رہی تھی۔“

”میں بہت تھکی تھی مگر اس کی ہنس کر رہی ہوں۔“ اس نے ہنسنے لگا۔ ”وہ دکان والی۔“
”میرے پاس لایا اور لیکر نکلی گئی۔“ ہنسنے لگی۔
”کیسے اور نہ صاف کیا ہوئی۔“ بھیجی یہی ایسا ہو جاتا ہے۔“

”یہ دو کیسی تھی؟“
”مجھے ڈپریشن ہو جاتا ہے۔“ دوسرا تھوکتے ہوئے۔ ”وہ پیر دروازے کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ جیسے دروازہ اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔“ تم نے مانڈ لیا ہے۔ میرا ایسا کوئی دوا کار نہیں تھا۔“ وہ ایک بل کو چپ رہ کر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”مجھے ایسا عجیب و غریب جادو، پلینز۔“ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“
”کیجیجی بہانہ نظر آنے لگی تھی۔“ اس نے

”تو ایک بار مجھ پر زندگی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔“
”کس بات کا قصہ؟ کسی ناراضگی۔“ میں نے سامان رکھ دیا۔ وہ سر ہٹاتے بیٹھی تھی۔
”مجھے اس پر ترس آنے لگا۔“ ہروں کے پاس، موتیوں کی مالا، قیمتی گھڑی۔ یہ سب اس کی شخصیت سے اگلا معلوم ہو رہے تھے میں نے بہرہ ریزی سے اس کے نشانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”سوچاؤ۔“ میں نے اسے رٹ دیا۔
”جانتا نہیں۔“ اس نے میری سی آواز میں کہا۔

”میں نے دروازہ اندر سے کھول کر دیا۔ اور پتہ چھا کر پھر گیا۔“ پھر ایسا لگا جیسے شیشا روڑی ہو۔ میں نے کھڑکی پر جھلکی دیا۔ وہ سچا سچ روڑی تھی۔ ”تمہو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔“

”سٹشما۔“ میں نے ٹھپ کر کہا۔

”وہ رو رہی رہی۔“ مجھے غصہ پڑھنے آئے لگا۔
”کیوں بے چاری کو دھکی کیا۔“ جی چاہا اسے یا جنوں میں لے کر اس کے آنسو کی جلاؤں۔
”اس نے کہا تھا۔“ مجھے یہ سب پتہ نہیں۔“
”اور اب تو وہ پرانی تھی۔“ یہ تو اسے اسی کی نظروں میں گرانا ہو گا۔

”پلینز شیشا۔“ ہوا کی ہے؟“
”کچھ نہیں۔“ اس نے آنسو پونچھ لیے۔
”آدھی رات کے بعد ہم بچان کو پٹ پیچے تو شیشا بہت حد تک سنبھل چکی تھی۔“ ہاتھ دھو کر وہ کمرہ میرے ساتھ پلٹ خام پر آ کر آئی۔
”ایسا ایسا سامان اٹھانے پر وہ رنگ روٹ نکم گئے۔“ میں نے سوچا تھا اسے وہاں چھوڑ کر ادھر ادھر ہو جائوں گا۔ ڈینگ روم میں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں تھی۔

”چلے چلے پلاؤ۔“ اس نے کہا۔
”ہم نے سٹال سے چلنے پھرنے چیلنج کر دیا۔“ وہ تڑپا تڑپا ہو گئی۔
”اب۔“ وہ قالی لائین کو دیکھ کر غصہ سے بولی۔

”صبح کرنا۔“
”ریشا رنگ روم مل جائے گا۔“
”اس نے تجھ پر دیکھی۔“ کم آن لٹ اس پرانی کوٹنگ۔
”وہ کسی بوجی کی طرح چل دی میں اس کے پیچھے تھا۔“ ریشا رنگ روم کا خیال میرے دل میں بھی آ رہا تھا، لیکن میں اور زیادہ بچھڑے میں چڑا نہیں جاتا تھا۔ میرے اندر بہت کچھ مڑکا تھا۔ اسے دو بار دنگرنا یا بل پل مرنے جانا مجھے منظور نہ تھا۔

”وہ سیدھی دفتر کے اندر چلی گئی۔ ایک ڈبل میڈر روم خالی تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
”باب اسٹ پلینز۔“ اس نے کہا پھر مجھے سنی طب ہوئی۔“ اندر ج کرادو اور کرسی پر بیٹھ گئی۔“ مجھے چپ دیکھ کر اس نے

”جلدی سے کہا۔“ مشرا بندھ کر نہ رہی۔
”جب کر کے کا تار کھول کر کھلی چکی۔“
”نے میرے ہاتھ میں تھما دی تو شیشا کافی مضبوط اور اسودہ خاطر نظر آ رہی تھی۔“ اندر جا کر وہ میرے بستر پر گئی۔
”پھر مجھے کھڑے دیکھ کر بولی۔“
”تم شام سے میری کمر میں نہیں آ رہے۔“
”کی بڑی بڑی آنکھیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔“ جی پھر مفر کر لے۔“ اب آرام کرو۔“
”میں پٹنگ سے بڑے پٹنگ کو دیکھ رہا تھا۔“

”اب کیا تکلیف ہے؟“ وہ اس پر بولی۔
”کی طرح کہہ رہی تھی جو دنگر نہ کر رہی ہو۔“

”لیٹ جاؤ۔“
”میں سگریٹ لے آؤں۔“
”سگریٹ صبر بھی پی جا سکتی ہے۔“
”میں تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔“
”سگریٹ تو میرے پاس تھے۔“ میں ہلٹا ہوا چھوٹی کے پلیٹ فارم پر مل گیا۔ پلیٹ فارم پر رونے لگی۔
”سگریٹ سٹاک کو میں ڈپریشن پر بیٹھ گیا اور شیشا کوڑی در لیدر اوٹھ گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کاشی جاگنی تھی اور پلیٹ فارم تقریباً خالی تھا۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ نہ جانے کب اُٹھ گیا۔“

”جب جاگا تو صبح ہو رہی تھی۔“
”سہاگ ہو کر اسے میں بچا شیشا نہا کر نکلی تھی۔“
”دیکھ کر مسکرا دی۔“ وہ رات والی شیشا نہیں۔
”کوئی اور ہی تھی۔“

”آرام سے سوئیں؟“
”تم؟“
”ہاں، سو گیا تھا۔“
”اس نے غیب سے نظروں سے مجھے دیکھا۔“
”ہنسنے ہوئی ڈرینگ ٹیل پر جا بیٹھی۔“
”تم بھی نہاؤ۔“
”مجھے تیار ہونے میں دیر نہیں لگی۔“ نا۔“
”باقی۔“

”دوبارہ۔“

مس جوزف

مس جوزف گلدلے جسے ہم کی خوبصورت اور س کو دوشینہ ہوئے، سکرابٹ کی اپریل ہر وقت اس کے ہون پر نص کرتی تھی۔ رہنے نے اسے پہلی نظر میں لیکر کوئی اہمیت نہیں دی۔ دوبارہ دیکھنے کی تمنا پیدا نہ ہوئے۔ جوزف اس کی بے اعتنائی پر بری طرح جھگڑتی۔ سوچا کہ ان نے میری توہین کیا ہے۔ اس کا کوئی اثر مجھے اس طرح رانا نہ نہیں کر سکتا، جو شخص ایک بار مجھے دیکھ لیتا ہے وہ دوسری بار دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ چمن یا تو حین ہر وہی کی پہچان نہیں کھتا یا بے اور جذبات سے عاری ہوا اور خوبصورتی سے کوئی دیکھ ہی نہیں کھتا۔ اس کا خیال ہے کہ ایسے جہان لوگوں کو جیسے کا حق نہیں چوسن کا زام نہیں کرتے۔ شاید ابھول کر زندگی کے داسے سان کھلنے کے مستحق نہیں ہیں۔ وہ جانوروں سے بھی بڑ ہیں۔ دوسری طاقات میں رہنے کے دل کا موم گھلا داتے احساس ہو کر مس جوزف ایسی لڑکی نہیں جس کو لیکر فراموش کر دیا جائے اور اس کے حسن و جمال کا خوش یا جائے۔ اس رات میں وہ چند بار بلند ہوا ہر تزیں اس جوزف کا چہرہ سامنے آیا ہوں پر تہہ آنکھوں میں غار، فرسایا جگہ۔ جس جگہ پر آواہا گیا اس وقت اس کی شہینہ کی ن دوکان پر جاتے جہاں سے شام کو قلم خریدنا تھا۔ ایکس گتے تھے۔ یہ سن دتا، مس جگہ بے چین رہا۔ کس بجے ہی دکان پر پہنچ گیا وہاں صفایا دیکھی تھی مگر جوزف موجود تھی۔

۳۱۔ نزد چال اوکھا اٹھا دہلی ۱۱۰۲۵

چہرے کو زیادہ دیکھا جس میں گلاب کی تپوں کا سارنگ تھا اور ہلکے بھی پھوٹ رہی تھی جوزف نے لگا ہوں کی جھجھکوں کی اور سمجھ لیا کہ وہ مجھے زیادہ توجہ سے دیکھ رہے۔ اس نے چمن سے ہلکی سی دیکھی لپٹی چاہی پہلے وہ محض سوالات کا جواب عاں انداز سے دے رہی تھی اب جینٹل سکرابٹ ہوں پر لاگت کو کرنے لگی۔ سوچ رہی تھی نہ جانے کتنے دنوں کے بعد ایک حسن برت کا کپ دوکان پر آیا ہے اس کی دلکاری ضرور کرنی چاہئے۔ چمن نے اسے ملتفت پارسلز کا کام جاری رکھنے کی کوشش کی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا دیکھا

"آپ کب سے یہاں کام کر رہی ہیں؟"

"دو سال سے۔" جوزف کے کچھیں خرم تھا جیسے سارے مضرب پائے پر جھنجھٹا اٹھا ہو۔

"کتنے گھنٹے مصروف رہتا ہے؟"

صبح سے شام تک ایک گھنٹہ کا شرط لٹتا ہے۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم آہ کیا ملتی ہے؟"

"پانچ سو۔" جوزف بڑی خوش اخلاقی سے جوابات دے رہی تھی اور احساس میں لگ رہی تھی کہ کبھی تھی۔ تبسم کا انداز بدل گیا تھا، کبھی زیر لبے سکرابٹ جواب دیتی کبھی ہنسنے لگتی۔ اتنی ہی دیر میں وہ چمن سے زیادہ اطمینان پر تھ گئی تھی۔ چمن اس کی طرف یوں کھنکھراتا تھا جیسے لوہا مقناطیس کی جانب یا خرچ خشک کبریاں طرف کھینچنے لگتا ہے۔ اگرچہ اسے یہ احساس بھی تھا کہ میں حدت تجاوز ہوا ہوں اور گھنٹہ گارنڈ وانیات کی سمت توجہ نہ ہوں۔ لیکن اس کو صبر و خود جوزف ہی نے دیا تعلقہ چاہتی تو بات چیت اتنی طویل نہ ہوتی تھا۔ چمن کے موافق تھی اس نے

ہمت کر کے یہ اور پوچھ لیا۔

"آپ رہتی کہاں ہیں؟"

جوزف نے غور سے چمن کو دیکھا اور خاص انداز سے مسکلاتے پھر رہائش کا پتہ بتا دیا۔

چمن کا خوشی بڑھا اس کے اشتیاق میں سمندر کی سی موجیں اٹھنے لگیں۔ جسے بھی کہ ساتھ ایک سوال اور کر ڈالا۔

"مگر کب ہر وقت ملتی ہیں؟"

"آئے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"جی تو جانتا ہوں کہ ان کو؟"

"جیسے کب؟"

"جب آپ ملائیں؟"

"ملاؤں گی تو کبھی نہیں آپ خود اپنا نام بتائیے؟"

"شام کو چہرے۔"

"ہاں اس وقت میں کو اور ٹرین پہنچ جاتی ہوں۔ سڑک کو دن پھر رہتی ہوں مگر وقت آپ نے دیا ہے اس وقت بچ کر دیکھنے جلی جاتی ہوں۔"

"ہمت دیتی ہے۔ بیکر ہے؟"

"آج کل کس کس کو نہیں اور میں تو یہاں کھڑے کھڑے اور کمرے سے باہر کرتے کہتے ہو رہ جاتی ہوں، بدیرت مٹانے ہی کی کچھ جلی جاتی ہوں۔"

"ایسی؟"

"کسی پہلی کے ساتھ؟"

"ایسی صورت میں مجھے سٹنڈے کو نہیں آنا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"آپ کے پر دو گرام میں غلغلہ پڑے گا؟"

”وہ بہت جڑا ہوتا ہے، آپ مانگ سکیں گے اسے ہیں۔“
 ”شاہک کھانی میں اس وقت؟“
 ”نہیں، ایک قریبی جگہ پر، کبھی جگہ پر سے لڑنے وقت کو چھوڑنے آتی ہوں۔“
 ”پہلی یاد دہانی کو،“
 ”میں نے جو کچھ سامان اکٹھا لے آئی ہوں؟“
 ”اور چھ کھانے جاتی ہیں؟“
 ”جی ہاں۔“

”جس روز ہی شام کو دوکان پر چلا آنا۔ کبھی لطف لانا کبھی بڑھاپا، آہستہ آہستہ تعلقات بڑھتے رہے۔ اس نسبت سے جس کی تقریباً میں اضافہ ہوتا رہا۔ میں وہ جوزف کے گھر بھی چلا جاتا، وہ نہایت خوش قسمت ہے غیر مقدم کرتی، چہرے پر ہنس بھری آواز، گال تنہا لگتے، آنکھیں جھپک جھپک، پتیلیاں سرکاری کھانے دیتیں۔ جن کو اس کا تھکا کر جوزف اس کے آگے سے بہت مسرور ہوتا ہے۔ چلتے ہوئے کھانے کھاتے کرتی، چل چلائی، مٹھائی بھی منور کرتی اور کچن چرتی بھی کئی سیٹ میں اس کے چہرے کی طرح کشش تھی۔ رچنے لے ایک روز چاہتے پینے کے بعد کہا۔“
 ”کبھی آج بھی میرے یہاں آئے؟ اور یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا۔“

اپنے اس باہر محبت سے اگر فرصت ملے
 ہم عزیزوں کا کبھی سامانِ محبت دیجئے
 جوزف ہنسی۔ بوں کے پیچھے مسکھ مارا

”دک آدمی ادبی۔“
 ”کب؟“

”جب ہی چاہے مجھے فون کر کے آجانیے۔“
 ”لیکھ سکتی ہی ساتھ ہوگی؟“
 ”ایک نیاں دو۔ کرٹریس یہ کہ آپ سے زیادہ خوش صورت نہ ہوں۔“

”ورنہ آپ ان پر نہیں لگے؟“
 ”مرا نہ تو ایک ہی دلی ہوتا ہے اور وہ بچا۔“
 ”پھر یہ خوف ہو گا کہ ان میں سے کوئی میری قیاس نہیں جانتے؟“
 ”یہ ان کے مؤثر خوف ہے۔“

”سبھی ایک ہی ہے۔ آہستہ آہستہ پاس نہیں کر اسے باشتی رہوں؟“

”خیر یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی۔“
 ”میرا صاحب چور محفوظ رکھیں گی؟“

”میں جوزف نے انکو لپی لیتے ہوئے عجیب انداز میں جواب دیا۔“

”پاکل نہیں بچا، سب بانٹ چکی ہوں۔ آپ لینا چاہیں تو مانگئے۔“

”دوست سوال پھیلا ہوا ہے۔“
 ”آپ کا جو وعدہ تھا دیا چکا ہے۔“

”مگر بہت تھوڑا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دیتے ہیں باہر طرف قدر خوار دیکھ کر۔“

”مطلب؟“
 ”بخل نہ کیا جاتے۔“

”اس کی عادت نہیں؟“

”مجھے سندسے کوئی حرف اپنی پہلی سیکھنے کے ہمراہ آئی۔ رحمن سنا پست برت گیا۔ خوشی لگ لگ میں گائی اور فخر ریز آواز میں بولا۔“

”ہیں اور خط و صل خدا سنا بات ہے جلد نذر دہی بھول گیا اضطراب میں۔“

”وہ ایک ایسا سیرن گیا جس کی تخلیق ہی جذبات مسرت سے ہوئی ہو۔“

”ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ دو قریب سے قریب تر آئے رہے، یہاں تک کہ حواطم کے جھوٹے بیان بھی ہو گئے۔“

”پھر سس جوزف اچانک غائب ہو گئی۔ رحمن حد سے زیادہ پریشان ہوا۔ کا تلاش کرنے پر بھی اس کا سرخ نہ ملا۔ رحمن راز دن اس کی یاد میں خود تہذیبی اس کی زندگی کا مشغول بن گیا۔“

”رحمن عرصہ کے بعد پہنچا جوزف کے رشتہ دار اس تعلق کو تابعدا کرتے تھے۔ انھوں نے جوزف کہیں اور بھیج دیا۔“

”وہ کسی سے نامہ و پیام نہیں کر رہی تھی۔“

”رحمن نے کچھ کہہ کر ہمیشہ تنہا رہے گا۔ اکثر رونے لگے۔“

”رہے۔ رونے کا ارادہ نہیں کرتا آپ ہی آپ آسمان کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔“

بقیہ: بین الاقوامی زبان کا سائنٹیفک معیار

- ۱۔ مردانہ و نادرادارہ شفقت رکھتی ہو تاکہ ہر قوم کے افراد والدین کی طرح سایہ گستر ہو سکے۔ یہ شاعری نہیں ہے۔ مطلقاً حقیقت یہ وجہ معقول ایک آفاقی زبان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہی اس کی کامیابی کا معیار ہے۔
- ۲۔ اس کے ادب میں مختلف اقوام و مذاہب، افکار و عقائد، تہذیب و سماج کی متوازن (Balanced) نمائندگی ہو۔
- ۳۔ یہ اور اسی طرح سے معین دیگر وجوہ و شرائط کی عالمی و آواز زبان کے لئے ضروری ہو سکتے ہیں۔ ان اہم کے پیش نظر لفظی طور پر اپنی جامعیت و صلاحیت اور درست استعمال و نگہ گیری کے لحاظ۔
- ۴۔ بین الاقوامی حیثیت کی حامل ہے؟

- ۱۔ پہلے الارتباہ ہونا کہ مختلف زبانوں، تہذیبوں، قوموں اور ملکوں کے لئے یہ آسانی ضروری اور رابطے کے فرائض انجام دے سکے۔
- ۲۔ وسیع القواعد ہونا اس معنی میں کہ مختلف زبانوں کے واسطی الفاظ کو کوری طرح جڑ زبان و ادب بنا سکے۔ تیز و دیگر زبانوں کی قواعد کے ساتھ صرفی و نحوی اشتراک اپنی امتیازی خصوصیات کے باوجود قائم کر سکے۔
- ۳۔ حاذب و خوب یعنی ”زبان شیریں جا بھیری“ کی صفت رکھتی ہو۔ اس کو سن کر ہی ماضی ہو نہایت پیدا ہو۔ انجینی اسی ایک اس سے وحشت نہ کر سکے۔ اس میں زبان کی موسیقیت کا ناز بھی بہماں ہو۔
- ۴۔ عین دین کی سادگی رکھتی ہو۔ یہ عین دین تجارتی ہو یا تہذیبی، سماجی

ٹوٹی سُورَتِی کے ریزے

سُورَتِ سُرَن کِیْف

”سینا“ ارے ذرا مہیاں آ۔ راجیش اکل آئے ہیں۔

جی جی ہی تو گیا یہ نام مٹی کو کہہ سکتی ہوں۔ دہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے اپنی اُمتی تھی اور اُٹھ بند کر کے آرام کر رہی تھی۔ ایسے میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی باہر کا آئی آئے تو دو گھڑی اس سے بات کر کے جی بہلا لیا جائے، لیکن آئے تو سبھی تھے تو یہ حضرت جی کی صورت دیکھنے کی بھی میں عواذ نہیں ہوں۔ ایک بار مٹی کی آواز ان کی کردی تو باپا کی آواز آئی۔ جانا ہی پڑا۔

راجیش اکل اپنی پہلی عادت کے مطابق کسی کا خاکہ اُڑا رہے تھے اور جا لہوڑا سا ڈرائنگ روم تہنوں سے گونج رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اپنی کھانی روک دی اور کہنے لگے: ”کیوں جی، کیا، بسیار پڑھنے کا ارادہ ہے کیا؟“ اپنی بڑھائی سے کیا فائدہ کر سکتا ان کے وقت استقبال میں پڑی ہو۔

جی میں تو آکر کچھ کو کہوں: ”چپ بے پڑے فوڈ!“ میری صحت کی خرابی تو میری ہی دین ہے۔ اب میری سونے گھر میں لا کر رکھ لی تو مسیرو صحت کے بارے میں چرچہ کر رہا ہے اور جب میرا موقع تھا تو مونہ میں منگھٹیاں ڈال لی تھیں۔ کہیں اور جا کر گیل نہیں مڑا۔ میری چھائی پر سونگ

دنے کے لئے چندہ میں معد میں میرے ہی گھر کیوں آتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہنے والی باتیں ہی نہیں جانتیں۔ میری اتنی ہی شرافت بہت تھی کہ میں، اکل خاموش رہی اور نہ گنگل کر ایسی باتوں کا جس طرح سکرا کر جواب دینا چاہئے وہ نہ دیا۔ سب ہی نے میری خاموشی اور بے اعتنائی کو محسوس کیا۔ جی اور با دادوؤں کی نظروں میں ناراضگی دکھائی دی، لیکن بڑے سیال سب سے زیادہ کا نیاں نکلتے انہوں نے ظاہر کیا کہ انہیں اپنی کھانی کی وجہ سے میری بے تمیزی پر نظر ڈالنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ کہنے لگے: ”تو تیش کھانی حضرت دل بھینک نے...“ منظر بالکل بدل گیا۔ مٹی اور باپا پھر سکواٹھے اور حضرت دل بھینکا کی ممانعتوں کی داستان سننے لگے۔ میں آدھے منٹ میں اُسے کراندہ چلی گئی۔ کسی خبر سے جانے کا نوٹس بھی نہیں دیا۔

اندھا کو ریلوے پر ڈھکولا اور برف جیسے پانی کی لوری پھیل غٹا غٹ کی گئی۔ جم میں تو ٹھنڈی آگئی، لیکن دماغ کا اشتعال کم نہ ہوا۔ آٹھ گھنٹہ کر کے پلنگ پر لیٹ گئی۔ ڈرائنگ روم سے آتی ہوئی آواز میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ راجیش کبہ رہا تھا: ”نہ تیش، تم حضرت دل بھینک سے کچھ نہ کہنا، اُسے ناراض کرنا تمھیں

نہ ہوگا۔“

”کیوں؟“ باپا کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ کہا مجھے تو ب کے مونہ پر دھکرا اُڑا دی گئے؟ تم سے بھی تو بہت ناراض ہیں۔ تمہارا انہوں نے کیا کر دیا؟“

”تہیں سہا کی سٹا دی کر رہے یا نہیں؟“ راجیش نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ مٹی کی مشتعل آواز آئی۔ ”اس مردود سے کرنی ہے اور سچر وہ تو سادگی ہے۔ دو تین کا باپ ہے۔“

”اُن سبائی وہ دو اُن کے بھتیجے اس سے بڑے؟ تو ہے، لیکن اُن کے بھتیجے اس سے بڑے؟ تو ہے۔ اور بہرات اپنی حضرت کی صلاح سے کہتے ہیں۔ یہیں شاید معلوم نہیں ہے ان صاحب کا کھانا مینڈا امریکہ سے دو پہنچنے کے لئے سٹان آ رہا ہے۔ اس عرصہ میں وہ لڑکی کبھی پسند کرے گا اور شادی بھی کرے گا۔“

”وہ تو بہت امیر ہیں۔ ہماری جیسی معمولی حیثیت کے آدمی کے ساتھ...“

”بے وقوف ہے تو بھی یار۔ اسے مینڈا کوئی چیز کا بھوکا ہے۔ باپس ہزار روپے ہسینہ پانے والا انجینئر ہے۔“

”سچر بھی دیکھا کو؟...“

راہیں تھیں پھر لوگوں کی بات کاٹ دی —
بول: ”وہ فقہ حنفی ہیں۔ میں نے سہرا ملایا۔“
تم میں حضرت دلی بیگ کے ساتھ...“
مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ طوفان کی طرح

ڈیرانگ مردم میں چلی آئی اور دوسرے بولی —
”اچھا، میں آپ کی عزت کرتی ہوں، لیکن اگر آئندہ
آپ نے میری شادی وادی کی بات کی تو میں میرا
آپ کی پلاٹری کر دوں گی۔ مجھے کسی آنکھ کے باپ کی
بہو نہیں بندہ ہے نہ جیندر کے باپ کی نہ مریندر
کے باپ کی۔ میں نے اپنی ساری زندگی آرٹ کے
لئے وقف کر دی ہے کاغذ لکھ کر لیا ہے۔“ مریندر
راہیں کے صاحب زادے کا نام ہے۔
دو بیکڑے لئے خاموشی چھا گئی۔

میں ہانپنے لگی۔ ”راہیں کا چہرہ یونانی ٹیٹوں کی طرح
بے حس ہو گیا تھا۔ جی کا چہرہ گھبراہٹ کی وجہ سے
کاغذ لگا تھا۔ ابتدائی صدمہ سے نکلنے کو تیار پانچینے
”سیا، ہپیو بلاٹ اور سی پٹ آف میں ایک
ستہاری عقل بالکل ماری گئی ہے؟“

ایسے موقع پر کسی کی عقل قائم رہ سکتی ہے؟
میں نے اور دوسرے بیچ کر کہا: ”ذرا پانی پیو جن میں
پاپا، آپ کی۔“ اور جس طوفانی رفتار سے ڈرانگ
روم میں آئی تھی۔ اسی طرح باہر نکل۔ دروازے
پر پہنچے۔ پیچھے تھی کی آواز کان میں پڑی۔ ”میں تو
سیا“

”ابھی نہیں تھی۔“ بپیر سل کو دیر ہو رہی ہے
جوابات کو تورا بھرت کو کرنا نہ نہ میک اپ کیا نہ
کپڑے بدلے، باہر آکر پڑی نور کی آواز کے ساتھ
اسکو راسٹارٹ کر دیا۔ اب سوال اٹھا کر ماریوں
کہاں، رپیرل تو آج تو ناہیں تھی۔ وہ تو راجش
کی موجودگی میں گھر سے باہر آنے کا ہمانہ کیا تھا کہ اس
کے پاس جائے، ایک ایک کے کہیں سہیلوں کے نام
سوچنے شروع کرے۔ میرا تو شام کا بیچ اپنی ڈگری کی
ہوئی۔ تجربے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آج وہ بیٹنی
میں دسویں مارا دیکھے گی۔ روزانہ پانچ بیٹنی کے

کے ساتھ کسی پارک میں پہل رہی تھی۔ ”جنوں“
سے ملا جائے تو طبیعت پہلے۔ لیکن کون ملے گا
اس وقت؟ راکش کو مجھ سے زیادہ شین سے
عشق ہے۔ رام کنارہ دلی گیا ہوا ہے۔ ہرش
مروڑ کا بیٹا دوس میں مل جائے گا، لیکن اس
کا بے گئی ہنسی اور موہنہ سے آنے والی بدبو کون
برداشت کرے گا کسی دن اس سے کہنا ہی چاہیے گا
کہ پائیر یا کالاج کراؤ۔ پھر اس خراب
مٹو میں کسی سے جھگڑا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی
سے نہیں ملوں گی۔

ایک غیر معروف سے ریسٹوران میں چلی گئی۔
چلنے کی، کچھ ناشتہ بھی کیا، لیکن بات نہ پڑی۔
کے کورسے معلوم ہوا کہ اگر میں کچھ اور آرڈر نہیں
کرتی اور میری جگہ خالی نہیں کرتی تو وہ خود مجھ سے
اٹھ جائے گے، کچھ دے گا۔ اس کے علاوہ
اس ریسٹوران میں جاؤ بیٹ بھی کیا تھی، اس کے
گاہک بھی پورے ڈیرانگ کو گھر جیسے لوگ تھے، جو
میں نے گھر گھر کر دیکھ رہے تھے۔ انکو گھر
اسکو مل دیا۔ اورنا جیل کے کنارے والے
پارک میں ایک طرف اسکو گھر کیا اور گھاس
پر لیٹ گئی۔

گرمیوں کی شاموں کو اس پارک میں
اجتی خاصی جھپٹ سہرا جاتی ہے۔ بیبیوں گزرنے
والوں کی آنکھیں مجھے تعجب سے دیکھتیں۔ دوچار
نوجوانوں کی نفر سے باری بھی تھی، لیکن اس سے
نہ جھلٹا ہٹ ہوئی نہ شراکت کا ٹوڑا بھرا۔ دماغ میں
گرسنتہ یا بچ ہوسوں کی باتیں گونج رہی تھیں۔
جی ہاں۔ راہیں اٹھل یا بچ برس پہلے ہی اس شہر
میں آئے تھے۔ جھکے آگے میں کسی دوسری بیٹ
سے ٹوپیٹش پڑے تھے اور مسٹنٹ ڈانکر کر کے
عہدے پر فائز تھے۔ پاپے ان کی ملاقات سیکرٹ
میں ہوئی یا پاپا حال ہی میں نائٹس ڈیپارٹمنٹ میں
سپرٹنڈنٹ کے عہدے سے ترقی کر کے ڈپٹی سیکریٹری
ہوئے تھے۔ دونوں کالج کے ساتھی تھے۔ کالج

میں صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بہت کم
بعد ملے تو دوسری ہو گئی۔ ایک دوسرے کے گھروں
میں آنا مانا شروع ہو گیا۔

اپنی طرح وہ منظر ایسا ہے جب وہ بیٹی
مترہ اپنی اہل کے ساتھ ہمارے گھر آئے تھے۔
میں رنگ رہ گئی۔ اور میرے کاندی میں بھی اتنی
جاذبیت ہو سکتی ہے۔ وہ ملی بہروز تھے جو عمو
میک اپ سے ڈھک لیے ہیں۔ اور جس کے لئے
”لیڈی لکٹ“ اور ”بیٹی ورلڈ“ ضرورت بن جاتی
ہیں۔ مولیٰ مناسب چہرہ اور اسی طرح کا سن و سوا

اوپر سے دیکھنے میں مولیٰ شریف انسان سے
زیادہ کچھ لگتے تھے۔ لیکن انھوں میں اس طرح
کی جھک اور آواز میں اس طرح کی کھٹک تھی کہ
جی چاہتا تھا کہ بولے اور دیکھ ہی جائیں۔ راہیں
بچے جاذب نظر تھے، اتنی ہی قابل نفرت ان کی
بیوی تھیں۔ کالی، موٹی، بد صورت اور بد مزاج
سہی۔ آتے ہی ہمارے گھر کی آرائش پر کتہہ چینی
شروع کر دی۔ میں نے حال ہی میں میرے کیا تھا۔
منزل امیں کی باتیں میری معلوم ہوئیں۔ مجھے کچھ
کہنے کے لئے تیار دیکھ کر مٹی نے آنکھ سے اشارہ
کر کے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ راہیں
نے یہ بات بدلنے کے لئے غرضی کے ذکر پھیر دیا۔
پاپا سے بولے۔ ”راہیں، کالج کے کوئی سیکل میں
تو مجھ خراب شہر چھا کر آئے تھے وہ مٹو اب بھی
ہے یا صرف کان دیا گھر گھر ہی تاکا ہو لارے
رہتے ہو؟“

پاپا کے بولنے سے پہلے مٹی بول اٹھیں:
”ان کا رینٹنا جاری ہے۔ ساتھ ہی دولتال
میں جھارنے لگے ہیں۔“

پاپا درحقیقت ہندی کے اپنے شاعروں
میں کیے جاتے تھے۔ نظروں کا ایک مجبور بھی جھپو
کے تھے۔ یونیورسٹی کے ہندی ڈیپارٹمنٹ کے
پروفیسر تک ان کی ادبی مانت اور سوزانی
کے قائل تھے۔ ٹوڈن گیا تو پھر شاعری کا شہر شروع

ہوگئی۔ ایک فلم سنے کے بعد راجیش بولے: "بھئی
تمہاری یہی شاعری تو دماغ خراب کرنے والی
چیز ہے۔ تم نے گیت کہنا بالکل چھوڑ دیا کیا؟"
دراصل راجیش بھی اسی وقت ناواقف صوف
فیض نبھانے کے لئے چلتے تھے، دل چاہی انہیں
بھی گیتوں ہی میں تھی۔ انہوں نے دو تین گیت سنائے
راجیش نے دل کھول کر قیوبت کی۔ سزا جیل ہونہ
مٹھانے بیٹھی رہیں۔ چمن نے کہا: "انہیں تو کورستا
کرنے کی بیماری ہے۔"

"آپ کوں بیماری سے کیا پریشانی ہے؟"
راجیش نے کہا: "میں تو چنا ہوں اس بیماری میں آپ
بھی شرکت کیجئے۔"
"نہیں صاحب، مجھے ایسی بیماری سے کوئی
دل چاہی نہیں ہے۔ پریشانی یہ ہے کہ انہوں نے
یہ مرض وراثتاً اپنی بیوی کو بھی دے دیا ہے۔ آپ
جانتے ہیں کہ...؟"

راجیش نے انہیں اپنی بات پوری نہ کرنے
دی۔ دوسری طرف ٹرسے اور دیکھا: "سیا، نکالو لہجہ
بیامن؟"

میں بے حد عجیب دہی تھی، مگر کھانے
اپنی اکلوتی اولاد کا یہ ملاعت کا قمار
کچھ ایسے خوبصورت ٹھنک سے نکالا تھا کہ انکار کرنے پر
سبھی انکار کی گنجائش نہ تھی۔ اور سچی بات یہ ہے
کہ میں خود بھی چاہتی تھی کہ راجیش جیسے شہر
مذاق والے شخص کے سامنے اپنی شاعری پیش کروں۔
میں نے بھی دو گیت سنائے۔ راجیش نے مسکاکر
مٹی کی طرف دیکھا اور بولے: "آپ کی بیٹی کو
کتنی حیران رہاں ہیں۔ آپ نے صرف ایک ہکا دکھ
کیوں کیا۔ تو ننگیت کی بھی ہوسٹن ہو رہی ہے۔"
پا پا لوسے "مہارت و مارت تو میں نہیں
مانتا، لیکن صبح شام آٹا روٹے کر آؤ گھر دیکھا
کوتی ہے۔ میں تو اس کلاسکی میوزک سے گھرا تا
ہوں۔ یہ بیماری اسے اپنی ماں سے ملے ہے۔"
اس کے بعد جرح کچھ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔

راجیش کا موسیقی کا مذاق بھی بہت بلند تھا۔ میرا
اور مٹی کا گانا سنا۔ راجیش نے ہارمون کو ستر کوڑیا
اور ٹھیکے کا ساتھ دینے کے لئے خود طبلہ لے کر بیٹھ
گئے۔ ٹھیکہ بھر تک میوزک کا نفرین ہوتی رہی۔
سزا جیل میں پریشان ہو رہی تھی اس کی طرف
کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ چھٹی بات تو نہیں
جانتی، لیکن میں کچھ دنوں تک بالکل مدھوش ہو گئی
تھی۔ راجیش کی آنکھیں بند تھیں اور ان کی آنکھیاں
اور بقیہ لیاں میں جہارت سے آٹا لہجہ جاری
تھیں اور دوسری صورت میں جو کمال دکھائی تھیں،
اس سے ظاہر تھا کہ وہ اچھے سے اچھے گانے گاتے
کہا ہے ساتھ ساتھ چنے کے لئے مجبور کر دیتے ہوں گے۔

ہم ماں بچی کی تو بساوی کیا تھی۔
گانا ختم ہونے پر راجیش بولے: "بھئی شیش
تمہاری بیٹی بڑے کمال کی چیز ہے۔ میں نے ساری
زندگی میں اپنی ٹیلیٹ والی لڑکی نہیں دیکھی۔ کم از کم
کم اتنی کم عمر اور اتنی خوبصورت کوئی لڑکی اس دور میں
نہیں دیکھی۔ تمہیں بالکل انصاف نہیں ہونا چاہیے
کہ تمہارے ایک ہی اولاد ہے۔ ایسی لڑکی دس
لڑکوں سے بہتر ہے۔"

اب بھینس ہی نے زبان کھولی: "یہ تو صرف
کہنے کی بات ہے۔ لڑکوں کی بات ہی اور مٹی جتنے
مٹی اور پا پا اس نے مٹی بدلتی ہی پڑھاؤں
رہے، لیکن یہ بات راجیش کی برداشت کے بھی
باہر ہوگئی۔ تیزی سے بولے: "کیوں صرف کہنے
کی بات ہے؟ جو ہر لالہ تیرے کے بھی صرف ایک
ہی بیٹی تھی۔ انہیں کبھی اس بات پر انصاف ہوا؟
اور سب نے دیکھ لیا کہ اس ایک بیٹی کے مقابلے
کا کوئی مرد پورے ٹھک میں نہیں ہے؟"

"وہ دوسری بات ہے۔ ہر بیوی نہیں
نے ارشاد فرمایا۔"
"دوسری تیری کوئی بات نہیں صرف
اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے؟" اندھا گاندھی اندھا
گاندھی صرف اس لئے کہ خدا داد صلاحیت

کے علاوہ انہیں اپنے والد کی پوری توجہ ملی ہوگی
سے کہ ادھیڑ عمر کی ہونے تک وہ پڑوسی کی
گاندھیں میں رہیں اور مٹی تو شیش سے گاندھیں
دینے کے لئے بھی نہیں کہتا صرف حوصلہ افزائی کے
لئے کہتا ہوں۔ میرا تو خیال ہے کہ مگر یہ اسٹیج
پر بھی اترے تو کسی سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ ہوم
کی اتنی سٹیں ہے کہ فرسٹ کلاس ڈائنر ثابت ہوگی
اور اوپر دے دیے کی ایکٹریس؟

بات معمولی ہنسی مذاق کے درمیان ختم
ہوگئی۔ لیکن میرے تازہ دل پر بہت برا اثر پڑا
گئی۔ رات عجیب طریقے سے گزری۔ سوئے میں
بھی کالوں میں گفتگوں ہی سمجھتی رہیں۔ راجیش کی
تجویر میرے دلے دلے کا سا حکم بن گئی۔ اور
میں نے تجویز کر دیا کہ ڈانس بھی سیکھوں گی اور ڈان
میں بھی آؤں گی۔ مجھے تو کوئی وقت نہیں ہوگی۔
وقت تو لڑکوں کو ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہر کھاتے
پیتے کھر کا لڑکا اسٹیج پر آنا چاہتا ہے۔ لڑکیوں
کوئی تعلیم کے باوجود دکھائی دین ہیں رہنا چاہتے
میرے صحتی خوش نصیب لڑکیاں کتنی ہوتی ہیں
جن کے والدین ان کے آڑے نہ آئیں۔

تہہ تو کر دیا لیکن یہ بھی سوچنے کی اس وقت
یہ بات کیوں سوچی۔ پہلے بھی تو کچھ دوستوں اور
مدرسین نے یہ بات کہی تھی، لیکن اپنی ماں اور اپنے
باب کی دین مینی موٹیفی اور شاعری کے علاوہ اور
دھیان کیوں نہیں گیا۔ راجیش کی بات میں کیا
جاد تھا کہ ماں اپنی زندگی کو ایک دنیا موڑ دینے
کو تیار ہو گئی۔ کیا مجھے ان سے عشق ہو گیا تھا خود
ہی اس بات پر ہنسنے آئی۔ پندرہ برس کی لڑکی
کا بیٹا بیس برس کے مرد سے عشق کیا مافی رکھتا
ہے؟ اور وہ دیکھے عامی معمولی انسان ہیں۔ کوئی سے
کام دیوں کہیں ان کی گود میں بیٹھنے کے لئے
بے قرار ہو جاؤں، لیکن ایسے انسان سے عشق
نہیں تو عقیدت تو ہو ہی سکتی ہے اور جس طرح
عشق کی کوئی مدتیں اسی طرح عقیدت کی بھی کہاں

مرد ہو جاتا ہے۔ بہت بڑھ جائیں تو دو دو جنون
 بن جاتے ہیں۔ عقیدت کے جنون میں بھی لوگ
 پھرتے ہیں۔ دنیا کی قسمت پر اپنی زبان کاٹ کر چٹھا
 دیتے ہیں۔ لیکن ایسی عقیدت کیوں پیدا ہو گئی؟
 اس کا جواب کوئی دے سکتا ہے؟ کسی سے عشق بھی
 کیوں ہو جاتا ہے؟
 قلم حقیقہ کہ لکھ چار برس ڈانس اور ڈرامے
 کی ریاضت میں لگائے۔ جسم تنگ کر چڑھ جانا۔
 ٹوٹنے کے لشکر کی تک سے پوری ٹھہریاں سننی
 پڑتیں۔ ٹوٹنے کے ڈانسر کیڑوں کی ڈانٹ ڈپٹے
 پیرسوں میں رہنا آ جاتا۔ لیکن کوئی دقت مجھے اس
 راستے سے نہ ہٹا سکی۔ اور واقعی لافش کی بات
 صحیح ثابت ہونے لگی تھی۔ کیوں کہ تین برسوں ہی
 میں تنگ یا صوبہ کی نہ بھی اپنے شہر کی بہترین
 اداکارہ، راقصہ اور منتخبہ سمجھی جانے لگی۔ دو
 اخباروں میں میرے انٹرویوز لکھ چکے تھے۔
 اس سب کے باوجود مجھے اپنی ریاضت کا
 اصلی صلہ اس روز ملا جب میرے ایک ڈرامے
 کے لہذا لٹریچر پر آکر راجیش نے مجھے مبارک باد
 دیتے ہوئے میری پیٹھ پیچھتی پائی۔ دوسرے روز
 میرے گھر آکر کہا کہ میرا دل چلے تو کیا کر بیٹھ اپنے
 ساتھ رکھوں۔ مجھ پر اس بات سے ذلہ سا چھا گیا۔
 پاپائے اس بات کو معمولی تعریف کے طور پر لیا۔
 لیکن جی تو اس بات سے کھنکھائی آئیں ہو گئیں۔
 راجیش کا بیٹا سریندر حال ہی میں ایم۔ بی۔ ایس
 پاس کر کے آیا تھا۔ جی تھے یہ سمجھا کہ راجیش نے سہا
 کو بھی جو بنائے کا شرف دیا ہے۔ کچھ دنوں میں
 پاپا اور مکی کے درمیان یہ باتیں ہونے لگیں۔ پاپا
 بہت حوصلہ مند نظر نہ آئے۔ ان کا خیال تھا کہ راج
 کے کہنے سے کیا ہو گا ہے؟ بات تو بت بے جب پیش
 راج ہو۔ بات اس کی پرچی تو مجھے بھی معلوم ہو۔
 کیوں کہ پہلی مرتبہ لوگ راجیش کے گھر گئے۔ راجیش
 کی بیوی نے اپنے منہ سے کبھی کہا ہی نہ تھا کہ ہم لوگ
 اُن کے گھر آئیں (اور پہلی مرتبہ کے بعد تو کسی ہمارے

گھر بھی نہیں آئی تھیں) سب سے زیادہ غرض میں
 تھی کیوں کہ اب راجیش کے گھر میں رہنے کا موقع نہ گا۔
 سریندر بھی دیکھنے میں لڑا نہ تھا۔ بات مزید کم کرنا تھا۔
 لیکن گھر سے تنگ کا لہذا دل سا امان تھا۔ میں
 اسٹوں پہرے میں رہنے لگی۔ کبھی کبھی سوچتی تھی
 کیا ہو گیا ہے۔ شادی کی بات سریندر سے ہے اور
 مجھے خوشی اس بات سے ہے کہ بے کہ راجیش کے
 گھر میں رہتا ہے۔ دل نے پوچھا عشق کس سے ہے؟
 بیٹے سے یا باپ سے؟ دماغ نے جواب دیا۔
 کسی سے بھی نہیں۔ صرف باپ سے عقیدت ہے۔
 دماغ نے دل کو سہلا دیا۔
 لیکن ہا: دہی کو تاپے جو منظور غلام ہوتا ہے۔
 نہ دل کا دل نہ دماغ کی اور نہ میں راجیش کے گھر
 جا سکی۔ چار یا پچھینے عجیب طرح گزرے۔ راجیش
 ہمارے گھر کرتے ہر طرح کی باتیں ہوتیں، لیکن پاپا جی
 میری شادی کی تہنید باندھتے تو راجیش ٹال مٹاتے اور
 کوئی دوسری بات بھڑکتے دیتے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ
 اپنے منہ سے کہہ چکے ہیں تو پھر شادی کی بات سے
 کیوں پھرتے گئے۔ لیکن پریشان میں بھی تھی کہ معتد
 ظالم لٹریچر کیوں کر رہے ہیں۔ کیا آتما جیڑا چاہتے
 کہ پاپا دنیا بھی چاہیں تو نہ دے سکیں (دھپے پاپا
 اور راجیش کی بارگاہ چکے تھے کہ جیڑا چاہتے واپس
 کے گھر سے جاسی لڑکی کو کبھی نہیں بھیجتا چاہیے)۔ تو
 کیا بات تھی پھر؟
 آخر ایک بعد پاپا اور جی نے فیصلہ کر لیا کہ
 دو ٹوک بات کر لی جانیے۔ شام کو راجیش
 آئے داسے تھے۔ میں ڈرائنگ روم کے بلبلہ والے
 کمرے میں بیٹھی تھی۔ کیوں کہ میری قسمت کا فیصلہ
 ہونے والا تھا۔
 چائے کے بعد جی نے بات بھڑکی۔ راجیش جی
 سید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
 راجیش تجب سے (مناہ معنوی تجب سے)
 بولے۔ سید کے بارے میں میری رائے آپ نہیں
 جانتیں۔ ہر طرح سے قابل لڑکی ہے۔

پاپائے کہا۔ "ان کا مطلب ہے اگر سہا کی شادی
 سریندر کے ساتھ..."
 "نہیں ہو سکتی"۔ راجیش بات کاٹ کر فریٹے
 بیٹے میں بولے تھے۔
 مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہوا۔ راجیش کے
 منہ سے ایسی بات بھی نکلی سکتی ہے۔ اور ایسے ہی
 میں؟ مجھے پکڑ آئے تھے۔ لیکن پھر ڈرائنگ روم
 سے آئے والی آوازوں سے کان لگا دیتے۔ پاپا اور
 جی کچھ دیر خاموش رہے پھر مجھے لے گیا۔ انکار کی
 وجہ؟
 راجیش خاموش۔ میں اندر والے کمرے میں
 پریشان۔
 پاپائے کچھ ناراضگی کے لیے میں کہا۔ "صاف
 بات کیوں نہیں کہتے۔ اگر نہ پچھنے کی بات ہے
 تو میں سریندر کے لئے لکھ لکھ کھولنے کا دفتر..."
 "تم میری تو نہیں کر رہے ہو مینٹی..."
 کہیں معلوم نہیں کہ جیڑے کے بارے میں میرے کیا
 خیالات ہیں؟
 "میں پھر کہتا ہوں کہ بات صاف صاف کرو۔
 اگر روپیہ پیسہ درمیان نہیں ہے تو تمہیں یہاں
 کیا چپے ہے کہ اُسے جو بنائے دیتا نہیں ہو؟"
 "پڑ نہیں۔ مجھے بھلا سے بھلا دیا ہے۔ وہ
 جتنی تمہیں بیماری ہے اس سے زیادہ مجھے بیماری
 ہے۔ اور اُسے لے کر کہا ہوں کہ اس کی شادی نہ کرو
 سے نہیں ہونی چاہیے۔"
 "مجھ میں نہیں آتی بات"
 "اچھا شو۔ سوال میری پسند یا نا پسندیدگی
 کا نہیں ہے سریندر کبھی کبھی طرح یہ مانا پسند نہیں ہے۔
 مشکل یہ ہے کہ گھر میں آئے اپنی ساس ہی کے ساتھ
 رہنا ہے۔ اور میری مدد کتنی روش خیال اور زبان
 کی پہنچ ہیں وہ تو ہیں اچھی طرح معلوم ہے۔"
 کچھ دیر خاموشی کے بعد جی بولیں۔ "لیکن آپ
 اور سریندر جی نہیں..."
 راجیش نے ہنس کر کہا۔ "آپ اپنے عیاں معقول
 (یعنی منطقی) طور پر

پانچواں شوہر



اور دونوں کی طرح آج بھی راندوشٹام کو اپنے گھر لوٹا، لیکن آج جانے مسکو کر اس کا استقبال نہیں کیا۔

”کیا بات ہے.... کھانا؟“
”کھانا نہیں بلکہ تم نہ تو... بدلتے ہوئے تیر میں جانے جواب دیا۔“

”ٹھیک ہے“ راندو نے اطمینان سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے نہیں۔ طبعی صاف“ راندو کے اطمینان پر جانور کی بے اطمینانی بڑھ گئی۔

”مجھے شوک لگی ہے....“ میسے جی کی لڑکی ہوا راندو و عبرت زدہ رہ گیا۔

”طبیعت خراب ہے کیا؟“ اپنا نیت سے سمجھے اس جملے کو جانو نے اپنی تیز نظر زبان سے روٹی کی طرح ڈھن کر رکھ دیا۔

”مجھ سے سوال کرنا ہے؟ اتنی بہت؟“
..... تو تو میرا باپ بچاں خود ہے۔ پہلے کے چار شوہروں نے بھی میرے سامنے زبان نہیں کھولی۔

”سمجھا؟“ تب تک راندو کا بھی پارہ چڑھ چکا تھا اس نے چٹان چٹان دوڑا تھے اس کے کانوں پر جسٹر دیے۔ چوٹ کھاری تھی۔ جانور اور گھسنے کیلئے آنسوؤں میں برس پڑی۔ جانور کو ملانے مان کر بھی لڑو کوشش نہیں ہوئی تو اس نے عورتوں کے لئے جوڑے

راندو دنیا نیا شوہر آیا تھا۔ دن بھر کام کاج میں گزار دینے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ رات کہاں گزارے؟ اس نے سن رکھا تھا کہ شہروں میں ہوٹل ہوتے ہیں، لیکن ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے پیسے وہ کہاں سے لائے؟ کسی نے کہا کہ سفر خانہ میں جا کر رہو۔ وہ شرمیلیس بدلتا رہا، مگر مسافر خانہ نہیں ملا۔ اب وہ راہ گیروں کو دیکھ رہا تھا۔ کس سے فریجے؟ قحبہ بازار سے سودا سلف لے کر ٹوٹ رہی جانور کی نظر راندو پر پڑی۔ جانو نے پہلی ہی نظر میں سمجھ لیا کہ یہ آدمی جنگلی سے آیا ہے۔ راندو کا بھی جانور کے بارے میں کچھ ایسا ہی اندازہ تھا، لیکن جانور کے لباس سے اس کا اندازہ یقین میں نہیں بدل رہا تھا۔ راندو نے جب اس سے مسافر خانہ کا پتہ پوچھا تو اس نے جواب دیا:

”مسافر خانہ کیوں؟ میرے گھر ملے۔ اس شہر کے آخری سٹر پر ہے۔“ شہر یا بھی جانور کی “شہر یا۔۔۔؟ جانور سے بنا ہوا نہ تو خوشی ہو آدمیوں میں رائج ہے۔ شہر کا نام ستر ہی راندو کے دل میں اپنا نیت کے جذبے نے انکڑائی لی۔ اندر جانور کے ساتھ ہو گیا۔ تب سے راندو جانور کے یہاں رہتا ہے۔ جانور کا گھر اب راندو کا بھی گھر ہے۔

ستیا رام پتر، بکھرے لپ (پہلا)

عجڑی لگائی ہوئی ہے اُسے دے ڈالی۔
جانور سمجھتی ہوئی جان کی طرح ٹپکھارائی تھی۔
”بڑھیا کتنا ہے، رسالا سڑک کا کتا۔“
بیس دن پہلے میں جوان تھی۔ کل تک جوان تھی....
حرامی.... کل....“ مگر راندو تب تک ملان سے نکل کر جانور کا کتا تھا۔

جانور جانتی ہے۔ رات ہوتے ہی راندو گھر ٹوٹ آئے گا۔ وہ مردوں کی اس کڑوی سے اچھی طرح واقف ہے کس طرح بستر پر کئے ہی مردوں کی بے سحر کی زبان گنگ ہو جاتی ہے اور نوا اور اس وقت کہو تو عورت کی حق تو پی کی مگر رکھ لیتے ہیں اسے اپنے پہلے کے چار شوہروں کا تجربہ جو ہے۔

وہ آج کھانا نہیں پکائے گی، ہو سکتا ہے راندو ہوٹل سے کھانا لیتا آئے۔ جانے جانے راندو کی نظر خراب کی تو کی پھر پڑی ہوگی.... پھر وہ ستر کی کے ہوٹل سے کھانا جو گوشت لائے گا۔ پھر گوشت کا خیال آتے ہی جانور کا اندر کڑو پڑے گا۔ اور وہ راندو کے کونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔

راندو اس رات نہیں لوٹا۔ دوسرے دن بھی دکھائی نہیں پڑا۔ دوسری رات بھی نہ آئی تیسرے دن چوتھے دن بھی غائب رہا۔ اور نہ چوتھی رات کو بھی لوٹا۔ جانور تب آواں ہوئی۔ اس دن جانور کی باتیں

نے اپنے ہم پر حذر کیا۔ کیا وہ سچ بول رہا ہو گئی ہے؟

ہفتہ میں ایک دن وہ چھوٹے سے شہر سے بڑے شہر میں بیڑیاں بیچنے جاتی ہے۔ میں پان کی دکان میں لے کر رکھی ہیں اس نے۔ سلیمان، جندی سنگھ، فرنا ندیں۔ سبھی تو جاننے کے آئے کا انتظار شدت سے کرتے ہیں۔

سلیمان تو میں ہی کہتا ہے۔ ”تم اپنی بیڑیوں سے بھی اچھی ہوا اور مے درجہ ہیں۔ اور ہندی سنگھ تو ہر گھوڑا پر ہر مٹا اور کہتا۔ ”جانیں! میں تو قوسی مٹنے واسطے تیری بیڑیاں خریدتا ہوں، ورنہ.....“ فرنا ندیں تو میں دیر لڑا ہے۔ اسے دیکھتے ہیں ایک لمبی رٹا کھینچ کر کہتا۔ ”ہائے، کیا جوانی کو باندھ رکھا ہے؟“

جوان تینوں کو پس ہی جواب دیتی۔

”جیل بات مت بنا۔ پیسے نکال۔“ جانو کو گلے دے دہی ادا کا دے کہ نہیں۔ ہر بار وہ اور زیادہ جانب نظر پڑنے کی کوشش کرتی۔ اس سچ دھج میں وہ جیتی بیڑیاں لے جاتی تھی یک جاتی۔

بیڑیوں کا پیش اس نے تب شروع کیا تھا جب جاسو کھائی اس کی زندگی میں آ رہا تھا۔ جاسو کھائی کی خوشی کے لئے جانو نے اپنی اکلوتی بیٹی جو ابھی دس سال کی تھی، کو نکلتے کے ساتھ لے کر وہاں کام پر لگا دیا تھا۔ اب اس کی بیٹی کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ جاسو کھائی کی یاد آئے تری جانو کا مزہ تلخ ہو گیا۔ جاسو کھائی اس کی زندگی میں آیا تو فرور تھا، مگر وہ طوطے کی طرح ادگیا تھا۔ وہ اس کا تیسرا سر نہ رہا۔

پہلا سر ہر تھا مانگو رام۔ مانگو رام اس کے گڈوں کے بل کا تھا۔ جانو نے جب جوانی کی دہریہ پر قدم نہیں رکھا تھا تو وہ مانگو رام کو

جانے کی تھی۔ مانگو رام اور جانو کی ملاقاتیں اکثر بازار میں ہوجا کرتی تھیں۔ جانو موسما اور فزٹ کرنے بازار جاکر کرتی تھی۔ مانگو رام ان سہیل کو لینے آیا کرتا تھا۔ یہ آئے تب پہ چلا جب انکو لے گیا تھا۔ اب تو میں تمہارے جوین کے سہیلوں کا ایک ہر دے دیکھ میرے علاوہ ان سہیلوں کو کوئی اور ملتا نہیں لگے۔“

مانگو کا باب جانو کی قیمت (آڑی واسیلا) میں ایک دکان کی قیمت چکانی پڑتی ہے، جو گائے، بیل، بکری، بھینس یا ہڑیا کی صورت میں ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم کو گونا گے کہتے ہیں (ادا نہ کر سکا تو جانو مانگو رام کے یہاں سہاگ آتی تھی۔ اور سماجی اصولوں کے مطابق مانگو رام کی زمین میں گئی تھی۔ کتنا بڑے مذاق تھا مانگو رام، اُسے کتنا چار کرنا تھا! ماندو بھی دیر سا ہی ہنس کھنکھاتا اور اس کا بیار بھی مانگو دیکھتا۔ زندگی سے بھر پور۔ جانو کو لگا تھا، مانگو راند کی شکل میں لوٹ آیا ہے۔

”مانگو۔ مانگو۔ تم کہاں کھو گئے؟“ وہ زور زور سے رونے لگی۔ مانگو کو جیسے بے ہوش کر دیا تھا۔ جانو اس سے بچھڑنے کے بعد لوٹ ہی گئی تھی۔ اس نے ہڑیا بیچنے کا دھندا بند کر دیا تھا۔ سہلا جب مانگو ہی نہیں رہا تو ہڑیا کس کے لئے بن گئے۔ وہ راناگو کے لئے ہڑیا بنائی تھی اور زیادہ ہی جانے سے بچنے کا دھندا شروع کیا تھا۔

ایک دن اس کے ایک مستقل بھابھ مانگی نے زور مارا۔ ”تم جیسی اچھی ہڑیا بناتی ہو وہی کوئی پانچ میل تک نہیں بناتا۔ نہیں تو میں تمہیں ہڑیا بنانے پر مجبور نہیں کرتا۔“ مانگی نے کہا تھا۔

راندو بھی ہڑیا کی تعریف میں کچھ اب ہی کہا کرتا تھا۔ ”راہ کیا خوب ہڑیا بنائی ہو۔ ہاتھ میں کی نہیں کر لے آ جا ہے۔“

ایک رات مانگی ہڑیا کی کرنا کے یہاں پڑا رہا۔ صبح بیدار ہوئی تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ جانو کا شوہر بن گیا۔ جانو ہڑیا بناتی۔ مانگی شربت چلاتا۔ اب دوکان داری زوروں پر تھی۔

پڑا ہر سواری کا۔ سر ہرج نے مانگی کا نیش کے سچے میں کام کرنے کے لئے باہر بھیج دیا۔ مانگی نے کہا تھا میں ایک سیرن کام کر کے لوٹ آئے گا اور اس کے لئے کان کے پھیل لائے گا، لیکن مانگی نہیں ٹوٹا۔ اس نے سیرن کا کام ختم کیے کا دکان سے شرط کا ایک خط لکھ دیا۔ ”ستور دین گھوم میں۔“ اب وہ آسم جا رہا ہے۔

اس کے بعد اس کا پتہ نہیں ملا۔ جانو ادھب کے پاس گئی۔ چاول دکھائے۔ ادھب نے نکال دیا۔ ”مانگی کی صورت سے بھینس گیا ہے۔“ جانو نے پوچھا۔ ”کوئی تدبیر ہے اور جی ہے۔“ وہ کانٹا نکال دیا۔ ایک کالا بکرا۔

جانو سوچنے لگی۔ مانگی بیل جانے کا تو اس صورت نکلیا مانگو، میرا کیا۔ جانے دو! اور اس نے گھوڑوں کے ادھب سے منکر کرانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اب سوچتے۔ اگر ماندو نہیں ٹوٹا تو اس بار ادھب کے پاس جانے گی۔ اور اس سے ستر بڑھو کر ماندو کو لانے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ گرسوں کا لمبی بوتلی دودھ پر اسے اب بھی یاد ہے۔ جب اس کی جوبیڑی میں ایک نوجوان آیا تھا۔ نوجوان نے آتے ہی شربت کی فرمائش کی تھی۔ جانو نے کہا۔ ”شراب نہیں ہے۔“

”ہڑیا بھلاؤ۔ نوجوان شاید بہت جتنا تھا۔ ہڑیا کی کوہ نوجوان وہی کھاٹ پر پڑ گیا۔ زندہ توئی تر اس نے بتلا دیا کہ بیڑیوں کا کام کرنے کے لئے جگہ چاہئے اور جتنی جگہ جانو کے پاس ہے اتنی جگہ سے اس کا کام چل جائے گا۔ جانو نے غور کیا۔ ایک دم ٹھیک لگا۔ وہ

سبھی اس صوبے کا نہیں ہے۔ گجرات کا معلوم پڑتا ہے۔ کہیں ہاتھ آگیا تو بہت! جاننے سے موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

جاسو بھائی ٹہری کا کام کرتا اور جانوس کا ہاتھ مٹاتی۔ اب جانو نے ٹہری کا دھندا بند کر دیا۔ دونوں آپس میں بہت مل جل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے پہلے جن کے ساتھ تھے۔ نہیں سے دوری آتا دی کہ طرح جانو کی زندگی میں ایک دوسری صدی کا آغاز ہوا۔ بول چال لباس سبھی بدل گئے۔ جانو نے خواب میں دیکھا کہ گجراتی ٹیکو کی ہے۔ وہ گجرات ہمارے کی۔ دہن کی طرح رہے گی۔ جانو کو معلوم ہے، اسی پر جس تجارت کے ایک نو جوان نے اس کی ہزاروں کی لڑکی سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا ہے۔

جاسو بھائی کے ہاتھ دو پیسے آئے تو وہ گجرات چلا گیا۔ گجرات سے تو اتنا سزا میں شادی کر کے ایک گھر بنا بھی لے آیا۔ دہن کو دیکھ کر پہلے تو جانو انداز و قطار روٹی پھر موہہ زور لڑائی ہوئی۔ جاسو بھائی دلاس دے کر دوبارہ گجرات چلا گیا۔ چلا گیا تو چلا گیا۔

جاسو بھائی کی کسی تازگی راند میں تھی۔ اس طرح راند کو پائرس نے جاسو بھائی کو پالیا تھا۔ لیکن اب تو وہ دھول کھوٹے تھے۔ چوتھا سوہرہ تھا سادہ سو۔ سادہ کو سوہرہ کہنا پاپ ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ایک دم وفادار۔ کبھی اسے غصہ نہیں آتا تھا۔ بس کمی ایک بات کی تھی۔ وہ اس کی قربت میں ڈیرا سہا رہتا۔ ایک بچے کی طرف۔ کہیں راند میں تو آج کل لایا نہیں ہو جائے گا۔ بس اسی چھان بین میں اب لکھ پڑی تھی جانوس سے۔ راند کبھی مادہ دیا نہیں ہوگا۔ وہ بچہ نہیں ہے۔

راند تو مرد ہے مرد! راند میں دن بھر تھا اس رات پورا جانو لٹکا تھا۔ جانو تپا ہوا تھا اور کچھ کھو گیا۔ آج اسی رات ہے کہ ہاتھ کا ہاتھ سنبھال نہیں پڑتا۔ جانو

اور صبا سے اور صبا کی کو آئی ہے۔

اور صبا کی تین دن بعد راند واقعی ٹوٹ گیا مگر وہ تنہا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ تازہ چٹیکے ہوئے جوس کے طرح ایک دوسرے سے لڑکی نے جانو کو پچانا جانو نے آئے۔ اس کا نام جاسو تھا۔ دس برس پہلے بھڑکی ماں بیٹی لپٹ کر رو رہی تھیں۔

راند ورجو جانو کا پانچواں شوہر تھا اور اس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کا پہلا شوہر، یہ سب دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

بقیہ: ٹوٹی مورتی کے زیرے

ہر ایک کو کیوں سمجھتی ہیں؟ سرخند پر چھٹے میں کتا ہی تیز بول مان کے آگے سر جھکائے ہی رہتا ہے۔ لڑکی میری بات... تو وہ نہ چھپے کتا چھاپے۔ ابھی میں سما کی تعریف کرتا ہوں تو مونہ پچا جاتی ہے۔ ہو جانا کہ سما کی طرف داری کی تو بڑھاپے میں مجھ پر ایسا الزام لگے گا کہ مجھ پر کھانے کے علاوہ کچھ نہ کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

میں آسمان سے سخت زمین پر لڑکی اور مجھ جڑ ہو گئی۔ راجہ کی آواز آئی۔ شاید آپ لوگ میری باتوں کو اب بھی بھانے بازی سمجھ رہے ہیں؟ پاپائے سجدہ پیچھے میں کہا یہ نہیں، میں جانتا ہوں تم جھوٹ نہیں بولو گے۔ چلے شادی کی بات ختم... لیکن سرخند میں سما کے ہاں میں کیا کہتی ہیں؟

”کہا کو گئے سنی کر۔ خودی سمجھو کہ ایک جاہل عورت موجود زمانے کی کسی خیم میں آرٹسٹ لڑکی کے ہاں میں کیا کہہ سکتی ہے... میں، نہیں تو شاید میری بات پر یقین آگیا ہو لیکن میں تم کو مجھ پر غصہ آتا لڑکی ہے۔ شاید وہ میرا بیوا آنا بھی زیادہ پسند نہ کریں۔

مٹی بوس! اگر آپ مجھے جاہل سمجھتے ہوں

تو دوسری بات ہے وہ میری قوت آپ کی سمجھ و ادراک اور صفا کرتی ہے بہت سناڑیوں اور سچا تھا ہوں کہ ہماری دوستی اور لڑکی ہو جائے۔ سما کی شادی کا مسئلہ تو صرف دس دن کا تھا۔ وہ مجھ پر سیکھوان کو نظر نہ کرنا تھا۔

”اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں پڑے گا تو وہ میں بھی کر دوں گا۔ سما کی شادی میری ذمہ دار ہے سمجھوں گا۔“

لیکن میں نے دانت پیسے لے۔ معلوم نہیں مجھے غصہ راجہ کی بیوی پر کیوں نہیں آتا شاید اس نے کہہ دیا ہے انسان سے کٹر بھی تھی، لیکن یہ شخص جسے میں دینا کی طرح تو جتنی تھی ایک سولی انسان سے بھی گیا تو راند لگا۔ اس قدر بزدل ہے

کہ اپنی جاہل بیوی کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتا، فخر خباہت کی طرح باہر سے پھل لاد لکائی دیتا ہے۔

غبارہ یہ کتہا کیا تھا اور اس کے اندر کی گلیں کی بدولت میں بسلی میں تھی۔ دینا کی ٹھنکی بگر کر پھونچ پھونچ کر آئی اور فرش پر اس کے زیرے پھوٹے۔ میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا میں سرخند دھوئیں کا کہنا ہی سمجھ کر دکھاؤں گی۔ سرخند اور راجہ میں کھینچا بیاناؤں گی۔ واقعی دوبارہ اور بدنام ہو جانوں گی۔ دیا کی۔ نو جوانوں اور بدنام دھوئیں کا کھل کر سنا تھا۔ سچی اور پاپا کی سونوٹی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ شہر میں بنائی ہوئے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ اس کو کسی شراب کے جام پر جام پڑتی گئی۔ پاپا اور مجھے سے سمجھا کر لڑکی ہاتھ سے نکل گئی۔

سرخند کی بھی شادی ہو گئی ایک میرٹھ پاس مٹی کی شکل و صورت کی لڑکی سے۔ خوشی ہی ہوئی یہ خبر پر۔

لیکن یہ راجہ کو پاپا بھی میری شادی کا بے شکا کیوں لگا رہا ہے۔ غرض تو سناٹا لگا لیکن ٹوٹی مورتی کے زیرے سے اب بھی مٹیوں میں کچھ چھب جاتے ہیں؟

• ۱۹۳۹ء ستمبر ۳۱ء چنکی گڑھ

زوجہ گزیدہ

ہمارے پڑوس میں بھی حال ہی میں ایک صاحب مع اہل و عیال آباد ہوئے ہیں۔ مصیبت اعلیٰ بیاتہ پر بھلا بیجو تک کا کاروبار کرتے ہیں اور تارنار و قرآن سے اعزازہ ہوتا ہے کہ ان کی پرنسپس خامی کامیاب ہے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفاء زبان میں تاثیر اور کاروبار میں بے اندازہ برکت دی ہے۔ اہل ایلان تھر اور ساکنان معافات ان کے فریخ پر نوز کی زیارت اور استاں پوسی کے لئے غزل و غزل اور جرق در جرق آتے ہیں اور یہ رما و رشت اپنی جبین حالی کر کے دامن کو گو ہر راد سے سبھ لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک دریائے فیض جاری ہے، جس میں زیر دست طینا ہی آئی ہوئی ہے اور معتقدین حسب استطاعت سیراب ہو رہے ہیں۔ میں بھی داخل حنات ہونے کی نیت سے گھسے گا۔ ان کی قدم پوسی کے لئے حاضر ہو جاتا ہوں۔

ہر چند ان کے ہاں بڑی برسر رہا ہے، خرابے تماشہ دے رہا ہے اور یہ سبزہ خداوند ہاتھوں سے میٹ رہا ہے، تاہم اس نیک اور

زر داری کے باوجود ان کے رونا دینا پر شکستہ طریت کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ بڑھوسے مزہج ہوتا ہے کہ باطن میں کوئی زخم کھد گئی کھرا گھاؤ موجود ہے، جس سے ٹیس کی لہر رہ رہ کر اٹھتی ہیں اور چہرے پر کرب و ماذیت کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

ہمارے نئے سہمیہ بڑے خلیق و غنادر ثابت ہوئے۔ ہار ری ملاقاتوں کی تعداد کے ساتھ ساتھ گفتگو میں بے تکلفی کی مقدار بھی بڑھتی گئی اور سمپسر وہ صاحب کمالی ادیب بچھاں وہ آفتاب علم و حکمت اور یہ ذرا بے مقدار باہم شہر و شکر ہو گئے اور ایک دوسرے کے ہر از و یار غار بن گئے۔

میں محبت و فرقت میں ان کی غلوت گلہ خاں میں حاضر ہوا کرتا۔ میں چونکہ اس کوچہ سے نا آشنا نہ تھیں اور اس پیشے کے تعلیمی نا ملہ تھا، اس لئے اپنی سادہ لوحی کے باعث ابتدا میں ہی ہمتار ہو کر وہ عجیب الاشکال اور ملاوٹ چٹانگ قسم کے تعویذات نقوش تیار کر کے معتقدین کو دیا کرتے ہیں، مگر لیکن نقد و معیبر حضرات نے مجھے حلیف بیان کیا کہ

ان کے نقوش و طیتے اپنے غیر مرئی اور بالائے بغضی اثرات کے باعث معین و پیچیدہ امر میں اولاً بھیل معاملات میں تیرہ ہدف ثابت ہو چکے ہیں۔ علی الخصوص ان معاملات میں جہاں جدید مسیحا سائنس کے بھی پر چلتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ان نقوش سلیمانی اور تعویذات روحانی کے حصول کے لئے لوگ دور افتادہ علاقوں سے آتے ہیں اور استہانی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے موند مانگنا حق الفت ادا کر کے انہیں رجاتے ہیں اور قیوس و برکات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

مجھے یہ شرف و سعادت حاصل ہے کہ میں نے انہیں نقوش و تعویذات تیار کرتے ہوئے چشم خود دیکھا ہے۔ حروف و اعداد نہایت باریک خطیں لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ان کے پاکیزہ خط کی تعریف کی تو بڑے عجز و فروتنی سے فرمایا:

"ابن سبت نہیں رہی دہ میں واہ گنم پر اقبال کا "ترانہ ہندی" اور سیدہ مرغ پر "مشکہ جواب شکوہ" روانی سے لکھوا کر لاتا تھا۔ چاول پر "قل ہا للہ" لکھنا تو سیدہ لویں اور نقوشوں کا مشغلہ ہے"

ناچہ نما تعویذات بنانے میں انہیں بھلی حاصل تھا اور کسی خاص اہتمام و التزام کی ضرورت

محمد خورشید نادر، محکم عبدالستار، نروثی مسجد، نیانازار، کامٹی (۴۲۱۰۰۱) ضلع لاہور
مہاراشٹر

بھی نہ تھی۔ مجھ سے محکوم ہوتے، حالات حاضرہ پر پہلے لاگ بعد وہ فرماتے اور لغزش بھی تیار کرتے جاتے۔ میری چشمہ نگہ گارہ یعنی دماغ یہ منظر بھی دیکھ لے کہ اگر گا کہوں گی پورس ہوئی ہو لغزش کا اسٹیشن ختم ہو جائے تو سادہ کاغذی موم جاد میں مفلون کر کے ہلک کے ہاتھ میں سٹھا دیتے اور پیش بندی کے طور پر تاکیدا کہہ دیتے کہ لغزش کر کھول کر نہ دیکھیں ورنہ زرب عبادت اور لوزر عبادت دونوں زائل ہو جائیں گے۔ لیکن ہمیں ہر جوں کے وہ لغتہ محال کی حرمت کے قائل تھے، اس لئے اس طرح کے سادہ لغزش کا پیسہ نہ لیتے تھے، لیکن اگر کوئی بے اہم اور دنیا پیہر انگار بھی نہ کرتے تھے مبادا دل شکنی کے مرتکب گردنے جائیں بلاشبہ علم و بر دباری کے پیسہ بکرم تھے۔ اور خدا دوسری اور رقیی اغلبی کا یہ عالم تھا کہ لوزر ڈوئیز لکڑیوں، میٹروں اور میواؤں سے کوئی چاراج نہ لیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان سے پیسہ لینا سڑے ہوئے پتہ ڈرے مارنا ہے۔

انڈاز گفتگو بڑا دل چپ، دل کش و دل آویز تھا۔ کوثر و نسیم میں غوطہ دی ہوئی آبرو کے مصطفیٰ لہو لہتے تھے۔ مسند اور مسلم الثبوت اساتذہ کے برگزیدہ اشار لڑک زبان تھے، جنہیں وہ معمولی تحریف و تغیر کے بعد بڑی جرسبکی اور بے ساختگی سے گفتگو کے دریا اس طرح استعمال کرتے جاتے کہ لغزش کی نیت پر موقی لڑھک رہے ہوں۔ ان کا یہ انداز میان فطری تھا، جس میں تصنع و تکلف اور خود کمانی کے جذبہ کو طغیانی دھل نہ تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ اپنی خود کز کے چہرہ چیدہ آفتناسات مجھے سنایا کرتے تھے۔ ایک دن اپنے غفوان شباب کے حالات بیان فرما رہے تھے۔ میں مہذب گوش تھا۔ فرمایا:

”جب یہ آتش تانی جوان ہوا تو اتفاقاً فقرت کے بین مطابق ایک شگھر اور شعلیق شریک حیات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بد قسمی سے گھر میں کوئی بزرگ شخصیت نہ تھی میں عالم طفلی ہی میں تھا کہ والدین داغ مفارقت سے گئے تھے۔ اس لئے سلسلہ جنبا نی کے لئے ایک مستعار اور جزوقتی سرپرست کی ضرورت تھی۔ نظر انتخاب محلہ کے ایک پیر دانا اور لکھا ہر مرد معقول پر پڑی۔ ان بزرگوار ذی وقار سے اس معاملے میں تحریز فرم کر دی دکھائی اور ایسی بچہ قی کا نظاہرہ کیا کہ میں ششدر رہ گیا۔ سبیل کسیری فرماؤں کے جو میں گھٹوں کے اندر ہی زوجہ منتظر، لباس عروس میں جلوہ گر فریب خانہ پر تشریف لے آئیں۔ چٹ منگنی پٹ بیابا آپ نے صرف سنا با پڑھا ہوگا مگر میں نے تو با قاضی طبع گستاخے۔ اور اس طرح جھکتا ہے کہ گھر بھونک کر سنا شاد دیکھنے کے باوجود سہلا نہ دل تیر گئی شام کو کئی، مجھے محترمہ کی خاندانی تاریخ اور خود ان کی شخصیت کے جغرافیہ کا علم بعد میں ہوا۔ لیکن اب تفصیل میں جانے سے کیا حاصل؟ مختصر یہ کہ جس نے سب ساس پر گرائی کی اس کو یہ ناقول اٹھنا لایا گھر بھٹ اٹھے ہی ان کی شخصیت بے نقاب ہو گئی۔ گھر میں آتے ہی انہوں نے پر میرے نکلنے شروع کر دیئے اور بیفہ عشرہ میں گھر دکھنا ہوا، جہنم بن گیا۔ نیم بختہ، نیم سوختہ راتب اور

Water-etter-shave

سے مشابہ چائے اور کچھ اس پیسہ تاکلید کہہ بیٹی ہوگی۔ اب میں آپ سے کیا کروں شریعت خستہ جانی کی بس یہ سمجھ لیجئے کہ میں نے مرمکے زندگانی کی — تنخواہ معقول تھی، مگر ماری رقم اس آبنوسی مجید کے قلع سازی اور دنیا کاری کے لوازمات کی خریداری میں صرف ہو جاتی۔ بقیہ اخراجات کے لئے رفوت کا سہارا لینا پڑا۔ مگر تاکہ ایک

دن از م کے مالک نے مجھے دیگوش کی طرح کاٹ کر پھینک دیا اور میں کئی پتنگ کی طرح پہنائی عالم میں غلطی اور بھولنے کھانے لگا۔ چند ہی دنوں میں فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اور اس بچھین چھری کو کوسولہ سنگھار اور لائش جمال سے فراغت نہ ہوئی تھی اور جس ویلہ محاش کی تلاش میں یوسف بے کاروں کی طرح جھٹک رہا تھا۔ شوریہ کی کے ہاتھوں سر والہ دوش بن گیا تھا۔ پھرتے پھرتے تیب باکل ٹھہال ہو جاتا تھا تو کربلے ہونے کسی غریب الوطن کی طرح بیٹھ جاتا تھا جہاں بھانڈ گھٹی ہوئی تھی۔ احباب عصری کی بھی تباہ ہوئے۔ جب دیکھا ان دنوں میں تیل جن میں راتو بیا نفع اکیلے انداز کٹی

افتقاریاں۔ اس کسیرس کے عالم میں ایک کرم فرمانے دوسرے جہانندہ افرا سے مشورے لیے کاٹورہ دیا ڈوہتے کوڑے کا سہارا۔ لیکن اس ہم کے دوران ہم ذات افراد نے کچھ ایسے دل لادینے والے تجربات بیان کئے اور اپنی بے چارگی اور بے دست و پائی کی الہی دل خراش اور رون فر داسائیں سنا لیں کہ مجھے اپنی حالت قابل رشک معلوم ہوتی تھی۔ اس دوران مجھ پر یہ حقیقت متکشف ہوئی کہ میری کہا نی روداد جہاں کا درو رکھتی ہے۔ کیونکہ جو آسے سنا تھا اسی کی وارڈ معلوم ہوتی تھی۔ بعض افراد نے اپنے دل آئندہ کو تمام تمام کے بد وقت تمام اپنی پیتاسانی شری کی۔ مگر چند کلمات کی تبدی کر کے گھوم پڑا اور وہ صرف ایک سرد کا گھٹیا ٹکڑہ تھے اور مجھے اس بات پر ایمان لانا پڑا کہ سدا کی تبدی جزا کرم و کے آسوخ ہو جائے میں گھولنا بی ہو جاتی۔ قصہ مختصر اس تک دو دو کے باوجود میرے معاشیہ کا کوئی تسلی بخش حل دریافت نہ ہو سکا اور ہم اپنا سامان بے لکھتے۔ اس صحت حال سے تسلیم حزیں اور خوش جوا کیوں کہ مجھے سمجھ

اور جگر کے نامور کسے دکھائیں؟ غیر آپ سے کیا بد وہ آپ کو محرم راز درونِ محرم خانہ ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ زورِ محترمہ ذوالصفا سی خصوصیات سے متصف تھیں۔ یہ کلام اور بد زبان بھی تھیں اور ویدہ دین اور وحدہ درجہ گستاخ بھی۔ اس فطرتِ تہدیکِ برتانِ بلاشبہ ویک سے سوا تھی۔ جب وہ مجھ سے آمادہ پکار ہوئیں اور میری ذاتی محبت اور خاندانی فطرت کو ہلکا کرتیں تو عالمِ غیب میں ان کے منہ سے شہد سا اٹھتا اور ادھر میرے دل سے دھواں۔ وہ غنچِ دین جب ہاتھ پر رکب لٹا ہوتی تو پوری گلیں گرنی ہوئی ڈرکے نفاذ کا سماں ہوتا۔ لوگ اپنے کان اور دروازے بند کرتے۔

محبت میں ایسا تھان محترمہ کے بل و نہار۔ ان کی اس طرح کی دل آزار حرکتوں سے جان سخت نہیں میں تھی۔ کٹری جمل کر کوئلہ ہوجاتی ہے اور کوئلہ راکھ۔ مگر میں سوزِ نیت ایسا کرا کوئلہ ہونا نہ راکھ۔ میں چوبہلم کی طسریں سنگدار۔ اللہ بہتر مانتا ہے کہ میں اس رشتہ ازدواج کو نوبت سے تقدیرِ جان کر لوری ایمان داری اور غرض اسطوری سے بھگت رہا تھا۔ آہ ایمان اس آفتِ جان اور بلائے ناگہاں سے نہا ہ کئے کیا کیا نہ کیا۔ میرا لڑتے کیا۔ گریہ بے یقوت کیا۔ ظلم ان کے مجھے طعنہ اختیار نہ تھا۔ مگر ان کی خردسری ہمسرہ کسی اور بے اعتنائی کا دہی عالم رہا۔ ہر حال جب کلیجہ پک گیا، اور چھلنی ہو گیا اور انہماکِ تعمیر کی ہر میوٹھوں کو شش کو اس خرد بین خود را راکھ کرت پسند کیے سب زنگار دیا تو میری بہت مجبور ہو کر میں نے انہیں دغا دیا اور اس جیبہ کہ میں کوئی گنا کے سپرد کر دیا یعنی اپنی رودادِ غیبتِ ناقص لکھ کر اپنے رومانی پیشواؤں کو ارسال کر دی۔ انہیں میری خامِ بہت عزیز تھی۔ اس لئے تین طائف مسلح رات بید کیا اور چلتے دن کو دروازوں سے

افراد سے اپنی فحش کی داد پانے کی توقع تھی، وہ سب کے سب مجھ سے زیادہ ششِ فحش تھے۔

آنا کچھ کے بعد وہ خاموش ہو گئے شاید ماضی کی یادوں میں گھونکتے تھے۔ میں نے اس بات کو کچھ فہم نہ کیا کہ ان کا ذہن اپنے مرکزِ نقل سے غائب کچھ سرک گیا تھا۔ اور نگہ کشیل کا مدار کچھ بیضوی ہو گیا تھا۔ کیوں کہ گھونکے دورانِ جلدی ان پر خود کلامی کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ بے خودی خدا جانے انہیں کہاں لے جاتی۔

اداس تناسلِ سامین ان کی باز آمد کے منتظر رہتے کچھ دیر تک کربِ خود کلامی میں مبتلا رہے کہ بعد میں سچ ان کی واپسی ہوئی اور پھر وہ خود کو حاضرین کے ترغیظ میں پانچ گھنٹہ و شرم سا نظر آئے۔ اور ان کا سرخ و سپید چہرہ عرقِ افعال سے تر ہو جاتا۔ اس وقت بھی ان پر وہی عالم طاری ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چپکے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"غائب ہیں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ میں معزاقی طور پر برسرِ روزگار ہو گیا تھا۔ ایک وقت وہ تھا کہ پرورشِ آفات اور ضرباتِ صدمات کے باعث حیران تھا کہ دل کو روئل یا جگر کو پٹیوں۔ مقدور نہ تھا ورنہ ایک فوج کرکے گنج کر لیتا اور آج بفضلِ ربی یہ عالم ہے کہ آمدنی اور ضروریات کا حساب لکھنے کے لئے ایک اکاؤنٹ کی تقریری پیچیدگی سے غور کر رہا ہوں۔"

آنا کچھ کے بعد وہ پھر مراتب میں چپکے۔ لیکن خطابِ معمول اس وقت جلدی طبع ہو گئے اور گپا ہو گئے۔

"لیکن اس قابلِ رشک نازِ انسانی کے باوجود ازدواجی زندگی کی وہ ستر میں جن کا داغِ زخمِ زخم رومانی نادلوں اور جن کی چھلکیاں ہماری سماجی نفلوں میں نظر آتی ہیں، ان کے فضاں سے نکسر محروم ہوں۔ اب اپنے دل کے پیچھے

قصد کو رواہ انہیں ایام میں اتفاقاً سرورہ ایک تعمیرِ شناست سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے جی ہوں گے کہ کسی اہم دیرینہ کامنا بہتر سے ملاقات سمجھاؤ گئے۔ انہوں نے مجھے اس محنت اور ناگفتہ بہ حال میں دیکھا تو آمدیدہ ہو گئے، فوراً ایک کشتی کا اور اپنے گھونکے اور شری نیت و شفقت سے پرسش حال فرمائی۔ دل بھر گیا۔ میں نے انک اور کئے کی کوشش کی پسند نہ آئی۔ بالآخر پچھتے پچھتے اس کی طرح بھٹ پڑا۔ ہنسنا کچھ تھک فوراً کاظمی ان آگیا۔ بہت دنوں کے بعد ایک حقیقی اظمِ غلامِ ملائکہ ساری داستانِ پرالمِ ملک کر سسکیوں سے جھپکوں کے درمیان انہیں سدا کی میری رودادِ غم کوئی قندہ شش ہو گئے رکھے اور تادیر سے حرکت پیچھے رہے۔ پھر ایک خطِ رقم اپنی جیب میں سے نکال کر مرحمت فرمائی اور لانا فہم لئے تھے کی تاکید کی اور برسرِ روزگار کر دینے کا دھرہ فرمایا۔

حسب الارشاد دس روز ان کی ترم ہوئی کئے ان کے در دولت پر حاضر ہوئے مگر۔

اعلا حضرت ہی مجھ کو پیکر کا کاروا کر دیتے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی خلوت گاہِ خاص میں اس پر اسرار پیشہ کے رموز و نکات سے آگاہ فرمایا۔ اس کے علاوہ بعض اقدارہ امن کے خاص انخاص صددی نفلوں سے بھی آگاہ فرمایا۔ زان لہا اپنے مستقل گاہ کوں اور اسراوہ لباسِ انجمنوں سے میرا تعارف کر دیا۔ قیل و غصہ میں نے اس فنِ عزیز کے مجاہدات پر عین حاصل کر لیا اور ان کے فضلِ عوام میں بھی مستاف ہو گیا۔ پھر وہ شخص بے ریا اور صلیبِ جوہر و سخا دوسرے شہر ہجرت فرما گئے۔ اور اس زعفرِ ملائکہ کی خلافت و نایاب میرہ ہر د کردی۔ اس طرح میں نے اکام و روزگار کو آسان

پیغام ارسال کیا کہ ”لوہے کو روہے سے کاٹو“
چنانچہ میں نے کٹائی بسپا اور زور دینے کے
صرف سے ایک ایک ٹکڑا ہیروں کی فراہم کی جس میں پہلی
ہیروں کی ہی کام خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔
بلکہ بعض معاملات میں ان سے بھی سہرا۔ پھر میں نے
اُسے کچھ شہ دے کر اور کچھ روغن تازہ مل کر زور
اڈل کے مقابل میں کھڑا کر دیا۔ اس قرآن المسدین
سے گھر کی روغن اور کھانا آرائی دیدار ہو گئی۔
زود ہی تمام حب میرے حرم میں داخل ہوئی تو
سہ آتش میں جتنی تھیں یعنی ابھی ان کے دوسرا لقب
جو ان مرگ ہو تو ہر دل کے گفن بھی نہ مٹے ہوئے تھے
کہ مجھ سے منسوب ہو گئیں اور گئے ہی اپنے مفادات
کے تحفظ کے لئے عار حارۃ اقدامات شروع کر دیئے۔

تیسرے طرف تاک تصادم کی شکل میں ظاہر ہوا، جو
میری چلائنگ کے عین مطابق تھا۔ زور اڈل کو
اپنی سیرٹی پر ہمارا تھا اور زور دینے کی سطحی دلیل
یہ تھی کہ آپ نے جو خیر برخواست، چنانچہ میرا برابری
تھی، اس لئے گھمان کا رن پڑا اور میں گورنمنٹ
حافظت میں بیٹھا اپنے پیر و مرشد کی توجہ تدبیر کا تکل
ہو کر صدق دلی سے ان کی درازی نگر کی دعا مانگ
رہا تھا۔ سکول کہ ان دونوں کو باہمی جو تہرہ برابری
سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اس خاکسار کی طرف
متوجہ ہوں۔ اب اگر یہ شامت ہمالیہ شغفیت
شوہر اند کے جذبہ سے منقلب ہو کر دخل و مداخلت
کا مرکب بھی ہوتا ہوں تو دونوں مجھے مردانے میں
دھکیل دیتی ہیں اور ایک زبان ہو کر گتے ہیں۔
دور جھلس جھلس خوش موکسٹن داؤد
گداؤے نشینی تو مردوںے مخزوش

اس بندوبست سے قدرے اطمینان اور
فراخ دل حاصل ہوا مگر وقت یہ ہوئی کہ دونوں
کی حد تک کشتی سے پیدا شدہ بیچ و پکار مردانے
تک پہنچی تھی جس سے وحدہ پر پرے اثرات مرتب
ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے آپ کے پڑوس کا یہ
مکان خرید لیا۔ اور نقل مکانی سے قبل رٹانے

حد تک کو ساؤنڈ پر دت بنوایا اور مردانے کو خانقاہ
میں تبدیل کر لیا ہے اور اب اطمینان سے خدمت
خلق میں مصروف ہوں، لیکن میری اس عزت گزشتہ
اور گذشتہ گزشتہ گزشتہ آپ یہ توجہ اخذ نہ کریں کہ میں نے
ازدواجی زندگی سے راہ و آفاقہ رکھ رہا ہوں
میں معذور نہیں بلکہ بغیر کس شخصے پناہ گزین ہوں اور
ہر چند کہ گزشتہ میں نفس کے مجھے آرام بہت ہے مگر
مادی آسائشوں کی فراہمی کے باوجود وہ بھی سکون
اور اطمینان قلب اب بھی حاصل نہیں ہے۔

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا:
”کیا آپ نے کچھ بھی ان بزرگوار سے
رجوع فرمایا؟ انہوں نے آپ کے لئے رجوع فرمایا
کی تھی؟“

ان کا نام سنا تو مجھ جھری سی کی اور فرمایا
”وہ بزرگوار بھی ایک طرف تھا شافلے۔ خدا مانے
ان کے جتر اعلیٰ نے بارہ کاون سا مرکب استعمال
کیا تھا کہ سیمائی اثرات اب تک ان کی باقیات
میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ عجیب سیمائی شخصیت
تھی! میرے دلیر سونہ میں طعام ماہر بہ تعبیل
تمام خلق تک متھونے کے بعد جو سونے تو پھر اٹھو نہ
سکے۔ بلاخر پچاسیوں نے مل کر انہیں کا ندھے
پر اٹھایا۔ چڑی پڑا سر شخصیت کے مالک تھے۔
آج بھی ان کی یاد سے دل و جگر میں جھک گاہ گاہ
ہوتی ہے اور ہر شے دبو سے ڈر مانتی ہے کہ خدا
انہیں دوزخ کے عذاب سے بچائے۔ بہت سی
خبریاں تھیں مرنے والے میں!“

قدرے سکرت کے بعد وہ پھر گویا ہوئے:
”حالانکہ میں بیویوں کے معاملہ میں نہ صرف
یہ کہ خود کشیل ہوں بلکہ اب تو ذوالقرنین بھی ہو چکا
ہوں۔ مگر حیا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ
ازدواجی زندگی کی حقیقی لذتوں سے ابھی محروم ہوں۔“
اضحیٰ! ایسی بار و بار شخصیت کے
فیض سے میں جلد ہی محروم ہو گیا۔ ایک دن حاطے
کس بات پر دونوں ازدواجی مثال پر ایک

وقت برس پڑیں۔ ان کے احباب غفران کی افس
اور صریح الاشغال تھے، اس وقت و طغرائی تاب نہ
لا سکے۔ تیرا لاکر فرس پر گریہ اور تیرہ حیات اور
بنو غم دونوں سے نجات حاصل کر لی۔ فعلیت
کے وقت دونوں نے دیکھا کہ لاش سیاہی مائل نیلگون
ہو گئی تھی۔ کسی نے ان کے دیکھا کہ لاش سیاہی مائل نیلگون
کسی نے زہر خورائی کا۔ مگر ہم جیسے حق شناس اور
مغرب بارگاہ خاص جانتے تھے کہ یہ صریح زہر
گزیدگی کا افس تھا۔

بقیہ: سورج مکھی

چار بناتے ہوئے اس نے کہا۔

”میرے ساتھ ڈھوڑی چلو“

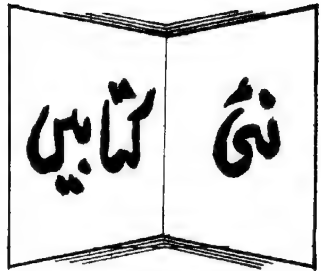
”نہیں“

اس نے دوبارہ نہیں کہا۔

جب ہم ان کیس کی حدود سے نکلے تو ڈھوڑی ملنے
والی اس سامنے تھری تھی۔ وہ بیس میں جا پہنچی۔ میں
چلنے لگا تو کوئی: ”رات کچھ تو گزیرا کروں بیٹے کتے؟“
میں خاموش رہا۔ ہم دونوں ہی جلتے تھے کیا
تھا۔ تمہارا ایک قرین تھا پھر پڑا۔ وہاں سے بھلا۔
”قرین؟ کون سا؟“ میں پوچھا۔
”چلو اچھا برا نہیں باؤں میں!“ وہ آتش کی

عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بار میں اسے مدد گئی
تھی۔ مگر میوں کی دیر سے ہی ہم اچانک باہل ہوا
تھے۔ تب میں نے شاید اپنے آپ کو بچا لیا تھا۔ وہ
بہت سوچا پھر کہہ رہی تھی: ”نکل رات مرنے مجھ
سے مجھے بچا لیا تھا!“ اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔
”تمہارا؟ احسان میں زندگی نہیں سمجھتی ہو گی۔
تمہاری عیب کی اور بہت تو کس دہی ہوئی۔“
”نہیں شش اسباب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔“ میں
نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

جب اُس کی بس چلی تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی
آنکھیں پونچھ رہی تھی۔



سوچ گگر

معتمد : حسن عابد

ناشر : کاروان پبلیشرز ۱۹۹/۱۶۹، فیڈرل بی ایریا کراچی

قیمت : اٹھارہ روپے

”سوچ گگر“ پاکستان کے مشہور شاعر حسن عابد کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ حسن عابد کا تخلص ’رادی‘ ہے، ’سیتا پیر (رادی)‘ اور ’رادی‘ دونوں کراچی ہے۔ انہوں نے کھنڈو نیوٹرٹی میں تعلیم حاصل کی۔ یہ اس کھنڈو نیوٹرٹی کی بات ہے جو ڈی۔ بی۔ مگنری۔ مسعود حسین رضوی ادیب، برو فیصلہ کالی پرشاد، اشتیاق حسین اور آل احمد سرور کے ناموں سے بیجا جاتی تھی ایسا کھنڈو میں ان کی ذہنی تربیت اور شعری احساس کی کیا رسی ہوئی، جہاں جعفر علی خاں آخر کھنڈو، سراج کھنڈو، ساکت کھنڈو، اسرار الحق مجاز، سلام چھٹی شہری اور باقر مہدی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ان آوازوں میں کلاسیکی عظمت، تہذیبی رجاؤ، زبان کا محنت اور روزمرہ و سماجی کی دل کشی رکھنے والی آوازیں بھی تھیں اور ان قید و بند کو توڑ کر ایک نئی آزاد فضا میں سانس لینے اور نئے نئے اپنے عہد کی تہمتا کرنے والی آوازیں بھی تھیں جو ادب میں نئے نئے تجربات کے در کھول رہی تھیں۔ اس روایت اور رہنماوت کی بڑی فنی فضا میں جن لوگوں کی تربیت ہوئی ان لوگوں میں حسن عابد بھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی عناصر آج بھی ان کی شاعری کی تعمیر یا فکر میں بنیادی شکل رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نرمی، دل کشی، رجاؤ، اس عظیم تہذیبی اور ادبی روایت کا ورثہ ہے، عجمان کے غزل میں رچی ہوئی ہے۔ آج کے زمانے میں صرف لطافت کی پیروی کسی کے لئے بھی مستحسن نہیں قرار دی جاسکتی اور نہ حسن عابد نے اس مشکل میں رسوائی کی ہے۔ انہوں نے اپنی فکر کی تعمیر میں ان صحت مند قدروں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی شاعری کی جدید عبارت کو

نگہروں، ذروں اور طالعوں سے آراستہ کیا ہے، جن سے اس میں ایک نئی شان اور دل کشی پیدا ہوئی ہے۔ حسن عابد ایک درد مند دل رکھتے ہیں جو دوسروں کے دکھوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف زندگی کا کرب ہے جسے وہ یہ کہہ کر بڑی جواں مردی سے برداشت کر لیتے ہیں کہ

میںلا دھوکہ مجلسِ غم مبتلا ترے آنگن میں دل کے فز بجھائے ہوئے تو ہیں
اشکوں کے گہروں کے چمکتے ہوا سکہ کچھ بھول سے جہر ہی جانتا بنگلہ میں
ہاں کشمکشِ جانِ عزت انکارِ ہم بھی ہیں یوں ہیں کہ اپنے عہد کا اقرار ہم بھی ہیں
یا اپنے عہد کی تصویر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

تھا ایک ہی ہی خیر قاتل کے سامنے باران ہوا تھے کتنا سے کھٹے ہوئے
شکستگی کا عیب ایک سلسلہ ہے ہاں مجھے مکان بھی تو ہوا طالع ہوا
سلے ہوئے ہیں معجرتوں کے آئینہ آئیں گے کوئی رند ماسفر تھکے ہوئے
حسن عابد کو متاثر کرنے والی دوسری شے حسن ہے اور سب وہ اس کا بیان کرتے ہیں تو سر تا پا اس تاثر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کے احساسِ جمال نے ان کی شاعری میں ایسا افضل پیدا کیا ہے جس کی دل کشی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

نسبت ہمیں بھی اس گل پیر میں سے ہے
آوارگان کو چہ دلدار، ہم بھی حسین

پھر میرے ہر طرف زلف کھلے شانہ چلے
پھر وہی سلسلہ شوقی رندا نہ چلے

ہیں اسی کے یہ رنگ ہائے سخن میرے سپلو میں خوب روئے وہی
اس کا چہرہ اسی کے حذر و حال انسا موعہ گفتگو ہے وہی
شہر میں شور ہے اس شورش کے بجائے ہر کوئی رند پھر بھرتا ہے دیوانے

سبھی جینوں کو اپنے شہرِ جہاں میں لہانے والے حسن عابد کے یہ اشعار بلکہ ”سوچ گگر“ کے بیشتر اشعار ان کے جذبات و احساسات ہی کے ترجمان نہیں بلکہ زندگی کے اس کرب، اس کشمکش اور اس حسین ترنمے کی شاعری کی تمام نشاندہی کرتے ہیں۔ ”سوچ گگر“ اپنی لطافت اور گت آپ کے عہد سے بھی ایک خوب صورت مجموعہ کلام ہے۔

نشانات

معتمد : محمد علی صدیقی

ناشر : ادارہ عصر نو، ۴۲۔ ہمایوں کالونی، کراچی

قیمت : ۲۵ روپے

محمد علی صدیقی پاکستان کے اہم ناقدوں میں ہیں۔ اس سے قبل ۱۱

وجہ ہے کہ ہر سکندر، ہنگرے لوگوں نے ان کی تنقید کر سارا اور زندہ کیا ہے۔
 "نشانات" کی کتابت و طباعت اچھی اور دلچسپ و کاغذ بہت اعلیٰ ہے۔
 (شائبہ روٹری)

اسپارٹاکس

مصنف: باڈل سرکار

مترجم: انیس اعلیٰ

قیمت: ۱۸ روپے

ناشر: معیار پبلی کیشنز، دہلی، بھارت

"اسپارٹاکس" دو اعلیٰ باڈل سرکار کا ایک نیم تاریخی ناول ہے جسے ہندوستان کے مشہور اور ممتاز اسٹیج تھیٹر کے اداکار، ہدایت کار اور ڈرامہ نگار باڈل سرکار نے ہنگالی میں ڈرامائی روپ دیا اور انیس اعلیٰ نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔ پچھلے چند برسوں میں انیس اعلیٰ نے اسٹیج کے اداکار کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا انہوں نے باڈل سرکار کے ایک مشہور ڈرامے "پھل" کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس کے نام سے کیا تھا، جس پر انہیں مغربی ہنگال کی اردو ادبی ٹی وی نے انعام ملا تھا۔

اسپارٹاکس ان غلاموں کی داستان ہے جن پر حضرت علیؑ نے ۱۷ سال قبل روم میں ظلم ڈھلائے تھے۔ اور جنہوں نے ظلم کو ختم سے تنگ آکر بغاوت کر دی۔ اگرچہ یہ بغاوت سال پہلے کی داستان ہے، لیکن آج بھی ہماری زندگی میں اس کی معنویت ہے۔ آج بھی دنیا میں روم کے وہ غلام زندہ ہیں اور روم کا وہ طبقہ بھی ابھی متم نہیں ہوا جو ان غلاموں پر ستم کرتا تھا۔ صرف روپ بدل گئے۔ تمام دنیا میں رنگ، نسل، مذہب، زبان اور علاقے کے نام پر وہی کچھ جو رہا ہے جو روم میں ہوتا تھا۔ اسپارٹاکس اس ظلم و ستم کے خلاف ایک موثر آواز ہے۔ اسپارٹاکس ایک غلام تھا، لیکن اس نے سامراج وادی روم کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

ڈرامہ نگار کا کسی ڈرامے کا ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے کیوں کہ ایک ناول نگار یا ڈرامہ نگار کو تاریخی کارکردگیوں پر بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ اس کے فن کا اعتبار وہ ناقدین کرتے ہیں جو بہت سے تعصبات کا شکار ہوتے ہیں اور جن کی رائے کا درست ہونا ضروری نہیں۔ ڈرامے کا حاملہ دوسرا ہے۔ آپ کا تاریخی، سامع اور ناظرین کو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ آپ کے ایک ایک لفظ کا رد عمل ہوتا ہے اور آپ کے ہاتھ آپ کو مسلیم ہو جاتا ہے کہ سامع اور ناظرین نے آپ کی تحریر پسند کی یا آپسند۔ انیس اعلیٰ خود اسٹیج کے مشہور اداکار ہیں وہ اسٹیج کی ضروریات سے واقف ہیں وہ مکالموں کو موثر بنانے کا فن جانتے ہیں۔ انیس یہ معلوم ہے کہ اسٹیج پر کس انداز کی زبان کی ضرورت ہے۔ اسپارٹاکس کی زبان صاف، سادہ اور سلیس ہے۔

کی دو کتابیں "قوازن" اور "کروپے کی مرکزیت" سنا تے ہوئے ہیں۔ مغربی و مشرقی ادبیات پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ ادب کے سلیسے میں وہ ترقی پسند نظریات رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے نظریات کسی سیاسی سلیسے سے متعلق نہیں رکھتے۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب کو مضبوط کیڑے بگائے ایک ایسا شعری عمل سمجھتے ہیں جو فن کار، نفاذ اور ادبی اشاعت کے باوجود اپنے حامل اور سماجی و معاشی عوامل کا تابع ہوتا ہے۔ وہ ادیب کی انفرادیت اور آزادی کے نال ہیں اور شعرا کی کلام کے مطالعے میں اس سیکڑ کو خاموشی سمجھتے ہیں۔ انہی لئے ان کی تنقیدی نظریات میں قوازن نظر آتا ہے۔

"نشانات" مجموعہ صلیبی کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے، جس میں ۲۶ طویل و مختصر مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کو چار موضوعات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی ادبی مسائل، لسانی مسائل، خراج عقیدت اور اجمالی مطالعے۔ پہلے حصے میں سات مضامین ہیں، جس میں روانت اور جدیدیت، ادب اور جمہوری اقدار، اگرستہ دس سال کے ادبی رجحانات اور ادب کے عصری نفاذات اہم نظریاتی مضامین ہیں، جن میں انہوں نے ادب اور ادیب کے سامنے درپیش تھیں مسائل کا جواب واضح انداز میں حائرہ لیا ہے اور موجودہ نال کا بڑی غیر جانب داری سے تجزیہ کیا ہے۔ دوسرے حصے میں پانچ مضامین ہیں۔ یہ مضامین لسانی ماحول، انیسویں صدی تک، لسانیات، تنقید اور وٹ گن اسٹائن، اسٹریکچل ازم اور لسانیات، لہذا چوسکی اور روم زبان اور شاعری کی زبان کے موضوعات پر ہیں۔ تیسرا حصہ پانچ مضامین ہیں لیکن داخلی طور پر ایک دوسرے میں جوڑت ہیں۔ ان میں اس تنقیدی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے، جو جدید لسانیات اور اصولیات کے تحت وجود میں آیا ہے۔ اردو میں یہ تنقیدی نقطہ نظر جدیدیت کی دین ہے حالانکہ مغرب میں اس کا آغاز ختم ہوتا جا رہا ہے۔ مجموعہ صلیبی نے ان مضامین میں لسانیاتی تنقید کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ اور ادبی تنقید میں اس کی ضرورت و اہمیت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

خراج عقیدت اور اجمالی مطالعے کے تحت سات سات مضامین ہیں جن میں بعض ارمیوں اور شاعروں کے فن کا جائزہ مل گیا ہے۔ ان میں شاہ عبداللطیف، اقبال، پریم چند، سارتر، پابلو نرودا، محمد حسن عسکری، عرش چندر، رفیع احمد رفیع، ابن اثیر، فارغ بخاری، شمیم روفانی، لشکر نامی، احمد داؤد حسن، مابرٹ مل ہیں۔ یہ مطالعے محمد علی صدیقی کی ادبی تنقید کی مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مطالعوں سے ان کے ادبی نقطہ نظر کے ساتھ جدید ادب پر ان کی گہری نظر، عصری تقاضوں اور ادبی میلانات پر ان کی گہری نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجموعہ صلیبی کی تنقیدی سب سے بڑی خوبی ان کا واضح، مدلل اور غیر جانب دارانہ رویہ ہے۔ یہی

پچھلے تیس چالیس سال میں اردو میں طبع زاد مرثیہ بہت کم لکھے گئے۔ اور جو لکھے گئے ان کا ادبی معیار زیادہ بلند نہیں تھا۔ اس کا بانی زاری میں انیسویں صدی کے یہ تجربے بڑی نعمت ہیں۔ اس کا خاکس کے تجربے پر انہیں اثر پڑا۔ انھوں نے اردو کا ایک نیا اس سال انعام بھی ملا ہے۔ (خلیق انجمن)

قلم کی کاشت

شاعر: محمد عثمان عارف نقشبندی

ناشر: بیدل اکیڈمی، بیدل نزل، بیکانیر، راجستھان۔ قیمت: ۳۰ روپے

بیدل کا مہر ہے:

بہرِ حضور تپ سودا شرِ کاشت

اور غالب کا شعر ہے:

رنگِ شمعِ شہزادے می لڑیم

کفِ خاکِ غبارِ می لڑیم

یہ دونوں بیانات تخلیقِ عمل سے متعلق رکھتے ہیں شاعر اپنے ماحول سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اس کے رنگ دہے میں حرارت کے ایک بے مین ہر کا دروازہ کھلتا ہے جو اس کے خون کو شعلوں سے سیراب کرتی ہے، اس نے قدمائے گری کو شعر کی ایک خاص صفت بتا یا تھا۔ غالب ”خن گرم“ کی بات کرتے ہیں اور پھر اس تجربے کو یوں بیان کرتے ہیں:

بلاشو رہے سر میں ہم کب تک

قیامت کا ہنگامہ رہ رہ کر

میر تقی اس ہنگامہ خیز ادب اور غالب کی شہزادگی کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر کے ہاتھ میں قلم کی جگہ تلوار ہوتی ہے یا وہ قلم سے تلوار کا کام لیتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تحریر اور احساس جو عام آدمی کے لئے معمولی یا گونگے یا ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ شاعر انہیں اپنے الفاظ کے ذریعہ زبانِ عطف کرتا ہے۔ اس طرح وہ چیزیں جو ہمارے سامنے ہوتے ہوئے بھی ہماری دوسرے میں نہیں ہوتیں ہماری گرفت میں آجاتی ہیں۔ عثمان عارف نے اس عمل کے نتیجے کو قلم کی کاشت سے تعبیر کیا ہے۔ اپنے دیوان کے لئے انہوں نے جو استعارہ استعمال کیا ہے وہ غالب کے اس مصرعے کی یاد دلانا ہے:

لینا دانتوں میں جو تنکا جو ایشہ نیتاں کا

دانتوں میں تنکا لینا اظہارِ غم کی علامت ہے، لیکن شاعر کے یہاں وہ تنکا بھی نیتاں کا ایشہ نہیں بلکہ مائری کا کام کرتا ہے۔ بالشری اور قلم میں دونوں کی طرح مشابہتیں ہیں۔ ظاہری بھی اور معنوی بھی، عثمان عارف کے مجھے کا نام قلم کی کاشت، بھی ان دونوں تصورات کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری میں بھی تجربے کی دونوں آہٹیں

داخلی اور خارجی صاف نظر آتی ہیں۔

اگرچہ شاعری کے بارے میں عام طور پر اردو شاعری کے بارے میں خاص طور پر یہ بات مشہور ہے کہ اس کا عمل سے کوئی علاقہ نہیں، ایمن خیالی دنیا کی چیز ہے، مگر اصلیت اس کے برعکس ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ خیالی دنیا اور عمل کی دنیا الگ الگ وجود رکھتی ہیں اور یہ بات بھی غلط ہے کہ شاعر باعمل انسان نہیں ہوتا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہمارے شاعروں میں اقبال، حررت، مولانا محمد علی اور مجاہد ظہیر مولانا شبلی جیسے لوگ شامل ہیں۔ جو سیاست کے میدان میں سرگرم رہے ہیں۔ ہمارے بہت سے شعرا نے لفظ زندگی کی شاعری اور شہر کی دونوں جہتوں سے حصہ لیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی سماجی زندگی میں وکالت، ڈاکٹری، سرکاری نوکری، تجارت، کوئی بھی ایسا کام کرے جسے عام طور پر غیر شاعرانہ سمجھا جاتا ہے اور شاعرانہ زندگی میں اس کی شخصیت اس شخصیت سے باطنی الگ ہو کر سماج میں نظر آتی ہے۔ لی۔ ایں۔ ایٹھ ایک عرصہ تک بینک میں ملازم رہا۔ لہذا شاعری کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی شخص کو دنیاوی کاروبار کے لالچ نہ رکھے اور دنیاوی مصروفیات کوئی ایسی بیماری نہیں جس سے شاعری کو نقصان پہنچے۔ قدیم یونان میں یہ خیال عام تھا کہ شاعر کو باطنی شخص ہونا چاہیے۔ اس معنی میں ہمیں کہ جو کچھ وہ شعر میں لکھے اسے گرد کھائے، بلکہ اس معنی میں کہ اپنی شہر کی زندگی میں وہ ایک کارآمد انسان بھی ہو۔ یہ مضمون کہ شاعر کو عمل سے کوئی نقصان نہیں اور شاعر کی بچان یہ ہے کہ وہ سماج پر ایک بوجھ ہوتا ہے، بہت بعد میں مسئلہ آیا اور اسے عمل قبول عام بھی حاصل نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ بعض غلط فہمیاں کی بنا پر ہمارے یہاں بعض باثر لوگوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہمارے شاعر ناچارہً محض ہیں اور کاروبار دنیا بیکار زاریات سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ایسے لوگوں میں حال کی پیشانی تھے۔ عام قاعدہ کے کوئی باثر نقاد جب کوئی ایسی بات کہہ دیتا ہے جو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے تو بہت سے لوگ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں جنہیں اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ محمد عثمان عارف جو سیاسی آدمی ہیں اور مرکزی حکومت میں نائب وزیر بھی ہیں، شاعری کس طرح ادیکوں کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ہمارے ادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو انہیں پتہ چلے کہ صرف مٹی سلیم ٹیم ان گنت ایسے ادیب اور شاعر نظر آئیں گے جو دنیاوی زندگی میں بھی سرگرم کار تھے۔ محمد عثمان عارف اسی سلسلے کے ایک نمایاں نمونہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا تعلق نقادوں سے بھی ہے اور نقادوں اور شاعری کا رشتہ ہماری تہذیب میں ایک ہزار برس سے زیادہ پرانا ہے۔ شاعرانہ خیال کی پہلی صفت ابو عبد اللہ الخیر سے شروع ہوتی ہے۔ حکیم نانی نے سونیا نے اور اخلاقی مسائل کو شاعری میں اس طرح جوست کیا ہے کہ اس وقت سے

آج کل کی دنیا

تقریباً ہر عرصے کی کسی حد تک تعصوت سے مراد مراد حاصل کیا۔

عثمان عارف کے اس مجموعے میں کوئی اسی غرض نہیں شامل ہیں۔ انہوں نے مختلف مجرموں میں طبع آزمائی کی ہے اور غزل گو شاعری کی سی کیفیت یعنی زمینوں کی گفتگو ان کے یہاں اکثر نظر آتی ہے۔ یہ ایک دل چسپ بات ہے کہ نظر آگیا پانچویں ہجوم میں رولف و فانیہ کی یاد دہانی نہیں تلاش کرتے۔ لیکن اگر غزل کی زمین انہی، مشکل یا تازہ ہونے سہاری نظر اور بھرا سا ممد دونوں اس سے فوراً متاثر ہوتے ہیں۔ غزل کی کامیابی میں اس کی زمین کا پڑا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے پائے زمین کے لوگ پرانی زمینوں اور غامض کرشمہ روز زمینوں میں شوخ کنیا اور بچے شہر نکالتا بہت اہم جانتے تھے۔ محمد عثمان عارف کی بعض زمینیں حسب ذیل ہیں :

مری جاں کون کہہ دے گا۔ درماں کون کہہ دے گا۔ جیلہ نہ جانے، ایسا نہ جانے۔ مطلوب میں بھی جوں۔ محبوب میں بھی جوں۔ راہ رنج گے گا کون۔ ہم سفر دیکھ گے گا کون۔ یہ زمینیں شکل تو ہیں، لیکن ان کا کشکال نفسی نکلنا بائیں کا نہیں، بلکہ مصروف فحشی کا تقاضا کرتا ہے۔ غزل کے لوازم کا احترام عثمان عارف کے مزاج کا قصہ ہے۔ ان کے یہاں بات کو براہ راست کہنے کے بجائے رمز و انداز میں اس کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ہم معصروں سے بھی انساب نہیں کیلئے اور گزشتہ استادوں سے بھی۔ تیر کا سفر ہے :

اس نیت کو جس میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں
یگانہ نے اسی کا دوسرا پہلو ہے مشہور شعریں یوں پیش کیا ہے۔
خودی کا لاشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بسنا نہ سمجھا

عثمان عارف نے اس کا ایک اور پہلو تلاش کیا :

اس دورِ خرد پرست میں دکھا جرم غور سے
عارف خدا بہت ملے انسان کم ملے

تخلّص کے برجستہ استعمال نے شعریں ایک نئی بہت پیدا کر دی ہے کہ شاید خدا کا عارف ہو جائے یا انسان بن جائے نہ تم رتبہ رکھتا ہے۔

عارف کے یہاں سماجی نا انصافی اور انسان پر جبر اور زندگی کے خلاف احتجاج کا رنگ نمایاں ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں یہ احتجاج اور انسان کی زبوں حالی پر یہ درد مندانہ اظہار رائے ساٹ اور بے طاقت ہو گیا ہے۔ اور غزل سے زیادہ لفظ کی تیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عام طور پر شاعرانہ اظہار کی شرطیں انہوں نے لہری کی ہیں۔ فنی نے غلط نہیں کہا تھا۔ فلسفہ وغیرہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن شاعری طرزِ ادا کا نام ہے۔ غلام کے بیان میں وہ کہتے ہیں اگر ان کی رائیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے، کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے کوئی دقیق نگاہ نہیں ہے تو نہ ہو۔ بحثِ معرفت،

یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کے ساتھ زبان کی فحشی اور صفائی ہے یا نہیں۔ شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی حدت اور دل آویزی ہے۔ عثمان عارف اس نکتہ سے جوڑی آگاہ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے انہوں نے اپنی رائے ذیل کو منثور یا اخباری بیان بنانے سے حتی الامکان گریز کیا ہے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

برقی جاگڑی کی قیامت گزر گئی

دنیا اسی کا نام ہے پتھر پتھر رہی

موت پر آپس میں جیروں ماتم کوں آتسو ہیں

زندگی وہ ساختہ جس کا کہیں رو نا نہیں

کسے معلوم سقا بن جانے کا لب شہر ہی فصل

بہت خوش تھے کہ باہر کو کچھ قاتل سے ملے ہیں

بھڑکی ہوئی ہے آگ کچھ سے پٹ کی

چھل کے طعن میں ہے جو کا نٹ لگا ہوا

عارف کے کلام کا دوسرا نمایاں پہلو ان کا احساسِ شمس ہے انہیں اگر زندگی کش کش اور کشش سے بھر پور نظر آتی ہے اور وہ اس کا نام بھی کرتے ہیں اور اس کے علان آواز بھی بلند کرتے ہیں تو مطلب یہ نہیں کہ وہ زندگی کی خوب صورتی اور غامض کرانہ کی خوب صورتی سے بیگانہ ہیں۔ ان کے یہاں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں انسان عورت اور محبوب کے جن کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ انسان محبوب بھی ہے۔ اور عورت انسان بھی ہے۔ بعض خیالی صفات کا مجموعہ نہیں۔

گھونگھٹ کی ستور اڑٹ میں گاؤں کی گوریاں

دیکھیں اگر حیران حجبیلا دکھائی دے

عورت ہر ایک شمع فرداں ہے عشق کی

ہر آدمی کو شمع کا پر واس نہ جانے

آٹھ میں بھرتہ سکے ہاتھ سے بھی چھو نہ سکے

جن کو صفت خیالوں کا تو پسیکر نہ بنا

غزل کا بے تکلف لہجہ عثمان عارف کے بعض اشعار میں بڑی خوبی سے برتا گیا ہے :

رواداری کی لطافت میں کہیں کبیا کیا

کہیں سکون سے میٹھیں تو کچھ کلام تحریر

آپ فرمائیں ہیں آپ نے کیسا جاننا

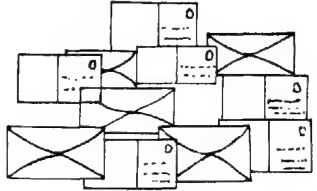
ہم زمانے کی نگاہوں میں تو متوجہ ہو

نہبت متیں بڑی چیز ہے عارف امتیں

ہم تو بدنام ہوئے اور بہت خوب ہوئے

’فلم کی لاش‘ ایسا مجموعہ کلام ہے جس کا ہم کو پتہ نہیں ہوتا چاہیے۔ شمس الرحمن فاروقی بظہر آرد مجلس اہل انضامیہ کی

مکتوبات



دل چپ اور اچھوتا:

کئی سال بعد، آج کل سے رجوع ہو رہا ہوں اس عرصے میں آپ نے کئی اہم نمبر بڑے سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ ترتیب دیئے ہیں۔ برسرِ چل کر زمین و ندوں میں بھی آپ نے اپنے نفیس مزاج سے عبادت نکھارا اور دل کشی پیدا کر دی ہے۔ جمیل منہری پر خصوصی شمارے کی شاعت قابلِ تحسین ہے۔

مالک رام، منظر امام، دوار کا داس شعلہ، ابوذر عثمانی اور رضا نقوی و آجی نے تقریباً ہر پہلو نمایاں کر دیا ہے۔ مجھے "بادوں کے روزن" بہت پسند آیا۔ منظر امام نے اس میں مقالے، اپورٹاژ، خاکے اور سمرگشت کا جو دلاؤین امتزاج پیدا کیا ہے وہ دل چپ اور اچھوتا ہے۔ عشرت قادری، بھوپال

کمی کا احساس:

جمیل منہری نمبر نکال کر آپ نے ایک اہم اور عظیم نقص کو پورا کیا ہے۔ جمیل صبیحہ شخصیت پر ضخیم نمبر بھی ادھورے ہوں گے، مگر آپ نے اتنے کم صفحات میں قارئین کے ذوق و شوق کا خیال رکھتے ہوئے جو مواد پیش کیا ہے اور علامہ کی شخصیت کے ساتھ انصاف کرنے کی جو کوشش کی ہے اس میں آپ بہت حد تک کامیاب ہیں پھر بھی جیل حرف ایک شاعری نظر آتے ہیں۔ مضمون نگاری پر روشنی توڑتی ہے مگر افسانہ نگاری کے متعلق کچھ بھی نہیں۔ جس سے ایک کمی کا احساس دل میں کھٹکتا ہے۔ ستحر، جوش و فرائز نمبر بھی تعاضدے وقت ہے۔ رضوان عثمانی، مظفر آباد

تشہ:

آج کل، "جمیل منہری نمبر بہت پسند آیا۔ بہت اچھے مصنفین آپ نے یکجا کر دیے۔ انتخاب کے حصہ میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جمیل صاحب بہت بڑے شاعر تھے اور ان کا مقام ابھی تک طے نہیں ہو یا ہے عبدالعصمد، نالندہ

اپنی مثال آپ:

جمیل منہری نمبر قابلِ تعریف ہے۔ اجتماعِ ہند میں "جمیل بھیتا" جمیل منہری کا نظریہ حیات، "جمیل منہری کا تنقیدی شعور" جمیل منہری کی غزل گوئی، "جمیل منہری کی تنقیدی نگاری" یہ سب مضامین اپنی مثال آپ ہیں جس کے لیے رضا منہری، دوار کا داس شعلہ، محمد حسن، مسرار احمد و باب اشرفی، اجمار علی، ارشد صاحب شکریہ کے مستحق ہیں۔

محمد ضیاء اللہ عثمانی، سہیل پور
(دبئی، متحدہ)
نومبر ۱۹۸۲ء

قابلِ تحسین:

"آج کل" کا جمیل منہری نمبر دیکھا۔ اس نمبر کے لیے مبارک باد قبول کیجئے۔

مضامین میں عبدالغنی، احمد سجاد، و باب اشرفی، دوار کا داس شعلہ، منظور حسن محمدی، اور وادی صاحبان کی کاوشیں خیال انگیز اور بہت خوب ہیں۔ خصوصاً احمد سجاد اور و باب اشرفی نے علامہ کی شاعری کے جن گوشوں پر مضمون قلم بند کیا ہے وہ لائقِ مطالعہ اور قابلِ تحسین ہیں۔ منظر امام کا مقالہ سبھی بہتر ہوتا اگر وہ علامہ کے بزرے میں اپنی شخصیت کو اُبھارنے کی کوشش نہ کرتے۔

آخر میں علامہ کی گونا گوں تخلیقوں کے انتخاب نے اس نمبر کو اور بھی بہتر بنا دیا ہے۔ نشاط الايمان، مکتبہ

خوبصورت نمبر:

آج کل، "جمیل منہری نمبر خوبصورت ہے۔

ابوذر عثمانی، و باب اشرفی اور عبدالغنی کے مضامین پڑھے جانے کے لائق ہیں۔ انہوں نے ایمان داری اور محنت سے مضامین لکھے ہیں۔ منظر امام اندرا محمد سجاد کے مضامین جمیل مرحوم کے فن کا لازماً نتیجہ کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ منظر امام اپنی زرگیت کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔ احمد سجاد نے علامہ اقبال کے ساتھ جب اعلیٰ مطالعہ شروع کیا تو جمیل مرحوم کو کنگڑا اُٹلی بنا دیا گیا۔ شاید تقابلی تنقید کا یہ بھی کوئی اصول ہے؟

مولوالم پرویز رانچی

آج کل نئی دہلی

حصاری کتابیں

۸۔ مربع اقبال (جنگ نامہ آزادان) قیمت ۵ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات شجر و شلب اور نادر تصاویر اور تحریریں کا مجموعہ۔

۹۔ یہ ہندوستان (شیلادھر) قیمت ۱۰ روپے
اس باغیچہ رنگ میں سلاخ اور پہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ لیکن تصاویر۔

۱۰۔ سر سید احمد خاں (پروفیسر خلیق احمد نظامی) قیمت ۵ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سر سید کے کارناموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ابوالکلام آزاد (عرش طہانی) قیمت ۵ روپے
ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے سماروں میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دل کشی انداز میں بیان۔

۱۲۔ جواہر لال کی کہانی تصویریں کی زبانی قیمت ۳ روپے ۵ پیسے

محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات و تھیں تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

۱۳۔ ہم ایک ہیں (عرش طہانی) قیمت ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی و سماجی گونا گونی اور ایک رنگی کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

۱۴۔ پھول اور بزرگوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے قیمت ۵ روپے ۵ پیسے

گھر محلوں و قلوں کے عام جلہا مار طیف، جیسی جیسے اور آج اور دیر کے بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی پسندیدہ چیزیں بنائے سکتے ہیں۔

۱۔ شعل آبادی (ساغر نظامی) قیمت ۴ روپے
ہندوستان کی جنگ آزادی کی منعم داستان (حصہ اول) ۲۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۶ء کے واقعات شامل ہیں۔ ویدہ زیب آفات و طاعت عمدہ نمونہ گروہوں۔

۲۔ بھارت خلائی دور میں
خلائی سائنس کی دلچسپ داستان۔ سری ہری کوٹ کی میزبان ملک کریمتہ کا انکشاف نہایت آسان زبان، خلائی کوششوں کا طے طے لکھا گیا ہے۔ ۴۰ صفحات کی کتاب۔ کاغذ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

۳۔ پہلے سال
پانچ سو سے زیادہ پہیلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

۴۔ رنگ برنگ بچوں
بچوں کے شاعر شعیب الدین بچہ، سیتی سیو ہادی، انگریزی، اسٹیل میرٹھی، ٹوک چند محرم اور دیگر بہت سے شعرائے آسان زبان میں لکھی ہوئی نظمیں۔

۵۔ آج کل کی کتابیاں
۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۸ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مشہور کتابوں کا مجموعہ جس میں واجدہ بنت، عصمت چغتائی، قزوین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہ پارے شامل ہیں۔

۶۔ کون جتنا کون ہارا
بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کتابیاں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے عمدہ کتابت۔

۷۔ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر (ڈاکٹر محمد عمر) قیمت ۲ روپے
ڈاکٹر مازا چند نے اپنی مشہور تہذیب میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں ساریت کے ہوئے ہے۔

"آج کل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصول ایک ہمارے ذریعے
ونس روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ دی۔ پی نہیں بھیجیں جائیں گی۔ یہ سلا آرڈر بھیجیں یا دی۔ پی طلب کیجئے۔

بزنس میجر پبلیکیشنز ڈوئٹرن، میاں ہاؤس نیو دہلی ۱۱۰۰۱۱

مکمل

ایک روپیہ



نٹ بال



ہانگ



ہینٹس



ہاسٹ بال



والی بال



جیمناٹکس



تیراکی



ہینٹس



تیرا بازی



لانیٹس



ایٹھلیٹکس



سائیکل دو



ہسٹ بال



صدر جمہوریہ ہندو شری ذیل سنگھ ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو امریکہ سے واپسی پر نائب صدر جمہوریہ شری اہم۔ ہریت اللہ اور وزیر اعظم شری قی اندرا گاندھی کے ساتھ دہلی کے ہوائی اڈے پر۔ صدر موصوف علاج صحابی کے بے امریکہ شریف ملے گئے تھے۔



ملک بھر میں شرع کو سریش ریڈ کو س ہنڈر مٹا دیا گیا۔ تصویر میں انڈین ریڈ کو س سوسائٹی کی ایک ڈائریکٹر وزیر اعظم شری قی اندرا گاندھی کی سارنگھی پر ریڈ کو س ٹیک ٹکائے ہوئے۔

تمت
مشاعره

[illegible]

اور پھر وہی دیکھ چکے ہیں:

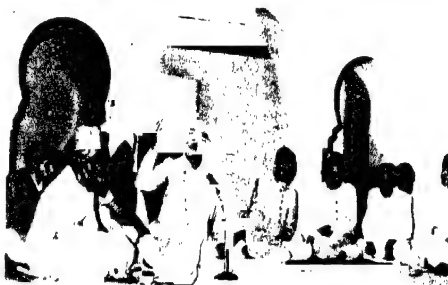
پہلے میں، (دائیں سے بائیں) شریف اہل نقوی،
ڈاکٹر غلام احمد غفاری، ڈاکٹر شمیم سہنی، اختر اویس
ڈاکٹر شادو سیکھ، چچہ صاحب (عروج بنی نقوی اہل نقوی)،
آغا دجال احمد مال، انور سہنی، عراج سہنی نقوی،
نور احمد، نبیلہ انور سہنی، (دوسری صفائی) :

۱۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۲۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۳۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۴۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۵۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۶۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۷۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۸۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۹۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔
 ۱۰۔ ہر موصوفی کا بیان شاعرانہ، عظیم اور شاعرانہ ہوتا ہے۔



▲ ساقی نقی (اشفاق نور خان) اسلام آباد سے ہے۔ (تھریس ڈیجیٹل) کیسٹل علی (غلام سیف اللہ) انٹرویو (سراج احمد) کراچی کے ایک ایڈیٹر جس نے سیریل کٹیل کی قاتل کو قاتل قرار دیا ہے۔ (ڈیوڈ رانا) ڈاکٹر اب (مصدق علی) کراچی میں کراچی کے ایک ایڈیٹر جس نے سیریل کٹیل کی قاتل کو قاتل قرار دیا ہے۔ (ڈیوڈ رانا) ڈاکٹر اب (مصدق علی) کراچی میں

▼ **حقیقۂ جاننا دہری** (اشفاق گوہر خاں) کلامِ پریم سے جوئے (تسویسِ دامن سے بائیں) : (فرق گوگنہ پوری (سوداگرہ) ، مکتبۂ علمی ، نشتر وادی ، جگر و آبادی ، اکبر آبادی ، کمزرسند رنگہ سیدی تھر ، نمونہ دہری (اسد اللہ خاں) ، ناظم مشاہدہ میکران جے صاحب۔



ہمدانی کتابیں

رقع اقبال (جنگ نامہ آزاد) قیمت ۵ روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات شجرہ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا مجموعہ۔

برہندہ ہندوستان (شیلہ ۲) قیمت ۱۰ روپے
اس با تصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ لیکن تصاویر۔

سرسید احمد خاں (بروقیہ طبع احمد خاں) قیمت ۵ روپے
ہندوستان مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سرسید کے کلاموں کا زراست اور بڑا حصہ۔ اس بات کو بڑے ماحول انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

الوانکام آزاد (مشرقی طبع) قیمت ۱۰ روپے
الوانکام آزاد جدید ہندوستان کے ادب میں ہیں۔ ان کی خدمات کا حسین و دل کشی انداز میں بیان۔
جواہر لال کی کتابیں تصویروں کی زبانی قیمت ساٹھ روپے

محبوب دہا اور ہندوستان کے سید و بزرگوار علامہ شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے عجیب واقعات رنگین تصاویریں۔ بچوں اور طلبہ علموں کے لیے بہترین تحفہ۔

ہم ایک ہیں (مشرقی طبع) قیمت ۱۰ روپے
ہندوستان کی ثقافتی و سماجی گونا گونی اور ایک رنگ کا دلچسپ بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔

پھول اور برہنوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے قیمت ڈھارہے ۵ روپے
گھر گھر درختوں کے جام جلی، ادر ملے، جستی جستی اور آچار و پیڑا بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے اپنی نسل پسند چیزیں بسا سکتے ہیں۔

پندرہ روزہ "کوجنٹا"

ملک کی ذراعتی، تعلیمی، ثقافتی زندگی کا ترجمان ہندوستان اور ترجمانی پر درگاہوں کی جگہاں پیش کرنے والا واحد اردو رسالہ۔ جست، فی کالی، ایک روپیہ۔ سالانہ ۱۲ روپے۔

شعل آندازی (سراغ لفظی) قیمت ۱۰ روپے
ہندوستان کی جنگ آزادی کی معلوم داستان احمد علی، ۲۰ صفحات پر مشتمل جس میں ۱۸۵۴ء کے واقعات شامل ہیں۔ دیدار زیب کرت۔

سہارن علی دوسریں قیمت ۱۰ روپے
علی دوسریں کی دلچسپ داستان، سری ہری کوٹ کی سہارا بے تربت کا اپنا شانیت آسان زبان، مغلان کو ششوں کا بکے چٹکے لٹا دیں ہیں۔
۱۰ صفحات کی کتاب کا کفہ عمدہ، تصاویر سے مزین۔

پہلیاں قیمت ۱۰ روپے
پانچ سو سے زیادہ پہلیوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

بک بک بک بک قیمت ۱۰ روپے
بچوں کے شاعر شمس الدین، سید سید بادی، انیسویں، اسٹیلی، سید علی، تنویر چند غلام اور دیگر محبت سے نثر کی آسان زبان میں کئی بولی لکھیں۔

آج کی کتابیں قیمت ۱۰ روپے
۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک سالانہ "آج کی" میں شائع شدہ مشہور کتابوں کا مجموعہ جس میں واحد سیم، مصحف جنتانی، انور حسین اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہرہ آفاق شامل ہیں۔

کون جتنا کون ابرا قیمت ۱۰ روپے
بچوں کے لیے آسان زبان میں بھی بہترین دو دلچسپ کتابیں۔ کتاب شروع کرنے کے بعد ایک ہی نشست میں ختم کرنے کو کہ جانتا ہے عمدہ محنت۔

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر قیمت ۲۰ روپے
ڈاکٹر مارچنڈے اپنی تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈاکٹر مارچنڈے اپنی اس تحقیقات کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں گہرائی کے ساتھ گہرائی سے۔

سہارن پالیگنٹ

یہ کتاب ان اہم اقدامات کا جائزہ پیش کرتی ہے، جو پالیگنٹ نے کچھ اٹھائیں، جس کے دوران نافذ کیے گئے اس میں پالیگنٹ کے قابل قوت و فعال اقدام سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

"آج کی" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ موصولہ ایک ہمارے شفعے
دش روپے سے کم قیمت کی کتابیں بذریعہ دی۔ لی نہیں بھیجی جائیں گی۔ پر علی آرڈر دینے والی پر طلب کیجئے۔
بزنس میجر پبلیکیشنز ڈوٹرین، بیلا ہاؤس نیو دہلی ۱۱۰۰۱۱

آج کل

ایڈیٹر
سراج نرائن راز

سب ایڈیٹر
شونامہ سنگھ

جلد ۴۱

شماره ۵

دسمبر ۱۹۸۲ء

قیمت ایک روپیہ

فون ۲۸۷-۶۹

اگر بائن پوس سمسٹ ۱۹۰۴

ترتیب

۳۲	مؤلف نام	کلیس	۳	ملاحظات
۳۶	تقریباً	سوسہ کی گڑھا	۶	کئی کئی لفظی علاج و سہو
				جی۔ ڈی۔ چند
۴۰	جنگلی جانوروں کا تحفظ	اشدیا علی	۸	کافور ٹرنک کے حالات
				کاظم علی خان
۴۲	مسند	رام پال ناگپوری	۱۳	یہ مصنف حسین احمد
				سریات اور اداری کا نام
۴۳	شاہجہان	شاہجہان	۱۳	سکندر گانا
	برہمچاری	برہمچاری		نورسین خان
	محررت	محررت	۱۹	اودن کے ساتھ لفظیات
	نعل	نعل	۲۵	افسر آذری
	راؤ کار دشت	راؤ کار دشت	۲۶	دیباچہ دشت
	گیارہ سفر	گیارہ سفر	۲۶	طالب جگوال
	برہمچاری	برہمچاری	۲۸	حادثہ کی کہانی
	نور علی	نور علی	۲۹	مدحت الانس
	نارسی	نارسی		میرزا

آرٹس : مگرچہ ارورہ

رئیس منبر و ایس۔ ایف جیسوال۔ اسٹنٹ بزنس منبر و ایل۔ آر۔ بٹرو۔ اسٹنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن)۔ اے۔ کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین کے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ترسیلی زر کا پتہ

ایڈیٹر: آجکل (مدرسہ) علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ، اتر پردیش

ہرنس میجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پیٹریا ہاؤس، نئی دہلی

ملاحظات

آؤوگی دؤور کے ماحول کو بہتر بنانے، ملکیانہ کو بہتر سے بہتر بنانے، تنظیمی اور انتظامی امید بہتیت، وقت کی اہمیت، نظم و ضبط اور مال کے معیاری ہونے پر توجہ مرکوز کرنا ہی چاہئے گی۔

اس پہلے کی دیگر خصوصیات میں بہ آمد کو فروغ دینے کے سلسلے میں متعدد دسبا مشاغل کا اہتمام شامل ہے۔ ہند اور یورپی اقتصادی برادری کے درمیان تعاون کے امکانات، لاطینی امریکہ اور مغربی ایشیا میں ہند کا اقتصادی تعاون، ”چھوٹے پیمانے کے شعبے میں برآمد کی گنجائش“ ”بین الاقوامی پہلے پر کاروبار کے لیے اور مناسب مؤثر ذریعہ ہیں“ ”پیدائش اور“ ”تعمیراتی برآمد اور ایکریٹک نیز ہیرے جہازات کی برآمد“ پر مباحثے ہوں گے۔ ان مباحثوں میں ہند اور بریوین ہند کے ماہرین حصہ لیں گے۔

تجارتی مہلوں سے متعلق ہندوستانی ادارے کو امید ہے کہ اس پہلے کو تقریباً ۴۰ لاکھ افراد دیکھ آئیں گے۔ ان میں تاجر اور غیر ملکی وفد بھی شامل ہیں۔ ہندوستانی برآمدات کو فروغ دینے کی غرض سے غیر ملکی وفد کو مدعو کر کے بے وسیع اختفاات کیے جانے ہیں۔

جنگل پیش، برما، بنگلہ دیش، مصر، ایتھوپیا، اندونیشیا، ایران، کینیا، ملائیشیا، مارشس، نائجیریا، پاکستان، فلپائن، سینی گال، سمبیر، سومالیہ، سری لنکا، تنزانیہ، تھائی لینڈ، ترکی، دارو، یوگنڈا اور زامبیا کے ۲۲ تجارتی وفد کو مدعو کیا گیا ہے۔

”مستقل پولیٹیز میں“ جابر اللہ پرواز ان کی زندگی اور ان کا ہندوستان، ”ذاتی پولیٹیز اور تجارتی پولیٹیز“ شامل ہیں۔ فرانسیسی سے متعلق پولیٹیز کو پہلی میدان میں خاص حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۸۲ء کا بین الاقوامی تجارتی میل ہندوستان سمیت مختلف ملکوں کے مختلف شعبوں میں ترقی اور پیش رفت کو اجاگر کرے گا۔ اس ترقی اور پیش رفت کا نتیجہ ہند کی معیشت کے فروغ پر اثر پڑے گا۔ جسے صنعت یافتہ ملک کی حیثیت سے اپنی ماکو کو ہندوستان رکھنا ہے۔

حصہ لیں گی۔ علاوہ انہی مرکزی وزارتوں، ریاستی سرکاروں، مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے سرکاری اور نجی طبقے کے ادارے اور ہند کی دیگر تنظیمیں بھی حصہ لیں گی۔ مجموعی طور پر تین ہزار ہندوستانی کمپنیاں اس پہلے میں شامل ہیں۔

مقاصد:

اس پہلے کا خاص مقصد ہند کی صنعتی ترقی کو آگاہ کرنا اور اس کی تجارتی صلاحیت کے مظاہرے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ غیر ملکی کے شرکار کو درآمدی اور برآمدی امکانات سے بھی واقف کرنا مقصود ہے۔ اس طرح کی کوششوں سے روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ غیر ملکیوں کے شرکار کو تجارت، صنعت و حرمت، زراعت اور ٹیکنالوجی میں اپنی کامیابیوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملے گا۔

اس پہلے کی بدولت اس میں حصہ لینے والے ملکوں کے درمیان تجارت پر جانے اور ترقی پذیر ملک کے درمیان تعاون و اشتراک کا بھی موقع ملے گا۔ علاوہ انہی ترقی یافتہ ملکوں کی بھی ہند اور بریوین دنیا کے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے حوصلہ افزائی ہو سکے گی۔

پہلے کا مقصد ہنگامہ کار میں اضافہ کرنا ہے۔ کیوں کہ ۱۹۸۲ء ہند میں پیداواری سال کے طور پر نہ یا جاری ہے۔ پیداوار کے سلسلے میں وسائل اور انسانی توانائی کو محفوظ رکھنے،

ہند کا بین الاقوامی تجارتی میل ۱۹۸۲ء

اس سال نومبر میں دہلی میں ایک اور بین الاقوامی تجارتی میل کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل ایشیا اور ۱۹۶۹ء اور ۱۹۸۱ء میں بین الاقوامی تجارتی میلوں کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس برس یہ چوتھا بین الاقوامی تجارتی میل ہوگا۔

پہلے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یورپی اقتصادی برادری کے ملک، افرادی اور اجتماعی طور پر بھی اس پہلے میں حصہ لینے پر حصہ لیں گے۔ تا حال ۳۱ ملک اس کی تصدیق کر چکے ہیں کہ وہ بین الاقوامی تجارتی میل میں حصہ لیں گے۔ ان ملکوں میں افغانستان، ارجنٹائن، آسٹریلیا، بحرین، بنگلہ دیش، بیلجیئم، یورپی اقتصادی برادری، ایسی ای ای سی، فرانس، ویتنام، جمہوریہ جرمنی، یونان، بھارتی، ایران، آئرلینڈ، اٹلی، کیمبوڈیا، جمہوریہ کوبا، کیمبرگ، ملائیشیا، ملائیشیا، مالٹا، نارویج، نیپال، فلپائن، سنگاپور، سوویت یونین، برطانیہ، قطر، سری لنکا، تنزانیہ، ترکی، سعودی عرب، بھارت، متحدہ عرب امارات، متحدہ عربی جمہوریہ، زیمبیا اور یورپی اقتصادی برادری شامل ہیں۔

امید ہے کہ اس پہلے میں ۵۳ فرم ملکی کمپنیاں

نور علی خان

بہتر معیار زندگی

آبادی میں اضافے کی شرح کو کم کرنے میں سب سے زیادہ کامیابی ترقی پذیر ملک کیوں کر ملے۔ کیوں ابھی آبادی کی شرح بھارت میں ۴ فی ہزار تک کم کر سکتے، اس کے بعد چین کا نمبر ۳ ہے۔ یہاں شرح اضافہ میں ۴ فی ہزار کی بات ہے۔ جندوستان، چلی، کولمبیا، انڈونیشیا، کوریا، اٹلی، اور تھائی لینڈ جیسے ممالک کی آبادی میں اضافے کی شرح ۱۵ سے ۲۵ فی ہزار تک کم ہوئی ہے۔

مائع عمل ادویہ کا استعمال بھی آبادی میں کی کرنے

مستند محائزوں سے ایک حوصلہ افزا پیروی بھی ملے گی۔
آج کے کوثر کی پذیرِ خاک اپنی آبادی سے علق پر و گروہوں
کے لیے خدو اپنے وسائل ہی سے رقوم فراہم کرتے ہیں انہیں
اگر خیرِ ملک سے ان مسئلے میں ایک روپیہ عطا ہے تو وہ
چار روپے ۱۰ فیصد حوصرت کرتے ہیں۔

شہرہوں کے غیر معمولی پیداوار کو ملک کی حدود میں آنے سے پہلے تجربہ پڑی واسطہ علاقوں کی تعداد و برصغیر خارجہ ہے اور اس طرح پوری آبادی کا نقشہ ہی بدل رہا ہے۔ نیز مختلف سماجی کے وجود و بین آبادی میں مسلسل یہ دو ایسے مسائل جنہیں چھین دینا کو مزید صدی کی آخری دو دہائیوں میں سامنا کرنا ہوگا۔ تجارت سے تیار کئے گئے ٹیکس ناکافی پروگرام میں، ان مسائل کے حل پر خاطر خواہ توجہ کی ہے اور کچھ کے سامنے کام آ جا رہا ہے۔

مجھے کو چھوڑا رکھنے کے لیے ایک ذہنی فضا کی
تیاری میں مصاحرا داروں کو کام کرنا پڑا۔ وقت
کی اس عجزت کو حکومت اور عوام دونوں محسوس کر رہے
ہیں اور بدطرطوں کام کے لیے مستعد نہیں بن سکے
ملک میں مزید ممالکی کی کھجائش عید ہے۔ اگر یہ
زندگی بہتر ہونے کے ساتھ صحت و صفائی کے تعلق سے
لوگوں میں بیداری پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ اور حکومت
مجھے کھجوا پڑی ہو رہے داروں کے بہتر بنائش
کا بھی تعہد کرانے کے اقدام کر رہی ہے۔ ایسے ہی بطور
پر ترقی کی جاسکتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
عوام کا مولد زندگی بہتر اور طے ہو جائے گا۔

وفیات

اُردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبرافیس کے ساتھ

چشمِ ہمت کی گردوں کے گمانے پہانے شاعرِ افسانہ
 افسرِ آفری کا ہر گز پرستش کوئی چاہنے کوئی دہانے
 نامِ مستور ہو گیا ہسپتال میں، انتقال ہو گیا۔ مرحوم آغا خان
 کی دیرینہ کوششیں ختم تھیں۔ مرحوم نعمت کے دورِ پیکار
 یعنی امریکہ کی کڑی تنقید کو ذرا آغا خان نے ہی سہا رہا۔
 تھے۔ فرانس کی حکومت کے شکنجے میں ان کا نام مسترد
 شائع کیا جائے۔ ان کی ایک فرمال ان کے اپنے ہی خط میں
 شامل اشاعت ہے۔ انہوں نے کہا تھا: ہوا کی گھنٹی
 بے آواز ہے ہمارے درمیان نہیں

افسر آدری صاحب کا نام سر وہپ کرشن کھوسلا
جن کی ملازمت کچھو کچھو لائبریری کے متول کا ماسٹر
گھر کے سامنے ہوئی۔ تعلیم دین بائی۔ شہر کوکل کا ذوق
فخری تھا۔ پرنٹنگ ٹیرو چورہ برس کا عمر میں بھی جب
وہ انٹرنس رہے کے طالب علم تھے۔ ابتدا انٹرنٹ والی
صاحب سے شروع کیا۔ لیڈ میں کچھ بچوں کی مرحوم سے
اسلام لی۔ مرحوم تجانی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا
بیلا کھوہ سلام "فلاس کے نام سے ۱۹۵۷ء میں
شائع ہوا۔ ایک مجموعہ "روشنی و تصویر" کی "دیوانی
رکھا خط میں تھا۔

ایسی ہی اندوہ ناک خبر اردو کے مشہور شاعر
مولانا کوثر اگاکے انتقال کی ہے۔ اگاکے مرحوم بھی استاد
کے کورم فائزوں میں تھے۔
مرحوم کو ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو روہت گدی میں دل کا
ہڑا، جس سے وہ ماہاں رہ نہ سکے۔ مرحوم ایک طویل
عصر سے علیل تھے اس لیے تھے۔

بل کرش انکے ۲۵ اکوڑ بے لڑکے اور ۱۰ لڑکیاں
میں پیدا ہوئے۔ انگریزی زبان ولایت میں اہم
پاس کیا اللہ رکھ دے اور اسی پر اماند ہوئے۔ اور
وقت وہ روزگرمیں جہاد میں دیا خود ہی لڑائی میں
انگریزی کے آئندہ تھے۔ مرحوم کے چچا خٹری کبیر
’آئینہ اور پیرچاٹا‘ اور ’دفعہ اول‘ ’دوش بھر دفعہ‘
'ہم بدن اویں' شائع ہوئے ہیں۔ ’الہامہ آفاک‘
مرحوم کے کسانان میں سے ہیں بل کرشک ہے۔

دودھ کی مفروضہ فرہوں پر ایمان لاری ہے اور اس سے بچوں کی پرورش کے لیے ایک نیا کچھرا بھر رہا ہے، جس میں معنوعات کو ادیت کی حیثیت دی جا رہی ہے۔

بچے کے لیے ان کا دودھ ایک ناقابل بدل نعمت ہے۔ ہمارے پرکھوں اور بزرگوں کا درس تھا کہ اس کی شروعات بچے کی پیدائش کے درمیان گھنٹے کے اندر ہی ہو جانی چاہیے۔ وادھن کا دودھ دودھ بچے کے لیے بہت اہم اور مفید ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد دوسرے دن تک مکتا ہے اور بہت قوت پکڑتا ہے۔ اس میں بیماریوں سے محفوظ رکھنے والے اجزاء کے ساتھ ساتھ ایسے صحت بخش اجزاء ہوتے ہیں جن کا اثر زندگی بھر رہتا ہے۔

ہسپتال میں بچے کو دیکھ کر نئے والے ان کا اس بات پر زور دینا چاہیے کہ وہ اپنے بچے کو سر دوسرے گھنٹے بعد پلائی دودھ پلانے لگی۔ کسی بھی طرح کی اوپری حرکت یا بچے کی چرسے کی مشورتی عادت میں ڈکاوٹ ڈالنی ہے اور ان کا دودھ بھی کم ہو جاتا ہے۔

ان کے دودھ میں آن گشت صفات ہیں۔ بچہ اسے آسانی سے ہضم کر سکتا ہے۔ اس سے بچے کی آنکھوں کے ارد گرد مداخلت کا اچھا نظام پیدا ہو جاتا ہے اور بچہ گیس، آنکھوں کی بیماریوں، خون کی کمی، سانس کی بیماریوں، الرجی، ایگزیمیا اور کان وغیرہ کی بیماریوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

ساتھ ہی بچہ کی قربت اور گرمی سے اس کے تجربے کی مناسب انورڈنا ہوتی ہے۔ بچے کی صاف ہونے کی طاقت طوری شروع ہو جاتی ہے اور اس کے طاقت صحت مند طریقے سے نکلتے ہیں۔ لیکن ہر ماں سے ماں کا دودھ بچے کے لیے قدرت کی معجزہ دہ بہترین خوراک اور رحمت ہے۔ یہ ماں کی بھائی سے سیدھا بچے کے گود میں ہو جاتا ہے۔ لہذا اس میں بیماری کے خاتمہ نہیں ہوتے۔

مصنوعی دودھ پینے والا بچہ ان کثیر حلیوں میں

کنبے کی یقینی منسلح و بہبود

ہے۔ اور ہمارے دیہات میں تو اس آج بھی بیس بیس اور تیس تیس مہینوں تک بچے کو اپنا دودھ پلاتی رہتی ہیں۔

ماضی میں یہاں ایک خریٹ حبیب مررت کو دودھ پکڑتے والی کوا جاتا تھا۔ سبکیں آج ڈیڑھ دودھ اس سے یہ لقب پھینکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

نیشنل ہینڈی آرٹن آسانی کی وجہ سے آج ممت کی شان دودھ اترنے میں نہیں بلکہ دودھ چھٹنے میں ڈھونڈی جا رہی ہے۔ بھروں اور قصبوں میں یہ رجحان خاص طور پر نظر آ رہا ہے۔ پرانے زمانے میں ماں کی گود میں اور گھر کے آگن میں بچے کے دودھ کے دانت نکلتے تھے۔ یہ دانست آج بھی نکلتے ہیں، لیکن ان کی چمک اور پختگی شہر کی لٹریچر اور دیواروں پر ایسا وہ کیلنڈروں کی تصویر میں منتقل ہو رہی ہے۔

آج بچہ شیر خوار نہیں بلکہ برتل بردار ہے۔ فیزک بنگ بال نے اسے اپنی ماں کے دودھ سے محروم کر دیا ہے۔ ماں کے دودھ کی جگہ آج بازار میں طرح طرح کے بند دودھ کے ڈسچے بک رہے ہیں۔ جو عام طور پر جانوروں کے دودھ سے تیار ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانے انہیں تیار کرتے ہیں گئے ہوئے ہیں اور شہر کی ادارے ان کی تفریب میں زمین آسمان کے مقابلے مل رہے ہیں۔ اس طرح ایک نفاذ بندی فرارغ پارٹی ہے۔ جو بڑے ہند

آسانی زندگی اتنی دل فریب ہے کہ اس سے ہولیوڈ ہونے کے لیے انسان ہیشہ کسی آب حیات کی تلاش میں رہا ہے۔ لیکن بہتر لفظی دیکھ کر بچے کو دنیا میں آتے ہی ماں کے دودھ کی شکل میں جلد ہی آب حیات حاصل ہوتا ہے، آج وہ اس سے محروم ہو رہا ہے۔

ادھر قریب پچاس سال سے مغرب میں مویشی پروری کی صنعت نے جو کڑے دکھائے ہیں، ان کے نتیجے میں دودھ کی دیگر اشیاء کے ساتھ کسی نئی اقسام کے دودھ کا پاؤڈر بھی بنیٹا ہونے لگا ہے۔

مویشیوں کے دودھ کی استعمالات میں پہلے بھی تیار اور استعمال ہوتی تھیں۔ معمر لیٹن احمد دم کی تہذیبوں میں دودھ، پنیر اور مکھن کے عام استعمال کے ثبوت ملتے ہیں۔ مارکوبو کے مطابق تیرھویں صدی میں ایشیا کے لوگ ڈیری کی اشیاء کا استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان میں قراس سے بھی بہت قوت پکڑتے تھے۔ دودھ اور اس سے بنی اشیاء کا صحت رواج بلکہ رواج تھا۔ لیکن ان دنوں دودھ کے پاؤڈر کا بکین کوئی وجود بالکل غائب ہو گیا۔

تعم زانے سے ہندوستان میں بچے کے لیے دودھ کو طاقت اور ہمدردی کا بنیادی وسیلہ بنا گیا تھا۔ آئندہ میں اسے بال امرت تسلیم کیا گیا

اجزا سے مرد ہو جا کر ہے جو اسے ماں کے دودھ سے
مٹے ہیں۔ چنانچہ اس کے اندر باریا دیوں سے مقابلہ
کرنے کی طاقت نہیں ہیں باقی۔

بچوں اور بچوں کے استعمال میں دھواں کو کھانے کا ڈور
اور پانی کا ڈور لڑنے رکھنے کی مقدار اور قدم قدم پر
آکڑی اور جراثیم سے بچنے کی احتیاط کو بڑا کیا بھیرے کا
عمل ہے کہ کئی تعلیم یافتہ عورتیں بھی، جو بچے کے لڑکچہ
کو چڑھ کر..... دودھ تیار کرتی ہیں، کہیں نہ کہیں
چڑھ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ماؤں کے
بچوں کو نہ صرف کم زور دودھ ملتا ہے بلکہ اس دودھ
کے ساتھ ساتھ ان بچوں کے اندر بیماری کے جراثیم
بھی داخل ہو جاتے ہیں، اس سے ان کی صحت نشوونما
نہیں ہو پاتی اور ان کی قوتِ مدافعت بھی کم ہو جاتی
ہے، لیکن سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے
کہ بچے ماں کے اس پیسے سے جدا ہو جاتے ہیں جہاں
انہیں قوتِ بخش پیار اور شفقت ملتی ہے، ان میں
خود اعتمادی پیدا نہیں ہو پاتی جو زندگی کا دامنِ تقدیر
اور ترقی کا پہلا ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ بچے اکثر بیمار
اور کمزور رہتے ہیں نیز ان کا مزاج پڑھ لڑا ہو جا کر
کچھ عقلمند نہیں ہو سکتا جہاں کہیں وہ بچوں سے
دودھ پلانے سے ماں کی محنت خراب ہو جاتی ہے
یا اس کا جسم بے ڈول ہو جاتا ہے۔ یہ سراسر فلاحیال
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مکمل ایک سلسلہء عمل ہے جو
بچے کی پیدائش پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس میں بچے کی
پے درپے طبی مرمت اہل ہے۔ اور اس پرورش کے لیے
ضروری ہے کہ بچے کو ایک سال تک ماں کا دودھ
مٹے۔ قدرت کے اس طریقے پر چلتے سے زچہ کی
صحت سنبھال جاتی ہے۔

اس طریقے سے ماں کو ناقابلِ بیان قلبی محنت
نیز ایچہ صحت کے لیے نفسیاتی فضا ملتی ہے بچہ اس کے
بدن میں جو ضروری چیزیں جمع ہو جاتی ہے وہ دودھ
کی شکل میں نکلی جاتی ہے۔ اس کا ہم تیزی سے اپنی
قبل از ولادت کی حالت کو رہتا ہے۔ بہت دیر تک بڑھنے
کا امکان نہیں رہتا۔ اور اس کا جسم صحت سائبان شکیل

ہو جاتا ہے۔

عورت کی محنت بچے کو اپنا دودھ پلانے سے
خواب نہیں ہوتی۔ یہ خرابی تو درحقیقت بار بار
اور جلدی جلدی بچے پر کیا کرنے سے واقع ہو جاتی ہے۔
جس کی وجہ سے عورت وقت سے پہلے کوئی ہو جاتی
ہے۔ ایک اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اپنا دودھ
پلانے والی ماؤں کو بچائی کا کیسٹروٹے کا امکان
قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔

کچھ اور صحتوں میں خیال پایا جاتا ہے کہ انڈیا میں
کی حالت میں ماں کو بچے کو اپنا دودھ نہیں پلانا چاہیے۔
یہ بھی ایک غلط خیال ہے۔ اگر حالات میں بچے کو ماں
کے دودھ سے ضروری اجزاء مل جاتے ہیں جو
اسے بیماریوں سے بچا سکتے ہیں۔ اگر ماں بچے کو اپنا
دودھ نہیں پلاتی تو اس کی کمزوریوں میں پہلے تو دودھ
اور پھر دوسرا مواد جمع ہو جائے گا اور اس کے بعد
اس کا دودھ کم ہوتا جائے گا۔ اس طرح ماں اور
بچے دونوں کے لیے مزید پریشانیوں پیدا ہو جائیں گی۔
ملازمین پیشہ عورتوں کا یہ کہنا کہ ملازمت کی
وجہ سے.....

انہیں اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے باقاعدہ وقت
نہیں ملتا۔ زیادہ باورنِ دل نہیں ہے۔ ابتدا ہی سے
بچے کو نپل سے دودھ پلانے کی عادت بھی نہیں ڈالنی
چاہیے۔ تین ماہ کے بعد بھی وہ اپنے بچے کو کچھ شام
اپنا دودھ پلا سکتی ہیں۔

ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ جب تک عورت
بچے کو اپنا دودھ پلاتی ہے اس کے آدام دیر سے
شرع ہوتے ہیں۔ اور نگلنے بچے کی پیدائش کا امکان
بہت کم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نگلنے نہیں۔ ان میں مل کر پچے
پر ضروری دیکھے جاتے ہیں۔

گرما پچے کو ماں کا دودھ پلاتے رہنے سے
ایک ماں کی پرورش اور صحت میں بہتری دلائل ہوتی ہے
اور دوسرے کنبہ بندی ہو جاتی ہے جس سے بچے کے
گرگہ اشتغالی، اقتصادی اور نفسیاتی حالات کو
تاقب میں رکھا جاسکتا ہے۔

کلاسز کے مال کا دودھ ایک ایسا ایک مہم ہے
کی بدولت ایک طرف تو بچہ کو صحت مند زندگی ملتی ہے اور
دوسری طرف بچہ کے خاندان کی صلاح و بہبود یقینی ہوتا ہے۔

بقیہ: مکتوبات

اور آپ کا یہ یہ فیصلہ "عمر و سلسلہ بھی کچھ کم
انادی اور خوب صورت نہیں ہے۔ کئی خاص کوشش
یا آوازوں کی بغیر ہی آواز کے خاندان کے پاس بہت
سے سفار کی تحریروں کے نمونے جمع ہو جائیں گے، جو
کچھ زمانے کے بعد تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار
کر لیں گے۔ اس ضمنی اقدام کے لیے آپ کے شعور اور
سیٹھ کی داد دیتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ صاحب
کلام کی تحریروں کے محکم کے ساتھ ہی اگر اس کی تصویر بھی
شائع کر دی جائے تو اس سلسلے کی افادیت میں
خاصا اضافہ ہو جائے گا۔ اب یہ میاں کی بات تو
میں بلا خوف تردد یہ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کو اگر دو
کے ان دوتین جریدوں کے دوش بدوش رکھا جاسکتا
ہے، جن کے اعلیٰ ترین ادبی معیار کی تم کھائی جاسکتی
ہے۔ اور جن کے مضامین کے حوالے بلا تعلق نہیں ہی
دے جاسکتے ہیں۔ یقیناً وہ حوالہ مستر ٹھہریں گے میری
مبارکباد قبول کیجئے۔

آؤں پر تاپ کچھ لکھی پرتا پ کر لے

وضاحت

مختصر اس صاحب نے بغیر تفصیلی معلومات کے
کہا کہ علامہ افضل پور کے ایک چھوٹے سے کتب خانہ
جسے شاید صاحب نے ذکر کروں کے رہے کے لیے مزایا
تیار کر گئے ہیں (میں نے کتب خانہ داروں کے مددگار سے
میں ۲۵ اسلامی کتب صاحب، سید علی محمد صاحب جو
نہ دیکھ کر اپنے بچے (راقم الحروف) کے لیے بڑا مستحباب
جسے علامہ نے تحریر کیا صاحب جو مرنے اپنا بڑی باغ
مکان کی وجہ سے مجھ کو ان کتب صاحب کے علاوہ کتب خانہ
کو دیکھ کر دیکھنے کے لیے دے دیں۔

سید اقبال رضا، پٹنہ

آغا حجو شرف کے حالات تحقیق کی روشنی میں



کا نام "سید محمد سعید خاں بہادر" تھا کہ جسے حالات شرف پر اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مسن اور گارسان دہاسی نے شرف کے بزرگوں کا وطن شہر بتایا ہے۔ اس اطلاع پر یہ اضافہ ممکن ہے کہ شرف کے دادا سید محمد سعید خاں شہر (ایران) کے مسوطن تھے۔ شہر کی شکوہ فرنگ مس: ۱۳۳ میں شرف نے اپنے متعلق لکھا ہے: "..... وطن جدی ایران..... نیز شکوہ فرنگ مس: ۹۳ میں شرف نے اپنے خاندان کے بارے میں یہ اطلاع بھی فراہم کی ہے:

صحیح النسب ہے مراحت نداد

ریاست سیادت ہم ہے یہاں

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ شرف ایران کے ایک صحیح النسب تہذیبی خاندان سے تھے، لیکن گذشتہ شعور لکھنے کے ۱۹۰۰ء کے متعدد شماروں کے معاصر اندراجوں سے یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ شرف رضوی سید یعنی امام رضا کی اولاد میں تھے۔ یہ امام رضا کا روضہ ایران کے مشہور شہر مشهد میں ہے اور مشہور شرف کے دادا سید محمد سعید خاں بہادر کا وطن تھا۔ آغا حجو شرف کے حالات پر مشتمل جو مصادر میری نظر سے گزرے ہیں، ان سے شرف کا سید ہونا تو ظاہر ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شرف سادات کے کس شعبے سے تھے یا رضوی سید تھے۔

مفتویٰ شکوہ فرنگ مس: ۱۳۳ میں خود شرف کا بیان ہے کہ ان کا خاندان ایران سے ہندوستان آکر مقیم ہوا اور گولیا تھا اور لکھنؤ میں شرف کا مکان محلہ مولوی گنج میں واقع تھا۔

سکونت کا اپنی مادوں پستا

مکان مولوی گنج میں ہے مرا

وامنت شرف میں ان کے مکان کی تفصیلات ملتی ہیں اگر وہ تکلی نہیں تو ان سے انکشاف ہوتا ہے کہ شرف کا دور شہاب کھن کے جس شان دار مکان میں

آتش کے صاحب دیوان شاگرد آغا حجو شرف کا صحیفہ حیات وہ بند کتاب ہے جس کے متعدد ابواب ابھی تک وقت کی گڑھی رویش ہیں اور اردو تحقیق انہیں بے غائب کرنے سے قاصر رہی ہے۔ یہ شعر شاید اسی صورت حال کا ترجمان ہے:

آن میں ہی کہیں ہو گا اب ذکر ہمارا بھی

جو بند کتاب ہیں ہم دنیا ترسے ہاتھوں میں

(سحر گھنٹی)

اس صورت حال کی خلاف ورسی کے لیے شرف کے ناکافی حالات پر اضافہ ضروری ہے۔ حالات شرف کی تلاش میں اردو و پنجابی کو جو جو کے جن حار اردوں میں گامزن ہوتا ہے وہاں نئے نو قدم قدم پر ہیں، مگر روشنی دور دور تک نہیں۔ زیر نظر مقالے میں ہم نے کانٹوں کو دور کر کے راہ کو روشنی سے صحر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کوشش میں ہماری ناکامیوں کے اعداد و شمار تیار کرنے والے کرم فرما اگر ہماری راہ کی دشواریوں کو ستورا بھی مرتب کر سکیں تو ہم ان کے مسنون کرم ہوں گے۔

آغا حجو شرف کے معاصرین میں محسن، شاعر، ماہر اور گارسان دہاسی نے شرف کے والد کا نام سید محمد عرفان صاحب بتایا ہے، بلکہ خود شرف نے اپنے والد کا نام سید محمد خاں عرفان صاحب "درج کیا ہے بلکہ خوش معزز زبیا سولہ محسن، محسن شہر، تندرگہ ناہر اور غمناز حواہید جیسے مصادر شرف کے دادا کا نام بتاتے ہیں۔ شرف کے حوالہ سے حالات مرزا محمد سکری "آب گھنٹی پر ملاحظہ فرمائیں اٹھی اور ذکر شاہ عبدالسلام نے پیش فرمائے ہیں ان میں بھی شرف کے دادا کے نام موجود ہیں بلکہ میری اطلاع کے بموجب شرف کے دادا

لیکن مسعودی لکھو فرنگ میں: ۹۴ نیز میں: ۱۳۴ میں خود شرف کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ آغا جو "عزیزت سلطان شرف کے یہ دو نام تھے: (۱)

سیادت حسن خان (۲) طالع العین حیدر

سوانح نگار شرف کا سب سے ولادت بھی نہیں بتانے خوش مرکز زیا (تالیف ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء) بتاتے کہ اس تذکیہ کی تالیف کے زمانے میں شرف جوان تھے۔ اگر حواضی ہوتے تو مراد ۱۸۵۱ء کا اس ناما سہ تو شرف کا نائے ولادت ۱۲۴۳ھ — ۱۸۲۸ء کے آس پاس قاسم کیا جا سکتا ہے۔ خود شرف نے اپنا صحیح نام بتا لیا ہے "سیادت حسن خان" بتا دیا ہے اگر کسی تاریخی نام تصدیق کر جائے تو سیادت حسن خان سے یہ فیصلہ ذیل ۱۲۴۳ھ ہی متعین ہو جائے گا:

سیادت = ۲۴۵

حسن = ۱۱۸

خان = ۹۵۱

تاریخ = ۱۲۴۳ھ

اقی قرآن کی رو سے شرف کا ولادت ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۲۸۰) قریب تھا جس میں ہوتا ہے۔ میرے ان معروفات کی تصدیق یا تردید مزید تحقیق ہی سے ہو سکے گی۔

فہم خانہ جاوید میں لاندہ سری رام کے بیان کے بموجب آغا جو شرف کی بیوی تھیں وادی علی شاہ کے والد میرزا حامد علی کویت سے بہاوی تھیں اور کویت کے دو فرزند بڑے مرزا نیز بچے مرزا ناصر شرف کے تھے۔ میری اطلاع کے بموجب کویت کے یہ دو بیٹے ان کی دوسری بیویوں سے تھے۔ مولانا غلام ولی حامد کویت کو منسوب شرف کی بیوی کا نام بھی بتاتے سے تا صریح۔ میری اطلاع کے مطابق شرف کی ان بیوی کا نام غلام علی غلام علی کویت تھا۔ کویت کی جڑ اڑا لائی ناب گیم کے وطن سے ہوئی تھیں ان کے نام یہ تھے:-

(۱) مرزا قرة الصمد (۲) شاہنشاہ مرزا (۳) غلام شاہ مرزا (۴) بڑی بیگم اور دوم) دہلی بیگم گلہ شرف کی بیوی غلام بیگم کے کویت کی ان چار اولادوں میں سے مرزا قرة الصمد چھبیسہ ۲۲ اپریل ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۹۹ھ میں مرزا ۱۲۸۸ء کو پیدا ہوئے تھے اور شاہنشاہ مرزا کی ولادت ۱۲۹۹ نومبر ۱۸۸۲ء مطابق ۱۲۹۹ رمضان المبارک ۱۲۸۹ء کو ہوئی تھی۔ یہ تمام اطلاعات اصل شرف کے لیے اخذ کیے گئے ہیں۔

مرزا حامد علی کویت ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں وادی علی شاہ کے والد میرزا قمر مومنے تھے کویت کی بیوی شادی ان کے سجدہ خان بابا مرزا خان کی بیٹی سے ڈی جی ۱۲۹۴ء مطابق ۱۸۷۹ء میں ہوئی تھی اور سجدہ بادشاہ ہو کر غلام علی شاہ (تاریخ ۱۲۸۲ء) کویت کا بیٹا

گزارا وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا جو عزیزت و شرف کے جملہ نفیس سامان سے معمور تھا۔ شرف نے اپنے اس محل میں جسے "میاں" سے ایک خانہ باغ آراستہ کیا تھا، جس میں خوش رنگ بھول، بزمیں اور قریب بھی موجود تھے اداس محل میں شرف بڑے ٹھاٹھ ساتھ ساتھ میلاد زندگی بسر کرتے تھے یہ شرف کی یہ زیانہ بود و باش شاید اس وجہ سے ہو کہ وہ اودھ کے سناپی خاندان سے تھے۔ لہ صاحب تذکرہ خوش مرکز زیا نے بھی شرف کو "حالی خاندان" لکھا ہے۔ اس واسطے سے شرف کے بہن بہن اور اطراف و احوال پر بھی روشنی پڑے۔ وہ صبح کو سیدار ہو کر ہواغری کے لیے سوار ہو جاتے تھے۔ یا غزلوں کی اس گلشن میں ان کے ہمراہ جال شاہ و وفا دار صاحبوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ یا غزل کی سیر ان کا مرغزین غزل تھا۔ ان کے محل میں باذن خوش فضاں و خوش جمال کا بگھٹ رہتا تھا۔ ان کے محل میں ذمہ دار تھیں اور انہیں ۵

"دل چپ داساں کا مزا اور ذوق تھا"

اپنے محل میں شرف کا بیان یہ بھی ہے:-

زردہ چمن پر بزم تھی، گلزار تھے مکان

تھا وہ طلسم خانہ کبریت میں تھا جہاں

افسانہ گو دہ کہتے تھے دل چپ داساں
پر لیل کے ہوش اڑتے تھے اس سخن کا بیان
تھیں نعمتیں زمانے کی موجود کیا نہ تھا
کس عاشقی کا دل کو ہمارے مزا نہ تھا
داستان کے علاوہ شرف کو تین دیگر کتب بھی ملتی تھیں اور ان کی طبیعت میں بالکل تھا:-

تخی و سیر کا شوق طبیعت میں بالکل
چنگیز خان نہ کرتے تھے ہم سے کبھی سخن

محب نہیں کہ عہد شباب میں شرف کا بھی بالکل بن اور ذوق تخی و سیر انہیں خواجہ حیدر علی آتش جیسے سنہوش شیراز کا بے شک شاعری شاگردی میں لانے کا سبب رہا ہو۔ حکام شرف میں گل و مل، چمن، شکر، گلستان، گلزار، گلشن، لالہ، دریا، جانا، باغیچہ، دین، پری، دیویوں کے جوہر، بیانات میں وہ شاید شرف کی کسی ایک نئی کہ غنائیں اور انہیں غزلوں شاعری کی بعض مقامات ملائیں نہ سمجھتا چاہیے۔ سوانح نگاروں نے ابھی تک شرف کی حیات و شخصیت کے تذکرہ بالا تمام بیوروں کو کیا سیر نظر انداز کر رکھا تھا، جن پر زیر نظر مقالے میں شاید پہلی بار روشنی پڑے۔

شرف کے نام پر مصداق میں اختلاف ہے مگر تمام آئندہ اس پر ضرور متفق ہو کر ان کی عرفیت "آغا جو شرف" ہی تھی۔ مختلف آئندہ میں شرف کے یہ نام ملے ہیں: سید باقر، سادات حسین خان، سادات حسین خان، سادات حسین خان

آئی انی ٹی

شاہی شرف کی پہلی نوبت گیم سے ہوئی تھی۔ پہلی نوبت کا خطاب کوکب علی تھا۔ شرف کی مشنری سیکرٹری فرنگ نے بھی لکھی (مکتوبہ یکشنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۶ء) میں کوکب کی ان دونوں بیویوں کی مداح موزوں ہے۔ (درجہ شرفہ فرنگ طبع لاسر ص ۱۲۴ تا ۱۲۵) نیز ص ۱۲۵ پر شرفہ فرنگ ص ۱۲۴ تا ۱۲۵ پر بھی مسلم ہونا ہے کہ حاملہ کوکب کی یہ دونوں بیویاں (یعنی بادشاہ بہو اور کوکب علی) اولاد کوکب کی ہم خاندان تھیں۔ شرف کی پہلی کوکب علی کا بی بی عبد حامد علی کوکب کے خاندان سے ہونا بتا ہے کہ شرف بھی اودھ کے شاہی خاندان سے تھے۔

دستیاہ معلومات کی روشنی میں شرف کی پہلی فراب گیم کے بھائی سے کوکب کے فرزند ہار مرزا قرۃ العین بی بی شنبہ ۲۲ اپریل ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اگر فراب گیم کے ان بڑے فرزند کی ولادت شاہی کے ایک سال کے اندر فاس کی جاسے تو شاید کوکب سے فراب گیم کی شادی کا زمانہ تاریخ ۱۸۹۸ء اپریل ۱۸۹۸ء (مطابق ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ) کے آس پاس تھیں۔ اس کی جاسکتا ہے۔ میرے اس نظریہ کی تائید مشنری شرفہ فرنگ سے بھی ہوتی ہے۔ شرفہ فرنگ ص ۱۲۴ تا ۱۲۵ میں شرف کے کوکب کی بیویوں کے ذکر میں کوکب علی کو بھی شامل کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شرفہ فرنگ کی نکاح سے قبل ہی وہی مدعا مدعی کوکب سے کوکب علی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور شرف کے بیان کے بموجب مشنری شرفہ فرنگ ۱۲۸۳ء کوکب کی پہلی شادی (شرفہ فرنگ ص ۱۲۵) سے کوکب سے فراب گیم (کوکب علی) کی شادی ۱۲۸۳ء کوکب سے ہو چکی تھی۔ تقریباً ۱۲۸۳ء کوکب سے ۱۲۸۳ء اپریل ۱۸۹۸ء کوکب کے درمیان زمانے کے مطابق قرار دیتے ہوئے کوکب سے کوکب علی کی شادی ۲۲ اپریل ۱۸۹۸ء مطابق ۳۰ ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ سے قبل ہی ہو چکی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ۱۲۸۳ء کوکب اگر یہ شادی ہوئی ہو تو شرفہ فرنگ کا تعلق ۱۲۸۳ھ میں کوکب کی بیوی کی حیثیت سے کوکب علی کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ ۲۳ اپریل ۱۸۹۸ء سے قبل ہی کوکب گیم کی شادی کوکب سے ہو چکی تھی۔ اگر میرے یہ معروضات قابل قبول ہوں تو اس سے نتیجہ بھی نکالے گا کہ اپریل ۱۸۹۸ء کے آس پاس شرف کی پہلی فراب گیم سے فراب گیم پہنچ کر شاہی کے قابل ہو چکی تھیں۔ وہی کہ سن بلور سے اگر ہم چودہ سال کی عمر (دس سال) کوکب گیم ۱۸۵۳ء کے آس پاس پیدا ہوئی ہوں گی اور شرف (شرفہ فرنگ ص ۱۲۵) شادی ۱۸۵۳ء میں ۲۹ سال کے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ شرف کے یہاں ۲۹ سال کی عمر میں اولاد ہونا فریب تھا۔ اس سے۔ ان قرآن کی روشنی میں بھی شرف کے سن ولادت کا ۱۸۲۸ء (۱۲۴۳ھ) کے آس پاس ہونا قرین تیس تیس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ شرف کے زمانہ ولادت کی اس تیس سالہ عمر کی تصدیق مزید تحقیق سے ہو سکے گی۔

آغا شرف حکومت اودھ کے زمانہ (فروری ۱۸۵۹ء) کے کافی عرصہ تک گھوڑی میں رہے، لیکن پھر وہ بکتر شاہ ۱۲۸۰ء (۱۸۶۳-۱۸۶۴ء)

تک وہ مکمل منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں اشتراک سلطنت کے بعد وادی علی شاہ بھی اپنے متعلق کے ساتھ یہ مقام مستاجر مقیم تھے (مقام غازی علی شاہ ص: ۵۳۱) گمان غالب ہے کہ قیام مکلف کے دہلی کی اپریل ۱۸۹۸ء سے قبل شرف کی پہلی فراب گیم کی شادی حاملہ کوکب سے ہوئی ہوگی۔ مکلف کی یہ شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۸ء سے قبل ہی شرف اپنے داماد حاملہ کوکب کے مکان واقع مشیاہ راج میں مقیم ہو چکے تھے۔ جیسا کہ شرفہ فرنگ ص ۱۳۲ تا ۱۳۵ کے اندازوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ مشنری شرفہ فرنگ ص ۱۲۴ میں شرف نے کوکب کی مدد بھی کی ہے۔ دیوان شرف ص ۲۳۴ تا ۲۳۶ میں ولی عبد حامد علی کوکب کی تین اردو فرادوں پر شرف کے حسن عمل کی موزوں ہے۔ کوکب شاعری میں بھی شرفی ہنر (تلمیذ میر جیسا کہ مکتوبہ) کے شاگرد تھے۔ عبد حامد علی کوکب نے غالبہ فرادوں سے ۱۲۹۱ھ میں یہ عالم شہادت وراثت پائی تھی۔ غالبہ کوکب اس نوبت داتا پور شرف کا قطعہ تاریخ ان کی ناکھانہ دلی کا ترجمان ہے۔ (دیوان شرف ص ۲۳۶ تا ۲۳۷)

شاہ سلیمان میں تھے کہ آغا شرف، فراب گیم علی خاں والی رام پور کے درباری شاعروں میں سے تھے۔ موصوت کا یہ بیان تصدیق کا طالب ہے۔ میری اطلاع کے بموجب رام پور کے درباری شاعر میں آغا شرف کے بجائے ان کے ہم نام آغا شرف شریف تھے۔ غالبہ کوکب علی خاں ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق جمادی الثانی ۱۸۶۵ء کوکب سے فراب گیم علی خاں ناظم کی وفات کے بعد والی رام پور ہوئے تھے۔ (انتخاب یادگار طبعہ اول ص ۸۳) اور ظاہر ہے کہ شرف اس زمانے میں مکلف منتقل ہو چکے تھے۔ انتخاب یادگار میں آغا شرف کے ترجمے کی عدم موجودگی بھی اس نکتہ کی تائید کر رہی ہے کہ آغا شرف رام پور کے درباری شاعروں میں شامل نہیں تھے۔ تذکرہ نادرس ۸۸ میں آغا شرف کوکب کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ مگر اس واحد شہادت کے علی الرغم ذرا مکرر دیا، سراپا سخن، سخن خواہہ گلرنگ کے مشورہ مکتوبہ مورخہ یکم جنوری ۱۸۹۹ء (ص ۳) کی معاصر شہادتیں شرف کوکب کی کا شاگرد ثابت کرتی ہیں۔ مشنری انصاف مکتوبہ میں شرف کا یہ شعر بھی موجود ہے: ہ

مزد دل کو ہے ذوق (جسے) فنی ہوں میں
ہمیشہ سے شگرد آتش ہوں میں (مکتوبہ سخن ص ۸۰)
شرف کے اس شعر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ صرف آتش کے شاگرد تھے اور تذکرہ نادرس کا آتش کے کہنے کی روایت مشکوک ہے۔ دیوان شرف طبعہ اول ۱۸۹۹ء کے برہنہ سرورق ۱۷ ص ۲۹۵ کے انداز بھی شرف کوکب کا شاگرد بتاتا ہے۔ شرف کے متعلق پروفیسر عبادت پوری، پروفیسر نذر الحسن دہلی اور ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی تحریریں تذکرہ نادرس کے آس

حوالے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرف کو تاریخ کا شاگرد بنایا گیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کا یہ اندراج بھی لغزش کا محتاج ہے کہ آغا جو شرف کو صد لغزش نشان نے تاریخ کا شاگرد بنایا ہے۔ یہ نشانے کے تذکرے سخت متغیر و متغیر ہیں۔ ۱۸۴۴ء میں شرف کو تاریخ کی شاگرد لکھا گیا ہے اور تاریخ نے شرف کے حاملین تاریخ کا نام تک نہیں لیا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے ظہر بظاہر تاریکی جگہ تاریخ کو تحریر فرمادیا ہے۔
علامہ شرف کی متعدد داخلی شاخیں شرف کو سو متغیض کا مضمین ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ شرف کو متغیض ہے خدا کا دم بھر

جو تک غفلت سے ہی وقت ہے بشاری کا

یہ شعر دیوانی شرف ص: ۳۲ کے علاوہ خوش معرکہ زیبا تالیف ۱۸۴۲ء میں بھی موجود ہے۔ ان تراکیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرف ۱۸۴۶ء یا اس سے قبل ہی سانس چڑھنے کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ دسمبر ۱۸۵۹ء کے آس پاس بھی جانے والی شرف کی ایک غزل کا یہ شعر بھی شرف کو سو متغیض کا مضمین ظاہر کر رہا ہے :-

یابہ سو متغیض کی دوا پھر راضی ہوں وہ بیمار کو دماز میسا مٹھرا
یہ شعر دیوانی شرف ص ۵ میں موجود ہے۔ ۱۵ جنوری ۱۸۶۹ء کے آس پاس بھی جانے والی غزل میں بھی شرف کا یہ مضمین ملتا ہے :-
دم فقی میں ہے سو متغیض سے شرف

چھٹکارا ہووے کا نفس واپس سے کب
یہ شعر گورنمنٹ کونسل مورخہ ۱۵ جنوری ۱۸۶۰ء میں نقل کیا گیا ہے۔ اسی گلدستہ کے مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۶۱ء کے شمارے میں شرف کا یہ شعر بھی ہے :-
دم بھر ہوا ہوں تراگوں سو متغیض اس بے غوی میں آنا ہوں پشیمارا بنگ
شرف کے یہ تمام اشارات ہیں سانس چڑھنے کا مضمین ثابت کر رہے ہیں یہ شرف کی اس بیماری کا حوالہ دے سوا کچھ اور ان کے ذریعے پیش کردہ احوال شرف میں کہیں نہیں مل سکا ہے اور اسے بھی حالات شرف پر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

آغا جو شرف کے شاگردوں میں مجھے مندرجہ ذیل شامل ہے :-

(۱) آغا نواب شرف علی خاں اویچ (۲) جوزف جو ہانس صاحب گلا

ان میں سے جوزف جو ہانس صاحب پہلے شرف کے استاد سیو میو ویزر علی صبا کے شاگرد تھے بلکہ مگر یہ ظاہر و ناظر صبا (جون ۱۸۵۵ء) کے بعد ۲۲ مارچ ۱۸۶۰ء تک جوزف جو ہانس صاحب آغا جو شرف کے شاگرد ہو چکے تھے۔ مزید تحقیق سے شرف کے اور بھی شاگرد تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر مہمات بریلو کی قیاس ہے کہ آغا جو شرف نے ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۸ء کے درمیان یعنی ۱۸۵۲ء سے قبل وفات پائی تھی۔ (دیکھو فرنگس ص: ۸)

ڈاکٹر شہ عبدالسلام کا بیان ہے کہ شرف ۱۸۵۳ء کے بعد کسی سال فوت ہوئے ہوں گے (دہستان انش ص: ۱۳۳) لیکن تلاش کیے پر مجھے دیوان شرف میں متعدد داخلی شاخیں ملتی ہیں جو بتاتی ہیں کہ شرف ۱۸۶۴ء (۱۲۹۱ھ) کے بعد کسی کم از کم ۹ مارچ ۱۸۵۵ء (۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ) تک ضرور بقید حیات تھے۔ بڑی مراد دیوان شرف ص: ۳۵، ۳۶ میں شرف کے ان متعدد اشعار تاریخ سے ہے جن سے ۱۲۹۱ھ (۱۸۵۴ء) اور ۱۲۹۲ھ (۱۸۵۵ء) کے مابین مندرجہ ہوتے ہیں بلکہ ان اشعار تاریخ میں مامد علی لکب دمتوی ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء (بیرانیس دمتوی ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۵۴ء) اور زمانہ دمتوی ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۵۵ء کی ایامات پر بھی شرف کے اشعار شامل ہیں۔

دیوان شرف کی یہ ناقابل تردید داخلی شاخیں پروفیسر مہمات بریلو کے اس قول کو رد کر رہی ہیں کہ شرف نے ۱۸۵۲ء سے قبل وفات پائی تھی۔ مزید برآں ان شاخوں کی روشنی میں ڈاکٹر شہ عبدالسلام کا یہ بیان بھی برہم کا طالب ہے کہ شرف نے ۱۸۵۳ء کے بعد کسی سال انتقال کیا ہوگا۔ کیوں کہ شرف ۱۸۵۴ء کے بعد ۹ مارچ ۱۸۵۵ء کے بعد فوت ہوئے ہوں گے۔ امید ہے کہ میرے یہ مویعات شرف کے صحیح منہج وفات کو تلاش کرنے میں اردو تحقیق کے معاون ثابت ہوں گے۔

دیوان شرف پہلی بار ۲۰ مارچ ۱۸۹۶ء (مطابق جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ) کو راجا محمد امجد علی خاں آٹھویں بادشاہ کے حکم پر مطبع جعفری (واقعہ خاص جدید) لکھنؤ سے شرف کی وفات کے برسوں بعد شائع ہوا تھا۔ اس میں ۳۰۶ غزلیں، ایک واسوخت، چار گیتیں، ایک گندہ بند اور ۲۹ فارسی دارو و قطعات تاریخ شامل ہیں۔ یہ دیوان اب خالص کامیاب ہے۔ راقم الحضور نے حال ہی میں دیوان شرف کا جو انتخاب کیا ہے وہ جدیدی سٹائٹ ہوئے والا ہے۔ اس دیوان کے علاوہ شرف کے ادبی آثار میں شکوہ فرنگ اور اساتذہ لکھنؤ کے عنوان سے دو دارو و مثنویاں بھی شامل ہیں۔ جن میں سے پہلی مثنوی پاکستان میں پروفیسر مہمات بریلو نے مرتب کر کے لاہور سے شائع کر دی ہے اور دوسری مثنوی بھی اب لکھنؤ میں چھپنے والی ہے۔ مجھے ان مثنویوں اور دیوان کے علاوہ شرف کا غیر متداول کلام بھی دستیاب ہوا ہے جس پر میں اپنے ایک علیحدہ مقالے میں بحث کر چکا ہوں۔

حواشی

- ۱۔ رک: (۱) سراپا سخن: حسن علی حسن، مطبع مشرقی اٹلی شہر واقع دکن، گجرات، لکھنؤ، طبع ۱۸۹۱ء
- (۲) سفر شہزاد: عبدالغفور نشانہ، مطبع مشرقی اٹلی شہر لکھنؤ۔

فتح اکثر نیرم، ۱۸۰۱ء: ص ۲۴۳ (مملوکہ شید کا کالج لائبریری)

(۳) تذکرہ قادریہ مولود کتب حسین نادر۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب
کتاب بنگلہ کھنڈ، طبع ۱۹۵۴ء: ص ۸۸

(۴) ہندوستانی ادیب کی تاریخ، نگار مان دتاسی جلد ۳ ص ۱۱۳ (پروف
ڈاکٹر عبادت بریلوی)

۴ مشہور و معروف: تصنیف آغا جعفر نون۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی طبع لاہور
۹۳

۵ رک: (۱) خوش موکر زبیا: مولود سادات خان ناصر مرتبہ ڈاکٹر شمیم بیگم
کھنڈ طبع مولائی، ۱۹۱۱ء ص ۴۳۳

(۲) سر اچمن علی، ۱۸۱۱ء (۱) سخن شہزاد ص ۲۴۳

(۳) تذکرہ قادریہ ۸۸ (۵) تم غاضد عابد (جلد چہارم): لاہور

لاہوری رام۔ دلی طبع ۱۹۲۹ء ص ۵۳۱-۵۳۲ (شید کا کالج لائبریری)

(۶) تاریخ ادیب اردو: مرتبہ مرزا محمد مسکری مرتبہ مرتضی حسین ناضل
علی، ننگ بنگلہ پریس لاہور

(۷) مہذب القذات (مستطبرق) مہذب کھنڈی ص ۱۴۶

(۸) آئینہ سخن کھنڈ نادر جلی ۱۹۱۹ء ص ۵ (مقالہ از پروفیسر
نور الحسن بٹانی)

(۹) دبستان ابانقی، ڈاکٹر شاہد اسلام، مکتبہ جامعہ دہلی۔
طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۳۳ تا ۱۳۹

۱۰ وٹے ٹکڑے و فرنگ ص ۹۳

۱۱ دیکھ: (۱) گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ص ۳

(۲) گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ ۵ جنوری ۱۸۶۰ء ص ۳

(۳) گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ ۲۹ جنوری ۱۸۶۰ء ص ۳

(۴) گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ ۹ مارچ ۱۸۶۰ء ص ۲

۱۲ ان معاد کی تفصیل حاشیہ زیر میں موجود ہے۔ ان معاد میں صرف
دبستان آئینہ ص ۱۳۲ میں گلہ سہ شہزاد کی خواہے سے شہرت کے نام کے
ساتھے "جنری" مرقوم ہے۔

۱۳ دیوان شہرت: آغا جعفر نون، طبع جعفری کھنڈ طبع اول مطبوعہ ۲۰ مارچ
۱۸۹۹ء ص ۳۲۰ تا ۳۲۳

۱۴ برعالم نگارشات ادیب: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب بنگلہ کھنڈ
طبع ۱۹۲۹ء ص ۱۳۰ (حاشیہ ط)

۱۵ خوش موکر زبیا ص ۳۳۳

۱۶ آئینہ شہزاد دلی اور ناگ بن کا ذکر آج تھا: مورخہ شہرت کھنڈی۔
نامی پری کھنڈ طبع دسمبر ۱۹۶۹ء ص ۹ میں موجود ہے۔

۱۷ رک: (۱) خوش موکر زبیا (۲) سخن شہزاد (۳) تذکرہ قادریہ (۴) تم غاضد عابد

جلد چہارم (۵) گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء

(۶) تخلص شہزاد سر اسمن، مرتبہ ڈاکٹر شمیم حسین، سر اچمن علی دلی ۱۸۹۸ء

۱۸ نگارشات ادیب: تصنیف شمیم حسین، کتاب بنگلہ کھنڈ طبع ۱۹۵۹ء ص ۲۴۳ میں بیان
یہی کی جگہ شہرت کی نواسی لکھا ہے۔ جو تصدیق طلب ہے۔

۱۹ نگارشات ادیب: ص ۲۲۳

۲۰ ان دونوں شہزادوں کے تعلقات تاریخی ولادت دیوان شہرت
ص ۳۵۳ تا ۳۵۴ میں موجود ہیں۔

۲۱ سلطان عالم دہلی شاہ: پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ص ۱۲۸

۲۲ نگارشات ادیب: ص ۲۲۳ میں ہے کہ کوکب تقریباً ۲۳ سال کے سن میں
برمرض عینہ فوت ہوئے تھے۔

۲۳ کھنڈ کے چند نام ور شعرا (عبد اول): ڈاکٹر سلطان حسین کھنڈ طبع بکر
۱۹۷۳ء ص ۱۸۸ تا ۱۸۹

۲۴ انتخاب یادگار: اسیر الدینی، آجہ المطالع (رام پور) مطبوعہ ۱۹۷۱ء

۲۵ ۱۲۹۷ھ (مطابق نومبر ۱۶۸۸ء) طبع قدیم ص ۳۹۹ تا ۴۰۰

(مملوکہ شید کا کالج لائبریری)

۲۶ غرض بہتر: ڈاکٹر محمد حسن۔ کھنڈ طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۴۳

۲۷ بہ حالہ: (۱) گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۶۰ء ص ۱۲
(۲) سخن شہزاد ص ۹۷

۲۸ (۳) تم غاضد عابد (عبد اول): لاہوری رام نون کھنڈ
لاہور طبع ۱۹۰۸ء ص ۵۰۹

۲۹ بہ حالہ گلہ سہ شہزاد کھنڈ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۶۰ء ص ۹

۳۰ تفصیل کے لیے دیکھئے یہ مقالہ لاہورہ سہ کھنڈی مشہور دہلی اکادمی کھنڈ
۱۹۸۲ء ص ۱۷۰

۳۱ جاس صاحب کا ذکر بحیثیت نادر
یہ سہ کھنڈی انگریزی کتاب "یورپین اینڈ انڈو یورپین پرنسپل
آف اسیٹو لائبریری شین" از رام پارسکین، دلی کھنڈ طبع ۱۹۶۱ء

۳۲ ص ۶۱ تا ۶۲ میں بھی موجود ہے کہ مملوکہ شید کا کالج لائبریری کھنڈ
۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۱ء میں حاصل شدہ تھی، یہ چیز نہایت کمزوری ہے کہ اس کی تصدیق نہ
مستور ہونے کے سبب نہ ہو، حالانکہ شہزادہ شہرت کی زندگی بھی کسی اس سے

بھی ۱۱۹۲ء بعد نہ ہو سکتی ہے (بہ حالہ ڈاکٹر شمیم حسین رضوی دلی ۲۳ ص ۸۰)

۳۳ انہی بات: پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، دیوان اردو کا کھنڈ طبع نومبر ۱۹۶۹ء

۳۴ تلاش دبیر: نادر علی خاں، نامی پری کھنڈ طبع دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۱۱ تا ۲۱۲۔



سید صفدر حسین صفدر

(حیات اور ادبی کارنامے) ایک مختصر جائزہ

خیر یاد کہہ دیا۔ ۹۔ نومبر ۱۹۵۸ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کے عہدے پر فائز ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد دہلی، بمبئی، دادو (سندھ) اور لاہور کی مختلف کالجوں میں سینئر ٹیچر اور پرنسپل کی حیثیت سے ترقی پزیر ہوئے۔ ایک مدرسہ کام انہیں مہیا کرتے رہے۔ اس کے بعد لاہور میں پرنسپل اور آف انٹر میڈیٹ اینڈ سکینڈری ایجوکیشن، سرگودھا اور پھر ڈاکٹر عظیم علی کوٹلی کے مہمدیہ، جرحوی، شہلاہ، علی شکر رہے۔ ۹ جولائی ۱۹۵۹ء کو ڈاکٹر سر شمسہ تعلیم (پنجاب) کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۱ مئی ۱۹۶۳ء کو خزانہ منشی سے سبکدوش ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۵۹ء میں ان کا عقد سیدہ جمیلہ خاتون (دختر شادی: سیدہ منظر حسین ساکن قصبہ بٹہ، ضلع مظفرنگر) کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بے غلہ بقیہ حیات ہیں۔

ڈاکٹر صفدر حسین کی واد اولاد سیدہ منظر (عرفہ زلیخا خاتون) و روبینہ صفدر ہیں جن کی ولادت ۲ جمادی الاول ۱۳۸۹ھ مطابق ۳ نومبر ۱۹۵۹ء بروز جمعہ نہ ہوئی تھی۔

۱۹۶۳ء میں جبکہ ڈاکٹر صفدر حسین نے اچھی نرالی شباب میں قدم رکھا تھا، وہ بھی عام شہرہ کی طرح غزل گوئی کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کے جوہر نکلتے گئے۔ سادگی کے ساتھ جذبات و احساسات کی ترجمانی ان کی غزلوں میں ہو گئی۔ آغاز پیداکرتی ہے۔ کتنے اچھے انداز میں جن محراب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

سلم آپ کے پیش ادا کی یکستانی
میری نظر کا بھی لیکن جواب ہو نہ سکا

ڈاکٹر سید صفدر حسین ایک ہم گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ولادت بروز جمعہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۲۰ء قصبہ شمسہ مظفرنگر لاہور میں ہوئی تھی، لیکن تعلیمی شریکیت میں تائید پائش ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء درج ہے کہ وہ قصبہ بٹہ، ضلع مظفرنگر کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جس کے مرنٹ اعلیٰ سید حسن رضا ابن سید فاضل حسین تھے۔ سید حسن رضا کی زوجہ اولیٰ سیدہ بہادری بیگم (دختر سید جمال الدین ساکن موضع جٹوڑہ) سے دو بیٹے (۱) سید حبیب حسین عرف منگو (۲) سید ابراہیم حسین ہوئے۔ سید حبیب حسین کی صفدر حسین کے ہم بزرگوار اور سید ابراہیم پسر بزرگوار تھے۔ مادر گرامی سیدہ اما بیگم (دختر سید کوثر حسین) تھیں۔ جن کے سایہ عاطفت میں ڈاکٹر صفدر حسین نے پرورش پائی اور پر واز ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر صفدر حسین نے تعلیم: فیض عام ہائی اسکول، میرٹھ اور اسلامیہ ہائی اسکول، مظفرنگر اور گورنمنٹ ہائی اسکول، مظفرنگر اور میرٹھ کالج میں درجہ بدرجہ فی اے تک تعلیم مکمل کی۔ بعدہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے (اردو) اچھے پوزیشن پر پائی۔ ۱۹۵۳ء میں ایم۔ اے (فارسی) ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ایل۔ اے۔ بی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۵۸ء میں بی۔ اے کی ڈی کی اسناد حاصل کی تھی۔

ڈاکٹر صفدر حسین کی ملازمت کا سلسلہ بحیثیت ٹیچر اور اساتذہ ملازمت: کالج، جالندھر سے شروع ہوا۔ اچانک وہ دوسالہ ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۴ء مقیم رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۵۴ء سے ۶ ستمبر ۱۹۵۴ء تک سرکاری وکیل کی حیثیت سے کام کیا، لیکن اس پیشہ میں دل نہ لگا تو اسے

وہ محبوب کے نزدیک پہنچنا چاہتے ہیں، لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ محسوس

● ۸۵۔ اندرون مقبرہ، گولہ گنج، کشنور

سوال کہتے ہیں :-

وہ اکھڑے ہیں لیکن دل کی منزل دُور ہے سہسپری
اُمی سے کوئی پُرچھے ہوں گے یہ دُوریاں کیوں کر

دسمبر ۱۹۳۳ء

عجب وہ دیکھے ہیں کہ محبوب موت پر نہیں ہوتا تو تکلیف دل کی خاطر

فرماتے ہیں :-

ہم بھی کچھ نقد ہیں آپ بھی کچھ دُور نہیں
بس یہی کہنے کہ ملتا ہمیں منظر نہ نہیں

اور ترکِ محبت کا ارادہ کرتے ہیں :-

اچھا بنا عشق کے سجدے نہ ہوں قبول

جانتے ہیں بیٹے دل مضطر لیے ہوئے

محبوب ان کے اس ارادے سے پریشان ہو جاتا ہے کچھ کہنا چاہتا
ہے، لیکن شرم و حیا دامنِ حقیق ہے۔ تجھی اور غارِ شکر نکلیں

معذرت خواہ نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر مفسر کو یہ اندازِ محبوب پسند آتا ہے :-

اب ان حبس کی ہوئی نظروں سے گفتگو کیا ہو

کہ معذرت نے کیا جن کی شرمسار بھی نہ

اور وہ اس کو یقین دلاتے ہیں :-

اُمی اور خیالِ ترکِ محبت ! غلط غلط

آپ اعتبارِ شہرست بے جا نہ کیجئے اللہ

لیکن ڈاکٹر مفسر صرف وادیِ سخن و عشق ہی میں محدود رہنا نہیں چاہتے۔

ان کے سامنے زندگی کے دوسرے مسائل بھی ہیں، جو ان کی دُور بین نگاہیں

دیکھ رہی ہیں اور وہ اپنی حدودِ جد سے ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ زندگی کے دردِ بچوں سے جھانک کر دیکھتے ہیں تو انہیں معلوم

ہوتا ہے :-

زندگی کیا؟ کہیں شعلہ، کہیں جھیلی، کہیں موج

یہی ہے تابیاں مل جائیں تو انسان ہو جائے

ان کا عزمِ مستحکم ان کی جنتِ افزائی کرتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے :-

کہرے بہت جو بڑھا ہوں تو ہوا ہے عموماً

یہی امداد کو ہر سمت خدا ہو جیسے

مقبول اکیڈمی، لاہور نے ۱۹۳۳ء میں نکال دینے کے نام سے

ان کی ۱۰۰ غزلیں جو ۱۹۳۳ء سے اکثر تراشہ ۱۹۳۳ء تک کے دوران میں لکھی گئیں

شائع کیں۔ ان غزلوں میں اگر ایک طرف سفید دل جذباتی مددِ بزرگ کی نگاہیں

کھار رہے، تو دوسری طرف تو ہم لکھی کی رہنمائی، زندگی کی تڑپ اور اس

کے مختلف پہلوؤں پر منطقی اندازِ فکر میں روشنی ڈال رہے ہیں جس سے قاری کا ذہن

واضح طور پر متاثر ہوتا ہے اور ان کی فصیحِ مسلم کی داد دینا چاہی ہے۔

ان کا دوسرا اثر ہرکار "قصہ خیال" مجموعہٴ شاعریات ہے۔ اس میں

تین صوفیات ہیں: (۱) قصہ کوکاب، (۲) قصہ طاووس، (۳) قصہ ذرات

اس میں ۴۲ نظمیں فن کا راز طریقے سے پیش کی گئی ہیں۔ بقولِ پروفیسر

حمید امجد خان :-

"اس نے مجموعہ کے منظومات کی جمالیاتی ہر کاری

اور دلاویز منظر کشی ایک لغتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی"۔

حقیقت کچھ ایسی ہی ہے۔ ان کی نظم سراپائے جمال کے چند شعرا مناظر ہوں۔

حسنِ مجملہ آیاتِ خدا ہو جیسے

چہرہ ایسا ہے کہ قرآن کھلا ہو جیسے

جھوٹ عارض کی جو بیچے تو فلک ناز کرے

پاؤں چھوئے تو زمیں میں طش طاش ہو جیسے

وہ عجب کہ کربِ حُرور کی جنبشِ سرِ بال

وہ تعلیم کو پری نندہ سدا ہو جیسے

وہ صبا کے فرشتوں کو بھی پیارا آجائے

وہ لغات ہے کہ مریم کی جنا ہو جیسے

مختصر یہ کہ معبود کا تمہیلِ رنگیں

مدعا یہ ہے کہ شاعر کی دعا ہو جیسے

ڈاکٹر مفسر ایک شاہکار کے بعد دوسرا شاہکار دینے ادب کے

سامنے پیش کرتے رہے۔ مختلف اصنافِ سخن پر ان کی تصانیف کی ایک لمبی

فہرست ہے۔ وہ ایک وقت ایک شاعر، ادیب، مفکر، مفسر، محقق،

مؤلف، مقرر، مورخ، مرثیہ نگار اور اچھے مرثیہ نگار تھے۔ کھنڈ اور

اہلِ کھنڈ کے قدر دان۔ پاکستان میں وہ کوئی وہ یہاں کی تہذیب، تمدن،

معاشرت کو کھنڈا نہ گئے۔ ایک غلط سمجھی جو رہ رہ کر انہیں بے چین کیا کرتی

تھی مضبوط ہوسکا تو بے ساختہ کہہ اُٹھے :-

یادیں بھینکی ہوئی حبِ تابہ دل آجاتی ہیں

اُس کے دروازہ کی زنجیریں پلا جاتی ہیں

گوئی چپ ہے بے اپنے کناروں کا سکوت

ہر کھنڈ و غلبت ویرانہ کا بھر پور شہرت

چشمِ عروابِ ساحلِ بحرِ ان ہیں اب بھی

سرد ہونٹوں میں کچھ آئینہ اداں ہیں اب بھی

کھنڈ دُور ہے اب، دل سے قریب تھا پہلے

اے جنوں دیکھ تو سجدہ وہی تھا پہلے

دل کو کرب رابط اس کے خض و غاشاک سے صحت
ایک محل میری منتقا کسی خاک سے صحت
اے شام اودھ! منزل ویران نشا ط
اک دبستان لطافت ترے ایوان نشا ط
تیرے بھی کے شبان میں منجھتا ہے شعور
چاندنی ذہن کی بھیلی ہے فضا میں آدور

دل عز خانہ ہے گلے میں دروہام اُداس
اک شگفتی ہوئی بستی ہے سرشام اُداس
گرد رہ کے جو اُٹھتی ہے آفتن سیلاب
تجیش سیدہ مامی کا دُھواں بھیلاب

انہی تاثرات کے پیش نظر لکھتے ہیں :

”کھنڈے یقیناً ہماری تہذیب کا ایک ایسا جتنا اہم گناہ ہے جتنا
شاہکار تھا جو اپنی دلگذاہنی، وسعت اور دریائی کے
اعتبار سے تقریباً نصف تک تقریباً ڈیڑھ سو سال تہذیب
ثقافت کے میدان میں ہندوستان کی سربراہی کا فریضہ سر انجام
دیتا رہا۔ سارے ملک میں وہ اپنی ذہنیت کا واحد مرکز تھا۔
جس میں سچ بنارس کی دانگی، شام اودھ کی صلاحیت
اور شبہ مالوہ کی دل کشی کی سرحدیں ایک دوسرے سے
ملتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔“

کھنڈے سے دل محبت اور یادوں کے پیچھے خیالی گویہ انہوں نے
اعلا کا طابع پہنچایا تو ”کھنڈے کی تہذیبی مرث“ بن کر سامنے آیا۔ بلاشبہ یہ
کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر مہندرنے اپنی اس سوکھتہ الہا تصنیف میں کھنڈے کی
تاریخ، تمدن اور تہذیب کی حکمتی جن ڈھنگ سے کی ہے شاید اس سے
بہتر ممکن نہ تھا۔ اودھ سے دل چسپی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا
ہے کہ ان کے کئی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالہ کا مضمون ”زندگی اور ادب
شاہان اودھ کے عہد میں“ تھا۔

اسی وجہ سے تحت انہوں نے یہاں کے شعراء، اداوار اور مرثیہ
نگاروں کے کائناتوں کا تذکرہ فرمایا فرغ علی سے کیا اور ان کو سراہا۔
”رزم نگار لکھنؤ“ ان کی یہ تصنیف ہے جس میں قدیم و جدید مرثیہ نگاروں
سے انہوں نے کم و بیش روشناس کی ہیں گویا تھا بلکہ ان کے کلام کے
اقتباسات اور ترمیم بھی پیش کیا۔ اودھ مرثیہ سے دل چسپی اور لگاؤ کے باعث
میں ان کا ارشاد ہے :

”مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری ادبی پرداخت
اور ذہنی خوشنما میں اُردو مرثیہ کا بڑا حصہ ہے۔ مجلس
رشتائی ادب اور مرثیہ رسولؐ سے میرا تعلق عالم عقل میں قائم
ہو احباب میں پراثری جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے
رُباعی اور سلام تحت المفظ پڑھنے لگتا تھا۔“

”میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں کھنڈے سے
متاثر نہ کیے بغیر باقی نہیں رہی تھی اور شعور، علم،
واقفین اور دیگرین کے باہمی رابطوں نے مزید آسود
..... کا احساس دلایا تھا گویا اب انیس و دہریہ
انس و موتس، عشق و عشق، نفیس و آرتج، ماہر و کامل،
..... ہمارے پاس بن کر دو ٹوٹتے“

اس جذباتی قربت اور احساس نے ہی ان کو اس طرف راغب کیا اور مرثیہ
لہذا انیس ”تصنیف کر کے انہوں نے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا
اضافہ کیا۔ غلوں دل سے ”شاہکار انیس“ و ”تجلیات انیس (مرثیہ ۱۱)
مرتبہ کر کے دامن ادب کو گلہائے عقیدت سے ملاماں کیا مرزا دتیر کے پانچ
نویسٹوں نے مرثیہ ”نادر مرزا دتیر“ کے نام سے شائع کر دیے۔ خانوادہ
انیس سے قلمی اُلفت اور رغبت ہی کے تحت انہوں نے میر علی محمد آف
کراچی ”سمادین“ کے نام سے شائع کئے۔ سلی پانچوں پانچوں کے ادواب فرازی کا
ثبوت دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ مرثیہ نگار جن کا کلام زیرِ طبع سے آراستہ
نہ ہو سکا انہیں کریں۔ انہوں نے اس کے لیے بڑی جدوجہد کی اور بہت
سے مرثیہ حاصل کر لیے تھے، لیکن وہ یہ کام پورا نہ کر سکے۔

ڈاکٹر مہندر کا طبیعت اہلار سے دہا ہا نہ عقیدت اور رغبت تھی۔ انہوں
نے ان کی مدد میں ربا عیادت اور سلاموں کے علاوہ مرثیہ بھی تصنیف کیے۔
جس میں ترکیب الغالی، حسنِ تافیر و طیف کا کمال، مہرِ لوط و اقتدار نگاری اور
انڈیز بیان کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں ان کے پانچ مرثیہ کا مجموعہ ”لب
فلت“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مرثیہ کی تصنیف میں دلیل ہے :

نمبر شمار	عنوان	مطلع	در بیان	تعداد
۱	آنکھوں کا	نیرِ بزمِ اہمات کی ضیا، تھے عباس	سمیت رحمت حضرت ۱۰۹	
۲	طہار کو بلا	مسیح ماثورہ محرم جو مرثیہ وار ہوئی	ہوا و شہادت حضرت ۷۲	
۳	طہرہ تہذیب	طہرہ اہل جہ زمانے میں شہانہ تہذیب	سیرت شہزادہ کی ۹۱	

زلفیں وہ جن پہ تصدق شب معراج کا طول
جن کی خوشبو سے مدینے کو مہلی ٹرے رسول
آنکھیں اصحاب کی روشن ہوئیں جلوۂ دلکھا
اپنے محبوب پیر کا سدا پا دکھا
ڈاکٹر مصدق نے اپنا یہ مرثیہ "جلوۂ تہذیب" ۱۱ جولائی ۱۹۹۵ء کو
امام بارہ منصوبہ کالونی (کراچی) میں پڑھا تو حاضرین مجلس عالم و عیسٰی بخود
ہو گئے۔ ڈاکٹر محاسن فاروقی اس مرثیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے درج بالا بندہ
کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اس بندے کے دوسرے معرے میں خواب دنیا کو انہوں
نے جس طرح دکھایا وہ بھی ان کی ایسی قدرت تھی جس سے
پوری مجلس بے کل ہو گئی۔ پھر میپ کی شفق کا اور شہابی
ہو جانا اور دھوپ کا عارض پر تو سے گلابی بن جانا نزاکت
بیان کی بڑی لطیف مثال ہے۔ یہاں مرثیہ رنگ تغزل
سے معمور ہو گیا اور احساسی تاثرات کا ایک ایسا میدان
کھلا کہ تمام مجلس عالم کیف میں ڈوب گئی۔ حضرت علی اکبرؑ
بہر شہیدہ پیغمبرؐ آتے اور اس بارے میں بھی مصدق صاحب
نے کئی زوردار بند پڑھے، مگر ان کا خاص عمدہ رہ بند
ٹھہرے جن میں انہوں نے مصوفی کی شجاعت کا ذکر کیا۔
ایک نہایت خاص بیلو اس سلسلے میں انہوں نے یہ نکالا
کہ حضرت علی اکبرؑ کو گھبراہٹ ہی سے شجاع دکھایا ہے۔
اس بیلو میں وہ لطافت ہے جس کی طرف کسی مرثیہ نگار کا
دھیان نہیں لگا تھا۔ انیسویں بند میں "ہنگے" کی ردیف
کے ساتھ چھپا میں شجاعت کے نشانات کا عجیب نفسیاتی
بیلو سامنے آتا ہے۔

ماو نو کو کبھی تلوار سمجھ کر ہنگے
ہنگے لوں جیسے علی دیکھ کے اژدر ہنگے
سُن کے آواز اذان جھوٹے میں اکثر ہنگے
جب کچھ عساکر قریب آئے تو اکسیر ہنگے

کیوں دیکھیں سے شجاعت کا آئے پیار سے

شہسوار کی جو بے دروغی ملدار سے" ۱۱

میدان کرطاس میں جب امام حسینؑ، اُن کے انصار و اطفال پر پانی
بند کر دیا گیا اور ایک کے بعد ایک درخت شہادت پر فائز ہونے لگا تو حضرت
عساکر بھی میدان کارزار میں جانے لگے آگے بڑھے وہ جانتے تھے کہ امام
عالی مقام انہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے، اس لیے وہ اذن جہاد بڑے
مودبان طریقے سے ان الفاظ میں طلب کرتے ہیں:

تعداد	در بیان	صفحہ	حصہ	تعداد
۱۱۶	سیرت و احوال سیارۃ شہدا	۱۱۶	چراغ مصطفوی	۴
۸۳	صوت و شہادت سید پیغمبر	۸۳	مقام شہیدی	۵

ڈاکٹر مصدق کے مراثی فصاحت و سلاست، روانی و نزاکت الفاظ کے لیے
حمین پیر میں جن کی بڑھاپہ نزاکت و لطیف کشش بڑی حاذبت رکھتی ہے۔
وہ رنگ قدیم کے ماحی ہوتے ہوئے رنگ جدید کی آمیزش سے ایک ایسا
مرقعہ بنی کہنے پر ہمارے حیرت انگیز کیفیات سے بھر پور، شاعرانہ خیالات سے معمور
ہے۔ رنگ قدیم کی ایک جھلک بھی حرارت کے لہذاؤں میں سراپا ہے حضرت علی اکبرؑ
ملاحظہ ہو:

ناظر میں جو اس نور کی روش میں وہ آنکھیں

بنیادیں جو ان چہلوں کی کشش میں وہ آنکھیں

مانند پیر آپ کا مسکن میں وہ آنکھیں

اکہم کی طرح نور کا خرم میں وہ آنکھیں

شرمندہ ضیا میں گھر خور ہے ان سے

تاریخی اسقام سخن دور ہے ان سے

رہتی میں اسی نور پر گرد و پرہ نگاہیں

ایسے بھی ہیں کچھ رفیع جو بھرتے ہیں آہیں

امداد وہ اس نور کی بسبب تک کہ نہ چاہیں

کما دخل جو شرمیں آہیں ہوں میں یہ راہیں

مدد میں مری فیروں کا قدم آہیں سکتا

اس انداز کا پرتو بھی کوئی پا نہیں سکتا ۱۱

اب ڈاکٹر مصدق کا نون نگاہ ملاحظہ ہو:

اسے خوش حال ملے اکبر غازی کا شہاب

جس کی پرچھائیاں دیں خواب دنیا کا جواب

مدد شرب، مدد کھان سے زیادہ شاداب

اللہ اللہ وہ کھلے ہوئے عارض کے کلاب

کیا تعب کہ شفق اور شہابی ہوگی

دھوپ بھی پرتو عارض سے لگائی ہوگی

جہذا عارض شہادت گستاخ توں

ودیدہ بلی سدرہ جو خشک جس سے وہ بیول

آہ کل کی دلی

کسری منہاس نائل ہیں کہ ڈاکٹر مصدقہ
 " ۱۵ اور ۱۶ جنوری سنہ ۱۳۸۵ کو درمائی شب کو شیخ پور
 میں ایک مجلس عزائیں مرتبہ پڑھ رہے تھے اور جب یہ
 معرکہ بچھا

معجزہ وہیں عمر کے عالم اور سران
 مجمع پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور سامعین نے مکرر اور سرگرم
 پڑھوایا میری مرتبہ اسی معرے کو کہ اس جوش عقیدت اور
 خلوص سے ادا کیا کہ دل کا دورہ پڑا اور رون قفس
 غصہ سے پرواز کر گئی۔ ۱۰

یہ واقعہ اس بات کی سند ہے کہ ڈاکٹر مصدقہ کا ممبر رسول سے تعلق عالم
 عقلی سے تادم آفرما۔

کائنات عالم میں ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن موت کی آغوش
 میں جانیے اس سے انکار ممکن نہیں اور نہ فریبی مل سکتی ہے، مگر
 خوش نصیب ہیں وہ مبتلاں جو اس طرح عالم غائی سے عالم بقا میں داخل
 خیال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مصدقہ بھی کچھ چکے تھے کہ ان کا وقت انحراب
 قریب آگیا ہے کچھ الہامی کی کیفیت کے پیش نظر وہ فرماتے ہیں ۵
 دوستو! ختم ہے یہ سلسلہ عزم و عمل
 اب نظر آتا ہے اعصاب رئیس میں صل

عشق اور رخص کا ہر بار گر ان چٹک دیا
 اب سبک دوش ہیں آتی ہے تو آجائے اجل

ڈاکٹر مصدقہ کے انتقال پر ملال کی تیر جس وقت یہاں موصول ہوئی
 دنیاے ادب میں سنا تھا گیا۔ دل اس بات کو یقین کرنے کے لیے احوال
 اس بات کو ہرگز ہرگز سنے کے لیے تیار نہ تھے کہ وہ پرستار ادب ہمیشہ ہمیشہ
 کے لیے خاموش ہو گیا۔

ڈاکٹر مصدقہ انتہائی تخلیق، ملنسار، ہنسملزاج اور فرشتہ خلعت
 انسان تھے۔ ان کی ذات گرامی جامع کمالات اور اوصاف حمیدہ کا
 ایسا پرتو تھی کہ جس کی تپ سے وہ چہرہ جو حوادث زمانہ سے اپنی تبدیاب
 کھو چکے تھے منور و روشن ہو گئے۔ غلابی عالم نے ان کو ایک ایسے دل کا مالک بنا
 تھا جو ہمیشہ طالب ذوق و ادب کے لیے وارہتا۔ ان کے درے کبھی کوئی
 بالیں نہیں لوٹا۔ وہ ہر ادب و نواز کی مدد پوری فراخ دلی سے کرتے تھے۔
 کوئی بھی ادبی مسئلہ پیش نہ کرتا تو پوری خوش اسلوبی سے حل کر دیا کرتے تھے
 ادیبوں، نقادوں، شاعروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کے
 کارناموں کو سراہتے تھے۔ ان کے درجن خلطو جہانوں نے یہاں
 (سند و ستان) ارباب ادب کو کبھی خالص ادبی ہیں اور ہر ادبی اہمیت
 رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط کو نثر شیعہ میں دیدی، مالک دلم، ناسیجیا

اب تو حضرت سنی حاتی نہیں بچوں کی فضاں
 کی خلا کاٹ کے مراؤں میں یا شاو زمان
 میرا منہ دیکھ کے رہ جاتے ہیں لعل ناداں
 گاہ آگے دکھاتے، میں مجھے خشک زباں

دل پہ گھر کر الم غم کا حساب آتا ہے
 پلہ ساقی کو تر ہوں جواب آتا ہے
 جوش خادم نے سنبھالا سہا اس دن کے لیے
 دل مضطرب و بالا سہا اسی دن کے لیے

میری ماں نے مجھے پالا سہا اسی دن کے لیے
 فرض نے موت کو ٹالا سہا اسی دن کے لیے

اب تو مولا مجھے لڑنے کی اجازت دیجیے
 یہ نہ ممکن ہو تو سرعت کی کی خدمت دیجیے
 وعدہ کرتا ہوں کہ توار نے جاؤں گا
 مشکیں خاموشی سے بھروں گا چلا آؤں گا

صبر حضرت کا نمونہ انہیں دکھاؤں گا
 سر جھٹکا کر تیر و تیر و ستان کھاؤں گا

ایک نیزے کی اجازت ہو ضرورت کے لیے
 وہ بھی اتنی نہیں مشکوں کی حفاظت کیلئے ۱۰

یہ وہ لفظیاتی پہلو ہے جو ڈاکٹر مصدقہ بڑی خوب صورتی سے اہل کتب
 ہے۔ روایت وہی ہے جسے دوسرے شعراء اور شیعہ نگاروں نے بیان کیا
 ہے، مگر ڈاکٹر مصدقہ کے ان لفظیاتی بیان نے اسے جانہ تو عطا کیا ہے۔
 اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ علم انبیاء کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ روزنامہ
 " جنگ " راولپنڈی (۱۲ مئی ۱۹۶۵ء) ڈاکٹر مصدقہ کی مرثیہ نگار پر مطلب
 آسان ہے۔

" مصدقہ صاحبہ نے کلاسیکی ترتیب، اس کے بیانیہ وصف اداس کی
 تمیل کا راز اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن..... جبرہ اقدار کی عظمت
 حقیقت پسندی کی روشنی، تاریکی شعور اور ان کی عظمت کے تصور
 کی ترویج کا ہے۔ انہوں نے انسانی کئے اسباب کو قبول کیا ہے اور
 کلاسیکی مرثیے کی ہنسی ترتیب کو مسترد کیا ہے۔ ان کے خیالات،
 نئے افکار اور نئے اسباب سے مدین کیلئے ۱۰

یہ مداح اہمیت ساری عمر آخر اہل ہر مدح شاکر تاربا اور بقول تاثیر نقوی
 مدیر "عظیم" کو اتنی

" خداوند عالم کو مصدقہ صاحبہ کی نہ جانے کو کون سی ادا
 پسند آگئی کہ اس نے فرشتہ اجل کو حکم دیا کہ وہ عزم
 سے فرش پر جائے اور اس مداح محمد و آل محمد کو گھے
 لگائے " ۱۰



خواجہ حسن نظامیؒ

اور ان کے معاشرتی تصورات

دانش مندانہ فکر سے دنیا والوں کے سامنے آؤا کشم میں ڈال دیتے ہر خواجہ صاحب تمام مرد دنیا اور آخرت میں بھلائی کے حصول کے لیے سرگرم رہے اور انہوں نے مباح و مکرم کو کبھی ایک دوسرے سے الگ کرتا اور غرام نہ سمجھا۔ یہی معاملہ ادیب و تاجر کا ہے۔ ہمارے یہاں یہ نصیبی سے ادیب و شاعر کے فاقہ مسمیٰ کوئن اور شخصیت کے لیے جزو لازم مان لیا گیا ہے۔ ادب یا کچھ خاندان کی کفالت کے لیے ملازمت کو اس کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ مگر خواجہ صاحب کا الگ بظاہر یہ ہے کہ انہوں نے ”مشق کھن“ کے ساتھ تجارت کی ”مشق“ کو بھی جاری رکھا۔ کیوں کہ ان کا خیال یہ تھا کہ :-

”خدا سے یہ دنیا اپنی شان کے اظہار کے لیے بنائی ہے۔ بندوں کو بھی اپنی ہستی کا اظہار اپنے عمل کی مستعد و جدوجہد سے کرنا ضروری ہے۔ جو اس راز کو سمجھ کر کام کرتا ہے، کام لیا ہو جاتا ہے۔“

خواجہ صاحب کو بہ یک وقت ”مقلد اور غیر مقلد“ ایک ہی مانتے ہیں قرآن دنیا بظاہر عجیب بات کہتی ہے۔ لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ گزرے کل کی ابھی باقوں کی تقلید کے قائل تھے اور ساتھ ہی ساتھ نئے زمانے کے صلاح و انکار کو پرابوں پر ترجیح دینے والے کا اجتہاد اور حوصلہ رکھتے تھے اور یہی سچ ان کی کام بائی کا راز تھا۔ وہ خود کہتے ہیں :-

”قدیمی تہذیب برٹ دی ہے اور نئی تہذیب اس کو مٹا رہی ہے۔ ایسی نازک حالت میں کامیاب وہ ہوتے ہیں جو پہلے والی تہذیب کی خوبیوں اور مٹانے والی تہذیب کے محاسن کو جلدی سے سمجھیں۔“

مسلمان اور کسب وکسب انسانی ہر سے بھی اپنا ہر گئی فرق و تمیز

خواجہ حسن نظامی (۱۹۵۵ء۔ ۱۹۸۷ء) ایسی رنگارنگ شخصیت کے مالک تھے، جس کی ہمہ جہتی، برتقونی اور رنگارنگی نے اپنے عہد اور آنے والے زمانوں پر وہ گہرا اثر چھوڑا اور نقوش مرتب کے جن کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔

خواجہ صاحب گریہ بھی تھے اور ہر ادبی، صوفی بھی تھے اور صحافی بھی، دین دار بھی تھے اور دنیا دار بھی، ادیب بھی تھے اور تاجر بھی، مقلد بھی تھے اور غیر مقلد بھی، وہ کٹر مسلمان بھی تھے اور وسیع الشرب انسان بھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض یا میں ہم میں سے بعض لوگوں کو ایک دوسرے کی ضد لگیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو ان میں کوئی تضاد نہیں۔

ہر پہر اپنے مریدوں کے لیے اگر مڑا ہے تو کسی نہ کسی کام پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح صوفی صرف خال خالی میں بیٹھ کر توبہ نہ گنڈے کرتے والوں کو سمجھ لیتا صحیح نہیں بلکہ یہ وہ ہوتے ہیں جو ہر دور میں مشاہد حق عرفان ذات اور خدمت خلق کے لیے ہر نفس آمادہ اور ظالم کے مقابلے مظلوم کے دلیل اور اس کی زبان رہے ہیں۔ سو حضرت خواجہ حسن نظامی بھی صوفی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ حضرات اہل تصوف کی سچے روایات کے امین ہونے کے ناطے صحافی بھی تھے، جن کو آج نئے زمانے کے عناصر حکومت میں آؤا ذوق بلند کرنے والا اور مظلوم کی داد دہی کے لیے آمادہ پیکار چرچا غفر صفا ہوتی کو سمجھا جاتا ہے۔

دین و دنیا میں کوئی تنازعہ نہیں ہے اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ دنیا کا کچھ بگاڑ پائیں یا نہ بگاڑ پائیں، لیکن دین کو ضرور اپنی غیر

● شہزادہ ملک و عرب۔ ایرانی شہزادہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۹۱۵ء

مکتبہ کافی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ ذہنی خفقات، کچھ زمانے کے ہوتوں پر کسی حد تک، کچھ فرقہ وارانہ تعصبات کے تجروں اور کچھ دین کی اصل روح سے ٹھنڈے ایسا ماحول بنا رکھا تھا اور شاید یہی کہیں اب بھی ہو۔ لیکن خواجہ صاحب کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے ”وصل خواہی“ اور ”در صلح علی“ کا مشرب اختیار کیا اور اگر ایک طرف ”مدنی شام سندھ کی مڑی“ کی مدد سے قرآنی گراں دوزان واد میں اپنی جلائی طبع اور ظلم کی قوت سے سوراخ اندر مڑی کی جگہ کا مشیل بن کر امر کیا تو کربلا کی داستان کو اردو میں اس طرح پیش کیا کہ رزمیہ نگاری میں لافان اور مہا بھارت کے رجحیتا ہائیکہ اور دوسری کی یاد تازہ کر دی۔ ”جیا اجمیری“ کے گیت سنائے۔ ”اجمیری پنہیل کے پھول“ کی خوشبو کو عام کیا تو دوسری طرف مادھا کے سہارے، بٹھو دھاکے، راج ڈھارے اور پانڈوؤں کے سہارے شری کرشن کی کتا بھی لکھی۔ گیان دھیان کے سرورٹ بھلے، ”پر دوا کی گولہ کے کنارے چننا من مڑی“ سے صحیفہ کی قطعے سنائے، ”اگر برہم دوتہ ماسی“ کے سنی سمجھائے اور یوگ و شمشٹ سے ”لام اپرینی“ کے سہارے جگ تک پہنچائے۔

خواجہ صاحب محرم میں پیدا ہوئے اور ذی الحجہ میں ان کی وفات ہوئی۔ اس طرح انہوں نے اسلامی کیلنڈر کے ہر مہینہ کا رنگ اور بہار دیکھی۔ اور ان کی زندگی کا سفر اسلامی تاریخ کی ایک قربانی سے شروع ہو کر دوسری قربانی پر ختم ہو گیا۔ ان کا انتخاب حیات مسلمانہ کے فدر کے کچھ برسوں اور طوفان ہوا اور شعلہ کے فدر کے کچھ زمانے کے بعد غروب ہوا۔ اس طرح انہوں نے اس جہم ملی دہلی کی سرکسنگی، الٹ پیچڑ تہذیبی اصل، پھل اور خاک و خون کی دہشت اور وحشت بھری نغضوں کو دودھ و دغہ دکھا۔ لیکن سب سے دل چاہ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس سب کے باوجود خواجہ صاحب زندگی بھر رجائی تعقیبات و دما شرت کے ساتھ رہے۔ اور سرگرم عمل رہے۔ قومی ذہن پاسنے اور نہ ستا یہ اس حرکت، صحت مند اور فعال تعصوف کا نتیجہ تھا، جو فرار کا نہیں، قرار کا، جو کدو کا نہیں، مجاہد کا اور لڑاؤ کے لیے عبادت گھر کا نہیں بلکہ اس دارالاسباب میں مادی وسائل کی فراہمی کے لیے محنت و مشقت کا سبق دیتا ہے۔ اسی لیے خواجہ صاحب، صرف اولیت، اطاعت اور مبادت سے عبارت مونی نہ تھے بلکہ ماسوائے اصلاح کو کبھی انہوں نے اپنا مقصود دعوت بنایا اور بیلا غلو و تفاوت کہنے کی بجائے اصلاح انہوں نے گھر میں بلینڈ کیا۔ اور وہ اس طرح کہ کدو گھوں میں تو اؤل کی جگہ گلو اؤل نے اور سراج کی جگہ مجرے سے لینی شمع کوڑی تھی۔ زبان بازار کی کے ساتھ بلانڈی اؤل اور اسفل حذبات بھی درانے لگے تھے، جو خیر شری امرام

بھی پہل پھول رہی تھیں۔ خواجہ صاحب نے سب سے پہلے انہی کے فطرت آواز اسٹائی۔ بیچو، کاکیاں دی گئیں، حملہ ہوا اور انتہا یہ کہ بعضی حضرت نظام الدین اولیاء کو چھوڑ کر ناظر۔ لیکن انہوں نے اصلاح کے پروگرام پر ہی نظر رکھی، انتقام نہیں بلکہ اس محبوب محبوب الہی نے ہمیشہ ہی کہا: ”کشندہ کشندہ بود“ (جو برداشت کر لیتا ہے وہ مار ڈالتا ہے)۔ قل آخر کار اس میں ان کو بڑی جنگ کام یابی ہوئی۔

خواجہ صاحب نے دنگا ہوں کے بعد عام مسلم معاشرہ پر نظر ڈال اور سب سے پہلے سچے چرنے ان کی قوت اپنی طرٹ منڈول کر لی وہ شادی بیاہ میں غلط رسوم و رواج کی عمل دانگ تھی۔ خواجہ صاحب نے اس محاذ پر بھی قلبی جنگ چھیڑی اور انہوں نے کم عمر کی شادی، شوہر اور بیوی کے باب میں حق انتخاب، محدود برادری کی قید، دولت کی حرص، مہر، جہیز اور بیوہ کی شادی جیسے مضموعات پر ظلم اٹھایا۔

۱۹۱۲ء میں کم عمر کی شادیوں کے تعصبات کی نشاندہی کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

”چھوٹی عمر کی شادی بیوی بچا دلوں کے لیے برگر مناسب نہیں ہے اور سہارے گھروں میں کبھی خوشحالی اور اطمینان پیدا نہیں ہوگا جب تک یہ غلط رواج قائم ہے؟“

شوہر اور بیوی کے باب میں حق انتخاب کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے لکھا:

”بیٹا بیٹی کو دیکھو یہ ماشوہر کو پسند کرنے کا مذہب! تو اعتبار سے مکرر دیا جائے گا“

اور:

”مسلمان بڑی غلطی کرتے ہیں جو حق انتخاب کے مسئلے کی اطاعت سے محض ہوتے ہیں۔ ان کی غفلت قوری اصلاح کے قابل ہے۔“

محدود برادری کی قید یعنی اپنی برادری ہی میں بیٹی کی شادی لازمی طور پر کرنے کی روش پر بحث کرتے ہوئے وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ:-

”کٹنے کی شادیاں فساد بھی پیدا کرتی ہیں اور یہ فساد آنا گھرا اور سخت ہوتا ہے کہ مذہبوں اور نسلیوں تک دھڑ نہیں ہوتا۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں یہ بہت بُری رسم ہے اور اس کا ترک کرنا بہت ضروری ہے۔“

اسی طرح ملک کی عام فلسفی، مفردوں کی زیادتی، اسباب آمدنی کی کمی

ہاٹے لوگ بیٹھا ٹیکی کشادی کرنے میں رعبہ پیسے کو بہت دیکھتے ہیں....
کر لڑکی سوئے میں بی بی اور مریوں میں سفید تو رہے گی کہ اس کا شوہر
کر دڑتی ہے۔" اٹھ لیکن خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"ایسی شادی مانگنا ناخوش گوار ہوتی ہیں اور مسلمان
بیوی میں کبھی موافقت نہیں ہونے پاتی۔ والدین ہرگز
دولت کا خیال نہ کیا کریں کیوں کہ دولت سے موافقت
پیدا نہیں ہو سکتی۔ ضرورت اعتدال کی ہے یعنی بیٹا
بیٹی کی کشادی کرنے میں فریقین کو اپنی حیثیت اور
بساط کا اندازہ کر لینا چاہیے۔" لے

ہر کے معاملے میں اظہار خیال کرتے ہوئے خواجہ صاحب کے لیے کانٹھیا پن
مزاج کی تلخی اور سماجی حالت سے بڑی ملاحظہ کیجئے :-

"کیا آج کل محکم شریعت کے بموجب نکاح جائز ہوتے
ہیں۔۔۔؟ مجھے اس میں بہت تاثر ہے۔ کیونکہ
شریعت اسلامی نے نکاح کے لیے ہر کوئی ضروری قرار دیا ہے۔

مگر جمہالت کے سبب ہر کے معاملے کو احکام شریعت
کے موافق بہت کم لے کیا جاتا ہے بلکہ اس میں ذاتی
نفسانیت داخل کر دی جاتی ہے۔۔۔۔۔ اگر کوئی کہے

کہ جناب ہر کا مسئلہ بہت نازک ہے، اس کی نسبت
یہ خیال کرنا کہ دنیا نہیں پڑے گا یا بعض مقرر کرنے
کی چیز ہے دینے لینے کی نہیں ہے تو نکاح میں

خرابی پڑ جاتی ہے۔ کیوں کہ نکاح میں یہ بات
ضروری ہے کہ ہر دینے اور دار کرنے کا پختہ ارادہ
میں موجود ہو ورنہ نکاح جائز نہ ہوگا۔۔۔۔۔ ان

حالات کو دیکھ کر اور اوقات کو سن کر میرا دل کا پٹنا
ہے کہ مسلمان خواہ مخواہ اپنے سروں پر گناہوں کا انبار
لا رہے ہیں۔ اور دوسری ناموری کی خاطر ان کے

نکاحوں میں خرابیاں پڑ رہی ہیں۔ سب سے زیادہ
انہوں اس بات کا ہے کہ علماء اس کی نسبت خاموش
رہتے ہیں اور یہ مسئلہ سختی سے نہیں جانتے کہ حیثیت

سے زیادہ ہر پر نظر کرنا اور بھی اس کی نسبت یقین رکھنا
کہ ہر دنیا نہیں جیسے گا، جائز نہیں ہے اور اس سے
نکاح کے حجاز میں فتنہ پڑ جاتا ہے۔" لے

جنہی کی لعنت پر ملاطمت کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ :-

"بیٹی والوں کی زندگی میں سب سے بڑا وبال لڑکی کا

ہیز معلوم ہوتا ہے۔ جتنی جس کی حیثیت ہے اتنا ہی زیادہ
فکر ہے۔۔۔۔۔ حیثیت اور باطاعت سے زیادہ اور محض فضول
ہیز دینا اسراف ہے۔۔۔۔۔ ہندوؤں کے ہاں لڑکی کو

ہیز دینا شاپ میں دھل ہے۔ مسلمان بھی ان کی دیکھا
دیکھی ہیز اور لڑکی کی شادی کو کنیا دان کہنے لگے ہیں۔ مگر
یہ کبنا درست نہیں ہے۔ اور ہیز کے لیے بہت زیادہ

فکر مند رہنا بھی نامناسب ہے۔ اس کے سبب صداہا
گھر الوں میں لڑکیاں بیٹھی رہتی ہیں۔ پورا اور شاد کار
ہیز جتنا نہ ہونے کے سبب لوگ ان کی شادیوں میں

کھستے اور بچاریوں کی جوانیاں برباد ہو جاتی ہیں۔
میں مسلمانوں کو ہیز کے معاملے میں اسراف اور
فضول خرچی کو ترک کر دینا ضروری ہے اور اولاد میں لڑکی

کے وجود کو آفت جان اور دیوالی جان فاحیان اسی لحاظ
سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ہیز کے سبب ماں باپ کو بھد
زیر بار ہونا پڑتا ہے۔" لے

بیوہ کی دوسری شادی نہ کرنے کو سخت گناہ جانتے ہوئے خواجہ صاحب
مسلمانوں کو تنبیہ کرتے اور بتاتے ہیں کہ :-

"بیوہ کی کشادی نہ کرنا، خدا رسول کا نافرمان ہونا اور
اپنی بے گناہ اولاد کی دھنگی کوتاہ و برباد کرنا ہے اور
صرف یہی نہیں بلکہ خاندان کی عزت و آبرو بھی بیوہ کی

شادی نہ کرنے سے بعض اوقات ملتا میٹ ہو جاتی ہے
اور اکثر سنے میں آتا ہے کہ بیوہ عورتوں کا چال چلنی
خراب ہو گیا ہے۔ اس بدنامی اور گناہ کا دیاں ان

داروں کے نامہ اعمال میں لکھا جاتا ہے جو بیوہ کی شادی
کو عیب اور بڑا سمجھتے ہیں اور نہ حلال کرتے ہیں اور نہ دوسروں
کو کرنے دیتے ہیں۔۔۔۔۔ کیا حضرت یحییٰ کی خاطر کی ولولہ

بیوہ نہ تھیں؟ اور انہوں نے رسول خدا سے دوسرا
نکاح نہ کیا تھا؟ کیا حضرت فاطمہؓ کے والد کی اکثر بیویاں
بیوہ نہ تھیں؟۔۔۔۔۔ یہ بات خدا کے قہر و غضب نازل

ہونے کی ہے؟" لے

نئی تسلیم نے جس نے کچھ کر چھ دیا، اس نے عورتوں کی سماجی حیثیت
اور مرتبہ کے بارے میں نئی نئی محنتوں کو کھڑا کر دیا۔ سوال یہ تھا کہ عورتیں
کیا کر سکتی ہیں؟" لے اس کا جواب خواجہ صاحب نے سن ۱۹۱۷ء میں اس طرح

دیا :

”اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہو گیا ہے کہ مسلمان اپنی پچھلی حالت پر نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ ان عورتوں کو تعلیم ملے نہ بنا دیا جائے۔ اس نے نئی روشنی کے جواں بہر ترقی کو پیش میں ہیں کہ ہماری عورتیں بھی یورپ کی طرح خوب ہی لگا کر کھنا پڑھنا سیکھیں۔۔۔ لیکن ہمارے توجہ ان یورپ کی ترقی کو کرنا ان کی تقلید کرنا چاہئے ہیں۔ اگر ان کو اپنی قدیمی ترقی کے اسباب معلوم ہو جائے تو وہ ہرگز اس سے بخود خیال پر توجہ نہ کرنے بلکہ

پھر خراجہ صاحب، حضرت خراجہ عین الدین اجمیری، خراجہ قلب الدین سیمتارا کا، حضرت محبوب الہی خراجہ نظام الدین اویارہ کی بیوہ ماؤں کے تذکرے سناتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح ان سبھوں نے ان دُعا کے نتیجے کی ایسی تعمیر و تربیت کی کہ انہی کے صدقے سے اس ملک میں ”مسلمانوں کا حقیقتاً“ لہذا نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”اب بھی اگر مسلمان لوگوں کو رستے کی حالت کا لحاظ رکھ کر تعلیم مذہبی دی جائے تو ان کی آئندہ تسلیں پہلے ہی ترقی کر سکیں گی۔ کیوں کہ اسلام سب کے نزدیک ظاہر و باطن کو درست کرنے کے لیے ایک مکمل مذہب ہے۔“

خراجہ صاحب نے اپنے معاشرہ میں اسراف بے جا کے خلاف مستقل صدارت احتجاج بلندی اور قومی امانی کے صحیح استعمال پر ہمیشہ زور دیا۔ وہ لکھتے ہیں:-

”فعلول خراجہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے: اسراف نہ کرو۔ اسراف کرنے والے شیطان کے ساتھی ہیں۔ دوسری جگہ منسوب کیا: کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔

اگر چار آئے تو کڑی بات میں تمہاری تن پوشی ہو سکتی ہے اگر دوسرے کے دیکھ کر تمہاری برہنہ پائی کو دیکھ کر سکتی ہے، اگر ایک طرح کے دال سانے سے تمہاری روٹی چل سکتی ہے، تو تین چار روپے گز کے پیرے پہن کر اپنے جسم کی عادت نہ بگاڑو۔ دس روپے کا دلائی بوٹ اور پانچ روپے کا لام دار چوٹی نہ پہنو۔ دس طرح کے کھانے و مٹیر خوراک نہ لگاؤ۔ تم ایک غریب ملک کے باشندے ہو تم ایک مخلص قوم کے فرد ہو۔ دوسرے صحابہ کو ایسی خیال رکھو کہ دس سال میں ہیں۔“

قوی آمدنی کے صحیح اور سودی چیزوں کے استعمال پر اپنے ایک مضمون ”جسب گھڑی کی سازش“ میں مفسر اللہ میں لکھا گیا تھا، اس طرح درود ہے:

”ہندوستانی حقیقت کا سہ بے وقوف ہیں، جن کو وقت کی پابندی کا کوئی خیال نہیں، مگر یو روپ کی تقلید میں پیش کے چند کچھوں کو چاڑی کے سکے سے کڑبڑ لیتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف یہ بے کاریتیل کے ٹکڑے پہنچ جاتے ہیں اور ولایت میں چاندی پہنچ جاتی ہے۔

میرا بس ہوتا سارے ہندوستان میں ڈھنڈورہ بیٹھ دولی کھڑی دی رکھے جو وقت کی تدرجاستا ہو۔ نیا ہی نہ تازہ کے لئے کوئی اپنی دولت غیر ملک میں نہ بھیجے بلکہ میں قریبی ملکوں کا کہ جب تک اپنے ملک میں گھڑی کے کارخانے قائم نہ ہوں اور یہاں گھڑیاں نہ بننے لگیں کوئی ہندوستانی گھڑی نہ خریدے۔“

اسی موضوع پر اپنے ایک مضمون ”نٹ بال“ میں لکھتے ہیں: ”اب یہ عالم ہے کہ دسویں ہندو عیسویں دن گیند خراب ہو جاتی ہے۔ جو تے ٹوٹ جاتے ہیں اور غریب ہندوستانی ولایت والوں کی جیب میں چاڑی کے سکے ڈال کر چڑے کے ٹکڑے دوبارہ خریدنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سبھی ایسے اھل کورڈر سے سلام جس سے ملک کی دولت برباد ہوتی ہو گھڑیوں کا تماشا اچھا نہیں ہوتا۔“

تمام حقوق کو اللہ کا کتبہ سمجھنا سنت رسول ہے، لیکن زمانے نے اونچ نیچ، رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کی اتنی دیواریں کھڑی کر دیں اور درجہ بندیوں ہو گئیں کہ اشرف المملکت کو ارذل اور کمرتا دیا گیا۔ خراجہ صاحب کا حس دل اس پر تڑپ اٹھا۔ جھوٹ جھات کا امت پرمانہوں نے مسلمانوں میں اپنے ایک مضمون ”چار زاوہ سید کی گودیں“ اس طرح نغم اٹھا یا:

”نچ زاد جھوکرے۔ امیری گود میں آجا۔ تو شور دے کیں ہے، پلید ہے، کندہ ہے، مگر میرے واحد خدا کا بندہ ہے۔ مجھ میا آدمی ہے۔ ناک، کان، ہاتھ پاؤں آنکھ، زبان، دل، دماغ رکھا ہے۔ سچہ کو کس نے اچھٹا اور ناپاک بنا دیا۔ نہیں تو پاک پورے، عزت دار بلند مرتبہ، کون ہے جو سچہ کو خدا کی درگاہ میں بٹھائے رکھا ہے۔ مہندرا پھلور

گر حاکمین جانے سے منع کرتا ہے۔ تو آئندہ فقیر،
عربی رسل کا فرزند قریب ہاتھ پاؤں دھوئے گا اور اپنے لاپ
کی بنائی ہوئی مسجد تو عید کی اپنے ساتھ لے چکے گا۔

بابا پانی تدریجاً، میں سمجھ رہا تھا، تو انسان
ہے، بلذتستان ہے۔ غلیظۃ المسلمین محمد قاسم کا
محنت جگر ہے، خاقان الہند خارج قاسم کا نور نظر
اور قرآن سے غریب چار کے پسر مذکور کا گاہ میں سب برابر
ہیں۔ آخر عرب دین کے مہاراج، اُن کی ذات اور بیٹی
ذات کو ہر پری کی نگاہ سے دیکھنے والے بیٹی کی سیوا اور
جہاں کس، جس سے پریم پر چار میں میر غریب، ادنیٰ اعلیٰ
چھوٹے بڑے، چڑھے، اُن پڑھ کی کچھ تدریس رکھی اور
اُپر لپٹی دیا۔

ذات پات نہ لہر چھے کوئے

ہر کو بھیجے سوہرا کہ ہوئے

تو آہر کے نام کی بائری بجائیں، ہر کر ڈھونڈیں،
ہر کو پائیں۔ ۱۱۱

اپنے جہد کی سیاست گزیرہ معاشرہ جو ہمیں ورثے میں ملی ہے اس پر بھی
انہوں نے حکیمانہ انداز سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"گہرا اور غبار سے جو تاریکی پھیل رہی ہے اس کو کوئی روشنی
دور نہیں کر سکتی۔ ایسے ہی جس سیاست پر بناوٹ اور پاکاری
کا گہرا اور غبار جو اس کو کبھی کسی روشنی سے فائدہ نہیں پہنچ
سکتا۔ ۱۱۲

مسلم معاشرہ کی حیثیت اجتماعی پران کی یہ عارفانہ توجیہ اور بے بیش گوئی یاد
رکھنے کے قابل ہے کہ:-

"آج میں نے دو سلازی کی میٹھیں دیکھیں کہ خشک سفینت
کی چٹکیاں بنا رکھی تھیں۔ میر جمال الدین صاحب نے کہا کہ بغیر
پانی کے ٹکیاں اس واسطے ہی ماتی ہیں کہ شین کا دباؤ دوکے
اجرا کو ایک جان کر دیتا ہے۔ میں نے کہا تو ظاہر ہو گا کہ مسلمان
قوم کی تعلیم و معاشی وضعیت سے نہیں ابھر کر پُر قدرت کے
دباؤ سے ہوگی۔ ۱۱۳

انہوں نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا کہ:-

"مسلمانوں کو نہ ہندوؤں دین کے نہ انگریز۔ ان کو تو خودی
تجارت صنعت و حرفت میں ترقی کرنے سے آنا وہی حاصل
ہوگی۔ جب تک یہ کاری اور فلسفی دین نہیں ہوگی کوئی قوم

مسلمانوں کی حالت آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ ۱۱۴
کیوں کہ:-

"موجودہ زمانے میں وہ شخص کبھی کام یاب نہ ہوگا جو ہر کام
میں دوسروں کا امتیاز نہ کرتا ہے اور اپنی عداوت اور قتل
پر سرخوردہ نہیں کرتا۔ ۱۱۵

جہاں کا اکرام اور احترام ہر شخص پر واجب ہے، لیکن جہاں کی کبھی کچھ قدر داری
ہوتی ہیں ان پر وہ اس طرح حکم اٹھاتے ہیں:-

"الشیخا اور مذہب اسلام کی تہذیب جہاں تواری سکھاتی
ہے، لیکن بے اطلاع کسی کے گھر پر بے وقت پیچھے مانا دونوں
تہذیبوں میں نہایت میوب ہے۔ خصوصاً رمضان کے
مہینے میں کسی کا جہاں نہ ادا کرے اطلاع مانا بہت ہی بڑا ہے۔
اور سردی کے موسم میں گرم بستر کے بغیر کسی کا جہاں ہونا اور
بھی زیادہ میوب ہے۔ ۱۱۶

خارج صاحب کا نظریہ تھا کہ جب کسی بھی سے ملو فرٹ کر ملو کیوں کہ:-
"دیکھو میٹھوں کو دیکھو وہ اپنے درخت سے ٹوٹا ہوا کوسی
کیرٹے میں رکھے جاتے ہیں تو وہ کیرٹہ خشک و مار مو جاتے۔
پتوں میں یا برتن میں رکھے جاتے ہیں تو ان کو کبھی معطر
کر دیتے ہیں۔ لیکن جس درخت میں پیدا ہوتے ہیں، اُس
درخت کے پتوں اور ٹہنیوں میں ان پتھوؤں کی خوشبو نہیں
ہوتی۔

اس کا فنی سبب کچھ بھی ہو، لیکن مثال دینے کے لیے
کہہ سکتے ہیں کہ حبیب جھول دوسروں سے ٹوٹ کر ملتے ہیں،
اس وقت ان میں دوسروں کو خوشبو دار کرنے کی صلاحیت
پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک اپنے درخت میں لگے رہتے
ہیں، اُس وقت تک ان پتوں اور ٹہنیوں کو بھی معطر کرنے
کی قوت ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ ۱۱۷

تو یہ تھا خارج صاحب اور ان کے معاشرتی تصور کا ایک اجمالی
اور مشترک خاکہ، اس میں عہدی عنایت بھی ہے اور پیغام فکر و عمل بھی کیا ہم
اس کا اپنا نہیں گے؟

حوالے:

- ۱- خارج نظامی: ہفتہ وار "روزنامہ" دہلی، یکم جنوری ۱۹۳۳ء ص ۳
- ۲- ایضاً ص ۱۳
- ۳- خارج صاحب کے معنون کا عنوان ہے۔

- ۳۔ ایضاً ۵۔ ایضاً ۶۔ ایضاً ۷۔ ایضاً ۸۔ ایضاً
۹۔ خواجہ حسن نظامی: ”آپ بیتی“ دوسرا ایڈیشن (دہلی: ۱۹۷۲ء) ص: ۲۸
۱۰۔ خواجہ حسن نظامی: ”اولاد کی شادی“ پانچویں اشاعت (دہلی: ۱۹۷۲ء) ص: ۶
۱۱۔ ایضاً ص: ۷، ۱۲۔ ایضاً ص: ۲۶، ۱۳۔ ایضاً ص: ۸
۱۳۔ ایضاً ص: ۱۰، ۱۵۔ ایضاً ص: ۱۰، ۱۱۔ ایضاً ص: ۱۲
۱۴۔ ایضاً ص: ۴۹، ۵۰، ۵۱۔ ایضاً ص: ۶۵، ۶۶
۱۹۔ ایضاً ص: ۷۸، ۲۰۔ ایضاً ص: ۷۹
۲۱۔ خواجہ صاحب کے معنون کا عنوان ہے۔
۲۲۔ خواجہ حسن نظامی: ”سی پادہ دل (مقتدا دل) نواں ایڈیشن (دہلی: ۱۹۷۵ء) ص: ۲۷۱

- ۲۳۔ ایضاً ص: ۳۷۲، ۲۳۔ ایضاً ص: ۳۷۳
۲۵۔ ایضاً ص: ۵۲۰، ۲۶۔ ایضاً ص: ۵۱۷، ۵۱۸
۲۷۔ ایضاً ص: ۵۱۷، ۲۸۔ ایضاً ص: ۵۱۲، ۵۱۳
۲۹۔ خواجہ حسن نظامی: ”ہفتہ وار“ ”روزنامہ“ دہلی: ۸ جنوری ۱۹۷۲ء ص: ۱
۳۰۔ ایضاً ص: ۳
۳۱۔ ”روزنامہ“ دارالحدیث ۲۴ جنوری ۱۹۷۳ء ص: ۳
۳۲۔ ایضاً ص: ۱۱، ۳۳۔ ایضاً ص: ۸، ۸ جنوری ۱۹۷۳ء ص: ۱
۳۳۔ ایضاً ص: ۸، ۸ جنوری ۱۹۷۳ء ص: ۱۳

بقیہ: نئی کتابیں

ماہی الغیر ایک خاص معیار کے ساتھ قاری کے ذہن میں روشن ہو کر دل کو چھو بیٹا ہے۔
شوق سفر حیدر آباد سے غلط ”غریب خانہ“ کے بے عمل اور عام استعمال پر یہ بلا غلط
فرمان ہے:

”..... تو اذیع اور انکساری کے سیاق میں کیسے کیسے نصرت حضرت بھی
شاعری سے نہیں چڑکتے؟“

علامہ ازیں مولانا کے کچھ محض الفاظ صرف اپنی جگہ بہت لطف دیتے ہیں
بلکہ اس کتاب ہی کا انہیں مزید راج کیا جائے۔ مثلاً ”جہاں تک ”جہاں تک“ کے ذہنی
بہت زیادہ حقیقی اور غیر دھوکے کے اس کا کوئی تمہید ملے اور نہ ہی صبح و شام
یا ”ادھماکا“ (ادھماکا ہوتا ہے، نفٹ جھڑکا ہوتا ہے)۔ ”بازمغز ادھماکا
ہے“ (ادھماکا ہوتا ہے جو بات ہے وہ ”نفٹ ہوتا ہے نہ کسی اور ادھماکا
اسی طرح بعض دیگر بزرگ نظموں کا بہت خوب صورت ترجمہ استعمال کیا گیا ہے۔
مثلاً ”سیزیم“ کے لیے ”ندرت خانہ“ (غنائیاب ندرت خانہ کا استعمال کم
ہوتا ہے) لیکن یہ اور اس طرح کے دیگر الفاظ ایسے ہیں جو عام محض صولت

حسن الامضوی گیلانی و گیلانی کی دوسری اپنا بدل نہیں رکھتے۔
طاعت و کتابت سمجھا رہی ہے۔ غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مثنوی
حسن کے ساتھ ساتھ سمجھوتہ اعتبار سے ”گیارہ سطر“ لائٹ ویدو قابل
مطالعہ ہے۔

(انجمن مثنوی)

”پروازیں“ اور ”نقشِ جذبات“

شاعر: ملک راج شاعر بے نام
ناشر:

ملنے کے پتے :- کوارٹر میز سی ۲-۳۲-۳۱، ملکہ گنج، دہلی
مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی

”پروازیں“ اور ”نقشِ جذبات“ جناب ملک راج شاعر بے نام کے شعری
مجموعہ کے کلام ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعری
صرف جذبات کی شاعری ہے۔ مبارک ہیں جناب بے نام کے جذبات و
احساسات کہ آج جب کہ انسان ایک شعنی دور سے گزر رہا ہے اور
دن بھر کی مٹاؤں میں سرگرداں ہے تب ان کو اس قبیل کے اشعار کہنے
کی فرصت مل جاتی ہے۔ یہ
ماستھے پٹھن اور غضب ناک کرے ہے
وہ اپنی نگاہوں سے مجھے جاک کرے ہے

سننے سننے داستانِ دلبری
کوئی پیری میں جراتی پاگوب

ماتھے محبت جواں ہو رہی ہے
کسی کی نظر مہرباں ہو رہی ہے

اس مجموعہ میں قطعات، غزلیں، دوبہ، محبت شامل ہیں۔
جناب بے نام اردو سے محبت کرنے والے ان لوگوں میں سے ہیں،
جنہوں نے اردو زبان کو اپنا اور ہٹا چھوڑنا یا جوہلے آپ خود
ہی شمع، خود ہی پروانہ اور خود ہی آئین ہیں۔ وہ اپنی منزل کے خود
ہی راہی اور خود ہی رہبر ہیں۔ ان کا لہجہ انہوں اور گیتوں کا ایک سدا بہار
گلدستہ ہے، جسے وہ ہر خاص و عام تک پہنچا دینا فرض سمجھتے ہیں۔
ان کے کلام میں نئی لطافت اور زبان و بیان کے حسن کی کمی چاہے محسوس
ہو، مگر ان کے خیالات کی پاکیزگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔
(ذکی طسارتی)



افسر کڑی

خوبی و فتنہ کا نر افسانہ ہے
 کہ دیارِ دہلی کا قولِ عشقِ کرم ہے
 آسمانِ تہمت پر داز سے کہ دور نہیں
 اس قتل خانے کے شکار ہے
 نام کی آوازِ نابھی و دھنک
 تو مکتبہ و جب غیا پور سے غنڈہ کس
 کس کی پانڈیہ کا منقلب و رشتہ جی
 باڈی سے باندھ دیا ہے رشتہ داری
 دھوکہ دینا پر پانڈیہ کا خیال
 سر پہ دھنک پر پانڈیہ کا خیال
 فتنہ دار کے ہتھے ہی چلے جاتے ہیں
 دل کے قاتل میں چھپتا ہے
 خود دوست میں چھپتا ہے
 وقت پر دھوکہ دیا ہے
 دھنک کس نے چھپا دیا ہے
 ہر اہلِ جہم لیا خوب سے افسر کس

رہنوردیاد

تھکا ہوا ہے ایک سافر سفید ریش و چراغ سحری
 نقاشے عالم کے نظروں کو وہ درد و حسرت سے دیکھتا ہے
 سفید چادر ہے وہی بچہ عصا ہے بری ہے دست تل میں
 بدن میں لرزنا قدم میں لرزنا وہ سالی رنگ لک کے رہا ہے
 شکستہ بہت ہے پاؤں خل میں نہ پیش رنار کچھ ہے باقی
 مقیم نہ منزل ہے پھر بھی اپنے سفر کا سالانہ کیے ہوئے ہے
 دل جس ہے جہاں گزیدہ نگاہ گوے جہاں رسیدہ
 جہاں تغیر آتش کی ہر ایک گردش کو سمجھتا ہے
 فریب و نیکی کو کراہی چھل انسان کی حسرتی
 وہ جہد لطف کے دن نالے شباب کی وہ مسین زانی
 شباب دھجھ کا وہ طونہ دل و نظری کہ انظر ارادہ
 بچا ہے پہلی سی یاد ایام، تلخ و شیریں سے اس کے دلیں
 ہے چہرے چہرے سے اس کے ہر ایک والداتہ سیاقا ہر
 برست و مدحوش سخی جوانی جہاں فانی بھی صفا نہ فانی
 گذشتہ کی کیفیتوں کے منظر نظریں لیے ہیں خواب بن کر
 سرود چنگ و رہا ہے سخی تو زندگی کی خراب سستی
 کمال راحت رہ محبت میں ہر مذہب و رسم تھا تو کیا
 یہ کشش میں سخی دلیت رستی نہ دل یہ نگار سناش کاری
 نشاط و فرست کا دور آیا تو دھڑکی باتیں بھی ساتھ آئیں
 کے لہو و لب میں کچھ دن تو زکرب و نقب بھی دیکھا
 تو ام ہو گیا عذاب و راحت ہے زندگی کا یہ ترینہ
 جہاں کی جنگوں کے دل پہ چہرے کی رکت و خون نہرے سے
 تمام حریفہ کی خیریت کے منکر ہے دعویٰ برابری کا
 جو باپ بے میں جھپٹش ہے تو کھال کھائی میں بھی جھپٹش ہے
 یہ خزان آدم پہ پل رسی میں حکومتیں بھی ریاستیں بھی
 جو اہل صدق و صفا بھی مائے تو بارساؤں کے بھید کو
 جو دروہوں کی سخی درست داری تو دشمنوں کی سخی دکھائی
 جو گروہاں کی سخی جہد راحت بدکار سب تھان کی رست
 نظر بہ است و فراز رہہ تو بہت خزان میں نہ لیں بھی
 مقام نہ منزل سے بے خبر ہے تھکن کی دھن میں جارا ہے
 یہ عزم و بہت بجایا ہے لیکن مکت جہاں ہے بدن میں باقی
 سہارا کو کھنکھایا ہے وہ ایک سوکھے ہوئے شجر کا
 ملا بھی سامنے اسے سفر میں تو وہ بھی جگر خزان رسیدہ
 بہار و دھن کی ٹٹ پچی ہے پٹ گیا ہے کٹن زمانہ

شباب خون گشتہ کے ہوتے پھر رہے ہیں کا باغ حوی
 جہاں کے غرت کدے کو نور مگر کے پیم عورت سے دیکھتا ہے
 ہے بہت احوال زندگی کا ہمیں کے ایک انگشتہ تل میں
 "سراغ شاید" کو کمر بند کیا ہے "تھک تھک" کے لئے رہا ہے
 زلف شغوا، نہ چم بیٹا نہ تاب گفت رنجہ سے باقی
 ہے زندگی کی شام لیکن سحر کا سالانہ کیے ہوئے ہے
 نشاط و رنج حیات دیدہ ہے عزم و سر و جہاں چنیدہ
 کچھ اپنی سخی کو جا بخت ہے کچھ کے کچھ دل میں کا پتہ ہے
 وہ آپ اپنی ہی تکدی چینی ہے کر تا حاتمے حکمت چینی
 وہ عشق و لطف و طرب کی باتیں ہیں اکی جیسے ہلکی کی ہیں
 جنوں کی تعلیم ہو شیار کی جرد کی ترغیب جہاں پاری
 گزرتی ہیں نظر کے آگے سے داستان جن کی رنسیں
 اُداس آنکھوں، نہ وہ دل سے ہیں حادثات حیات ظاہر
 نظر میں تصویر بھی جنوں کی لمبوں پہ آفت کی سخی کہانی
 گزرتی ہے عمر و مدت کی جن پہ چھائی آفتاب بن کر
 گناہ کا ہی صواب جب سخی تو جہاں ایمان سخی بہت بخت
 جنوں کا لطف و کرم ہی یکسر خدا کا لطف و کرم تھا تو کیا
 وہ عیش و عشرت میں کھوئے رہنا وہ نرم و باروں میں بارہ فدا
 جو چند دلیں تھیں جانی کی تو کالی راہیں سب تھکائی
 جو رنج و فرقت میں گزری تازہیں فرمنا جس طرب بھی دیکھا
 جو باہم رغبت ہے پاؤں دکھا کسی نے کھسکا کیا ہے زینہ
 جنوں انسان کی جڑ کا رسی تباہ نامی میں جن کے بندھے
 نہ دوستی کا خیال کوئی نہ پاس کوئی برادری کا
 جلا میں گھر بار و دوسروں کے فساد و فتنہ کی وہ تپش ہے
 میں سکر و کرب و دریا پہ بہی یہ مکتیں بھی سائیں بھی
 عفو تھیں مکتیں، کمد تھیں جورد و زام کے دل ٹوٹے
 ادھر جو باہم سخی صلح و الفت ادھر سخی ان بن متا سخی بھی
 وہ مال و دولت، و دار و حمت، وہ جن قدرت بلند حمت
 کسی بھی انسان بھی سفر ہے تو عین آئی ہیں مشکلیں بھی
 نگاہ فرما یہ جم ہی ہے قدم وہ آگے ٹھہر رہا ہے
 جو کئے بہت پھر لکھیے ہوگی بہار باغ و چین میں باقی
 نہ عجول بنے نہ چھاؤں اس میں اکیلا گراں ہے نہ گڑھا
 مشاہیر اس محل کا تھا گویا یہ پیر مر و جہاں گزیدہ
 ازل کے دن سے ہی روشن پرزواں ہے دنیا کا کاغذ

ہے کہ نور حیات جو بھی یہی ہے انجم اس کا آخر
 "جہاں کی خدمت ہے حق پرستی" "ہی ہے بنام اس کا آخر"

دینا نا قسمت — بی ۲ - ۱۸ - ۱۸ سالہ گجراتی دلی

غنیسی

زہیں سے گذر آسمان سے گذر ستاروں بھری کہکشاں سے گذر	خون اُتسیدو آرزو دیکھا دل کا آئینہ لہو لہو دیکھا	میری نگاہ رازِ مخمور، رازِ بھی رازِ دال بھی ہے گو یا لبِ موشِ ہی درد کا ترہال بھی ہے
غلامیں پہنچ، شبنم پروازِ کمر حدودِ زمان و مکال سے گذر	پھول کلیوں سے برسرِ پیکار باغ کا باغ جنگِ خود دیکھا	جوش کے ساتھ پیش ہے، عزم کے ساتھ پیچ میرا مذاقِ زندگی، چری بھی بنے جلال بھی ہے
ستاروں کی دنیا سے آگے نکل گذر گاہِ شعلہ زغال سے گذر	شارخِ غلی بھی تہی ہوئی تلوار غرضِ مزاجوں کو شہِ خرد دیکھا	تجھ کو ملی ہے اکھ تو، دیکھ بھی اکھ کھول کر تیرا رفیقِ رازِ دال، دشمنِ ناگہاں بھی ہے
غمِ دوستان سے مہمنوم ہو دل آزاری دشمنان سے گذر	پتے پتے کا زرد دھت چہرہ کانٹے کانٹے کو سرِ خرو دیکھا	میرا کلام ہے جھلکِ وقت کے رنگِ روپ کی میری نوا بہار بھی امیری نوا خزاں بھی ہے
ہے سرسبز وادی تری منتظر کہستانِ آتشِ دُشال سے گذر	جام دیکھا تو لٹا پھوٹا ہوا مکڑے مکڑے ہوا سب دیکھا	اب تو ادبِ نواز بھی بیچتے ہیں نوازِ شیں اہلِ نغری بے رخی، شوق کا امتحان بھی ہے
عناصر کے غیض و غضب سے نہ ڈر حوادث کے سیلِ رواں سے گذر	جو تصور میں رنگِ کفر تھا اُس تصور کو رُوِ برُو دیکھا	میرے ریاضِ شمعِ پھول ہیں رنگِ رنگ کے خواب بھی ہے، خیال بھی نگر بھی ہے زباں بھی ہے
نہیں کس کو معلوم غالب ہے تو گداہن کے ہرستاں سے گذر	مل کے طالب سے دل بہت غریب جو مسخا وہ ہو ہو دیکھا	غم کی نوا زشات نے طالبِ غم بسا دیا اپنا ہی غم نہیں مجھے، مجھ کو غم جہاں بھی ہے

عزیز

حامدی کاشمیری

مفت ارمیم

عبدالمستین نیاز

ہے برف پوش ہوا ہفت رنگ سائے ہیں
ضروہ وادی زرتاب میں ہم آئے ہیں

طلوع ہونے کو پہ میرے سینے سے سورج
ہوائے لہتیوں کے سب دیئے بجائے ہیں

چمکتے پہتے کہ تیغ و سناں پرستے تھے
زمین نگار رہے شاخوں نے زخم کھائے ہیں

سمندوں کی تہوں میں بٹا ہوا گاہیں ہیں
بتاؤ کس نے ہوا کے ستم اٹھائے ہیں

سحر ہوئی کوئی آمادہ سفر ہی نہیں
سبھوں نے آخر شب اپنے گھر چلائے ہیں

گرچے ہیں نہ برستے ہیں سنگ بستہ ہیں
یہ کیسے گرد کے بادل سروں پہ چھائے ہیں

پھر در سچہ دا ہوا پھر زخم دل کیسا کھلا
”پھر نظر میں بچوں ہیکے“ پانڈ سا چہرہ کھلا

بغض دی اُس نے غموشی کو تسلیم کی زبان
ایک مدت میں کھلا ہم سے تو وہ کیسا کھلا

ہلکا ہلکا سا بدن تھا، ہلکی ہلکی سی نظر
خوب صورت تھا مگر وہ کاغذی چہرہ کھلا

ہے شعور غم کو میرے وسعت دل کی طلب
چشم حیرت کے لیے تو ان ناک صحر کھلا

رات کے تنہا مسافر اکوہ غم کاٹے گا کون؟
یوں تو ہر شاخِ شجر کے پاس ہے تیشا کھلا

ٹیس اٹھتی ہے تو رگ رگ میں ہجرت ہے غم
کچا کھانچتا غائب نے کہ زخم اچھٹ کھلا

اڑھ لی میں نے بدن پر سبز نمیندوں کی روا
اے برسے سپنے سنہرے، آہری آنکھوں کیا

نیم کی شاخوں سے چھپتی حامدنی تو یہی رہی
میں تو پیکر کا ہوں قائل تو مجھے پیکر دکھا

بیٹھ میرے ساتھ مجھ سے گرمی احساس لے
ایک دن سبزے پہ لٹھی دھوپ نے مجھ سے کہا

تیلیاں رنگوں بھری پھولوں سے تھیں لٹی ہوئی
اور پھر موسم نے آنکھیں بند کر لیں کچھ نہ سمجھا

اپنے نیچے پانڈ کر رکھو نشین مت بناؤ
آندھیاں ہی آندھیاں ہیں سلسلہ در سلسلہ

اب یہ کچھ بتا دے دل کے گھاؤ کیوں اچھے ہوئے
بچوں گل جاتے اگر خوشبو سے بھر جاتی تھا

● موتی پارک، بھوپال

● تم موتی طویلہ اندھ ۲۰۰۳ء

● ۳۹۱۔ جواہر نگر، سری نگر (جنرل کثیر)

غزلیں

مدحت الاخر

جھوٹ میں تھوڑا سچ ملا دیکھوں
چاہتا ہوں نہیں خفا دیکھوں

عشق میں کچھ ہوس بھی شامل ہے
دوست میں تیرا راستہ دیکھوں

دُور سے دیکھتا پسند نہیں
یعنی اس کے قریب جا دیکھوں

اس سے مل کر بدل گیا کتنا
لاؤں میں آج آنسو نہ دیکھوں

تیری آنکھوں میں مجھ کا کتنا شک
زندگی بھر نہ آنسو نہ دیکھوں

● نیا گودام کامٹی، انجیر راولپنڈی ۱۹۱۰ء

رونقِ شہری

اُچھے احباب خوش گیتیاں چھوڑ دوں
میں کہاں اپنی بے چینیاں چھوڑ دوں

بے ارادہ سفرِ شہر کی سیلِ رواں
ریت پر ہر طرف کشتیاں چھوڑ دوں

تو نہ ہائے اگر من کے تالاب میں
اس میں بلی ہری پھلیاں چھوڑ دوں

ساتھ چلتا ہے سایہ کوئی دھوپ میں
اس کو برسات میں اب کہاں چھوڑ دوں

تو بھی بادل کی خوشبو کو رکھ باندھ کر
میں بھی کرے میں کچھ تیلیاں چھوڑ دوں

● گول گھڑ، ممبئی ۱۹۲۸ء

اقبالِ شہر

فرار پاز سکا کوئی راستہ مجھ سے
ہزار بار مرا سامنا ہوا مجھ سے

یہ بے ہنر بھی نہیں ساتھ بھی نہیں دیتے
نہ جانے ہے مرے ہاتھوں کو یہ کیا مجھ سے

طویل رستے جس کی کشش سے کٹ جائیں
جلی گئی ہے بہت دُور وہ صلا مجھ سے

میں لوٹنے کے تصور سے خوف کھاتا ہوں
لپٹ نہ سکتا ہوں میرے نفس پر پاؤں مجھ سے

ہزار بار جنم بھی لیا تو کیا اُشہر
مرا وجود بکھرتا چلا گیا مجھ سے

● سکاجی منڈی، کاشمی، ناگپور ۱۹۱۰ء

میزان

جواب دیا۔ "یہ کارنامے غنی خریدی ہے؟" کار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نگاہیں باہر کی طرف رنگ گئیں۔ سڑک اب بھی پانی میں نہانی کھڑی تھی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادلی تیسرے رہے تھے۔

"اس طرف لی ہے؟" دوست نے ونڈا اسکرین پر نظریں جمائے بات جاری رکھی۔ "تم بھی ایک گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے؟" اس طرح ہر آدمے میں کھڑے ہونے سے بچ جاؤ گے۔" مشورہ سن کر وہ بے اختیار سکاڑا "تم میرا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہو؟"

"نہیں۔۔۔ میں انتہائی تنہید گی سے کھربا ہوں۔ تمہاری بھلائی کی خاطر۔"

وہ چند لمحوں خاموش ہو کر سچا رہا۔ پچھلے اس کے ہونٹوں پر ایک بھی بھی میسج سکرپٹ اُبھرائی۔ "تہیں تو معلوم ہے گاڑیوں کے دام کتنے بڑھ چکے ہیں اور پٹرول کی قیمت ہم بڑی حالت سے بھی واقف ہو۔ کیا میری حیثیت کا کوئی آدمی ایسا سوچ بھی سکتا ہے؟ اس زمانے میں تو بس جی لینڈیا ہی ایک بڑی بات ہے۔"

"سبھی جیسے گا تو اپنا اپنا انداز ہوتا ہے اور یہ حیثیت و قیمت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میاں حیثیت آسمان سے نہیں اترتی، بنائی جاتی ہے۔"

وہ گھر سے باہر نکلا تو آسمان ابرا کو دھما۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ بہت دیر تک وہ اک ٹوٹے ہوئے مکان کے برآمدے میں کھڑے ہو کر بارش رکنے کا انتظار کرتا رہا۔ کافی وقت گزر گیا، لیکن بارش کم نہ ہوئی۔

وہ پریستان ہو کر بار بار آسمان کی طرف دیکھا رہا۔ اچانک ایک نئی کار برآمدے کے نزدیک آکر رُک گئی۔ وہ کار میں بیٹھے اپنے بچپن کے دوست کو دیکھتے ہی پہچان گیا، جس کے ہاتھ پاؤں اب اینٹ اور پتھر کے تھے اور بیٹ میں سینٹ کی آن گنت بوریاں بھری تھیں۔

"آجاؤ۔۔۔" دوست نے دروازہ کھولے ہوئے اسے آواز دی۔۔۔ ایک لمبی کی بچکا ہٹ کے بعد وہ برآمدے سے اتر کر اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ "میں نہیں اچانک دیکھ کر رُک گیا۔ بارش بہت تیز ہے۔ کسی ضرورت کام سے جا رہے تھے؟" کار ڈرائیو کرتے ہوئے دوست نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ایک ضروری کام ہے۔ تم نے نئے نوٹ خرید لیے؟ بہت دیر تک بارش رکنے کا انتظار کرتا تھا تاہم اس نے تشکر ادا نہیں کیا۔"

شہر کے لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے دوسروں کا ہوش بے ہوا کرتا تھا۔ بیٹھے ہوئے لوگ اسے دیکھ کر اترا نہ آ سکتے تھے۔ اس تعلیم کی وجہ سے بھی کہ اس کے پاس ایک مسیضان تھا، بہت ہی قیمتی میزان، جو کبیر کا پتھر ہونے کا بنا ہوا تھا۔ اس میں جگہ جگہ قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ وہ ہر روز اس میزان کو ہاتھ میں لیے شہر کی سڑکوں پر نکلتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ وہ حق و باطل

صداقت اور غیب صداقت کا اعلان اپنے میزان کی مدد سے کرتا۔ جتنا تھا۔ یہاں تک کوشش ہو جاتی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چلے جاتے تھے۔ شہر والوں کو اس کے فیصلے پر مکمل اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا اس شخص کا میزان کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اُسے خود بھی ابا بایاں جان سے مارا تھا۔ اکثر تنہائی میں وہ اس ترازو کو معیت سبھی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ دراصل اس میزان کے لغز اس کا وجود، اس کی شخصیت، اس کی سستی۔

اک دن یوں ہوا کہ ایک ضروری کام سے جب

• جودیشل میسرٹ، مول کورٹ، مظفر پور، بہار

آٹھ لائیڈ

ت نے ایک ہاتھ سے اشریک منہاٹے،
 سرے ہاتھ سے پانچ سو بیس مارکر سگریٹ
 نے جوئے کھا، تم جانتے ہو میری کیا
 بت تھی؟ میرا ایک سگریٹ دفتر میں
 تھا۔ زندگی بھر افسروں کے آگے ہاتھ
 بھٹکھڑا رہا۔ مرنے وقت اُس نے بہت
 بڑی سی رقم چھوڑی تھی، جو اس نے
 چاکر کمانی سے بچا بچا کر اور میری ماں
 لڑوں سے چھپا چھپا کر جمع کی تھی۔ لیکن میرا
 بہت دُور اندیش انسان تھا۔ اُس نے
 ہمیشہ ایک ہی نصیحت کی، "بلیٹ"
 وہ دولت ہی اس دنیا میں سب کچھ ہے۔
 تیری کیا نگاہ میں پیسے ہیں تو رنگ تیری ٹوپیا
 لے گئے۔ میں نے بات گزہ میں ہانڈہ لی
 کتابوں کو کنارے رکھ کر دھن دولت
 نے میں لگ گیا۔ آج میں بہت بڑا اٹھنیلدار
 ہوں۔ بڑے بڑے انجینئر مجھے دیکھ کر کرسی
 ہانڈہ کھڑے ہوتے ہیں۔ میرے پاس
 ملٹی ہے، موٹر ہے، نوکر چاکر ہیں، میں
 مرے گزرتا ہوں لوگ مجھے رنگ بھری
 ہوں سے دیکھتے ہیں۔ بتاؤ کیا میں ایک
 ایاب آدنی نہیں؟" دو گالیہ نقریں اُس
 جانب مڑ گئیں۔
 "ہاں۔ بہت کامیاب ہو تم۔"
 نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے وہ وقت بھی
 ہے جب تم کیلنس کے جوئے پہن کر ماسے
 بے ہوش تھے۔"
 "لیکن ہمارے پیروں میں تو آج بھی ڈنڈا
 چل رہا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف اشارہ
 تے ہوئے دوست نے دُور دار توجہ لگایا۔
 "ہے تو۔ اور مجھے اس کا مدرم
 نہیں؟ اُس نے انتہائی بے سکون ہنس میں
 مجھے میرے باپ نے وہ فعل نہیں سکھائی
 بارے ماپ نے نہیں سکھائی۔ میں نے کہا ہوں

میں وقت ضائع کر دیا۔

"دیکھو، میں تمہیں ایک گڑ کی بات
 بتاتا ہوں۔ کاروائے نے دوسرا سگریٹ جلا یا۔
 "بتاؤ۔" وہ ہمیشہ گوش ہو گیا۔
 "تمہارے پاس وہ سونے کا ترازو ہے
 نہیں جانتا ہوں وہ بہت قیمتی ہے۔ اس ترازو
 کو بیچ ڈالو۔ بہت اچھے پیسے مل جائیں گے۔
 اس کی جگہ کام چلانے کے لیے ایک نقلی ترازو بنا
 لینا۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ کاروالا اُسے
 انتہائی رازدارانہ طریقے میں سمجھاتا رہا۔ اس دولت
 سے ٹھٹھا کرنا۔ کوئی نشان دار پرس کر لینا۔
 میں پارٹنر بننے کو تیار ہوں۔ لاؤ ملاؤ ہاتھ"
 یہ سب کچھ میں کر چنٹوں کے لیے وہ سکتے ہیں آگیا۔
 کوئی جواب دینے لگا، یوں ہی خاموش، کم مٹم،
 اپنے آپ میں دُور باہر میٹھا رہا۔ اُسے یوں دوس
 ہوا جیسے کسی نے پھرے بازو میں اسے گالی مار دی
 ہو۔

"کیا بات ہے، تم اس طرح چُپ
 کیوں ہو گئے؟" اُسے یوں سکتے کے عالم میں دیکھ
 کر دوست نے ٹوکا۔

"انہیں نہیں۔ کوئی بات نہیں۔"
 پہلو دینے ہوئے اُس نے اپنا اضطراب چھپانے
 کی کوشش کی۔ "دیکھو، ایسا کرو۔ مجھے اسی
 جگہ اُتار دو، ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"
 "لیکن ابھی تو بارش کی بھی نہیں۔"
 کار کی رفتار کم کرتے ہوئے دوست نے حیرت سے
 اس کی طرف دیکھا۔ "تم تو بیگ ہاؤس کے؟"

"میں سیکھنے کا مادی ہوں دوست۔"
 کار کھٹکے ہی وہیے تھا تا باہر کی طرف کوڑ پڑا
 اور تیر تیر قدموں سے فٹ ہاتھ کی طرف بڑھ گیا۔
 اس کا عقلمند دوست کونہ کھوئے، انکھیں کھلا
 اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ کھینکتا ہوا لگا ہوں
 سے اوٹل ہو گیا تو اینٹ، پتھر اور سٹ کے
 اُس سرکب نے ہونٹ کو ڈکڑی سی بھائی، شانے

مولا نے اور کاروائے کے کتے تیزی سے آگے
 نکل گیا۔

ایک شام جب وہ ٹھکانا گھر میں
 داخل ہوا تو بھون کے چہرے ترسے ہوئے تھے۔
 اس کی بوڑھی ماں نے تباہی کو دیکھ کر ہنسے بہو
 پنجا میں چل رہی ہے۔ وہ خاموشی سے سر
 جھکائے اُس کرے میں چلا گیا جہاں بستر پر اس
 کی بوی آنکھیں بند کئے تھے۔ بڑی سختی۔
 نزدیک کی پتے بیٹھے ماں کو گہرائی کوئی نگاہوں
 سے گھور رہے تھے۔ اس نے ٹھک کر بیوی کی
 پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخوار اس وقت بھی تیز تھا۔
 بڑی کی نے بتایا کہ صبح سے گھر میں چرچا نہیں
 جلا کیوں کر انہی ختم ہو چکا تھا۔ بیخبر اُس کے
 لیے نقلی حیرت انجینئر تھی۔ یہ الفاظ سننے کے لیے
 وہ کسی وقت بھی تیار رہتا تھا۔ ماں اناج کے
 ساتھ ساتھ اب دواؤں کا مسئلہ بھی تھا۔ وہ کچھ کہے
 بغیر فوراً ہی گھر سے باہر نکل پڑا۔ شہر میں آگست
 ایسے لوگ تھے، ان سے وہ اپنی پریشانی بیان
 کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے ایسے چند لوگوں کا
 انتخاب کیا جو صاحب حیثیت بھی تھے اور میں
 کے غلوں پر اسے اعتماد بھی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے
 جو کارنس کے گرد جمع ہوتے تھے۔ اس کی مفلحت
 اور سچائی کے مستحق تھے۔ جلدی جلدی راستہ
 لے کر کے اُس نے اپنے ایک شاہکے دھڑا سے پر
 دستک دی۔ "آپ اور اس غیب خانے پر۔
 میری تو قسمت جاگ اچھی؟" صاحب خانے نے
 چپکے ہوئے کہا۔ عزت و احترام کے ساتھ ایک
 آواز سے کہیں میں سما یا اور لیا جاتے ہوئے تھا۔
 "آپ کا جینا پسند کریں گے۔ شرت یا کافی؟"
 "اس وقت تو میں بہت محنت میں ہوں۔
 انشاء اللہ آئندہ بیکر بھی۔" اُس نے زبردستی سکلنے
 کی کوشش کی۔ الفاظ سولے ہوئے حلق میں
 ڈبکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ دو ایک بار کھٹکے مار

میں نے ازل و صاف پہنچے۔ میں اس وقت دروازے
اتہا کی پریشانی میں ہوں۔ آپ کے پاس ایک
خون ہے کہ آیا ہوں۔ اس نے دیکھ لیا ہے۔
”فرمائیے۔“ شہنشاہ نے جلدی سے
اپنے کان آگے جھکا دیئے۔
”مجھے پھر وہ لوں کی سخت ضرورت ہے۔
افشاہ اللہ کے ماہ ادا کو دوں گا۔“

شہنشاہ کا گھلا ہوا چہرہ ایک دم سے گھلا
گیا۔ اس کے چانچ بند تھیں۔ ایک دم سے
پڑ گئے۔ جوت ایک دوسرے سے چپک کر رہ گئے۔
اور انھیں غلامی گھونٹنے لگیں۔ جیسے وہ تیری
سے کچھ سوچ رہا ہو۔ کیا تاؤں آپ نے تیری
اُٹھن میں ڈال دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد
شہنشاہ کی شکل بھی اڑا اُبھری۔ ”پچھلے دنوں
پڑس میں مجھے اتنا اُٹھانا سہنا کر اکرین کر
ڈرتا کر رہ گئی ہے۔ یوں کچھ یہ مکان یہ سالان
نیلام ہوئے ہوتے۔“ دروازہ ڈھکی بات۔
آپ کا حکم سنا انھوں نے آپ کے لیے توکان بھی
حاضر ہے۔ شہنشاہ سا لاش کیسے لے کر آئے۔
”لیکن آپ کے پاس تو سونے کا تاراڑ ہے۔ انھوں
کی مالیت کا۔ پھر پریشانی کیوں؟ اسے
آپ چاہیں تو دوسری بیڑی فرم دے سکتے ہیں۔“
معاذ اور جلیل کا پسلسلہ نہ جانے کہاں جا کر فرمنا۔
کیوں کہ اس شخص نے اپنی گرتی ہوئی صحت کا دیکھا
دنیا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے وہ ایک جیسے سے
اُٹھ کر ہوا۔ اس پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ اپنی
کوشش میں ناکام ہو گیا۔ وہاں سے نکل کر اس
نے دوسرے شہنشاہ کے دروازے پر دستک دی۔
پھر صبر سے اندر جا کر چوتھے کے نام دروازے
کھٹکھٹائے اس نے۔ ”پروردہ اے کہ دروازے ایک
سایہ جواب ملا۔ وہ تھکے ہوئے تھکے تھکے
طرف ٹوٹ پڑا۔ وہ چلتے ہوئے اچانک اس کی
نگاہ اپنی کلاں پر پڑی اور ایک خیال ذہن میں آگیا
کہ طرح کر لگ گیا۔ اس نے اپنی تھری آٹکی اور ایک

قریب کی دوکان میں گھس گیا۔ اپنے مزاج پر
کی نشانی علیحدہ کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس
کی پگھلیں ہنسی ہو گئیں۔ لیکن دروازے اس نے
اپنے آپ پر قابو پا لیا۔
اور کچھ دیر بعد جب وہ گھر پہنچا تو اس
کے باغ میں دو اون کا پیکٹ بھی تھا اور اناج
کی بھریاں بھی۔ ”بچے اُسے دیکھ کر دوڑ پڑے۔“

یہ سب بیکار ہے۔ ایک رات نائے
میں اس کا ذہن سیخ اٹھا۔ کچھ لمبی راتوں سے
وہ ستر پر کڑیں بند رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس
کا ذہن تھک چکا تھا۔ اُن گنت سوالیہ نشان جو
سچن اٹھائے سانب کی طرح کھڑے تھے اور وہ
انہیں بھی ہوئی تھکوں سے گھور رہا تھا۔ یہ عزت
احترام، یہ عظمت و صدفیت بے کار ہے۔ یہ
سب کچھ۔ یہ میں اپنے مورچہ پر ناجائز ہے۔
سب سے بڑا ہے وہ آدمی جس کی بقوری دولت
سے بھرنی پڑتی ہو، جس کا گھڑ میں پیسے ہوں۔
ایمان داری تو ایک بے معنی لفظ ہے۔ کتنے
ناکھ میں وہ لوگ جو خرابوں کو سنبھالنے کے
جیتے۔ ہتے ہیں۔ زندگی کی تنگدستی کچھ اور ہیں،
جنہیں دیکھنے کے لیے دعا انھوں کی تھیں، تھیں
انھوں کی ضرورت ہے۔ تیسری آنکھ جو دوروں
کے گریبان کھانکتی ہے اور ان کی کامیابی کے
ڈھکے چھپے رازوں تک پہنچتی رہے۔ اس
کے اُٹھے ہوئے ذہن نے ایک بار پھر ان ہی باتوں
کو دہرایا جو وہ بچپنی کی راتوں سے سوچ رہا تھا۔
اُس نے ستر اٹھا کر بیتی کو دیکھا جو اس کے پسپلو
میں بے خبر سو رہی تھی۔

اتنے قریب سے دیکھنے پر اس عورت
کے رخساروں کی شکن پیرے کی اُبھری ہوئی
پڑاں کی کچھ اور گماں ہو گئیں۔ وہ خاموش آغوش
ٹھاپوں سے گھورتا رہا۔ دوسرے کمرے میں
بچے خڑائے لے رہے تھے۔ بڑھئی ماں پر آنکھیں

کھانسی کا زورہ پڑا تھا۔ دوسرے میں کسی
آواز کے کتے کے بھونکنے کی آواز اُبھری۔ پھر کئی
کے شہر چلنے لگے اس کا ذہن جاتا رہا۔

صبح سویرے جب کہ ابھی آسمان پر دھواکے
سارے جھلکا رہے تھے، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر
دھیرے سے اُس نے کچن کھول کر سونے کا تاراڑ و۔
نکالا۔ اور در تک صبح کے دھندے میں اسے اٹ پٹ
کر دیکھا تھا۔ پھر اُس نے تاراڑ کو اپنی آنکھوں سے
لگایا، بوسہ دیا اور پھر کانپنے کا حقوں سے ایک
کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لٹکائے دے تھروں
گھر سے باہر نکل گیا۔ سڑکیں ابھی ویران تھیں۔
کچن میں کوئی شخص اُسے مندر یا مسجد کی طرف مارتا
ہوا نظر آیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ہوا چڑی کے لیے
باہر نکل پڑے تھے۔ اپنا مزہ چھپاتے وہ جلدی
جلدی راستے کے تاراڑ اُبھرتی دیر بعد اُس
نے جو دروازہ کھٹکھٹایا وہ ایک مٹا کر گھر تھا۔
سارے دیکھتے ہی حیرت زدہ رہ گیا۔ ”بابو جی“
آپ؟

”ہاں ایک غریبی کام ہے سلیم جی۔“ اُس
نے دھیرے سے کہا۔ ”آپ کچھ وقت دے سکتے ہیں؟“
”آئیے۔“ اندر آجائے۔ ”سارے
سامنے کے گھر اُٹھ گیا اور ایک جیسے کمرے
میں بیٹھا تہہ سے بولا۔ ”آپ نے اتنے سویرے
سویرے کیوں کشت کیا یا کسی سامان کی ضرورت
تھی تو میں آجاتے۔“

”ہیں۔“ اُس نے جھپکے ہوئے بات
شرعی کی۔ ”میں کچھ خریدنے نہیں، بچے آیا ہوں،“
”اچھا اچھا کوئی بات نہیں،“ سارے
سر کو جنبش دی۔ ”آپ نے نکدہ نہیں۔“ اکان داری
اپنا دھرم ہے جی۔ جتنا پیچھے میں کھانوں اتنا
ہی کھروئے میں۔ دیکھتے ہیں کہاں دیکھائے۔“
کپڑا ہٹے ہی تاراڑ دھک اٹھا۔ سڑا کی آنکھیں
بھٹی کی بجلی رہ گئیں۔ وہ چند لمحوں جھپکائے
غیر تاراڑ کو دیکھا تھا۔ پھر باغ میں سے کمر

اٹتا پلٹا رہا۔ ”بابو جی — یہ تو کھرا سونگہ ملاوٹ نام کر نہیں۔“ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد سنا کرے کہا۔ ”اور یہ سہرے جو اسرات بالکل اصلی ہیں۔“ کچھ کہتا ہوں بابو جی آئی عمر بڑھ گئی میں نے آج تک ایسا سندھو مال نہیں دیکھا۔“ میں اسے چینا چاہتا ہوں سیٹھی۔“ اُس نے سخت آواز میں کہا۔ خود اسے اپنی آواز بہت دُور سے آتی محسوس ہوئی۔

”لیکن — سنا کر کچھ سمجھتے تو کم گایا۔“ یہ تو بہت قیمتی ہے جی۔ میں اس کا دام نہیں لگا سکتا۔ بابو جی کچھ پوچھو تو اس دھرتی پر کوئی بھی اس کا مال نہیں دے سکتا۔“

”سیٹھی جی، مجھے قیمت نہیں۔ روپے چاہئیں۔“ وہ غلاؤں میں گھورتا ہوا بولا۔ ”مجھے روپوں کی ضرورت ہے کہ میرے گھر والے اچھا کھا سکیں، میرے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ سکیں، ان کے جسم پر اچھے کپڑے ہوں، میں اپنی بوڑھی ماں کا علاج کسی شے کے ذریعے کرنا چاہتا ہوں۔“ مجھے روپے چاہیں کوئی نہ کرے، میں بیسیاں بوجھتی ہوں۔ میں اس لئے ایک اچھا سا راکا خریدیوں۔ اور اس سیٹھی جی، میں ایک کار لینا چاہتا ہوں کہ مجھے بارش سے بچنے کے لیے کسی ٹوٹے ہوئے برآمدے میں پناہ دینی پڑے۔“ سنا کر کشتی ہانڈھے اسے دیکھتا رہا، مستانہا جب کہ میں خاموشی چھا گئی تو سنا کر اٹھ کر مکان کے اندر دوئی جسے میں گلیا اور تھوڑی دیر بعد جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں نوٹوں سے بھری ایک پتیلی تھی۔

”سیٹھی جی ایک اور مدد کر دو گے؟“ تھیلی اٹھا کر چلتے ہوئے اُس نے سانسے لا زارہ مانہ بے میں سرگوشی کی۔ ”میرے بچے پیش کا ایک ترازو بڑا ہوا بالکل اسی سونے کے ترازو جیسا کہ کوئی بھی دیکھ کر دھکا کھا جائے۔“

”اچھا؟“ کوئی سیڑھی ہاتھ ہے؟“ سندھو سکوڑا۔ نقلی مال بنانے میں تو سہارا جواب نہیں۔

آپ دیکھ لیں اس دودن کا نام انوں کا تیسرے دن ترازو آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔“

”اور ہاں —“ چلتے چلتے وہ ہر شخص کو گایا۔ ”یہ بات کسی اور کو نہ معلوم ہونے پائے۔“ ”جے ٹکر ربو جی — آپ کی محنت ہماری محنت — سنا رنے رخصت کرتے ہوئے اُسے پوری طرح مطمئن کر دیا۔

ان دودنوں میں جیسے اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ گھر جس کے دروازے پر روپائی برسی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے جھٹکا اٹھا۔ بچوں کی بھی کچھ سی آنکھیں روشن ہوئیں۔ اس کی بیوی کے کھانے ہوئے رخصتوں پر ایک بار سہرے نازکی دودھ گئی۔ ہر تہذیبی کو وہ خاموش لگا ہوں سے گھورتا رہا۔

اور کچھ تیسرے دن جب وہ جھٹکا تاجو میں ملا ترازو ہاتھ میں لے کر شہر کے ڈسے چوراہے پر پہنچا تو ہمیشگی طرح اُسے دیکھتے ہی لوگ اس کے گرد جمع ہوئے گئے۔ ان میں جھوٹے بھی تھے بڑے بھی۔ امیر بھی تھے غریب بھی۔ جھوٹے بھی تھے اور کچھ بھی۔ مجمع بڑھتا گیا۔ لوگ بدستور اس کے میزبان کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔

حسب معمول اُس نے ایک اوپے معام پر کھڑے ہو کر میزبان بلند کیا۔ سپر تو کچھ دیر اسے گزشتہ دنوں جیسا محسوس ہوا پھر اچانک جانے لگا ہوا کہ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچانک پیشانی پر پینے کے تختے تختے قلعے نمودار ہونے لگے اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے ترازو کی چمک دمک اچانک مابذ پڑ گئی ہو۔ اس میں جڑے ہوئے لعلی بیڑا چپا ہوئے ٹوٹ کر زمین پر پھرنے لگے ہوں۔ اُسے یوں لگا جیسے ہر شخص، پورے کا پورا مجمع اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے، قہقہے لگا رہا ہے۔ بے شمار نکلیں اس کی جانب اُٹھتی ہوئی ہیں، اُس نے کچھ بولنے کے لیے ہونٹ کھولے، لیکن آواز اُس کے حلق میں گھٹک کر رہ گئی۔ دھیرے دھیرے اُس کی

نگاہیں پکڑ گئیں اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اندر سے مر چکا ہے۔

بقیہ: جنگلی جانوروں کا تحفظ

بقول سرکاری رپورٹی جہاں جنگلات ہوں وہاں کا جانور عالم ان دنوں زیادہ ہوشیار ہو گیا اور سلام شکاری کے قاتل نہیں سمجھتے۔ شکاری اپنے پرست کی تعداد سے دو چار ہوا ترازو یاہذا رکتا ہے مگر سر چری پر اس کا دل دھتا ہوتا ہے گا۔ انہوں نے کہا کہ بعض امریکن غازی اہلی مقدس کا واسطہ نہیں لگتا کیونکہ اہمیت سے جانوروں کی حفاظت چاہتے تھے۔ وہ اصل قدرت سے نا آشنا ہیں کہ شکار پر پوری طرح مابندی لگانا میں حماقت ہے۔ یہ یقیناً ناقابل عمل ہے۔ ان امریکن کی نشاندہی کرنے پر امریکی سٹامپوں نے اپنی زمینوں پر غارتگری کی۔ راست سوری اور اس کے کے جنگلوں میں ہرن کی تعداد بڑھانے کے لیے انہوں نے اس علاقہ میں بڑے بڑے دوسرے جنگلوں میں شکار کھول دیا۔ اور شکاری کے لیے آسانیاں فراہم کر دیں۔ اس کا نتیجہ اچھا نکلا۔ چند جانور جب اسے کوئلے ایک ایک ہرن کر گراں قدر ٹرائی سمجھا گیا۔ مسٹر ڈویل کے مشور کی روشنی میں امریکی راجن کسٹس، ایلی ٹراس، اوکلاہوما، آریزونا، انڈیانا وغیرہ میں ہرنوں کی کشتی۔ مگر کچھ ہرنوں کو شکاری کے لیے بھیبت کر کے قہیہ جائے۔ اور ۳۰ فی صد کے حساب سے تعداد بڑھنے لگی۔ نظام قدرت کے اگر جانور کا ایک کچھ بھی مر جائے تو مادہ جلدی کر ماتی ہے، ورنہ کھانے والے کوئی موسم اپنے بچوں کی موجودگی کی وجہ سے دگر ماتی نہیں ہے۔ یہی حال سامتی نر کے مار دینے جانے پر ہوتا ہے۔ درندوں کی تعداد بڑھانے کے کچھ حاصل نہیں ہے۔ غیر فطری مرتبہ نسل بڑھانے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر گراے۔ اسٹار کرپو لپٹا اور شکاری کا اپنے اور سراسر خاص کہاں نے ایسا مشورہ دیا کہ کھنڈر بائین ٹکس میں شکار کھول دیا جائے۔ ان کے بموجب پرست کی تیسواں ایک ماہ سے دیکھنا رکھنے سے جانور شکاری سے اور کچھ بچا جاتا ہے۔ شکاری اور ماہر لالائے حفاظتی فزس کے درمیان کچھ اور بے تکلف انداز تعلقات بنوا جائے شکار کو قطعی بند کر دیتے ہیں۔ کامیاب کے لیے ایک کشتی مجاہد ہے۔



لکیری

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”کیا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”میں آدمی سے بھرپور انسان بن جاؤں گا۔“

”تو کیا تم اب تک انسان نہیں تھے؟“

”نہیں۔۔۔ انسان تو بہت ہی غیر معمولی“

ذہن، چار سوکھیں اور غیر عادی ہوتا ہے اور میں تو اب تک صرف آدمی تھا۔ ایک نازل آدمی، جس نے دوستی، وفا، شہادت اور انسانیت سے ناظر جوڑ رکھا تھا اور میری اسی دوستی، وفا، شہادت اور انسانیت کے حوالہ پر یقین کرتے ہوئے میرے گہرے دوست نہیں نے زندگی بھر اپنے سے زیادہ مجھ پر بھروسہ کیا تھا، مرتے مرتے اُس نے اپنی سہا اور اپنے بچوں کو میرے حوالے کر دیا تھا اور تب سے میں اپنے دوست کے بیوی بچوں کو اپنا سمجھنے لگا تھا۔

میرا وہ دوست جس نے زندگی کے ہر ادنیٰ بچے میں ساتھ دیا تھا میرے دل کو محبت کے خزانوں سے بھر دیا تھا۔ میں ہر طرف سے غفلت سمجھنے آئے تک کسی کا ہمارے نہیں ملا تھا۔ اتنا چچا پیار۔ وہ دوست جو میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہلا اٹھا تھا ایک صدمہ تک وہ میری آپ بیتی کی کمری کی غناوت کرتا رہا۔

ماستہ چلے، بازار سے گزرتے، میری نگاہوں کو

وہ پڑھتا اور قہقہے سے قیمتی نئے کو اس طرح میرے لیے خرید لیتا جیسے کہ وہ پیریں دوٹکے کی ہوں۔۔۔ جب میں سوچتا کہ میرا یہ دوست اتنا شفیق ہے۔ شاید ماں سے بھی زیادہ۔ باپ سے تو یقیناً سوا۔ تو میں اس کی پوجا کرنے لگا اور وہ تو مجھے دیوتے سے بھی بڑی تیز ماننے لگا تھا۔

ایک دن ہم دونوں ٹہنی بیٹھے تھے۔ چاند آسمان پر تھا۔ ہم دونوں کا منہ داغ دھاوا تھا۔ اُس نے بڑی افسردگی سے چاند کو تاکا۔ میں نے اُسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا سوئے ہو جان، ان کیوں افسردہ ہو گئے؟“

میری حید پر اُس نے زبان کھولی۔

”جانتے ہو میں کتنا بد نصیب تھا۔ کبھی کبھی

یہ خوف سڑا سہا رہتا ہے کہ پھر میں بد نصیب نہ ہو جاؤں۔ میں کبھی میں پیہم ہو گیا۔ میری ماں مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ مجھے چھوڑ گئی۔ میں تنہا ہو گیا۔ اس قدر ہمارے دم گھٹے گناہ تھا۔ نیلین تمہاری محبت نے مجھے دوسری زندگی دی۔ میں ہی اٹھا۔ سوچتا ہوں تم مجھ سے کب بڑے ہو گئے تو کیا ہو گا؟“

”ابنیں میرے دوست۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔

تم میری جان ہر ادارے میں۔ دونوں الگ ہو ہی نہیں سکتے۔ ہو گئے تو دونوں کی موت یقینی ہے۔“

حالے کیا ہوا۔ میرے دوست کا ہارٹ فیل

ہو گیا۔ سہا اور اس کے بچے میرے دوست کی اہمیت میرے سہارے ہو گئے۔ سہا کو سارے خاندان والوں نے چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ اُس نے مجھے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ آج بھی مجھے اپنے شوہر کا دوست کٹھن کر کی جان بھیجتی تھی۔ سہا کے بچے مجھے پا کر اپنے باپ کی موت کو بھول گئے اور سہا نے بھی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا۔ میں اس کا سارا وقت مجھے اور اپنے بچوں کو خوش رکھنے میں گزارتا تھا۔ میں دھیرے دھیرے سہا کے دل کے قریب پہنچ گیا اور ایک دن سہا نے مجھے اپنے غم خیزنے کی جالی سوپ دی، جس میں اس نے اپنی زندگی کا سہارا یہ سجا رکھا تھا۔ اپنے بچوں کے مستقبل کا بھی خیال نہ کیا۔ میرے کہنے پر اُس نے کہا۔

”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ تمہارے لیے میں ایسے کئی خزانے نکال سکتی ہوں۔“

سہا کو کچھ چھپنے میں نہ مناسب کہہ سکتا تھا۔ اور اُسے مجھ کو بھروسہ کر دیا۔ زمانے مجھے غلطی پر راہ دکھائی کہ وہ کیا تھا ہے۔ مجھے قاصد یا سہا کو بے وفا، آکارا۔ لیکن آہستہ آہستہ میرے اند کا آدمی وفا شہادت انسان دوست نہ جانے کہاں رخصت ہو گیا وہ شاید اسی دن سے اُس نے مجھ کو ہاسٹس میں دن میری ماں نے کہا:

● ۱۹۔ لینن ٹرٹ، مکملہ ۱۳، ۱۹۹۰ء

”تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ تو مجھ کو بت سے سٹھو کر کے گا، جو بچوں والی ہے تو پاگل ہو گیا ہے جو ہو گیا ہے آہستہ آہستہ بھول جا۔ میں تجھے پھر سے آواز کروں گی۔ سرسبز باغات تیرے نام کروں گی“

”کیوں ندیم کیوں جاگ رہے ہو؟“
 سہما کی آواز پر میں چونک اٹھا۔
 ”نہیں، بس لیٹ ہی“
 میں نے ہانا بتایا۔
 ”نہیں کچھ تو ہے، جس کی پمڑہ داری کی جارہی ہے“

سہما میرے بستر کے قریب چلی آئی۔ ”دوسری نگاہیں خود بخود ٹھک گئیں۔ وہ افسرہ کی اپنے بستر پر ٹوٹ گئی کچھ دیر بعد اس کی آواز میری سماعت سے منکرائی“

”ندیم، میں دیکھ رہی ہوں اصرار مجھ سے ہو گئے ہو۔ تھک چکی ہوں سہا گئی ہیں۔ تمہارے چہرے پر بھی وہ کیرن نہیں رہی ہیں جنہیں بڑے عرصے میں دیکھتی تھی۔“
 ”اے سہما، میں بدل گیا ہوں۔ میں بدل رہا ہوں۔“
 ”یہی کہنا چاہتی ہوں۔ میں آدھی سے شیطان بن رہی ہوں۔“
 ”ندیم کے تھے مجھے الفاظ سہما کی سماعت سے ٹکرائے تو یہ بھر کے لیے دوچکر گئی۔ لیکن کچھ لمبے عرصے میں ٹھہر کر کہی۔“
 ”تم آدھی سے شیطان بن رہے ہو، لیکن میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ ابلیس فرشتوں کے سردار سے نہیں بنا ہوا۔“

”سہما۔ تم بہت بھولی ہو۔ سوچنا پسندے لوگوں جیسے تمہارے خیالات ہیں۔ تم نہ ہی روایات پر اس قدر یقین رکھتی ہو؟“
 ”ندیم!“
 سہما کچھ دیر بعد اس طرف بولی کہ میں مہجران ہوں

میری امانت نے بھی کیا سبق دیا مجھے! اس دن سے میں بدلے گا۔ اپنی تبدیلی پر میں خوشنود ہوں۔ سہما کی کبھی بھی سوال نہ لگائیں، اب مجھے ملنے لگے کہ نہیں کرتیں، میں اب اس بات سے بھی نفی ہے پر وہ ہو گیا ہوں کہ سہما کے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے اپنی جینوں کو پیسے سے لالہ کر دی۔ مستقبل میں اپنے بچوں کو کس طرح پالے گی؟ مجھ اب کو احساس نہیں ہے کہ وہ جوان ہے، حساس ہے۔ اپنا جانی اور اپنے احساس بھرے دل کو نہ کہاں کہاں بٹھکے گی؟ اس مفاد پرست دنیا میں جب کہ آدمی جو کھڑے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے، وہ کس طرح جے گی؟ اس کے بچوں کا کیا ہوگا؟ میرے مروج دوست کی وصیت، مجھ پر یقین یہ سب اب میرے لیے کوئی ہمتی نہیں رکھتا۔ میرے اندک آدمی مر گیا ہے۔ ایک انسان اب بھرا ہوا ہے، زہر ملا انسان، میں اب تو چھوڑ دوں گا۔ اس کے بچوں کو چھوڑ دوں گا۔ مگر ابھی تو سہما کے پاس کچھ قیمتی چیزات باقی ہیں۔ ابھی کچھ دن اور سہما اپنے قبضہ میں رکھوں اور پھر میری ہی سسرال سے فوت ابھی صرف آفریں ہے۔ سہما کے اندک ابھی تو انتظار ہے جس میں وہ فائز کر کے سب کچھ کھیں گی۔

اتھا۔ میں نے گھر اس کی طرف دیکھا تو سہما کی آنکھوں کو دیکھ کر دل دھڑک اٹھا۔ وہ آٹھ گز سے قریب آئی اور ٹھک کر لیٹی۔

”کائنات کا وجود ہی تبدیلی پر مبنی اور اس سب تبدیلی پر قائم ہے۔ اسی تبدیلی نے ابلیس کو کشت جان بنایا اور دوزخ کو کالی اور جہنم تبدیلی اگر نہیں کچھ اور بنا دے گی تو یہ اچھا طرح سمجھو کہ یہ سوسال پرانے خیالات دروایات پر یقین رکھنے والی بھولی سہما اس کے گرنے والا دلائل سن سکتی ہے یا نہیں سے بچنے والا گرم دکن کا ماحول سن سکتی ہے؟“

سہما نے پہلے یہ اصرار کے اس طرح ہاتھ رکھتی تھی جیسے کہ وہ واقعی بدل رہی ہے، تبدیل ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ نہیں پرچاروں حالت چلتی گرتی میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اب وہ معصوم بچی کی طرح کھڑی تھی اور میرے اندک آدمی آہستہ آہستہ چہرے پر ابھر کر طرف نکال رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا میرا دوست، میری جان، میرا ایمان مجھے خوں خوار غمروں سے غمزدہ رہا ہے۔ ایک طرف میرا دوست ہے جس نے مذکر کے بعد لکھے زندگی دی تھی۔ مجھے کھانا کسے کئے آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف میری ماں دیکھی کا سہما لے میری طرف بڑھ رہی تھی منکرائی ہوئی۔ میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟ مجھے بچاؤ۔

میں اس قدر زور سے چیخا کہ سہما گھر کا کمرہ گئی اور میں اس سے پلٹ کر کچے کی طرف رنڈ لگا۔

● ●

شرح چندہ	
ہندوستان پاکستان دیگرممالک	
سالانہ ۱۰ روپے	۱۶ روپے
دوسالہ ۱۸ روپے	۲۸ روپے
سرسالہ ۲۵ روپے	۳۸ روپے
فی کاپی ایک روپیہ ۱/۵۰ روپیہ ۲۰ سینٹ ۱۵ پائی	

مشعل آزادی (مجلد اول)
 حم سے حلقہ چیمپے
 رنل منیجہ پبلیکیشنز ڈویژن
 پیٹالہ ہاؤس۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

سونے کی گھڑیا

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "آپ کس بجلیکٹ میں

ہیں۔ اسے کب رہی ہیں؟"

"جی۔۔۔ سائیکلو کی میں؟"

شاب نے دکھا اس کا چہرہ گھٹا ہوا رہا۔

صاف و شفاف چہرے پر حیا کی سرخی اُبھر کر اُسے

اور حیا بنا رہی تھی۔ شاب کچھ بولنے کے لیے سوچ رہی

رہا تھا کہ ریشما کمرے میں داخل ہوئے ہوئے بولی۔

"ارے آپ لوگ خاموش بیٹھے ہیں۔ یہ

ناہید بھی بالکل بے وقوف نہ لگی ہے؟"

"اتھارے شفا، تم لوگ میٹھو میں ذرا اپنے

کمرے میں جا رہا ہوں۔ کہتے ہوئے شاب کھڑا ہو گیا۔

شاب کو پاری کے وقت جب ریشما نے

اپنی ہیلیوں کا گھٹا لٹا کر لایا۔

"یہ تقسیم میں ہماری کلاس فیلو۔ یہ صاف

ہیں بی۔ ایڈ کی طالبہ۔ یہ ناہید ہیں جن سے

آپ پہلے ہی مل چکے ہیں۔ اور یہ میں قسم! لی اسے

فائنل کی طالبہ..... شاب نے جھپٹ کر سر ہٹا کر

سب کے سلام کا جواب دے رہا تھا، لیکن اس

کے دماغ میں بس ایک ہی جملہ بازگشت کر رہا تھا۔

"یہ ہیں ناہید جن سے آپ پہلے ہی مل چکے ہیں۔"

اور یہی چہرہ اس کی آنکھوں میں تھیں کر رہا تھا۔

دوسرے دن صبح جب شاب کلینک

جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ریشما اس کے پاس

کچھ دیر ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں ناہید۔ ان سے ملو

یہ ہیں ہمارے بھائی جان اور اگر کوئی کچھ

سے پوچھے کہ تمہیں خدا کی بنائی ہوئی چیز دل میں

سے بے دماغ کیا چیز پسند ہے تو میں کھولنگی

میرے بھائی جان۔ اور بھائی جان یہ میں میری

سب سے عزیز ترین بہن! ناہید بی! میں ان کی

فرسٹ ڈورین آئی تھی اور اب ایم اے میں بھی

ایسا ہی آزاد ہے؟"

ناہید نے طہری سے سلام کرنے کے لیے ہاتھ

اٹھا دیا اور شہاب جو ناہید کے حسین بیکر میں

کھوسا گیا تھا طہری سے سنبھل کر ناہید کے سلام

کا جواب دیتے ہوئے ٹولا۔

"بہت خوش ہوئی آپ سے مل کر۔"

"اچھا چلے، اب ہم لوگ اندر چل کر بیٹھیں۔"

ریشما نے کہا اور تینوں اندر کی جانب چلے گئے۔

ابھی وہ لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچے

ہی تھے کہ کسی کی آواز آئی۔ وہ ریشما کو لپکا کر رکھ

تھیں۔

"ناہید! میں اتنی سے مل کر کبھی آئی۔"

تم تب تک بھائی جان سے باتیں کرو۔ کبھی ہوئی

ریشما اندر چل گئی۔

"نرسین! کبھی؟" شاب نے صوفے کی

آج ریشما کی سالگرہ کا دن ہے

ساڑھے تین بج چکے ہیں۔ پاری کا انتظام

مکمل ہو چکا ہے۔ اب وہ لان میں بیٹھی اپنی

ہیلیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ اچانک اُس

نے دیکھا بھائی جان! وہ کبھی جانے کے لیے

بھاگ چکے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اُس نے دُور

کرگن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھائی جان! آپ کہاں جا رہے ہیں۔ پانچ بجے ہائی کال

ہے۔ میں پاری سے پہلے آپ کو نہیں جانے دوں گی۔"

"مجھے جانے دو ریشما۔ ہمارا اتحاد تو ہمیں

مل ہی گیا ہے۔ اب لوگوں کی پارٹی میں

لوگ کرکیر کر دوں گا۔"

"نہیں بھائی جان! میں آپ کو نہیں جانے

دوں گی۔ میں آپ کو اپنی ہیلیوں سے ملاؤں گی۔"

"اچھا جی میں نہیں جاؤں گا۔ اب تو

خوش ہو۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے

ایک رکشہ آکر ٹوکا۔ اور ریشما بھاگ

طرف بھاگی۔ "ناہید! میں ہمارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

کیوں کہ میں نے تم سے جلدی آنے کو کہا تھا؟"

"ساری (Sari) ریشما مجھے

● ۱۶۔ نیو برج ہوسٹل، دہلی ۱۱۰۵۱

”جہاں جان بتائے، آپ کو ہمارے
میاں کیسی لگیں؟“

”بالکل بے وقت تمہاری طرح“ مسکراتے
نئے جواب دیا۔

”مذاق نہیں جہاں جان بچ بتائے۔
ناہید آپ کو کیسی لگی؟“

”ٹھیک لگی۔ لیکن تم ناہید کو الگ سے
پاؤں چھپی ہو؟“ اس کے سر پر ایک چیت
تے ہوئے شباب نے جواب دیا۔

”بنا دوں گی۔ پہلے آپ سُن لیتے۔ بڑی
خزان اور خوشی لڑکی ہے۔ بزرگوں کا ادب
بھول اور مجبوروں کی خدمت کرنا اُسے

نا اچھا لگتا ہے۔ بے چاری کے والد کی
زی اسکو مل ماسٹر میں۔ اس سے چھوٹے

جانی اور ایک بہن اور ہیں۔ سب بڑھ رہے
ہے۔ لیکن یہ اس نے گھر پر ٹیوشن کر رکھے ہیں۔

کالچ، شام کو ٹیوشن، اپنی پڑھائی اور ماں
بیماری کی وجہ سے گھر کا سب کام۔ لیکن پھر
اہر وقت سکول ہی رہتے ہیں۔“

”اچھا بھئی ماں لیا۔ تمہاری پہلی بہت
ہے۔ لیکن یہ سب مجھ سے کیوں بیان کر رہی ہو؟“

”اس لیے سمجھا جان کہ میں اس کو اپنی
بی ٹی بنا کر چاہتی ہوں۔ میں بہت دن سے

اگر اسی نظر سے دیکھ رہی ہوں۔ بتائیے آپ
یار لڑکے؟“

ریشہ کے اس اچانک سوال پر وہ کچھ گھبراسا
یکل سے جوابات بار بار اس کے ذہن میں لڑکی

اُنہی بات ریشہ کی زبان سے سُن کر اسے تعجب
اور خوشی ہوئی۔

”کیا بات ہے جہاں جان؟ آپ چپ
ہیں؟ کیا آپ کو ہماری پسند سے اختلاف

ہے؟“
”نہیں ریشہ! اسی بات نہیں ہے۔ تمہاری

پند تو ہمیشہ ہماری پسند رہی ہے“
”میں بھی معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔ ریشہ

نے حوصلہ نہ دکھایا۔“ میں آج ہی اتنی سے بات کروں
گی؟

اور رات کو کھانے سے فارغ ہو کر جب
وہ اتنی کے کمرے میں پہنچی تو اُتر وہاں موجود

تھیں تھے، اس لیے اُس نے فوراً بات شروع
کر دی۔

”اتنی کل آپ نے ہماری پہلی ناہید کو
دیکھا کیسی لگی وہ آپ کو؟ اتنی تم اس کو اپنی جہاں

بتانا چاہتے ہیں؟“
”ہوں....“ کچھ سوچتے ہوئے وہ

بولیں۔ ”ابھی لڑکی ہے۔ مگر اس کے والد کیسا
کرتے ہیں؟“

”بہ چارے اسکول ماسٹر ہیں۔ مالی
حالت زیادہ اچھی نہیں، لیکن پھر بھی عزت دار

لوگ ہیں اور ناہید تو بہت نیک لڑکی ہے۔
خوب صورت بھی ہے۔“

”نہیں بیٹی، مجھے اسی لڑکی چاہیے“ جس
کے ساتھ اتنا جھڑپتے جس سے ہمارا گھسر

بھر جائے۔ ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے اور وہ بھی
ایک ذہین اور ہونہار لڑکا ہے، ماشا اللہ! میں

تو کچھ کیش بھی بٹکروں گی تاکہ ان پیسوں سے
شباب اپنے اس مکان کو ڈاکٹر پھر سے اپنی پسند

کا بنائے۔“
”کیا باتیں سو رہی ہیں ماں بیٹی میں؟“

اُنہی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
”ارے یہ آپ کی بے وقوف لڑکی ہے نا

ذرا سی خوب صورتی دیکھی اور پھیل گئی۔ لیکن میری
نظر تو روٹک جاتی ہے۔“

”لیکن بات کیا ہے ریشہ بیٹی؟“ اُنہی
نے اُسے اُٹس دیکھ کر اُسی سے پوچھا، لیکن

اس کے بجائے اتنی نے جواب دیا۔
”شباب کی شادی کا ذکر ہے۔ یہ اپنی کسی بی

کے ساتھ کبھی نہ لکس وہ لڑکی غریب گھر کی
ہے۔ میں تو اسی لڑکی چاہتی ہوں جس کے ساتھ

شان دار جہیز لائے۔ اتنا کہ لوگ دیکھ کر تعجب
کریں؟“

”نہیں بیٹی، مجھے آپ کی رائے سے
اختلاف ہے۔ اگر لڑکی نیک ہے، شریف ہے

ان لوگوں کو پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ جہیز کی
کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کے فضل سے شباب

کی پلٹیں ابھی چلی رہی ہے۔ اگر ان بچوں کی
خوشی ہے تو ٹھیک ہے۔ میں بھی مسخوڑ ہے۔“

”یہ ہرگز نہیں مرسو۔ اتنی نے سخت آواز
میں کہی وہ دونوں تو بے وقوف ہیں۔ آپ بھی

ان کا ساتھ دینے لگے۔ میں تو رشید صاحب کی
لڑکی کے لیے سوچ رہی ہوں۔ صورت زیادہ

اچھی نہیں، لیکن وہ بہت بڑے ہیں۔ کپڑے
کی تجارت ہے۔ دودھ کا تیل بھی بیٹتی ہیں،

ایک کھلے میں ہے اور چار دوکانیں دلی میں ہیں۔
ابھی برسوں ان کی اہلیہ آئی تھیں کبھی نہ تھیں

سعودی؟ اب سے کپڑے دھوئے ان کے شین اور
چھ صدقائیں بیٹی کے جہیز کے لیے منگائے ہیں۔

فریج، ٹیلی ویژن اور فریج کو دینے کے لیے سکوٹر
پہلے ہی خریدا جا چکا ہے۔“

”لیکن بیٹی، کیا ایسا ہو جہیز کے لالچ میں
جھنس کر بعد میں آپ کو بچپنا پائزے۔ میں ابھی

شادیوں کے خلاف ہوں۔“
”آپ تو ہمیشہ ہماری بات کی مخالفت

کرتے ہیں۔ لیکن میں سوچ چکی ہوں میں وہی رشتہ
کی بات کروں گی؟“

”بیٹی آپ کی مرضی؟ ایک ٹھنڈی سانس
بھرتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔ اور ریشہ بے چاری

دوبارہ صورت لیے ہوئے واپس چلی گئی۔
دوسرے دن صبح شام کے بھلائی نے

شباب سے بات کی۔
”بہا شادی ریشہ نے تم سے بھی ناہید کہنے

بات کی ہو، لیکن میری ملائے نہیں ہے، اس لیے کہ میں صرف ظاہری صوبہ صوبائی کی فائل نہیں ہوں۔ بلکہ میں انجام پہ نظر رکھتی ہوں۔ اس لیے جاری کے والدین اسے کچھ چیز بھی تو نہیں دے سکتے۔ میں رشید صاحب کی لڑکی کے لیے بات کروں گی۔

”اچھی جیسی آپ کی مرضی ہو، لیکن میں چیز کے خلاف ہوں۔“ بھیجی ہوئی آواز میں شتاب نے کہا۔ ”خدا کا دیا ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور پھر دیکھی کے ساتھ ساتھ چیز کی بھی خواہش کرنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔“

”ضمیمہ ہے بیٹے۔ لیکن میں اسے چیز کا مطالعہ نہیں کروں گی بلکہ وہ خود ہی سمجھ رہے ہیں۔ ان میں کچھ پیش رقم دینے کی طرف ضرور ان کا ذہن متوجہ کر دوں گی۔“

”اچھی آپ مجھے معاف کیجئے گا، لیکن کیا یہ مطالبہ انسانیت اور شہادت نہیں معلوم ہوتا کہ ان باپ کے لیے ان کی سب سے عزیز ترین شے اور سب سے قیمتی چیز یعنی ان کی بیٹی اُسے وہ آپ کو دے رہے ہیں اور آپ اُس کے ساتھ ان سے کیشن رقم بھی حاصل کرنے کی امید کریں؟“

”شاب بٹیا تم ابھی بچتے ہو۔ دنیا کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہو۔ دنیا میں آنکلی تو یہ ہو ہی رہا ہے اور کچھ لگن اُن کی قیمتی چیز لاپری ہوں تو میں پناہوں میرا بھی تو اُن کے سپرد کر رہی ہوں۔“

”اچھی“ میرے اور آپ کے خیالات میں بہت فرق ہے لیکن پھر بھی آپ میری ماں ہیں۔ مجھ پر آپ کو پورا اختیار ہے اور آپ کی مرضی کا احترام کرنا ہمارا فرض ہے۔ نہ چاہتے مجھے کبھی شاب نے ان کے مرتبہ کو کچھ بوسے اُن کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا۔

”یہ آپ نے کیا کیا صحابی جان؟“ اچھی کے جاتے ہی ریشما کمرے میں داخل ہوئی۔ اور اُٹھو

میں اُس صوبہ ہونے وہ سہائی سے لپٹ گئی۔ ”پنگلی وہ ہماری مال میں۔ کسی منتقت سے اُنہوں نے ہم لوگوں کو بلا لیا ہے، ان کی خواہش کو میں رد کر دوں ایسا تو میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔“ بھارتی ہوئی آواز میں شاب نے کہا اور ریشما تو اس میں کامیاب دیکھتی رہ گئی۔

تقریباً دو ماہ بعد رشید صاحب کی لڑکی مون ڈھیر دن چیز اور یکایک ہزار کیشن کے ساتھ شاب کی دہلیں تک اس گھر میں آگئی۔ اچھی کی خوشی کا شک کا نہیں تھا۔ اچھی کامیابی پر نازاں بار بار بھوکے ملائیں لے رہی تھیں۔ ریشما بھی کبھی محبت سے سہائی کے گلے میں یا میں ڈال دیتی اور کبھی تیرے اور کبھی اُن کے بال درست کئے لگتی۔ لیکن یہ خوشی کا زور زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔ چند ہی ہفتوں میں مون اس گھر سے بیزار ہو گئی اور ایک دن شاب سے اُس نے کہا۔ ”میرا دل آپ کے اس گھر میں بالکل نہیں لگتا۔ آپ کو جو کیشن رقم ڈیڑی نے دی ہے، اس سے اپنے کلینک کے قریب کوئی ٹیلیٹ خرید لیجئے۔“

”لیکن یہ مکان ہمارے دادا کے زمانے کا ہے۔ اچھی اور اُنہوں اس مکان کو چھوڑ کر کہیں بٹنے کو تیار نہیں ہوں گے۔“

”تو میں یہ کب کبہ رہی ہوں کہ آپ سب کو لے کر چلے۔ میں ان لوگوں سے الگ ہی رہنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“ شاب نے تیز نظروں سے مون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں یوں ہی..... مجھے اُچھن ہوتی ہے ان سب کی قربت سے۔“

”لیکن وہ فلک تو ہمارے معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے اور مکان بھی کافی بڑا ہے۔ ہمارے پاس میں کمرے ہیں۔ ایک ڈرائنگ روم ہے۔ جب کہ ان میں افراد کے لیے صرف

دو کمرے ہیں۔“

”میں یہ سب نہیں جانتی۔ میں میں الگ رہنا چاہتی ہوں بالکل فری ہیکر۔ مجھے یہ ہر وقت کا بوجھ اچھا نہیں لگتا۔ کبھی ریشما کی سہیلی پلی آ رہی ہے کبھی کوئی بڑھیا اگر اچھی کے پاس غصوں بائیں بنایا کرتی ہے۔“

”یہ سب تو میرے گھر میں ہوتا ہے۔ لیکن میں اچھی کو مصنفہ میں چھوڑ کر الگ رہنے کے لیے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“ جل کر مون نے پوچھا۔

”بالکل آخری اور بالکل۔“

اس وقت تو مون علامہ کا خاموش ہو گئی لیکن اس دن سے اس کی سلطنت ریشما اور اچھی سے کئی گنا بڑھ گئی۔ وہ بات بات پر ان لوگوں کو تھپوٹنے لگی اور ایک دن ریشما سے اُس نے کہا۔ ”ریشما یہ کمرہ جو تمہارے استعمال میں ہے، اسے خالی کر دو۔“

”کیوں سہائی کچھ میں کہاں جاؤں؟“ حیرت سے ریشما نے پوچھا۔

”تم یہی اچھی اُن کے کمرے میں جاؤ۔ میں یہاں اپنی کتابیں رکھوں گی۔“

”میری اچھی سہائی اگر آپ کہتے تو میں

الاریاں خالی کر دوں۔ لیکن کرہ نہ بیچے سہائی۔

اچھی کے کمرے میں میری اسٹڈی (STUDY)

بالکل نہیں ہو جائے گی۔ اس کی آواز بھاری تھی۔

”میں نے کبہ دیا، مجھے بحث نہ کرو۔

آج شام تک کمرہ خالی ہو جانا چاہیے۔“ کہتی

ہوئی مون اپنے کمرے میں لپٹی گئی۔ اور اچھی بوجھ

کی سیب بائیں میں رہی تھیں پس بھوکا سو نہ سکتی

رہ گئیں۔

لاچ سے اُن کے کمرہ ریشما سب سے

پہلے اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ وہ اُس تو بچتی جاتی تھی

اور اپنا سامان اچھی کے کمرے میں لگاتی جاتی تھی

اور رات کو جب قباب کلیک سے واپس آیا تو اس وقت ریشا اُمّی کے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھی۔ شاب اُسے پکارا تو اُس نے کمرے میں بیچ نکلا۔ لیکن کمرہ خالی دیکھ کر وہ خود اُمّی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ریشا کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ اُمّی سے مخاطب ہو گیا۔

"اُمّی ریشا کا کمرہ خالی کیوں ہے؟ یہ سب سامان یہاں کیوں آگیا اُمّی کے حجاب دینے سے پہلے ہی ریشا کی نذر تمام ہوگئی تھی۔ اس نے کہا۔

"سمجھا جان، مجھے اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔"

"ارے کب سے ڈر لگنے لگا ہے؟"

اس کی بات کا یقین نہ کرتے ہوئے شاب نے پوچھا۔

"سچ سمجھا جان، مجھے اکیلے میں ٹھیکرا ہوتی ہے۔ بڑھائی نہیں ہوا پاتی۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ یہ دیکھو میں بتا رہے ہیں عید کا رد لایا ہوں۔ ہم اپنی سہیلیوں کو بھیجتے ہیں۔"

اور پھر ایک دن صبح جب کہ جانے کے بعد مومن نے اُمّی سے بتایا: "اُمّی، کل بُوا نے جاتے وقت کہا تھا آج وہ کام کرنے نہیں آئے گی۔ وہ اپنے بچے کو لے کر اسپتال چلے گی۔"

"کوئی بات نہیں بیٹی، میں تمہارے ساتھ جو بچہ سے موسے لگا کر لاؤں گی۔"

"اُمّی، آپ اس غلط فہمی میں نہ بیجئے کہ میں آپ کے ساتھ کام کرناؤں گی۔ میں نے کبھی اپنے گھر میں کام نہیں کیا۔ میرے ماں باپ نے آنا ہی نہیں دیا کہ میں میری شادی نہیں کی ہے کہ میں آپ کے گھر کا بچہ دیکھوں۔"

ریشا کو کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی، اُمّی کے پاس آکر بچنے لگی:

"اُمّی آج میں کالج نہیں جاؤں گی۔ آپ

نے کبھی میرے سامنے کام نہیں کیا ہے۔ اگر آپ خدا نخواستہ بیمار ہو گئیں؟"

"نہیں بیٹی۔ تم کالج جاؤ۔ اگر کوئی دن مانا نہ آئی تو کیا تم روزنا غنڈ کر لو گی؟"

"لیکن اُمّی، میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔" ریشا نے اپنے آستون پر تجھے ہونے کہا۔

دوپہر کو جب شاب کلیک سے کھانا کھاتے آیا تو ریشا کو دیکھ کر تعجب سے اُس نے پوچھا: "ارے ریشا، آج کالج کیوں نہیں گئیں؟"

"آج طبیعت ذرا سست تھی۔"

"تو ہم سے دو کیوں نہیں ملے۔"

مجھے لگتا ہے تم اپنی بڑھائی کی طرف سے لاچار ہوئی جا رہی ہو۔ اپنا کمرہ چھوڑ کر تم نے بے وقوفی کی ہے۔ یہاں تیز لائٹ میں آؤ کوئی نہ نہیں آتی، اس لیے تم جلدی لائٹ آف کر دیتی ہو۔ آخر کیا سوچا ہے تم نے؟" ریشا خاموشی سے سمجھاؤ کی ڈانٹ سن رہی۔

تیس دن سے بڑا نہیں آئی تو میرے کمرے کی ڈشنگ بھی نہیں ہوئی۔ صرف ہمارے دینے سے ہی کمرہ صاف نہیں ہو جاتا۔ ہر چیز پر ڈھیر ہوا وصول جمع ہے۔" مومن نے تقریباً جیسے ہوئے کہا۔

ریشا جواپنے کمرے میں مہلتے میں ٹھوکتی مومن کی آواز سن کر اپنی کتابیں بند کر دیں اور بیٹش اور ڈشنگ کمرے کو سچ گئی۔ ایک ایک چیز برش سے صاف کی۔ کمرے کے فرش پر پوچھا لگایا۔

یہی نہیں بستر کی چادریں اور تکیے کے غلاف بدلے گھر کی دروازے کے پردے بھی بدل دیے۔

دو گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد کمرہ داخل آراستہ نظر آئے لگا۔ اس کے بعد وہ شام کا کھانا پکانے اور بی خانانے میں چلی گئی۔

آج ریشا کا راز ٹپنے والا ہے۔ شاب بے صبری سے انتظار کر رہا ہے لیکن ریشا ہمیشہ کی طرح خوش نہیں ہے بلکہ داس داس کی نظر کر رہی ہے۔ آخرا نے ہی شاب جلدی جلدی

ریشا کا رد عمل غمزہ تلاش کرنے لگا۔ پہلے فرسٹ ڈویژن کی فرسٹ میں پھر سینڈویچ میں جب انہیں ملا تو شاب کی بے چینی بڑھ گئی۔ اُس نے دروازہ فرسٹ اور سینڈویچ فرسٹ دیکھ ڈالی۔ جب انہیں ملا تو مجبوراً سختی کی فرسٹ دیکھی۔ اس میں ریشا کا رد عمل غمزہ موجود تھا۔ شاب کو تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ریشا؟ آج تک تم کبھی غمزہ نہیں آئیں اور کبھی ہو گیا؟" ریشا نے کوئی جواب دینے کے بجائے غمزہ چھپی کر لیں اور انھوں سے استعجالی ہو گئے۔

شاب پریٹن پریٹن سامنے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔

"بیتہ نہیں ریشا کرنا ہو گیا ہے، اتنی ذہین لڑکی اور غمزہ ڈڈوڑن۔ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"بڑھائی سے دل بھاٹ ہو گیا ہے۔ دوسری باتوں میں دل لگنے لگے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" شاب نے اُٹھتے ہوئے مومن سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کوئی دل میں مل کر میری برائیاں کرتی تو تم ہی ہر وقت۔"

"نہیں سمجھی۔ وہ ہرگز ایسی نہیں ہیں۔ تم بے کار شک کرتی ہو ادا اُمّی نے تو مجھے کبھی تمہاری کوئی بات نہیں کہی۔"

"میں آپ کو تو ہمیشہ ہماری بات غلط لگتی ہے۔" مومن نے بڑبڑا کر کہا اور سننے۔ آج میری سہیلی کی سال گرہ ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے۔ آپ بیٹے جاکر کوئی تحفہ لے آئیے، لیکن اس کا خیال رہے کہ تحفہ قیمتی ہونا چاہیے۔ ہمارے اچھے بڑے کے مطابق۔"

"اچھا اچھا سمجھی آملے گا۔ پہلے آپ مجھے ایک چائے تو دے دیجئے۔"

"میں نہ لے سکتی ہوں۔ جا کر آپ اپنا تین سے کہنے جس کی ہر وقت طرف داری کرتے ہیں۔"

جنگلی جانوروں کا تحفظ

وہ ملک خوش نصیب میں جو جنگلی جانوروں کی دولت سے مالا مال ہے۔ جانور قدرت کا مبارک تحفہ ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا انسانی فطری ہے۔ قریب قریب ہر جانور کو انسانوں نے پالا، سنبھایا، سکھایا اور ان سے محبت کی ہے مگر ان کی دو باتیں انسان نہ بدل سکتی ہیں ان کی نسلی اور فطری خصوصیت اور نہ ان میں پسند مائل کو مصنوعی طریقوں سے بدلنے کی کوشش کی گئی اور ایک جنگل جانور اس سے کم جنگل ہے بھی مگر اس کے پیچھے یہ ان کی موت ہو گئی اور ان کی فطرت کے سلسلے میں توازن قائم نہ رہ سکا، کیوں کہ جانوروں کے روزانہ کے پروگرام میں وہی حساب سے بدلے رہتے ہیں اور وہ ہر موسم میں جلا کا رہے ہیں۔ فطرت و فطری کام کا جائزہ نہیں۔ سخت دندہ سنی کے پروگرام، عشق و محبت کا پروگرام اور ان کی جھلک کے نئے سب کے سب فطری خواہشات احساس و ادراک کے تحت چلتے ہیں۔ ان میں روزانہ انداز ہی بہت اور رکھتے ہیں۔ قدرتی پیش آنے والی روزانہ اندازوں کو جانوروں میں کر کے تسلیم کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کی پیدا کی ہوئی رضا اندازوں کو وہ قبول نہیں کرتا۔

جانوروں سے محبت رکھنے والوں اور ان کی حفاظت کا دم بھرنے والوں کا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان کے لیے آہنی کے من پسند فطری ماحول کو پیدا کرے یا پرگزاردہ بنائیں مگر ہرگز کوئی مصنوعی ماحول پیدا نہ کریں۔ ہر جانور ماحول سے جھکوں کے ذریعہ انسانی آبادیاں ہیں۔ جنگلی جانور انسانی گاؤں والوں کو، ان کے حیوتوں اور ان کے نوشیوں کو نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ مگر ممالک کے جانور وراثت ان ایک دوسرے کے سلسلے سمجھ کر بالکل ہم آہنگ ہیں۔ ہر جانور کی آدم خوری سے روک دیا گیا ہے جو کہ ان کے چرندوں کے شکار سے ان کی تعداد گھٹتی ہے۔

● گاڑی کا کھنڈ، تھیلے، کھنڈ

آج وہ زمانہ ہے کہ دنیا بھر میں وائلڈ لائف کی حفاظت کے پروگرام ہیں الا قوامی سطح پر چل رہے ہیں۔ بڑے بڑے دانشور ماہرین نے اعداد و شمار فراہم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اعتدال سے زیادہ تحفظ کے بغیر خراب ہیں۔ اعتدال سے مراد یہ فطری زندگی جیسے ماحول میں موت، زندگی اور حادثات کو مٹوانے دینا چاہیے نہ کہ فطری فضا قائم رہنے میں توازن بننا ہے۔ وہ ہر ایسی ایکس کے خلاف ہیں جہاں حفاظت کے خیال سے یا انفراسنیسٹ لٹل کے معیار کو ملحوظ رکھنے کے لیے جانوروں کے شکار کو بالکل بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ کام خیال ہے کہ سب قتل کا قانون کم ہونے لگا اس کو شکاری کے پوچھنے کے کھاتے میں کھو دیا جائے۔ کم از کم ہمارے دس میں جنگلی جانوروں سے متعلق جتنے الزامات ملتے ہیں اس کا ذکر دارشکاری کو سمجھا جاتا ہے۔ جانور پتے نہیں دیتا یا کم دیتا ہے تو شکاری کی وجہ سے جانوروں کی عمریں کم ہوتی ہیں تو شکاری کی دہشت سے جانور بھاگتے ہیں تو شکاری کی وجہ سے۔ حقائق تسلیم کرنے والوں اور دفتری گھوڑے دوڑا جانوروں کی پرورش اور حفاظت کرنے والوں کے لیے اس پہلنے کے سوا دوسرا ہوشیار کیا جاسکتا ہے۔

جہاں وجہ بات کی بنا پر اس معاملے میں غائب خواہ کام یا بی نہیں ہو رہی، ان میں سے چند کا ذکر میں بطور نمونہ پیش کئے دیتا ہوں تاکہ شکاریوں پر کھو جانے والے فضول الزام کے ساتھ ساتھ وائلڈ لائف گمنامی کی کمیوں اور کارکردگی میں سامنے رہے تو صحیح صورت حال سامنے آجائے گی۔ ہمارا دور جو برہنہ رجحان کا دور ہے۔ ہمارا ہر فرد اپنے وجود کو پورا احساس رکھتا ہے۔ مگر ہر ایکس کو لگتی ہے تو ہر کسان ہر جانور اور ہر گاڑی خود اس کا جائزہ لیتا ہے۔ اگر عوام کا اشتراک اور ان کی ضرورتوں کا حصہ ان میں کم کیا نہیں پایا جاتا ہے تو وہ اس کو نقل شدہ بازی تسلیم کر کے بے تعلق ہونا مناسب سمجھتا ہے۔ اور اس اسکیم کے لیے عوام میں پہلے ہی

سے نفعاً بنائی جاتی ہے تو ان کا ذہن اس کے لیے آلودہ رہتا ہے۔ عوام کو اس کا
 دلائل و امر و نہی کے جو جتنی حالاتوں کا ذکر دیوں اور کسی ایسے انسانی سماج کے
 لیے لازمی ہے، اگر کمزور درجہ کی کوئی عقافت دے گی تو ان درجہوں
 کے ظلم و تشدد سے نفعیہ کا بھی بدولت کرے گی۔ ہر نقصان اٹھانے والے کو
 معاف دے گی۔ جسے طویل ہاتھ اور سرکار پر حملہ چاہے گی تو وہ کس انوکھے
 کھیتوں کی فصل پریش چلیں گے اور نقصان کو برا بھلا کہیں گے۔ درجہوں
 اور درجہوں کے لیے جو کرایہ جنگل آنا پر سکون ہوگا کہ وہ وہ ان کے
 اہل کار کو لینا داخل کھجور اس کی حلقہ سے براہ راست کاٹی نہیں۔

ہزاروں کے تعداد اور گنتی تھی۔ حاجی کا نہیں جو محنتی نہیں کرتے جلا کارانوں، بھلائیوں اور خدمتوں کے ہاتھوں ایسا بڑی ہوئی کر سکتے والے ہاں ہاں اور جلی میں گھرے ہونے کی وجہ سے اس میں گھٹ گئے۔ تحقیقاتی کمیٹی پر دست نہ مل سکے کراہم کا مادہ اور کسی کے ذریعہ جب سے رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ سٹر ولیم ٹی۔ ڈوبل، ڈائریکٹر حکم غلط حوالہ دیا کہ اپنے ہلکی کچھڑا بات پر غور کرو کہ اسے کتنی اور ذریعہ موت جو ذوق سے پیش آتی ہے وہ اس موت سے بدرجہا بہتر ہے جو جانوروں کو نہ کر کسی میں یا کسی دندے کے خونخوار پیچوں میں آتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شکاری کو جنگلی جانور ذاتی ہی تعداد میں لیا جائے ہیں جو وہ بھی بھی منافع ہوا ہے۔ جو جنگلی جانور ہر سال مر جاتا ہے وہ دراصل فاضل (سربیس) تعداد ہوتی ہے۔ مینول کا مرنا مر جاتا ہے میں ضروری ہوتا ہے، وہ کسی حالت میں بھی دوسرا سال نہیں کر سکتے تم جنگلی جانور کے شکاری آدمی کو غلاف فریگر کے، مگر وہ دراصل علم حیوانات کے اعتبار سے بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ بقول ان کے جنگلی جانوروں کو شکار کے طریقے کے بارے ان کے محمود علی اننگ (کنزرویشن) کا اچھا طریقہ ہے۔ لٹل ٹیک جنگلی جانوروں کے فاضل تعداد جنگلی رکھ جائے اور شکاری اس پر رنگ انداز سے شکار کیے۔ اپنے اس بیان کی وضاحت کے لیے وہ کہتے ہیں کہ کوئلہ لاف کے نفع سے شکار نہیں کر کے یہ بنیادی اصول کو اپنایا جائیے۔ وہ کہ زیادہ تر جنگلی جانور اپنے ماحول کی نسبت سے تعداد میں زیادہ بننے دیتے ہیں۔ جن کی وہ ماحول پر بدتر نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے قدرتی توازن کے زیاہ تعداد کے بچوں کو اس لیے مرنا ضروری ہے کیوں کہ ڈری کر کے جانوروں نے جنگ بھڑکی ہوئی ہے۔ جبریں غیر اور جانور جانور زیادہ ہونے لگے وہ نسل بڑھ جائے گی اور آدمی کر کے شکاری ڈول ڈول کے جانور شکاری ہی مارتا ہے جو دراصل فاضل اشاک کے ہوتے ہیں۔ ان کو شہر لید کرنا ہے زمینہ۔ قدرتی توازن ان کا حفظ میں دندوں کے پتھریل ہیں، بیماریوں سے، زیادہ مردی اگر کسی جانور سے یا اپنی حالت کی کمی سے یا کسی ایکٹوینٹ سے ہوتی رہتی ہیں۔ شکاری اپنی مٹائی ہر عمر اور ہر سال شکار کرتے ہیں سمجھ اور نہ مارتا ہے سولے چھٹا سال سن اور پانچ سال کے۔



مسئلہ

مسئلہ کا نام زبان پر آتے ہی ایک مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے کہ یہ مسئلہ کیا چیز ہے جس نے کل کائنات کو اپنے احاطہ میں لپیٹ رکھا ہے اور صل ہونے میں نہیں آتا۔ مسئلہ ہو گیا تو مسئلہ رہا اور حل کرنے بیٹھے تو مسئلہ سے مسئلہ پیدا ہوتا نظر آئے گا۔ مسئلہ تو صل نہیں ہوگا۔ البتہ آپ تحصیل ہو جائیں گے یا پھر خدا کی مسئلہ میں جائیں گے۔ مسئلہ کا خالق کون ہے؟ ظاہر ہے کہ مالک ملک کو ہی مالک مسئلہ کیا جانے گا، لیکن قرآنی سے دیکھیے تو مالک ملک خدا کی مسئلہ ہے۔ مالک ملک کے سامنے کائنات بنائے اور پھر کائنات کی بنی ہوئی شکل دیکھیے میں پورے سامان دان گئے۔ یعنی اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے تو قرآن کا سامنا ہوا ہوگا۔ محنت صرف ہوئی ہوگی۔ یا چڑھیلے چڑھے ہوں گے۔ یہ مسئلہ کیوں پیدا کیا گیا یا کیوں کوڑا کیا گیا۔ کس کسی مداخل کو ضرور کیا گیا۔ مالک ملک کو یہ مسئلہ پیدا کرنے کا خیال کیا کیا یا کس طرح آیا اور کیوں آیا؟ یہ ایک ہی مسئلہ آج تک جن میں نہیں ہوا۔ اس ایک مسئلہ پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ بڑے بڑے فلاسفہ، مؤرخ، مصیرح اسکا ٹکڑی مارتے رہے ہیں، فکرمیں مار رہے ہیں اور رچی دینا ملک ملک میں ملتے رہیں گے لیکن یہ مسئلہ میں ہوگا۔ مسئلہ تو صل جیسا کہ جو پہلے مسئلہ کے خالق کا مسئلہ حل ہو چکے

● محمد ولی خان، لاہور، پنجاب

بنایا گیا ہے کہ مسئلہ سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے مسئلہ کے خالق کا ہی مسئلہ حل نہیں ہوا تو کائنات کا مسئلہ کس طرح حل ہو۔ بات اتنی تو ہم بھی میدان میں کوڑی اور خالق مسئلہ سے ملاقات کا مسئلہ بن گیا انٹرویو میں، لیکن خالق مسئلہ سے ملنا بھی تو ایک مسئلہ ہے۔ فی الحال خالق مسئلہ اور مسئلہ کا کائنات کو چھوڑ دینے اور آگے قدم بڑھانے۔ لیکن ذرا غور کریں۔ ایک بات یاد آئی۔ مالک کائنات نے ایک مسئلہ پیدا کیا۔ وہ آدم اور حوا کی شکل میں نمودار ہوا۔ انہیں کس بات سے متنبہ کیا۔ انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ مالک ملک نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور انہیں عرش سے فرش پر دھکیل دیا۔ پھر کیا تھا مسائل کا لامتناہی مسئلہ شروع ہو گیا۔ بات تو معمولی تھی۔ یعنی مالک کائنات انہیں جھڑک دیتے، سزا دیتے، سمجھا دیتے۔ لیکن گناہوں سے کہ مالک کائنات اور آدم نے مل کر کائنات کو مسائل میں اٹھانے کا نقشہ تیار کیا اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب انسان سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا تو وہ مالک کائنات کے حضور میں حاضر ہو جاتا ہے اور سربسجود اپنے مسئلہ کو پیش کرتا ہے، اور پھر گرد گرد مائیں کرتا ہے۔ مالک کائنات وہاں کہاں۔ مسئلہ کو حل کرے۔ لیکن مالک مسئلہ کا رخسہ دیکھیے کہ نہ جانے کب سے مسئلہ پیش ہو رہے ہیں اور نہ جانے کب تک ہوتے رہیں گے، لیکن مالک مسئلہ ایک بھی مسئلہ

حل نہیں کرتا اور مسائل میں پھنسے لوگوں کو اپنے حضور میں حاضر بھی رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی آج تک حل نہیں ہو سکا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن ایک جماعت ایسی بھی ہے جو مالک ملک کو عرف مالک کائنات عرف مالک مسئلہ کے وجد کو ہی نہیں مانتی۔ نہ ملنے۔ مالک ملک کو پرواہ ہی کیا ہے۔ مرزا کو تب سے کہ وہ جماعت مسائل میں نہ اٹھے۔ محققین کی رائے ہے کہ جتنے مسائل اس جماعت نے پیدا کیے ہیں اور جتنے مسائل میں یہ لوگ خدا بھیجے ہوئے ہیں اتنے مسائل کسی ان کے ہوا ہی نہیں۔ مگر ہم ان کے مسائل میں کیوں اُٹھیں؟ چھوڑ دینے آگے قدم بڑھائیے۔ یہی تو یہ بھی بہت نہیں لگ رہا ہے کہ وہ جماعت کون کی ہے؟

آپ خود ہی فرمائیے بات کس موضوع سے شروع کر دیں۔ ہر ملک کا مسئلہ ہے، ہر شہر کا مسئلہ ہے، ہر گاؤں کا مسئلہ ہے، ہر مکان کا مسئلہ ہے، ہر فرد کا مسئلہ ہے۔ چلتے بچتے کی زندگی سے شروع عات کرتے ہیں۔ بچہ پہلے نہیں ہو، مسئلہ یہ مسئلہ تو سنا چڑ ہے کہ کھڑے تباہ و برباد کر دیے۔ بچہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ مگر کاہنہ کیم پیسے آئے۔ چنانچہ دوسری بیوی لگئی۔ پہلے آئے لائے کا مسئلہ۔ آئے لائے پہلے پہل بیوی کو مٹانے کا مسئلہ آئے چھوڑنے کا مسئلہ۔ دوسری بیوی کے بچہ ہو گیا تو پہلی بیوی مسئلہ اور دوسری بیوی آئے پلاس کے بچہ نہ ہوا اور پہلی کے ہو گیا تو دوسری بیوی مسئلہ۔ دونوں کی اپنی بچے پلانا ہوئے

بقیہ: سونے کی گڑیا

اور شاہ مجبوراً گھر کر لیا اس کے پاس
جالے لگا، لیکن کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس
کے قدم خود بخود ٹوٹ گئے۔ رشتہ اور اہل میں آہستہ
آہستہ کچھ باتیں ہوئی تھیں۔ شاہ کو مون کی کچی
ہوتی بات یاد آگئی۔ اور وہ کان لگا کر دہلی کھڑا
ہو گیا۔

"میری بچی، میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔
متنبہاں شہر ڈوڑیوں کے لیے میں ہی ذمہ دار ہوں۔
کاش میں نے تمہیں کالاج کے کسی عزیز دل کے
شاہد کی شادی کی ہوتی لیکن میں نے بات سمجھ میں
نہیں آتی کہ تم وہیں کی سب زیادتیوں کو خاموشی
سے بردہائی ہو۔ شاہ سے سکین چھپائی ہو وہیں
ختم سے کہہ خانی کو روایا کسی کی ذمہ داری بھی اپنے
سر لے لی۔ اے گناہ خیز بھروسے ساتھ کام
کروانے کے لیے تم نے اسکول سے ناخدا کیا اور شاہ
سے طبیعت کا بہانہ کر کے اُس کی ڈاٹ بھی سن
لی۔ اب تنہا ہی محنت کی خراب ہوئی عاری ہے۔"
"اجی، مجھے اپنی پرواہ نہیں۔ مجھے تو یہ فکر سنا
ہے کہ آپ لوگوں کی مصیبت کا سہارا کون ہے؟ اور ان میں
سہائی جان سے مسیح اس لیے نہیں بتائی کہ میں
نہیں جانتی ہوں کہ میں آگ میں ہم لگا لگا ہے میں اسی
میں آؤں بھی جھٹکے کیے ڈال دیں۔ کم از کم انہیں تو
خوش رہ لینے دیں۔ انہیں خوش دیکھنے کے لیے میں یہ
قربانی آسانی سے دے سکتی ہوں۔ لیکن مجھ سے آپ
کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی۔" وہ سسکیوں سے بھرنے
لگی۔

شاہ اس کے آگے کچھ نہیں سکا۔ اس کا سر
چکراتے لگا۔ دونوں اکتوں سے سرعام کروڑ روپے
سے بیک گیا۔ کاش میری بیٹی نے میری شادی
اس سونے کی گڑیا سے نہ کی کسی دھڑکتے ہوئے
دل والے انسان سے کی ہوتی!

کر لے کا مسئلہ۔ پسینہ نہیں ہے تو پیسے کا مسئلہ۔ پڑی
کے گھر میں شیل وٹن آگیا۔ اپنے گھر میں شیل وٹن
لانے کا مسئلہ۔ پہلے حکومت بنانے کا مسئلہ پھر حکومت
چلانے کا مسئلہ۔ حکومت قائم رکھنے کا مسئلہ۔
آکا رام گیا رام کا مسئلہ۔ اپوزیشن کا مسئلہ۔ مسکوں
سے بچنے کا مسئلہ۔

"شرع زندگی سے لے کر زندگی کے اختتام
تک مسائل میں سہنا انسان مسائل میں ہی اٹھنا
رہتا ہے۔ ایک مسئلہ سے دوسرا مسئلہ اور پھر مسئلہ
مسئلے میں نہ بچاڑے کھڑے رہتے ہیں اور بالکل
مسکوں میں آسمان پر آرام سے اور تمام مسائل سے
بے نیاز تو کون کے مسائل کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور
لطف سے رہا ہوتا ہے۔

یہ درہا مسئلہ کا ایک پہلو جہاں مسئلہ، مسئلہ ہی
بند رہتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ اس کا مات
میں ایسے انسان بھی ہیں جو مسائل کی پرواہ ہی نہیں کرتے
نہ وہ مسائل پہنچا کرے ہیں نہ مسائل میں اٹھتے ہیں۔ وہ
چاند پر کھنڈی جھپکتے ہیں، سمندر کی تہوں میں اڑتے
ہیں، سر پہ لاک چوٹیوں پر جا کر ناچتے ہیں۔ سمجھو ٹپے
ڈالتے ہیں۔ زندگی کو تماشہ سمجھتے ہیں۔ حرب کھاتے ہیں
خرب کھاتے ہیں۔ شیروں سے بچر جاتے ہیں۔ انہیں
تاقو کر لاتے ہیں۔ جبر سے میں بھرا نہیں
مدعا ہے میں کھٹے ڈراؤنے تنگیوں میں جا کر تنگ
کرتے ہیں۔ جس طرح ملائی نہ کر سکتا ہے وہ
مسائل کو پچھلے ہیں۔ زندگی ان کے اشاروں پر چلتی
ہے ناچتی ہے۔ مسائل ان کے آگے ہاتھ باندھے
کھڑے رہتے ہیں۔

مجھے تصویر کے دونوں رخ آپ نے سامنے
پیش کر دیے۔ اب آپ مسائل میں اُٹھنے یا مسائل
کو اٹھانے یا ان سب باتوں سے بے نیاز زندگی لطف
اٹھانے۔ یہ آپ کا کام یا دوسرے معنوں میں آپ کا
مسئلہ۔ میں تو چلا۔

مسئلہ۔ بچہ پیدا ہونے سے پہلے یہ مسئلہ کہ پیدا
ہو گا گھر پر، ہسپتال میں، اپنے گھر یا گھر سے
کے گھر اور گھر میں۔ یہ بچہ اچھا مسئلہ ہی بنا
تو مردہ پیدا ہو گیا۔ تو مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اگر
نہ پیدا ہوا تو اسے لنگر سے کھانے کا مسئلہ
پاؤں سے تھک سہتا ہوا لنگر سے بچنے
چاہتے ہیں۔ خطی سے چمک ہوئی اور بچہ
یا تو مسئلہ اور اگر کہیں لڑکے کی بجائے لڑکی

یا تو مسئلہ اور لڑکیاں ہی ہوتی رہیں تو مسئلہ
یا مسئلہ کا مسئلہ کہ لڑکیاں ہیں۔ ایک اور مسئلہ
خواب میں آنکھوں میں لڑکیاں ہو گئیں تو کھجے
، دلدل میں جھنسن گیا۔ اور لڑکیاں لائق نہ بنائے
۔ لائق نہ بننے کی صورت میں نا لائق نہ جانے
والدین کا کہنا نہیں۔ انا تو مسئلہ۔ وہ وقت
والدین کا کہنا ماننا فرض تھا۔ اب تو کہنا نہ
رہا ہے، اس لیے مسئلہ اور سخت ہو گیا۔ اسکا
ل جوئے کا مسئلہ۔ پاس ہونے کا مسئلہ۔

لینے کا مسئلہ۔ خوشگوار روز پیدا ہونے سے ہی
نرسا ہو جاتا ہے۔ یہ تو حالت ہے ان کی کہیں
ہو گئی اور ان کی نہیں ہوئی ان کی شادی
جاکر ایک اور مسئلہ پیدا کر رہا ہے۔ وہ
اس کے لیے تنگ کرنے کا مسئلہ۔ طعنے دینے
اور سب ہندو نام یا سکھ اور بڑے بڑے
بنا کر جانے کا مسئلہ۔ پھنس گئے تو خود کو
مسئلہ۔ دیکھا آپ نے۔ اچھی تو سنی سانی
، شہید کے بعد ناندو دیہ۔ ہم تو راستہ
گئے۔ ابھی تو کالاج یا یونیورسٹی پہنچے ہیں نہیں
لج یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا مسئلہ سفارت
سے ہیرا پھیری سے داخلہ لینا تو ہر
نرسا ل کا مسئلہ بھی طبائے نہ کر دی۔ کبھی
رہنے۔ پہلے طبائے استادوں سے ڈرتے
جائتا طبائے سے ڈرتے ہیں۔ نیا مسئلہ۔
پاس کر لیا۔ کاروبار کا مسئلہ۔ لڑکی کا مسئلہ۔
بک لیا، بیک سے اسٹیک سے تو خرچ

نئی کتابیں

مٹی کا مکان (غزلیں)

شاعر: شاہد کبیر

ناشر: اختر کبیر، بہنتراک جہاں شاہ اردو اکاڈمی

پتہ: سیکریتات ہائی، عمر علی روڈ، موہن پورہ، ناگ پورہ ۱۸۰۰۱۳۲۰

سائز: ڈی بی

صفحات: ۸۰ قیمت: ۱۵ روپے

جدید اردو شاعری میں ناکپورا اور اس کے فوان کے تین نام نمایاں ہیں۔ ان میں پہلا نام شاہد کبیر کا ہے۔ دوسرے رونام مدت الاختراذ عبدالمکریم اختر کے ہیں۔ مدت الاختراذ اور عبدالمکریم اختر نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس شعر کو نیا شروع کیا۔ گویا جدیدیت کے دھومو دھماکا ان کے ذریعہ کے ساتھ ہی ان کے نام سامنے آئے، لیکن شاہد کبیر ان شاعروں میں ہیں جو جدیدیت کے پیش رو کے جاسکتے ہیں اور جن کی شاعری کی عمر کم و بیش وہی ہے جو آزاں دہندوستان کی۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کے ذہنوں میں ابتداء اگرچہ جدیدیت کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا لیکن انہوں نے جدیدیت کے ایک یا قاعدہ دھماکا کی شکل اختیار کرنے سے خود سال پہلے ترقی پسندی کی نظریاتی جبر کو قبول کرنے سے انکار کیا اور جن کا ایک نئے نئے آرازی کی اہمیت محسوس کی۔ شاہد کبیر اس جوڑے سے قافلے کے بگے کی صفوں میں دھبی، لیکن سائل ہے ہیں۔

”مٹی کا مکان“ شاہد کبیر کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان غزلوں سے گزرتے ہوئے آپ کی ملاقات ایک ایسے کردار سے ہوگی، جو پہلی نظر میں شاید آپ کو غریباں محسوس نظر آئے۔ اسی سفاک دنیا کی زہرناک فضا میں ماسن لیتا ہوا ایک کردار جس میں غمناک پن بھی ہے کی

اداسی پر موزوں ہے۔ لیکن یہ کردار محض اداسی نہیں کر رہا ہے۔ یہ جینے کی طرح جینا چاہتا ہے۔ ایک سیر پر زندگی اس کا طبع نظر ہے۔ وہ قدم قدم پر جانی تریمتوں سے دوچار ہوتے ہوئے بھی نفس نفس میں روحانی ظفر مندلیوں کی تڑپ بے ہوش ہے۔ اسے حال کی سفاکیوں کا شدید احساس ہے، مگر وہ اس شعور سے بھی بہرہ ور ہے کہ وقت اذان کے لیے ہمیشہ آتا ہے رحم نہیں رہا ہے، اور یہی شعور اسے سفلگی کی طرف سے بھی کبھی خوش گمان کر دیتا ہے، خواہ غمناک گمانی کے یہ وقفے کتنے ہی مختصر کیوں نہ ہوں۔

شاہد کبیر بے لاکھ آظہار کے قائل ہیں، مگر ان کا بہرہ مند بہ آدمی کا بہرہ ہے۔ اس لیے میں ذیل کرکھر ڈرے تجربات بھی ایک عجیبائی آہنگ اختیار کر لیتے ہوں۔

برگ غزل (غزلیں)

شاعر: ابو محمد سحر

ناشر: مکتبہ ادب، ۳۹۔ مالویہ نگر، سہو بال (مدھیہ پردیش)

سائز: ڈی بی

صفحات: ۱۱۲ قیمت: ۱۵ روپے

اردو ادب کے طلبہ نیز سنجیدہ قارئین کے لیے ڈاکٹر ابو محمد سحر کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی کتابیں ”اردو میں تنقید نگاری“ اور ”انتخاب قصائد اردو“ تعصبات کا حصہ ہیں اور کئی دوسری تحقیقی اور تنقیدی کتابیں بھی اس درجہ اعتبار کی حامل ہیں جو ہمارے زمانے میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے یہ بحث کیا ہے کہ اگر کمیر سے لیے تو یہ اکتشاف ہی ہے کہ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے کیا تھا، لیکن آگے چل کر دوسری حیثیتیں ان کی شاعرانہ حیثیت پر غالب آتی گئیں۔ تو ”برگ غزل“ کی اشاعت کا اہتمام کر کے انہوں نے گویا اپنی پہلی محبت کی تجدید کی ہے۔ مگر اس طرح ان کی گزشتہ شاعرانہ شخصیت کا بانیات کا کوئی امکان پیدا ہو سکا ہے، یا نہیں؟ یہ سوال خود طلب ہے۔ یہ غزلیں زبان و سلا کی سطح پر سنجیدہ کاری کی حامل اور انتخاب معائن کی سطح پر خوش ذوق کی آئینہ دار ہیں، ان غزلوں کا شاعر اپنی ادبی رعایت کا شعور رکھتا ہے اور شاعری کے جدید میلانات پر بھی اس کی نظر ہے۔ ہر قسم کے خیالات تک اس کی رسائی ہے اور وہ خیال کو چاہے فانی کے ساتھ

غفلوں کا جامہ پہنا سکتا ہے، لیکن یہ خیالت اس گرمی سے خالی ہیں۔
جس کا سرچشمہ زندگی کا مصنف مطالعہ یا دور کا مشاہدہ نہیں، ذاتی تجربہ
ہو کر رہا ہے۔ زندگی کا ذاتی تجربہ ہی اس کا اصلی انشراح کو بھی ہمیر کرتا ہے۔
جو ذہن و فکر کے دشت میں طے ہوئے نظام کو رد و پذیر کر دیتے ہیں تبدیلی
کر دے۔ غیر رسمی شاعری کی عمارت اسی طے پر تعمیر کی جاسکتی ہے۔ مسلح اور
ہموار زمین پر نہیں۔

”برگِ خزان“ کی غرضیں قاری سے احترام کی طالب ہوں گی۔ اپنے
ساتھ بے تکلف جو جانے کی اہارت اُسے نہیں دیں گی۔
(مختصر سمدیدی)

سحر حرف

شاعر: سحر ہوسٹیا رپوری
ناشر: موڈرن پبلیک ہاؤس، 4۔ گولاماریٹ، دیرگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۳
سائز: ڈی مائی
قیمت: بیس روپے

”سحر حرف“ سحر ہوسٹیا رپوری کی تازہ ترین شعری پیش کش ہے۔
جس میں ایک عمدہ اور گلیاؤں خیز طبع نشاں ہیں۔ سحر صاحب کا تعلق
دماغ اسکول سے ہے اور دماغ اسکول کی جملہ روایات کی پاسداریاں اور
نزاکت خیال ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

یوں تو سحر صاحب طویل اور مختصر دونوں تجربوں میں اپنے فن کے
جوہر دکھائے ہیں، لیکن ان کا سلیان متعمر ہر کی طرف زیادہ ہے۔
”سحر حرف“ میں بھی متعمر ہر کی غرضیں نشاں زیادہ ہیں، جس کی تفسیر
۲۶ ہے اور ان غزلوں کے اشعار بھی طویل و بھر والی غزلوں کے مقابلے میں
زیادہ ہیں۔ متعمر ہر میں سحر کو یہ بین آسان کام نہیں ہے، اس میں غفلوں کی
نہیں بلکہ حرفوں کی ترتیب کرنی پڑتی ہے اور سحر صاحب اس میں پوری طرح
کامیاب رہے ہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ متعمر الفاظ میں بھی خیال کو رپوری
گرفت کے ساتھ ظاہر کر سکیں ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ان کی فرقت کا اس قدر احساس
کتنا سیلا ہے چاند فی کالیاکس

لو سحر! دل ڈٹ گیا
مائے عقدے ہوئے حل

عشق! فرماں روائے ہفت افلاک! آپ کی ہر جہی سے ڈرتا ہے

آج کل کی دہلی

عشق میں سحر گنگی ہی سحر

اب تو اس میں کتاب بھی نہیں

اور یہ اشعار حب خود سحر صاحب کی زبان میں نئے جواں تو دواقتہ
ہیں جاتے ہیں۔ شاعروں میں محنت میں پڑھنے والے اکثر شعرا مے جہری
سامعین کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غالباً ذرا حق گور کر پوری پہلے ایسے شاعر
کئے جنہوں نے محنت لفظ میں پڑھ کر اپنا سکھایا اور سامعین کو سحر
کئے رکھا۔ محنت میں پڑھنے کا فرق کا انداز واقعی دیکھیں اور سننے کے لائق
تھا۔ ذرا حق کے بعد سحر ہوسٹیا رپوری بھی ان کامیاب شاعروں میں ہیں جو
محنت لفظ میں پڑھنے ہوئے سامعین کو ہاندھے رکھتے ہیں اور شاعر و قاری
لے جاتے ہیں۔ سحر کا انداز فرقان سادہ ہی لیکن ان سے خواہجہ کا مضرب
ہے۔

ممکن ہے تا حدیث ادب سحر کی غزلوں میں سے اکثر روایتی کلاسیکی
شاعری سے منسوب کریں، لیکن ہر صورت ان کے کلام میں زبان و بیان کے
مصاب تلاش کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تو محال ضرور ہوگا۔ سحر ہوسٹیا رپوری
کی شاعری پانچواں خیال کرتے ہوئے فارغ بخاری سے بجا طور پر رکھا ہے کہ
”سحر ہوسٹیا رپوری سحر ہوسٹیا رپوری کو شاعر ہے، وہ غزل کا دروازہ شاعر ہے۔
اور غزل کی روایات سے انحراف کیے بغیر اپنا سلیب پیدا کرنے کا فائل ہے۔
اس کے ہاں احساس کی نازکی اور اپنے انداز سے اپنی بات کہنے کا ذہنک موجود
ہے۔“

کتاب بڑے سلیف سے شاعر ہوئی ہے۔ ہر ورق پائے ناز آڈٹ موبد
کے موفک کا نتیجہ ہے، جو بہت دل کش اور بامعنی ہے۔

(رتان ارشد)

محفصل (سوانحی مضامین کا مجموعہ)

مصنف: حسن الدین احمد

صفحات: ۲۱۵

قیمت: بیس روپے

ناشر: ولا کیڈمی، حیدرآباد

”محفصل“ حسن الدین احمد کے تالیف کردہ ۲۹ سوانحی مضامین پر
شتمن ایک مطالعاتی کتاب ہے، جس میں بعض مضامین کا نام میں بعض کم
کار آمد اور بے کار کوئی نہیں ہے۔

حسن الدین احمد اردو تحقیق و تالیف کے دنیا میں انفرادی شاعر ہیں

دسمبر ۱۹۸۸ء

منقولہ کلام کے مؤلف کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کئی کتابیں مقبول خاکوں کے مجموعے "انجمن" کے شریب قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

ذریعہ رجوع کتاب "مغل" ان کی دیگر کتابیات سے اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس میں کئی ایسی تاریخی و تاسیخ ساز شخصیتوں پر مصداقین شامل ہیں، جن پر اس سے قبل اہل قلم کی نگاہ بہت کم گئی ہے اور وہ اپنی دنیا و شخصیتوں اور کارناموں کے باوجود اس خراج عقیدت سے محروم رہے ہیں، جس طرح کا خراج عقیدت حسن الدین احمد نے اپنے مضامین کے ذریعے ان شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ادا کیا ہے۔

سوانح نگاری میں جہاں موضوع کا اہم شخصیت ہونا ضروری ہے، وہاں سوانح نگار کا شخصیت سے متعلق جیتے جزییات کا عالم ہونا بھی ضروری ہے۔ "مغل" کے زیادہ تر مضامین اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مؤلف کو ہر صفت شخصیات کی جزییات کا علم ہے بلکہ وہ ان شخصیات کے گرد و پیش سے اچھی طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ بیان پر بھی خاصی قدرت رکھتا ہے۔

حسن الدین احمد محققین و مولفین کی صف میں کتنے طبع مقام کے مالک ہیں اس کا فیصلہ تو "منصب داروں کا منصب ہے۔" لیکن اس امر سے ان کے کسی قاری کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کے اسی خلوص کی شمع نے بہت سے ایسے چروں کو روشن کیا ہے جنہیں تاریخ نے دھندلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بات اور ہے کہ حسن الدین احمد اپنے خلوص اور راداری کی "زور" میں اکثر ایسے لوگوں کی "مغل" میں دعوت دے بیٹھے ہیں، جن کا ان سے صحیح طور پر تعارف بھی نہیں ہوتا۔ نتیجے میں کئی مضامین "مغل" کی فوس" سے آگے نہیں بڑھ پائے۔ اس کی مثال "مغل" میں سٹل مسخ شیخ مجیب الرحمن اور صاحبزادے پر مضامین ہیں۔ "مغل" کے آغاز میں "ابتدائی باتیں" کے تحت مؤلف کے کئی بیانات "تدریسی لہجہ" کے باوجود ان کی بالغ نظری کے غمازیں۔ کتابت فہمیت ہے۔ کئی جگہ کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ صفحہ ۱۱ پر یہ ترقی ہے اس قسم کی صورتی خرابیوں سے بچا جاسکتا تھا۔ باقی "مغل" معلومات افزا کتاب ہے جس میں یقیناً حسن الدین احمد کے خلوص اور محنت کو دخل ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ایم فاضل)

یادگارِ وحشت (دشتِ صدی کے مرقع پر شائع کیا گیا مجلد)

مرتب : اسحاق رائد
پیش کردہ : ڈاکٹر محمد ایل کونیز وحشت صدی
۶۔ رپن اسٹریٹ، کلکتہ ۱۶

سید رضا علی وحشت (۱۸۸۱ء تا ۱۹۵۶ء) سرزمین بنگال پر پیدا ہوئے۔ وہ ان معدودے چند شعرا میں سے تھے جن کو "اساتذہ سخن کا درجہ حاصل ہوا" اور جنہوں نے اردو شاعری کی مثبت روایات کو غیر اُردو زبان علاقہ میں نہ صرف باقی رکھا بلکہ اپنے شاگردوں کی تیر اور لائق تعداد کے ذریعے انہیں ترستی بھی دی۔

"یادگارِ وحشت" "جنتِ وحشتِ صدی کے موقع پر شائع کیا گیا ایک معلوماتی اور تعلیمی مجلہ ہے جس میں وحشت مرحوم کی زندگی سے متعلق تقریباً ساری معلومات، ان کے شاگردوں کے نام اور ان پر لکھی گئی اساتذہ کی آراء شامل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اجماعاً آبادی، نیاز فتح پوری، شبلی نعمانی اور علامہ شبلی عسکری جیسے بلند پایہ ادباء و شعرا کی آراء اس میں درج کی گئی ہیں۔ وحشت، شاد عظیم آبادی، عزیز گھنوی، مفتی گھنوی اور حضرت مولانا وغیرہم جیسے میوس صدی کے نصف اول کے بلند مرتبہ شعرا کے ہم عصر تھے۔ اگرچہ وہ شاگرد تھے حضرت شمس گلشنی حلف عبدالغفور ناسخ کے جو داغِ دہلی کے شاگرد تھے، مگر وحشت کو کلام غالب سے بے پناہ رغبت اور عقیدت تھی۔ چنانچہ انہوں نے بہت سا کلام غالب غالب کہا اور اس میں نمایاں کام باقی حاصل کی۔ انہوں نے خود فرمایا:

تیرے اندازِ سخن سے ہے یہ ظاہر وحشت
کہ مقدر ہے ترا غالبِ دُوراں ہونا

ذریعہ رجوع مجلہ میں شامل تقریباً سبھی مضمون نگاروں نے وحشت کی "تقلیدِ غالب" کے سلسلہ میں کچھ کچھ لکھا ہے، مگر انھوں نے ان کے رنگِ کلام میں ایک اور چیز تلاش کی ہے اور صحیح تلاش کی ہے۔ وہ ہے کلامِ وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو۔ ان ہی کے الفاظ میں:

"..... رواجِ غزل اور طبعیادِ فکر کے ساتھ وحشت کے یہاں ایک بالکل نئی چیز نمودار ہے، جو اساتذہ متقدمین کے یہاں مغمور ہونے کے برابر ہے۔ یعنی اگر کسی کے ہاں نظریاتی جائے تو وہ غیر ارادی یا غیر محسوس شدہ ہے۔ وحشت کے کلام میں دوسری تمام خصوصیات اور شعری محاسن کے ساتھ نگر و نیاں کا ترقی پسند اندازِ پہلو ملتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت ان کی شاعری کا شباب تھا، شعرا و ادیب کے باب

پندہوں کی اصلاح وضع کرنے کا خیال بھی کسی داغ میں
یا سکتا اس اعتبار سے وحشت کو اگر اردو شعریں ترقی پسندی
کہا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا۔۔۔۔۔ صلتا
ل۔ احمد اکبر آبادی مزید لکھتے ہیں:

”..... شعرو وحشت کا جزو غائب تعزل ہے۔ واردات
مغن وحش و ہرانی گئی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ تو اردو
شعر میں پہلے سے موجود تھا۔ میری نظر میں جو چیز وحشت
کو متاثر بنا دیتی ہے وہ ان کے فکر و خیال کی ترقی پسند
خصوصیت ہی ہے۔ مادی فلسفے میں ہر ذرے سے تخلیقی
مشقت کا مطالعہ کیا جا سکے۔ روحانیت کے معکوس
نے علمی صالح کو راہ نجات کہا ہے اور اس پر ادریت
اور روحانیت کے فلسفے ہم زبان ہو جاتے ہیں۔ وحشت
دور جدید کی مادی ترقی کو دیکھ رہے تھے اور ان
ترقیات کے مخالف و صانع بھی نہیں تھے، لیکن میری
نظر میں ان کے خیال و تصورات کی ترقی پسندی مذہبی تعلیم
کی مصلحہ فہم و ادراک کا نتیجہ تھی۔ وحشت نے سب سے
زیادہ فکر تخلیق عمل پر صرف کی ہے۔۔۔ صلتا

آخر میں ”مالا نہ مرادید“ کے عنوان سے اسحاق رائے نے حضرت
نے ۱۰۰ شعروں کا انتخاب بھی شامل کیا ہے جو مزید دل چسپی اور
کا حامل ہے۔ حضرت وحشت کے شاگردوں، عقیدت مندوں
کے کلام سے محبت رکھنے والوں نے ”جشن وحشت صدی“ کے
زیر قیود و مجاہدات کو کر کے بہت مفید اور دلہائی کام انجام
- اس جشن اور اس مجاہد کو منظر عام پر لانے والے سبھی افراد
وں کی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

طباعت اور کتابت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے اور اسے بلا معاوضہ
لیا ہے۔

ہ سفر۔ سیاحت ماجدی

مولانا عبدالمجید دریا آبادی مرحوم

حکیم عبدالمعوی دریا آبادی

ادارہ اشاعت ماجدی، کلکتہ

۳۶۹ قیمت : ۳۰ روپے

”عمیار سفر۔ سیاحت ماجدی“ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ مولانا
عبدالمجید دریا آبادی مرحوم کے گیارہ اسفار کی روداد ہے، جس میں بمبئی،
بہار (دو اسفار)، جھوپال، حیدر آباد، دہلی (دو اسفار)، کلکتہ، لاہور اور
مدراں (دو اسفار) کے سفر شامل ہیں۔ ان میں سب سے پہلی لاہور کا سفر ہے۔
اس سے قبل مولانا مرحوم سیاحتی ادب میں اپنی دو کتابوں ”سفر حجاز“
اور ”دھاتی ہفتہ پاکستان“ کے ذریعہ قابل قدر امانت فرما چکے تھے۔ زیر قیود
کتاب اسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ اور سب سابق خاصے کی بیڑ ہے۔

مولانا مرحوم کے بیشتر سفر ”سج کے سفر“ ہوتے تھے، اس لیے کہ جمع،
نہروں اور جیسے جیسے ان کی طبیعت کو مسرت نہیں تھی، جو واقعی علمی
زندگی کی گوشہ نشینی کے ضروری بھی تھا۔ خذ قریر فرماتے ہیں:

”..... اس سفر میں ناچ کی کے ہوتے ہیں۔ قومی اور دینیک ملیوں میں شرکت کا معمول
سالہا سال سے ٹک ہے۔ عیدن و ازادوں اور دوسرے کرم و ناؤں کے خذ پر خطا س
ساری مدت میں برابر بیچے کر کلاں یوم سنا ہوا ہے، غلاں کی ساگر ہے غلاں
کی برسی ہے، غلاں لادی کو لٹنے ہے، غلاں دینی کا فرس ہے..... ان خطوط پر
اگر ارکے کا اثر ہمیشہ آشایا ہوا ہے، یہ حضرات ورا بھی غز نہیں فرماتے کہ اگر ایک بار
بھی کسی سبک جیسے کے لیے قدم اہر نکلا تو کچھ جیوں کی نہ کوئی حد ہے نہ نہایت۔
ہر جلسہ اپنی عکرا ام اور فروری۔ وطن کی دہائی ہی دشوار ہو جائے گی اور صدق
کا ہی نہیں کہنا چاہیے کہ خیر کا سارا دانشری بند ہو جائے گا۔ تعینت رتایف
کا کام ہمہ وقتی مطالعہ و اجاڑ ہے اور بلا سکون خاطر۔ سفری نامہ ہوریاں خلقت
کا کجزم، تقریری ہجماں۔ یہ سب اسی کے لیے جو کو باب مقصد حیات کی چمکے
زیر قیاد! کسی بزرگ کی زیارت کرنی ہوئی یا کسی بزرگی عیادت، یا کسی محدود اور
مجید کی کسی کمی میں شرکت، یہی ہے جس کے دعا ایک مدت میں ہیں جو اس تک سفر
کے عہد میں اشتیاق کی گہائی میں پیدا کر سکتی ہیں۔ وہ“

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا مرحوم نے اپنے آپ کو جلیوں جلیوں کی
”زد“ سے محفوظ رکھ کر علمی و ادبی دنیا پر بہت بڑا احسان اس طرح فرمایا کہ اپنا سارا
دلت علمی تحقیقات و تصنیفات میں صرف فرما کر علم و ادب کو مال مال کیا اور
دنیاوی علانی سے خود کو محفوظ رکھ کر خاص عالمانہ زندگی کو ناکم کرنا ہوا وہ ہیں۔

سج کے سفر میں وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کوئی غم ابرا نہ ہو جس میں
علمی و ادبی شغلیت نہ ہو۔ کتاب اور اسان سے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ
منتقل رکھا۔ چنانچہ ان کی بارہ اسفار میں بھی مقامات و مکانات و مناظر سے
زیادہ علم اور اسان کی روداد بیان کی گئی ہے۔ جسے پڑھ کر شہزاد رفیع کا نقشہ
سامنے آئے یا نہ آئے اس پر کبھی علمی و ادبی سرگرمیوں اور دہان سے متعلق عالمان
اور ادیبوں کی شخصیتوں کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔

مولانا مرحوم کا طرز نگارش ایک لطیف دل چسپی اور عالمانہ وقار کے
ساتھ سلاست سے مزین ہوتا ہے۔ وہ بے ضرورت تفصیل سے ہمیشہ اعراض فرماتے
ہیں۔ بلکہ اشاراتی انداز میں صرف ایک جملہ میں وہ سب کچھ چھپ جاتے ہیں کہ ان کا
(دلی ملاحظہ)

خوب

اکتوبر کے شمارے کا سرورق خوب ہے۔ صادقین بلاشبہ فوراً ٹائپل میٹس،
ہیں اور شاعری سے لے کر خطاطی اور آرٹ میں نمایاں مقام پیدا کیا ہے۔ ایہ ایک
تفصیلی مضمون شائع ہو کر آپ نے ان کا حق ادا کر دیا۔
کنز سبین کا اسناد خوب ہے۔ ان کا اپنا مخصوص رنگ ہر سطر سے عیاں ہے۔
”اماموں کا رب“ تقریر تبلیغ ہو کر رہ گیا ہے۔

شفاق احمد ٹوڈی، پورنیہ

توجہ طلب

”آج کل“ بات ماہ کو برصغیر نظر توڑ رہا۔

”نقش بازی ہے کسی کی شوقی قسم پر کا“ سے متعلق جو تصویر برسرِ قلم
چین کی گئی ہے، ایضاً صادقین صاحب کے آرٹ کا اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

”صادقین کی رباعیات“ کے عنوان سے ایک مضمون صفحہ ۱۱ تا صفحہ ۱۲ پھیلا
ہوا ہے، جس کے خالق امام مرتضیٰ نقوی ہیں۔

صادقین کی رباعیات میں نامور رویت، عیب مانید، انعقدت رو کا کا امتحان
کے علاوہ اور بھی خوب نظر آتے ہیں۔

کیا یہی اچھا ہو تاکہ آج کل کے مسیحا کو غمنا رکھنے اس قسم کی بے راہ روی
کی طرف بھی توجہ دی جاتی۔
آرٹا علومی، شبیلہ

دستاویزی حیثیت

بہت بڑے گروہ سے راہبر جاتے ہوئے جو سفر میں وقت گزاری کے لیے دھیکس

ایشالے سے ”آج کل“ کا اکتوبر کا شمار لے لیا تھا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی ہاتھیں دوش
ہو گئیں۔ غالب کا شعر اور صادقین کی تشکیلی شعر نے دو آئینہ کا نقشہ کش رہا ہے۔

جس طرح غالب کی عفت ہے کہ صرف غالب ہی کہہ دینا بہت کافی ہے، بالکل
اسی طرح صادقین کی رقت بھی اب ایسے کہ انہیں مضمون صادقین کہہ کر مخاطب کرنا

پڑ رہا ہے۔ اس قدر دلکش شعر کے لیے صادقین کی سیری مبارکباد دیجیے۔ بہت ہی
سرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔

صادقین کی شوقی تھیل کا یہ سلسلہ نہ صرف ادارہ آج کل پر بلکہ اردو شعرو سخن پر بھی ایک
عظیم احسان ہوگا۔ عبر الرحمن جیتانی صرف غالب ہی کا شمار نہ کرے۔ محدود رہ گئے۔

اور صادقین نے ان کے قدم اٹھانے کے لیے کوشش فرمائی ہے۔
اللہ کرے دورِ قلم اور زبان

(آگے صفحہ ۱۶)



حسن انتخاب

اکتوبر ۱۹۸۲ء کا ماہ نامہ آج کل، نظر توڑ رہا۔ سرورق مسرور صاف
کی تزئین کاری سے مزین ہے۔ آئندہ اس سلسلے کو ضرور جاری رکھیں۔ اس طرح
’آج کل‘ کے وقار اور آرائش میں بڑا خوب صورت اضافہ ہوگا۔ فنی لحاظ سے بھی اسے
اربابِ علم کے حلقے میں قبولیت حاصل ہوگی۔ دیوبند اسٹراک گمشدہ میر کی تلاش
بڑا فخرِ اعظم، مضمون ہے جو ان کے مغربی فلسفہ نفسیات کے گہرے مطالعہ و نتائج کا
آئینہ دار ہے۔

ارشاد جمال نے ”مستیہ اور شلی کے درمیان اختلاف“ کا ٹرس اچھے اور
فلسفہ رنگ میں تحریر کیا ہے۔ اسی طرح امام مرتضیٰ نقوی نے صادقین کی رباعیات
کا جو حقائق پیش کیا ہے اسے پڑھ کر آخر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ کلاش اس کا چیلر
کچھ اور زیادہ ہوتا۔

رسالہ میں اضافی نوئی حصہ بھی بہت خوب ہے۔ آپ کے محسن انتخاب کی داد دیتا
ہوں۔ اس بار محنت و اکرام نظم کی حیثیت سے شکر کھیل رہی ہیں۔ اس ”وقت“ کے
میدان میں بھی بازی اُن جیسے کا ہوتا ہے۔

مظہر وارثی، لاٹھی، ضلع باجوڑ

ابدی زندگی

بہارستان میں اردو کی زندگی ابدی ہے۔ اگر اس کا ثمرت کی گور کار ہو
تو وہ ”آج کل“ کا مطالعہ کرے۔ کیسے کیسے اردو کے علم کا اس ملک میں پیدا ہوئے
ہیں سماں اٹھ اکتوبر کا شمار دیکھا۔ عظیم ہر وہی کا مضمون ”مرثیہ“ پڑھا جلا جاتا
عرض کر رہا ہوں کہ جتنے معلومات میں اس کا کاسب مانا۔ تاہم تحقیق اور تنقید
کا بہترین نمونہ ہے۔ طلباء کے لیے خاص طور سے مفید ہے جیسی طرف سے

آگے صفحہ ۱۶



نائب صدر جمہوریہ شری ایم۔ جلیل اللہ، یکم نومبر ۱۹۷۱ء کو نئی دہلی کے پرگتی میدان میں 'بھارت میں الاقوامی تجارتی میلہ ۱۹۷۱ء کا افتتاح کرتے ہوئے'



ہزارہی منشی وکمل ٹری۔ وان سینٹر، صدر عالمی توانائی کانفرنس نے ۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو نئی دہلی میں مرکزی وزیر برائے توانائی، شری بی۔ شرما سے ملاقات کی۔
توانائی کانفرنس کی بارہوی کاٹھوس نومبر ۱۹۷۱ء میں نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔





سعودی عرب کے نائب وزیر اعظم شہزادہ فہد بن سلطان بن عبد العزیز بن سعود کوئی دہائی میں وزیر اعظم شیخ اندر کا ندھی سے ملاقات
کرتے ہوئے۔



نئی دہلی کے نئی ترقی سکون میں منعقد چٹان کی کتابوں کے میلے کا ایک منظر۔ ۱۳ روزہ عرب وزیر اعظم شیخ اندر کا ندھی بی کیشنر ڈیرین کے ایشال پشتراف لائیں تو
ٹوٹری کے کارٹر پشتراف بی۔ بی ٹاٹا گئے انہیں سعودی کتاب جلا لال کی کتابی کی دو ملین پشترافیں۔

قاری ہے آج کے کو نیا سالے مبارک ہو

ترتیب



ملاحظہ
مقالہ

۲

۵

۱۱

۱۵

۱۹

۲۰

۲۱

۲۲

۲۵

۳۰

۳۳

۳۵

۳۹

۴۳

۴۸

منظر عام

زار علی

غیب ہونی

وفا ملک پوری

شریف پوری - ہونہ رمارہدی

میرزا علی - میرزا علی

م م راجندر

میر راجہ

وہی چہ کار

صوفی اور

تذکرہ ہونی

ای۔ کے پڑھنا / شریعت

اجاز علی احمد / میرزا

حسن ہونی / عابدی

ڈاکٹر مصطفیٰ / کلا علی خان

ڈاکٹر علی شریعت / شارب رونی

عراق علی / شارب رونی

پروفیسر / ہادی / رفقا

ایڈیٹر / ایس۔ بی۔ مہاراجہ / شارب رونی

محمد باقر / ہادی / ہادی

سردار / شارب رونی

سردار / شارب رونی

سردار / شارب رونی

سردار / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

میرزا علی / شارب رونی

نظم

غزل

افسانہ

طنز و مزاح

علاقائی ادب

نئی کتابیں

مکتوبات

اردو کا مقبول عام مصور ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر

راج نرائن راز

سب ایڈیٹر

شوناتھ سیکہ

جلد : ۴۱ شماره : ۶

جنوری ۱۹۸۳ء

پوسٹ ماگہ سہ ماہی

قیمت : ایک روپیہ

آرٹس : محمد چرن اور

پرنسپل : ایس۔ ایل۔ میسوال

اسٹنٹ پرنسپل : ایس۔ آر۔ برہ

اسٹنٹ ڈائریکٹر : ایس۔ آر۔ برہ

مفتاحین : علی محمد کلاپت کاہتہ :

ایڈیٹر : "آج کل" (۱۹۸۳ء) : ایس۔ آر۔ برہ

پیشہ ورانہ : ایس۔ آر۔ برہ

پرنسپل : ایس۔ آر۔ برہ

پرنسپل : ایس۔ آر۔ برہ

پیشہ ورانہ : ایس۔ آر۔ برہ

فون نمبر : ۳۸۰۶۹

ملاحظیات



سپرائیڈ

چار دسمبر ۱۹۸۲ء - نئی دہلی کا نیا ہوا سٹیڈیم میلے صوبی گھاگھی کا مرکز بنا، وہاں جیسا کہ ہندوستان کا تاریخی مذہم و جدید شہر دہلی، نئی اسپرٹ کی کھیلوں کی اختتامی تقریب کا آغاز۔ بھل کی گوج۔ ۵، ہزار تماشاؤں سے بھر چکی کھڑا سٹیڈیم — ان کے فوہ ہائے تحنیں۔ ۳۳ ملکوں کے چار ہزار سے زیادہ کھلاڑیوں کا شانہ نشا، ہم قدم مارچ۔ کھلاڑیوں کے خوشی سے چلتے ہوئے چہرے، اپنی کامیابیوں پر مشادواں، آئندہ کھیلوں میں اپنی کامیابیوں کی امید و آس ہے۔

موسیقی اور پنو پچسٹی رقص کے رنگ رنگ پر وگرام، مختلف بینڈوں کی ڈھنیں۔ ممر و راور دل گرفتہ بناتی ہوئیں۔ سننے کی خوشی، کھیلنے کا علم اور سینول میں سننے کی آس دلوں میں لیے ہوئے کھلاڑی۔ دوستی، رنگ گلت اور سیل جمل کا مثالی نمونہ بنے۔ بلند ہوتے ہوئے جھڑے۔

صدر جمہوریہ گھیا فی ذلی سنگھ، وزیر اعظم شری کشی اندرا گاندھی مرکزی وزیروں، غیر ملکی مندوبین اور اعلیٰ افسروں کی موجودگی۔ کھیلوں کی اختتامی تقریب کے مختلف پروگرام۔ رقاصوں کے ساتھ نوب اسپرٹ کھیلوں کی طمات اپنی رقصی۔ ایکٹر انک بوز ڈپر الوداعی کی گنگ ملگ۔ ہمارے اوتو۔ الوداع — آپ کا شکر ہے۔ اپنی کی جانب سے جوابی شکریہ۔

ایکٹر انک بوز ڈپر شری کی شکل میں نمودار ہوتا اور بھر اور کی طرف نواختا ہوا تو۔ اس کا ہاتھ ہلا کر تماشاؤں کو الوداع کہنا اور بھر غائب ہو جانا۔ پھر صوبے جھگڑا ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اندھے اور دوسرے ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہو گئے، جو ہندوستان کی ان کھیلوں کے انعقاد کی صلاحیت کے ضمن میں گاہے گاہے پیدا ہوئے تھے۔

یہ واقعی بہت بڑا جھنجھکا تھا۔ گورنڈوستان میں ان کھیلوں کے انعقاد کا فیصلہ ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا، تاہم سیاسی نقیب و فرائض میں ان کھیلوں کی تیاری کا کام کی رنڈا رنڈست پڑی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں حکومت بدلی۔ اور اس ضمن میں ایک اور کھیل کی گنجی۔ اور اس کے ساتھ ہی کھیلوں کی تیاری کا کام پھر زور زور سے ہونے لگا۔

اسٹیڈیم تعمیر ہونے تک۔ تنظیمی انتظامات بھی مکمل کرنا تھے۔

بہر حال کوششیں کامیاب ہوئیں۔ مختلف پھل لائی۔ ایشیاد ۱۹۸۲ء کے اوقات میں ایشیاد ثابت ہوا۔ ان میں پہلی بار ۱۲ کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ یہ تعداد اولمپکس میں ہونے والے کھیلوں کے برابر ہے۔ گھڑ سواری، کرکٹ، جینڈ بال اور کشتی لائی، بیچارہ کھیل پہلے بار ان ایشیائی کھیلوں میں شامل کیے گئے۔ مزید یہ کہ سبک شکرا (ملائیشیا) اور کینیڈا (ہندوستان) کو کھیل منظر پر سے غرض سے شامل کیا گیا۔ کشتی لائی کے مقابلے سے پرے کے قریب واقع رام گڑھ جھیل میں اور کشتی ڈھلے کے مقابلے میں ہوئے۔ ان کھیلوں میں ۳۳ ملکوں کے چار ہزار سے زیادہ کھلاڑیوں نے شرکت کی۔ اسے بڑے پیمانے پر کھیل ایشیائی مثال آپ تھے۔ اس کا اندازہ ماضی میں منعقدہ کھیلوں پر ایک نظر ڈال کر بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

تیسرے ایشیائی کھیل کرکوس ہوئے تھے۔ ان میں شرکت کرنے والے کھلاڑیوں کی تعداد ۴۸۹۶ پر بڑھ کر ۱۳۲۲ ہو گئی تھی۔ تہران میں منعقدہ ساتویں ایشیائی کھیلوں میں ۱۶ ملکوں کے ۲۸۹۶ کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ کرکٹ نہ کھیل بیکار میں ہوئے تھے۔ ان میں ۲۵ ملکوں نے شرکت کی تھی۔ اور اب ۳۳ ملکوں کے پانچ ہزار کھلاڑی اور افسران شرکت کے لیے آئے۔

ان کھیلوں کے لیے متعدد اسٹیڈیم تعمیر کیے گئے۔ اندر پتھر ڈنڈا ولسٹنڈیم خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایشیائی کھیر کا پہلا اور دنیا بھر کا تیسرا اسٹیڈیم ہے۔ ایشیائی کھیل کا ڈول کے علاوہ دہلی میں ۱۶ اسٹیڈیموں کی تعمیر و ترمیم کا عظیم کام سر انجام دیا گیا۔ ایک کھیل کا ڈول ہی کو نیچے یہاں پانچ ہزار افراد کے قیام و طعام کا انتظام ہے۔ یہاں ۵۲ مکانات ہیں جن اڑھائی ہزار شہر خانی کے کمرے ہیں۔ وزیر ارا افراد کے بیک وقت کھانے کا انتظام ہے۔ اس کا ڈول کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ

ایسا اچھا اور جدید سہولیات کا حامل کھیل گاڈز مونی میس کی دوسری جگہ تعمیر نہیں ہوا۔

ہندوستان میں کھیلوں کے جدید ترین، الیکٹرانک آلات، اسکو ر بورڈ اور پراسائیڈنٹ آلات، آرڈر فٹ میدان، مصوری سطح والے بیڈمنٹن کورٹ وغیرہ پہلی بار استعمال کیے گئے۔

کھیلوں کی سہولیات کے ساتھ ساتھ ایک نظر کھیلوں کے ماحیا پر بھی۔ ماضی کے مقابلے میں، گھر ہندوستان نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ابھی چین، جاپان، کوریا جیسے ملکوں سے وہ کھیلوں کے میدان میں بہت پیچھے ہے۔

۱۹۸۲ء تک جاپان نے سوئٹے کے ۳۵۳ اور دوسرے نمبر پر اپنے دے کوئی کرنا ۵۸ سوئٹے کے نتیجے حاصل کیے تھے۔ اس وقت تک ہند کے شخص ۴۹ نتیجے حاصل کیے تھے۔

۱۹۷۳ء میں تہران میں منعقدہ ایشیائی کھیلوں پر چینی چھانگے۔ انہوں نے سوئٹے کے ۳۲، کانے کے ۲۸ اور جاپانی کے بھی ۲۸ نتیجے حاصل کیے۔ لیکن چین کے سوئٹے کے متغیر کی تعداد ویز بان ٹکٹس ایران سے کم نہی۔ اس نے سوئٹے کے ۳۶ نتیجے حاصل کیے۔ اس کے بعد بنگال کھیلوں میں چین دوسرے نمبر پر آگیا۔ اور جاپان سر فرست رہا۔ اس نے سوئٹے کانے اور جاپانی کے بالترتیب ۶۰، ۵۹ اور ۴۹ نتیجے حاصل کیے۔ چین نے سوئٹے کے ۵۱، چاندی کے ۵۲ اور کانے کے ۳۴ نتیجے حاصل کیے۔ نویں ایشیائی کھیلوں میں سب سے زیادہ نتیجے ایک بار پھر چین اور جاپان کے حصے میں آئے۔ چین نے سوئٹے کے ۶۱، چاندی کے ۵۱ اور کانے کے ۴۱ نتیجے جیتے جب کہ جاپان نے سوئٹے، چاندی اور کانے کی بالترتیب ۵۰، ۵۱ اور ۴۳۔ ہندوستان آٹھ ایشیائی کھیلوں میں سوئٹے کے ۴۹ نتیجے حاصل کر چکا ہے۔ ان میں سے بیشتر نتیجے ایشیائیکس (جما کی کھیل کور) اور کشتی میں حاصل کیے گئے ہیں۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۲ء میں نوٹ بال میں اور ۱۹۶۹ء میں

بکی میں یہ کامیابی حاصل کی گئی۔

بھارت نے آٹھ میں پندرہ ایشیائی کھیلوں نہایت عمدہ اور معیاری کھیل کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہندوستان کا نویں ایشیائی کھیلوں میں شامل کرنا اور جنوبی کوریا کے بعد پانچواں نمبر پر۔ اس نے نویں ایشیائی کھیلوں میں سوئٹے کے ۱۳، چاندی کے ۱۹ اور کانے کے ۲۵ نتیجے حاصل کیے۔ ۱۱ کی مجموعی تعداد ۵۵ ہے جو بنگال میں ہونے کے کرکٹ کھیلوں کے مقابلے میں بہر حال زیادہ ہے اور ہندوستان کھلاڑیوں کے بہتر کھیل کی پختہ گامی علامت ہے۔ ۱۰ کھیلوں میں ایک ات اور بھی سامنے آئی ہے ہفتہ ماضی قریب کپانی ہائی ایشیائیکس اور سولہ نوں لیے مشہور رہا ہے۔ اب وہ کھیل کے سید الموں اپنا پرچم بلند کرنے لگے۔ گولف، گھڑ سواری اور عورتوں کی بکی میں حاصل ہوئی کامیابیاں اس کی اچھی مثال ہیں۔ عورتوں کی بکی میں معیار کی کہ اس سے ہندوستانی مرکو کھلاڑی بھی سبق سیکھ سکتے ہیں۔ بالخصوص گولی کرنے کے ضمن میں۔ ہندوستان خواتین کھلاڑیوں میں نام ڈی۔ وی۔ ویسٹر۔ اوشا ایشیائیکس کی کامیابی لائق مبارکباد ہیں۔

علاوہ ازیں ان کھیلوں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی ہے کہ سابقہ کھیلوں کے مقابلے میں، اب کہ بہتر میں کہ کھیل دیکھنے میں آئے۔ اس بار آئے، قائم ہوئے۔ ان سے چار ہندوستانی کھلاڑیوں کا ہیں۔ ان کھیلوں سے ایک بات اور بھی واضح ہوگئی، مشرق وسطیٰ کے ممالک فٹ بال کے میدان میں ایک طاقت کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ اب کے مقابلے نے جیتا۔ چاندی کا نمونہ کیت کے حصے میں اور کانے تھوڑے سوویڈیم کے حصے میں آئے۔

نویں ایشیائی کھیل، بہتر و فنی تکمیل کو ان کے ضمن میں اٹھانے کے لیے تمام ملکوں سے آئے۔ ماہرین اور کھلاڑیوں نے دول کھیل کو ترقی دیا۔ پاکستان کے بکی کپتان مسیح اللہ نے بھی بکی کا ہندوستان اور کھیلوں کے انتظام کی تمام تر ثابت اور صلاحیت رکھنا

۵، برس کے تھے۔



مردم گزشتہ کچھ برس سے ہمارے آ رہے تھے۔ وہ ادھر گڑھے کے علاج کے لیے اسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ مردم کے لیے مکان میں ان کی بوجہ اور دو بھیاں ہیں۔ شری رہبر جبر آزادی کے بچا ہوا ہنگامت سنگھ کے انقلابی گروپ کے سرگرم رکن تھے۔ جبر آزادی کے دوران اس انقلابی گروپ کے لاسر میں برطانوی گورنر پریم بھنگنے کا کام شری رہبر کے سرکام تھا۔ شری رہبر گرفتار ہوئے۔ ان پر مقدمہ چلا اور انہیں سزائے موت کا حکم ہوا تاہم بعد میں ایک اپیل کے نتیجے میں انہیں رہا کر دیا گیا تھا۔

شری رہبر کی تعاقب میں متعدد ناول اور سفر نامے شائع ہیں۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "ہنگ پڑش" ہے۔ اس کے ہندی ترجمے کا اجرا گزشتہ ستمبر میں وزیراعظم شری اندرا گاندھی نے کیا تھا۔

شری رہبر کی موت کی خبر سن کر انہما بغزبیت کے لیے آئے والوں میں صدر جمہوریہ ہند گاندھی کی ذل سنگھ، وزیراعظم شری اندرا گاندھی، شری لاجپت سنگھ اور دیگر ممتاز شخصیتیں شامل تھیں۔

صدر جمہوریہ ہند نے شری رہبر کی موت پر انہوں کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تقریبی پیغام میں کہا کہ وہ علمِ حب وطن اور شہیدانہ عظمت کے نیک ترین تھے۔ وہ جبر آزادی کے نذر مجاہد اور سکھ لڑاکوں کے سچے پیروکار تھے۔ وہ مہاراشٹری تھے۔

وزیراعظم شری اندرا گاندھی نے انہوں کے قتل کا کوئی ایک مہینہ شخصیت سے عوام کو ملگایا ہے۔ ●●

بدن نرم لب و لہجہ۔ مگر قوتِ ارادی۔ فریاد سے قوی تر۔ اس کے شاہد بہت پہلے دیکھنے میں آئے جب ہما نکا گاندھی نے ۱۹۴۲ میں مشہور زمانہ "کریک ہندوستان چورس" کے لیے انہیں سپاہیہ کریمی قہب کیا۔ یہ واسنی بڑا اعزاز تھا۔ اس وقت دہلی کی کامبرٹی آڈم میں گاندھی جی کے ساتھ رہے جو نے تقریباً بیس برس جو گئے تھے۔ وہ گاندھی جی کے روحانی وارث تھے۔ گاندھی جی کی طرح دہلی جی بھی غریبوں کی سماجی اصلاح اور بہتری د سکھایا جاتے تھے اور اس کے لیے بار بار کورستان رہتے تھے۔ تلکام میں کسانوں کی خوراک کے بعد سے انہوں نے خود ان کی خرید کرکھائی۔ لوگوں سے ان کی ماضی زمین نقد لینے اور کھیلے ہوئے بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنے کے لیے انہوں نے ساتھ ساتھ پزیرا ریل پیدل ہاتھ کی تحریک بنے بھلے سماج کی حامل رہی۔ موعودہ مردم کے لائق و انصاف۔ مگر دہلی جی کی راست کرداری کے ساتھ اپنے مقصد رہے پروکارا میں رہے۔ جیسے وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اس پر مبنی ثابت قدم رہے تھے۔ اپنی حیات میں دہلی جی نے اپنی سزاوت اور خدمت سے عوام کی زندگی کو ممکن بہتر بنایا۔ ہندوستان اپنے آپ کو اب سے ماہر محسوس کرے گا کہ ان کا راست آجیا ہندو بھاءو سے آج ہمارے درمیان نہیں۔ ان کا فرہہ — "لیک نیونیکہ" بہت سے ہمارے راجوں کو روشن رکھے گا۔

صدر جمہوریہ ہند گاندھی کی ذل سنگھ نے اپنے تقریبی پیغام میں انہیں جبر آزادی کا ایک عظیم موردا قرار دیا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ نے اپنے پیغام میں کہا کہ سماجی اصلاحات کے شعبے میں وہ منفردیت کے انسان تھے۔ وزیراعظم شری اندرا گاندھی نے اپنے پیغام میں انہیں ہما نکا گاندھی کا روحانی وارث کہا۔

اُردو کے صحافی طغتن میں یہ خبر انہوں کے ساتھ چھی جاسے گی کہ دہلی جالندھر اور حیدر آباد سے ایک وقت شائع ہونے والے اردو اخبار "ملاب" کے چیف ایڈیٹر شری رہبر سیسہ ۸۰ رومہ ۱۹۸۲ء کو دہلی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ بمقام

کھیل اپنی جگہ ہیں۔ کھیلوں میں ہاریت کی حیثیت بنتی ہے۔ اہم اور عظیم بات تو یہ ہے کہ اس کی طرف وزیراعظم شری اندرا گاندھی نے اشارہ کیا ہے۔ میں کھیلوں سے آپسی کمال میں جبر سے اور سرنگانی کا اصول پیدا ہوتا ہے۔ مختلف قومیت کے بھگڑوں میں اچھی چوٹی دیتا میں یہ شری رہبر اللہ ان کی بات ہے کہ عظیم ترین بڑا ملک کو نوروزوں نے دوستی کے جذبے سے جمع ہوا ہرسانی طاقت اور مصیبت کے دوستانہ مقابلوں میں حصہ لیا۔

کھیل کیا فائدہ ہونے، گویا میل بھجری اور کھیلوں کا ایک روحِ باب ہمارے ماضی کا ستر اہم ترین گید کھیل کو کی بہتر سہولیات کے فراہمی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو رہنمائی و ترقی میں ان کھیلوں کی کی رہے۔ ان کھیل کی دل کشی اور دلی دل لازی، عوام، منتقلین اور کھلاڑیوں کے کوشش و فریاد کے نقوش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے دل کے نہاں غولوں میں محفوظ ہو گئے ہیں۔

ولوبابھاءو

دہلی بھاءو کے کچھ دلوں تک حیات و موت کی لکھنؤ میں مبتلا رہنے کے بعد، ۱۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ اور اس کے ساتھ ہی ماضی و حال کو ملانے والی بڑی ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی۔



گاندھی جی سے عزت و تہنیتی، شادی کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو۔ راست کردار۔ راست گفتار۔ حقیقت نوا

آغا خان دہلی



حسرت کی غزل کا نشان امتیاز

ہے زبان کھنڈیں رنگ دہلی کی نمود
تجربہ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا
وہ زبان کھنڈوں کی صدیقی اور سنگی کے قابل تھے، مگر ان کی طبیعت ”رنگ دہلی“
یعنی تاثیر اور روزگار کی جانب مائل تھی۔ ایک جگہ دو سات سات کچے ہیں
حسرت مجھے پسند نہیں طرز کھنڈوں
پیر و مود شاعری میں جناب تسلیم کا
نیکون دوسری طرف وہ کھنڈ اور دہلی دونوں مدرسہ ہائے فکر و اسلوب سے
بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں:

رخصتے ہیں عاشقانہ حسن سخن کھنڈوں سے وہ مود سے عرض
اس طرح کی تعداد بیاں حسرت کے یہاں اور بھی لے ہے۔ کبھی وہ اپنی غزل گوئی پر
نازاں نظر آتے ہیں اور کبھی اسے روک کر دے ہوئے اپنے سہل منتی کی طرف توجہ
دلاتے ہیں:

پسند آیا طریقی شاعری تیرا میں حسرت
کہ جب کہنا کبھی کچھ، غزل کہنا بے بدل کہنا

اور

سہل کہتا ہوں مستی حسرت غزل گوئی برا شاعر نہیں
حسرت نے تمام دیر، معنی، غالب، جوش، حقیقہ و طریقی اور نیک کھنڈوں سے
فیض یاب ہونے کا اعتراف کر لیا ہے، لیکن ان کے کام پر دوسرے اساتذہ
سخن کے رنگ کی جھلکیاں بھی نمایاں ہیں خاص طور سے تنقید اور شاعرانہ تعلیم آبادی
کی۔

حسرت بار بار اپنے کام میں ”طرز موتی کی رنگین نگاریوں“ اور ”ترکیب
موتی کی بے رنگیوں کا ذکر کرتے ہیں۔“ ”غیر تقسیم شے بھی وہ اپنے
کام کو وجد آفرینی بناتے ہیں، لیکن دوسرے اساتذہ کے ساتھ حسرت غالب کا نام

حسرت موبائی کی غزل کا مطالعہ اردو غزل کی تاریخ کا مطالعہ ہے۔
میر سے لے کر دارج اور شاہد عظیم آبادی تک اردو غزل کے مختلف رنگ حسرت
کے یہاں جلوہ گر ہیں۔ اردو کے چھوٹے بڑے، قدیم و جدید شعراء کے دواوین کا
مطالعہ اس مشعر و محضن کے کس شعر حسرت نے کیا تھا؟ شاید یہ کسی اور شاعر
نے کیا ہو۔ انہوں نے اپنے رسالے ”اردو کے معنی“ میں دلی اور شاہ حاتم سے لے کر
رضا علی و رحمت مکتوفی تک سب ہی قابل توجہ غزل گوؤں کا انتخاب شائع کیا۔
اور بیہش شاعر مختلف اساتذہ سخن سے انکساب فیض کرتے رہے۔ آج کے دور
میں جب شعراء اپنے علاوہ کسی اور کا کام اس خوف سے نہیں پڑھتے کہ کہیں ان کی
تاریخ تکمیل پر حرج نہ آجائے، حسرت کا یہ اعتراف شاید شعر کا موجب ہو۔

غالب و مصطفیٰ و میر و نسیم و مومن

طبع حسرت نے اٹھا یا ہے ہر اسادے سے فیض

ایک جگہ انہوں نے اپنے استاد امیر اللہ تسلیم کی پیر و دی کا بھی اعتراف کیا ہے۔
پیر و تسلیم ہوں۔ شیدائے انداز و نسیم شوق ہے حسرت مجھے اشاعر حسرت فیض کا
دوسری جگہ انہوں نے قائم کے طرز سخن کی تقلید کا بھی ذکر کیا ہے:

قائم ہے ترے دم سے طرز سخن قائم کچھ وہ کہان حسرت یہ رنگ غزل دلی
فاری شعرا سے بھی فیض یاب ہونے کا اعلان کرتے ہیں:

اردو میں کہاں ہے اور حسرت یہ طرز نسیمی و نفیسی
حسرت نے نسیم کھنڈوں کے آگے دلائے تلمذ تہ کیا تھا جو نسیم و طریقی کے شاگرد
تھے اور نسیم کو مومن کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ اس طرح حسرت کا سلسلہ
کھنڈوں سے دہلی تک پہنچتا ہے۔

لے کے علاوہ اسے باقاعدہ فیض یاب ہونے کا ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ
بہرہ و گنجائش کے لیے جو خیالات و مضامین کا تعلق ہے، حررت نے
غالب سے دیا ہے کسی اور سے استفادہ نہیں کیا۔ "کلام غالب کی شرح" سے
بھی اس کا مثبت ثمر ہے کہ وہ غالب سے بہت متاثر رہے ہیں، یہ چند مثالیں
کا کافی ہوں گی:

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے ۸
غالب

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیسا چاہتا ہوں

حررت
اجاب چارہ سازئی و حشمت نہ کر سکے
زندان میں بھی خیال بیا بیاں نمود و نہت

غالب
شاو جزوں نے غلیمت آزادی دیا
زندان میں ہیں خیال کے صحرا سبیلے ہوئے

حررت
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس درد پیشیاں کا پیشیاں ہونا

غالب
مرے بعد وہ گزرے عشقِ مستم سے
ندامت کے پہلو نمایاں ہیں علم سے

حررت
موتوں سے اس اثر پذیر کی اعتراف تو خیر حررت نے بار بار کیا ہے۔ اس
اثر پذیر کی قومیت یہ ہے:

ما نہ نعل ہے کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کہ اپنی شبیر دراز میں

مومن
نہ پھیر دیکھ آئیں جو خواب رہتے دے
خدا کے واسطے اے اضطراب، رہتے دے

حررت
جلد دے ہانگر! شبیرِ جبریل میں مت جا
وہ کہیں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

مومن

صاحب کیا انہیں بلاؤں کہ یہ بھی تو ہے خیال
اُن کو شبیر نہ ہو مرے حالِ تباہ کی

حررت
کیوں کر وہ کہیں منتِ امداد نہ کریں گے
کیا کیا دیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
مومن
طبعِ احباب تھے مرزوقِ خلق سہی
بہمنے کیا کیا ترے خاطرے گوارہ کیا

حررت
آتش سے استفادہ کا اعتراف حررت نے نہیں نہیں کیا، لیکن آتش کا رنگ ان
کے کلام پر امت نہاں ہے کسی آنکھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔
خدا جانے یہ آتش کس کے کی تسلسل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شان، آئیے کو یاد کرتے ہیں

آتش
دیکھئے اب رنگ کیا لائے وہ سُج و لعلِ غریب
آئینہ پیشِ نظر ہے، اہمیت ہے شانِ آغا

حررت
زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گلِ سوز رکبت
قارون نے راستے میں لٹایا حسنِ مراد کیا

آتش
ہر شیعول چین میں زرِ رکبت ہے
بانے ہیں بہار نے خزانے

حررت
نعمتوں سے کسی کے میں نے کی ہے گفتگو برسوں
یہی ہے ایک تصویرِ خیالی رو برو برسوں

آتش
رو برو چشمِ نعمتوں کے وہ ہر وقت رہے
نہ سہی آنکھ نے گراں کا انکار وہ نہ کیا

حررت
حررت اساتذہ کا اثر قبول کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کو حتیٰ کہ اصلاح
اور ترمیم کو اپنے انداز میں شخصی حاصر پہنچاتے ہیں، لیکن وہ شاذ ہی کہیں
اساس دلاتے ہیں کہ وہ ان اساتذہ سے آگے بڑھ گئے ہیں۔

۷
حررت نے ایک ایسے وقت میں آنکھ کھولی جب غالب اور مومن
کے انکار کی پچیدگی اور اظہارِ رویوں میں ان کی شکلِ ہندی عام، ناخاندانہ یا
نیم خاندانہ طبقہ میں اپنا لطف و اثر کھو رہی تھی۔ ناسا کے ست کی پینترے کچھ
خاص اکھاڑہ بازوں کو خوش کر سکتے تھے۔ ایسے میں امیر و دافع اور ان کے
شاگردوں کی شاعری ایک ذوالِ پذیر معاشرے کی تعریف یں کر بھری اور

گھر گھر مقبولیت کی سند پائے گی۔

خبر کے بعد کی سیاسی صورت حال نے سرسید کی تحریک کو زخم دیا۔
نوجوانوں میں بیداری کا احساس جاگا۔ مغربی انکار و خیالات نے اذہان کو
جھنجھڑا دیا۔ سٹاروں کی نئی روشنی نگاہ کی جانب مائل ہوئی۔ مائتی، بھڑکی
آواز، آتشیں برقی و فزیک اور نظم کے فروغ کی مدد پر بدین معرقت ہوئے۔ ایسے
وقت میں اردو غزل میں جو پہلی صبر آواز ابھری، وہ شاد و عظیم آبادی کی تھی۔ یہ
آواز غالب اور دماغ کے دو بالکل مختلف اور متضاد دھاروں کے درمیان سے
ابھری تھی، مشاد، اکبر الہ آبادی اور امیلیہ برٹھی کے ہم مرتبے۔ دماغ اور صبر
سے چند سال جھوٹے، اندر صبر اور اقبال کے کم و بیش تیس سال پہلے
تھے۔ شاد نے غزل کو ایک نئے پاکیزہ مزاج سے آسان کیا جو صبر و باری کی اصطلاح
میں "عاشقانہ" بھی ہے اور "عارفانہ" بھی۔ جیسے اسلام ندوی نے لکھا ہے کہ
شاد موجودہ دور کے خوش گوشت کے پیش رو ہیں۔ "تیار خچ پوری نے، ۱۹۳۰ء میں
لکھا تھا کہ گزشتہ پچاس سال کے غزل گوؤں میں شاد عظیم آبادی کا مرتبہ سب سے
بلند ہے۔ ظاہر ہے ان کے بچپن نظر دماغ، امیر، مہلا، حررت، قافی، اسفہر،
یگانہ، بھگت سب ہی رہے ہوں گے۔ انہی بات کا اعادہ نیاز فتح پوری نے
۱۹۵۰ء میں اس طرح کیا:

"بیان کی سادگی، نرم لب و لہجہ، سوز و گداز اور واقفیت، جنہیں
تغزل کی جان کہا جاتا ہے، ان کے (شاد کے) یہاں اس قدر روشن اور
انداز میں پائی جاتی ہے کہ ان کی مثال اس جہد کے دوسرے شاعر
میں نہیں ملتی۔"

صبر نے شاد عظیم آبادی سے باقاعدہ ملازمتوں کے ۱۴ اعتراف کہیں نہیں
کیا، لیکن دست و پا کی عظمت کے ہمیشہ معترف رہے۔ اردوان کا انتخاب، دیوان
سب سے پہلے صبر نے سنا لی کیا۔ صبر نے کلام پر شاد کے دلگہ سخن کی
گہری چھاپ ہے۔ شاد عظیم آبادی کے بچپن فلسفہ، نگر اور مثنوی، آفری کے مصلوہ
پہلے میں ایک مصلحت ہے۔ صبر کے بیان خیال کی سادگی اور بے تکلفی
شاد کی مثنوی آفری اور مصلحت کے مقابلے میں زیادہ مطلوب اور مقبول نہیں۔
صبر کے میں طرح غالب کی بیسیوں زمیوں میں طبع آزمائی کی ہے، اس طرح
شاد کی بہت سی زمیوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شاد اور صبر کے ہم مطلب
اشعار کا تقابل محال کیا جائے تو شاد کے اشعار بہتر اور برتر معلوم ہوں گے اور
ایسے اشعار عامی پڑی قلمرو میں ہیں۔ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ شاد عظیم آبادی
کہتے ہیں:

اے چنچ! رات دن تجھے رونے سے کام ہے
میں نے دیر و دراز وقت، ذرا رحم کو شام ہے
صبر موبال نے اس طرح کہا ہے:

کہیں ہلک بھی اے عظیم غزل ناہ انشان
کہیں تک تری اشک باری کہاں تک
شاد کا مشہور شعر ہے:

کس مٹوشے سے صبر اور مٹی سنجیں ہوتی ہے
تڑپ اے دل، تڑپے سے تو دلکیشان ہوتی ہے
لیکن صبر جب اس مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شعر یوں ہوتا ہے:
غور گھر صبر کو ہوتی ہے تڑپ سے تسکین
درد و خو درد صبر تکی کی دوا ہوتا ہے
شاد کا ایک اور شعر ہے، جو زبان دوام ہے:

ر اب بھی اک مر ہے جینے کا انداز آیا
نہیں جھوڑے پچھلا، میں باز آیا
اور اب صبر تکی کا شعر دیکھئے:

زندگی ہے اسی کا نام تو صبر اسی در ماندگی سے در گزیرے
(اساتذہ کلام کا بلاغوب اور گہرا مطالعہ صبر تکی کی لطافت بھی متبادر
ان کی کمزوری بھی۔ طاق اس طرح کے آندو شاعری کے بہترین نمونے ان کے
سامنے تھے اور وہ اپنے کلام کو ان کا نمونہ بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ کمزوری
اس طرح کہ وہ اکثر اساتذہ کے خیال اور اسلوب کے طبع پر مکرر ہو گئے۔ ان کے الگ
الگ اشعار دیکھ جائیں تو کہیں معنی و دانش کی جھلک دکھائی دے گی، کمہیں
تغیر، غالب اور صبر تکی اور مٹی شاد عظیم آبادی کی اور ان اشعار میں جہاں صبر
تغیر یا تقلید کرتے نظر آتے ہیں وہ نیز اور غالب، نور جا، معنی، آفری، مومن اور
شاد کے مرتبے کو نہیں پہنچتے۔)

پھر صبر تکی کا نشان امتیاز کیا ہے؟ (ایک خصوصیات کی بنا پر وہ مٹوشے
مجھے جانتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جگہ بہت واضح ہے کہ صبر تکی بہت سے
اشعار میں، ممکن ہے کہ انفرادیت کا فقدان ہو، لیکن ان کی ہر غزل ان کی اپنی غزل
ہے۔ صبر نے مختلف مین کے کچھ یوں سے اپنا گلدستہ سمایا ہے، لیکن گلدستہ
سمایا کے میں نہیں؟ ہوں نے کبھی نہ جانتا ہے کام یہ کہ اردو کوئی اندھین فواز
ان کی ہم سہری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان سہریوں کو الگ دیکھا جائے تو شاید
ان باغوں کی نشان دہی کی جائے، جہاں سے یہ سہری لائے گئے ہیں۔ لیکن اگر صبر
صبر کے پورے گلدستہ کو دیکھیں تو بے اختیار کہہ آئیں گے کہ یہ گلدستہ صبر تکی کا
اور صبر صبر تکی کا ہے۔

(صبر تکی جو وہ اساتذہ تھے۔ ان کی ذات میں غزل میں قلم بہم، شاعری،
مساوت اور نصیحت۔ ان معیوں کے تقاضے اور مطالبات الگ الگ ہیں اور
صبر تکی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے میوں کے مطالبات الگ الگ پورے کیے۔
اور مٹی کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا۔ جہاں جہاں ہے کہ انہیں دل شاعری کیلئے

رومان سیاست کے لیے اور پیشانی کی عبادت کے لیے عسکی کئی تھی۔ سیاست میں وہ شہر بہرہ نہ تھے۔ ٹڈرے، بک، اپنے خیال میں جن کو۔ کابجہ میں رہے قیامی کاہل کے سوال پر کمانی ہی سے بنو آدما کہے۔ مسلم لیگ میں آئے قیامی سے اختلاف لائے رہا۔ ان کا شعوبہ:

ایسا عاشق اوروں میں لائیں کہ اس سے ہم
تنگ آگئے ہیں اب دلی میراں سے ہم

میں سمجھتا ہوں حسرت مزا مانو مان پرور تھے اور اولیٰ و آخر شاعر۔ وہ سیاست میں بھی شاعری رہے۔ ان کی سیاست کلہ راج جو بظاہر تند خو تھا دراصل دوماںی ہی رہا۔ گینوم اور لغتوں کو ساتھ ساتھ دسی کے جاسکتے تھے۔ آقا اور آداب و اخلاق کی حق سے پابندی کے باوجود دلفیاد شاعری کی حمایت کرنے کا حوصلہ حسرت کو ہی تھا۔ لغتوں اور سلوک میں وہ کبھی شہر تیریز کے قطعہ اور ادب میں شامل ہوتے ہیں، کبھی عبدالقادر جیلانی کے اور کبھی سری کرشن علی لکھنؤ کے۔ کبھی سحر اور ہرندران کا سفر کرتے ہیں۔ حسرت کی شخصیت میں عشقی اور دہشتی کے ساتھ ساتھ ایک قلندر اور درویش بھی تھی۔ جو اترتیب ان کی سیاسی اور صوفیانہ زندگی کی تادیل ہے۔ حسرت کا کلام سراسر عاشقانہ، نرم و نازک، لطیف اور سبک ہے، جو ان کے مزاج کی نرمی، خود فروشی، ایسا نادر ہے کوئی پر طالت کرتا ہے۔

اک طرف تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کی شاعری سراسر عشقیہ شاعری ہے۔ ان کا عشق شاہد بازاری سے نہیں، بلکہ گھر پر عورت سے ہے۔ حسرت کے کسی تذکرہ نگار نے ان کی کسی محبوبہ کا ذکر نہیں کیا۔ پریس عبد اللہ گورنے ان کا کہتا ہے کہ اردو ادب میں سب سے پہلے حسرت نے "بنت علم" سے عشق کیا۔ اس زندگی میں کیا باتیں، اس کی تصدیق نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ حسرت کو اپنی بیوی سے والہا نہ محبت تھی۔ اور شہرت میں وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جو انہوں نے اپنی بیوی کی موت کے بعد لکھے تھے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ حسرت نے اپنی بیوی کی زندگی میں بھی ان پر اشعار لکھے۔ حسرت کی طبیعت اک طرف تماشا تھی، اس لیے اس سے کچھ بعد میں بھی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی شاعری کا مرکز محمدی بیوی ہی کو بنایا ہو۔ بہر حال حسرت کی محبوبہ جو بھی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ صحن کی لکھنؤ اور دہلیوں کے ہر سہلو پر ان کی نظر ہے۔ ان کا عشق ایسی ہی دنیا کا ہے۔ اس گھر پر عشق میں جو عظمت، شگفتگی اور عذبات کی وارفتگی ہے۔ وہ حسرت سے ہی مخصوص ہے۔ عشق ان کی زندگی ہے۔ ان کے کردار کا صفائی اور فطرت کا صاف ہے۔ عشق انہیں محو اولیٰ کی خاک نہیں چھوڑتا، بلکہ انہیں زندگی کے کارزار میں حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ان کے عشق میں ایک سادگی، ایک بیدلانی ہے اور ان کی شوق میں بھی ایک بصیرت

آپ کا لکھنا

ہے۔ وہ مرتاپا محبت ہیں، اولیٰ تا آخر عشق۔

سید کا رستے باسقا ہو گئے، ہم ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

ناز نے عشق ہار کی حسرت مر رہی توڑ کر دیا مہربک

نئے عیب سب عشق بازی میں حسرت نہ نہیں وحدہ، نہ غنہ، نہ نیکہ

شاو مان تھا جو ترے رنجی طرح کار سے دل

غم دنیا سے گراں بار نہ ہونے پایا

اس ناز میں سے ہم کو جتنے گزند پہنچے

سب دل پذیر پہنچے سب دل پسند پہنچے

ہوں کہ ان کی محبت اس دنیا کی، اسی گوشت پرست کی محبت ہے۔ اس لیے وہ ہوس کو محبت کی سادگی ہے الگ کوئی اور جذبہ نہیں سمجھے۔ ان کے یہاں محبت اور کون میں امتیاز نہیں۔

المحمد کہ تاریکی فرست ہوئی دور

مژدہ وصل بصد جلودہ انوار آیا

بہن جاں میں نسیم ہوس انگیز طبعی

کشت آسیدہ پر ابرطرب آثار آیا

حسن کی خوب کو جس طرح حسرت نے محسوس کیا تھا اور حسن کے مختلف مظاہر کو انہوں نے جس طرح اپنی زور میں جذب کیا تھا، اس کی کوئی اور مثال اردو شاعری میں شکل سے ہی ملے گی۔ حسرت حق پرست تھے اور اس صفت نے ان کے احساس اور جذبہ کو تازہ رکھا یہ کہتے ہیں:

کیا جس پرستی بھی کوئی مجھ سے حسرت

ہونے دو جو اخلاقی کی تنقید کڑی ہے

ہر چند وہ ایک عجب اعلان کرتے ہیں:

وہم ہو یا تمہارا دور ہو، کوئی ہو، دنیا میں

کیا جس سے تعلق ہم سے پیدا ہو، مگر مہر رکھا

لیکن ان کی حسن پرستی اور نظر بازی انہیں لندن، اٹلی اور بیروت کی عیدتوں کی جانب بھی ملتفت کرتی ہے:

کیا کہیے کہ رہتا ہے بہر حال تصور

حسرت میں لندن کی اسی آفت جاں کا

اگلی میں تو کیا، میں تو یہ کہتا ہوں کہ سہبت
دنیا میں نہ ہر کوئی اس شکل کا، ثانی

ساتھ ان کے جسم آئے تھے ہیروت سے۔

یہ دوک مستحب ہے اسی ہم معصی کا

ما (حسرت کے یہاں کوئی ریاکاری نہیں تھی وہ اپنی روزمرہ زندگی میں ہی
نہیں، شاعری میں بھی کچھ بولتے تھے اور ان کا یہی کچھ ہمیں مسافر کرتا ہے
ان سے قریب کرتا ہے، ان کی شاعری میں میں محض صیغہ، بے گھر ہیں ہے،
اُس وقت کی اردو میں کوئی نہیں ایک نئے لہجے کا اضافہ ہے جو محض اجود
ادعا کے آقا، اپنے عہد میں کافرانہ کسی لہجہ کے بغیر، بلا شاعرانہ ہے
جھجک، بغیر روش کے شاعرانہ پر نادر ہے، ہم اسے کس طرح اپنے تکلف دور
سمجھتے ہیں تیار نہ ہوں نا

تجربے سے کچھ سیکھ ہی رہے ایک ہوجانا ترا

اور ترا و اسوں میں وہ انگلی دیا نا ہونے

کھینچ لیتا وہ مرا پردے کا کونا، دلچسپا

اور دوپٹے سے وہ مونہ چھپانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست دیا ہونا ترا

اور مرا وہ چھڑنا وہ لہ لہنا نا یاد ہے

خیر کی نظروں سے بچ کر سب کی خیر کے خلاف

وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوہڑ کی دھوپ میں بچھو کوٹلانے کے لیے

وہ ترا کوٹنے پہ نکلے پاؤں آنا یاد ہے

حسرت کی اکثر کامیاب غزلیں ایک ہی مزاج، ایک ہی نفسانی نشاندہی

کرتی ہیں اور ان پر غزل مسلسل کا اطلاق ہوتا ہے۔ مضمنا میں ایک دوسری پردے

معلوم ہوتے ہیں اور مزہ خیالی کے عیب سے ان کی زمیں عموماً پاک ہیں۔ ان کے

کلام کا ایک اور وصف اس کا سہرا یا ہم سطح ہونا ہے۔ ان کے اشعار کو "بے مانیات

ہست" ہونا اس نہیں۔

حسرت گزرتے ہوئے واردات عشق کا ذکر بڑی لذت، لطافت سے

کرتے ہیں۔ لاشعری کی یادیں ان کا تہی سر ہاں ہیں۔ اسی فوسٹلہا، ان کی زندگی کو

ایک کیف، ایک سرسبز مٹھالی کے۔ ایک غیر ملکی حسینی بابت، جس سے کسی سمندری

سفر میں ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ تب وہ یہ اشعار کہتے ہیں تو ان کی شہرہ زل

یاد آتی ہے، جس کا ذکر اگلی میں لے گیا ہے:

جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشا نہ تیرا

یاد ہے مجھ کو کبھی تک وہ (زمانہ تیسرا)

پاکے گرم نگر تجھ کو سر بریش جہاں

نہیں چھپتا تو کبھی پھر نظر نہ تیسرا

میرے اصرار پہ وہ ہاتھ پھڑا کر آخر

دستخط آپ سے اردو میں بتانا تیسرا

اس طرح یہ اشعار بھی ایک ہی کیفیت کی ترمیمی کرتے ہیں:

یاد کرو وہ دن کہ تیرا کوئی سودا نہ تھا

باوجود حق تو آگاہ و مست فی نہ تھا

مست روز افزوں پہ اپنے مجھ کو میرانی نہ تھی

بزیہ نگیں پہ مجھ کو نازِ بیکت فی نہ تھا

دیے کے قابل بھی تھے وہ عشق کی بھی سادگی

جب تیرا حق سر گرم غور آرائی نہ تھا

آغا زنجبٹ کا بار بار ذکر کر کے حسرت مزے لیتے ہیں:

وہ دن اب یاد آئے ہیں کہ آغا زنجبٹ میں

نہ چلاک تھے اسے شوق آئی تھی، نہ عیبت دہی

یاد ہیں سارے وہ پیشِ افرات کے مزے

دل اچھی بیولا تھیں آغا زنجبٹ کے مزے

وہ سہرا پا نا نہ تھا بیکنا، رزم جعب

اور مجھے حاصل تھے ٹھٹھ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے

اب کہاں سے لاؤں وہا، و انغیت کے مزے

حسرت زندہ تجربات کے شاعر تھے۔ محبوب کے جسم پر ہیں اور اس کی

خوشبو کا ذکر جس طرح حسرت کے یہاں ملتا ہے۔ اس التزام اور نگرار کے ساتھ

شاید کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملے۔

اللہ سے جسم یار کی خرابی کہ خود بہ خود

رنگینوں میں ڈوب گیا پیر میں تمام

دوڑن پیر میں ہوئی خوبی جسم نا زین

اور کبھی شوق ہو گیا رنگ ترے لباس کا

پیرا میں اس کا بے سادہ و رنگیں یا عکس سے شینہ گلابی

آج تک جس سے معطر ہے جنت کا شام

آہ کیا چیز تھی وہ پیر میں یار کی قرب

محتاج ہوئے عطر نہ تھا ہم خوب یار

خوشبو طبری کا تو اس پیر میں تھی

مندی ۱۹۸۳ء

مقرر ہائے مہربانی سے سارا بدن اپنا
وہ شکر ادا کرتے ہیں خود بھی تو اکثر بہرین اپنا

حضرت کی محبت ایک معاملے سے جلیقہ اردو لے کے بھاگی ہے۔ ایک
ایک دفعہ میں جب کوڑیل اٹھارہ لاکھ شکاری، اور ایسا بھی تو تھا کہ حضرت
اپنے اسکاٹ لہسے کر چکی ہے۔ حضرت نے مشفقہ شکاری کی رحمت اور پاکیزگی
دل کی، حضرت کے یہاں ایک سباز روی بھی۔ انہوں نے اگر دہلی کی کچھ خبر بیان
جیجی کی تو کھنڈ سے بھی کچھ مصیبت مستحاصلیں اور ان دونوں کے آئینے
سے اپنی مشاہیر کی تصویر تیار کیا۔ اس لیے حضرت کو کسی خاص درجہ نگر و نرس
منسوب کرنا مناسب نہ ہوا۔ نسبت ان کھنڈ کی کز و دیان بھی حضرت کے یہاں
موجود ہیں اور حجاز و قریہ میں انھیں رنگ کی ہم نشینیت کرتے ہیں، اس کی
بازگشت بھی حضرت کے یہاں مشائخ دینی ہے۔

عربی کہا ہے وہ کم ہیں اہل نام حسدا
ان پر مرنے ہو تو کچھ دن ہمیں حبیبنا ہے ضرور

ماں بھی بچپن میں جو رحمتی تمام شب
اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

ہم بچپن کے سے بھی گئے چائے آپ کے موند کا
کہتے ہی رہے آپ کو دیں گے نہ دیا ہے

رنگ سے بٹ بٹ گئے ہم دیکھ کر گرم نظر
فیرنے مثل میں جب آنکھیں دہائی آپ کی

ہائے کہنا وہ ان کا وصل کی شب
ٹوٹنے عجب زور کر دیا ہم کو

ماں سے بے مناسب نہیں ہم پر یہ فتاب
سر سے ٹھٹھ جائے نہ خستے میں دو پہنہ دیکھو

حضرت کی زبان میں پرستگ، شوقی اور سلاپ ہے۔ ان کی تازہ کار
فارسی ترکیبیں اپنی لطافت کا اظہار اور حضرت کے رچے ہوئے ذوقی فارسی کی
تائید داریں۔ ان کے مضامین پیش پا افتادہ ہوتے ہیں، لیکن ان کے بیان میں ہمیشہ
تازگی ہوتی ہے۔ زبان کی سلامت، ہمعانی اور روانی کے اعتبار سے حضرت کی
فرہنگی اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہیں۔

حضرت کے یہاں نہ ستور کی جھنڈا ہوتی ہے، نہ قمر کی سرگوشی۔ ان کا سہم
عام ہل حال کا ہوجہ ہے نہ زیادہ بلند نہ بہت جدا دیا۔ ہل حال کے بیچ میں زیادہ

ان کا ہل حال نہیں ہوتا، اس لیے کہ بچی کا پیدا ہونا نادر ہے، مگر ہر وقت
بنادش سے پاک ہے۔ حضرت کے یہاں میں اکثر بہن کا احساس ہوتا ہے، وہ اس
بے تکلف، سادہ، معصوم بچے کی وجہ سے بے حضرت کے یہاں نہ ہوتی ہے، نہ
مخالف و معاند کے دفتر۔ فلسفہ طرازی اور خیال افزائی کی اپنی اہمیت ہے، لیکن
بعض شعرا کے یہاں یہی صفات استاذانہ ہڈی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔
حضرت کی غزل مذہم بقدر ہے، جتنی ہوتی ندی کی طرے ہے، نہ شور، نہ طہری ہوتی۔
ان کے بہترین اشعار کا اندازہ یہ ہے:

میں بیہ پروا کو خود میں وغرور آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

نہیں آتی تو یاد ان کی جینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

خود کا نام میوں رکھ دیا، جزو کا خود
جو چاہے آپ کا حسن کر شمر ساز کرے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو سرشمار کے وہ گئے

ان متحرک و سنگین کہتے بنتا سنی تاویل خیالات چلی جاتی ہے

توڑ کو میر کر مں نا آستنا ہو جائیے بندہ پرور جائیے، اتھا غنا ہو جائیے

شکرِ اطاعت نہیں، شکر و بیاد نہیں کچھ بھی تیری فتنا کے سرا یا نہ میر

پھر تخلص ہے ہی مجھ سے کہ اس محفل میں چل
اس دل سے تاب کی خند کو اپنی کراوں

فرم آ رہا حضرت سبب اندک بتاؤں مرے عشق کی بستی مرے حوٹوں کی پتو

حقی راحت حیرت کی کس درجہ فرادانی میں نے تم کو سنی کی موت بھی نہ پہچا

دل کی چوس مشاوری ان کا بھگت کا تو کچھ مجھ سے کہو کہ شوق کی بارگاہ کو کب
(آجے سلاپ)

مزید اوزان رباعی

سبب پے سبب است، و تپے و دامت

کی

روشنی میں

"مفعولن" والے اوزان

ع	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فعل
ع	"	"	"	فعل
ع	"	مفعول	مفاعلن	فعل
ع	"	"	"	فعل
ع	"	مفعولن	فاعلن	فعل
ع	"	"	"	فعل

بعض عروضوں نے اوزان رباعی کی طرف استراحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ رباعی کے کئی جزا اوزان مکمل کئے ہیں اور کہ لوگوں نے رباعی کے دو شعر عرب اور ازیم ترتیب دیے ہیں اور مزاج ہے کہ رباعی کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ ان کے جزا اوزان کا اخراج مندرجہ ذیل زعمات سے مل میں آتا ہے۔

ع ازیم عا قرب عا مسد عا قبض عا کف عا جب عا ہز عا ہتم عا زل۔

اور ارکان کی تفصیل اس طرح کی ہے:-

ع	مفاعیلن	ع	مفعولن	ع	مفعولن	ع	فاعلن	ع	مفاعلن
ع	مفاعیلن	ع	مفعولن	ع	مفعولن	ع	فاعلن	ع	مفاعلن
ع	مفاعیلن	ع	مفعولن	ع	مفعولن	ع	فاعلن	ع	مفاعلن
ع	مفاعیلن	ع	مفعولن	ع	مفعولن	ع	فاعلن	ع	مفاعلن
ع	مفاعیلن	ع	مفعولن	ع	مفعولن	ع	فاعلن	ع	مفاعلن
ع	مفاعیلن	ع	مفعولن	ع	مفعولن	ع	فاعلن	ع	مفاعلن

ان عروضوں نے مندرجہ ذیل کیفیت کے سبب کس مقام پر فعلی کہا ہے یہ ایک ہی بحث ہے کہ یہ مقام اس بحث کا نہیں ہے نہ اس مقام کی وقت پر اشارہ کئے ہیں۔ ہمیں تو اس مقام پر صرف رباعی کی شکل کا قانون "سبب پے سبب است و تپے و دامت" کی ہی بحث کرنا ہے۔

رباعی کا اخراج بحر بجزع سے ہوا ہے اور اس کے متوجہ ہو بیس اوزان مندرجہ ذیل دو اوزان پر عمل تحقیق کے مرہون منت ہیں۔

ع	مفعولن	مفاعیلن	مفاعیلن	فعل	فعل
ع	مفعولن	مفاعیلن	مفاعیلن	فعل	فعل

ان اوزان کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عروضوں نے مکفوف ماقبل پر عمل معاثر کیا ہے یعنی مفاعیلن اول کی جگہ رکن مقبوض یعنی مفاعلن لائے ہیں۔ لیکن ماہر مفاعیلن کی جگہ مفاعلن رکھنے سے احتراز کیا ہے۔ اور کوئی مقفول وجہ بیان نہیں کی، جب کہ مفاعیلن اور مفاعلن دونوں رکن عام زعمات سے حاصل ہوتے ہیں۔ خاتم العروض حضرت علامہ مشن آبادی نے انجمنی نے عروضوں کی اس مشکل انگیزی اور بے راہ روی کو شدت سے محسوس کیا اور رباعی کے قانون کو مد نظر رکھتے ہوئے دو وزن اس طرح قائم کیے۔

ع	مفعولن	مفاعیلن	مفاعلن	فعل	فعل
ع	مفعولن	مفاعیلن	مفاعلن	فعل	فعل

اور ان اوزان پر عمل تحقیق فرما کر رباعی کے اوزان میں مزید بالفاظ اوزان کا اضافہ فرمایا جو ہر طرح جائز ہیں اور ان پر کسی قسم کا عروضی اعتراض وارد نہیں ہوتا اور ان کا خلاصہ یوں

"مفعولن" والے اوزان

ع	مفعولن	مفاعلن	مفاعلن	فعل
ع	"	"	"	فعل
ع	مفعولن	مفاعیلن	"	فعل
ع	"	"	"	فعل
ع	"	مفاعیلن	فاعلن	فعل
ع	"	"	"	فعل

ان کا خلاصہ

اس اصول پر غور کرنے کے بعد ہمارے سامنے تین باتیں آتی ہیں۔

۱۔ یہ اصول کس کس کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔

۲۔ اس اصول کی عرض و غایت کیا ہے۔

۳۔ یہ اصول رہائی کے مزید اوزان کا تلاش کرنے میں ہماری کہاں تک مدد کرتا ہے۔

رہائی کے مزید اوزان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے مندرجہ ذیل حقائق آتے ہیں۔

(۱۔) رہائی کا ہر وزن چار ارکان پر مشتمل ہے

بدا رہائی کے ہر وزن کی ابتدا مضبوط یا "مف" سے ہوتی ہے یعنی

رہائی کے ہر وزن کے شروع میں ان دونوں ارکان میں سے ایک رکنا بطور لازم آیا ہے۔

(ج۔) رہائی کے ہر وزن میں "مقل" یا "فول" (دیکھو لام) پر یا "ف" یا "غ" (دیکھو نون) بطور لازم آیا ہے۔

ہو کہ ہمیں رہائی کے لئے اوزان کو "سبب" سے "سبب" کی روشنی میں پرکھنا ہے لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ارکان کے اجزائے اولیٰ یعنی سین اور آواز کو ہم لیا جائے۔

دوسرے حروف لفظ ہے جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا حرف ساکن ہو۔

رہائی میں آنے والے سین خفیف :- مف، جو، ن، فاجی۔ فغ
وہ حرف لفظ ہے جس کے پہلے دو حرف متحرک اور تیسرا حرف ساکن ہو۔

رہائی میں آنے والے آواز مجموع :- مفا، ملن، فنل
وہ حرف لفظ ہے جس کا پہلا اور تیسرا حرف متحرک ہوں اور درمیان کا حرف ساکن ہو۔

رہائی میں آنے والے آواز مضبوط :- مو، ملن
وہ حرف لفظ ہے جس کا پہلا حرف متحرک ہو اور بعد کے دو حرف ساکن ہوں۔

رہائی میں آنے والا سبب وقف :- فاع
وہ جہاز حرفی لفظ ہے جس کے پہلے دو حرف متحرک ہوں اور بعد کے دو حرف ساکن ہوں

رہائی میں آنے والا وقف :- فون

(نوٹ) معلوم ہونا چاہیے کہ ساکن حرف کے بعد آنے والا ساکن حرف ہمیشہ موقوف ہوتا ہے مگر یہاں جب سبب خفیف کے بعد ساکن حرف آتا ہے تو اس کو سبب وقف کہا جاتا ہے اس طرح وقف مجموع

کے بعد ساکن حرف آتا ہے اس کو وقف کہا جاتا ہے۔

۱۔ اجزائے اولیٰ بیان کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رہائی میں آنے والے ارکان عشرہ کا تجربہ کیا جائے تاکہ قانون رہائی سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ مف مو مف + مو
سبب خفیف وقف

۲۔ مف مو مف + مو + نون
سبب خفیف سبب خفیف

۳۔ فاع ملن فاع + ملن
سبب خفیف وقف مجموع

۴۔ مف می مف + می + نون
سبب خفیف سبب خفیف

۵۔ مف ملن مف + ملن
سبب خفیف وقف مجموع

۶۔ مف ملن مف + ملن
سبب خفیف وقف مجموع

۷۔ فاع فنل فاع + فنل
سبب خفیف وقف مجموع

۸۔ فاع فغ فاع + فغ
سبب خفیف

۹۔ فاع فون فاع + فون
سبب خفیف وقف

۱۰۔ فاع فاع فاع + فاع
سبب وقف

رہائی میں آنے والے ارکان عشرہ کا تجربہ کرنے کے بعد ہم اس تجربہ پر پہنچے ہیں کہ فاع، فون، فاع کے علاوہ تمام ارکان دو یا تین اجزائے اولیٰ سے مرکب ہیں۔ یعنی ارکان ایسے ہیں جو واحد ہو کر آئے ہیں یعنی ان کی تشکیل صرف ایک جزو اولیٰ سے ہوئی ہے۔

ان ارکان کے پیش نظر یہ بات قطعی یعنی ہوجاتی ہے کہ سبب مل نکلتا ہے سبب والا قانون ہرگز ایک رک کے متعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق ماقبل رک کے آخری جزو اولیٰ اور مابعد رک کے اولیٰ جزو اولیٰ سے ہے مگر اگر پہلے رک کا آخری جزو سبب یا وقف ہو تو اس کے بعد آنے والے رک کا پہلا جزو بھی سبب یا وقف ہونا چاہیے۔ یہاں اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ وہ وقف مجموع ہے یا وقف مضبوط

وہ پکارنا ہے۔

اس قاعدہ کی فرض و غایت یہ ہے کہ عروض میں کامل عرض و غایت دسترس حاصل کیے بغیر عربی کے اوزان کی پکے کی جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ فاضل وزن صحیح ہے کہ نہیں۔

یہ قانون خاص طور پر ان لوگوں کے لیے زیادہ مفید ہے جو رباعی کے جسد اوزان کو یاد نہیں رکھ سکتے صرف چند باتیں دہیں میں رکھ کر ہی اس وقت کی مدد سے اوزان رباعی قائم کر سکتے ہیں۔ دو چہ باتیں یہ ہیں۔

۱۔ قانون رباعی میں مبین اور اوزاد کی تکرید مسد رباعی میں آنے والے ارکان عشرہ مسد رباعی کے پہلے رکن میں مفعول یا مفعول کا بطور لازم آمد نہ ہو سکتا ہے۔
۲۔ آخری رکن میں فعل یا مفعول یا فاعل کا بطور لازم آمد۔
۳۔ آئیے اب ہم ان باتوں کی روشنی میں رباعی کے اوزان تحقیق کریں۔

جب آپ کو رباعی کا وزن تحقیق کرنا ہو تو سب سے پہلے شعر درج کارکن اور آخری رکن بطور لازم رکھ لیے مشابہت پہلارکن مفعول اور آخری رکن فاعل، تجویز کرتے ہیں۔

مفعول (۱) ۲ (۳) ۴

لہذا ہر عدد کے پیش نظر دوسرا رکن ایسا چونا چاہیے جس کی ابتدا سبب سے ہو۔ چونکہ رکن ماقبل "مفعول" کا آخری جزو "و" اسبب خفیف واقع ہوا ہے۔ رباعی کے ارکان عشرہ پر نظر ڈالنے سے آپ کو اس قسم کے دو رکن دستیاب ہوتے ہیں۔ ۱۔ فاعل ۲۔ مفعول۔

۱۔ ہم سب سے پہلے دوسرا رکن فاعل رکھ کر وزن معلوم کرتے ہیں۔
مفعول فاعل ۲ (۳) ۴

دوسرا رکن دریافت کرنے کے بعد تیسرا رکن دریافت کرنے کے لیے یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس رکن کا پہلا جزو "و" ہو اور آخری جزو "سبب" ہو اس لیے کہ دوسرے رکن کا آخری جزو "علن" وند ہے۔ اور چوتھا رکن "فعل" سبب خفیف ہے۔ رباعی میں آنے والے ارکان

عشرہ میں ایسا رکن صرف "مفعول" ہے لہذا اوزان یہ ہوا

مفعول فاعل ۲ (۳) ۴
سبب سبب وند سبب سبب

سبب - وند ہے وند - سبب ہے سبب۔

اب اگر دوسرا رکن "مفعول" رکھا جاتا ہے یعنی مفعول مفعول ۲ (۳) ۴ تو اس صورت میں بھی تیسرا رکن "مفعول" ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ماقبل رکن کا آخری جزو "و" وند معروض ہے اور مابعد رکن "فعل" سبب خفیف ہے اور مفعول کا پہلا جزو "مفعول" وند معروض ہے اور آخری جزو "فعل" سبب خفیف

لہذا اوزان یوں ہوا۔

مفعول مفعول مفعول ۴
سبب سبب وند سبب سبب
سبب ہے سبب - وند ہے وند - سبب ہے سبب
دووں وزن قاعدہ کی رو سے اندر کے گئے ہیں لہذا صحیح ہیں۔

اب ہم رباعی کے جسد اوزان کا اس وقت حد کی روشنی میں تجویز کرتے ہیں تاکہ یہ قانون ابھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

"مفعول" کے شروع ہونے والے اوزان رباعی

۱۔ مفعول مفعول مفعول فعل
۲۔ وند وند وند وند
۳۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۴۔ وند وند وند وند

۵۔ مفعول مفعول مفعول فعل
۶۔ وند وند سبب سبب وند
۷۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۸۔ وند وند سبب سبب وند

۹۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۱۰۔ وند وند سبب سبب وند
۱۱۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۱۲۔ وند وند سبب سبب وند

"مفعول" کے شروع ہونے والے اوزان رباعی

۱۔ مفعول مفعول مفعول فعل
۲۔ سبب سبب وند وند
۳۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۴۔ سبب سبب وند وند

۵۔ مفعول مفعول مفعول فعل
۶۔ سبب سبب سبب سبب وند
۷۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۸۔ سبب سبب سبب سبب وند

۹۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۱۰۔ سبب سبب سبب سبب وند
۱۱۔ مفعول مفعول مفعول فاعل
۱۲۔ سبب سبب سبب سبب وند

مفعول سے شروع ہونے والے اوزان رباعی

و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع

مفعول سے شروع ہونے والے اوزان رباعی

و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع

یہ یا اصل رباعی کے مزید اوزان تلاش کرنے میں ہماری کہاں تک مدد کرنا ہے۔

جیسے کہ بیان کر چکے ہیں کہ غائر عروض حضرت علامہ مفتی آبادی نے حکم مجاہد کے پہلی نظر رباعی کے مزید ۱۲ اوزان ایجاد فرمائے ہیں اور جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اگر ہم اس قاعدہ "سبب ہے

آلاء اللہ تعالیٰ

سبب" کے تحت مزید اوزان تلاش کرتے ہیں تو بھی صرف یہی اوزان تحقیق ہوتے ہیں اور ان ۱۲ اوزان کے علاوہ کوئی دوسرا وزن سامنے نہیں آتا۔ لہذا رباعی کے صرف ۳۴ اوزان ہی ہو سکتے ہیں۔

رباعی کے ان اوزان کے درمیان جو بطور لازم آتے ہیں رباعی میں آنے والے ارکان عشرہ میں سے دو ارکان ایسے ہیں کہ پہلا جزو بھی وند ہے اور آخری جزو بھی وند ہے۔ مفاعیل مفاعیل۔ جب رباعی میں دوسرا اور تیسرا رکن "مفاعیل" ہو سکتا ہے تو "مفاعیل" رکھنے سے بھی اس حکم کے اطلاق میں کسی قسم کی قحاح پیدا نہیں ہوتی لہذا علامہ کے تحقیق کردہ مزید ۱۲ اوزان رباعی جو اصول نے حکم مجاہد کے پیش نظر سامنے ہیں اس قانون پر بھی پورے اترتے ہیں۔

علامہ کے ایجاد کردہ اوزان کا تجزیہ:

مفعول والے اوزان

و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع

مفعول والے اوزان

و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع
و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع	و مفعول مفاعیل مفاعیل فاع

بقیہ: آگے صفحہ ۱۹۸۳

احسان دانش

محفل میں اپنا مقام بنالیتا ہے۔ ان عمارتوں کی ٹھیلیں اس کو اپنا
ہمان خصوصی بناتی ہیں اس کی اینٹوں کے غیر میں اس کے پیچھے کے
قطرے شامل ہیں۔ وہ ان طلبہ کی قسٹوں کے ٹھیلے کرتا ہے جن کی صفت میں
بچے کہ وہ خود تحصیل علم نہ کر سکے اور ان اساتذہ کا مسلم بنائے ہیں اس کے
اگھے اس کی ناداری نے ڈانٹے ادب تہہ کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔
اور یہ پورے پر پیدا ہونے والا انسان جب کتابیں پر دم توڑتا ہے
تو دنیا کے تمام مرد و زوروں کو پیغامِ عمل، عرصہ اور ہمت کا جذبہ
عطا کرتا ہے۔ محنت کا راز بکھا کر دنیا سے اس حقیقت کو تسلیم
کروا لیتا ہے کہ محنت کش محدود ہی نظامِ عالم میں کلیدی حیثیت کا حامل
ہے اور اسی کی محنت حیات کے اہم مسائل کا حل بھی ہے احسان اپنی بیشتر
نگہوں میں مرکزی کردار بن کر ابھرتا ہے۔

عوامی زندگی سے دلچسپی اور اس کے مشاہدے نے فکر کو عوامی
شاعر بنادیا۔ اسی قومیت و قومیت اور موضوعات کی مہمالت کی بنا پر
اگر احسان کو دو وجہ یہ کا نظر کیا جائے تو بجز ہوا کا، کیونکہ ان کے موضوعات
بھی عوامی زندگی کے وہ مشاہدات ہیں، جن کا عین براہ راست تجربہ ہے
اور اسی براہ راست تجربے نے ان کو راست اظہار نے جو اصلیت و صداقت
پیدا کر دی ہے اس کی بنا پر وہ میر تقی میر اور اس کے خوب نظریے ہیں یہی اصلیت
صداقت ہے کہ کلامِ فطری بناتی ہے اور جب ان پر ان کی خاص فطرت کی چوٹ پڑتی
ہے تو کس کس بات پر لکھتی ہیں میر تقی میر کی نشہ ریت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

احسان نے مختلف النوع موضوعات پر پڑتی فنی ٹھیلیں لکھی ہیں کہ ان
پر الگ الگ بحث ممکن نہیں ان کو مختلف شعبوں اور خانوں میں تقسیم کر کے
ہی ان کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔

انہوں نے اپنی نگہوں میں طنز نگاری کی طرف خاص توجہ دی ہے۔

احسان کا تعلق سماج کے جس طبقے سے رہا ہے اس کے مسائل
آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی زد میں لیے ہوئے ہیں جس ان
محفل تن پروری کی خاطر معرفتِ دولی حاصل کرنے کے لیے چستی
و صوب اور ہم کو جھلسا دینے والی نو، پارگوں میں خون بھر کر دینے والی
سردی میں صبح سے شام کر دینی پڑتی ہے کبھی مقور اور اس کے لیے پیش
پاستی جاتی ہیں، کبھی ہڑت کے کدے جیتی ریت پر مستعدی سے ڈھونڈ
دی جاتی ہے۔ کبھی خواب گاہوں میں میٹھی نیند سونے والوں
کے لیے شب بیداری کی جاتی ہے کبھی شکم سیر گھر ہانک اتمامِ عمر کے
باغوں کی گھبائی کی جاتی ہے تاکہ ان کی جمالیاتی حس کو غنہ فراہم
ہوئی رہے۔ تب کہیں شام کو فیر مستحق طور پر دولی میسر ہوتی ہے۔

احسان نے اسی محدود سماج کے کرب آگیاں، نازک حالات پیچیدہ
مسائل کا صرف مشاہدہ کیا بلکہ عملی طور پر اسے جھلک کر خود تماشا
بھی بنے اور تماشا بنی۔ اسی براہ راست مشاہدے کی ذاتی تجربے
نے احسان کو وہ صداقت عطا کی جس کی بدولت وہ زندگی کی سچی تصویر پیش
کرنے پر تدریس کے سہی وجہ ہے کہ ان کی مٹی میں عوامی زندگی کے
وہ تمام پہلو نمایاں طور پر ملتے ہیں، جن کا ان سے براہ راست سابقہ پڑا ہے۔
وہ محفل اپنی نگہوں کے تحت عین بنات خود ایک عملی کردار ہیں۔

احسان کی زندگی کا داستان خود ایک مسلسل ناول ہے، احسان
جس کا سر کردہ کردار ہیں یہ کردار مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر اپنی منزل
مقصود تک پہنچے ہیں کا یہاب ہوتا ہے کہ سرحدوں سے اپنی زندگی کے سفر
کا آغاز کرتے وہ غریب مزدور انسان مالی گیری اور پھر سیاسی گیری کرتا ہوا لکھنویوں
لکھنویوں کا کرنا کا محبت ہوا آخر کار ان کی ٹھیلیں کی راقی بنتا ہے حقیقت
جیسے شعلہ کی ہو چوٹ کی شعلہ سے نوتا ہے اور جس کا ہم پر ہم پر کسی

کیفیت دیکھیے

ہے وہاں اس طرح اس منظر خوش پوش میں سایہ
کبے ٹوٹا ہو دھوپ کی آغوش میں سایہ
افسون بہار میں سنسرا طرح پیش کیا ہے سہ
ملاحقوں کے قافلے پڑے ہیں ہر چٹان پر

برس رہی ہیں ستیاں ہی ستیاں جہاں پر
اتر رہے ہیں زمزمے گھٹاے آشار میں
دھوپ اور گرمی کی ایک سکن تصویر دیکھیے سہ

دھوپ عقی پروں کی چوٹی پر تھوں پر سلیے تھے
سائے میں گرمی کے مابے ہانپتے چوپائے تھے
اسی دھوپ اور لہو میں سفر کرتے ہوئے ایک مسافر کی کیفیت بھی ملاحظہ
فرمایا جس سہ

آرٹا میں کھتولی سے تھکا ہارا ہوا
پیاس کا، پیدل سفر کا، دھوپ کا مارا ہوا!
پیریاں ہونٹوں پر، اعصاب میں تعاست سر میں درد
ذائقے کیف، گدسی گرم، پیشانی پر گرد
یہ منظر کسی ان کی تمام بیانیہ نظموں کی تہید میں ملتی ہے۔

ان کی اکثر بیانیہ نظمیں، منظوم افسانے ہیں۔ نکاح ثانی اور نوحوس
جوہ انس کی بہترین مثالیں ہیں جہاں میں ایک مشکل پلاٹ ہے۔ سراپا
نگاری بھی ہے اور کردار نگاری بھی۔ جذبات نگاری بھی ہے اور مکالمے بھی۔
نکاح ثانی میں ایک امیر گھرنے کی جوہ گرد بسر کرنے کے لیے اپنے چیلے
میں جکر رہنے لگتی ہے آخر کار وہ دہاں وہ اپنی بھوجوں اور بھائیوں کے
طعنوں کا نشانہ بننے لگتی ہے اس کے بھائی جب اس سے دوسرے
نکاح کے ارادے کو ظاہر کرتے ہیں تو وہ دھڑلے سے بے حال ہو جاتی
ہے سہ

بھائیوں کی جب سنی اس تیر رقت نے یہ بات
ہوٹ دانٹوں سے چلے دھکیے کانوں پر ہاتھ
روح گھرائی پسینے سے جبین تر ہو گئی
ہوٹ تو لرزے مگر گفتار دو بھر ہو گئی

وہ اپنے مروج شوہر کے تصور میں ڈوب جاتی ہے اور جب اس پر
غشی طاری ہو جاتی ہے تو پھر اسی عالم میں اپنے شوہر کو دیکھتی ہے کہ
وہ بچوں کے لیے کھلونے لے کر آیا ہے۔ یہ منظر احسان کی زبان سے
اور زیادہ رنگین ہو چکا ہے۔

اسی طرح نوحوس جوہ میں ایک رات کی بیاہی دہن کے جوہ

منظریت میں افسون نے تلف و محمول درتوں، ساعتوں اور اوقات
کے جاندار و مرجع پیش کیے ہیں مثلاً گرمی، برسات، صبح، شام
وہ پیر اور رات وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ یہ سارے مناظر آئینہ ذات کے ہیں نظر
میں آیا ابھرے ہیں۔ مناظر کی خارجی تصویریں پیش کر دین کسی شاعر کے
قد و قامت کو معتبر نہیں بناسکتا۔ احسان کا ہر نقش اس کا اپنا نقش ہے۔
احسان کو پڑھنے کے بعد اس کے تعارف کے لیے کسی دوسرے ہمارے
کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ صانع و بدائع کا سہارا لے کر ترسیل کی راہوں
کو چھپا دہ نہیں بناتے۔ ان کے یہاں نہ بورک کی مشاخص ہیں نہ زمرد کے
پتے نہ زمرد کے پھل، نہ موسیقی کی زبان، نہ سبیل کا تازیانہ، نہ افسوس
کو اب کا سبرہ، صبح اور صبح زبان استعمال کر کے عوامی زبان میں خوش نظر
پیش کیے ہیں وہ حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس قبیل کی نظموں
میں صبح مسرت گرمی کی دو بھر، ایک شام، افسون بہار، شب بیاہ،
وادی کشمیر کی ایک صبح وغیرہ شامل ہیں۔ صبح مسرت میں طلوع آفتاب
اور نزل سحر کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں سہ

سہلا کے گول کے رشارے بے باغ سے جھونکے آتے ہیں
مفلوک کے روندے استوں میں خوشیوں کے علم ہر اتے ہیں
گردوں سے زمین کے دامن پر توڑ اترتی آتی ہے
آنکھوں میں شہابِ فطرت کی تصویر اترتی آتی ہے
ایک دوسری نظم میں صبح کا منظر پیش کرتے ہیں سہ
شخص جھک کے شمع کی رہی تھیں ہوا کھا کھا کلیاں می رہی تھیں
برستے تھے درختوں سے ترانے تھے معور ترنم آہستانے
دستیں زول کی پہاڑیں ہوا میں ابھی تم آخری تھی صف میں
اسی طرح شام کا منظر پیش کرتے ہیں سہ

سانس اکھڑ رہی تھیں شفق کے شہاب کی
ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی چٹا آفتاب کی
منہ جو ذیل شہر میں رات کے منظر کو ایجاڑ آگئیں افشارے نظم کر کے
پورے منظر کو ایک شعر میں سمودیا ہے سہ

گر چکا تھا طائر مغرب سے چراغ آفتاب
بند تھی جردان تاریکی میں فطرت کی کتاب

اسی طرح ”دو قہر“ میں قبرستان کے عبرت آگئیں پس منظر میں مکنت

نزلہ شام ملاحظہ ہو سہ
زمین گنگ، فلک چپ، فضا نہیں آرزو
پرانے خستہ مزاروں کی جہاں بیاں مردہ
بہادوں کے چیمے میں بادل اور سورج کی آنکھ بولی اور سائے کی

جو جہانے کی داستان ہے جہاں سے

منکس بہتکی دل کی آرزو لانے نہ پائی ستمی

نسیم خواب بیداری میں اہلنے پائی ستمی

عروس نو کا سیز بونگی سے پارہ تھا

دھکل کر دو ہی سکتی تھی نہ ضلع کو نہ پارہ تھا

وہ اتنی مصوم، کسین اور نو آموز تھی کہ نہ اس کو محوم ہی پنا آتا تھا اور نہ

جوان شوہر کے خم میں اسے رونے کا حلیقہ ہی تھا مگر اسے یہ احساس

مزدور تھا کہ سماج میں محسوس سمجھ کو تقریبات اور محفلوں میں مسترد یک

ہونے کی اسے اجازت نہ ملے گی

میری ہر ایک ماسن بھوکو ناما نوں سمجھے گی

سہاگن ہو کے دوشیزہ مجھے محسوس بھجے گی

مجھے اب کون بولانے لگا تقریب شادی میں

ناخاندہ خاتون میں ایک ناخاندہ عورت کا مقصد ہے جو شخص کے پاس

خود کو اسے جاتی ہے۔ غیرت اور شرم ہر ہر قدم پر دام لگ کر ہے۔ اسے اپنی

خودی کا بھرپور احساس ہے اور جہالت کا یار دوشی زندگی سمجھتی ہے، محتاج

حسینہ میں وادی کشمیر کی حسینہ کا بیان ہے جہاں حسن فطرت کے

ثانیقین کو ہر در سے اور ہر پتے میں حسن نظر آتا ہے وہاں احسان حسینہ

کے ہمیں میں اس ناداری اور غلطی کو بھی دیکھتے ہیں جو سماج میں اخلاقی پستی کی

بنیاد بنتی ہے

روونکے فاتحے سے چہرہ نذر نذر

سر سے لے کر پاؤں تک تصویر درد

زندگی گرد اسب میں آئی ہوئی

آہرہ کی ناؤ چکرائی ہوئی

تھپے تھپے جھجے پر اسے دیار کا شہیر

یہ ستم اور یہ شباب بے نظیر!

دل بھر آتا ہے تری برسات سے

درد اٹھتا ہے ترے نصبات سے

احسان کی نظموں کے نوائی کرداروں میں وہی قانون مشرقی ہے

جس کی عفت، صحت اور پاکیزگی کے پیش میں مقتد ہیں۔ ان

نظموں میں ایک طرف تو مشرقی عورت کا شکل کردار ہے جس میں محسوس

نے عورت کے عجیبے ایشاڑمیا، غمخواری، صبر اور خود داری کے مرتعے

پیش کیے ہیں۔ دوسری طرف اسی عورت کے وہ اہم مسائل بھی بیان

کیے ہیں جن کا سماج آج تک کوئی حل تلاش نہ کر سکا۔

احسان کو شاعر مزدور کہنا میرے خیال میں نامناسب ہے کسی

حد تک ان کو مزدور شاعر کہا جاسکتا ہے۔ وہ بھی ان کی ذاتی زندگی

کے امتدادی پس منظر کی بنا پر۔ ہاں ان کو بے کسوں، بے بسوں،

نامرادوں اور ناداروں کا شاعر کہنا جاسکتا ہے جو زندگی میں تیر و بھینوں کا

مشکار رہے ہیں خواہ وہ کسی بھی طبقے کے ہوں۔ انھوں نے مزدور طبقے

اور کسانوں سے متعلق بہت سی نظیں لکھی ہیں جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں: جیش بچاگی،

مزدور کی موت، مزدور کا بھان، مزدور کی لاش، ڈول مزدور، دروازہ، مزدور کی پستی

اور مزدور کسان وغیرہ۔ بیوقوفیت محنت کشوں کی زندگی کے سر پہلو پر نظر آتی ہے اور

ان کے مختلف مسائل کے مرتعے پیش کرتی ہیں۔ مزدور کا سراپا ملاحظہ فرمائیں

اے اس دھندلے سے نظریں اسیر انقلاب

جار ہے اک جوان مزدور با حال خراب

وقت زمین پر ہی کن دھجیاں ہتی ہوئی

رہروں کے شفا سے کٹا ہوا زلم شباب

دامن محنت میں عہد نو جوانی اٹھ کر رہ

مغلی کی گود میں سوئی ہوئی روح شباب

سانے تقدیر کے تدبیر سے وقف سجد

مطلب خاک کے تہ سے رہے گردوں کا کتاب

لیکن اٹ رہی موت کا سیلاب اور انسان کا دل

مصراندہ کے جھوٹے ہیں جان حیات

بُشیرے سے نمایاں خستہ حالی

کنڈھے پہ کدالی، پیٹ خالی

چہرے سے شہر افق بنایاں

اعضا سے نفا ہتھیں منمایاں

سانوں میں تھکی ہوئی سی تیزی

ماٹھے پہ نشان سجدہ ریزی

مرحبا ہو شباب چپ ہے

ہنگامہ انقلاب چپ ہے

جیش بچاگی میں ایک غریب لڑکی کی چشم دید مصیقت کا بیان ہے

اس نظم میں پورے طور پر مزدور طبقے کے ہر فرد کی مظلوم حالی اور

ناداری کی داستان کو بڑے جذبات اور کرب آگیاں ہیں میں نظم

کیا گیا ہے نوٹ کا حال ملاحظہ فرمائیں

اندھہ جھپٹتا تھا شامت کی نظر سے

مرجھائے سے رخسار تھے قافوں کے تہ سے

مرد بھی پرانا سا تھا چوڑی بھی پرانی
جور مٹی قسمت کے مشکبوں میں جوانی
بہر رنگی کے باپ کا یہ عالم تھا کہ
انٹیس کے آگے جو گر کاٹ رہے تھے
ارمان سب اپنا ہی ہو چاٹ رہے تھے
اور اندر دہن کا یہ حال تھا کہ

کہنے کو تو دہن مٹی پر مزدور کی دفتر
امان کا دوپٹہ تھا اور آبائی مٹی چادر!
فاقوں میں یہ پیدا ہوئی عورت میں بی بی ہے
خود داری و تہذیب کے ساچوں میں دلچسپی ہے
مشکوہ اسے تقدیر کا کرنا نہیں آتا
برداشت کی سہارے گزرتا نہیں آتا
اسے جان پیر دیکھ دفت دار ہی رہنا
آئے جو مصیبت مٹی تو ہنس کھیل کے سہنا
پھر شرعہ کو غافلہ کر کے کہتا ہے کہ

کس طرح زندگی کو بوجھلا رنج و مہن دیکھ
مزدور کے اس زندہ جنازے کا گن دیکھ
اس نظم میں جو رفت اور تشریف وہ آئین وغیرہ کے مٹیوں کے علاوہ اور
کہیں نہیں تھا جس کا ہوا احسان کی خاص غفلت، آسان اور عام فہم زبان اور براہ
راست مشاہدے میں ہے۔ مزدور کی موت اور مزدور کا جہان، وغیرہ بہت
سی نظمیں حقیقت سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے ان ہی خصوصیات کی حامل ہیں۔
ان میں مزدور کا جذبہ صاف بھی ہے اور زندگی کی تڑپ بھی۔ اس کے
حال کی بے کسی بھی ہے اور بے بسی بھی۔ اسے کون سے پر اس کی نظر بھی ہے
اور زندگی کی خوبصورتیوں کو لچھائی نظر سے دیکھنے کی کیفیت بھی۔ اپنی محنت پر
ناز بھی ہے اور محنت کے بے صد ہونے کا شکوہ بھی۔ اس کی بے کلی بھی
ہے اور بے دردی بھی لیکن ان تمام مایوسیوں اور نا کامیوں کے باوجود اس
میں ایک جذبہ آثار و قربانی بھی ہے۔ اس میں خدمت کا جذبہ بھی ہے اور خدا
پر یقین بھی۔ وہ مردوں کے باوجود شکر ہے۔ اس کو اپنی قوت بازو پر
بھروسہ اور ناز ہے۔ اس بنا پر میں کہنے میں بالکل جھجک محسوس نہیں
کہ ناگوار احسان کا مزدور اقبال کے مرد مومن سے کسی طرح کم نہیں۔

احسان پر یہ اعتراض بالکل درست ہے کہ مزدوروں کے
دکھ درد کو اپنے دل میں محسوس کرنے والا اس بھی مزدور کے مسائل
کا کوئی حل نہیں بتاتا۔ اس کے سارے شکوے خدا سے ہیں۔ کبھی
کبھی ان شکوؤں میں احسان نے ترش بھی لکھی اختیار کیا ہے۔ مگر نہ وہ

سناج سے اس کا کوئی شکوہ کرتے ہیں اور نہ سناج سے مزدور کے لیے کچھ
مانگتے ہیں۔ اس کے جواب میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ چند نکلون میں
احسان نے اس مسئلہ پر سماج کو مجبور کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ
سناج کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے مگر انڈا زہمت زیادہ بھر پور اور نیچا
نہیں ہے۔ اس کی وہ صرف یہ ہے کہ احسان تقدیر پر بھروسہ کرتے ہیں اور
خدا کے علاوہ کسی کے آگے دست طلب پھیلانے کا بیوہ سمجھتے ہیں۔

یہ اعتراض بھی بجا ہے کہ احسان کے یہاں کوئی فلسفہ حیات نہیں ہے
مگر احسان کے کسی فلسفہ حیات کی امید بھی نا مناسب ہے۔ پہلی بات
تو یہ ہے کہ فلسفہ حیات دینے والے انسان کو زندگی میں بہت اور ذہنی
سکون دے گا کہ رہتا ہے۔ کم از کم شعرا کی طرح دو وقت کی روٹی کا تو ہمارا
ہونا ہی چاہیے۔ جس شخص نے عمر کا زیادہ حصہ سانس لینے کی جڑ بھد
میں گزارا جو اس سے فلسفہ حیات کی توقع کون کرے گا؟ اسے کب مسلم
حاصل کرنے کی بہت اور نکلون میں گھومنے کا موقع ملا؟ اگر مان لیا جائے
کہ انھوں نے اپنی زندگی بھر کی عمر کو اس کی کوشش نہیں کی کہ ان کی طرح روٹے
پر پیدا ہوئے اور خدا پر مزدور مل پر دم توڑے تو بھی درس حیات کے لیے ان
کی ذاتی زندگی کی کہانی ہی کیا کم ہے؟ پھر بھی احسان کی شاعری میں
فلسفہ خیالات اور فکر کبھی مفقود تو نہیں۔ ان کے یہاں ٹھکر کی گہرائی
بھی ہے اور خیالات کی بلند پروازی بھی۔ جس طرح ان کی زندگی رفتہ
رفتہ ارتقا کی مثال سے گزرتی تھی اسی طرح ان کے شکروں میں بھی
ارتقا کی روح قلمی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی غزلوں کے چند اشعار
لاحظہ ہوں۔

کریں گے عکس سے کیا خاک باتیں
بغل میں جن کے دھندلے آئینے ہیں
ہیں وہی لوگ ہم سے رہبروں میں
کہ جن کے ساتھ رہتے ہیں پڑے ہیں
ذرا غمزدار مگر رونے سے محتارے
کئی یہاں دشمن یاد آ رہے ہیں
یہ ان کی آخری غزل کے چند اشعار۔ اسی میں انھوں نے اس اہم حقیقت کا
اعلان بھی کیا ہے کہ

مرے اشعار جو ہوتے ہیں مشہور
خدا شاہ ہے ذاتی تجربے ہیں
احسان کی شاعری کا ہر شعر ذاتی تجربہ کی بت پر ہی ہے۔ توارد ممکن ہے
لیکن شعور کی طور پر کتاب کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ان کی غزل کا شعور
ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ یہ کہ ان کو احساس ہے کہ انھیں

اعتدال

مثیل یوان تو کبھی مثل شجر ہوتا ہے حد سے بڑھ جائے تو اک نوع دگر ہوتا ہے
 معتدل ہو تو بکھر جان بکھر ہوتا ہے
 اعتدال ایک کسوٹی ہے میرے ہر نفسو! اسی میزان پر رفت و عمل کو تولو
 دوڑ کے پھٹنے سے گرنے کا بھی ڈر ہوتا ہے
 ضبط نفس اصل میں ہے عفتِ انسان کی دلیل ہر قدم جس کا ہو متاد وہ دانا و عقیل
 صاحبِ حوصلہ و اہل نظر ہوتا ہے
 جو نہ امت کا سبب ہو وہ مناسب نہیں جوش تیز خوشبو بھی اڑا دیتی ہے انسان کے ہوش
 خبر بھی حد سے بڑھ جائے تو شہر ہوتا ہے
 بوجہ اتنا بڑھ کر شکستہ ہو کر ٹوٹ جاتی ہے وہی شاخ چمن میں اکثر
 یعنی جس شاخ پر کثرت سے پھر ہوتا ہے
 بارشِ موسمِ گلِ رحمتِ بزرگاں ہے مگر اس کی کثرت سے بھی اربابِ چمن کو اکثر
 قطرہ طوفان کا سیلاب کا ڈر ہوتا ہے
 ایک ہنگامہ ہے آگن میں تو گھر میں طوفان ہو جہاں کثرتِ اولاد کا اک سیلِ رواں
 ہمہ اوقات وہاں فقر و شہر ہوتا ہے
 کثرتِ غوغا ہے کیا سوزِ نہانی کے سوا آنکھ کا سیلِ رواں کچھ نہیں پانی کے سوا
 نون کا اک قطرہ بھی چپے تو گھر ہوتا ہے
 ایک ہی پھول کبھی ہوتا ہے جانِ گلشن ایک سورج ہی سے ہوتا ہے زمانہ روشن
 ایک ہی چاند اجالے کا نگر ہوتا ہے

غلیبی

شرر فتح پوری

میں اس جہان درد کا اُشب دیدہ ہوں
داس ہی چاک چاک نہیں دل دیدہ ہوں

پھر زبیر استاں ہو تو لطفِ بیاں بھی ہے
درِ زمیں و کربم میں حرفِ شنیدہ ہوں

اپنی ٹودے ہوں حریفِ وجودِ مرگ
آغوشِ زندگی میں اجسبلِ آئیدہ ہوں

خداں ہوں مثلِ زخم، تیرے لطفِ ناز سے
خوش ہو کر مرگب آرزو سے آبدیدہ ہوں

رُہوا کر دے مجھے کہ میں ننگِ عزل ہوں
ہاں کیوں سنو مجھے کہ میں غم کا قصیدہ ہوں

اک اک ورق ہے جس کا شرر نقشِ رنگِ رنگ
میں وہ غمِ حیات کا رنگیں جریہ ہوں

احمد رمضی

من کے برگد تلے انگاروں کی ملا بھی چپی
مجھے سے گو تم سے گر آگ میں چپا نہ کھلی

راتِ کمرہ میں جو تنہائی نے کروٹ بدلی
نیند آنکھوں میں کسی ساپ کا چمن بن کے آگ

میں نے بنجوں کے سمندر سے پکارا ہوا ہے
انگلیاں دیکھیں مگر ہاتھ کی لذت نہ مٹلی

میرے جس سانس سے میرے ہی بدن کی چادر
کون مجھے پرانے آئے یقین، کیسے جلی

ستمِ سنولائی نہ سورج نے سیمیٹی باہیں
اُس کے رنگ میں لمحوں کی خدائی دیجی

اس بھرے شہر میں اپنا یا کسی نے زبے
میں نے دیکھا تو عفتی لاش وہ میری نکلی

رضا امر و ہومی

کیسے نشانِ عشق ملے کچھ پستہ نہیں
یادوں کا اک ٹھہرا ہے قافلہ نہیں

آرائشِ جمال سے غافل ہیں مہمیں
پرھیا یوں کا شہر ہے اور آئینہ نہیں

مدھوں کے بارِ غم کو تو دل نے اٹھالیا
لمحوں کی طرح چکوں پہ آنسو ڈکا نہیں

ہر سمت دل فریبِ منظر کی دھوم ہے
خوشبو کے اس دیار میں بوئے دفا نہیں

مرکز ہوں ہر نگاہ کا میں جانے کس لیے
کیا اسے میکدے میں کوئی پارا نہیں

میری ہر ایک لغزشِ پاستیوں کا راز
انسان ہوں رکت میں کوئی دیوتا نہیں

• بلا ٹا ۲۳ - جی پبلیشٹ نئی دہلی ۱۰۰۰۱

• حرفِ چوہری برسِ طویلِ دانی (پیر ایچ اے) نکلا زبیر ہوں
• طبعِ مراد (پیر ایچ اے)

• فتح علی محمد کشمیر (پیر ایچ اے) ۱۳۲۰-۲۲

مختصر

محبوب راہی

ات کو دن کہوں، دن ہو تو اسے رات لکھوں
نی چوچا ہے زمانہ میں وہی بات لکھوں

پنا افسانہ زمانے کی حکایات لکھوں؛
ن میں آناسے کہ اب کوئی ظلمات لکھوں

شیشہ ربط چمچ جانے کا اندیشہ ہے
بشتوں ناطوں پہ اگر اپنے خیالات لکھوں

رب پہ پہنوں کو کہوں تحفہ افلاص و وفا
فرخندہاں کو ترسے چہار کی سوغات لکھوں

ماہ کامل میں کہوں ماضی نگین کو ترسے
بڑی زلفوں کو اماؤس کی سیدرات لکھوں

انکثافات کروں مگر ب کے مہر و کی کے
میں جو عنوان سرت پر مقالات لکھوں

فتح مندوں کے وہیں شہم سے سر جھک جائیں
میں اگر اپنی شکستوں کی وجوہات لکھوں

مصلحت مجھ کو گیسے دینی ہے مجبور کر میں
آگ کو برف لکھوں دھوپ کو برسات لکھوں

گرد اہمال سے جو پاک ہوں کیسہ راہی
ایسے اشعار کہوں ایسی عزایات لکھوں

جلیل ساز

اؤمیت کر بے فواہے بہت
ہر طرف شور و ارتقا ہے بہت

عقل کی مشعلیں فروزاں کر
چاند بے نور ہو گیا ہے بہت

رات دن کی نیاز مندی سے
صرف اک حرف ابھرا ہے بہت

کھلکا ہوا سنبھل سنبھل کے چلو
تیز تر آج کل ہوا ہے بہت

سوچ انہی گریہ کو، غنچے!
سکرانے کا حوصلہ ہے بہت

اہل دانش فحوش رہتے ہیں
اور کم حرف بولتا ہے بہت

کب نہ جانیں برس پڑیں آنکھیں
دل پہ چھائی ہوئی گھٹا ہے بہت

عہد ماضی کا تذکرہ نہ کرو
صاحبو! دل مراد کھلے بہت

ساز ہم سے خیر لوگوں کو
اک فب! ایک بویا ہے بہت

حیات لکھنوی

سلسلہ خوابوں کا بونیخ دھارہ جانے گا
ایک دن بستر پہ کوئی بگمنا رہ جائے گا

دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدلتے جائیں گے
اور مردوں سے بھرا دستِ دھارہ جانے گا

ہر صدائے فک کے وہ احسان تہائی میں ہے
اپنے ہی دیوار و درمیں گوشت رہ جائے گا

خواہشوں کے دشت میں کوئی جھلک بنے نام سی
اک پرندہ دور تک اڑ چکا رہ جائے گا

دو گھڑی کے واسطے اگر طے ہو گئے تم
پھر مری تہیوں کا سلسلہ رہ جائے گا

چار سو پیل ہوئی بے چہرگی کی دھند میں
ایک دن بے کس ہو کر آئینہ رہ جائے گا

اب تو کچھ یادوں کے سسے زندگی کے سات ہیں
کیا خبر سخی قریبوں میں فاصلہ رہ جائے گا

جو بھگ میں آئے بن جاؤ نصف ہوا رہے
وقت کے ہاتھوں میں پن فیصلہ رہ جائے گا

اب دیوں میں کوئی گھٹائش نہیں مٹی حیات
بس کہتوں میں کھس حرف و خارہ جانے گا

پندت سار

ہے مہی۔ لیکن ان کا اکھٹا ہونا کوشش کرنا ایک دو سال سے اپنے آپ کو برہن ہونے کی وجہ سے دوسروں سے کھلے اور بڑا بچنے لگا تھوہ مشروہ سال کا ایک جوشیلا اور پھر تیرا لڑکا تھا جو تین میل پر سے سناٹا و حرم ہالی اسکول میں دوسری جماعت میں پڑھنے جاتا تھا۔ ایک دو سال سے اس میں غلبہ تہی آرہی تھی اور دوسکول سے ہی دوسلے لگا تھا۔ اس نے کچھ گاؤں کے نو جوان لڑکوں کو اپنے ساتھ ملکر اپنا ایک گروپ بھی بنا لیا تھا۔ ایک دوسرے کو شرمینے لہنی مال سے کہا۔

ماں اپنا بیٹی کوئی بان مرلدا تو رکھیں۔ یہ تو کھیلوں، ملاہوں، چماروں اور کھیلوں سے بھی ایسے بات کرتے ہیں جیسے وہ ان کے برابر کے ہوں۔ ان ہی کی وجہ سے ہمارے مندر میں بھٹی اور چارک آجاتے ہیں۔ سکول میں ان کے بچے کسانوں کے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ کل انھوں نے راتوں کو اپنی بیٹی کا شرت بٹایا تھا۔ ملاں کو پٹیا جی کو بھما۔ گاؤں کے لڑکے ان پر دھڑکنا زیادہ برداشت نہیں کریں گے۔ ملین مشرکھن کی یہ باتیں سن کر کہت دھنی اور اس نے بیٹے کو بڑے پیار سے بھانا جا مل لیکن مشرکھن شے سے نہیں ہوا اور ملاں

کوشش چودھری مشیو نارائن نے ہی کی تھی۔ گاؤں میں دوسرے خبر پر پنڈت برہم دت تھے۔ پنڈت برہم دت گاؤں کے اسکول کے ماسٹر تھے اور بہت ہی سادہ اور ملنا آدمی تھے اور ہر وقت انسان کو اخلاقی طور پر ادنیٰ بنانے کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ پنڈت برہم دت کو کچھ لوگ پنڈت جی اور کچھ ماسٹر ہی کہاتے تھے۔ چودھری مشیو نارائن اور پنڈت برہم دت نے اس گاؤں کے لیے بڑا کام کیا تھا۔ ان دونوں ہی کی وجہ سے گاؤں میں مذہب، ذات اور کام کی بن پر سب بھداؤ ختم ہو گیا تھا۔ آج سے پندرہ سال پہلے تک گاؤں میں ہر بیٹوں کا کوٹاں الگ تھا، لیکن اب کوئی کوٹاں ہر بیٹوں کا نہیں تھا اور وہ میں کوٹیں سے چاہیں پانی لے سکتے تھے۔ اسی طرح سے گاؤں میں چھوٹا سا مندر تھا اس میں ہر بیٹوں کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ پنڈت برہم دت کے اسکول میں اب کوئی ہر بیٹن بچت الگ ٹاٹ کے ٹکڑے پر نہیں بیٹھا تھا سب بچے اپنی کلاس کے مطابق لی جن کر ایک ہی ٹاٹ پر بیٹھے تھے۔ پنڈت برہم دت کی اسے گاؤں میں عورت ان کے پنڈت ہونے کی وجہ سے نہیں ملکر ان کے بلند کردار اور خیالات کی وجہ

گنگا پور کسی اور گاؤں کی طرح ایک چوٹا سا ٹنٹ گاؤں تھا۔ اس کی آبادی مشکل سے تین ہزار ہوگی۔ ذات اور مذہب کے لحاظ سے بھی یہ گاؤں کسی اور گاؤں کی طرح ہی تھا۔ زیادہ آبادی ہندو کسانوں کی تھی۔ میں نہیں مگر مسلمان چلوں اور کاشتکاروں کے تھے اور تعزینا اتنے ہی مگر پچھلی جاتیوں کے لوگوں اور ہر بیٹوں کے تھے۔ یہ لوگ بھی گاؤں کے محاشہ بے اور زندگی کا ٹوٹ حصے تھے زیادہ تر لوگ بڑے کھے نہیں تھے لیکن ابھی بھوجہ رکھتے تھے۔ ایک دوسرے کی عزت اور اور کرنا اور وقت پھٹنے پر دوسروں کی مدد پر جٹ جانا سب گاؤں والوں کا شیوہ تھا۔

گنگا پور کی لہنی پھر پور سماجی زندگی تھی۔ تیج تھوڑا، ریاست دی اور میلے میلے ہونے ہی رہتے تھے مگر اس گاؤں کی بنیادیت بھی سارے معاملوں میں پوری دی چلی رہی تھی۔ پنڈت کے پردھان گاؤں کے سب سے بڑے کسان چودھری مشیو نارائن تھے۔ چودھری مشیو نارائن کوئی ساٹھ سال کے ہوں گے اور بہت ہی کھلے راقی اور بردبار آدمی تھے۔ اس وقت وہ بھلی چارہ گاؤں میں بنا ہوا تھا اس کے لیے سب سے زیادہ

انکار ہاں کہتوں کی طرف نکل گیا۔ ماں نے جب ڈنٹے ڈنٹے شام کو پتہ نہایت سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے۔

”میں تو بہت دنوں سے اس کے بہت چاہتا ہوں۔ اس لڑکے کی محبت خراب ہو چکی ہے مگر چاہے وہ میرا بیٹا ہو اس معاملے میں ضبط نہیں ہوں۔ میرے کانوں میں تو یہ خبر بھی پڑی ہے کہ یہ لڑکا لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر اب کی رام لیل کے موقع پر ہر یجنوں کو مست دین نہیں گئے دے گا۔ ایسے بھوت کے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اب مجھے اسے بیٹا کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے“

شتر و گھنہا سہتی گڑبگڑا تھا وہ کوہ کوگوں کے اثر میں آ کر رہ رہے تھے کہ ہر یجن اور پھر ہر یجن جاتوں کے لوگ اونچی جاتی کے لوگوں کے سب سے کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اس قابل نہیں ہیں کہ اونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ انھیں نہیں رہتے شتر و گھنہا ان لوگوں کو برا دیکھتے تھے گنگا گنگا اور انھیں چونا بھی پاپ بھگتا تھا ایک دفعہ ایک تنگ لگی میں کھلا ہر یجن اس سے چھو گیا تو اس نے کھوکھو بہت برا بھلا کہا مالا مال کو اس کے پاپ کے برابر تھا۔

جوں جوں دسہرے کے دن نزدیک آ رہے تھے گنگا پور میں روٹی بڑھتی جا رہی تھی۔ گاؤں کے لڑکے ہر روز تیر کمان، تلوار اور رنگ رنگی جینٹیاں بنا رہے تھے اور طرح طرح کے کھیل کھیل رہے تھے۔ انھوں نے دسہرے والے روز راؤن کا ایک پتلا بنا کر جلانے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر شتر و گھنہا بڑی اور ہی بھوت سوار تھا وہ لوگوں کو یہ سیکھا رہا تھا کہ میلے میں کسی ہر یجن کو ڈانے دیں اور کوئی ہر یجن آئندہ سے منہ میں گھسے گا۔ شتر و گھنہا کے ساتھ کئی نا بھولے لڑکے گئے تھے اور وہ اپنا گروہ مضبوط بنا رہا تھا۔ ان میں چودھری شیو نارائن کا لڑکا جگت بھی تھا۔

جگت نے اپنے دادا کے وقت کی سہری بہیلی نکال لی تھی اور شتر و گھنہا اور جگت یا تو اپنی مائیکلو پر اور یا اس بہیلی پر اس پاس کے دیہات میں گھوم گھوم کر یجنوں کے خلاف زہر پھیلا رہے تھے۔ شتر و گھنہا کی ان حرکتوں سے تنگ آ کر ایک روز پتہ نہایت پر ہم دت نے اس پر ہاتھ بھی اٹھا دیا مگر شتر و گھنہا پر اس کا بھل کچھ اور ہی ہوا اور وہ اس کو کشش میں کر کے باپ سے سامنا نہ کر سکی تھی رات گھڑا اٹھا اور دوستوں کے گھر چلا گیا۔

ایک روز جب شتر و گھنہا سائیکل پر بنی میں تنہا نے جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ کھوا کی لڑکی دھتورہ اونٹوں کی لڑکی چبا اپنے گھٹے منہ کے باہر والے کونہیں سے بھر رہی تھیں۔ اس کوئیں سے پانی شتر و گھنہا کے گھر بھی جا رہا تھا۔ بھی کافی سو رہے کہ وقت تھا اور کونہیں پر ان لڑکیوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا شتر و گھنہا نے اپنی سائیکل روک لی اور کونہیں کی طرف بڑھنے لگا۔ کونہیں کے پاس اس نے سائیکل کو پھینک کر دی۔ وہ ان لڑکیوں کو اس کو کونہیں سے پانی بہرتے دیکھ کر آگ بگڑا کر گیا تھا۔ پہلے تو اس نے آگے بڑھ کر ان لڑکیوں کو خوب سنائیں اور پھر اپنے ڈنڈے سے بھروسہ ہر وقت اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا وہ لوگوں کو گھروں کو توڑنا ہوا سائیکل پر چڑھ کر ندی کی طرف جاگ گیا۔

دسہرے سے تین دن پہلے شیو پوجا کے موقع پر واقعی شتر و گھنہا اور اس کے ساتھیوں نے منہ میں کسی ہر یجن کو آٹے نہیں دیا۔ لیکن اس کے لیے اس نے اپنے باپ سے کھلم کھلا ٹکر نہیں لی۔ پہلے تو اس کا ارادہ تھا کہ اس روز منہ کے باہر وہ اور اس کے ساتھی لڑکے انھیں لے کر کھڑے ہو جائیں اور کسی ہر یجن کو آٹہ نہ دے دیں مگر بعد میں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا کیونکہ اس میں باپ اور چودھری شیو نارائن

سے جھگڑا لڑی تھا اور وہ اور اس کے گم کے آؤی بڑی اہمیت میں تھے اور پتہ یہ وہ پتہ بھی جانتے۔ شتر و گھنہا کے ایک ساتھی رام بھروسے جو مصلح دی دوزیادہ کھرا گئی اور شتر و گھنہا اور اس کے ساتھی توڑا نہاں گئے۔ مصلح دی بڑی کڑبڑ پوچھا سے ایک دن پہلے وہ ہر یجنوں کے گھر جا کر انھیں یہ زبردست خبر کہ انھیں گے کہ گھر کی پوجا کے موقع پر ان کا کوئی بھی مواعیت یا بچہ منہ میں گھسا تو ان سب کی خیر نہیں اور ان کا گاؤں میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ تمام ہر یجن ڈنڈے اور اس روز شام کو پوجا کے وقت سے بہت پہلے ہی وہ اپنے گھروں میں دیکھ کر بڑھ گئے شتر و گھنہا جگت اور ان کے ساتھی خوش تھے کہ کوئی ہر یجن پوجا کے دن منہ کی طرف بھی نہیں گیا لیکن گاؤں میں نفرت کی اس بڑھتی ہوئی لہر کو دیکھ کر اس روز جن لوگوں کے دل روئے ان میں چودھری شیو نارائن اور پتہ نہایت پر ہم دت بھی شامل تھے۔ اس کے اگلے ہی دن پتہ نہایت پر ہم دت کے گاؤں میں یہ خبر بھی پہنچی کہ شتر و گھنہا اور جگت نے مولوی صاحب کے درے کے ریکو کو صرف اس بات پر خوب مارا کہ اس کی عمر ہی رام بھروسے کے گھر میں گھس گئی تھی۔ اصل وجہ یہی کہ شتر و گھنہا اور اس کے گھر اس کا ساتھی آپ سناؤں سے بھی فائدہ کھانے لگے تھے۔

دسہرے والے دن کی بات ہے شتر و گھنہا اور جگت اس روز صبح سے اپنی بہیلی میں سوار اداہر اڈھ بھر لگا رہے تھے۔ پھر وہ کسی دوسرے گاؤں میں بھی چلے گئے۔ گاؤں کی پری طرف میلہ صبح سے ہی بڑا شہر ع ہو گیا تھا اور جگت نے اپنے کچھ ساتھی اس جگہ چھوڑے تھے جہاں راؤن کا پتلا کھڑا تھا۔ پاس ہی رام اڈھریتا کی ایک بھانجی بھی لڑکیوں نے بٹکر کھڑی کر دی تھی۔ ان ساتھیوں کی بیڑ پوٹی تھی کہ وہ کسی ہر یجن کو میلے کے اس میں دے ڈالتے دیں۔

شتر و گھن اور جگت کا ارادہ پہر کو میلے میں جانے کا تھا۔ بھرا ہی وہ پوش و فرخش میں اپنے ساتھیوں سے ملے ہوئے کھڑے رہے تھے۔ وہ پہر کے دو بجے ہوں گے۔ وہ ہوا کی سی تیزی سے بل کو اڑنے شتر کے ساتھ اپنی کچی سرک پر گنگاپور لوٹ رہے تھے۔ دونوں میں خون کا پوش تھا اور وہ بل کی دم کھرد کر لے زیادہ سے زیادہ ہانک رہے تھے۔ گاؤں کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی میل کا ایک پیہر راستے میں پڑے ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور کھل کر دو ہانگہ شتر و گھن اور جگت بری طرح پتھروں کے ایک ڈھیر پر سرسکے بن گئے۔ دونوں کے سروں اور ناکھوں سے خون بہنے لگا اور جگت تو گتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ پہلی کے پیچھے کے ٹوٹنے اور جگت اور شتر و گھن کے گرنے کا فطری میل کی بھڑکنے تو نہیں دیکھا کہ نہ کہ میل تو گاؤں کے دوسری طرف بھر رہا تھا مگر کلہا اور اس کی لڑکی دھڑو اور نوانے دیکھا کہ نہ کہ وہ ہر کے کنارے کنارے پتھر لگا رہے تھے۔ وہ تینوں ایک حادثے کی جگہ پہنچے۔ دھڑو نے فوراً اپنی دھوئی کا پتو اڑا کر اس کے دو ٹکڑے کر لیے۔ وہ اپنے ٹوٹنے میں پانی بھرا لائی اور اس نے شتر و گھن اور جگت کے

زخموں کو دھو کر دوسرے سے اس ان پر شیل بانڈھ دیں۔ اس کے بعد ان سب نے پانی کے چھینٹے ان دونوں کے مز پر مارے جس سے ان کو کچھ ہوش آ گیا لیکن منہ سے کچھ نہ بول سکے انھوں نے ایک اور آڑی کو بلا یا اور دونوں کو کھانچ پاس ہی اپنی جھوپڑی میں لے گئے۔ کلہا کی جھوپڑی یہاں سے پاس ہی تھی۔ دھڑو کے گھر میں تھوڑا سا دھڑا تھا اور اس نے گرم کر کے اور اس میں تھوڑی سی ہلدی ملا کر دونوں کے منہ میں تھوڑا تھوڑا ڈال دیا۔ اتنے میں بل ایک پیچھے کی پہلی کو گھسیٹا ہوا گھر پہنچ گیا تھا اور گاؤں کے بہت سے لوگ انھیں تلاش کرتے ہوئے جھوپڑی میں پہنچ گئے۔ شتر و گھن اور جگت اب پوش میں تھے اور وہ کلہا اور دھڑو کی چارپائیوں پر بٹے ہوئے دھڑو سے اپنے زخموں پر دھڑو کی پٹیوں لگاوا رہے تھے۔ یہ لوگ دونوں کو چوہدری شیونارائن کے گھر لے گئے اور وہیں چارپائیوں پر لٹا دیا۔ اتنے میں خبر سننے ہی میلے میں سے چوہدری شیونارائن اور پنڈت برہم دت بھی آ گئے اور گھر پر اچھی خاصی بیہوش آگئی ہو گئی۔ سر شام راون کے پتلے جلتے ہی گنگاپور کا دوسرے کا میڈنم ہو گیا مگر میلے سے لوٹتے

ہی گاؤں کے بہت سے لوگ جن میں ہر بھن، کھنک اور چلاے سب شامل تھے، چوہدری شیونارائن کے گھر شتر و گھن اور جگت کو دیکھنے پہنچ گئے۔ اس پہلی جھوپڑی کو دیکھ کر، جس میں مولوی صاحب اور ان کا لڑکا بھی تھا، شتر و گھن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے پہلے تو کرپو سے معافی مانگی اور اسے بھائی کہہ کر کپارا اور پھر دھڑو کو کھڑا دیکھ کر اسے لایا اور اسے چارپائی پر بٹھا کر پنڈت برہم دت کے سامنے ہی بولا۔ ”ہن دھڑو میں آج تھوڑی وجہ سے زندہ ہوں۔ کچھ دن ہونے میں تو تھوڑا اور بہن چپا کا بیان کیا تھا۔ میری آنکھوں پر جراثیم کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آڈر میں پتہ کا دل بھی دکھایا۔ میں موہن کو اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکا کہ ہم سب ایک اور براہر ہیں۔ کیا تم مجھے معاف کر دو گی؟“

الہاڑو مصوم دھڑو کچھ نہ سمجھی اور شتر و گھن چلی گئی اور ایک کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اس حادثے کے باوجود لوگوں میں ایک خوشی سی تھی اور سب سے زیادہ خوش تھے چوہدری شیونارائن اور پنڈت برہم دت۔ جموں نے اپنے اصولوں کی خاطر گمراہ راکوں کی طرف داری نہیں کی تھی!

بقیہ : مزید اوزان رباعی

امداد کی گنجائش نکل سکتی ہے۔
جواب: یکساں پہلے بیان کر کے کہ رباعی کا اخراج بحر ہزج سے کیا درست ہے جن کا اخراج ”مغناطی“ اصل بحر ہزج سے ہوتا ہے۔

قانون ”سبب پہ سبب“ ... ”فعل بحر ہزج سے حاصل کروا رباعی کے اوزان کے لیے ہے۔ اگر رباعی کے بعد اوزان کسی اور کے ہوں گے! جاسکتے ہیں تو اس قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ وہاں صرف حکم معاصر ہی کا دخل ہے جب کہ ہم نے رباعی کے بعد اوزان بحر ہزج سے نکالے ہیں جن کا ذکر ہماری تصنیف ”کلید عروض“ میں موجود ہے۔ ہشتہائی اوزان ایک لوز مال چپا

مفعول	مفعول	فاصل	فعل
سبب	سبب	سبب	سبب
مفعول	مفعول	فاصل	فعل
سبب	سبب	سبب	سبب

ایک سوال: قانون ”سبب پہ سبب“ ... کے تحت یہاں پر غور کرنے سے چھٹکے کہ ”مغناطی“ کی جگہ ”مغناطی“ اور ”فاصل“ کی جگہ ”مغناطی“ ہی لایا جاسکتا ہے۔ نیز ”فاصل“ لائے ہی دو اوزاد کا مجموعہ ہے۔ کیا رباعی کے اوزان کی تشکیل میں ان اوزان کا عمل بھی ہو سکتا ہے؟ اگر عرض اس امر کی اجابت دیتا ہے تو رباعی کے اوزان میں مزید

فارورڈ : بیک ورڈ



انہوں نے مجھے پچھرا اور ٹھہرتے ہوئے
 آگے بڑھ گئے۔ سائیکل کی طرف تو وہ دھڑکی
 طرت گرے۔ وہ سڑک پر گرے ہوئے تھے۔
 پوری دنیا اسی طرح چل رہی تھی، جس رفتار میں چلائی
 سائے سنائی اور اپنی عمارت پر چلائے تھیں کی
 لڑیاں مل چھوڑی تھیں، جس سے پوسٹروں پر نیم
 عرباں ہم بیٹھے ہوئے معلوم ہوئے۔ جو بچہ بچہ
 میں لگ کر کچھ ہنس پڑتے۔ لوگوں کی بھیر، چل پل
 اور رونق اپنے میں مست۔ سنیائے بائیں طرف
 گلی گھومتی سڑک پر بے شمار کاریں، اسکوٹر، منہ
 دھانیں بچہ میں ہارک اور زنجیں قرارے....
 سب کے چھپے نلک بوس عمارتیں ان میں ملتی
 ہوئی بنیاں ستاروں کی طرح دکھائی دے
 رہی تھیں۔ آسمان میں گھنٹی ہوئی نیکیلی گھڑکیاں
 یہ سنسنی ذات اور مردی کا احساس کر لیا
 اگر وہ زمین پر گرے ہوئے تب شاید اُچھڑ گیا
 بھی نہ جاتا..... جس دنیا سے ہم لڑ رہے
 ہیں وہ آسمان سے جاگے۔ اور ہم کہاں رہ
 گئے؟
 اُنہیں ساتھ لے کر اپنا آسان نہیں تھا۔ کبھی
 وہ لڑاکا جاتے تو کبھی اُن کا سائیکل۔ ان کے
 تھیلے کی نلک سے زادہ تھی۔ اسی میں ان کا
 سب کچھ بند تھا۔ ایک گھنٹہ میں شکل سے ہم ایک

اور دنیا کی باتیں سن رہے ہیں۔
 ”آپ کا کھر کہاں ہے؟“ ایک جھٹکا لگا۔
 اتنے برسوں سے ہم انہیں جانتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں
 معلوم کہ ان کا کھر کہاں ہے؟
 ہم صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ فزئیر گھڑی
 شاپ کے مالک ہیں۔ ان کا پورا نام بھی معلوم
 نہیں تھا۔ غلامت سے سرو تو نہیں جھکا پر اندر ایک
 زخم کی طرح کچھ محسوس ہوا۔
 ”کہاں رہتے ہیں آپ؟“
 ”ساری دنیا میں“
 اُن کا جواب پہلے صدمے سے بھی مہربانی
 ضرب تھی..... اندر تک تھوڑی طرح کا فانی ہوئی۔
 وہ ہم سے اور ہمارے مقصد سے جڑے ہوئے
 ہیں۔ ہم ان کے قریب ہوئے ہوئے بھی کتنی دور
 ہیں؟
 ”آپ سائیکل پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو
 ابھی چھوڑ آتا ہوں۔“
 ”آگے نہیں بیٹھوں گا۔“
 ”چھپے بیٹھ جائیں۔“
 ”چھپے بھی نہیں بیٹھ سکتا۔“
 ”ہیں دس میل دور جانا ہے؟ استاد؟“
 ”نہ گئے نہ چھپے۔ ایک ساتھ، بالکل ساتھ“
 ساتھ“

کچھ قدم چلتے ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
 بات کچھ اور تھی۔ کہیں انکی بوٹی، جسے جلدی جھٹکا
 شکل تھا۔ ویسے بھی سڑائی اول مول باتیں کرتے
 ہی ہیں۔ لیکن استاد کی چھکانی باتیں کسی گھرے دکھ
 میں ڈوبی ہوئی تھیں، جو ان کے ذمہ رہنے کے
 انداز کے بالکل برعکس تھیں۔ وہ سچے بے فکر اور
 زندہ دل انسان۔
 یونین آفس کی طرف جاتے ہوئے راستے
 میں ان پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا۔ گھر فلوں
 سے بھرا تھیلہ فٹ پاتھ پر لگا ہوا تھا، سائیکل بچہ
 سڑک میں، وہ اپنے عمارت کے چوڑے ساتھ اُٹھنے
 کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لایاں تک لہے
 تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کو ان سے
 نہ کوئی سروکار اور نہ ہی کوئی واسطہ۔ یہ ٹھہری
 زندگی کا ایک سچا منظر لگا۔
 تھیلہ اٹھا کر کندھے پر ڈالا، سائیکل گھڑی
 کی، اُنہیں بھی اٹھایا تینوں کو ایک ساتھ ساتھ جانا
 بہت مشکل لگا۔ ضرورت سے زیادہ پی لینے کے بعد
 وہ وہاں تھے، جہاں سے دوسری دنیا شروع ہوتی
 ہے، جس کا رشتہ اس دنیا سے ہوتے ہوئے بھی
 کہیں اوجھل ہو جاتا ہے..... لگتا ہے ہم کسی

نیل ہی چل پائے۔

مجھے سیاسی قسم کی اس کلاس کی فکر ہوئے گی، جس میں آج مجھے ہونا تھا۔ وہاں اب میرا انتظار کر رہے ہوں گے؟

رات کو جب استاد کی مکان بند ہوئی، کلاس کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ سب ڈاکڑوں کے سامنے برقعائی جگہ تھی، وہی سارا سکول بن جاتی۔ آدھی رات تک وہاں بات چیت ہوتی۔ ہر روز ایک سماجی کسی نہ کسی مسئلے پر ہوتا۔ ہم کبھی کے کھینے کے نیچے ٹھاٹھا رہے ہوتے، ان کے سائیکل کی گھنٹی بجتی۔ تھیلے میں سے بڑا کھانا نکال کر کھتے۔ نوکریاں امرت پور۔ میں انکار میں سر ہلا دیتا۔

"زندگی کے لیے لڑنا ہے۔۔۔ اور زندگی کو پیٹھ پٹا کرنا ہے۔۔۔ یہی زندگی ہے۔۔۔ نہیں پیتا تو ہم چلے۔۔۔ یہی ان کا معمول اور پھر رات میں ہمیں اوروں کا کھانا کھانے کا انوکھا انداز۔ اسی وقت ان سے کچھ باتیں ہوتیں اور ہم کچھ ہلکے ہو جاتے۔ ہماری تھکن تو رات ہی ان کی تھکن بھی کچھ منٹوں میں کاٹ دیتی ہو جاتی۔ کبھی کبھی ہماری سماجی باتوں میں جب کہ کر اٹھتے تھے۔

اس خوشحال علاقے کے سب ہی مزدور تھیلوں کے دفنان کی دوکان کے قریب تھے۔ وہاں دن بھر لگا لگھی رہتی کبھی نخرے گونجتے، کبھی کس جگہ سے جلوس شروع ہوتے۔ جب کبھی انہیں دن میں دکھائی دے جاتا تو فوراً ان کی آواز سنائی دیتی۔ چائے کے پیالے کے ساتھ تھپڑے شہر کی اہل کار خلاصہ لیتے چلے آتے۔

وہ دوسرے علاقے سے عزت کا کام لے آتے اور سستے داموں پر کرتے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ بدقسمتی سے عزت اسی طرح کی مارکیٹ میں جاتی۔ نہ ہی کوئی ٹھکانہ اس طرف آتا۔ صبح آٹھ بجے ان کی دوکان کھل جاتی۔ رات تک وہ کسی نہ کسی گھڑی پر ٹھکے کام کیا کرتے۔ ایک آٹھ پر

آج کل نئی دہلی

پڑھا شیش، دوسری بند تھی۔ دونوں ہاتھ گھڑیوں کے انچ بڑے گرد گھومتے رہتے۔ جیسے ہی گھڑی تیار ہوتی ہے جوتے۔ جلیق ہوئی تھی کے پاس ٹوک کر اسے دیکھتے۔ کچھ سوچے گئے۔ اور مسکرا اٹھے۔

سفید شلوار، سفید قمیض، پاؤں میں پٹاؤ کی چمچ، ماتھے پر گندھا ہوا بھول، ہمیشہ کچھ نہ کچھ گنگناٹا ہوا سر نہ جیتا ہوا چہرہ۔

وہ پھر مرگ کے بیچ بیچ گئے۔ سر کے جوڑ کی طرح حرکتیں کرتے ہوئے کچھ گمانے گئے۔ "ایک ساتھ.... قی.... دم.... م...." ٹوٹا ہوا کفرے اور جھلے گئے اور چور جاتے۔ اب ہم اس سرگ پرستے چور پر شہر کی طرف جاتی ہے۔

میں نے تانگہ روک لیا۔۔۔ کوچان آڑ کی کو ایک سواری آگے اور دوسری پیچھے بیٹھ گئی۔

"آپ آگے بیٹھ جائیں۔"

"تم بیک ورڈ ہو جاؤ گے۔"

"پھر آپ پیچھے بیٹھ جائیں۔"

"تم فارورڈ ہو جاؤ گے۔"

"آپ ٹریس ٹریس میں آپ ہی آگے نہیں۔"

"مجھے بیک ورڈ نہیں ہونے دوں گا۔"

کوئی دوسرا وقت ہونا تب مجھے ان کے اگلی فلوپوں پر پہنی جاتی۔ ایسا نہیں ہوا۔ اس بات پر شرم محسوس ہوئی کہ وہ اس کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ اگر ہمارا کام اپنی ہی زبان میں ہوا جوتا تب ہم زیادہ لوگوں کے دلوں میں ہوتے۔

ایک ٹھکانا آتا ہے، جب ہم بہت سی ہاتھوں بافلوں کو محسوس کر لیتے ہیں۔ وہ ہم کو ایسا ہی تھا،

جب دوسروں کا کرکٹ اپنا بن جانا ہے۔۔۔ ان کی اچھی ہوئی پائیں میری کھج میں آئے تھیں۔ اب ہمیں بدل کر اپنا جانا تھا۔

"شاعر صحافی ہونا ضرور کوئی گرم نظم سنانا۔"

وہ مرگ کے کنارے بیٹھ گئے۔

شاعر صحافی فیملی سے نکلا لاہور آمدورفت۔

جیسے جلوس میں انقلابی گیت گاتا۔ وہ استاد کو گھنٹوں شہرت نہا کرتا۔ استاد کسی کے کھاکرتے۔ "روں میں خون ڈھرتے گاتا ہے۔ روز کیوں نہیں آتا؟"

وہ اس کے ڈپے پتے جم پر دھول جاتے اور اس کے لیے کچھ کھانے کو منگواتے۔ گلاس بھر کر دیتے۔ "لو۔۔۔ ایک ہی سانس میں ختم کر دو۔"

شاعر صحافی پر دانہ اور کھجند ان سے ایک ایک گھڑی مار چکے تھے۔ وہ کھڑکیاں دہم کر دیکھتے ہی کام بند کر دیتے۔ دوکان سے باہر نکل آتے۔ اس کی طرف گھورتے۔

"کھانا کھا یا کر نہیں؟"

وہ انہیں ڈانٹا اٹھالانے۔ اسے زبردستی کھلاتے۔ اور خوب ڈانٹنے کا خالی بیٹ دینا کو فیس کٹے کر لے لے جب سے انہیں معلوم ہوا کہ بارہ و دودو دن بٹھو کا رہتا ہے۔۔۔ تب سے ان کی آنکھیں ہر وقت اسے کھوتی رہتیں۔ ہم سب میں بیجا بہت خاموشی اور رنجیدہ سماجی تھا۔ استاد کی پار سے اس کی سوچ کا سلسلہ ہمیشہ ٹوٹ جاتا۔ وہ بڑ بڑاٹ میں ادھر ادھر دیکھتا۔ وہ پھر اپنی جگہ ٹوٹ جاتا اور پھر وہیں کھو جاتا۔ جہاں بیٹھ جاتا۔

مفتی زاد کھاسر پر ہوا تو تھا کہ چلا کر۔ وہ ان کے پاس کو کھڑا ہو جاتا۔ موٹے عضلات کے پیچھے سے اس کی خشک آنکھیں انہیں گھورتیں۔ اس کے تھیلے میں موٹی موٹی کتابیں ہوتیں۔ جن کا علم وہ آسان زبان میں کھانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا۔ لیکن اس کی آسان زبان بھی لوگوں کو مشکل لگا کرتی۔۔۔ اسے کبھی فقرہ نہ آتا۔ اسی لیے وہ مرتا سے اسے اجازت کرتے۔

وہ گھڑی وقت کرتے رہتے اور بچاؤ کی دھمکی آواز گونجتی رہتی۔

استاد کے اندر کچھ ہے، جسے وہ بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ وہ اندر سے بہت بے چین ہیں۔ کبھی کبھی وہ اس ہلے کے بعد بچاؤ کا کرتا۔ لیکن

تھے۔ اتفاقاً ان کے محل میں پھنس کر رہ چلے۔
 بی بی ری... ری... ری... بی بی...
 وہ پھر رونے لگے۔ انہوں نے کسی کو
 ایک دوپٹہ اپنے ماتھے پر مارا۔
 ”پرستش! اچانک اُن کے مونہ سے
 نکلا۔
 ”کیا آپ رشتہ کا میرا ہے؟“
 ”ہاں؟“ انہوں نے کھڑے ہو کر مجھے جانوں

میں پھیر لیا۔
 میری آنکھیں پھر اُٹیں۔ اُن کے سینے میں اس
 گھڑی کا ذکر بالکل کسی جاوید چٹری کی طرح تھا۔
 وہ اپنی عجوبی دنیا میں اس دنیا کو فرما کر بدل دینا
 چاہتے تھے۔
 ”اب تو اکیلا اس دنیا کو بدل سکتا ہے۔
 اسی لمحہ باتوں سے کچھ نہیں ہو سکا۔“

اُن کا اشارہ ہمارا ان ہی لمحوں کی
 طرف تھا جس کی وجہ سے ہم بٹ چکے تھے اور اُسید
 کی جواب کی کہ تھی، کھو چکی تھی۔ اُن کی ہونے والی
 گھڑی جیسے امید کی کرن تھی۔ جیسے ہی وہ کسی پری
 کھتا مبینا بکائی گئی تھی۔

گندے نامے کے اوپر چڑھ کر لڑکی کے ہن
 کو ہار کرتے ہوئے ہم اُس گلی میں داخل ہوئے جہاں
 بہت سی بریکیں باؤت کی طرح کھڑی تھیں۔ پوری
 گلی میں دُور تک چارباؤں پر پلگ سڑ رہے تھے۔
 ایک ہی دروازے میں ایک عورت دکھائی دی، وہی
 اُن کا گھر تھا۔

ایک اُمّی کو دیکھ کر عورت ٹھٹھک کر پچھے
 ہٹ گئی۔ تھکے آئے دیا۔ سائیکل دھار کے
 ساتھ کھڑکی کا اوڑھنا۔

”انہوں نے مجھے بچھا اور اندر دھکیل دیا۔
 ”نہیں۔“ عورت کے چہرے پر خوف
 کی جھپا لڑ گئی۔
 میرے قدم رک گئے۔ ایک نامعلوم دروازے
 اندر کھینچ پیدا ہوا۔ میں نے گھر ہار کر ان کی بیوی کی طرف

دیکھا۔ اُن کے ماتھے پر بھی وہی گندنا تھا، جیسے
 اُس دن کے ماتھے پر تھا۔ اُس وقت ایک کھجور کی
 طرح ڈنک مارتا ہوا لگا۔ میں نے بہت سے گھر
 دیکھے ہیں۔ کئی گھر کی اجنبی کے آنے ہی ننگے پوجائے
 ہیں۔ کئی گھر کچھ گھر نہیں رہتے۔ وہ ہمیشہ کے لیے
 غم ہو جاتے ہیں۔ کئی گھر وہیں رہتے ہوئے بھی
 وہیں نہیں رہتے۔ یہ کیسا گھر ہوگا جو کسی اجنبی کے
 آنے سے پہلے ہی بدل گیا ہے۔

”کارڈ کے لیے راستہ چھوڑ دو“
 ”آئیے۔“ اُس نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔
 ”اے اب کون سا میرا ہوتا ہے۔ آج
 وہ کھوکھا بھی اٹھا کر لے گئے۔“
 ”نہیں۔“ ہم اُڑ گئے۔ اُن کی بیوی نے
 زور کی جھنجھاری۔

”کیا کہہ رہے ہیں اُس دن؟“
 باہر سوتے ہوئے آدمیوں میں چلی ہی ہوئی۔
 ایک سیخ کے ساتھ سب بدل گیا۔ اتنی سی دیر میں
 وہ دوسری عورت بن گئی۔ تھکے سونے ہوئے
 ایک بہت چھوٹی سی خوش انداز مٹھی تھی اُن کا لفظ
 نہیں ہوا۔ اب لگا جیسے اُن کی تباہی کا بیج اُس نے
 کر میں ہی آیا ہوں۔

اُن کا کھوکھا بھی آج اُڑ گیا۔ دوکان
 چار چھپے پھلے گرا دی گئی تھی۔ اتنے مہینوں میں
 ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ اب اُن کا گزارہ کیسے
 چل رہا ہوگا۔ کام بہت کم ہو چکا۔

راتے میں دوتے ہوئے انہوں نے ایک
 دارالحکومت کی سڑک میں برابر ملا کروں۔ تب اس میں
 یہی دُور ہو گیا۔ وہ اپنا ذاتی غم مجھ سے برابر
 چھپاتے رہے۔ شاید کھوکھا اُڑنے کا بھی اتنا
 غم نہ ہو جتنا ہم سب سے الگ ہونے کا۔

خوشے آٹھن میں سوئی ہوئی لڑکیاں اُٹھ
 کر بیٹھ گئیں۔ گیارہ لڑکیاں۔ وہ مجھے دیکھتے
 ہی چیخ اُٹھیں۔ مجھ سے ہونے لگے ہلکے بال سب
 کو دُور دُور بنا رہے تھے۔ سب کے تن پکچھے اور

مناہیں تھیں۔

یہ منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ ایک
 جھوٹے کی مادہ کی طرح دل دہلا دینے والا تھا۔
 ایک جھوٹے کی مانند زخمی کر دینے والا۔ انہیں
 دیکھنا میری طاقت اور قابو سے باہر تھا۔ میں پھر
 بیٹا۔

”بھواری۔“ اُن کی روتی ہوئی بیوی کے
 دونوں ہاتھ چلنے چلنے ہوئے تھے۔
 ”میرا کڑا لادو۔“ برت مٹاؤ۔
 دعوت ہو گئی۔

میں نے کسی پر مٹھنے سے انکار کر دیا۔ میری
 آنکھیں صحت چلا گئیں۔ ہر سونے کے جھکے
 میں بھلا تھا۔ وہ اپنی موجودگی بھی ایک جرم تھی۔
 اُن کی بیوی نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے شاید وہ اب
 صاحبان چلی گئیں۔

اتنے برس جو جیدہ، سگریٹ، چائے پیتے
 اُن سے پی وہ ڈسنے لگے۔ اُن لڑکیوں کے تن کا پڑا
 بھی ہم جیسے رہے۔ جن کے لیے ہم سب لڑ پے
 ہیں اُن سے ہماری کیا سائنچ؟
 ”برتن کیوں نہیں آئی؟“ انہوں نے ایک

عجیبی گالی دی۔
 ”خاروڑ لوگ نہ کبھی عرصہ میں ہر ہاتھ تھا
 ہیں نہ ہی انہیں گالیاں دیتے ہیں۔“ میں نے
 دھیرے سے اُن کے کان میں کہا۔
 ”کیا کہا تو؟“

انہوں نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے
 کوئی پتھر میرے اوپر پڑا ہو۔ انہوں نے ایک
 دہرا مارا۔ بیوی کے پاؤں پھر گر روئے گئے۔
 ”مناف کر دو... میں پتا نہ دے کہ تم نہیں
 ہوں؟“

”انہیں پُپ کرانے؟“
 لیکن انہیں پُپ کرنا مشکل تھا۔ تمام جوا لادو
 باہر آنے لگا۔ باہر سے آتے ہوئے لوگوں کو دیکھتے
 ہی لڑکیاں کرے میں جا کر چُپ گئیں۔ گیارہ لڑکیاں

ڈھلتی شاہ کا اجالا

صبح ہوئی تو بادشہم تخت پر بیٹھی، لیکن رات کی طرح تاریکی اور کان کی وجہ سے ہم اتنا ٹوٹ رہا تھا کہ دروازے کی بہت نہ ہوئی۔ ایک دن کی جھٹکی کی جھنجھکی کا آرام کرنے کی ضمانتی۔

ہوایہ کہ کل شاہ کو سورج کے افق پر پہچاننے کے پس بار چلے جانے سے ایک گھنٹہ پہلے اچانک آسمان ابرو اور سر پر لگا تھا۔ اور پھر جیسے جیسے تاریکی گہری ہوتی گئی، گھٹا میں زور پڑتی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ بے موسم کی کالی کھانسیں برس کر رہی ذم لیں گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ رات گہری ہوتے ہوئے موسمِ صلا ابرو بادشہم شروع ہو گئی تھی۔

اکتوبر کی سردی کی بجلی سردی کے دن تھے۔

گھنٹہ ٹوٹ اندھیرے اور مسلسل بادشہم کے پیش نظر ہم لوگ رات کے کھانے سے جلد ہی متاثر ہو کر سو گئے۔

ظاہر ہے کہ بادلوں کی گرنے اور پانی کے شور میں اسے صبح سویرے میں سونا تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ البتہ آئینوں کو نہ کہ گرم ہندوؤں پر دروازہ ہو گئے، اس آئینہ میں کہ بادشہم ابھی بند ہوئی کہ پوری اور پوری آئینوں جو صبح چلنے کے آئینے میں جو خواب ہو جائیں گی۔

مجھے خواب یاد ہے کہ بادشہم کی تہت کافی دیر تک بدستور قائم رہی۔ اور یہی کہنا مشکل ہے کہ کب

میری آنکھ کھلی تھی۔

بھئی اچانک میرے کانوں کے پردوں سے بڑی کی آواز نکلائی۔

”سنتے تو؟“

”اور نہ ہوں! کیا بات ہے؟“ میری آنکھ کھل گئی۔

”ذرا فور سے سنو۔ بڑی کی آواز میں کافی گھبراہٹ تھی۔ اب بڑی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔“

”اسے“ یہ تو بڑی کے کراہنے کی آواز ہے، شاد روا! میں نے اس کی آواز کو پہچان لیا تھا۔

بڑی کی پامو گشتا: ہوتے ہوئے بھی اکثر ہاسے کوارٹس کے اس پاس کے کوارٹروں کے گرد منڈلاتی

رہتی تھی۔ شروع شروع میں میں کسی کے ہاں سے بچا کچھ روٹی کا موٹھا کھڑا امل جاتا، اسے دوسرے

ہاں لگا کر جہا جاتی۔ کچھ مزید پانے کی اُمید میں موزن لگا ہوں سے چند تازہ کے لیے اس گھر والوں

کو دکھیتی رہتی۔ اور جب کچھ دسنا تو ٹیپ چاہ چاہ دوسرے گھر کی طرف رخ موڑ لیتی۔ اس طرح ہوں

جوں وقت گزرتا گیا اس پاس کے کوارٹر والوں نے بڑی کو جیسے اچانکا۔ اسے فرما فرما ان گھر

والوں سے آقا دھور پر چراگ سنے لگی اور وہ اسی عہد و محنت کی بڑی کی کر رہ گئی۔

بڑی کے کراہنے کی آواز کو سن کر جہا میں نے

دروازہ کھولا تو سامنے عجیب سے نکل آیا۔ کھڑکی کے شیشے کے نیچے ڈھکی دیوار سے لگ کر کراہ رہی تھی۔ سنبھلی کے درد سے اس کا ہر امل تھا۔ اور اس پر بادشہم کا

میں لپک کر شاہ روا کلائے اندھ لگا پھر جب تک ہم دونوں واپس بڑی کے پاس آئے وہ ہر دم

کے درد سے آزاد ہو چکی تھی۔ اور بڑی بھی ابھی ٹیپ چاہ بیٹھی تھی۔ نیتے نیتے ہاتھ بٹے سیمیک کر

اپنی ماں سے پیچھے ہوتے تھے۔ میں نے شاہ روا کی حالت دیکھا۔ وہ میری نگاہوں میں نہاں سوال کو سمجھتی۔

”ہاں نہیں!“ شاہ روا نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ اس وقت بڑی کے بچوں کو ہاتھ لگانا اس کے

خفے کو صحت دینا ہو گا۔ وہ آپ کو ٹوچ ڈالے گی۔“

”نہیں! شاہ روا! جانے راتے کم عقل نہیں ہوا کرتے کہ مصیبت میں مدد کرنے والے کے عمل کی قدر نہ

کریں۔۔۔۔۔ اور شاہ روا کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اپنے کوارٹر کی جانی میں ایک خشک پوری

کا کھڑا اچھا دیا اور پھر ایک ایک کر کے بادشہم کی جھنجھکی اور سسٹھے سے اسے بیڑن کو انسان کی ماں کو اندازے

آیا۔ بڑی نے بالکل کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ ٹیپ چاہ دیکھتی رہی اور خود اس نے اس وقت جانی میں

پناہ کی جب با بچوں پلے محفوظ جگہ پر پہنچ گئے تھے۔

ماں جو سنبھلی، اور شاہ روا لپک کر ایک بڑے برقع

میں دو دھلے آئی۔

بادشہد سید محمد علی تھی، لیکن اب ہم اہلینا
سے اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔ اور یہ مسلوم
کب ہماری آنکھ مل گئی۔

دو پہر کے کھانے کے بعد میں جوں ہی ستانے
کے لیے بستر پر لیٹا، گہری نیند لے، جو خفاہی تاک
میں تھی، مجھے ڈرا آیا اور میں خوفِ ہوا ہو گیا۔
دو تین گھنٹوں تک میں سوتا رہا سو دار ہا بھر
اجانک جب میری آنکھ کھلی تو ساتھ دالے کمرے
میں چند عورتوں کی آوازیں سنائی پڑیں۔ پڑوسن کی
عورتیں میری بوی سے خوش لگیان کمرے میں محو
تھیں۔ ان باریک باریک سنائی آوازوں میں
مجھے مین مقب کے کوٹار میں رہنے والے پڑوسی
بابر محمد چندی جی صاحب کی چیریں کلائی صاف سنائی دے
رہی تھی۔!

”ہیں، رات کو آپ کے یہاں کافی اونچی
آواز ہے اور آواز ہی آپ تھیں۔ کوئی بڑی طرح کھانسی
دا تھا۔ میں نے سنا میری بوی سرزمین چنڈے پڑھو گی
تھی؟ دل میں آیا کہ بابر محمد چندی صاحبہ ہے، لیکن
بادشہ تھی نہ تھی؟“

”کیا کہوں! میں “سرزمین چنڈے میں ہی بول
پڑیں۔ یہ ہیں تانے کے پتائی... اور پھر آواز بالکل ٹھوکی
کی طرح بدم ہو گئی۔ اسی بار کوچے میں اور دوسرے کے
بھالے دھنچے بھڑکے۔ جو میں گھٹنے چا رہا تھا پر پڑے
پڑے کھوں کھوں کرتے رہتے ہیں... اس سے گئے
سرکشی اور دیا دہری ہو گئی۔ اظہار بیان میں مضنی
بھیلنے لگی، جیسے کہوں نہیں ہی، کہتے نہیں بیٹا۔ نہ
جانتے بڑے کھوٹ سے کب چھٹا دالے کا اور اس
خونگاری کو بھی میں نصیب ہو گیا۔ نہ کہ کو نہ دھو نہ
بیچنے بیچنے اور کچھ نہیں ہوا یا تو ہرگز نہ، ہر بات میں
کتنے چہی کرتے رہتے ہیں... کرو یہ نہ کرو...
اور دوسرے چہی کے پاپائی کی ہر فراموشی کو کھڑا
کرتے نہیں نکلتے...“

اس کے بعد میں نے عموں کا کمرہ چنڈ
کی گتھانیں پتھر لگایا۔ وہ شاید یہ امید لگائے
جیسی تھی کہ میری بوی بھی اس کے ڈکھڑے میں اں
ملا لگے۔ لیکن اس اعتبار سے اُسے باہمی نظر آئی
تو ایک سرد آہ بھر کر غری ہوئی۔

”جب بھی ان سے کہتی ہوں کہ قبر میں ہاؤں
دھلے ہوئے اس بڑے کھوٹ کی بے لاگ خدمت
بجالانے کے بجائے کئی عرصے پر دافن چڑھ رہے تھے
پتھروں، اپنے مصوم بچوں کی پروں کی طرف دھیان
دو، تو غر خڑبھے ہیں۔ خستے سے لال پیلے ہر جاتے ہیں۔
جھلا آتے ہیں... میں بوجھتی ہوں اس میں جھڑنے
کی کیا بات ہے صلا؟ ان سے پوچھا جائے ان خوشی
کرکشی پتھروں میں کیا رکھا ہے اس سوکے انجیر پتھر کو
گھٹینے گھٹینے کتنے درن تک کام چلے گا... نہ خود
کو نہیں نہ دوسروں کو نہیں لینے دیتے ہیں۔ مہم بھی
صاف بات کہہ دوں تو تڑکی جی ہوں... بالکل
دل سوک کر کہہ ہیں نہیں ہی... بڑا رک...“
جیسی سرزمین چنڈ کا چہ برس کا لڑکا انہیں بلانے
کے لیے آیا۔

”نئی! پاپا دفتر سے آگئے ہیں...“
اب ہماری پڑوسن بھلا کیسے ڈک تھی تھیں؟
مغل برناست ہو گئی، لیکن جانتے جانتے سرزمین چنڈ
کی نگاہ جاری کے ایک کرنے میں چپ چاپ لیٹ
ڈکی اور اس کے پانچ لڑائیہ بیٹوں پر پڑی تو
سستک کر رہی۔
”کتنے دیار ہے یہ پتے! ہیں! رات
کو یہ ڈکی ہمارے گھر سے باہر پڑی بیٹھ رہی تھی۔
ایک پتے کو جن پتائی تھی اور کبھی درد کے مارے کو نہ کہا
تھی۔ پائی اور شند کے مارے دونوں تڑپ رہے
تھے۔ جی چاہا کہ انہیں آٹھا کر اندر لے آؤں میں
نے پتے کے پاپا سے کہا تھی۔ انہوں نے کشش بھی
کی، لیکن ڈکی انہیں کاٹنے کو پڑی۔ اُسے شاید میری گون
پرانا، اٹھا نہ نہیں تھا جتنا کہ تم پر۔ مکن ہے ان
کے پتائی کی کھوں کھوں سے کچھ خوف ہو... اور“

یہ کہتے کہتے سرزمین چنڈ جانری کا دروازہ کھول کر کھڑی تھی۔
سرزمین چنڈ کے وہ انقلاب شکن کرے اس پر چل گیا۔

انسان کے انقلاب کی اس قدر گتھائی تھی! ایسا کیوں
ہوتا ہے؟ انسان آتاکوں کر جانا ہے؟ یہ میری
سوچ کے دائرے سے باہر تھا۔ لیکن جب عموں
حقیقت مونہ پھیلائے ہوئے سامنے کھڑی تھی تو ایک
بار پھر زمانے بھر کی گرواہٹ ذہن میں سیٹ کریں
سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ زندگی کے طوفانی سفر میں
پتہ کیچ لاپوں پر کھڑکی کھانے کھانے، کام لاپی اور
لاہمی کی سرکشیوں اور آہوں کی اکھنڈ میں ڈوبنا آگیا
جب انسان تنگ کر آخر چنڈ ہر جاتے لڑ گیا اُسے
جینے کا کوئی حق حاصل نہیں رہتا، پھلن سے
سرشار رہا، پروان چڑھے بیڑوں کا کما یہ فرض نہیں
بننا کہ صنف احوال اور فاضیاں کی بھولی میں کم
از کم اتنے سہیل تو ہر دروازہ کہ اس کی شمع رنگ
روشن رہے...!

میں اُس دن اپنے محاذوں کے پشتیں نکلا
میں بالکل اکیلے اور بے سہارا رہے پڑے والگا
کو اپنے پاس لے آئے کیسے روانہ ہو گیا!

مشعل آزادی

(حصہ اول)

ہم سے طلب کیجئے۔

نرس نبھو

پبلیکیشنز ڈویژن

پٹیل ہاؤس، نئی دہلی 110001



لوٹتے جڑتے رشتے

ایک کڑیوں نہ ملک سے باہر چند سال گزار کر آئیں اور باقی زندگی اچھی طرح بسر کریں۔ اُن کی یہ دلی دہی خرابی تھی، لیکن ملک سے باہر جانے کے لیے دلوں کی بھی ضرورت تھی۔ معمولی خزانہ میں وہ اپنی گزر بسر بڑی مشکل سے کرتے تھے۔

ایک دن انہوں نے اپنی اس دلی دہی خوش کا اظہار اپنی بیوی سے کیا۔ پہلے تو وہ سہم گئی، لیکن اس کا اظہار انہوں نے اپنے چہرے سے نہ ہونے دیا۔ وہ اس خوف ہی سے کانپ گئی تھی کہ وہ اُن کے بغیر کیسے دن گزارے گی سبیر بھی وہ اُن کی خواہش کو پورا کرنے کا جتن کرنے لگی۔

انہوں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس تیاری میں گھر کی ایک ایک چیز باہر جانے لگی۔ وہیں اسی دھن میں تھے کہ کسی دن کسی طرح ملک سے باہر چلے جائیں۔ اُدھر رشیدہ اس فلم میں اندر ہی اندر گھول رہی تھی، وہ اُن کا دل دھکا تا نہیں جاسکتی تھی۔ جب بھی وہ چہ بیوں کی بات سنتی تھی وہ خورشید صاحب سے کہتی: ”آپ اس کی گھر دیکھیں بس“۔ جانے کے لیے اختلاف کم کر لی۔ وقت بے میں اپنا سب دھیر آپ کو دے دوں گی۔

آخر کار وہ وقت بھی آگیا تھا جب باہر جانے کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ خورشید صاحب جانے

علامت کی پیشکش کی ہے۔ یہ اس کے کیرئیر کا سوال ہے، اس کی زندگی کا سوال ہے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ اس کے لیے بہت ہی صحیح ماپ (JOB) ہے۔ آپ اُسے جانے کی اجازت دے دیں۔

اور وہ اتنا کہہ کر کرے سے باہر چلے گئے تھے۔

اسرا نے کمرہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی آنکھوں میں رنگین زندگی کے سنے تپا چلے گئے۔ اس کے دوست اُس کے اس تقرر پر رشک کر رہے تھے۔

خورشید صاحب کو آج سے پندرہ سال پہلے کا وہ سفر یاد آئے لگایا وہ بھی اسدی کی طرح ایک ہی دھن میں تھے کہیں ملک سے باہر جا کر خوب ڈوبے گا میں اور پھر زندگی بھر میٹھ کریں۔ یہ اُس وقت کی بات تھی جب وہ ایک جگہ میں محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے پرانے کمرے پر گھبراہٹ میں گھر آئے جہاں اُس کے ساتھ زندگی کے کشن دن اور راتیں گزار رہے تھے۔ اُن کی مصیبتوں میں اُن کی شریک حیات برابری شریک تھی۔ خورشید صاحب تھے تو سمجھ کر کہ لیکن اُن کے حوصلے بہت بلند تھے۔ اُن ہی دن اُن کے دہن میں ایک خیال

چلے ہی پر نہیں جوش کرے سے باہر نکلے خورشید عالم صاحب نے اُسے بڑھ کر دو ہزار سے کو بیڑ دیا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے ٹیبل کی طرف بڑھے، اُنہوں نے کمرے کا بلب بند کیا اور نائٹ بلب کی مدد سے روشنی میں وہ ٹیبل کے قریب کڑی بیٹھ گئے۔ ٹیبل ہوتی کڑی کے پیچھے سے بارش کی آہستہ دینے والی آواز اُن کے کانوں سے گھرا رہی تھی، جس سے کمرے کی خاموشی میں پراسرار کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اُن کے سامنے ٹیبل پر اپنے بیٹے اسرا عالم کا تقریری خط لکھا ہوا تھا۔

”تمہیں بھی حق کے کمرے سے اسرا اور اُس کے دوستوں کے کہتوں کی آواز پر دوسرا ہٹنا کر دوڑنے کی طرف دیکھ لیتے، وہ نکادہ جاسکے اس خلو کو گھونٹے جا رہے تھے۔ اُن کے ان دنوں میں اب بھی جو تھی صاحب کے الفاظ گونج رہے تھے:

”عالم صاحب۔۔۔۔۔۔! میری سوجھ میں تمہیں آنا کہ آپ اس کو ملک سے باہر جانے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے ہیں، یہ ایسا موقع ہے جو دوبارہ نہیں آتا۔ یہ اسکی خوش قسمتی ہے کہ اس نے تھری ریاست میں گھسٹا پھیر گئی۔ اُن کی ڈگری ٹاپ میں حاصل کی ہے اور اُسے پہلی ڈگری فارلے کہنی نے

گھر نمبر ۱۸-۲۰، منگل پورہ، اورنگ آباد ۳۱۰۰۱۱
جہان شاہ

کے چکر میں اس طرح الجھ کر رہ گئے کہ انہیں نہ تو اپنے بیٹے کا خیال تھا اور نہ ہی اپنی بیوی کی صحت کا — اور پھر حوا یوں کہ ایک ناسات اچانک رشتہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی، اُس نے اُن سے کہا تھا —

”گستاخ کہ اب میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں اور میں اب آپ سے وداع ہو رہی ہوں — لیکن میں اس سے بہت خوش ہوں کہ یوں کہ کچھ ہی دنوں میں جو رشتہ آپ کے جانے کے بعد ٹوٹے والا تھا، آج وہ آپ ہی کے سامنے ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہا ہے، آپ کی خواہش کے سامنے میں نے اپنا سب کچھ آپ کی نذر کر دیا اور اسے نکیل تک پہنچایا۔ ہم نے جو کچھ کیا کیا اپنے مستقبل کے لیے ادا اپنے اگلے بیٹے اسد کی خاطر کیا کل وہ ہماری طرح زندگی نہ گزارے۔ ہر حال — آپ باہر ضرور جائیں اور میرے اسد کا خیال رکھیں اور — اور — — — اُنہا کہتے ہوئے رشیدہ کی آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ خورشید صاحب کے منہ سے بے ساختہ ایک صبح بھی اور وہ رشیدہ کے کاغذہ دروازہ سے بلا کر اُسے جھگڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ معصوم اسد بنگ کے کنارے کھڑا یہ منظر دیکھ کر آنکھوں سے دھواں نکلتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ اپنے باپ کے قریب آ کر اُن کے پیروں کو بچہ کر دینے لگا۔

رشیدہ کو انہیں نہ کوئی نصیحت نہ کوئی اور — اس طرح رشیدہ کا رشتہ ہمیشہ کے لیے خورشید صاحب سے ٹوٹ گیا۔ وہ چلا گیا کہ کب رہے تھے :

”رشیدہ — میں جو کچھ بھی کر رہا تھا تیری خاطر — تجھے شک نہیں اور آرام کے لیے کر رہا تھا۔ اپنے اسد کے لیے کر رہا تھا — لیکن۔ — اب تیری نہ رہی تو میں — میں یہ سب

کچھ کس کے لیے کروں — — — ایا کوئی ہے میرا — اب اس دنیا میں۔ جس کی خاطر میں رو پیکاروں — — — وہ اچانک بنگ سے ہٹے اور بڑی دروازے سے ایک فائل نکالی اور اُسے چھانڈ کر کھڑے کھڑے کر دیا، جس میں اُن کے باہر جانے کاویزا اور پاسپورٹ تھا۔

اور پھر — — — دن یوں ہی بیتے۔ رشیدہ کی بھائی نے انہیں بہت تنہا بند بنا دیا تھا۔ اندھیری خوف ناک راتوں میں انہیں اپنا بستر کاٹنے کو دوڑتا اور وہ اٹھ کر کتا بن پڑ جاتے تھے۔ لگ جاتے۔ انہیں بس ایک ہی کام تھا، آتش اور گھر کو مٹا کر دینا۔ انہیں ایک ہی دھن سوار تھی۔ اپنے ہی ٹمک میں رہ کر یوں نہ جبر و جہد کر جائے اور کسی اعلیٰ مہدے کے لیے کوشش کریں۔ انہیں خیال آ کر کہ یوں نہ (T.A.S) آئی۔ لے۔ اُس کے امتحانات دیتے جائیں اور پھر انہوں نے اس کی تیاریاں ستر موع کو دیں۔

رات میں جب وہ ٹیبل ٹیپ کی روشنی میں کسی کتاب میں دو بے ہوئے ہوتے تو اُن کے کانوں سے رشیدہ کی آواز نکلتی۔ وہ اُن سے کہتی —

”ارے — آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔ چلو — سو جاؤ — ؟“ انہیں ایسا لگتا جیسے رشیدہ بنگ پر لٹیٹ انہیں آواز دے رہی ہے۔ وہ نگاہ اٹھا کر بنگ کی طرف دیکھتے — انہیں وہاں صوف اسد لٹا ہوا دکھائی دیتا — جو ہر چیز سے بے نیاز زندگی آفریں میں ڈوبا ہوا ہوتا — اور وہ پھر کتا — بڑھنے میں لگ جاتے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رشیدہ دودھ کا کالہ لیے ان کے ٹیبل کے قریب کھڑی کبہ رہی ہو — ”لو — یہ دودھ پی لو۔ اور بستر پر اٹھ کر لٹ جاؤ۔ وہ بے خیالی میں اٹھانے پڑ جاتے اور بنگ جاتے تھے۔ وہاں کوئی نہ ہوتا تھا بس

ٹیبل پر خالی گلاس رکھا ہوتا — اُن کے ساتھ مندرجہ ذیل ہی کی قوت تھی، جو انہیں یہ سب کچھ کرنے پر آمادہ کر تھی۔ اور وہ اُس کی یاد کے سہارے بٹے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے۔ اور پھر یوں دن گزرتے گئے۔

انہوں نے دوبار امتحان دیا۔ لیکن آخری زبانی امتحان میں ناکام ہو جاتے۔ اس پر بھی اہل دلہ اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہ اُن کا آخری چانس تھا۔ اس بار انہوں نے جان توڑ محنت کی تھی۔ انہوں نے تحریری امتحان کا سب کیا اور پھر زبانی امتحان کی تیاری میں لگ گئے۔ تیسری اور آخری بار وہ T.A.S امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

جب انہیں اپنی کامیابی اور سلیکشن کی اطلاع ملی تو اُن کا دواں دواں ڈھال غشی سے مجرم اُٹھ۔ اور وہ ڈھلے ہوئے اپنے کمرے میں آئے اور بے ساختہ رشیدہ کو بیکار نے لگے کہ یہ خوشخبری سب سے پہلے اُسے ہی سنانا چاہتے تھے، مسکین وہاں کوئی نہیں تھا۔ پورا کوروا اندر سے ہی ڈوبا ہوا تھا۔ اُن کی آنکھیں رشیدہ کی یاد آنے سے نم ہو گئی تھیں۔

وہ اس وقت جو تھے — جب صبح کا سورج رات کی سیاہی کو آہستہ آہستہ دھو کر رہا تھا۔ کمرے کی دھڑکنی صبح صادق کی روشنی میں معدوم ہو رہی تھی۔ اس وقت اسد کمرے میں داخل ہوا — جیسے ہی اُس کی نگاہ خورشید صاحب پر پڑی اُس کے کونہ سے اچانک نکلا :

”ارے بابا — — — آپ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ کیا بات ہے ؟“ آج آپ رات بھر سوئے کیوں نہیں — — — بتائیے بابا بابا — — — آج میں سب کچھ جانتا ہوں کہ آپ ایک T.A.S امتحان ہونے کے باوجود دوسرے اتنے سچے سمجھنے والے مافوق میں رہنے کے بجائے ان بوسیدہ اور پرانے کمرے میں کیوں رہتے ہیں۔ میں نے جب بھی آپ سے پوچھا آپ نے

بھی بھی دیتا تھا۔ آخر آپ کا اس کرے
 ہے کیا رشتہ ہے۔ اور آپ اس
 کرے کی ایک ایک چیز سے کیوں مانوس ہیں؟
 آپ انہیں انہماں سے لیا ہے خیر کیوں رکھے ہیں۔
 — آج آپ کو سب کچھ بتانا ہوا چاہا۔
 انہوں نے بہت سے اپنا چہرہ اور اپنا
 اور دھبی آواز میں کچھ گئے۔ ”بیٹے۔
 اب تم ماننا ہی چاہتے ہو سو سنو۔ اس
 کرے سے اور اس کرے کی ہر ایک چیز سے مجھے کیوں
 پس ہے؟

”بیٹے۔ یہ میری زندگی ہے۔
 میری جیوری اور تنہائی ماں کی یادیں ہیں۔ جس نے
 آج مجھے اور تنہا اس حال تک پہنچایا ہے۔ اس
 کرے کی یہ حالت جو تو قیں بھی مجھے زندگی میں
 یہ خواہش دے کرتا۔ اس کرے نے مجھے بڑا
 بنے اور درجہ لکھ کر پیش کی زندگی گزارنے پر
 افسانہ۔ مجھ پر یہ دھن جھوٹ کی مانند سوار ہوئی
 اور میں — ٹھکے سے باہر جا کر روپیہ کمانے
 کی سوچنے لگا۔“

یہ آج سے پندرہ سال پہلے کی بات ہے
 جب تم دوسری جماعت میں پڑھتے تھے اور میں
 ایک بینک میں مولیٰ لکھ تھا۔ مولیٰ خزانہ میں
 ہم اپنا گزارہ کر دیا کرتے تھے، لیکن زندگی بہت
 محدود ہو گئی تھی۔ میرے دل میں روپیہ کمانے
 کی خواہش پیدا ہوئی، اور ٹھکے سے باہر جانے کی
 دھن میں، میں سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر کی تمام چیزیں
 انڈولر پہنچنے لگے۔ اس نیکو سیرے سے باہر جانے کا اثر
 تنہائی ماں پر اتنا بڑا کہ وہ بی۔ بی میں مبتلا ہو گئی۔
 لیکن — اس نے میری خواہش کا ہمیشہ احترام
 کیا میری بہت بڑھائی۔ اس سے پہلے کہ
 میں ٹھکے سے باہر جاتا اور تنہائی ماں سے جدا
 ہوتا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور —
 بہت دور پہنچ گئی۔ کبھی نہ واپس آئے کے لیے۔ وہ
 کبھی کبھی کہ باہر جانے سے روپیہ تو کما یا جاسکتا ہے

لیکن اس کے لیے جانی برداشت کرنا پڑتی تھی۔ یہ
 جہاں ان رشتوں کو توڑ دیتی تھی جو انسانوں میں
 ہوتا ہے۔
 اور — میں کہتا ہوں کہ وہ انسان
 انہوں سے دور ہوتا ہے تو اس کے تمام رشتے، تمام
 بندھن ایک دوسرے سے کچھ دھانگے کے مانند
 ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس کا احساس کسی کو بھی نہیں
 ہوتا۔ باہر جانے کی دھن میں، میں نے
 تنہائی ماں سے اپنا رشتہ ہمیشہ کے لیے توڑ دیا
 تھا۔ اس کے مرے کے بعد میں نے ملے کر دیا تھا کہ
 ہیں اپنے ہی ٹھکے میں رہ کر اپنی محنت و سحر سے
 وہ مقام حاصل کروں گا، جو میں باہر جا کر کمانا چاہتا
 تھا۔

اور آج — تم دیکھ رہے ہو وہاں
 سب کچھ ہے، لیکن — وہ نہیں — جس
 کے لیے میں نے یہ سب کچھ سوچا تھا — تم تو
 جانتے ہو اس دنیا میں میرا کون ہے — ایک
 تنہا دار کا حق — سو وہ بلی کی —
 اور ایک جرم ہو وہ بھی مجھ سے جدا ہو رہے ہو۔
 میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا کہ تنہا رہے
 دل میں ٹھکے سے باہر جانے کی بھی خواہش پیدا
 نہ ہو اور تم بھی انہوں سے ہمیشہ کے لیے رشتہ
 نہ توڑ بیٹھو۔“

”اس کرے میں اندھیرا کیوں ہے۔؟“
 اس لیے کہ تنہا رہ جانے کے بعد میری زندگی میں
 اور کیا رہ جانے کا۔ مجھے تنہائی واپسی
 تک اسی طرح اس اندھیری کوٹھڑی میں تنہا تین
 گزانی پڑ گیا۔ یا پھر — تم جب فلاں
 آؤ تو میں تم سے کبھی پاؤں لگاؤ نہیں۔ میں تو خدا
 سے بھی ڈھاکر رہا ہوں کہ تنہا رہ جانے سے پہلے
 ہی میں تم سے اپنا رشتہ توڑ لوں۔“
 اسٹاکہر کا انہوں نے اپنے دھنوں پر اتنا نیر
 پڑ کر کہہ کر کسی سے اٹھنا چاہا — لیکن —
 اس طرح میں ان کے اعتوں نے ان کا روبرو مضبوط

سے اٹکا کر دیا۔ ان کے ہاتھ پر نہ کھینچے گئے۔ ان کا
 چہرہ سینے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میرا سہارا ہے کہ
 بھی سیدھی طرح کھینچے نہیں ہو رہے تھے۔
 اس دن آگے بڑھ کر انہیں سہارا دے کر
 دوبارہ کر کے پوچھا دیا اور کچھ لگا۔ ”نہیں بابا۔۔۔
 یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔“
 ”بابا۔۔۔ میں سب دھنوں سے رشتہ
 توڑ سکتا ہوں لیکن — سوچ بھی نہیں سکتا
 کہ آپ سے کبھی زندگی میں رشتہ توڑ دوں۔“
 ایک ہوا جھونکا سائے کی کڑکی سے چونا سوا
 اکوڑیز پر پڑے ہوئے خدا کو پھر مٹا رہا تھا۔ اس
 نے ٹیٹ کر خنکی ٹوٹ دیکھا۔ پھر ویٹ اسٹاکہر
 بازو کرنا۔ خدا کو اپنے دھنوں پر اعتوں میں مضبوطی
 سے پکڑا اور — اسے غمور نہ لگا۔

پھر — اس نے نفرتی خدا کو کھانچ کر
 ٹھکے ٹھکے کر دیا اور — اپنے بابا کے
 دھنوں پر اتنا پکڑ کر کہ کسی سے سبک کر دینے لگا۔

بقیہ: حسرت کی غزل
 ہم جو رہے سوتوں پر گناہ ترکوب دفا کا
 یہ دم بھی بھوکے گنگار نہ کر دے
 میں بھی غریب، میرا خدا بھی خوش ہے تیرے درد سے
 درد کو دہرے مصیبت ہے دمانے کے لیے
 صرف صباں ہوا وہ غمگن جرتی باد میں بسرہ ہوا
 بہت غم ہے تو سے درد سے دعا میری
 یہ غمت ہے کہ دہرے کبھی خدا میری
 دیکھ اسے تم ماں! یہ نفس غمت ہیں
 بننے ہیں یہ دھڑکیاں غمت ہیں یہ آسانی
 پڑھتے ہیں وہ ماں غمگن کو تم بھی حسرت اٹھو سلا م کو
 تم سے مل کر یہ غمت ہے کہ وہ مراد آسان
 آکا تک تیری جوائی میں یہ کیوں کر گزرا
 ہم حسرت کو دوا دھنوں میں کبھی غم نہیں سے
 لکھ مقلعہ سنار نہ کر۔
 اسے وہ کچھ خوشی ہے تمہیں سن کا
 میرا جو کھانا، حسرت کی غزل دیکھ



ایک اکیلا تھا

بے مری سے بپ سقندہ دہرزہ امٹ کر پڑھا
لکھا تھا :-
(۱) آپ کی بیٹی، فرخ میں رکھی ہے گرم
کے پی لینا۔ فرخ کھوٹے وقت گھلا ہوا نہیں گھٹا
پاہے۔

(۲) کدات دی مایا ہی نہیں تھا پکڑ کر
ہی دیکھ کر مجھ سے پوچھ لیا تھا کہ دی آپ کے لیے مسز
صحت ہے۔ اس لیے ذیل روٹی اور دی کا ہشت آج
مت کیجیے گھٹے کے ساتھ کہ جسے میں مگر پیسے
خیل میں انڈا میں آپ کے لیے کم ضرورت نہیں ہے۔
نیک نیا دے کم ضرورت ہو جائے۔

(۳) آج کا نچ سنوئی کر دیے بننے میں ایک
نچ کھانے کی عادت ڈالنے میں سنسٹ مسگر کی
مات ڈال دی ہوں تو کیا آپ سننے کی عادت
نہیں ڈال سکتے تھو اور پھر پوری کے لیے تو گت تفت و
تاج چھوڑ دیتے ہیں آپ تو صرف نچ چھوڑ رہے ہیں۔
(۴) شعی رحون پیر سے پرس کر کے لائے گی

آپ صرف پیروں کی طرف دیکھیے گا، شعی عرف نہیں
کیونکہ منہ سے شعی کی شکر گیس گھٹا ہوں نے ہنسا ہی نہیں
کئی دوسرے مگر بھرا دیکھے ہیں اور ہاں دوسرے
گرنے کے عوض اجرت مانگے گی اسے ایک بپ
مت دیجیے، میں خود اس سے عجب کر لوں گی۔ کیونکہ
اس نے آپ کی فیس کے دو تین توڑ ڈالے تھے جنہی

اسے ہوئے جس
میں جانتا تھا کہ ہوائی منظر فرادعا۔ مگر احتیاط اپنے
آپ کو فرادعا کے بجائے سنت کہتا تھا میں نے پوری
سے کہا۔ ہاں! آپا ہے۔ مگر حضور ابھی ادھر رہے لے
نکھٹ کر

دو بولی۔ اس لیے کل صبح سے دن بھر ہدی
پوری فیصل سنت ہی کے ست سنگ میں گزارے
گئی۔

میں نے پوچھا۔ کیا میں پوری فیصل میں اپنے
آپ کو بپ شمل کہوں؟

اُس نے جواب دیا: سو ہی! چونکہ مگر اکیلا ہو گا۔
اس لیے آپ کی بپ شمل رکھ کر کام نکالیں کہ ہانچو
"آپ کا مطلب ہے مگر کا پکیرا؟"

مجھ نے جواب دیا: میں اس بعد پوری پر پیدار گیا
تیس سال بعد وہی اپنی ہی پوری گی۔ اور صرف پوری
پر پیدار گیا بلکہ اس سنسٹ پر ہی۔ دو واقعی منظر سنسٹ
تھا بلکہ وہ نہیں تھا۔

•
صبح جب جیدو ہوا، تو پوری فیصل پوچھا کہ اسے
سوائے جا چکی تھی۔ بپ دار ہونے ہی میں نے زندگی میں
پہلی بار مجھ سے ملنے والی کی مسگر آگئی تھی یہی تھی
پر کہ ایک کاغذی بزنس پر نظر پڑی۔ پرنس بپ
سے اوپر کہتا تھا: جاہت مارش فونڈ۔

میری پوری اکھوتی ہے۔ دوسری پوری گی
آسکتی تھی لیکن میری پوری سنسٹ مسلمان کیا کر میں
پوری اور سو تن دونوں کا دل ادا کر سکتی ہوں اور اس
عہدے کے کہ آپ کو احساس بھی نہیں ہو گا کہ اس میں
پوری کو ان ہے اور سو تن کون؟

اسناد دوسری پوری لانے سے پر ہر یکہ وقت
کی بھی بہت ابھری کہہ چکتا!

لیکن پوری کے اکھوتے ہونے سے ایک طرح کی
پیدا ہوئی کہ جب بھی شمل مگر روشتا ادھی کل والی
پوری موجود ہوگی کوئی چیر سانس لینے کو گتت ہی سانس
لے رہی ہے دوسرے مگر یوں گتت ہی جیسے میرے
مگر میں میرا جو دہا نہیں ہے۔ جب دوسرے فونڈ
کتنی تو بے لمس ہوتا جیسے میں خدا نہیں صرف نقص
ہوں اس سنسٹ مگر چوتھو کھلا ہوا ہے مگر شریں
کہہ رہا۔

میرا باری چاہتا تھا کہ میری پوری بال بچوں سمیت
فقط ایک دن کے لیے مگر بے مل جائے تو میں پورے مگر
پر اپنی اخراجات محسوس کروں۔ چاہے ایک دن کے
لیے ہی جیسے تنہائی کی بولش ہوت مل جائے۔ آخر بہت
تقریبی تو ایک دن کا بلاش دہانت کرنا تو شہر تھا!
کوئی جو بپ بہت تھو کہہ کر پرنسٹ میں بھی جاتی۔

اب تک ایک دن پوری کے میں طلب اپنی سونو
شہر میں ایک عظیم سنسٹ سوائی ڈیگزیر تھو جی ہسپتال
آج کل ہی دھلی

کی قیمت کا کافی پرے کی گویں خود کا ٹوٹ لگ، کاٹنا پکا
بدرست نہیں۔

(۵) اگر روز ستر ہجری کا جب سنا ترقی ہو جائے
”ہم تم اکبر سے مل رہے ہیں اور جان کو بچائے۔“
تو روز ستر فرات نہ کر دیکھے گا کہ کو کوا گناہی ہے ایک
چوڑا اور چار ڈانڑ ستر پر اگر بیٹھ جاتے ہیں اور روز ستر
پر اپنی بیٹی بیٹھ جاتے ہیں۔

(۶) چونکہ آج آپ کی دفتر سے جی پی ہے اس لیے
خلو ہے کہ آپ کے مفت نور دوست اور اکلین گئے
چائے، ہیں، بکٹ وغیرہ سے میٹھ کر یں گے مرغیش
پھونکے گئے سحر کی راہ سے تان اور صوفیہ
پیکر پھونکے گئے تا ش کیلین گئے، مگر ہے آپ کو جگہ
پر جی بھوک رہی، اور آپ اپنی بھوری کو کھانا منگائے اپنی
بھوک بھونک رہیں۔ بسک بادی کیجیہ گریجے نہ کہ
نگر نہ اور کب، لہذا ایسی کوئی نازیب حرکت
مت کیجیے گا۔

استیلا میں نے پڑوس کے ایک ملازم کا منہ
میٹھا کر کے لیے کہ وہ اپنے کو وہ آئے میرے گھر
کی واردات کی رپورٹ مجھے مستام کو دے دے،
وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ آج کل کے زمانے میں بھی
جو جھوٹ نہ بولے، اسے مٹا دینا بھتی جوں۔ میں
اس ملازم کا نام نہیں بتا رہی۔ روز وہ مجھے یہ بھی
بتا دے گا کہ صاحب نے مجھے آپ سے زیادہ منہ
میٹھا کرنے کی چٹی کش کی تھی۔

(۷) آج ایک چوٹھی اُسے گا، وہ ایک جھگ
ہے۔ آپ سے دس روپے لے کر آپ کے ہاتھ کی
گھیریں دیکھے گا کہ آپ ستر بن کر مک جین
گئے، دس روپے مزید دیں گے تو وہ ستر برس
چوہ کر اسی برس بتا دے گا لہذا اسے ہانی کا شفا
گلاس پلا کر مال دیجیے، کہ میری بیوی گھر پر جو نہیں ہے
اس کی سہم جو دیں، میں اپنی نہیں چوہا سکتا۔
لہذا کل تشریف لائے۔

اطلاع عرض ہے کہ ہدایت نامہ کی پراسرار
ناول کی طرح کا ناولیں مت لاس لیے میں نے دیمان

میں ہی چھوڑ دیا کہ کوسر میں در دوہنے لگا تھا۔
چونکہ یوں وجود نہیں تھی بوسیر دہائی اس لیے

ناسین کی کسور دہائی گولی دھونڈ لگا لی۔ ہرن بوی
نے تو مجھے ناسین سے بھی محروم کر رکھا تھا، ناسین
کو بوی مجھے کا لطف زندگی میں پہلی بار آیا۔

ناسین کے بونا استعمال کے بعد میں
نے پورے گھر پر نگاہ ڈالی وہ نگاہ جس میں آزادی
کا سلسل کا سرور تھا، وہ سرور جو عقیب کی کو جیل
سے رہا ہونے کے بعد ملتا ہے، ہاں، آج میں واقعی
اس گھر کا منت اہل ہوں۔ جو پھول گھاروں کا گھر نہ
جہ ہوں گا زردوں کا اور سرسبز بکر دی کرولں گا، جو
نہیں چاہیں گا۔

چنانچہ آزادی کے جوش مسرت میں ایسے کی گیند
اصالی جوت لین پر پڑتی تھی، اور اسے طلالہ لنگار
کے طور پر سائے کی دیوار پر زور سے دس بار دیوار
پر شگ پر کئی گز پر شہ تصویر چلی ہوئی تھی، گیند دیوار
کے بجائے لٹو پر چلا گئی میں سے تصویر کا مشینہ
کر کی کوئی کوکٹ لین پر بھگڑا اور پھر یک دست دو
شہ گیند جوینے پوئی تو تپائی پر بھی ہوئی ایش ٹرسے
نے اپنی پوری سیکڑیوں کی راہ سے فٹ لین کو نور
علی کو کر دیا۔

پڑوس کے جاسوس ملازم کا نام مجھے معلوم
نہیں تھا، اس لیے میں نے اسے لپکارا اسے بے نام
رپورٹرا اگر دیکھ لے کیا تو اسے میری نازیب حرکت
کہے گا؟

وہ بولا نہیں صاحب!
”مٹا باش، اصلا تو ہی بت، قلائین پر گیند
کیوں پڑی تھی، کیا نہیں لڑا اس لیے فٹ لین بناتی
ہیں کہ ان پر گیند کھیل جائے؟“

”نہیں صاحب!“
”او میں نے کئی بار اپنی بوی سے کہا کہ کوئی ایسی
ایش ٹرسے لاؤ۔ جوت لین پر گرے تو را کہ ایک
ڈوہ جوت لین پر گرے۔ بولو، کہا تھا کہ نہیں؟“
”کہا تھا صاحب!“

”اور اب یہ پیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
اور ایش ٹرسے کی را کہ کو ان ایشے کا گے۔“

”کیا میں؟“
”نہیں صاحب! میں!“
”تو پھر اسٹاؤ!“

”ایک منٹ میں ایشا ہوں صاحب!
اور ایک منٹ انتظار کیا، مگر طرامے کوڑاؤ
اشیا ایک لکھناب ہو گیا چانچ بھونی کلاس کے
ملازم پڑوس اہمیت، اٹھک اور ایک منٹ
کی را دیکھا گھر کے بادشہ نے سنا سبھی میں آج
تاہذا خبر اصلا خبر پڑھا میں نہیں تھا۔ ا
یوں بھی اخباروں میں پڑھنے کے لائق ہوتا ہی
ہے، سوائے وہ بدینت کی مشدہ ڈھنوں
کے مٹی کے تیل سے ملنے کی خبروں کے۔ اہ
خبریں پڑھنے سے تو بہتر ہے کہ اخبار میں ایش
کی را کہ جی جائے۔ چنانچہ بادشاہ
خبر میں را کہ اور پیشے کے کوئے لکھے کے
گرفتار ہیں پر را کہ کے دینے صاف چلی کھار
تھے۔

”جہوں کو پرش سے صاف کر دینا چاہا۔
مگر پرش کہاں ہوگا؟ عام طور پر دیکھ
ہوئی ایک پانی کے نیچے پرش نہ کر دیتی تھی
فور آپ پانی کے نیچے ہاتھ ڈالنا گھر ہاں پرش
موجود نہیں تھا، بلکہ ایک ٹیبل فون ڈاکٹر ٹری
تھی۔ وہ پیش اس میں گھر میں کوئی چیز نہ تھا۔
پر نہیں ملتی، فٹ لین پر گیند، پرش کی گھر ڈاؤ
پورے گھر کا ڈھانچا جو بچا ہے، گھر کی از سر
تخلی کرنا ہوگی۔

بہر کیف اپنا سفید رومل مگر گھر گھر را کہ
اُسے صاف کیے، بیس گور کی بے مشینہ تھ
اکار لی، اس مائی کو آج مشین کی را م صاحب
فرم بیکر سے فوراً زنا مشینہ فٹ کرنا ہوگا، اور
پڑوس ملازم نے جہا تک دیا تو... ۴۴
ڈاکٹر ٹری اصل کر بایٹ کا ٹیبل فون خبر دیکھا،

دیکھا گیا؟ چائے کی پتی بھی ہم نہیں، لہذا
 لٹکا ہوا پانی بڑی آواز سے پیچھے ہٹا کر رکھ دیا۔
 پیغیاں صدمہ میں آ کر گیس کی لگ پیچھے بند کر دیا
 تو پیچھے پانی کی ہنڈ ڈالنا اس کے حضور ہی نہیں
 سنی خواہ نواہ اپنی دائیں چھلیک بلی گئی۔

مگر جو بی ہنڈیا تادی، آدھے گز پر دکھیا
 چینی کا نیلا ڈبر رکھا ہے۔ بہت ترسکا تو پیچھے
 نظر کیوں نہیں آیا؟ اور مہربان من! مجھے پیچھے تر نہیں!
 چائے کا پیکٹ چسپا ہے۔ بتاؤ وہ کہاں رکھا
 ہے؟

پچھے بھی چڑیا نے کہا "چوں چوں چوں"
 میں نے کہا "بچوں چوں نہیں، چائے
 چائے چائے!"

میں نے عقب میں غضب ناک لگا چوں
 سے پردہ کی طرف دیکھا، وہ ایک کفن کے پیکٹ
 پر بیٹھی، گلاب برسی الپ رہی تھی۔ پیکٹ پر
 جلی حروف میں لکھا تھا "دیش چائے!"
 چڑیا کو جھٹکنے سے ڈر کر کہا "تھیک ہو صدمہ۔
 مجھے ہم نہیں، میں تھکاوٹ میں بیٹھ گیا کرتا نے"

آٹسے وقت میں مجھے چائے کا پیکٹ نذر کر دیا۔
 چڑیا چوں چوں کرتے ڈر گئی جیسے کدہ رہی
 ہو۔ تم دووں کے صدمے کا کیا اعتبار؟ ایک
 چڑی نے بھی ایک ہینڈ پیچھے لٹکے ایسا ہی وعدہ
 کیا تھا اور اس کے بعد آج تک نظر نہیں آتا۔
 نہ جانے کہاں رکھے "کھا پھر رہا ہے؟"

ہر کفن دونوں مطلوبہ اشیا کے دستیاب
 ہونے پر اپنی مالکانہ طاقت کی نشاندہی سرشار
 ہو گیا۔ آٹسے پانی کی ہنڈ یا پھر چلے پر رکھی۔ جب
 وہ تیری سے اپنے لگا۔ تو چائے کا پیکٹ کھولا۔
 مگر آہ! اس میں چائے کے بجائے گوند نکلا۔

غصہ، بوجی رہی ایکٹ رہی، کر دیتے ہیں
 دھوکہ پر بازی کر رکھا۔ لیکن پھر بوجی کر اپنے آپ
 کو پر جا گیا کہ ٹوکی چائے پیچھے کی چائے سے زیادہ دھوکہ
 اور لذت دہنی ہے، آج وہی پی میں گئے۔
 چائے؟ مسئلہ تو پھر وہی کھڑا ہے۔ چائے کی
 پتی تو بیٹھنی کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے۔
 ہائے! ارمی میری اکوٹی بوجی! تو کہاں ہے؟
 اور کچن کے دو دروازے سے آواز آئی: میں

بہل ہوں؟

تیری سے پیچھے کے دو چہرے قطرے میرے
 ماتھے سے نچکے اور ہنڈیا کے لمبے پانی میں جا گئے
 دروازے پر کچھ میری اکوٹی بوجی کھڑی تھی، اور
 پوچھ رہی تھی۔ "کیا پھر رہا ہے؟"
 میں نے جواب دیے کہ بے سوال کر دیا
 "مگر تم سنت ہی کے مانگے آئی جلدی کیوں لوٹ
 آئیں؟"

وہ بولی "سنگ ایک ہفت کے لیے ہفتی
 ہو گیا ہے۔ سنت ہی ایک ہفتے کے صدمہ برت کے
 بعد سنگ فرماؤں گے۔ لیکن میں یہ پوچھتی ہوں، کیا
 پھر رہا ہے میں نے کہا "چائے کی پتی نہیں مل رہی ہے"
 اور میں جس نیلے ڈبرے کو چوٹی کا ڈبرہ بھرا تھا
 بوجی نے اس ڈبرے کا ڈسک کھول کر کہا "اس میں
 رکھی ہے چائے۔ مگر میں چائے بنا کر کھانے کی پتی؟"
 میں نے کہا "سور کیلرہ سم" فریج کا دروازہ کھول
 غصے سے کھلا پھر دیکھی تھیں، لہذا وہ چائے کی پتی
 گئی؟

لیتیہ: احسان دانش

شاعری سے جو کام لینا تھا وہ نے کئے مگر ان کی ذمہ داری خود ان پر پڑی ان کی
 کوتاہیوں پر عاجز نہیں کی جاسکتی اس کے ذمہ دار ان کے نامساعد حالات
 ہیں۔

کہاں جانا تھا اسے احسان دانش
 بنابہر من کدھر کو چل پڑے ہیں
 اس خیال کا اظہار انھوں نے بار بار اپنی غزلوں میں کیا ہے۔
 ششما چوں سہ ہر غم سے فرشتے ترے حضور
 میں جانے لڑی ذات کے کس محلے میں تھیں
 کوئی میں پھینک کے پھیندا ہوں اسے عشق
 کمنہ تھی جو ستاروں پر ڈلنے کے لیے
 یہ اعتراف ان کی شخصیت کا نمایاں ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے محبوب پر
 پردہ نہیں ڈالا۔

ان اشعار میں فکر کی ہے اور خیالات کی بلند پروازی بھی حالانکہ وہ
 روایت کے عالمی اور طبع دار ہیں لیکن ان کا دھڑلہ ہر حال سے پوری طرح واقف
 بھی ہیں۔ وہ اس بات کو بار بار دہراتے ہیں کہ "صوفی پر چکر کسان صورت
 پر نظم کھنا بہت آسان ہے لیکن اس نظم میں ہاؤ کی صبح عکاس کرنا ناممکن
 ہے۔ وہی ادب زیادہ کار آمد ہوگا جو کامل کی بہتر نشاندہی کرے گا اور
 ان کے صبح تزلزل کی طرف اشارہ کرے گا" (آخری انٹرویو) اور شاید یہی
 وجہ ہے کہ وہ ہم میں سب سے زیادہ احسان مقبول ہیں۔

بقیہ: نئی کتابیں

ان کے دل و دماغ میں یہ بات آدھی جلتی۔ گولڈ کے دماغ میں یہ بات ابھی تو رو
 طرو تھوڑی سی اس میں دلچسپی ہے۔ اسی کتاب میں ممبر پرائیٹ جناب نواز احمد صاحب نے
 فرقہ وارانہ خیالات کو عتابِ اعلیٰ سے تہہ کی ہے۔
 مستقبل کے مدبر شری اہل عالمیہ، شاہانہ لاجپانی اس کا مایا اور زبھورت کوشش کی گئی
 ہماری طرف سے نیز اردو لائبریرین کی طرف سے سہارا دیا گیا ہے۔ (شرو تھوڑے)

ایک گھڑی کی کہانی

اُس پرانے مکان کو میں نے بارہ دن پہلے کرایہ پر لیا تھا۔ تاکہ وہاں اپنا ناول مکمل کر سکوں۔ شمالی دینا ڈی ایک بڑی جاگیر میں واقع اس خستہ جگہ کے قدرتی حوالے نے مجھے بڑا متاثر کیا تھا۔

میں اپنے ناول کا چوتھا باب مکمل کر چکا تھا۔ ہیر وین آئندہ چند چھپائی کے پھول توڑنے کے لیے ہیر و شہکار سینٹ کے باغ میں داخل ہو چکی تھی۔ شہکار سینٹ دراصل جانا رہا تھا۔ اس کا کتا چرچل زنجیر توڑ کر ایک چڑا۔ میں یہاں تک پہنچ چکا تھا۔

چرچل کو آئندہ کتنی پرچھٹ کر اسے زمین پر گرا دینا تھا۔ یہ دیکھ کر شہکار سینٹ ہیر وین کو بکھلنے کے لیے چپرس پرستے صابن کا جھاگ پونچھنے لیزر سی باہر کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ اور اس طرح چار کا آغاز ہوتا تھا۔ میں نے کہانی کا پلاٹ اسی طرح سوچا تھا۔

”کتنی کاسٹا تو نہیں ہے؟“

یہ آواز سن کر میں برآمدہ کی طرف بڑھا۔

سیاہ آؤٹی کوٹ پہنے ایک بوڑھا آدمی ایک طرف کھڑا اٹھارتے کے لیے پس و پیش میں پڑا ہوا تھا۔

”کتا گھر کے پھوڑے بندھا ہے۔ اندھا کھاؤ۔“

”کیا آپ ہی یہاں رہتے دلے کرک ہیں؟“

”میں کرک نہیں ہوں۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ میرا غرض ابھی دور نہیں ہوا تھا۔ ”یہاں کوئی کہانی کار رہتے ہیں۔ وہ کہاں میں گئے؟“

”یہاں صرف میں رہتا ہوں۔“ ”ٹھیک ہے۔ ذرا دیکھئے، یہ خط آپ کا تو نہیں؟“ اُس نے ایک زرد لافنا میری جانب پڑھایا۔ خط میرے ہی نام تھا۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔

شریح کیا۔

۱۲ جنوری

جناب۔

”ہنر نا تو اس کے جزئی کرے ملایا

کے اندر ایک پرانی الام گھڑی لگی ہے۔ برائے پروانی

اُسے تلاش کر کے حالِ موقعہ بڑا سنی کرن خانا ماں کے ہاتھ بھیج دیں۔ کرہ کی جانی بیچا رہا ہوں۔

گنوں گنوں کورت سپرد نا (دستخط)

”اب:“ ”ہنر نا تو اس میں نے خانا ماں سے چابی لے کر جزئی کرہ

کھولا۔ لمار کے دوسرے خانے میں سے گھڑی نکالی۔ گھڑی کو انگلیوں میں پکڑے ہوئے بھی لے

جوڑے سے پچھا: ”ہی ہے نا؟“

”ہاں بابو جی۔ ہی ہے۔“ اُس نے گھڑی کو

ایک دروازے میں لپیٹ کر اپنی نگلی کے اوپری سرے میں ٹھونس دیا۔

”اسے اتنی احتیاط سے کیوں لے جا رہے ہو؟“

”اسے لٹکے بیچنا ہے بابو جی، لٹکنا۔“

”لٹکنا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا: ”شاید

مرگت کے لیے؟“

اُس نے اپنا سر ہلایا: ”نہیں۔ دراصل اس

گھڑی کے ٹاک انگلیوں میں رہتے ہیں۔“

”کیا واقعی یہ اتنی قیمتی ہے؟“

”اس کے ٹاک کے لیے اس کی قیمت بہت

زیادہ ہے۔ اُن کے اصرار پر ہی ہم اسے بیچ رہے

ہیں۔ اس گھڑی کی ایک لمبی کہانی ہے۔ اُنہل نے

عزت سے پوٹی کر سہلایا۔ یہ دہانے کتنے ہی واقعات

کی شاہد ہے۔ وہ! وقت سنیں مبدل ہوتا ہے۔“

”میں سال پہلے تک رہے الام کی آواز اب

بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ! اس

آواز نے مجھے کیسے واقعات کو مت دیا تھا۔“ ”دور

اتنی کی جانب بڑھ چکی لگے پوڑھا خود پوڑھا۔“

ان جملوں نے مجھے اس کی جانب متوجہ کیا

اب تو یہ کہانی سنائی پڑے گی۔ پوڑھا مغرب کے

کھٹے آسمان کی طرف نظر کرے ہوئے تھا جہاں سورج

تپ رہا تھا۔ وہ لہلا۔ ”کانی گئی ہے۔“

میں نے اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

۱۲ جنوری ۱۹۹۳

بہت تک سورج منور نہیں ہوتا، تم انتظار
نہیں کر لیتے؟" اور وہ ہلکی ہو گیا۔

یہودیوں کے پاس کہاں کی سنانے کا فن جو ہوتا
ہے، اس نے اسی خوب صورت انداز میں کہنا شروع
کیا!

"میں سال پہلے کی بات ہے۔ میکاردی
کی ایک اسکاٹ صاحب یہاں "میگنی" کے تجربے
یا کرتے تھے۔ اونچا، خوب صورت۔ وہ قریب
ایس سال کے تھے مگر کبھی کبھار اسے تھے۔ وہ اپنے
بوسے ہم وزنوں کی طرح مغرور، بے رحم اور متعجب
ہیں تھے۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے دوسرے
دروں کے مقابلے میں وہ بالکل مختلف قسم کے شخص
تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں انگریزوں
کے تئیں نفرت کا جذبہ بھی تھا۔ وہ ان کے کہلوں یا
پاریوں میں بھی نہ جاتے تھے۔ وہ ایک بڑے جگہ
میں اپنے والد صاحبی کے "ٹوپی" کے ساتھ بالکل تہہ
رہتے تھے۔ دوسرے دروں نے ان کا بائیکاٹ
کر دیا تھا۔ لیکن میکاردی صاحب پر اس کا کوئی اثر
نہ تھا۔ ان کے باپ ڈپٹی تھے اور لندن میں کہیں
کے ڈائریکٹروں میں سے ایک تھے۔

"میکاردی صاحب اچھے کھلاڑی بھی تھے۔
صاحب صبح شام شید بٹا کر چہرہ ہلکے رکھتے تھے۔
ان کا سر ایک ٹیلے رکھتے تھے اس کے کھڑے کا سا
نڈھال تھا، جس کے کناروں پر کچھ گھنگھریالے نہری
بال آگے آتے ہوں

"وہ اپنے ملازمین کو بہت چاہتے تھے۔ ان
کے ساتھ بے تکلفی اور دم دلی سلوک کرنے میں وہ بھی
نہیں کچھ۔ جی کہ ان کے تہواریں میں بھی وہ حصہ
لیتے تھے۔ ان کا خانا ماں ناتو ایک مشہور دعوت
پہلوان تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ دونوں مل جل جانے
میں کشمیری پکیشن کیا کرتے تھے۔ میکاردی صاحب کا
سب سے زیادہ قابل ذکر تھا ان کا ایک انداز۔

"جیسا میں نے پہلے بتایا کہ صاحب کے پاس
نمکی نام کا ایک گتہ تھا۔ یہ کالافٹا صاحب کے ساتھ

ان کے دفتر جا کرتا تھا۔ بعض اوقات صاحب اپنے
دفتر میں بچے وقت سے قبل آجاتے اور اندر سے دروازہ
بند کر لیتے۔ کدو کا ایک بیکڑا لگا رہا ایک ایک جیسے
اٹھا کر انٹ کر رکھنا شروع کر دیتے۔ میز، کرسیاں،
کھینڈر، دیواروں پر لگی تصویریں وغیرہ کچھ جھپٹتے۔
جب ان کو اطمینان ہوتا کہ تمام چیزیں اچھی کی
جائی ہیں تو صاحب خود بھی سر کے پیڈیشن آسن کے
انداز میں کھڑے ہو جاتے۔ اس طرح کے سر کے بل کھٹے
ہوتے سے کر کے کی چیزیں پھر سے قدرتی معلوم ہوتیں۔

"بیرمن واربات چیراسی رامن ٹرانے
سب سے پہلے دیکھی تھی۔ ایک دفعہ دفتر کے کمرے
میں ڈپٹی کو دروازہ کھولتے ہیں مگر کبھی کبھار
انہوں نے خوف سے وہ کمرے کی جانب دوڑا لیکن
دروازہ بند تھا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ جب
اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ میڈیکل کرسٹن آئیر کے
پاس دوڑا گیا۔ کرسٹن آئیر نے آکر دروازے کی واڑ
سے اندر جھانکا۔ جیسی کے مارے اس کے کندھے پر
اتھار لکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر دوسرے کمرے کرسٹن
پانی کرتے تھے جی تھا نکالنا۔ بعد ازاں مامن نے تڑپتی
جھاٹک لیا۔ اس کے بعد دفتر کے تمام لوگ ایک کے
بعد ایک آکر اس مندر سے ٹکٹ اندر ہوئے۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد صاحب قدرتی
حالت میں آئے اور تمام چیزوں کو دوبارہ سیدھا
کر دیا۔ پھر گریٹ سٹاک کر ایک رسالہ پڑھنے لگے۔
اپنی ہنسی دہانے کی سرور ڈیکریشن کرنے ہوئے
تمام لوگ اپنی اپنی میزوں پر لوٹ آئے۔
ایک ٹیکس س۔ دی سین نے اسے "امریکی
انداز" کا نام دے دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کس م
امریکی سرزمین پر ہمارے ٹیکس نیچے دوسری طرف
رہتے ہیں۔ لہذا وہ اسی طرف سر کے کھڑے ہوئے
ہوں گے

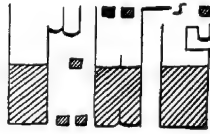
"بعد ازاں ٹوپی نے بھی "امریکی انداز" کو
لیا جب وہ اپنے مال کو ٹریڈیشن آسن کرتے دیکھتا تو

وہ بھی دیوار کے پاس پہنچ کر سر کے بل کھٹا ہونے کی
کوشش میں غرق لگتا۔

"اس طرح ان کا نام "سکی صاحب" ہو گیا۔
بعض اوقات وہ بہت نامزد رامن ہوتا ہے تو اپنے
ملازمین کو کبھی طرح چیتے اور تمام سامان اُدھر
اُدھر پھینک دیتے، لیکن جب وہ پڑ سکون پوچھتے
تو مار کھانے والوں کو ایک ایک کر کے بلاتے اور ہر
ایک کو پانچ یا دس روپے دیتے، اسی لیے ان کے
ملازم اکثر بے خواہش کرتے، کاش! آج بھی صاحب
مجھے بیٹیں۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس
وقت میں ان کے خانا ماں کے معاون کے طور
پر کام کرتا تھا۔

کئی سال گزر گئے۔ سننے میں آیا کہ میکاردی
صاحب بے تک جھپٹنے والے ہیں۔ کیوں کہ کمپنی
کے ڈائریکٹروں سے جھگڑا ہو رہا ہے کہ وہ سے انہوں
نے استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے دنیا میں ایک
دوسری جگہ خرید لی تھی۔ ان کے جگہ سے ایک لارم
گھڑی غائب کرنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ جب میں
بے تک مرتبہ اس گھڑی کو ان کی میز پر رکھ دیا تھا،
تب ہی سے میرے دل میں اسے اڑا لینے کی خواہش
گھر گئے ہوئے تھی۔ میکاردی صاحب کو اس کے
غائب ہونے کا پتہ بھی نہ چلتا۔ کیوں کہ وہ کافی شین و
بیج میں رہا کرتے تھے۔ اور اگر کبھی انہیں اس کا
خیال آتا بھی تو میں ان سے کہہ دیتا کہ وہ گر کر ٹوٹ
گیا تھا اور وہ میری بات پر یقین کر لیتے۔

جب بھی صاحب خفا ہوتے تو اپنی تمام جیسریں
اُدھر اُدھر پھینکتے تھے۔ تاوانا ماں مالک کی بات
جانتا تھا، اس لیے وہ ایسے موقعوں پر کبھی جیسریں اڑا
چکا تھا۔ میں نے بھی ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن
میں اس سے شرمناک رہا۔ جانا کہ گیت کا دروازہ لائن
نارنگی کی کس تھا۔ وہ ہر چیز کی پانچ پڑ مال کرتا۔
یہاں تک کہ عورتوں کے سر پر کئی ٹوکریوں اور بزنز
کو بھی نہ چھوڑتا۔ ان کی اس طرح کی تہہ تک دیکھ
ڈالتا۔ کافی سوچنے کے بعد میں نے ایک طریقہ وضع کر



بہار میں اردو تنقید

مصدقہ: انجمن ادب

قیمت: پندرہ روپے

مطبع: ایک ایڈیٹر، سبزی باغ، پٹنم

مذمت سے میری یہ رائے رہی ہے اور اس کا میں نے اکثر اظہار بھی کیا ہے کہ اردو چونکہ پورے ہندوستان کی زبان ہے اور اس وسیع ملک کے ہر علاقے میں اردو کی گراں قدر تصنیفات و تراجمات موجود ہیں، لہذا اردو زبان ادب کی سبب و مکتب نامی تاریخ مرتب کرنے کے واسطے ہر علاقے کی تصانیف و تصانیفات کا جائزہ لینا ضروری ہو گا۔ مقام محترم ہے کہ اس انگلشیہ یہ کام شروع ہو چکا ہے اور جدید آبادوں کے بعد بہار نے اپنے علاقے کی ادبی سرمایہ کو محفوظ کرنے اور اسے منظم عام پر لانے کی سعی ایک عرصے سے شروع کر رکھی ہے۔ بہار میں اردو کے ادیبانوں سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن کی خاصی اہمیت ہے۔ ادبیات اردو کی دوسری صنفوں کے علاوہ بہار میں تنقید کا بھی قابل غماز سرمایہ موجود ہے۔ جس پر تفصیل سے نظر ڈالنے اور حیطہ تحریر میں لانے کی خاصی گنجائش ہے۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کی پہلی نثر کتاب ”بہار میں اردو تنقید“ اسی موضوع پر ایک اہم تالیف ہے۔ جس میں مذکورہ ہائے شعراء سے لے کر آج تک کے تنقیدی سرمایے کا متغدادی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں مذکورہ شورش، تذکرہ گلزار ادیبان، تذکرہ عقی، جلد ۱، مخضر، قاسم وطن، تذکرہ ہندو غزلے بہار اور تذکرہ مسلم غزلے بہار کی مباحثی خصوصیات اختصار کے ساتھ تفصیل دی گئی ہیں۔ اس کے بعد یاد و رفتگان کے زیر عنوان عبدالغفور مسیحی، تاج، نصیر حسین خیال، مولانا سلمان ندوی، مولانا منظر احمد گیلانی، عیسیٰ الدین دہلوی اور عیسیٰ مظہری کی تنقیدی نگارشات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ادا و امام اثر معروف تالیف کا شغف الحقائق کا تفصیل جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد ازاں مختلف ادیب کے تحت تعلیم دہن احمد، اختر امجدی، شکیل الرحمن، عبدالغنی اور وہاب بھٹنہ کی الف راوی

تفصیل دی گئی

نقطہ نظر اور تنقیدی روش کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اردو تنقید کی روایت کے علاوہ تنقید کے مختلف دیستان بھی زیر بحث آئے ہیں۔

کتاب میں پہلی نظر کے ایک باب میں، باتحیات، العاصمات کے عنوان سے قاضی عبداللہ، حسن مکتبی، عطا کا کوئی، سید حسن، محسنظر حسین اور سید محمد حسن کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ”ادبی تنقید کی چھیلیاں“ کے تحت غلام سرور، ذکی الحق، ممتاز احمد، ابو ذر عثمانی، لعل الرحمن، منظر امام، نجم الشہری، قمر الحق، منظر اقبال، احمد تاجدار اور بعض دوسرے ادیبان کی تنقیدی نگارشات پر اختصار کے ساتھ رائے ظاہر کی گئی ہے۔ اس حصے میں تنقید نگاروں کی نئی صفت کا ایک ہلکا سا نقشہ سامنے آ جا تا ہے۔

پچھلی طرز پر زیر تبصرہ کتاب بہار میں اردو تنقید کا ایک ایسا جائزہ ہے، جس سے اس علاقے کی تنقیدی سرمایے پر عامی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے مولف ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ایک بہار نوجوان ہیں، جن کی تحریروں میں علمیت، سنجیدگی اور شرف نگاہ کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے بعض خیالات سے اختلاف ممکن ہے۔ مگر اس کے اعتراضات میں کوئی تامل نہیں کہ یہ کتاب بہار میں اردو تنقید کی اہم اور فائدہ مند تصنیفیں، یقینی معاون ہوگی۔ کتاب کو زبان صاف، سادہ اور سادہ ہے۔ کتاب و طباعت سحری اور سرسبز ورق کا زیب نگاہ ہے۔

— سید حسن

بھینگے زمین (غزلیں، نظمیں)

شاعر: ڈاکٹر احسن صوفی

قیمت: بارہ روپے

ناشر: نعت پبلشرز، حیدری اریکٹ، امین آباد، کھنؤ

ڈاکٹر احسن صوفی شاعری یوں قوت پاتی ہے کہ زمانے ہی سے کر رہے ہیں، لیکن اس جانب تنقید کی سے توجہ انہوں نے دس بارہ سال قبل ہی سے کی ہے ایک عرصہ تک ان کے ذوق کی تسکین کی راہ میں سائنس ایسا بظاہر سخت ممنوع حاصل رہا اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ ورنہ وہ سائنس دان بن پاتے شاعر ورنے پیسے وہ آج بھی اور جن کا مجموعہ ”بھینگے زمین“ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

”بھینگے زمین“ میں چھل مارت، غلط فہمیاں ہیں اور باقی غزلیں بھی کے معنی یہ ہیں کہ اس مضمونی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اس لیے جوئے ان کی غزل گوئی کے ان پہلوؤں پر غور کر س جو ان کی بچان بناتے ہیں یا نہا سکتے ہیں۔ احسن صوفی نے اپنا مضمونی سفر اس وقت شروع کیا جب ترقی پسند تحریک کے بھانے فکر و نظر کا حصہ بن گئی تھی اور جدیدیت میں نے ادھما تھمت کا

عادت کو اپنی متابع عزیز قرار دیا تھا، خود ایک ادما کی شکل میں ابھرنے کے بعد اپنی شکست کی آواز نہیں دیتی۔ اور بالآخر یہ ضرور ہوا تھا کہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک Synthesis ابھرنے لگتا ہے۔ اقدار ہمارا ضرور تھا۔ لیکن ان میں اتنی قدر اور انفعلیت کا فیصلہ وہ خود کرنا چاہتا تھا، جسے آراستگی کی اپنی زیادہ نگہ نظر نہ تھی، لیکن نئے نئے نکلنے والے کاموں کی خدمت کی ریلوں کے ساتھ ٹک پڑنے کا بائیسے دیا فتنہ کرنے والوں میں نظاموں کو ان کی خدمت کی ریلوں کے ساتھ متردو کیا، لیکن ایک طرح کے نظم کو قبول بھی کیا۔ نظام اور نظم کا فرق شاید یہ System اور Pattern کے لفظوں سے زیادہ واضح ہو سکے۔

اس منزل سے بہت سے نئے شاعر گذرے، لیکن ان کی پہچان وہی بتا سکے، جو عام تجربے کو اپنا مخصوص شعری تجربہ بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان چند شاعروں میں احمد ربوئی بھی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل اشعار بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

اس وقت بھی کیا تم نہ مجھے یاد کرو گئے

عجبیری طرح ہمیں کہ کوئی بات کہے گا

عرصہ گزرا کوئی خدا حافظ کہنے کو آیا تھا

اب بھی آنھوں میں اکثریت دہل رہا ہے

تو ملا تو میں اسیلا رہ گیا تیری فرت بھی تو میں تھا رہا تھا

ان اشعار میں ایک بالکل ذاتی لمس ہے۔ لیکن یہ ذاتی لمس انھیں دوسروں کے لیے اچھی نہیں بنانا بلکہ اس تجربے میں شامل ہونے اور اس سے ٹھٹھانے اور ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

ان کی غزلوں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تعلیمات اور فاری ترکیب تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ جن طرح مذہم سے اور شاعر شاعر اور انسان ہیں اس کے بغیر غزل وہ فیض سے بڑی آسانی سے متاثر ہو سکتے تھے اور فیض کا حصہ بن جاتے۔ ایسا ہے کہ جو اس کے قریب پہنچا وہ اسی کا ہوا ہے۔ احمد ربوئی نے غزل کو فیض کی اس شش سے بڑی شکل سے بچایا ہوگا۔ ایک اور تجربہ جس سے انھوں نے غزل کو بڑی محنت اور امانت سے بچایا ہے وہ ہے "ٹینڈی غزل" جس کی انھیں چند سال قبل متذہماتے، اہم شاعر بننے لگے تھے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں وہ گھر وڑا پن نہیں ہے جسے میں "ماٹھے کا اندازہ" کہوں گا۔ ایک ادھر شعر میں اگر یہ کیفیت تلاش کر بھی لی جائے تو اسے قہقہے کی بجائے عجز بیان قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ان دونوں اعلیٰین سے وہی شاعریاں سکتا ہے، جسے آپ اور اپنے تجربے پر پھر دہرے اور اس ضمنی سے اس استقامت کا پھر ثبوت دیا ہے۔ سائنس کے مطالعہ سے انھیں اس طرح متاثر نہیں کیا، جس طرح کے اثر کا خاص طور پر توجہ کی جاتی ہے۔ لیکن یہ کہ ان کے ہاں نہ سائنسی مضامین میں گ

آج کل کی دہائی

د سائنس کی دنیا کے الفاظ۔ اصل میں وہ سائنسی نظام سے زیادہ سائنسی نظم سے متاثر ہیں اور یہی سائنس کی روح ہے۔ علم افلاک کے دو نظام ایک دھڑ کی صند ہونے کے باوجود بالکل صحیح پہنچ گئی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن سائنس دان ایک نظام کو قبول کرنا تب ہی اور دوسرے کو مسترد۔ قبول کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ وہ نظام سادہ ہے۔ آسان نہیں۔ سادہ اس نظام کو قرار دیا جاتا ہے، جس کو تسلیم کرنے کے لیے کم سے کم مفروضوں کی ضرورت پڑے۔ یہی اس ضمنی کی شاعری کی خصوصیت بھی ہے۔ ان کے کلام سے ٹھٹھانے اور دوسرے کے لیے شاعری کے کم سے کم مفروضوں کو کام میں لانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے چند اشعار آپ بھی نہیں۔

شجر سارے برہنہ ہو چکے ہیں کہاں جانیں کوئی سایہ نہیں ہے بادلوں کو کسی کھڑکی سے نہ آنے دینا یہ تو کہہ کر ہر شے کو چھوڑ کر کہیں کہہ میں رات دن تری یاد بکھر گئیں مجھ پر روشنی میں مرا جاگتا رہا زبردستہ و مجھ کو کی متعدد غزلوں میں احمد ربوئی کے سائنسی مزاج نے خیال اور اس کی پہنچ میں سادگی کی ایسی دنیا آباد کی ہے۔ گل جڑے میں کی خوب صورتی کو کہہ کر کہہ سکتے تھے۔

احمد ربوئی کی غزل گوئی کی ایک اور خصوصیت ہے ایشائے خارجہ اور موسم کی کیفیات کو شعری تجربے میں ڈھال دینا اور غزل کو نظم بنانے میں اس میں وہ کیفیت پیدا کر دینا جس سے کچھ ایسا رابطہ پیدا ہو جائے کہ قبول متاثر میں اگر ایک شعر بھی کم کر دیں تو غزل کا حسن بکری طرح ہو جائے۔ یہ دونوں خصوصیات جو ان اشعار سے ایک ہی غزل میں یک جا ہو چکی ہیں۔ آپ بھی اس غزل سے ٹھٹھانے اور دوسروں سے

صوبہ پہلی توڑ کر وہے میں حرات جاگی

ہمے بٹھکے ہوئے سمجھوں میں بھی راحت جاگی

بکھو پیچیدہ دیے ٹوڑنے میں نہیں دھرتی پر ذرے ذرے میں طرب غیر تمازت جاگی

سبز پڑوں کی ہر کہ شاخ نے اٹھرائی لی

گلدھاروں کے گنگوٹوں میں مصابت جاگی

پھر ہر کہ رنگ میں احساس ناقص ابھرا پھر جہاں جہوں میں مصمم شزارت جاگی

آنکھوں آنکھوں میں کئی دُور چلے سستی کے

ناہراہوں پر بھٹکنے کی جہارت جاگی

احمد ربوئی نے خود کو خوب خوب لکھا اور وہ اچھی عمدہ غزلیں خوب لکھیں گے۔

جلد چہلوی

اردو میں خود نوشت سوانح حیات

معتمد؛ ڈاکٹر مسیحو الزہرہ

نشر: نامی پریس، خواجہ قلب الدین روڈ، گھنٹہ
قیمت: ساڑھے پچھپے

دیدہ زہیب سرگھر گروپس سے مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔
پہلی کتاب نامی پریس گھنٹہ کے مندرجہ ذیل کتابوں میں سے ہے۔
مردنی مشہور خطاط مسافرین کے خط میں ہے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر مسعود الزکرا
نے تحقیق و محاکمہ کے بعد اپنی گھنٹہ پریس سے ڈاکٹر آصف خاں کی ڈگری ملی ہے۔
اردو میں خود نوشت سوانح پر یہ کتاب باقاعدہ طور پر پہلا قابل ذکر تحقیقی
اور تصدیقی کام ہے، جو پروفیسر شمس الدین فہرزی کی نگرانی میں سرانجام دیا گیا ہے۔
کتاب پر تفصیل ذیل ناچ ابواب پر مشتمل ہے: ۱۔ خود نوشت سوانح حیات کا مفہوم
اور خصوصیات (۲) عالمی ادب اور خود نوشت سوانح حیات کی روایت (۳) اردو میں
آپ بیتی کے اہلکار کی مختلف نوعیتیں۔ روزنامہ، مخطوط، سفرنامہ، رپورٹ اور مستشرقین
سفر کیا (۴) اردو میں خود نوشت سوانح حیات ایک جائزہ (۵) خود نوشت سوانح حیات
کی طریقہ اور قیاداری کی توقعات۔ اس صنف کے اہلکار اور قیاداری کے امکانات۔ ان میں
کتابیات اور اشاریہ شخصیات بھی شامل ہے۔ ان ابواب میں جو تصاویر حاصل
کیا گئے ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل ۲۳ آپ بیتیوں کا جائزہ شامل ہے:

- ۱۔ قزاقیہ: مولانا جعفر شمس الدین (۲) داستانِ ندر: خیرت پوری (۱۹۱۵ء)
- آپ بیتی: عبدالغفور خان (۱۹۱۵ء) (۳) آپ بیتی: خواجہ حسن نظامی (۱۹۱۵ء) (۵)
- نکدہ: ابو الکلام آزاد (۱۹۱۵ء) (۶) اجمال نامہ: میرزا علی (۱۹۱۵ء) (۷)
- آپ بیتی: ظفر حسن اربک (۸) بخون ہوا: حکیم نور محمد (۱۹۱۵ء) (۹) یادنامہ:
- ناب جھنڈا: میرزا (۱۰) نصیر حیات: مولانا حسین محمد (۱۹۱۵ء) (۱۱)
- نابل فروری: دیوان سنگھ غفر (۱۲) شہادت: جوش بلگرامی (۱۹۱۵ء) (۱۳)
- شاہد کی کہانی شاہد کی ذاتی: شاہد علی آبادی (۱۹۱۵ء) (۱۴) سرگزشت: عبدالغنی بک
- ۱۹۱۵ء (۱۵) یادوں کی دنیا: یوسف حسن خان (۱۹۱۵ء) (۱۶) شاہراہ پاکستان:
- جوہری عقیق الزمان (۱۹۱۵ء) (۱۷) بوسے گل ناز دل و دود چراغِ محفل: جتوئی کاٹھری
- ۱۹۱۵ء (۱۸) یادوں کی برسات: جوش آبادی (۱۹۱۵ء) (۱۹) مجھے کہنا ہے کچھ اپنی
- دہان میں: حماد غلام السید (۲۰) اپنی تلاش میں: حکیم الدین احمد شمس الدین
- جوان دانش: احسان دانش (۱۹۱۵ء) (۲۱) نکدہ: شمس الدین احمد (۱۹۱۵ء) (۲۲)
- آپ بیتی: عبدالغفر دریا پوری (۱۹۱۵ء)

کتاب کے چوتھے باب میں آپ بیتیوں کے اہم مندرجہ ذیل چاروں کا احراز
کیا جاسکتا ہے۔

(۱) متعدد تذکروں میں ان کے سوانح کے مختصر خود نوشت حالات موجود ہیں۔

جن پر کتاب میں قوت دینا مناسب سمجھی۔ مثلاً:

انتخابِ یادگار: مولانا ابراہیم علی طبع ۱۲۹۵ھ طبع دوم ص ۳۲ تا ۳۳
میں ابراہیم علی کے مختصر خود نوشت حالات درج ہیں۔ مکتبہ انیسویں خزانہ طبع ۱۳۱۵ھ

ص ۳۲ تا ۳۳ سے قبل کے خود نوشت حالات مل سکتے ہیں یا تذکرہ خزانہ گزیرا
طبع ۱۳۱۵ھ ص ۵۰ میں سعادت خاں ناصر کے مختصر خود نوشت حالات مل سکتے ہیں۔

سربراہ کلکتہ میں جن میں جن کے مختصر خود نوشت حالات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں مختلف
تذکروں کے خود نوشت حالات تلاش کیے ان پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔

(۲) مکتبہ شریعت: نیاز علی بیگ خان (۱۳۱۵ء) (۳) میں بھی

مختصر سوانح کے خود نوشت حالات موجود ہیں، ان سے زیر تبصرہ کتاب غالی ملتی ہے۔

(۴) مولانا داستانِ تاریخ اردو: مولانا قادی طبع ۱۳۱۵ء ص ۳۱۵ تا ۳۱۸

(۲) آغا گل: نئی دہلی کے متعدد شماروں میں سوانح اور اردو سوانح کے خود نوشت

حالات غبار کاروں کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں، ان پر زیر تبصرہ کتاب میں مناسب
تقریر دلا جاسکتی ہے۔

(۴) "گلزار کی باڑی کی گڑبگڑ" میں عرب، اراکوں کی یاد: سید مسعود الدین زیدی

لاہور طبع ۱۳۱۵ء میں کتاب کے مصنف نے اپنے حجاب علی گڑبگڑ کے حالات لکھے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں اس کتاب کا بھی حوالہ نظر میں آتا (یہاں یوپی اردو کالجی گھنٹہ

سے زیر اشاعت اس کتاب کا ذکر کرنا بھی مناسب ہو گا۔ جس میں سوانح اور

اردو سوانح کے مختصر خود نوشت حالات جمع ہو چکے ہیں اور شائع ہونے والے ہیں)

کتاب کے چوتھے باب (ص ۱۹۳) میں سوانح کی آپ بیتی کے اہم تذکرہ

کتابوں میں گنج تاریخ "کلام بھی درج ہو گا۔ سوانح کی اس کتاب کا اصل نام

"گنج تاریخ" ہے۔ جو طبع ذیل شریعت پریس ۱۳۱۵ء ذی الحجہ ۱۳۱۵ء میں

چھپی تھی۔

کتاب کے تیسرے باب میں سفر ناموں کا جائزہ دیا گیا ہے جن میں مندرجہ ذیل

ساحبان قلم کے سفر ناموں پر تبصرہ ہے ان کے حوالے موجود ہیں: یوسف خان کیل پوٹ

جعفر سمیع صبری، محمد حسن آزاد، مرستیہ احمد خاں، خلیل عثمانی، مولوی بیگ الدین علی

شار علی بیگ، حامد خان، مفتی محبوب عالم، مفتی عبدالقادر، مولوی حسن نظامی، شاہ بانو

فتح علی ترمیش، قاضی عبدالغفار، قاضی ذوالفقار، مولوی ندوی، محمود فی

آغا محمد جتوئی، اختر یاسین الدین، سید اختر شمس الدین، ڈاکٹر سعادت بریلوی۔

شمس الدین ناز، قدرت اللہ شہاب، سید ابوالحسن ندوی، فضل الرحمن شیدا، جمال صبا،

عزیز بیگ، شریف فاروق اور امراؤں کے کتاب کے اس حصے میں مندرجہ ذیل سفر ناموں

کے احاطے کی گنجائش ممکن ہوئی ہے۔

(۱) سیر بقول (۲) آغا مقبول احمد خاں کا سفر نامہ: مولانا سید غلام حیدر خاں

طبعی منش کی گزارش کاران پور (طبع دوم) مطبوعہ قادی ۱۸۹۸ء

(۲) بدلتے رنگ: منظورالاکین، مکتبہ قادی ۱۹۵۸ء (یہ بھی ایک

پھر تاثر نامہ سفر نامہ ہے)

(۳) یاسین لاہور کی: سرم آندہ طبع نومبر ۱۹۸۱ء (یہ سفر نامہ آپ بیتی

دورانِ حیات سے قبل ذکر کرتا ہے)

اُمید ہے کہ آئندہ بیاضی میں زیر تبصہ کتاب ان معمولی کمزوریوں سے بھی پاک ہوگی۔ چوتھی ترتیب ہے کہ کتاب اپنی عبادت کے بل بوتے پر ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرے گی۔

— کاظم علی خاں

علامہ اقبال، مصلحِ قرنِ آخر

ڈاکٹر علی شریعتی

ترجمہ: ڈاکٹر کبیر احمد عباسی
ناشر: اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر روئی ویسٹ، سری نگر۔
قیمت: بارہ روپے

اُدھر شمس اس سب سے زیادہ حقیقی و نقیدی کام غالب اور اقبال کے بارے میں ہوا ہے۔ اب تک ان دونوں شہساز کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو اُنجا کر کے لے کر لے کر سیکڑوں مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اندر سے مسلح اب تک ہماری ہے۔ اس لیے غالب اور اقبال شمس کی زندگی سے پہلوؤں پر گئے دن کوئی نئی کتاب شائع ہوتی رہتی ہے۔ ادھر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے تینوں کی شہادت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ حقیقی اور اقبال شناسوں کے لیے عیدِ ہمت رکھتا ہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے ابھی حال میں علامہ اقبال پر ایمان کے مشہور عالم و دانشور ڈاکٹر علی شریعتی کی مشہور تقریر ”علامہ اقبال، مصلحِ قرنِ آخر“ شائع کی ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، جسے پروفیسر آبی احمد ویر، ڈاکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ نے دوسرے مکمل دور دوسری زبانوں میں اقبال سے متعلق تحریروں کا جائزہ لینے کے لیے شروع کیا ہے تاکہ اقبال کی آفات اور معنویت کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کا شمار ایران کے بڑے عالموں اور دانشوروں میں ہوتا ہے۔ وہ اقبال سے حدودِ متاخرتے اور مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے اور آزادی نئی اسلامی فکر کی از سر نو تشکیل کے سلسلے میں اقبال کو ایک مارا توڑ سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اقبال سے متعلق تھان کے مشہور مدرسے حسدِ اندام میں دو تقریریں کی تھیں۔ جس میں ”اقبال مصلحِ قرنِ آخر“ ان کی دوسری تقریر تھی، جس کا اردو ترجمہ کبیر احمد عباسی نے کیا ہے۔ ڈاکٹر کبیر احمد عباسی نے کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر علی شریعتی کے حالات زندگی اور فکر کا تفصیلی سے جائزہ دیا ہے، جو بے حد مفید اور معلومات افزا ہے۔

زیر تبصہ کتاب میں ڈاکٹر علی شریعتی نے اقبال کو دنیا کے عظیم انقلابی اور تاریخ ساز فکر کا پیش چیلر کیا ہے۔ ان کے خیال میں اقبال ایک مصلح ہیں، مسکین اس اصطلاح کو انہوں نے عام معنوں سے ہٹ کر ان معنوں میں استعمال کیا ہے جس میں تہذیبی اور نظریاتی تبدیلی کے ساتھ انقلاب کے اصل معنی بھی گھریں اور ملیے

آغا گل کوئی دہلی

وہ اقبال کو مرستہ احمد خاں یا باندہ وستان کی اسلامی تحریک کے دوسرے علمائے مختلف قرار دیا ہے، جس کی نگاہوں کو انگریز کی تہذیب، زبان اور مذہبی ترقی نے غور کر رکھا تھا۔ ان کی نگاہ میں اقبال کی شخصیت اپنے زمانے کے سیدار ترین شخصیت تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اقبال کا پیغام ہے کہ ہم اپنی اُن گوسینوں میں روش کیے رہیں اور ایمان، عرفان اور اس عظیم معنی کی روح کو دوبارہ اپنی جانوں میں منتقل کر دیں جو ”انسان پرورش ہے۔ تاکہ ہم لوگ بھی کی روح، جان کے معنی، پیچھے نہ رہیں اور جو کے اصل مقصد پر رونق سے آتشا تر ہو جائیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی اقبال کو ایک ایسی شخصیت سمجھتے ہیں جو مغربی استعمار، قدیم و جدید، تہذیبی و علمی مصلحت اور مذہبی فکر سے ناواقفیت کی بنا پر تہرہ تر ہو جائے کے بعد بیسویں صدی میں اقبال کی شکل میں دوبارہ متکمل ہوئی ہے۔ ان کی نگاہ میں اقبال ایسے انسان ہیں، جن کا دل مشرقی، روح مغربی، فکر بھی مغربی، فن بھی مغربی، فنش نہایت اہلکار اور پرکشش ہے اور جو روح کے در و آلام سے بھی واقف ہے۔ اور جو بیسویں صدی کے عظیم مفکر انقلابی اور فکر اسلامی کی تشکیل جو در کرنے والے ہیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی یہ کتاب یقیناً اقبال شناسی میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اقبال کی شاعری، شخصیت اور سیاسی مذہبی فکر کے بارے میں ہندوستان و پاکستان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے، لیکن علی شریعتی کا یہ مطالعہ ایک نئے رخ اور نئی جہت کو پیش کر رہا ہے اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر علی شریعتی نے فکر اقبال کی تاروں، اہرائی تحریک آزادی کے پس منظر میں کیا ہے اور ان کے افکار و خیالات کی تشریح کے ذریعے اس کے ہم فکروں میں جوش اور اسلامی انقلاب کی ہم فکروں کی ماہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جو اقبال کی عالمی معنویت اور آفاقیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

ڈاکٹر کبیر احمد عباسی بہت اچھے اور ذہن دار مترجم ہیں۔ انہوں نے بڑی وقت فکر کے ساتھ اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی فارسی کی کئی کتابوں کے بہت کامیاب ترجمے کر چکے ہیں اور اس اہم اور روان ترجمے کے لیے ہم ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب طبعیات و کتابت کے لحاظ سے بھی بہت اچھی ہے۔

— شاد بدولوی

تذکرہ شعرائے اتر پردیش حصہ اول، دوم

عرفان عباسی

اردو محل پبلشرز، ۹۱-یاغ نمبر، نیا گڑاں، کھنڈ
قیمت: حصہ اول: ۳۰ روپے، حصہ دوم: ۴۰ روپے
اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے بلکہ یہ جتنا غلط نہ ہوگا کہ تصنیف اور تاریخ کا نقش اول تذکرے ہی ہیں۔ حالانکہ ان کی تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی بحث حدیث موضوع بحث رہی ہے اور ان کی واقعت اور اختلاف میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تہذیبوں

اور عامیوں کے باوجود تذکرہ کرنے سے صرف میں اپنے ہمد کے شعراء سے معاف کر لیا گیا تھیں، تنقید اور تاریخ کی طرف ہماری رہنمائی کی یقیناً و تنقید کے ساتھ تذکرہ نگاری کا اندر گھوم گیا، لیکن دور جدید میں بھی بعض حضرات تذکرے مرتب کرتے رہے ہیں۔ جن میں ملک رام صاحب کا نام سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جنہوں نے عامیوں کے تذکرے لکھے۔ ان کے علاوہ ابھی حال میں عرفان عباسی کی ایک وسیع کوشش ”تذکرہ شعرائے اتر پردیش“ کے نام سے ہمارے سامنے آئی ہے۔

عرفان عباسی اردو کے مشہور نثر نگار ہیں۔ ان کے ناولوں کا ایک مجموعہ آپ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں شعرائے کھنڈ کے تذکرے کے علاوہ تذکرہ شعرائے اودھ آپ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں انہوں نے اودھ کی خاکستر میں ان چنگاروں کو تلاش کیا ہے، جنہیں لوگ فراموش کر چکے تھے۔ زیر نظر کتاب ”تذکرہ شعرائے اتر پردیش“ اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے جسے انہوں نے بہت وسیع پیمانے پر شروع کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے اگر گزشتہ چند ماہ میں اس کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور دوسری جلدیں زیر طبع ہیں تو چوتھی جلد کے شاعر کے علاوہ ان کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اب تک شائع شدہ تین حصوں کے پہلی نظر یہ تذکرہ تقریباً ایک ہزار صفحات اور ایک سو بیس شعراء کے حالات پر محیط ہے۔ اس تذکرے میں صرف مروج شعراء کو شامل کیا گیا ہے۔ جس کا حصہ اول سنہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان رعلت پسند دلی شعراء پر مشتمل ہے اور دوسرا تو سیرا حصہ سنہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء اور سنہ ۱۹۵۷ء تک انتقال کرنے والے شعراء کے بارے میں ہے۔ تذکرے کو سنہ ۱۹۵۷ء سے شروع کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۷ء تک شعراء کا ذکر اردو کے ضخیم ترن تذکرے ثم خانہ جاوید میں آچکا ہوگا۔ اس لئے کہ سنہ ۱۹۵۷ء تک اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور مزید دو جلدوں کا مواد مہیا کیا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس وقت کے شعراء کو تو وہاں نے دیکھا اور بیشتر سے مل چکے تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں زیادہ صحت کے ساتھ لکھ سکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ عرفان عباسی نے بڑی محنت، کاوش اور زہد زاری کے ساتھ اس تذکرے کو مرتب کیا ہے۔ اس تذکرے کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعراء کے بارے میں تمام ضروری معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ شاعر کا موقف، تعارف، مدد تصویر، نام اور شخص، تاریخ ولادت وفات، ولایت، تعلیم، حکومت، پیشہ اور شاعری، بلند، خاندانی حالات اور مذہبی پس منظر، رہن دین اور اسے مدفن و فرد کا خاص ذکر کر دیا گیا ہے، جس سے ان کے شعراء دیکھتے ہوئے بھی مدد مل سکے۔ ساتھ ہی جہاں سے شعراء منتخب کیے گئے ہیں، ان کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ ان معلومات کا فراہم کرنا، ان کی صحت اور عدم صحت کا یقین آسان کام نہیں ہے۔ ان دشوار یوں کا اندازہ

دیا جاسکتا ہے جس طرح اس کام کو کرتے رہے ہیں۔ اس تذکرے میں ہر جلد میں پچاس شعراء کے حالات اور ان کی خاکے ہیں۔ پہلی جلد کے اہم ناموں میں اس راجہ کی ہندو گرو، اچاریہ، سکھ پرست، دیکن، الہ آبادی، تکیوں، فریبی، جگر بیانی، جگر مراد آبادی، آغا خان کاغذی، خلیل الرحمن اعظمی، روشن صدیقی، ہنسل عظیم آبادی، شادمانی، شکیل عابدی، شفیق جونیوری، شمسیت کرہائی، خانی، دہلوی، فوج ناوری اور بہت سے شعراء کے خاکے ہیں۔ اسی طرح دوسری اور تیسری جلد میں جہاں غنایہ شادانی، سلام علی شہری، احتشام حسین، ریاض خیر آبادی اور شکیل عابدی جیسے مشہور شعراء کا تذکرہ ہے وہیں ذیل کے تذکرہ شعراء اور شاعرات کے ایسے نام ہیں، جو ذہنوں میں وقت کی گرد کے نیچے دب چکے تھے اور جن میں عرفان عباسی نے ایک بار پھر سامنے لا کر لکھا ہے۔ ان تذکرے نے اتر پردیش کے معروف و غیر معروف شعراء اور ان کے بارے میں بیش قیمت معلومات کو محفوظ کر دیا ہے، جس کی صیغہ حیات کا اندازہ دینے والی مہین ہی کر سکیں گی۔ یہ کام کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ ادارے کا تھا، جسے تنہا انجام دے کر عرفان عباسی نے علمی یکن اور عیون محنت کی ایک مثال قائم کر دی ہے۔

— شارب رولوی

میرزا بیدل، سوانح انتقاد و انتخاب

مؤلف: پروفیسر بیادی

تقسیم کار: ملکیت جامعہ، اردو بازار، دہلی

قیمت: ۳۱ روپے

میرزا بیدل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی تھے کتاب ہے۔ بیادی صاحب اس سے قبل ”مغنون کے مکتب الشعراء“ میں معرکتہ الہا کتاب لکھ کر ادبی مغفوں سے آوا جائے ہیں اور عبد حاضر میں سبک بندی میں قلم اٹھانے والوں میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

میرزا عبدالقادر سید کی تہہ اور شخصیت فارسی شعراء اور سب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے، مہنی تو نہیں، ہاں البتہ عام قلم ذہنوں کے لیے مشکل ضروری ہے۔ بیدل فارسی ادب کی ان ائمہ جاوید شخصیتوں میں سے ہیں جن کی شخصیت اور کام نے ان کے بعد آنے والی نسلوں کو سزا کر لیا ہے، جس میں غالب کا نام سب سے اہم ہے، لیکن غالب کی طرح بلکہ غالب سے کچھ زیادہ ہی مشکل پسندی سید کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ یوں ان کی شاعری کا پس منظر دھیرے دھیرے ہمارے معاشرے سے اٹھتا جا رہا ہے۔ اس لیے آج کا عام قاری ہی نہیں بلکہ بیشتر پڑھنے لکھنے والے بھی، بیدل کا نام بھیجے جانتے ہیں۔ اس کی شاعری اور شاعری سے عجیب رنگا رہا ہے۔ اس صورت حال میں پروفیسر بیادی صاحب نے بیدل کی گونا گوں شخصیت اور شاعری قلم اٹھا کر ایک کا نامہ انجام دیا ہے۔

ان کی کتاب اس لحاظ سے اور بھی اہم بن جاتی ہے کہ اُسے پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ بیدل کا کام آسان و سیدھا، پیچیدہ اور مشکل تو نہیں، جس کی ہیبت ہمارے دلوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جن کا وہی صاحب کے پہلے انداز بیان میں تلخی واقعات کی ترتیب کے ساتھ دیکھا جھلکا ادبی چاشنی کے لیے سیر پر تفرات بیدل کو اس طور سے ان کی مشکل بھاری کے خول سے باہر نکال لیتا ہے کہ ان کی آہیں اس پاس سٹانی دینے لگتی ہیں اور گزشتہ اہل افغان و تاشقند کا تصور اس احساس سے بدل جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کا شاہ ہے، جس کا خیر و بد کسی سرزمین پر بہار کے لوگ فخر و غم آباد نہیں کرتا۔ ہاں غربت نے اس کو چھکا یا ضرور۔

جنی ہادی صاحب کی بیان کی شریفی، طرز تحریر کی کشمکش اور تاریخی واقعات کو ادب کا حصہ بنانے کا عمل ان کی خصوصیت ہے جو عہد حاضر کے ناریلوب کے نقادوں کے بیاں کم ہی دیکھنے میں نظر آتی ہے۔

میرزا کی دقت پسندی، خیال کی ہندوی، ٹکری کی پرواز، صوفیانہ تفکر کی چھاؤں اور اس میں طنز و طعان کی آمیزش ان حالات کی دین ہے، جس میں شاعر نے انھیں گھولیں اور وہ اپنے ذہنی سفر پر نکل پڑا۔ شاعر اپنے عہد کی آواز بھی ہوتا ہے اور بد اور بھی۔ تباہی نے اس ماحول اور ان تاریخی حوالوں کو بڑی وضاحتی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اگر اس ماحول اور حوالوں کو سمجھا جائے تو دقت پسند شاعر کی شاعری کے خفوت پر دس دس گھنٹے کا سانس بھی آتا ہے اور ان کی بہتر پر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

بیدل کی شاعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے جنی ہادی صاحب نے بجا طور پر ملحد خیالی، رنگین اور نزاکت بیان پر زور دیا ہے۔ اردو والے غالب کی سنی آفرینی اور ملحد خیالی سے واقف ہیں، رنگین خیالی اور نزاکت خیال بھی پنہاں نہیں۔ اور جب یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ غالب اپنے بیشتر شعراء میں سب سے زیادہ بیدل سے متاثر تھے تو غالب کی عظمت بیدل کی عظمت سے معارف کرتی محسوس ہوتی ہے اور بیدل، غالب کے واسطے سے خاص طور سے اردو داں طبقے کے لیے بھی ایک مانی پہچانی شخصیت بن جاتے ہیں۔ مولف نے غالب اور بیدل کے باطنی تعلق پر کچھ لکھا ہے وہ اس لحاظ سے ہمارے واسطے سے عزیمات افزا ہے۔

بحث ادبی جو باسیاسی اختلاف کی گنجائش بہر حال بوجہ رہتی ہے۔ ہر سترہ ہے جنی ہادی صاحب کے بعض خیالات سے جس اتفاق نامی۔ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا اس سے بعض مبالغہ پوری ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کوئی قدم کار ہمارے ذہن میں سارالت اٹھائے، اختلاف و اتفاق کا فیصلہ میرا کرنے لڑے بھی اس کی بڑی کاسائی ہے۔ میرزا بیدل پر موصوفی کتاب نے بہت سادگی کی بجائے کوٹھم دیا ہے۔ اور کم از کم بیدل اور ان کی شاعری کا، مئی کے ذہنی خیال سے آنا کر علمی و ادبی مطلق میں منسوخ بحث بن دیا ہے جس یقین ہے کہ مباحثہ بیدل

انگل کٹی دہلی

اور اس دور کی شاعری نے عشق و محبت نے انکسارات ہمارے سامنے لائیں گے اور ہمیں فرشتہ

پندرہ روزہ 'مستقبل' نئی دہلی

ایڈیٹر: ایس۔ ایم۔ شاہ نواز
قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ۔ زر سالانہ: بیس روپے
لے کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر ۳۰۵۵، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

پندرہ روزہ مستقبل کا اجرائیوی مقاصد کے تحت نئی دہلی سے مل میں آیا ہے۔ آفتاب شامیہ پش نظر ہے۔ ادارے کے حلقوں "مستقبل" ہندوستان کے تہرے مشکل کا خواب لے کر نکلتا ہے اور اس کا تجربہ چاہتا ہے۔ مستقبل قوی یک جہتی کے استحکام، ملک کی آزادی کے تحفظ، سماجی و سماجی ترقی میں عوام کی عملی شرکت جیسے اہم آڈیشن کا نفاذ اور طرز دار ہے۔

جیسا کہ اولین شمارے سے ظاہر ہے، اس کو ملک کے مسلم دانشوروں کا اشتراک و تعاون حاصل ہے۔ اس کے ایڈیٹری بورڈ میں ممتاز جگہ علامہ اہد، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، جناب افتخار علی تھوڑی، دانش پائلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب عیال الرحمن، جناب سرفراز اعظم، ڈاکٹر عزیز مہینت اللہ، جناب سید سلیمان، فواد زاہد سید ذوالفقار علی خاں، جناب انوار احمد (میرزا پرائیٹ) محنت مر تاجدار بار، جبرین سوشل و ڈیپارٹمنٹ ڈائری بورڈ، محترمہ حبیبہ تھوڑی اور ڈاکٹر عبدالجلیل سٹال ہیں۔

"مستقبل" کے ادارے میں مقاصد شاعت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ کسی بھی انقلاب کے بعد جب قیود اور شروع ہو جائے تو قوم کا شعور ان اشخاص کی دلوں سے گزرتا ہے۔ اسی ادارے میں اس کی چل کر لکھا ہے کہ (اس کے ذریعہ) ہندوستانی مسلمانوں کو بتانے کے وقت کے لفظ کیا ہیں، قومی تحریک اہم ترین کام میں ان کا دل لیا ہے۔ انہیں لکھنا چاہیے کیا نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں لکھنا ہے کہ ان کا مفاد ملک کے عظیم تر مفاد سے وابستہ ہے اور ملک کا مفاد یک جہتی اور اتحاد میں ہے۔

اس پندرہ روزہ اخبار کے پہلے شمارے میں جن مشہور شخصیتوں کے مضامین شامل ہیں، ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کے سامنے ایک مثبت تصویر انداز نظر ہے جو ملک و قوم کے مفاد کی خاطر اپنا بیانیہ گھر گھر پہنچانا چاہتا ہے۔ مثلاً اس میں جگہ عابدہ صاحبہ، مکن پرائیٹ کا مضمین خواجہ کریم کے ہونے حالات میں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتا ہے۔ عالم اسلام کی دشمنی و معروف شخصیت مفتی عتیق الرحمن صاحب نے اسی شمارے میں فرمایا ہے کہ "غلامان کو محدود رکھنے میں کوئی شرعی یا اخلاقی رکاوٹ نہیں" اور یہ کہ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کے لیے لوگوں کے ذہن کو تیار کیا جائے اور ان کے شعور

تجربہ پیش کی اور کرائی، جس کی رو سے فوجی معارف، عقیقت کی مخالفت کی اور
دائے ظاہر کی دستبرد ستانی فوج میں انگریز سپاہیوں کی تعداد کم ہے ہندوستان کے
معاشرتی استحصال کے خلاف کوئی بات ان کی تحریروں اور تقریروں میں
نہیں ملتی۔

زندہ باد

’آج کل‘ ہمارے دل پہ ہے، خوب صورت، باطنی اور بیرونی تبدیلیوں
کے ساتھ۔ زندہ باد۔

لفظ ابنِ نسیفی

نادر، نایاب

سرورق کی تشکیل شعری اشاعت کا جدید سرچشمہ بن گیا ہے وہ نادر
ہیں بلکہ نایاب ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا تو اسے دلیے زمانے میں لوگ اسے
’ادوات‘ میں شامل کر لیں گے۔

صاحبِ سلیم، حیدرآباد

تروتازہ

ادھر چند جہیزوں سے ’آج کل‘ میں متعدد خوش گوار تبدیلیاں نظر آتی رہی
ہیں۔ بقیہ نہیں، آنا کی کیشیز ڈوئین کا جملہ آئنا تروتازہ بھی ہو سکتا ہے۔
کتور کا شمار ان شخصوں کے ساتھ کرنا کی طرح ہے اور سرورق حاصل
فرل۔ اسی طرح کے رت نے سلسلے زندگی کی علامت ہیں۔ انہیں جاری رکھتے۔

ابراہیم علی، اہل محلہ

انتخاب کی داد

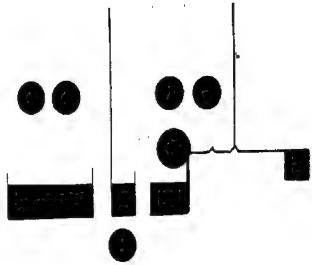
غالب کے بولے ہوئے شعری طرح سرورق کا ہر گاہ بول ہوا ہے۔ آکھنچو چھوٹا
کیا جیت پیدا کر دی ہے۔ کیا تخلیق کا نیا پہلو تلاش کیا ہے۔ چاروں مقالے لکھ کر آئینہ
ہیں، خیال افزہ دلی اور ذہن انگریز ہیں۔ پہلی بار کسی رسالے میں ایک ساتھ چار
خوب صورت تخلیقی مضامین کے نمونے پیش کیے گئے۔ انتخاب کی داد دیتا ہوں۔

براج کوئل نے کچھ کام ہیں لکھ کر انہیں کیا ہے جنہوں نے اردو شاعری میں
تجربات کیے ہیں کیا فوجی طرز کو اس کا ردال میں شامل نہیں۔ یہ کیرن نفسی نہیں،
احساس کرسی ہے۔

بہار صدیقی کی نظم بہت اچھی ہے۔ ’سوت‘ مٹھی اور پانچواں شعر بہت عمدہ
انسان ہے۔ ’ڈوئی مورتی‘ کے ریزے بھی گوارہ ہے، لیکن بس چوبیس، شام کے کہنے
پر ہر کی ختمات میں اضافہ ضرور کیا ہے۔ مواد میں نہیں۔ نظر ارباب، اودھ اور

جنوری ۱۹۸۳ء

۳۸



سرسید اور شبلی کے درمیان اختلاف

آپ کے مقررہ ماہ نامے کے کتبہ کے شمارے میں جناب ارشد قبیل صاحب
نے اپنے مضمون ’سرسید اور شبلی کے درمیان اختلاف‘ میں یہ دیکھنے کی کوشش
کی ہے کہ سرسید اور مولانا شبلی دونوں اپنے خیالات اور نظریات میں بالکل
درست تھے۔ اول الذکر کا قتل پرانی سن سے تھا اور آخر الذکر کا قتل
نئی سن سے۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ مجبور تھے اور یہ جبر تاریخی تھا اور
نسیب کو سید اعظم انگریزوں یا انگریزوں کی حکومت کے استبداد پر
تھے جن کی کا نگریں۔ اور اس میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ حضرت مولانا سید
سلیمان ندوی نے اپنے استاد مولانا شبلی کی حمایت میں مبالغے سے کام لیا ہے اور
سرسید امداد کو

A man of despotic nature
قرارداد ہے۔

فاضل مضمون نگار اسے قراؤش کر کے کہتے ہیں کہ یہ رائے سید اعظم کے سوانح
نگار اور مدار خواجہ الطاف حالی سے بھی ظاہر کی ہے۔

بلاشبہ شروع میں کا گھریں برطانوی حکومت کی وفادار تھی، لیکن اس دنوں
میں بھی کا گھریں کے لیڈر بھجائے اس حکومت کی برکات کو گھرانے کے ہندوستان کے
معاشرتی استحصال کا اور اس حکومت کے حکام کے اور ہندوستان کی جیت ہوئی غلطی
کا بھی ذکر کرتے تھے اور سخت گیر قوانین کی پروردہ مذمت کرتے تھے۔ داد امدادی
ندوی کی اور ریش ہندوت کے خاص طور سے انگریزوں کے باغی ہندوستان کے
معاشرتی استحصال کا ذکر اپنی تصنیفات میں کیا۔

کا گھریں نے ۱۸۶۹ء اور ۱۸۶۹ء میں اس کا مطالبہ کیا۔ ہندوستان کے
کا گھانے اور شمال مغربی سرحد پر عائد پائیس کو ترک کیا جائے۔
لیکن اس کے برعکس سرسید نے نمونہ نویس ایسی آئین کے دھڑلے اس میں ایک

آکھنچو چھوٹا



صدر جمہوریہ شری ذریعہ، نائب صدر جمہوریہ شری محمد بابت اللہ اور وزیر اعظم شریق اندھا لادھی، ۳ دسمبر کو نئی دہلی کے جواہر لال نہرو اسٹیڈیم میں نویں ایشیائی کھیلوں کی اختتامی تقریبات سلاخ فرماتے ہوئے۔



ایشیائی کھیلوں کی انڈیائی کمیٹی کے چیرمین اور بھارتی وائس چانسلر کے وزیر مکت شری پونا سنگھ، وزیر کوئی دہلی میں وزیر اعظم شریق اندھا لادھی کو ایشیائی کھیلوں کی اختتامی تقریبات سلاخ فرماتے ہوئے۔



عرب جمہوریہ مصر کے صدر بنزائی لینی جی جی مبارک (وسط) صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ (بائیں) اور وزیر اعظم شرقی اندرا گاندھی کے ساتھ دہلی کے ہوائی اڈے پر۔
بنزائی لینی جی جی مبارک، امرتسر کو ہندوستان کے دورے پر آئے ہیں۔



شرقی محنت قدر عملی وزیر عسکرت ہائے محنت و کامیابیات، اور گاندھی دھرم، ایک نیکو گروہ رام پورن رائے ایوان پیش کرتے ہوئے

ابھکا

فروری ۸۳

6



23.2.83
A. H. H.

نمکاس
• مالک امام • عبدالمغنی
• کالی داس گپتا ریضا
• مرزا جعفر حسین • شمیم حسینی
• شارب ردووی
• فضل امام • انضال احمد
• فضا ابن قیسی

رباعیات - چکیت کی یادیں

فتوا ابن سیفی



① آسان نہیں، اس طرح گل انساں ہونا
اس ذوق و لطف کے غزل خواں ہونا
”ہستی ہے، حاصر کا لہو رتر تزییب
ہے موت“ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

② دریا تھا، کہ دریا کی روانی تھا وہ
کیا جانے، غزل تھا کہ کھسانی تھا وہ
بھولنے کی مری شام وطن کیا اُس کو
لوگو! شفق صبح معانی تھا وہ

③ کچھ کام نہ تھا، کام دہن سے اُس کو
بلبل کی طرح ذوق، چین سے اُس کو
حب وطن از لذت ایماں خوشتر
بے لوث محبت تھی وطن سے اُس کو

④ جس لفظ سے تفسیر ہوئی تھی اُس کی
ہستی، کف اکسیر ہوئی تھی اُس کی
وہ خاک ہے، اشعار سے اُس کے ابھی نم
جس خاک سے تعمیر ہوئی تھی اُس کی

⑤ اسلوب تکلف، لب و لہجہ روشن
لفظوں کے درویش سے مٹی روشن
وہ فکر کی شوخی، وہ تب و تاب خیال
ہے اُس سے یہاں نام غزل کا روشن

⑥ چہرہ پہ شفق، دیدہ بینا روشن
پردے سے تخیل کے، دریا روشن
آواز مقلی اُس کی، کہ شمع خورشید
ہے سلسلہ تا سلسلہ کیا کیا روشن

⑦ عنوان، نگہ و منکر کی سرمستی کا
عرفان، غم نیستی و ہستی کا
سمجھیں گے کچھ اربابِ قلم ہی اس کو
جو رنگ تھا چکیت کی تروستی کا

⑧ زخموں کو گلابوں کا سر ایا کھٹا
کس طعنہ سے قاتل کو میسا کھٹا
اُس میں بھی گلابی دہی بھیجے کی مٹھاس
بر باد دی انساں کا جو لوح الٹا

⑨ وہ جان غزل، سرور دل آئے غزل
وہ نکتہ و رشوق، وہ دانائے غزل
آتا ہے فتناب پہ جو چکیت کا نام
بھر جاتا ہے نظروں میں سراپائے غزل

① فانوسِ سخن، شمع ہنر تھا چکیت
سوزِ نفس و سازِ نظر تھا چکیت
ترنے ہوئے بچے کی وہ گل رنگ دھک
لاریب، کہ محرابِ سخن تھا چکیت

② کیے یہ بھول گرد سفر تھا چکیت
کشتِ گھر و زمین ز رخت چکیت
ہم غصوں میں متاثر تھی اس کی آواز
اک سلسلہ حرف و گوشت چکیت

③ پاکیزہ خیالی کا نشان تھا چکیت
تہذیبِ غزل کا بھراں تھا چکیت
احساس کی گڑھی سے رہا شعلہ بجاں
گو بہرہ و سوسن کی زباں تھا چکیت

④ دلدادہ آدابِ خفاں تھا چکیت
زخمر زلی سازِ رنگِ جاں تھا چکیت
تیور میں عجب مٹسن تھا گنگا جنی
اک بُت کدہ لفظ و بیاں تھا چکیت



• مہینہ ستمبر ۱۹۵۱ء (جولائی)

اُردو کا مستقبل عام معرور ماہنامہ

آج کل

نئی دہلی

ایڈیٹر

راج نرائن راز

سب ایڈیٹر

شوناتھ سیکہ

جلد : ۳۱ شماره : ۷

فروری ۱۹۸۳ء

ماگھ بھالگن سمسٹہ ۱۹۰۳

قیمت : ایک روپیہ

آرٹ : پربیر کمار سین گپتا

برفن منبر : ایس۔ ایل۔ جیسوال
اسسٹنٹ برفن منبر : ایل۔ آر۔ بڑہ
اسسٹنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن) : اے۔ آر۔ کرشنن

مفتاحین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر "آج کل" اردو پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیل روڈ، دہلی ۱۱۰۰۰۰

پریس زر کا پتہ :

برفن منبر، پبلی کیشنز ڈویژن،
پٹیل روڈ، دہلی ۱۱۰۰۰۰

فون نمبر : ۳۸ ۷۹۹

چکیت صدی برس نمبر

ترتیب

ملاحظات

رابعیات : چکیت کی یاد میں
نفاذ این فیضی

حالات شخص و شاعر

توہین چکیت
چکیت کھنٹی
چکیت اور ان کا خاندان
کالی داس گپتا دتتا
مرزا جعفر حسین
انفعال احمد

شاعری

چکیت کی شاعرانہ اہمیت
چکیت کی نظم نگاری
مراثی چکیت
چکیت کی شاعری میں شعر نگاری
شارب رودری
عبدالغنی
مالک رام
فضل مام

نثر و نظر

چکیت کے نثری نمائندے پر ایک نظر
چکیت کا تنقیدی شعور
کالی داس گپتا دتتا
شمیم خٹک



وفیات

ایسے میں یہ بھی ظاہر ہے کہ پیش قدمی عوام کو خود کرنی چاہیے۔ عوام کے رضا کار ادارے اس ضمن میں بڑی مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں اور بے رہ ہیں۔ ایسے اداروں کو اس نوعی مقصد کے حصول کے لیے مزید سعی سے کام لیتا چاہیے۔ سرکار ہر طرح سے معاونت کر رہی ہے۔

اردو کے مشہور شاعر ابوالکلام آزاد نے حیدرآباد دکن میں ۲۲ دسمبر ۱۹۸۲ء کی رات میں لاہور کے سرور ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم ادیب طویل عرصے سے بیمار رہے آ رہے تھے۔ مرحوم نے شاہنامہ اسلام، اپنے گیتوں، غزلیات اور نثرات کے ذریعے اردو ادب کی حوصلہ دہندہ انجام دی۔ وہ کبھی فراموش نہ کی جا سکتے گی۔

۲۶ دسمبر کو دہلی میں اردو اور ہندی کے فعال مدیر مصنف اور مؤلف پرکاش پبلیکیشنز کا ایک طویل بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔ موصوف کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔

پرکاش پبلیکیشنز مشہور محافل شاعرانہ اور فن کار کے ائیر ٹیم ہے۔ ان کا اضافی مجموعہ میراث کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اردو شاعری کو روپوش نگاری رسم انوکھے ذریعے عروج دے رہی۔ ان محفلوں سے روشناس کرایا اور اس طرح دفعہ دنیا تو ان کی گراں قدر خدمت انجام دی۔

۳ جنوری ۱۹۸۳ء کو اردو کے مشہور شاعر جناب شہزاد علی اللہ کو جراثیم سے ۵ سال کے کٹے۔ ان کے شعری مجموعوں 'آتشِ نغم'، 'سوادِ جنرل'، 'فردِ غلام' اور 'گلِ آشنائی' لکھا تھا۔ ان میں ایک نثری تصنیف 'فلسفہ فردی' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

ادارہ آج کل، ان تینوں مشاہیر کے غم میں ہو گا کہ اردو کے ہر انسان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

پیشانی پر چھتھ صدی برس بزرگ کی صورت میں پیش قدمی ہے۔ ان کی کئی خدمات عام شاعروں جتنی ہے تاہم بہتر ترقی و ترقی کی شہری و دہری تعلقات، تعارف، تجزیہ، تبیین و تفسیر کے لئے متعدد ہفت روزہ کے اعتبار سے آج اس وقت انگریزی کے، ہمیں آپ کے لئے کاغذ بچا ہے۔

وزیر عظم شریقی اندر لگانہ می بجا کہیا

ہے کہ پلان کا مقصد مختلف مدت کے لیے رقم تھیں ہیں بلکہ کامیابیوں اور ترقیوں کا حصول ہے۔ پلان محض ہماری خواہشات کا مظہر نہیں۔ اس کے نتیجے میں قوم کے ہر فرد ہر شخص کو سہولت اور راستہ ملنی چاہیے۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں مختلف زمروں میں ترقی کے جوش سے رکھے گئے۔ ان کے حصول کے لیے مصروف موجود صلاحیتوں سے پُر اُپر اُپر فائدہ اٹھانا ضروری ہے بلکہ ذراعت، صنعت، توانائی اور ٹرانسپورٹ کے محفلوں میں صلاحیت کو بڑھانا ہے ضروری ہے۔ چھٹے منصوبے میں جلائل محل اختیار کیا گیا ہے، اس کا بنیادی مقصد شہریت کے پیداوار کی محفلوں کو ایک معقول شرح سے ترقی دینا اور ایسے پروگراموں کو بڑھا دینا ہے، جو غریبوں کے بہن بھائیوں کے بہتر بنانے کے لیے شروع کیے گئے ہیں۔

تمام ایک بات بہت واضح ہے اور اس کی صداقت کو ہم گزشتہ برسوں میں اپنے تجربے کی روشنی میں جو بھی سمجھ چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری ترقیاتی کوششیں بار بار دہری ہیں، لیکن اس کے خاتمہ سے ہماری آبادی کے ہر شخص کے ہاتھ میں نہیں آ رہے۔ وجہ صاف ہے: ہماری آبادی ترقی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ اردو ہمارے وسائل محض ضرورت پھر رہی ہیں۔ ایسے میں راستہ

اور سہولت کیسے میسر آ سکتی ہے۔ حالیہ مردم شماری کے نتائج پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہماری آبادی کے مجموعی شرح اضافہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی چنانچہ ترقی کی سب سے بڑی ضرورت تسلی لانگ ہے۔ شرح اضافہ میں کمی لانے کے لئے اقدامات کا کیا جانا ناگزیر ہے۔ یہ اقدام خود عوام کو کرنا ہیں۔ اس لیے ہمیں کہ ان کی اپنی کھلائی، ان کے خاندان کے سبھی افراد کی کھلائی اسی پر دار و مدار رکھتی ہے۔ گزشتہ ۳۵ برسوں میں ہماری آبادی میں ۳۶ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ہماری آبادی کل ۴۳ کروڑ تھی۔ اب ۱۹۸۲ء میں ستر کروڑ ہے۔ اگر شرح اضافہ فی صدی زخمائی آبادی ۲۰۰۰ء تک ایک سو کروڑ ہو جائے گی۔ اس وقت ہمارے وسائل اور ہمارا زمین بہن کھسا ہوگا، اس کا اضافہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ یہ بات بھی آہستہ کہ کچھ پانچ سالہ منصوبے میں شرح پیداوار کو ۱۱، شرح اموات کو ۹ اور نوٹا سیدہ بچوں کی اموات کو ۵ تک گھٹانے کا نشانہ دیا گیا ہے۔ اس کے لیے بچے کو کم عمر کھانے کے طریقوں پر عمل کرنے کے لئے جڑوں کی تعداد ۲۵ سے بڑھ کر ۱۵/۱۹۸۲ء تک ۵۳۹۵۰۰۰ ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے یہ ایک عظیم فرائض مقصد ہے۔ تاہم اس کا معنی افراد کی زندگی بچانے کا ہے۔

بہتر صحت کے لیے

”علاوہ اس شغفت سے بچنے کو دودھ پلانے سے بہتر طور پر اس کی نشوونما ہوتی ہے! اگرچہ یہ اعتقاد صدیوں پہلے کھینچے گئے، لیکن آج بھی ان کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ عالم سائنس میں ان افلاکی اہمیت آج بھی مستحکم ہے۔ کوئی انہیں حیلچ نہیں کر سکتا۔

ان کے دودھ کی اہمیت کے بارے میں صدیوں سے جو بحثیں سنا اور اٹھ گئے، حالیہ طبی مطالعے اور جاننے سے بالکل درست ثابت ہوئے ہیں۔

آج کی دنیا میں بچے کی نشوونما کو کبھی بھی جیسٹر سے آنا شروع نہیں ہے جتنا کہ بچے کو ماں کا دودھ نہ ملنے سے ہے۔ آج یہ سوال بڑوں، ماہرین نفسیات اور بچوں کی علاج و بہبود سے وابستہ تمام افراد کے لیے باعث تشویش بنا ہوا ہے۔ آج بھی بچوں اور طبی علاقوں میں ایسی ماؤں کی کمی نہیں ہے، جن کا یہ بچہ یقیناً ہے کہ ان کے دودھ سے بچے کی بہتر صحت کے نشوونما ہوتی ہے۔ نیز وہ تو اما اور مدرست ہوتا ہے۔ بعض والدین ایسا نہیں سمجھتے۔ ڈیڑہ بند دودھ اور دودھ پلانے کی بوتلیں بنانے والے کاروباری ادارے اپنے لینڈ بانگ انتہا لات کے باعث ان کی سوچ پر حاوی رہتے ہیں۔ صورت حال کچھ بھی ہو تاہم یہ واقعہ کہ اب تک ایسا کوئی متبادل مارکیٹ میں آیا ہی نہیں، جو ماں کے دودھ کی جگہ لے سکے۔ قدرت نے بچے کو دودھ پلانے اور اس کی نشوونما کے لیے پستان عطا کیے ہیں۔ جو اس کا بہت بڑا کرم ہیں۔ یہ دودھ غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے اور بچے کی ضروریات کو بخوبی پوری کرتا ہے۔

موٹی جو دودھ دیتے ہیں وہ ان کے بچوں کی نشوونما کے لیے اسی قدر ضروری ہوتا ہے۔ موٹیشیوں کے

یہ کتنا بھی غلط ہے کہ شروع کے چار مہینوں کے دوران بچے کی صحت مند نشوونما کے لیے ڈیڑہ بھینس و فیرو کے دودھ کا استعمال فرماتا ہے۔ لہذا: اور دل کی مرعال ہی میں کیسے نہ مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ چار مہینے پہلے ماں کے دودھ سے بچے کی بخوبی بہتر اور صحت مند نشوونما ہوتی ہے۔

یہ ایک سائنس کی حقیقت ہے کہ بچہ جن کو ماں کا دودھ نہیں ملتا ان کی شریان موت زیادہ دیر ہی ہے یا انہیں بچپن و فیرو میں بیماریاں ہوجاتی ہیں۔ اگر بچے ان تکالیف سے بھی بچ جائیں تو یہ ناقص غذائیت کی بیماریوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور انہیں ان بچوں کے مقابلے میں بہترین مارکا دودھ ملتا ہے، درحقیقت علاج معائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئے اور تحقیق کی بیماری مہلک ثابت ہو سکتی ہے اور وہ بچے زیادہ اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں، جنہیں ماں کا دودھ نہ مل پاتا۔ سائنس یقیناً اکثر بات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ان کا دودھ بھینس و فیرو کی دودھ کا عام ہے ایک مؤثر دوا کا کام کرتا ہے۔ دودھ نکلنے کے شروع میں بچے رنگ کا قدرے کاٹھا یعنی جو کہ شرم خارج ہوتا ہے وہ ہم میں قوت مزاحمت پیدا کرنے کے لیے انتہائی عمدہ وسیلہ ہے۔ بچے کو ماں کا دودھ نہ ملنے سے بچے کی بہتر نشوونما ہوتی ہے نہ ساتھ ہی دودھ پلانے والی ماں کو بھی متعدد فوائد ملتے ہیں۔ دودھ پلانے سے سرپستان میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ پستان میں ان کمزوری صحت بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس طرح کے مہلک امراض کو پستان کا کینسر ہونے کا خطرہ بھی کم ہوجاتا ہے۔ حمل کے دوران ایک عورت کا وزن کافی بڑھ جاتا ہے اور اس کی دیر چر لی میں اضافہ ہے۔ یہ سب دودھ بننے میں توانائی فراہم کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تجربات سے معلوم ہوا ہے کہ ایک بچے کو اپنا دودھ پلانے سے ماں کی کمزوری دیر چر لی میں زور ہوتی ہے، اس طرح جسم کا بڑھا ہوا وزن بھی کم ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ خواتین کو صحت سے متعلق کلینک یا ڈاکٹنگ کی کونٹریز نہیں ہوتی۔

چھپتے چھپتے: اولیٰ جنوں میں بغیر لٹوں کے ساتھ چھپ چھپانے کی کہ اور دے سہارا اور دھکیل کے دیر چر لی میں صحت مند حیرت الاکرام صاحب کا، مرنوی ۱۹۰۳ء میں شہسب میں ایک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہو گیا۔ زانا بیڈو اتنا بڑا ہیروں۔ اور ان کے ان کے پستان کے فطریں برابر کا شریک ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی رحمت اللطیفہ عطا فرمائے۔ آمین

توقیت حکیت

- ۱۳۰۰ء کٹیری پٹوٹوں کا ترک وطن (کٹیری) اور پنجاب، دہلی، یوپی اور بہار میں سکونت۔ حکیت کے آبا و اجداد بھی انہیں میں شامل تھے۔
- ۱۸۳۳ء پنڈت اودت نرائن حکیت (والد پنڈت برج نرائن حکیت) کی ولادت (غالباً کھنڈو میں)
- ۱۸۴۳ء کھنڈو میں ایک متاثرہ مہندہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۴۳ء کے لیے پنڈت اودت نرائن حکیت یقین کی طرف غزلی کی تخلیق سنبھل باغ بنال سے بھیجیں بہتر گیسو
- ۱۸۸۲ء ولادت پوتہ شب برہما محلہ راجپور علی جرنیفیز (پد پنڈت) کے تھیں (پنڈت) اپنے ۱۴ سالہ پنڈت لٹا برج نرائن حکیت (پد پنڈت) میں ہمیشہ ڈپٹی کلر تھام
- ۱۸۸۵ء انڈین نیشنل کانگریس کا قیام
- ۱۸۸۶ء پنڈت اودت نرائن حکیت کا انتقال۔ والدہ حکیت مع برج نرائن حکیت (عمر ۵ سال) کی کھنڈو کو مراجعت اور اپنے بھائی پنڈت لٹا برہما کے ساتھ کٹیری محلہ میں قیام اس وقت لٹا برہما و اہلسلہ ملازمت کھنڈو میں معتم تھے۔
- ۱۸۹۰ء اردو فارسی تعلیم کے لیے، گھر پر ایک بولی صاحب کا تقرر (والد کے انتقال کی وجہ سے تعلیم دیر سے شروع ہوئی۔)
- ۱۸۹۳ء اولین نظم جو سوشل کالغرض کٹیری پنڈت لٹا کے چوتھے اجلاس میں حکیت نے خود لکھی تھی۔ اس کاغذ میں کی داغ بیل ۱۸۹۳ء میں پڑی تھی۔
- ۱۸۹۵ء کالغرض اسکول، کھنڈو میں داخلہ (اس وقت پیر منڈل اسکول تھا)
- ۱۸۹۶ء اس اسکول سے مڈل پاس کیا۔
- ۱۸۹۷ء بڑے بھائی مہراج نرائن حکیت کھنڈو میں سنبھلی میں ملازم ہوئے جس سے گھر کی حالت بہتر ہو گئی۔
- ۱۸۹۸ء ٹوینٹ جوبلی ہائی اسکول (بڑا آب انش کا ہے) میں داخلہ۔
- ۱۹۰۰ء رسواں درجہ ٹوینٹ جوبلی اسکول سے پاس کرنے کے بعد کیننگ کالج میں داخلہ۔
- ۱۹۰۳ء ایف۔ اے پاس کیا۔
- ۱۹۰۳ء لمبی ملازمت کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع
- ۱۹۰۳ء کیننگ کالج میں پھر سے بی۔ اے میں داخلہ۔
- ۱۹۰۳ء کٹیری، ٹینگ رین ایسوسی ایشن اور "ہار لابریری" قائم کی۔
- ۱۹۰۳ء حکیت کے امت و خدمت اللہ رحمہ عارف بڑے بھائی (خلف) آری کھنڈو کی وفات۔ بعد میں حکیت نے افضل الدولہ افضل صاحب پورے بھائی (پد پوتہ راجپور کھنڈو) سے رجوع کیا۔
- ۱۹۰۵ء بی۔ اے کے امتحان میں کامیابی اور ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ۔
- ۱۹۰۵ء پہلی شادی پنڈت پریمچری ناتھ ناگو کی لڑکی کے ساتھ۔ پچھری ناتھ ناگو لکھنؤ ریلوے ڈپو آفس میں ملازم تھے۔
- ۱۹۰۶ء لڑکے کی ولادت پر پیو کی کا انتقال چند دنوں کے بعد لکھنؤ فوت ہو گیا۔
- ۱۹۰۶ء حکیت کی کوششوں سے "ارش پیر" کے ایک کامیاب شہ کے لیے خاتمہ۔ (یہ ایک کٹیری کے ایک نئے کی یاد میں منایا جاتا تھا، جو کہ "پد" "پد" اور "مسلمان" "پد" تھے۔ اسی لیے پچھری کہلائے) یہ ایک کھنڈو میں سادات گچ میں پنڈت راج نرائن معنی کے باغ میں، جس کا نام سیٹا باغ ہے، ہو گیا تھا۔ اب اس میں کٹیری پنڈتوں کی مذہبی رسوم کی یاد کی رسی اور بڑا علاقہ نے لے لی تھی، اس لیے اس کا انسداد لازم تھا۔
- ۱۹۰۶ء کیننگ کالج کھنڈو سے ایل۔ ایل۔ بی میں کامیابی۔ یہ داغ بیل پڑی ورس سے ملتی تھا۔
- ۱۹۰۶ء کھنڈو میں شہنشاہ حسین رضوی کے ساتھ چھ ماہ کے لیے وکالت کی ٹریننگ اور پھر انہیں کے ساتھ وکیل کی حیثیت سے کام کا آغاز۔ بعد میں الگ ہو کر دتہ گھر (کٹیری محلہ) ہی پر

۱۹۱۸ء گورکھ میں مرزا مسیح الدین شکیب کے مکان پر کرسمس کے دار کی حیثیت سے سکونت۔ اس مکان میں آخر تک قیام رہا۔

۱۹۱۸ء مسیح آمد کا اجراء۔ بہتر کمشنر پرشاد گول اور میر پرچیت (بہارنما) (انگریزی)

۱۹۱۹ء مہاراج دلائی کی ولادت۔ کنی اولاد ہی ہوئیں، لیکن ہر ایک لڑکی مہاراج دلائی زندہ رہی جو بعد میں مہاراج کا ک سے باہمی تھیں۔ دونوں حیات میں۔ (۱۹۸۰ء)

۱۹۲۰ء بال گنگا دھر جگجیو کا انتقال۔

یکم اگست ۱۹۲۵ء "باجواریا بنگا گجیو پشاد اور ما" آخری کام۔

۱۹۲۶ء عبد کے دن رائے بریلی آئین پر سیدھی طرف تاج کرنے سے محبت۔ ۱۲ فروری

ان کے معرے سے تاریخ ہے عمراو "۱۰۰" ۶۸

موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

۱۲۶۶

۱۲۶۶ + ۶۸ = ۱۳۳۴

قائم کر دیا تھا۔

۱۹۰۶ء دوسری شادی پندت سورج ناتھ آغا سرکاری کون کی بیٹی کھار دلی کے ساتھ۔

۱۹۰۶ء سلیک کا قیام۔

۱۹۰۸ء غزل کوئی (اس کتاب کے معلوم) اولین اشار۔

۱۹۱۳ء وکالت کے دفتر کا گھر سے الگ کر چھین کا کچ کے سامنے قیام۔

۱۹۱۳ء ہمدول تحریک کا آغاز۔ اس تحریک کا کھلے ہندوں اعلان مسز اینی لینڈ نے ۲۵ ستمبر ۱۹۱۵ء کو کیا۔

۱۹۱۵ء گورکھ میں پندت تلک ناتھ ملا (آمنہ نرائن ملا کے والد) کے مکان کی پشت پر پندت رگبیر دیال سنگھ کے مکان پر کرسمس کا کی حیثیت سے سکونت۔

۱۹۱۵ء گول کرشن کو کھلے کا انتقال۔

۱۹۱۶ء پہلی ٹی وی بیوہ کی شادی (نظم "ہدی صلح" کی تخلیق)

۱۹۱۶ء سٹیٹریٹ جیکسن ایسوسی ایشن سے الگ اور ایسوسی ایشن (کلب) کا خاتمہ۔

۱۹۱۶ء پندت جی راندر راکھری کی وفات۔

۱۹۱۸ء سندھ باغ میں گول دیال داس کے مکان پر کرسمس دار کی حیثیت سے قیام۔

کتابیں جن کے بغیر لائبریری ناممکن ہے

اردو کے ادبی رسائل کے مسائل قابلگی ۶ء
مقدمہ شعر و شاعری حالی ۵ء
نکات فہرست سخن سخن کا گدھ ۱۳ء
تجلیہ تحقیق تجلیہ صوفی ۱۰ء
سخن ان تاس سخن ۱۲ء
آب حیات آب حیات ۹ء
آب حیات اور زبان کا مسئلہ حضرت علی مدنی ۱۰ء
فناء غائب مرتضیٰ گیلانی ۱۸ء
زور پڑوں کی ہمار (مطرح نامہ پاکستان)

۱۳ء دامن
۳۰ء نکات و دلی (نیا لٹریچر) نرائن ایشی
۱۵ء غرضت پروین شاکر
۱۵ء گزشتہ وقتوں کی عمارت ربیع بن عبد

۵۰ء شہرے کے اندر قیام کی کتابیں طلب کرنے پر ڈاک فرجیعت
۱۰۰ء شہرے کے اندر قیام کی کتابیں طلب کرنے پر فرجیعت رعایت
۱۰۰ء کتاب "کتاب" لائبریریوں کو معقول کیفٹی۔

مندیہ بالا اردو کی برکت ہے طلب کیجئے۔

شعری شاعری
دوہرے خورشید افسر بوانی ۲۰ء
ماد قول کے درمیان بشیر فاروقی ۸ء
میل و جدوجہد ساجد زیدی ۲۰ء
بھگتی زمین آسن صوفی ۱۸ء
جانا جانان احمد فراز ۱۶ء
ایکھنسی کی کتابیں

اردو میں حمد و ترنہ کے سوانح حیات ڈاکٹر مسیح احمد ۹۰ء
ایکھنسی کی کتابیں ڈاکٹر شکیل صدیقی ۳۰ء
اردو میں اردو ترنہ کا ارتقا ڈاکٹر انور حسین ۵۰ء
آپ کے (تذکرہ شعرائے قصبات اوجھ) عرفان ہاشمی ۲۵ء
تذکرہ شعرائے اردو پریشی (پہلا حصہ) ۳۰ء
" " " " (دوسرا حصہ) ۳۰ء
" " " " (تیسرا حصہ) ۳۰ء
" " " " (چوتھا حصہ) ۳۰ء
جیلر و نقاد احمد علی و نقاد ڈاکٹر شاد بدوی ۲۸ء
دلی کا دبستان شاعری نرائن ایشی ۱۰۰ء

علم و ادب
کروچک کرگشت محمد علی صدیقی ۱۳ء
باغ و بہار ایک تجزیہ ڈاکٹر وحید رفیق ۱۰ء
مجاز۔ حیات و شاعری (دوسرا ایڈیشن) سرتسلیم ۲۰ء
اندر سورڈ ڈاکٹر شاد بدوی ۱۵ء
بگلا لکھنوی اردو زبان و ادب ڈاکٹر شاد بدوی ۱۰ء
سب دن کا تنقیدی جائزہ اسحاق احمد ۲۰ء
اردو ادب ڈاکٹر عزیز ناظم ۶ء

افسانے
دوسرا دور و زمانہ نور محمد کلا ۸ء
پہلی کی کتابیاں علی محمد فاضل ۵ء
خالد شاہ دیوان کا حاشیہ اشفاق حسین ۵ء
مٹی کا پہاڑ سلی صدیقی ۱۲ء

منازل
آدھا راستہ کرشن چندر ۱۵ء
آئیے اچھے ہی "عاشق" عبدالستار ۱۵ء
دارا سکرہ سید عظیم آبادی ۱۲ء
چار چہرے ہمدول سرور ۶ء
طوفانِ جاووت مسعود مدنی ۱۰ء

نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

نور ۱۹۸۳ء

۷

آج کل دلی

چلبست لکھنوی

برج نرائن چلبست لکھنوی محلہ منگل پورہ فریقین آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کا آبائی مکان شجاع الدولہ کے مقبرہ موسومہ مرگلاب باڑی کے سر دری بھاگ کے شمال تھا۔ میرے نانا قلوب علی محمد شجاع الدولہ کی بیوی بھی موسومہ منی صحر سے یہ مکان قریب تھا۔ پشتل جس بارہ منٹ میں ان دونوں مقامات کا درمیانی راستہ چلنا تھا۔ ایک اور خطیہ لکھنوی کٹھیری گھرانہ بھی اسی علاقے میں رہا کرتا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ میرزا شجاع الدولہ کی کٹھیری بہت پرست تھی وہ اسی علاقے کے قریب دھار میں آباد ہو گئے تھے۔ افسانہ لکھنوی کے گمراہ جو کٹھیری یعنی آباد سے لکھنؤ منتقل نہیں ہوئے وہ فریقین آباد کے پورے تھے۔ میرے جد غفرانیت ملک ایسے تین چار گھرانے آباد تھے۔ چلبست خاندان بھی اسیوں صدی کے اور فریقین آباد میں رہا کرتا تھا۔ برج نرائن چلبست اسی آبادی مکان میں تاریخ ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔

چلبست کے والد پکارت اودت نرائن چلبست سیلہ ملازمت میں بہار چلے گئے تھے۔ ڈپٹی کلرکی کے عہدے پر مامور تھے۔ ڈپٹی کلرکی کے فریقین آباد کے رہنے لگے کہ ان کا بیڑ میں انتقال ہو گیا۔ اُن کے صرف دو فرزند ہمارا چ نرائن اور برج نرائن تھے۔ والد کے انتقال کے وقت برج نرائن کی عمر مشکلہات برس کی تھی۔ اب فریقین آباد میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ لہذا اُن کے ماموں بہت ملتا پرستادہ بھٹ پوری جو اس وقت شیدائش میں ملازم تھے، فریقین آباد کو اپنی بیویہ اور دونوں بچوں کو اپنے گھر لکھنؤ لے آئے۔ یہ دونوں بچے اپنے ماموں کے سایہ عاطفت میں پروان چڑھے۔ ہمارا چ نرائن نے چلبست کے بعد انٹرنل امتحان پاس کیا اور ملازمت کر لی۔ رفتہ رفتہ میونسپلٹی کے ایجنٹ بن کر آ رہے ہوئے۔ ڈپٹی شہرت اور ہر دو لکھنوی کے ایک ہوئے۔ ان کی ملازمت کے بعد خاندان ڈپٹی ملک فارغ آباد ہو گیا تھا۔ برج نرائن نے تعلیم جاری رکھی۔ ۱۹۰۵ء میں بی بی نے پاس کیا۔ ۱۹۰۷ء

میں وکالت بھی پاس کر لی۔ زندگی کے آخری روز تک وکالت کرتے رہے۔ یہ خاندان فریقین آباد سے اکثر کٹھیری محلہ میں آباد ہوا تھا۔ اسی محلہ میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کٹھیری بہت رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ حرفی کر کے دوسرے محلوں میں آباد ہو گئے۔ مستند مسلمان، زما اور مہا مدین اس محلہ میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے گھر میں مذہبی اختلافات کا سماج پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمان باہم دیگر شہر دشمن تھے۔ غرضاً عادات و اطوار یکساں تھے کہ کٹھیری آبادی مسلمانوں کے زوال پذیر تھا۔ اُن کے زیادہ متاثر ہوئی۔ چنانچہ کٹھیریوں میں بھی تنوع پرستی اور بدو و نسب کی عادات بہت برسی ہوئی تھیں۔ برج نرائن ایک حساس دل اور صمیم طبیعت کے کردار میں آئے تھے۔ ان کا گھر اکثر خفاں تھا۔ تنگ ذہنی کی صورتوں میں مبتلا تھے۔ اس لیے عام علمی کے زمانے سے ہی اُن کا شعور کافی سباز ہوا۔ اور اُن کو اپنی بادر کے نوجوانوں کی اصلاح کرنے کی نوا میں گیر ہو گئی تھی۔ یہ کچھ غلط ہو گا کہ طالب علمی کے زمانے ہی میں اُنہوں نے حالات کے فرغ کا صحیح مطالعہ کر لیا تھا۔

وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے شہر کے صوبہ اول کے ممتاز وکیل سید شہناز حسین مرحوم سے کام لیا۔ اُنہوں کی قربت میں رفتی کے جادہ بھگوان ہوئے۔ سید شہناز حسین مرحوم شاہی خاندان کے ایک فرد تھے۔ اُن کا کزن سید سید تھا۔ وکالت کے اوقات سے فراغت ہوئی تو فرخ پورن اور بڑے بڑے اکابرین علماء و ادب کی اُن کے یہاں محبتیں رہا کرتی تھیں۔ اس دوران نے برج نرائن کے نظری مذاق کو فروغ بخشا۔ سید شہناز حسین مرحوم کے ایک قریب فاریہ میں صاحب تھے۔ جو بے انتہا خوش مذاق، خوش گفتار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ وہ برج نرائن بہت ضیق تھے۔ اور قریب وقت میں اُن کی وکالت چکا دینے میں مددگار تھے۔ اسی زمانے میں چلبست نے اپنے بادر کی کی زبردست اصلاح کی طرف کام باب اتھو کی۔ اُنہوں نے ایک کٹھیری ملک قائم کیا اور ایک ملازمی موسومہ بہار لائبریری چلائی۔ چلبست موجودہ

● بدری ناتھ روڈ، گولڈ گنج، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ (اپریل)

شرفِ بلا کے قریب پہنچتے اور ان کی فہمِ کردہ لائبریری اسی مقام پر تھی، جہاں اب کئی مکتبہ کونسل اسکول ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ لائبریری کی ترقی اور ان کے فضائل کی اصلاح لائبریری اعلیٰ کے سر کھٹا۔

حکایت اسی طبعیت میں ملوڑی میں پیدا ہوا فیضی نے لڑکپن سے ہی کلام کا شوق رکھا۔ اس کی طبیعت میں جو وہ اپنی نئی محبتوں میں بے تکلف و دخل کے ساتھ جتے تھے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بالکل بہت سے لوگوں کو یاد ہے۔ ملازم انصاف احمد نے اپنے حوالے میں درج کیا ہے کہ یہ حکایت کے کسما کے ذاب وزیر صاحب کو گورنر خاں کا کامیاب مشوق تھا۔ ایک دن ایک دوسرے کا کبوتر چھو بہت فخر میں لے کر آیا تھا، اُن کی چھت پر آگیا۔ دستور زمانہ کے مطابق ذاب صاحب نے کبوتر بچھڑا کر اوس کے بارے میں پوچھا۔ اپنے کبوتر میں میں شامل کر لیا۔ مور اتفاق کے یہ کبوتر بھینک کے نہیں بھاڑے تھے۔ وہ کبوتر چڑھ کر، بے بدل گیا اور وہ آگیا۔ حکایت اپنے کو کہنے سے منقطع دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے جبرستہ اور بے ساختہ یہ منتر کہہ کر ڈالا :

فرمیں پھر یہی نہیں۔ میں نے بھی غزل پڑھی۔ ضامو کی اصل حق کی غزل تھی۔ بڑا صاف
سحر وادائی رنگ و بو تھا۔

ایک شخص منور میں ان کے کلام پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں ان کے
کلام کا کوئی انتخاب یا اقتباس بھی پیش نہیں کر سکتا۔ ان کی عظمت بیان کرنے کے لیے
انتہائی کر دینا ہی کافی ہوگا کہ گفتگو کے تمام گزشتہ افراد کے مداح اور قدر شناس تھے۔
وہ بابر علی اقصیہ اور ان کا کام ہندو کی کی فطرت دیکھ گیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی
تھی کہ وہ زبردست ادیب تھے۔ اور ان کا تجربہ طبی بہت بلند تھا۔ شاعری کے علاوہ
شہزادیوں میں بھی کمال حاصل تھا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ اردو ادب کے سرمایہ میں نہایت
کامیاب ہے۔ اس زمانہ میں اردو کا بڑا گراں قدر اخبار تھا۔ طرزیہ، مزاحیہ، تنقیدی
اور خیرہ ادبی مضامین شائع ہوتے تھے جس آداب و ادب کی تنقید ہوتی، مسلسل مضامین
کا سلسلہ جاری رہتا اور جراثیم و ملامت ہوتا وہ بھی اپنی تنقید کو جسے شوق سے پڑھتا
تھا۔ اس اخبار کے موضوع دو عالمی شخصیتیں (ایڈیٹر) اور ان کے علمی معارفین
مردانہ طور پر تھے، خواجہ خلیفہ، نواب تیسرہ آباد اور شیخ جلال پور دہلی کے تھے۔ جن کے
مضامین چکیت نے اپنے مجموعہ مضامین میں بہت اچھے مضامین لکھے تھے۔ اسی اخبار
اردو کا نئے چکیت کا اس تاریخی ادبی مرکز میں ساتھ دیا تھا، جب ان کے
اور مولانا عبدالحق شوق کے درمیان ایک زبردست تاریخی ادبی بحث چھڑی
تھی اور مولانا نے شک جاری دہی تھی۔

یہ واقعہ اس طرح ظہور پذیر ہوا تھا کہ مولانا عبدالحق شوق نے اس رائے کا اظہار فرما دیا کہ شیخ
گلزار اہم خواجہ ہیں، ان کی تصنیف کو دیکھی تو انہوں نے اپنے نتائج نہایت واضح کر دیے تھے
کہ ان کے انفرادی کے یہ دشمنی ان کے نام سے کر دی۔ یہ ایک علمی تصدیق کی گئی تھی جس نے
ایک مدت تک اہل کتب کا خیال تھا کہ ان کے مضامین انھیں کے رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ چکیت
اور ان کے مایوس شائستگی، آخر وہ یہ کہ مضامین اور شیخ، شیخ کرنا تھا گفتگو کے قریب تمام
اساتذہ چکیت کی حمایت کر لیتے تھے۔ مولانا دہلی طاقت سے مدت تک نروا زما رہے، لیکن بالآخر
خود انہیں کی مسافرت طبیعت نے ان کو کربلا خانہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ جاتے ہیں کے
مضامین کتابی شکل میں مرکز شہر و چکیت کے نام سے شائع ہو چکے ہیں اور
اردو ادب کی تاریخ میں گراں قدر رہا ہے۔ یہی رائے میں چکیت کا کوئی تذکرہ ال
مرکز کا ذکر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یہ کہ وقت اور اس قدر قلت اس
مرکز کی تفصیلات پیش کرنے میں باغ ہیں۔

مرکز زمانہ چکیت انتہائی خوش مذاق، مسکرا لڑاؤ اور وسیع الاطلاق انسان
تھے۔ ان کے علاوہ تینوں کی تعداد بہت تھی۔ ہر طبقہ کے گھروں سے ان کی شادمانی تھی۔
اور وہ مرکز سے کسی خوش خلقی سے ملے تھے۔ لیکن ان کے نصف دوستوں
کی تعداد بہت کم تھی۔ اپنے ان مخصوص نصف دوستوں سے دیکھ کر کہتے تھے۔ وہ
لوگ بھی طرزیہ و مزاحیہ کا جواب نہیں دیتے تھے۔ ایک لطیفہ یا دہا پہلے جو بہت
دلچسپ ہے۔ تسلیل کا دن اور صبح کا وقت تھا۔ چکیت کے عزیز اور بڑے مضامین

آج کل کی دہلی

دوست نہایت بیچ زمانہ کو تعریف فرماتے۔ دلی خوش کن اور دلچسپی باتیں ہوتی
تھیں۔ اسی اشارہ مرا منعم بہت بھی آگے، جو طرزیہ و مزاح میں اپنی مثال آپ تھے۔
مرا منعم بہت کے مضامین ہی بہت بیچ زمانہ کو فرمایا کہ کہو سہائی کیا سب گھر
منصف ہو گئے؟ مرا منعم بہت نے انے انور جواب دیا کہ میں ہاں ہوتے اور جو
بڑے لکھے تھے وہ جہ ہوتے۔ مرا منعم بہت انے انے میں انے انے منصف ہوتے تھے۔
اور گویا ہی مدت قبل بہت بیچ زمانہ کو لکھی کے کعبہ پر نامزد کی ہو چکی تھی۔ مرا منعم
شہر گفتگو کے مسائل کو سلی شیخ علی عباس کے دماغ تھے اور جی کے کعبہ پر نامزد ہو کر مکمل
ہوئے تھے۔ بہت بیچ زمانہ کو بہت بہت زمانہ مکمل سب سے بڑے معجزہ کو
تھے اور ان کا دماغ بیگنٹ کی جی کے منصف سے مرزا ہوتے تھے۔

اسی طرزیہ و مزاح کے چکیت بھی ہو گئے تھے۔ طرزیہ اور مزاحیہ اشعار کہتے اور
اپنی کئی محبتوں میں اپنے مخصوص نصف دوستوں کو بنا کر لکھتے تھے۔ ان کا اہل کلام
بھی بہت تھا، لیکن انہوں نے اس کو خفیہ نہیں کیا۔ جن دوستوں کو نہ لکھتے تھے
مزاح کا ہزار میں لکھ دیا۔ راقم بہت بڑا کوشش کر رہا ہے جس سے اس کے درجہ
تعلقات تھے چند اشعار لکھے تھے اور اب تک محفوظ رہ سکے۔ وہ مرزا یہ درج
ذیل ہے :

بجرا آیا ہے سر میں درجہ بیگنٹوں میں لکھی ہے

عدم کا پارسل لکھ کرے تیرا رہی ہے

دوسرے قوم نے سینہ پر سپر باندھی ہے

راج چھوڑے بغیر یہ ہر باندھی ہے

ہم لائے موکل کو تیرے لیے کہتے ہیں

وہ بھینس کے نعل بھی لگا تقدیر سے کہتے ہیں

تساؤن کا فہم نہ موکل کا گزر

افسوس بھی جب گوشہ تنہائی ہے

کری سے عیاں غرض یک پائی ہے

میز ایسی ہے گو باکر پڑی پائی ہے

مرنے دم بہ ملک الموت مقابل آیا

دلی ناشارہ بھجبا کو موکل آیا

مندرج بالا اشعار میں پہلا شعر اس زمانے میں کہا تھا جب طاعون کی وبا
پھیلی ہوئی تھی۔ زمینوں کو سہارا تھا، سر میں درد ہوتا، بھلوان میں کٹی چلتی اور
دنیا سے کوچ ہو جاتا۔ امجدہ بننے دارو کا منظر بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے
دوسرا شعر اس وقت کہا تھا کہ جب بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے جہود بھی کرنے کے
لیے ہمارا جو رجسٹر لکھ رہے تھے۔ گویا مدت قبل ہی میں پرائیویٹ ہی کے تھے۔

جہت نے چہ زور فخر کی تھی، جس کا اثر پڑا تھا اور وہ بے کام باب بولتا تھا۔ جہاں جہ
 درجہ کی کم مسطرت کسپہ نہیں آئی۔ انہوں نے فخریہ شکر کر اور کج حال
 کی تہی چار اشارہ کئے وقت کے بہن نوجوانان نصیب وکیل تھا، جس کے پاس
 کوئی نوکل نہ ہو۔ اور اس کا خزانہ سرسودا کی کاغذ نہ ہو۔ یہ اشارہ یقیناً نکالت
 پاس کر کے لے لے کر ہوں گے، لیکن ان کو ایسی جہاں نصیب سے کبھی ہاتھ نہیں پڑا۔ وکالت
 شریعت کی تفسیر شہنشاہ چین کے ایسے کامیاب وکیل اور شاہی خاندان کے ایک ممتاز
 فرد کا ساتھ ہوا۔ علیحدہ کام شروع کیا تو ترقی کے مدارج علیحدہ کر کے کامیابی حاصل
 کی اور ایسی کامیابی حاصل کی کہ ترقی کے مدارج علیحدہ کر کے کامیابی حاصل
 یہاں بھی شہرت و سرفراز پور بھی تھی رہی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یمن میں
 اصلاح کی جو وقت فکر تھی اور اس اصلاح کے لیے انہوں نے کوشش کر لیا کہ ان کا
 جو مذہب نہ تھا وکالت کے میدان میں قدم رکھتے ہی انہوں نے ایک ایسے وکیل کا تصور کر لیا کہ
 جو غریب نہ ہو بلکہ غنی ہو اور نہ کسی کے پاس کوئی باقاعدہ دفتر ہو۔ بہر حال ان اشارے یہ
 صورت حال واضح ہوئی ہے کہ ان کے فخر و عزائم بھی اصلاح و فلاح لانے کی تڑپ
 تھی جن کو انہوں نے فقہی زندگی قرار دیا تھا۔

پہلیک لقا چشتا دھشت داری ایک مشہور اور ذوقوں کا بھونچا کرستہ عالم میں
 جب ان کے بہن کی چہرہ اودت مزاج نے ہنسنے سے انکار کر لیا تھا، اپنے ہمراہ کھنڈے لے
 تھے۔ یہ لقا ہی واضح کر سکتے کہ وہی حالت تھی۔ جہاں مزاجی کا مسئلہ تعلیم جاری
 تھا۔ اور جہاں مزاجی بہت کم سن تھے۔ دونوں کو دل میں لگا کر لیا تھا۔ جہاں مزاجی
 نے کھنڈے کو لٹکھڑکھڑا کر اس کا استعمال کیا اور وہ فی الفور ۱۸۹۶ء میں ملازم ہو گئے۔ حالات
 یقیناً بہتر ہو گئے ہوں گے، لیکن آمدنی وافر نہ تھی، لہذا مزاجی کو بھی کمانے کی فکر
 ہوئی۔ انہوں نے اپنے ہی کسب معاش کے لیے وکالت و پیشہ مناصب سمجھا۔ بہر حال وکیل
 جس کو علیحدہ علیحدہ کام کی فکر ہوئی ہے، اپنا ہم حالات فرخ داری سے متور نہ کرنا ہے۔
 لیکن جہت نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے تہہ بہ تہہ تھکانے کے لیے اپنے بلندیہ و دیوانی کے
 وکیل سے کام لیا کہ ان کے فیصلہ کر کے اسی وقت یہ ظاہر کر دیا تھا کہ ان کے حوصلے بخدا اور
 ارادے ظہیر تھے۔ اس زمانے میں حالات دیوانی میں کام کرنا سہل کام نہ تھا۔ بیرونی
 مقدمات میں محنت شاقہ کرنا پڑتی تھی۔ نظائر کی درجہ گزشتی ایک مصلحت ہوئی تھی۔
 جس کے لیے ذہانت، دقاوت اور دقیقہ دینی دیکھا جاتا تھا۔ جہت نے ان تمام
 ممانہ زل کو اپنی کما حقہ شہرت کے ساتھ اپنے ادبی مسائل کو جاری رکھا۔
 اور اپنی برادری کی اصلاح پر بھی پورے زور و توجہ مرکوز کیا۔

جہت کے کردار کی یہ اہم خصوصیت تھی کہ انہوں نے سن غور تک پہنچنے کے بعد
 اپنی زندگی کے لیے جو کچھ عمل کر لیا تھا، اسی پر اترتے ہوئے کار بند رہے تھے۔ یہ ایک
 صورت حال ان کی باطنی فطرت کا بقیہ ثبوت ہے اور یہ سبھی حقیقت ہے کہ وہ اپنی زندگی
 کو نیک نامی اور کامیابی کے ساتھ بسر کر گئے۔ بیویں مدد کے اوائل میں
 بالخصوص دوسری دہائی میں ہمارے شہر کھنڈ میں فرقہ واریت کی امت آنا شروع ہوئی

تھی۔ اس دوران بلاخیر کے کہہ جیسے ان کے دامن تک پہنچنے کی کوشش کی تھی مگر
 وہ محنت نہیں ہوئے۔ اپنا دامن بچھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے کئی ناہمواریوں
 پر غور و فکر کی روشنی میں یہ کامیاب کارنامہ کر دیا۔ ان کی برادری میں جو دیگر کارکن
 نے ان پر فرقہ پرستی کا عیب لگنے کی کوشش کی تھی، جو جہت تک نام نہاد، اس کے بعد
 فرقہ پرست نہیں تھے۔ ان کے بہن نے یہ اصول تھا کہ اپنی برادری کی زوال پذیر اصلاح
 کی اصلاح کریں۔ اور ان کو ان کا کام باب زندگی کر کے کامیاب سمجھیں۔ اس مقصد
 کو وہ اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ اس طرح عمل کو فرقہ پرستی میں جگا سکتا۔ انہوں نے
 کسی دوسرے فرقے کو لوگوں کی مذہبی اختلاف کی بنا پر کچھ کوئی مخالفت نہیں کی اور وہ
 کسی غیر برادری کو کوئی نقصان پہنچا۔ کیا انہیں کسی فرقہ پرست کہا جاسکتا ہے؟ نہیں!
 ہرگز نہیں!! بلکہ اس کے برعکس یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے
 آخر روز وکالت ہی نہیں، لیکن مسلمان کی خدمت میں دینی اہل کو لبیک کہا تھا۔

ان کو بالی بلڈ پریشر کی شہادت تھی۔ دوا و علاج کر لیا کرتے تھے، لیکن
 زیادہ تر ہیر کر کے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ مذاہن گوشت ان کی محبوب
 غذا تھی۔ اور مزہ کا گوشت ان کو بے انتہا پسند تھا، رات کو جب گوشت پڑی مقدار
 میں کھا لیا، لیکن صبح کو کوئی تکلیف محسوس نہیں کی۔ اس دن اہل الدین صاحب کا
 مقدر رات ہی میں لگا تھا۔ جہت پر وہی مقدمہ میں سب ال نہیں کر سکتے۔
 علی الدین صاحب سے خوش گوار تعلقات تھے۔ جہت صبح و شام تھے۔ صبح کی
 گاڑی سے رات پہنچے گئے۔ محمد ایوب صاحب ایڈووکیٹ سے دوستانہ مراسم تھے۔
 وہ فرقہ پرستی کے کھیل تھے۔ دونوں صاحبان ساتھ ساتھ رات پہنچے گئے۔ دن
 بھر کچھری میں کام کیا۔ شام کی گاڑی سے واپس آیا اور وہ تھا۔ جہت بالکل چٹ و
 چاق تھے۔ آتش پیچھے پیچھے چار بیٹے کو دل چاہا۔ گاڑی آچکی تھی۔ جہت گاڑی
 میں بیٹھے۔ اور ایوب صاحب چار بیٹوں کے گھر میں لگے۔ ذرا دیر
 بعد ایوب صاحب واپس آئے۔ گاڑی کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ چار والا چلنے
 لے کر آیا، لیکن دوست اپنے دوست کا ساتھ چھوڑ چکا تھا اور چار بیٹے والا
 دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اتنی حسین اور پاک موت خدایہ معصوم صفت انسان
 کو نصیب کرے۔

رات کو اسی روز صیت کھنڈ پہنچی۔ ادیبوں، شاعروں، علماء، کئی
 برادری اور ان کے تمام دوستوں کے ہاں صبح نام، گچھو، بڑے بڑے اساتذہ
 مثلاً صفی، مختار، تاق، آرتو، آذر و غیرہ نے دل لگا کر افسانہ تصنیف کیے۔
 جو بعد میں یاد چھت کے نام سے مشہور ہوئے۔ جہت رہے، لیکن ان کی یاد
 برقرار ہے۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھر تارے فلک ہریوں
 تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں



چکبست اور ان کا خاندان

سنی نہ تھی مگر کوئی انہیں ان پیشہ بدیل کر لیتا تو وہ دوسرے گروہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ریٹ ادبی بیاہ آپس میں کرتے تھے چکبست کا خاندان کا کنہ تھا۔

کشمیری پندت مذہبی حیثیت سے دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو آگ کی پوجا کرتا ہے، جس کو والا کہتے ہیں۔ کجاہ آجے کہ کشمیر میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسا مقام ہے جس سے برابر آگ کی شکل نکلا کرتے ہیں جس کسی کو کوئی چیرا اس پر چڑھانی ہوتی، وہ اس کو صاف بھتی میں رکھ کر اس آگ کے قریب بے جا آگ کر آگ کی پست اس کی طرف مڑ کر اس پر سے گزر پانی تو نیل ایک تھا کہ اس کی نذر قبول ہو گئی۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو پانی کی پوجا کرتا ہے، جس کو بر لوگ رنگب (Rangiba) کہتے ہیں۔ سنی بھگت میں ان کا ایک خاص مندر ہے جس میں ایک چوکور پتھر ہے، جس کے اندر پانی بھرتا ہے جس کا رنگ سنہرا رہتا ہے۔ اگر کسی وقت پانی کا رنگ بدلے گا کہے، تو نیا سال کہاں آئے ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔ اور لوگ پوجا پائے زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں میں صرف ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ آگ کی پوجا کرتے ہیں، وہ نہوار اور بیت کے مہما میں پہلے تو نہوار کوشت ضرور کھاتے ہیں اور یہ نہوار زورات کہلاتا ہے۔ دوسرا گروہ اس زمانہ میں کوشت نہیں کھا۔ یہ چکبست پانی کی پوجا کرتے والے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

چکبست دراصل برج نرائن صاحب کا تخلص نہ تھا بلکہ انسانی نام تھا جسے وہ تخلص کی صورت میں استعمال کرتے۔ کشمیری پندتوں میں خانانی نام مختلف دو گروہ سے پڑ گئے ہیں، خاص طور پر جب ان لوگوں نے

پندت برج نرائن چکبست ہندوستان کے ان شعرائے کرام میں ہیں جن کی زندگی نے وفاندگی، پھر ہی انھوں نے اپنی مختصر زندگی میں اپنا ایک خاص مقام ادب اردو میں حاصل کر لیا۔ چکبست کے حالات زندگی اور اور ان کے خاندان سے لوگ کو واقف ہیں۔ اس لیے میں ان کے خاندان کے حالات کے ساتھ ان کے حالات قلبیت ذکر کر رہا ہوں۔

چکبست کے والد پندت ادت نرائن چکبست پندت میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ فوٹ سرتے اور بھتیجین تخلص فرماتے تھے۔ پندتوں میں صدی میں کشمیری پندتوں نے جب بڑی تعداد میں وطن کو خیر باد کہا تو قواسم خاندان نے پہلو کو دیکھا تو مائی بن لیا اور مسلم ادب کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں بند مقام تک رکھا۔ چکبست کے والد نے اپنی تمام خاندانی جہاندار کو ختم کر دیا لیکن شعرا و ادب میں زبردست شخصیت حاصل کر لی تھی۔ اسی چکبست صرف پانچ سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ۱۸۸۷ء میں ہو گیا۔

یوں تو چکبست کی بہداشتن گذرنا چاہیے شہر فیض آباد پولی میں ہوئی، لیکن والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ اپنے دونوں لڑکوں کو لے کر اپنے نصابی پندت لالہ پندت کے یہاں کشمیری مسکھن پھل آئیں، جہاں چکبست نے اپنا تعلق بس ڈگری اسکول کلاں کے آغاز تک دن گزارا۔ جس طرح عام ہندوؤں میں چار درن یا ذاتیں ہیں، اس طرح کشمیری پندتوں میں تین گروہ ہوتے تھے۔ اول گروہ کہلاتا ہے جن کا کام تقسیم حاصل کرنا اور تقسیم دینا تھا۔ دوسرا گروہ کا کارکن کہلاتا تھا جو نوکری، تجارت اور دیگر قسم کے کاروبار کرتا تھا اور تیسرا گروہ جسٹس لاری کہلاتا تھا جو محروم میں خدمت کرتا اور صف میں طور پر باورچی گیری کرتا تھا لیکن ان حضرات میں عام ہندوؤں والی

مروم کے ہیں سے چکیت کا ایک خط ملا جو ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو کشمیری مسد کھنڈے لکھا گیا تھا۔

جناب خدوم و مسکرم بندہ

بند تسلیم و محض رائے عملی ہو کر نظم ذیل ایک رسالین اشاعت کے لیے ردوار کرنی ہے۔ لہذا امیدوار ہوں کہ ارادہ عنایت قدما نہ اس کو اصلاح فرما کر بندہ کو نمونہ فرمائے۔ بذریعہ ذاک اس کو رداف فرمادیجیے گا۔

آپ کا خادم

برج زانی چکیت
کشمیری مسد

نظم

یہودیہ میں تہذیب کا دور دور ہوا
ہوا دل گئی رنگ زمانہ اور ہوا
دلخا غار و شست تھا جائے نور ہوا
خدا کی شان جہاں کا عجیب طور ہوا
گفتا جو جبل تو سامان عرو جاہ برستے
شعور کو تری ہوئی گندہ برستے
دی نظم آپ انور کے نام سے مجمع وطن میں موجود ہے
نظم کے بند استاد کا خط ہے ۔

”مہربان من بعد سلام سنت الاسلام واضح ہو کر میں باہر گیا تھا اس وجہ سے درہوئی اور چار پائی دونوں سے کاغذ تیار ہے انتظار اس کا مد کرنا کہ آپ کا کوئی آدمی آئے روز میں بذریعہ ذاک ردوار کرتا۔ اب یہودیہ کو بذریعہ ہرنگ دہا کر رہا ہوں آپ نے بہت خوب فرمایا ہے اور یہ شوق اگر کچھ دنوں اور باقی رہا تو آپ کا کلام بل تریف ہو جائے گا۔ زیادہ شوق تھا۔“

نظم

منشی سید افضل علی خان عفی عنہ

۱۲ جنوری ۱۳۰۴ھ

اس خط کے حاصل ہوجانے کے بعد سے چکیت کے استاد کا مسد قلم جو ہے تاہم کہ وہ منشی افضل اللہ لیسہ افضل علی خان افضل کے شاگرد تھے۔ اس طرح چکیت کا یہ مسد حضرت معصیٰ تک پہنچا ہے۔

چکیت کی تعلیم پر اس طریق سے شروع ہوئی۔ پہلے ایک بلوچی صاحب ملازم رکھے گئے۔ اس کے بعد ان کا نام کاغذین اسکول کھنڈے میں لکھا گیا۔ جہاں سے انھوں نے منڈل کلاس پاس کی۔ اسی دوران ان کے بڑے بھائی جناب ہماراج نرائن چکیت کھنڈے یونیورسٹی میں ملازم ہو گئے تھے جس سے گھر کی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ مسد پاس کر کے چکیت کا داغہ گورنمنٹ جوبی کالج کھنڈے میں ہوا جو اس وقت صرف ہائی اسکول تھا۔

یہاں سے ہائی اسکول پاس کر کے کیننگ کالج جو جہ میں کھنڈے یونیورسٹی بنا، اس میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے پاس کیا۔ اس کے بعد کھنڈے میں ایل۔ ایل۔ بی کی تعلیم حاصل کی اور اربا یونیورسٹی سے اس کا امتحان پاس کر کے کھنڈے میں ۱۹۰۶ء سے وکالت مشورہ کر دی۔

ان کے ابتدائی دور پر کشمیری پسند توں اور اہل کشمیری مسد کا اثر رہا لیکن جلد ہی ان کی اصلاحی زندگی شروع ہو گئی۔ ۱۹۰۴ء میں کشمیری مسد میں انھوں نے ایک کلب اپنی قوم اور نڈان کی اصلاح کے لیے قائم کیا۔ اس کلب کا نام انھوں نے کشمیری بنگا مین ایسوسی ایشن رکھا ساتھ ہی ایک لائبریری بھی ”بند لائبریری“ کے نام سے قائم کی جہاں خاندان کے اہل کشمیری حضرات کے بزرگ جوان اور بڑے جمع ہوتے۔ اپنے حالات کا جائزہ لیتے اور مختلف مسائل پر غور و خوض کیا جیسے کہ تھے ہوتے تھے اور لائبریری جلسہ اختتام اور جشن سے منعقد کیا جاتا تھا جس میں باہر سے بھی کشمیری حضرات کو مدعو کیا جاتا تھا۔

چکیت نے جو دھور توں کی دوسری شادی کرانے کی اپنی کیا۔ کوشش ۱۹۰۶ء میں شروع کی۔ اور وہ ان کی زندگی ہی میں مکمل ہو گئی۔ عام ہندوؤں کی طرح اس وقت کشمیری بھی دوسری شادی یا جوہ کی شادی کے مشریدینا تھے۔ لیکن چکیت نے یہ اصلاحی کام اپنے اوپر لیا اور نہایت کاسیب بی سے اس کام کو انجام دیا۔

چکیت ایک آزاد اور ترقی پسند شخصیت کے مالک تھے۔ اس ماحول کا اگر ہم تصور کریں جس میں انھوں نے زندگی گزاری تو ہم دیکھیں گے کہ اگر وہ سیاسی طور پر جنگ آزادی میں شریک تھے تو سماج کی ہمدانی کو بھی اٹھائے بیٹھنے کے قابل ہر شہمند تھے۔ اور ساری زندگی اسی دھن میں گئے رہے۔

سیاسی طور پر وہ نصف اول کے لوگوں میں نہ تھے۔ ان کے لینے اصول نہ تھے بلکہ وہ اس وقت کے لیڈروں کے خیالات اپنی نظر اور نظم کے ذریعہ تمام تک پہنچانے کی کوشش پر ابر کرتے رہے۔ وہ کشمیری ہندوؤں میں لوگوں کی تسلیم کے زبردست علمبردار تھے۔ وہ لوگوں کو صرف فکر کی چہرہ پر ادبی میں قید رکھنے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ وہ لوگوں کی مقیم اور تربیت کے ساتھ ساتھ ان کو بہت مقام دینا چاہتے تھے۔ ان کی نظم ”چول سال“ ان کے ان خیالات کا مسکن پر تو ہے ہوتے ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ لوگوں کی جب ماں میں گئی تو اگر وہ تسلیم یافتہ اور صحیح تربیت یافتہ بن تو اپنی اولادوں کو صحیح تربیت اور ترقی دے سکیں گے۔

انھوں نے اصلاحی مقصد ہی سے ۱۹۱۴ء سے رسالہ ”صبح امید“

ہوا لیکن ہر امکانی کوشش کے باوجود شام سات بجے انتقال ہو گیا۔
یہی ایک اس شخص کی زندگی تھی اس کے خرد گرم تھے اور سامنے و
بزرگ عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے۔ دوسرے دن میت لکھنؤ لائی
گئی جہاں شام کو ان کی آخری رسوم ادا کر دی گئیں۔

بقیہ: چمکست کی شاعری میں منظر نگاری

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نوہن سال
خاموشی ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے میت وہ خستہ حال
سکڑتا سا ہو گیا ہے، یہ ہے شدت ملال

تن میں ہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گو باشد نہیں کوئی تصویر سنگ ہے
کیا جائے کس خیال میں غم سہی وہ ہے گناہ
نور نظر یہ دیدہ حسرت سے کی نگاہ
بنش ہوئی بوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشت ہائے جہنم سے اٹھ کوئے زرخ لہ

چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
مر ہوئے تن زباں کی طرح بولنے لگا
یہ وہ دل دور منظر ہے جس سے خون کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔
شری رام چند راجی، اپنی مادر گرامی کے پاس کس انداز سے پہنچے ہیں
وہ جس نغمیانی گفتگو میں مبتلا ہیں اس کی سیر پور مکا کی چمکست
کے ایک محروم ہو جاتی ہے ط

خاموشی ماں کے پاس گیا صورت خیال

اور ماں کی صورت حال کی نظر کشی کے لیے پھر وہ ہمیشہ یادگار رہے گلط
”گو باشد نہیں کوئی تصویر سنگ ہے“

یہ چمکست کا درد نگار نظم ہے جو منظر فریق کو بڑی دستگیری سے نظم کر دیتا
ہے۔ وہ غفلتوں کے انتخاب سے مناظر کا بھاری بھرپور آسانی سے بنایا ہے
ہیں۔ دراصل غفلت انسانی دلوں کو خوشی اور سکون بخشتی ہے، اور
زخم خوردہ دلوں کے لیے ہر کام دیتی ہے، چمکست نے شوری طور پر غفلت
نہیں کی ہے بلکہ غفلت ہی نہیں ہے جس سے وہ مجبور ہو کر منظر نگاری پیش کرنے
گئے ہیں، غفلت بہت سمجھ دہی کا فردا ز ثانی رہتی ہے وہ اپنے میں منظر
بکھیر رہتی ہے جن کا تعلق ذہن، جذبہ اور روح سے ہوتا ہے۔ وہ
چمکست نے ذہن، جذبہ اور روح کو لپک شاعری میں سمودیا ہے یہی
چمکست کی نظر نگاری کی خصوصیت ہے، جو ہم عصر شعرا کو حاصل نہیں۔

کا جڑا گیا، جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات پوری آزادی اور مکمل اعتماد
کے ساتھ دوسرے دن تک پہنچاتے تھے۔ یہ سال ۱۹۱۸ء تک شائع ہوا۔
لیکن جب ان کو اپنے پیشہ وکالت سے بالکل وقت ملنا بہت ہو گیا
تو مجبوراً انھیں یہ سال بند کرنا پڑا۔ ان کا ناول ”کلا“ جو انھوں نے ۱۹۱۴ء
میں شائع کر دیا وہ بھی ان کی اصولی زندگی کا پر تو ہے۔ وہ تو جسے زیادہ
پریمی ہوئی آزادی کو پسند کرتے تھے اور نہ ہی ترقی کی راہ کی کسی رکاوٹ کو
برداشت کرتے تھے۔ اور اس اصول کے وہ اس حد تک پابند تھے کہ
وہ اپنے سیاسی اصولوں میں بھی چندتہا بشن زامن در امر گنگا پرشاد
اور مہاراجا دھرم داس کو اپنا سیاسی استاد مانتے تھے گو کہ انھوں نے بال گنگا دھر
تک کے انتقال پر جو مضمون اپنے رسالے صبح امید میں لکھا ہے وہ ان کے
اس جذبہ کی نمائندگی کرتا ہے جو شک کی جنگ آزادی سے ان میں پیدا ہوا
تھا لیکن وہ اس اصول کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ استدلال پسند انسان
تھے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ہنگامہ کے بجائے معتدل صورت اختیار
کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تنک کا جو مرتبہ لکھا ہے وہ
بھی ان کے انھوں کی پوری فکری نشانی ہے کہ وہ گوالیار کی کرشن گوٹھ
کے زیادہ تر اہل اور پیرو تھے۔ اس کا پورا اظہار ”گوٹھ کی تقریریں“ کے
دیں چہ میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۱۷ء میں ہندوستانی پریس نظر آباد
لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ وہ مشرورع میں کانگریس کے ممبر
اور اس کے پیرو تھے۔ لیکن جب کانگریس میں جھگڑا مٹا دیا گیا تو وہ
بھی بشن زامن در اور باو گنگا پرشاد در اور کے ہمراہ کانگریس سے الگ
ہو گئے۔ تاہم وہ کبھی جنگ آزادی یا کانگریس کے سخت نفرت نہ ہوئے۔ وہ
مسز جینٹ کے ہم خیال تھے۔ اور اس وقت جو ہم رول کے حاصل
کرنے کی جدوجہد میں لگے تھے۔ ان کی نظموں میں جو ہم رول سے متعلق
ہیں۔ ان کی یہ آرزو پوری طور پر پرمٹ لیا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم مسز
جینٹ کی خدمت میں قوم کا بینام چمکست کی ان انگلوں اور جذبات کی
آغزدار ہے جو ان کی زندگی کا مقصد بن گئی تھیں اور جس کے لیے انھوں
نے ساری زندگی کوشش۔

افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ بارہ فروری ۱۹۲۶ء

جمو کے دن ایک مقدمہ کے سلسلہ میں انھیں رائے بریلی جلا پڑا۔

لیکن کار صاحب اس وقت وہاں سب بجے تھے۔ ان کے یہاں ایک بچے

دن تک بحث فرما کر اسٹیشن واپس ہوئے۔ دو بجے ریل آئی۔ ابھی

ڈبہ میں بیٹھے تھے کہ کرفٹ کا زبردست حمل ہوا۔ علی الدہن جڑ صاحب

کے مقدمہ میں گئے تھے انھوں نے اور چند لوگوں نے مل کر ریل سے

اتارا اور تنک روم میں گئے جہاں ڈاکٹری علاج فوراً شروع

آج کل کئی دہلی



چکیت کی شاعرانہ اہمیت

کوہام کہنے اور سماجی بائیزوں کو دور کرنے کے سلسلے میں شروع ہوئی تھیں اور جو کچھ بانیوں نے بعد میں تحریر کیا آزادی کے دور میں کہنے کا سبب نہیں۔

اصلاح کی ان کوششوں میں کئی کئی جگہ پر صدقوں سے راجح سماجی بائیزوں اور احساس تھا کہ جب تک مختلف طبقے اپنی اپنی جگہ پر صدقوں سے راجح سماجی بائیزوں اور فوجیات کو دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس وقت ملک در ترقی کی راہیں ہمارا ہوسکتی تگی اور آزاادی حاصل ہو سکے گی اس سلسلے میں شیرازاں بہار، شام کشمیری اور رقی نرائن درابر و رفو نے بہت کوششیں کیں، لیکن قدامت پرست اور سنے رجحانات رکھنے والوں کے اختلافات کی وجہ سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا چکیت نے ان مباحث میں سے سبق کو خرد کر لیا تھا اور اس کی تاریخ اور ان اختلافات سے واقف جماعتی میں مصلحین کو پیش آئی تھیں۔

چکیت خود ایک دور مندوں رکھتے تھے اور انہیں اس کی شہر خواہش تھی کہ کشمیریوں کی اصلاح ہو سکے اور وہ اپنے ملک کے دوسرے لوگوں کے شانہ بشا نہ ترقی کے راستے چلی سکیں۔ اس غرض سے انہوں نے ۱۹۰۲ء میں ایک کتب خانہ کبیر جیک میں ایسی اسٹن کے نام سے قائم کیا اور آخر تک اس کتب کے درجہ رواں رہے۔ اور اس کتب کے ذریعے عورتوں کی اصلاح اور فوجانوں کی رہنمائی کی کوشش کرتے رہے۔ چکیت کی شاعری میں اس پس منظر کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ وہ کوئی سیاسی سماجی مفکر نہیں تھے، لیکن ایک اعلیٰ علم، شاعر، دور مدعا اور احساس انسان کی حیثیت سے ملک کی ترقی و آزادی اور عوام کی خوشحالی کے سعی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت کے لوگوں اور خاص طور پر فوجانوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبہ کو مبدار کر کے کی ضرورت ہے۔

اصل دور دورہ رہتا تھا ان کا دور تھا جس کی ایک تنہا ہر طرف کی تبدیلی سے نکلا تھی، جو لوگوں کو رواجی مہضوں اور سماجی مہضوں سے تہیں نکلنے دے رہی تھی۔ جس کے لیے ہر پائی چیز قابل احترام اور ہر روایت، رسم یا توہم مذہبی عقیدے کی

چکیت اردو کے ان شعراء میں ہیں جنہوں نے بڑی مختصر زندگی پائی، لیکن اس مختصر زندگی میں وہ اردو کے ادبیاتی پر ایسے بھرے نموش چھوڑ گئے کہ گزشتہ نصف صدی کے فخرات و افلاکات بھی انہیں ڈھنڈلا دے سکے اور آج بھی وہ ادبی تاریخ میں ایک ایسے رنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے بغیر اردو شعراء و ادیب کی تاریخ ناممکن نہیں کہی جاسکتی۔

چکیت کا زمانہ ہندوستان کی ادبی، سیاسی، سماجی، اصلاحی اور تہذیبی تاریخ کے سلسلے میں بے حد اہم زمانہ تھا۔ یہی وہ ہے کہ چکیت کے شعری محرکات کو سمجھنے اور ان کی شاعرانہ اہمیت کا تعین کرنے کے لیے ان عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جیسے وقت ہندوستان کے فتنہ باز اور مہاریشی کے انفرادی کے جنہوں میں کا رنجا تھے۔ یہ اتفاق ہے کہ چکیت ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے (۱۸۸۲ء) جو ہر اعتبار سے تہذیبوں کا جد تھا۔ یہی دور ہے کہ اس زمانے میں کوئی بڑی تحریک سیاسی مسلح پرتل نہیں آئی، لیکن سرکار دولت انگلش یہ کے تمام کے بعد ہندوستان کے سیاسی و سماجی شعور رکھنے والے طبقے میں اس کا احساس پیدا ہوا تھا کہ غلامی کے اس مجھے کو انار جھینکنے کے لیے ایک نئی جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس احساس کو ہر صاحب فکر نے نقطہ نظر کے مطابق راہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ۱۸۵۰ء کی شکست اور اس کے بعد انگریزوں کے سامنا دار وسیع کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ عام ہندوستانی فون زدہ تھا بلکہ بڑھا ہوا معاشرہ بھی ہر طرف کے تضاد سے گزر رہا تھا۔ ان حالات میں ہندوستانی دانشوروں کے سامنے ایک راہ کھلی کہ انہوں نے اپنے انقلاب کی راہ و ہمت خواں کے بجائے اصلاح کی راہ و ہمت سال اقتصاد کی بجائے اور اصلاح سماجی اصلاح اور بعد یقین کے دلچسپ وہ ہدایتی پید کی جائے، جو حصول آزادی میں معاون ہو، اس لیے چکیت کے ہمدرد وہ اصلاحی تحریکیں اپنے فوج پرتل آئی جو تہذیب

طرح اہم تھا۔ دوسری انتہا انچا چڑھنے سے نفرت اور انگریزی رسم و رواج، زبان و لباس اور رہن سہن کی تقلید تھی۔ اور اس زمانے کے تمام مصنفین کو ان انتہاؤں کا ہدف بننا پڑا تھا۔ خواہ وہ کشمیری پڈنوں میں مثنوی زبان اور میں مسلمانوں میں سرسید احمد خاں۔ چکیت کو بھی اپنے کلمے کے سلسلے میں بعض اختلافات کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید اسی لیے انہوں نے دوسرے مسائل کو چھوڑ کر حسب الٹی کو اپنا موضوع بحث بنایا۔ جس میں اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ الٹی کے لوگوں کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ان کے ملک کا کتنی کیا تھا و کتنی بڑی علمی، تہذیبی اور سماجی غلطیوں کے وارث ہیں اور کہیں آج قوم ملت گناسی اور احساس کمتری میں مبتلا ہیں اس کے بین اسطور میں اگر دیکھیں تو اس میں ایک نئے انقلاب اور نئی تبدیلی کی خواہش پورے شدیدہ لگی چکیت نے انہیں جذبات کو اپنا موضوع بحث بنایا۔ حسب الٹی کے جذبات ان سے پہلے دوسرے اہم شعرا کے یہاں جھلنے لگے ہیں، جن میں اقبال اور درگاہ سہاسے سرور کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، لیکن چکیت کی شاعری کا محرک حب الوطنی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں باغیغہ ہیں، ان کے مرثیوں یا طنزیہ شعری اور متفرقات ان سب میں رنگ و بار اور توانائی و گنجی اسی سے پیدا ہوئی ہے اور چکیت کا کمال اتنی ہے کہ انہوں نے اس ایک رنگ سے نہ جانے کتنے دلکش و دلیرانہ رنگ پیدا کر دیے ہیں جو قوس قزح کی طرح ادب کے آبی پر چمکنے لگتے ہیں۔

چکیت کی شاعری کے تفصیلی جائزے کے لیے موصوعات کے نمائندے ہیں ان کی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ان کی اصلاحی شاعری، سیاسی شاعری، شخصیات، ماثی، طنزیہ بات اور غزلیات وغیرہ لیں چونکہ خیاری طور پر تمام موصوعات میں ایک ہی جذبہ حاوی نظر آتا ہے، اس لیے ان کے مطالعے کے لیے نظم اور غزل کی تقسیم پر اکتفا کیا گیا ہے۔

چکیت کی شاعری درحقیقت زندگی کا آئینہ ہے جس میں ان کے دور کی مائیک سماجی، معاشرتی و تہذیبی و اصلاحی تحریکات اور ان کی کشمکش کی بڑی واضح تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ ادبی ناقدین نے وصف نظر ثانی طور پر ادب کے رشتے پر زور دیا ہے۔ لیکن چکیت اردو کے ان چند شاعر ہیں جن کی شاعری زندگی اور ادب کے رشتے ہی پر زور دیتی ہے۔ انہوں نے ادب کو سماجی، تہذیبی اور سیاسی اثر کار کی شکل میں استعمال کیا اور وہ بھی اس وقت جب ترقی پسند تحریک کا وجود زمزموں میں بھی نہیں ہوا تھا۔ ان کے یہاں نیکل پرستی، روافی انتہا پسندی کی جو بد فہم فتنہ سامان اور مشورے مشرعبان کی تشویشیں گئی تھیں حقیقت اپنی تمام گنج ادا لیں اور مشورہ طرازیوں کے ساتھ محبوب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

ترقی پسندی پر یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ ترقی پسند ادب پروپیگنڈا ہے۔ ان کی شاعری موضوعاتی ہے اور موضوعاتی ادب وقتی ادب ہوتا ہے۔ غرضت نصف صدی میں اس کا جواب کس طرح دیا گیا ہے اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن

اس اعتراض کا ٹرا خبصہ موت جواب چکیت کی شاعری ہے، جو موضوعاتی ادب سببانیہ ہونے کے لیے آج تک مصروف ہے کہ زندگی ہے بلکہ ادبی سرمے میں ایک اندازے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں پر ایک اور بھی تفاد کی ایک تحریک کی طرف قوت دلا کر جانوں گا جس نے لکھا ہے کہ امریکہ میں پرورداری ادب کی ناگامی کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ پروپیگنڈا ہے بلکہ اس کا بنیادی سبب CRAFTSMANSHIP کی کمی ہے، لیکن چکیت کے یہاں بسا نیہ یا موضوعاتی شاعری کے بارے میں CRAFTSMANSHIP ہے۔ انہیں زبان و بیان پر ہلکی قدرت حاصل ہے۔ اور وہ اپنی بات کو ایسے دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں کہ موضوعاتی شاعری کی عیبیابی ان کی زبان کا وارث اور تشبیہ و استعارات کی دل کشی میں نظر انداز ہوجاتی ہے۔

یہاں پر ایک بات اور نوید قلب ہے جس نے چکیت کی شاعری میں اثر آفرینی اور اظہار کی شدت پیدا کی اور وہ ہے مدرس کی سببیت۔ میر انیس اور مرنالویر نے مرثیے کے لیے مدرس کو پناہ گراں میں بیان و اظہار کی بے پناہ طاقت بھر دی۔ چکیت نے جب مرثیہ سمجھا اور شاعری شروع کی کہ وہ زمانہ تھا کہ جس وقت آئینہ ذہن کی کوئی اور شاعری اور خاص طور پر کھنویں مضامین میں ہوتی تھی۔ انیس و دیگر کے انحال کو سمجھنا اتنی سہل کی نہیں گزری تھی، انیسوں اور دیگروں سے کھنویں کے لکھے گئے کہ بے آباد تھے۔ وقت تبدیل مزرور ہوا تھا، لیکن ذہن تبدیل نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے زبان پر مہا دیوں کی چاشنی عذہ فوقی علاوت، استعارات و تشبیہات کی آرائشی باقی تھی، اسی نے چکیت نے اپنے اظہار کے لیے ایسی سببیت کو منتخب کیا جو اس وقت بے مد مہول تھی۔ اور میں میں اثر انگیزی اور پراثر اظہار کی سب سے زیادہ قدرت تھی۔

چکیت کی چند نظموں کو چھوڑ کر سبھی مدرس میں ہیں۔ انیس و دیگر نے مدرس کو واقعہ کار کے لیے مخصوص و محدود کر دیا تھا۔ اور ان کے بعد بھی یہ سببیت مرثیوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی، اس لیے نئے اور بالکل مختلف موضوعات کے لیے اس سببیت کا استعمال آسان بات نہیں تھی، لیکن چکیت نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے موضوعات کو مدرس میں پیش کیا۔ مدرس کی سببیت، کھنویں کے محاورے، زبان کے انداز اور بعض خاص ترالیک کے استعمال کی وجہ سے کہیں کہیں پرانے یہاں انیس و دیگر کا اثر معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن جس مدرس لکھنے کے باوجود انیس و دیگر جیسے شاعر کے اثر سے بچ جانا مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن تھا مگر یہی چکیت کی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ ان کے چہرہ و رنگ نہیں آتے۔ اس کے علاوہ موضوعات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مماثلت کی گنجائش بھی کم ہے۔

عام خیال کے مطابق چکیت نے ۱۹۰۳ء میں ۱۲ سال کی عمر میں شاعری شروع کی ان کی پہلی نظم محبت تھی، جو انہوں نے سوشل کالغرض گیری پر ہندوستان لکھتے ہیں پھر ہی تھی۔ یوں تو وہ جذباتشارک ایک عام نظم ہے، لیکن اس سے اس عہد کی فکر اور عام رجحان کا اندازہ ہوتا ہے، جس کے تحت چکیت نے پہلی کو سوشل

میں وطن دوستی اور فنی محبت کو اپنا موضوع بنایا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ غزل یا مثنوی امداد سے شاعری کی ابتداء کرتے ہیں اور رواج کا تقاضا بھی یہی ہے۔ قوم اور وطن کی محبت کی باتیں سنو اور بے گنجی کی بات ہے، لیکن چکیت کا حسب قومی ہے اپنی شاعری کی ابتداء کرنا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانے میں اصلاحی جذبات عام تھے اور بیک گراؤ گھرے اپروپی باتیں سننے تھے۔ چکیت کی تذکرہ نظم میں کوئی قابل ذکر فنی نہیں ہے۔ لیکن خیال کو ربط کے ساتھ سلجھنے میں پیش کیا گیا ہے جس کے دو شعر نمونہ پیش ہیں :

حبیب قومی کا زباں پر ان دلوں افسانہ ہے

یادہ الفت سے چر دل کا مرے پیسا نہ ہے

جس جگہ دیکھو محبت کا دہاں افسانہ ہے
عشق میں اپنے وطن کے ہر بستر دلیرانہ ہے

اس پہلی ہی نظم کے بعد انہوں نے مدرس میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ شاید انہوں نے مخصوص خیال کے بیان اور موضوعاتی شاعری کے لیے مدرس سے زیادہ چارٹرڈ صنف سے ہی اس میں سیاسی و سماجی اور اصلاحی خیالات کو کامیابی کے ساتھ نظم کرنے کی زیادہ سمجھنا ہے۔ اس کے علاوہ کھنڈ میں صنف پہلے ہی مقبول تھی۔

دوسری نظم میں انہاں خیال کرنے کے لیے اسباب ہو سکے ہیں۔ اسی لیے ان کی دوسری ہی نظم مدرس کا شکل میں ملتی ہے۔ ان کی پہلی نظم کے مقابلے میں ”جلو کا صبح“ فنی چنگ کی بہترین مثال نظر آتی ہے۔ حالانکہ دونوں نظموں میں صرف چار سال کا فرق ہے۔ لیکن فنی فرق اس لیے بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ اس دہان کی ان کی کوئی

دوسری نظم بھی نہیں ملتی بلکہ ہے کہ انہوں نے اس چار سال کے عرصے میں اور بھی تغیر لکھی ہیں، جو صانع ہو گئی ہیں، اس لیے کہ علوہ جس میں جوفنی مہارت، افعال، عمارات، تکیات اور استعارات پر قدرت نظر آتی ہے وہ بڑی چنگ کی نشاندہی کرتی ہے۔ چکیت انیس و دہرے کے پیرائے میں ایک پختہ کار کی طرح پہلے چہرہ نظر کرتے ہیں اور چہرے کے بعد رفتہ رفتہ اپنے موضوع کا بیان کرتے ہیں۔ واقعات کو وہ بڑے سلیقے سے ترتیب دیتے ہیں۔ ان کے مدرس بہت طویل نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے موضوع طویل مدرس کے لیے مناسب نہیں تھے۔ اور ان کے سامعین اس کے تحمل کر سکتے تھے۔ اسی لیے عام طور پر انہوں نے مختصر مدرس لکھے ہیں۔ فرق محبت ان کا تیسرے طویل مدرس ہے جس میں ۵۲ بند ہیں۔ اور جو مختلف عنوانات میں منقسم ہے۔ یہ مدرس انہیں جوانان کثیر کے جلسے میں پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ جن کا موضوع تحریروں کی اصلاح ہے۔ مرتبہ

میں اس وقت کی تحریروں کی حالت، بے جہی، یورپ کی تقلید اور جو پسندی کو ظاہر کر کے اس بات کا احساس دلایا گیا ہے کہ وہ پیش بندی اور بے راہ دہی کو ترک کر کے قوم کو ادب پر اٹھانے کی کوشش کریں۔ ”جلو کا صبح“ امد ”مربع محبت“ دونوں ہی مدرس پر آئیں گی مگر یہ چاہ نظر آتی ہے۔ پہلا ہی بند ملاحظہ ہو:

ہاں نوازل مہوہ گفت دکھا دے

ہاں شمع زباں مصلح انرا دکھا دے

ہاں طبع رواں تسلیم زخار دکھا دے

ہاں رنگ سخن گلشن بی بی عار دکھا دے

گلزار معانی کا جہنم نظر آئے

طوبی چمنستان کا جہنم نظر آئے

اس کے بعد اپنے بارے میں لکھے ہیں :

ہاں طبع و شغف کی پروا نہیں مجھ کو

تحفین و ستائش کی قیمت نہیں مجھ کو

نیرنگی افلاک کا ٹھیکو نہیں مجھ کو

کچھ نکر ہو نہرت کی، یہ سودا نہیں مجھ کو

ڈوبا ہوا ہوں مثل سخن رنگ سخن میں

گل مجھے میں رہتا ہوں علقات کے چر میں

پھر یہاں پر کثیر کی تعریف کرتے ہیں وہاں کثیر کی صبح کی منظر کشی ان کے گہرے متاثرے اور اظہار پر معنی و لگت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس بند کا ایک ایک لفظ

صناعی اور رنگ آمیزی کی بہترین مثال ہے :

وہ صبح کو گہسار کے پتھروں کا ملکیت

وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا جہنمیت

گردوں پر شغف کوہ پہ لے لے کا ملکیت

مستوں کی طرح ایک کھنڈوں کا ملکیت

ہر بھیلو کی جنبش سے عیان ناز پری کا

چلنا وہ دیسے پاؤں نسیم سمسری کا

اسی طرح ”جلو کا صبح“ کا بند کا مدرس مومن کے باوجود چکیت کے

قدرت کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے لکھا تھا کہ :

بندش افلاخ جوڑنے سے تنگوں کے کم نہیں

شاعری کا مے باتش مرتضیٰ سار کا

چکیت کے مدرس میں یہ مرتضیٰ مازی اور نگوں کی جگہ کاٹھ مہر مقام پر

پنظر آتی ہے۔ خاص طور پر جلو کا صبح کے مصرعے اور الفاظ ”ہر تنق موقوف“ و ہر

نکتہ مقام دارد“ کی تصویر نظر آتے ہیں :

جب رنگ شب آئینہ سخی سے ہوا ڈور

ہنگامہ کرگون و مکان ہو گئے پُر نور

تبدیل ہوئی صورت کوہ شب دیکھو

چکا وہ تجلی سمسہ سے صفت طور

بجلی کی طرح جرج پے نور سحر آیا
آنکھوں کو نہ بھر غریب انجم نفس آیا

مستی تازی خشنکی میں تو خنک سخی ہوا میں
نشا دہی سخی بخت میں تو بخت سخی صبا میں

نور شبید منور کا دم حبسہ گری تھا
نور رخ جنتاب جبرائیل سحری تھا

دیا بے فلک میں تھا غیب نور کا عالم
بکھر میں تھا گرداب صفت نیرِ ظلم

ہندام سحر بادِ سحر جلی سخی بہیم
آرام میں سبزہ تھا تہر چادرِ شبیم

یا یہ بند ملاحظہ کیجئے:

مرغانِ جہنم عالم سخی سحر دم وصفِ جہنم آرا سے جہاں کہتے تھیں
شاہینِ شیریں جہنمِ سحر صفت خم تسبیحِ خدایں بہر حق سخی شہیم
غیروں کے سخی سخی درِ زبانِ محمد صلی
آئی تھی جھٹکتے میں صدا صلی علی

ان چند اشعار کو دیکھئے تو ان میں وہ تمام شعری صفات نظر آئیں گی، جو
اعلیٰ شاعری کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ان اشعار سے اس عہد
کے شعری رویے کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس وقت تک دعائیت، نفی، محاورے اور
روزمرہ پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اور اس کے کامیاب اظہار کو بے حد
پسند کیا جاتا تھا۔ ان اشعار میں رنگ، شب، آئینہ ہستی، کوہِ شبنم، بکیر، بجلی،
ظہر، بجلی، زہن، جگر، گرداب، شامیں، گردنِ تسلیم، تسبیح اور شبنم وغیرہ خوب
رعایتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ تشبیہات واستعارات کا استعمال
اس قدر ہمارت اور قدرت کے ساتھ کیا گیا ہے کہ انہوں نے امتیاز میں حاکمات
کی صورت پیدا کر دی ہے۔ یعنی اشعار کو پڑھ کر ان کی تصویر نگاہوں کے سامنے
آجاتی ہے۔ یہ صورت چمکتے کے بعد کے مسدس اور خاص طور پر "حاکمِ ہند" اور
"رامائن کا سین" میں زیادہ خوبصورت سے نظر آتی ہے۔

"رامائن کا ایک سین" میں زبان، الفاظ، محاورات اور روزمرہ
پر چمکتے کی بار بار گرفت کے علاوہ ان کی ایک اور خصوصیت سامنے آتی ہے اور
وہ ہے جذبات نگاری۔ اس مسدس میں رام چندر جی اور ان کی والدہ کی جذبات
کی تصویریں طرح انہوں نے کھینچی ہے وہ ان کی وقتِ فکر کی نشاندہی کرتی ہے۔
جذبات نگاری کا فن کئی دشوار ہے۔ اس لیے کہ انسانی جذبات کی سطحیں رشتے

اور تعلقات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ ایک شخص کے جذبات ایک ہی طبع
کے مواقع پر سال سے کچھ اور ہوتے ہیں اور آپ سے کچھ اور ہوتے ہیں
اور اولاد سے کچھ اور۔ یہ جذبات کی سطح دوست، احباب، رشتے دار اور
ہمسائے کے لیے کچھ اور ہوتی ہے اور مختلف اشیاء سے جذبات کے اظہار
کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ ان کے یہ الفاظ کا استعمال بھی مختلف ہوتا ہے۔
اسی لیے کامیاب جذبات نگاری کے لیے انسانی نفسیات سے واقفیت اور اس کے اظہار
کے لیے زبان پر پوری قدرت لازمی ہے ورنہ حقیقی جذبات نگاری نہیں ہو سکتی۔

چمکتے نے رامائن کا وہ سین نظم کیا ہے جو رخصت سے متعلق ہے۔ رخصت
یہ ذاتِ خود ایک اندازہ نہیں موقوف ہوتا ہے۔ رامائن کی رخصت اس لیے زیادہ دردناک
ہے کہ بیٹا ناں باب اور پڑ پڑوں سے ۱۴ برس کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ بکھر
ریاست کے عیش و آرام کو کچھ جگہوں کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ زندگی کیسی ہوگی۔
اس میں کیا کیا مصیبتیں برداشت کرنی ہوں گی، اس کا کوئی اندازہ نہ رخصت ہونے
والے کو ہے اور نہ رخصت کرنے والوں کو۔ اس لیے دلی اور زیادہ فداشیت سے
پڑ ہیں۔ بکھر اس کا بھی خوف دل میں نہیں نہ کہیں جائزین ضرور ہے کہ ۱۴ برسوں
میں نہ جائے کیا کیا حادثات ہوں۔ رخصت ہونے والا زندہ نہیں بھی آئے گا یا نہیں۔
بکھر جس سے وہ رخصت ہو رہا ہے انہیں واپس آکر دیکھنے کا بھی یا نہیں، ایسی
صورت میں چمکتے کا کام خاصہ دشوار تھا۔ لیکن انہوں نے جس طرح اپنے اس
مسدس میں جذبات نگاری کر لی ہے۔ اس سے ان کے انسانی نفسیات کے مطالعے
اور زندگی کے مشاہدے کا اندازہ ہوتا ہے۔

رام چندر جی اپنی والدہ سے رخصت ہونے کے لیے اپنے دل کو سمجھاتے
ہوئے ان کے پاس پہنچتے ہیں قرآن میں اس حال میں پاتے ہیں ۵
قرآن میں کو نام نہیں دے رہا ہے
گویا امتیاز نہیں کرتی تصویر سرنگ ہے
کیا جائے کس خیال میں کلم سخی وہ بے گناہ
نورِ نظر پہ دیدہ حرمت سے کی نگاہ

جنیش ہوئی بونوں کو سحری ایک سر د آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے آنکھوں نے رن کی راہ
ہجرے کا رنگ حالتِ دل کو بونے لگا
ہر بونے تن زبان کی طسیر بونے لگا

اس خاموشی میں چمکتے نے جذبات کی تصویر پیش کی ہے، اسے شاید
سینکڑوں الفاظ میں بھی ادا کرنا مشکل ہوگا۔ تصویر رنگ بن جانا فنی مشہور فنِ کفایت
کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ۵ لی گوشہ ہائے چشم سے آنکھوں نے رن کی راہ
اور ۵ ہجرے کا رنگ حالتِ دل کو بونے لگا
ہر بونے تن زبان کی طسیر بونے لگا

ماں کے دکھ، بیٹے سے جدائی، دنیا کے غلام، قسمت کی تمنا پی اور نہ جانے کیسے کیسے کرک کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ اسٹارٹسٹ کے زبردست مشاہدے اور انسانی نفسیات پر قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ماں کو جس وقت اس کا احساس ہوتا ہے کہ بیٹا رخصت کے لیے آیا ہے تو صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔
دو کر کہا تو حق ٹھکڑے ٹھکڑے بچوں پر میری جاں
میں جاتی ہوں جس لیے ہنسے چم پہاں

سب کی خوشی ہی ہے تو صبح کو جو روال
لیکن میں اپنے گونہ سے تہہ پر گونہ لگاں
کس طرح ان میں آنکھوں کے تارے کو بچھو دوں
جنگی ہنر کے راجہ کو لاؤں کو بچھو دوں
رام چند پائی انہیں سمجھاتے اور قہری دیتے ہوئے کہتے ہیں:

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ افسردہ
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کو دکاؤ

تمہاری نہیں ہوکتی تیرنگ ر و زنگار
ماتم کر سہیں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سخی سہی نہیں کہ اٹھٹائی کوڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ نصیب پڑی نہیں
دیکھیں اس سے بڑھ کے دھننے ان انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب

سوز دروں سے تپ ہو جائے کیا ب
بیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو فیضیہ بگڑے
وہ بھلبلا کرکے کچھ بے گھر ہو جائے
لیکن ماں کو اس بات سے تسلی نہیں ہوتی اور وہ کہتی ہیں:

بھیرہ کہا کہ میں نے سب یہ داستان
لاکھوں برس کی عمر جو بیٹے ہوا ان کو گیاں

لیکن جیسے دلی کوہے درپیش آستان
بچے ہر اس کا علم نہیں تم کو بے گناہ
اس درد کا شریک بہتا راہبگر نہیں
کچھ ماسا کی آج کی تم کو خبر نہیں

یہاں پر حکایت کے لیے خاصی دشوار منزل تھی، اس لیے کہ رام چند راج
کے بارے میں ان کے جو عقائد تھے ان کو دوجے سے صرف بچوں جیسا برتاؤ ان
سے خلاف ملاحظہ ہوتا۔ اسی لیے انہوں نے ان کے جذبات کے انحصار

آج کل نئی دہلی

کے موقع پر متانت، سنجیدگی، شجاعت اور قدرت کی طرف سے ملنے والے
عموں کو سہی خوشی قبول کر لینے کا اظہار کیا، لیکن ماں پھر ماں ہے، فراہ وہ
ایک عام انسان کی ماں ہو یا دیوتا اور ادا دہی کی ماں انہیں ان کی امانت کے لگے
وہ قطعاً نہ خیالات متاثر نہیں کرتے۔ بلکہ کسی اور ذرا نہ محبت اور پیار کے ساتھ
وہ کہتی ہیں کہ سہ لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیس ان اس
مصرعہ میں پورا چہاں جذبات حکایت نے آراستہ کر دیا ہے۔ ان کو بیٹے کی
رخصت کا حکم بھی ہے اور اس کی بہادر راز بانوں کی فوجی اور گیارہ کی بانوں
پر خرم بھی۔

”خاک ہند“ بھی ان کا بہت خوب صورت سندس ہے، جس میں ان
کی فن کاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس میں اور ان کے دوسرے سندس
میں ہندوستان کی عظمت کا ذکر جس طرح کیا گیا ہے۔ اس تلک میں مقصود میں
انہوں نے نظر انداز کر لی گئی ہے وہ دوسرے مقصود سے زیادہ خوب صورت
اور پراثر نظر آتے ہیں:

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے

تیری جیہی سے ہر جزیرہ ازل عیاں ہے
اگرے ذب و زینت کیا اوج عز و مال ہے
ہر صبح ہے یہ حضرت خورشید پر شمس کی
کرکڑوں سے گوندھتے ہے جیہی ہما لہر کی

چکبخت کے وہ سندس جنہیں سیاسی کہا جاتا ہے، دراصل سیاسی نہیں
ہیں۔ مگر اپنی لہنت سے عقیدت کا اظہار یا ہوم رول کی تمنا کہ: سہ
طلب فضول ہے کانوں کی بھول کے بدلے
نہ لیں بہشت سبھی ہم ہوم رول کے بدلے

ان کے اس جذبے کو ظاہر کرتی ہیں، جو ملک کی آزادی کے لیے ان کے دلی میں
موجزن تھا۔ وہ کسی طرح خود سیاسی انسان نہیں تھے اور بچہ اپنی شرافت نفس
کی وجہ سے ماحول سے کسی لحاظ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے
میں وہ لکھنؤی تھیں ان کے مکتل نامندے تصور کرتے ہیں کہ کچھ اخلاق، مروت
اور محبت سے مل جائے وہ بہت ہے۔ اس لیے ان کے بھال یا کسی نظریات
کو تلاش کرنا ان سے بحث بہت مفید نہیں ہو سکتی۔ اس وقت ایک گروہ کا جس
نظریہ تھا کہ انگریزوں سے ٹکرایا نہ جائے۔ بلکہ ان کے ملنے میں تھوڑی سی خودی رکھ
حاصل کر لی جائے۔ جو ہنسا ہے کہ ان کے دلوں میں یہ جذبات ہمارے یہ تھوڑی
سی خود مختاری کی وقت مکتل آزادی میں بدل سکتی ہے۔ لیکن اس وقت ان کا
صرف اتنا ہی مطالعہ تھا۔ چکبخت بھی اگر گروہ کے ہم نوا تھے۔ اس لیے انہوں نے
جب آزادی میں ہندوستان کی سیاسیوں کی شرکت کی تائید کی اور ان کو دل بڑھانے

کے لیے ایک پرائمر ٹیچر تھے۔ اس کے علاوہ ایچی بسنٹ اور مہم رول پر نگلیں گئیں یہ نگلیں اچھی ہیں اور ان کے جذبے کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ حکایت کے دوسرے مسدس اور نگلیں خواہ وہ امام بارگاہ آصف القولہ پر ہوں یا مسر دہرہ دونوں پر ان نگلوں سے بہتر ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان نگلوں کی ہمارے ادیبوں ایک تاریخی اہمیت ہے۔ اب تک اور شادی میں ان موضوعات کو پیش نہیں کیا گیا تھا۔ حکایت نے انہیں نظم کر کے اردو شاعری کو بہت اور مزمنوں کی گزراؤں عطا کی ہے۔

حکایت نے شخصی مرانی کی کئی طرح ڈال۔ ان سے پہلے غالب اور حالی نے بھی مرثیے لکھے تھے۔ لیکن حکایت نے باقاعدہ دوستوں، عزیزوں، عیال و من اور مصیبتوں کی شان میں برسے پڑا مرثیہ لکھے۔ حکایت نے ان مرثیوں کو نرسے کا نام دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غزل کے لفظ اس وقت واقعات کو رکھنے کے لیے مخصوص نہ کیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد کسی کے انتقال پر لکھی ہوئی نظم کو غزلیہ کہنا غلط نہیں لگتا تھا۔ لیکن دراصل ان کے اس طرح کے مسدس شخصی مرثیے ہیں۔ انہوں نے ان کے لیے مسدس کی حیثیت کو استعمال کیا تا کہ مسدس کے دروازہ پر باغیچہ کا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اس کے علاوہ مرثیوں نے مسدس کو عجم کی نغصے آشنا کر دیا ہے وہ باقی رہے۔

حکایت نے ۹ شخصی مرثیے لکھے ہیں، جن میں دو ان کے عزیزوں پر ہیں۔ اور ایک ان کے دوست پنڈت پرتاپ کئی گروں کے انتقال پر ہے۔ باقی ۶ مرثیے سماجی مصیبتوں اور اس وقت کے اہم رہنماؤں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ مرثیے بے حد پرائز ہیں۔ ان میں اپنے نعلق خاطر کے ساتھ انہوں نے اس قسمی لفظوں کا بڑے پختہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان مرثیوں میں گویا کرشم گو کہنے، بن نازوں، دار، بال گنگا دھرم تک اور گنگا پرست اور ما کے انتقال پر لکھے ہوئے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن میں ان کی خدمات کا اعتراف اور ملک کے لیے اس نقصان کو ختم کا ذکر ہے۔ گویا کرشم گو کہنے کے انتقال پر لکھے ہیں۔

اجل کے عام میں آنا ہے یوں تو عالم کو مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو

بہار تھے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
ملکے تھو کو اجل نے مٹا دیا غم کو

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
مہاگ قوم کا تیری جتا ہے جلست ہے
بش نرائن در کامرہ بھی ان کے دل کی گہرائیوں سے نکل ہوئی ایک آہ ہے۔ بش نرائن دران کے ادبی، اخلاقی، سیاسی اور انسانی قدروں کے رہنا اور ان کے لیے نیکی، شرافت اور سچائی کا ایک سہل تھے۔ اس لیے اس مرثیہ کا ایک ایک لفظ ان کے درد کی تصویر پیش کرتا ہے۔

آدیت کی یہ تصویر کشی جاتی ہے
جذبہ خیر کی تصویر کشی جاتی ہے
دنیاؤں محبت کا حراخت ہے

ای آنگھوں میں یہ دنیا نہیں ورا نہ ہے

حکایت نے شخصی مرانی کی شخصییتوں کی خدمات، ان کی قربانیوں اور اصلاحات کے ساتھ اس زمانے کی سیاسی و سماجی تحریکات اور ان میں بعض اندرونی اختلافات کو بھی قلمبند کیا ہے۔ ان مرانی کے ذریعے حکایت نے اپنے منہاسی دی مقصد کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ لوگوں میں وطن کی محبت اور اس کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا جاسکے اور انہیں ان مصیبتوں اور مفلکوں کے راستوں پر چلنے کے لیے آمادہ کیا جاسکے۔

حکایت نے شخصی مرانی میں اتحاد و مذہبی رواداری کو بڑے خوب صورت اور دل نشین انداز میں پیش کیا ہے، جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہمارے ملک کو آج ہے۔ حکایت نے اس وقت اس کا سبق دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس طرح کے اختلافات ملک کو کمزور کرتے ہیں۔ وہ اس راز سے بھی واقف تھے کہ جب تک لوگوں میں مذہبی رواداری نہیں پیدا ہوگی اس وقت تک حصول آزادی ممکن ہے اور ترقی ممکن ہے، اس لیے انہوں نے اپنے مسدس مرقع عبرت میں مذہب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

مردہ ہے دواں دواں جو گرجم بشر سے

کا مشاہدہ ہوا جو جزا تک کٹی تر سے

بے مثل غزنو دور صفا ہو جو گرجے

آئینہ آب آرتا ہے نقشہ سے

مذہب بہ جز اخلاق روا ہو نہیں سکتا

معنی سے کبھی نفع نہ ہوا ہو نہیں سکتا

حکایت نے نگلوں کے مقابلے میں غزلیں بہت کم لکھی ہیں اور وہ بھی آخر عمر میں

لکھی ہیں۔ یعنی ان کی غزل گوئی کا سلسلہ باقاعدگی سے ۱۹۰۹ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۰۸ء

میں ان کی ایک غزل کے مرتبہ دو شعرے ہیں جب کہ سال ۱۸۹۲ء میں انہوں نے

تفصیل بھی شیعہ روایتیں اور ۱۹۰۹ء تک تو اماں کا ایک سین، خاک ہند، ملیوگ

مرقع عبرت اور آداب انگریز جیسے معرکہ آرا مسدس کو کرشم گوئی میں اپنا ایک مقام مہما

چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان مسدس میں چہرے اور درمیان کے بہت سے بند

ایسے ہیں، خاص طور پر جہاں انہوں نے غیر باسیج کا سال نظم کیا ہے، جس میں بلا

کا تیز ملتا ہے۔ ان کی نظم مذہب شاعرانہ، تو نظم سے زیادہ ایک مسلسل

غزل ہے، جس کے یہ اشارہ ملاحظہ کیجئے:

ہست ہوں وہ سے نشہ آرتا نہیں جس کا

غالی نہیں ہوتا ہے وہ پیمانہ ہے میرا

فروری ۱۹۰۳ء

جس گوشہ دنیا میں پرستش ہو و ف کی

کعبہ ہے وہی اور وہی وقت خانہ ہے میرا
مسکین اس کے باوجود انہوں نے ۱۹۰۷ء تک غزلیں کیوں نہیں لکھیں۔ جب
کہ اس وقت کے کفو میں غزل ہی کے چرچے تھے۔ مشاعروں کا اتفاق عام تھا۔
چکیت کا شمار ہوتا تھا۔ اس لیے وہ مشاعروں میں ملائے بھی جاتے
رہتے ہوں گے۔ ایک صفت میں غزل نہ لکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بظاہر اس کا ایک
ہی سبب معلوم ہوتا ہے۔ چکیت اسلامی اور قوی تحریک سے وابستہ تھے اور غزل
مشاققہ و تصوف و معاشقہ تک محدود تھی۔ اس کے علاوہ عالی غزل کو برف ملاہمت
بنا چکے تھے اور غزل میں معانی کی محجرا و رشتہ نشینا شعاری سلیمت کے بارے میں
ان کی یہ رائے عام تھی کہ :-

”جو گویا کیش نام“ رات اور دن بھر وہی ہی الپے ہائے کاش کا
گانا اجاگر ہو جائے۔ اسی طرح شعریں ہمیشہ ایک ہی قسم کے
معانی میں سننے سے شعرے نفرت ہو جاتی ہے“ مقدمہ ص ۱۴۳

عالی نے خود بھی اپنی غزل میں نئے معانی نظم کیے اور خاص طور پر قوی و
مٹی مذہبات کی ترجمانی کی کوشش کی۔ اسی اثر کی شے کبر آبادی اور مسائل
کے بیان غزل اپنی قدیم روایات سے بہت گونا گویا ہے۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ
انہیں اثرات کے تحت چکیت اپنے وقت تک غزل کے میدان سے دور رہے۔ ورنہ
انہیں کلام پر اپنی قدرت حاصل تھی کہ وہ بہت اچھے غزلیں لکھ سکتے تھے، مسکین
جو نیک غزل کی ایک خاص روایت تھی اور اس روایت کو عالی کی آواز کے بعد بھی
کچھ بحث توڑ دیا۔ آسان نہیں تھا۔ اس لیے کہ غزل اب ایسی صنف تھی جس کے
رد قبول کا پہلا فیصلہ برسر عام عدالت میں ہونا تھا۔ یعنی مشاعروں میں
اس لیے یہ دیکھنا ضروری تھا کہ مشاعرے کے سامعین اُسے کس حد تک مقبول
کریں گے۔ لیکن جب چکیت نے دیکھ لیا کہ مدرس کی شکل میں وہ چیزیں پُر اثر ثابت
ہوئیں تو انہوں نے اس دعوے کے ساتھ غزلیں بھی کہیں کہ نہ

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں

وہی شعر کو کم قید سے آزاد کرتے ہیں
میرے خیال میں یہ نیا مسلک اور نیا رنگ سخن اس مقصد کی قوی اور
دفعی ست غری کی طرف اشارہ ہے اور وہیں شعر کو قید سے آزاد کرنے کی بات
اسے روایتی عاشقا نے معنایں کی بندش سے باہر نکلنے کی بات ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ چکیت نے اپنی غزلوں سے یہ واضح کر دیا کہ غزل بدلے جسے سماجی
حالات اور نئے احساس کا ساتھ دے سکتی ہے۔

چکیت نے بہت کم غزلیں لکھی ہیں، لیکن ان کم و بیش ۵۰ غزلوں سے
بھی ان کی غزل گرائی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اس عاشقا نہ صنف سخن
کو ایک نہال و لہجہ دے کر اس کے اندر پریشیدہ وسعت کو بے نقاب کیا ہے۔

انہوں نے اپنی غزلوں میں عاشقا نہ شعاری بھی لکھے ہیں، لیکن ان کا انداز عام روایتی
انداز سے مختلف ہے۔ عام طور پر ان کے یہاں غزل میں حب قوی کے علاوہ
تفسیقیت اور فحش معانی ملتے ہیں، چراغ بھی زبان زد ہیں اور چکیت
غزلوں میں انہیں اشعار سے بھی لے جاتے ہیں۔

غزل پر ایک اعتراض عام طور پر ہوتا رہا ہے کہ اس میں ہر شعر ایک نئے
معنوں اور نئے تجربے کو پیش کر کے لکھے گئے ہیں اس اعتراض کو غزل کا صنف سمجھا ہوا ہے۔
لیکن اگر کوئی اس اعتراض پر مصری ہو تو اسے چکیت کی غزلوں کا مطالعہ کرنا چاہیے
جو اگر شروع سے آخر تک مسلسل دیکھی ہوں تو بھی خیال کا سلسلہ ہر شعر پر نہیں ٹوٹتا
اور آخر تک ایک کیفیت نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک غزل کے یہ چند اشعار ملاحظہ
ہوں :

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سلیقہ یاد رہے

بڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

ایک سا غز بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے

ساتیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

تار بگڑا ہوا ہے دل کو سنبھال لوں کب تک

لے کے یا بند کہاں تک مری فریاد رہے

مجھ کو مل جائے جھپٹے کے لیے شاخ مری

کون کتنا ہے کہ نگشتن میں نہ صیاد رہے

دُم سے گاندھی کے رہے غور و فاسق تیں

قیس جھلکی میں رہے، کوہ یہ فریاد رہے

اس غزل میں ۱۲ اشعار ہیں، انہیں آپ عاشقا نہ مطالب دیکھ الگ بھی

کر سکتے ہیں، لیکن ان میں ایک صنف تہ نشین ہے، جو سسل کا احساس دلاتی ہے۔

اور عاشقا نہ محاورے لونا، بیڑیاں، ساغر، ساقی، محفل، صیاد، قیس اور

فریاد یا ساغر نہ ملنے کا شکوہ، عاشق باٹنے والے کی دغا کا ذکر، ساقی کی محفل

سے اٹھ آنا، دل کا دستبند، نگشتن میں صیاد کا ہونا، قیس اور محفل، کوہ اور فریاد

کی رعایت کے باوجود جو ذہن کو خاص روایتی غزل کی طرے لے جاتی ہے۔ چکیت

کے اشعار ایک نئی آواز اور بے دلی کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ محبوب یا ساقی کا شکوہ وہ

شکایت کے بجائے اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور یہ چکیت کی فن کاری

اور بہارت ہے کہ وہ غزل کی خالص روایتی اصطلاحات سے بالکل نئی نفا اور

نئے معانی پیدا کرتے ہیں۔

چکیت کے یہاں غزل میں بھی وطن کی محبت اور ملت قومی کے اشعار اور

اس عہد کی صنف دوسری اہم تحریکات کے اشارے مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ

جو مضامین میں دعوت نکرتے ہیں، وہ چکیت کا بنیادی CONTRIBUTION

ہیں۔ مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

زبان کو بند کر دیں یا مجھے اسیر کر دیں
لوگ نہ تیار ہوں کچھ کیا جاتا نہیں
فنا کا ہوش آتا زندگی کا درد سر جانا
عروس جاں نیا پر رہتی ہستی بدلتی ہے
لوگ نہ تیار کیا بسطہ زبان کیا مائیں
کوئی نا شاد سکھانے نہیں نالائا ہونا
زندگی کیا ہے غما میں ظہر تر تیب
یہ اشعار نہ صرف اردو غزل کی وسعت اور معنوی تہ دار کی کا پتہ دیتے ہیں
بلکہ چکیت کی مقامی اور شعرائے جاہل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

چکیت کی غزل کا ایک اور پہلو قابلِ توجہ ہے۔ چکیت کھنڈ کے شاعر ہیں
اداس وقت کے کھنڈ کے حب وہاں کی شاعری میں خادیت ایک شناخت کا درجہ
کھنڈ تھی اور کھنڈ اسکو اپنی خادیت کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ خواہ
مہوب کے سراپا یا دیگر ہوا کے باہاں کا۔ چلیں کی رنگینی کا سبب کچھ نہ کچھ ضرور
سمٹا یا پھر بادہ و ساف کے ساتھ ناف و در زلف و دماغ کا ذکر لازمی طور
پر نظر آتا تھا۔ حالانکہ معترضین نے جن طعن اُتے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے وہ
بڑی حد تک درست نہیں ہے۔ خادیت تو درستان دہلی کے شعراء میں بھی پائی
جاتی ہے اور دروہا درشا و غفر کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے جو در دو باس
کے شاعر ہیں، لیکن خارجی مہدیین کی جو بھی سطح کھنڈ تھی، چکیت کی شاعری
پراس کا ذرا سا بھی اثر نہیں آتا۔ چکیت نے زبان و بیان، الفاظ و محاورات،
تشبیہ و استعارات کی حد تک کھنڈ کی خوبیوں کو اپنا ہی ہے، لیکن خارجی لوازمات
کا ذکر ان کی غزل میں نہیں ملتا۔ آخر میں ان کی غزلوں کے یہ چند مضامین کرنا
چاہوں گا تاکہ ان کی غزل گوئی کی تصویر بخوبی ہو سکے۔

صدادیتا ہے یہ میرا اگر مہیاں جاگ ہونے پر
ہزاروں پیر میں پیدا کر دی گئی دھجیاں اپنی
اگر دردِ محبت سے نہ انسان آشنا ہوتا
کچھ مرنے کا غم نہ ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا
وہی قطرہ ہو کا اشک بن کر گر گیا رسوا
جسے ہم نے نمک پر دروہہ دھس جگ جانا
صبح کو ششتم کے موتی باغ میں چوری گئے

سہول کر دیں سے یہ کہتے ہیں تمہارا کام ہے
چکیت کی غزل ہماری شاعری میں ایک نئے آہنگ، نئے لہجے اور
نئے امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان کی زندگی اگر ان کے ساتھ وفاق کی کیفیت
ان امکانات کی زیادہ واضح اور زیادہ وسیع تصویر ہمارے سامنے آئی اور شاید انہیں
خود اپنی زبان مرگ کا طعم تھا، جیسا کہ ان سے یہ شعر نکلا ہے۔

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شہاب

لیکھ ایک ایسا بھی نہیں ہاتھ میں بیانا ہے
لیکن اپنی زندگی کے ۴۴ اور شاعری زندگی کے نصف ۴۴ میں بنی نظم و نثر کا جو سرا و شعری تجربات کی
جو کائنات اور ذاتی مادی حقیقت نگاہی انداز ہے اور اس کی جو تصویر کشی انہوں نے کی
ہے وہ اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ ان کے
مستزاد اور خلیں، زبان کی معافی و سلاست، بیان و اظہار کی روانی، زبان
کے روزمرہ اور محاورہ کی پاکیزگی کی ایک خوب صورت مثال ہیں۔ انہوں نے شعرو
ادب کو روحانی اعتبار سے سنسکرت اور بارہات سے نکال کر ارضیت سے اس کا رشتہ
جوڑا جس میں انسانی دھوکوں کا احساس اور زندگی کو زیادہ خوب صورت اور زیادہ
دلکش اور حسین تر بنانے کی تہا پور مشیہ ہے۔

بقیہ: چکیت کے نثری اٹلے پر ایک نظر

دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔
حقیقت یہ ہے کہ شاعری و زبان کے مادی کی تشریح و تعریف ناقص
قلم کے اعتبار سے ہار ہے۔
چراغ معنوں پر تھکے کا لٹا ہے۔

چکیت کی مجموعی ادبی خدمات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگرچہ
انہوں نے شعری گوئی چلیں (۱۸۹۳ء) سے شروع کر دی تھی، تاہم ان کا نام
ان کی نثری وجہ سے ہوا۔

گلزارِ بہار کے مباحثہ ان کی شہرت کے لیے پر پرواز ثابت ہوئے اور وہ
پہلے نفاذ مانے گئے اور بعد میں شاعر۔ ہی ان کے نثری اٹلے کی سب سے بڑی
اہمیت ہے۔

بقیہ: چکیت کا تنقیدی شعور

علاقے میں بیسویں صدی کے ربعِ اول کی تنقید پر جب بھی تفصیل کے ساتھ
نظر ڈالی جائے گی، یہ اندازہ ہوگا کہ اپنے بعض معاصرین کی طرح چکیت کی تنقید
بھی ایک مبالغہاتی رد و انکار کی ہے۔ یہ عمل مغربی بدعت کی تجربات کے بالمقابل
مشرقی معیاروں کی باز یافت اور اپنی روایت کے قیام و استحکام سے عبارت
ہے۔ چکیت نے یہ خدمت جن شکلوں میں انجام دی، ان سے چکیت کی عداوت
کے تسلسل کی مخالفت بھی ہوتی ہے۔ اداس کی ترویج بھی۔ اس کا کاغذ، اعتراضات
اور تنقید کی تاریخ میں چکیت کو ایک ایسا مہم شاعر شامل کرتا ہے جو قانونی چھٹل
نہ سہی، مگر جس کے بغیر اردو تنقید کا شہرہ روز ہوتی اور اس میں توازن کا وہ ماحول قائم
ہو نہ تھا۔ جس نے اردو تنقید کو انگریزی کا چہرہ ہونے سے بچا پایا ہے۔ چکیت
کا یہ امتیاز بھلے خود کچھ کم اہم نہیں ہے۔



چکبست کی نظم نگاری

نظیر اور بعض نقویں دقت ہیں۔ مگر ہندوستان میں چکبست اور مصرعوں میں روانی ہے اور مختلف ہندوؤں کے درمیان مکمل ربط اور اتفاق خیال نہ ہونے کے باوجود منظر کا ایک تسلسل اور ہر بند کے اندر ایک ترتیب ہے۔ اس نظم کا مطالعہ اس کی متفرق تصویروں اور خاص خاص ترکیبوں کے لیے کیا جانا چاہیے، جس سے ایک نئی صلاحیت کی امتحان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک ہندو لفظ ہو۔

والشس ستا گندو ششہ خاؤر کے غلجس پر والیل لا باقی تھاں بھی نہ کہیں پر تھی ہری کی پھلی جو منیا چرب بریں پر آئے نگارہ رہ کے وہی نور زمیں پر

ڈروں کا ستارہ بھی چکبست نظر آیا

ہیما ز خورشید چکبست نظر آتا

یہ صبح کی روشنی کے آسمان پر پھیل کر آہستہ آہستہ زمین پر آئے اور آفتاب کے افق پر طلوع ہونے کی بہت اچھی تصویر کشی ہے۔ ”آئے نگارہ رہ کے وہی نور زمیں پر“ سور کی نور انگلی کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی ہے اور اس سے مشابہہ کی بار پٹی کا پتہ چلتا ہے۔ یہ قدرت بیان کا سراغ ملتا ہے، خاص کر جب مصرعے کی سادگی کا مواد نہ ہم قبل کے مصرعے کی رنگینی سے کرتے ہیں۔ پہلے مصرعے میں تاریکی العنقاظ اور ترکیب ہے۔ جب کہ زیر نظر مصرعہ تعجب زبان میں ہے۔ پہلے مصرعے میں اس کا استعمال نمایاں ہے اور دوسرے میں افعال کا۔ ایک ہی شعر کے دو مصرعوں کے درمیان لفظیات کا یہ فرق، اسلوب بیان کی چمک دار اور زورونی پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس سے شاعر کی فنی احساس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہندو آخری شعر میں ”ہیما ز خورشید چکبست نظر آیا“ ایک مستقل تصویر ہونے کے باوجود معنی فہم ہے جب کہ اس کا مصرعہ اول ”ڈروں کا ستارہ بھی چکبست نظر آیا“ ایک عمدہ نکتہ کشی ہے اور پورا شعر قبل کے شعر میں طوں کے تذکرے کی تکمیل نظری و منطقی طور پر کرتا ہے، جو پورہ رہ کے زمین پر آئے نگارہ وہ سورج کی کرنوں کے افق پر بکھرتے ہیں، جس کی تصویر ہیما ز خورشید کے چمکنے سے کی گئی ہے، اس طرح پورے شعر میں

حالی کے بعد اردو میں جن شعرا نے ہندو لفظ کی نظم نگاری مختلف موضوعات پر کی، ان میں میں سب سے نمایاں ہیں، — اقبال، چکبست، صنیع المصنوی۔ حالی نے اصلاحی مقاصد اور اجتماعی عزائم کے اظہار کے لیے نظم کا ہر ایک بیان اختیار کرنا ضروری سمجھا اور سارا زور قلم اپنے انکار و خیالات کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے میں صرف کیا۔ اس زور قلم میں ایک غلوں دل اور جوش طبیعت تھا۔ اسی لیے چڑھنے والوں کے ذہن و قلب پر اثر ہوا۔ اور نظم نگاری کا فن مقبول عام ہو گیا۔ اس قبول عام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شاعری کے معروف مسلم لوازم و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت ہی سخن میں ضرورت اور موقع کے مطابق کچھ جزوی تجربے کیے گئے یا قدیم ہیئتوں کو جدید مواد و موضوع کے لیے استعمال کیا اور جدید حیات یا فانی واردات کو فنی تجاہلات اور شعری سلیکٹ کے پیرائے اور پردے میں پیش کیا گیا۔ حیات اور ابدیت کی اس ترکیب سے انفرادیت اور روایت کی وہ ہم آہنگی ظاہر ہوئی، جو ادب اور زندگی دونوں کی حقیقی ترقی کی ضامن ہے۔ یہ اردو شاعری کے ارتقا کا وہ خط مستقیم تھا جس پر ادب کا قسطنطنیہ منزل کی طرف گامزن ہوا۔ اقبال کے فنی کمالات و فتوحات کا راز اس خط مستقیم کو شاعرانہ عام بنانے میں ہے۔

چکبست اس شاعر عام کے ایک تیز و سرفراخ تھے مگر جو ان کی جہان مردی نے انہیں منزل کی طرف بہت دور تک جانے کا موقع نہ دیا۔ مگر ان کی تیز روی نے جو نشانِ حیرت ہم پر ہے وہ منزل کی سمت واضح اشارہ کرتا ہے۔ لہذا اس کا مطالعہ آج کے نظم نگاروں اور ان کے قاریوں کے لیے بہت مفید ہوگا۔ ان کی ایک بالکل ابتدائی نظم ”طلوع صبح“ ہے جو سندس کی شکل میں ہے۔ اس میں نو ہندوئیں اور سب اردو شاعری کے معروف استعارات و تمثیلات سے پُر ہیں۔ گرج بہن ترکیبیں

□ وارثی کچ، عالم گنج، جلد ۸۰۰۰۰، (بہار)

کے ایک ذرہ کو چمکانے لگا ہے، جس کے لیے ذروں کے سارے کاچٹک ایک نہایت موزوں اور خیال انگیز تصویر تراشی ہے۔ بندے ان انہری روشنیوں میں جو برق لگاری ہے، اس کی تہید اولین شمع کے دواں معروں سے ہوتی ہے جن میں ایک میں دانش اور دوسرے میں والہانہ کی قرآنی تہیات بالکل جست اور بہت معنی آفریں ہے۔

دوسرا بندہ -

جو نکل سنا گلشن میں برومند گھرا تھا دامان بحر میں گل خورشید پڑا تھا
کیا خوب معطر جینساں کا لڑا بھٹا ہر گل پہ گہر قطرہ شبنم کا جوا تھا
بلبل کہیں، طاووس کہیں گھوم رہے تھے مستوں کی طرح نکل میں گھوم رہے تھے

پہلا شعر کے دوسرے مصرعے میں "دامان بحر میں گل خورشید پڑا تھا" صبح اور سورج کے باہمی رشتے کی بہترین، نہایت حسین، رنگین اور زیر نقاشی ہے جب کہ اس نقاشی کا بہت موزوں پس منظر پہلے مصرعے میں برقی گلشن کے برومند ہونے سے تیار ہوتا ہے۔ یہ دراصل "جلوہ صبح" کی پیچیدہ تصویر اور اثر انگیز ہے، جس کی انتہا یہ ہے کہ مادرِ صبح کے آغوش میں گل خورشید ایک تابال اور خوشحال ذہن کی طرح کھینٹا نظر آ رہا ہے۔ یقیناً یہ جینساں کے معتدل کی خوبی ہے۔ جیسا کہ دوسرے شعر میں بتایا گیا ہے اور اس خوبی قدر کا عالم یہ ہے کہ ہر گل میں برفِ شبنم کا موتی چڑا ہوا ہے۔ نورِ سورج کی ایسی نصفا قائم ہو گئی ہے کہ ایک ایک نکل میں ہی میں گھوم رہا ہے۔ اور اس فوجِ بخش جاحول میں بلبلِ نغمہ دہیزے تو ہواؤں میں غورِ قص۔

یقیناً "جلوہ صبح" سے چلبست کی نظم نگاری کے طالع کا منظر سامنے آتا ہے۔ اور اس کے نوز و سورور کا انعکاس ہوتا ہے۔ اس مندرجہ اشعار شاعرِ حیات اور فن کارانہ طرزِ بیان کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان سے شاعر کا ذوقِ فطرت اور شوقِ جمال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں مستعمل الفاظ و ترکیب اشارہ کرتے ہیں کہ شاعر اپنے فن کی تہذیبی روایات اور سائیاں محاورات پر دسترس رکھتا ہے۔ زبان میں شائستہ اور بیان میں شوکت ہے۔ ابتدائی دور کی ایک اور نظم "برسات" میں بھی فطرت نگاری اور منظر کشی ہے۔ گرچہ تصویریں سب کی سب روایتی ہیں اور احساسات و خیالات میں مدرت اور تازگی نہیں، مگر روانی اور جوشِ بیان ہے، سادگی اور سلاست "جلوہ صبح" سے زیادہ ہے اور آخری شعر میں حب وطن کا وہ مصرع بھی ہے جو شاعر کا مایہ امتیاز ہے۔

ماز جو میں کو بہارِ مصر و شام و روم پر
مرز میں ہند میں دیکھے نصفا برسات کی
پہنچنے کے دور میں بھی چلبست نے فطرت کی شاعری کی ہے اور ان کی

نظم "سہرہ دہرہ دون" نہایت کامیاب اور موزوں ہے۔ یہ برسات کی طرح تصویر کی سہیت میں نہیں۔ عشقوی کی شکل میں ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور مطالعات پیش کی ہیں۔ خیالات میں صداقت ہے۔ اور بیان میں فصاحت و سلاست حقیقی تصویریں ہیں اور پُر اثر مناظر۔ ایک منظر ملاخند کیجئے۔

جو دور جاوے کبھی سے، اور ہی ہے سماں

یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انسان

بشر پہ رعب سے قدرت کا چھا گلب کیسا؟

یہ بل زمین کی توری ہے آگلب کیسا؟

بلندوں سے جو ہو مائل نشیبِ نظر

نریب دیتا ہے ندی کا پہنچ دوام اکشیر

نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا

سپید ناک چلا جا رہا ہے بل کھاتا

دہرہ دون کی پہاڑیوں اور ندیوں کا یہ مرقع حقیقی بھی ہے، حسین بھی۔ قدرت کے رعب کی نقش گیری پہاڑوں کو زمین کی تہذیب پر ہی قرار دے

کر کی گئی ہے اور دور سے نظر آتے والے ندی کے پیچ و خم کو سپید ناک سے

تشبیہ دے کر، پھر اس کے بل کھانے کا ذکر کر کے منظر میں جان ڈال دی گئی ہے۔

اور رعبِ قدرت کی نسبت سے ہیبت کا ایک نظارہ بھی دکھایا گیا ہے۔

لیکن چلبست قدرت کی منظر نگاری پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ مظاہرے کے حق میں حقیقت

کے جمال کا پورا بھی پیش کرتے ہیں اور اس طرح فطرت اور انسانیت کو ایک

دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں:

شرابِ انسانی حقیقی سے صحتِ ہر اک سرشار

شجرِ تمنا، کوہِ تمنا، چترِ تمنا یا یہ مشتِ غبار

دُشتِ دگرہ ہیں کیسا؟ ذاتِ پاک انسان کیا

طیور کیا ہیں، ہمایا کیا ہے، ابر و باران کیا

یہ سورج مچی، میدان کے عصفِ صربیں

سب ایک قافلہ شوق کے مسافر ہیں

بلاتشبہ ایک فلسفی اور صوفی کی نظر ہے جو منظرِ قدرت کو دیکھ کر تہمتِ رقتیں

میں پڑا انسانِ حیات ہے اور سوالات کے بعد جواب کے طور پر "موتی" مچتا ہے میدان

کے عناصر کا سراغ لگاتی ہے پھر تمام عناصر کو ایک ہی "قافلہ شوق کے مسافر"

قرار دیتی ہے۔ یہی شاعر ہے، جس نے شاعر کے "مذہب شاعرانہ" کی تشکیل کی ہے۔

جیسا کہ اس عنوان سے شاعر کی فکری پرتی ایک نہایت والہانہ اور سورور انگیز نظم سے

ظاہر ہوتا ہے۔

بروزِ غلی ہے مرا منوں و ہمدن دنیا ہے کہتے ہیں لکاشادہ ہے میرا

جس جا جو خوشی ہے وہ مجھے نذر اہستہ جس گھر میں ہوا مہم وہ عرا خانہ ہے میرا
جس گروہ و دنیا میں پرستش ہو ونا کی کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا
اس مذہب کا اظہار راسخان کا ایک سہیل سے آصف الدولہ کا اہم بارہ
تک مہی نظموں میں ہے۔ ان کے علاوہ متعدد احباب و اعزا کی شادی و فی و جماعتی
اداروں اور جلسوں سے متعلق تحریر کی ہوئی منظومات اس مذہب کی دستوں
اور جہتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً معذرت 'ماہ پاس' 'قوی مدس' 'درد دل'؛
رنگ زمانہ کے مطابق چلبست ایک اصلاح پسند عہد وطن تھے، لیکن
اتقلاب کے طغیان دار تھے۔ معاشرت اور سیاست و دقت میں وہ مصالحت پسند
اور اقبال پسند تھے۔ مشرقی اقدار و اخلاق کے دلدار تھے، مگر مغربی ترقیات
کے گرویدہ بھی تھے۔ اس معاملے میں ان کا ذہن مرکب و متوازن ہونے کے
ساتھ ساتھ سہم اور عجب رہ بھی تھا۔ انہوں نے بیک وقت گراں گراں کرشن کرکے
اور بالنگ و حرکات کی تعریف میں نظمیں رقم کی ہیں۔ چلبست کے سیاسی رویے
اور قومی احساسات کو سمجھنے کے لیے ہوم رول کے متعلق ان کی حسب ذیل نظمیں
کاٹی ہیں:

وطن کاراگ، آواز قوم — سرزمین کی خدمت میں تو کم پیام وفا
"آواز قوم" کا حسب ذیل بند چلبست کی مجلس شاعری کے نثر و فن کی
نشانی دہی کرتا ہے۔

رتیب کہے ہیں رنگ وطن میں یکساں
بنائے قوم تر قح خاک ہند کا راماں

جادو نگار اٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں

جو ہوم رول پر چشم شوق سنجیدہ ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

فرد و اواز اتحاد و یکتہ میں وحدت کے موضوع کو ایک شاعرانہ اسلوب
پیش کیا گیا ہے۔ خاک ہند کے دامن کو "قوم تر ج" کی طرح رنگین بنا کر فطری
اختلافات کو توڑ کر لاکھن عکاسی ہے پھر ہوم رول پر پیدا ہونے کے لیے "چشم شوق"
کی طلب کو تمام رنگوں کے امتزاج سے ایک نور کی آفرینش کا سامان کیا گیا
ہے۔ مستحب الفاظ اور منتخب بکیروں کی یہ وسیع سنجیدگی لطف بیان پیدا
کرتی ہیں اور ان سے تخیل بھی سرشار ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں فنی کماذ سے
چلبست کی سب سے اہم تخلیق "خاک ہند" ہے، جو ایک سس کے نو بندوں پر
متمم ہے۔ شاعر کے چار بندوں میں وطن کے شاندار و ماضی کی زبانی کا دلور
انجمن بیان ہے اور ملک کی مشترکہ تہذیب کا یہ مین نقشہ پیش کیا گیا ہے:

ولیار و در سے اب تک ان کا اثر خیال ہے
لہا رنگوں میں اب تک ان کا ہر رواں ہے

اب تک انھیں ڈولی نا قوس کی فضاں ہے
فردوس گرشاب تک کیفیت اداں ہے
کشمیر سے میاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہر رہا ہے دیارے لنگاب تک
یہ نکات چلبست تین بندوں کے خیالات کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہیں، جب
پانچواں بند ان کے خیال کو ایک منظر دیتا ہے اور ماضی کی بلند یوں سے ان کا کرشن
کی رو کو حال کی طرف لے آتا ہے۔ بلندی کو کچھ کی ترتیب ملاحظہ ہو:

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھولوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک ملائیس جنگلوں میں

اب تک وہی کرکس ہے سجلی کی بادلوں میں
پستی سے اُچی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گلی شمع انجمن ہے گواہ کسب و کسب
حب وطن نہیں ہے خاک وطن دی ہے

ٹیب کا شعر بہت ہی حسین اور سنی آفریں ہے۔ اس کی تکرار بھی قاری کے احساس
میں شدت پیدا کرتی ہے اور اپنی قوی حموی و کوکابی کا ادراک بہت تیزی سے
جوڑتا ہے۔ چنانچہ اس کیفیت کی تفصیل لکھن شاعر نے پیش کی ہے۔ سانس میں ایک
نئی زندگی اور بیداری کی منت ہے۔ انھوں میں اس شیریں منائی تخیل بڑے
خوش انداز طریقے سے ادراک جو شہریت کے ساتھ ہوتی ہے۔

نیداے بوساں کو سرور و سخن مبارک
رہیں ملیتوں کو رنگ سغن مبارک

بلبل کو گل مبارک گل کو چین مبارک
ہم سیکوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
خفیہ ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

یہ گویا مستقبل کی پُر امید و پُرتی تپاسی ہے جس سے سٹھرا کارعانی نقطہ
معلوم ہوتا ہے۔ آخری بند حسب وطن کے احساس میں ڈوبا ہوا ہے اور قبل کے
بند کی ٹپ کے تاثر کی وضاحت کرتا ہے۔ بند کے دوسرے شعری شعریات اور وطن
کا یہ غریب صورت و امتزاج دیکھو:

ہے رشک مہر فتنہ اس مستزل کچن کا

تھا ہے برگ گل کے کا شاخیں اس چمن
یہ ایک مربوط و موثر تخلیق ہے جس میں ستارے نے اپنے جذبہ حب الوطنی کو فخر شاعری
بنانے میں پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ اس طرح کی نظمیں اگر چند اور ہوتیں تو چلبست
کی وطنی نظم نگاری کا بایں بڑے مروجہ آداب حسب وطن سے سرشار و دوام و تخیل چلبست
اور بھی کھی ہیں، مگر ان کا معیار "خاک ہند" کا نہیں ہے بلکہ وہ کچل کے گیت ہیں

"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" اور "وطن کو ہم" وطن کو مبارک کے عزائمات سے لکھے گئے ہیں۔ ان کا انداز ترانے کا ہے۔ مگر بیانیہ آسان نہیں ہے کہ اقبال کے "ترانہ ہندی" اور "بیانہ" تو کیا ہندوستانی بچوں کا قومی گیت "سے بھی ان کا موازنہ ممکن نہیں۔

حاج حبیب دین سے قطع نظر، بعض شخصوں مسؤلوں میں "قومی" غیرت و محبت کے موضوعات پر چمکتی کی وہ متعدد نظمیں بھی ہیں جو انہوں نے "انجمن نوجوانان کشمیر"، "سوشل کانفرنس کشمیری بڈستان" اور ہندو یونیورسٹی کے جلسے میں پڑھیں۔ ان میں سب سے طویل تر قہ جرت ہے، ہم کے ذیلی عنوان اس طرح ہیں :

قبیلہ، خیر، قوم کی حالت، نوجوانوں کی حالت، دولت، آزادی، اصلاح، مذہب، پرانہ حکمران، تنبیہ۔ اس سے کم طویل "ورڈ دل" ہے جس کے ذیلی عنوان یہ ہیں : تمہید، ترقی، انجمن، حالت قوم۔ قومی سائنس بھی قدرے طویل ہے۔ ان نظموں کے برخلاف ایک اور طویل نظم "فریاد قوم" میں جنوبی افریقہ میں جاپان کا مذہبی کی جلائی ہوئی ہندوستانی تحریک کو موصوفہ بنا کر قومی تصور حب وطن کی قومیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے "برق اصلاح" میں کشمیری بڈوں میں عقیدہ یوگان کی ایک مثال کا ذکر مقدم کیا گیا ہے۔ اس طرح ایک نظم "چند لالہ" میں کشمیری قوم کی لڑکیوں سے خطاب "کیا ہے۔ ان سب نظموں میں وطن دوستی، جوش اصلاح اور اخلاقی نغموں کے ساتھ ساتھ شاعری بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر عصری حسیت اور اجتماعی شعور کی دکھائی اور ترجمانی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکیت بہت ہی حس، غیر اور غلط پسند انسان تھے۔ ان کی انسانی ہمدردی اور شخصی درد مندی کا اظہار بھی ان متعدد نغموں سے ہوتا ہے جو انہوں نے احباب و اعزاک کی وفات پر لکھے ہیں۔ ان سب تخلیقات سے ہمارے سامنے ایک بہت ہی ناگس، طبع، رقیق، العقب اور مجلسی انسان کی شریفانہ تصویر پردہ پن پر ابھرتی ہے اور اس کے لفظوں واضح کرتے ہیں کہ نوجوان شاعر کی دھچ پول منور، ہمدردیاں وین اور خیالات معلما نہ تھے۔ لیکن منظومات میں فنی تنظیم کی کمی ہے اور مزید شاعرانہ میں اہماری ہے۔ یہ اجزا کی شاعری ہے جس میں کوئی صحیح و سالم کل نظر نہیں آتا۔ یہ ضرور ہے کہ ان تجربوں سے شاعری جیسی ہوئی پختگی کن اور اس کے ساتھ ساتھ بلوغ فکر کا انداز ہوتا ہے، مگر لفظ "سراغ" ان کوششوں میں نہیں ملتا۔ اس سراغ کے حصول کے لیے میں میں مذہبی نظموں کی طررت رجوع کرنا پڑتا ہے، جبر ہیں :

کوشش کھینچا، گائے، رامائن کا ایک مین

تینوں موضوعات کے ساتھ شاعری عقیدت مذہبی ہے اور اس کا ان سہتوں سے تفریق بھی، جن کا نظروں میں کیا گیا ہے شخصی ہے، لیکن جن احسان و جذبات کا اظہار بھی ان فن کارانہ تخلیقات میں ہوا ہے وہ بالعموم آفاقی اور انسانی ہیں، مثال کے طور پر علی الترتیب پہلی اور دوسری نظموں کے آخری بندوں کے مشبہ

آج کل کی دنیا

خیالات ملا کر لکھیے۔

سچر جو دنیا میں کسی ہستی کا مل کا ظہور
دل میں جس کے جو سادہ ہوا عبادت کا سرور

جذبہ خیر کی جو جس کو ہستی منقطع
بادہ شوق سے ہوں جس کی نگاہیں منور
دل کو تسخیر کرے انجمن آرا ہو کر
ہو نہ دنیا سے خفا دین کا پیا را ہو کر

میرے دل میں ہے محبت کا تری سما یا

مال کے دان سے ہے بڑھ کر کچھ تیرا سا یا

یاد ہے فیض طبیعت نے جو تیرے سے یا یا
میں قسمت جو ترانہ زباں پر آیا
اس علاوہ سے جو دعوئے سخن گوئی ہے
دودھ سے تیرے لو کہیں میں بیاں دھوئی ہے

ان احساسات میں ہر مذہب ولت اور عقیدہ کے لوگ شریک ہوں گے۔ خواہ وہ کوشش کو دلونا اور لکے آتا سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں۔ اس لیے کہ "جذبہ خیر" و "بادہ شوق" اور "دودھ سے تیرے لو کہیں میں بیاں دھوئی ہے" جیسے نکات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ہر حال ان نظموں میں جو روحانی طبیعت اور جو بڑی بیان ہے وہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے جذبہ صادق پر دلالت کرتا ہے اور اس جذبے سے جو روحانی سرور و فوزا شہار میں پیدا ہوا ہے اس کا سرچشمہ عین مذہبی حسیت ہی ہو سکتی ہیں۔ ان احساسات نے شاعر کوئی کا ساتھ ترتیب دینے کے لیے ایک محرک رہا ہے اور اس کے نظری جذبات وید و سلسل کے ساتھ ایک نظم بہتیت میں پروئے اظہار آگئے ہیں۔ ان جذبات کی سرشاری محاکم شعری کی آنگاہ اور ترنگ بھی پیدا کرتی ہے۔ فکر کا خیالی حسن فن کے ضمن عمل کو اٹھا رہا ہے۔ کہنیا کی ولادت جن ماحول میں ہوئی اس کا یہ فکر انگیز شاعرانہ نقشہ دیکھیے :

شب تاریک کے قہقہہ میں ہے الیران تلک

بھبکی جاتی ہے انھیر میں ساروں کی چلک

وہ ہنسا ہے کہ ریشہ جلنے تپ فائوس تلک

نظر آتی نہیں ہی میں چراغوں کی بھلک

صرت ہلکنو ہے جو دیوانہ صفت پھر تا ہے

شع لے کر بھی اٹھتا ہے کبھی گرگ تا ہے

لائے کے تساب معمار اور خلوجہم کی وضاحت دیکھیے :

تو سے تیرے ہے عیاں نرمی دلی کا جو ہر
جوڑ بڑایے کہ مہا پنے میں بنے ہیں جوصل کر

دنگ کا لاہور کہ اہل جو یہ کہتی ہے غلہ
بند راہین کی وہ ہے شام یہ سحر کی سحر
گنگرے سے یہ نہیں چہرہ نورانی پر
تاج قدرت نے سما ہے تری پیشانی پر

اس اندازِ داد کے ساتھ چکیت کا شاہکار رمان کا ایک سین ہے، جو
دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک واجد احمد کا مال سے رشتہ ہونا، "دوسرا" مال
کا جواب، اس عظیم تخلیق میں مال بیٹے کا مکالمہ اداان کے جذبات و خیالات جس
بے عبرت، حسانت اور نفاس کے ساتھ دوج کیے گئے ہیں۔ وہ نہایت دلآویز،
پُر اثر اور فکر انگیز ہیں۔ دراصل یہ ایک تخیلی نظریے جس کے مناظر اور کردار اعلیٰ
ہیما نے پروست نظریہ اور بلندی تخیل کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ یہ ایک گہرا
نفسیاتی مطالعہ اور باریک مشاہدہ ہے۔ اس میں دلائی لاما، پُر خلوص اور محبت
کرنے والی روح کا مکمل اور درجہ دل دکھا گیا ہے، جو دل و جان سے ایک
دوسرے پر فدا ہونے کے لیے تیار رہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں سماج کے برتر اصولوں
پر اپنے مذہبی عقائد و اقدار کا بھی لحاظ ہے۔ اور وہ انسانی مفادات اور ان
سے وابستہ اصول و افلاطون کی خاطر چربی سے چربی قربانی دینے کے لیے آمادہ
ہیں۔ دونوں ایشیا روونا کا بیکر ہیں۔ مال سرسول کی زبان میں بات کرتی
ہے۔ اور ایشیا دماغ کی روشنی سے سمجھ کام لیتا ہے۔ اس طرح دونوں انسان
اپنے ذہن و روح کا بہترین نذرانہ آفاقی صداقتوں کے حصہ میں پیش کرتے ہیں۔
اور دنیا کے مقدس ترین رشتوں کی پاس داری کا مثالی نمونہ قائم کرتے ہیں بشرط
سے آخر تک غفلت و غفلت ہی میں ملوث طریقے سے ترقی کرتا ہے اور تخیل کے مراحل
ارتقا کا تجسس باقی رہتا بلکہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ غفلت عروج و بالکل
منطقی طور سے رو پڑ کر ہوتا ہے۔ بیان میں روانی، شستگی اور شیرینی ہے۔
یہ اپنے موضوع کی حدود میں ایک مکمل نظم اور مقرر تخلیق ہے۔ اسے اردو کی
کامیاب ترین نظموں میں ایک کہا جاسکتا ہے۔ نکتے غور کے طور پر مختلف
موافق کے چند اشارہ درج ذیل ہیں۔

ایک تم سیدہ ماں کے جذبات اور ان کے بیان و اظہار میں مصفا،
روانی اور سچی دیکھئے :

دو کر کہا مومن گھر سے کیوں ہو میری جان
میں جانتی ہوں میں نے اپنے ہو تم نہیں

سب کی خوشی یہ ہے تو صحران ہو رواں
لیکن میں اپنے مومن سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح نہیں اٹھ کے ہات کو کھینچ دوں
جوگی بنانے والے دھارے کو کھینچ دوں

آج کل کی دلی

نظم کا ماحول اشک و فانی نقش آرائی اور قدر شاعری پر مبنی ہے :
دوڑوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جین کی طرح سے انہوہنے رواں

ہر آنکھ کو نصیب یہ اشک و فانی کہاں
ان آنسوؤں کا مل اگر ہے تو نفسد جاں
ہوتی ہے ان کی قدر نقطہ دل کے راج میں
ایسا گھر یہ تھا کوئی دسرت کے تاج میں

پہلے بند میں جو تھے معرے کی لطیف نفسیاتی کیفیت اور دوسرے بند میں
مجھے معرے کی معنی نیر اہمیت ایک نازک اور خیالی آفرینی کا کارہی پر دلالت
کرتی ہے۔

"راہن کا ایک سین" میں جن قدر زبردست قادر و لکھائی کا اظہار ہوا ہے
اس کا نمونہ ایک کٹر لفظ و نظم "لاؤ گرنے سے جھپٹ" میں بھی نظر آتا ہے، جس کی
روایت مشکل ہونے کے باوجود مسلسل ۵۳ اشعار میں پرمشغلی اور پُر تھک آغاز سے
استعمال کی گئی ہے سچا شاعر میں طرز و دوزخ کی ہمار دیکھئے :
ہاں یہ کیوں آپ کے گم ہو گئے ہیں مومن دھواں
کنو دیکھیں میں یہ دکھائی ہے کیا جھلکا ہٹ

محل نشانی کے عوض ڈوڑ کیا دل کا بھرا
خواب چھینکا سراسر احباب پر کوٹرا کر کٹ
دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماسٹارڈ
خواب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے ٹھٹ

گدائیوں کس لیے درپردہ سنائیں ہم کو
ناچنے نکلے تو پھر مومن پر یہ کیسا گھبر گھٹ

یا درہ جانے لگی لیکن ہے وہ ٹھٹ کر گھائی
توس طبع کو اب بھیر دے آواز اس سر پٹ

چکیت نے اپنی نظموں کے لیے بیس تر مدرس کا استعمال کیا ہے —
جناب لالی داس گیتا رتھ کا یہ خیال صحیح ہے :
"انیش اور دیگر نظم کے لیے مدرس کو متعدد کر رہی چکے تھے۔ چکیت نے
بھی نظم کہنے کے لیے مدرس ہی کو ذیلی اظہار بنایا اور حقیقت یہ ہے کہ بے حد
کام یاب رہے۔"

(کلینیت چکیت - ص : ۲۰)
یہ بات گو کانفرنس کے دبستان شاعری سے چکیت کی وابستگی نظم کے کھس گئی
ہے۔ وردہ مدرس تو سب سے شہرہ آفاق ہے۔ اس سلسلے میں اس قومیت
کی بھی تحسید یہ کہ ضرورت ہے کہ نظم کے لیے مدرس کو متعدد کر دیا گیا تھا۔
اس لیے کہ انیش و دیگر کے موافق پھر حالی کی نظم "مدد جز اسلام" کے مدرس کے

بعد اقبال نے مدرس کے علاوہ ترکیب بند میں بہترین شاعری کے نمونے پیش کیے۔ لیکن مدرس کی ہمت سے زیادہ مرثی کے اسامات کا اثر حکمت کی شاعری پر ہے۔ جس کے نشانات سب سے زیادہ ان کی شاعری لغو "راہان اکابک سین" میں واضح ہیں۔ اس طرح مرثی کے اسباب کے نقوش بھی حکمت کی نظموں میں نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر "جلوہ صبح" کی منظر نگاری میں میراٹس کی نظرت نگاری کا عکس نظر آتا ہے۔ مدرس حالی کی اخلاقیات کی گونج بھی حکمت کی اصلاحی نظموں میں صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ کچا جاسکا ہے کہ خیالات اور طرزِ ادا دونوں کے لحاظ سے حکمت کی ساری نظمیں کھڑکی کی خرابیت اور بیت کم اور دلی کی طاقت اور جدت زیادہ ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط نہیں کہ حکمت کے رنگ سخن پر غالب کا اثر ہے اور اسی جہت سے آتش کا بھی، جو حکمت ہی کی طرح کھنڈے سے نکل کر نکلتے تھے۔ مگر اس دبستان کے عام اسلوبِ تغزل سے مختلف انداز رکھتے ہیں۔ چنانچہ حکمت کی زبان کے متعلق جناب کالی داس گپتا دھما کا یہ بیان مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے:-

"حکمت محکم الی اور فارسی آئینہ اندو گھٹتے تھے اور ہر مقام پر اس مہیا کو قائم رکھتے تھے، مگر اس نظم میں جو کائنات کی تعریف میں ہے، انہوں نے ایک پیچھے ہونے کی لاری طرح بہت سی ایسی تفسیروں اور استعاروں سے کام لیتے ہیں کہ شوش کی ہے، جو ہندی الاصل ہیں اور اٹا ڈا بیان بھی ہندی سے قریب تر ہے۔"

(گلیاتِ حکمت، ص ۴۴)

مفہم جو اعراف کا رنگ الی اور فارسی آئینہ اندو بھی لگتا ہے۔ جیسا غالب و اقبال نے کیا ہے بکھرنا ڈا بیان کا ہندی سے قریب تر ہونا کسی فن کار کی ذہنی نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ استعارے کے نظم کا لگنے کے ضمن چند معیار اور معرے سامنے رکھ کر پوری نظم کے عام اسلوب بیان پر چترہ کیا گیا ہے، وہ سب سے غلط ہے۔ اس لیے کہ بیشتر مشاعر میں وہ محسوس اور فارسی آئینہ اندو ہی جلوہ گر ہے، جس کا معیار حکمت نے اپنی شاعری میں ہر مقام پر قائم رکھا ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جہاں تک "ہندی الاصل" الفاظ و استعارات کے استعمال کا تعلق ہے، وہ شاعر کے تمام تحقیقات میں محسوس اور فارسی آئینہ اندو کے پہلو پر پہلو موجود ہے۔ جیسا کہ ان بھی اقتباسات سے واضح ہے، جو قبل متقد و نظروں پر تبصرہ کرتے ہوئے اس معنوں میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب اور شاعری کی تعلیمات میں فارسی اور ہندی کا سارا عظیم اثر بغیر غفلت اور بے مسمیٰ ہے۔ اردو زبان اور اس کا فہرہ ادب ہندوستان کی کسی بھی زبان اور اس کے ادبی طرح ہندی الاصل ہیں۔ یہی اس اصل پر غور کرنی چاہیے کہ زبان و ادب کی وہ تعلیم الٹن کی عمارت جو آئینہ اندو کی زبان و ادب نامی ہے تو اس

کے نقش و نگار میں قیام کی ان باتوں سے نمایاں ہیں۔ مگر (اظہارِ مسکرت اور ہنسا ہنسا کھڑی ہوئی اور جد میں کھڑکی کے آئینہ بھی شاہنشاہ ہوئے۔ حکمت کی شاعری اندو کے دور کے اچھے اور اہم شاعری کی طرح، اسی اصل پر قائم لیکن اس پر کھڑکی عمارت کے نقش و نگار کا محال ہے۔

مشرق بہادر سپرور نے حکمت کی شاعری پر یہ تنقیدی تبصرہ کیا ہے "میر سے اس معنوں کی یہ غایت نہیں ہے کہ اس دور جدید کے دو تہا اندوز اقبال و حکمت کے کلام پر محبت کی جائے اور ان میں فرق دکھلایا جائے، لیکن یہ حکمت بے جا نہ ہوگا کہ اگر حکمت کے بے نسبت اقبال کے کلام کا رجحان روحانیت اور صوفیانہ مضامین کی جانب زیادہ ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ان کا فلسفہ زندگی ہے، اس کا عکس ان کے کلام پر بھی ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر حکمت کے کلام میں زیادہ رنگینی اور درد ہے اور انسانی جذبات و حسرات پر اس کا اثر یہ نسبت انسانی دماغ کے زیادہ ترنا ہے اس لیے اس کی روح غالباً یہ ہے کہ حکمت نے کھنڈ کی آپ و بیاں نشوونما پائی ہے اور ان پر ان اساتذہ کے کلام کا زیادہ اثر ہے جو کھنڈ کی ناموری کا باعث ہوئے۔ اور جنہوں نے اس شہر کی شہرت میں باقاعدہ لگا دیے۔"

(صبحِ صبح، ص ۱۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سپرور نے اقبال و حکمت کے موازنے کا ایک معیار نکال کر صحیح تنقیدی سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ اردو ادب دونوں شاعروں کو اردو ادب کے دو جدِ بزرگ ماننا نہ ہوگا مگر ان کا تاریخی مقام بھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ گویا ہے لیکن فلسفہ زندگی کے بغیر، روحانیت اور صوفیانہ مضامین کا رجحان انہوں نے جذبات و حسرات کے ساتھ کیا ہے اور اس اقبال سے حکمت کے کلام میں زیادہ رنگ و درکار نکلتا نکلتا ہے، وہ صبح نہیں۔ اس تعالیٰ اور رنگت کی مغالطہ آمیز نظمیں اساتذہ کے ساتھ حکمت کی لاسٹنگی کے بیان سے انفرادی واضح ہوا ہے۔ انہوں نے انفرادی اور دور کے تناظر و دبستان کھنڈ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دوسرے حکمت کا رنگت جس گہرائی اور طرزِ نگاروں میں نہیں۔ جہاں تک فلسفہ زندگی کا تعلق ہے وہ حکمت کے کلام میں بھی موجود ہے۔ جو وہ اس کثرت کے ساتھ اصلاحی اور تاریخی نہیں دیکھتے۔ ان نظموں میں ان کے مذہبی عقائد اور تہذیبی انداز نمایاں ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بنیادی بحث یہ ہے کہ تو اقبال کا کلام انسانی دماغ کے لیے ہے نہ حکمت کا کلام انسانی جذبات و حسرات کے لیے، بلکہ دونوں کے کلام کا اثر ایک وقت دماغ و جذبات و حسرات کا ہے، بات یہ ہے کہ سپرور نے کھنڈ کے فلسفہ زندگی کے بغیر وہ اقبال کے

احساسات پر مبنی ہے، لہذا جذبات و محسوسات سے اس کی تعمیر بھی ہوئی ہے۔ اور نتیجتاً جذبات و محسوسات پر اس کا اثر بھی پڑتا ہے۔ یقیناً اس فلسفے کی تشکیل میں دماغ کی قوت اور عقل کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اور یہ ایک ذہن دست منطقی اور منظم فکر کا نتیجہ ہے، لیکن اس امر و واقعہ سے جذبات و محسوسات کی نفی نہیں ہوتی۔ اور شاعری کی حد تک اس سے قلب و روح کے سوز و گداز کو آگے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق و ایمان پر اتنا دور اور ذوق و شوق کا اظہار ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ کیفیت جہکیت کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ اس درجے پر نہیں پہنچتا جو اقبال کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ ”رنگینی“ اور ”درو“ کے عناصر و ذوق شاعری کے کام میں مشترک ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کا درو رنگ زیادہ گہرا، بسیط اور محیط ہے۔

جہکیت، تجارذ کی طرح اردو کے ایک جوان مرگ شاعری، لہذا ان کی فن کاری میں اس کمالات کی جو کثرت ہے وہ کمالات کی نہیں، حالانکہ ان کا ذوق بہت بلند اور اسلوب کچھ ہے۔ اور اراخان کا ایک سین جیسا شاہکار اشارہ کرتا ہے کہ اگر جہکیت کو زیادہ موقع ملتا تو وہ شاعری کے بہتر نقوش چھوڑ جاتے۔ اور بلند تر مقام پر فائز ہوتے، لیکن ان کی متعدد نقیصے، جن کا مطالعہ و تجزیہ کیا گیا، انہیں اردو کا ایک اہم نقوش نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ جدید اردو نظم نگاری کے ایک ستون جہکیت بھی ہیں اور ان کے

فنی تجربات سے نئی نسلیں بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ خاص کر عصری حیات اجتماعی احساسات اور فلسفی اخلاق و تہذیبی اقدار کی صفائی اور ترجمانی کے لیے جہکیت نے جو پیرہ بیان اختیار کیا ہے اس سے کچھ سبق سیکھے جاسکتے ہیں۔ زیادہ تر قریحیت نے اپنے مضامینات کی نقاشی کے لیے مسدس کی حکمت اختیار کی ہے مگر بعض اوقات قصیدے اور مثنوی کی ہئیتوں کا استعمال بھی کیا ہے اور ہر ہئیت میں چند کامیاب اور موثر نمونے پیش کئے ہیں۔ حالانکہ ان کے دور میں یہ مضمون عام سمجھے گئے تھے اور ان کے متعلق شاعری کے احساسات بھی تازہ جہکیت کی افراوٹ ایک روایت کے اندر بروئے افکار آئی اور آج ان کا انفرادی تجربہ خود ایک روایت یا جزو روایت بن گیا ہے، جس سے استفادہ نئی نسل جہتوں کو میں اور جزاثر تجربات کرنے کا موقع دے سکتا ہے۔

شرح چندہ

ہندوستان	پاکستان	دیگر ممالک
سالانہ ۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱۵۰ پونڈ
دو سالہ ۱۸ روپے	۲۸ روپے	۴ ڈالر ۲۰۰ پونڈ
سیرالہ ۲۵ روپے	۳۸ روپے	۵ ڈالر ۳۰۰ پونڈ
تی کالی ایک روپیہ ۱/۵۰ روپیہ	۳ سینٹ ۱۵ اپنی	

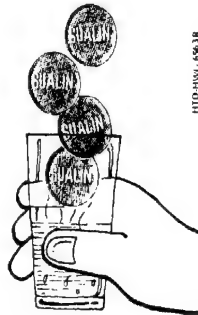
سعالین سے جوشاندہ بنایے! نزہ زکام اور کھانسی سے چھٹکارا پائیے!

سعالین کی جادوئی آدھی بریلی جانے، بہتر ترجمانی میں گوں کر نوز جوشاندہ بن جاتا ہے۔
جوشاندہ نزہ زکام کے جوایم کو تم کو کتابے اور ان کی مزید پیش کردہ کتابے۔
اس طرح سعالین سے بنایا جوشاندہ نزہ زکام اور کھانسی کی
مسک توں میں جلد آرام دیتا ہے۔



سعالین

نزہ زکام اور کھانسی کا مست اور آسان علاج



بکھر د

HTO-HWL-563R

مرانی چکیت



ان کے دلوں میں مہر دی اور دلائے رسول و آل رسول کے جذبات پیدا ہوں۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ نکلا کہ مرثیہ اپنے بنیادی منبع نثر سے بہت دور نکل گیا۔ ایسے میں سبکدوش کو جرأت تھی کہ وہ ان شعراء سے کہتا کہ حضرت آپ کی قادر لکھائی اور وسعت معلومات تسلیم اور مقصود بھی قابل توفیق۔ لیکن آپ جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں، یہ مرثیہ نہیں ہے، بلکہ مدرج و منقبت کی دوسری شکل ہے۔ اس کے باوجود بعض شعراء نے زبانِ تال سے توسیع کر وہ اس کی جرأت نہ کر سکے، زبانِ حال سے ضرور احتجاج کیا۔ انہوں نے خود ایسے مرثیے لکھ کے مثال قائم کی کہ مرثیہ کی اصلی حدود کیا ہیں۔ اس طرح گویا انہوں نے اپنے یا رانِ طریقت کو دائرے کے محیط سے واپس مرکز پر لانے کی کوشش کی۔ ان منہجی ممبر صاحب میں چکیت کا نام نہایا ہے۔

مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ رثاء ہے جس کے معنی ہیں رونا اور غمناک بیان کرنا۔ عربی ادب میں جتنے مرثیے ہیں اور ان کی نامی تعداد ہے، ان کے بھی دو مقصد ہیں: مرنے والے کی جہلی پر دُعا و غم کا اظہار اور اُس کے کردار کی عظمت اور خوبیوں کا بیان۔

فارسی میں یہ صنف سخن عربی ہی سے آئی۔ یہاں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا۔ اس دوران میں کر بلا کا حادثہ فاجد پیش آچکا تھا جس میں خاندانِ غزوت کے کئی بچے و چراغ اور ان کے اہلوان و اہلخانہ شہید کر دیے گئے تھے۔ اب تک شعراء اپنے ہم عصروں ہی کے مرثیے لکھتے رہے تھے، لیکن سانحہ کر بلا کے بعد ان شہداء کو گرام کے مرثیے بھی لکھ جانے لگے۔ حال اُن کے شاعر نے ان کا سہم بھی نہ اُسے براہِ راست ان سے لے کر لیں تھا۔ یہ مرثیے بھی محمولِ ثواب کے مقصد سے لکھے گئے۔

اردو میں مرثیہ نگاری فارسی کی تقلید میں شروع ہوئی۔ یہاں متعدد شعراء نے اپنے اعزاء و اصحاب اور عمائد قوم کے مرثیے لکھے، جن میں سے بعض مستقل اہمیت کے حامل اور ادبِ اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس صنف کو اصلی فروغ و ترقی ان شعراء کے بدولت حاصل ہوا، جنہوں نے اپنی عزیز شہداء کے اہل بیت کی طرح و نشا اور ان کے دردناک اور مینِ آئینہ حالات بیان کرنے میں مصروف کر دیں۔ ان کے سامنے یہ روایت تھی کہ کسی نے معاصیہ اہل بیت پر خود ماتم کیا، یا دوسروں کو ماتم کی ترقیب دی یا کم از کم اس کا اظہار کیا، وہ ثواب کا مستحق ہو گیا۔ اسی لیے ان شعراء نے ان شہداء کے کردار کی مغلطی اور مصیبت کے بیان میں زیبِ داستان سے کام لینے میں بھی کوئی معافہ حق خیال نہیں کیا۔ بشرطیکہ اس سے سامعین پر رقت طاری ہو، اور

کلمات چکیت میں توضیحی مرثیے ہیں، جو انہوں نے ملک کے شاہیر اور اپنے اصحاب کی موت پر لکھے۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

- ۱۔ ہمدرد گوگرداناؤ سے (۱۱ بند) (وفات: ۱۴ جنوری ۱۹۰۱ء)
- ۲۔ پرتاپ کرشن کرٹو (۲۱ بند) (وفات: ۱۹۰۳ء)
- ۳۔ احمد دھیا تھاکھا (۱۳ بند) (وفات: ستمبر ۱۹۱۱ء)
- ۴۔ گنگا پرست اورما (۱۹ بند) (وفات: ۲۳ جون ۱۹۱۳ء)
- ۵۔ شیخ ذراغ چکیت (۸ بند) (وفات: ۱۹۱۵ء)
- ۶۔ گوبال کرشن گوکھے (۱۰ بند) (وفات: ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء)
- ۷۔ بجن نرائن در (۱۶ بند) (وفات: ۱۹ نومبر ۱۹۱۶ء)
- ۸۔ اقبال نرائن سلاطین (۴ بند) (وفات: ۱۹۱۶ء)
- ۹۔ بال گنگا دھر تلک (۸ بند) (وفات: یکم اگست ۱۹۱۹ء)

یہ سب مرثیے مدمس کی شکل میں ہیں۔ ہندوستان میں مرثیے اپنے طویل

□ سی۔ ۵۰۳ ڈیفینس کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

۲ گنگا پرشا دورما:

کبھی کبھی مرنے والے کی عظمت کا اظہار یوں بھی کرتے ہیں کہ چوڑی نھنا اور ماحول کی کیفیت رنگ و رخ کا بیان کر کے اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اس مہرانی پر تمام عالم فوج نہاں ہے۔ چلیکتے گنگا پرشا دورما کے مرثیے میں یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

گنگا پرشا دورما ۱۳ اگست ۱۸۶۳ کو ضلع ہردوی (ہریانہ) کے قصبے جیلا کی کے ایک اچھے گھرانے جیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہان اور دھ کی ملازمت میں معزز جہدوں پر متمکن رہے اور وہ انجی داد و دیش اور دغا و عام کے کاموں میں دلچسپی کے لیے مشہور تھے۔

گنگا پرشا دورما نے فارسی اور عربی کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ وہ سماجی راجہ تھے اور بہت مددگار اور بہت سے بہت متاثر ہوئے۔ پنڈت مالویہ کو قورہ اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے۔ سماجی راجہ کبھی بھاسے میں کسی شہر یا قصبے میں آتے، گنگا پرشا دورما ضرور ان کی طوالت کو جانتے۔ بارہا سماجی جی لکھنؤ میں ان کے بھانجے بھی رہے۔

گنگا پرشا دورما کی وفات ۱۹۱۳ء کی ۲۳ جون ۱۹۱۳ء کی شب میں حال میں ہو گئی تھی۔ وہیں حالت بگڑ گئی اور ۲۳ جون ۱۹۱۳ء کی شب میں حال میں ہو گئے۔

چلیکتے کے مرثیے کا پہلا بند ہے:

کس کے ماتم میں یہ سہاں سیر ہوئی ہے

کچھ عجب طرح کی اسباب میں سرگوشی ہے

کیس سکتے ہیں، کہیں عالم بے ہوشی ہے

یہ تو مجھ ہے اور اس طرح کی خاموشی ہے

کون دل سر دھوا، غم ہوا نازہ کس کا!

قلم کے سامنے ہے آج جنازہ کس کا!

وہ مقدور کلمنٹ میڈل کیٹی کے صدر رہے تھے۔ یہ امر واقع ہے کہ نیا کلمنٹ بہت حد تک انہیں کی کوششوں سے تعمیر ہوا۔ کلمنٹ میں ان کے نام کی میموریل سوسائٹی اور مال اور صلاوگاہ الہ شہر کی طرف سے انہیں خدمات کا اعتراف ہے۔ چونکہ ان کی موت قیامت میں ہوئی تھی، اس لیے وہیں راہ منسلک کر دیا گیا تھا۔ کلمنٹ کے بیشتر اصحاب ان کی آخری رسوم میں شامل ہو سکے۔ نہ انہیں آخری دیواری نعیم ہوا۔ ایک ہندو میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

کلمنٹ کا بچے دم بھر گزارہ نہ تھا فراق

مرے اس حال کا لاش نہ ملا رہے تھا فراق

نے گیا کچھ کو پہاڑوں میں اچل کا قہر آق

رہ گئیں معلق آسمان کی نگاہیں مشتاق

دو قدم لاش تری دوش پہم دھرنے کے
آخری فتنہ محبت کا ادا کر سنے کے

گنگا پرشا دورما اپنے زمانے کے ممتاز صحافی تھے۔ "ہندو ٹائمز" اور "ہندوستانی" دو سر روزہ ہے ان کی ادارت میں شائع ہوتے تھے۔ انہیں آزاد مشقی اور بے باک نویسی کے باعث انہیں عوام میں تو مقبول ہونا ہی چاہیے تھا، اس کے ساتھ حکومت کے معلقوں میں بھی انہیں قدر و منزلت حاصل تھی۔

قوم کرتی تھی تھپ تھپی زبان سے مسہر یاد

بحث و فکر کیلئے میدان میں کلم تھا آزاد

تیرے اخبار دلائل گئے تیرے جوش کی یاد

دل کے ٹکڑے ہیں بھی اور یہی تیری اولاد

مرثیہ ان دوسرے ناک بندوں پر ختم ہوتا ہے:

یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے مرثیہ کا چین

اپنے بچوں کو چھاتی ہے زمین کی ناگین

داغ دیتا ہے مگر کب کوئی دل سبز وطن

اس کے صدمے سے لڑتا ہے یہ الہا ان کیٹن

جاننا رات میں جس وقت ہوا آتی ہے

قلم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

یوں ہی دنیا میں تھے الہ نظر دوتے ہیں

آنکھ میں اشک نہ ہو، قلب بگڑ دوتے ہیں

آدمی کیا ہیں شجر اور ٹھہر دوتے ہیں

پھیل فہم کی طرف نام و ذکر دوتے ہیں

جس کو انسان بھلا دے یہ وہ آزار نہیں

یہ وہ زخم، جو مریم کا طلب کار نہیں

۳۔ گویا ل کرشن گوکھلے:

گویا ل کرشن گوکھلے کی عظمت کا کچھ اندازہ اس سے کیجیے کہ جہاں گاندھی انہیں اپنا گورو مانتے تھے۔ حکومت ہند کے نائبین ممبر سرفیلڈ ڈو سن نے کہا تھا کہ چچی بات تو یہ ہے کہ صرف ایک آدمی ہے جس سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اور وہ میں سرگو کھلے۔ وہ گوکھلے کو ہندوستان کا گلیڈسٹون اور جرب جیٹھ کا لیڈر کہا کرتے تھے۔ لارڈ کرزن وائسرائے اپنے زمانے کے قابل ترین افسران میں سے تھے اور وہ کسی کو غلام نہیں لاتے تھے۔ ان کا قول ہے کہ کبھی لیڈر کوئی میں سرگو کھلے کی مدد اور چسپوز تقریریں ہی کو مسترد ہوتی ہے۔

گوٹھے کے کم معدول میں چھپے آدمیوں کی کئی نہیں تھی۔ جسٹس رانا ڈے سرفروزشاہ بہت، بال گنگا دھرتی، مسز ایچا جینٹ، سری نواس شاستری دفر و سب اسی مہر کے لوگ تھے۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ ہر ایک نے علم و علم، سیاست، قصصیت، خطابت کے میدانوں میں اپنے لازوال نشان چھوڑے ہیں، لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کو یہ پیر مٹا ہیر کی صف میں بھی دکھائے کا نام ہر درخشاں کی طرح بدھنی اور ضیا ہارے۔ وہ رانا ڈے سے بہت متاثر تھے، بلکہ سیاسی اور رفعا و عاتر کے کاموں میں انہیں اپنا گورہا ور رہنما مانتے تھے۔ دادا جی ناری بھی ان کے بہرو تھے۔ اور انہیں کی طرح وہ بھی انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت تک پہنچے۔ انہوں نے ۱۹۰۵ء میں بنارس کے اجلاس کو زینت بخشی۔

ان کی صحت بہت دن سے خراب تھی۔ علاج مایکے کوئی انا نہ نہیں ہوا۔ قوم کو دھڑکاؤ تھا کہ خدا خواست اس خادم ملک و ملت کا اخیر وقت اب دور نہیں۔ آخر کار وہی ہوا جس کے خیال سے دل کانپ رہا تھا۔ ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ دیکھیے جلالت ان کا مہرہ کیسے شروع کریں گے:

لرز رہا تھا وطن میں خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رونا ہے دیدہ تر سے

صدائے آتی ہے پھل بھول اور پتر سے
زمین پر تاج چرا، قزم ہند کے سر سے

مہیب قوم کا دنیا سے یوں ردا نہ ہوا
”زمین الٹ گئی، کیا منقلب زمانہ“

کسی کی معقوت منظور نہیں، لیکن جن اصحاب نے گوٹھے کی سوانح غری کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی اس دہائی کی سیاست پر غور کیا ہے، وہ جلالت کے مندرجہ ذیل شعروں کی صداقت پہچان کر گئے۔

بڑھی ہوئی تھی محنت زوال پہ۔ ہر قسم کی
تسہل و ہر قسم کی تسدیر قوم کی چمکی

لگاؤ یا اس تھی ہندوستان پر عالم کی
غیب تھی ستمی مگر روشنی ترے دم کی

تجی کو ملک میں روشن دماغ مجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ مجھے تھے

وطن کو قسے سوزا کہیں اب تو اب کے ساتھ
سحر کا ٹور بڑے جیسے آفتاب کے ساتھ

چنے رفاه کے کلّی حُسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشوونما کا نسب زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فنا ہے

مرثیے کا اختتام ان دونوں اور چار نثری مضامین پر ہوتا ہے:

اہل کے دم میں آنا ہے یوں تو اہل کو
مگر یہ دل نہیں تیار تر سے ماتم کو

بہاؤ مجھے میں دیا میں ایسے ہی عزم کو
دشاکے تجھ کو اہل نے مٹا دیا ہم کو

جنانہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سبک قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

وہ کارجہ زمانے میں یادگار ترا
وہ کونوں کے کہیں میں نہیں فرار ترا

جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا
خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا

پتی ہے قوم ترے سائے کرم کے تلے
میں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

۴۔ لوک مانیہ بال گنگا دھرتی گنگ:

تاک نہ صرف گوٹھے کے کم عمر تھے بلکہ ایک طرح سے ان کے بقا قابل اور حریف بھی تھے۔ گوٹھے (اعتدال پسند اور نائٹریٹ سیاست علیر دار تھے، تو تاک انتہا پسند اور گرم گروہ کے قافلہ سالار۔ اسی لیے زندگی بھر تاک اور گوٹھے کا ٹکراؤ رہا۔ لیکن یہ بعض طرح کا کار اختلاف تھا۔ دورہ دونوں کی منزل مقصود ایک تھی، اور دونوں ایک دوسرے کی حب الوطنی اور وطنیت کے بھی قائل تھے۔

اس میں ایک انتہا پسندی سیاسی غلیظت ”بال، پال، لال، لال پر ختمی تھی، یعنی بال گنگ دھرتی تاک، پال، چند پال اور لال لالیت رائے رنہ رنہ اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کا اختلاف اتنا شدید ہو گیا کہ جب ۱۹۰۷ء میں راجہ بانی گھوش کی صدارت میں کانگریس کا سالانہ اجلاس سورت میں ہوا تو کانگریس دو فریقوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس تقسیم کے لیے بہت حد تک تاک ہی ذمہ دار تھے۔

ملک کی پوری زندگی ہماری اور شرفیت سے عبارت تھی۔ وطن سے ان کی محبت دنیا کی ہر قوم کی کشش اور ترغیب سے بالاتر تھی اور آزادی وطن کی راہ میں کوئی بڑی بڑی قربانی ان کے لیے ناممکن نہیں تھی۔

انہیں پہلی مرتبہ ۱۳ ستمبر ۱۸۹۷ء کو کٹر فوٹو کے مقدمہ نقل میں ہندو پینتھ کی سزا ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ ان کے آخری وقت تک جاری رہا۔ وہ ”مرید“ اور ”کسیری“ دو درجہ داروں کے اندر تھے۔ اولان کے آتش بار اور بیوں کے ایلوان حکومت میں بھرتی خال سا بجا رہا تھا۔ یہ فو: ”سوراج میرا پادھنی حق ہے“ ملک ہی نے آزادی کے سوا کوئی دیا تھا۔

۸۔ ۱۹۰۶ء میں انہوں نے "کبیری" میں دو مضمون لکھے: (۱) "ملک کی ترقی" اور (۲) "یہ علاج متعلق نہیں، حکومت کی نظر میں یہ قابل اعتراض ٹھہرے۔ مقتدر چلا اور انہیں پھر برس کی جلاوطنی کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ یہ بورا مانہ انہوں نے ایک (برما) جیل میں گزارا۔ انہوں نے سبکدوش گیتا پرانی مشہور تصنیف "گیتا رسیہ" اسی قید کے دوران میں قلمبندی کی تھی۔ یہاں سے، ۱۸ جون ۱۹۱۳ء کو رہا ہوئے مگر ۱۹۱۵ء میں سرانجامی میسٹ کے ساتھ مل کر انہوں نے بوم رول ایک قلم کی، جس کا ذکر حکایت کے کلام میں اکثر ملتا ہے۔

جنگ آزادی میں ان کی آخری گرفتاری وہ تھی، جس سے رہائی کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں دوسرے افسر سپنے تھے۔ جہاں ان دنوں پنڈت نرمل لال تھرو کی صدارت میں انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ اس سے چند ہی ماہ قبل ۱۹ اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ بابا کا خونریز سانحہ ہو چکا تھا۔ جس سے پورے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ دھماکے اور ترقی کا یہ احساس کانگریس میں نہیں شیعان و جن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے وہاں منعقد کیا گیا تھا۔ جب تک وہاں بیٹھے تو پورے جیلے میں نیا جنس و خروش پیدا ہو گیا۔

لیکن انہوں نے اس کے بعد زیادہ دن زندہ رہا اور ملک کی خدمت جاری رکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔ ویدیک اگست ۱۹۲۰ء کو رہائی مل گیا ہوئے۔ انہیں ذرا اوقات کو سامنے رکھے ہوئے چھت کھتے تھے:

موت نے رات کے پردے میں کیا لیکھا دار
رہتی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غنبار

مگر کہ سرور ہے سو یا ہے وطن کا سرور
ظلمہ مشیر کا باقی نہیں، سوئی ہے کھپار
لے کسی جھاتی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تموار گری جاتی ہے

تھا مگجیان وطن وید یہ مہام ترا
"دگھن پاؤں" یہ تھا قوم کو بینام ترا

دل رقبوں کے لرزے تھے یہ تھا کام ترا
نہیں ہے چونک پڑے اس جو بیام ترا

یاد کر کے تجھے منسوب وطن روئیں گے
بندہ رجم و فاجہ میں سے اب سوئیں گے

زندگی تیری بہار چینستان و ف
آبر و تیرے لیے قوم ہے بیان و ف

ماشتی نام وطن کشہ ارمان و ف
مرد میدان و فاجہ و فاجہ جان و ف

ہو گئی تیر وطن، ہستی فانی تیری
نہ تو پیری رہی تیری نہ جوانی تیری

مرنے کا آخری بندہ ہے:

لاش کو تیری سوزا رہ نہ رفیقان کھن
ہو جس کے لیے منزل کی جگہ قاک و ف

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے ہوسے دامن
دیں اسی کا بچے خواب کے منسوب کفن

شور ماتم نہ ہو، بھونکا رہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھینٹ کو چست تیروں کی

یہاں شہیدوں سے جلیانوالہ بابا کے معقولین کی طرف اشارہ ہے۔ بھینٹ کی تلخ مباحثات کے جلیانوالہ بابا کے جو کہ روپ اوپا نوروں و دلوں کے بزرگ تھے۔

۵۔ پنڈت لشن نرائن در:

اس نوع کا آخری مشہور پنڈت لشن نرائن در کہ ہے۔ جو تادیبی ترتیب سے تو بال گنگا دھرتی کے پہلے کہے لیکن میں نے جو وہ اُسے سب سے آخر میں لینا پسند کیا ہے۔

چکیت کے تمام اثرات میں اس مشہور گواختاری حقیقت حاصل ہے۔ اپنی زبان، سلاست، روانی، قدرت جذبات — غرض ہر لحاظ سے نہ صرف ان کا بہترین مشہور ہے بلکہ ان کے بعد سے دیوان میں اس کے بہت کم نظیر ہیں۔ لشن نرائن در کے چکیت کے ساتھ تعلقات کے کئی پہلو تھے اور ہر پہلو بہت اہم تھا۔ اسی لیے انہوں نے ان کی عنایت کو غیر معمولی طور پر محسوس کیا۔ جس کا اظہار در کے ایک ایک مصرعے سے ہوتا ہے۔ پہلا بندہ ہے:

صدر مہم سے ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زبان، دل کا سہارا نہ رہا

گلشنِ علم و ادب کا جس آرا نہ رہا
مطلع دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

سب سے غم ایک طرف، ایک طرف ہم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہم اپنا

اس بند کی بیت میں ایک لوبل اسناد پہنا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ چکیت کے علم، ادبی، سیاسی بلکہ ذہنی انکار کی تفسیل میں لشن نرائن در کا بہت اثر رہا۔ سرتیج بہادر دیم و نے لکھا ہے:

"میں سمجھتا ہوں کہ اگر پنڈت لشن نرائن چکیت کے

خیالات میں پیشگی خبر گیری اس قدر جلد پیدا ہوئی، کہ اس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ان کی علمی اور اخلاقی زندگی پختہ تھی، لہذا ان درباری صاحب کی ذات ابرکات سے وابستہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ایک نظم میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

کیا زمانے پہ کھلے بجزی کا مری دار
ظاہر فکر میں پسید ا تو ہر اتنی پرواز

کیوں طبیعت کو نہ ہو پیروی عشق پہ ناز
حضرت آہم کے قدیموں پہ ہے یہ فرق نیا ز

فرخ پر کو کس اور سے شرف پانے کا
میں شرابی ہوں اسی زندگے میں پانے کا

حکایت نے پندت بھی نرائی در کی زندگی میں ان سے تعلق ایک مضمون لکھا تھا، جو ان کے مجموعہ صفات میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی وضاحت سے ان چیزوں کا اعتراف اور اپنی نیا زندگی کا اقرار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :-

”پندت بھی نرائی در کی زندگی ایک ایسے مردِ صالح کی زندگی ہے، جس نے علم و دولت اور ملک و قوم کی خدمت کو ذریعہ سمجھا، اور آزاد خیالی اور مابعد فلسفہ کو انسانی شرافت کا معیار بنالیا کیا۔۔۔۔۔ پندت صاحب موصوف اپنے صفاتِ قلب، حمیت و نیک نیتی اور صبر و استقلال کے لحاظ سے انسانی عظمت کی تصویر ہیں یا انہوں کو ان کی قدرت نے قوت اور استغنیٰ کے پتلے میں کسی جوج کی طرح چھو بند کر دی ہے۔۔۔۔۔ میں ہمیشہ سے آپ کو اپنا حسن اور شرفِ شہرت خیال کرتا ہوں!“

انہیں جذباتِ عقیدت کے باعث وہ چاہتے تھے کہ اپنا مجموعہ کلام پندت بشن نرائی در کے نام منسوب کریں، لیکن انہوں نے کلام کی اشاعت سے قبل ہی پندت صاحب موصوف سے رخصت کر کے عالمِ بقا ہو گئے۔ اس پر حکایت نے اپنے مجموعہ ”صبحِ دکن“ کی ابتدا میں ”نذرانہٴ روضہ“ کے عنوان سے ایک نظم کا اعتراف کیا۔ اس نثر کا ایک بند ہے :-

اب پس پیش کیے بانی تری ہستی کی مثال
دل کے مندر کا اسب لاسہ یہ تصویر کمال

تو کہ یہ روح کا سودا ہے، بلا خوف زوال
مگر اس خاک کے پھلے کی ہے تسکینِ حال

یاد مٹتی تیرے دھرت واسے ہم کو تسلیم ہوا آج، بیٹی کیا ہے

سے لعلِ لعلِ دھرت کے اور ہر شخص کرتے تھے۔

صرف انہی نہیں، وہ چہلچلِ نرائی در کے تعلق کو اپنا حاصلِ حیات اور عزیز ترین سرمایہ سمجھتے تھے۔ دیکھو، ایک ایک لفظ غلوں کی خوشبو سے جھک رہا ہے :

مجھ سے یا رانِ عدم نے یہ اگر فرمایا

حسرت آباؤ جہاں سے تجھے کیا ہوا تھا

میں کہوں مجھ کو کس اک دہر کا مل پایا

زندگی کی یہی دولت ہے، یہی سرمایہ

لے کے دنیا سے یہی مہرِ وفا آیا ہوں

اپنے حسن کی غلامی کی سند لایا ہوں

پندت بشن نرائی در ۱۸۶۳ء میں بارہ بجے (لوہی) کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پندت کشن نرائی پیشے کے لحاظ سے منصف تھے۔ جو اس زمانے میں ہندوستانیوں کے بہت بڑا اعزاز تھا۔ غرض کہ نرائی در وکیل تھے، بہت کامیاب وکیل۔ انہوں نے ولایت سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ اور ۱۸۸۸ء میں وکلہ میں اپنے گھرانے کے جہاد و جہاد جیف کرشمہ وکالت شروع کی۔ لیکن ان کے پیشے کے جزوقرور اور دھپے کی بدلی میں ان کی انسانی قدروں کو سرخ نہیں کیا۔ ان کے پیلوں پر اورد مدد دل تھا، جبر کسی کی معیبت پر حق کے آنسو رونے لگتا تھا۔ ان کی آمدنی کا بڑا حصہ غنیمت اور علانیہ خیرات کے ناموں میں صرف ہوتا تھا۔ عام ظاہر میں انہوں کو ان محاسن کی کیا خبر! لیکن انہی خوبیوں نے انہیں اپنے دوستوں کا محبوب بنا دیا تھا۔ حکایت کے ورثے کے یہ دو بند ہیں :

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشکِ محبت اکثر

جن پر مدد تھی زبانِ اور قلم کے چھس

دو بچے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیر وں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہر ہے کہ نرائی در کے یہ دیوانے ہیں

شعبہ دیکھیں، نالوس کے پروانے ہیں

دولتِ علم و ہنر سے نہیں دنیا عالی

بزمِ عالم کی یہ رونق تھیں جانے والی

پر ہے کتاب و جوہر، دھرت عالی

اوسیت کی بنا جس نے ازل میں ڈالی

کچھ بڑی بات نہیں فاضلِ دوراں ہوتا

آدمی کے لیے معراج ہے اس ازل ہوتا

پھر اس مضمون کا اعادہ کرتے ہیں :

چند کو معلوم نہ تھا دولت دنیا کیا ہے

جس کی شے ہے زوال کا سودا کیا ہے

خود پرستی کا زائے میں نقصان کیا ہے
عیش کیا چیز ہے، راحت کی تنہا کیا ہے

تو نہ سمجھیں غیبروں کی حد کے علم میں
اپنی راحت کا بھی سامان ہے اس عالم میں

ایسے انسان ہزاروں روز بیکار پیدا ہو رہے ہیں! اور جب شہیت انبوی
سے آپ کو کوئی ایسا شخص مل جائے، تو اس کی دائمی بھلائی کیوں کر شاق نہ لگے
گی! اسی لیے کہتے ہیں:

آدمیت کی یہ تصویر بیٹھی جاتی ہے
خونِ اطلاق کی تدبیر بیٹھی جاتی ہے

مذہبِ خیر کی توفیر مٹی جاتی ہے
ہمٹے جانے میں تقدیر بیٹھی جاتی ہے

دلِ اوس مبت کا عزا خانہ ہے

اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں اور انہی ہے

تعلیم کے دوران میں جب وہ اچھی ولایت بھی میں تھے، انہیں ہندوستان
کی تحریک آزادی سے وابستگی پیدا ہو گئی۔ واپس آئے تو اس میں پٹلی اور امانت
ہو گیا، اور وہ کانگریس کی سرگرمیوں میں مل جاتے تھے۔ ملک کے سیاسی
دعما اور کارکن ان کی دلچسپی و توجہ پر غور کرتے تھے اس سے عیاں ہے کہ وہ ۱۹۱۱ء
کے کانگریس کے اجلاس محلہ کے صدر منتخب ہوئے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔
کشمیری پریسوں میں سے تین افراد کانگریس کے صدر ہوئے: لیٹن زائن اور دیکلہ:
(۱۹۱۱ء) موتی لال نہرو (اندرس: ۱۹۱۹ء، کلکتہ: ۱۹۲۸ء) جواہر لال نہرو (لاہور:
۱۹۲۹ء، کلکتہ: ۱۹۳۶ء) لیٹن زائن اور ۱۸۸۰ء میں کانگریس میں شامل ہوئے۔
جب موتی لال نہرو ممبئی ۳۶ برس کے تھے (ولادت: ۱۸۶۱ء)۔ جواہر لال نہرو
ابھی عالمِ دہلی میں بھی نہیں آئے تھے (ولادت: ۱۸۸۹ء)

لیٹن زائن درگاہِ حق کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ تین دن اور صحت کی مثال جسم
تھکے لگے، حالت روز بروز بدستور ہو رہی تھی۔ ایسے میں بھی جب جان کے لئے پڑے
ہوئے تھے، اور ان کے ارد گرد کے لوگ ان کی حالت زار دیکھ کر دم توڑتے، انہیں
اگر کسی بڑی فکری شخصیت تو ملک و ملت کی، غریبوں اور محتاجوں کی ایسی کی طرف چمکتی
انداز کرتے ہیں:

بے تکلفی تری ہستی کے سارے کا زوال
وہ شہنشاہ کی ماسی، وہ مرلہ کا بھونچال

تب بھی تو سوائے وطن تھا، ترے جیسے مکان
خون تھے تیرے، موت کا آیا نہ خسیال

کابش تن سے طبیعت کی جلا کم نہ ہوئی
دشمنِ شمع کی ٹکھنے سے ڈرا کم نہ ہوئی

تجہ کو لیک کیوں! یا عالم! کالا کاسفیر
مٹا الگ اہل جہاں سے تری مٹی کا خمیر

آج دنیا سے دنی کی جوہری دامنگیر
کیا سبب روح کو لینا تھا یہاں رکھ کر

کیا اسی طرح فطرت کی صفت ممکن تھی!
کیا اسی جگ میں جینے سے جلا ممکن تھی!

ان کا ۱۹۱۵ء میں انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت عمر صرف ۵۶ برس کی تھی۔
ظاہر ہے کہ ہر صاحبِ دل کو ایسے برگزیدہ شخص کے انتقال اور نقشِ قدم پر چھٹی جھڑپ
ہوگی۔ اسی لیے مرثیہ کا خاترا ان نظموں پر کرتے ہیں:

دل ہو تیرا سا تو دنیا کی حقیقت کیا ہے!
تو پڑتی ہو جوہرِ موت، وہ دولت کیا ہے!

فیر حوس سے نہ راحت ہو، وہ راحت کیا ہے!

جس میں سودا نہ ہو کچھ بھی، وہ طبیعت کیا ہے!

زندگیوں کو فقط مانی بھلا نہ ہے

مردہ وہ ہے جو کسی رنگ میں دلہا نہ ہے

عام طور پر قصیدے اور مرثیے میں شاعر مدح و انتہا کا ذکر ایسے عمری اعزاز
میں کرتا ہے کہ کچھ نہیں کہتا، کس کی مدح و ثنا کی جا رہی ہے یا کس کا مرثیہ لکھا
گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں جو افعال استعمال کیے جاتے ہیں، ضروری نہیں کہ
وہ موصوف ہی سے مخصوص ہوں، بلکہ ان کا اخلاق کسی شخص پر بھی کیا جاسکتا ہے۔
آپ نے ملا علی قلی کو ہر گاہ کہ چمکتی نہ اپنے مرثیوں میں مرنے والے کا ذکر کیا الفاظ
میں کیا ہے، اور اس کی جو صفات بیان کی ہیں، وہ واقعی اس کی خصوصیات ہیں وہ
کسی اور پر منطبق نہیں کی جاسکتیں۔ اس سے جہاں خود چمکتی کا ذاتی علم اور اس
سے عروج سے غلوں عیاں ہے، وہیں اس سے ان مرثیوں کی اثر افزائی میں بھی
ہضافہ ہو گیا ہے۔

غرض یہ مرثیے بقامت کبر اور بقیت بہر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ یہ ایک اور
نماز سے بھی قیمتی ہیں۔ اگر آپ کو کسی شخص کے کردار و حالات اور عادات کی واقفیت
حاصل کرنا ہے، تو یہ دیکھ کر کہ وہ دوسروں کی کون سی عادات کی تکمیل کرتا ہے،
اور ان کے کون سے اعمال اس کی نظریں پسند فرمے اور قابلِ تخریف ہیں۔ یہ بات
اس کے دل کی آواز اور اس کے کردار کا نیند ہوگی۔ اس سبب سے ان مرثیوں کا مطالعہ
کیا جائے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چمکتی خود کتنے جلد وقت انسان اور مصروف
خلق، حب وطن، علم و دینی، اصلاح معاشرہ، ترقی پذیری کے دلدادہ اور
مذاہبی تھے۔

مذاہمت کند اہل عاشقانِ پاکِ طینت را

● ●



چلبست کی شاعری میں منظر نگاری

پر کوئی فرق اور اثر نہیں پڑتا۔ مزید عربی میں منظر نگاری کے کامیاب نمونے ملتے ہیں بلکہ منظر نگاری کے فنی پرہیز پور ہشت و تیس بھی ملتی ہے چنانچہ مراۃ الشرا میں عبدالرحمن نے ابن رشیق کے حوالے سے نقل کیا ہے جس سے صحنی یا عروسی کے ساتھ ساتھ معنوی اور مصوری شاعری پر روشنی پڑتی ہے ملاحظہ ہو:-

”الشعر اذا قلّ سراج الى باب الوصف ولا يميل الى خصوصه واستقصائه وهو مناسب للشيئين وليس به لانه كثير فاقا في اضعافه والصرق بين الوصف والتشبيه ان هذا اختيار عن الحقيقة وان ذاك خيار وضميل“

اثر مستشانتہ نقل کے سبب وصف میں داخل ہے اور حرواح اس کی اصناف کا نام لے رہے۔ وہ تشبیہ سے ملتا جلتا ہے لیکن تشبیہ نہیں اس لیے تشبیہ اکثر وصف میں آتی ہے۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ وصف خبر ہو تبھی کسی حقیقت کی اور تشبیہ محض مجاز و تشبیل دراصل مزاحی اور فطری مناظر ایک ہی ہیں جسے مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس ذیل میں محسن العلماء مولوی امداد امام اثر کا بیان پڑا بصیرت افزا دوسرے ملاحظہ ہو:-

”شاعری دو قسم پر تقسیم پاتی ہے۔ یعنی شاعری مطلق بہ عالم خارج سے بر زبان انگریزی آؤنگیو (Objective) اور شاعری متعلق بہ عالم ذہن جسے زبان انگریزی سبجٹیو (Subjective) کہتے ہیں۔ اول فطری شاعری جس کا نام خارجی رکھتا ہے، ایسے بیانات پر مشتمل ہے جن سے عالم فی الخارج کے مسائل پیش نظر ہو جاتے

منظر نگاری کی تعریف و توصیف کے ذیل میں ہمارے نامہ دین نے مختلف انداز فکر کے کام لیا ہے۔ ہر شخص نے اپنے طور پر لکھا اور ہر نامہ دین نے فطرت نگاری کو منظر نگاری تصور کیا ہے اور کسی نے پچھلے شاعری تصور فرمایا ہے۔ انگریزی ادب کے بارگاہوں نے بھی کسی ایک تعریف میں یقین نہیں کیا۔ چنانچہ ہڈسن نے منظر نگاری کے لیے Treatment of Nature کا مفہوم پیش کیا ہے۔ اسی البتہ نے

یہی لفظ رواد رکھا ہے۔ منظر نگاری کے ذیل میں N.H.Nic

نے - Prof. Love Joy کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ اس لفظ کے متعلق انگریزی میں یہ معنی استعمال ہوئے ہیں کسی نے Naturalness کو کسی نے Noble Nanog مراد

لیے ہیں اور بعض حضرات نے External Nature کے

تعبیر کیا ہے بلکہ ہندی کے ادب نے

کہا ہے۔ سنسکرت میں بھی منظر نگاری کی علامتیں ملتی ہیں۔ ح-ص

طور پر کالی داس کے ڈراموں میں

و غیرہ میں بہت سے منظر بہ شاعری ملتی ہے۔ معلوم نہیں

کیسے یہ لوگوں نے فرض کر لیا ہے کہ عربی اور فارسی میں منظر بہ شاعری

نہیں ہے یا نہیں کے برابر ہے۔ دراصل منظر بہ شاعری کو صحنی شاعری

کے ذیل میں جب رکھا جاتا ہے تو اکثر فن کے پیش نظر اس کی توجہ

تشریح اور توجیح میں عموماً ذہانت و فرق ضرور ہوجاتا ہے لیکن بعض مضمون

1. Under-currents of influence in English

romantic poetry by Margeret Shetwood P. 3.

2. Mountain Gloom and Mountain Glory by N.H.Nicolson Page. 12.

لہ مراۃ الشعر - مرتبہ عبدالرحمن صفحہ ۲۵۵ مطبوعہ اردو اکاڈمی کھنوا ۱۹۷۸ء

ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر یہ لفظ "رزم، بزم، جلوس، مژدک، اشقام، ہستین، باغ، قصور، چمن، گلزار، سبز، زار، لالہ، نار، چمن، ہوا، برقی، باران، سیل، برف، شفق، بحر، شام، روز، شب، شمس، قمر، سیاسے، ثوابت، قطب و برج و دیگر حرفی امشیہ کے متعلق ہوتے ہیں۔" لے

مندرجہ بالا بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ منظر پر شاعری کتنی وسعت کی حامل ہے، لیکن تاریخ اس بات کی شہادہ ہے کہ اردو شعرو ادب کی قبول تاریخ کی روایت میں منظر نگاری کی طرف کم ہی توجہ دی گئی ہے۔ اس کا وہ اجماع سبب تو یہ ہے کہ اردو شاعری بہت عرصے ہی عزل کے مزاج سے مناسبت رکھتی رہی اور عزل میں منظر نگاری کی ذرا کم ہی گنجائش ہے۔ اس وجہ سے شعرا نے داخلی کیفیات کو پیش کرنے میں زیادہ سگری دکھائی ہے۔ فارسی شاعری کی طرف بعد میں اذبان و افکار منتقل ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ منظر نگاری اس میں انگریزوں کی بھی چوک ہوئی تو مصنف کی کیفیت سامنے آتی ہے۔ منظر نگاری کے لیے یہ شرط ہے کہ شاعر نے جس منظر کو پیش کیا ہے اسے دیکھ بھی ہوا ہو یا ویسی ہی کیفیت پسند کر دی ہو جس کی اصل منظر میں ہوتی ہے۔ انگریزی شعرا نے منظر نگاری میں یہ امتیاز برتی ہے۔ چنانچہ روز و رات، کھٹس، اور مینیسن وغیرہ نے مناظر قدرت و فطرت سے اپنے فن کو ہم آہنگ کیا ہے۔ لیکن ان سب میں سروسامان کا شک کو اخلاقیات حاصل ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا نئے حسن اور صداقت کے امتزاج سے شاعری کو فائدہ پہنچا ہے۔ اس کا نئے لیے پیشہ ہو رہے کہ وہ مختلف چوہوں کا مشاہدہ، مطالعہ اور تجزیہ کرتا رہتا تھا۔ انیس مدت میں مدد یک دیکھتا اور مختلف اوقات میں ان کی رنگینی، رُوب اور دل کشی کو محسوس کرتا تھا اس کے بعد انھیں تشبیہات و استعارات کے طور پر نظر کرتا تھا جس سے اس کے کلام میں منظر نگاری کی جتنی اور حقیقی رنگینیاں ملتی ہیں۔

منظر نگاری کے احوال میں نواد اور ہیئت کے رابطے پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے۔ سادہ یا بغیر تصفہ کے صرف طول کلام کے لیے منظر کشی بھی عیوب قرار دی جاتی ہے۔ اکثر بغیر منظر ضروری مناظر پیش کرنے سے متاثر ہونے پر توجہ تھی۔ مختلف مناظر کی عکاسی لطف و حظ اور سروسامان حاصل کرنے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔ جن میں مقامی اور ارضی منظر کی روشنی میں کوئی کی کو، قمریوں کی باؤ، اور پیچھے کا مستارہ الپ بھی سنائی

لے۔ کاشف الحقائق، شمس اعلا مولوی احمد امام، ج ۱، ص ۷۲

دیتا ہے۔ کیجئے ہوئے سبزہ زار، کیجئے ہوئے دشت گلزار کی نظر کیجئے ہیں۔

حسن و جمال کی دل کشی انسانی فطرت کا حصہ ہی ہے اور قدرتی مناظر سے زیادہ حسین اور دل کش کوئی بھی منظر نہیں ہو سکتا۔ ایک پتلا اور اعلیٰ فطرت کا مطالعہ دیدہ دل کی روشنی سے کرتا ہے اور اس میں حسن کی لازوال اور ابدی قدر میں انگریزوں کی بھی ہوتی نظر آتی ہیں جس سے روح کو سکون اور قلب و جگر کو نور ملتا ہے۔ وہ فطرت کو بھی روحانیت کا پسیر رکھتا ہے اور کبھی محض طور پر عروس کو سے تعبیر کرتا ہے جس کا کھنکھان، ہنسنا، حفاظ و خیام نظر آتا ہے۔ کھیاں زیر لب نغمہ ریز اور طائران خوش الحان عزال خوانی کرتے ہیں، ہر روش پر فخر و غرور جھوٹ جھوٹا ہے۔ اور واضح ہے کہ ایسی ہی لائقہ اور تشبیہات و استعارات کی عکاسی اور توضیح کے لیے منظر نگاری کی اہم ضرورت ہے اور اردو شاعری میں اسی غرض و غایت سے اس کا رواج بھی ہوا جو حالات اور ضروریات کے تحت اپنے پیرہن بدلتی رہی، کبھی "استخوانی" کبھی "تاریخی"، کبھی "اسطوری"، کبھی "علاقائی"، کبھی "مصورانہ"، کبھی "برائے تصفہ اور برائے اعتراف کی فطرت استعمال ہوتی رہی ہے جس میں فطرت کی ہمدردی کا نظم اور بھی نمایاں ہوتا رہا ہے

یوں تو اردو کے سبھی شعرا نے ابتداء سے ہی بغیر کو گنگے لگایا ہے اور انھیں بند کر کے شاعری نہیں کرتے ہیں۔ سگری و صحنہ خاص چننے شاعر کے یہاں زیادہ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ فہرست طولیوں جو بے کلام ہے مگر کلی تقبہ، ہفت، نظری، ولی، نظیر، سودا، امیر، انشا، ذوق، غالب، مومن، امیر، سروسامان آبادی، امیر، مینائی، غنیمت، کا کوئی، عزیز، کھنوی، امین، و دیگر، مرشد، عشق، تیش، عروج، نفیس، آزاد، حسانی، انبیا، چغتائی، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری وغیرہ کے نام ضرور یاد کیجئے۔ لیکن سب سے زیادہ نظیر اکبر آبادی، امین، رشید، انبیا، جوش ملیح آبادی، سروسامان آبادی اور چغتائی نے توجہ کی ہے۔ چغتائی کھنوی کی منظر پر شاعری پر براہ راست میرا میں اور دیگر مرثیہ گو شعرا کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ گو چغتائی امین اور انبیا جیسی منظر کشی پیش کرنے میں توجہ ہے جن کا غرور اوقات یہی گمان ہوتا ہے کہ ایک صورت پرش سے تصویر کشی چاہی جاتی ہے۔ انھوں نے فطرت کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور فطرت کی کیفیات کو اپنے قلب و فطرت میں امارت ہے۔ ان کی ایک نظم "سیر در درہ دون" کا منظر منظر ہو۔

ہیں، بہار کا پہلے پہل ہوا عاتشگون
جیبِ خطہ دل کش ہے سیر دہردون
کیا نہیں اسے غارتِ بشر کی صنعت نے
یہ سبزہ زار کھلا یا بعدِ ستِ قدرت نے
سپرد ابر کے ہے انتظامِ پانی کا
ہوائے سد کو ہے حکمِ باغبانی کا
تمام شہر ہے گردِ غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے ہر طرف ہے ہریالی
باس پہنے ہیں گلِ خشت و سنگِ سبزہ کا
بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگِ سبزہ کا
ظلمِ شمن کا ہے بیچ میں یہ مغل دستہ
کھڑے ہیں کوہ و شہر پہلوں میں صفِ بستہ
یہاں جو آگے شرفِ قیام کرتے ہیں
یہ سنہری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں
بندہ یوں سے جو ہو مسائلِ نشیبِ نظر
فریب دیتا ہے ہندی کا بیچ و خمِ اکثر
نگو گو دور سے پانی ہے جو نظر آتا
سفید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

اس تقسیمِ کدو نشینی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چکیت انسانوں
اور مشینوں کے ذریعہ جو قدرتی مناظر غارت ہو رہے ہیں اس بات سے کافی پریشان
اور متفکر ہیں۔ ان کی نگاہ میں حقائقِ کائنات کی اس وسیع و عریض
دھرتی پر قدرت اور قدرت کے اصل منظر اور رفتے ہی دل کشی
کا سامان فراہم کرتے ہیں یہ "سیرِ رہبرہ دون" کی شلابِ خفاشیں
پانی کا بل کھاتا ہوا چمکانا، بسیرِ سانپ کا گمان ہوا، کتنا دل کش اور
دل فریب منظر ہے جسے چکیت کے قلم نے پیش کیا ہے۔ یہ نظم اردو
کی منتظرِ پرشاد ہی میں بڑی ادا دیت کی حامل ہے۔ چکیت اس
طرح کی منتظرِ شری میں مگن ہوئی رکھتے ہیں۔ چکیت کشمیری پر جس قدر انھیں
کشمیر کے آڑے آڑے سے دیا ہوا ادا، عقیدت تھی۔ چنانچہ ایک
عزل کے شعر میں بھی یہ کہہ جاتے ہیں کہ

دورہ دورہ ہے میرے کشمیر کا مہاں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی بھجھے

اس میں بھی منتظر کشی ہے۔ راہ میں پتھروں کا لکنا، دراصل
پتھروں کے ٹکڑوں کا پانی دینا ہی معلوم ہوتا ہے۔ چکیت کوئی
کشمیر کے بیان میں بہت بوجھتا ہے اور اس قدر کا سیلاب

معموری کرتے ہیں کہ دلِ شاو دوسرہ ہو کر وجد کرنے لگتے ہیں۔ ان
کی نظم "کشمیر" کے پسند منسوب بندہ لاطفہ ہوں۔

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا
پتھروں سے پہلوں کے وہ اڑنا ہوا چمکانا
گلے ہوئے لاجوں کا وہ کشتیاں کھینا
دل کا وہ سدِ شام ادھر کر دینا

وہ کس چراغوں کا جھلکتا نظر آتا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آتا
لاصح کو کہار کے پہلوں کا بھگنا
وہ جھڑیوں کی آڑ میں پتھروں کا چمکانا
گردوں پر شفق، کوہ پر لالے کا لکنا
سنتوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بھگنا

ہر پہلوں کی جھن سے عیاں ناز پر کی
چلتا وہ دیے پاؤں نسیمِ سحر کی
وہ طائر کہار، لبِ چشمہ کہار
وہ سد ہوا، وہ گرم ابر گلہر بار
وہ میوہ خوش رنگ، دوسرہ سبز چمن زار
اک آن میں صحت ہو جو، برسوں کا ہو بیمار

یہ باغِ وطن روکش گلِ نازِ جلال ہے
سرمایہ نازِ چمن آرا ہے جہاں ہے
چکیت نے ان بندوں میں واہ کی کشمیر کی رعنائوں کو بکیر دیا
ہے۔ دلِ لیک کا دلِ فریب منظر، پہاڑوں پر سنتوں کی طرح ابر کے
ٹکڑوں کا بھگنا، وہ طائر کہار، لبِ چشمہ کہار، عجیب
طرح سے روح کو گرماتے ہیں، چکیت نے اسے ایمانہ ادا کی ہے نظم کے
پیمانے میں ڈھال دیا ہے۔ ہمارے اردو کے بہت سے شعرا نے
واہ کی کشمیر پر نظمیں ہی ہیں لیکن چکیت نے ایک عجیب کیفیت طاری
کر کے نظم کی ہے جس سے پڑھنے والے پر بھی نوعیت طاری ہو جاتی
ہے۔ کیونکہ اس میں فطری تصویریں قلم کے سہاے اور لفظوں کی مدد
سے اجاڑی گئی ہیں۔

چکیت نے اپنی نظم "عصف الدولہ کا امام بارگاہ"، "رامائن کا
بین" اور "کرشن کشمیر" میں بھی کا سیلاب منظر نگاری کے نمونے
پیش کیے ہیں۔ "رامائن کا بین"، چکیت کی وہ نظم ہے جس پر انٹرنیشنل
کا گمان ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:-

(آگے مشاہیر)

۱۹۰۵ء کے بعد چکیت شرسہ کے بارے میں تقریباً دس سال اور سائی کے بارے میں کم از کم تیرہ سال کا خاموش سہہ بکھرا وہ ان دونوں مشاہیر کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

(۱) "اودھ پکا آخری یادگار مگر گلزارِ ایشم کا مباحثہ ہے۔ اس کی ابتلا اس طرح ہوئی کہ کھنڈ کے شہور افسانہ نویس مولانا مسعود نے گلزارِ ایشم کی زبان اور شاعری پر افرامیں شائع کیے اور اسی کے ساتھ تاریخی حیثیت سے یہ بھی لکھا کہ یہ مثنوی اصل میں آتش کی تعریف ہے، ایشم کا نام مثنوی فرضی ہے۔ اودھ پکا نے اپنی ہائی وٹس کے مطابق ان افرامیں کا خاکہ اڑا دیا اور سب سے بڑی گرفت یہ کی کہ اگر مثنوی آتش کی تعریف ہے تو اس میں زبان اور معادسے کی شرمناک غلطیاں کس طرح نظر آتی ہیں۔ مولانا شرسہ اس شارے کو کافی نہ سمجھا اور اس عنوان سے جواب دیا کہ فریقین کی طبیعتیں جوش پر آمیز ہیں۔ اور اودھ پکا کی کجی ہوئی ہنگ لکھی اسی سبب کی کہ اس کی کجی دُور دور تک پہنچی۔ گلزارِ ایشم کا قصہ تو درکنار رہا، مولانا شرسہ کی زبان وافی اور شکر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے اور اسے ملک نظر دشر کی کچھ بڑی جھوٹا کہیں۔ یہ سلسلہ بھی سال بعد بدلتا ہوتا تھا۔ اس بحث کے فیصلے تک علاوہ انھیں معصوم کے متعلق جو مضامین نکلے ان میں شرسہ کی زبان و معادسے کی تحقیقات کا خاص مصلحت بخیر ہے۔"

(۲) (مضامین چکیت ص ۲۲۳) ماخوذ از گلزارِ ایشم (۱۹۰۵ء) "اردو زبان پر مولانا حالی کا جوا احسان ہے، اس کی یادوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے آزاد بندی کو زمانے کے ساتھ اردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہتے اور یہی بات تاریخی، مگر ایسے انگریزی داں اصحاب کی بددوسے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موسوی نے قائم کیا اور جس کے ساتھ میں اردو شاعری کو ڈھانسا گیا وہ اس عیب سے خالی نہ تھا، میں کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ اس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کمزرت سے پایا جا سکتا ہے۔ مولانا ایک دہائی اس وقت کشمیلہ لادائی گئی تھی دھونے کے لیے اے رخسارِ حجاباتی کپڑے پہ سے مہکتا ملک کا دھبہ بابتی دھوٹوں کے کپڑے کو پہنا تھا نہ رنگا دھبہ پہ کپڑے پہ نہ کسبشہر بابتی

مرزا محمد شفیع شیرازی لکھتے ہیں :

"مجیدہ مضامین کے علاوہ جو مضامین اودھ پکا میں چکیت کی ڈاک کے سلسلے میں اصل کے خطوط کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں وہ بھی لوگ جناب چکیت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہم کو ذاتی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مضامین مذکورہ جناب چکیت کے لکھے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔"

مباحثہ گلزارِ ایشم ۱۹۱۳ء میں کھنڈ سے شائع ہوئی اور بہت مشہور ہوئی۔ چکیت اس کی اشاعت کے بعد ۱۳ سال تک اسی کھنڈ میں زندہ رہے۔ اس کے بعد یہ شبہ بے بنیاد ہے کہ یہ خطوط چکیت کے لکھے ہوئے نہیں !

چکیت کی پہلی کڑی اول اول در ایسے ادیبوں کے خلاف تھی، جو شہر و وقت میں سے تھے یعنی مولانا شرسہ اور مولانا حالی۔ چکیت کا پہلا معنیوں "پنڈت دیاندر کول" تھیں جب تکچیر درپن کے فروری ۱۹۰۳ء کے شمارے میں چھپا ہے، اس وقت چکیت کو اپنی عمر کے ۱۳ سال پورے کیے ہوئے تھے ایک جہیز بھی نہیں مورا تھا وہ حالت۔ اسے اس کا رکھتے تھے اولیٰ حالات میں مبتلا تھے۔ پھر سے بی۔ اے میں داخلہ لینے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ غالباً یہ معنیوں یعنی پہلا شرسہ یا اسی ہی حالات کے فرسٹ کے دنوں کی دین تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ مثنوی شاعر تھے، نظم کے شاعر۔

۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء کو اودھ پکا میں چکیت کا ایک مزاحیہ معنیوں شائع ہوا۔ پھر چکیت نے ۲۳ سال کی عمر میں مثنوی گلزارِ ایشم مرتب کیے کے شائع کی۔ اس کے آخر میں انتخاب دیوانِ ایشم شامل کیا اور شرسہ میں ایک مہبوط دیباچہ لگا یا اس دیباچے کے بنیادی نظریاتی دو معنیوں تھے : (۱) پنڈت دیاندر کول ایشم اور (۲) مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا۔

جیسا کہ پہلے دیکھا یا جانچا ہے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی چکیت کا لکھا ہوا "آتش کا بارہواں خطہ شرسہ کے نام" تھا۔ یہ ۱۹ نومبر ۱۹۰۵ء کو اودھ پکا میں شائع ہوا تھا۔ گو یہ ۲۴ سال کی عمر ہی کی عمر کے پہلے ہی چکیت اس ہنگامے کا اپنا معیار قرار دیتے تھے، اگرچہ کچھ معنیوں نگار چند سے اور بھی اچھے تھے۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جہاں چکیت ان مضامین میں اپنی عداوت و ملامت اور متانت کو بروئے کار لا کر خاص و عام پر اپنا سکر بھلائے دکھائی دیتے ہیں، وہاں ایک فریبے اور کچھ سبب دوسرے نیز عداوت چکیت کا تاریخی جوڑے نظر آجاتے ہیں۔ بیان کی نوعیت کی دین ہے۔ معنیوں لوگ ان کے طرز استدلال کی مضبوطی کو دیکھ کر کچھ پر مہو ہو رہے تھے کہ یہ چکیت کے پیشے یعنی وکالت کی وجہ سے ہے۔ مگر یہ درست نہیں کیوں کہ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی اہل اہل بی اے صرف داخلہ کیا تھا۔ وہ کرکلی ۱۹۰۶ء میں بنے۔

جوں وال ان دوشعروں میں نظم کیا گیا ہے، وہ نہایت اعلیٰ درجے کا اصولی اصلاح کار کر رہا ہے، مگر انہی خیالات کا طریقہ شاعر نہیں ہے۔ اگر پاکیزہ و سلیس نثر میں یہ خیالات ادا کیا جائے تو اس نظم کے زیادہ دلی کششیت ہوگا۔ ہمیں انہیں سے گھبراہٹ ہے کہ مولانا عافی نے اُردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اصولی اصلاح کو یہ نظر نہیں رکھا۔ اُردو شاعری کے داستان جو داغ اور دھبے تھے، انہیں اس طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ داغ دھبے اتاری رہے نہ دامن کا ایک تاریابی رہا۔

(مضامین چلبست ص: ۲۶۶ - ناخیز اذاد دوشعروں کی صحیح امتیاد نمبر ۱۸۹)

ان دونوں اقتدار سے ظاہر ہے کہ باوجودیکہ چلبست کی عمر ۲۴ برس سے تجاوز کر چکی تھی اور ان کا فوجی اہلکار ایک فتنہ بار میں بھیجا تھا، وہ اپنے موقف سے گناہ کش نہیں ہوئے نہ شاعر کے معاملے میں نہ عافی کے۔

چلبست صاف اول کے شاعر ہی نہیں تھے، اپنے عہد کے اچھے نقاد بھی تھے۔ مباحثہ نگار پرستیم ان کی تنقید نگاری ہی کا ہر نام ہے اور اوپر لکھے ہرے مضامین اور اس سلسلے کی دوسری تقریروں کے معاملے سے قاری ایک ہی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس ادبی جنگ میں شرف سے آخر تک چلبست کا پلہ بھاری رہا۔ اور انہیں معنون اور ادبی میدان دونوں کے گناہ سے انہیں کو فتح حاصل ہوئی۔

ب۔ سوانحی، تنقیدی اور متفرق دیباچے پر پرتا اور مضامین

ان مضامین کی تعداد ۲۱ ہے۔ اور انہیں ذیل کے خانوں میں بانٹا جاسکتا ہے:

سوانحی:

پنڈت پران ناتھ سرموتی، پنڈت رحیمون ناتھ بہر پور، پنڈت رتن ناتھ سورسٹار، لکھی رام سرور، دادا کھائی نوروی، پنڈت بھتی نرائن دت، منشی سید محمد عیسیٰ رحیم، مرزا محمد بیگ سم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جلال پورشاہ برقی، نواب مرزا محمد بڑیلعلی عروج۔

سماجی اور تنقیدی:

- ۱۔ کلام اقبال ۲۔ رعایت عافی ۳۔ داغ ۴۔ تاریخ ۵۔ ایک یادگار مشاعرہ ۶۔ اودھ پچ ۷۔ اودھ شاعری ۸۔ بھارت درپن

۹۔ ذات کی تعریف:

متفرق:

اندیشہ کا نظریہ کیا گیا اور اجلاس:

جلد سالانہ تقریریں ایک مضمون میں چلبست کی تقریر:

کلمہ کا نظریہ پر ایک محسوس نظر:

دیباچہ "لوگوں کی تقریریں"

"صبح امتیاد" کا مسلک۔

مضامین پڑھنے کے بعد جو پہلانا اثر قائم ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ چلبست ہر موضوع پر قلم اٹھانے پر قادر ہیں اور اپنی زبان، طرز بیان اور صفاتی حالات کو ساتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ نفس معنوں کے مطابق اپنی تحریر کو فعال کر دیکھ کر بنا لیتے ہیں۔ مثلاً ان کے تمام سوانحی مضامین متنوع نہ ہونے کے باوجود صوفی اور باغی ہیں۔ بعض مقامات میں کی عدم موجودگی میں تشبیہی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ ان حضرات میں بیشتر سبب انسانی بھی نکھار جاتا تو اگر وہ اب ان کو کوئی نام دیا ہی نہ رہ جاتا۔ ان مضامین میں تنقیدی اور ادبی چاشنی موجود رہتی ہے اور بعض جگہ قرائن پر درازی کی گمان میں۔ پنڈت رحیمون ناتھ بہر پور جو صرف ۳۹ سال کی عمر میں فوت ہوئے تھے، چلبست اس طرح رقم زد ہیں:

"ذوقِ رحیم کی تربت کو خدا عزیز کرے۔ کیا دردناک دل پایا تھا۔ ڈھلے ہی ۵

کھل کے کئی کچھ تو بہار جلاں فضا دکھائے

حسرت کن غمخوار ہے جو بھی کچھ غمخوار ہے

یہ شعر ان کے سون کا مرتبہ ہے جن کا چارچہ ہستی سرشت نام نکل

ہو گیا اور جو دنیا سے تاشاودا مارا گئے۔ چنانچہ یہ جلال گنگ

جس کا نام زیب عنوان ہے، انہیں رحمان غیبیوں میں

ہے، جن کی زندگی کی بہار ماں فضا پر قبل از وقت دوس

پڑ گئی۔"

ان ابتدائی سوانحی مضامین میں ادبی تنقید یا تنقیدی انشا پر درازی کا نود بھی دیکھ لیتے:

"فسادِ اُلوٹاٹھ جیتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ غفلت کی

نئی تراش، ترسیوں کی خوب سرموتی، کلام کی کرکھی، مضامین کی

خوشی، طرزِ تحریر کی نزاکت، جواب و سوال کی دل جو نزاک

زبان کی پاکیزگی، جامعہ کا صفائی، روزِ مرقہ کی طمانت طمانت

کی گھٹاوی، تراشوں کی نئی بچہن، ایجادوں کے پانچینے گھٹا

کو حضرت سرشار کا وارو شیدا بنایا۔ اور وہیں ایسے فسادے کا

شائع ہوا ایک ایسی بات تھی.....

حضرت سرشار نے اس میں لکھو کی کئی کئی تہذیب کا نقشہ

کھینچا ہے۔ اس میں لکھو کی اس کی ہوتی حالت پر

کئی ایک عالم ہے.....

میرے دوستو! بیان کی خاک کو یہ فخر حاصل ہے کہ میں بھی کچھ

ایہوں اور شہزادوں کی آنکھ کا مرمر بنی ہے۔

جیسا کہ بڑا چاہئے شروع شروع میں ہی رشتی کے باوجود چکیت کی نشے کی پانے

اسلوب پہنچے۔ انہوں نے عقلی و فطری کئی آزاد کا اثر بھی دیا اور دنیا کو آج کل

کے بیشتر لفظ رکھتے ہیں، وہ انشاء پر ہزار کی میرا بھی پڑ کر بھی پئے۔ مگر انہوں نے

آخر فراموشی کا عہدہ رنگ بیکار کیا تھا اور جو بھی رنگ اپنے ساتھ نہا سکتے۔

عقلی و فطری ایک جھلک دیکھئے۔ یہ ان کا ۲۲ سال کی عمر کی نثر کا نمونہ ہے :

”جب کہ تیر کو پہنچے تو کھیر کی ضلع اسکول میں مسئلہ کا مسئلہ

نکالا اور حصول معاش کا ضابطہ ڈیٹا لیتے

بی

” میں نے اس کے بہت دنوں میں ان آزاد خانہ بڑا دہرہ

میں طاق اور سرکار میں مشاق ہیں تھے

صاحب آپ حیات کے اسلوب کی چھاپ اور انشاء پر داری دیکھئے۔ یہ سلا اقتباس

۲۲ سال کی عمر کا شے ہے اور دوسرا اقتباس دوسرا ایسی شے ہے۔

” ملنے والے حلقے میں کوئلاں داستان فرماؤ آزاد کی

فلاں انگریزی ناول سے اخذ کی گئی ہے مگر ثابت نہیں کر سکتے۔

حضرت سرشار کی یہ کیفیت کئی کچھ آزادوں میں بیٹھے ہیں،

آپس کرتے چلتے ہیں اور وہی باتیں فرماتے ہیں کچھ چلتے ہیں

مگر اس انداز سے کہ عبارت کی شوقی اور مصداق میں کی آراگی

میں سرور و فخر نہیں آتا۔ والہ کیا زبان تھی۔ جیسا زبان سے

کیا عالم کو سبایا اور تاثیر کا طعم میں گیا تھا

بی

” کہیں وہ تیرم ہار دیا کہ سستہ نظر آ رہے، جی میں بیٹھے بڑے

معتز نگار نقادوں اور شاعروں کو جمع ہے۔ بیکہ بھوں

کے گھسٹے جھکے ہیں اور سرشار بن کا جادو چل رہا ہے۔

کہیں ان کو یہ سبکل اور فہم منقہ فرجیوں کی پُر رعب

صورتیں دکھائی دیتی ہیں، جن کی چند زوں سے نہایت کارند

برس رہا ہے اور بریں کی نوا اوروں کے پالے اب تک تنقہ فرجیوں

کے اعزاز و تکرار کا چمکا ہوا ہوا ہے۔

مگر ۳۳ سال کی عمر کو پہنچ کر جب کہ ان کی عمر کے صرف ۱۱ سال باقی رہ گئے ہیں،

ان کے اسلوب میں رنگ آمیزی کم ہو گئی ہے اور انشاء پر داری کی جگہ براہ راست

یات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نمایاں ہے۔ جیسے :

” اور وہی کی ظرافت کو ہمیشہ بھولی اعلیٰ دہے کی ظرافت

نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بڑی فنی و سخنرین بہت

فرق ہے۔ اگر لطیف و یکایک ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو

زبان کے عاشق کو غالب کے کھوں پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اور دوسرے

ان کے چھاپہ رات میں جہاں اور بہت سی لطافت و بھنگی کے

چہرہ موجود ہیں، وہ ظرافت کی جھلک بھی کم دکھائی دیتی ہے۔

نہ چھتیاں ہیں بلکہ نصفی کے مگر ذرا فنی فنی ہیں۔ لیکن

دوسرے کی بات میں۔ مگر طبعیت کی شوقی متین الفاظ کے

پردے سے چھپتے ہیں اور دیکھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ

کا تو ریزہ لگتی ہے۔ ہارک اور لطیف مذاق کی بھنگی اور

بے ساختہ چہرے پر چمکندہ و آسانی زبان لطیف آتا ہے۔

جن لوگوں نے اور وہی اور غالب کے خطوط کا مطالعہ کیا ہے، ان کے یہ کیفیت

کی اس بے لاگ اور بھنگی رائے سے اتفاق کیے بغیر چلا نہیں۔

مضامین چکیت اور دوسرے مجموعے بڑے معانوں کی روشنی میں تدبیر

لکھا ہے۔ یہ کچھ اس کتاب کے مگر چکیت کے ذہن میں تدبیر کا کئی مستقل تصور نہیں

تھا تاہم ان کی طبیعت انصاف پسند تھی اور زیادہ سے زیادہ غیر جانبدار رہنے کی فطرت

راغب رہتی تھی۔ یہی وہ انفرادی مزاج ہے، جو ان کی تمام نگارشات میں انہیں

اس عہد کے دوسرے نقادوں سے الگ اور ممتاز مقام بخشتا ہے۔

ج۔ منشورات رسالہ ”صبح امید“

جیسا کہ معلوم ہے یہ رسالہ اکتوبر ۱۹۱۸ء سے نکلتا شروع ہوا تھا۔

اور کم از کم کئی ۱۹۲۱ء تک جاری رہا۔ اس طرح مطالعہ ۱۹۲۳ء تا شہداء دہلی کے

ہے۔ مگر ۲۲ جنوری میں بھی جولائی۔ اگست ۱۹۱۹ء۔ جنوری۔ فروری

۱۹۲۰ء اور اگست۔ ستمبر۔ ۱۹۲۰ء کے شے شے شے ہیں۔ اس طرح شہداء کی تعداد

گھٹ کر ۲۹ رہ جاتی ہے اور اس کتاب کو دسمبر ۱۹۱۸ء اور اپریل ۱۹۲۱ء کے برس سے

۱۔ مضامین چکیت ص ۲۲۲

۲۔ مضامین چکیت ص ۲۰

۳۔ مضامین چکیت ص ۲۳

۴۔ مضامین چکیت ص ۳۰

دستیاب ہی نہیں ہوئے۔ جو کچھ بھی اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ انہیں ۷۷
شماروں میں سے ہے۔ اس رسالے میں چکیت خود مندرجہ ذیل جلدوں کے
تحت باقاعدگی سے لکھا کرتے تھے:

۱۔ رفتارِ قوم

۲۔ تنقید (یا ریویو)

۳۔ ہمارے معاشرتی

”ہلچل“ کا کوئی حصہ زیرِ غور نہیں ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔
پہلا یہ کہ یہ انتخابِ نظم ہے۔ اور چکیت کی نثری حدود میں نہیں آتا۔ دوسرا یہ
کہ اس کا کم از کم نوے فی صد مواد میں نے الگ سے ”انتخابِ آئینہ“ وغالب
کے عنوان سے (۱۹۸۰ء) شائع کر دیا ہے۔ باقی ماندہ کچھ مواد ترجمید میں
دستیاب ہوا۔ ”انتخابِ آئینہ“ وغالب کے دوسرے ایڈیشن میں یا کسی صفحے میں
شائع کر دیا جائے گا۔

اس سے پہلے کہ ”رفتارِ قوم“ تنقید اور ”ہمارے معاشرتی“ پر بات
کی جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ”صبحِ آئینہ“ میں پیسے چکیت کے ان
مصنفین کا ذکر کر دیا جائے جو مندرجہ بالا تینوں عنوانات کے تحت میں
نہیں آتے۔ یہ ہیں ”صبحِ آئینہ کا ملک“ اور ”اردو شاعری“۔
اول الذکر اکتوبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور ابیری کتاب
”چکیت اور باقیاتِ چکیت“ میں شامل ہے۔ دوسرا نومبر ۱۹۸۸ء کے
شمارے میں چھپا تھا۔ اور مضامین ”چکیت“ میں شامل ہے جو کچھ دو دنوں
معمولاً اہم ہیں، اسے اس نمبر میں ان کے کچھ اقتباس دیے جاسں گے۔ چکیت
کے آخری زمانے کے رجحان کو سمجھنے میں مدد دیں گے۔

”رفتارِ قوم“ اس رسالے کا نہایت اہم فرم ہے۔ اس میں چکیت
مختلف موضوعات پر رائے زنی کیا کرتے تھے۔ بیشتر موضوعات سیاسی ہوتے تھے۔
اس لیے ظاہر ہے کہ ان پر چکیت کی رائے اپنے ملک کے مطالعہ ہوتی یعنی
اعتدال پسندی غالب ہوتی تھی۔ یہ وہ باب ہے جو ”صبحِ آئینہ“ کے ہر شمارے
میں باقاعدگی سے شائع کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان تمام ۲۷ شماروں میں جو بیسے عجیب
نظر دے ہیں، یہ باب موجود ہے۔ ان میں سے ”رفتارِ قوم“ ”چکیت اور باقیاتِ
چکیت“ میں پیش کیا جائے گا اور ابیری ۱۸ ”رفتارِ قوم“ اور ابیری مرتبہ کتاب
”مقالاتِ چکیت“ میں شامل ہیں۔ یہ فی الحال زیرِ طبع ہے۔

”تنقید“ کا کہ ہر شمارے میں باقاعدگی سے نہیں لکھا جاتا تھا۔ لہذا
ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہفت و شماروں کے مقالات مل سکے ہیں۔ اس کا کم
میں تازہ تصنیفات پر چکیت کے متعلقہ شائع ہوتے تھے۔

”ہمارے معاشرتی“ بہت مطواری حصہ ہے۔ ”صبحِ آئینہ“ اس میں چکیت
مختلف رائلوں کے خاص خاص مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ
حصہ صرف اس لیے مفید ہے کہ ان میں دوسرے ترجمیدوں کے مزاج کا علم ہوتا

ہے بلکہ اس سے بھی کم ان مقالات پر چکیت کی رائے سے ان کی اپنی طبیعت کے میلان
کا پتہ چلتا ہے۔ یہ کاظم تنقید کا کم سے زیادہ باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ مقالات
چکیت میں ۱۹ شماروں کے ہمارے معاشرتی شامل ہیں۔ ایک ہمارے معاشرتی
پہلے ”چکیت اور باقیاتِ چکیت“ میں شائع ہو چکا ہے۔

اس دور میں چکیت ادنیٰ کم اور سا کا زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ
پہلے ہی شمارے میں ”صبحِ آئینہ“ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
”عزیزانِ وطن! اس انقلاب کے دور میں نئے خیالات
کی بہت بڑی ہونے لگی ہے۔ ”صبحِ آئینہ“ کی ذمہ داری کو نبھانے والا
ہوئے ہے۔ وطن کی محبت اس کا ناطہ ہے۔ اس کے بادشاہ
آزادی و جمہوریت کی ہوا کو اپنے دامن میں لینے کے لیے تیار
ہیں۔ قوم و ملک کی خدمت اس کا مسلک ہے“

گزشتہ اکتوبر ۱۹۸۷ء میں حب وطن اور قوم و ملک کی خدمت ہی ان کا نصب العین ہو گیا
تھا۔ حب وطن انسان کے اعلیٰ ترین عبادات میں سے ایک ہے اور اچھے انسان میں
یہ ہمیشہ کسی رکھی شکل میں موجود رہتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اس جلد کے شکل کا سیاسی
اور قومی ہونے لگی اور چکیت نے ایک اچھے انسان کی طرح اپنے آپ کو اسی جذبے کو
ترجمہ دی۔ اب وطن کی محبت اور وطن کی خدمت کے سوا سب باتیں ان کے لیے
شالوی حیثیت کی تھیں۔ یہیں وہ ہے کہ انہوں نے اپنے مجموعہ کا نام ”صبحِ وطن“
رکھا اور اپنے رسالے کا نام ”صبحِ آئینہ“۔

لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے کبھی بھی سیاست میں قدم نہیں رکھا۔
اور نہ ہی اپنے آپ کو کبھی سیاسی مفکر کی حیثیت سے متبادل کی کوشش کی۔ وہ
اس وقت کے سیاسی لیڈروں سے متاثر تھے۔ ان کے بنیاد کو خاص مقام میں
بھیلا دینا چاہتے تھے۔ اور ”صبحِ آئینہ“ اسی ائینہ پر نکالا گیا تھا۔ ”رفتارِ قوم“
کے عنوان کے تحت لکھے ہوئے اور ان چکیت کی سیاسی موجھ پوچھ کے گواہ ہی
نہیں بلکہ ہندوستان کی سیاست کی تاریخ بھی ہیں، جو دوسرا آٹھ بیسے (اکتوبر
۱۹۸۸ء تا مئی ۱۹۹۲ء کی مدت کا بھر پور احاطہ کرتے ہیں۔

”صبحِ آئینہ“ کے اجراء کے ۱۳ بیسے بعد چکیت اپنے رسالے میں (نومبر
۱۹۸۹ء) ایک مضمون لکھتے ہیں: ”اردو شاعری“ یہ مضمون چکیت کے اصولی تنقید
کا آئینہ دار ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ انہوں نے
مغربی مطالعات کا اثر قبول کیا تھا، تاہم وہ مغربی قدروں سے
دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ مضمون اس لئے کی تنقید کا اعلیٰ نمونہ
ہے۔ شاعری کی نفسیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”نفسِ شاعر کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ
کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ایریابہ کہ شاعر کی آوازوں کے سننے
سے یاد دہانی کہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے
(نکلتے منہ سے)

چکیت کا تنقیدی شعور



چکیت

دوا دہی اور تنقیدی ردیوں کے اختلاف سے زیادہ ایک دوا دہی اور ایک ذہنی ماحول سے متعلق رکھنے والے دو افراد کے باہمی تامل سے کی رودادوں کی ضرورت کو گروں نے ایک معروف نقد گو کی حیثیت سے جانا اور چکیت اول و آخر محض ایک شاہراہ تھے۔ یہ مکرر اگر تکرر کر کے کہلے چکیت اور کسی مضابطہ نقاد کے ذہن ہوا ہوتا تو فٹ مٹا اُن کے اختلافات و مقدمات کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھا جاتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ فقر اور چکیت دونوں نے محکومین ایک ہی مضمون ادبی اور سائنسی رویہ اختیار کیا تھا اور اپنے اپنے استدلال کو ایک ایسی شکل دی تھی، جو شعریات اور ان کے افہام و تفہیم سے بہت واضح و بالہ رکھتی ہے، ان کے تمام مضامین کو ذاتی نقیبات اور ترجمان کا اظہار سمجھا گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی بھلا دی گئی کہ اس مکرر سے چکیت کا رویہ فقر کی طرح بہ یک وقت شخصی اور عمومی ہوتے ہوئے بھی خودی کی روشنی میں بھل کہیں زیادہ زمین، منفعت دار اور مدلل تھا۔ جانب دلوں دونوں تھے۔ مگر ایک کی جانب داری و لائق کے استحکام سے تقریباً عاری تھی اور تصادم نے خاصی ادنیٰ کیجی دوسرے میں چکیت کی جانب داری کو ایک مضبوط بنیاد بھی میسر تھی۔ اس بحث میں چکیت نے نہ کہ کمالت جو غریبی اور غریبی مصلحت کے ساتھ کی ہے۔ اس کے پیش نظر اس واقعے سے انکار محال ہے کہ اگرچہ چکیت کا ذہن بھی تمام کمال اُردو ادب میں تھا، لیکن وہ فقر کے مقابلے میں ایک بہتر تنقیدی شعور رکھتے تھے اور اس شعور سے کام لیتے کاسلیق بھی۔

بجز یہ کہ یہ کہتے ہیں کہ چکیت مضابطہ نقاد نہیں تھے تو ایسی کاسلیق ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اردو تنقید کی زبانت سے مختلف ادوار میں ادب کی تعمیر و تقدیر کا مذاق عام کرنے کا عمل صرف مضابطہ نقادوں سے مخصوص نہیں رہا۔

● گل جہر ایڈیٹر، جامعہ گل، نئی دہلی ۱۱۰۰۵۵

یہاں مضابطہ نقاد سے میری مراد ان شخصیات سے ہے جنہوں نے شعوری طور پر تنقید کا فن اختیار کیا۔ ادب کے کچھ معیار مقرر کیے اور نظم و نثر کی مختلف اصناف پر ان معیار کے اطلاق کی شرطیں اور صورتیں متعین کیں، جنہوں نے تنقید کو ایک فرد محقق اور قائم بالذات مرکزی کا بدل جانا اور مکرر کے ساتھ ساتھ باہمی خارجی دیا جسے سب کا شکار ہوئے بغیر ایک داخل و باہمی صورت اور مقصد کے تحت اپنے نقطہ نظر اور نتائج کا اظہار کیا۔ تذکرہ نگاروں میں اگر میر کے سامنے کسی اور کا چرچا مل دے گا تو اس کا سبب محض یہ نہیں کہ ان کے مجیز معاصرین تذکرہ نگاری کے آداب سے بے خبر تھے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ میر کے مجیز معاصرین کے تذکرے نکات اشعار کا جواب بن کر سامنے آئے۔ چنانچہ جو فرد فنا دانہ بصیرت نہیں تیر کے تاثرات میں متقی ہے شاید دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں سطر و سطر سب دونوں کے اعتبار سے بہت کم تر ہے۔ لیکن اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکالنا واقعتاً بھی اور متناہی غلط ہو گا کہ اردو تنقید کے اولین غفوش کی تربیت میں تیر کے دور اور ان کے بعد کے تذکرہ نگاروں کی دایمیں لائق توجہ نہیں ہیں۔ ایسا مکرر ہوتا ہے کسی روایت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی خدمت ایسے اشخاص سہرا می دیتے ہیں جن کا ذہنی رتبہ اس روایت کے بنیاد گزاروں کے برابر نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے کہ چکیت سے پہلے حالی، شبلی اور آزاد کے تنقیدی افکار اور اسالیب سامنے آچکے تھے اور اردو میں تنقید کا وجود تسلیم ہو چکا تھا۔ حالی اور شبلی تو نے ایسے نقاد تھے جن کے حدود میں مکرر کا جواب ہماری تنقید کا پسین چسپن کر سکی ہے۔ آزاد کی آہستہ آہستہ مدغم و لائق ذوق اور ان سب سے بڑھ کر نظم اور کلام بزموں کے باب میں خیالات کے موانع سے آزاد کے مکرر کا داخل میں ذہین معروضی اور تنقیدی ردیوں کی جو روشنی دکھائی دیتی ہے اس کی حیثیت مستقل سمجھی ہے اور ضرور دہی۔ ان کے بعد آنے والے مجدد چکیت ان کے آگے نہ سکیے بلکہ یہ تمنا جاوے کہ اپنی تنقیدی نگارشات کی بنیاد میں سے کس کے برابر بھی نہیں ٹھہرے۔

حکمت کی تنقید تو آپ نے ان مابین پیش روئوں کے نام کر دیا اور روایت کی توسیع میں بھی نہ بچے خود کی روایت کا صرف آغاز — پھر کسی اس حقیقت کا جواز کیلئے کہ اصفیہ کی تاریخ اور لفظ کا معنی اور اس وقت بعض معتدلات نے بھی یا حکمت کو سب سے نظر انداز کر دیا ہے یا پھر انہیں جگہ دی بھی ہے تو جاننے میں۔ گو یہ کہ حکمت نے اپنے معانی اور اثر سے اپنے معرکے میں جو حقائق پیش کیے تھے ان کا رشتہ بالآخر دو تنقیدی روایت سے بہت کمزور ہے یا پھر سب سے ناقابل اعتنا۔ حکمت کے ساتھ یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے اور اس امر کا ثبوت بھی کہ عام طالب علم کو رکنہ ہمارے ہرگز یہ حقیقتیں اور ناقدین بھی اپنی روایت کا جائزہ دینے وقت بعض دیگر حقائق سے بے نیاز کر دیا ہے۔

”معانی حکمت“ کا شمار اودھن کی معروف کتابوں میں ہوتا ہے، لیکن نظم لفظ کی بات ہے کہ حکمت کو ان معانی میں کیا پر نہ تو اودھن کی عمومی روایت میں کیا قابل قدر دے پر فائز نہ کیا، نہ تنقید کی تاریخ میں ان کے مرتبے کا تعین ہوا۔ ”عبدیہ تنقید پر باقاعدہ کام کرنے والوں نے بھی اپنے جائزے کا آغاز آزاد، حالی اور مشتکی کے حوالوں سے کیا، لیکن ایسی ہی صدی کے اواخر سے یہ سفر شروع ہوا تو اس کی دوسری اہم منزل میں صدی کے دہائیوں کے بعد کبھی جاننے والی تنقیدیں پھریں۔ گلزار نسیم کا دیباچہ ۱۹۰۵ء میں ملت آیا تھا۔ اس پر بیشتر کے اعتراضات اچھا ۱۱ اپریل ۱۹۰۵ء کے گلزار میں شائع ہوئے اور حکمت کی طرف سے جواب جواب کی اشاعت ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کے دوسرے مسئلے میں ہوئی۔ گو یہ کہ گلزار نسیم کے اولین مطالعے اور اس پر بخیر و فکر کے مسئلے میں حکمت نے جناب بھی وقت دیا رہا ہو، مگر اسے اپنے نتائج کے دوران حکمت نے اس بارے میں جو کچھ بھی لکھا کم و بیش غلط رہا ہے۔ شادی سے لے کر تعلق بعد کے تمام مباحث میں حکمت کا انداز اور لفظ ہی ہے یا پھر نتائج میں جس ایک ساتھ طنز اور جارحیت کے عناصر شائع نظر آتے ہیں۔ استدلال کا ناسانہ یہاں بھی حکمت کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں ہے، مگر یہ استدلال جان نہیں معلوم ہے جسے اس پر حیدرایت کی گڑھ پائی ہوئی ہے۔ خبر، اس مسئلے کے معزول پر گفتگو کر دیں ہوگی۔ یہاں اشارہ اس امر کی جانب مقصود تھا کہ حکمت کی تمام تنقیدی تحریریں بیسیں صدی کے دہائیوں یعنی اودھن کی آئی اور تنقید کے آئی دور میں سامنے آئی ہیں اور تنقید کا خاصا مغفل شکار دور رہنا چاہیے۔ ایک طرف عبدیہ تنقید اور دہائیوں کے آثار کے ذریعہ رونق پونے والے تقریری مضامین کا دور تھا جس کی ترجمانی علی گڑھ تحریک، انجمن اشاعت مفہوم (مطالعہ انجمن پنجاب) اور بعد میں شعر و شاعری سے ہوئی ہے۔ دوسری طرف ترقی پسند تحریک کے ساتھ فروغ پذیر ہونے والے ادبی صورتوں کا دور۔ یہ ایک ایسے تسلسل کا قصبہ جس کی ایک کڑی آئینوں صدی کی آخری دہائیوں میں دریافت ہوئی اور دوسری بیسیں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں کو بھلا گئے کے بعد جو حقیقی دہائی کے وسط میں۔ ابھی انہیں کہ نیچے کے خود کی ذہنی ذرا اور روش سے کیرا نکھیں پھر لگی ہوں، لیکن اس کا ذکر

بہن روا روئی کے آغاز میں کیا گیا۔ یہ حقیقت سمجھادی گئی کہ حالی اور آزاد کے اصطلاحی میلانات تاریخ کے مرکز جزئیات کی ہر گاہی کے باوجود ان کے رشتے کی سرشت کا تمام و کمال انہما نہیں تھے۔ ان سے اختلاف کی ہر بھی ایک سوزی میلان کی صورت اُسی تھی جو توجہ و ترقی کے شور شرابہ میں گم ہو گئی۔ حالی کے عہد میں اس ہر کی ناکامی سب سے زیادہ حکم اور مضبوط بنیادوں پر مشتمل کے تنقید و تنقیدات کی، اور علی گڑھ تحریک نیز انجمن اشاعت مفہوم کے ادبی رجحانات کا رد عمل بیسیں صدی کے اوائل میں کی سطح پر ہوتا تھا۔ ان میں کچھ سطحیں متذکرہ رجحانات کا نفع و فہم کرتی ہیں۔ مثلاً مغرب کے متنب ہر سے بھی ہوئی مرغوبیت کے مقابلے میں مشرق کی قدیم یا اس کی با زبان کامل۔ لیکن یہ صورتیں بظاہر ان رجحان کا حلائیہ ہونے ہونے بھی مراجعت یا قدامت پسندی سے ایک شعوری گریز کی علامت تھیں۔ یہ روایت ہے کہ ان کے زمانے اور بھی مختلف تھے اور ان کا عمل بھی۔ مثال کے طور پر ابوطیف کا سیلان جس نے ذہنی اور ادبی فرسودگی کے بالمقابل نگار ادبیات کے ایک نئے نظام کی ترتیب کا کام انجام دیا اور اس نے مغرب سے ایک ایسی سطح پر تعلق قائم کرنے کی کوشش کی جس کے خارجی نشانات حالی اور آزاد کی باتوں سے ملے جاتے تھے۔ عبدیہ تنقید، مہدی امانی، تہجد و انصاف، یلدرام اور سناز کے رویے بھی ترقی پسندانہ یا شعری تھے۔ مگر ایک دوسری سطح پر۔ اگر کسی کو ان میں اور علی گڑھ تحریک یا انعم بدیع کے طبع و ادب میں سماجی تضادوں کی غایت کا کوئی شریک دکھائی نہیں دیتا تو اس کا جواب اس کے تنقیدی شعور کی سہل پسندی اور یک طرفہ پسند سے طلب کیا جانا چاہیے۔

اس پس منظر میں جب ہم حکمت کے شعور کو متین کرنے والے عناصر پر نظر ڈالتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت یعنی بروئی صورتوں کے باوجود عامی پسند و تمنا۔ اپنی روایت کی طرف حکمت کا رویہ نہ مکمل یکاب کا تھا نہ مکمل انحراف کا۔ اس معاملے میں ان کی نظر دنیا کی طور پر انتہائی تھی۔ انہوں نے مغربی تعلیم حاصل کی تھی اور اس مسئلے میں ان کا تدارک کسی دشمنی تک مغربی انکار اور ادبیات سے بچا ہوا ہوا تھا۔ لیکن وہ مغرب سے اس حد تک متاثر نہیں ہوئے کہ اپنی تہذیب اور ادبی روایت کے اس میں سے بے گناہ نہ بوجھتے۔ چنانچہ اپنی روایت کے تئیں انہوں نے جو موقف اختیار کیا اور اس کی تفہیم و تفسیر کے بارے میں جہاد و نظریات کیا کیے، تو ہم سراسر مغربی فکر کے سب سے مشرقی تعلیم الدین اور نئے نئے کو اس امر کا تصور رکھتا ہے کہ ان کی تنقید مشرقی یا مغربی کسی ایک نظام کی قادی نہیں اور وہ دونوں کے درمیان متعلق دکھائی دیتی ہے۔ مگر یہ خیال ہے کہ اس اعتراض میں ہم دراصل مشق کے ادبی مزاج اور شعور کی انفرادیت کا اعتراف نہیں کرتے۔ لیکن یہی یہی معاشرے کی کھینچے جانے والے کا اپنی روایت میں مقید ہونا چاہتا ہے جو ہم نے اسے اپنی باہم اپنی روایت سے ایک دم متبرک ہونا چاہا۔ یہاں معقولیت کا راستہ دی ہے جو دوا میں ان کے اختلاف و تضاد سے آزاد بیک وقت دونوں سے استفادے کا ہو، جو مختلف المذاہب معاشرے کے ہجوم میں اپنی طبیعت کے توازن اور شعور کی تنظیم رکھ سکے جس کے پاؤں اپنی زمین پر مضبوطی کے ساتھ

جے جوئے ہوں ، تاہم اس کی کتبہ نگاہ گردو پیش کے تمام ملاقوں تک پہنچ سکے۔ یعنی نے اپنی انگریزی دانی کا گھر کا کیا بھی ہے تو بس اس قدر کہ انگریزی کی بعض کتابیں ان کی نظر سے گزری تھیں جس سے وہ اچھا طرح مستفید ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس مقام پر مستفید ہونے کا مفہوم محض یہ نہ تھا کہ کتابیں ان کے استفادے کی صلاحیت کا فقدان تھا، ایک طرف ان کی کم پڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے (اور ہو نا بھی ہے) چاہے کتنا کہ کتبہ نگاہی نے اس دور نگاہی کے جن اصناف پر تنقیدیں کیں، ان کے علاوہ میں مغربی تنقید کے اصول اور نظریات جو صرف مغرب سے مخصوص ہوں کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتے تھے۔ شبی کے دور تک دور درکار، باہمال ہماری زبان میں کسی ایسے نفاذ کا جو نہیں ہو سکتا تھا، یعنی ہوش و حواس یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ مغرب کے ہر ادبی اصول، معیار یا نظریے کا مشرق سے کوئی مختلف ہونا ضروری ہے۔ ادب اور فن کے دنیا میں میں سرحدیں اس طرح نہ بنے ناگزیر ہوں گے۔ تاہم قوم کی اور فن کے سے بھی آگے ماکہ قدیم ایرانیوں اور یونان کے شعرا پر ایک نظریاتی حائلے کو نافذ ہونے کا کہ ان کے صدیق پہلے نفاذ اور تنقید کے جدید مغربی نظموں میں مماثلت کے نشانات ایک دوسری درجنوں کے باب سے مل جائیں گے۔ یہاں ان اقوال کو دہرے کر کے ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ حیثیت کے ادبی مزاج اور حیثیت کے تنقیدی مضامین میں اس مزاج کا اظہار جس طرح ہو چکا ہے، اُسے سمجھنے کے لیے دو صورت ممکنہ: اسول کے حوالوں سے مدد لینا اور مندرجہ مذکور مسئلہ پر ہی اس کا محاسنی مغربی اور مشرقی کی تکرار کے تناظر میں کیا جانا چاہیے۔ حیثیت اردو کے ادب کے تحریری اسلئے تھے۔ ہندوستانی تھے اور قوم پرست تھے۔ ان تمام افادات یا واقعات کے ہر کاغذ پر کے مغیران کے شعور کا جو بھی خاکہ گویا خاص اور اودھو دھوگا۔ بلکہ اگر آپ مجھے ادب میں فرقہ واریت کی ترویج کا الزام نہ دیں تو بس اس موقع پر یہ اوجاؤں کرنا چاہوں گا کہ میں حیثیت کا ہندو ہونا بھی یاد رکھنا چاہیے۔ ان کی تخلیقی شخصیت اور ان کے مجوزی ذہن کو ذرا کی تشکیل میں یہ تمام حقائق سرگرم رہے ہیں، کم و بیش اسی سطح پر ہے ہم حیثیت کے عہد کے کسی بھی تنقید پرانے شخص سے بلا تکلف منسوب کر سکتے ہوں۔ کیا نظارہ کا منظر ہر دائرہ میں حیثیت نے ایک ساتھ اپنی ان تمام حیثیتوں اور جہتوں کا تحفظ کیا ہے۔ ان کی یہ حیثیتیں ایک دوسرے سے متحرک تھیں ہیں نہ ہی یہ جہتیں ان کی مجموعی ادبی شخصیت کو الگ خانوں میں منقسم کر دیتی ہیں۔ ان میں سے اجتماع سے ایک ایسے شعور کا خاکہ تیار ہوا ہے جو نہ صرف ایک ایسا منظر ہونے کے علاوہ پیچیدہ بھی ہے جسے اپنے تمام ابعاد اور مضامین پر مزین ہیں کہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے مکمل وجود کے اظہار کا جیسا ہے۔

جس حقیقت کی طرف ان سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی تفسیق کے لیے مضامین حیثیت کی فہرست پر نظر ڈال لینا بھی کافی ہوگا۔ اس کتاب میں کئی سیس مضامین ہیں۔ ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ پندت و شکر کوئی نسیم

- ۳۔ پندت و شکر و شکر
- ۵۔ چھی رام سرور
- ۷۔ گلزار ابرسم
- ۹۔ اودھ کا
- ۱۱۔ مرزا محبوب علی گڑھ
- ۱۳۔ منشی گلزار ابرسم
- ۱۵۔ اودھ شاعری
- ۱۷۔ دادا بھائی کوروی
- ۱۹۔ تاریخ

- ۴۔ قاج
- ۶۔ دیباچہ گلزار ابرسم
- ۸۔ ایک یادگار شاعر
- ۱۰۔ منشی سید محمد حسین
- ۱۲۔ نواب سید محمد آقا
- ۱۴۔ شہادت درین
- ۱۶۔ پندت و شکر و شکر
- ۱۸۔ پندت و شکر و شکر
- ۲۰۔ ذات کی تفسیق

یہ فہرست مضامین حیثیت "اشاعت ۱۹۳۶ء مطبوعہ انڈین پریس لٹریچر، الہ آباد سے" اخذ ہے۔ ان میں سات مضامین تحریر ہیں جن میں شائع ہوئے، باقی "گلزار ابرسم" میں، دو "نادر" میں، باقی تقریباً اودھ شاعری، ادب، صحیح آئند اور تنقید میں اور ایک گلزار ابرسم کے دیباچے کی شکل میں۔ ان کے موضوعات کو ذہن میں رکھ کر یہاں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ یہ مضامین شائع ہوئے، اس نتیجے تک پہنچنے میں جہر نہ لگے کہ حیثیت کا شعور اپنی چند مخصوص وابستگیوں رکھتا تھا۔ یہی صورت حال حیثیت کے شعری مجموعے کے نام اور ان کے کلام کو موضوعات اس میں ہم بیگانہ والے بحر و بون کی بنیاد پر سامنے آتا ہے۔ گوکہ حیثیت کے تخلیقی نظرداران کے ذہنی تبدیلی اور سماجی رویوں نے انہیں ایک میدان نظر کرنا تھا۔ مضامین حیثیت کا بیٹا لیکن ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا جب حیثیت کی عمر کم تر تھی۔ ۱۹۲۶ء میں حیثیت کا استقبال ہو گیا۔ اسی تخلیقی اور ذہنی سرگرمیوں کے اظہار کے لیے حیثیت کو بہت مختصر مدت میں شکر آئی۔ لیکن اسی مختصر مدت میں انہوں نے ادبی، تبدیلی اور سماجی زندگی کے ان تمام شعبوں پر اپنے نقوش کش کیے جن کے سلسلے سے حیثیت کی ذہنی اور تخلیقی شخصیت شرافت کی جاسکتی ہے۔ آج کی اصطلاح میں حیثیت ایک کو شید (COMMITTED) شخصیت رکھتے تھے۔ یہی ہر شخصیت کے کچھ مخصوص مقاصد، مہاج، ترجیحات، تعقبات اور تعقبات ہوتے ہیں۔ میں یہ بات حیثیت پر اصرار میں سمجھتی ہوں کہ یہاں حیثیت سے پہلے اس نوع کی شخصیت کا سب سے اہم نمونہ ہمارے ادیبوں میں حالی کی شخصیت تھی۔ ظاہر ہے کہ حالی کی شخصیت کے بھی اپنے حدود تھے، مگر حالی اور حیثیت میں فرق یہ ہے کہ حالی نے اپنا تناظر اور اپنی سرگرمیوں کا دائرہ ایسا رکھا، جس کی دیواروں میں حالی کے عہد کا پورا فکر اور ادبی زندگی پوری روایت مٹ آتی ہے۔ اس دائرہ کی حدود کی حد میں تو ان پر پڑتی ہیں، لیکن حالی کے تناظر کی آزادانی انہیں زیادہ متبر بھی ملتی ہے اور وہ بھی۔ حالی کے معاملے میں حیثیت کا شعور اگر محدود نظر آتا ہے یا یہ کہ حیثیت اور تنقید میں ایک پورے قوت نہی کے صورت اس لیے کہ حیثیت نے اپنے شخصی ماحول، معاشرت اور ماحول کی پار دیواری سے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے ہاں تناظر اور تنقید کی وہ ذہنی تضامیں نہیں ملتی ہیں جن

حالی کو ایک نئی نظر سے اپنی تاریخ و روایت کا جائزہ لینے اور ایک نیا مقدر قائم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ لیکن اس نے جتنے سے جتنے حالات کے باوجود یہ کیفیت کی رائے بھی دیکھ لی ہے:

"مجھ کو انصاف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا مصروف اصول شاعری سے ہے خبریں، نازک خیال اور بے خبری واری جو کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے جوہر ہیں ان اشعار (گزارش) کے وہ استاد، جو کیا دلی کے انصاف کو قائل ہو کر رہے ہیں، ان میں موجود ہیں بھر ان کی یہ کہنا ہے مستحق دارد۔ وہ یہ ہے کہ مولانا حالی مغربی شاعری کی پیروی کی فکر میں انگریزی نظموں کے ترجمے کر رہے ہیں اور جو کچھ روزانہ میں ترجمہ ہوتے ہیں ان نظموں کی نازک خیالی اور طنز و ہزنی کے جوہر تشہیل سے جانتے ہیں اور اسٹاندارڈ اور نظمیں کی پیروی ان تمام نہیں کرتے، اس لیے آپ خیال کرتے ہیں کہ مغربی شاعری کا اصول یہ ہے کہ عبارت صادق و علم گری جائے اور اس خیال کے مطابق، اردو کے جیسے استاد میں آپ نازک خیالی اور باریک بینی کی وجہ سے کسی نظم کی پیچیدگی پاتے ہیں، اس کو بے بسی اور جمل قرار دیتے ہیں"

(معانی جگہیت ص: ۴۲/۱۳۲)

حالی کے سلسلے میں کہ ایسی ہی دل سے ملے اور وہ کچھ کمزیر تھے دل سے بھی تھے۔ اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جگہیت نے یہاں دراصل ایک ادبی گروہ کے انداز نظر کی ترجمانی کی ہے، جو اس کے تمام افراد اپنے مخصوص رویوں اور رجحانات سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انھوں نے ان کی مخصوص مکتب فکر سے وابستگی کے باوجود اپنے فیصلوں میں اس کیفیت کے استحکام کا تابع نہیں ہوتا۔ سبب یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ جگہیت دراصل مکتب اور وہ کچھ کے غلط نظریوں میں شریک ہوئے ہیں۔ وہ تمام افراد جنہوں نے مقدمہ شعر و شاعری کی بنیاد پر حالی کو اپنی ملازمت کا برف بنایا سخن فہمی سے زیادہ اپنی طرف داری کے سبب سمجھو گئے۔ ان میں اور جگہیت میں فرق صرف یہ سامنے آیا کہ اس حلقہ کے ادبوں نے یہاں حالی کے معروضات کا جواب حسن و طنز کی زبان میں دیا تھا۔ وہیں جگہیت نے اپنی بات جمالیاتی اور سلفی دلیوں کے ساتھ کہی۔ یہ غصہ بہت طوفانی ہے، جتنا جہل اور مکتبیت یا مقدمہ شعرو شاعری اور مکتب اور وہ کچھ کے اعلانات سے صرف نظر کر کے اگر جگہیت کے تنقیدی معانی کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جگہیت نے اپنے ادبی اصول کے بہت سے مغلطات کو ایک نئی منطقی بنیاد فراہم کی۔ اسی مقررہ ہمدانی ملازمت اور غلط جگہیت سے ہوتی ہے۔ ہم خواہ اس کی ترجمانی میں شریک نہ ہوں، مگر یہی ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے خدائے کا انھیں اسلوب میں کیا ہے اور ان نتائج تک پہنچنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا ہے، وہ تجرباتی تھی۔ اور علیٰ بھی۔

ڈاکٹر عبدالحسین کا خیال ہے کہ جگہیت کے اسلوب میں یہ عناصر ان کے پیشے میں

وکالت میں ہدایت کا نقصان بھی ہو سکتے ہیں، لکھے ہیں۔

انہوں نے (جگہیت) کے اکثر مزید تر معانی ان لوگوں پر لکھے ہیں جن سے انہیں وحدت تھی، یا جن سے لامحدت رکھتے تھے، لیکن مصیبت تمام کے لیے بھی نہیں۔ دو گز رویوں کا انھار ہی بے باکی سے کرتے ہیں جس طرح محاسن بیان کرتے ہیں۔ سادات و منصف مزاجی ہر جگہ نمایاں ہے۔ جب گلزارِ ابرار کی اشاعت کرتے ہیں کہ ایک ہنگامے سے دوچار ہونا پڑا، اس وقت بھی انہوں نے نہایت سادات و نجیب کے اس ادبی محسن کے قدم رکھا۔ ان کا ساتھ دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ راقم رضی کی تہذیب کے سچے گرامر کی روح کی کی کرشمہ کرتے تھے اور ان کی نظری ذات اور جگہیت ان کی دست گیر ہوتی تھی۔ اس لیے ان کا تہذیبیہ شائے پر ٹھیک جھٹکتا تھا، لیکن یہ کہ یہ سب سے انھار ان کے پیشے سے رکھا دیا ہو۔

(مختصر تاریخ ادب اردو ص: ۲۹۵)

انھار صاحب نے یہاں جو کہ ایک عمومی رائے دی ہے اور اس کی تائید مؤثر جگہیت کے انتسابات پیش نہیں کیے ہیں، اس لیے اسے تمام وکالت قبول کرنا مناسب نہ ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ جگہیت کی کڑیوں سے ان کی ذات و فطرت نمایاں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کا ساتھ دلائل و براہین پر مبنی ہوتا ہے اور جگہیت ان کی دیگر ہوتی ہے، لیکن وہیں بھی ان کی کفایت نہیں کرتا۔ اپنے نوکیلی کرداروں اور فطرت کی وہ پستی بھی کبھی کبھی اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ چنانچہ جگہیت کے مقدمات بھی ہر موقع پریشان نہیں رہے ہیں۔ بعض مقامات پر صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان کا ذہن حجاب واری اور گروہ بندی کے اثرات سے آزاد نہیں ہے۔ یہ حقیقت وجہی ہے کہ چونکہ دوزانہ سے اکثر تعصبات راہ پاتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جگہیت نے باوجود اپنی بات کا پیرایہ متین رکھا ہے، لیکن یہ سادات بھی ان کی طنز و مزاح کے منہ سے ملبوس دکھائی دیتی ہے۔ وضاحت کے چند مثالیں دیکھیے۔

۱۔ قومی جھگڑوں کے متعلق بہت نظریں اہل قصبہ شائع کیں، لیکن صرف دونوں ایسی تصنیف ہوئیں جن کا خیال قدر و دان انھیں اپنے دل سے غریب سے نہ شائیں گے۔ ایک تھوڑے سرت دہلی بندت رتن نامی لکھنؤ کی شاعری اور دوسرے سرت جو کہ حضرت بزرگ کے ذوق نظر کا نتیجہ ہے۔ سنا گیا ہے کہ یہ سرت کو میں کا ایک شعر لکھا ہے کہ لا رہیں اور میں شادان بند ہیں، ایک شب میں لکھنؤ لکھا اور وہ میں تپ کہ حالت تھی۔ مولانا حالی کا سرت بھی ایسی رنگ میں ہے۔ مگر جو کہ مولانا دور کے دل میں شاعری کی ہل نہیں دیتے، لہذا الھ کے سرت میں اس جوش و خروش کا انھار نہیں، جو کہ کچھ پہلے کا خاص جوہر ہے۔

(معانی جگہیت ص: ۲۹۱)

۲۔ گو کہ ہم کوسرہ شاد کے ساتھ مولوی عبدالمصطفی صاحب قنبر کا نام لیے ہوئے تامل ہوتا ہے، مگر چونکہ اہل اسلام کے ایک خاص فرقہ میں آپ کی شہرت بہت ہے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی طرف توجہ کا مقابلہ کیا جائے۔ افتخار پنازی کے میدان میں سرشت اور شہر سے کوسوں آگے ہیں۔ شہر کی عبادت سلیس، پاکیزہ اور دلہن ہوتی ہے، مگر قدرت سے غالی۔ وہ بات کہاں کو ہر حرف اپنے دامن میں دیکھیں ادا کی کہ بھولے لیے ہوئے ہے۔ ان کی شہر پر مقام ہمک ہندو شہر ہے غنکر ہے۔

(معانی حکمت ص: ۵۳)

مرشد اور تاجر کے مقابلے میں مولانا حقانی کے دل کو شاعری کے آگے سے محروم قرار دینا (اعتباس ص) یا کسی عبادت میں سلاست اور پاکیزگی کی موجودگی کے ساتھ ساتھ اسے ایک ننگ و شہر ہے شکر گنج (اعتباس ص) تنقیدی زبان و داری کے معانی بھی ہے اور ایک طرح کی تردید و فکری بھی۔ اگرچہ یہاں اس واقعہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ حکمت کی تحریر میں اس قسم کی تردید کی جا یا جانے والی ان کے حقائق کی مصیبت کے رد میں اس شکل میں سامنے آئے۔ مگر تنقید کی ناکہ نظر شرط یہ بھی ہے کہ اشتعال نقد و بصیرت پر غالب نہ آئے ہو۔ اختلافات کے جھگڑے میں بھی معروفیت کا دامن آس کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ جیسا کہ شہر میں عین کسب گیا حکمت کے ان معانی میں نہیں اعتقاد کا رویہ، جس کا دفاعی اور متاخر انداز نظر ان کے تنقیدی شعور کے آزادانہ اور بے لگ اختیار میں مانع ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکمت کے وہ معانی بھی ہیں جن میں انہوں نے شاعری کی شرطوں اور میٹروں کا تعلق ایک کشادہ ذہن میں اندر سے دار نقاد کی حیثیت سے کیا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے معنوں اور شاعری میں حکمت نے مغربی اور مشرقی شعری انداز کی ادبی و فنی اور شاعری کی افراط و تفریط کا احاطہ ایک ایسے تناظر میں کیا ہے جس کی حیثیت عالی اور محرم حسین آزاد کے ادبی شعور سے ایک اضافے کی ہے۔ ان معنوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی طرح حکمت اپنی روایت کے تسلسل اور اس کی وحدت کا بہت گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس شعور نے ان کی نفس ایک مخصوص عرصہ امتدادی پیرائی کی تھی اور وہ اس عرصہ میں اچھی طرح باخبر تھے کہ مختلف ذائقوں اور زبانوں کی افراط و تفریط شہر کا اوصاف کے باوجود اپنی اپنی روایات کے واسطے سے معنی استیاضہ کی حامل بھی ہوتی ہے۔ یہی استیاضات مختلف روایات کے شئسا نامے ہوئے ہیں اور اردو کی شہر روایت بھی انسانی ایک ایک رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔

مغربی افکار اور سادہ سب کے سہلی ہی اپنی انفرادیت کے دفاع کی یہ کوشش حکمت کی تنقید کو ایک نئی معنویت سے ہمکنار کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حکمت نے اپنے قدردان اس معنویت کی تعمیل و ترویج زبان و مصلحت کے ساتھ کی ہے۔ اس کی مثال ان کے سامعین کے یہاں بہت کم پائی۔ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کے کرلے

آج کل کی

سے حکمت کی آگاہی بھی بہت گہری تھی حکمت نے مختلف اصناف یا شعرا کے مطالعے میں اردو فارسی کے ہم رنگ، ہم فہم اور متحدہ اصناف یا شعرا کی مدد سے موازنہ کا ایک نیا معیار بھی قائم کیا ہے۔ ادب کی تقسیم کے معاملے میں محاسن و معائب کی پہچان کا مسئلہ کسی مطلق اور عارضی نقطے کی مدد سے آسانی میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کو بھی مستم محاسن اور معائب کی نوعیت بجائے خود اسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ نقد کے پاس اس مرحلے سے آسان گزرنے کا وسیلہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک طرح کی نقابانی نظر سے کام لے۔ حکمت نے اس وسیلے کا استعمال کیا جا بہت خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں ان کے مطالعے کی وسعت اور ان کے ذراں ذاتی و ذراں کمالی طور پر محاط ثابت ہوئے ہیں۔ قدیم شعرات کے مصولوں اور مضامین و بدائع سے باخبر ہیں حکمت کے شعور کو ایسے معنوں پر ایک مضبوط و منطقی بننا و فراخ کرتی ہے۔ شہر میں جن کی کیا تھا کہ حکمت کا شعور اپنی چند وابستگیوں کو بھی رکھتا تھا۔ ایسی صورت میں فخرنا آئے بہت واضح اور درخشاں بھی ہونا چاہیے تھا، لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ حکمت نے اپنے تناظر کی ماضیت سے قطع نظر بعض معانی میں محرک شعر و شاعری کو ایک آزادانہ پس منظر میں دیکھ کر دیکھنے کے متن بھی کیے ہیں، اس لیے ان کا شعور ان کی تمام تحریروں میں کہاں اور ایک ڈھانچا ہے۔ ان معانی میں حکمت نے اپنے مسائل ایک ساتھ دوسروں پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک تو زبان اور شعر کی خارجی ہیئت سے وابستہ سطح پر دوسرے شعر کی داخلی ہیئت یا اس کی تہ میں چھپے ہوئے احساس اور تجربے کی سطح پر۔ جہاں کہیں یہ دونوں سطحیں ایک دوسرے میں جذب ہو گئی ہیں حکمت کے مطالعوں میں گہرائی بھی درآئی ہے اور ان کا تنقیدی شعور بھی سبیل اور گہرا اور نفاذ پایا ہے۔

بحث نقد و حکمت کی تقویم و تقدیر ہمیں اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے اسلوب کا ایک جائزہ بھی نہ لیا جائے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ اس لیے مختصر آچیناسٹ روی پر اکتفا کر دوں گا۔ یہ بات بھی کہیں بھی چاہیے کہ حکمت کا اسلوب ان کی تنقیدوں میں بہت واضح اور مدلل ہے۔ لیکن حکمت بہت سادہ ایک شاعر تھے، چنانچہ ان کی تنزیہی شعر کے کئی عناصر سے مزین دکھائی دیتے ہیں۔ ہر شاعر اپنے معنوں میں حکمت نے فہم میں آزاد کے اسلوب کی تعریف کی ہے اور شہر کے اسلوب کو بے مزہ بتایا ہے۔ خود ان کے اسلوب میں آزاد کی یہ حیات کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ آزاد کی طرح حکمت کی تنقید بھی کئی تعلقات پر تکرار کو بھی کی روایت کی کوشش کرتی ہے۔ مسائل کا تالاف انداز میں بحث کر کے کہ آزاد کی طرح کی دانتے کا لکڑا اپنے منطقی اور معنوی فیصلوں کو بھی شعرا و زبان کے ہمارے ایک تاریخ میں نقل کرنے کی روشنی، یا خاص ذہنی اور اصولی مبادی کا استعاراتی اور محاکاتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش، محاسن و معائب کی چاشنی، محاسن و معائب کی چاشنی کے ہمارے کی خطابت کے ذریعہ ایک ڈرامائی خاکہ قاعدہ ظہیل — یہ رویہ حکمت کی تنقید کو دل چاہ بھی بنتے ہیں۔

حقانی کے اسلامی سیرات اور تہذیب و تمدن کے دور کی مقصدیت کے درمیان (آگے صفحہ ۲۳۳)

فروری ۱۹۸۳ء

بچے کی بھلائی عورت کا احترام ملک کی شان



تفصیلی معلومات کے لئے اس کوپن کا استعمال کیجئے :-

ڈپٹی ڈائریکٹر،
ماس میلنگ یونٹ،
ڈائریکٹریٹ آف ایڈورٹائزنگ اینڈ پبلیشنگ،
"بی" بلاک، کستور باگ، گاندھی مارگ،
نئی دہلی 110001
نئے 20 نکاتی پروگرام کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لئے
براہ کرم مجھے (مذہب/ہندی/انگریزی میں کتنا بچے روادار ہیں۔

نام _____
پتہ _____
ہسٹری _____
پس کوڈ نمبر _____

نتھ پودا بنتا کلشن
سل کی جوانی آج کا بچپن
بچہ ملک کا پاسدار ہے
اس پر مستقبل کا بار ہے

نئے 20 نکاتی پروگرام کے تحت بچوں کی صحت، بھلائی اور
مروہ نشوونما کا ایک پروگرام چلایا جا رہا ہے۔
ماں، بچے کو کھن جمن ہی نہیں دیتی بلکہ اس کی ابتدائی تعلیم
و تربیت کی ذمہ دار بھی ہے۔ اس طرح وہ صحیح معنوں
میں ملک کی معیار ہے۔
عورت اور بچوں کی فلاح پر ہی ملک کی بہبودی اور تحفظ کا
انحصار ہے۔ اس لئے بچوں کی بھلائی اور عورت کی ترقی و
احترام کے لئے اس پروگرام میں ایک نئی روح
بھونکی جا رہی ہے۔

بچے کو پر غذا خوراک تبھی میسر ہوگی
جب کنبہ مختصر ہو

نیا 20 نکاتی پروگرام

By No. D(DN) 103
R.M. 948/57

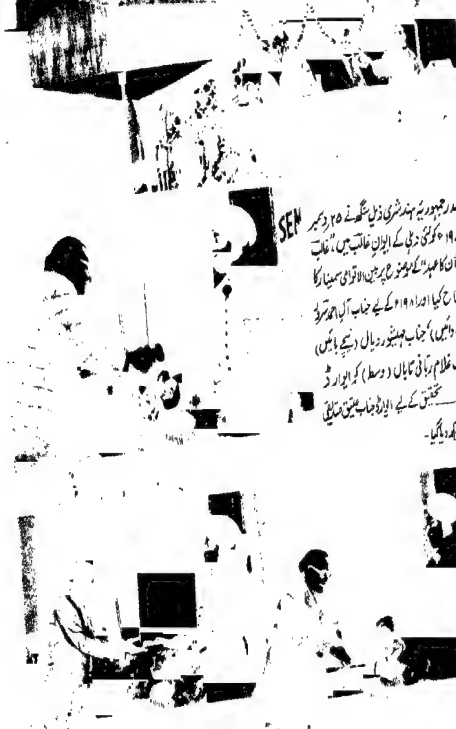
Licensed U(D) - 50 to post without pre-payment
at Civil Lines, Post Office, Delhi.

February, 1983

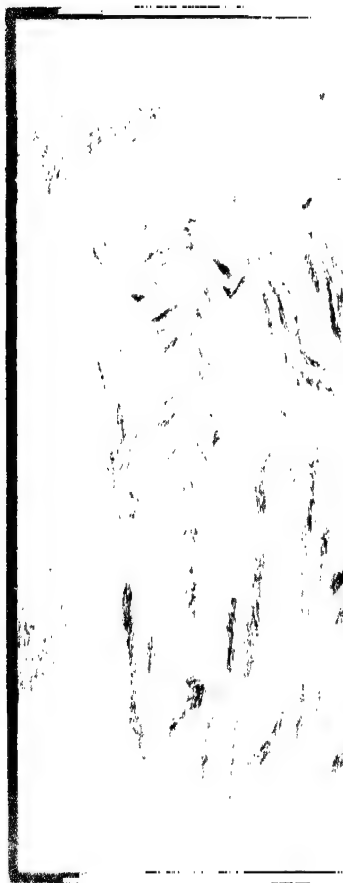
Vol. 41 No. 7

AJKAAL (URDU)

INAUGURATION OF SEMINAR ON GHALIB & PRESENTATION OF GHALIB BY S. ZAIL SINGH, PRESIDENT, INDIA DECEMBER, 25, 1982 GHALIB INSTITUTE, NEW DELHI



SEMINAR
صدر جمہوریہ ہند شری ذیل سنگھ نے ۲۵ دسمبر
۱۹۸۲ء کو نئی دہلی کے ایران غالب میں، غالت
اور آئن کا عبد "گرمینورج پر میں" اتوری سمینار کا
افتتاح کیا اور ۱۹۸۲ء کے نئے جناب آئی احمد ستر
دینچے ہائیں) جناب ہمنور دیال (نیچے ہائیں)
جناب غلام ربانی تہاں (وسط) کو ایوارڈ
دیے۔ تحقیق کے لیے ایران غالب میں متعلق
(روح مکرم) لکھا۔





وزیراعظم شری گاندھی ۳۱ جنوری کو نئی دہلی میں ہندوستان کے آئین کے آئندہ ترجمہ کا اجراء کرتے ہوئے قانون، انصاف اور کسب فیہ کے وزیر شری جی ناتھ کوشن (دائیں) اور بیرون وکھیر کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر نارون عبداللہ (وسط) ملی دیکھے جاسکے ہیں۔



وزیراعظم شری گاندھی ۱۹۵۲ء کے ہادیوں کے ساتھ شری گاندھی نے ان بچوں کو نئی دہلی میں ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو خلیہ ولسہ دھاری کے لیے تعینات دیا

آج کل



سب ایڈیٹر
شونامہ

مارچ ۱۹۸۳

شمارہ ۸

جلد ۴۱

پچانگن جیت ۱۹۰۴

فون ۲۸۷۶۹

قیمت ایک روپیہ

ترتیب

ملاحظات

مقالات

۳۶	آر جی ایف / ایس۔ ایم جی	۲	علاقائی ادب
۳۷	یہ رشتے یہ بندھی جن کہانی	۳	حبیب رضوی
۳۸	ہندی نظیں: پیپر۔ تاج چھوٹی نظیں	۹	عابد سہیل
	رام داس شراشریہ یادگار، کیرلا ناٹک	۱۵	اکرم عثمانی
	نئی کتابیں		
۳۱	پکبت: حیات اور ادبی خدمات	۱۹	نارنج پرنٹنگ پرس
	کلیات پکبت (نظم)		
	پکبت اور ایمانیات پکبت	۲۰	انتر فصاحت
	انتخاب آتش و قاب		
	نور آج ہم ہیں	۲۱	بشیر پیر، غفران بیگ
	پہن چہار	۲۲	شہیرا پروسی، مہنا منظر، دیبک تر
	تغییر اور علمی تنقید		
	عشق کا چاند تھیرا	۲۳	امیر خسرو
	آپ بھیں ترستی ہیں	۲۵	ذکر شہیدی
	شہید کلاچ میگزین (مصائب)	۳۰	مسیحہ اوزر
	احسان و ادراک		
	مکتوبات	۳۲	پردیزہ میمن
۳۸	کاظمی خاں، حجاب بائی، محمد صغیر عالم		
	انتقام، بچہ، سپین میاں		

نظمیں

زما۔ عجز نظر

غزلیں

بشیر پیر، غفران بیگ

شہیرا پروسی، مہنا منظر، دیبک تر

افسانے

موت

آپنی اپنی

دو ایک کورس

طنز و مزاح

نکارا بہ ناکار

مردوق: تشکیل شرفاء، صادقین

آرٹ: محمد عتیق اودھ

پرنس نیو ویس۔ ایل جی سیال۔ اسٹنٹ پرنس نیو ویس۔ ایل۔ جی۔ پتو۔ اسٹنٹ فارمٹر (پروفیشن)۔ کے۔ جی۔ کرشنن

ترسیل زر کاہتہ

مطالعہ کے متعلق خطوط، کتابت

پرنس نیو ویس کے پبلشرز ڈیون پبلشنگ کمپنی

پرنس نیو ویس کے پبلشرز ڈیون پبلشنگ کمپنی

ہونا یا جانے لگا۔ اس سلسلے میں آندھرا پردیش اور اڑیسہ میں پروگرام کی تیارہی اور ٹرانسمیشن کی سہولیات مہیا کیے جانے کی تجویز ہے۔

مذکورہ سال کے دوران حکومت نے دور درشن سے "اسپیڈ نیو پروگرام" شروع کیے جانے کی بھی منظوری دے دی ہے۔ اس پروگرام کے عین دوسرے ہٹاؤں کے ہیں۔ کینیڈین یا فرموشلی کی طرف سے پروگرام ترتیب دینا کینیڈین یا فرموشلی کی طرف سے غیر ملکی پروگرام درآمد کرنا، اور دور درشن کی طرف سے پروگرام تیار کرنا نیز انہیں پیش کرنا۔

حال ہی میں حکومت نے دور درشن کے لیے ایک ورکنگ گروپ تشکیل دیا ہے جس کے صدر اقتصادوی ترقی سے متعلق ادارے کے ڈائریکٹر ڈاکٹر بی۔ سی۔ جوشی ہیں۔ اور اس گروپ کا ایک خاص کام یہ ہے کہ وہ اس بارے میں سفارشات پیش کرے کہ ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں پیش قدمی اور پیش قدمی کی طرح مدد کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ گروپ قومی درشن کو اطلاعات اور تعلیم پر عوام کی دلچسپی کا ایک موثر ذریعہ بنانے کے لیے بھی سفارشات کرے گا۔ گروپ سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہری اور دیہاتی علاقوں میں پیش قدمی دیکھنے والوں کی ضروریات کے مطابق قومی درشن شروع کرنے کے سوال کا بھی جائزہ لے اور اس کے لیے ایک ڈھانچہ تشکیل دے۔ ساتھ ہی ساتھ قومی درشن پر دیگر کاموں میں بہتری لانے کے لیے بھی اقدامات کیے جارہے ہیں۔ سنسنے پر پروگرام شائع کیے جارہے ہیں اور پائے پروگراموں کو نئے سے نئے ترتیب دیا جا رہا ہے۔ تاکہ انہیں دیکھنے میں دلچسپی برقرار رہے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ قومی پروگرام کی منصوبہ بندی کرنے کے وقت دور درشن میں امریکی تقابلی بنانے کے پروگرام شامل مدیا کے لیے نیز انہیں ملک میں پسند کیے جانے والے اور لیا جائے۔ قومی پروگرام میں خاص زور اس بات پر دیا جائے کہ بین علاقوں میں پروگرام دیکھے جا رہے ہیں، اس علاقے کے عوام کی ترقیاتی، اقتصادی سرگرمیوں اور دلچسپی کا پتہ پورا خیال رکھا جائے۔ قومی پروگرام کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ پسند، مذہبی، علاقائی تفرقہ بیہودہ، سائنسی مروج اور ثقافتی و کفر و فتنہ دھما جائے۔

ملاحظات

ملکی ہوا۔ زیادہ سے زیادہ علاقے میں ایشیائی کھیل دھانے کی طرف سے دو چھپنے سے بھی تیل مدت میں کم طاقت والے ۲۰ "ریسورس" نظام قائم کیے گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء کو دور درشن کے پاس ۲۰ ٹرانسمیٹر تھے۔ آج ۳۱ مرکز ہیں۔ جن میں شمال مشرقی خطے میں، اور پورٹ بلیم میں ایک بڑے مرکز بھی شامل ہے۔

رنگین ٹیلی کاسٹ

حکومت نے اپریل ۱۹۸۲ء میں فیصلہ کیا کہ ضمنی ٹرانسمیٹروں سے ایشیائی کھیل رنگین پیش کیے جائیں۔ تاہم ۳۱ مئی سے ۲۰ ٹرانسمیٹروں کے کھیلوں کو رنگین ٹیلی کاسٹ کوں ملے ہو گیا۔ حکومت نے حال ہی میں رنگین پروگرام جاری رکھے اور ان میں بدترجہ اضافے کا اعلان کیا ہے۔ چھپے منصوبہ میں بھنگور، اھمکابو، ترلویندرم اور گواٹی میں ٹی وی کی سہولیات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ آٹھ بڑے مرکزوں سے براہ راست رنگین ٹیلی کاسٹ کے انتظام کے سلسلے میں بھی ایک اسکیم پر عمل جاری ہے۔

خیال ہے کہ اسٹیٹ ایکٹیو جوائنٹی یاگٹ ۱۹۸۳ء تک کام کرنا شروع کرنے لگا۔ اطلاعات و نشریات کی وزارت اس منصوبہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے بندوبست میں مصروف ہے۔ چھپے منصوبے کے دوران اسٹیٹ راجیکٹ کا آندھرا پردیش، اڑیسہ، جھارکھنڈ، گجرات، بہار اور اتر پردیش کے منتخب اضلاع میں عملی جامہ

وزارت اطلاعات و نشریات کی کامیابیاں

ملک میں رنگین ٹیلی وژن کی شروعات، دہلی علاقوں میں ٹی وی ایشیائی کھیل دھانے کے لیے اسٹیٹ II منصوبہ سے آندھرا اور ٹی وی خدمات کے لیے اسٹیٹ سٹیٹ کا استعمال ملک کے مختلف حصوں میں دور درشن کی جانب سے کم طاقت والے ۲۰ ٹی وی ٹرانسمیٹروں کا قیام۔ ٹی وی پر قومی پروگراموں کا آغاز اور دوسرے پریکٹیشن کی طرف سے اپنی سفارشات پیش کرنا اطلاعات و نشریات کی وزارت کی ۱۹۸۲ء کی کچھ خاص کام نمایاں ہیں۔ یوم آزادی یعنی گزشتہ برس ۱۵ اگست سے ٹی وی پر پروگرام پیش کرنے کے لیے اسٹیٹ کا استعمال شروع کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد آندھرا پردیش، اڑیسہ، جھارکھنڈ، بہار، گجرات اور اتر پردیش کے ۱۵ اجزاء سے ناممکن سہولیات کو ٹی وی کے دائرے میں لانا تھا۔ جہاں پہلی پہلی گئی ہے۔ ستمبر ۱۹۸۲ء کے پہلے چھپے میں اسٹیٹ اسے تاہم جو گیا تو حکومت نے اسٹیٹ سٹیٹ کے تعاون سے ٹی وی کی سہولیات پہنچانے کی خاطر ایک ملکی کمی منصوبہ مرتب کیا۔ اس کمیٹی نے ہوا کہ ملک کے وسیع و عریض علاقے میں ٹی وی ایشیائی کھیل براہ راست دیکھے گئے۔ یکم نومبر ۱۹۸۲ء سے ایک سال کی مدت کے لیے ٹی وی ٹرانسمیٹروں کے لیے گئے۔ ان کی مدد سے دور درشن کے تمام ۱۴ مرکزوں سے ایشیائی کھیل براہ راست دکھانا

دیں انشا اللہ تعالیٰ کے وزیر مملکت کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کا مقصد قومی پروگرام میں مسائل کی جانچ و نظر اور توسیع کے پروگرام میں بہتری لانا اور اس سلسلے میں متوازن کاروں کا ایک پتیل بنانا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو

اس وقت آل انڈیا ریڈیو کو سب سے اہم اور خاص کام یہ درپیش ہے کہ وہ اپنی نشریات کو مستحکم اور صاف ستھارے کرنے کے اقدامات کر رہا ہے۔ کیوں کہ قومی کھیلوں کی نشریات سے آل انڈیا ریڈیو کی نشریات متاثر ہوتی ہیں اور وہ صاف ستھاری نہیں دیتیں۔

غیر ملکی نشریاتی تنظیموں کی طرف سے غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے شمال مشرقی خطے میں نشریاتی نظام کو مستحکم کرنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ چھٹے منصوبے میں اے۔ آئی۔ آر کے چھ مشین قائم کیے جا چکے ہیں جن میں سے تین شمال مشرقی خطے میں قائم کیے جائیں گے۔ اور باقی پڑوسی کے مقام ایٹانگر میں چھائیے کے قریب اور کم کے ٹنگٹونگ مقام پر یہ مشین قائم کیے جانے والے ہیں۔ شیلنگ، گوبائی اور بلیر گڑھ کے ٹرانسمیٹر کی ترقی بڑھانی جا رہی ہے، تاکہ اور زیادہ وسیع علاقے میں ان کے پروگرام سنے جائیں، شیلنگ، گوبائی اور بلیر گڑھ میں باہر تہب ۱۰۰-۵۰-۲۰ کیویٹ میڈیم ویو ڈی کے ٹرانسمیٹر لگائے جائیں گے۔

حکومت نے آل انڈیا ریڈیو اور دور دراز کے اسٹیشنوں کو روزمرہ (راے) اسٹیشنوں اور (بی) میڈیا بنانے دیا ہے۔ آخر کار گزشتہ برس میں وہ لوگ آئے جس میں جسر اور ملازمتوں جیسے کام آئے ہیں انہیں باقاعدہ بنائے جائیں گے۔ ان اقدامات سے اسٹیشنوں کی ترقی کے روشن امکانات ہوں گے۔

پریس

حکومت پریس کی آزادی پر یقین کامل رکھتی ہے۔ اور اس پر سختی سے کاربند ہے۔ ہندو جیسے حکومت میں جمہوری اداروں کے لیے پریس کا کردار بحالیت

کا حامل ہے۔ اور اس سلسلے میں انہیں میں بھی ضمانت دی گئی ہے۔ بہادر پریس سے ہمارے اس یقین کو اور بھی تقویت ملتی ہے۔

اطلاعات و نشریات کی وزارت کی یہ منظوری دے رہی ہے کہ اگر غیر معیاری اور اچھی صحافت پر قبضہ پایا جائے تو یہ خوبصورت مذمت صحافت کے فروغ کے خلاف میں ہوگا۔ ملک کی پریس سے متعلق جن سرگرمیوں میں مشغول کیا گیا، اُن کی کبھی بھی رائے کبھی اور اچھی صحافت پر قابو پایا جائے۔ متعدد تنظیموں کی طرف سے وصول ہونے والی عرضداشتوں کے بین نظر اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت شری این کے بی سالو نے پریس سے متعلق تنظیموں کے نمائندوں کو مدعو کیا اور ملنگ اسٹائے کا اظہار کیا کہ بھارت میں بلایو پیکر روویل کی گنجائش ہے۔

دوسرے پریس کونسل کی رپورٹ نومبر ۱۹۶۸ میں پارلیمنٹ کو پیش کر دی گئی۔

حکومت نے اپنی اس پالیسی کا اعلان کیا ہے کہ وہ جوئے اور دھماکہ زربے کے اخبارات کی مدد کرنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ وزارت نے ۸۳-۱۱۹۰۲ کے لیے اخباری کارکنوں کی پالیسی کا اعلان کیا ہے، اس میں جوئے اور دھماکہ زربے کے اخبارات کو مستند بات دی گئی ہیں۔ حکومت کی اشتہارات سے متعلق پالیسی بھی اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ اس سے جوئے اور دھماکہ زربے کے اخباروں کو زیادہ فائدہ پہنچے۔

ریاستوں کے ذریعہ اطلاعات کی سہولتوں کی کافر نس جولائی ۱۹۶۲ میں منعقد ہوئی تھی۔ ملک میں اطلاعات اور مواصلات کے نظام کی توسیع نیز اسے ترقی دینے کی غرضت اور پر تامل خیال کیا گیا۔ کافر نس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ قومی انعام جیسے دلائل اور جرائد کی نمونہ کو لکھ کر نہیں سے شے فرار سے دیا جائے۔ کافر نس میں خیال ظاہر کیا گیا کہ دیہی اور مقامی عوام کے لیے ٹی وی ڈائری ایک موثر ذریعہ ہے۔ کافر نس نے ۵ راکٹ ۱۹۶۲ سے ڈیڑھ کروڑوں کے انگریزی اور ہندی میں ۹۰ منٹ کا روزانہ قومی پروگرام شروع کرنے کی ہر کوئی وزارت کی تجویز منظور کر لی (اب یہ پروگرام شروع ہو چکا ہے) حکومت انٹ

ایک اے اور ایچ او ویو کی سہولیات سے فائدہ اٹھانے پر کوششیں کر رہی ہے، کافر نس اس کی بھی تعریف کی کہ۔ کافر نس نے اطلاعات و نشریات کی وزارت کے مختلف شعبوں کی ان کوششوں کی بھی تعریف کی ہے جو وہ ریاستی اطلاعاتی ذرائع کا ساتھ مل کر کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔ کافر نس نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ مرکزی ذرائع ایسا کر مختلف امور جیسے قومی کمیٹی، فزٹے لائز، ہم آہنگی کے بین نکاتی پروگرام اور مواصلات کے سلسلے میں کام کیا جائے۔ قومی انعام کے لیے ریاستی ذرائع ایسا کر زیادہ سے زیادہ فعالیتیں بہتار کرنے کا ایک طریقہ وسیع کرنا چاہیے۔

ہندو غیر عوام دارملکوں میں اطلاعات کے بیلڈو صوبہ کے غیر جانب دارین حکومتی کونسل کے ماہرین کے گروپ کی قیادت ۱۹۶۸ کی دو میٹنگوں کا انعقاد کر کے ذرائع اطلاع میں بین الاقوامی تعاون اور اشتراک کو مزید فروغ دیا ہے۔

وزارت کے تحت سرکاری شے کی نمونہ کی تصاویر سے متعلق قومی کارپوریشن فلم سازوں کو سرمایہ فراہم کر کے ان کی مدد کر رہی ہے۔ سرپرچہ این براؤن کی طرف سے جاپان کا گزشتہ تیار کی گئی فلم مرکز مصلحہ کی ایک حصہ ہے۔ جسے برطانیہ اور دیگر ملکوں کا لاکار پوریشن نے بنایا ہے۔ اس فلم کا ۲۰ نومبر کو پریس میں ادا دیا جائے گا۔ ۱۹۶۸ کے آخری ہفتے میں جاری فلم کے دیگر کردی گئی ہے۔

دیگر خاص باتوں میں ملک میں منعقد فلم اسٹوڈیو قومی فلموں کا اشتہار سلیڈ سلیڈ اور میکینیکل فلموں کا سلیڈ مل میں۔

ہندوستانی انہیں کا اردو ترجمہ

۱۲ جنوری کو نئی دہلی میں ایک تعریف میں ہندوستانی انہیں کے اردو ترجمہ کی رسم ادا کرانے کے لیے قومی انعام پریس انڈیا گاندھی نے کہا کہ ملک کے انہیں کے ترجمہ ہندوستانی میں ہونا چاہیے تاکہ ہر کوئی اس سے فیض یاب ہو سکے۔



پہیلیوں کی ہندوستانی روایت اور امیر خسرو

ایک بچہ لال بھجور کا
جئے اور مان کو کھائے
مال مرے اور خود بھی مر جائے

خود کو از کونے کے لیے اسے ختم کر رہے جب مایا ختم ہو جاتی ہے تو یہ بچہ بھی مر جاتا ہے۔ اس کی موت فزول نہا ہے۔ جڑوں میں تھیلے ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ بیلہ اپنا وجود ختم کئے دیا میں لیا جاتا ہے۔

ویدوں میں خالقا، زمان و مکان، ذات و صفات، جزو کل کو سمجھانے کے لیے ایسی ہی پہیلیوں کا سہارا اکر لیا گیا ہے، اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی کہ ایک بہیم خیال کو، بہام کی زبان میں عقل و فہم کے قریب لایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کی پہیلیاں اپنشدوں میں بھی بھجائی گئی ہیں :

ایک پڑا اٹھا ہلکا
اور پڑا نیچے پست

اسے آپ سورج کہہ سکتے ہیں۔ سورج اوپر ہے، لیکن اس کی دھوپ نیچے پھیلی ہوئی ہے۔ ریشی کا مطلب سورج سے نہیں ہے۔ اس میں تخلیق اور تخلیق کار کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ اس میں وعدہ الوجود کا فلسفہ بتایا گیا ہے۔

اس میں کائنات تخلیق نہیں ہوتی بلکہ ذات کا ہی ظہور ہے۔ اس کی ہی برسیلا ہے۔ یہ اُسی سے نکلے ہے۔ اور پھر نوٹ کر اُسی میں مل جائے گی۔ اس اُٹنے و رفت کے ذریعے ہی پختہ بیان کیا گیا ہے۔ جڑ ذات مطلق ہے۔ اُپنشدوں میں ہر نام کا تصور ریشی کی شکل میں پہلی کیا گیا ہے اور اسی کائنات کا درخت نہاں ہے اور اس کی پودہ و پھول ہوئی ہے۔ اسی درخت کی پتیوں کا کائنات ہے۔ طوطی کا تصور بھی کچھ اسی طرح کہ ہے۔ اس کی بھی جڑیں آسمانی جنت میں ہیں اور اس کی شاخیں زمین پہلی جنت تک پھیلی ہوئی ہیں۔

پرفوں کا خاصا راز و معنی ملا ہے اور اس میں مگر جگہ پہر ہیسیاں بھجائی گئی ہیں۔ ان میں ایک ہی وحدت الہی ہے اور ہر موی بھی۔ مایا ہر موی تخلیق کائنات کی طرف سے وجود میں آتی ہے اور پھر وحدت کی شکل میں خود کو ظاہر کر کے فراوانیوں کے پورے اس رنگ پر موی کائنات کو پیدا کرتی ہے۔ ان راز ہائے پنهان اور راز کو دھندوں

آپ اس پہیلی کو دھونے یا نہیں، میں نہیں جانتا کچھ بھی ناختم نہ تھیں تو کی طرح میں آپ پر آگیا تھی ہونے کا فتویٰ صادر نہیں کروں گا۔ اس پہیلی کی گرد میں ہی کھولے دیتا ہوں۔ جی چاہے تو آپ مجھے لال بھجور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ آگ ہے۔ یہ لکڑی سے پیدا ہوئی ہے، اسے لکڑی اس کی مال ہے۔ آگ جلنے ہی لکڑی کو کھاتی ہے۔ جب لکڑی ختم ہو جاتی ہے تو آگ خود بھی کچھ جاتی ہے۔

لیکن یہ پہیلی ہرگز نہیں ہے۔ یہ مقدس رنگ وید کی ہے چاہے۔ میں نے اس کے صرف مسکرت روپ کو عام فہم بنانے کے لیے اردو یا ہندی کے قاسب میں ڈھالا ہے اور کوشش کی ہے کہ اُسے جوں کا توں آپ تک پہنچا دوں۔ یہ پہیلی ہے، لیکن سی ڈی ضوئے اسے یہ نام نہیں دیا۔ یہ تو ایک مقدس کتاب کا ایک مقدس پیغام ہے۔ اس کے ذریعے تخلیق کائنات کے گور کو دھندوں کو ہمیں سمجھانے کی کوشش جاوہرشی نے کی ہے۔ ویدوں کے مطابق ذات مطلق کھن فوہ ہے اور ریشی مٹھ ہے، اس لیے مایا کو پیدا کرنے کے لیے اپنی مشیت وہ ودیت کرتا ہے اور مایا کائنات کی تخلیق و تعمیر اور قریب کلام ہر انجام دیتی رہتی ہے۔ اس طرح مایا سب کی ماں ہے۔ وہ رونا کی تخلیق کرتی ہے۔ لیکن یہ رونا زور و غل کا ہی ثبوت ہے۔ ثبوت دریا میں نہا ہونے کے لیے تڑپنا ہے۔ تڑپنا اپنے غریب کی طرف جانے کے لیے ہے فراوانی ہے، لیکن مایا اور وہ مایا اسے گھیرے ہوئے ہے۔ اس بند میں کو توڑے بغیر وہ اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے یہ لال بھجور کا بچہ، تھوڑی دُور اپنی ماں کو کھاتا ہے۔

• صدر رشتہ ہندی، جامعہ اسلامیہ، لاہور، ۱۱۰۲۵ھ

کو ملاستوں کے ذریعے ہی پیش کرنا ممکن تھا۔ بالکل میں براہم ایک ملاست ہے۔
 نیکین کسی نے دعووں، اُپنھندوں اور پالوں کے اس طرز اظہار کا کچھ نہیں
 کہا۔ مہی کی تہذیب کو کچھ نہیں لکھا گیا۔ پھر حضرت ہوتی ہے کہ حضرت ابرہہ رحم
 کے ہندی کلام کی طرف یہ رویہ کیوں اپنا یا گیا۔ کس وقت اور کیسے ان کے کلام
 کو یہی کہہ کر بدھ متی کلادو دیو گیا۔ ان کے کلام کی سمجھدگی اور روحانیت کو خیر باد
 کہہ کر حضرت ابرہہ سہو کو یہی رویتور کرنا لگا۔ ہم اپنے اس کہہ جی کے طبع دار کے
 ساتھ اس سے بڑی زیادتی نہیں کر سکتے تھے۔

بات کی بات ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی

سائل مرد ہے، یہی مرد عاشق ہے، یہی ہندی صوفی شعرا کا پریم پُرکھ ہے۔

آج کل نئی دہلی

یہی اللہ جل جلالہ کا ارادہ کر کے دیکھتی ہے۔ وہ پریشان ہوتی ہے کہ اپنے نوٹس کو کیسے
 رکھانے لگی، اس کا سامنا کیسے کرے گی اور نہ کیسے دیکھانے لگی۔ اس کا سہیلی
 سامتی کوئی نہیں ہوگا۔ کوئی کبھی سخی تعلقات دنیاوی! اس کا ساتھ نہیں
 دیں گے۔ صرف ساتھ ہوگی اس کی سہیلی اور بدیہی حضرت امیر نے اس سلاطیت کی پاسداری
 بھی اپنے کلام میں کی ہے اور اس خیال کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے :

خوب نہیں ایک اوٹن خوب تر ہے، کہنے کو نذر ہوا
 خبر ہے جسے سرسراہی، بھی رنگ نہیں کوئی آنی

ایہ خصوصیات ہیں کہ وہ دودھ اٹھل سر کے
یہ سب اور ذکر و غیبتی ہے جو عجائبات کو، خدا اور اہل طہن کو کاشی ہے اور
دوئی کے تمام پڑے حکم کر دیتا ہے:

ایز خیموں کے وہ دو انگل سر کے

جو سالک انہما کے درجے کو حاصل کر لیتا ہے وہ ظاہری لباس اللہ کو دینا ہے بے پردہ ہوتا ہے۔ وہ تمام تر مادی وسائل اور دھرم اسباب سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسی حالت میں وہ وحی کی طرف حضرت امیر کے اشارہ کیا ہے:

ابیتا کیس بنی منگی کر دی نار

”موتی“ ایک ایسی علامت ہے جس کے ذریعے صفات ذات کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور صفات انسان کی طرف بھی خمریوں نے وہی طرح اس علامت کو پہنچا ہے۔ تاہم ان کے یہاں یہ خمریہ جب تک نہیں تھا تو صرف اس علامت سے پہنچے انہوں نے انسان کے پہلے صفت ذات کی طرف اشارہ کیا کہ موتی کے ذریعہ کہ یہ عاتق ہی سہا تھا ان صفات کی چمک و رنگ اکثر توجہ دہنیا اور اسلوب کی طرف بھی اعلیٰ اشارہ و نصیحت الہیہ کیا ہے :

چاروں امدت خالی بھرے، سو قیاس سے ایک نہ گھرے

مکمل (آسمان) نامتوں کے یہاں برہم نہر (جلہ انساہ) کی علامت ہے اور کبر کے یہاں اودھانکوں ہے۔ خروٹ آسمان ایزوتی کی علامتوں کے ذریعہ ایک ساتھ ہی کی باتوں کو بیان کر دیتا ہے:

والا مسلک برہمنی کے ایک پسر کی آمد ضرورت ہے۔ اس کا ذکر پارکرنے کے لیے ایک ملاح دیکھا ہے۔ یہ دنیا جو سارے، بھولوں کا سمندر ہے۔ اس سے پھر ہی ہاتھ بچ کر بچا کر انا رکھتا ہے۔ بہت سے پران طریقہ کو دیگر بھی کہا جاتا ہے۔ اور مسٹر موہن کو بہت ہی ناؤ کھا گیا ہے یعنی علاج کی اڑائی بہت جلدی ہے۔ اس کے لیے خدائی اشیاء کو بنا کر دیتا ہے۔ اپنا وجود اپنی فزوی اور اپنا سب کچھ اُسے سنبھالنا پڑتا ہے۔ ملاح (خود غرضی) وجود ہے اور بے ملاح ہے، ایسا ہے۔ خروٹ اپنے حال پر گریہ و زاری کرتے ہوئے پارکرنے کے ملاح کی پستی کرتے ہیں۔

مجان سے ملاح کو ہم کون پارانا

ملاح کا دیسوں کی دنگا مٹی کا دیسوں کی بار

دیکھ میں اپنے حال کو کو دوس جا بجا

لیکن قسمت سے ہی کوئی ملاح ملتا ہے۔ ملاح اُن سے کوئی گرو اور پیر قوت کرتا ہے اور اُن سے ایسی سے گرو کی کو ایسے پرل دیکھ کر صیب ہوئی تو وہ ملاح سے دیتا ہوا جاتا ہے۔ کیرے ٹھیک ہی کہتا ہے۔

بھاری گڑا اپنے قوت کو خوشیوار

ماس سے دوتا کرا، کرت، زلال بار

لیکن پیر راہ بنا سکتا ہے۔ اس پر خود راہ واقع کے ملاح کو چھٹا کر تا ہے۔

یہ ٹھٹ (مقام مشق) کی ڈگر (راہ مشق) بہت ہی مشکل ہے اور شرا بہ مشق (گھما) سے ملتی (وجود) کو سمجھنا بہت ہی مشکل ہے۔ مشق کی چوٹی ہے، وجود فنا ہو جاتا ہے۔ تبھی اس گھوٹ پٹ کی لاچ رہتی ہے۔ تو اُن اکثر حضرت امیر کا یہ کلام گاتے ہیں جس میں انہیں خیالات کا صاف مٹا سکتا ہے۔

بہت مشکل ہے ڈگر ٹھٹ کی

کیسے میں بھولوں اور صاف مٹا

پڑیا ہم کو میں جو مٹی مٹی

دو دو چپ موری مٹکی پٹکی

خروٹ ختم کے بل بل جائیے

لاچ راہی موری مٹکی پٹکی

اس مٹکی کا ذکر کبر داس کے یہاں بھی ملتا ہے، ان کے یہاں یہ مان کی مٹی ہے۔ اور جسے چٹے پاتیم سے صحبت نامک ہے۔

مان ہی کی مٹی سر پہ ناک پوجہ موری

مٹی ٹپک موری تم سے صاحب کبر موری

حضرت امیر کی قسمت سے انہیں حضرت سلطان الاولیاء مل گئے، تھے، لیکن ہر ایک کی اپنی قسمت کہاں۔ پیر مونا آسان نہیں ہے۔ وہ پیر ہو سکتا ہے جو پرانی پیر سے واقف ہو۔ ورنہ میرے لفظوں میں وہ کا فر ہے پیر ہے۔

کبر سوئی پیر ہے جو رحمت پر پیر

جو پیر پیر ہے جو کافر ہے پیر

لیکن گستاخ کو کہہ بخسروی میں بھی بگڑا گستاخوں کی کمی نہ تھی۔ ان کی صفائی اور پتی ہوئی ہے، یہ رنگ کے صاف ہیں، من کے نہیں، ان کے دلوں میں دوتی کا راج ہے۔ یہ پاپ کی کھاں میں خروٹوں کی خور غیری ہے:

اُقبل برن اودھن ایک جیت دودھیاں

دیکھت میں مادھو ہے پڑ پڑ پاپ کی کھاں

یہ پیر جسم پر کل اور گئے میں فقر کی جھولی ڈالے دوسروں کو کھٹا کر رہا ہے۔ اور اس کے چٹا ہے کھیر اس کے طبع ہے۔

سر پٹ لگے میں جھولی، کسی گرو کا چپ جلا ہے

بھر بھر جھولی گھر کو دھارے اس کا نام بیلا ہے

ایسے ہی ہر دھوپوں کو کبر داس نے بھی لٹکا رکھا ہے:

مالا پیری ٹپک لٹکا لیا میں جٹا بڑھاتا ہے

انتر کرے لٹکا لٹا رہی یوں نہیں صاحب ملتا ہے

عورت اور مرد کے تعلقات پر مٹی کی خامزات کو بھی روحانی اعتبار کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ پچیس (مرد مٹی) ہے۔ ماری خواہش نفس ہے، مایا ہے۔ یہی خواہش دنیا بھی ہے، اسی سے وہ دینے والی ہے۔ خروٹ ناری کو کدو، روجہ کل اور دوسرے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ نیچے حضرت امیر نے اس کے مایاوی روپ کو بھی پریش کیا ہے اور اُن کا تعارف خاص بندوسانی ہے۔

ایک پُرس او لولا کھ ناری، بیج پڑھیں وہ جزا ساری

بجے پُرس دیکھ سنار — ان ناریوں کا یہی سنکار

کچھ خواہشوں کا دل ہے، ناریاں اور تریا میں (عقوتیں) خواہشات میں اور ان پر یوگ (تبعہ) کر کے کی پُرس خود کو کھسم کر دیتا ہے۔ مادہ جل جانا ہے اور مرد کامل ہو کر ان خواہشات کا حاکم بن جاتا ہے۔ پہلے وہ ان کا داس تھا اب سوا ہو جاتا ہے۔ اس طرح سہاگ والی پونا ہی ان ناریوں کا سنگار ہے۔ تبھی ممکن ہے جب مرد (مالک) نار (اُنک) میں جل جانا ہے، خود کو پالیتا ہے۔ خودی اور انا کو را کھ کر دیتا ہے۔ تبھی وہ ان ہزاروں ناریوں (خواہشات دنیاوی) پر قابو پاتا ہے۔

ایک پُرس ساہنار، نار جلے پُرس، دیکھے سنار

بہت جلدے او پروسے را کھ، اب ان ناریوں کی پوسے سا کھ
پُرس جب مٹی پر آتا ہے تو ان ناریوں (خواہشات) سے آشنا کرتا ہے۔

جسم انسانی ایک مکان ہے جس میں جو کچھ نہیں ہے اس گھر کے دہم و دھج اتر گئے ہیں۔ اس کا فرض آگ لگے اور ادا پر یہ پانی سے ڈھکے، دھگ لٹس ہے اور پانی چاہے اور صلابت ابدی ہے۔ اس بات کو گور کو نہ تھنے زیادہ وضاحت سے کہا ہے:

گلن مثلہ میں اندھا گوزن تباہ است کا باسا
حضرت امیر خسروؒ نے اسی خیال کو اپنی ہندی میں پیش کیا ہے:

شجرہ کارج بنائیک مندر، برون نہ جاوے اس کے اندر
اس مندر کی ریت دھانی، بجاوے آگ اور لٹھ پانی

ناحقوں اور مدھوں کے یہاں گھر روشننا ناڑی ہے۔ اگنی کندھ لٹس ہے۔ جل سادیت ابدی ہے۔ روشننا ناڑی کو یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے جانکے اور برم و بندھری پہنچا ہے۔ وہیں چارے ملاقات ہوتی ہے۔ جہنم ہو جائے اور صل نصیب ہوتا ہے۔ پردہ پردہ کچر خستہ سے عبادت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اہمیت کس طرح نصیب ہوتی ہے۔ اور جو کس طرح اپنے ساد کی طرف لوٹنا ہے:

اگنی کندھ میں گھر لگا اور جل میں کیا فلاں
ہرنے پر نہ آت ہے اپنے بیا کے پاس

روشننا ناڑی ہی اپنے ساتھ لڑکے جتنا یا سورج جاندو ناڑیوں کے نیچے بیٹھی ہے۔ ان دونوں کے بیچ سے نکال کر کوئی اکیس اس میں ہیں پہنچا ہے جسے ہم نہر کہتے ہیں اور جہارت کا گزرا ہے۔ جو ایسا کر پاتا ہے کہ اسے ہی سادیت ابدی حاصل ہوتی ہے:

ایک ناڑ کو بے بیٹھی، ڈھیری ہو کے بن میں بیٹھی
جس کے پیٹھے آئے پہلے، خروا کی کے بل بنی جائے

ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے نام تو بیٹیوں کے ہٹ لگی ممل سے پہری واقفیت رکھتے تھے۔ یہی نہیں وہ سور اور سے یوگ کے بھی جانکار تھے۔ جیسا کہ انہوں نے اشارتاً نہ نہیں کیا ہے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ناک کے دائیں اور بائیں ٹکرے چپٹے ہر مین سادوں کو گڑی کی جینیں کوئی کہتے ہیں اور اگر کامیں دکھاتے ہیں۔ حضرت امیر جی کے اکلہ جگانے اور بھی پوچھنے سے بھی واقف ہیں۔

دو در سے سور سے اکلہ جگانے بصورت ہر کے ایک لگا دوے
سنگی چھوٹے چھوٹے ہو گئے لے کھی سا جیہ؟ ناسمکی جوگی

لیکن سارا زہد و تقویٰ یوگ اور تپا کر کھوں میں ختم کر دیتا ہے۔ عالم، زاہر، مہاتما مشکل سے ہی غور سے سوچ جائے۔ یہ عر زمان کی ریامت کے کھیل کو کھاتا ہے۔ ریامت اور تپا کر کھوں کھیرے، جسے بہت مشت سے پکا یا جاتا ہے۔ جہر کے دو چکر کھایا جاتا ہے، لیکن کر کاتنا اسے اکل کھاتا ہے۔ نہ بار بار جہاتما دھول (حق) کو کھایا کران و گران کر تارہ جاتا ہے۔ حق سے دُور مانع جاتی ہے اور انسان کا وجود کھار کھار جاتا ہے حضرت امیرؒ نے اسی حقیقت کی

آئین خی دی

نشانہ ہی کہ ہے:-

کھیر کیا کی متی سے اور چر دیا جلائے
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی دھول بجائے

حضرت امیرؒ میں تھے اور صوفی کا مسک آتش جہر کتر کرنا ہے۔ جہاں کی اندھری رہیں یہ گوری بہیم کو کچے نیز نہیں کاٹ سکتی۔ اس کی تمام ریامت اسی کے دیوار کے لیے ہے۔

سنگی پیا کو جیس۔ دیکھوں کر کیے کاٹوں اندھری رہیاں
سوئی بج آئے ڈرائی ہے اور بھر کی آگ اسے سانپ بن کر ڈرتی ہے:

سوئی سیج ڈراون لاگے

ہو کی آگ ہو کے ڈس ڈس جائے

آتش جہر نیز نہ ہوتی ہے اور اس کا وجود محکم ہونے لگتا ہے اور وہ اپنا سنگار نکالتی ہے۔

چوڑیاں چوڑیاں پگ پگ پڑاوں، اس چولی کو گولی کی آگ لگا

چولی صوفیوں کے یہاں وجود غالی کی علامت ہے اور چوڑیاں خواہشات نفس ہیں۔

صوفی کا وصل اپنی بیچان آپ ہے۔ اس منزل پرین وٹو کھارنق مٹ جاتا ہے۔ مستغرق، عاشق و مشق سب ایک ہو جاتے ہیں:

خستہ رہی نہاں کی جاگنی کی کے سنگ

حق میر وں پیکو دود بھنے ایک رنگ

بقیہ: "ویرانے" ایک مطالعہ

اور نہ ہر لال کا نہ یہ واقعات ممکن تھے زان کر داہلی کی انفرادیت کا وجود۔ فرقہ و افراط تو مصطفیٰ دور سے بھی ہے۔ پھر یہ کہاں بھی کہیے؟

اختصاصاً صاحب کے اچھے آسانے ہمیں کشادہ خیال سے پہلے کی جا چکی ہے، آٹھ کی آسانہ نگاری سے متعدد صحن پرکشش قائم کیے ہیں۔ یہی سطر ہے کہ انہوں نے احمد ز کی زبان کو فر فری آدا کی اور لکھتے سے آدا کیا، دوسرے یہ کہ ان کے ان انسانوں نے انسان کو داخلی ہم آہنگی کے آداب کھائے اور میر نے یہ کہ ان انسانوں میں، انہوں نے حقیقت پسندی (REALISM) کو اس طرح برتا کر عارفی دنیا کی تصویر کشی اور حقیقت پسندی کا فرق واضح کر دیا۔

مردود تواس بات کی کہ ان کے چند دوسرے اچھے اور اچھے یا خراب انسانوں کا بھی اسی طرح تجزیہ کیا جاتا اور ان کے کئی کئی سے بڑھنے کی کوشش کی جاتی کہ ان کے فنی ارتقا کا کتنا کچا تھا اور اس کے کیا کیا امکانات تھے بقیاناً یہ ہمیں بھی چلنے کی کوشش نہ ہوتی لیکن اس عارفی نوعیت کے معنوں میں یہ ممکن نہیں۔ اعتقاد میں کے انسانوں کی تعداد بے شمار ہے، لیکن یہ انسان اس بات کی نشان دہی مردود کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے نہ اندنگاری ترک نہ کی ہوتی تو وہ اندلسا نہ کو اس سے کم بھول نہ گئے جتنا انہوں نے نصیر کیا ہے۔



”ویرانے“ ایک مطالعہ

بھائی کی اندھی محبت کو قرار دیا ہے، جس کے خیال میں ”پڑھنے والے میرے ایک ایک لفظ کے لیے بے چین ہیں یہ، لیکن انہیں یہ احساس ہے۔“ میں ہر طرح کے معنائیں لکھتا تھا۔ ڈرائے اور ٹیٹس بھی لکھتا تھا۔ اس لیے ایسا محسوس ہوا کہ اگر میں افسانے لکھنا چھوڑ بھی دوں تو دوسری چیزیں مجھے زندہ رکھنے کیلئے بہت ہیں۔ یہ احساس مجھے اب اندازہ ہوتا ہے میرے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔“

استقامت صاحب کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۰ء کی گریسوں میں ہوا، جب وہ بائی اسکول کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان پر خردان کے قول کے مطابق ”تیارہ پھیری کے لڑکھانوں کا اثر تھا۔ اس لیے ساری طاقت عبارت آرائی پر صرف ہوتی تھی۔ اور افسانے جان ہو جاتا تھا۔“ اس وقت لکھے جانے والے افسانوں میں سے کوئی بھی تخلیق شائع نہیں ہوئی اور اس طرح ان کی باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز تین سال بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں ہوا اور غالباً ۱۹۴۰ء میں ختم ہو گیا۔ ان فوجی برسوں میں انہوں نے، افسانے لکھے۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ گویا دس برسوں میں ہی افسانے لکھے گئے۔ ان میں سے دو افسانے مافوق فطرتی طبع زاد افسانوں کی نگاہ سے ۱۵ قرار پاتے ہیں۔ باقاعدہ طور سے افسانہ نگار قرار پانے کے لیے یہ تعداد کسی طرح کافی نہیں۔ لیکن ان کی ادبی اہمیت ضرور ہے۔

کیونکہ بعض اتفاق تھا کہ استقامت صاحب نے ۱۹۳۰ء میں تیارہ پھیری کے انداز میں دوہرے افسانے لکھنے کے بعد انہیں اس قابل بھی نہ سمجھا کہ شائع کرانے۔ تین سال بعد کے ابتدائی افسانوں کی نشر و اشاعت کی فوجی سے محول ہونے کے اندازہ کاروں کی تسکین وغیرہ سے یہ اندازہ کافی حد تک نہیں کرا کر ۱۹۳۰ء کے افسانے بھی وہ اس وقت کے رسالوں میں اشاعت کے لیے بھیجے تھے تو ان کی اشاعت میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ کیوں کہ وہ عام ادبی مزاج سے ہم آہنگ ضرور ہے ہوں گے، لیکن ان کی اشاعت سے اخراج اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت نقصان لکھا بھی نہیں

استقامت صاحب کے انسانی مجموعہ ”ویرانے“ کی تلاش ہر صدمہ سے تھی۔ تقریباً تیس سال قبل یہ کتاب پڑھی تھی۔ لیکن اب دہائیں میں ان افسانوں کا کوئی پرتو نہ تھا نہ کوئی طاقت باندھا نہ کردار۔ ویرانے کے افسانے دوبارہ پڑھنے کے خواہش کے پیچھے یہ آرزو بھی تھی کہ وہ کوکھنگالوں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ ویرانے کے افسانے بائیس شور و غبار ہے ال وقت اور بھی خام تھا۔ یہ افسانے دوبارہ پڑھنے کا موقع ملا تو ایک مسرت آمیز جہت سے دوچار ہوا کہ اس فراموشی کا سبب خامی پڑی حد تک اپنے شعور کی خامی ہی تھا۔

”ویرانے“ کا پہلا ایڈیشن ہندوستان پبلنگ ہاؤس، الد آباد سے شائع ہوا۔ اس وقت اس میں پندرہ افسانے تھے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن چار سال بعد غالباً ۱۹۴۰ء کے شروع میں دوبارہ فروزا اردو، لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں دو افسانوں اور ایک چارسطی دیاچھ دوام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں بقول مصنف کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ممکن ہے کہ بعض مقامات پر غلطی تبدیلیاں روا رکھی گئی ہوں۔ اس سے زیادہ تبدیلیاں کی گئی ہوں تو استقامت صاحب ان کی نشاندہی ضرور کرتے۔ اس وقت پہلا ایڈیشن پہلی نظر نہیں، اس لیے ان معمولی تبدیلیوں کی نشاندہی بھی ممکن نہیں۔ تنقید نگاری اور افسانہ نگاری کے درمیان کشیدگی مصنف کے ذہن میں بالکل تبدیلی سے سوچو تھی اور تاخیر ہو کر تنقید کے میدان مار لیا اور استقامت صاحب اسی کے چور ہے۔ انہوں نے، خسارے کا دم لینے ہوئے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے۔ ”جب اچھے افسانے پڑھنے کو ملنے ہوں تو کم اچھے افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے زیادہ افسانے نہیں لکھے ہیں اور ان افسانوں کی کتابی صورت میں اشاعت کی ضرورت اپنے مجھے نہ تھی۔“

نصرت پبلشرز، حیدرآباد، لاہور، الد آباد، لاہور۔ ۲۲۰

مرد متین جنہوں نے دو سال بعد "انگلے" اور چھ سال بعد ترقی پسند ادبی تحریک کا نام لیا اور یہ کہ اعتدال صاحب کو ان لہروں کا سہم پرور ہی نہیں اس کا حریف تھا۔ لیکن اعتدال صاحب کے مزاج کی سادست روی دیکھ کر جس سال انہوں نے غلامی پھوری اور علیحدہ کے اخراج سے اپنا دامن بچا وہیں "نور انگلے" کی روایت کو اپنا نیا اور انسانی ادب کی اس سب سے بڑی روایت کو جس کی داغ بیل پر حکم چڑھنے والی تھی۔ اعتدال صاحب کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور اس کا اظہار دوسرے کے انسانی میں عجیبہ چمکے اس کے بچپن نظر ان کے لیے یہ کوئی مشکل بات تھی کہ وہ پریم چند کے طرز کے اندلے (کھن) پر اس کی رات ویلو سے قطع نظر) سمجھے، خوبصورت نظر آنے تیار کرتے اور انسانی ادب میں کم سے وہ مقام حاصل کر لیتے جو مردوش اور انکم کو کوئی کو حاصل ہوا۔ شعلہ اس سے زائد بھی حاصل کر لیتا ان کے لیے کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔

لیکن انہوں نے اپنے وقت کی غموں میں ہم لڑنے سے خود کو الگ رکھا اور ایسے اندلے لکھے جو خدا کے اعتبار سے کم لگنے کے باوجود انیسیادوں سے خاصہ اہم ہیں اور چالیس چالیس سال گزارنے کے باوجود جن میں سے کم سے کم نفع کی تازگی ہرگز نہیں۔

اعتدال صاحب نے "بزمِ گل" کے بعد کے پانچ انشائوں کو ابتدائی انشاء نگاری کا دیکھا راز دیا ہے اور ان کو مجموعہ صرف اس لیے شامل کیا ہے کہ لوگوں کو ان کے "ذہنی ارتقا کی رفتار کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن "بزمِ گل" کے بعد کا اندازہ "اس کا کیا قصور تھا؟" ۱۹۳۲ء کی تخلیق ہے۔ جب کہ اس کے بعد کے ۵ اندلے (جو اس پہلی مجموعہ کے آخری انشاء ہیں) "روحانی"، "ایثار"، "قلعے میں طوفان"، "ہنگامہ ہستی سے دور" (نور)، اور "مغناطیس" (ماخوذ) بالترتیب ۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۴ء کے انشاء ہیں۔ ان تمام مجموعہ کو کتابت کے وقت انشائوں کی ترتیب میں کچھ تبدیلی ہو گئی اور "اس کا کیا قصور تھا؟" جو ۱۹۳۹ء کی تخلیق ہے، غلطی سے "بزمِ گل" کے بعد چھپا گیا۔ مجموعہ میں ان انشائوں کی شمولیت کی ہر طرف یہ اہمیت ہے کہ ان سے یہ اندازہ ہوا جائے کہ اپنے مختصر سے انسانی سفر میں اعتدال صاحب کو کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا۔ ان پانچ انشائوں سے جن میں سے دوا خیز ہیں یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ ان دنوں معتدلت خواب و خیال اور حقیقت کے درمیان کھول رہا تھا۔ ان انشائوں میں تعداد کی نسبت آتے آتے ہوا جاتی ہے۔ اور معتدلت اس سے دامن بچا لیتا ہے۔ رجعتی "سرجو"، رجعتی اور خوش کے درمیان کشمکش کے کئی مقام ایسے ضرور آتے ہیں، جہاں وہ تعداد کی شکل اختیار کر سکتے تھے، لیکن معتدلت اس سے گریز کیا اور اس نے گودیا نے گھٹکے کے آگے کر دیا۔ "کوشل" اب سب سے زیادہ مشت رہتا ہے اور گھٹکے پر پستی صرف اس لیے کرتا ہے کہ رجعتی اس کی گود میں ہے! اسی طرح "ایثار" میں غدار اور ہاشم کے درمیان کشمکش کو ذہن نہیں آتی۔ غدار، "عینہ" اور ہاشم کے درمیان سے ہٹ

جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان دنوں کی شادیاں الگ الگ مہلوں پر ہوتی ہیں۔ اور وہ خوش و غم زندگی گزار رہے ہیں اور انشاء "ان کی محبت سے اپنی دروستد اور تاریک زندگی کو روشن اور تابناک بنائے ہوئے ہے۔ اسی طرح "ہنگامہ ہستی سے دور" کہبت ان فرست جلد کی یاد کو جسے سے لگاتے ساری زندگی گزار رہا ہے، اور ان میں ہلکے ایک بچے اچھا بچا ساری محبت باری سونپ کر اس کے سما کی طاہر کی تلاش میں لڑتا ہوا تھا ہے اور کچھ کی کویتہ نہیں چھوڑا کدہ کہاں ہے اور یہ کہ اُسے طاہر ملایا نہیں۔ "مغناطیس" میں بھی شکیب چاہنے اس نام کے ڈرائے کی ہیروئن "نور" کا پارٹ اور کدے والی نور جہاں سے محبت کو قربان کرتا ہے۔ کیوں کر اس کا خیال ہے کہ وہ "نور" سے محبت کرتا ہے۔ نور جہاں سے نہیں۔ نور جہاں بھی اس میں بے مددگی چھپ رہی ہے اور جب شکیب کی عدم موجودگی "مغناطیس" کھلیا گیا تو نور جہاں سب سے بڑا پارٹ کیا؟

ان انشائوں میں معتدلت تعداد سے بچتا ہے، کشمکش کو اپنی انتہاؤں تک نہیں پہنچاتا کہ درودوں کی عمیلیں، اپنے ہاتھوں پر رکھتا ہے۔ ان انشائوں کے سارے کردار ایک طرح کے آدرش دیکھا ہوا اور سے ہوئے ہیں۔ یہ پریم چند کے آخری دور سے قبل کے انشائوں کا اثر ہے۔ ان میں عمل اور حرکت ہے، لیکن جہاں ان کے لیے تجربہ "نور" کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کردار نیاز اور طہرتم کی زبان نہیں استعمال کرتے، جنس کو محبت کے لیے سم کا نا بھی نہیں قرار دیتے، لیکن عملاً میں کو بھی ہشت و خور و مال دیتے ہیں اور کہاں کوئی دنگونی ایسا ملے لیتی ہے، جہاں سما کی قربت کی باوجود رت ہی نہیں رہتی یا کوئی مجبوری اس کی راہ میں آجاتی ہے۔ یہ نیاز اور علیحدہ کا اثر ہے۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ ان پانچ انشائوں میں جو "ویلے" کے کم و بیش ۴۲ صفحات کو محیط ہیں، وہاں لہر کی نسبت کم کہا جاتا ہے۔ عمل اور افعال طور سے تعداد کم کے فقدان نے علامہ کے اسکا نام کم کر دیا ہے۔ یہ کردار گشت پست کے غرور ہیں، لیکن ان میں سے بیشتر ایک طرح کی خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور وہ مجبوری مجبوری باتیں جو درود کوئی زندگی اور اس کے مسائل سے مل کر ایک بڑے عمل کی تشکیل کرتی ہیں ان کو پیشان کر نہیں کرتیں اور جہاں کردار زندگی کے مسائل سے نہ اچھیں نہ ٹکراتے ہیں، جہاں تعداد سے گریز کیا جائے وہاں مکالمہ کی ضرورت؟ اس کے علاوہ ان انشائوں کے کردار اور ملاقات نہ لیتی طرح اپنا داخلہ جواز پیش کرتے ہیں نہ خارجی۔ لیکن یہ بحث بعد میں آئے گی۔

اعتدال صاحب نے اگر ۱۹۳۴ء تک کے ان انشائوں کے بعد اس نے دیکھے ہوتے تو اس معنوں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

لیکن اس کے بعد اعتدال صاحب نے کم از کم بارہ اندلے ایسے لکھے ہیں جو میری نظر میں اولیٰ حقیقت ہے۔ جبکہ کوئی انشاء نگاری سے ایک رشتہ حقیقت قائم کرتے ہیں۔ سب سے پہلے کہ اس رشتہ کی نوعیت کیا ہے، اور کہ آج کے اندلے کے

تتار میں ان کے نفعہ رہ جانے کا امکان ہے اور اگر ہو تو کیوں؟
 "مستحکم میں لکھتے ہیں:

"میں واقعی حقیقتوں کی اصلیت کا مستحکم نہیں ہوں، لیکن جانتا ہوں کہ واقعی حقیقتیں خارجی حقیقتوں کا کچھ کس ہوتی ہیں کبھی تبہ۔ اس طرح واقعی حقیقتوں کا اس طرح بیان کرنا کہ ان کا مستحق خارجی حقیقتوں سے بظاہر ہو، میرے خیالی میں حقیقت نگاری نہیں ہے۔ حقیقت ایک پیچیدہ عمل ہے، اس لیے اسے حقیقتوں میں آج نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت وقت، معاشی اور سیاسی مسائل، عمل اور خیال ایک دوسرے میں گھٹے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وقت اس کو گھسیٹ کر خیال رکھا ہو کہانی کے لیے ضروری ہے، لیکن یہ دل کی کبھی بلاش سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی افکار بیان سے اور کبھی ہونے و موزوں کے انتخاب سے"

یہ دیباچہ ۳۱ ستمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا تھا اور مندرجہ بالا اقتباس میں اس کی بحث کی باڈیٹ صاف نشانی دیتی ہے، جو ترقی پسند فکریہ کے اقوال اور ادبی معیاروں کے زیرِ زیرِ ہونے کے بعد ایک عرصہ تک کسی طرح چینی رہی۔ اس دیباچہ میں خارجی حقیقت، افکار بیان اور ہونے والی سے بحث کی گئی ہے، لیکن افکار میں دل کی آواز صرف بلاٹ، افکار بیان یا ہونے سے پیدا ہو سکتی تو اچھے اور مومن افکار کے درمیان امتیاز قائم کرنا کوئی مسئلہ نہ ہوتا اور اس امتیاز کی حدود متعین کرنے میں کوئی وقت نہ ہوتی۔ اختتام صاف سامنے آئے ہیں، اس لیے افکار کو ایک ان کی طرح اس صورت میں نہیں دیکھا، جس طرح انہوں نے افکاروں کو اپنے خاص طور سے ۱۹۳۳ء کے بعد کے افکاروں کی تعمیر کی۔ ان میں سے ممتاز افکار افکار بیان، بلاٹ اور ہونے والی کی ایک اچھی ان کی پیش کرتے ہیں، جس میں سے کسی ایک کو افکار کی مجموعی ہیئت کو جوڑنے کے بغیر الگ نہیں کیا جاسکتا۔

"ویرانے میں ان بارہ افکاروں میں ٹھنڈا، بیزاری، مجبوریاں، حرارت اور اگر کسی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، لیکن کیوں؟ وہ کون سے عناصر ہیں جو انہیں مصنف کے دوسرے افکاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کا سب سے آسان طریقہ تو یہ ہے کہ اچھے افکار کے لوازمات بیان کیے جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ وہ بہت کم افکار ان معیاروں پر کس طرح پورے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک طریقہ اندیشہ بھی ہے اچھے یہ کہ ان افکار کا تجزیہ کیا جائے۔ ممکن ہے اس تجزیہ میں افکاروں کی اہمیت کی جہان کی شکل کے معیار بھی سامنے آجائیں۔

ان سادہ افکاروں کے تجزیہ کے لیے تو ایک ذخیرہ تلاش کرنا ہوگا۔ اس لیے آئیے ان کے صرف ایک افکار "مجبوریاں" کا تجزیہ کر دوں گی کہ روشنی میں کریں۔
 گیارہمین: دیہات کا ایک ایسا پائندہ جو حالات کے ہموار مجبوریاں تجزیہ مزدور بن گیا ہے، غصے سے، محنت مزدوری کے دوران میں ملتا

ہے تو دوسری جوان ہڈیوں کو جو مجبوریاں سناتا ہے۔ اُسے رنگہ رنگہ پسینہ کھینک کر کسی کام کے جوری کا اڑا کر دھو کر پستہ نہیں، بچہ کچھ وہ لکھا کر لڑکے کی جرات نہیں کرتا۔ چاندی کے دوران جب لڑائی پھر جانے کے سبب آئے اسپتال سے دوا لے لینی ہندو جانے کہ تو وہ لڑکے ہو جانے اور اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہ جاتی کہ وہ لکھا کر لڑکے وقت اکیلے جانے کو ٹوک باروک سکے۔ وہ لڑکے کو لکھا جاتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ وہ لکھا کر لڑکے کا رہے کہ محنت کے مطلب کو نہ سمجھ سکا۔ وہ لکھا کے ہاتھ سے غصے میں دوڑ پڑے پھینک دیتا ہے۔ بچہ اپنی کھڑکی کے باہر جھپک دیتا ہے۔ وہ سارا دن ان دیواروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ بچہ سچ ہوتی ہے تو عزت اور احساس کی جنگ میں ضرورت محبت جاتی ہے اور وہ دونوں لڑنے لگتا کہ محبت میں رکھ لیں اور کہتا ہے۔ "تم لوگ سب کی سب کی بات سے مجبور ہیں۔ کیا کریں؟"

لکھیا: ایک طرح کی خوراک کا مادہ اس میں ہے۔ منور لال کی انہیں اس سے کچھ کچھ ہیں، جسے وہ کھجور کا ہے، لیکن بظاہر غیر متاثر طریقے سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسے منور لال کی تنہائی پر غم آتا ہے اور وہ انہیں کسی قدر مجبور محسوس کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ شوہر کے علاج کے لیے دو سہرہ کہاں سے آسکتا ہے۔ اس کے دل میں بھی منور لال کی تنہائی اور ان کی کا احساس ترقی کر جاتا ہے۔ اسے صرف اپنی مجبوری نہیں بلکہ گمراہی اللہ منور لال کی مجبوری کا احساس ہے۔ منور لال کے کرے سے نکلنے والے مجبوروں کا احساس اس کی نگاہ میں گمراہی کے احساس کو کم کر دیتا ہے۔ وہ شرمندہ معلوم ہوتی ہے نہ گمراہی ہوئی۔ صبح ہونے پر وہ شوہر سے کہتی ہے کیا دو روز لاؤ گے۔ ٹھیکیدار بوجھنے کہا ہے کہ دو چار دن میں کام پورا کرنا ہوگا۔ اچھے نہ ہونگے تو کیسے کام چلے گا؟

منوہی لال: ٹھیکیدار جو مکان بنانا ہے۔ سخت کلامی و لگائی گئے سے کام نہیں لیتا بلکہ اپنے بول سے لوگوں کو کام پر لگانے لگتا ہے۔ مزدوری کا معاملہ بھی صاف ہے اور عام طور پر اپنی پیش کش کا۔ پہلے پوس میں تھا لیکن رشوت کے جرم میں نکال دیا گیا تھا۔ بیوی کے کہنے کے بعد دوسری شادی کا خیال بھی نہیں کیا۔ مزدور کی ضرورت منور لال کو رہتی تھی۔ اسی طرح منور لال کا کام بھی نہ کر سکتا۔ لکھیا اب سب سے زیادہ ہنس رہی ہے۔ منور لال کی انہیں اس سے کچھ کچھ رہتی ہیں اور سب کچھ اس طرح کچھ کچھ ہیں کہ ان کی غیر برائی بھی ہوتی ہے تو لکھیا ان کو دین کو کام لے کر خوش فہمی بھی سناتا رہتا ہے۔
 ان تینوں کی زندگیوں کے اس صاف سے افکار کا تاثر پتا چلا سکتا ہے۔

پایس سال قبل پہلے جلسہ اس افسانے کو اگر اس ذمہ کے دوسرے افسانوں اور افسانوی ادب پر تنقیدی مضامین - بیڑن اور ذمہ داروں کے پس منظر میں دیکھیں تو بعض خصوصیات حیرت انگیز طور پر متاثر کرتی ہیں۔ سب سے پہلی بات تو کہ ان تینوں کرداروں میں کوئی کردار ایک نیا یا نیا پن کر دہشیں خیر و شران کر دہشوں کی ضرورتوں اور قوت، حالات، کابر اور اس سے لڑنے اور اپنے طور پر ان کا نکلنے کا طریقہ ہر ایک کے بیان جدا جدا ہے۔ گیارہ تاریخ کی کرتا ہے، دوسروں کی بیویوں سے مداف کرتا ہے، لیکن انہی بیوی کا بننا سوزنا سے بہت نہیں اس کے باوجود وہ اسے ٹوٹتا نہیں۔ بہت وہ بات گتے روپے سے لڑتا ہے، ناراض ہوتا ہے، لیکن کچھ ہونے سے اس صورت حال کو ایک ناکیز بائی کے طور پر قبول کر لیتا ہے۔ کچھ خدائی کی خفا میں کے باوجود کوئی گناہی صورت نہیں۔ وہ اپنے سوہریکے جانب سے دفاع نہیں تو پھر اس بات سے سوہرلا کے پاس کیا چیز ملے جاتی ہے؟ صرف سوہریکے جھوٹی، بوسہ اور حالات، ایسا نہیں ہے۔ صرف اپنے ہم کی آگ؟ ایسا بھی نہیں۔ سوہرلا کی تنہائی اور افسردگی کا احساس؟ یقیناً یہ بھی نہیں بلکہ ان تینوں چیزوں سے غصہ کی جھنجھٹ سے لے کر وہ ساری چیز ہے کہ معصیت کا راز کیا کھیر ہیں کہ سوہرلا کے گھر میں داخل بھی ہوتی ہے اور ملحق، شاداب اور افسانوں اور کچھ بھٹی ہے۔ اور سوہرلا کی طراوت اور ہم چٹھا۔ پسینہ کی زکری سے رشتہ کے الزام میں نکالا گیا، لیکن بوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی بھی نہیں کرتا۔ اللہ ہم کے معاذ ہے کہ آگ سے نکل بھیجا ہے۔ لیکن اس مطالبہ کی تکمیل اس کی زندگی کا ٹھکانہ نہیں۔ وہ مزید دہش کو حیرت و شگفتہ پر دیتا ہے۔ اس سے سختی سے بیزین نہیں آتا۔ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔

یہ تینوں گشت پرست کے ایسے کردار ہیں، جن میں ہم آپ بہت سے اپنی صورتیں دیکھیں گے۔ ان کے کردار پر یہ بات دوسری ہے۔ تینوں کردار کما میں اس طرح ہیوست ہیں کہ ان کو ایک نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر کچھ تجزیہ کی خاطر ان کو افسانوی ڈھانچے سے الگ کر کے ایک ایک ڈھانچہ سے دی جائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ان میں کسی نم کی بڑی تبدیلی کے لیے ان کے حالات و احوال، رد و قول اور جہات کو جڑوں کا قوت دھکے افسانہ کی ابتدا، درمیان اور انتہا کا انکسوس میں کوئی بڑی تسبیہ ملی کی جائے؟ یا کسی ایک کردار میں تبدیلی کرنے سے باقی دونوں کرداروں، واقعات کے تسلسل اور پیسے افسانے کی انہیں اس طرح نہ رہ جائیں کہ ان کی ہیوست کڑائی کی چھڑان وہ جائیں گے۔ افسانہ میں یہ کردار اس طرح ایک دوسرے سے ٹکے ہوئے ہیں کہ کسی ایک کردار میں بھی بنیادی تبدیلی کر دی جائے تو افسانہ بھر جائے گا اور گھبراہٹیں سرائیں گے، سوہرلا سرابا دی یا کھلیا کر غراب غوریت کے توپسی دکھا یا جائے تو کیا افسانہ اپنے اندر لائق، داخلی منتقلی سے محروم نہ ہو جائے گا؟

اپنی داخلی منتقلی میں یہ افسانہ ممکن ہے۔ سارے کردار واقعات، کرداروں

کا ارتقا اور انجام ایک دوسرے میں اس طرح ہیوست ہیں کہ کوئی کس کے لیے جینی نہیں۔ پوری اگلی گزروں کے بنیادی کردار یا واقعہ میں تبدیلی ممکن نہیں۔

ہر شئی افسانوی تخلیق کو اور افسانہ پر، ٹائٹل یا ٹائٹل و سولوں کا جواب ضرور دینا چاہیے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے وجود کا داخلی جزو بن کر رہا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ کردار، ہر واقعہ تخلیق کی داخلی منتقلی میں اپنی تفسیر، اپنا جواز فراہم کرتا ہے یا نہیں۔ افسانوی اگلی کے ہر جزو کا دوسرے اجزا اور ان کے اجزاء کے مجموعہ سے تعلق، ہم اسے اگلی اور تاثر پر بطور نام افسانوی ادب یا اس کے داخلی منتقلی ہے۔ جو بھی افسانوی تخلیق اس معیار پر پوری اترتی ہے وہ اپنی طور پر قافی قدر قرار دے جانے کی مستحق ہے۔

لیکن ادب اور خاص طور پر افسانوی ادب کے کچھ ایسے مطالبات بھی ہوتے ہیں جہاں دائرہ سے باہر ہے جن کو ادب کے غیر ادبی معیاروں کے نام دیا جاتا ہے۔ ادب کے یہ اگر ان میں جس دوسرے سوال کی جانب اشارہ کیا گیا تھا وہ اسی "غیر ادبی" معیار سے متعلق ہے۔ لیکن آخر وہ سوال ہے کیا؟ وہ سوال ہے کہ کوئی بھی افسانوی تخلیق عالم امکان سے متاثر تو نہیں یا یہ کہ اس کی تخلیق تو نہیں کرتی۔ ممکن ہے بعض لوگوں نے افسانہ حسین کا افسانہ "مجرور" دیکھا ہو، لیکن اس کے خدخال، کرداروں، واقعات کے اندر چھوٹا، انجام اور پلاٹ سے ایک حد تک واقفیت تو ہو چکی ہوگی۔ اب اس دوسرے سوال کی وضاحت کے لیے ایک سوال کو کھینچا گیا یہ افسانہ خست میں اپنی معصیت پر قرار دے سیکے؟ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، دودھ شہد کی نہیں اور کہ رات کے بارے نہ باشد اور صورت حال میں کیا یہ افسانہ اپنے وجود کا جزو فراہم کر سکے گا؟ سوہرلا فریادیں وہاں موجود ہیں تو ہوا کھلی بھی شاید وہاں ملک نہ پاسے ہاں کیا نہ شاید وہاں پہنچ جائے۔ لیکن صوفی اس کی ضرورتی سے افسانہ کیسے بنے گا؟ اور ہمیں، کجانی کے دو کردار تو شاید وہاں پہنچے سے موجود ہوں۔ سب سے پیچیدہ صورتہ کردار کو بھی وہاں سے چلیں، لیکن وہاں ان تینوں کو کھلی شہر بنا ہو گا اور کھلی شہر کے درمیان کشش اور تصادم اس طرح ممکن نہیں، جس طرح ان کا وجود ممکن نہیں کے درمیان ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہر دوسرے میں وہ مطالبات ہی ہوں گے معاشی، سماجی اور جہانی جہاں افسانے کا مازا بناتے ہیں۔

چنانچہ کسی بھی افسانوی تخلیق کو معصیت کا حامل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عالم امکان سے اس کا رشتہ برقرار رہے اور یہ عالم امکان اپنے سارے لوازمات کے ساتھ تخلیق میں اس طرح آئے کہ تخلیق اس کا رشتہ برقرار رہے اور نہ تخلیق پر۔

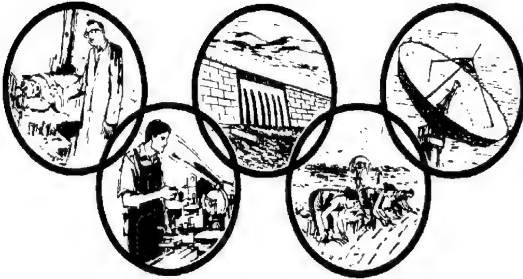
آئیے افسانہ صاحب کے اسی افسانہ "مجرور" کی جانب پھر واپس۔ کیا یہ افسانہ جہاں جہاں سے آخری نقل معیار کے زمانے میں کھلی جاسکتا تھا؟ افسانہ کے تانے بانے اس کی درشت و پروازت، کرداروں، واقعات کے تسلسل اور زہریلی ہوا پر ایک نظر ڈالنے سے یہ کہ یہ افسانہ کی جاسکتا ہے کہ یہ افسانہ نہ تو جہاں کے زمانے میں کھلی جاسکتا تھا نہ جہاں درشتا طفرے کے زمانے میں۔ کیوں کہ اس زمانے میں نہ گیارہ کا وجود ممکن تھا نہ کھلی (آخرت پر)



سدا بڑھتے قدم

فوجی اہل شایان گھیلوں کی نیرازی کے فرائض انجام دیتے ہوئے ہم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں، ان کے لئے بھارت کو دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام ملے ہیں۔

اسٹیٹیم بریڈکارڈ قائم سے ابھر کر گئے۔ ملک بھر اور دیگر ممالک کے لاکھوں ہی گھروں میں بھین ٹیلی ویژن پر کھیلوں کو دکھائے گئے۔ اس کے لئے کیمریٹروں، اسکریننگ اسٹیشنوں، ڈائریکٹرز اور مصنفی ستارے کے ساتھ اردیوں کے عظیم سلسلے کا کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔



میل کے ساتھ کی گئی سخت محنت کی یہ منہ بولتی مثال ہے اگر ہم تو یہی نہیں دیکھ رہے ہیں تو اسی گن سے ہم کریں تو اسی طرح کی کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

آئیے ہم سب مل جل کر
اپنے وطن کو مضبوط بنائیں

sharp 52/566

» غریبی دور کرنے کا ایک ہی منتر ہے —
 اور وہ ہے واضح مقصد اور ڈسپلن کے
 احساس کے ساتھ سخت محنت —
 — اندر لاگاندھی

ستیمو جیتے — شرم ایلو جیتے



davp 82/514

زیر تہ ثنائی — شخصیت اور فن

عزیز انجم — بے شمار دعائیں۔

مہاراجا کا کہ بہت خوش ہوئی۔ اپنے متعلق مہاراجہ تاثرات سے مزید سرت ہوئی۔ مہاراجہ فراموشی پر اپنی کچھ تعلیمات جو شائع ہو چکی ہیں، پتھرا پر مبنی۔ غنیمت، غنیمت، آزاد فرمائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنے قلم سے میرے خاکے میں کیسے رنگ بھرتے ہو۔ مہاراجہ طباطبائی اور ذہانت کا امتحان 400

(ناچور سے۔ مورخہ: 24.5.76)

کے معلوم تھا کہ یہ ارادہ اس وقت پورا ہو سکے گا، جب وہ اپنی شفقت بچاؤ کرے سے بے موجود نہ ہوں گی۔ بعض ارادوں کی تکمیل میں واقعی ناقابل طافی تاخیر ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زیر تہ ثنائی ۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو ممبئی پورہ ناچور (مہاراشٹر) کے شریف اور دین دار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد الماحج عبدالرحیم صاحب (پکلی واسے) مذہبی اور روشن فکر شخص تھے۔ زیر تہ ثنائی نے گورنمنٹ گراؤنڈ ہائی اسکول ناچور سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ناچور پورہ ورنٹی سے "مولوی" کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے اور مئی عالم کے بعد ۱۹۶۰ء میں ایم اے اور اے کے اہل۔ لے ڈی کالج ناچور میں مدرس ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں فارسی ادب میں ایم اے کیا اور سیب کی تفسیر پر تحقیق کام کرنے کی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ طبیی اسناد کے اعتبار سے گراؤنڈ ان تمام سندوں کو حاصل کر چکے تھے، جو کی پونیورسٹی کے ایک عام استاد سے ترقی کی جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ صدر شعبہ اور دو معزز برہمن اور تادم حیات اس پرائمریز رہے۔ ان کی تعلیمات پر کئی مولویوں کی ایکڑیوں نے انتہامات دیے۔ ادبی اور علمی مشنیت کے علاوہ ان کی سماجی مصروفیات بھی جادری تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو ناچور کے ایڈیٹرز پورڈ اور ناچور پورہ ورنٹی کے اردو فارسی پورڈ آف اسٹڈیز کی

۱۹۷۵ء کے ادھر کی بات ہے۔ پتھور میں کل ہند اردو اساتذہ جاسات کا نفرین کا انعقاد ہوا تھا۔ میرے اور چند مجھ جیسوں کے علاوہ سب اساتذہ ہی اساتذہ تھے۔ ۱

اس کا نفرین میں ایک ایسی شخصیت سے تعارف کی سعادت بھی حاصل ہوئی، جو استاذ ہونے کے باوجود ہم "ناگروں" کی صف کے لوگوں سے بھی "غیر مدرسا" کی طرح میں ہم کلام ہوتی تھی۔ یہ شخصیت تھی: ڈاکٹر زیر تہ ثنائی کی — جن کو مرحوم کہتے ہوئے آج بھی دل میں چھین سی جاتی ہے۔

تین دن کی کانفرنس تھی، گراؤنڈ ہائی ان سے تین دن کی شخصی ملاقات رہ سکی۔ لیکن یہ تین دن مجھے کچھ دن میں ڈاکٹر صاحب سے ہم بستے قریب ہو گئے کہ بہت سوں کے ساتھ تین سال رہ کر بھی اتنی ذہنی قربت نہیں حاصل کر سکے۔ آج جب اس نکتہ پر غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی شخصیت کا جادو اور ان کے رویے کے غلوں کا کرسٹر تھا، جس نے وقت کی ظاہری حد بندیوں کو عبور کر کے سامعین کی میکانیکی تقسیم کو بے معنی بنا دیا تھا۔ اس بظاہر مختصر سی ملاقات میں ہی وہ ہم سے اتنی شفقت برتے گی کہ میں کو کانفرنس کے بعد کئی سال تک ان سے خط و کتابت رہی اور وہ ہمیشہ میرے غلوں کا (میں میں میرے طالب علمانہ حوالات درجہ ہوتے تھے) محبت و شفقت کے ساتھ جواب دیتی رہی اور انہوں نے ہمیشہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح مخاطب کیا۔

میری دلی تمنا تھی کہ ان کی شاعری سے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ چنانچہ میری نگہداشت پر انہوں نے اپنی منتخب شاعری اپنے قلم سے لکھ کر روانہ کی تھی اور لکھا تھا:

• ۵۵۷۔ کشمی بانی نگر، نئی دہلی ۲۳

وہ مرتضیٰ۔ اور یوں دیکھی، ریسرچ کرنے والوں کے لیے تسلیم شدہ سر دائرہ تھیں۔
مگر اپنی تمام سماجی، علمی اور ادبی مصروفیات کے باوجود وہ نہ صرف اپنے گھر
کے لیے ممکن تھاں، تھیں۔ بلکہ اپنے شاگردوں، نئے فن کاروں اور اپنے ہم عصر
مستعدین کے لیے بھی وقت نکال دیتی تھیں اور ان سے اس طرح بیٹھتی تھیں
جیسے وہ ان کے گھر کے ہی فرد ہوں ان کے ذات کا ایک حصہ ہوں۔ حیدر علی خٹہ
نے ان کی شخصیت کے اس پہلو پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"..... زریں باقی فن کی دلدادہ اور فن کار کی قدر دان

تھیں۔ جب انہوں نے کتاب، تحریک، نگار، اور ان،

مضبطن، شاعر، گفتگو اور دوسرے صنفِ ادب کے سبب

میں میرا اور محنت اور کام دیکھا تو بہت سنا کر ہو گیا۔

ہم دونوں باہمی اسکل میں عظیم علمی مباحث کے شاگرد

رہ چکے تھے۔ باقی کے بھی بڑی مہارت بھری پائرس بلایا اور

جسم بھری پور میں ان کے یہاں بیٹھتے تو وہ بے حد

سرور میں۔ ان وقت شریعت کے گھاس اور پھوس کی

لشکران ہمارے سامنے سادیاں اور بھٹ بٹ چڑھتے

ہاڈی میں لگ کر ناستہ تیار کر ڈالا اور ہزار

محنت و اہل راہی کھانے پر مجبور کر دیا۔

میں ایک سیویں سادی، لیکن ایک انتہائی مخلص

اور متاثر کی صورت کو دیکھ رہا تھا۔ یہ عورت ایک

سلیقہ مند گھڑی، ایک مخلص دوست، ایک قدر دان

جو ہر دور اور ایک شوق مال لگ رہی تھی۔ اس کا کوئی

طریقہ اور کوئی رویہ ایسا نہیں تھا، جس سے یہ ظاہر

ہو نہ کہ وہ کسی کا جیسے بیڑا آف دی ڈیپارٹمنٹ ہے یا

کوئی مشہور و معروف ادیب ہے۔ یہ ملاقات کوئی دس

سال پہلے کی ہے اور ان دنوں میں ان سے جب

بھی ملتا ہوا وہ ہمیشہ ایک درد مند ماں کی طرح شفیق

رہتی، مخلص دوست کی طرح ہمیشہ آتی رہیں اور ہم ہر

نئے والوں سے جن طرح لڑکر اور لڑکر ملا جاتا ہے، حتیٰ

رہتی۔

گزشتہ اوقات کسی نکتہ پر ان سے اختلاف خیال بھی

ہو گیا، خاص کر مائیکر سمیت چل پڑی ہے۔ ثانی مباحث

سامنے مجھے ہر گز بھی کچھ نہیں سمجھنے کی کوشش

کرتے ہیں، مگر ہم دونوں اپنا اپنا ایک ٹانگ کا ٹھوس

نچا رہے ہیں۔ ایسے مواقع نہ صرف ان کے یہاں بلکہ خواہ

محمد عابد اور ڈاکٹر منشا صاحبان کے یہاں بھی بیٹھ آئے
ہیں۔

مظہر امام راجح ۱۹۸۰ء میں اقبال اکیڈمی ناگپور

کے مشاعرے میں آئے تھے، ان کا تمام باقی کے یہاں تھا۔

انہوں نے مظہر امام کی خواہش پر مجھے اور مرحمت الاختیار کو

گھر بلایا۔ ادبی گفتگو چلی ہے تو کئی بات پر باہمی بحث

ہو گئی ہے اور مظہر امام صاحب بھی محظوظ ہو رہے ہیں کہ

باہمی کبھی چوٹی میں کی طرح رو دہاؤں جو جاتی ہیں اور سمجھ مان

کی طرح ڈانٹتے بھی ہیں۔

کچھ باہمی کا دل بہت بڑا تھا۔ ان کا سراپا صحت کی

خوشبو سے بڑا ہوتا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک ہندوستانی

محنت کا رچا ہوا اور وہ ایک گھر کا مہمان، وراثتاً

بھوی، مخلص دوست، ذمہ دار گھر، معتبر ادیب اور

معروف شاعر ہی نہیں، بلکہ قریبی طرح ایک ماں بھی تھیں۔

..... (دور کو نامہ ص ۱۲۳)

ایک بک بڑا لکچر، ایک معتبر ادیب اور نامور شاعر ہونے کے باوجود

علم و ادب سے متعلق ان کا ذہن کتنا متلاشی رہتا تھا۔ اس کا اندازہ ہم ویسٹ

ایس کے بیان سے لگا جاسکتا ہے۔ موصوف کا بیان ہے:

"..... زریں کی طبیعت میں غنیمت کی تصویر اور مجھوتھی۔

وہ انگریزی ادب کی کئی تحریکات سے بھی آگاہ رہتا

چاہتی تھیں۔ مجھے کہ اس باب میں سوالات کیا کرتی تھیں۔

انہوں نے باتیں پوچھتیں جن کا علم مجھے بھی نہیں رہتا تھا۔

لیکن ان کے سامنے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بالکل

نرم نہیں محسوس ہوتی تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین ہوتا تھا کہ

سری قدر جو ان کے دل میں ہے وہ کم ہونے والی نہیں۔

مثلاً ایک بار انہوں نے مجھ سے پوچھ لیا کہ:

CONCRETE POETRY کیا ہوتی ہے۔ اس وقت یہ

اصطلاح میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ میں نے ہمیشہ کے

مطابق اپنی جانت کا اعتراف کر دیا۔ مجھے بڑی ہیرت ہوئی جب

انہوں نے مجھے بہار میں چھپنے والا ایک رسالہ دکھایا

میں ان کی اپنی اسی نوع کی نظم چھپ چکی تھی....."

(دور کو نامہ ص ۱۲۳)

حقیقت یہ ہے کہ ایک مقام مسئلے کے بعد کھوج، تلاش، علم، اور کچھ حال

کرتے رہنے کی ذہن ایک کم بابت صفت بن چکا ہے۔ کئے پڑے ٹکے لوگ ہیں

جڑے ہیں مٹاؤں کے مضر کو زندہ رکھ پائے ہیں ؟ ڈاکٹر صاحب نے مسئلہ ہوتے ہوئے ہمیشہ خود کو مسلم سمجھا اور آخری سال تک علم کی خدمت میں مصروف رہیں اور مصروف علم موسمی شخصیت تشکیمان علم دینی کی آنکھوں کو برسات چھوڑ کر ۱۳ جنوری ۱۹۸۲ کو دار فانی سے عالم بقا کی جانب کوچ کر گئے۔ لیکن جن شراوس طامبان ادب اور شرافت شادوں کے دل میں اپنے فن اور قلوب کے ایسے نقوش چھوڑ گئے جو اس کی یاد کو تازہ رکھیں گے

ادبی گروہ بندرین اور مصلحت طلب پرستی کی اس دنیا میں ڈاکٹر صاحب ان کم باب افراد میں سے تھے، جن کا انسانیت پر کامل ایمان اور محبت پر ایمان ہوتا ہے۔ ایسے افراد چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ہر مذہب کا احترام کرتے انسانی قدروں کے پاس بان ہوئے ہیں۔ چنانچہ نواب غازی پاشا قابلِ ملاحظہ معین "نواب غازی کی بصیرت شعری" لکھتے ہوئے ان کا قلم اپنے دل کی آواز فرما کرتے لکھتے ہیں:

"..... رام اور رب کا مقصود ایک ہے اور جو آپس کی دشمنی میں مرتبے وہ دھمکیوں کا سمیت ہے اور خدا کا دوست۔ ایسے لوگ بظاہر حق کے پیہری، مگر بہ باطن ننگ و چورہ عاود محض و عقلا اور قرآن و ودید کی پیشانی کا کلنگ ہیں۔ انہیں نہ ہی مسلم کہا جاسکتا ہے اور نہ ہندو بلکہ یہ لوگ انسانیت کے باعث ننگ و عار ہیں۔ ایسے لوگ حقیقی معنوں میں نہی عامل قرآن ہیں اور نہ گیتا قرآن۔ بلکہ نام نہاد و عملاً اور جیتوت جواسانیت کا خون کرتے ہیں اہم لغزت کے بیج بونا جن کا شیوہ ہے....."

(دورِ جہانِ نامتہ صفحہ ۳۹)

ایک ہی مقام ہے، جہاں ان کا قلم دھیمی جذباتی رو کے بجائے (جو ان کے اندازِ تحریر کا غالب اور مخصوص مغیرے) قدرے بلند رنگ اور کسی حد تک طنز پر مبنی اختیار کر لیتا ہے، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ سماج، تہذیب، مذہب، رواداری اور انسانی و اخلاقی قدروں سے متعلق کتنے واضح اور مثبت جذبات رکھتے تھے۔ ان کی مشہور نظم "اندازِ کھو" کے مطالعے سے اس کی مزید توثیق ہوتی ہے۔

ملاحظہ کیجئے:

غلام مسکدہ بگڑا ہوا ہے
غلام غلام غلام اس سے بھی بدتر
اڑاں بے سوز، سحرے غیر خفلس
صدائے فوس کی بے کیف سی ہے
عبادت میں مصوری ہے نہ لذت
نجات دہرہ و دل بے یقین ہے

تسلیں بھام و نزل کیا کریں ہم
شبہ ہے، شبہ ہے لائی بھری

محبت، آرمیت

مساوات و مصوری

بتان رنگ و رنگے تانے ہیں

فریب و ہرے کے سسکے ہیں

خود اپنی ذات سے بگڑ گئے ہیں

نہ شانِ دل و نہ باقی ہے

نہ عاشق کی ادبائی

نشدنی حمایتِ ہر طرف ہے

اخت کامتازہ پیٹنے ہیں

صفیاءِ حرم میں یا نصیبانِ بھیموں

وی بازیگری ہے سامری کی

دی انسان، ماد و مادی

مگر اس پر بھی یہ اندازِ دیکھو

ترقی یافتہ کھسلا رہے ہیں....."

ایک حساس فن کا کل طرح ان کا دل بھی اس بے راہ روی، بے اخلاقی، اخت کے فقدان، عدم مساوات اور فریب و ہرے کے مسلسل پراگشتا ہے، جو تمام نپاد "ترقی" کا منطقی نتیجہ ہے اور شاید اسی لیے اپنی شخصی زندگی کے لیے نیازی کی طرح ان کے شاعرانہ رویے میں کہیں صوفیانہ اور ضعیفانہ بے نیازی درآتی ہے جو ان سے کہلاتی ہے کہ:-

مل جلتے تو لڑکے ہیں دنیا

مل نہ سکے تو نون لپٹائے

ڈاکٹر زبیر خان نے ادب کی مختلف اصناف سے متعلق کئی مضامین اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا تحقیقی معنوں "نواب غازی خان کی بصیرت شعری" نواب غازی کی شخصیت اور فن پر چھ پرچہ مصنفوں ہے۔ جو نواب غازی کے متعلق تعارف کے علاوہ معنوں نگار کی تنقیدی بصیرت کا بھی مظہر ہے۔ اس کے علاوہ "دورِ جہانِ آرزو" ان کا ایسا معنوں ہے، جس سے جہاں ایک طرف علاقہ و دورِ جہان کی ادبی تاریخ اور اس علاقے کے ادیبوں سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں، وہاں دوسری طرف ادب کے نشیماں اور دو ذرا کے رویے کے متعلق ان کے اپنے خیالات کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

کتابوں میں "اردو شاعری کی ہندوستانی روش" کے علاوہ مرادپ کے ذریعہ قومی یک جہتی کے فروغ کی ایک سچھی کوشش ہے۔ "سیاحت کی تفصیل شاعری" اور "معدہ آہ بحیثیت شاعر" ان کی تحقیقی کاوشیں ہیں۔ اولیٰ لفظ کر

بہارِ طائر

گر میں رہوں تو تجھ کے تنہائیاں ڈسین

نکلوں جو شہر میں تو شہنشاہانِ ڈسین

مٹو تو زندگی کی تو انائیاں ڈسین

ایک لاکھ ہیں کہ جن کی پذیرائیاں ڈسین

نصو رہم ہیں کہ اناطقی پہ جان دین

عم اپنے دل کی چوڑی کو خود ہی اچھال دین

اب عشق و عاشقی میں کہاں جان دین

میں اپنے بندے سے ہیں بے جا لگ دین

عم لوگ افسانہ لب لباب ہیں

خدا شہر میں تھا ملک کا نہرو انیاں ڈسین

آئیں ہمیں ہماری ہی پرھائیاں ڈسین

تازہ سے یہ دور کب تک کی اچھال دین

انسان کو خود اسی ہی اچھائیاں ڈسین

نارنگی زریا گری

نارنگی زریا گری

زمانہ



عجزِ نظر

اک رداے سُرخ اڑھا دو خیر عریاں کو تم !
میرے سینے میں چھپا دو خیر عریاں کو تم !
جانے کیا کچھ دھکتی ہے میری دیوانی نظرس
اک ہائے غم کے زندانی کی زندانی نظرس
درو کی آک کائنات اور غرقِ جراتی نظرس
ہو نہیں سکتی حریفِ قہر عریاں کی نظرس
میرے سینے میں چھپا دو خیر عریاں کو تم !
اک رداے سُرخ اڑھا دو خیر عریاں کو تم !

• شہزادہ جاحد و رڈو، گلگتھ (پوہی)

جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے
ہم نہیں جان سے بے مرزہ مگرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
شہسوار کو جو شرف ہے وہ مٹنا نہیں گے

ہم تو مقہور زمانہ ہیں خدار کئے ہمیں !
مٹو اگر موت کی ناپاک زباں چٹکے ہیں !

جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے
زہر کا گھونٹ پیا ہم نے تو جو سانس لیا
وامِ ترویج میں قاتل نے ہمیں سب سانس لیا

یہ زمانہ کھلاتا قل جو نہیں تو کیا ہے
بجڑا کی لم و جاں جو نہیں تو کیا ہے
اس کے جہزوں سے تو ہر آن ٹپکتا ہے ہوا
مہینوں سے بھی بلا علاج ٹپکتا ہے ہوا

گندہ چھریوں سے ہمیں ذبح کیا ہے اس نے
قواہ نظر وہو اس طور پر کیا ہے اس نے
کٹے ریتے ہوئے زخموں کو کبھی بھولا اس نے
سکھائی سوئی ہوئی ٹپیوں کو کبھی بھولا اس نے

اس نے محنتی وہ عجب ترش افلاس ہمیں
لڑتے ہیں بھی آئی نہ کبھی ناس ہمیں
خاک اور خون میں غلط ہے اس کے ہاتھوں
سرنگین سرنگیال ہے اس کے ہاتھوں

یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے
ہم نے تقدیرِ الہی سے جو حجت پایا
وہ اس آکاں نے بے دفعہ ٹوٹا کھایا
ہم نے کیا کیا نہ رگِ جان کو سچا ڈالا اس نے

ہمیک میں بھلیق باہنوں کو مروڑا اس نے
تھے جو تقدیر کے رشتے بھی توڑے اس نے
محنتِ غم کے پیچھے بھی نہ چھوڑے اس نے
یہ زمانہ کھلا قاتل جو نہیں تو کیا ہے

جس کو مرنا ہے مرے ہم نہیں مرنے والے
ہم تو مرنے کے عوض قتل کیے جائیں گے



بشیر مدبر

منظرِ ایرج

اُس کی آنکھوں سا اُس کے گیسو سا
میرا سارا کلام خوشبو سا

کتنی مدت کے بعد تجھ سے ملے
سکراتا ہے پیار آنسو سا

دل کے اوراق پر چمکتا ہے
رات بھر ایک نام حبسگن سا

آج وعدہ کسی کا توڑ گیا
رہی تبتیبوں کے بازو سا

روز تنہائیوں میں اک پہرہ
تولتا ہے مجھے ترازو سا

بہتے خواب کا منظر ابھی تھا میں ہے
میں مطمئن کہ مرا ذہن کا دیوار میں ہے

گداری عمر کی کیفیت کی منڈیروں پر
وہ شخص فصل رسائی کے انتظار میں ہے

وہ ایک نام ادا مجھ سے جو نہیں سکتا
کہ حرفت حرفت زلف کے اعتبار میں ہے

پتھر کے حائے تو شاید لٹ کے آڑے
مناسب اب کے سفر پر ہے اختیار میں ہے

ابھی تمام جہاں داساں ہوئی ایرج
زمین خرام ہیں سونے ابھی طاریں ہے

داستانوں کے سبھی کردار آذر ہو گئے
بھولنا چاہا مگر اتفاقاً پچھتر ہو گئے

یا مری آنکھیں بھگاد دیا اتار دیا تائب
دوستوں سائے ابرہہ کے برابر ہو گئے

کارزار زندگی میں دفعتاً تو کب سلا
فصلے سب طے ہوئے سب کے مر ہو گئے

اپنی خوشیاں یہ خلقت ہائے کریم پی لے
ہم جزیروں کے ٹٹا ٹٹاں کئے سمت ہو گئے

دشمنیں ٹوٹے ہوئے احمقوں کی آرج پہ لگا
بلعداں داز کے بھی عقد تر ہو گئے

غزلیں

دیپ تمر

مدنا منظر

شمیم امروہوی

پلٹے ہیں وہ ہوسرت دکھا دکھائے کہاں
سے لے بھینک دیا ہم کو پھر ملا کے کہاں

وہ ایک بھول جو پڑے میں تیرے ہنسا تھا
ہو میں جانے اُسے لے گئیں اُڑ کے کہاں

ترا خیال بھی اب دل سے بوجھ لگتا ہے
سمجھ میں آتا نہیں ہم رکھیں اٹھائے کہاں

تہائے بعد از حیروں میں مجھ گیس گیس رکھیں
دیے اٹھائے پھر یہ اب جلا جلا کے کہاں

پڑے میں کوسے ہوئے ہم ایندھے بھر پور
ترا خیال گیارہ رات بھر جگا کے کہاں

دیے کا ارگھ دیا جانے ہم نے کس کے لیے
ہوئے شام اُسے غمی بہا کے کہاں

سزم نہ جان سکے اور کرم نہ جان سکے
مزاج یار کا انداز ہم نہ جان سکے

نشا طریح کو چر شام غم نہ جان سکے
کبھی وہ اپنا وجود و عدم نہ جان سکے

یہ عشق کیسا ہے، جنوں کیسا ہے، بخودی کیا ہے
وہ ذلیت کیسا ہے جو غیبِ علم نہ جان سکے

مرے مقام کو میرے جنونِ الفت کو
تمام قیدی دیو و حوسم نہ جان سکے

سکونِ دل کی وہ منزل پہ کیسے پہنچے گا
جو غم کا فاصلہ دو قدم نہ جان سکے

لڑکے رہ گئے آنسو سر مرزگانِ نظر سر
کہاں ہے یار کا نقش قدم نہ جان سکے

نظر کا تصادم تو اک پل رہا
کئی دن مگر ذہن بوجھل رہا

جو یکسو بننا مقفل رہا
تنگ و دود میں آؤر سسل رہا

سدا میری آنکھوں میں تیرا کشم کشم
سدا ان کی آنکھوں میں کاجل رہا

ذرا کوئی دیکھے ہمارا نصیب
اگر دھوپ چاہی تو بادل رہا

اٹھی سرخ آنکھیں کہاں سے اٹھی
یہاں سے بہت دور مقتل رہا

درِ کجوں کی آغوش ہوا سے شمیم
دھوکھٹ بچا اور نہ آنکھیں رہا

• ۱۸۵، آجولین، میرٹھ، ۲۵-۱۱-۲۰۰۱

• ۱۹۵۶/۱ شیخ، ۱۰، اندر ڈاکٹر، جگورہم

• قاضی زادہ، امروہو (پنجاب)

موت



کاس اماں کرنی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر چہ وہ ان دھوا
رجائے تو اس میں چہلکی چورہ جاتی ہے اور شکر اس
کو بے سبب چہ ہے، ان کے قریب بھی نہیں بیٹھا
لیکن چہ ہے، ان کی دونوں ایک دھوا میں بیٹھا، بیٹو
یہ چوکر اب جب بھی چہ ہے رات کو اپنی کارروائی شروع
کرتے، کر کے میں کھٹ کھٹ، چوٹی، میز کے کوئی سامان
گرتا، یا کسی شے کے کڑے کی آواز، جند بونی، تو میں بوی
کو پکارتا

جواب مٹا "رات بسر سونے نہیں دیتے ہیں
اب کیا چہ؟" میں کہتا "چہ ہے مار، نہیں آئی
حق تو روز رنگے کرتی تیں، اب گئی ہے تو آئے آٹھے ہیں
گورہ کر چہ ہے، ان میں یوں نہیں لگتیں؟"

اس پر بوی دوسرے کہتی "یا اللہ کس
کند، زمین آدمی سے واسطہ پڑا ہے، کئی بار کہہ کر چہ ہے، ان
دھوئے جیڑا میں نہ ہر گھرا، آٹا لگا دیا ہے، لیکن کوئی بات
بھو میں ہی نہیں آتی۔"

میں کہتا "یہ بچی دونوں کے سن رہا ہوں۔"

"بڑا خیال ہے تو ڈوھو کر دیکھیے۔"

معاذ ریح دفع ہو جاتا، لیکن میری نیند بچاٹ
ہو جاتی۔ بوی کا کھانا وہ توند بادہ کرکٹ کے کورسجی۔
اسی دس ماں ایک دن بچے پاس سائیل آیا، اوٹس
خٹہ کرانے ہوئے کہا۔

"انھیں بتا رہی ہیں کہ چاکر رات بسر۔"

کامہت، اچھے بچے پر طبعی۔
بھر بھر لوگ بھوس کے ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے
دونوں اپنے اپنے کچن کھینے اور بچے کے بعد، بیوہ کی
چائے پی جاتی۔ میں سرگرت نہیں چلتا ہوں، لیکن یہ
بھی اس کی ایک وضع تھی کہ مردہ رنکرت کی ڈیر میری طرف
برھتا اور چہ۔ "ادھ مناف کیجیے گا۔" کہہ کر ایک گرت
لپٹے جو توں میں رہا تھا اور بھڑا ہے ایک خاص اداسے ملکا نا۔
کئی دنوں جدت کم کو دفتر سے لوٹے وقت مجھے چہ ہے،
یاد آگئی۔ دراصل پچھلی رات ایک چہ نے بہت ستایا
تھا۔ دو گڑھی کی الماری کے اوپر چڑھ کر اس کے کچے کچے اپنے
دونوں سے کھڑا رہا تھا۔ تیجا تب بھی بوی کی آنکھ کھلتی،
پکھڑا سترہ دیا ہو جاتا۔

"کئی بار کہا کہ دفتر سے لوٹے چہ ہے مار، ایسے
لگا، لیکن کام کی بات تو کبھی یاد ہی نہیں رہتی ہے، سستی ناس
کر دے گا لیکن الماری کا۔"

چنانچہ میں نے ایک دو گان سے "چہ ہے مار، کی
دو ایک ڈو لیاں خریدا لیں۔"

لیکن بوی نے اس رات نہ ہر گھرا، آٹا نہ بیٹھا۔
"اب کل بناؤں گی، چہ ہے، ان کو بھی تو دھونا چوگا۔"

تھڑوں کا کہہ کر دونوں بیٹے بھی چو چوئے نے فطاری کئی،
اور بیٹھے دن کی ہم کے بند کی ایک چہ بنے کھٹ کھٹ
آزار دینے لگے تھے۔ بوی ہر بار چہ ہے، ان میں چہ ہے کے
مرنے کے کہہ اسے ابھی طرح دھو دھو کر دے چہ ہے کہ موت

کرے سے علی گڑھ کا اسٹور تھا اس بے اسٹور کے
چہ ہے رات کے وقت کرے میں آجاتے اور غائب ہو جاتے
پہلے۔ ہم گڑھی نیند میں ہوتے کہ اگر ایک ایک چہ کے
کے کہ کبھی چہ کے کہنے کی آواز آتی، گھر کر دھ بیٹھے، کتنی
جانتے اور تب بہت میں کہ میر پر کھا ہو، گھٹان، یا سٹار
میز پر کھین کی شیشی یا کریم کی شیشی، فری پر کھری پڑی ہے
اور چوہاں اور چوڑ کر پڑی تری سے بھاگ رہا ہے۔
بوی نقدان کا خازنہ لگائے کہ نہ کچھ پر کرس چوٹی
کتنی بار کہا کہ بازار سے "چہ ہے مار، بیٹے آئیے گا، لیکن یہاں
ان باتوں کی کسے فروخت ہے۔"

میرے دفتر کے پاس ہی اسمائیل کا دفتر تھا۔ وہ ایک
بھڑو لو جٹ کا بیٹا سٹنٹ تھا، ہر بار مار تھا اور ایک
عرے سے بچے کے وقت میں میرے دفتر میں آتا، اس کا کھول
ہر ایک تھا۔ وہ ایسے آدمی تھا کہ وہ بھی سکرانا، شاعرت۔ وہ
نوشہ راج ان تھا، اور دفتر میں ہے اسے کبھی آتا چوہا
لیکن وہ میرے صدم کے دائرے سے باہر تھا۔

وہ مردہ بڑی بڑی بھند سے بچے کے وقت آجاتا، اس
کے گول سر پر بال بس تھے، تھے تھے گے کر ایسے ایک کھڑ
سے دھو کر اسے کھ، آسانی لگتیں چنگا کھانسا۔
مہاسنٹ کا بھرے جسم کو آدمی تھا، اوپر کو بلیٹ، استمال
نہیں کہ تھا، اس لیے دھتھے، قہقہے پر پتلون، اوپر کی طرف کیچن
اُس کا مجھے شہل پر گیا تھا۔

اسمائیل آتے ہی کہتا "بیٹا، اب

میں نے چوہ کی روکھا اور اس نے کہا۔

اسامیل نے کہا۔ "میرا ایک بات بیٹا، چوہے دان کا کچر چھڑے۔ میں آئے ہیں نہ تو کھانے کے میں کچر چھڑا دیکھے چوہے نہ کھائیں گے۔ یہ زہر ملا ہوا خوش ہے۔ چوہے دان میں تو ان کے پیسے کا ذخائر کاڑتا ہے۔" میں نے کچر چھڑا کر چوہی کو اسامیل کی پوری حسنائی تو دے دی تھی۔ "اسامیل کا تو دار و زاب ہے، رہے آپ تو آپ کو کچر چھڑا دی ہیں، چاہے، چوہے کھائیں گے کیونکہ اس طرح ہم لوگوں نے آئے ہیں نہ تو کھانے کا اور ان کی گویاں بنا کر چاروں طرف ڈال دی ہیں، تو کس معیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا، کوئی مسہری کے نیچے چھڑا کر دیا تو کوئی صوفے کے اوپر تو کوئی بیٹھے پر کے امدادی کے اندر۔" اسی ایک چھڑا دیکھ کر ہی تھی۔

یہی کہ بتانے کے لیے دوسرا نیا دیا گیا۔ اپنی اچھا تو فیض نہ ہی دیا تھا۔

رات بھر چوہے تنگ کرتے رہے۔ چوہی کو چلیا تو بولی۔ "اب اس وقت کی طرح سو رہے ہیں انشاء اللہ چوہے دان بھر دھو دیں گے۔" لیکن چوہے تو شینہ وٹ گئے تھے۔

دوسرے دن اسامیل دفتر میں آیا تو صبح عادت اس نے شے کو منسک کر بہت سے اٹنے سیدھے سوال کر ڈالے۔ میں نے اسامیل کی گفتگو میں بریک لگائے کی فرط سے کہا۔

"اسامیل میں آج تمہارے یہاں سونے کے لیے کارڈ ہیں۔"

اسامیل کی باہمی کھلی تھی۔ "میرا چھڑا دیکھنے کے وقفے کے جب وہ ملنے لگا تو اس نے سب دیکھ لیا۔" تو میں آج کچر چھڑا کر انہما کر دیں۔

میں نے کہا۔ "یار اسامیل کیا پوری کچر چھڑا کہیں اور راست بسر کی جا سکتی ہے۔" اسامیل میری اس بات سے خوش و مبارک ہو گیا اور اس نے اپنی زبان نکال کر انہما کر دیا اور اپنے گھونپہ دونوں دونوں سے کھجے کھلے پئے لگے۔ اس

آج کی تھی دہلی

کے تو کر کے کا یا انداز مجھے پسند تھا۔

ختم کو دفتر سے گھر پہنچا تو چوہی خوش تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ یہیں بتاتی تھی کہ اس نے کون سا کھانہ کھام سدا ناہم دیا ہے۔ وہ پانی تھی کہ میں خود دیکھ جاں کر اس کا پتہ لگاؤں۔ میں نے ذرا سی دیر میں یہ پتہ چلا لیا کہ چوہے دان دھو دیا گیا ہے، اور اب راست آئے پر اس میں چوہے کا پتہ لگا دیا جائے گا۔

رات آئی تو آئے میں زہر بکرا سے چوہے دان کی دھو دیکھا گیا۔ اب چوہے دان کا پتہ کھاتھا، اور چوہی اس کا روٹنی سے خوش تھی جیسے اسے کامل یقین ہو کر کوئی زکوٰۃ چوہے دان میں چھپی ہی جائے گا۔

ہم گھر پر تین سو گئے تھے کہ چوہے کی چوہوں نے میں دیکھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف سے دیکھا کہ ایک چوہا تیزی سے چوہے دان میں گشت لگا رہا ہے۔ اس پر راج کی روشنی ڈالی کہ میں نے اس منظر کی حد بندی کر دی چوہے پر ایک بیڑن کی گینت طاری تھی اور وہ بری طرح چوہے دان کو جھنجھڑا تھا سدا یہ دیکھ جاتے۔ وہ پھیلے مانگوں پر سدا بلند ہو کر چوہے دان کی نادر کو اپنے تیز دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کرتا۔ ظاہر ہے وہ اس میں ناکام ہوتا۔

پھر اچھی باتیں کر کے پیچھے ہٹتا اور تب بند چوہے کے اوپر سر پر چڑھ جاتا اور اسے تیزی سے کاٹنے لگتا۔ تھوڑی دیر تک چوہوں نے سدا دیکھ کر دنا۔ آج اس کی آوازوں کی دونوں کی کواڑ سے مختلف تھی کہ اس میں اذیت صاف جھلک رہی تھی۔

چوہی نے بتا دیا کہ ہر کھانے کے بعد اس کی پیاسا بھوک اٹھتی ہے اور وہ ہر طرف دھڑپاؤں مارنا سب کچھ کھجے بغاوتی جاتے تو ہم ان کی پیاس بجھائی جاتے۔ اور وہ باپ چوہے دان کے تاروں کو بری طرح قوی رہا تھا۔

چوہی نے کہا۔ "بند کیجیے، روشنی دیکھو کہ پیاس دیکھنے کی چیز ہے۔" روشنی جھلنے کے بعد ہمارا تعلق صرف اس کی آواز سے رہ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اور بھی دو تہی جاری تھی۔ میں نے سدا زور لگا کر مارنے کی روشنی چوہے دان پر ڈالی تو

ایسا محسوس ہو کر جو اس کا کھانا ہمارا ہے۔

دیکھ بھال اس سے دھنڈے تو کچھ پڑوں چوہی کی۔ پھر چوہی کو کھانے لگ گئی صبح میں نے دیکھا تو چوہا سناٹا چوہے دان کے ایک کونے میں پڑا تھا اور اس کی دم چوہے دان سے باہر جھانک رہی تھی۔

اس دن بچے پر اسامیل آیا تو میں نے سدا کے ساتھ سناٹا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "پلیے آپ کو خیرات ملی۔" میں نے کہا۔ "نہیں اچھی تو پھر دیکھ رہی ہیں۔" اسی طرح جتنے دن کے اندر وہ چار چوہے اور بھی چوہے دان میں مارے گئے۔

اسامیل اب جب کہ میرے دفتر آتا تو اراہوں کے ساتھ ساتھ چوہوں کے احوال بھی پوچھ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں جوتو تھی اور وہیں فوجی صحت حال سے کڑبٹ رہی ذاتی تمزکی چھوٹی چھوٹی پر دیکھ بھال لگاتو کرتے تھے۔

گاہے گاہے وہ اپنی گفتگو کو چھانک ایک سناوڑ دے دیتا۔ وہ آپ کا فائدہ وہ آپ کا نقصان وہ آپ کا پورا۔ اور پھر تعریف کے بل باندھ دیتا۔ میں ہوتا تھا بعض مختلف سی مشوئیوں میں گھر سے رہنے کے باوجود اسامیل کو پھنسنے پڑے جاتے ہیں مگر اسے یہ نہیں پڑتا کہ ایک دوسری رو آئی۔ شاید یہ باتیں وہ اس کے کرتا ہو کہ میں اس کی دوسری طرف چپ گفتگوں میں دل بہا رہا ہوں، گواید تعریف تو صیغہ دو مختلف اطرا راج موضوع سخن کے درمیان ٹھانی اور کھلی مشیت رکھتی تھیں۔

اس طرح وہ ہر روز مجھے کچھ نئے باتیں کرنے کے بعد اور کئی گھر میں چھوٹے کے بعد ایک سبک کر کے رخصت ہو جاتا۔

ایک دن سو رہے میں چائے پی رہا تھا کہ گھر کے ایک بچے نے مجھے بتایا کہ ابھی ایک سبک شخص بہر گئے کہ کل رات اسامیل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ جنازے کی نماز ظہر کے بعد ملنے کی مسجد میں ہو گی۔ ایسا لگا کیسے داتے سے پہلے کہ پتہ لگا رہا تھا۔

آنٹی ایلی

کھنڈ کا نام بھی ڈوبنے لگا۔ چل چل: "اور اس نے مجھے کچن کے اندر دھکا دے کر باہر کے دروازے کی چابی بند کر دی۔"

"وہ بھی آ رہا ہے ٹھاکر۔" گورکھ نے باہر سے ہائب لگائی اور صاف کھول کر دھب سے سہری پر چڑھا۔ ٹھاکر کے نام پر میری اور بی بی کی آنکھیں میں اڑ رہی تھیں۔

ہم دونوں کورس میں ہنس پڑیں۔ لطیفہ باز، مسکین سموت، چھٹے ٹھاکر دسٹ سٹگھ کی دوسہائی بوی کے سامنے دار کا نام لینا بھڑوں کے کچے پر چڑھ چھینٹنے کے برابر تھا۔ اس لیے ٹھاکر زیادہ تر سہاں اکوہیہ تھے۔ سچی نے پریز کو کورس میں مکتون ڈالا اور میں نے غور سے کھنڈ کے ٹرین کے۔

گورکھن اور ٹھاکر کی دوسہائی اور سچی کی گھنڈ کے سامنے میرا لٹم جوں کا گلاس انتہائی ذیلی نظر آ رہا تھا۔ لیکن میرا بے حوصلہ تھا اور مجھ پر ابے حد کرکڑی۔ گورکھن کاٹنے ٹیک کھانے اور ٹھاکر کے لطیفوں کے درمیان ہنسنے ہنسنے میں سب کے جڑے دھم گئے۔ بارہ بجے بجتے ٹھاکر نے امان لی اور سچی کے الفاظ میں "غیبت" ہونے لگی۔

"جیل صوفیہ اور جھپک آئیں۔" سچی اور گورکھ نے فیصلہ کیا اور ہم سب کا زمین لہجہ بند کر دیا۔ ٹھاکر کے گھر جان وہ ڈوڑی ڈونڈا کر کے آتا ہے گ اور ان کی بیوی کے لئے استقبال کریں وہاں ہونے

سردار کے ہاتھوں میں دو پھینکے تھے۔ ایک میں جھپک اور دوسری میں ٹھاکر اور دوسرے میں شامت کے مارے دوڑتے۔ تیلی نے آیا کو پکارا۔

"ارے آیا کو کیوں پکار رہی ہے۔ یہ چوہے صوفیہ؟" "نہ بھینا آئی تو صوفیہ ہی کھئے۔ میں نہیں پکاتی آپ کی کھل کھلے۔ ایک عدد بوی، ایک عدد باہر جن انہیں سے کام چلائے۔ میں رکی بھی سلام کرنے کو۔ یہ بیٹھے آداب ٹرن۔ بند ہی چلی۔"

گورکھ نے مجھے دو دروازوں سے پکڑ کر صوفیہ پر نظر پڑا رکھ دیا۔ کھنڈ کسی سے اپنا اسٹنٹ ہے کیا؟ انہوں نے آنکھ ماری اور کھنڈ داڑھی کے اندر دیکھنے لگا۔ "اپنا اسٹنٹ کیا فاک ہو گا اس کا۔" نے ٹھاکر وہی سال پچھڑی اس کی کسی؟

"کون ہے بھی وہ؟ آٹھ برس سا کھڑا زار کھنڈ گورکھن کی کھنڈ میں سچی کی صوفیہ و بی بی زان فراصل ہی سے آئی تھی۔"

"ارے وہی گھوڑے میں لائق والی۔ اسی کے لیے پریشاں ہے؟"

"ارے کچھ شامت بھی کرے گورکھن ہنس پڑے۔ وہ گھوڑے میں لائق والی یا یہ کھنڈ میں دو لٹیاں مارتی صوفیہ۔ کون کس کے لیے پریشاں ہے؟"

"تم مدد کی پھانک رہے تم دونوں پر۔ دروازہ ان تو دیکھ۔ کھنڈ کا نام ڈوڑ دیا۔ میں بڑی طرے بھینڈا۔" نے سؤ (یہ سچی کا دوسرا کلمہ تھا) اس کھنڈ والی کے

"ڈرنے ٹھاکر۔" بھرا کی پچھڑی کا ذکر۔ نے یہ کہا۔ ارے کھار۔ اور لارٹو ہاؤس کھنڈ کی فارغ التحصیل، جین، تازک انڈام چندر گور بیدی نے جوف نام میں سچی کھنڈ کی تھی اور گھر بند خالص عمارت بنائی میں کھنڈ کو کھنڈ کی تھی اور ڈرنے مونیہ۔ جین کا کھنڈ کلام تھا۔ پیر کے پچھڑوں کی پوری بیٹھ تقریباً میرے مونیہ میں کھنڈ کی دی۔

"دیکھ سچی اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں نے اپنی آنٹی کو وقت دے رکھا ہے اور وہ چوہا ہے میں نے سچی جڑے بات کرنے کے لیے۔"

"ڈرنے ٹھاکر۔" نے اس اسٹیر لوانتیا تیر کر لیا کویری آواز ہی اس میں ڈوب کر رہا ہے۔ پچھڑی کی آواز سے آواز میں چلنے پڑے کھار۔ سردار سے نہیں ملے گی؟"

"جانے اب آئیں گے۔ ارے سچی میں کب تک بیٹھوں؟"

"اب آ ہی جا۔ دار کو طلب سار کی ہوگی۔ چوہ نہیں کرے گا۔ اور سچی کے اس کھنڈ کے اندر دن کے چارائے دیکھ کر مراد گئی میری دوڑنے میں نورار ہوئے اور دروازے کا فریم ان کے لائے چوہ سہریم سے کھنڈ۔ جین ٹھاکر، خوش مزاج، بارہا سچی، بوی بچوں کو ٹوٹ کر چاہتے والے، کھنڈ فرادے بے نیاز

• سی۔ ۱۱، نیو انیسری پوسٹ، بیٹو، پٹنہ ۸۰۰۰۰

کہ ان کا سبھا امتحان کر کے رکھا جاتا اور آٹے
 ہاتھ میں ملتا تھا۔ سیدھے سے سر جھانپنے سے
 برائی آکھوں سے وہ سب کھوڑ کر پھٹیں۔ سبوں
 کی شان نزول سے خیال میں کہیں کوئی کردہ عیاض
 بارہ بجے رات تک انتظار کرنے کے بعد کوئی نہیں
 روٹیاں نکالے گئے۔ مگر کچھ کا کھنا تھا کچھ کریمین
 سے بنے ہیں۔

اجانک بے سارا نظرائی کی برداشت سے باہر
 ہوا تھا۔ انہوں نے خاص اور سی سے لفظ سنا کر شرمنا
 کر دیں۔ تین جگہ نے دوپہر میں نہیں ٹھوس لیا اور گرہن
 انتہائی بخیرہ جسے ساتھ الگ کوٹے پر لگے۔
 ”سجائی! ہم نے سوچتے جیسے کہ یہ ہی ان
 سے کہا تھا کہ کھانا بس کرو۔ اس سے زیادہ تمہاری
 بسا کی نہیں ہے، بلکہ ان کو کھوڑ پڑی تیسرے ہی میں
 آؤٹ ہو چکی تھی۔ کچھ کیا خاک آنا گرہن کے
 ڈھکڑاپ ۱۹۳۴ء کے آس پاس ٹھنڈا آؤٹس گئے
 تھے۔ اس وقت گرہن کی عمر کوئی دس برس کی تھی۔
 اس لیے وہ خرب فرماتے تھے نہیں اور دوسرے تھے۔
 بچائی پوتے ذرائع کی باتیں ”کا کارڈوین
 بچائی پوتے۔“

”میں رہنے دو۔ بی زحما دہرا۔ میں نکالے
 ہوا نکالے۔“
 تو سجائی! اٹس۔ تمہارے جسم نے تو بھیل
 دیوای می کی تو میں اٹس تو میں اور سارے مام کوڑ
 دیکھ تھے۔ اس مردود نے کار کوڑا دیکل کا پورا
 کر سٹ۔ نیچے پیر پیر ہنسی کا دودھ پڑا۔ گو بھوک تو بھیل
 پڑا پیر ان کی تھیں اور سارے مام کی بھیل سی سسرنگ
 طاری تھی۔

ٹھاکر کوڑا پڑا اور نیچے ان کی بھری کی امان میں
 وہ کوڑا گرنے اور نیچے جب غور نہیں کرنا کے پیچھے
 روٹی میں اہتہ دو لائی۔ ڈیپو۔ سی۔ اے کی بھولی کی مٹا
 ستری ممدت میں چھوڑ گئے تو پڑا سارے بارہ بجے
 تھے۔ مگر بی کی آغوش میں روٹیں دیکھ کر بھری جان بھگتی
 آؤٹ کی بھری کی سیدل کھنکھاتی وہ بی کی بھری کے ساتھ

ساتھ نکلیں۔

”کس کے ساتھ آئی ہو؟ وہی تمہارا دوست؟“
 ”معاذ مجھے۔ دوست نہیں دوست کا شوہر۔“

”COMES TO THE SAME“ ”اورے! واپس
 آئے دوست نہیں ہے۔ آئی دیتے آئے بھولاوت باہری
 گزرا رہا کرو۔“ ان کا بھرتیہ اب میں بھیگا ہوا تھا۔ میں
 خاموش سے دانت پیسی ہوئی بیڑھیاں لے کر گئے۔
 نہیں، جھوٹی جھوٹی کرکڑی کی ہوئی بھیلیاں پرانے
 اور ملاؤ لاڈ کی جی اور گرہن کے پیچھے پڑھا کرے کھر
 کا وہ فہمہ راستہ اور اب ساڑھے بارہ بجے رات کا یہ
 شدید راتینی کا ٹکس میں جس جیز کا زہر خند۔ آئی ایل
 زین سے تعلق او ایل میں کہ ان سب چیزوں کے درمیان
 ان کا گرہن نہیں تھا۔ وہ دنیا کی انتہائی غیر دلچسپ اور غریب
 شخصیت تھیں، جو بھیلوں میں شریک تھیں نہ بھیلوں
 میں۔ ایسے سوتوں پر صرف غلامی کی جاتی تھیں۔

کوس میں داخل ہوئی تو میری آسامی دوم
 میٹ کلانی بے ”س“ کا بہت زیادہ استقبال کرنے
 کی وجہ سے ہم سب ”سلیانی“ کہا کرتے تھے۔ خروٹے
 میری جی تھی۔ میرے بیٹے ملحقہ جھوٹی سی راتنگ
 نیل پر میرا پندار تھم دونوں گلے لگتے تھے۔ آئی کی تحریر
 میں نے فرما بھان لی دو گھنٹے تک میرا انتظار کرنے
 کے بعد وہ واپس لوٹ گئی تھیں۔ کھانا تھا بھر
 کبھی نہیں گئی۔ الفاظ کو پیچھے پیچھے سے تھے بیسے ان پر
 کوئی رد نہ رہا۔ مجھے جیسے کھانے ڈنک اردیا۔
 آئی ایل کی بھری بڑی بے رونق آنکھیں چاروں طرف
 کرے میں بھرتی تھیں۔ بے جاری آئی دورے آئی
 ہوں گی۔ دو گھنٹے تبدیل کی ہوگی۔ اگر حضرت گنج
 میں ہی آگئی ہوں گی تو غامی دور تبدیل بھی چلتا
 پڑا ہوگا۔ بھر یہاں آکر دو گھنٹے کا انتظار۔ نہ بھی
 بے صبر حال نظر آئے انتظار سے بچے کے بے انہوں نے
 مجھے پرسوں کی ٹیلی نوں کر دیا تھا اور میں نے انہیں
 اطمینان دلایا تھا کہ میں جوش میں ہی ہوں گی۔ میں
 نے میگزین کیٹ۔ ایک میگزین کے نیچے سسے سے
 لکھوں کا ایک بلیٹ رکھا ہوا تھا۔ آئی ایل کبھی

خالی ہاتھ نہیں آتی تھیں۔

پیش راج میں صرف انہوں اور دروازوں
 کے نیچے آنکھیں میڈیم اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔
 آزاد ہندوستان میں پرخص اپنے بچے کو انگریزی میڈیم
 میں پڑھانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انگریزی اسکول
 ہرمانی میڈیکل کی طرح پیدا ہو گئے ہیں۔ آئی ایل
 بھی ایسے ہی ایک پھٹے انگریزی اسکول میں پڑھاتی
 تھیں۔ بیرونی تو صرف تین سو دیتا تھا، لیکن آئی ایل
 سے محبوب بہت تھا، اس لیے اس کے اسکول میں آئی ایل
 ایک سمت صرف تین اساتذہ ایسی تھیں، جن کی اداری
 زبان انگریزی تھی۔ اس سبب سناٹا خالص نہیں، مگر
 انگریزی دولی لوگ ان تھیں۔

ایلی آئی سے می ملاقات آئی ایک گوانیزو
 ریٹا مینز کے ذریعے ہوئی تھی۔ ریجائی ماں سے انہوں
 نے کچھ دور دراز کی رشتہ دار کاٹی تھی۔ میری ماں
 اور ریجائی نانی کو ان کے ایک گاؤں کی تھیں۔ انہوں
 خاصہ دیکھ انداز میں بتایا تھا۔ ہمارے اعداد و شمار
 پر ہمیں کچھ نہیں گرا کر اس گئے تھے۔ انہیں پڑنگائی نرین
 نے عیالی بنا دیا تھا۔ کچھ کچھ پڑنگائیوں نے ہمارے
 خاندان میں شادی بیاہ بھی گئے تھے۔ انہوں نے بڑے
 فخر سے بتایا۔ میری ماں بہت گوری تھیں۔ آئی ایل
 غامی ساؤنی تھیں، اس لیے ان کی گوری رنگت
 کا تیرہ ضرور کرنی تھیں۔ ان کے اعداد و شمار سے یا
 برعکس، مجھے ان کے شجرے کا کھت سے قطعی کوئی لکھی
 نہیں تھی۔ مگر آئی ایل ایک بہت دلچسپ
 (CASE) معلوم ہوئی تھیں۔ پونوڑی کے
 سائیکو لوجی ڈیپارٹمنٹ کی ریسرچ اسکیم میں کام کرتے
 کرتے ہر فرد مجھے ایک کس معلوم ہوتا تھا۔ اور بھی
 کا کھنا تھا کہ میں خود ایک کس میں جی جا رہی ہوں۔

ریشاک میں سب میں بی بی بان سے ملی تو
 دیشاک ان کا تھانہ ان الفاظ میں کہا تھا: یہ
 ہمارا کھائی میں ہیں۔ بڑی سربیش ٹری نیک۔
 اب ہمارے یہاں ہی رہی ہوگی۔ ایک اٹائی بان واری
 ان پر بڑی طرح عاشق ہے، مگر شکل یہ ہے کہ دونوں

کیتھونک ہے۔ بے جا رہا، بیاہ نہیں کر سکا۔ میں نے ہونٹوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر نہیں دیکھا۔ لانی بے ڈول، ڈھلے بے رونق، مائل و لکڑی مائل رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں کوئی کشش نہیں تھی۔ ادنیٰ جیسا پرانی دھب کا بد رنگ اسکرٹ، سیم میں سے ٹوٹی ہوئی پنڈلیاں جہاں تک رہی تھیں، مجموعی حیثیت سے وہ مجھے کسی آؤٹ سے مست پر لگیں۔ یہ کوئی سات آؤٹ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اور ریشا ایم۔ اسے قابل کر رہے تھے۔ گزرتی تھی اس وقت بھی تھی ستادی جوتی تھی اور لگنے کی کرکھو تھی جی کورسے چارے شہر کھڑکیں سوئی اور کچل سرگرمیوں کی کمر محسوس ہوتی تھی۔ اُن کی فکر اس نے بھی ایم۔ اسے میں داخل ے لیا تھا اور میں میرے اور ریشا کے ملنے میں داخل ہو گئی تھی۔ اب اس سب باتوں کو ایک جگہ بہت گھبراہٹ۔ ریشا کا ڈیڑھا اُٹھا ہے۔ تجبی دو بچوں کی ماں ہے اور میں ایک بچہ کمر کنواری و سنگ گزل۔ ہاں تو اس وقت میں نے آؤٹ سے مشابہت کی ایک کے ساتھ کسی اطالوی یا دوری کی ذہنی شبیہ بنائی اور دل ہی دل میں اتھائی بدتمیزی سے ہنسن پڑی۔ کچھ ہی دن بعد ریشا نے مجھے فادر سلوٹو سے ملا یا۔ حضرت گج کی بگھوٹی کی روشنیوں، ریسیڈوئل پوش دوکانوں اور صحنہ میں ہونٹوں کے رنگ برسنگے آئینوں کے درمیان کھڑی کیتھون کی پُر سکون عمارت کے اندر کی بے پناہ تنہائی، خاموشی اور اداسی کے دھبے کچھ نہ کچھ کی شوکی ہادی ابھگوانڈن پڑھیا کر گھٹیا کی آسودہ دھاتا رہے تھے۔ نیلا آنکھیں، ہنرے بال، سنہری حارشی، لانا بند، پتھر برونڈن، تقریباً جوان عمر، چہرے پر بیکریگ جو دنیا میں ہر کوئی دیکھے ایک ہوجانے پر پیدا ہوئی ہے۔ میرے منہ پر سے غمت نکلا۔ ”یار ریشا وہ آئی ایل کی سش اسش“ ریشا نے مجھے خاموش کر دیا اور اندھ جانے کے لیے سر پر اسکاٹ بانڈ سے لگی۔ فائل اسحاق قریب آ رہے تھے میں نے بھی سر پر آئیل دست کیا اور کیتھون کے اندر بیٹھے بال میں گھٹنوں کے نیچے جھک کر دھکی۔

”یا ایک پروردگار! اپنے ان محبوب بندوں حضرت مسیح، اوصد تہ مریم کے فضل۔۔۔۔۔ مگر خاک جی رنگا آنکھوں کے بگے آئی ایل نامی ناجی رہی۔

فادر سلوٹو نے دل چاہا انسان تھے۔ اُس دن میں شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ آبا کا خیال تھا وہ لگے باہر ریشا کو دے تھے۔ ہم سب جے جے نہائی تھے اور ابھی کسی کی فکر تک ممکن نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ شادی میاہ اور ڈگریاں۔ مجھے اپنے ریڈٹ کی شدید فکر تھی ادا اس کے بعد ڈگری کی بھی۔ چند منٹوں میں میں فادر سلوٹو سے گھل مل گئی۔ ادب کچھ کچھ ڈالا۔ اُنہوں نے کسی تسلی دی، کتنا ہنسا، کتنے سارے لطیف سنائے۔ چلنے وقت وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے خصوصی دعا کریں گے، ما اپنے سارے سائل کیتھون میں پھیر آئی، مگر ایک سوال ذہن میں جا چکا رہا۔ آئی ایل اور فادر سلوٹو؟

واپس میں کُن کاوش لائبریری کی بیڑھاں چڑھتے ہوئے ریشا نے بتایا۔ ”تو تو بڑی کاؤوری ہے۔ آئی ایل باندی سے کتنی سی“ کے لیے جا بابر کی تھیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے دھانے کسی سے حاملہ ہو گئی تھیں۔ اسقاط کروا دیا۔ گھار بھی ہے ہرے کی ہیں۔ کروٹو دیا، لیکن شدید احساس گناہ میں مبتلا ہو گئیں۔ فادر سلوٹو کی شخصیت دیکھی ہے تم نے؟ اُنہوں نے سہارا دیا۔ ان کے دکھ دیکھے۔ اب آج کل وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ فادر اُن پر عاشق ہو گئے ہیں۔

”اور آئی ایل؟“ میں نے سوال کیا۔ ”میں چلے تو کھال کی چرتیاں بھڑا دیں؟ ریڈٹ نے منع کر ڈالے دالے ملازمین کہا۔ ”تے چاری؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ میں خود را جی داسی دیر میں فادر سلوٹو پر عاشق ہوتے ہوئے بھی تھی۔

”یہ چاری دے چاری کچھ نہیں۔ زبردست ایڈٹ ہیں۔ تمہاری سائیکسٹری کی اصطلاح میں اسے کیا کہتے ہیں جو ہر وقت خوابوں کی دنیا میں رہتا ہو؟“

میں خوابوں کی دنیا میں رہا کرتی تھی، جہاں اداں کا دے کا مرض بالکل شکیک ہو چکا ہو۔ آبا بھی ریشا نہ چہرے ہوں۔ بیٹھی اور میری ڈگری لگ رہی ہو اور ابی چار بھوئے ہیں بھائی اکرام سے پڑھ رہے ہوں۔ ایک بڑا سکان۔ خوشحال اور محفوظ۔ احساس تحفظ، جو مجھ بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب بھی قلعے کی دیواریں مضبوط ہوں اور خواب بڑا وہ دیکھنے کا مطلب ہے، قلعے کی دیواریں مضبوط ہیں۔

اور آئی ایل کے قلعے کی دیواریں کی مضبوطی کا کیا ذکر وہ تو کسی نے فوراً کر پورا تہہ بالا کر دیا تھا۔ وہ پیدا ہی ہوئی تھیں گھنٹروں کے دلدیاں۔ تھی کسی شخص تو ان کا اعتقاد ہو گیا۔ باپ نے انہیں یتیم خانے میں داخل کر دیا اور دوسری شادی کر کے زحانے کہاں ثابت ہو گیا۔ آئی ایل کو خدا ترن مشرور نے پڑھایا لکھا، ٹوٹری دانی، مگر اس شخصیت سے خود ہی کی تلافی نہ کر سکے جو ہرے کا سیالائی تھی ہوتی ہے۔ ایسے آئی ایل تیس سال کی عمر میں بھی ایک نئے بچے کی طرح تھیں جو بہت کورنٹ لڑوں ادباً سمجھ کے اس سے سببان لیتا ہو اور ایک مختصری بہت بھری نگاہ۔ ایک بڑے بچے کیوں مجھے پس پڑھا چلا نا ہو۔ اُنہوں نے میری نگاہوں کی پھر دیکھی کہ سببان لیا تھا۔ اور مجھ سے، خود سے آؤٹ تو برس چھوٹی، ذہنگ سے جدوجہد کرتی، تجربہ کار لکھ کی دنیا میں ایک ناچو گاہ سے یوں جھٹ گئیں جیسے کمزور لیکن تناور درخت سے چٹا کرتی ہے۔

ریشا نے لے کر ان کے قلعے سٹائی تھی۔ ”آج آئی ایل نے ذرا دانا سے چھدے بال میں بھی گڑھا کا چھڑا سا گچھا بھجا تھا۔ وہ انہیں فادر سلوٹو نے دیا تھا۔“ دوسرے دن اس نے اطلاع دی۔ ”وہ بھیا گیا تو اُنہوں نے اُسے پانے کے گلاس میں ڈال دیا اور دیکھ اس کی طرف تھی رہی۔ وہ کھائی کہ کہہ بیٹے لگی

یہ SHE IS SUCH A MAD CAP ہے۔ یہ نہیں تھی نہ کیوں انہیں گھر میں بند کھڑا ہے؟ ریشا میری عمر تقریباً مگر لی کی مہاموں میں

صوبے چھوٹی۔ سب کا لاڈلی۔ سب اچھی خاصی
 لڑکوں سے گئے ہوتے تھے۔ باپ کی بیکری تھی اور
 ایک ننھو بھگوان لڑکا الگ اس پر عاشق تھا۔
 اس لیے ننھو کی فلاح پر اس کی تھی مستقل معزز ہو
 اور مال مستور آگئی تو ذوق اپنا سفر آخرت بہت سے
 کرتا ہے۔

رشتا! میں نے کچھ فوری کچھ زبردستی مستند
 کی ہوئی تنہا کے ساتھ کہا۔ "آئی اے ایک ایک
 دیکھو مگر میں!"
 "اور تم دیکھو مگر میں نہیں چاہتا"۔ یہاں سے
 کیونکہ کہیں جہاں پھر نہیں جانا۔ یہاں سے
 بات کا دل تھی۔ اور زور سے اس کی کمر کو
 پکارتا تھا۔

سال کے بعد اندر اندر آئی اے میں نے
 کا کچھ عجیب دیا۔ فارسلو نو لے مانی کو لے کر
 دیا کی تھی نے بڑی جہاں چلائی تھی کہ وہ ایک پادری
 کو دیکھ کر رہی ہیں۔ کچھ دیکھنے سب جہاں سے
 الگ کا بڑا نک میں دم کرتے تھے۔
 "آئی اے! آج فارسلو نو لے لے میں تے
 ہوتے گھر گئے کھاتے تھے۔ آپ کے بھی وہی لاندہ؟
 وہیں کہتا۔

"آئی اے! آج فارسلو نو آرڈر (ORDER)
 چھوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی
 کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بڑی خوبصورت ہے۔" فونی
 ایک لگتا۔

"تم کیا کہتا۔" وہ جواس پر جاتیں۔
 "جہاں نکلا ہے آئی۔" جہاں انتہائی
 عجیبہ اور آداس ہو کر نکلتا۔

اور اس کے دن سیرے سیرے ہوتا۔ بھوکو وہ
 منگوا پیا شہر اور قریب ڈھک میں بھی جاتا۔ آئی
 سورو تھیں۔ رات کو وہیں بائیں کی میں تنہائی
 سے جھانک کر ہولہ لے کرے کرے کھاڑا کھا کر
 یہاں کی تھی سے ناظم تھا، وہ تنہائی کا بہت قدر کرنے
 بڑی تھی دوستی سے بھی تھی۔ سہلی جھینے اس کا

کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ انہوں نے دیشا کا گھر چھوڑ دیا۔
 اس کی سبک داری کی معرفت انہیں ایک بڑے فونی انٹر کے
 وسیع دروازے کے دوسرے سرے پر رہتے ہوئے تین
 سو روٹ کو لڑ رہیں سے ایک مل گیا۔ جس سے وہ اس
 انٹر کے بچوں کو پرورش پڑھاتی تھیں۔ باقی کے دو لڑکے
 میں سے ایک مال تھا اور دوسرے میں ڈرائیور۔
 دونوں کی برباد تھی پھر انہوں کی قاتل تھیں اور
 آئی اے کی کفن ہوئی، انہوں کو انتہائی مشکو کی فلاح
 سے دیکھتی تھیں۔ وہ وہ فونی انٹر کی بڑی فوری بہت
 اُنچے ستون پر ایسا وہ تھی۔ آئی اے دونوں کے درمیان
 گلتی رہیں۔ وہ نو مینس لفظ (AND) (NO MAN'S)
 کے دوسرے میں آئی تھیں۔

دن دھلے کلش لگائی تھے علاقہ میں رات
 جب جلدی آئی اور صاحب ہم صاحب گلب کی
 جگہ گلب کرتی ڈیوٹیشن میں برتا جھپٹے اور مالی اور
 ڈرائیور کی بیویاں اپنے اپنے بچوں کو لے کر جھلگتی
 جا رہا ہوں میں دیکھ جاتیں تو بچے کے ساتھ میں میاؤ
 کی ننھوں کا آوازوں کے درمیان آئی اے باری باری کاٹ
 لینے کے قابل تھیں اور میں اُٹھتے دو روکو داکر
 سوچتیں کہ یہ دولت مندا اور خوبصورت مرد اُنچے
 بن لڑکوں کی قسمت میں کھسے میں وہ کون سی دنیا کی
 مخلوق ہو کر رہی ہیں۔

ایم۔ اے میں میرا فرسٹ کلاس نہیں آیا
 تھا، اس لیے دیگر رشتہ نہیں ملی مگر سال بھر
 قریب ماہ کے بعد ڈیپارٹمنٹ نے مجھے ایک لبریری
 اسٹیم میں لے لیا اور میں وہی ڈیپو۔ سی۔ اے میں
 منتقل ہو گئی۔ ڈیپو بس ڈیپو آجائے۔ بساں
 رہنے والوں کی خاں ہیں ہوں۔ کچھ کلش تھا
 آئی اے کے اب مجھے مائل و بالغ، خود مختار بڑوں
 کے خلع میں رکھ دیا تھا، اور مجھے کچھ زیادہ قریب
 آگئی تھیں۔ "تم دنیا کی دوست ہو اور دیشا بڑی
 بھی جاتی ہے۔ اس طرح تم بھی میری بھائی بنو گیں۔"
 دیشا کیسے سے ایک ننھی اور سخی مخلوق کے بعد بھی
 وہ ان کو لے لے اپنا رشتہ جوڑنے پر پھر ہار کر گئی تھیں

اس طرح انہیں کی بھرے پڑے کنبہ کا ایک کا لکھنے
 کا احساس ہوتا تھا۔ جھپٹا اور کھوکھلا سی۔ آئی اے نہیں
 کھلے کنبہ کے رشتوں پر زندہ تھیں۔ ایک دن وہ مال گھڑی
 ہوئی انہیں اور مجھے لگے لگا کر ڈائیں مار مار کر رونے
 لگیں۔ میں جبرست زدہ ہو گئی۔ آئی اے کو کوئی ایسا
 قریبی عزیز نہیں تھا، میں نے مرے پر اتنی دباؤ کی مارنے
 کی اُمید ہوتی۔
 "فارسلو نو آئی واپس چلے گئے۔" انہوں نے
 برس سے تھا سائیں لگا دو مال نکالا اور انہیں خشک
 کھاتے کے اطلاع دی۔

مجھے سہی باران پر پڑا غصہ تھا۔ علی گئے
 میں بولی۔ "لو کیا آپ کچھ میری تھیں کہ وہ واقعی
 آپ پر عاشق ہیں اور پرانی تھی مجھ سے ہیں؟"
 انہوں نے جواب نہیں دیا۔ میں ایک ایک ننھے
 سینے کی نظروں سے دیکھ کر سر جھکا لیا جس کو زبردستی
 اس کی ماں سے علیحدہ کر دیا گیا ہو۔ فارسلو ایک
 خوش گوار خواب تھے۔ منتقل ہونے کا ایک موموم
 اُمید تھے، جیسے ایک ایک سہارا تھے۔ آئی بہت دنوں
 کے بعد اُنڈر گراؤڈ ہو گئیں اور لبرری بھی اپنے
 جگہ پر کچھ بڑا انہوں ہوا۔

ڈیپارٹمنٹ میں میری اسکیم کا کام زوروں
 پر تھا۔ سائنس دانوں میں رہتے ہوئے فرسٹیشن
 پر میری بھری تھی اور میں اگر انتہائی بیزاری کے
 عالم میں سوچتی تھی کہ مادی دنیا میں رہتے ہوئے فرسٹیشن
 پر تحقیق کچھ نہیں ہوتی۔ کس سیوقف نے کہا ہے کہ
 فرسٹیشن مرت سائنس دانوں میں بڑھ رہا ہے کام
 کی زیادتی میں "میں خود سے اہلی آئی سے رابطہ تم
 نہ کر سکتی۔ اسی دوا میں تجھے اطلاع دی کہ آج کل
 بین کور (PEACE CORPS) کے ایک امریکن
 فوجی کے ساتھ کچھ ننھو فونی گفتگو میں اور اس اطلاع
 کے ساتھ ایک ننھے کا احساں کر دیا۔ "پتی کو فرسے سال
 دیکھا ایک دن مجھے بھی کو فرسے سال؟

"تم خود کو کس خانے میں رکھتی ہو؟" میں نے
 مصنوعی تنہائی سے کہا تھا اور جی بھتے سے کھڑی تھی۔

کچھ دنوں بعد اس امر میں کو دیکھا تو باہیں گھل گئیں۔ اس بار محروس ہوا کہ انہی اہلی کی ناکھڑا سے لگے گا۔ گئی۔ میں پلٹ کر پوچھنے لگیں، اتہاسانی غلیظ، پتے دات، گھوڑے میلا لانا موہن جو کھولے رنگ کے تلوں سے بھر اڑا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ خاما الحق بھی تھا۔ جیسا کہ اس نے گھٹنے پھر کر ملاقات میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ انہی اہلی کو بیاہنے کے لیے پرفیکٹ سینیٹر میٹر لی، ”مگر وہ ماہ بعد انہی پھر میرے شانوں پر سر رکھ کر وہی تھیں۔“
کیا ہوا انہی؟

”وہ جو سخت — وہ — وہی جم —“
انہوں نے پچھلیوں کے درمیان کہا۔
”غیر مت تو ہے؟ کیا ہوا جم؟“ میں بھی اسے پچھلیں پچھلی گئی۔ کچھ اس کی صورت ایسی ہی تھی کہ اس کے متعلق سب سے پہلے خیال ہی آیا۔
”اوہ —“ وہ اور زور سے رونے لگیں۔
”ارے کچھ پیسے بھی تو؟“
”نہ چاہا زور دے — اس نے بھی کیا سمجھا۔“
میں اسے ایک گھر دینا چاہتی تھی۔ اس کے بچوں کی ماں ماننا چاہتی تھی۔ اپنے اور اس کے بچوں کی ماں —
مونیہ — مونیہ — تمہاری سمجھ میں یہ سب کچھ آتا ہے؟ — جولو — اور ان کی پچھلیاں بندھ گئیں۔

میں نے انہیں ہی بھر کر روئے دیا اور خود کچھ کچھ بھی مونیہ تاکتی رہی۔ خوب رو لینے کے بعد انہوں نے باقی کہانی سنائی۔ گھر دیکھ کر وہ پوچھا مونیہ بھی بیس کر رہی تھیں ایک ماہ تھا۔ میں گھر اور سرائے کی زنجیریں تڑا کر وہ بھاگ گیا تھا۔ انہی اہلی اسے باجوہ کے کچھ بھاری کے درمیان جھپٹنا چاہتی تھیں۔ بسبس — جہان گدھی — اعانت دے وہ ایک موہن مارو۔ اور گھر مونیہ کے کچھ مکان پر وہیں۔ بچے کم زور ہر گئے تھے۔ ہاں مے اس بابت پراسرار میں نہیں تھا کہ انہی اہلی کے بچوں کی ماں نہیں۔ ان کی طرف — پیدا کرکین دھوا اور پالائی وہیں با زانگی۔ بہر حال

اس نے عافیت اس میں بھی کر تھیں اس کے پرستے مانی وہ پچھلے آڑے گئے۔ اور انہی اہلی اور ایلو میڈ کے اس ہوٹل میں مزید کوسٹ برسانے کو زار و قفا۔
روئیں۔

گشت کی اس شدید میں بھری ستام کو جب بن برے بادلوں نے دوسرے ہی اندھیرا کر رکھا تھا اور مختلف ٹھکانوں سے کوئی ہوئی درکنگ گزرا اپنے اپنے کوروں میں ڈکی ہوئی ٹرانسپورٹس کی تھیں اور رسم چھپان کھاری تھیں زار و قفا روئی مظہر اُصول آڑی صورت والی انہی اہلی کے لیے میں نے دل میں بے پناہ محبت اور بے پناہ غصہ! مہٹ کر یہ ایک وقت آئندہ سے ہرے محسوس کیا۔ محبت اس لیے کہ وہ محبت کی حد تک تھیں۔ معصوم، غفلت، غناک اور پڑاس لیے کہ چالیس برس کی عمر کے قریب پہنچ جانے پر بھی ان میں انسانوں کو بچانے کی تیز پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی وہ حالات سے سمجھ کر نہ کو تیار ہو سکتی تھیں۔ لیکن کچھ لوگ شاید ایسے ہی ہوتے ہیں۔
اور ان کا مدد لاکھی کے پاس نہیں ہوتا۔

تبی کو کوئی کام دھام تو تھا نہیں۔ بس ساری دنیا کی جرسی پورنی زچہا تھی۔
”وہ تمہاری انہی اہلی آج کل تریش کے ساتھ گھوم رہی ہیں؟“
”تریش کون؟“ میں نے مل کر پوچھا۔

”ارے وہی جو ملے چلے والا اسلائے مونہ؟“
میں نے زور سے پوچھی۔ جواسیس میں تریش کی بائالکی بہت بڑی ایجنسی تھی۔ وہ ایک تھری سٹیج گھر کے لاڈ تھا۔ اور اس کی پوری جیڑی خیریت تھی۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم تھا کہ بی۔ اے میں تریش کی کرن پر مامری کلاس فیلور رہ چکی تھی۔ جس نے سوچا کہ اب انہی کے لیے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

ہوشی کے ساتھ ساتھ تجربہ کار سوسائٹی رس میجر پڑی زبردست سماجی کارکن تھیں اور خصوصیت سے گھنٹوں کے مقررین ملنے کے متعلق بڑی باخبر ہا کوئی تھیں۔ ٹوڈ میں ہوتیں تو بڑی جگے دلاؤ اور دل پہ

گنگو کرتیں۔ ایک دن ڈانٹ ٹھیل پاپا ہی موڈ میں کر میں نے ان سے کہا کہ وہ کوئی ایسا شخص بتائیں جس کے ساتھ انہی اہلی کو نہتی کیا جاسکے۔ یقیناً یہ بھی ایک سماجی خدمت ہوگی۔

”اس سے کون شادی کرے گا، تمہاری اہلی سے؟“ انہوں نے جبرست کہا۔
”کیوں میں جبرست؟“

”زبردست آدرا ہے۔ کون نہیں جانتا اس کے پاس میں۔ پوری کینیڈی ٹھکانوں کی ہے۔ پارسوں سرز جھٹ کچھ رہی تھیں چرچ والی مینگ کے دکاندار۔ کاب تمہاری انہی اہلی نے چرچ جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ببب نادرسو اگلے تے تب... انہوں نے کانٹے میں پھنس بھی کھانکھانکھان میں ڈالا۔ اور تھانی غلاست سے موہنے چلائے گئیں۔ میں نے ہا نہیں مانی۔ وہ جو میں ایک سر ڈاؤنڈا۔ رنڈوے۔ دوایں ہائے سٹما آپ کی مدد کرنے آتے ہیں؟“ انہوں نے بات کا ڈی۔

”ڈی سوزا کی مشادی کسی اچھی عورت سے کراؤں گی۔ یہ سمجھتی ہو امی گھر کے لیے وادی عورت ہے؟ خوب بیڑی چٹائی ہے اس نے تم کو۔ ہاں یہ بتاؤ۔ یہ ہم سبھی لڑکی اس فرائش کے لوگوں سے کیسے ملتی تھیں۔ سائیکلو پیڈ کر تمہاری اپنی چولیس ڈھیلی ہوئی رہی کیا؟“ میں نے دارمان لی اور خاموش ہو گئی۔

انہی اہلی آن کل ایک چمے سرے کے بدقماش چھوڑ کے ساتھ گھنٹی نظر آتی ہیں جو ان سے تقریباً دس برس چھوٹا ہے۔ انہیں کوئی امید ہے کہ انہی اہلی اور خدمت سے وہ ایسے دلاؤ راست پڑے آئیں گی۔ میں اب ان سے ملنے سے حقور آسا کرتے لگی ہوں۔ میری ”مناسب“ سے سبب دوز کر رہی ہے اور میرے جڑے والدین بڑی شد و مد سے لڑ رہا۔ تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن ایک ایسا شہر ہے، جہاں اتھار ایک میگزین۔ (اگلے صفحہ)



وہ ایک بوڑھا

نہایاں ہو جاتا۔ اس کے اوپر گھبراہٹ طاری ہو جاتی اور مانگتے پر ننگی گیس کی لٹاریاں ہو جاتیں۔
تقریروں کے بعد عموماً بے جے کار بونی۔ موٹے موٹے باروں کا ایک دوسرے کی گردن میں تھوکر ہوتا۔
ایسے موقع پر بوڑھے کی گردن میں بھی ایک بار ضرور پینا بیا جاتا۔ ہارین کر بوڑھا ڈاٹا عجیب سا گفتا جیسے ہار کے بوجھ سے گردن ٹوٹی جا رہی ہو۔ اور جب تک کوئی من جلا کھیل کے جانے کے بعد وہ ہار میں کی گردن سے آواز نہ لیتا، باجوا کے تھوچوں سے بھیلوں کی بچھڑیاں بکھر جاتیں، بوڑھا عموماً بے چین ہی رہتا۔
بوڑھے کے گرد ہر وقت لوگوں کے جمع رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بوڑھا نہ صرف شہر کے لیے بنگلہ تھا بلکہ خاص کر رہنے کی عادت کی وجہ سے اس سے دوسرے بزرگوں کی طرح ذرا معقولات کا بھی اندازہ نہ تھا۔
اس کے علاوہ بوڑھا جس ملگر پر کھڑا تھا وہ جگہ جگہ بہت کارآمد۔ شہر کے بچوں تک۔ خوب صورت بچے بزرگیوں کی وجہ سے بنگلہ کی مجلس میں اسیچ ڈیوٹو نہانے کا بھی کوئی حقیقت نہ ہوتا تھا۔ بڑے حرس سے خوشی جانتے تھے زوردار دھڑے سے مہیا کرتے۔
وہ مردہ ہوا ہوا باندہ بوڑھے کا سانس بانی اور تقریروں کے گلاب کی سونا سونا گھٹا۔
روزے نہانے سے جیسے موت۔ نئی نئی آواز میں کھسب رہی جاتیں۔ نہایت گردے کے پان کھولے جاتے اور اپنی

بس آگے ہی دلا ہے۔ کسی نے اس بوڑھے کو بڑے ہوتے نہیں سنا تھا۔ مگر اس کے ہونہ سے ہی پوتی باتوں کا ذکر ہو کر چلا جوتا۔ اس کی باتیں ڈیرائی جاتیں۔ اس کے خیالات کا اظہار کیا جاتا۔ مگر وہ سب کی سنا اور ہونہ سے کچھ بھی نہ کہتا۔ جیسے کہنے کو کچھ باقی نہ ہو۔
بوڑھے کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے سر پر سایہ کرنے والا سانس بانی ہر صفت اس کے سر پر ہاتھ نہیں کرتا تھا بلکہ اس تک اسے داغے لوگوں کے لیے آرام کے علاوہ تباہ خیالات کے لیے ایک پڑھنا مقام کی نہ لگتا۔
لوگ بوڑھے کے اوپر ڈیرہ کر صفت باتیں نہیں کرتے تھے بلکہ جو میں میں متنبات باندھ کر ہاتھ جلا جلا کر دھو کر تھے۔ چمچتے۔ جلا تے۔ نھرے دگاتے۔
ان کے بلند بانگ دھڑوں سے نضا ٹوٹا اٹھتی۔
نہری کی نفل پر جوش و خروش طاری ہو جاتا۔ بھر پور صحت جاتی۔ کبھی کبھی تو بکھڑا تھی بڑھ جاتی کہ سانس بانی کی سرحدوں کے اندر سرہ بھی لگائی ہوتا۔ پاس کی شکر پر پختے والوں کی کھیر میں ہو جاتی۔
بوڑھا سب کی باتیں بڑے طور سے سنتا۔ اس کا دل دروندی سے بھر آتا۔ اس کی سنان میں کبھی اور گہری میر جاتی۔ اور کبھی کبھی آنکھیں جبر سے پٹھے پٹھتیں۔ سائیں۔ گھبراؤ۔ تار بند کی جیسے الفاظ اس کو بوڑھے کے ہر سے ہا جنت کا احساس

وسط غریب طویل بڑھانے سے گھسے ہوئے میر میوں داغے اوچے جوتے۔ بھولنے سے خوبصورت سانس بانی کے نیچے بوڑھا بہت دلی سے لاشی کا ہمارا بے کھڑا تھا۔ اسے میدان میں کھڑے ہوئے طویل و صر گزری جاتی تھی۔ زجانے کتنی گریبان آئیں اور کتنی سر دیا اور رہا میں گزرتیں۔ بچے جوان اور چان بوڑھے سے بھگتے۔ مگر بوڑھے کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہ آیا۔
بوڑھے کے ہوشوں کی ملکوتی سکان۔ اور سینک کے خیشوں کے پچھے سے جماعتی ہوئی آنکھوں کے مخصوص بلا سے ایک عجیب سی موت تھی۔ شاید اسی لیے شہر کی دن بھر کی دھڑ دھڑ پ کے بعد تو کبے ہر تھیزوں، ہر سات کی تکی بوڑھا اور مرد ہواؤں کی جھٹی سوتوں سے بچنے کے لیے اکثر لوگ اس سانس بانی کے نیچے تک ہار کر بیٹھ جاتے۔ کھنوں سے کھنوں کا آرام کہتے اور کبھی کبھی تو بزرگیوں پر بڑھ کر سوسے جاتے۔
مگر بوڑھا نہ تھکتا نہ آرام کرتا۔ اس کی تکی جانا میں دعوتی اور صرٹ ایک شانے کو ڈھکی ہوئی چادر ہی اس کا ٹاپا رہی تھی۔ اپنے گرد و پیش سے بڑا گول لکائی دار سینک کے پچھے اس کی آنکھیں کی گہری نگر میں لگتی رہتیں۔ اُسے دیکھ کر سانس بانی جیسے نہ کسی کا انتھار ہے۔ اس کا، ہر ایک بنگلہ نہیں آیا۔ اس کا جو

• ۱۱۱ پریس۔ نائی پریس بڈنگ، کھنٹو ۲۲۹۰۰۳

ہفتیہ : نئی ایسی

میں ڈرتے گی ہوں۔ جو کہتا ہے لوگ اپنی دلائل میں میرے اوپر کبھی چسپاں کر دیں۔ انہی نے بغیر کسی رشتے نام کے ایک لڑکی سہروردی کے بدلے جو فہم مجھے دی ہے اس کا بدلہ شاید میں نہیں چکا سکتی۔ اپنی تنہائی کو خدمت خلق اور دینی، وطنی، سی۔ اے میں ڈوبنے والی ذہن دار گھولنے کی مس پوسٹا تجویز ہیں کہ طے اصحاب میں اونچے درجے کے انصار اور دقت تاجر شل میں، اپنے اونچے ستونوں سے عیاں جی ہیں اور اپنی ایسی کو اس نے لڑکے کے ساتھ دیکھ کر انتہائی حقارت سے کہتی ہیں: ”بچی آوارہ ہے۔ یہ گھر کرے گی صلا،“ اور اپنے شوہر و بچوں میں، خوش و غم تبخیر و عیدی سے ذکر کرو تو ”دُلفے مونہ“ کہہ کر اسیر لڑکی کو آزاد تیر کر دی ہے۔ میں اپنی ایسی کے لیے کیا کروں؟ خدا کی اس وسیع دنیا میں میرے ذلیل بہت محدود ہیں۔

آنکھیں اچانک کھل گئیں۔ سامان میں کوئی تھا ہی نہیں۔ اوپتے چوڑے پر ٹوڑے کی ٹیکہ عالی تھی۔ اپنی جس اونچی جگر پر ٹوڑھا پچھلے سالوں سے اٹل کھڑا تھا، وہ عالی تھی۔ جھنڈیوں سے سجھا عالی چوڑے دیکھ کر اسے خوف معلوم ہوا۔ وہ بھرتی سے پیچھے ہٹا اور واپس مرگ پر کھٹکا۔

سجھا گئے سمجھ گئے اس نے ایک بار پھر پیچھے ہٹ کر چاروں طرف دیکھا۔ رات کے پچھلے ہرکے سٹلے اور انہی کے کھلاڑیوں کوئی نہ تھا۔ آخری سیر میں اس کے پیروں میں کوئی چیز پھنسی۔ یہ ڈوبنے کی قومیدہ چادر تھی۔ جو شاید جانے وقت شانوں سے ڈھلک گئی تھی۔ چادر کے پاس ہی گول کمانی دار صینک پڑی تھی۔ وہ ایک چھلانگ لگا کر بھرتی سے مرگ پر اٹھ گیا۔ اس کی سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ وہ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا رہا۔ بڑھا کہیں نہیں تھا۔

سبزے پر دور تک شبنم کے موتیوں کا ٹوٹنا بتا رہا تھا کہ کوئی ادھر سے ہو کر گیا ہے۔ مگر کدھر گیا ہے یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔

خوبیاں گنوائی تھیں۔ اور دوسرے روز مختلف کردہ بالکل جی مل دہرا تا۔ ایک ہی بات مختلف زبانوں سے بار بار سننے سننے ٹوڑے کے کانوں میں بٹیاں بٹنے لگیں اور وہ بڑی بے بسی اور آگاہی سے اپنے کو درجہ لڑکوں کو دیکھتا۔ اس کا غموش سنس آنکھیں ابھی کرتیں۔ مگر سیر پھاڑ میں کسی کو اپنا ہوش نہ رہتا۔ سراسر کھاکر اور ٹوڑے کو کوئی دیکھتا۔ دوسرے دھیرے دھیرے خیر کے حامل میں ڈوڑھا بھائی چہرہ گویا۔ اب اس کا نام قمر کے قتلوں یا نادان کی بکوں کی کتابوں میں جوتا۔ کبھی کبھی دھروں کے ہونہر سے انہماں میں کمر توڑنے کے بجائے ڈوڑھے کے چہرے پر ہزاری اور نہایت کی بولی چھا جاتی۔ اب اس کی یہ لڑکے کے شیشے دھندلے ہو گئے تھے۔ آنکھیں پھولنی پھولنی گئیں۔ پیچھے قمر کا استحکام اب عجیب سی تھکا دیش میں بدل گیا تھا۔ اس کی پتلیوں پر کچی دھولیں جڑ گئی تھیں۔

جلد توکل ہونا تھا، مگر اس کی گھما گھی اور تیار ہا ایک دن پہلے سے ہونے لگی تھیں۔ ٹوڑے کے سامان کو بھینڈیوں اور ٹوڑے جسے جھنڈیوں میں پھونک کی آنکھیں رنگ رنگے حرفوں میں چمک رہی تھیں، سیاہ یا گیا تھا۔ جھنڈیاں اپنی زیادہ تمیں کو مرگ سے ٹوڑے کا چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ منتظمین رات کے تنک ٹوڑے کے کت مولوں کے پاس بیٹھ کر اگلے روز کے جلنے کی کارروائی پر تیشیں کرتے رہے اور چہرے جلد ہی اس کی تاکید کرتے ہوئے ایک ایک کر کے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

ابھی صبح تلخے میں کافی دیر کی کدات بھر مل میں اور ٹام گولنے کے بعد ایک مزدور دانی پسند سے پوچھ بلکے جیسا کہ پوسا سامان کی فون بڑھا۔ مگر کبھی دُور تھا۔ ٹوڑے کے چوڑے کی صاف اور کچی سیرھیاں اسے نیند کی دھوت دیتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ بڑوں بھی ٹوڑے کے قدموں میں ایک نیند کے لکڑ جاناس کا معمول بن چکا تھا۔ وہ نیند میں ڈوبا دھیرے دھیرے سیرھیاں چڑھنے لگا کہ اس کی بند ہوئی ہوئی

ہماری تاریخ آزادی کی شعری دستاویز

مشعل آزادی ساغر نظامی

قیمت : ۴ روپے

بزنس منیجر: پی ایچ ڈی ڈوٹرین، پٹیا لہ ہاؤس، نئی دہلی

شرح چند کا

ہندوستان پاکستان دیگر ملک

سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱۵۰ پونڈ
دو سالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵۱۴ ڈالر ۲۰۰ پونڈ
سہ سالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۵۰ روٹ ڈالر ۳۰ پونڈ
فی کالی	ایک روپیہ ۱/۵۰	روپیہ ۳	سینٹ ۱۵ پی



نجم رہا ہے دل کا تار

اور مولیٰ موت نے شرمائی ٹھنڈی آکھ کر کہتے ہے
اب بچھٹائے کیا بدورت جب گھر میں لگ گیا فون!
ہم رہ رہ کر اس دن کو کہتے ہیں جب گھر میں ٹیلی
فون گولے کی محنت مرزدروٹی تھی۔ دیکھ بیگ صاحب
نے سجدہ و غیر فرمائشات کے ٹیلی فون کی فرمائش بھی
سہاگ رات ہی کو درج ذیل تھی۔ لیکن جب ٹیلی فون
شبیہ دیکھا اور دروازہ کھلا ایک ایک کر کے ادا فون
کی ڈور میں بندھے گھر میں پدھر پدھر گئے تو بچے ہوئے
ریکارڈ کے کسی خاص پول پر اچھی مہی سونی کی طرح
ٹیلی فون کا اصرار بھی شدت اختیار کر گیا۔ پہلے تو بیگ
نے خاص زنا بخور کے ذریعہ اپنی بات منوانا چاہی
لیکن جب یہ آزمودہ حربہ ناکام ہو گیا تو خوب شرمے
بہائے۔ جو اب ہم فوراً چکے گھر میں ڈھل گئے۔
اب بیگ نے فون کے ہتھیار تیز کر کے۔ پہلا منڈل کی
تہا فراموشی کے حوالے سے ان کے شوہروں کے "بقی ایتنا"
ہونے کے شہار شہرت پیش کیے۔ سمریتہ کے بارے
میں فرمایا:
"کئی خوش قسمت ہیں سمریتہ۔ مشریتہ نے
انہیں سہاگ رات ہی کو موہہ دکھائی میں ٹیلی فون نذر
کیا تھا۔"

ہم نے طنز یہ بھی جواب دیا۔ آپ کو کسی
نے غلط بات بتائی ہے بیگ! مشریتہ نے سہاگ رات
کو سمریتہ کی خدمت میں ٹیلی فون نہیں بلکہ ٹیلی فون کا
مُلقہ علی پیش کیا تھا۔"

میں کافی دیر تک جھنجھکے رہنا پڑا۔ جب اپنے ٹیلی فون والے
پہنچے تو پہچان کر اس دوران میں بیگ صاحبہ و سمریتہ
فون کر چکی ہیں۔ ہمارے ساتھیوں کی محکمہ خیر مسکراہٹ
صاف چلتی تھی یہی حق کہ ہماری عدم موجودگی میں کوئی
ٹیلی فون نہ کر سکا ہے۔ اپنا ایک فون کی گھنٹی بجی۔ ہم نے فوراً
ریسپونڈ کر لیا۔ بیگ صاحبہ کی آواز سنائی
دی۔ آگے آپ۔ مل گئی فرحت۔ اتنی دیر تک
باقی عدم میں کیا کر رہے تھے؟
ہم نے حیرت سے کہا: "باقی عدم۔! یہ بات
سے کس گھر سے کہا؟"
"ہو گا کوئی آپ ہی کا بھائی بند۔" اُدھر
سے طنز کا چھلکا ہوا سیدہ ہمارے کانوں میں اُڑنا لگیا۔
پھر خشک لہجے میں پوچھا۔ "کھانا ہے آپ اکیسے
ہی گئے تھے نا باقی عدم؟"
ہمارے چہرے کے بل پل جلتے تاثرات نے
تھنائیوں کی دہلی دہلی ہنسی کو جھنجھکے میں بدل دیا۔ بس
ایک شرمائی بے چارے اس دکھ میں ہمارے بارے
شریک تھے کہ ہم انیس اودھ میں اپنا دکھ شریک نہ کر سکتے
ہوئے۔ اُدھر یہ وہ بھی بھاری ہی کتنی کے سوار میں۔
اس ٹیلی فون پر حیرت کا شکار ہیں۔ شرمائی کا خیال
ہے کہ اسی سبب یوں کہیں پہلے تو اس ٹیلی فون کے
آگے ہی ایک عدد ڈور مار کر ڈور میں، فون کر میں تاکہ
بات کر کے وقت اپنے شوہروں کی نقل و حرکت پر بھی کڑی
نظر رکھ سکیں۔ لہذا اس محنت کی بجائے ہم بیگ صاحبہ کی آواز

ٹیلی فون لڑی کر آآمد نے بے ٹکین اس
وقت جب اپنے گھر کی حدود سے ڈور بڑھیں۔
محدود ہو۔ البتہ جیسے ہی اس کا آآمد نے کی آمد فون
گھر میں ہوتی ہے تب ہی ٹیلی فون اس دن بدلتا رہتا
کی طرح ہو جاتا ہے، جو ہوا کا لہر دیکھ کر بدھ رہی
اُدھر جی کے مصداق اکثریت دلی باری میں شامل
ہو جاتا ہے۔ جتنا کہ جس وقت تک یہ آآمد نے ہمارے
غریب خاندان سے ہر سہ ماہی کر دیتی، رادے نے
چین کیا مہینہ لکھا تھا۔ اپنی مرضی سے جہاں چاہے،
جاتے، جب جی جاتا آفس سے غائب ہو جاتے۔
کئی دن میں باروں دوستوں کے ساتھ گھر سے اڑتے
شام کا شور دیکھتے اور گھر پہنچ کر بلا اجازت اور ناظم
کا ہوا بنا کر لپیٹا کرتے۔ لیکن جن روز
سے اس جگہ ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے ہمارے
آزاد قدموں میں پڑیاں پگھلی ہیں۔ اس کی آمد کے
ساتھ ہی ہماری آمد و رفت بیگ صاحبہ کی گشت میں
آگئی ہے۔ دن میں یہی تہہ و بالا فون کر کے ہمارے
WHERE ABOUTS کے بارے میں اس
قدر تفصیل سے انکوائری کرتی ہے کہ اب ہمارا پڑیشن
اپنے اندرون کی نظریں خاص مشکوک ہو چکی ہے۔ ساتھیوں
کی نظریں الگ نکلتی ہیں۔ آج کل کی بات
ہے کہ فون کی کام کے سلسلے میں "اس کے اجلاس

محبوبہ کا کہنا ہے: ”اوپر سے نفع کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ“ جن کے ایک اشارے پر شیخ صاحب نے ٹھہر کر کہا: ”اگر لائق لگادی“۔ ”ہم نے تو محض بچہ لگایا۔“ یہ بھی غلط اظہار ہے، مجھے تو ان کے ٹھہرنے ہی ایک نئی فون دکھائی نہیں دیا۔ ہاں بچہ لائق ضرور لگادی ہے شیخ صاحب نے۔“

”مجھے دوپٹی سجوانے کا؟“ ہم نے فوراً لقمہ دیا۔

جواب میں مقرر تھے کہ یہی مفید نہ انداز ہے
ارشاد فرمایا: آپ کی کچھ میں نہیں آئے گا یہ سخت! اسے
توہین روزہ اپنی پندرہ سون کوٹھن پر تنگ کروں گی
ان کو حزب ملاؤں گی۔ ان کہنہوں نے مجھے بھی توہر
ملا یا، کھلوا ہے۔ بلکہ میری ماہیچہ تو آپ بھی

ماستھیں کو چلائیے، اگر چاہائیے، لیجیے نمبر گھمائیے۔“
اس سٹور کے ساتھ محترمہ نے ریسیور والیں رکھ دیا۔

کہہ رہا تھا۔ ”میری نیندیں حرام کرنے والے
 تجھے مینے سے نہیں سوسے دوں گا۔“ سیدھی طرح بتاؤ
 میری بیوی کو افواہ کے کہاں چھپا رکھا ہے اُسے
؟“ یہ خطرناک بہتان سن کر ہاتھ پاؤں
 پھول گئے۔ ”بچے، دانگ گیسروں میں نہیں بے زبان

جہازوں کا تاقیہ ٹھہرایا گیا تھا اور یہ الزامات ہم
 جواب دہ نہیں تھے۔ لیکن کسی کی جوی کے
 اٹھانے کے متعلق ہم جواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔
 ہم نے تو یہ جگہ یا اور اس تازہ ترین الزام سے
 انکار کیا تو وہ دلائل چاہتے ہوئے ہو گئے۔ ہائے
 ہائے اس قسم کی ہولناکیوں کی دلچسپی۔ مجھے آپ
 سے یہ امید بڑھ نہیں سکتی، آخر کہاں جہاں کے رکھ
 ہے اس حوالہ کو....؟

ہم نے سمجھا کر کہا۔ ”میں جوش کی دوا
 کرو۔ جو شخص خود اپنی جوی کی طرف اس کے اسکت نہیں
 رکھتا وہ کسی اور کی جوی کو افکار سکتا ہے جیسا کہ
 مجھے تو یہ فن ہی آسید زود معلوم ہوتا ہے۔“
 آسید کے ذکر پر مجھے یہ توجہ لگ گئی۔
 البتہ ہم دوسرے ہی دن ٹھیکہ فون کے منتقلہ اسٹر
 کے پاس پہنچ گئے یہ معلوم کرنے کی فوج سے یہ فون
 اس سے پہلے ہی کے نام افکار تھا۔ وہ زور سے یا
 مرگلو اور اگر گویا ہے تو فوجی نوٹ مرابے یا فوجی
 کی ہے!“

منتقلہ اسٹر جو کچھ ہماری جوی کی پہلی کی ہیں
 کے صلیب تھے، اس نے محوڑی کی دیو میں صلیبات
 کا دھیر مارے سامنے لگا دیا، میں سے یہ چلا کر
 ہماری کول میں پہنچے سے پہلے یہ فون جانوروں کے
 کسی ڈاکٹر کی ملکیت تھا، جو کچھ روز پہلے اپنے کسی
 چوہے کے مرنے کی مالک کے ساتھ نہیں قرار دیا گیا تھا۔
 اور اس حد سے مالک کے شوہر کا دماغ ایک کٹی
 تھا۔ اس ٹھیکہ سے ڈاکٹر نے پندرہ برسوں سے فون
 کے بل اور اس کیس تھے، اس نے مکرانے فون مضحکہ کرنا
 تھا اور یوں یہ بلا ہمارے گزری۔ منتقلہ اسٹر نے
 چلتے چلتے ہمیں کئی تعلق فرمائی کہ کچھ دنوں تک
 لوگ اس مفرد ڈاکٹر کے دھوکے میں ہیں اس قسم کے
 دھوکے آہستہ آہستہ کرتے رہیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ ہزار
 ہزاروں کی فون کی تعداد بڑھ کر گئی۔ چست پنچ
 فون کے متعلق میں تم یہ جھٹکے براہ راست کرتے رہے۔
 لوگ تو خیر بڑے بڑے نہیں ہوئے۔ البتہ تم خود اس قسم کے

”ماہی خبر“ جھٹکنے کے مادی ہو گئے۔ !!!
 ایک تہہ آدمی رات کو فون کی گفتگو بھی
 ہم نے نہیں سنے ہوئے رسید ہوا تھا اور جیسر
 ”ماہی خبر“ میں ایک عدد ہوا ہی ”ماہی خبر“ کی
 دروازہ لگا تھا۔ جواب میں انتہائی مزاحمت کا آغاز سنا
 دی۔ ”صاف کرنا صفا ہی صاحب، آپ کو
 بند سے جگا دیا۔ کیا آپ اردو جانتے ہیں؟“
 اس عجیب و غریب سوال پر پہلے تو ہم ہکا بکا
 رہ گئے پھر خیال آیا کہ شاید کوئی مصیبت زدہ اردو
 والا ہے۔ اردو کے نام پر ہم ویسے بھی کافی
 جذباتی ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جذبات کی آویں، افرا
 کیا۔ ”جی ہاں، میں اردو جانتا ہوں فرمائیے“
 دوسری طرف سے چلا کر سنا دی۔ ”ابھی ابھی
 غالب کی زمین میں ایک منزل ہوئی ہے۔ منتقلہ توجہ
 چاہتا ہوں؟“

ہم نے سمجھا کر فرمایا۔ ”اس وقت مات کے
 مارے بارہ بجے ہیں اور آپ تو چاہتے ہیں؟“
 ”خدا فون بدلت کیجیے۔“ اُدھر سے
 گزرا کر اپٹ شروع ہوئی۔ ”بھیکے کئی دفن سے شہر
 میں شروع ہوا، بالکل نند میں۔ سننے والوں کا عجیبے کال
 پڑ گیا ہے۔ اب فرانسیزیوں میں ایشیوں ہونے کی ہے
 پیٹ بھول رہے۔ آپ نے بھی میری منزل نہیں سنی
 تو کچھ کہتا ہوں میرا پیٹ بھٹ جائے گا۔ میں حیران
 گا۔ اور ایک عجیبہ سنا کی روز ناک موت کے ذمہ دا
 آپ ہوں گے۔ اور وہ آپ کو کبھی صاف نہیں
 کرے گا۔“ شاعر صاحب اناپ شتاب کیے تھے اور
 ہم نے فون کٹ کر دیا۔ محوڑی زیر ہند جیسر
 گھنٹی بجی۔ ہم نے سمجھا کر رسید ہوا تھا۔ دوسری طرف
 شاعر صاحب بدستہ اپنی استدعا کے ساتھ دھڑے ہوئے
 تھے۔ ”پڑھنا جان! میری غزل سن لیجیے۔
 خدا آپ کو ادا ہے کہ بل جڑوں کو نادر کے، آباد
 رکھے۔“ اس دردناک طرز پر خطاب پر ہمارا
 دل دڑا سا بیجا۔ ہم نے انکڑے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”مٹک ہے۔ جلدی سنا ہے اپنی غزل، مجھے نیند

آ رہی ہے۔“ جواب میں شاعر صاحب کی آواز آئی۔
 ”خدا آپ کو سلامت رکھے۔ اور وہ آپ کا اسان
 کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ ویسے آپ شہروں میں
 تو بدلتے ہوں گے، شعر سننے کے بعد آداب سے بھی
 یقیناً واقف ہوں گے۔ میرے ہر شعر پر کئی محمول کرواد
 دیجیے۔ سبھی جان، شاعر روی، کپڑا، مکان کسی چیز
 کا ٹھکانہ نہیں ہوتا، صرف داکو کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔“
 شاعر صاحب پھر پڑی سے اتر گئے تھے۔ فلزائیم نے
 ایک بار پھر فون کٹ کر دیا کچھ وقت کے بعد جیسر
 گھنٹی بجی اور سسل جتی رہی۔ بالآخر ہم نے فوری
 قوت کے ساتھ رسید ہوا تھا اور کچھ آؤ دیکھا نام
 بے سہارا برس چسے۔ ”انتہائی وابستہ آدمی معلوم
 ہوتے ہیں آپ ایک دم فضول ملکہ فحشد۔“ ہم
 اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ دوسری طرف سے سبھی بھر کم
 ٹھیکہ کر سنا دی۔ یہ کیا یہودی گے ہر وقت!
 ”دعا سلام، ایک دم کام، وہ بھی اس تقدیر کا نام۔
“ شاعر صاحب کی آواز پہلے سے ہی مارے ہوش
 اُٹ گئے۔ ”گزارش کر عرض کیا۔“ سوری آپہنچو اور اسل
 ابھی کچھ دیر پہلے ایک شاعر صاحب مجھے بار بار فون پر تنگ
 کر رہے تھے، ان کے دعوے آپ کی شان میں لگائی
 سرزد ہو گئی۔ میرے صحت یافتہ ابھی غلطی نہیں ہو گئی۔“
 جواب میں شاعر صاحب کی دہرائی دی۔
 ”غلطی تم سے نہیں برحق ظہر سے سرزد ہوئی ہے کہ
 تم جیسے نامقول آدمی کو ہانا دلا دینا کر، اپنی معصوم
 بچی کا مستقبل تباہ کر دیا۔ یہ نہیں میری معصوم بچی ٹھیک
 سے کھا پی پیتی یا سوتی بھی ہے یا نہیں۔ ذرا بے فون
 پڑھاؤ۔“
 ہم نے فلزائیم سے جواب دیا۔ ”آپ کی معصوم
 بچی خوب ڈٹ کر کھائے کے بعد اس وقت میں کی غنید
 سو رہی ہے۔ کیجیے تو نکالوں؟“
 آواز آئی۔ ”میں نہیں مے ست جگاؤ۔“
 ہم نے پوچھا۔ ”اگر کوئی پیغام آپ کی معصوم
 بچی تک پہنچا یا ہو تو فرمائیے۔“
 ارشاد فرمایا۔ ”اس وقت میں نے اپنی بچی کو

بقية: موت

ہوں کہ چمکی تو بات بے کردہ ہوئی کہ کھڑے ہونا اپنا حق سمجھتے
دوسرے میں آیا تھا، اور پھر ایک گڑبڑ پیش کہ اس نے کئی اور فریضے
سپاست اور ادب و شاعری پر گفتگو کی تھی، اور میدان میں
اس نے کچھ اور حوا ذکر کیا، ہمیں جانتی تھیں۔ پھر عرصے کی سختی
سب گزشتیں ہو چکی تھیں، اور تب دماغ سلاخ مار گیا تھا۔
میں بھاگنا ہوا اس کے گھر پہنچا۔ بڑی سوگوار سی، نصفنا
تھی، عزیز و اقارب کے علاوہ بہت سے اس کی پاس
کے لوگ بھی قیام تھے۔

اُس کے جانی نے بتایا۔ پاس میں کہیں تھے
میں اس ایل کے ایک نئے والے کی چکی کی بات آئی تھی۔
وہ ایک بے رات تک مجھ کو کھانا کھا رہا۔ آخری
دشتر خوان کے بعد اس نے دو کھانا کھایا اور پھر وہاں سے
سگریٹ بنایا جو گھر کے طرف روانہ ہو گیا۔
بتائے والے نے بتایا۔ ٹھیک اس جگہ پہلا وہ
مگر اس ایل کے گھر سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر واقع ہے
وہاں تک کہ گویا، اور اس نے پانی پانی بیچنا شروع کر دیا
اس دور میں اس نے مٹی کی شیش اتار دی، مٹیاں، انار
پھینکی اور ایسا آٹا کھا کہ چتون میں آنا پھینکے گا کہ پڑوس کے
کچھ لوگ اس کی دلد زین میں سر کر سوتے ہیں اور بیٹھے۔
باہر نکلے تو پھر کھانا اس ایل میں، پر پڑا ہر طرح پر ر
خدا۔ وہاں کچھ سرخ نے اس کا رخائی کے گھر تک اسے
اسے لے جایا، لیکن تب تک وہ رچا تھا۔

کسی نے کہا کہ یہ اس کا دوسرا دور تھا۔
 اُس دن پہلی بار اس بات کا علم ہوا کہ میرے حریف ایک
 ہنسے ہوئے اسامیل کو جانتا تھا، اصل اسامیل سے تو سرے
 سے میری کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔

اور یہ وہ اسماعیل عاوج کے گھر پر صرف وہ اور اس کی بیوی رہتی تھی۔ ہاں بچے اس کے کوئی نہیں تھے۔ شاید وہ بھی اس سے زندگی کے چھبھٹا بیٹا اسے اندازاً دس اسی کے تھنوں کو کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

متعلقہ تہدیدار کے گھر ایک عرصہ تک فون کال کرتی رہی۔ اور اس طرح مزاج پر کسی کو نہ خانہ مزاج درست کر کے دیا۔ ٹیٹ جاتے ہیں۔ ایک پڑوسی نے تو نہایت ہی حد تک کاغذ پڑھا۔ کیا ایک روز فونانے لگے۔ ”ہمارے نام آتی ہوئی فون کالوں کی اطلاع دینے کے لیے آپ لوگوں کو خواہ مخواہ ہمارے گھر تک آتے کیلیف گزار کرتی رہتی ہے۔ آپ کی ان تخلیفات میں بڑی تخلیق ہوتی ہے۔ لہذا آپ کو اس زحمت سے بچانے کے لیے ہم نے سوچا ہے کہ آپ کے اور اپنے گھر کے بیچ کال کیل سے ربط قائم کیا جائے۔

ان تھنڈیوں کے سین دیاتے دیاتے اپ اپنے
 ٹھہری میں ہم نہیں بولے (BELL BOY)
 کے عہدے پر نامزد ہو گئے ہیں۔ لہذا صاحبو! بھولے
 سے سمجھا ہے ٹھہری فون میں ٹھہرائے۔ اگر ایک بار یہ
 لاپ لاپ کے ٹھہریں داخل ہو جی تو چھپ کے اچھے خاصے
 کھر کھر آفات و بلیات لا سکتے ہیں تو کوئی نہیں
 روک سکتا۔ — !!!



جگانے کے لیے فون نہیں کیا ہے بلکہ دیکھنے کے لیے فون
 کیا ہے کہ تم گھر پر موجود ہو کہ نہیں۔ بچے دنوں کی سرکشا
 کر رہی تھی کہ تم اکثر اُدھی رات تک گھر سے غائب
 رہتے ہو۔"

میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”حضور! باجائے
 قبلہ! اب اس وقت کی بات ہے جب گھر میں ملی فون
 نہیں لگا تھا، اب تو میں ۵

جی ڈھونڈتا ہے پھر دی نصرت کے مات دیں ...
 خسر غصے سے دھاڑے۔ " بزرگوں کے آگے
 شاعری بگھارتے ہو۔ "

ہم نے تو کی یہ ترکی جواب دیا۔ شاعری
 بنیں سچائی عنین کر دیا ہوں دیے چاند بنی عنین سے
 آپ غالباً ناسن کلب سے فون کر رہے ہیں کیا آپ
 کے معصوم بچے کی والدہ کو اس بات کا علم ہے کہ آپ
 روزانہ آدمی اذیت دات تائب ناسن کلب میں رہی کھینٹے
 ہیں۔

اس اختلاف پر جس دم تک کہ جیسے ماہر مریض
 گیا۔ ہم نے "سہلو ہیلو" کی گردان کے حب انہیں
 اپنی بات متوجہ کرنے کی کوشش کی تو مصروف
 "انگ نبر" کو کہہ کر نکل کر دیا۔ یہ اہل بیمار اور تفری
 "انگ نبر" سمجھا، جو ہمارے حق میں رائے نہایت ہوا۔
 میں دن کے اسرار و راز کو صاحبِ ذوق نے
 کے بعد ہی کھلے ہیں، حالانکہ ابتدا میں یوں لگتا ہے
 جیسے آپ کے دربار اچانک بند ہو گئے ہیں، لیکن
 خوشی ہے کہ میں نے ساری فنی اترتوں ہی ہے تب
 محسوس ہوتا ہے کہ درجہ کی یہ بلندی بالکل وسیع
 اور ہے کہ میں نے کے دربار اچانک مجھے عرصہ
 میں سفرِ نکلاں کے درجہ کا نقصان "الف" کر کے
 کے بعد نکلاں میں تبدیلی کے اس کا درجہ بلندی کا
 ہے۔ — کتب کو چوری ہوئے جو ہمیں ہماری
 خیرِ خیرت چاہنا کہ اگر آپس کے تھے وہ اب دن میں
 روز و بار کا ریزہ ریزہ ہی کر کے گئے ہیں۔ یہ دربار
 ہے کہ ہمارے ہی کے دربار نہیں اچانک یہ الہام
 ہوئے کہ "پشتی" کی کہ کوئی کاروائی کے سلسلے میں

یہ رشتے یہ بندھن!

اوشانے زمین پر پڑی ہوئی کتاب کو اٹھا لیا اور خاموش گھڑی رکھی۔ اس کا دل پڑھنے میں بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ آئے دن گھر میں ایسے ہی کثرت ماسخ اور تکرار، جھگڑے اور طنز و تشبیہ ات ا عجیب اٹھیں اور کشیدگی جی ہوئی ہے۔

اوشانے سوچا: "کنو اپنی کی دلیر لاکھتے ہی ماں باپ مٹی مٹیوں کے رشتوں میں بردبار کی وجہ سے لگاؤ اور محبت یکا یک ٹوٹ جاتی ہے۔ ممتا اور پیار و محبت کے نام پر ماں باپ اپنے بچوں کے پرول میں زندگی کی یوں بیٹنا چاہتے ہیں۔ ان کا دود باریکبار بندھن اتنا کھلے اور سخت کیوں ہو جاتا ہے، جہاں آزادی نہیں۔ گمراہ بندھن ہے۔ وہاں پیار و محبت اور ماں کی ممتا کی کوئی گنتا نہیں رہتی۔ جی جی۔ اگھوٹی اولاد۔ اور وہ بھی مچوہ ماں کی اگھوٹی اولاد۔ اس سے بڑھ کر تکلیف دہ اور کوئی چیز نہیں۔

ایک دن شام کو دفتر سے لوٹتے وقت اوشا اکیلی بن آئی۔ اس کے تہراہ ایک اجنبی مرد بھی تھا۔ بھگارتی کے ادھم صدمی رہ گئی۔ اوشانے نہایت ہی سلیقہ مند سے اس سے اس مرد کا تعارف کرایا اور کہا کہ وہ کالج کا تدریس ساقمی ہے۔ اسی نے انا کو یہ سبھی بتایا کہ وہ کس قدر خیر ملازم ہے۔ بھگارتی اس اجنبی اور اچھا نگر مرد کو کھو کر دیکھتے ہوئے

"ہائے رنی چڑیل۔ بھگارتی کی تفصیلی آواز کی گونگائی دی۔" کون ہے وہ؟ "تم کس کے بارے میں پوچھ رہی ہو؟" کتاب کو پکڑنے پر اوشانے اوشانے پوچھا۔ "وہی تمہارے فریڈ کے بارے میں ہے۔" "اوہو! اب تو تم نے تعہد کر لیا ہے کہ وہ لڑکا ہی ہے۔ ہے نا؟" "تمہیں نے فرمایا تھا؟" "کیا بتایا تھا؟" "کہ وہ لڑکا ہے۔" "میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اگر وہ لڑکا ہے تو تم کیا کر لو گی؟" "تب تو وہ لڑکی ہے۔"

"میں نے کب کہا تھا کہ وہ لڑکا ہے؟" بھگارتی کے غصے کا پارہ چڑھ گیا۔ "تو گویا تو بیٹا بنا چاہتی ہے کہ اس معاملے میں مجھے پوچھنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ ہے نا؟" "اوہو! اتنا غور سے سمجھو۔ کمانے والی ہونا؟ میں تیری کمائی پر بڑی ہی دبی ہوں۔ میں تیری عیاذ میں ہوں۔ اس بات پر اپنی ذلت، بے عزتی! ماں کے لیے تیرے دل میں رنی کجی کی بار عزت اور عادت نہیں تھی۔ ہائے سبھان اس صہری کا بڑھری میں اور کتنے دن زندہ رہوں۔ بھگارتی بڑبڑانے لگی۔

"تم نے کہا تھا آج چلی ہے؟" "کیا سمجھ؟" "دوپہر کو تم گھر نہیں گھس؟" "اوہو! سیدھا سیدھا پوچھا ہوتا کہ تم کہاں گئی تھیں؟"

"اچھا اب بتاؤ تم کہاں گئی تھیں؟" "فریڈ کے ان۔" "سوچا تھا کہ۔۔۔" "اوشا کھڑی کہ آج ایک۔۔۔" "اس کا تھماں ٹھیک نکلا۔ ماں بھل چڑی" "فریڈ مٹی۔۔۔ مرد با عورت!" "اچھا! جو کتنا چاہتی تھیں تم نے لکھ لیا۔" "تب تو۔۔۔"

"فریڈ مٹی! ماں کی! اب میں پھوٹی بچی نہیں رہی۔ اب میں سانی ہوئی ہوں۔" "جو کچھ بھی ہو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔" اوشا ہاتھ میں تھکی کتاب کے اوراق اٹھتے گئی۔ "تمہیں بتانا چاہیے کہ وہ تمہارا فریڈ لڑکا ہے یا لڑکی؟" "مجھ کو وہ لڑکا ہے۔"

● ۶۶ برس بعد، اوشا کے کانوں میں دھلاس ۶۰۰۰۰

یہ سوچے مگر یہ کہ یہ دونوں الگ الگ دفاتر میں ملازم ہیں۔ مختلف کام کرنے والوں کے ہاں یہ قدیم بارہ ایک تازہ کیسے ہو گیا۔ سچا گری کو ایک دم کئی دن پرانی بات یاد آئی۔ اوشانے میں فریڈ کا ذکر کیا تھا، یہ وہی تھیں۔ اب تک وہ اپنی بیٹی کے ہاتھ پیٹے ذکر پائی۔ سنا یہ یہ سب، مگر کئی بیٹی ہے۔ جوانی اور عطر لاکھ دینے پر بھی اپنے آپ ظاہر ہو جائے ہیں۔ مگر اوشانے وہ تو اچھی چل رہی ہے۔ اچھے اخلاق اور نیا کورا کلا لڑکی ہے۔ جسکی جھوک اندر اس کی آسودگی کے ذرائع کی منتا بی بی شرم اور بے حجاب بد چلن لڑکی ہرگز نہیں۔ پھر بھی یہی سنا ہے کہ اوشانے اس دو کس کو اپنے نظری حیرت کے ساتھ اس کی اصل اور واقعی شکل میں قبول کرنا ہے۔ سچا گری کی اوشانے کے دھڑکے برفوں سے کالی پریشان ہو گئی تھی۔ اوشانے اس نووارد کو کالی بیٹی کی سچہ دیر باتیں بھی کہتی رہی۔ اس دوران نو جوان نے اپنی سلیقہ مندی اور اپنے حق کر دار کو بھی سمجھا دیا۔ جب وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو اوشانے ناں سے کہا۔ "اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

سچا گری بھی کچھ اٹھوئی اوشانے کو ٹھیک کر دے اور پھر وہی آواز میں کچھ بد جانے لگی: "سب کیا ہو رہا ہے اوشانے؟" اوشانے نے کئی اسی قسمی کرتے ہوئے کہا۔ "اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

اوشانے کے پاس کے نقوش ایک دم اُجھٹے گئے وہ کہنے لگی۔ "اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

اوشانے کے پاس کے نقوش ایک دم اُجھٹے گئے وہ کہنے لگی۔ "اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

"بیٹی، میری کچھ نہیں کچھ نہیں! اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

"بیٹی، میری کچھ نہیں کچھ نہیں! اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

"بیٹی، میری کچھ نہیں کچھ نہیں! اے جی! میں ان کے ساتھ باہر جا رہی ہوں۔ ہم رات کا کھانا بول میں کھا گئے ہیں۔ ناشتہ کر دیکھتے کا پروگرام ہے۔ مکان کی چابی میں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں۔ میرے انتظار میں خواہ مخواہ پریشان نہ ہونا۔ سمجھیں! اور میں رات بھر میرے جلنے کی جہاں ضرورت نہیں۔"

اُمی لگی ہیں رہنے والی مسمی سے متعلق کافی حوصلہ سے طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں، ایک ایک دن مسائل کا یہ گھنٹن ہو گیا۔ چنگاری میں دہی اڑا رہی، بھڑکے سوسوں کرتے شعلوں کی طرح پھیلنے لگیں۔ اُس مکان کا دروازہ دیکھا کہ سب پر دھڑم سے بند کر دیا گیا۔ ایسا نظر نہ رہتا جیسے بے عزتی اور بدنامی کر دھک دیا گیا ہو۔ بند دروازے کے پیچھے ماں باپ کی چیخ و پکار، گالی گلوچ اور ان سب کے درمیان مسمی کی گڑگڑاہٹ اور آہ و زاری سنائی دے رہی تھی۔

بھانگر تیری بیٹی کے پاس دوڑی آئی اور پوچھ پچائی: "جاتی ہو؟"

"مسمی کو جاتی ہونا؟ چاروں طرف اسی کا چرچا مچ رہا ہے۔ سننا ہے کہ کوئلے کے ساتھ گھومتی تھی۔ اب پیر بھاری ہو گئے ہیں۔ اُس کوئلے نے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اب بے جا رہی اور رو کر بلان ہو رہی ہے۔ یہ بھی سننے آیا ہے کہ اس کے ماں باپ اس بھوکے کے پاس گئے اور اس کے پاؤں بھی پیر کر دیے، لیکن وہ شے سے کس نہیں ہوا۔ دیکھ کر نے کسی ایسے فرسے کے ساتھ کھینچ پھرتے کا نتیجہ آخر کیا نکلا۔ مونہ لانا کر کے پہلے کپڑے دوپ مرنی تو اچھا تھا۔"

اور سننے سے مزے نہ اٹاؤں میں اتنا ہی کہہ۔ "یہ لوگ اس کے پیر بھونے کیوں گئے؟" "کیوں گئے؟ یہ بھی کوئی سوال ہے؟" بھانگری کی آواز میں قسمتی کی ٹپٹیں شامل تھیں۔ "سوچا ہوگا۔" بیٹی کے ہاتھ پیر کر دیے گئے۔ میں غل غل سوت باندھ دیا جائے گا تو مارا سا ملو د بھانے گا۔ بھانگر نے کہنے بھانگر کیا کھواری بیٹی ان ہی جانے۔ ہائے ہائے کیسا اندھیر ہے۔ سنا ہے بے جا رہی تھی تو اس مومے کے پاس کسی تھی۔ دودھ کھانے سے سونے کی لالہ کوشش کی، مگر وہ کھنٹ، ایک دم مادہ آخر کر گئی کیا۔ ان باپ کو بھیجا۔ یہ بھی کئی نادان ہیں۔ اتنے دھتک

اندھیرے میں کیسے رہے پتہ نہیں!"

"لیکن ایک بات ہے ماں جی! چلو لڑکائے دن بٹکا اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول چھونک کر گھیرے آؤاتی ہے اور جب بات بگڑ جائے تو ان باپ کے پیر پھیلے۔ تو بہت بُری بات ہے۔" اور سن لے آواز میں درشتی کی آغوش تھی۔ "نادان لڑکی اور کیا کرتی۔ شادی ہو جائے تھی مانتے کا کتاب ڈھل سکتا ہے نا۔" ماں نے کہا۔

"اور ہو! ایسی بات ہے؛ اگر کتنی کا خیال ہے کہ اس کے پیچھے کو سماجی اصولوں پر حاوی کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ وہ اس لڑکے سے شادی بھی کرنا چاہتی ہے۔ اُسے پہلے ہی اس بات پر غور سوچنا چاہیے تھا کہ کہاں سے سماج میں شادی بیاہ کے اصول کیا ہیں۔ ورنہ اُسے اس طرح کی جرات نہیں کرنی چاہیے۔"

"تو تنہا کبہ رہی ہے بیٹی! میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن اوشا تو بھی ہتیار نہ بنا۔ جو سماج اور اپنی عزت کی پروا نہیں کرتے، اُن کا انجام یہی ہوتا ہے۔ کبھی؟"

"ماں جی! ہم دونوں کے خیالات میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ اگر میں سماج کے نلے ہوئے اصولوں کا خیال نہیں کرتی اور اپنی مرضی سے اپنے خیالوں پر بھی عمل پیرا ہوں تو اس کے جو بھی نتائج مجھے سنبھلنے پڑیں گے، انہیں میں اکیسلی ہی سنبھلیوں گی، ڈروں گی نہیں۔ مگر مسمی اس معاملے میں مجھے الگ ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اس لڑکے کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی۔ اسے سماجی استدوار کا لحاظ نہ رہا۔ لیکن اب پیر بھاری ہو گئے تو شادی کے ذریعے اپنے اس "انیر" پر سماجی اصولوں کی ٹھہر لگا نا چاہتی ہے۔ ہے نا؟ جس بندھن کو توڑنے کی جرات کی، اُس بندھن میں خود کو جکڑے رہنا چاہتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" "تو تیری نڈھل سماجی اصولوں کی اخلاقی

قدروں پر چڑھا غلط ہے"

"ماں جی! ہم تیری بات کو سمجھ نہیں سکتیں۔ ہم چاہے سماجی اصولوں اور مذہبی عقائد کی پیروی کریں یا نہیں بنائال کر دیں، ان کی خلات و درز کی جس راستے کا انتخاب کریں اس پر آخر تک اپنی تمام ہمت کے ساتھ ڈرتے رہنا چاہیے۔ ایک قدم اس طرف اور دوسرا اُس طرف۔ یہ دو حامل نہیں چلے گی۔" سماج کے پاس ایک ہی کوئی ہے، جس پر وہ کسی کو پرکھتا ہے۔ مختلف اور الگ الگ کوئی لکھے؟"

بھانگری نے بھانگری کی اپنی بیٹی کو بھیجی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ مجبور اور آواز میں پوچھا "تب تو لڑے۔"

ماں جی! میری زندگی میں مجھ پر بھیا بھی وقت آئے گا۔ میں اُسے اپنا لوں گی نہ اپنی طرف ڈاری اور حمایت کے لیے کسی کے پاؤں پڑوں گی یا کسی کو مجبور کروں گی؟"

"شادی نہیں کرے گی؟" "ایسا میں نے کب کہا؛ لیکن ایک بات ہے ماں جی! میں جس سے شادی کروں گی اُس سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔ میں جس سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہوں، وہ اور میں ایک بندھ جو دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ایک اثر بندھ میں بندھ جانا چاہتے ہیں۔ علاوہ اس کے کوئی اور مجبوری نہیں رہے گی۔ سمجھیں؟"

بھانگری نے مسمی کی ہم قسم کھڑی رہی۔ اوشا نے نیز بڑبڑک اٹھایا، سینڈل پہنے "بھانگر ماں جی ہوں" "ماں نے تو پوچھا۔" "ہاں ماں جی!"

"اُس مومے سے ملنے؟" "اور سننے کے قدم آگے بڑھائیے۔" "میرے سوال کا جواب دے بغیر چل پڑا؟" اوشا چپ چاپ دیکھنے پار کر گئی ہوئی بیٹھے آگئی۔

تھنڈے کے گھٹ پر اُسے دیکھتے ہی اوشا کے

پر اس کی غلطی۔ وہ مدت سستی کی طرف آنکھیں
جمائے کھڑی تھی۔ اس طرح کے ملتے سے سیندر
پونھنے کے بعد آنے کے بعد اس کی ماں نے اوڑھیں تو
کو نہ بڑھا تھا۔

سستی کی طرف دیکھ کر ہانڈے دیکھتی اس تو
بڑے کی آنکھوں میں جو جذبات منعکس تھے وہ نفرت
کے آئینہ دار تھے یا حسد کے۔ اس کا فیصلہ کرنا اس
کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔



بقیہ : زمرینہ ثانی

تحقیق کریں :

برش تھا سے ایزل پر جھکت ہوا
زلف بکری ہوئی پشانی پر
سڑق پرے پایاں جھٹکا خواہ اسوں پر
غلکے چند گھیریں ابھری
اس کا تخیل خواہیں اٹلا جاتا ہے
کوئی سٹ کار بنائے گویہ
میرا سچ، میری امید کامرز
میرا فن کار ہے
میری کام تمناؤں کی تکمیل کرے
میری ناکہ حکایت
میرے افکار کی عظمت
میرے ایمان کی حرارت
میرے ایمان کی عظمت کر
اپنا ستر کا رزق کرے

”نغمہ“ میرا فن کار و طبع و تخیل و فطرت
یقین ہے کہ یہ نام محبت کی نقیب و نگار و تخیل
انچھٹے غلوں اور غصے والا دل کی کی وجہ سے ادب اور علم
کی دنیا میں تادیر پار دیں جائیں گی۔

”اے میں آزاد خیال ہوں۔ یہ صبح ہے۔

لیکن ایک بات ہے۔ شادی شدہ ہو یا غیر شادی
خود۔ ہر انسانی رشتہ میں ایمان داری اور اعتماد
ضروری ہے۔ کیا داری اور دھوکے بازی کی گنجائش
اس میں بالکل نہیں؟

”سنو: تم جاؤ تو مجھے رشتہ توڑ کر گئی
دوسری لڑکی کو بھی اپنا سنے ہو۔ میرا دل بھی اگر کسی
دوسرے مرد کی طرف مائل ہو جائے تو میں ایسا ہی
کر دوں گی۔ لیکن۔۔۔ ایک وقت دوسریوں سے
پیار۔۔۔ جی جی۔۔۔ کتنی گری ہوئی بات ہے یہ۔“
گھر کی طرف لوٹے وقت اور شہ کے دل میں
دکھ تھا اور نہ کچھ ٹھٹھ جائے کا چھتاوا۔ جو رشتہ
ایمان کی طرف لگا تھا۔ اس نے بڑی خاموشی سے اسے
اپنا لیا تھا۔

دکھا۔۔۔ سستی کے گھر کا دروازہ آج کھلا
ہے۔ برآمدہ میں ایک لڑکی پر سستی باغ میں کتاب
لیے دیوار کی طرف موندنے کے بیچے ہے۔ اسے دیکھتے ہی
اور شہ کے دل میں اس سے اتنا ہمدردی ابھرتی۔
سوچا۔ کیا وہ لڑکی جو کہ ایمان سماجی انداز کو پا مال
کرنے کی جرأت کر بیٹھے ہیں، انجام کار اپنی اس
بزدلانہ خواہش پر توجہ نہیں دیتے کہ انہیں سماج قبول
کرے۔ بزدل نہیں ہے۔ انہیں ایک طرف عبید
طرز زندگی اپنانے کی چاہ بھی ہے اور دوسری طرف
یہ اپنے بچے پر سے چھکارہ بھی نہیں پاسکتے۔
عجیب گورکھ دھندے میں اُبھے ہوئے ان لوگوں کو
نئے عہد کی آزادی نصیب ہوئی ہے اور نہ ان
کے ہاتھوں پر وہ روایتوں کا قہر چھو رہا ہے۔
اور شہ کے دل میں آیا کہ جا کر سستی سے ملے۔

پھر اس نے سوچا۔ اگر وہ میرے موثر بات نہ
کرے تو۔۔۔ سستی تنہا وہیں دیکھے اس نگر نہ تو جوان
کا چہرہ اس کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ اور شہ سوچا۔
پرسن ہے ان دونوں کی شادی بھی ہو جائے۔ دل
یہ دل میں سستی تانی ہوئی وہ آگے بڑھے۔ لیکن۔۔۔ اس
وقت ساتھ کے مکان کی کھڑکی میں کھڑی ایک جوان بڑے

چہرے پر سستی کی لکڑیاں چمک رہی تھیں ان دونوں
نے اس سے مل کر لیا تھا کہ وہ گھر کے سے تھکے لے
جائے گا، لیکن بعد میں فوج کر دیا تھا کہ وہ کسی
تھکے لے آئے تو بڑے ہو گا

”گستاخ تم میری ماں سے دوستہ ہو یا
تو میں ہماری لگی میں آنا پسند نہیں۔“ چھوٹے بھائی اوشا
نے چوٹ کی۔

”نہیں تو۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ اس
نے بات کو مٹانے کی کوشش کی اداوارت کو معروف
رکھنے کے لیے نہایت ہی جوش و خروش سے باتیں کرنے
لگا۔ انٹروال کے دوران اس نے آخر پوچھ کر دیا۔
”اس سستی کا کیا حال ہے؟“

”سستی؟“ اوشا نے اس کی آنکھوں میں
تھانے ہوئے پوچھا۔ ”مے جانے ہو؟“
گھبراہٹ میں اس کا چہرہ سیاہ چمکا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ وہ تو بھئی۔“
اس کی آواز پر گھبراہٹ غالب تھی۔
اداسہ گھٹی۔

اس کی آنکھوں میں بھی سا ایک شہ کو نہ اٹھا۔
”تو یہ بات ہے۔“ جی جی۔۔۔ دھوکے باز
تھوڑی ہوئی وہ سستی سے اٹھتی اور تیر کی طرف باہر
نکل گئی۔

وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔

”اوشا!۔۔۔ اوشا!“

”میرا پیچھا نہ کرنا۔ گڈ بائی!“

”سنو تو۔۔۔“

”جھوٹ نہیں کے۔“

”ایسی کون سی بڑی بات ہوئی جو۔“

”بانی کی یاد رکھا ہے۔ تم سستی سے۔“

”ہم دونوں اپنی مرضی سے ملے جلتے رہے

ہمارے درمیان نہ کوئی بندھن ہے نہ مجبوریاں۔

شادی شدہ لوگوں میں ہی فیڈ میں کی بات ٹوٹ سکتی

ہے۔ بہتالہ غصہ میری کھڑکی میں نہیں آتا۔ تم تو آزاد

خیال لڑکی ہو!“

دوپہر

رام دلاس شرما

تاج

شمشیر بہادر زنگہ

الغافلو
بہاؤ میں بہاؤ
لامحدود بہاؤ

شاعر!
الغافلو سے
مت کرو کھلوڑ

چلاؤں
یا چپ رہوں
ذرا ہوں
سمندر کا اک ذرہ

سمندر میں
سمندر سے بڑا درد
کیسے سہوں

چلاؤں
یا چپ رہوں
ذرا ہوں
سمندر میں ایک ذرہ

بس
کہنے آسمان کے
زیر صبر سے چلائے
پل چکا
بس
کہنے رنگوں کے
خوابوں کے پیچھے
سی چکا

بس
کہ بہت ہی چکا
بس کہ بہت ہی چکا

کیا کبھی اڑ چلے گا یہ
رنگ مر مر میں سما یا ہوا بہار
زندہ
پیار کا موسیٰ زندہ

ہیں
پنا دل ہے تارخ
پنا تاج روضہ
روز کی ہنسی
یہ رنگ مر
خواب لانا فانی
شاہکار

میں اس میں دہن ہوں
جوستاروں کی جھلک سے جھانکتا ہوں
عرش کے سوسم ہوں

تاج الکاہرنگ درجی
میں اس میں جھانکتا ہوں
اننت (لامحدود) تک

شاہ جہاں میں
دل میں تک آتا
مستاز کے
جو تم

چھوٹی نظمیں

کیدار ناتھ کوثر

الغافلو سے
مت کرو کھلوڑ

میں کا چھٹا سورج
آجے لگا ہے
میں کی دہلی ہوئی آگ کی بھٹی میں
اور

کانوں میں رومال پیٹے
مجبور سہٹ لیاں
دھکیلے میں مرل مائیکلین
دفنوں، دوکانوں، کارخانوں کی طرف
چڑھائی پر
پسینہ پونچھتے، پیوندے خاکی نیکرو
کوتھی ہے
رکٹ میں سوار مصل مصل خانوں
گلاڑی جھوٹے کے ڈر سے بولھائی، بدحواس

گرم ٹوکے جھونکے
بے کار، آوارہ، بھنگوں کی طرح
دن دہارے راہ گروں کو چھڑچھاڑ کرتے
بھٹک رہے ہیں —
شہر کی ٹہنی سڑکوں پر مزے سے

یو سسپن کمی کے نکلے
ٹپ ٹپ جیبتی ٹونڈ
جسم سے پتکا میں بیٹھی پڑیا
میک جاتی ہے پے کو پڑی
اچانک ایک دم خاموش

جسب کہ شہر ہے
محبوب جو مٹکوں کو کرتی ہے پیلا
اور ہر ہون کو کالا
ثابت ہو گیا ہے بالکل بے کار
ہماری مطلب پڑی کی موٹی تر تیر بار

نکل کھلاؤ



تجھ: کیدار ناتھ کوثر

نتیجہ کتابیں

چلبست حیات اور ادبی خدمات

ڈاکٹر افضل احمد

ملنے کا پتہ: چاندی خانہ، ڈیپورھی آغا میر، کھنؤ

قیمت : بیس روپے

چکیت اردو کی ادبی تاریخ کے ایک اہم ستون ہیں۔ یہ ادبی انق پر اس وقت طغیان مچا، جب ملک تاریخ کے اہم ترین دور سے گزر رہا تھا۔ ملک طرف اصلاحی تحریکیں کوٹھ پیل کر سیاسی شکل اختیار کر رہی تھیں۔ دوسری طرف سیاسی نفعت زہم کو دم دل میں مقسم تھی۔ قومی تصورات، جب الٹنی اور قدیم سوال اس وقت کے اہم موضوعات تھے، جو مختلف اداروں اور ذیلیوں میں بحث کا موضوع رہتے۔ اس جذبہ کے خوار کے یہاں ان موضوعات کی تحلیل کا نمایاں طور پر لگائی گئی ہیں، لیکن چکیت نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا مقصد بنایا اور لایس کی فن کاری اور سنی کی کس آواز میں اپنے کام میں لگنا کہ ”یہ سبیر دور درود“ کہلائے۔

حکومت کی ادبی خدمات اور شاعرانہ کامیت بہت سہ سے اہم نامورین نے انہیں
خیال کیا ہے۔ بہت عرصہ پہلے، دو چار حکیمت کے نام سے پیدائش آئندہ لائق ملاحظہ
مختلف ملکوں کے معانین کا ایک مجموعہ درست کر دیا تھا، جس میں حکیمت کی شاعری
کے مختلف پسروں کا جائزہ دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ دنیائے فوٹا ایسے
معانین شائع ہوئے رہے ہیں، جن میں حکیمت کو نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا لیکن
یہ تمام تجزیہ شاعری عمومی خدا کی ایک نظر نگاہ پر کرنے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ اسی
خیال کے تحت ڈاکٹر انصاف احمد نے ”حکیمت“۔ نجات اور ادبی خدمات کے موضوعات
پر پروفیسر حسام الدین کی نگرانی میں بی۔ اے۔ ڈی کے لیے مقالہ تحریر کیا۔ یہ مقالہ
حکیمت پر پہلی بار جامعہ تحقیق کا دل ہے۔

یہ مقالہ مقدمے سے ضمیمہ (غیر مطلوبہ کلام) تک ۲۳۸ صفحات پر محیط ہے، جس میں یکجہت کی حیات اور شخصیت، ادبی ماحول، اصلاحی تحریکات،

سیاسی و قومی غریزات، غزل گوئی، بوجے، نثر نگاری، ڈراما اور چمکتے کے ادبی مقام سے تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اس مقالہ کے ذریعے چمکتے کی زندگی، ان کی معروضیات، تشریری بیگم بیگم ایسوی ایچ سے ان کی وابستگی اور اس کے طویل کردار، چمکتے کی ڈائری، اعلان کی تناؤ گری کے مسئلے کے بارے میں پہلی بار بعض حقائق سامنے آئے، جس سے چمکتے کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

مولانا جیات اور شخصیت کے ارتقاء سے بحث کرنے کے وقت ڈاکٹر محمد افضال احمد نے چلبستی کی وجہ سے بے گمان حالات اور شخصیات تک کا جائزہ لیا ہے، جنہوں نے چلبستی کی شاعری اور شخصیت کو متاثر کیا ہے۔ اس کے بعد قیام مغربیہ اور دوسرے گانا ترا سلطنت اور دھنگ کے ادبی باہول کا مختصر ذکر ہے تاکہ نقش و تاج، ایس، ویدیر، شرور و سرشار اور اور دھنگ کی لکھنؤ کی ادبی روایت کا ایک خاکہ نگاہ میں آجائے اور اس کے پس منظر میں چلبستی کو بہتر طریقے پر سمجھا جاسکے۔ کتاب کے چوتھے باب پنجویں صفحے میں اسلامی نظریات اور سیاسی و قومی شعور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کا چھٹا چلبستی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے مجید ہے، اس لیے کہ چلبستی ان تحریکات سے مراد متاثر ہیں جس سے بلکہ ان کے علمبرداروں میں سے اور ان اسلامی و قومی نظریات کو عام کرنے کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو وقف کر دیا تھا۔ ڈاکٹر افضال احمد نے ان نظریات کو تحریکات کو صرف تاریخی حیثیت سے نہیں بیان کیا ہے بلکہ چلبستی کی مختلف نظموں سے ان کی بازیافت کی ہے اور اس طرح ان ابواب میں چلبستی کی کئی تادم تعلیم زیر بحث آگئی ہیں، جو انہوں نے سیاسی و قومی شعور یا اسلامی تحریکات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہی نظموں کی فنی و ادبی قدر و قیمت کا اکتین کرنے کی کجی کو عرض کی گئی ہے۔

چلبکیت کی نظر میں اس جائزے کے بعد ان کی غزل گوئی، فوسے بینی
شخصی مرثی، نثر نگاری اور ڈرائے کا تنقیدی جائزہ دیا گیا ہے۔ چلبکیت کی غزل
کوئی سے بحث کرتے ہوئے انہوں نے مسجع تنبیح کا لایا ہے کہ چلبکیت کے مضامین اور
نئی نئی اصطلاحات سے غزل کو بے وسعت دی اور قصوت کی بجائے حب الوطنی
اور قوم پرستی کو مرکزی جگہ دی۔ چلبکیت کے شخصی مرثی یا ڈرائے کا باب معاملے میں یہ
اجیت دکھائے ہے، جن کا معاملہ انیس کی روایت کے پس منظر میں کیا گیا ہے۔
آخری باب میں ان تمام مباحث کی روشنی میں چلبکیت کے ادبی مقام کے تعین کی
کوشش کی گئی ہے۔ اس حصے میں ان اعتراضات سے بھی بحث کی گئی ہے جو
رسالہ الفاظ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں مولوی محمد مجیب تھانے چلبکیت کی زبان پر کیے
تھے۔ ڈاکٹر انصاف احوالے دوسرے نادر کارداروں وغیرہ کے کام سے اس کا علاج کر
مولوی محمد مجیب تھانے ان اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ اس کے علاوہ چلبکیت کے بارے
میں مشہور محققین اور ناقدین کی رائے کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کے ادبی مرتبہ کا تعین
کیا ہے۔ محمد مجیب تھانے نے ڈاکٹر انصاف احوالے میں معاملہ چلبکیت میں ایک اہم

مستام رکھتا ہے، ہمیں یہ چکیت کے بارے میں تقریباً تمام ممکن مواد کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔

کلّیاتِ چکیت (نظم)

مرتّبہ: کالی داس گیتا رتنا
ناشر: سالار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی

قیمت: ۲۰ روپے

اس زمانے میں چکیت کی شرو نظم اور ان کے دوسرے علمی و ادبی کاموں کو جس شخص نے از سر نو روشناس کر لیا اور بڑی محنت، لگن اور ان تھک کوششوں سے ان کے کارناموں کو ترتیب دے کر حاشی اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا وہ کالی داس گیتا رتنا ہیں۔ کالی داس گیتا رتنا خود ایک اچھے شاعر ہیں اور بہت اچھا علمی، تحقیقی اور تعلیمی ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے چکیت کے پورے کام کو بڑی محنت سے مرتب کیا کہ زمانی ترتیب کے لحاظ سے کلّیاتِ چکیت میں شائع کیا ہے، جو ایک مضمون سے نایاب تھا۔

"کلّیاتِ چکیت" کے مترجم میں قوتیت چکیت دی ہے۔ جس میں ۱۸۴۳ء میں چکیت کے والدین شریوت اور ان چکیت کی ولادت سے لے کر ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء میں چکیت کی تاریخ وفات تک کی تاریخیں اور ان تاریخوں سے متعلق واقعات کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ کسی شخص کے بارے میں قوتیت کی ترتیب آسان کام نہیں ہے۔ لیکن کالی داس گیتا رتنا نے اس عہد کے مختلف اخلاعات، رنگ اور ذرائع سے ان تاریخوں اور واقعات کو مرتب کرنے چکیت کے مطالعے اور اس زمانے کے حالات میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بہت بڑی دستاویز فراہم کر دی ہے۔

قوتیت چکیت کے بعد چکیت کی مندرجہ تصانیف اور شری تصانیف کا تعارف ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چکیت کا کام کب کس شکل میں شائع ہوا اور ان کے کام کے کتنے اخلاعات شائع ہوئے۔ اس طرح پہلی بار ایک جامعہ پر ان کی شری تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جس سے بعض ایسی چیزیں کا بھی علم ہو سکے۔ جن کے بارے میں عام چرچے والوں کو واقفیت نہیں تھی۔ مثلاً اس کا علم کم ہی لوگوں کو ہو گا کہ سائنس کا لبریشنم کے سلسلے میں چکیت نے اودھ چچ میں آئینی کی طرف سے ۱۲ اخفوط لکھے تھے۔ جو بعد میں جنت کی ڈاک سے عذرا سے شائع ہوئے۔

کلّیات کی پہلی جلد اول کے عنوان سے کالی داس گیتا رتنا نے چکیت کی شاعری کا تفصیل ملاحظہ کیا ہے اور ان کی شاعرانہ سمیت پر روشنی ڈالی ہے اور چکیت پر لکھے گئے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ جلد اول کے آخر میں گفتنی کی آخری سطروں میں انہوں نے جو سطر لکھا تھا ہے وہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

آج کل کی دنیا

اس لیے کہ اس میں معترض کا نام نہیں ہے جس کی وجہ سے اعتراض "عام" سا ہو گیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کی کبھی ادیب، نقاد یا بال علم نے چکیت کو کیوں لکھا ہو اس بارے میں حیرت و حزن پر کام کرنے والے کے بارے میں ایسے خیالات کون دہرائے کر سکتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ انہوں نے یہ سطر ہی نہ لکھی ہوتیں۔ کلّیاتِ چکیت میں چکیت کا مندرجہ کام بھی مل سکا ہے سب شامل ہے۔ کلّیات کی کتابت و طباعت دیدہ زیب اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے۔

چکیت اور باقیاتِ چکیت

کالی داس گیتا رتنا
ناشر: وول پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی

قیمت: چالیس روپے

کالی داس گیتا رتنا نے چکیت پر بہت کام کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے کوشش کی ہے چکیت کی ان تمام تحریروں کو یک جا کر دیا جائے جو مختلف رسائل یا اخبارات کے صفحات پر شائع ہوئی ہیں اور جن تک ادب کے عام قاری کی رسائی نہیں ہے۔

چکیت اور باقیاتِ چکیت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ذکرِ چکیت کے عنوان سے ہے۔ اس میں چکیت کی حیات اور ان کے والد اور شریوت نرائن چکیت کے بارے میں بعض تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ چکیت کے والد کو بھی شاعر تھے اور یقیناً گفتگو کرتے تھے۔ اس سے قبل ڈاکٹر افسانہ ایلم نے ان کے عرف ایک شعر کی نشاندہی کی تھی، لیکن وہی داس گیتا رتنا نے ان کے ۱۲ اشعار نکال دیے ہیں، جس میں ایک تاریخ وفات اور درویش ہیں۔ اس کے بعد چکیت کی اولیٰ نظم اور "تندرے کے سٹے سے بحث" کی گئی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انہوں نے پہلے تیرہ شعر ہی کے بعد حضرت عظیم گھنوی کو اپنا کام دکھایا اور ان کے انتقال کے بعد افضل گھنوی کے رچو کر کیا۔ اس کے علاوہ چکیت کے بارے میں بعض اہم شعرا اور نقادین کے اقتباسات چمڑا حوالے کے عنوان سے درج کیے ہیں۔

اس حصے کی ایک خاص چیز اس زمانے کے پانچ شاعروں کی روداد ہے۔ جس میں خدیو چکیت شریوت تھے۔ اس روداد سے بھی بہت چمڑا ہے کہ ان شاعروں میں چکیت کے علاوہ اس عہد کے کون سے شعرا اور شریوت ہوئے تھے۔ اور انہوں نے کون سی چیزیں لکھی تھیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ باقیاتِ چکیت کے عنوان سے بحث ہے جس میں چکیت کی نظم و شریوت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کالی داس گیتا رتنا نے جتنی تفصیل لکھا ہے کو خاموشی کتاب کے پیش نظر اس حصے میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے جس کا علم لوگوں کو ہے، اس لیے اس کی صرف نشاندہی کر دی گئی ہے، لیکن چکیت کی دوسری تحریریں جو تک ابھی لوگوں کی رسائی نہیں ہوئی تھیں، انہیں ایک جا کر دیا گیا ہے، یہ ایک اہم اور نیک کام تھا۔ لیکن کالی داس گیتا رتنا نے بڑی محنت

ہے ان تمام تحریروں کو اودھ بچ، بیچ، امید، اردو سے معنی یا کسی اور مرگہ لٹ ہوئی تھیں، تلافی کے شائع کر دیے، جن کا مطالعہ دل چاہے خالی نہیں ہے۔ ان تحریروں کے مطالعے سے اس زمانے کے علمی، ادبی اور سیاسی رجحانات کا بڑی حد تک اندازہ چلتا ہے۔ باقیات حکمت کے حصہ نظمیں حکمت کی وہ رامیاں نظمیں بالعموم کے بعض حصے خزانہ اور متفرق اشعار ہیں، جو اب تک ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں تھے۔ زیر نظر کتاب لیٹنٹا مطالق حکمت میں ایک اہم اضافہ ہے، جس کے لیے کالی داس گچھا ورامیاں ک باد کے سخی ہیں۔

انتخاب آتش وغالب از: برج نرائن حکمت

مرتبہ: کالی داس گچھا

ناشر: ساکھ پبشرز، پرنٹریٹ لٹریٹ، ممبئی

قیمت: تیس روپے

فرانسیس گورکھ پوری نے حکمت کو صنف اول کا مخور اور سخن شناس کہا ہے۔ سخن شناسی کو وہ یہ اصطلاح میں نقاد کہا جائے تو غلط ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ حکمت صنف اول کے شاعر اور اپنے عہد کے اہم نقاد تھے۔ ادب اور فن پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ انتخاب اغلا پر آپس جو قدرت تھی، روزمرہ اور محاوروں پر انہیں جو اثرات اور تشبیہات و استعارات پر جو گرفت تھی وہ خود بھی ان کی تنقیدی بصیرت کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مضامین حکمت اور خاص طور پر مگر حکمت و فخرت میں ان کی تنقیدی رویہ اور نقطہ نظر بہت واضح شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات کے تحت جو مذاق بن رہا تھا اس سے حکمت خوش نہیں تھی۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی نظموں میں بھی کیا ہے۔ لیکن جب انہوں نے انامہ صبح امید لکھا تو شروع کیا تو اس بات کی کوشش کی کہ مذاق قدیم سے کئی نسل کو آشنا رکھا جائے، اس لیے انہوں نے غرض کن کے عنوان سے لکھا:

”مغربی تہذیب کے اثر سے ہمارے خیالات کام کر رہا ہے اور

شاعری کے متعلق بھی بدل گیا ہے۔۔۔ ہمارے اکثر تعلیم یافتہ

یہ خیال کر رہے ہیں کہ محض نئے خیالات و جذبات کو نظم کرنا

جو ہر شاعری ہے۔ اور پرانے رنگ کے شاعر اس سے متاثر

نہیں ہیں کہ ان کے کلام میں آزادی، وطن پرستی وغیرہ کی مخلوق

کا پتہ نہیں ملتا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں

ہو سکتا کہ پرانے رنگ کے اردو شاعروں کے کلام میں تصنیف اور

آدھ کا عیب ہے مگر ان کے کلام میں جس قدر جہت اس عیب

سے پاک ہے وہ ان شاعری کی تصویر ہے“

اس لیے صبح امید میں انہوں نے ہر راہ مستقیم شاعر کا انتخاب شائع کرنے کا

آج کل کی دلی

اعلان کیا اور اس انتخاب کے لیے انہوں نے سب سے پہلے آتش اور غالب کے کلام کو منتخب کیا۔ صبح امید حکمت کی ادارت میں اکتوبر ۱۹۸۱ء سے نکلتا شروع ہوا۔ اندکالی داس گچھا ان کے قیاس کے مطابق مئی ۱۹۸۱ء تک شائع ہوا اور جنوری ۱۹۸۱ء تک اس میں یہ انتخاب شائع ہوا تھا جس میں غالب کے کلام کا تقریباً پورا انتخاب وہاں پہلے کے ہیے دیوان کا انتخاب شائع ہو سکا تھا حکمت کی خواہش تھی کہ یہ انتخاب مکمل ہونے پر کئی مشکل میں بھی شائع ہو، لیکن ان کی زندگی نے وہاں کی کالی داس گچھا نے صبح امید کے ان تمام شماروں سے جن میں یہ انتخاب شائع ہوتا رہے ہیں انہیں یک جا کر کے انتخاب آتش و غالب کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ جو حکمت کی سخن شناسی اور تنقیدی بصیرت کی ایک جامع تصویر ہے اور جو کالی داس گچھا رضا کی بے ٹوٹ خدمت اور علمی کمن کی نشاندہی کرتا ہے۔

• شارب درویشی، دہلی

آج ہم بھی

معتمد: شفیق فخرت۔ سہ اشاعت: ۱۹۸۱ء

شائع کردہ: عہد پرورش اردو کاڑی، ممبئی پال

قیمت: بارہ روپے

وز شفیق فخرت عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ ان کے انشائیہ نمائندوں کو ہم لوگ برابر پڑھتے رہتے ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ ”آج ہم بھی“ انشائیہ نمائندوں پر مشتمل ہے۔ ان کی تعداد ۱۲ ہے۔ ان انشائیہ نمائندوں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ہے اور کہانی کا انشائیہ اور سماجی شعور بھی۔ شفیق فخرت کہانی کو تخیل کے فن سے ہم کنار کرنے کا مہتر جانتی ہیں اور ماضی اور حال کے واقعات کو دل چسپ اور روز پر لکھتے ہیں جو ان میں کمال رکھتی ہیں۔ ان کا تخیلی اظہار دلکش اور دل چسپ ہے۔ وہ حضرت آدم پر بھی دلداری اندازہ لگاتے سے گل کھلاتی ہیں اور ”کری“ کی ماہیت پر بھی خندہ زن ہیں۔ ”جہد نامہ جدید“ اور ”اندیشہ ہائے دور و دار“ میں وہ عصری معاشرت پر نفسیاتی تنقید بھی کرتی ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کی عبارتیں ادب لطیف کا بھی جادو جگاتی تھکتی ہیں، لیکن لفظی کا شائبہ نہیں۔ وہ تہذیبی اور ماضی کے شریعت و طریقت حیات کے مسائل کو چھڑتی ہیں۔

شفیق فخرت کی موضوعاتی پابندی نہیں۔ وہ حیات اور اس کے مسائل سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے انشائیہ نمائندوں میں کیت وکم، دماغ و روشنی، فکر و نظر اور علم و عمل کی آمیزش ملتی ہے۔

انہوں سے کہ اردو میں صنف انشائیہ اور مزاح نگاری کا عہد بار دوبہ اٹھنا ہے، مگر کبھی کبھی جب اس طرح کے مجموعے نظر سے گزر جاتے ہیں تو

حکومتی ہے۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ یقین ہے کہ عملی وادبی معلقوں میں بڑی بڑی ہوگی۔

فصل امام

پس غبار (افسانے)

افسانہ نگار: مختار شمیم

ناشر: محبوب الہ آبادی، بدھوڑہ، محبوب الہ (مدھیہ پردیش)

قیمت: ۹ روپے

مختار شمیم اردو فانی سے کئی جینیٹوں سے متعارف ہیں۔ ان کا پہلا تعارف شاعر کا ہے۔ مگر افسانہ نگار اور تنقید نگار کے طور پر بھی ان کا نام جانا چھپا جاتا ہے۔ ان کا ایک تحقیقی مقالہ بھی ”ریاست ٹونگ اور اردو شاعری“ کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس عنوان پر ان سے پہلے کسی نے تقریباً اٹھایا تھا۔

مختار شمیم اپنی شاعری میں ایک جدید ذہن کے ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ اور ان کے کلام میں احساسِ واقعہ کے لاکھ ساچنوں سے گزرنے والا واضح و بھان نفاذ آتا ہے، لیکن اپنے افسانوں میں انہوں نے اس بیانہ انداز کو پرستار رکھا ہے، جہاں افسانے کی سلسلہ روایت کا حصہ ہے۔ اس مجموعے میں کل ۲ افسانے شامل ہیں۔ ان میں پہلے اور تیسرے افسانے ”گفتنی فہدیٰ کتنی بہتی“ اور ”پہچان“ (کو چھپ کر باقی حار افسانوں میں وہ افسانے کے جدید اسلوب کے قریب سمجھا نہیں سکتے۔ ”گفتنی فہدیٰ کتنی بہتی“ اور ”پہچان“ ایسے افسانے ہیں جو جدید اسلوب سے ان کی باخبری کا پتہ دیتے ہیں۔ خصوصاً ”پہچان“ جو اس کے ان کائنات میں فرد کی طرف سے کسی گوشہٴ امان کی تلاش اور اس تلاش کے مختلف مراحل کو قاری پر اس طرح منکشف کرتا ہے کہ چند لمحوں کو ہی بھی حیرت و بھی اپنی شناخت کے سفر کو نکل کر اُسوتا ہے۔ یہ افسانہ بیانہ کی حد تک باہر کر گیا ہے، مگر کہانی پر نہ تو توجہ نہیں ہوا ہے اور یہ ایک بڑی خوبی ہے۔

افسانے میں دل چسپی کے عنصر کو ترجیح دینے والے فارمین کے لئے یہ فہار ایک دل کتنی تھ ہے۔

• مخور سعیدی

تنقید اور مجلسی تنقید

مصنف: ڈاکٹر وزیر گانا

ناشر: موثرین پبلشنگ ہاؤس، گولاماریٹ آنڈل

قیمت: ۲۳ روپے

ڈاکٹر وزیر گانا اردو کے لطیفانہ شاعر، جدیدیت کے صالح مبلغ، ممتاز محقق اور نقاد ہیں۔ انہوں نے اردو تحقیق اور تنقید کو ایک خاص بیج عطا کی ہے اور اسے ایک نئے معیار اور درجہ سے روشناس کرایا ہے۔

”تنقید اور مجلسی تنقید“ وزیر گانا کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کا استدلال اور احوال مصنف کے اسلوب نگارش اور بزرگ کی حکمتی کرتا ہے۔ وزیر گانا کے پاس تاریخی اور وسعت نظر کا وصف واقف مقدار میں ہے۔ انہوں نے کسی ایک مجلسی مضمون کی بنیاد پر ایسے مضمونوں پر قائم نہیں کی جنہیں علمی اور عامیانہ کہا جاسکے۔ ان کا تجسس جس اور تحقیق مضمون کی نوع میں آرتے میں ان کے مددگار اور معاون ثابت ہوئے ہیں۔ وہ لفظوں میں اور نقطہ سنجی حلالانہ وہ جدیدیت کے پرستار ہیں۔ لیکن جدیدیت کے متعلق کوئی جذباتی ردیہ نہیں دیکھتے۔ وہ جو کہتے ہیں اس کے پیچھے ایک نطق ہوتا ہے اور اس کے دوست ہونے کا واضح اور بکل ثبوت بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات کی تہ تک پہنچنے کی جو استطاعت میسر آئی ہے، وہ آج کے نقادوں میں محدود ہے چند کو ہی نصیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین ان کی انفرادیت کے خزانہ ہیں۔

”تنقید کیسے“ میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

”نفاذ اپنے مفاد میں اولین حیثیت نہ پاس کرے اور ان اور ان پر اس کے اندر چھپے ہوئے امکانات کی روشنی میں اپنی تنقیدی جس کو بروئے کار لائے۔ نہ پکر اپنے نظریات یا افکار کا ممکن نہ پاس میں تلاش کرے کی کسی کرے۔ اسی طرح ”مجلسی تنقید“ میں کہتے ہیں: ”تنقیدی مجلس کا نفاذ اپنے نظریات کے اظہار میں محفل طور سے آزاد نہیں ہوتا۔ اور یہاں وہ ایہوں کی موجودگی سے متاثر ہوتا ہے، وہ ان صرف اپنی تنقید میں رجحان خود نمائی کا مظاہرہ کرتا ہے بلکہ کار کی شخصیت سے بھی ایسے اثرات قبول کرتا ہے، جو اس کے تنقیدی نتائج کو خاص سا بچوں میں ڈھال دیتے ہیں“

وزیر گانا نے دیئے لیکن چرچا مستطال ہے جس کی بات کہتے ہیں۔ ان کے یہاں وہ فلسفہ کہیں دکھائی نہیں دیتا، جو بالآخر کسی بھی کلمہ کا سکے کے لیے ان کا منظر بن جاتا ہے۔ انہوں نے جو ہر جہت پر دل کی بجائے ذہن کو اپنا پاسبان بنایا ہے۔ اپنے مضمون ”میراجی“ میں کہتے ہیں: ”میراجی کی کوئی تو گمان کے کوثر سے سے متعارف ہونے کی ہر تک ہے۔ گوتم کی لاسی اور بھر افسانوں کی ٹنگ وروے اُسے کوئی قلمتہ نہیں..... تو نوسا عرفان کا وہ لہو جو ایک لہو حیرت بن کر میراجی کے سامنے آکھڑا ہوا، مگر جسے میراجی گوتم کی طرح حیرت زدہ کر سکا۔ یہ بھی اچھا ہوا کیوں کہ اگر وہ اُسے عبور کر جاتا تو پھر حق کا نہ رہتا۔ ایک نہایت دہندہ کے

مصعب کو اپنا لیتا اور یہ بات اس کے من کے لیے یقیناً مغرب ثابت ہوتی۔ اس طرح وہ غالب — ایک جدید شاعر — میں اپنے فعال ذہن کی تازہ کاری کا ثبوت بھی پہنچاتے ہیں۔ کہ بے پناہ اندھیروں میں غالب کی آنکھیاں اس "حقیقت" کے پس سے آشنا تھیں جسے ایک روز طبع پرنا تھا۔ چنانچہ اسی لیے غالب کے اشعار آج کے ذہن کو مطمئن کرتے اور تسکین دیتے ہیں کہ وہ حال سے منسلک ہونے کے علاوہ مستقبل سے بھی مربوط ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا انسان کھڑے ہو اس مضمون میں وزیر اعلیٰ غالب کو مدینہ ثابت کرنے والے دیگر مروج معروضات کو رد کر دیا ہے۔

یہی کہ اس مجموعہ کے سترہ کے سترہ مضامین میں وزیر اعلیٰ اپنی طبیعت اور دانشوری کو جسے یہ دلچسپ انداز میں منسلک کیا ہے۔ ان مضامین کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں پورے ان احساس نہیں ہوتا بلکہ تدریجاً اپنی فاضلی کا کھیل مڑے ہوئے مصنف کے ساتھ مسخرہ تو ناچا جاتا ہے اور اس کے ذہن میں نئے دریچے کھلتے چلتے جاتے ہیں۔ کتاب عمدہ شائع ہوئی ہے۔

• کنور سہیل

عشق کا چاند اندھیرا

افسانہ نگار: پُنت ناتھ

ناشر: سیما پبلکیشن، کوچہ روح الشفا، دریائے گج، نئی دہلی

قیمت: بیس روپے

پنگر ناتھ ایک کبر مشق افسانہ نگار ہیں۔ وہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے اردو کہانی کے سفر پر ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے ڈرامے لکھے ہیں۔ اور ڈراموں پر شریات میں بھی حصہ لیا ہے۔

"عشق کا چاند اندھیرا" پنگر ناتھ کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں بھی ان کا احساس دل اور فعال ذہن عمدہ مترشح ہے۔ وہ انسانی زندگی کی جبر و اختیار کے شہاں ہیں اور اپنے شہادت کو اپنے کئی تجربات کے سہارے افسانے میں ڈھال دینے پر قادر ہیں۔ ان کے افسانے زندگی اور معاشرے پر بڑے بھرپور اور گہرے طنز سے عبارت ہیں۔ بے شک وہ بات جہاں جہاں اور حرارت سے لرز جھٹکتے کرتے ہیں۔ لیکن جن سفاک حالات میں سے اس محبت کو گزرتا ہے کہ ان کے لیے بھی اور جلد تیرے کو افسانے کا موضوع بنانی غالتے چلے جاتے ہیں ان کی قوت مضمر ہے۔

پنت کو اپنے معاشرے کے نامور پرمٹھی رکھنے میں گریز نہیں کرتے۔ محض کا پھل پھول میں مگوئی مگوئی اور ان کی کہانی بیان کرتے ہوئے ملک میں پھیلا ہوا تاریکی بدعتی اور بد کرداری کی طرف واضح اشارے کرتے ہیں۔ چلے دو کو پھیل کی گھاٹی

میں رہا کرتے تھے۔ اب دو گھنٹے پہلے اردنی فوجیں پہن کر تاج محل کا پتلی بنا اور اسے شیر پش کے شیش محل میں رہتے ہیں۔ گومتی کے خاندان کے عاؤں سے ہجرت کی اور شہر میں بسا۔ وہ گاؤں کی سادگی اور مصورت کو دہن چھوڑ آیا اور شہر کی ہوس، بے ایمانی اور فحاشی میں گھومنا۔ ان ساری خاتونوں کا شمار گومتی کے عاشق اور دوست کوئی کو پنا پنا۔ گومتی کے فوجی کرلی اور وہ ایک چمچ ہو گئی۔ جس پر لکھا تھا "میرے مجبور کا سامان سامنے والے مکان میں پناہ دیا جائے۔ سامنے والے مکان میں نامراد عاشق رہتا تھا، جو اپنے دو گھنٹے کے گھر والوں کے سامنے گومتی کے لائق ثابت ہو کر سکا۔

اسی طرح "رکھیل" میں پیشکر ناتھ آج کی فاضل ماں اور اس کی بیٹی کے لالچ اور معنوی زندگی کو افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ ان ایک نفس حبس اسٹیل ویلہ والی عورت ہے۔ وہ اپنی شخصیت کے رعب سے اپنی نوکری کے کام کو کامیابی سے سزا دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے فائدہ کو فحاشی پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کوئی کمالی سوسائٹی کی دین ماڈرن ویسٹ میں ڈھال دیتی ہے۔ اس کے گھر میں پینٹنگ گیسٹ بن کر رہنے والا زوجہ ان کی بیٹی کا عاشق ہے اور وہ اسی وقت اپنی بیٹی اور پینٹنگ گیسٹ کے درمیان والا کوڑا کھوتی ہے، جب وہ پہلی بار اپنی نچوڑ لے کر آتا ہے۔

"دو دہائیں" معصومیت کی جبر کی قربان نگاہ پر دم توڑنے کی کہانی ہے۔ اور رقص، پاؤں اور زنجیر" اس میں کا اقبال ہے، جو ہمارا معاشرہ فرد کے گرد لپی دوڑا کر طرح طرح کی کر دیتا ہے۔

پنگر ناتھ کے افسانوں میں روانی ہے اور روبا عہری سوسائٹ۔

• کنور سہیل

آنکھیں ترستیاں ہیں

مصنف: پروفیسر یحییٰ حسن ناتھ آزاد

ناشر: مورٹن پبلشنگ ہاؤس، ڈیگولارکٹ، دریائے گج، نئی دہلی ۱۱۰۰۲

قیمت: چھپتیس روپے

پروفیسر یحییٰ حسن ناتھ آزاد اردو کے مستند اور محترم ادیب اور شاعر ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب آزاد صاحب کے ان بائیس خصوصی مضامین کا مجموعہ ہے، جو اپنی لائے ان دوستوں اور بزرگ ادیبوں کی یادیں تحریر کیے گئے ہیں جن کا وہ دنیا میں نہیں رہے۔ ان میں سے بیشتر (تقریباً اسی) نام ایسے ہیں، جن میں اردو دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔ اور صاحب ہیں اپنا ایک مستقل مقام رکھتے ہیں۔ آزاد صاحب نے ان شخصیات کا ہائے پوری جزئیات کے ساتھ ساتھ ایسے ایسی حقیقت، محبت اور ذہنی وابستگی کے باوجود مختلف شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے

غیر ثابت دار ہے۔ اب کے طالب علم متوجہ ان شخصیات پر تحقیق کام کریں گے تو انہیں ترستیاں ہیں ان کے لیے بہت محدود مواد ثابت ہوگی۔ آزاد صاحب کی طرز تحریر اتنی دلکش اور اثر ہے کہ کتاب پڑھنے والے کو ہر جگہ لگتا ہے جیسے منورہ شخصیت ہماری نظروں کے سامنے چل رہی ہو۔ ایچ جیڑھ صاحب کی مختصر اور شیریں ہیں جن کا اثر اتنا خود معنی کو بھی ہے۔ دراصل یہ مضامین وہ اثراتی نوٹ ہیں، جو آزاد صاحب نے ہنگامی حالات میں فوری طور پر لکھے تھے کہ بے قلم نہ کیے۔ لکھنے والے کو یہ بالکل ٹھیک اور مناسب سمجھتا ہے۔ لیکن کتابی صورت میں شائع کرانے کے بعد ان پر نظر ثانی بہت ضروری تھی۔ ڈیڑھ توڑ صرف وقتی اہمیت رکھتی ہے، لیکن کتاب کی اہمیت اور اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ بھال اتنی متفادالہغات شخصیات پر لکھنا اور ان کے بیرون اور اندرون کی سیر کرنا آسان عمل نہیں تھا، لیکن انہوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ یہ سوانحی کتابیں ایک ایسی ہی کی روایتی بالیدگی سے مناسبت کرتے ہیں جو ان کی ہونے کے باوجود آج کے کتاب کا دیا جاسکتا ہے۔ آخر نے لکھا ہے اور انہوں نے سچے دل سے اعتراف کیا ہے کہ "انہیں ترستیاں ہیں" اور وہ سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ جیسے موزن پر ہشتنگ دوسرے خوب صورت ادبی جاذب نظر محبت آپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

شیعہ کالج میگزین (تہانمبر) باب ۸۲-۱۹۸۱ء

مدیر: کاظم علی خاں
 صفحات: ۸۰ صفحہ ۳۰ سائز: ۲۰ x ۳۰
 قیمت: ندارد
 پتا: کاظم علی خاں، ۲۰۱۔ وکٹوریا اسٹریٹ کھٹو ۳۰۰-۲۲۹
 شیعہ کالج میگزین کا یہ سہ ماہی صورتی و معنوی دونوں اعتبار سے قابلِ مذکر ہے۔ اس کی مدد سے ہم آئین کے خفا گر میر ذریعہ قلم تہانمبر کھٹو کے احوال ادبی آثار سے بروخی باخبر و لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کام باب تہانمبر شیعہ کالج کے دفتر داران اور مدیر کی طور پر لائقِ انگریز ثابت ہوئے ہیں۔
 اس تہانمبر میں جن صف اول کے ادیبوں کے بیانات و مقالات شامل ہیں ان کے نام یہ ہیں:

جناب قاضی مہرالدود، جناب پروفیسر سید عتیقہ امین نوٹروی، جناب پروفیسر لیاقت چندیمن، جناب ڈاکٹر مطلق نجم، جناب رشید حساں، جناب پروفیسر سید محمد عتیق، جناب ڈاکٹر سید مجاہد حسین "ابن سعید" (میرزا آباد

دکن) ان کے علاوہ اس میں تہانمبر پرمیٹر بگڑائی، لالہ سری رام اور مولانا حسرت موہانی کی تحریریں بھی شامل ہیں۔ حسرت موہانی مرحوم کا تہانمبر کھٹو کی بمقتل معنون احوالِ صبا پر نہایت اہم شے ثابت ہوئے اور یہ معنون مولانا حسرت کی تنقید نگاہی کے معاملہ میں بھی مددگار ثابت ہوگا۔

تہانمبر میں خود مدیر نے بھی قلمبند متقدم گوشتوں سے روشناس کرایا ہے۔ خاص طور سے ان کی تحریر "میر صبا کھٹو"۔ جلیو گرائی "تہانمبر کھٹو" پر تحقیق و تنقید کے لیے ایک ناگزیر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انہوں نے تہانمبر کھٹو کے متعلق پانچ درجے سے زیادہ مصادر کی جو قریب پڑی کی وہ ان کی وسعت مطالعہ پر وال ہے ان کا ایک اور مقالہ "آئین کے بعض غیر معروف شاگرد" بھی اس نمبر میں خاصا اہم ہے۔ اس کے ذریعہ ہم تہانمبر کھٹو کے متعدد دیگر معروف اُستاد و صحابیوں سے روشناس ہوتے ہیں۔

اس نمبر میں تہانمبر کی متعدد غرضیں بھی شامل ہیں اور تہانمبر کی مشنری صیدیہ کا کم باب مکمل متن سبھی تعلقات و حواشی کے ساتھ اس میں خاصے کیے گئے ثابت ہوتا ہے۔

تہانمبر کا دار ہے "مرثیہ شہداء تمام آسمان آسمان" شیعہ کالج کھٹو کی تاریخِ بران کرنا ہے۔ اس میں تہانمبر کے مدیر جناب کاظم علی خاں نے مواد و اسلوب کا حسن و دل نشین مرقع پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ موصوف تحقیق کاٹو کے دوش بدوش اپنی شگفتہ نگاہی کے اس خط کو آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔ ہم اس کامیاب تہانمبر کے لیے اربابِ ادارہ خصوصاً جناب سید علی ظہیر، جناب مولانا طاہر جردی اور جناب عدلیٰ سن کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اسد حسین

احساس و ادراک

معنیف: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
 ناشر: ایکویٹل بک ہاؤس علی گڑھ
 قیمت: ۲۲ روپے

"احساس و ادراک" ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے اس سے قبل "تفکر زاویے" کے نام سے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا شمار اردو کے مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ قلم، قافی اور نقد پر ان کی تحقیق اور تنقید کی کتابیں کافی مقبول ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے مضامین اور خاکوں کا مجموعہ ہے، جس میں ۱۳ مضامین اور چار خاکے

بقیہ: مکتوبات

کھاسبہ دیران شاعر آغا جعفر خٹ کے حالات پر با تفصیل روشنی ڈالتے ہیں۔ موصوف کی محققانہ کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ جناب افتخار اوس کا مفاہیم بھی صحیح کاغذ ہے اور غرضین نظامی کے سناڈ ٹکڑے ایک اہم پہلو "معاشرتی تصورات" سے شناسائی ہوتی ہے۔ مکتفہ غافلے بھی سید مصطفیٰ حسین۔ سہات اور ادبی کا نام رکھ کر واقعی ایک اہم علمی، ادبی شخصیت سے نئی شکل کے لوگوں کو متعارف کرنے کا حق کام کیا ہے۔ اگر موصوف ڈاکٹر مصطفیٰ حسین کی تعنیقات و تالیفات کے اشتقاق بھی اپنے مقالے میں چند سطریں لکھ لیتے تو شاید یقین ادب کو سید مصطفیٰ حسین مرحوم کی عظمت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوتا۔ میں چند تعنیقات و تالیفات کے نام (طبیور و غیر مطبوعہ) بیان درج کر رہا ہوں۔ یہ فہرست ان کی شائع کردہ کتاب و جلدان (مجل) (مجل نظر) کی منقولات کا دورہ (مجموعہ) میں بھی موجود ہے۔

- ۱۔ گفتگو کی تہذیبی لیرات ڈاکٹر محمد حسین ۲۔ شاہکار انیس۔ (دزمی شاعری میں میر حسن کی حیثیت) ۳۔ لب فرات۔ (ڈاکٹر محمد حسین کے تراجم کا مجموعہ)
- ۴۔ چراغ مصطفیٰ۔ (مرثیہ و حال حضرت امام حسین علیہ السلام) ۵۔ نقد لطاف (خطوط حسن) تبلیغ آبادی نام پر مرفرت حسین) ۶۔ سادہ سخن (سید علی محمد عارف لکھنوی کے مرانی کا مجموعہ) ۷۔ ذوالخوت (آغا شاعر فرما شادی کی لکھی کے مجموعہ)
- ۸۔ پیرا پیرا (مرثیہ نگار حضرت کے حالات - مرثیہ: شاہد احمد آبادی) ۹۔ عرفان جمیل (علامہ جمیل نظری کے تصانیف و مرانی کا مجموعہ) ۱۰۔ دزم نگار ان کا کلام (اردو شاعری کی سہ ماہی سید مرتضیٰ علی کاغذ) ۱۱۔ تجلیات ایس (میر حسن کے مطبوعہ غیر مطبوعہ مسالوں کا مجموعہ) ۱۲۔ و احاطت آیت و توفیق: میر حسن کی حسن گفتگو، ۱۳۔ محفل اہجاز (سید حسن رضا کے مرانی کا مجموعہ) ۱۴۔ بزم ناظم (ناظم الہیہ سید ناظم حسین ناظم کے مرانی کا مجموعہ) ۱۵۔ دجلان جمیل (علامہ جمیل نظری کی ملی خطوط کا مجموعہ) ۱۶۔ آداب بسنوں (ڈاکٹر مصطفیٰ حسین کی منقولات کا مجموعہ) ۱۷۔ مرتق جمال (ڈاکٹر مصطفیٰ حسین کی منقولات کا مجموعہ) ۱۸۔ گفتگو کی ادبی لیرات (ڈاکٹر مصطفیٰ حسین)
- ۱۹۔ گفتگو ادب کے تہذیبی اور ثقافتی محرکات (ڈاکٹر مصطفیٰ حسین) ۲۰۔ جہت نامہ دھرم نام لاہوری۔ (اردو ترجمہ) ۲۱۔ دعات قطب الملک (سید محمد اللہ خاں کے سیاسی خطوط کا مجموعہ) ۲۲۔ جنگ نامہ سید علیہ عالم علیہ (مثنوی) ۲۳۔ سادات اہلو کا غرور و فناء (ڈاکٹر مصطفیٰ حسین) ۲۴۔ فیاض ناظم (کاظم بیگ کے مرانی کا مجموعہ) ۲۵۔ دلاورانہ (علائی کے سوانح آئین و دیر کا حجاب)

اس تمام کی دیگر منقولات بھی خوب سے خوب تر ہیں۔ رضا احمد حسینی کا اسناد "میزان" پڑھو گے حیرت ہوئی۔ کہیں کہیں ہمارے اب بھی اسناد نگار بہت کم ہیں۔ جن کی نگارشات پر وہ راست قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے حسینی کا یہ اسناد قدم پر ڈر لکھنے والوں کے لیے تحریک کا باعث ہوگا جو نئے لکھنے والوں کے سبکی میں کھو گئے ہیں۔

ہیں۔ وہابی تحریک، تصوف، مومن اور اقبال ڈاکٹر مدنی کے محبوب موضوعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے صاحبان کا سلسلہ کسی دیکھی صورت میں تصوف سے جاملتا ہے۔ تصوف اور مثنوی "مثنوی" اکابر پرورد کا سلسلہ، میر حسن کی اور میر خسرو اور اسناد دینی میں تصوف کی تفریق و تاراج کے ساتھ موقوفانہ نکات کا اہل کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مصنفین تصوف کے سلسلے میں کافی معلومات فراہم ہیں۔ اس مجموعہ میں تین مضامین اقبال پر ہیں، جن میں اقبال اور مومن، اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے شروع و اختتام کے طور پر علامہ اقبال کا ایک انگریزی خط درج کیا ہے، جو انہوں نے مولانا صاحبہ جلالی کو لکھا تھا۔ اور میں بھی انہوں نے مثنوی کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ان کی شاعری سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ شاید وہاں وہ ہی وہ خط لکھ کے کسی حقیقی جذبے تک پہنچ سکے ہیں۔ ان کے خیالات غلط ہیں۔ وہ اپنے جذبات کے سوتیلے پن کو چھپانے میں کامیاب نظر آتے ہیں" یہ اس کے عام آدمی کی تین بیک علامہ اقبال کی رائے تھی اور اس وقت بہت سے لوگوں کو تفر کر سکتی تھی، اس لیے مولانا نے اس کی تشہیر نہیں کی۔ جسے اب بعد ترقی مصعب نے تقریباً ۱۸ سال بعد شائع کیا ہے اور اقبال کے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ اقبال پر ضرب کلمہ اور اب جلالی کے خیالات جاری تھے اور مثنوی کی شاعری کا اس سے کوئی میل نہیں تھا، اس لیے انہیں مومن کا کلام غلطانہ اور تنفر کے حقیقی جذبے سے ماری نظر آیا۔ ڈاکٹر مدنی نے خاص شدت اور جذباتیت کے ساتھ مومن کا دفاع کیا ہے۔ اس جذباتی شدت کے ساتھ وہابی تحریک اور جہاد جہاد آبادی میں انہوں نے وہابی تحریک کی خلعت اور مومن کی آنسو کے جہاد کو پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ کاروان آزادی کی اس جنگ کے لیے نہ روانہ ہوتا تو عدلی قسم ۱۹۴۴ میں جو آزادی ہم کو ملی وہ حاصل نہ ہوتی۔ اس طرح کا بیان یا "خدا کی قسم" کے ساتھ ادعا تاراج یا تنقید میں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ وہابی تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک چھوٹے گروہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور نفرت ضرور پیدا کی، لیکن مذہب "عقائد" اور سیاست کے سلسلے میں اپنے انتہا پسندانہ رویے کا خود شکار ہو گئی۔ اس کے علاوہ اردو غزل کا دوسرا علاقہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۰۶ء تک، ہندوستانی لکچر میں اردو شاعری کا حصہ، آئین کی شاعری اور کلیم الدین احمد اور غزل کے ساتھ ان کا دورہ مجموعہ کے اہم منقولات ہیں۔ خاکوں میں پر فیسر ضیاء اللہ جلالی، رشید احمد صدیقی اور سید محمد رفیع کے خاکے ہیں۔ آخر میں ایک خاکہ شہر جلالی پر ہے۔ جس میں جلالی کی اہم شخصیتوں کا ذکر ہے۔ یہ خاکہ صرف دل چسپ اور منقولات افزا نہیں بلکہ ان میں ایک ایسی تہذیب اور زبان و بیان کی دل کشی نظر آتی ہے، جو کم لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔ کتاب کی کتابت بہت اچھی اور گرد و پیش سادہ و دیرینہ زیب





آغا حجاز شرف لکھنؤی

آٹھ کے شاگرد آغا حجاز شرف کے اہل پر ایک مقام "آج کل" دہلی ۱۹۸۲ء میں چھاپا ہے۔ اس مقالے کی تنویر و اشاعت کی درمیانی مدت میں مجھے شرف کے بعض عزیزوں اور ایک شاگرد کے متعلق جوئی معلومات دستیاب ہوئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ شرف کے دادا سید محمود میر خان اپنے وطن مشہد (ایران) سے ہندوستان آکر پہلے دہلی میں رہے، پھر ۱۲۱۵ھ میں وہ اندھا آگے اور انہوں نے ۱۲۳۳ھ میں یہ مقام لکھنؤ وفات پائی تھی۔

۲۔ شرف کے دادا کے ایک بھائی کے متعلق تفصیل تانہ تصوف سے اپنی غیر معمولی چوڑی کے باعث صوفی ہو گئے تھے۔

۳۔ شرف کے بچے ۱۲۳۳ھ میں دہلی سے لکھنؤ آئے اور وہیں ان کا عقد ہوا۔ شرف کے ۱۲۴۲ھ میں فوت ہوئے تھے۔ شرف کے نانا کا نام معلوم نہ ہو سکا، مگر یہ فرد معلوم ہو رہا کہ وہ قطب الملک نواب عبداللہ خاں کے پوتے اور قطب الملک خاں میں دہلی کے بیٹے تھے۔ شرف کے نانا کے حقیقی دادا قطب الملک نواب عبداللہ خاں اور ان کے چھوٹے بھائی سید حسین علی خاں تارخ ہند کی وہی ممتاز مستیاں تھیں، جو "سیدان باؤشاگر" کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے حالات فی الذکر تیسرے صفحہ میں کی کتاب تیرانہ شاگرد لاہور طبع ۱۹۵۵ء میں موجود ہیں۔

۴۔ شرف کے والد سید رفیع اللہ ایک گوشہ نشین دینی علم ورس تھے۔ سید رفیع اللہ ۱۲۶۹ھ میں طویل ہونے اور چھ ماہ کی طویل علالت کے بعد ۷۲ سال کے سن میں رحلت کی۔ شرف کے والد نے لکھنؤ ہی میں وفات پائی تھی اور وہ اپنے باپ میں دفن ہوئے تھے۔ سید رفیع اللہ نے ۲۶ جمادی الآخر ۱۲۹۹ھ (مطابق ۱۸۸۲ء) کو جمعہ کے روز نماز جمعہ کے وقت انتقال کیا تھا۔ ان کا سن وفات شرف کے اس صبر سے ۱۲۶۹ھ برآمد ہوتا ہے: ۵

لکھنؤی

۵۔ شرف کے بچے بھائی کا نام سید علی خاں تھا۔ امیر علی خاں کے ایک فرزند مہدی جن بھی تھے۔

۶۔ شرف کے ایک بچہ زلف باقر علی خاں کا بھی طرہ تھا ہے۔

۷۔ شرف کے ایک شاگرد کا نام نواب بہار تھا۔ وہ شاعر تھے، مگر شرف نے ان کا تخلص درج نہیں کیا ہے۔

یہ تمام معلومات شرف کی اس غیر مطبوعہ سنوئی "انسانہ لکھنؤ" سے ملی ہیں، جس کا ایک کپی نسخہ محبتی خان صاحب ڈاکٹر فیض مسجد کے پاس موجود ہے اور میں اس کے لیے مولانا کا انتہائی ممنون ہوں۔ شرف کے مندرجہ حالات "انسانہ لکھنؤ" کے صفحات ۱۳۵ تا ۱۴۱ ص: ۱۳۳ نیز صفحات ۱۵۸ تا ۱۶۲ میں درج کیے گئے ہیں۔

لاکھنؤی خاں، لکھنؤ

اعلیٰ معیار

مدتِ مدید سے "آج کل" بالاستیعاب زیرِ مطالعہ ہے، مگر آپ کی ادارت میں رسالہ میں تیزی سے اعلیٰ معیار کی طرف بڑھ رہا ہے، قارئین کو دراصل اس کا اندازہ بھی نہ تھا۔ اتنے کم عرصہ میں آپ کی ساری جمعیہ سے جو خوشگوار تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ بلاشبہ لائقِ تحسین ہیں۔

گزشتہ شمارے سے سرورق پر اشعار کی فہرست کا سلسلہ ایک اہم اور گرانقدر اضافہ ہے۔ جو آپ پر مرقع چغتائی کے مطابق مرقع صادقین، تیار کر رہے ہیں۔ اس فہرست کا نام رکھ لے آپ اور جناب صادقین دو زبان ہی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جناب باغی، المآباد

مزید اضافہ

"آج کل" کا ہر شمارہ فخر سے گزرتا ہے۔ آپ نے اس کی وقعت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ خدا رکے آپ اسی طرح ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

محمد منصور عالم، آمہ

نکھار اور شباب

کہتے ہیں میں جیڑ کی عمر زیادہ سے زیادہ ہوتی جاتی ہے، وہ چیز ناقول اور گزندہ ہوتی جاتی ہے، مگر "آج کل" کے بارے میں یہ رائے غلط ثابت ہوتی جا رہی ہے۔ کیوں کہ جن جوں اس کی عمر بڑھ رہی ہے، اتنی ہی نکھار اور شباب کے ساتھ یہ منظر عام پر آتا جا رہا ہے۔ اور حقیقت یک جا کرنے کا انداز قوی ہوتا جا رہا ہے، جس کے لیے میری مبارک باد قبول فرمائیں۔

اختتامِ انجم، ڈالمن گنج

مستحق کام

عالیہ شانہ (دسمبر ۱۹۸۲ء) بالاستیعاب جناب لاکھنؤی خاں کا مقالہ شرف

آج کل ۶۱۹۸۳ء



جمہوریہ بنگلہ دیش کے وزیر اعلیٰ اور بنگلہ دیش کے سابق وزیر اعلیٰ نے ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ کو صدر جمہوریہ ہند سے راجستھان میں ملاقات کی۔

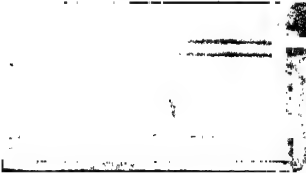


۲۵ مارچ ۱۹۶۳ کو نائب صدر جمہوریہ ہند شری گوبند لال انڈیا کے دورے پر شریف لالہ جمہوریہ بنگلہ دیش کے صدر بنائی شری لالہ شہو مہمان خصوصی سے ملاقات کی۔





وزیراعظم شری انوار گاندھی، راجہ ۲۰۰۲ کو گاندھی دہلی کے دگیان بھون میں شروع ہوئی راقوں تا دایستہ دہلی لانفرنس میں انسانی تقریر کرتے ہوئے۔



راجہ ۲۰۰۲ کو گاندھی دہلی کے دگیان بھون میں پاکستان کے وزیر خارجہ عزت مآب صاحبزادہ یعقوب ظفر (دائیں)، اور سجات کے وزیر خارجہ شری بی اوی نرسہاراؤ سجات، پاک
شریک کیشو کے قیام کے ساتھ سہ پہر دستہ کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان پاکستان کے صدر عزت مآب جنرل محمد ضیا الحق اور وزیراعظم ہند شری ندریا اندھا دھرمی تشلیف فرما ہیں۔

آج کل



راج نرائن راز

مہینہ شیشتر
شونامہ سہ

جلد ۴۱	شمارہ ۹	اپریل ۱۹۸۳
قیمت ایک روپیہ	فون ۲۸۷۰۶۹	چیت بلیاکھ ۱۹۰۴

ترتیب

ملاحظات :

مقالات :

۲

۵

۱۱

۱۵

۱۳

۲۶

۲۷

۲۸

۲۹

۳۰

۳۱

۳۳

۳۵

خارج نغای کی دنی

پکاش پندت

عقی مباری

نعمتی کی نگینیں

فراق گرو گھیری

شامین

ستیا سنجارا

ظفر گوگر لیدی

نرمھوا آس - شپور رسول

آزادی آزادی

وہمہند

خزائن رسیدہ بیل

علاقائی ادب :

۳۸ گائری پھول (ہندی نظم) نریش ہنسا/ناراشانی

۳۹ گور کا پھول (مراٹھی کہانی) سھارنہ/ایس کے یادکر

نئی کتبیں :

۳۳ نیم ترانیدہم جادوکارم/آرٹھی امروہی

عورت درویش راجندر جادوکارم/اکل فاروقی

انکار پریشاں اثر انصاری/عمود غوی

نیت جگر بکر جاندھری/عمود غوی

ادراک محمد سلیم اللہ، ولی محمد علی/اسمیر

تین من عباس تین من عباس

اڑتے لمحے شیش ہنسا/شون کی روٹا

ایک آنکھ والا ہرن اد/کرشن دات/شون کی روٹا

مات سمندر بدینہ ازماں مآثر/رام/علی باغوی

مکتوبات :

۳۸ کالی دس گتھا - ایمو فریڈ

نصا ابن نعیمی - چھپکاش قہر مجذوبی

گٹا زبانی - شاہین

سرورق، تشکیل شونامہ، صادقین

آرٹس - محمد چمن اردوہ

پرنس بنجوریس، ایل سپال - اسسٹنٹ پرنس بنجوریس، ایل، آسٹریا - اسسٹنٹ فارمنٹر (ہندو کش)، - کے کے کرشن

ترسیلی زد کاہت

مطالعہ سے متعلق خط و کتابت

پرنس بنجوریس، ایل سپال - اسسٹنٹ پرنس بنجوریس، ایل، آسٹریا - اسسٹنٹ فارمنٹر (ہندو کش)، - کے کے کرشن

ایڈیٹر آج کل، سندھ پکاش پندت، دہلی

ملاحظات

بہترین بہن کیسیلے

یہ ایک مکان ایک بنیادی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ غریب اور چھوٹے ہوئے لوگوں کے رہیں سہن کے حالات خاص طور پر گہری تشویش کا باعث ہیں۔ دوسرے ترقی پذیر ممالک کی طرف ہمارے دل میں بھی ذرا دلچسپی کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگ شہروں میں آ رہے ہیں۔ تیسری برہمنی ہوئی حالت اور شہروں کے تیزی سے بڑھ جانے کے سبب رہائشی مکان تعمیر کرنے کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ دینی علاقوں میں زمین کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن وہاں بنیادی اور اہم مسئلہ سہولیات کی کمی ہے۔ شہری علاقوں میں زمین کی قلت اور مناسب مکان ڈھنسنے پر یہ ہوتا ہے کہ ٹھکانے جو بنیادی ڈھانچے و بورد میں آجاتے ہیں اور ان میں دینی علاقوں سے شہروں میں آنے والوں کو پناہ مل جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں، جو اس سے بہتر جگہ گاہ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں سب سے زیادہ تشویش ان ہی لوگوں کے بارے میں ہے۔

ایک اندازہ کے مطابق ہماری تقریباً ۲۵ فیصد شہری آبادی ملکی جو بنیادی ڈھانچے و علاقوں میں گزربسر کرتی ہے۔ ان میں سے بیشتر کا معیاری اقتصادی طور پر گزربسروں سے ہے، جن کی ماہانہ آمدنی ۳۵۰ روپے

کے ہے۔ یہ لوگ مکان پر اپنی آمدنی کا ۱۵ فی صد زائد خرچ نہیں کر سکتے۔ ان کی جو بنیادی ڈھانچے و علاقوں میں رہنے والا ایک اوسط گھنٹہ مکان پر سارا سے مترو پڑے ماہانہ خرچ کر سکتا ہے۔ لہذا ہمیں اس لئے کوئل کرنے کے لئے متاخذ انداز میں کوشش کرنی ہوگی۔ دستیاب متبادل وسائل میں سے نہایت موزوں اور موثر وسیلے کا انتخاب کرنا ہوگا۔

بہنہ و سنان کے دینی علاقوں میں ایک کروڑ ۶۱ لاکھ اور شہری علاقوں میں ۳۶ لاکھ کافروں کی کمی ہے۔ یہ ایک عام اندازہ ہے اور اس میں عائشی مکانات و دیگر کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔

مکانات کی کمی کا سب سے زیادہ شکار اقتصادی طور پر کمزور طبقے اور کم آمدنی والے لوگ ہیں۔ اقتصادی طور پر کمزور طبقوں میں جن ان گنتوں کا شمار ہوتا ہے جن کی مجموعی آمدنی ۳۵۰ روپے ماہانہ ہے۔ کم آمدنی والے ذریعہ پر ۹۰۰ روپے ماہانہ، متوسط آمدنی والوں ۱۵۰۰ روپے ماہانہ اور ۱۵۰۰ روپے ماہانہ سے زیادہ آمدنی والے زیادہ آمدنی والے گروپ میں آتے ہیں۔

سرکاری شعبے تحت مکانات کی ترسیل کی ضرورتیں دیکھتے ہوئے مسکینوں کے تحت اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے آمدنی والوں اور کچھ متعلقہ متوسط آمدنی والوں پر زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ اس حقیقت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مکانات اور شہری ترقیات کی کارپوریشن نے ۵۵ فی صد رقم اقتصادی طور پر کمزور

طبقوں اور کم آمدنی والوں کو تیز تقریباً ۲۵ فی صد متوسط آمدنی والوں کو دی ہے۔

چھٹے منصوبے میں دینی علاقوں میں رہنے والے بے زمین مزدوروں کو مکان بنانا کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۸۵ تک ایک کروڑ ۴۵ لاکھ کمزور کو مکان بنانا کرنے ہوں گے۔

جیسی بے زمین مزدوروں کو مکانات کی جگہیں بنانا کرنے کی اسکیم ۱۹۸۰ میں شروع کی گئی تھی اور چھٹے منصوبے کے شروع ہونے سے ہے، ۴۴ لاکھ کمزور کو مکانات کے لیے جگہیں دی جا چکی ہیں۔ منصوبے میں باقی ۶۸ لاکھ کو جگہیں دینے کا نشت نہ رکھا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت کم ترقی پر مکان بنائے جاتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو تا ہے مقامی طور پر دستیاب تعمیر ساز وسائل ان کی استعمال کیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ مکان دیے جاتے ہیں وہ بھی ان کی تعمیر میں کم کار وادار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں رہائشیوں کے منصوبوں کے لیے مجموعی طور پر ۲۵ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔

مکانات کی کمیابی اسکیم کے تحت چھٹے منصوبے میں باقی ۸۲ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔

تعمیراتی جو بنیادی ڈھانچے و علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی، سڑکوں کی تعمیر، سڑکوں پر روشنی کا انتظام اور صحت سہولیات بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر دو کام کا متعلقان علاقوں میں عام ماحول، صحت عامہ اور مختلف محبت کے حالات کو بہتر کرنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ٹھکانے جو بنیادی ڈھانچے و علاقوں میں مکانات کا ماحول بہت ناقص ہے، لیکن یہ بنیادی ضرورت کو پورا کرنے میں تاہم مجموعی قلت کو دیکھتے ہوئے جو کمزور کھانوں کو زیادہ سہولیات دہانے کے لیے محسوس اور ملکی سطح نظر پر لایا جاوے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ترقی کے پہلے سے آہ و کراہ کا پروگرام شروع کیے جانے لگیں۔ ان علاقوں میں ماحول کو بہتر بنایا جائے۔ اور صفائی بخراں کی بنیادی سہولیات (۲۱)

خدمات کے شعبے میں کافی سرمایہ کاری کی ہے۔ اور یہ اس کا ثمرہ ہے کہ ان ریاستوں میں خواندگی کی سہولت بڑھ چکی ہے اور شرح پیدائش نیز اموات میں کمی ہوئی ہے۔

ان ریاستوں کے تجربے سے غائدہ ۱۹۵۷ء کے کچھ اور ریاستوں نے بھی تعلیم اور غذائی بخش فراہم کرنے کے شعبے میں سرمایہ کاری کو اولین اولیت دی ہے۔ ان کی کوششوں اور سرمایہ کاری کے نتیجے میں ان علاقوں میں تعلیم اور سرمایہ کاری کے شعبے میں اضافہ ہوا ہے۔ ان متعدد اقدام اور کاموں میں باوجود اس مسئلے کے کہ تین سال پہلے ہی برتھ کنٹرول کیا گیا تھا۔ لیکن ان کے لیے اضافہ کر دینے کے لیے مسلسل اور ترقی سے ہم جانا ہوگی۔

بندیش آبادی کے مسئلے کو پیش ہی اقتصادی ترقی کے لیے منظر میں دیکھا جا رہا ہے اور اس مسئلے میں کچھ سالہ منصوبوں میں خاص زور دیا جاتا رہا ہے۔ چھٹے منصوبے میں اس مسئلے کو تدریجیت دی گئی ہے اور اقتصادی ترقی کے لیے آبادی پر قابو پانا کم ضروری ہے، اس کا اندازہ چھٹے منصوبے کی دس سالہ کے منصوبہ ذیلی اعتبارات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

عوام کو بہتر معیار زندگی جیتا کر ملنے کی طرف سے خاندانی علاج و بہبود پروگرام کو بخوبی قوی کوششوں کا ایک جز بنانا ہوگا۔ بے روزگاری اور معاشی کے مسائل حل کرنے کے لیے برہمن اور معاش کو کشش کرنے کی ضرورت ہے۔ زمین چھوٹے اور زرعی کاشت کاروں، دیہات کے بے زمین مزدوروں، خواتین مزدوروں، خواتین مزدوروں اور خواتین مزدوروں کے لیے زمین پروگرام مرتب کرنا چاہیے۔ بے زمین مزدوروں اور خواتین کاشت کاروں کو کھانسی بخشنے والا دوا جیتا کر ملنے کی طرف سے دیہاتوں کا ایک ذریعہ پروگرام مرتب کیا جا رہا ہے۔ ان پروگراموں کا بنیادی مقصد دیہاتوں کو معاشی طور پر ترقی دینا ہے۔ اقتصادی حالت میں بہتری کے نتیجے میں غریبوں کے لیے مکمل جانے لیں گے اور ان کے ذرا حاصل کیے گئے ایک معیار زندگی کی تکمیل کے لیے ترقیاتی کام شروع کر دے گا اور درودوں کی دست گیری سے آزاد کرنے کے لیے اقدام کر دے گا اور اس کی کامیابی پر بہتر کر کے پھر بھی ترقی دے گا۔

آبادی کا مسئلہ

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے ابتدائی اعداد و شمار کا گزشتہ سال اعلان کیا گیا تھا۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر ملک کی آبادی کے مسئلے پر کافی بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال ہو چکا ہے۔ اصل بحث یہ تھی اس بنیاد پر کیا جاتی رہی ہے کہ آبادی کی روک تھام کے لیے کیا جانے والی کوششوں کا نانا نیا منصوبہ بندی کے پروگرام پر بھی اثر نہیں پڑا۔ اس مباحثے اور تبادلہ خیال کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ فی الواقعیت کا ربا اور گزشتہ ۳۰ برسوں کے دوران ہماری معیشت نے جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، انہیں بحیرہ نظارہ انداز کر دیا گیا۔ اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری نہیں ہوگا کہ دنیا میں ہندوستان ملک ہے جس نے سرکاری طور پر نانا نیا منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے ابتدائی اعداد و شمار کا گزشتہ سال اعلان کیا گیا تھا۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر ملک کی آبادی کے مسئلے پر کافی بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال ہو چکا ہے۔ اصل بحث یہ تھی اس بنیاد پر کیا جاتی رہی ہے کہ آبادی کی روک تھام کے لیے کیا جانے والی کوششوں کا نانا نیا منصوبہ بندی کے پروگرام پر بھی اثر نہیں پڑا۔ اس مباحثے اور تبادلہ خیال کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ فی الواقعیت کا ربا اور گزشتہ ۳۰ برسوں کے دوران ہماری معیشت نے جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، انہیں بحیرہ نظارہ انداز کر دیا گیا۔ اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری نہیں ہوگا کہ دنیا میں ہندوستان ملک ہے جس نے سرکاری طور پر نانا نیا منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۸۱ء میں ہماری آبادی ۹۸ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی تھی اور ۱۹۷۱ء کے دہے اخیر اس سے ساڑھے دو گنے بھی ملک میں سالانہ شرح اضافہ تقریباً ۲.۵ فی صدی رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالانہ شرح اضافہ ساڑھے دو گنے کی طرح تک جگہ ۱۹۵۲ء کی صورت تھی۔ علاوہ اس کے معنی

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے ابتدائی اعداد و شمار کا گزشتہ سال اعلان کیا گیا تھا۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر ملک کی آبادی کے مسئلے پر کافی بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال ہو چکا ہے۔ اصل بحث یہ تھی اس بنیاد پر کیا جاتی رہی ہے کہ آبادی کی روک تھام کے لیے کیا جانے والی کوششوں کا نانا نیا منصوبہ بندی کے پروگرام پر بھی اثر نہیں پڑا۔ اس مباحثے اور تبادلہ خیال کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ فی الواقعیت کا ربا اور گزشتہ ۳۰ برسوں کے دوران ہماری معیشت نے جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، انہیں بحیرہ نظارہ انداز کر دیا گیا۔ اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری نہیں ہوگا کہ دنیا میں ہندوستان ملک ہے جس نے سرکاری طور پر نانا نیا منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۸۱ء میں ہماری آبادی ۹۸ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی تھی اور ۱۹۷۱ء کے دہے اخیر اس سے ساڑھے دو گنے بھی ملک میں سالانہ شرح اضافہ تقریباً ۲.۵ فی صدی رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم اپنی کوششوں میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سالانہ شرح اضافہ ساڑھے دو گنے کی طرح تک جگہ ۱۹۵۲ء کی صورت تھی۔ علاوہ اس کے معنی

● مرکزی وزیر منصوبہ بندی ڈوٹی چیرمین پلاننگ کمیشن انی ڈی

خواجہ حسن نظامی کی دلی

رسم و رواج کی دلی

خواجہ صاحب (۱۸۷۵ء — ۱۹۵۵ء) نے جس دلی سیر کی کہوں تھیں، اُس کے گھروں اور محلوں میں اگر ایک طرف مغل شاہزادوں اور شاہزادیوں کی داستانِ کرب و بلا کے چرچے تھے، تو دوسری طرف ای دلی کے کئی کچے سنت و بدعت اور جائز و ناجائز کی بحثوں سے گزر رہے تھے۔ شاہ اسماعیل شہسپارم نے انیسویں صدی کی ابتدا میں ترک رسوم کے مسئلے میں جہادی وعظ کیے تھے وہ بڑے فوہر و حول کی دلوں میں تازہ تھے۔ برصغیر میں اسلامی حودی کاری (MODERNISATION) کی تحریک کے بادِ آدم وہ مرستیاد ہوئے ہو رہے تھے جو کبھی اپنی جماعتی دلیانی کی نعرے گزر جانے کے بعد ”جہل سالار عزیز“ کے دوسری حافی سنت و تابع بدعت کا لقب اختیار کرنے پر تھے ہوئے تھے۔ اپنے اس دُور میں مرستیاد ”ترک بدعات“ کے معاملے میں اتنے سخت تھے کہ ایک بار اپنے بے تکلف دوستوں کے محفل میں سنت کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”صرف بدعت عقائد میں ہی باتوں کے اضافے ہی کرتے نہیں تھے۔ بلکہ اس کے دائرے میں ہمارے روزمرہ کے اعمال بھی آجاتے ہیں۔ کوئی بھی ایسا کام کرنا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں دیکھا ہو، بدعت ہے۔ یہ سُن کر ان کے دوست مفتی صدر الدین آزرہ نے ان سے پوچھا کہ تعزرت بھی تو آپ آم کھانے کو کبھی بدعت کہیں گے، اور صرف اسی شخص کو تابع سنت قرار دیں گے جو اُم سے پرہیز کرتا ہو۔ مرستیاد نے اس کا جواب اُٹاتے ہوئے دیے ہوئے اپنے موقف کی مزید وضاحت میں کہا کہ جس طرح حجاز کا کوئی کوثر، واجب، سنت، محبت، مہمان اور ناجائز کا لوں کو حرام، مکروہ، حُرکری اور مکروہ تہذیب کے مختلف درجہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح بدعت کے بھی کفر سے لے کر ترکِ ادنیٰ تک کئی درجہات ہیں۔ اس لیے یہی مسئلہ ہے خود روش کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ

حضور نے جن اشیا کو روش جان فرمایا ہے، انہیں کھانا یقیناً سنت ہے۔ اور جن چیزوں کو آپ نے ناپسند فرمایا ہے، ان کا استعمال بلاشبہ مکروہ ہے۔ وہ گئیں وہ چیزیں جو حضور کے سامنے نہیں تھیں ان کا معاملہ مشتبہ ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ انہیں پسند کرتے یا ناپسند۔ اس لیے اسی چیزوں کے کھانے کو ہم مکروہ تو نہیں کہہ سکتے، لیکن ان کا استعمال غیب کی وجہ سے ترکِ ادنیٰ کا نصف میں ضرور آتا ہے۔ اس پر آزرہ نے بوجھا کر اُم کے نزدیک اُم کے نزدیک اُم کے نزدیک مرستیاد جواب دیا کہ میں اس شخص کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دوں گا کیونکہ اُم کا معاملہ مشتبہ ہے۔ لیکن اگر آپ اُم نہ کھانے والے کے بارے میں مجھے پوچھیں تو میں کہوں گا کہ اگر کوئی شخص صحت اس نیت سے اُم نہیں کھاتا کہ اسے حضور نے کبھی نہیں کھایا تو مجھے یقین ہے کہ اس کی موت کے وقت فرشتے اس کے پیروں کو چومنے کے لیے اس کے پیتر پر آئیں گے۔

مرستیاد اور ان کے دوستوں کی یہ گفتگو ۱۸۵۰ء کی ہے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے سنت و بدعت کے موضوع پر اپنے خیالات ”راہِ سنت و دروِ بدعت“ کے عنوان سے تقلید کر کے ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیے تھے۔ یہ رسالہ ایک طرح سے شاہ اسماعیل شہسپار کے رسالہ ”حقائق الحق العریض میں احوال المرتضیٰ و العریض“ میں سنت و بدعت کے مسئلہ پر پیش کردہ خیالات کی جھلک دکھاتا۔

۱۸۵۰ء کے مرستیاد اور ۱۸۵۳ء کے مرستیاد میں بظاہر زمین آسمان کا فرق آچکا تھا اور اس وقت لوگوں نے مرستیاد کو ”عاقبت سنت“ کی گوتی سے انداز کر ”کوسناں“ کے گروپ میں لا کر رکھا تھا، لیکن مرستیاد اس وقت بھی اپنے خیال پر پیلے ہی کی طرح بقول سے فرق کے ساتھ جے جے تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۳ء میں رسالہ مذکورہ کو دوبارہ شائع کرتے وقت یہ وضاحت کی کہ ان کے مذکورہ بالا خیالات اس زمانے کی یاد دلاتے ہیں، جب ان پر بعد از خود ”معاہدت زور و خور“ سے طعن تھا۔ اب ان کے خیالات میں اعتدال آچکا ہے تاہم اس

پندہ غیر مطالعات اسلامی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱-۲۵

معاملے میں وہ اپنی پہلی رائے پر ہی قائم رہا۔ ہاں یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اس معاملے کا متعلق انسان کے احوال سے ہے۔ اگر کوئی شخصی کیفیت رسول میں صرف اہم لگے ان تمام چیزوں کو ترک کر دیتا ہے جن کی مذکورہ سے ثابت نہیں ہے تو میں یہ کہوں گا کہ محبت کے معاملے میں اس شخص کی ایک خصوصی کیفیت ہے۔ اور اس کیفیت کا ایک خاص درجہ ہے۔ لیکن مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس وضاحت سے چند برس پہلے ۱۸۵۹ء میں انہوں نے سنت وراثت کے موضوع پر اپنے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے تسلیم کیا تھا کہ ”ذرو منور و باہت“ کے زمانہ میں وہ عقائد و عبادات اور مذہن و معاشرت سب کو مذہب کے حاد میں رکھتے تھے اور یہ ان کی بھول تھی۔ لیکن اب انہیں یہ کہنے میں پاک نہیں ہے کہ دینی اور دنیاوی معاملات کو باہم ملا کر نہیں کرنا چاہیے۔

دسمبر ۱۸۵۵ء کے صدر مسیحا نے سماجی رسم و رواج کو دین کی آنکھوں سے دیکھنے کی بجائے دنیا کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا تھا، اور اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ”رسول کے دوائے“ غلطی کے چند لوگ مجھے ہیں اور ان کے احوال و اعمال کو ناپنے کا جو حصہ میرا ہے اس پر تمام لوگوں کے اعمال کو نہیں ناپنا چاہیاسکا۔

خواجه حسن نظامی کی دلی کے موضوع پر گفت گو کرتے ہوئے مسیحا کی بات کو بعض لوگ شاید غیر ضروری تشبیہ سمجھیں، لیکن میرے خیال میں سنت وراثت کے موضوع پر مسیحا کے مذکورہ بالا خیالات کی معنویت کو اچھی طرح سمجھنے کے بغیر شاید اس دلی کو ٹھیک سے نہ سمجھ سکیں گے جسے خواجه صاحب کی دلی کہا جاتا ہے۔

خواجه صاحب کی دلی رسم و رواج کی دلی تھی، اور رسم و رواج کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ انسانی سماج اسی سے مرتب ہے پھر بھی اسی پر مرتب ہے۔ دوسرے سماج کی طرح مسلم سماج کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی اہم کے ڈاڑھے اگر ایک سر پر دیں گے ملے ہوتے ہیں تو اس کے دوسرے سر پر دنیا کے ٹکڑے پڑ گئے ہوتے ہیں۔ مسلمان گھرانوں کی سنا پیدی کوئی رسم ایسی ہوگی جس کے لیے لوگوں نے کوئی مذکورہ دینی بنیاد نہ فراہم کی ہو۔ مثال کے طور پر شب برات کے طوع کو لے لیجئے کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم فرقی — یا شاید کسی دوسرے بزرگ — کی نذر سے جب یہ روایت گزری کہ غزوہ اُحد میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک دست شہید ہو گیا تھا، تو انہوں نے جب بے دردی کے جذبات میں اپنا بھی ایک دست لٹا دیا — پھر یہ سچ لکھا شاید یہ وہ دانت نہ ہو جو غزوہ میں کام آیا تھا، انہوں نے ایک اور دانت اکٹرا کر چھینا۔ اس کے بعد بھی انہیں شب برات کا گناہ یاد میں بھی دانت انہوں نے نہ لٹا دیا۔ اس طرح ایک ایک کر کے انہوں نے اپنے تمام دانت لٹا ڈالے۔ جب دانتوں کی تکلیف ختم ہوئی تو معدہ کی پکاریں اُٹھیں کان دھرا چڑھا، سخت جبر کھانے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔

آج کل کی دلی

اس لیے نرم غذا کے خیال سے طوع پکا کر کھایا۔ کہا جاتا ہے کہ شب برات کا دن تھا۔ بس وہ دن اور آج کا دن، مسلمان اس عشق رسول کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے شب برات کے موقع پر طوع پکاتے ہیں۔ خواہ اس لیے کہ انہیں قرض وام کیوں نہ کرنا پڑے۔ خود کھاتے ہیں، دوسروں کو کھاتے ہیں اور جو کھانے کھاتے کے قابل نہیں، ان کی جان کھاتے ہیں۔ سب سے اہم بحث سے قطع نظر کہ شب برات کا طوع جائز ہے یا ناجائز، یہ بات تو معلوم ہے کہ شب برات میں ایک خصوصی کیفیت کا نام دیا جاتا ہے، وہ بات جب ہم ایک سچی روحانی کی دنیا کی بجائے مادی کی دنیا کی نظر سے دیکھ لیں۔ اس دنیا کی ایک علان تو مکمل ترک رسوم کی اس تبلیغ میں پوشیدہ تھا، جسے اس دلی میں شاہ اسماعیل نے شروع کی تھی، باوجود ”مصرطاع“ (اصلاح رسوم) کی اس دعوت میں بھی تھا، جسے ڈی ڈی نذیر احمد ان کے معاشرے نے اپنی تحریروں کے ذریعے میں لکھا تھا۔ ”مرآۃ الغریب“ کے دور زندہ عابد نسائی کے درباروں اکبری اور اصغری کے ذریعے ڈی ڈی نذیر احمد نے اس رسم میں اصلاح کا ایک طریقہ بتایا ہے۔ جب تک اپنے گھر میں اکسبری کا دور دورہ رہا ہر شب برات پر حضور رات کے تلے خراج ہوتا رہا۔ گھروالے مقررین ہوتے رہے اور گھر کی مادیات ہاتھوں سے پہنچے مقرر رہی، لیکن جب اکسبری کے گھر کا حال تو کس حال کا بتا کر اپنے گھر کی اچھی اور اصغری کی بات سننی ملے گی تو اس نے پہلی شب برات میں یہ انتظام کیا کہ اگر شہر کے بیروں کے مقررین میں فخر کے لیے بہت کھڑی مقدار میں طوع بنوا۔ اور نچے میں ایک گھر سے آئی ہوئی طوع کے کیلیٹ کو دوسرے گھر پر لے کر اپنے گھر کے ناک کو بھی کھٹے سے بچایا۔ اس طرح شب برات بھی ہو گئی۔ گھروالے مقررین ہوتے رہے گئے۔ اور اڑھیس برسوں والوں کا موہنہ بھی میٹھا ہو گیا۔ ہاں اگر کوئی نقصان میں رہا تو وہ گھر کی مادیات، جو ہر سال بیرون پچھوئے طوع کو کھٹا کر بازار میں بیچ لی جاتی تھی۔

خواجه حسن نظامی نے دینی تعلیم اس گھرانے کے اساتذہ سے حاصل کی تھی۔ جس کا سلسلہ شاہ اسماعیل سے جا ملتا ہے۔ اور جہاں رسوم کے خلاف جہاد کا نالغہ تھا ایمان تھا۔ دوسری طرف وہ اس خاندانی ماحول کے بھی پروردہ تھے، جہاں ہر پہلے رسم و رواج کو دین کا درجہ حاصل تھا۔ اس طرح خواجه صاحب نے شب برات کی انہیں کوئیں تو انہوں نے اپنے کو کسب اور کلیسا کی کشش میں مبتلا پایا۔ حضرت خواجه نظام الدینؒ کے عرس کے موقع پر اہل خاندان اور دینی والے ”خواجه بیبا“ کی یاد میں جن حکمت کی مرتب ہوئے تھے، انہیں نوجوان حسن نظامی نے دل اور زبان دونوں سے غلط فرما دیا۔ جب وہ خراج کے مزار پر واپس لوٹے تو ناچنے دیکھتے تھے تو اس کے دلی پر پھر زبان مٹی نہیں، اس لیے انہوں نے دیکھا کہ

کی جانے والی تمام مہمت کے غلات جاکھلے تھکان لی، لیکن کہاں سے پرکھڑے ہو کر دیامیں ڈوبنے والوں کو بسٹیں کرنے کی بجائے خود بھی دیا میں مہماندہ بڑے اور سخت بھر پور ہاتھ پیر مارنے والوں کو تیرنے کا کڑھکھانے رہے۔ انہوں نے چونکہ اصلاح خانقاہ کا بیڑا اٹھایا تھا، اس لیے سب سے پہلے تو انہوں نے یہ بتے کیا کہ وہ خانقاہ کو اپنی روزنی دلا کر اسکا ہار نہیں بنائیں گے۔ جیسے کا آزاد ذریعہ تلاش کریں گے تو ان کی باتوں میں کچھ انہی کی ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل خواجہ صاحب کی خود نوشت ”آپ بختی“ ہے، جس کے دیباچے میں ان کی طبع پر پورے اہل متبع کھاسے کہ ”ہر لوگ اگر خواجہ صاحب کی طرح محنت و مشقت سے روزی کمایا کریں اور ہمدوں کی نذر نہ ہوں گا خیال نہ کریں تو وہ بھی نصیحت کرنے میں بے خوف ہو جائیں گے“

جو لوگ جس وقت والی اور نذر و نیاز ہی کے سر سے خالق نہ ہوں گے وہ خانقاہ کی زندگی اور سرمد و رواج کے میدان میں خواجہ صاحب کے اصلاح کا کارنامہ کو مستند ”ساہ“ مانے اور سنبھالنے کو دوہہ پلانے کے مرادف قرار دیں گے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھٹکانا چاہیے کہ انسانی تہذیب کی تاریخ میں دم و رواج اس رواجی دلوں کے مانند ہے جسے آپ ترکیبوں سے تو نہیں بند کریں تو ٹھیک ہے ورنہ جب بھی اسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کے خون کے ہر قطرے سے نئے نئے دلوں وجود میں آتے جائیں گے۔ اسے آپ انسانی کرداری کہیں یا انسانیت کا خاتمہ، لیکن بات یہی ہے کہ انسان رنگ و بو کا عاشق ہے۔ دورنگی اس کی سرشت میں ہے۔ آپ اس سے لاکھ کہیں وہ وسوسہ سر نہ تو موم ہو سکتا ہے اور نہ سراسر رنگ۔ وہ یک رنگ کو یہ کیف زندگی سمجھتا ہے اور زندگی کی بے کئی کو مختلف ہانوں سے رنگیں و پڑ پھار بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ میلاد پہلے بھی ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بحث بھی جاری ہے کہ میلاد کی مخلص منعقد کرنا تو اب کام ہے یا پیسے خرچ کر کے ٹھکانہ لینا ہے۔ لیکن بحث اور میلاد دونوں کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان مسلسل دورنگی کی تلاش میں ہے۔

خواجہ صاحب کی دلی میں بھی میلاد ہوتے تھے اور سنید آج کے اتنا اقتصادی دباؤ نہ ہونے کے باعث کچھ زیادہ بھی ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب میلاد کے خالق تھے جو مخلص منعقد کرتے تھے اور دوسروں سے منعقد کراتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ میلاد کے سلسلے کی جانے والی غیر ضروری باتوں کی اصلاح بھی چاہتے تھے۔ وہ اس بات کو غلط سمجھتے تھے کہ لوگ قرین کے میلاد کی مخلص منعقد کرائیں اور نام و نون کی خاطر معمولی روشنی اور کھانے والے اور مٹھی پاؤں کے نام پر بے انتہا خرچ کریں۔ ان کے نزدیک یہ بڑیاں تھیں۔ لیکن یہ برائیاں میلاد کی وجہ سے تھیں بلکہ جیش و در میلاد خواہوں کی کارکن تھیں۔ انہوں نے اپنے میلاد نامہ میں ان برائیوں پر نفس کر تنقید کی ہے اور اپنے

مردوں کے سامنے مخالفین میلاد کے موقف کے انہی پہلو کو بھی واضح کیا ہے۔ ”میلاد نامہ“ کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ ہر ملک کچھ لوگ میلاد کے مخالف ہیں مگر ہم کو یہ جان کر دینا چاہتا ہے، مگر یہ مخالفت ذکر رسول کو منع نہیں کرتے۔ یہ ان باتوں کو روکنے ہیں جو ہمیں لوگوں نے میلاد کی مجلسوں میں غلاب شرع اور غلاب حکم اسلام شائع کر دی ہیں۔ خواجہ صاحب کا میلاد نامہ دراصل رسول نبیؐ کی ہے۔ وہ میلاد کی مخلص میں مروجہ ”میلاد ادب“ کو رد کرتا ہے اور خدا کو چھٹا نشان رسالت کی بے ادبی سمجھتے تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ گاہے گاہے بازخانہ پرمیں کرتے ہوئے لوگ میلاد کے پہلے رسول اکرم کی منکلی سراج سے واقفیت حاصل کریں۔ لیکن میلاد کے سربراہ اپنے آداب جوئے میں جو صرت ”سراج خوانی“ سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اس لیے خواجہ صاحب نے اپنے میلاد نامہ میں میلاد کے روایتی آداب کا بھی پورا پورا اخیال رکھا۔ دینی میلاد کا تصور بغیر تمام کے مشکل ہے، اس لیے خواجہ صاحب اس مسئلہ پر پہنچنے میں تو اپنے موقف پر قنوت پہنچانے کی خاطر کہتے ہیں کہ ”یہ روشنی والے قومی گیت گاتے ہیں تو تعظیم کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم فقر و غارت کے موجد کی آمد پر تعظیم کو کیوں نہ کھڑے ہوں“

جس دلی کی ہم بات کر رہے ہیں اس دلی میں گھر ملی اور سماجی رتوں کو زندگی کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔ اولاد میں ایسے لوگ موجود تھے جو ان رتوں کی عقلی توجہ بھی کرتے تھے۔ معزز خاندانہ رشتہ نگار یہ بتے اپنے ناپوں کے منفعت کو داروں کے ذریعے یہ بات کہلاتی ہے کہ ہمارے سناج میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو بڑوں کو ایک منکلی جادہ دینے کے بھی دروازا ہیں، مسیحا ہی لوگ مختلف مذہبی تہذیبوں کے مروج پر نذر و نیاز کے پہلے اچھے اچھے کھانے پکھانے ہیں۔ جس میں سے کچھ نہ کچھ فریوں کے بیٹوں میں بھی چرنا ہے۔ اس لیے اگر اسی پہلے یہ نیک کام ہوتا رہے تو اس میں ہلائی کیا ہے! — رشتہ نگاری کا ایک دل چاہ کر دار (خانہ) نانی خوشو ہے۔ ان نانی خوشو کے منہ سے انہوں نے مسلمان گھرانوں میں لاکھ بعض تہذیب کی عقلی بنیادیں فروغ کی ہیں۔ ایک موقع پر نانی خوشو چند نئی روشنی کی باری کھل کھل کرتی جہاں جہاں رنجیوں کو یہ کھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ انہیں شام کے چھٹے میں ہرے بھرے بڑوں کے نیچے نہیں بیٹھا جائے۔ یا کھانے کے آسمان کے نیچے نہیں آتا چاہے درد ان پر ابرو داسے کا سایہ ہو جائے گا۔ لڑکھا حب ان سے سانس بگڑا کرتی ہیں تو وہ کھلا کر کہتی ہیں کہ مجھے معلوم ہے کہ اوپر صرف اللہ میاں ہیں اور ان کا سایہ جس پر چڑھائے اس کی قسمت کا کھانا، لیکن ان سے ڈرنا لوگوں ہے۔ ڈرنا تو لوگ جن پر ہی ہے، اس لیے ان کے حوالے سے بچ کر نہ لکھا جاتا ہے۔ وہ دراصل تعصبات یہ ہے کہ اگر سنے مسلمان کے نیچے آؤ گی تو صحن مکن ہے کہ جہلی یا کوئی دوسری چڑیا اوپر سے تھارے بالوں

پریٹ کر دے۔ بتاؤ سر دھوئے کی دشواری میں چڑھ گئی یا نہیں۔ اسی طرح نام کے وقت پرندہ درخون پر بس کر کے ہیں اور مسل بیٹ کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت اگر تم بچروں کے نیچے بیٹھو گے تو ہتھارے سراد کر پڑے گندے ہوں گے یا نہیں۔ اب لات کو تھانوی کی تو نہ پوچھا ہو گا یا نہیں۔

جہان داری مسلم سماج کا ایک بنیادی وصف ہے۔ اور خاص صاحب کی دلی ایسے لوگوں سے خالی نہیں تھی، جو جہان داری کے پہلے ڈھونڈتے تھے۔ انشرف صبری نے "دلی کی عجیب و غریب ہستیاں" میں ایک میاں ٹٹرو کا کردار پیش کیا ہے، جو حد درجہ عیب ہونے کا وجود جہان کا دل رکھنے میں سالم کو بھی شرم دلا سکتے تھے۔ حاتم نے بڑی صداقت دکھائی کہ جہانوں کے لیے اپنے اونٹ ذبح کر ڈالے، لیکن میاں ٹٹرو کے کلابہ اجڑاں میں جب ان کے ایک کے ایک موہنہ بوسے تھانے وار دوت برسات کی لذت میں جہان ان کر آدھکتے ہیں اور میاں ٹٹرو کی خصوصی ماش کی کھجری کی ہڈی کو چرے پر دیکھ کر اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں تو میاں ٹٹرو پوری ہڈی تھانے دار صاحب کے حوالے کر دیتے ہیں کہ اب آپ اسے اٹکیے کیا کھا میں۔ اپنے ساتھ گھرے جائیں تاکہ کھائی اور نیچے اسے چکھ سکیں۔ دل جب بات یہ ہے کہ اس کھجری سے میاں ٹٹرو اپنا دودن کا فائدہ لوٹنے والے تھے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ایسی خاندان کے سالم

میں وہ دوست جہان کی خاطر کھجری برسات کی رات میں جہان کو تیر کر اس پار جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ اس وقت سے (دشا بدھ یا غازی آج) خاص پوروں والے باش لاکر اس سے دوست کے بچوں کے لیے ایک عجب سرہ بنا سکیں نتیجہ ظاہر ہے۔ تھانے دار صاحب گھر میں بیٹھے کھجری کھاتے رہے اور میاں ٹٹرو کو مچھلیاں بچتی رہیں۔

خواجہ صاحب اس بیان پر کھیل کر جہان داری کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے کا نا باقی کے ایک معنی "مان زمان میں تیرا جہان" میں ایسے جہان پر کڑی تنقید کی ہے، جو میزبان کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک رات جب ایسے ہی چند وبال جان جہان بھیج جاتے ہیں تو وہ انہیں کھلاتے چلاتے تو تیز رہیں، لیکن ان کی خبریں غریب لگتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب جو خیرے مولوی واقع ہوئے ہیں، جب اوروں سے شروع جہان داری کی اہمیت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں اڑے ہاتھوں لیے زمین اور کچے ہیں کہ — آج کے زمانے میں سرائے اور جوش قدم قدم پر موجود ہیں تو میرا اطلاع کسی کے یہاں جہان ہی کی رہی پینچا اور اسے بلا سبب تکلیف دینا تو اب انہیں گناہ کا کام کہا جائے گا۔

ایک شہر وصال ہے کہ "دلی کی لڑکی ستمرا کی گائے۔ قیمت چھوٹے تو باہر جائے" اب مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ کس کی قسمت کی طرف اشارہ ہے۔ جانے

والی کی اسے جانے والے کی۔ یقیناً جانے والے کی قسمت بھڑکی ہوگی۔ اگر اتفاق سے جانے والی "مرآۃ العروس" کی لکھی ہوئی یا "بنات الغنم" کی بہروں محمود کی تربیت میں آنے سے پہلے دلی میں آلا ہوئی یا اے۔ آر۔ حافظ کی "چتر" والی بچہ ہوئی۔ خواجہ صاحب کی دلی میں ایسی اکبر یوں، بھانوں اور خرس آراؤں کی کئی نہیں تھی، چاہتے بھڑک رہے، جہات اور بد مزاجی کے باعث اپنے گھر چلا بیٹھتے ہیں۔ "کلا ناہی" کے لیفٹننٹ معائن مثلاً "شادی کی بڑی رسمیں"، "بان کی گھوڑی" میں خواجہ صاحب نے صفائی بھڑائی، سلیقہ مندی اور سحر کون کی خوبیوں کو اچانک کر کے کی کوشش کی ہے اور نام لیے بغیر لڑکیوں کو صغریٰ اور محمود بنے کی تعریف کی ہے۔

خواجہ صاحب کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خزانہ بچروں کو سجا کر نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنی اس خالی کا انہیں احساس بھی تھا، مسکین بحیثیت عجمی وہ گھر ٹوٹ دیکھ کر دیکھ کر غور توں کی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ شاید اسی لیے آپ بیتی کے خاتمہ پر انہوں نے گھر داری کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے انگریزوں کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور پڑھے والوں کو تنقید کی ہے کہ بچوں اور عجمیوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت تو والدین خود کریں، لیکن اگر ہو سکے تو سلیقہ اور سحر گھر میں کے لیے انہیں انگریز اور یورپین آڈالوں کی انگریزی میں رکھیں۔

خواجہ صاحب کی یہ جلدی تھی۔ وہ کھرا کیلے ان معنی کی ذمہ۔

وہ دلی بھی ڈاکٹر ڈاکٹر حسین کی بھی، ڈاکٹر عابد حسین کی بھی، مولانا اسلام علی صاحب کی بھی اور بر وفیسر محمد جمیل کی بھی — بالفاظ دیگر وہ جامعہ والوں کی بھی دلی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس وقت عام معنوں میں صرف ایک قلعہ سیوارہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک مرکز تھا تہذیب کا، ایک منبع تھا سائنسی ذہن کا۔ اس وقت کی جامعہ اور جامعہ والوں کا یہ کارنامہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انہوں نے سائنس کی دبی قلعہ کے مواقع حاصل نہ ہونے کے باوجود بچروں کو سائنسی طور پر سونپنے کی ڈگری پر لگا یا۔ جامعہ کے بنیادی پتھر کو دین و دنیا کی آمیزش کے حوالے سے نصب کیا گیا تھا، لیکن دین و دنیا کی آمیزش کا یہ مطلب نہیں تھا کہ لوگ سائنس کی کاغذی ڈگریوں کے ساتھ ساتھ دنیاویات کی بھی سمجھیں حاصل کریں اور اس کے بعد ایک کی دوسرے پرفیلیٹ ثابت کرنے دینی یا موقع دیکھ کر حوالہ دینی طرح بھی پندروں کی صف میں جا بیٹھیں اور بھی چاہیں یوں میں جا کر کلیں بھر لیں۔ آمیزش کا مطلب تھا ایسے ذہن بنانا جو دوسروں کو ٹھنڈے دل سے شیخ، لیکن شہر اس وقت کریں جب اس کے دل کے قہبات کو دور موب جاتیں جو حضرت ابراہیم کی طرح خدا سے مطالبہ کر کے کہ زندگی اور موت کے قلعے کو زانی تیں، شاہد کی

طور سے سمجھانے کی ضرورت ہے اور جب خدا اس سے کہے کہ کیا میری باتوں پر تجھے یقین نہیں ہے تو پوری عاجزی کے ساتھ جواب دے کے کہ یقین تو ہے لیکن اطمینان قلب سے سرفرازی کی منت ہے۔

اب میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ اگر عاصم نہ جوتی تو خواجه صاحب کی دلی میں سانس ہی نہین کا فقدان رہ جاتا۔ اس دن میں کوئی بھی اچھا کام کسی کے بغیر نہ کر سکتے تھے۔ جامعہ نہ ہوتی تو کوئی اور ادارہ نہ ہوتا، کوئی فرد نہ ہوتا جس سے نیک کام کو فروغ ملتا، لیکن اس بات کے کہنے میں ہر حال کوئی ممانعت نہیں ہے کہ خواجه صاحب کی دلی میں جامعہ سے خاص طور پر اردو دواں طبقہ میں سانس ہی نہین پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اس وقت کی دلی میں ایسے لوگ آسمان سے آئے تھے جو کسی بات کو اس وقت تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے تھے، جب تک آپسے جوئے اور شاہدہ کی کسوٹی پر پرکھ کر نہ دیکھیں۔

۱۹۰۶ء میں دہلی ریفرم نے ”روحانی تاثیرات کا معنیٰ مناظرہ“ کے عنوان سے دہلی کے دو خواجهوں کے درمیان ایک گفتگو کی تھی۔ ”کائناتی“ میں اس مضمون کو پھر کراچی میں ہوتا ہے کہ ریفرم والوں نے دو خواجهوں کو حقیقت دو علامتوں کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایک تھے اطمینان قلب کی علامت، خواجه حسن نظامی اور دوسرے تھے سانس دہلی کی علامت، خواجه محمد رفیع دہلوی۔ پوری گفتگو میں خواجه شفیع اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ دواؤں تو میڈیسن، جیسا کہ میڈیکل اور دواؤں علاج کی عقلی بنیادیں ہیں، اور انہیں سانس ہی جبر کی روشنی میں ثابت کیا جائے۔ دوسری طرف خواجه حسن نظامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حیرت اس مادی دنیا کی بہت سی چیزوں کو انسان اپنی ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح عالم روحانیت کو بھی بالکل ایسے علم نہیں پیش کیا جاسکتا۔ دراصل میں طرح عام لوگ خود سے سانس ہی پر کیے بغیر سانس دہلی کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور تجربہ اور مشاہدہ کی ذمہ داری چند مخصوص لوگوں پر بھروسہ دیتے ہیں، اسی طرح ”روحانیت“ کے ساتھ بھی ہماری معاملہ ہونا چاہیے۔ یوں لوہا مکالمہ کی بحث میں ختم ہو جاتا ہے۔

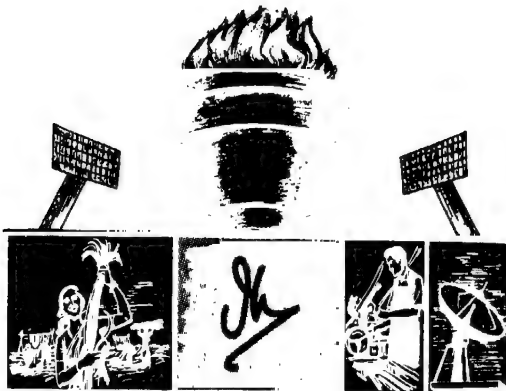
اور دونوں اپنے اپنے موقف پر باقی رہے تو بے نتیجہ ٹکرائے کا کام سامعین پر بھروسہ دیتے ہیں۔ خواجه شفیع یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ ”تاخیر ہر چیز میں خدا ہی نے دی ہے، لیکن ہم جب اس تاثیر سے کام لیتا ہے تو اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کئے ہیں۔ جس درخواست ہماری اصحاب باطن سے ہے کہ اس معنوی طاقت کا جو ان کی رائے میں ان کی آنکھوں میں موجود ہے، ہم کو مشاہدہ کروا دیں کہ قائل ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں خواجه صاحب کی اس بات پر مناظرہ ختم ہو جاتا ہے کہ ممکن ہے آپ کو اطمینان نہ ہو، لیکن مناظرہ سننے والے صحیح فہم رکھتے ہیں کہ میرے ”روحانی کلمات اور تصویف گزشتوں کی تاثیرات کا غلط عقل میں آنے کے قائل جان کیا کیلئے یا نہیں، اور اگر میں باطن میں جواب دیتے ہیں تو نام بھی رہا تب بھی میرے حیر کر کے اطمینان ہے کہ خود میری عقل نے میری دلیوں کو

مان لیا ہے۔ میرے لیے اور میرے ہم عقیدہ لوگوں کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم روحانی کلمات کی تاثیر کو بر وقت اور ہر جگہ دیکھتے ہیں اور اسی وجہ سے اس کو کہتے ہیں۔“ خواجه صاحب کی دلی میں اگر ریفرم نہ آگیا ہوتا تو یہ مناظرہ شاید اتفاقاً ہی سے اپنے انجام کو نہ پہنچ جاتا۔ دلی مسلمانوں کا شہرہ چمکے اور دلی والوں نے مناظرہ کو کچھ دلوں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔ جنگ کی طرح مناظرہ بھی فتح و شکست کے بغیر ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ بات صرف سانس دہلی کی دلی تھی کہ ہمارا فرقہ جماعت بھی اپنے موقف میں غصہ ہو سکتا ہے، عاصم جو سکتا ہے، عموماً ہو سکتا ہے۔ ہمارا فرقہ صرف اتنا ہے کہ ہم اپنی بات کو دوسروں تک پہنچا دیں کسی کے دل کو بدل دینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ کام صرف خدا کا ہے، اسی لیے جب ہم اپنی بات ختم کرتے ہیں تو کہتے ہیں — وَرَبُّنَا ذُو فَضْلٍ بَازِلًا۔

یہ معارف خواجه حسن نظامی میری ہوسا کی دلی کے زیر اہتمام منصفہ سمینار ”خواجه حسن نظامی کی دلی“ میں پیش کیا گیا تھا۔

بقیہ: پرکاش پنڈت

ان کی ادنی خدمات کا جائزہ لینے کے لیے تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ ان کا طبع زاد کام تو صرف اتنا ہے کہ اردو میں ”میراث“ نام سے افسانوں کا مجموعہ مرتب کیا اور ”قوافل“ نام سے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہندی میں چھپا، لیکن ”شارہ“ اور ”فن کار“ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے اردو ادب کی جو ضرورت کی اس کی اہمیت کچھ نہیں ہے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ اردو ادب کی ہندی میں شغل کرنا ہے۔ اچھے اس کام کے لیے وہ ہمیشہ باہمیہ مانگے۔ انہوں نے غالب سے لے کر آج تک کے جدید شاعروں سے ہندی ہاضموں کو روشناس کرایا، جس سے انجمنیت ملی اور دونوں زبانیں قریب آئیں۔ اردو اور ہندی میں کئی کی دلیا رمانا ہے۔ اور انجمنیت کا باعث ہے۔ جمادیب دونوں رسم اخلاصتے ہیں، انہوں نے ایک عام فہم علوی زبان مرنانے کی اور استوار کی ہے، ان میں قابل ذکر نام منشی پریم چند کا ہے اور دوسرا اختر حسین رائے پوری کا۔ پریم چند بھی نے افسانوں کی زبان مشکل ہے، لیکن پریم چند کی اور پریم چند کی آسان ہوتی ملی گئی۔ اختر حسین رائے پوری نے گوئی کی آپ بیتی کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ سببیں اور سادہ زبان کا وہ بہترین نمونہ تھا۔ پرکاش پنڈت نے جو کام کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے بہت سے افسانہ نگار ہندی میں استعمال کرنے لگے۔ میں نے اردو فن کی کئی مشہوریت حاصل ہوئی ہے کہ ہندی کے کئی بھی فنکار لکھنے لگے ہیں۔ ان کو کیسیلوں میں فرقہ بھی نہیں ملتی تھی۔



شہداء کی جیت

شہداء کی جیت، دسپہاں اور سخت محنت کے ذریعہ ایشیائی کھیلوں کو تاریک کامیابی غلطی کی جس سے بھارت کو اس کی تنظیمی اور طے سے مضبوطی کو تیز رفتاری کے ساتھ چاہیے مکمل بننے کے کی صلاحیت کے لئے، دنیا بھر سے خارج جیت ملا۔

اس کی جیت، دسپہاں اور سخت محنت کے ذریعہ ایشیائی کھیلوں کو تاریک کامیابی غلطی کی جس سے بھارت کو اس کی تنظیمی اور طے سے مضبوطی کو تیز رفتاری کے ساتھ چاہیے مکمل بننے کے کی صلاحیت کے لئے، دنیا بھر سے خارج جیت ملا۔

اس کی جیت، دسپہاں اور سخت محنت کے ذریعہ ایشیائی کھیلوں کو تاریک کامیابی غلطی کی جس سے بھارت کو اس کی تنظیمی اور طے سے مضبوطی کو تیز رفتاری کے ساتھ چاہیے مکمل بننے کے کی صلاحیت کے لئے، دنیا بھر سے خارج جیت ملا۔

اس مشعل کو روشن رکھیں

آئیے: ایشیائی اولمپکس کو قومی تعمیر کے وسیلہ تر میدان میں بھی بروئے کار لائیں۔

پوری معیشت ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنا اور اپنے کرداروں ہم وطنوں کے ہوجہ کو بھارت کا چہرہ ہاتھ ہے۔ یہ جدوجہد ہم میں سے ہر ایک کو کرنا ہے۔

آئیے! ہم سب مل جل کر اپنے وطن کو مضبوط بنائیں



darv 82/584

پرکاش پنڈت



پرکاش پنڈت (مزم)

تھے۔ پرکاش پنڈت بنا کرتے تھے کہ ان کے دادا، برہم ساجی خیالات کے تھے۔ وہ گھر بار چھوڑ کر سنہ ۱۹۰۲ء میں آئے تھے، لیکن بعد میں حالات نے ان کو پشیمان کیا کہ جتنا چھوڑے تھے، اتنا ہی کچھڑ کر مل رہے اور دادا کو گریہ سے نوبت ہو گئی۔ ان کے دادا پرکاش پنڈت وہ محنت گیر آدمی تھے۔ کچھ دن ان کی کوئی نگرانی میں نہ گذرا۔ شام کے کھانے کے بعد چراغ ملنا دیتے۔ پرکاش پنڈت اور چھوٹے بھائی بھیم سین کے کتے کے بیٹے کر پڑھو اور خوریاں بیٹھے نگرانی کرتے۔ جب تک اسکول کا لام قلم سمجھا، چارخ ملنا رہتا۔ سونے کی اجازت نہیں تھی۔ سب بڑھے کا نام پڑھنا تو دادا ہمارے ہی کی۔ راتوں اور صبحاوت کی کہانیاں سنایا کرتے۔ منہ مانتے ان کی اعلیٰ تربیت کرنا تھا۔ اس کو کسی نگرانی سے دل میں لینا تو کا جذبہ پیدا ہوا۔ لیکن محنت کی عادت بھی بڑھ گئی جو آگے کل کر کام آئی۔

دادا کا انتقال کب ہوا، یہ نہ پرکاش پنڈت نے بتایا اور نہ میں نے پوچھا۔ البتہ سب وہ لاہور میں ہمارے بڑے دوست تھے تب ان کی عمر بائیس تیس برس تھی۔ شادی ہو چکی تھی اور دو بچے بھی تھے۔ وہ مال روڈ پر ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھے۔ بچے روپے ہینڈ تنخواہ ملتی تھی۔ اس سسے زمانے میں بچے بائیس برس بھی کافی تھے۔ سلیسے سے رہتے اور دوستوں کی خاطر فراموشی میں کوئی کس تہیں ہٹھا رکھے تھے۔ نفاست پسندی طبیعت میں رہا میں کئی تھی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، کتا کی چوہ اور گھنے کالے بال۔ ٹھکے خوب ہی سندر کرتے تھے۔ دلچسپ اور لاپرواہی کہ سنا تھا کہ بچے بائیس برس کے بچے کا لکھنے لکھنے کا ابتدائی دور تھا۔ ان کو کوئی رشتہ دار ہندی میں اردو میں نام کا نہیں ہوا۔ لکھتے تھے۔ اس میں پرکاش پنڈت صرف ہاتھ مارہ لکھتے تھے لکھا کہ طرح ادارت کے فرائض ادا کرتے تھے۔ گاہے گاہے اردو کے ”مست جموں“ اور ”مگروں کھنڈل“ میں بھی لکھتے تھے۔ لاہور سے ان دنوں ”ہالین“ ”اولیٰ دھنا“ ”ادب لطیف“ ”شامکار“ ”مالکیر“ سولاری ادلی پہلے لکھتے تھے، مگر

۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء کو اردو اور ہندی کے نامور ادیب پرکاش پنڈت رحلت فرما گئے۔ انہیں ایک مدت سے ملے لاکھینہ تھا۔ ان کی موت اسی عرصے میں ہوئی۔ ان کا جنم، ۱۹ نومبر ۱۹۰۲ء کو لاکھن پور میں ہوا تھا۔ ان کی عمر ۵۰ برس تھی۔

پرکاش پنڈت میرے دوست — بہت ہی عزیز دوست تھے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے پرکاش پنڈت، کنبہ لال پور، دلی پور، ستیا پور اور دلی پور کی لاکھ اور ستیا پور میں لکھن پور میں ایک دوسرے کے چڑھی تھے۔ ان کو کوئی۔ ایم۔ سی۔ اے میں بزم ادب کی میٹنگیں ہوتی تھیں۔ ان میں ہم چاروں ایک ساتھ ملنا کرتے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد، میراجی، چاراجی، حضرت کوئیال، قیوم غفر، حقیقہ، موہن پوری اور یوسف ظفر وغیرہ کافی بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ ان میں لاکھ دادی، فرانک دادی، سیاسی اور فزیکس سائنس ہر سائنس کے لوگ شامل تھے۔ وہاں جو تھیں، غرضیں، افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تھے، ان پر خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ طرح طرح کے نکتے نکالے جاتے تھے۔ پرکاش پنڈت نے وہاں دیکھی کوئی چیز پڑھی اور دیکھی بحث میں حصہ لیا۔ وہ خاموش بیٹھے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے بولنے والوں کو سن دیکھا کرتے تھے۔ جانشین بننے بھی تھے۔ پھر میرے کسی اور عمل کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ آدمی بولنے سے کچھ بچتا تھا۔ میرے تو سمندر سے بھی کچھ لے رہے۔ اس کی تھوہ کو نہ سکتا ہے۔ اپنے بھڑکنا اور چپ رہنا بہت پرانے ہیں، جو بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔ پرکاش پنڈت میں یہ لگتا تھا، جسے انہوں نے زندگی بھر مانے رکھا۔

وہ بزم ادب میں ہوا میں پیدا ہوئے تھے۔ نام ام پرکاش تھا۔ سب لکھنا شروع کیا تو میں ہم پرکاش پنڈت بن گیا۔ ان کے چڑھے لاکھ پور سے امرتسر پہ آئے

پراکش پبلیشنگ کی سسٹم ان ایک نئی سسٹم — کوئی بھی شخص پبلشر کی ادیب نہیں ہوتا۔ لیکن کچھ کی صلاحیت ہو تو آوری آہستہ آہستہ نیچے سے اوپر اٹھتا ہے۔ ارتقا کا یہ اصول ہم سب پر عام ہو جائے۔ پراکش پبلیشنگ بھی قدم بہ قدم اٹھے ہوئے۔

لاہور ادیب اور پبلشر کا مرکز اور نہایت چارہ خیر تھا۔ لیکن ملک کی تقسیم کے باعث چھوڑنا پڑا۔ میں یکم جولائی ۱۹۴۷ء کو وہاں سے چلا آیا تھا۔ پراکش پبلیشنگ کا ہی بعد میں آئے۔ آزادی کے بارے کا خیال نہیں تھا سو چاہا کہ اس میں چھپے ہو گا تو پبلشر ٹوٹ آؤں گا۔ لیکن اصنافِ امداد ساتھ لیتا آیا تھا ایک سائیکل چھپے رہی تھی اور پراکش پبلیشنگ سے کب دیا تھا کہ اسے بک کر دینا۔ آخر تقصیری جی جی ہوئی تھی۔ مگر سب باہر نکلتا جان جو کچھ کام اور پیش پر سامان بک کر دینے والوں کی بھلہ۔ اس کے باوجود پراکش پبلیشنگ نے سائیکل ایک کوفی اور دو ہریس پاس ملکر دو مہینے صفحہ سیچ گئی۔ اگرچہ یہ واقعہ بہت عجیب ہے، تاہم ان کی دزدانہ کے احساس کی دلیل ہے۔

۱۹۴۸ء کے شروع میں ہم پھر دہلی میں ایک دوسرے سے ملے۔ ساتھ لہذا دہلی کی پکٹا سے ہجرت کر کے مدراس آئے۔ انہوں نے برف ماسٹی کی مدد سے شاہراہ نکالنا شروع کیا۔ پراکش پبلیشنگ بھی انہی کے ساتھ اس زمانے سے وابستہ ہو گئے۔ میں کونٹ پارٹی کے روزانہ اخبار "ناؤ ڈے" وابستہ تھا اور پکٹا انہیں منزل اور دبا ناسی تھی۔ "شاہراہ" کا دفتر وہاں سے عوضی ہی ڈور تھا۔ چنانچہ ہر روز کی ملاقات رہتی تھی۔ ساتھ اور پراکش پبلیشنگ کی رہائش جاندی پول کا روبرو کھڑے دفتر کے قریب کو چھ پبلیشنگ میں تھی۔ مجاز کھنوی بھی دلی آکر سڑک کے ساتھ رہ گئے۔ جوش شیخ اکبری "آٹھل" کے ایڈیٹر تھے۔ دلی کے ڈپٹی کمشنر منگل سبھی کی بدولت منہ اصرے کھڑے رہتے تھے اور کوئی بھی مناوہ جوش، مجاز اور سادہ کی شرکت کے بغیر کام یا بے بی سمجھا جاتا تھا۔ ان مناوہوں اور پائوٹ سمیتوں میں پراکش پبلیشنگ بھی ساتھ رہتے اور اپنی مادیات کے مطابق غاصب جیسے سب کچھ دیکھا اور سننا کہتے۔ شاہری اور زبان کے ہر زمانہ دیکھنے کتابوں کے مطالعے سے سمجھنا کھن تھے وہ مناوہوں اور پائوٹ سمیتوں سے آسانی ذہن نشین ہو گئے۔

ان دنوں ادیب کی ترقی پسند تحریک ضرور تھی۔ دلی میں انہیں کا سرگیشی رہتا تھا۔ مغز ادیب اردو بازاری سے ماہ نامہ "ماحول" نکلتے تھے۔ ان کی مینڈا ریشٹنگس "ماحول" کے دفتر میں ہوا کرتی تھیں، جن میں دلی کے اور پنجاب سے آئے ہوئے ادیب کا کوئی ٹیڈ نہ رہا۔ حتمہ جیتے تھے۔ دہلی کی مہم ادیب کی طرح انہیں کی ان مشنگوں میں بھی جو نظمیں، غزلیں، افسانے اور نثر کی پڑھ جاتے تھے ان پر خوب خوب بحثیں ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان بحثوں سے ذہنی تربیت ہوتی اور لکھنے کی تحریک بھی تھی۔ ساحر۔ پراکش پبلیشنگ اور

میں انہی کی مشنگوں اور جلسوں میں شرکت کرنے کی کڑھ اور کھنوں وغیرہ بھی جاتے رہے۔ یہ ادبی مرکز ماسیاد اور ماسیاد پبلشر کی لاٹری جڑو تھیں، تنگہ ناک اندولن پبلشر تھا اور ایک نئے نظام کا تصور تفہیمات میں منکس ہوتا تھا۔

مئی ۱۹۹۹ء میں انہیں منصفین کی کل ہند کا نفرین پبلیشنگ (دہلی کے قریب) میں ہوئی۔ ساتھ اور میں اس میں شرکت کرنے گئے۔ اس کے بعد ساحر دہلی میں بھی رہ گئے۔ شاہراہ کی ادارت کے قرائع پراکش پبلیشنگ سرانجام دینے لگے۔ پنجابی اور اردو میں ایک ساتھ لکھنے والا پریٹ لای، ماہ نامہ سبھی دہلی کا بارڈر سہرونی آگیا تھا۔ اردو پریٹ لای کی ادارت بھی پراکش پبلیشنگ کے سپرد ہوئی۔ انہوں نے دوقطی پروجیکٹ ادارت کے قرائع خوش سہو سے سرانجام دیے۔

شاہراہ میں میرا افسانے اور مضامین تو چھپتے ہی تھے۔ ان کے علاوہ ایک مستقل کالم تھا "میں زہر لایا کہ کبھی کبہ نہ سکا تھا" اس کالم میں انہیں بھی ترقی پسند تحریک پر چاروی گٹ بندی اور خط و کتابت کی کڑی تنقید کیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی غفرائی تھا وہ پراکش پبلیشنگ، ان کا نام نہ ہونا لازمی تھا۔ پراکش پبلیشنگ پر دباؤ ڈالنا کہ وہ میرا کالم بند کر دیں، لیکن وہ اس دباؤ کے ہتھ نہیں لگتے۔ یہ کالم برقرار چھپتا رہا۔ نتیجہ یہ کہ وہ شاہراہ کی ادارت سے الگ ہوئے انہوں نے جلی پبلشنگ ہاؤس کے جواب بدلہ ان کے تعاون سے "نکار" شروع کیا۔ لیکن آپس میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے، ان کے باعث "نکار" زیادہ دقتوں میں چل گیا۔

پراکش پبلیشنگ کی اقتصادی پریٹا جیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ان پریٹا جیوں کے حل کی اور کوئی صورت نظر نہیں آئی تو وہ اس کے پاس بھی چلے گئے۔ ہمیں چار سال دہلی گزارے۔ لیکن سبھی کا نفسی ماحول انہیں راس نہیں آیا اور وہ جیسے سے بھی زیادہ پریٹا جی حالت میں دلی ٹوٹ آئے۔ دماغی توازن بچھو گیا اور مدد خواہی کا عالم تھا۔ راج پاٹل اینڈ سنز کے شری دشناما تھا ان کے درمیان تعلقات تھے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں وہ ان کے آگے آئے۔ دشناما تھا نے ان کے گزراہے لائق تنخواہ مقرر کر دی اور کہا کہ دو چار لکھنے کے لیے دستبر آجا یا کریں۔ جتنا کام ہو سکے اتنا کریں۔ وہ دفتر آئے گئے۔ کام تو زیادہ نہیں ہوتا تھا، لیکن طبیعت چل جاتی تھی۔ باغ چھ بیٹے لوں کی گزر گئے اور رزق نہ طبیعت منہل گئی۔ میں سیکرٹری تھا صرف اپنی کارگزاری کی بدولت وہ اسی دفتر میں ہند پاک ٹیکس کے ٹی ٹی کرتے رہے۔

اب انہوں نے جاندی پول کا مالک اور لاٹری چھوڑ دیا اور دہلی شاہراہ میں رہائش اختیار کیا۔ ہم پھر ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ میں بھی ۱۹۵۰ء میں اردو بازاری سے نوین شاہراہ چلا گیا تھا اور ۱۹۵۸ء میں وہیں ایک چھوٹا سا مکان چھو گیا تھا۔ ہند پاک ٹیکس کا ٹرم سہو جاتے پر منقطع ہو رہا تھا۔ کوئی ڈیڑھ دو سو کا ملک کر رہا۔ ڈاکٹر کی طبیعت سے پراکش پبلیشنگ کے جو کام کیا

اس سے انہیں لاکھوں کاموں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا انتخاب ، ان کا ٹکٹ آپ اور نئے ملازمین کی بھرتی کا کام الگ ٹکٹ میں ہی تک وہ تہنکے رہے۔ وہ چکر اس میں کسی دوسرے کا دخل نہیں تھا۔ یعنی نے کہا ہے کہ چھوٹی باتوں میں احتیاط کرنا بڑی باتیں اپنی احتیاط خور کر گی۔ میں نے پرکاش پبلیکیشنز میں ٹکٹ میں ایک بات دیکھی۔ ایک دن میں ان کے پاس دفتر میں بیٹھا تھا، نئے کارڈ پر گیا۔ ابھی ملازم لگا کے کہے سے باہر چلے گئے۔ پرکاش پبلیکیشنز اپنی جگہ سے اٹھے اور میں بیٹھا دیکھتا ہوں کہ کبھی فاضول نہ چلے۔ ہند پاک ٹکٹ کے دوسری زبانوں کا معیار ادب ہندی میں منتقل کیا۔ پرکاش پبلیکیشنز دوسرے اداروں سے جرمنیہ کر داتے تھے اسے خود بھی غور سے دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کتاب کے ترجمے میں غور سے جانے کیسے بڑی معمول ہو گئی۔ پرکاش پبلیکیشنز نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”بھرا تم پرانے آدمی پر۔“ اسے کوئی بات نہیں ہوتی چاہیے۔ اور دشواری کو انہوں نے خود ہندی میں منتقل کیا۔ جب کہ خود بالخصوص کے بارے میں شک کی گنجائش نفاذ کی زبانوں نے خود مجھے کٹھن دیا۔ یعنی جہاں وہ دوسروں کو سٹورہ دیتے تھے وہاں سٹورہ لینے میں بھی کی طرح کی عادات نہیں کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ادیبوں کی ایک پوری ٹیم بنائی اور وہ ان سے ان کی صلاحیت کے مطابق کام لیتے تھے۔ مثلاً مختار مازہر می سے انہوں نے جاسوسی ناول لکھوائے اور اسے لکھ کر انہیں بھیت ملے کا فرضی نام دیا۔ یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ مختار کی وفات کے بعد اب بھی بھیت خول رہا ہے۔

دفتر میں اور گھر پر کٹر ملاقات رہتی تھی۔ گھر پر ان کا کوڑا لگتا تھا، جس میں کہ میں نہیں اور ان کے کھنے کی میز تھی۔ میں جب بھی گیا انہیں کھنے میں معروف پایا۔ کھتے جاتے تھے اور بڑی پیسے رہتے تھے۔ بڑی آواز پیتے تھے کہ امیش پورے بھر جاتی تھی۔ دفتر سے لوٹے وقت بچوں کے لیے کھل نہ دیتے۔ گھر لوٹ کر کوڑی زبرد آدم کرتے۔ بچوں سے پہنچتے ہوئے اور اس کے بعد کھنے بیٹھے جاتے اور رات کے تک کھتے رہتے۔ کسی دوسرے ادیب کو میں نے اتنی زیادہ محنت کرتے نہیں دیکھا اور محنت زبانیت کی کمی کو بردار کر دیتی ہے۔

اب ان کا سنی اور اٹھالیس تین بڑا دلچسپ اور انتہائی لیکن شاذ و نادر ہی ہوتے تھے۔ جیسے کہ لکھتے تھے دیکھ کر کہتے تھے۔ نوین شاہ بدھ کی کلاسی تھی اس پاس اور میں نے کوئی اس میں رہی تھیں۔ جیسی کہ میں سمجھتا ہوں، لبرل اور میرٹ میں سستا تھا۔ میرے لیے لوگوں نے بھی اپنے مکان بنائے اور وہی جیسے تھر میں اپنا مکان بنڈا کہ بہت بڑی ضرورت ہے، لیکن اتنی آمدنی کے باوجود وہ مکان بھی نہیں بنوا ہاں ایک دو گھر خارج کی کاٹی تھا، دوسرے چھوٹے مکان تھے جیسے میں کو بھی دلی ہوا تھا۔ ہمیں یہ بھی سمجھتی تھی کہ انہیں زلف تھی۔ اُسے ایک کافی دوست کا فرم میں زرگری ملائی تھی، لیکن ہمیں سین کی محنت خراب تھی، جو کچھ فرم سے

ملتا تھا، وہ وہاں داروں میں اٹھ جاتا تھا۔ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری پرکاش پبلیکیشنز نے اپنے سر اوردھ کر لی تھی۔ آخر عیسیم سمجھتے تھے پچھلے پچھلے کر مل پلا سب تک وہ اپنے باؤں پر کھڑے نہیں ہو گئے ان کا فریج پرکاش پبلیکیشنز پر کھلے رہے۔ لیکن اس بات کا کبھی کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ وہ جہاں رشتہ داروں کا خیال رکھتے تھے وہاں دوستوں کے بھی دوست تھے اور ضرورت کے وقت کام آتے تھے۔ میں جب جب گرفتار ہوا، جیل میں توجہ کا کام کیا یا اور میرے گھر بھرا ہوا۔

محنت اور بڑی مشکلوں کے باعث پرکاش پبلیکیشنز کو گیس کی بیماری ہو گئی تھی، کئی مرتبہ میرے ساتھ سچ سویرے میرے کچن کا کارڈ گرام بنایا لیکن نہا، نہیں ملے۔ گیس کی بیماری کے علاوہ انہیں گھٹے کا کسٹرو بھی ہو گیا، جب اس مرض کا علاج پلازما میں آئیں تھوڑی باڈی میں ایک وید کے پاس لے گیا۔ وید صاحب نے بنایا کہ کینسر کا صاف ایک ہی علاج ہے، نہیں اپنا پیٹیاں بنایا ہوگا۔ پرکاش پبلیکیشنز نعمت پسند آدمی تھے، جواب دہ کروں یا جوں، پیٹیاں نہیں پیوں گا۔ وہ ساحر کے پاس بھی چلے گئے، جانا تھا ٹیوٹ میں علاج کروایا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ دس سال تک می سکونگے۔ اگر اس کے بعد مرض پھر ابھرا تو کوئی علاج ممکن نہیں۔ پرکاش پبلیکیشنز نے یہی سال بھی پہلے کی طرح محنت کرتے گزار دیے اور برادری کی طرف سے بے فکر رہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ صرف دس سال کے بعد پھر ابھرتا۔ وہ پھر علاج کے لیے بمبئی گئے، جہاں میری وقت میری ان سے ملاقات ہوئی تو کچھ گئے ڈاکٹر اب ایک ہی علاج بتاتے ہیں کہ آپ کسٹرو کے کچلے کا کافی حصہ کاٹ دیا جائے، لیکن میں آپریشن نہیں کرواؤں گا۔ جہاں صحت یں کو گھر میں پڑے رہنے سے مر جانا کہیں بہتر ہے۔

میں سے لوٹے تو جیل لگانے سے جبرہ کاٹی بد نما ہو گیا۔ سوچا بھی تھی کوئی بھی کھوٹیں چیز کھا نا ممکن نہیں تھا۔ مختار اس یا دودھ پیتے تھے۔ لہذا سے بھلے بھی منگوائے، لیکن حالت سدھنے کے بجائے بگڑتی گئی اور ستمبر ۲۰۱۹ دسمبر ۱۹۸۲ کو ان کے انتقال کی خبر ملی تو کہ ٹیما لگا۔ ایک دوست — ایک رفیق صدیق کے کچھنے کا صدمہ کچھ نہیں ہوتا۔

پرکاش پبلیکیشنز جیتے دھڑلے رہے۔ اپنی شرطوں پر چھے۔ نعمت پبلیکیشنز اور خور داری سے بھی۔ انتقال سے دو روز پہلے میں اور سندھو بکرم ان کے گھر گئے۔ جرم سے تو بڑی دھکی کر بیماری پر کاٹی بیسہ اٹھ رہا ہے۔ آپ نے ادب کی اتنی خدمت کی ہے اگر آپ درخواست دی تو آپ کو کسٹرو مشنری سے مالی مدد مل سکتی ہے۔ پرکاش پبلیکیشنز کا حباب تھا، ادبی خدمت کے عوض مدد ملے تو مجھے لینے سے انکار نہیں، لیکن میں اس کے لیے درخواست دلاؤں گے مجھے گوارا نہیں۔ وہ خوش مزاج اور زندہ دل آدمی تھے۔ محنت کو سامنے رکھتے تھے بھی ان کے چہرے پر کسی طرح کی غلظت نہیں تھی۔ (تکمیل پر)

ہجاری کتابیں

مربع اقبال (اچھن نامہ آزاد) قیمت ۵ روپے
 طائر اقبال کی زندگی کے اہم واقعات شجرہ نسب اور نادر تصاویر اور تحریروں کا مجموعہ۔

ہندوستان (شیلادھر) قیمت ۱۰ روپے
 اس بالقصور کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ رنگین تصاویر۔

رستہ احمد خاں (روہیلہ طبع احمد ننگلی) قیمت ۵ روپے
 ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر سرسبز کلمے کا زہاں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ اس بات کو بڑے عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

الو اکرام آزاد (اعزیز طبع) قیمت ۱۰ روپے
 الو اکرام آزاد جدید ہندوستان کے مہولہ میں ہیں۔ ان کی شعاعت کا حسین دور کشی انوار میں بیان۔
جہاں لال کی کتابیں تصویروں کی زبانی قیمت ۱۰ روپے

محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جہاں لال جی کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصاویر میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لیے بہت ہی نفع۔

ہم ایک ہیں (اعزیز طبع) قیمت ۱۰ روپے
 ہندوستان کی ثقافتی و سماجی کوٹھن اور ایک بڑی کاوش بیان۔ قومی زندگی کی توانائی کی داستان۔
نیلول اور سربوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے قیمت دو روپے

گھر گھر درختوں کے عام جملہ، مرلیط، جیشی جیسے اور آج روبرو ہمارے سامنے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھسیٹے اپنی کن پسند چیزیں بننا سیکھ سکتے ہیں۔

پندرہ روزہ "یوجنٹ"

ملک کی ذرا مٹی، تعلیمی، ثقافتی زندگی کا ترجمان منصوبہ ہند اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا واحد اور دور رس سالہ جیسٹ، فی ماہی، ایک روپیہ۔ سالانہ: ۱۲ روپے۔

شعل آزادی (اسانہ نقاشی) قیمت ۱۰ روپے
 ہندوستان کی جنگ آزادی کی منظوم داستان حسنہ آہل، چمکناٹ پرکشش جس میں ۱۵۰ ایکسکے واقعات شامل ہیں۔ ویدہ زیب کلمات و طباعت عمدہ بھرپور رنگوں میں۔

مہارت خواتین (دو زبانیں) قیمت ۱۰ روپے
 خواتین کی دلچسپ داستان سرسبز ہی کوڑی کی سارا زانے ہر جگہ انکشاف ثبات آسان زبان، اخلاقی گوشوں کا پیکل لکھا گیا ہے۔
 ۱۰۰ تصویروں کی کتاب، کاغذ عمدہ، تصاویر تازہ

پایلسان قیمت ۱۰ روپے
 آج کے تازہ پسیلوں کا مجموعہ جن سے بچے اور بڑے یکساں طور پر لطف اٹھا سکتے ہیں۔

بک بک بک قیمت ۱۰ روپے
 بچوں کے کتابت شیعہ الدین، متعلیم سید ہادی اور بی بی اسلم علی بی بی، نمک زینہ خرم اور برجیت سے خدائی آسان زبان میں لکھی ہوئی تعلیمی

آج کل کی کہانیاں قیمت گیارہ روپے
 ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۶ء تک رسالہ "آج کل" میں شائع شدہ مستحضر کہانیوں کا مجموعہ جس میں دھندہ پتھر، عصمت چٹائی، قزوین حیدر اور دیگر افسانہ نگاروں کے شہرہ آفاق شامل ہیں۔

کون جیتا کون ہارا قیمت ۱۰ روپے
 بچوں کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دو دلچسپ کہانیاں۔ کتاب شری کرشن کے بعد ایک میں نظم کر کے کوئی چاہتا ہے

ہندوستانی تہذیب کا مسلمان برادر ڈاکٹر محمد، قیمت ۲۰ روپے
 ڈاکٹر محمد نے اپنے مختصر تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا حارہ لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد نے اپنی ان محققان کاوش میں یہ دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مسلمانوں کی زندگی میں حرارت کے موئے ہے۔

ہجاری پالینٹ

یہ کتاب ان اہم اقدامات کا جائزہ پیش کرتی ہے، جو پالینٹ نے پچھلے اٹھاس برس کے دوران نافذ کئے، نیز اس میں پالینٹ کے قابل فخر خدمات اور اہم سرگرمیوں کا احاطہ کیا ہے۔

"آج کل" کے خریداروں کو ۲۰ فی صد رعایت۔ محصولات ملک ہمارے فیسے
 وٹس رہے تے تم قیمت کی کتابیں خریدو۔ یہ نہیں بھیجی جائیں گی۔ پوسٹ آرڈر بھیجئے ہادی بی طلب کیجئے۔
پرنس پیپر پبلیکیشنز ڈوٹرین، پٹیا لہ ہاؤس نمبر ۱۱



غنی بنارس

— ”آل یوسف گم گشتہ بازار قصیدہ“

اصلی، رہتی اور باغی کا نام اردو قصیدہ گوئی حیثیت سے کتابوں میں مذکور ہے، مگر ان کے قصیدے اب محض کتابیں۔

قلمی دیکھ کر آئندے جب شمالی ہند میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز ہوا تو قصیدہ گوئی نے بھی فروغ پایا۔ دہلی کے نیک عالم اور لائسنس علی خاں نقاش نے قصیدے بھی لکھے، لیکن وہ قصائد مکمل محض ذرا رہ سکے۔ شمالی ہند میں قصیدے کا شان دار ارتقا سودا و دیگر کے عہد سے ہوتا ہے۔ سودا سے قصیدہ نگاروں میں جنوں نے فوری تصانیف کی روشنی میں اپنے قصیدوں کو وہی معیار اور تکنیک سمجھ کر گوشہ کی جو ایرانی شعرا کے پیش نظر رہی ہے۔ مثلاً سودا کے یہ قصیدے فارسی قصائد کے متبع میں لکھے گئے ہیں۔

- ۱۔ جواب کفر ثابت ہے وہ تمہارے مسلمان
- ۲۔ نہ ٹوٹی شیخ سے زنا رنج سب سلیبانی
- ۳۔ اگر عدم سے نہ ہو سنا تو فکر روزی کا
- ۴۔ تو آب و دانہ کو کس کا گھس نہ ہو پیدا
- ۵۔ اٹھ گیا جہن ورے کا چمنستان سے محل

سودا سے انتشار و متغی تک کے فتر کو اردو میں قصیدہ نگاری کا دوسرا دور قرار دیا گیا ہے۔ ذوق، غائب اور حسن کا اردو قصیدہ گوئی کے تیسرے دور میں آئے ہیں۔ ہر چند اس عہد کے قصیدے لکھے گئے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے آخری محل فرماں روا ہا دربار نقاش کے زوال کے ساتھ ہی فن قصیدہ بھی رو بہ زوال ہو گیا اور اسے بس کے اردو میں سودا و ذوق کی خروار ان قصیدہ گوئی سے۔ قصیدہ نگاری میں قصیدہ گوئی کا داخل ہے۔ یہ فن ریاض و عرفی ریزی کا ہے۔ اس محل میں شاعروں کی فنی کرب و قشوع سے گزرتا ہے، وہ اس کا بدلہ اودھا و وعدہ چاہتا ہے۔ درباری شاعر شاہزادہ جہاں علی و بخشش کی آئینہ مرآۃ نقاشی لکھتے تھے۔ اور کیوں نہ ہو حبیب کوہ پونہ میں اسے بھرے جلتے، شاعر شرفیوں

نہ ہر مغز کے کوہ پونہ چمکت از معروہیں گیسر

منام تیر باہر - انصیب از ہر کس گیسر

قصیدہ شاعری کی بڑی پر شکوہ مصنف ہے۔ قصیدہ لکھنے کی ابتدا عربی زبان میں ہوئی ہے۔ اس لفظ کے معنی مغزا اور گودا کے ہیں۔ قصیدہ واقعی مغز سخن ہے۔ اہل عرب زبان و بیان میں کسی کو کوہ پونہ نہیں لگاتے اور اپنے علاوہ دوسروں کو کوہ نکالی سمجھتے تھے۔ سب سب ہے کہ غریب ہجو کھلائے — ”عہد جاہلیت“ سے ہی عرب فاراد اسلام قصیدہ گو شہرت کی اونچی منبر لیں پر نظر پڑتے ہیں۔ مشہور ہے کہ مکہ کے بیٹے میں دور دور سے قصیدہ گو شعراء جمع ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ انہیں میں سے سات قصیدہ گو یوں کے مشہور قصیدے آج زمرے کو رکھلائے کبھی، اور بڑاں کر رہے گئے تھے جنہیں سلسلۃ الذہب اور سبۃ معلقہ کہا جاتا ہے۔ ان میں امرؤ القیس، زہیر، ثابتہ اور اشقی بہت ممتاز سمجھے گئے۔

جیسوں یعنی اہل ایران نے جب شاعری میں عرب کی تقلید شروع کی تو قصیدہ نگاری کو بھی اپنا ہا اور حقیقت یہ ہے کہ اسے ایک نئی شان و شوکت عطا کی یا یہاں تک کہ فارسی شاعری کے ہر دور میں قصیدہ نگاروں کی ایک روشن قطار نظر آتی ہے۔ جن میں بعض نام تو آج بھی پورے پورے جاتے ہیں۔ مثلاً: غنوی، ہستائی، منوچہری، افراسی، سوزنی، خاقانی، جہیز، قافانی و غیرہ۔

اردو شاعری میں بھی دیکھ کر اس وقت کی طرح قصیدہ گوئی فارسی سے داخل ہوئی۔ جس طرح اردو شاعری کے ابتدائی پائے میں سرزمین دکن میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اردو قصیدوں کے اولین نمونے بھی دکن کے ہی قلب شاہی، ملا شاہی، نظام شاہی اور علاؤ شاہی عہد کے شعراء ہوجائے گئے ہیں۔ مثلاً نقاشی، نوری، ابی الدین

• دکن کرد، بھلی، جلی آہ وہاں

سے تو بے حلقہ جملعت فخر و مسلک مروارید سے مراتب بلند ہوتے فوٹن کارل
نے بھی ٹری میٹر کاوی سے قصیدوں کے وہ شاہکار پیش کیے ، جن پر شعر و ادب
مبنی بھی نادر کیسے کم ہے ۔

مگر جب ہوا بگڑی ، بساط سلطنت اٹھی ، حکومتوں کو زوال ہوا ، بادشاہ
اسیر و غلام وطن ، دوسرا ذوالبد حال اور ملک غلام ہو گیا تو قصیدہ نگاری کا
احول بھی نہ رہا ۔ وہ فضا بھی ختم ہو گئی ، شعر گوئی کی ڈگر بیل گئی ۔ اب معاشیہ کو
ضرورت اصلاح کی تھی ، مصلحین پیدا ہوئے ، خداداد حالی و اضلح میر بھی سامنے آئے ۔
ہاں ، جن کا طبع نڈر نہ تھا ، جو اسے آتی جاتی جانتے تھے ۔ انہوں نے دن و در شب
کی بنا ہلی ، خوار و معلول سے لڑ گئی ۔ بزرگوں دن سے رجوع کیا اور اپنے جذبات
دروں کی بے تابی و شدت اور بندگی و اطاعت و عقیدت کا اظہار ٹری میٹر پر کرتے
تو دعائیہ انداز میں کیا ۔ گوشت گیر و زلفت بلند شعور اور بلند برادرین و دانش ور تھے
رہے ۔ یہ گنگنا کر دُور در بعد میں دینا سے شاعری سے تکلفات و تعلقات کو یکدم مٹا
کر دیالوگ ۔ نیز بے ہوش حالات میں قصیدہ گوئی کی ضرورت نہ رہی اور اس میدان
میں جبار باد بھیجن رہے وہ دیکھیں سب کچھ سال قبل کے تعلیم یافتہ و صحبت گزشتہ تھے ،
میں جھکتا ہوں بڑی حرکت غلط ہے ۔ اس درجہ بد یاغیے ہوئے حالات کی نشانی
۱۸۵۷ء کے دیر سے کی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر ایچ محمد نے جدید شاعری کی تحریک کا باقاعدہ
آغاز ۱۸۴۲ء سے بتایا ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ قصیدہ گوئی کا پورا جس آب و ہوا میں
پنپتا ہے ، وہ یقیناً بانی نہ رہی ، لیکن یہ کہنا کہ اب قصیدہ گوئی ختم ہے بالکل
غلط ۔ قصیدہ نگار آج بھی موجود ہیں ، اکثر شہرت کی ہوا میں اڑے اور بیشتر نچلے قول
گوشت گوئی میں پڑے ہیں ۔ شہرت بھی تو خدائی دین ہے ۔

آئیے ، اب میں سلسلہ تحقیق کے ایک ایسے قاصد ارکلام ، بلاغت نظام ، مگر
انگزام قصیدہ گو شاعر کا تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں ، جس کی ہر دانش
۱۸۶۳ء میں پھر بنارس میں ہوئی تھی ۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد اور جدید شاعری کی تحریک
(۱۸۸۳ء) سے گیارہ سال قبل ۔ قاریہ کے اندر کے بعد دعائیہ قدیم پوری طرح
ٹوٹنے پھرنے لگی تھیں ، ایک سیاسی انقلاب اچکھا تھا ۔ معاشیہ کی اٹھل چلن نماواں
تھی ۔ سبیت کی تباہی روز افزوں اور بڑا رنگی رونق ، انداز مکی تھی ۔ ایسے میں
مستند شہور کو نہ کرنے والے یہ شاعر تھے ۔ بنارس کے ایک وضع دار غلامان کے بانی نادر
فرید شاعر صدیقی تھے بناری ۔ برقی نقول ڈاکٹر لال شہرت —

”اپنے استاد مرزا محمد حسن خان بناری کے بعد غالب بنارس کے سب سے بڑے
عروضی شاعر تھے ۔ جنہوں نے نثر شاعری اور اس کے رموز و نمائندگی پر مہر کا نظام ہو
جایا تھا تعلیمات میں کیا ہے اور فن عروض و نظم بیان کی علامت روایات کو
اپنی شاعری میں بنایا ہے ۔۔۔۔ ان کی قادر الکلامی کا مظہر ان کے شان دار قصائد
ہیں ، جن میں ان کی دعائیہ طبع بڑے نادر شعر سے مزین نظر آتی ہے ۔
دیوانی فنی بہتر نہ کہ طبع ہے ۔ یہ سب پیش نظر اس وقت مردم کے عہد

چار قصیدے ہیں جن میں ایک ہر سری جائزہ مقصود ہے ۔
پہلا قصیدہ سائنس اشتراک ”در حمد باری تعالیٰ اعز و جل“ اس مطلع سے
شروع ہوتا ہے :

اے تعالیٰ اللہ جس کی ہر جگہ طبع رواں
جائیں ہر قسم فتنوں کے جہاں و کم و کمالات
دوسرا قصیدہ ہفتیہ کیا کسی اشار کا ہے اور پہلے شروع ہوتا ہے ۔
رواقی از درجہ ہیں ہے کون آج اسے باغبان
خند سے بھی ہے رابین دگر کا پتہ گر اں
تیسرا قصیدہ بھی ”در لغت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم“ اس اشار پر مشتمل ہے ۔
رباعی نظم سخن کی نوکٹ چکا ہے بہار
کہاں سے کہنے کا گھر چلنے کے کوئی آخر کار
اور چوتھا قصیدہ بھی ”در لغت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم“ ہے ۔ یہ قصیدہ علامہ
حمید کا کر دینے کے منہ پر زمانہ قصیدہ لایم کے پیش نظر اسی زمین میں رقم ہوا ہے اور
حق کے قصیدے کے ۱۲ اشعار کم ۱۳۰ اشعار پر مشتمل گونا گوں اوصاف نثری و فنی کا
حامل ہے :

کر کے امتحان چو کا شے اسٹپے بادل
زلف بنگلے سے چٹکتا ہے ابھن گنگا جمل
یہ صرف چار قصیدے ہیں ۔ ایک عمدہ اور حسین نعتیہ ۔ شاعر کے نزدیک نہ
کسی دنیاوی اعزاز اور کم ، بخشش و اعزاز اور صلہ و ستائش کی امید ہے نہ تمنا ۔ یہ محض
ہدایت و عقیدت کے پھول ہیں جو جزائے اخروی کی ہوا میں سکراتے ہیں ۔ اب
دیکھیے ان قصیدوں میں شاعر نے اپنی دعائیہ بامید و محض عقیدت کی فراوانی
کس قدرتِ حق سے پیش کی ہے ۔

فنی نے اپنے مہذب و متقی کی شان میں سائنس شاعر کا جو قصیدہ رقم کیا ہے ۔ اسی
زمین میں ظہیر قاری کی ایک قصیدہ ۱۸۵۷ء شاعر کا لڑے گزرا کہ جو ایک عمدہ عاجزہ
ملک حضرت الدین شاہ کی مدح میں لکھا گیا ہے ۔

اے فرشتہ دولت منظور ملک جاوہر اں
ہجوم سلطانی و ہجوم در سلطان نشان
یہ وہی ظہیر ہیں جن کے دیوان سے تحقیق مشہور ہے کہ ”دکھ بزدلو اگر
بیانی“ مگر اس قصیدہ میں انہوں نے بہت زور لگا یا تو ممدوح کے لیے اس قسم کے
مصرعے سامنے آئے ۔

ج : در سخا چوں حاجی در عدل چوں نو شیر و اں
ج : بر سر باج حلاوت چو صلہ با سائل
ج : حضرت رشاد راجہ افلاک زیدت سائل
ملاحظہ ہو حضرت فنی بناری کی طبع رواں ، ہوا زرخیز اور نادر کلام :

اسے تعالیٰ اللہ پہنچی کسی مگر طبع رواں
جا نہیں سکے فزشتوں کے جہاں وہم و گمان
لامکان میری اولوالعزمی کی جولا نگاہ ہے
نزیہ ام ترقی میں مرے تہہ آسمان
ہمت عالی یہ کہتی ہے اجازت ہو اگر
کوڑاؤں عرش کے تارے اگلی بے ندیاں

یہ آغاز، یہ آہنگ، یہ بلند بانگ دعوے الفت کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ مختصر
خطابہ قصیدہ اردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ صرف چند اشعار کا مجا سے نمونہ ملا خطہ
ہوں:

جامہ مستی میں معصیہ مرے پر ہم نشاط
ہر گلی میں میرے دامن کی ہے گلزار بہان

نخن اقرب کا گل گردن مری معدن ہے
جلوہ زار ستر آلاء ہے رویہ رواں

عقلت قصیدہ سے ہیں جو مہر مزاب زن
ہر نفس کے تارے نکلے صدمے کن دکاں

یہ خود اشکامی و خور شامی خدا آشنائی سے ہم آواز معلوم ہوتی ہے۔ معرفت کی صرف
چھینٹ چٹے پر شاعری ترشہ ہو جاتی ہے، چ جائیدہ شاعر وحدت الوجود کی پردہ
کشی پر آکاؤں نظر آئے۔ فرماتے ہیں:

اس کے دریا کا ہے تندرہ بحر ناپید انکار
گردہ ہے صوا کی اس کے گیتی شکر نشان
علقہ گرداب اس کا ہے محیط دور حلق
ہر رنگہ میں ہے اس کے گردش بہت آسمان
رنگ تیارہ روانی میں ہے اس کا ہر جاب
دکھن قلب فلک ہے اس کا ہر سنگ نشان

اور مقلع پڑھ کر دور معرفت باز ہوئے اور یہ مشہور شعر پر دہ ذہن پر پہ سنا
آجھڑا ہے:

دل میں آئینہ طبعی معصوم داشتہ اند
اچھڑا استاد ازل گفت ہماں می گویم

معرفت غنی کا مطلع ہے ۵

صورت آئینہ حیرانم بدشت معرفت
اچھڑا دیندہ بر دل میں اسے فنی گویم کہاں

اسی زمین میں فتنی کا طویل نعتیہ قصیدہ لکھنا شروع کیے کی بات ہے۔ مطلع ملا خطہ ہو:

روانی افروزمیں ہے کون آج اے باغبان
خلد سے بھی ہے رہا میں دہر کا پتہ گراں

یہ شان دار قصیدہ بے پناہ شعری معجزوں کا حامل ہے۔ نازہ کا رقصہ پہل اور
فدوت بلالماں استعاروں کی بہار دیکھ کر ہونٹوں کو اس قصیدہ کا مطالعہ فرمائیں۔ کوڑو
تقسیم سے مطلع ہوتی فنی کی اپنی روانی و جبجہی اور تسلسل و ہوشیاری میں مرقی و
نغیر سے اچھکیں ملاتی ہے۔

بہار نیشیب، مکالماتی گزیر، حکاکاتی جمال، تمہیل کی روانی، معجزوں کی
آفرینش، علوم و فنون کا وقت اور سب سے بڑھ کر ایسی بیاری زبان کا پس پڑھتے
جائیے، جو سنے جلیے۔ روزمرہ اور کھٹ کھٹ لفظ کی لائن اور صلیکے حسن جو لکھوں
سے منسوب ہیں۔ جناب فنی کی تاریسی ان کے دادا امین نظر کرتے ہیں۔ چند اشعار متفرق
ملاحظہ ہوں:

میں لہرے ٹھوکیوں سے ایسے فوٹھلان حسین
اٹھ نہیں سکتیں زمین پر ہاتھ رکھ کے ڈالیاں

دادہ انگو ر کا گھٹ ترنیا بن گب
ہے رہیں ہر گمش میں عروج آسمان

کلب سوس سے بچا ہے فزرا رنگیں ہر طرف
چادر مہتاب رکھے تہہ لنگر آسمان

بھر دیے گل کے قدر وہ ساقی کفاحم نے
نقد زرد دینے کو جس فنون کے کھولیں مضامین

مشرقی کی خاتم حسین میں ہے ہمیں سراج
فرق ہے پھر حاکم میں زہرہ کی جگہی زرفشان

گزیر کے نازک مقام سے بھی فتنی بڑی کامیابی سے گزرتے ہیں۔ قصیدہ کا
حسن مطلع یوں ہے:

اے خروشا اقبال وھل بادشاہ دو جہاں
چارو ہے مہرب آلاء اللہ کا سکڑ رواں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں رطب الانسان ہیں۔

اک اسباب میں فلک پر چاند دو کھلے ہوا
ایسے سلطان کو کہیں ہے صاحب تاج و ستان

نظیانہ ہے جس کے دن کا عصر مسئلہ
کو دیکر زور سے ہے جن کا مسئلہ طوفان زماں

آخر قصیدے میں مدح مانے دیئے ہے :

اپنی رحمت سے مدینہ میں اے پیغمبر سے تو
چہ بہت یہ صحت ہوا تیرا فتی نا توں
ہستانی پاک پر جا کر پڑھے وہ یہ سلام
العسلۃ والسلام اے بادشاہ دو جہاں
اور عسلۃ والسلام کے یہ دس شعر تو دیئے ہیں :

العسلۃ والسلام اے سید احمی لقب
العسلۃ والسلام اے گنج علم دو جہاں
العسلۃ والسلام اے شیع بزم اولیں
العسلۃ والسلام اے خاتم پیغمبران

فتی نے یہ دعائیہ اشعار ان کے عقائد معبود اور مشی کمال پر رسیدہ کے کچے ترجمان
ہیں :

فتی بنا کر کسی دلت کے بغیر اور عام ذہنی انقلاب کا سہرہ پر اس تھا۔ مصل
سخرواں چاندنی ہو چکی تھی، انھوں نے بکریں دلت کی تھیں نہ اب ہوتے جابھے
تھے۔ اس میں اس زلی علی کے باوجود فتی نے اس کو نا اُمید نہ کئے۔ دل میں مسرور
ولولہ اور مصلحتی تھا۔ ان کے دوسرے قصیدے کی غریب صورت تشبیہ طائر

ہو :

راہ میں غلطی نہ کی تو لٹ جاتی ہے بہار
کہاں سے لائے گا گن گن کے کوئی آسیر کار
ذہاجم بزم سخن میں ہے ایک قطرہ سے
کہ لک کے ہر سخن میں جو جابھیں ہم بھی بادہ خوار
حباب آئینہ بھرتے جہن سے حبابی ہاتھ
ہے بہتر اس سے کہ ہم چن لیں گل کے بدلے خار
بھراں سے کام لیں نشتر کاں تو قلع یر
کبھی تو لائے گا انھار زخم دامن دار
پتھر ڈکرائے بھر لیں گے ساعر و مینا
بھراں کا دور چلا دیں گے بزم میں اک بار
یہ مانا نشتر ہو گا شراب کبہ سا
مگ کچھ آنکھ میں آجائے گا ضرور غما
یہ سن کے طبع رسائے کہاں کہ ہوش میں آ
کہاں خیالی ہے تیرا نہ اپنی بہت دار
ابھی تو دردِ تیرے میں اس قدر ہے
جولے شمع میں اپنی بجڑ دوں اک بار
مہر دوسرا توں بھر کے بادہ بہر جائے
زینت بین بنے صحن حباب غما

وہ بادہ، بادہ تو حید ہے لقب میں کا

جو ایک جام پیے تا ابد رہے سحر شاد

بزم علم و معرفت کے اس امین کو عزت نفس نے طعن دیا ہو گلاب ہی تو وہ بادہ
خود شامی کا سہارا رکھا تھا

کہاں میں انوری و ذوق و عرفی و سوز

کہاں میں حضرت خاقانی قصیدہ نگار

ہماری بزم سخن میں بھی آئیں دم بکھر کر

ذرا وہ دیکھ لیں اس دور آئینہ کی عیار

دیکھئے حضرت فتی بناری نے شے ادب سے اپنے بزرگ پیش روؤں کو بھی
آواز دی ہے اور ایران کے ممتاز قصیدہ نگاروں کو بھی۔ عربی شیرازی کا قصیدہ
قصیدہ "ترجمہ اسون در تائید مولائے شفقیاں علی علیہ السلام" لفظی فتی کی نظم
سے گزر چکا تھا۔ فتی نے ذی زہی انجمن کی۔ ترجمہ اسون کا مطلع ہے :-

جہاں بگشتم دور واد ہر ہر شہر و دار

نیا ختم کر فرستد بخت در بازار

کیا زور ہے اور کیا ایمان، اے سمان اللہ !

فتی کو اپنی فن کارانہ عظمت کا احساس تھا مگر معتدل و متوازن، وہ کسی
پر فخر نہیں کرتے کسی کو گرجھ نہیں سمجھتے قصیدے کے یہ ابتدائی اشعار مسلسل پڑھنے
کے ہیں۔ سلاطین کیا خوب فرماتے ہیں :

یکایک آئی صداغیب سے یہ کافوں میں

ذرا بھی بی کے نہ مجزوب کی طرح بڑ مار

جوست بادہ و حدت ہے تو سنبھل کر چل

ہبک نہ جائے کہیں راہ ہے دشوار

چلے جوتن کے ذرا اس رہ حقیقت میں

مراؤ کرے گر کر کہ ہو گئے فی التار

سوائے عجز نہیں کوئی سر بلند یہاں

ٹھکانے خود ہی سب ناز و کھ اپنا وقار

گر بڑ کرے فعل سے راہ لگ اپنی

نہ بھول جائے کہیں نئے میں تجھے رفتار

سنا وہ مطلع برجستہ میں سے ثابت ہو

خدا ہی عزت و ذلت کا سب کی ہے مختار

اور اس مطلع ثانی میں جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

سائے گ مجھے کیا آسمان کج رفتار

نہیں ہے قبضہ قدرت میں میں کے کوئی کار

شاعر نے آسمان کج رفتار کی اپنی پُر کلفت مذمت کی ہے جسے پڑھ کر سو ادا کہ بجا ہے

انکال خدادی

لا فریاد آتی ہے چند شرمیں ہی مجھے۔ ۷۰

حلاکے دن کو بھی چلتا ہے شغل خورشید
یہ خطبہ کہ نہیں امتیازِ نعل و نہب
تمام مہم میں بڑھے کے پڑ گیا ہے نیل
جراہ ہے کس دنگلام کی بڑی ہے مار
جر ہوئے دانت تو بچے نہ نقشبائے نغم
یہ ٹونگ جانا انہیں مثل دانہ ڈائے انار

پھر مہم کی فغاںے دل کش لا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس کی حق کار از پتھر کاری کی دلیل ہے۔ ملاحظہ ہو :

زمین پر لوٹ گئے گہرے ہائے نورستہ
پڑی جو تھی مویج نسیم تند کی مار
وہ گدگدائے لگی آئے پھر نسیم سحر
وہ ٹھکڑا کے پستے پٹھہ ٹھکڑا
خوشی سے بھول گئے ایسے ضبط ہو نہ سکا
کھڑے ہیں دانت نکائے وہ موتیوں سے انا
چھپا یا بنزرد پٹے سے لاکھ پتوں نے
چھپا دشت بد گشت کے جرموں کا امحار
کھڑی ہے کھوے ہوئے کھڑکیں شہلا
کچھ اس طرح کہ کسی کی ہے طالب دیدار
جو پڑ گیا ہیں نے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے
کہا ہے آج ہے بولورستہ ابراہار

لاریب غمی کا یہ قصیدہ بہت آفرینی، مطلق فکر، شان و شکوہ اور قدس سے مزین طبعی کے ساتھ مہمانت و شجاعت کا پڑا اور دل کش نمونہ ہے۔

غمی کی طبیعت میں عزابت اور خلل پند ہی نہیں ہے۔ جسے اگر قصیدہ کا جزد سمجھا گیا ہے۔ ایسی عزابت جو زندہ بمانی اور زبان میں آجھاؤ پیدا کرے، ندرار کے بنا کرتی ہے۔ انصافاً دوسری بھی شکل پسندی، دور کار کا رنجشوں اور نا افسانہ الفاظ کے طمران سے ایک گھن کر گج کی صورت کیفیت پیدا کی جاتی رہی ہے۔ غمی نے اپنے قصیدوں میں ان باتوں سے پرہیز کیا ہے اور بیشتر اپنے طبعی ذوق کو ثابت کرنے کی عمل کو سرش کی ہے۔

حضرت غمی کا آخری اور شاہکار قصیدہ ایک سو تیس اشعار کا پیش نقشہ ہے شک یہ قصیدہ جس کا کو روئی کے قصیدے کے آگے نہیں جاتا، مگر ہم اسے کسی حال میں بہت پیچھے بھی نہیں دیکھتے غمی نے آدیا اپنے قصیدے میں اشعار کا تعداد قصیدہ غم سے بارہ کم کر رکھی ہے۔ علامہ غم کا کو روئی کا زبان زد مطلق یوں ہے جب مست کا شی سے چلا جائے مسترا بادل برق کے کاغذ سے پانی ہے صبا لگا گل

آج کا نئی دلی

غمی نے اس قصیدے میں خاص ہندوستانی ماحول پیش کیا ہے اور مضرب ہندی الفاظ، ہندوستانی رسوم بنار کا ذکر، ہندوئیس کا میلاد اور جھوا مکمل اور اسی نسبت کی کٹھنوں اصطلاحیں لائی ہیں۔

تو دیتے جاتے ہیں ٹنگا میں بنارس والے
نرم ازل کا سنچسپ ہے یہ جھوا مکمل
ایسی صحن و صیں دہی انشیب کے بعد وہ مدحت غیر المصلیٰ کی طرف
بڑی خوب صورت گزرتے فرماتے ہیں۔

اب سوچے کہ کاری سے بنارس اگر حضرت غمی نے اتنا عمدہ نقشہ پیش کیا ہے تو وہ حق کار جو بنارس کی کا زائیدہ و پروردہ ہوا ہے وسیع شاہد اور نور ہے نور قربات سے کیا کچھ کام نہ لے گا حضرت غمی کا قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے

کر کے انسان جنگا کی سے امضا ہے بادل
زلف شگروں سے چکتا ہے ابھی لنگا گل
قصیدے کی یہ شہرہ زمین بھی اردو میں ترقی ہی سے متاثر ہے۔ قرنی کے قصیدہ "دردمد حکیم ابراہیم" کا آغاز اس مطلع سے ہوا ہے

چہرہ پر دار جہاں دشت کشد جوں بجمل
شب خود خیم رخ و روز شود مستقبل
اس قصیدے کے ۸۹ اشعار غمی کی تخیل و تخیل کی پوری نمود ہے۔ خود کہتا ہے

داد یک شہر ز عسرتی ہستال کیں نمود
کبر و نازش نہ با ذار و قدرت و وصل

قصیدے کی یہ زمین اردو میں اس قدر پھولی کہ کعبہ میر سے عصر جدید تک اس میں خاطر خواہ طبع آزمائیاں ہوتی رہیں اور ایک سے ایک شان دار اور شاہکار قصیدے وجود میں آئے۔

خداے رحمن قریبی میر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت اسی زمین میں

۱۷۲ اشعار کی کھیں۔ مطلع ہے

جب سے خورشید ہوا ہے من ازل و ازل
تنگ گل جھکے ہے ہرات ہری کے اچھل
تیر کے ہم عمر مرزا رنگ ستارے بھی حضرت علی کی منقبت اسی زمین میں ۱۵۱ اشعار کی کھیں اور یہ اردو میں اربابِ نغمے خراجِ کھین لیتے رہے۔ مطلع بہت مشہور ہے

اٹھ گیا بہن دوسے پانچساں سے عمل
تجارتی اڑی لے گیا باغِ خواں مستاصل
حضرت غمی کی منقبت میں تیر شہو کاوی نے ۱۹۲ اشعار کا قصیدہ لکھا اور دہلی میں لکھنؤ کے مطلع ہے

بہر جو ہو جو شہنشاہ ازل
فاہدے کج ہے فتنہ ہندوئے ز وصل

اس زمین میں قصیدہ لکھنے سے قبل قریباً سب ہی نے قرنی کا قصیدہ دیکھا ہے اور اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ میر اس قصیدے میں ایک جگہ کہتے ہیں

میر ہے ہر مفضل جو بقول مستر فی
ہل کو دھڑکتے ہیں منزل جلا کر مشعل

اپریل ۱۹۵۳ء

تحریر کھنڈی نے بہار کی تہذیب میں محض ۲۹ اشعار بھی اسی زمین میں کہے اور اغلب ہے کہ حضرت غنیمت کاردی کا قصیدہ پڑھ کے رقم طراز ہوتے ہیں۔ مطلع دیکھیے:۔

اے صبا جا کے بنارس سے اڑا لیا بادل
چاہیے بندہ سوئے سون کے لیے رنگ گل
مید غلام حسین تہذیب نگاری نے نظامِ نصف جاہ و دن کا ایک بہار یہ قصیدہ
اسی زمین میں ۱۲۳۰ اشعار کا کھیا ہے اور جو بظاہر زور قلم زد کھایا ہے۔
مطلع ہے:۔

باغ پر آج گھاٹی پ اٹھا ہے بادل
خسرو باز بہاری کا کھچا دل بادل
غشی امیر معانی کھنڈی نے ذرا بکلی علی خاں دلا رام پر کی مدح میں
ایک سو اسی اشعار اسی مقبول زمین میں کہے اور اپنے رنگ سخن کے پھول کھلائے۔
مطلع ملاحظہ ہو:۔

عالم خواب میں بینا میں عجب باغ میں کل
شجر کو جس باغ کی کہیںے کوہل
حقیقت یہ ہے کہ تیرہ سوں یا ستودہ، تیرہ سوں یا ستودہ یا تیرہ سوں یا ستودہ
ہر ایک آسمانی سخن کا آفتاب و ماہتاب ہے۔ وسعتِ علم، قدرتِ فن، زبان و
بیان، فکر و خیال اور شہرِ صنعت گری میں سبھی ایک ہے۔ مگر علامہ
حق کا کوردی اور غشی غنیمت کی بنیادی ہے جو قصیدے کہنے وہ اپنی مناسبت موضوع
سے پاکیزگی و لطافت کا وہ معیار پیش کرتے ہیں، جہاں توحید و رسالت اور عشق و
معرفت کے بانی واقعی کا حق ادا ہو تا نظر آتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں بعد از
خدا بزرگ کوئی کہے کہ غنیمت حق اور زبان چپ ہو جاتی ہے۔ حق و غنی کے دل
جس باد صفا سے صاف اور وہ جس شرابِ امت سے مست تھے۔ اس کا آفتاب
تھا کہ اس قصیدہ نصیر میں ایسی پاکیزہ اور زورانی نغما قائم ہو جہاں فکر و نصیرت
کا ذریعہ ہو اور حیات و کائنات کا وہ جمال دل نشین بھی جس سے رومانی ملاوت
اور عشقِ جاں گزار کی لذت عرفانی کا حصول قائم ہے۔

یہاں دیکھیے غنیمت کے اس قصیدے کا کوئی نغماتی ملاحظہ منظور نہیں بلکہ اس کے
محاسن صوری و معنوی کا ذکر قطع ہے۔

ہر چند منشی مہاراج کی ابتدائی تعلیم بڑا ضابطہ نہ ہو سکتی مگر طبع موزوں
کی رہنمائی میں آخر تک ذاتی مطالعہ اور محنتِ اربابِ سخن سے کسبِ فیض کرتے
رہے۔ شعر گوئی قدرت سے ولایت کی تھی۔ مزاج کا تقویت پسندی نے اس پر
اور جلال کی، قصیدہ گوئی کے میدان کا مروجہ نسخہ کے جس مبلغ علم اور طبع و قلم کی شرط
ہے۔ وہ قدر قابل اور عارفانہ شہر وانی کو نصیب تھی اور کئی اور دوسری ذوق و
موجہ کو مگر کھلائے نہ پائی بھی ایک چیز ہے جو بغیر ان شرائط کے جو طرفدارِ نازی میں

آج کل کی دل

قافی کو بھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں قافی بنائی کا ماحول تھی۔
میں ذیل میں حضرت غنیمت کی اس نسبتِ قصیدے سے متفرق اشعار مثلاً دیتے
ہوئے عرض کروں گا کہ یہ خاص فیضانِ سخن، معلقانے قادر و راجح العاطف کریم ہے۔
جسے ہم مشن دریا میں سے قویہ کر کے یا فصاحت، بیان و لطافت زبان سے محسن کا قصیدہ
پڑھ چکے ہوں تو غنیمت کے ان اشعار سے نصف اندوز ہوں۔ دیکھیے کہ غنیمت کی کتنی
پروازیں ہیں، جو ابھی نظروں سے اوجھل ہیں۔

جو کئی ہے قدحِ ماہ کی صورت ایسی بیس کوسرہ کو سونے سے جیسے کھول
مستی آلودہ نظر آئے ہیں دھننِ بخیم چہرے تک عین گلابِ نیم زحل کا کابل
سرزمینِ گلزار اسی سب سے کہہ بہ تہذیبِ طراوت سے نور کا عمل جاری ہے:
جم گئے پلنت پہ ماہی کے ہم کاؤ در میں
دنیا کا سہ سر و شاخ آئی نکل
اور وہ شاخ کہ ہے جس کا تنگو نہ گشتی
اور وہ گشتی جو ہے مزرعِ اربابِ عمل
اور وہ مزرعِ اربابِ عمل ہے کہ جہاں
تخمِ ریزی جو کرے آج کو کھل پائے کل
کل بھی کہنے میں ہے اس جو شِ نوکی توہین
اس قدر بعد یہاں مٹا ہے ہر شے کا بدل
تخمِ ریزی کو اک ہاتھ سے کرتا جانے
دوسرے ہاتھ سے چٹا دھ جلا جائے پھل
یہ وہ گلشن ہے جسے فیضِ طراوت اس سے
آبِ حیاتِ خورشید میں پیدا ہو کر نکل

ملاحظہ فرمائیے اس کا بڑا نصف ہے اور قدرتِ خیال نمایاں جو سر۔ ملاحظہ ہو:

ابر پانی کے دیے جانا ہے جھیلے منہ پر
ہے مگر برقِ تپان سوزِ دروں سے بیکل
سائنس لینے کی جگہ بے شل شیدا کو نہیں
لے صبا ہے جو تجھے دعویٰ رفت رتو چل

مطلع ثانی میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و توصیف رقم ہوئی ہے۔
کیا اچھوتا آغاز ہے، ملاحظہ ہو:۔

نور احمد سے یہ فاقے نے خجدار دوازل
مہمِ محمود احمد میں جوملائے کوئی
شہسوارِ عالی جلوہ گرِ شہبِ ابراق
ہائے ہر فرد سے روشن ہوئی چشمِ بکا
ہر کابِ شہر دین کو خانہ نشین کو ہم
ایک تو کھجور ہے کہ ام وہ ہے سب فیض
تہترے نام مقدس کا میسر ہو بدل
شبِ اسرا جیٹے سوتے شہزادِ جل
ہو گیا دیدہ و شبابِ جہاں میں احوال
ساتھ فرزند کے ہوں جیسے براتی میدل

بار احسان سے ٹھکی گردن پرشانی
غنی نے بھی نجات سے قبل ۱۳ اشعار کی ایک نزل بادل کی تدفین میں لکھی ہے۔
ہاں! قافیہ جناب حق کے قافیہ سے الگ رکھا ہے۔
منہاجات و دعا کا خلاصہ گویا اشعار ہیں:

شیخ دل نے توبہ سے بھرے ایسا
لوگ بھیجے یہ پھر تپا ہے نفل میں بوسل
میں تجھے عالم مستی میں پکاروں رہا
تو کیجے پیار سے کیا کہتا ہے کہ بھی پاگل
میں مجھ کو جلد دیدار و محاذ سے جھکو
تو کیجے دیکھ لے گی بھرے جود ہے بیکل
دم نکل جائے مراد کچھ کے جلوہ تیرا
یوں مرا حاتمہ یا خیر جو یارب ازل
باپ ماں، اول و عیال اور فتنے کے غبار
تیری رحمت سے رہیں دستِ دلہا پر لپ

غنی کے قصائد میں جذباتی صادق کاغذیں اور عشق ممدوح کا کیف و کم ہے۔
ذبان کی سادگی و شیرینی اور بیان کا زور قصیدے کی شان و دلالت ہے۔ ہر
چند کہ زبان میں وہ تلفظ، تصنع اور طرائق نہیں ہے، ہر قصیدے کی روایت
سمجھی گئی ہے، مگر بعض فن نے زبان و بیان کو ناز کی و شگفتگی کے ساتھ وہ انکام
بخشا ہے جس کے بغیر قصیدہ کا تصور ممکن نہیں۔

غنی فرسے ذباں داں میں اداس کے مزاج ہرشتا، وہ بڑی خوب صورت
اور نادر ترکیبیں مین کرتے ہیں، جن سے مفهوم و معانی کی پوشیدہ وضاحت ہوتی ہے۔
مثلاً گیتی شوق نشان، روکش قلب فلک، قیامی نوبت سیرتہ، دختر جمود عالم
نمناک، آبیہ شمع خورشید و فیروز اور شاعری اپنے اس حسن فکر پر ہر شاہی نادر کے
کم ہے۔

غنی غنی، نازی کمال و وفات بھی دی ہے جو علامہ اقبال کا ہے۔ گویا ایک
ہی سال اردو کے چاند سورج دونوں غروب ہوئے۔ غنی کی گمنامی کا سبب ان کی
کم آہنگی، عزلت گزینی، تصوف پسندی، دنیا سے کنارہ کشی اور شہرت سے گریز تھا۔
خونابہ زخمِ غمِ غامض گشت ورنہ عاشقان
تاہر جگر گشت وگریاں رفو گشت

مبارکباد

۱۳ جنوری ۱۹۸۳ء

کل ہی آگت کا خصوصی شمارہ (جیل نظریہ نیر) موصول ہوا۔ شخصیت اور شعری
کے سلسلے کے تمام مضامین اپنے اپنے انداز میں جیل نظریہ کی گونا گوں لیکن سادہ و
پُرک فکر کی اساس کا احاطہ کرتے ہیں۔ مالک رام، رضا نظری، دودا کلاس
خفقہ، نظرم رام، دوپا اشرفی، عبدالغنی، احمد بخاؤ، محمد حسن، ابو ذر عثمانی،
طلحہ یونی بوق، اعجاز علی ارشد، غلام رفیع، شکیب ایاز، ثریا جمال نظری
ممتاز احمد، منظر حسن مندوی اور دوسرے نگاروں کے اس شخصیت اور شاعر سے متعلق بیاد
اور خلوص اور عقیدت سمجھ ہے اور ساتھ ساتھ ایمان داری کا کھرا بھی —
جہاں کلام کے محسوس کاغذ ہے وہیں شخصی اور شاعر کی تعادات اور دوسری فتنی
کو تاہوں کی طرف اشارہ بھی ملے ہیں۔ جیل کی نظریات شاعری پر بعض شعری دوا
کا معنیوں کے بدل چپ ہے اور یہ ذہن و ہوش انجام دے سکے تھے۔ آخر
میں کلام کے انتخاب سے اس شمارے کی دل فنی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس
پیش کش کے لیے مبارکباد۔

۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء کا قاف ہے کہ اختر اور مری مرحوم نے (ذباں
پہ بار خدایا یک نام آؤ) مجھے پڑھو یونیویسٹی کے ایک مشاعرے میں شرکت
کی دعوت دی تھی۔ مشاعرے کے دوسرے دن حیدر باغ میں واقع اپنے
دولت کے رہائے ہوئے ایک دینی اجتماع کا اہتمام کیا۔ اجتماع کے
خاتمے پر صدر مجلس سے گزرا میں نے گوی کہ میں بھی چند کلام سے سامعین کو نواؤں۔
تعلیل حکم کے طور پر انہوں نے اپنے بے حد مختصر صدارتی خطبے کا یوں آغاز کیا۔

۴ میراں بچہ شاد میں کہ زملے کے قدر دار
شاعر سے چاہے ہیں امامت نماذ کی
صدر مجلس تھے جیل نظری —

شاہین، کنید!

شرح چندہ

ہندوستان پاکستان دیگرمالک

سالانہ ۱۰ روپے ۱۶ روپے ۳ ڈالر ۱۵۰ پونڈ
دوسرا ۱۸ روپے ۲۸ روپے ۵ ڈالر ۲۰۰ پونڈ
سرا ۲۵ روپے ۳۸ روپے ۵۰ ڈالر ۳۰۰ پونڈ
نی کا پی ایک روپیہ ۱/۵۰ روپیہ ۳۰ سینٹ ۱۵ پی

بقیہ: مکتوبات

کے معاملے سے چکیت کی ذاتی اور شخصی زندگی کے حالات و کوائف اور بہت
سے راز و نیاز سے سربستہ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ فقہاء ابنِ فیضی کی بیاد
بھی بہت خوب ہیں۔

گھانا، زامبیا، لہر، رام رائے



نہنی مہنی نظمیں — جاپان کی ہائیکو شاعری

جاتا۔

ہمارے ہاں، بلکہ ہر زبان کی شاعری، اکثر عشقیہ موضوعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف ہائیکو زیادہ تر موسموں یا قدرت کے نظاروں اور عجوبوں کے بارے میں ہوتی ہے۔ اس میں پہاڑوں، مندروں، دیوتوں، برف، چاند، موسم بہار، پھول، پرندے، میوہ، وغیرہ الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے۔

ہائیکو کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ کچھ طور پر واضح نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی تصویر کے دو یا تین حصے پاس پاس رکھ دیے گئے ہیں اور پڑھنے والے پر لازم ہے کہ عرواں کو جوڑ کر تصویر کو مکمل کرے۔ الفاظ کے استعمال میں ایسی قسم کی کفایت شاعری ملحوظ ہوتی ہے جو کئی گرام بھیجے برقی جاتی ہے جس کے ہر لفظ کی قیمت ادا کر کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ بے ہائیکو میں خیالات اور تصورات کے تکرار یا اضافہ Association

of Ideas سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہائیکو کے متاخرین کا عقیدہ تھا کہ ہر انسان کو موسموں کی تبدیلی کا تجربہ اور سادہ ہونا ہے، اس لیے موسم یا موسم کے کسی سہل سے

فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ہائیکو میں موسم یا اس کی کسی خاص کیفیت سے متعلق ایک کھدی لفظ ہوتا ہے۔ یہ پہلی بار عمل نہیں بلکہ اس کے حل تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہوتا ہے۔ پڑھنے والا اپنے تجزیوں، مشاہدوں اور ادا دہوں کے کلب متغیر میں اس کا مفہوم اندازہ کرتا ہے۔ اس خصوصیت یعنی موسموں کے حوالوں کی وجہ سے کئی غیر جاپانی مصنفوں نے یہ رائے کاہر کیا ہے کہ ہائیکو شاعری کا مضمون انسانی معاملات اور جذبات نہیں بلکہ تجربہ ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے جیسے کبھی قدرت کے مناظر اور موسموں کا انسانی جذبات کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ہینڈرسن کا عقیدہ ہے کہ ہائیکو انسان کی خلوت اور جذبات سے زیادہ دیس کے بیرونی معاملات سے کم تعلق رکھتی ہے۔

جاپان کے نام کے ساتھ ساتھ ہی ہمارے ذہن میں فریب و رقص، نزاکت اور نغمی رنگ و زین کا تصور ابھر رہا ہے۔ جہاں ہم جاپانوں کے دوسرے کارناموں سے کافی تنگ واقف نگاہ رکھ رہے ہیں، وہاں شاعری میں ان کے حلیہ کا اعتراف اور تعجب و شگفتگی کم ہے کہ اردو میں شاید نہیں ہوئی ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح جاپانی زبان میں بھی ہر قسم کی شاعری کا انفرسارہ موجود ہے جس میں ہائیکو شاعری خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اس قسم کی شاعری کی تخلیق زمانہ قدیم سے جاری ہے، لیکن سترھویں صدی سے اس نے اپنا منفرد مقام پیدا کر لیا ہے۔ شاعری کی اس قسم کو ہائیکو کہہ جاتا ہے۔ ہائیکو میں سترہ صوتی اوزان (SYLLABLES) ہوتے ہیں، جو کم و بیش چھوٹے چھوٹے الفاظ بنتے ہیں۔ نظم میں معربوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے پہلے اندیس سے مصرعے میں پانچ یا چار اور اوردھڑا یا دیرپائی مصرعے میں سات اوزان ہوتے ہیں۔

ہائیکو شاعری جاپان میں بہت مقبول ہے، لیکن اس کی تخلیق اتنی عام نہیں کیوں کہ یہ روایتی شاعری سے زیادہ مشکل مانی جاتی ہے۔ پھر بھی ایک ڈھڑا کے مطابق وہاں ہر سال میں تقریباً پچاس ہزار ہائیکو نظمیں لکھی جاتی ہیں اور کئی رسالے صرف ہائیکو نظمیں ہی شائع کرتے ہیں۔ عام شخص ان کو مکمل نظم نہیں سمجھتا۔ ویسے تو شاعری بنات خود استادوں، حکماء اور شہنشاہات سے عبارت ہوتی ہے۔ جو بات تشریح تفصیل سے کہی جاتی ہے، وہی شعروں میں نہایت اختصار کے ساتھ ادا ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ہائیکو ایک رہا می یا غزل کے شعر کے معانی بھی جاسکتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ غزل کی حاکمیت ہے۔ رہا می یا غزل کے شعر کی طرح ہائیکو بھی جگہ مکمل اور پُر معنی ہوتی ہے۔ اس کو کوئی عنوان نہیں دیا

اس میں ایک ہائپر میس کر تھوں۔ اس کی تشریح اہدیس کی جلتی۔ پہلے دیکھیے
نظم آپ پر کیا تاثر چھوڑتی ہے؟
وہ تینوں خاموش تھے

میزبان، همان
اور سفید گل داؤدی

وہ تینوں خاموش تھے
میزبان، همان
اور سفید گل داؤدی

عزیز ہے کہ سفید گل داؤدی ندرت کا ایک شاہکار ہے، ایک کٹر ہے۔
اپنے کرتے کے سائے میزبان اور همان دونوں دنگ ہیں۔ وہ اپنی زبان کیسے
کھول سکے ہیں۔ جہاں تک شاعر کا تعلق ہے اس کو کہنے کے لیے اور وہ کیا گیا ہے؟
اس لیے ممکن سکوت، نظم خاموشی سے ممکن ہو جاتی ہے۔ انگریزی کے مشہور ادیب
آلڈس ہکسلی (Aldous Huxley) اپنے مضمون The Rest
is Silence میں جو شکستہ کڑے کے دربار Huxley کے آخری الفاظ تھے۔
واقعہ کیسے کہ انہا خیال کے سب سے پہلے ان کا خیال ضرورت ہوتی ہے۔ جب کسی
خیال یا جذبے کو غفلتوں کی صورت میں مدد فراہم کیا جائے تو موسیقی ضرورت پڑتی
ہے اور سب موسیقی بھی باکام ہونے لگے تو یہ خاموشی کا سہارا لینا پڑے گا کہ
ہمیشہ ہمیشہ اور ہر عکاسی سب خاموشی ہے۔

Musio at Night by Aldous Huxley

جاپانی زبان میں ایک لفظ ہے: HARGSI یا انہا خیال کے مقرر ترین
دیکھنے کے استعار کیا جاتا ہے جو خاموشی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کے
لئے اپنی بات کسی دوسرے تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ خاموشی ہے۔ ہم میں سے
اکثر لوگوں کا تجربہ بھی ایسا ہی ہے۔ عاشق و معشوق غفلتوں میں خاموشی میں ایک
دوسرے کے پاس بیٹھے رہتے ہیں اور ہر وقت کی تیر و نفا کی شکایت کرتے
ہیں۔ بولوں انہاں:

ایسا سکوت جن پر قدر میر بھی مدام
اب چند اور ہائیکو ملاحظہ ہوں:

بالآخر برف اور پانی کے باہمی اختلافات ختم ہو گئے

اب دونوں اکٹھے ہو کر

بوند بوند ٹپک رہے ہیں

(سے شمی شیش)

اس نظم میں وہ عنصر پیش کیا گیا ہے جب کہ موسم بہار میں موسم سرما کی ہوائی
برف کی تہیں چھلکتا شروع ہوتی ہیں۔ برف اور پانی اصل میں دونوں ایک
ہی ہیں۔ پانی جب موسم گرم جاتا ہے تو برف ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ اختلاف برف
کے پچھلے پر ختم ہو جاتا ہے اور دونوں ہوند ہوند ہو جاتے ہیں۔

اپنی نازک باتیں پہلے لاکر

ایک گلابی پھول.....

آنا پڑا!

میری محبوبہ نے کہا

ایسا لگتا ہے کہ یہ نظم ممکن نہیں اور اس کا مفہوم بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اکثر
پڑھنے والے شعر میں اس کی نظر پڑ کر دھوکھا کھاتے ہیں۔

مزید وضاحت سے پہلے کہ میں سفر بیان کرنا مناسب ہوگا۔ جاپان میں بڑھ
مت کی ایک قسم رائج ہے اس کو زین (ZEN) کہتے ہیں۔ دوسری جنگ
عظیم کے بعد زین کے بارے میں امریکا میں اور دوسرے ملکوں میں بھی کافی مطالعہ
کیا گیا ہے اور اس فتنے کو بخوبی سمجھا جانے لگتا ہے۔ چینی مدی میسوی میں بڑھ
مت ہندوستان سے چین اور وہاں سے جاپان پہنچا۔ چین سے گزرتے ہوئے
وہاں کے فتنے سے بھی متاثر ہوا۔ اور وہاں کے کچھ اور مذہب کے کئی پہلوؤں کو اپنے
میں سمیٹ لیا۔ لفظ "زین" سنسکرت لفظ "دھیان" کی بڑی چوٹی شکل ہے۔ زین کوئی
مذہب نہیں بلکہ ایک سلسلہ ایک طریقہ زندگی ہے۔ مزید تفصیل میں نہ جاتے ہوئے
یہاں آنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ "زین" نے جاپان کی مذہبوں کو رنگ اور جانوں کے
درواز کو بہت متاثر کیا ہے۔ ان کے فنون لطیفہ بھی اس کے اثر سے بچ نہیں پائے۔
زین سادگی، راستی، استقامت اور شہرت پرستی ہے۔ وہ بھی سے زیادہ ان کی
بات کا استعمال کرتا ہے۔ یعنی وہ بات دوسرے فرائے میں جبر کا ذکر نہ سمجھا
بیاد کی اہمیت رکھتی ہے۔

"زین" بہترین قوج اور تصدیق کو اہمیت دیتا ہے۔ زین آرٹ،
اہلکار، گہرائی، بہت کاتھری، اور ذرائع ابلاغ میں کفایت شعاری کا مظہر ہوتا ہے۔
مصوری اور فن کی پر زین کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک فرسائی نام کو
درخت کی شاخ پر ٹھہرنا ہوا ہندو زین چینگ میں کیسے دکھا یا جائے گا۔ ایک
گیر شاخ کے لیے ایک پتے کے لیے چند پرندے کے لیے اور کیسوں کی سفیدی
بجائے خود برف کے لیے ہی برش کی جسد گیری اور تصویر تیار ہے۔

معموری کے فن کی طرح ہائیکو شعری بھی "زین" سے متاثر ہوئی
ہے۔ اس میں بھی اسٹائے، کنائے، تشبیہات ملیں گے۔ اب وہ نظم
دو بارہ ملاحظہ فرمائیں۔ جس سے ابتداء میں بھی:

The New World of Philosophy by

Abraham Kaplan

(ایلیا) 1988

اپریل ۱۹۸۳ء

اس نظم میں انا کی ایک اسی معلوم ادائیگی جھٹکتی ہے جس پر شہزادہ سلیم خدا ہوا تھا۔ ولایت کے مطابق سلیم انا کی کے ہاتھ میں دو کبوتر تھا کہ کبوتری در کے لیے کھلی رکھی تھا۔ واپس آنے پر اس کو صرف ایک ہی کبوتر ملا۔ سلیم نے انا کی سے پوچھا کہ دوسرا کبوتر کیا ہوا، تو اس نے جواب دیا۔ "صاحبِ عالم! وہ تو اڑ گیا۔" کیسے؟ "سلیم فرمایا۔"

انارکی نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑنے ہوئے جواب دیا: "اے!"

شام کے چھٹے میں
چمکا خدا برکتے ہیں
اسے حسینہ
تو مجھے ایسے گھوڑی ہے؟

اس نظم میں شاعر نے خود اپنا مذاق اڑایا ہے وہ بھی کین کے ساتھ شام کو گھر سے نکلتا ہے۔ ایک لڑکی اسے یوں گھوڑ گھوڑ کر دیکھتی ہے جیسے وہ چمکا ڈھ ہو کہیں کہ چمکا ڈھ اندھیرے میں نکلتے ہیں۔

کس مفرور بانی - لوتے بائل کو
جرات نہ ہوتی

کہ وہ ان کھنگھلاتے ہوئے نازک چھوڑوں
پر برس سکے

(بوسوں BOSHON)

بارش سے ان چھوڑوں کی پٹھریاں گر کر نلک میں مل جاتی ہیں اس لیے باؤل بھی یہ فکرم کرنے سے بچتا ہے۔

تالاب میں خواہرہ چاند
اور سائت آسمان

دونوں چور چور
کم محبت مینڈک!

(بوسوں)

چاند رات میں تالاب میں ایک مینڈک مڑا تباہ اور بچھڑک کر باہر نکل آتا ہے۔ اس حرکت سے تالاب میں چاند کا عکس وہ آسمان کا سائت پن دونوں ٹوٹ جاتے ہیں۔

پتھر روٹ محاذ ہیں

یک استالوں پر

رنگین صورت کتابوں کے

— اور ہوا متنتس!

(کیٹو Kito)

ذرا دیکھیے کئی کئی ہوا کی وجہ سے دوکانوں میں رکھی ہوئی کتابوں کے ورق اٹکتے جاتے ہیں۔ کچھ کتابوں میں عربی رسم کی تصویریں ہیں۔ کیوں کہ ہوا یہ تصویریں دیکھنا چاہتی ہے، اس لیے کتابوں کے ورق اٹکتے کی کوشش کر رہی ہے۔ دوکان دار نے کتابوں کو ہوا سے بچانے کے لیے ان پر کاغذیاب "پیپر وٹ" رکھ دیے ہیں۔

بادِ لطیف کے شوقِ نظارہ کا یہ ایچ "نکبت بادِ ہبہاری" کی
اشعلیوں کے قصور سے بھی کچھ آگے ہے۔

اب چند تغلیں بغیر تمبر کے چسپ ہیں؛

غرض اُمید اے سخی چڑیا!

اپنے سبز آلود پاؤں سے

تم میرے صحن میں کیا لکھ رہی ہو؟ (شکی SHIRI)

ایک باغِ عورت

کس صبر سے

نفقہ منی بکاؤ گڑبازوں کو

چھوڑ رہی ہے!

(راٹسٹو RANSETSU)

ہاتھوں کے بل کھڑا ہو کر

نواب زادہ مینڈک

شعر سنا رہا ہے

(سوکن SOKAN)

اب زمین پر انگری

رقص کے بعد

سفرِ روضہ

پتنگ کی روح پر وار گزرتی! (کیو بونٹ KYOBONTA)

جاپانی ہائیکو کی یہ مثالیں انگریزی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ (اس مضمون میں شامل زیادہ تر تغلیں Peter Bellenson کی کتاب:

The Four Seasons سے لی گئی ہیں) اور اس طرح ترجمہ کی خرابی

بے محبت ممکن نہ تھا۔ اس سے اصل کی خوب صورتی اور رعنائی یقیناً کافی حد تک

متاثر ہوئی ہوگی۔ اطالوی زبان میں ایک کہاوت ہے کہ ترجمہ خدا کا ہوتا ہے۔

کیوں کہ وہ اصل کا روپ ناظرین تک پہنچانے کے بجائے اسے سمجھ کر دیتا ہے۔ اس

طرح ان مثالوں میں دوسری قدرتی کا ارتکاب ہوا ہے پھر بھی اسید کی جاتی

ہے کہ اصل کی نزاکت خیال اور نکتہ آفرینی کی کچھ عیبک ابھرتی ہوگی۔

تشریحاً، وضاحت اور تجربے کے بغیر اکثر ناظرین ان نظموں کو ناممکن اور بے معنی سمجھتے ہیں اور سب سے پہلے یہ کہ "نظموں کے زمرے میں شامل کرتے۔ یہ نظموں دراصل کارٹون کی طرح ہیں۔ اچھے کارٹونوں میں بہت کم کلمہ جاتا ہے بلکہ اکثر کچھ بھی نہیں لکھا جاتا۔ مثلاً ایک نہایت ہی کامیاب کارٹون میں ایک شخص کھبا اٹھا کہ اسے نصیب کرنے جا رہا ہے۔ ایک گھنٹہ بہت ہی خوش اور مسرور آواز میں اس کے پیچھے چل رہا ہے۔ کارٹون کے نیچے کچھ نہیں لکھا جاتا ہے۔ اب آپ جانے ہیں کہ کچھ کا نصب ہونا کتوں کے لیے ایک حاجت پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ اگر کارٹون آپ کو کچھ ایسا تو خوب "ورڈ کوئی" آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے ؟

ہائیکو کا اثر یورپ اور امریکہ سے خیزل کیا ہے۔ سب سے پہلے فرانس میں ۱۹-۵۰ء میں ہائیکو کی تقلید شروع ہوئی۔ انگریزی شاعری میں جوائنزم تحریک IMAGISM MOVEMENT منڈلینڈ (Bare Pound) نے ۱۹۱۲ء میں شروع کیا اس نے ہائیکو سے فیضان پایا خود پونڈ نے اپنی مشہور اور مختصر نظم IN A STATION OF THE METRO کے بارے میں اس اثر اور فیضان کا اقرار کیا ہے۔ یہ نظم ۱۹۱۲ء میں سبب سمی گئی تھی تو ۳۰ سطور پر مشتمل تھی ۶ جیسے جیسے اس کو مختصر کر کے نفع کر دیا گیا۔ ایک سال بعد اسے مزید مختصر کیا اور وہ دوسری بقول پونڈ "ہائیکو کی طرح" نظم بن گئی۔ وہ نظموں ہے : ۵

The apparition of these faces in a crowd
petals of a wet black bough

ایجویم تحریک کے دوسرے ارکان فلچر (FLETCHER) ایچی لوڈل (AMY LOWELL) فلینٹ (FLINT) اور دوسرے غیر اجمیٹ مہر میے فراسٹ (FROST) آئکن (AIKEN) اٹکین (ATKINSON) (STEVENS) پیٹن (YEATS) میک لیش (MACLEISH) اور ڈی ایچ لارنس ہائیکو سے متاثر ہوئے

مغربی ادیب انسان خدا سے ملنے میں متفق تھے کہ اختصار، واضح، بھری DEFINITE IMAGERY اور علامہ رائے زنی سے گریز ہائیکو کے صوب سے زیادہ اہم تھے ہیں۔ ہائیکو نے ایک ایسے رنگ و روغ دیاجس میں قدرتی اجزائی اور مہمیک تکنیک انہماں خیل کے اہم ذرائع کے طور پر استعمال کیے گئے۔

• The Japanese Tradition in British and American Literature - By Earl Miner

IMAGISM BY STANLEY K. COPPMAN JR

نظم کی نئی دہلی

ہائیکو کا بانی اور سب سے بڑا استاد ویاٹو (BASHO) (۱۶۴۳-۱۶۹۴) مانا جاتا ہے۔ اس کی شاعری میں ماٹھاڑ اور صوفیانہ مضامین کی بھرمار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہائیکو کا نیکیتسٹ جی بی دسٹرس اور اس کے اعلیٰ معیار کی بنا پر ہی اسے ایک زین (ZEN) کہتے ہیں انہماں خیل کا نام ہائیکو کی بہت - عموماً اس معاملے میں زین گرد نہایت بے لوثی کا پرانا ذکر کرتے ہیں۔ ہائیکو کے حوالہ دینے والے شاعر کا نام نامی طور پر قابل ذکر ہے۔ انہماں خیل میں ہیکو کی ہیکو (BOSON) کا بول بالا تھا اسے فلمی حقائق اور فحاشی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اسی کا ہم عصر (ایسا ISSA) جذباتی، طنزیہ اور حد درجہ انفرادیت پسند تھا۔ چونکہ شاعر شمشلی (SHIRI) اس نے میوہیں ہدی کے احوال میں وفات پائی، اس نے روائتوں سے لہذا تو کی اور ایک ہی ذکر کی بنا پر دھکی روزمرہ کے نظموں اور واقعات کو برا اثر ملا میں بیان کو اس کی خصوصیت مانی جاتی ہے۔ ان اساتذہ کے علاوہ ہائیکوس میں اور بھی بہت شاعر ہوئے، لیکن یہاں سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں۔

اتاناکا کا ہائیکو کا ہائیکو نظموں کے حصے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ دوسرے ادیبوں میں بھی کچھ ہے۔ خود ہائیکو کے آخری استاد جس کا ذکر بھی ابھی ہوا ہے، شمشلی نے ہائیکو کے شاعروں کو دوسری زبانوں کے ادیب اور فنون لطیفہ کا مطالعہ کرنے کی تلقین کی تھی۔

ہماری تاریخ آزادی کی شعری دستاویز

مشعل آزادی

ساز نظامی

قیمت : ۳۰ روپے

میلے کا پتہ :

بزنس مینر

پبلیکیشنز ڈوژین، پٹیاں ۱۰، نئی دہلی

بہ شہلاشاہ

غزل

30-10-54

30-10-50

الحمد لله الذي جعلنا من هذه الدنيا داراً لعبادته
 فاجتهدوا في طاعته وابتعدوا عن معصيته
 فان الله يحب المتقين
 والذين آمنوا وهاجروا ما كان لهم
 من قبل من ديارهم وما كان لهم
 من قبل من قومهم فليعلموا ان الله
 قد غفر لهم ذنوبهم ولهم اجر
 كبير
 والذين آمنوا وهاجروا ما كان لهم
 من قبل من ديارهم وما كان لهم
 من قبل من قومهم فليعلموا ان الله
 قد غفر لهم ذنوبهم ولهم اجر
 كبير
 والذين آمنوا وهاجروا ما كان لهم
 من قبل من ديارهم وما كان لهم
 من قبل من قومهم فليعلموا ان الله
 قد غفر لهم ذنوبهم ولهم اجر
 كبير

ہرانی بیاض سے ایک ورق — (بنا کر ختم منی)

حرف و کتب و تصویق و تصدیق

پچھلے برس
مئی
آخری نظم



قریہ جاں
مئی
ایک نظم

رات بھر زنجیر کھولوں
اک نئی زنجیر پہنوں
اپنی ان بے خواب آنکھوں میں
سنہرے خواب ہیں کر
چند اک سیاب پائے درد کے کر
رنگ کی طرح بھینچوں
اودان فوں کی گڑبوں میں
سجرا پئے خواب باندھوں
اب مری سوچوں میں گر ہیں
اب مری سانسیں وہاں
اب مری دھوپوں میں گر ہیں
اب مرے سانسے بھی جاں
اب مرے اطراف گڑبوں کا ظلم
شہد کی سکھئی کے چھتے کی طرح جبکہ امرا گڑبوں میں جم
(اب جو ان گڑبوں کو کھولوں اک مددی پر پسیں جاویں)
صبح دم بستر پہ تنگ کر چد گر تاہوں
نواب یہ سوچتا ہوں
رات بھر زنجیر کاٹوں لاٹا جاذوں مگر
کیوں نئی زنجیر پہنوں
کیوں کوئی زنجیر پہنوں

بہر ریڈو کے کنارے میں کھڑا سوچتا ہوں
وہی سرسبز گھنے پتھر ہیں سورج ہے وہی
دھوپ میں ساری تمازت ہے جواں جوں کی
چشم داہرو ہیں وہی جن کی سج دھج ہے وہی

گھر سے نکلا تو کئی بار خنسیاں آیا ہوتا
جسوتے تو پریشان نظری بھی ہوگی
ہر کھل آنکھ میں رسوائیاں منڈلاتی ہیں
باعث درد بردی دیدہ وری بھی ہوگی

یہ مگر کون سی مسئلہ ہے سفر میں اب کے
پہلے آتا تو نہ سخت دل میں غلا کا احساس
دن گزرتا ہے کچھ اور اندھیکر دے کر
وہل گئی رات تو پھر سہیل بلا کا احساس

اجنبی شہر میں شیشے کے گھروں سے باہر
جھرمٹوں میں کوئی اپنا ہے گناں تک مشکل
درد بے خواب کسی آنکھوں کا پرانا محسوس
یوں ہے داماندہ کہ اب آہ و فغان تک مشکل

لے
Rideau Canal کنیڈا کے دارالسلطنت آٹوا کی شہر میں

● ۶۳۲۱ - فرچون ڈرائیو - اورینٹس - اڈٹارو - کیلیڈا

کے دن سی ٹو اسے فور

۱۹۸۳ء



ستینہند جاوا



بات بنے گی	بہاگے گی	ہم ہی تو ہیں	ڈبل روٹی
کسم رنگ	پانی کی اک موہ	بھر تاس	جو چڑیا کو بھینکی
ہوئے کائنات میں کہیں	ریت گھردنو	اڑنا سا بادل	لے گیا کوا
رات چمکے ہو	پانی کی دھار	نیرا آچل	ہاں کھینچوں
ڈھکا آٹسو	گوری کے گلے پر	یہ راستا تو	مطہیں ہوں پر
بادل کی آنکھ سے	ڈوبتی دنیا	دور تک جاتا ہے	مجھے جیتا ہے
بہا گیا موتی	آبائو نان	ہمیں کھڑے ہیں	ہوئیں دیکھیں
ڑکی ہے بازو	چمکول یہ بھرتے	توڑے طہرے	کھڑکی پر آکے
اندردریا کی	اٹھنے پڑ	آدھے ادھر سے لگ	دوسرا سمت
پلکیں بند	تنبانی کی	کلا کار ہیں	دل کا دھواں
ساگر پاس	کوئی اور درو ہے ؟	چلے جا رہے	فلک پر سچا
بہی بھر بھی پیاسی	اب تو آما	سمتوں کو چھڑتے	روائے بادل
مٹ کی ریت	بیل پڑے	کسی سمت	چڑھتی چربے
میں ہوں اکسلا	مٹی مٹل میں	بڑھتے چڑکے	راہ کے پتروں کو
آئین میں نکسی	بنا جھبک	گلے لڑھکھوٹے	انہی کی لاکھی
یادوں کا پورا	لے آئی ہوا	کوئل بھٹی	بڑا سا گھر
تالا کلا	سوندھی مٹی کی پاس	سکھی اڑکے	جس میں سمجھا سہانے
ندی سے گرا کھیت میں	تو آس پاس	چاشنی پر مٹی	پگھلا خانہ
آئیں آئیں یہی	مکھو دھیرو	بیٹھی رہ گئی	چڑھتا پانی
	کچھ سوہنے سے بڑو		پکڑ کر تے گھر

● 44A/50 W-E-A ، قزول باغ ، نئی دہلی ۵



زلیں

ظفر گورکھ پوری

اشک کیا، موجِ حسنا ہے شاید دل بھی کٹ کٹ کے بہا ہے شاید
زندگی مجھ کو تھی لگتی ہے تم نے کچھ چین لیا ہے شاید
دوسرے سوچ رہے ہیں محب کو میرا سر مجھ سے جدا ہے شاید
تیری گردن بھی بہت نیلی ہے نہ ہر ٹوٹے بھی پیسا ہے شاید
رات تہنائی بہت روٹی ہے زخم اُس کا بھی ہر ا ہے شاید
بس رہی ہے مرے دل کی شریان سوچ کا گھاؤ لگا ہے شاید
چھو رہا ہے جو تریا کی جیس میرے کاندھے پہ کھڑا ہے شاید
میرے چہرے پہ خراشیں تو نہ بھیں آئینہ ٹوٹ گیا ہے شاید
رات بھر نیند نہ آئے گی میاں دیکھ، دروازہ کھلا ہے شاید
نہن کچھ رک سی گئی ہے گویا درد کچھ تہم سا گیا ہے شاید

اک بار یوں بھی اپنے بدن کا مکاں گرے
قائمی کی چٹ بے ہوئے دروازے کاں گرے
پیلے کی بھیڑ راس نہ آئی فقیر کو
جھولی میں چند خواب تھے جانے کہاں گرے
تہذیب، وضع داری، روایات، آبرو
کن آتشیں چٹاؤں کے ہم درمیاں گرے
تو پر سن بدل کے اتر سطح ماہ پر
اس پر تو کم سے کم نہ زمیں کا ڈھواں گرے
دینا نہ جانے کون سے بیلے میں دفن ہے
میں وہ میکی ہوں جس پہ خود اس کا مکاں گرے
شیشے کا قعر، کوئی پمپسہ کہ میری ذات
کچھ تو وہاں مزدور تھا، پھر جہاں گرے
خوابوں کا سا سناں تھا وہ بھی نہیں رہا
اب یہ زمیں پھٹے کہ ظفر آسمان گرے

ہو نہ ہو مسیرا خود اپنے سے ظفر
رابطہ ٹوٹ گیا ہے شاید

• ایف پگ نیو میو نیسل کالونی، دہلی، دسمبر، ۱۹۷۳ء

غفر لہیں

نور محمد یاس

شہپر رسول

ہر ذہن روایات کا مقتل نہ ہوا تھا
وہ آج ہوا ہے جو یہاں کل نہ ہوا تھا

ہو خش ہوگا جو احساس کا
سمندر بھیجے جائے گا پیاس کا

زہرِ شب، ویران بستر اے خدا
کرب اک منظر یہ منظر اے خدا

کیوں دُورِ طریٰ خلقِ اُس اک شخص کے پیچھے
کما شہر میں آگے کوئی یا نکل نہ ہوا سنا

ابھی دل کے آنگن میں ہے چاند فی
ابھی چاند ڈوبا نہیں آس کا

میں ترے شاہیں کا شہسپا اے خدا
کون ہے میرے برابر اے خدا

تھے بند مکانوں کی طرح لوگ پُراسرار
اک باب سخن تھا جو مفصل نہ ہوا تھا

سبھی پر ہے موسم کا یکساں اثر
اگر فرق ہے کچھ، تو احساس کا

بارشیں ہوتی ہیں اکثر اسے خدا

دل خون کیا تم نے تو پانی ہوئے جنہے
یہ مسئلہ مجھ سے تو کبھی حل نہ ہوا تھا

اب ان دہشتوں سے مغربی کہاں
 فوراً اپنے میں جنگل ہے و سواس کا

کاش! تو بھی مجھ میں آکر دیکھتا
 دُوبتے سورج کا منظر اے خدا

تاریک تھا اپنی ہی نظر کا کوئی پہلو
سورج تو کبھی آنکھ سے اوجھل نہ ہوا تھا

کبھی تو کوئی ابر ایسا ملے
ہو اندازہ جس کو مری پیاس کا

میرا ہمایہ بھی مجھ سا کیوں نہیں
یہ تعجب ہے سراسر اے خدا

یوں اُس کی شجاعت ہوئی مشکوک پر جنگ
تنہا وہ سیاسی تھا جو گھائل نہ ہوا تھا

لیلا ہوں رونق بھرے شہر میں
کا مانہ ہے یہ میرے بن ماس کا

ہر کچھ ہونے مجھے کیسے کریں
ان حقیقہوں کی مدد کراے خدا

کب صغیر ہستی پہ سہمی تا ائم کوئی صورت
وہ نقش سہا باقی جو مکمل نہ ہوا سہتا

بکوں گا تو پتھر کے رہ جاؤں گا
سافر ہوں میں دشت احساس کا

دوستی اور دشمنی کے نام سے
ہندو جو کس کس کے اندر اسے خدا

تمہی دن کی کھل دھوپ مرے خون کی بہا
سہ میرا چراغ شبِ مہمستل نہ ہوا مہمستا

مگر ایسا ہی نہیں ماس کا

ہج میں معصوم سا اک آدمی
طرف سانیوں کے لشکر خدا

آزادی آزادی

جاتی تھیں کہ وطن کی آزادی کا احساس کیا ہو نہ؟
ہاں حبیب انہوں نے اس زخمی حالت میں دادی کرات
کی تاریخوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر دیکھتا چاہتا تھا کہ
کہتے ہوئے کھل گئے تھے۔ ”مجھے ابھی بہت کام ہے۔
متمخرن کے ان دھبوں کو چھو دینا درندہ پریشانی میں
بڑھاؤ گی؟“

لیکن دادی نے نہ تو کام کے ختم ہونے کا انتظار
کیا اور نہ وہ ان دھبوں کو فرشتے اور چہار دیواری سے
رٹا سکیں۔ جوان کے سہاگ کی لکیر اور ان کی جڑوں
کی کھٹک میں دھڑکتا چکر لگے گریں تو پھر اٹھ بیٹہ نہ
سکیں۔ تین روتے بچے پچوں کی سسکیاں بھی بے اثر
ہو گئیں۔

یہ ان دڑوں کی بات ہے جب مائنان محلے
ٹکڑے نہ تھا۔ اس بے مروت میں کوئی فرق نہ آیا اور
پھر میں اس پس منظرے کھلی آگ اور ایک طرح سے
بے فتنی ہوں، اس لیے مجھے طوطی پر علم بھی نہیں کہ دادی
کے دل چڑھتے ہوئے اور وادی کی بے مروتی کے بعد میرے
پتی اور ان کے بھائی بھائی کی پرورش اور پرداخت
کیسے ہوئی۔ دیکھیں کلوز اپ کے بغیر زندگی کو
سمجھنا بہت مشکل ہے۔ مگراب میں بڑا ہو گیا ہوں۔
یہ یاد رکھنا کہ دوسرا سال ہے۔ یہ میرے بچپن کے
کی جوتی ہے۔ اس لیے میں ابھی ایک بچہ کہہ کر بچے کا ہوں
— اللہ بھرا رکھے سنی اوتھی بدردن کی طرح نصنا

میں نے اپنی زندگی میں اس گھر پرے کی دوزخ رستے
دیکھے ہیں جیسے کئی صدیاں پہلے تھی ہوں۔ اور جب ب
قدروں نے کروں میں دادی کی آنکھیں اجڑا ج
سے چنے اٹھیں۔ ایک بے صدا بھار وجود کے گھوڑے جھلک
ہاں ہاں پرتی رہی ہے۔ مگر ان آزادوں کو سننے
کی خدمت کسے تھی۔ یہاں ان کا کیا کون تھا؟
زندگی کی جھکا جھکے تپائی کی آنکھوں سے بے فتنی
لی تھی۔ انہیں کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ نقل
اور غرضوں آوازوں کی گونج نے انہیں اس قدر ہیرا
بنا دیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی آواز میں بھان پاتے اور
مصلحت اور دولت نے ان کے لبوں کو سی کر دیا تھا۔
اس لیے کہ دادی کی آستنی کا کوئی اعتقاد ان کے پاس
نہ تھا۔ دادی بہت اکیلے تھے۔

لوگ کہتے ہیں۔ دادی ہی اسی وقت گزری
تھیں، جب ایک تاریکی میں چھپے چھپاتے دادی
گھر آئے تھے قرآن کے نیروں سے چھریوں پر ہر دم
تھا۔ انگریزوں کی گول گول جگہ جگہ کے بلا جود کا فزون کا
ایک بچہ، جس میں اٹھارویں کے نام، چتے، کا نام
اور ان دنوں کے جسے تھے۔ کوٹ کے اندر چھپائے
چھپائے کسی طرح گھر کے اندر آئے تھے اور اپنے سامنے
ہاتھ پکڑنے کی دھجی آگ میں انہیں جلایا تھا۔ دادی
نے نہ تو زندگی میں کبھی ایک جیتے جانے انسان کے جسم
سے اتنا مارا ہوتا ہوا سون دیکھا تھا۔ اور وہ یہ

ٹھیکٹھک صوفی تھیں اور ساقاں میں
تھا۔ اس لیے سب کچھ ہی چھوڑ گئے۔ دیکھیں بھی تو جان
نہ اور صدمہ طالب ملوں سے بھی خفا رہے ہیں۔
کبھی، کبھی، کسی ایک کو فائدہ اڑانے کی ضرورت ہوتی
ہے تو پھر یہی قربانی کا بڑا ہوتا ہے۔ لیکن شاید گھر میں
کیلا میں کیا نہیں ہوں، ایک وجود اور بھی ہے جس کے
ہونے اور نہ ہونے کے کچھ بھی گڑبڑ پہلے ہیں۔ میرے
دادی!

”جہ چارے پاگل ہو گئے ہیں!“ اگر کوئی جان
ان کے کمرے کی طرف نکل پڑتا تو قاتل دینے والا
بیوقوف نہ تھا۔ حالانکہ دادی کیسے پاگل ہو گئے ہیں،
یہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ یہ منور ہے کہ باوجود
بہت باتیں کرتے ہیں یا پھر لاکھ کوئی ان سے پوچھ
کرسے۔ ایک چپ بڑا چپ!

لیکن کبھی بہت باتیں کرنے کے باوجود، آدمی وہ نہیں
کہہ پا تا جو دہن چاہتا ہے اور کبھی کبھے کچھ آدمی بہت
کہہ کر جاتا ہے۔ دادی جی کی شانت اور بڑی پوری
آنکھوں میں مغفوں اور بچوں کا ایک سمندر تھا۔
مارتا، رہتا ہے مگر یہ بات ہے کہ ان کا وجود د اس
گھر میں اس انہی کی طرف ہو گیا ہے جس کی زبان کوئی نہ جانتا
ہو۔

• شہزادہ محمد رفیع دہلوی، لاہور، نزل گزری بار، چٹہ



دُھند

گوئی جی ہوئی شہنشاہاں اچانک بند ہو گئیں۔
 رنگ برنگے قتلوں سے سجائی گئی ایک عالمیت
 عمارت بیوہ کی مانگ کی طرح اڑ گئی اور وہاں
 لال جوڑا پہنے سے پہلے ہی جھاگ گئی۔ جو کچھ بھی ہوا
 اُس میں نہ تو ذہن کا تصور ہے اور نہ ہی مراری کا۔
 تصور اگر ہے تو فتنہ گو بند کا جس بار کچھ خوشنات
 کو نظر انداز کر کے اپنی چھٹی خواہشات کو پورا
 کرنے کی خاطر ایک ایسے نامعقول فیصلے پر قائم رہا جس
 کے عمل نے شادی کے ریت کے ذروں کی طرح
 بکھر دیا۔ حالانکہ قدم اٹھانے سے پہلے مراری نے
 ایک شخص دوست و فرماں بردار کو رکنی حیثیت سے
 اس کو روکا تھا۔ تو کبھی تھا۔ ہاتھ جوڑ کر راجا بھی کی
 تھی۔ مگر گو بند کو جب سے ۱۵ لاکھ روپے کی لٹری
 ملی ہے۔ وہ کسی دانتور یا دافش مندی رائے قبول کرنے
 کے بجائے اپنے غریقی تقاضوں کے اشاروں پر خود
 ناچنے یا اوردوں کو کچانے کا عادی ہو چکا ہے۔
 چاہے تو یہ تھا کہ گو بند سے جوئے حالات
 کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اپنی دہلی ہوئی خواہشات کے ایک
 چھوٹے سے دائرے سے نکل کر ایک وسیع مدار میں پرواز
 کرنا، سادگیاں بھانڈوں کے زور سے پروردگار کو فائدہ اٹھا کر
 اپنی اونچی اڑان کو دل کش بنا کر ایک گرھ کی طرح مردوں

کی تلاش کو نئے سمائے ایک بازی مانند ایک نئے
 افق کی تلاش کرنا، مگر اس کی وہی خواہشات کا مقصد
 اتنا بھاری ہے کہ وہ اڑان سے پہلے بار بار کی جگہ پر
 گر جاتا ہے۔ جہاں وہی سال پہلے تھا۔
 کل کے گو بند اوسان کے گو بند میں فرتز جو ہے
 سو اتنا ہے کہ کل وہ ایک بے مین ٹکی تھا۔ بھوکا پیاسا
 ایک ایسا شخص جو اپنی خواہشات کو بے بسی کی چادر سے
 ڈھانپ کر اپنے فکست دل کے گوشوں میں چھپا لیتا
 تھا۔ مگر آج — آج وہ سیٹھ دولت رام ہے
 جو دولت سے ہر چیز خرید سکتا ہے۔ اپنی ہر خواہش
 پوری کر سکتا ہے۔ جیسے تو وہ ہنسی کی جوں کو ہٹا کر
 یا دونوں کی نوک سے کھرج کھرج کر اپنی دینی خواہشات کو
 نکال کر اُن کو پورا کرنے کی خاطر بڑی بڑی رقم داؤ پر لگا دیتا
 ہے — ریشہ بازی بھی وہ اپنی ایک درپردہ خواہش
 پوری کرنے کے لیے کر رہا تھا۔
 ماضی کے ڈھنڈے خاکوں میں رنگ بھرنا
 ہی غالباً اس کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ اور اپنے مقصد
 میں کامیاب ہونے کی خاطر وہ کھڑا تھا نہ حرکتوں کا
 سہارا لیتا ہے۔
 کل کا گو بند بھوکا ضرور تھا، مگر آج وہ بڑے
 بڑے کھانے کی میز گھومتا ہے جس میں چار پانچوں
 کھانا کھا رہا ہے جیسے وہ اپنا پیٹ نہیں برسوں سے
 خالی چڑا گھردام بھرتا جا رہا ہے۔

کل کا گو بند ننگا تھا اوسان وہ دلیں دس
 دس بار کپڑے بدلتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی اُسے
 جب اور لوٹ کا خیال آتا ہے تو وہ فوراً بین لیتا
 ہے۔ رنگ برنگے کپڑے، کچھ جدید طرز کے، کچھ
 پرانے طرز کے، کچھ لاجوں ہمارے جوں کے وقت کے، کچھ
 چیلنے، کچھ ذری دار کپڑے وہ بس خریدتا ہی رہتا
 ہے۔ کپڑوں کا انتخاب وہ فحشی پوش کو کر کر کرتا ہے۔
 جب کبھی پیٹھے پیٹھ یوں ہی اس کو کھانے کے
 ہیرو یا ہیروئن کا اسٹیڈم یاد آتا ہے تب وہ سہا
 رزئی کے پاس پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک کاسٹیم
 کے لیے وہ باج یا کسور دے بھی خرچ کرتا ہے۔ اپنے
 کپڑوں کے علاوہ وہ بچوں اور عورتوں کے کپڑے بھی خریدتا
 رہتا ہے۔ حالانکہ اُس کی دھڑی جی رہی ہے اور وہی
 دیکھتے نہیں۔
 برسوں پہلے وہ ایک لال رنگ کی گاڑی دیکھتے
 ہی خیالوں میں گھومتا تھا۔ اور کبھی کبھی فحشی
 اسٹریٹنگ پیکر کو مڑ کر لٹا رہتا تھا۔ فحشی بریک
 دیتا تھا — اور اب رقم بٹے ہی اس نے وہی
 کار خرید لی ہے اسی کھٹار گاڑی کو دیکھتے ہی
 چلاتا رہتا ہے جیسے گاڑی کا ٹوکھا مالک جو اپنی میں
 چلاتا رہتا تھا۔ ایک فلیٹ میں کرا، مرنہ میں سکار
 رکھ کر —
 کل کا گو بند اپنے قریب والین سے لڑتا جھگڑتا

خزاں اسیدہ قیل



موتی کی طرح جا بجا بچیل گیا ہے اور دل ہے کہ پرانی
چمکی کے پاؤں کی طرح گھر گھر ڈگر ڈگر اٹھ چکے ہیں
ڈال رہا ہے۔ وہ اضطراب کے عالم میں بار بار بولی بیٹے
ہیں، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے کہ با زو کوٹ چکے
ہیں۔ اور دم ڈگر ڈگاتے گئے ہیں۔
اندک اندک کو کم کو کم تاکہ تو کہیں دوسرے ایک
آواز آتی ہے۔

”بابا! یہ زرد بیل میں کٹوا رہی جا ہے۔
اب سوائے کوڑے کے اس کے کچھ حاصل نہیں ہے۔ یہ
اصغراں کا بیٹا ہے، جو کسی سے خوف کی طرف قدم بڑھا
رہا ہے۔ جو اب میں اصغراں کے ذہن سے ایک لب
نکلے گا، باوجود شخص اس کے بیٹے کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔
دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے ہیں۔ زمین
اور آسمان کی طرح۔ آسمان نے اپنا سورج سوائیز پر
آنا دیا ہے۔ زمین کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ طویل
دفعہ گزر گیا ہے۔ بچے کی نظریں غیہ ہو کر زمین پر ٹپک
گئی ہیں۔ وہ اصغراں کی تیز مقلد یا نقلوں اور خاموش
مگر جھکی ذوقی موتی آواز کا بیچام کھو گیا ہے۔ وہ قہر قہر
کا پ رہا ہے۔ نازک بیل کے زرد پیشوں کی طرح۔ اس کے
چہرے پر غم اور پشیمانی کے سبب سامنے لہر رہا ہے۔
لیکن — زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو گڑے ہوئے لہجوں
کی طرح جوتے ہیں۔ مگر بے جوتے گئے —
اصغراں کے ذہن میں کچھ ریگنا ہے وہ جو تک

سامنے ڈھل چکے ہیں۔ آہستہ آہستہ
اندھیرا چھا رہا ہے۔ بجلی بجی جہاں سے زرد پتے قہر قہر
رہے ہیں۔ نفعاً بڑا سراسری کا لباس پہنے ہے۔ ایسا
لگ رہا ہے کسی نے وقت کے سینے میں پنجرہ آنا دیا ہے۔
اور اب وقت آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتر رہا
ہے۔ بڑھے اصغراں اپنے زمانے میں ایک گرد
آکر دیکری پر غمخیز اور اڑاس کے کچھ سوچ رہے ہیں۔
محل نما مکان کا وہ حصہ جہاں اصغراں کے بیٹے
سے اب نئی طرز سے تعمیر کیا ہے، کا غنہ خوش رنگ
پتھروں، غباروں اور تیز رفتاری روشنی سے جھلکا رہا
ہے۔ آج اصغراں کے پورے کی سال گزری ہے جس
میں شہر کے سوز و گدگد مدعو ہیں۔

تصور کے حصار سے نکل کر اصغراں ایک نفر
قہر قہر سے زرد پتوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ کچھ
دیر تک آکر دودھ نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں، لیکن
جلدی احساس کا سخت پتھر ان کے سر پر اتر گیا ہے اور
ان کی نظریں جھک جاتی ہیں۔ مگر گراہ و نازک بیل کے نود
پتے نہ ہوں، آسمان کی تلخی میں موتی بجلی ہو، جو سیر
ان کے سر پر آ رہی ہو یا بجلی ٹھہر ہو جس پر بھول رہی ہو۔
اصغراں کے پاس اب کچھ نہیں بچا ہے سوائے
تصور کے۔ سوچے سوچے ان کا ذہن دھنکی ہوئی پرانی

بڑے ہیں اور اپنا کا پتا ہوا یا سوچنا ہی ہرے مانتے
ہیں۔ پشیمانی پر پیسے کا سیلاب آ گیا ہے۔ سو ادا ایک غم
گرم ہو گا۔ اصغراں کی پشیمانی کے پیسے سے کھینٹا ہوا
گرتا ہے اور بیل کا ایک پتہ دوسرے پتوں میں اوجھتا
ہوا کھر کھر کر اصغراں کی بیز کے میں باس فریٹ پر گرنا
ہے۔ اصغراں غم سے اس پتے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس
طرح کے جیسے کوئی آسانی ہے، زمین پر گر چکی ہو۔ پتہ ہو کر
دوش سے آہستہ آہستہ فریٹ پر چلتا ہوا ان کے پیروں کی
طرف بڑھتا ہے۔ گھر ڈگر ڈگر ڈگر۔ اصغراں جلدی
جلدی اپنے زیر سیٹ کر دوسرے اکھینچا بیٹے ہیں۔
ایک بوڑھی عورت کو جس کے بال برف ہو چکے ہیں۔
وقت نے چہرے پر چھڑکیں کا گھنا مارا ہے۔ وہ دودھ
کرب کے سدھار احساس کے ساتھ بھی نیم نا آئینوں
سے اصغراں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اصغراں کا دل تیز
آواز کے ساتھ گھڑی کے پنڈول کی طرح ہلنے لگا ہے اور صحت
میں کانٹوں داگو لاسا پھنس گیا ہے۔ وہ سخت پشیمانی کے
ساتھ بیلنگ کا لاف کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کا انتظار ہے۔
یا موت کا —

اصغراں کا بیٹا یا بھانجہ صحتی سے ایک
طرف کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر احساس کی کوئی پڑھائی نہیں
گھیزا ہے نہ درد کا احساس — جیسے وہ بہت لطیف
کسی بات کا منتظر ہے۔ اصغراں کا اکھینچا بیٹے کی ہیں۔
مگر اب انھوں میں وہ بیل کی مقلد یا نقل نہیں رہے جیسے

• ۳۶/۲ کیٹ روڈ، لاہور

چراغوں کا دھواں ہے۔ ان کی آنکھوں کے سورج جو کہیں
 اُٹھیں ہر دھند گرمی اور تیش رکھتے تھے، وقت کی گھڑی
 سے سیل گئی ہیں۔ ہفت روزہ جلدی سے اپنی آنکھوں پر پلوں
 کا پردہ لگا لیتے ہیں۔ مگر ان کا دل چاہتا ہے وہ اپنی ساری
 طاقت جمع کر کے بیٹے کو اس دوسرے ڈاکٹر کے آواز
 کے گولے سے اس کا سر گھوم جائے یا پتی ہو کے ہاتھ سے
 گلاس جھین کر کمر کا قطرہ قطرہ پانی وہ اس کے حلق میں
 ڈال دی ہے۔ بیٹے کے منہ پر پھیپھڑے سے چھینک دیں۔

خز خز غزل میں پانی پانی پانی سے اس کا دودھ
 حالت حرکت کے حلق سے بڑی کرب ناک آوازیں نکلتی
 ہیں۔ ہفت روزہ کے دل پر آراجل رہا ہے۔ خز خز خز
 — کھر کھر کھر کھر — وہ سخت سے پیسے پھرتے
 ہیں اور وہ پھر کرا سناں کی طرف ہاتھ دیکر دیتے ہیں۔
 جہاں آہستہ آہستہ صوفیہ ڈوب رہا ہے۔

ہوا — پتوں کی تھر تھر ہٹ — ہفت روزہ
 جلدی سے نکلنے لگا اور وہ دیکھتے ہیں، مگر اس طرح
 کہ کوئی پتہ آئینہ نہ دیکھ سکے۔ آئینہ عروس ہوتا ہے یہ
 پتوں کی تھر تھر ہٹ — ان کی فریاد ہے۔ وہ سن رہے
 ہیں۔ مگر خاموش ہیں۔ کچھ رہے ہیں اور انجان ہیں۔

پھر کسی احساس کے تحت ان کی نظر پر تھک جاتی ہیں کہ
 اب ان کی آنکھوں میں اتنی طاقت نہیں کہ آنسوؤں کا قطرہ
 برداشت کر سکیں یا پھر وہ ان آنسوؤں کو چھٹا نا جائے ہیں۔
 مگر کس سے — شاید — شاید خود سے — مگر

کہیں —؟ یہ کوئی ہفت روزہ سے پوچھے تو وہ اب میں
 ہفت روزہ کی پٹلیں جھینگ جائیں گی اور میں خشک ہو
 جاؤں گا۔

ہفت روزہ کی طاقت سے آج ایک نساڑاڑا ہوا
 ہے۔ وقت کا ایک کامیاز — اور وہ ہے ہوا کے
 دھول سے زرد پتوں کی تھر تھر ہٹ اور کچکا ہٹ —
 یہ تھر تھر ہٹ اور کچکا ہٹ شاید کسی آنے والی بات کی
 علامت ہے۔

وقت نے ہفت روزہ کے ذہن میں کاتوں کے بج
 بدل دیے ہیں۔ اور اس سے پہلے کہ وہ آج آئیں عماراً
 و فضل کی شکل اختیار کر میں وہ ان بچوں کو ذہن سے

محال کر چھینک دیتا چاہتے ہیں۔ مگر اب یہ کہاں کہیں
 ہے۔ اب تو ان بچوں نے جڑیں پھینکی ہیں اور پھر ایک
 جڑ جو تو ناممکن بھی تھا۔

ہفت روزہ اپنے ورلڈ سے میں ایک غزال رسیدہ
 بیل کے سائے میں، جس میں اب ساہوکار و تیش نہ آدہ
 ہے آداس اور خاموش بیٹھے ہیں۔ آداس اور خاموش۔
 — جیسے دن بھر کی ٹو اور ڈھوپ کے بعد موسم آداس
 ہے۔

وقت — ظالم سی ہے اور مرمم بھی —
 وہ اپنے اندر ظلم کی آگ ہی نہیں، محبت کی ننگی بھی رکھت
 ہے۔ اس لڑکے کی طرح جس کی مقام پر لے جاتا ہے۔

اور وہاں کسی دیوار، درخت یا کسی پتھر پر اپنا نام لکھاتا
 ہے۔ وقت بھی اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ ہفت روزہ
 کے برف جیسے سفید بال، چہرے پر سنو کی کے جالے کی

خبریں یاں اور پشانی پر موٹی موٹی ٹہنکیں، جو پہلے کسی
 خاص وقت پر آسمان کی تھیں۔ اب مستقل ابھری رہتی
 ہیں۔ یہ سب وقت کی کٹ نیاں ہیں تو ہیں اور یہ آنکھوں
 کے گچھے گچھے چراغ زندگی کے اذہر سے علامت کی تو ہیں۔

اب ہفت روزہ کے چہرے پر پہلے کی طرح دوپہر کے سورج
 کی تابناک ٹہنکی ہیں۔ ڈوبنے شروع کی لالی ہے اور
 آنکھوں میں وہ پہلی ایک جگہ بھی نہیں۔ ان کی آنکھیں سچ
 کے ستاروں کی سی ہو گئی ہیں۔ دھندلی دھندلی اور رنجی
 عجیب سی۔

اس وقت ہفت روزہ کے سامنے بڑا کادہ انہما
 پڑا ہوا ہے، جس کی موٹی سرخیاں انگاروں کی طرح
 ان کے احساس کے دامن میں رکھی ہوئی ہیں — یہ

دیکھنا ہے۔ کل ہفت روزہ جس کی ایک ایک ٹہن پڑھ لیتے
 تھے، آج تو وہی ٹہنیاں پڑھنا بھی آنکھوں سے پانی پھرتے
 کے مصداق معلوم ہوتا ہے۔ وہ اخبار اُٹھا کر آنکھوں
 کے قریب لاتے ہیں اتنا قریب کہ — انہما پیشانی
 سے ٹکرا جاتا ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ اخبار کے الفاظ
 اس طرح ٹھوٹے ہیں جیسے اذہر سے میں راستہ تلاش کر رہے
 ہوں۔ مگر وہ ہمیشہ ٹھک جاتے ہیں۔ کوئی بانگسل احساس
 انہیں بہت کچھ سمجھنے لے جاتا ہے، جہاں ہفت روزہ چلے تو

بہت آسانی سے جاتے ہیں، لیکن پھر وہاں نہیں آتا چاہتے۔
 مگر یہ کہاں کہیں ہے۔ وہی وقت — جھلٹاتا ہے —
 نے بھی جھلٹاتا ہے۔ چاہے گھسیٹ کر لے جائے اور اس گھسیٹنے
 میں ہفت روزہ کو ہوا نہ ہو جائے۔ یہ کہیں کہیں جاتی
 ہے، دل ریزہ ریزہ ہوتا ہے اور دماغ کی گھسیٹ
 جاتی ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے۔ خون ان کی پٹلیوں
 سے بہ رہا ہے۔ وہ جلدی سے کچھ پراہٹ کر دیتے ہیں
 وہاں دھوپ کے آب کی طرح تر پڑتی ہوئی رگوں کے سوا کچھ
 نہیں ہوتا۔ کاش — کبھی ایسا ہو کہ وہ اس گھسیٹنا کافی

میں — مگر جہاں۔ ہفت روزہ سوچتے ہیں۔ لیکن —
 سوچنے سے کچھ نہیں بدلتا۔ پھر —؟ ہفت روزہ سر

اُٹھا کر بہت سے بچے سے اڑ دیتے ہیں۔ کچھ دیکر بک کر
 نظروں سے گھٹتے رہتے ہیں اور پھر — وہ دیکھتے
 ہیں بیل کے نازک چوں کی جگہ آئینے کی آئے ہیں، جن
 میں انہیں اپنا شکل نظر آتا ہے۔ جہاں میں سے ان کے
 بیٹے نکلتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ساری دنیا انہیں
 ان آنسوؤں میں نظر آتی ہے اور وقت — برائی شکل
 میں ان آنسوؤں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سب کچھ دیر میں۔

وقت — ان آنسوؤں سے نکلتے گا اور پھر —
 اور پھر — نہیں — ہفت روزہ آنکھیں کچھ کچھ کھول
 سے سر جھکا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے وہ قطرے نکل کر
 فرش پر پھیلنے لگتے ہیں۔ یہ وہی قطرے ہیں جو ہزاروں برس
 سے چل رہے ہیں۔

کوئی ٹوٹا آدھی جب پتھر کی طرح خاموش ہو جائے
 تو سمجھ لو کہ اسے اپنے پورے ہونے کا شدید احساس ہے۔
 اور اس پر موت کا خوف طاری ہے۔ ہفت روزہ بھی پتھر
 ہو چکے ہیں۔ مگر انہیں موت کا مطلب نہیں ہوتا۔ انہیں
 خوف ہے تو ہیں وقت کا وقت — جس کی آہٹ
 نے انہیں پتھر بنا دیا ہے۔ وہ ہمیشہ گوش وقت کے
 بڑھتے ہوئے تھکوں کی آہٹ میں رہے ہیں، جو چند
 یوں میں — چند گھنٹوں میں ان کے سر پر پتھر ترے
 ہوئے زرد پتوں کو کھڑے کر دین پر پتھر ٹک لے گا۔

تھکوں کی آہٹ — ہفت روزہ جلدی سے
 اخبار اُٹھا کر آنکھوں کے قریب لے آئے ہیں۔ اتنا قریب کہ

آئیں ٹھیک جاتی ہیں۔ ایک بچہ دوڑتا ہوا مصغراں کے پاس آتا ہے۔ بیان کا ہوتا ہے۔ وہ بئیں اور شرٹ میں ملبوس ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں غبارہ ہے جس کی دھڑکاؤ سے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھی ہے۔ غبارہ ہوا میں معلق ہے۔ اس کی گت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے جس سے غبارہ کی توت پر واڈ آہستہ آہستہ زائل ہو رہی ہے۔
 "دادا! پوتا توئی زبان سے مصغراں کو پکارتا ہے۔"

اب تک مصغراں کی آنکھوں کا پانی پلکوں پر آچکا ہے۔

"دادا — دادا — پوتا بچہ سے کچھ تیز آواز سے پکارتا ہے۔ مصغراں بدستور بیچھر جئے ہوئے ہیں۔

پوتا ایک کدو کے دانے کا ہاتھوں سے احتیاط سے لیتا ہے۔ مصغراں کی پلکوں پر پھلکا ہوا پانی فرش پر گر جاتا ہے۔ بصر میں پوتا حیرت زدہ نظروں سے فرش پر گرے ہوئے آنسوؤں کو پھیر دادا کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔

"دادا میاں — پوتا کچھ پکارتا ہے۔ مگر بہت آہستہ سے۔ اس کی آواز میں غم و غمگینی ہے۔ وہ بدستور دادا کی آنکھوں میں جھانکنے جا رہا ہے اور مصغراں احساس کے نتیجے میں ہلکے ہوئے ہیں۔

"دادا میاں! آپ تو لے ہیں؟" پوتا جواب دہنے اور ہنسنے سے فرق کو بخوبی سمجھتا تھا، دادا سے پوچھتا ہے۔ پوتے کے معصوم سوال پر کہ جو معصوم منہ دھکتا، مگر مصغراں کا احساس جگانے کے لیے آگ کی سی تیش رکھتا تھا۔ مصغراں ایک بار کھینچنے لگے ہیں، لیکن جلد ہی پھیرتے آہستہ اور کھینچتے ہوئے وجود کو سمیٹ کر بیٹھے ہیں۔ دور سے — پلگول کی طرح معصوم پوتا حیرت بھری نظروں سے دادا کی اس بدی ہوئی کیفیت کو دیکھ رہا ہے۔
 "تمہیں تو بیٹھے — میں دو کہاں رہا ہوں۔"

وہ ہنس کر سر کو اٹھانے کی طرح جھٹکتے ہوئے کرب کے ساتھ کہتے ہیں:

"یری آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔ کمر و بھگٹی ہیں نا اس لیے۔ وہی جلد جو مصغراں فریاد فرماتا سب کو تپا لیتے ہیں، دہراتے ہیں۔ پوتے کا سر وہ چہرہ روشن ہو جاتا ہے۔

"دادا میاں! آپ نے بھی دوستو تپا ہے؟" پوتا جب کہ بہت معصومیت سے پوچھتا ہے۔

مصغراں اپنی جگہ سے ہوجاتے ہیں۔ گویا یہ معصوم بچے کی زبان سے نکلا ہوا جملہ نہ تھا۔ وقت کی تپ سے نکلا ہوا گول تھا جو سیدھا مصغراں کے سینے پر لگا ہوا۔

"میں آپ نو دستہ تر سے دستاؤں؟" پوتا دادا کے قریب آکر ان کی بے لوث آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھتا ہے۔ مصغراں کے ہونٹوں میں قفل چڑ گیا ہے۔ ذہن میں کھانے سے کچھ بکھ گیا ہے۔ اردول میں کچھ ٹوٹ سا گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا وہیل سر اُپر اٹھاتے ہیں۔ ان کے سامنے ان کا پوتا ڈسکون رہا ہے۔

"ایک نئی قسم کا دانہ ہے، جو ترقی کی علامت اور جس میں سچی کی علامت ہے: یہ آواز مصغراں کے سینے کی ہے۔ مصغراں کو جھلک بھیں اٹھا کر اپنے پوتے سے کچھ پوچھ دیکھتے ہیں۔ سامنے ان کا سہاری کھیر کر مینڈا کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک ہے۔ زندگی کی تیز چمک — وہ اپنی تیز روش آنکھیں مصغراں کی بھیجی آنکھوں میں ڈالے ٹھہر رہا ہے۔ مصغراں شکست کھا کر نفس بھکا جاتے ہیں اور وقت کی انگلی بجز کوئل پڑتے ہیں۔

دندانے کی دیوار پر ایک خوب صورت بیل چڑھی ہوئی ہے۔ بیل کے سبز بچوں اور کھینچ پھولوں کے سامنے میں قدیم زمانے کی ایک کڑی ٹی پی ہوئی ہے جس پر مصغراں بہت پوسکون حالت میں بیٹھے بلکے بیٹھے جھمٹے ہیں۔ گری کے سامنے پڑنے لڑکی ایک میز پر جس پر مازہ اخبار رکھا ہوا ہے جیسے مصغراں نے اچھی آگئی مکن پڑھا ہے۔ اب مصغراں کچھ سوچتے ہیں۔

ایمانک دیوڑھی میں کسی کے کندوں کی آہستہ سناٹی دیتی ہے۔ سچی کے بے پروائی نیت کا ہے۔ مصغراں گریٹ نوکر اپنے پیچھے پڑی کھڑی دیکھتے ہیں ایک بار گئی ان کے چہرے پر غمخیز نظر آتی ہے۔ دوسرے سوچنے کی سی غصہ بک شری کنبہوں کی گریٹ بکھنے کی ہیں اور آجکھیں غصے لگنے لگی ہیں۔ مصغراں آہستہ آہستہ گری پر سے اٹھتے ہیں۔ بہت اٹھا کر بہت بار وہ بے انداز سے آہستہ آہستہ چل کر بیٹھے کچھ ناسے پر ٹپھٹکے ہیں۔ کچھ ناسے پر — بیٹھے ہونٹ کپکپا رہے ہیں۔ چہرے پر خوف کے درمیانے رنگ رہے ہیں اور پیشانی سے پیسے کا سوڈا چھٹ نکلا ہے۔ ایمانک دہلے مصغراں کی آنکھوں کی گری نے ان کے سینے کے چہرے کو سرخ کر دیا ہے اور پیشانی کچھ لادی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے درپردہ قوتوں کو دے رہے ہیں۔ مصغراں کی تانناک لڑائی..... بیٹھے چہرے پر کڑی جھڑپوں کوکوت کا دم لادی ہے۔ مصغراں کی گویا پانی کی گڑبڑ دو ڈنکا رہا ہے۔

"دادا میاں! آپ سلاستو نہیں دیکھتے؟" پوتا دادا کو پوچھ رہا ہے۔ مصغراں جو وقت کی انگلی چمکے بہت ڈرے پڑے گئے تھے، اس کی ریڈر پر کھینچتا ہوا وقت ان میں پھردینے لایا ہے۔ معصوم پوتا کھلی بھری نظروں سے دادا کی طرف دیکھتا ہے اور وہ اس سے چل رہا ہے اور کچھ دوری پر سامنے کمرے میں داخل ہوجاتا ہے۔ جہاں کچھ در پر پہلے اس کی سالگرہ کا کیک کا ٹاپا ہے۔ پوتا کمرے میں پہنچ کر دروازہ کھٹا پھیر دیتا ہے۔ ہوا کے گرم مچھوکیں کی طرح — آواز میں مصغراں کی ساعت سے ٹکراتی ہیں۔ تیر — اور تیر — مصغراں لنگت غمخیز بادشاہ کی طرح کہیں کی طرف غافل ہوئے بہت تیزی سے بڑھی آری ہوں — ہر سال ادھر پریشان — کہیں ایسے مقام کی تلاش میں جہاں رسائی مل سکے۔

آوازیں بدلتی ہیں جلدی ہیں۔ تیر — اور تیر — اور مصغراں وقت کے تجویں میں پھنسے تپ نہ رہے ہیں — تپ نہ رہے ہیں۔

آہستہ آہستہ اندھیرا چھا رہا ہے۔ گلی کی ہوا چلی ہی ہے اور زان رسوہ کیل کے نچوڑے لڑنے ہیں۔ ●●



گائتری پھول

نریش جتتا

تو ساری نغما
آواز سے ہی نہیں
خوش ہو اور تکلیف سے بھی غمور ہو اُٹھتی ہے
یہ خوشبو، یہ نام سکندھ
مجھے ہی نہیں، نکل کائنات کو
سراپا چنڈن، کد مپ اور کیڑا بنا جاتی ہے
انسان پر جب بھی
زبان
یہ نیا مٹی کرتی ہے
اُسے گائتری کہا گیا ہے
زمان کا یہ گائتری پھول
اور کچھ نہیں
انسان کی دعا ہے

۵ ایک بے حد مقدس دیہ منتر

درخت جب دعا کرتا ہے
تب ایک پھول کا جنم ہوتا ہے
تجی تو درخت کی گائتری کو
سچول کہا جاتا ہے
میں جب بھی مہا را نام
منکل بھی نہیں، جڑی نام
بانسری میں بجا رہا ہوتا ہوں
تو لگتا ہے
ویرانے میں اک پھول رنج رہا ہے
ابھی ابھی ہمالہ میں ایک ندی کی تخلیق ہوئی ہے
اور یہ آواز
پانی کی زمین پر پہلی بار رواں ہونے کی ہے
یا ایک ستارا
آسمان کی کسی بجراں تنہائی میں
گنگا تے ہوئے اپنا سنگا کر رہا ہے
میں جب بھی مہا را نام
بانسری میں بجا رہا ہوتا ہوں

• گرنٹھ آر دوا سکول، پسرہ (دورکھلا)

ہیں۔ میرا خیال ہے کہ گھڑ آپ کسی Gynaecologist سے ملیں تو بہتر ہوگا۔ میں میں گھڑ لے کر کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن آپ کی عمر...."

اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ کیا سن رہی تھی؟ یہ کیسے ہوا؟ اس کے بارہ کوڑا بیس سال ہو چکے تھے۔ آج اس کی عمر بیالیس سال کی ہے۔ یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ پر ادا تھا کہ یہ غیر متوقع کیا کسی؟ خصوصاً یہ یہ کہل کیسے نکلا آئی؟ وہ بیس سال میں یہ سوتا کیسے بھٹوٹ پڑا؟ اولاد کے لیے اب تک اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ دلی دیرتاؤں کی منت مانی تھی۔ لڑی ڈاکٹر سے جا چکی کرائی تھی، لیکن سب بے فائدہ۔ بیاہ کے بعد کچھ سال انواع و اقسام کی دواؤں میں گزر گئے۔ آٹا نہ لگا سکا کھیل نہ کھینے۔ یہ سب کچھ سونے پر سونے ہی وہ مبتلا تھی۔ بچے بارہ سال سے باپ سے ہرگز اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ جب اس کو طبی ہو گیا کہ لا، بھنا اس کی قسمت میں نہیں ہے، تب اس نے اپنے شوہر کی کر اپنا بیٹا ان کی ماری ماما اس کے لیے وقف کر دی۔ اُس نے بھی اس کی بات کو کافی جگہ لٹنے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن بدن سستی ہوتا گیا۔ اس نے اس کی تنگ مزاجی کی بھی پروا نہ کی۔ اس کو اس بات کا اطمینان تھا کہ اُسے دن اس کا افسانہ لکھنا پڑتا تھا۔ وہ بھی علیل ہو کر بستر پر پڑ پڑتی تو وہ گھبرا جاتا کہ اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ کیوں کہ ان کے گھر میں ان دونوں کے سوا تیسرا اور کوئی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ دونوں ایک جان جانتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ بھی ایک دوسرے سے جدا ہونے کا وہ خیال تک نہیں کر سکتے تھے۔

"اگر آپ Second Opinion چاہتی ہیں تو میں آپ کو ایک لیڈی ڈاکٹر کا پتہ دیتا ہوں۔ ڈاکٹر مس تھانی۔"

"میں آتی ہوں۔ ایک بار میں ان کے پاس گئی تھی۔ تب انہوں نے کہا تھا کہ "ناممکن ہے" وہ بڑبڑائی۔ ادھر مگر اس عورت کو چہرہ چیلے لال ہو گیا۔

"لیکن جو ناممکن تھا اب وہ ممکن ہو گیا ہے۔ جلدی کھجے اور ان کے پاس جائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو زیادہ تک ان کی بھگائی Observation میں رہنا ہوگا۔ وہ بھی آپ کو یہی سلاہ دیں گی۔ قدرتی طور پر زندگی ذرا مشکل معلوم ہوتی ہے۔ یہ میں آپ کو گھڑ دینے کا ارادہ ہے نہیں کہ رہا ہوں۔ آپ اپنی تعلیم یا فہرست میں۔ Mature میں۔ اپنی اپنی قسمت میں ڈاکٹر سے بات کرنے سے ملیں اس لیے ایک بار پر دوسرا صاحب کو ہم سے ملنے کے لیے بھیجے۔ آج کل وہ بیس میں یا چوبیس میں ہے؟"

"معتز یہ وہ امریکہ جا رہے ہیں۔" اس نے دودھ بھرتے ہوئے اُس نے کہا۔

اپنے فیملی ڈاکٹر کے دواخانے سے نکلے ہوئے اُس نے سوچا کہ کیوں ناہی

ڈاکٹر تھانی سے ملوں؟ پھر خیال آیا کہ وہ وقت مقررہ پر پہنچی ہیں۔ اس کو بھی ساتھ لیتی چلوں۔ ان کی پرنسٹن شوہر کی موت کی خبر میں نہیں۔ شاید ان کا کہا سچ نکلتے۔ یا میں کہیں کسی جلی جاؤں؟ پہلے میں مطمئن ہو جاؤں پھر سرا مال ان کو رخصت کر دوں....

شادی کے بعد ملاوٹ کی دیر نہ کر دوں گا اظہار کرنے والا ایک خیالی مکالمہ اُس نے دل ہی دل میں کی بار بار کیا تھا۔ "ہمارے یہاں ایک جہان آئے والے۔ شروع ہی سے جہانوں کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں تھی۔ اس کو چڑانے کے لیے وہ کہا کرتی تھی کہ آج ہمارے یہاں جہان آئے والے ہیں، اس پر پرنسٹن ہو کر وہ کہتا تھا My god یہ لوگ ناحق میرا قیمتی وقت سناٹے کھینے ہیں۔ اب کی بار بھی اس کی ایسا ہی رد عمل ہوا۔ اُس نے کہا "مجھے ان جہانوں سے بچاؤ۔ اگر وہ یہ امان نہ دے تو بڑا احسان ہوتا ہے۔" پھر میں کہوں گی "اجی بہت سارے نہیں، ایک ہی جہان آئے والے۔" دیکھیے، وہ یہ پہلی کڑ بھر سکت ہے یا نہیں؟

اس کا یہ خیالی مکالمہ اس کی سوچ میں تبدیل ہو گیا۔ آخر کب تک وہ اس راز کو اپنے دل میں چھپا کر رکھ سکتی تھی۔ اب اس کے اظہار کا وقت آ گیا تھا۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اس کے دل کی ساری لطافت سا رازہ کر گیا ہو گیا تھا۔ ادھر مگر میں اس کو بڑا انا۔ اس کے ساتھ راز دہناؤں کی ڈاکٹر کا کیا ذہب دے گا؟ اب اس کے یہاں جہان نہیں آتے تھے۔ بال بچوں والے رشتہ داروں کو بھی اس کی باسلیقہ فکر گہمستی میں ہے یا دغل دینے میں جھجک ہوتی تھی۔ کچھ اور رشتہ دار جنہیں اس کے مزاج میں اچھا دخل تھا اس کی اس قسم کی ممانعت سے بخوبی واقف تھے۔

گھر آئے پر مے لیموں چڑنے کی خواہش ہوئی۔ آج اس کو اپنی ماں یا دادا کی تھی۔ اپنے نواسے کی آمد کی راہ دیکھتے دیکھتے چل بیٹھے جارہی۔ وہ کجا کرتی تھی کہ "ہیما! تیرے بیٹے کے لیے یہ طلاق لاکھ بنا رکھا ہے۔ کب سے اسے سنبھلے ہوئے ہوں۔ آج سے جاوے۔ پھر حقیقت اس پر منکشف ہوئی۔ اپنی بیٹی کی گودہری ہو۔ اس کے لیے اس نے کتنے دلی دیاؤں کی منت مانی تھی۔ طلاق کے برت رکھتے تھے۔ پر لیکن بے فائدہ۔ وہ بڑی آنا وادی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ "مجھے امید ہی نہیں بلکہ پڑا تین ہی ہے کہ ایک دن تیری گودہری ہو جائے گی۔ سوچو کبھی کھلتی ہے بھر پور کیسے بچہ ہو سکتا ہے؟ ایک دن مجھے کوئی لگا بیٹوں ضرور دکھائی دے گا۔" پر انہوں کو آج اس سے دیکھنے کے لیے ذرا نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد ان کی دے اس کا کلاؤ نہ دھ گیا تھا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی تو اس کی خوشی کا شکار نہ ہوتا۔ اس کو روز بروز عورت کے جسم میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ مٹا کے یہ اچھے سے کپڑے پہنتی۔ چرتی بیوی جی ترتیب دیتی۔ میرے یہی ادھر مگر کی قسمت اس میں نہ ملے ہوئے سے جھکتی۔ ہیما نے سوچا کہ اگر

آغا میری ماں زندہ ہوئی تو میرے چچا دیو کو یہ خوشخبری سنائے میں کوئی دشمنی نہ تھی۔ تب میں اس سے پوچھتی: کیا ہم اپنی کوکھ دونوں کے لیے اپنے بیاں بلائیں؟

”کیا وہ بیمار ہیں یا بولیں ہی آرام کرنے آرہی ہیں؟“

”میں نہیں، امی کی بات نہیں۔ وہ بھی چکی ہیں، مندرست ہیں۔ لیکن میں جو مزدوری محسوس کر رہی ہوں۔ اس کی ذمہ داری آرزو تھی کہ وہ فائدے کا موڑ نہ دیکھے۔ اب اس کی امید بڑھنے لگی ہے، لیکن باغیچہ اب زندہ نہیں ہے۔ اس کو سڑک ہاش ہوئے یا پھانچاں یا پھانچاں سال تھا۔

اس نے آنکھیں پونچھ لیں۔ اب بچھیلنے سے کیا ہو سکتا ہے ہا ایک سالہ کو چاہیے کہ وہ سراسر خوش رہے۔ اور غرضی غذا، کھل ہو اس کی اور ادھارنگ بھرے ماحول کا خاص طور پر خیال رکھے۔“

”اب میں اس کے استارے پر ناچوں گی؟“

”یہی وہی ہے کہ روتے ہیں ان کو بتاؤں گی کہ آپ جب امریکہ جائیں گے تب میں گھر پر آؤں گی۔“

”میرا کوئی سہی ہوگا۔“ اس پر وہ پوچھیں گے، ”کیا کسی پہلی کو گھر پر بلا رہی ہو؟ یا بھائی صاحب اور بھائی صاحبہ آ رہی ہیں؟“

”نہیں نہیں، ابھی کوئی نہیں آ رہا ہے۔ تمہارے بھی رشتہ دار اور دوست آئیں گے پر اب نہیں۔ ان کو ہم کے بڑے میں شامل ہونے کے بھیجے گا۔“

”ہاں مگر ان کو کس کام لیں؟“ وہ عقیدت بھرے لیے سر پٹے گا۔ میں بچی سے ہاتھ ملوں گی۔ اسے خوشی کے اس کی گوس اپنا موڑ چھپانے کی کوشش کروں گی۔ اس کے فرست ہفتی میں سے اپنی عمر کے خیال سے بہتر وہ بھی بعید کی باتوں میں لگوں گی۔

”اے گورے زلف والی بات متی۔ ان باتوں کی خوشبو بھی کی آ رہی تھی۔“

”چسپاں ماں اس کی آواز میں گرجا رہا ہے۔ پڑوس کی سڑکیں گھاٹ فرصت میں سماج سیوا کرتی تھی۔ ایک دن یہاں کے ساتھ بیٹھ گئے (جہاں وہ کام کرتی تھی) گئی۔

سڑکیاں کو دیکھتے ہی کہنے ہی پڑیں گے ”میری آگئی! موسیٰ آگئی! چلائے ہوئے آئے گھر لیا۔ اس کو بالکل مٹ کو بیٹھے ہیں ان میں جوڑنگ گئی تھی۔ ان میں سے عورتیں سب سے چھوٹے ایک بچہ کو اس نے اپنے پاس بٹھایا اور ہمیشہ کی طرح ان کو کھاتی

سنائے تھی۔

ماں باپ کے بارے میں خود ان بچوں میں کوئی سڑکیاں اس کی ماسا کی ایک ہونڈ کے پیلے وہ چاکلے بچھی۔ کھاتی سنتے سنتے اس کی گونڈیں سوئی وہ بھی سی جان۔

”جہ دیتے والی ماں ہے اس کی قسمت کے بھرے بھروسے ہو گیا تھا۔ کام سیٹ کر گھر لڑتی ہوئی سڑکیاں کو دیکھ کر گھبراہٹ کے ان کے وہ چہرے، ان میں سے کچھ دہی کی

عمر نسبت زیادہ تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روک رہے تھے۔ فائدہ ایک دوسرے کو آگاہ کر رہے تھے کہ موسیٰ دھنے دھنے بچوں کو بیاں نہیں کرتی۔ دل ہلا دینے

والے اس منظر کو دیکھ کر بیاں بہت متاثر ہوئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ ان معصوم بچوں کی صورتیں اس کی باطن کی آنکھوں سے ہلنے نہیں ہلتی تھیں۔

پھر ایک دن اس نے اپنے بچے کا موڑ دیکھ کر سوچ کی لہر میں بچکے لیے ہوسے ان اسکا گے بچوں کا ذکر کیا۔ وہ چڑ کر لپٹا۔ ”آج تم کو یہ کسب

شو بھی ہے۔ کہاں کے کوارٹر دینے، کوڑے پھرنے کے ڈھیر پر بھیکٹا دیے گئے۔“

میں اس بچے کو پوچھتی آ نکو سے کچھ پسند نہیں کرتا، جس کے اس باپ کا کچھ نہیں۔ اس کا یہ رد عمل اس کو بہت ناگوار گزارا۔ اور وہ بیٹھ بیٹھ

کر دینے لگی۔ اپنی فزین کی نسبت اس کے گھناؤنے جوڑ دار ایک قوم کا کمزور بھگ رہا تھا وہ اس کو بہت کھرا تھا۔ اس نے سوچا کہ آفران کی چند نالی، ان کا بھر علم

کس کا کام؟ وہ ایک بار گولا ہے۔ بے ذمہ دار ہے میں۔ لہذا غفلت ہے۔ کیمبر نے ٹھیک ہی کہا ہے ”دھاتی اکثر پریم کا پسے سوینڈت ہوئے۔“ جو

جی قزاق اس کا کاروبار دوزخ میں ہے، جس کو غفلتوں سے ہمدردی نہیں ہے اس کی اور میرے دل کی دھڑکن ایک کی ہے ایسا اس نے میں نے بڑی لطفی

کی۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو سے عجیب سا لگا۔ اس کے لیے اس کے دل میں عجز و بگاڑنے لگے گھر کر لیا۔ اُسے مغرب و پچھ کر وہ بٹھایا۔ شمع پر پی ہو جانے کی

طرح آتے جانے والی اس کی مری اس سے اختلاف رائے رکھتی ہے۔ اس بات پر اُسے دشمنی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کو منہ نہ ہونے والا بولا۔ ”آج تم اس ایک

آدھ بچہ پائے گئے گھر لانا۔ یہ کجوت نکلے پر کم اس سے نفرت کرنے لگی۔ اپنا بچہ پھر اپنا بچہ ہے۔ بے فکر کا بچہ اپنا پھر لٹکا ہے تو بھیک اور اگر

کجوت لٹکا ہے تو سارا الزام ہمارے ہاتھ پر پھوپھو دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بڑا کہنے پر وہ سے نفرت کرنے لگے۔

اس کے اسی خیال سے وہ جزی طور پر ہی متغیر ہو پاتی تھی۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کے قانون اور شر کے بغیر یہ ممکن ہے۔ ماسا کی ماری وہ ایک

آدھ بچہ گھر پالنے اور دوسرا اس سے نفرت کرتا ہے۔ ایسے زہر آلود ماحول میں وہ اس کی پرورش کیسے کر سکتی ہے۔ اس کی بد نسبت یہ بہتر ہوگا کہ بچا رہے

جہاں ہیں وہیں رہیں۔

اس بچہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ان کے دلوں کے لیے ایک صیقل ثابت ہوا۔ اس کی چھوٹی بہن کے بیٹ کا پرنسپل ہوا تھا۔ زخم میں سیٹنگ ہو گیا تھا۔ اس میں

بے جاری چل سی۔ آخری دنوں میں ایک بار بیاں اس نے، جہاں گئی تھی میں بھانپ گئی تھی کہ اب وہ پھر دوسے دنوں کی جہان ہے۔ اپنی بہن کے پاس وہ اپنی

آخری خلا میں کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”ہیں، اگر میں اس کا بیلا بھاری سے نہ بچی تو کیا تم میرے بیٹے ششکر کی پرورش کرو گے؟ کچھ ہیں کہ دل مرے پر موسیٰ د

مرے۔“ بہن کو کیمبر مرگ پر دیو کہ اس نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ بٹھ کر ماضیوں

لاں ہاں کرے گی۔ کیونکہ وہ اس کو بہت عزیز تھا بچہ کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی کے پاس رہنے پر راضی نہیں تھا۔

بہن کے انتقال کے بعد ششکر کی پرورش کا مسئلہ پیش آیا۔ اس کی ماں تو بھی

کی گزر رہی تھی۔ سبکدھار خیل تھا کہ یہاں پشکر کو سنبھالنے کے لیے پہل کسے گی۔ کیونکہ وہ وطن پہنچا، ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ کوئی بال بچوں والی بہن ہوتی تو وہ اپنے قیمتی بھائی کے گھر دوسرا ہار دیتی۔ میا زادہ لادے لے، بچے کے لیے ترس رہی تھی۔ اس کی ماری تہ نہ رہا، ہاتھی ہو گئی تھی، اس لیے وہ بہت ڈار بیٹھی تھی۔ پشکر کی دل نے تو اسے صبر نہ دیا تھا۔ اس کی مصلحتی دل تو یہاں ہی مگر پشکر بڑا خوش نصیب تھا کہ اس کی بھوی اچھی ذمہ داری کرتے ہی اپنے پیارے ہونے کی ہمت کے بعد دوسرے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔

سب کو انتظار تھا کہ کب یہاں پہل کرے گی، اپنے شوہر کی اعانت کے بغیر وہ اتنی جلدی ذمہ داری کیسے لے سکتی تھی، لیکن اس سے ناامیدگی آمیزہ رکھنا عجب تھا۔ وہ انھیں بھی پرکھتی تھی۔ سکران کی حالت میں بہن سے جو وعدہ کیا تھا اسے وفا کرنا ضروری تھا۔ بے چارے پشکر کو دیکھ کر اس کا دل بڑھ گیا کہ یہاں تھا۔ لیکن شوہر کا بڑا عمل کیا ہو گا۔ اس احتمال سے وہ بچتی سا دھبے بیٹھی تھی۔ اس کی انھیں کانکے خیال تھا! آخر اس کے بیٹھنے کی خیال میں بہت اچھی۔ وہ اس کو ایک طرف لے گئے اور بولے۔ "عذرا، تم کے تلامذہ کی محنت اس نے آپ سے وعدہ لیا تھا۔ آپ نے بھی تو وعدہ کر لیا تھا، لیکن میں آپ کی ذمہ داری سے سبکدوش کرنا چاہوں۔ میں پشکر کے بغیر ذمہ نہ دیکھوں گا۔ میں اسے لے جاتا ہوں۔"

اس کے دل پر جو بوجھ تھا وہ مٹا گیا۔ عارضی طور پر گھوٹا نہ ہو، ایک بڑے جھیلے سے اسے نہات تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ گھر کو نہ لے جائے۔ آہستہ آہستہ اس میں اس نے اپنے شوہر کے خیال کا پتہ چلائے گی اور اس کو لڑنے لگی۔ کئی عرصے وہ پشکر کو اپنے یہاں لائے گی۔ ہمارے ساتھ رہتے رہتے وہ ہم سے ہل جاسے گا۔ جاس ہونے پر وہ مستقل طور پر اسے اپنے یہاں رکھ لے گی۔ ماری آئیں وہ اپنے بیٹھنے والے صاحب سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے ان سے صرف اتنا ہی کہا کہ کچھ دنوں بعد وہ پشکر کو لے جاسے گی۔

گھر پہنچے ہمارے اس کی بہن کی بیماری کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس کی ناگہانی موت پر اس نے اظہارِ افسوس کیا اور میا سے ہمدردی کا اظہار۔ پشکر کا بھیل کر بھی ذکر نہ کیا۔ وہ بولی۔ بے جا رہے پشکر! اچھا، ہاں کی ماسا سے محروم رہ گئی۔ اس پر وہ دکھائی سے جلا۔ جیسی ناک کی مرضی۔ "بھرا اس کی عدم موجودگی میں اس کو جو رحمت اٹھائی ہے اس کا اس نے عقلی حال نہ کیا۔ ایک کام کی کتاب کیسے کھولیں۔ نئے بیز پر لگنے کی دولت کیسے اڑھل دی۔ جس کے نتیجے میں اس کے ہنسے ہوئے خوش کیسے برباد ہوئے۔ ایک دن بخار میں مبتلا ہونے پر اس کو پانی دینے کے لیے گھر بھر میں کیسے کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔ ان باتوں کو اس نے ننگ مرچ لگا کر بیان کیا اور بولا۔ "بہت اچھا ہوا جو تم علوی آگے۔ میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔"

اس نے اس کا ہاتھ اٹھاؤں نہ کر دیا۔ اس پر ایک قسم کا لالہ طاری ہو گیا۔

اُس دن ان اپنے شوہر کے ساتویات کرنے کے ٹوڑ میں رہی۔ بعد میں تو فخریہا ہند بھر میں سے خاموشی اختیار کر گئی تھی۔ اس بچے نے تو اس نے اپنے بیٹھنے کو کوئی خلل کھانا نہ اُٹھولے اس کو۔ بھائی صاحب اپنے خلاص کھینچتے تھے کہ "پشکر اچھی اپنی چاہی کے پاس ہے جو اس کی دیکھ بھال کرتے کرتے تنگ آگئی ہیں اور دوسری شادی کے لیے اس کے ہاتھ کے پیچھے کھڑے ہیں۔ یہ خطا اس نے چڑھا، لیکن ان تین لیا۔

وہ بار بار اپنے آپ کو جتا رہی تھی کہ اپنے بچے کے لیے اس کا دل صاف ہوا۔ اس میں کوئی جھل کیٹ نہ ہو۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "مجھے چاہیے کہ میں اس کے دل کی انھیں کو کھولوں۔ سمجھاؤں کہ اس کے لیے مجھے بہت کڑے اپنا بیت ہو چکا ہے، لیکن اس کے لیے تو وہ چاہا ہی ہو گا۔ اپنا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہر بار اپنے شوہر کی تسکین کے لیے ایک نایک سنا بہت تلاش کر کے اس نے اپنے آپ کو کھیا یا بھیا۔ اس کے تین اچھی تخت میں رہی بھری نہیں رہے دی۔ ایک دن اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ دونوں ایک جان اور دو قاب ہیں۔ ایسا جو اس کا خیال تھا وہ بے بنیاد تھا۔ اب وہ خیال کرنے لگی کہ وہ جو بہن میں ایک الگ وہ دونوں ہیں، جن میں دوڑیں پڑی ہیں اور ان میں ہمارے کئی کوئی بہت نہیں کر سکتا۔ اب تو اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ایک عرصے بعد اس کا اپنا بچہ پانے والا تھا جیسے اپنے ہاتھوں کے دکھ درد کو اس نے ختم نہیں ہونے دیا دیکھ ہی اس کے شوہر نے بھی یہ دیکھ اپنے دل میں بدل گیا ہو گا۔ اس نے بلا وجہ اپنے آپ کو تحقیق میں کھپا دیا۔ اپنے علمی انہماک، مطالعہ اور تحقیق کے شوق کے نتیجے میں اس نے کئی ہی مسیاری کی باتوں کی تخلیق کی تھی۔ علمی انداز پر ملکی میساری رسالوں میں اس کے متعدد تحقیقی مضامین شائع ہو چکے تھے۔ جہاں جہاں دھماکا ہوا اسے اس کے طالب علم ملتے تھے جیسی اس کی تعریف کرتے دیکھتے تھے۔ باپ سے بیٹا سواہی ہو، اس لیے میں اس کو شہر سے لے آئے تھے اس کی تعلیم میں داخل کر دی گئی۔

ابھی تو وہ بچے میں مل رہی تھی۔ لیکن وہ ابھی سے اس کے رنگ روپ، شکل و صورت کے پسند دیکھنے لگی تھی۔ لااقرنے مجھے کتنا ترسایا۔ میں اب سے تیری راہ دیکھ رہی تھی۔ اچھی تو جہاں سے ماہ باقی ہیں۔ تو کس پر پڑے گا؟ اپنے بچا پر؟ یا مجھ پر؟ تیری ناک اور آنکھیں کیسے ہوں گی؟ تیرا رنگ کونسا ہو گا؟ نام کون کا ملے گا؟ تیری سے میرے سامنے بیٹے ہے۔ بھلو۔ تو۔۔۔۔۔ کس نام سے تجھے پکاروں؟ آٹھ گھنٹے کا گروپڈ پڑ ہاتھ رکھ کر وہ اپنے والے اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کرتی جلی جاتی تھی۔ اس بات چیت میں وہ اتنی کھوکھی تھی کہ گھر آئے اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ بھی باز نہ کی۔ وہ دیکھ باری آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تھی۔ میں میں ملنے ڈالنا اس سے مناسب نہیں سمجھا۔ اپنی چائے اس نے خود ہی بنائی۔ پیٹلے تو اسے اچھی نہیں مل رہی تھی۔ گودوہ انھیں آیا تھا۔ بھر بھی جاسے میں وہ ذائقہ نہیں تھا جو اس کے ہاتھ کی بنی چائے میں

۲۲

اُن کے عظیم دہاب دار مستقل کنش ان کی کئی ہیں۔ فی الحال وہ تنقید کے نہیں۔ تحسین کے سختی ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ ۵
مجھ پر تنقید کر کے وہ جاوید
اپنے بارے میں سوچتا ہوگا

نہیں امر دہوی
کراچی

مومن درموج

مصنف: جناب راجندر بھادور مومن

قیمت: تیس روپے

لئے کاپی: مکتبہ جامعہ لکھنؤ، جامعہ علی، دہلی ۲۵-۱۱۰۰۰

جناب راجندر بھادور مومن ایک کھنڈ شاعر ہیں۔ پیش نظر کتاب مومن درموج اُن کی خیالات کا تیسرا مجموعہ ہے، جس میں پوئی، اُردو، اکاڑی نے انھیں اپنا رُخ عطا کیا ہے۔ جناب راجندر بھادور مومن ایک معتبر شاعر ہیں۔ اُن کے کلام میں متقدمین کے پُر و نادر روایات کی دلچسپی کا چاشنی بھی ہے اور عہد حاضر کے انسان کا وہ کرب بھی ہے جو اُن کے کلام کو ایک نئی جلی محاسن کے ساتھ ان پچھین کا احساس دلاتا ہے جو محروم ہیں۔ ناکام ہیں اور نامرادوں کا عظیم حلقہ ہوتا ہے اور ان حالات کا بھی عکاس ہے۔ جو پھول کے جمال میں بیٹھی ہوئی اُس آگ کا پتہ دیتے ہیں۔ جو جنابت کے گہرے سمندر سے اُٹھ کر مومن سے والہانہ طور پر ہمکنار ہو کر ظالم سے کھیلنے کا طریقہ بخشتی ہے۔

کا بیوں کے ساتھ اُٹھے طوفان کے ساتھ کھیلے

ایسے بھی دور رس کھیلوں کی زندگی میں

مومن صاحب کی شاعری پُر خلوص جذبات، شہادت، شہسنت زبان، عموماً جرات، اور شدت احساس پر مبنی ہے۔ وہ قدیم اور جدید انداز کا احترام کرتے ہیں اور اپنی بات کہنے کے لیے وہی انداز چاہتے ہیں، جس کو وہ نفس موضوع کے اعتبار سے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ نازک خیالات کے اظہار اور فنی واردات کے بیان پر قدرت کا ملکہ رکھتے ہیں۔

آسان نہیں ہوتی۔ راہِ غبت بھی

ہاتھوں سے گزرتے ہیں پھولوں کے شنائی

عندہ سوز و ساز میں نغمہ سُر خوشی کہاں

دل ہی میں جب نہی نہیں پوٹوں پہ چھین چھین کہاں

اور غزل لکھی دلوں میں سوز گرا زید لکھی تھی اور آج بھی دلوں کو

تڑپاتی اور گرماتی ہے۔ غزل کی تڑپ اور گرمی اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک جناب مومن نغمہ سُر خوشی جیسے احساسِ دل شعرا کے دل و ذہن کا نازک لڑائی لڑیں گے۔



نئی کتابیں

نیم تراشیدہ صنم

مصنف: جاوید اکرم

ناشر: میناکشی پبلشرز، ۱/۱۰۰، سول لائنز، فتح گڑھ، پوئی

قیمت: ۱۵ روپے

میں نے کسی زمانے میں اپنی کیا تھا کہ

سینہ رنگ میں ترپتے ہیں

نئے احسان نام تراشیدہ

اور

مجھ سے ہی طالب پرستش ہیں

میرے احسان خود تراشیدہ

تو مجھ سے یہ تراشیدہ اور خود تراشیدہ احسان عزیز جاوید اکرم امر دہوی کے ناز و تجوید میں نیم تراشیدہ صنم کے روپ میں نمودار ہوئے۔ میری پہلی صفت 'نیم تراشیدہ' تھی۔ یہ دیکھ کر سرت ہوئی کہ جاوید اکرم نے ان احسان کو نیم تراشیدہ کر دیا ہے۔ اور وہ دل میں آج کل نگر و بان کے جوڑ بچے کھلے ہیں اور تخیل و تخیل کی جو سمیتیں اور مہربانی پیدا ہوئی ہیں۔ جاوید اکرم کے کلام میں اس کا واضح عکس نظر آتا ہے۔

بقول رئیس بھی جاوید اکرم اور غزل کے نئے رجحانات سے متاثر ہو کر سرور ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کی شاعری کو قدیم اور جدید روایات کا خوب صورت سنگم کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور یہ کہ جاوید اکرم اپنی تلاش و جستجو اس طہر جاری رکھیں گے اور اس وقت میں غزل پر کھڑے ہیں۔ اسے اپنے شعری سفر کا نقطہ آغاز ہی تصور کر لیں گے۔

میں ان توقعات میں نہیں بھیجی کہ تمام خیال و ہم زبان ہوں۔ جاوید اکرم میں وہ تمام شعری صلاحیتیں اور فنی استعداد موجود ہے۔ جو کہ دنیا کے سخن میں

آغا علی خاں

منوارتے رہیں گے۔

اکرم فاروقی،

افکار پریشان

شاعر: آثر انصاری

ناشر: نگارہ پبلیکیشنز، منو ناٹھ بھجنی، یوپی

قیمت: پندرہ روپے

”افکار پریشان“ اثر انصاری کا غزلوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ پہلا شعری مجموعہ ”کین دکن“ کے نام سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا، جسے اتر پردیش اردو اکادمی نے اہم بھی حاصل ہوا تھا۔

”افکار پریشان“ شاعر کے ذہنی کرب اور نفسی گرفت کا امتزاج ہے۔ جس میں زندگی کے گہرے مسئلے اور اپنے دور کے بے گنتے ہوئے نعوش کے بیدار خوابوں کی کاروائی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۱۱ غزلوں پر مشتمل اس مجموعے کی ورژنگزنی بھی اپنی کثرت میں کافی کامیاب دلائے بغیر نہیں رہتی۔ بجز کی ترتیب کے چند متفرق اشعار دیکھے جو ذہن دل کو اپنی طرف کھینچنے نظر آتے ہیں: ۵

کون ہے اس اداسے جو حسرتام
رکھی جاتی ہے گردشِ ایتام

رنت بردوش ہے برائے گل
دیکھیے کیا جن کا بو انجم

داروشتِ دل پائی تو کسب ہوگا
حزقِ قریب ہے بندہ گئی تو کسب ہوگا
شبِ فراق ٹوٹ جاتے کی بھورت
نگاہِ شوق پر ہجر گئی تو کسب ہوگا

بیسے جیسے جذبہ جن مل گشت گیا
زندگی بھی رفتہ رفتہ حسیدِ جو ہل گیا

گزر گیا ہے فضا سے بسلائے انسان
خود اپنے دل کی جہوں میں مگر اتر نہ سکا

مطلب یہ بھی ہو یا رب شعورِ بیدار گری
ہم اسے زخم کو بھی حاجتِ رفو بہت

”افکار پریشان“ کی ترتیب میں سال پہلے عمل میں آئی تھی اور اگرچہ سیرا اعتقاد میں رضوی مرحوم اثر انصاری سے ذاتی طور پر واقف تھے، لیکن مقصد کی محض تحریری گزارش پر انہوں نے ایک مختصر اور پختل تعارف لکھ دیا، جو مرحوم کی بے پناہ انسان دوستی اور شرفِ ادب کا ثبوت ہے۔ بقول ”مستادمعنا“ غزل میں سوز و گماں اور پختل بیان کا مطالعہ کرتی ہے وہ ان کی (اثر انصاری) غزلوں میں فراوانی کے سبب سمجھ کر ہے اور مزاج میں وہ شائستگی ہے جو ہر جن

کی عظمت، ابتداء اور غیر متوازن جذباتیت سے بجاتی ہے۔

نختِ جگر (مجموعہ کلام)

معین: جگر جالندھری

ناشر: مرواد پبلشرز، گورنمنٹ کالونی، پٹنالا

قیمت: دس روپے ۲۵ پیسے

”نختِ جگر“ جگر جالندھری کا دوسرا مجموعہ کلام ہے، جو حکومت پنجاب کے مالی اشتراک سے شائع ہوا ہے اور جسے ہر پردیش اردو اکادمی سے اہم سبھی موصول ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں تیس غزلیں، سولہ نظمیں، چھتیس قطعات اور اڑتالیس متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۳ صفحات پر مشتمل آٹھ افراد کے فہرستات، بھی ہیں جو شاعر اور اس کی شعری صلاحیتوں پر تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں ان کے استاد جوش ملیح آبادی مرحوم اور شاعر یا لکونی کے تاثرات قابلِ غماز ہیں، جن کے اقتباسات بالترتیب درج ذیل ہیں، جو جگر جالندھری کی شاعرانہ حیثیت کے نقیض میں ضلزل راہ کا کام دے سکتے ہیں۔

”میری رائے میں وہ (جگر جالندھری) زبان اور فن دونوں کا پیر اور ان کے کھڑکے شعر کہتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور ان کی پختہ رائے ہیں۔ حسرت و زوال کو اسے اور فن کے دوسرے معنوں سے ہمیشہ نکال دیتے ہیں۔“
”شری دھرم پال جگر جالندھری کو ان کی پختہ گوئی کی وجہ سے میں عملی طور پر فارغانِ اصلاح قرار دے چکا ہوں۔ جو کچھ فن شراور فنِ عروسی سے وہ مکمل واقفیت رکھتے ہیں، اس سے شعر کہتے ہوئے ان کی شہرہ تمام پہلوؤں پر نظر پڑتی ہے۔ کیا مجال ہے کہ خیالات کے انبار میں کوئی انہیں چھوڑ دے پائے۔ اور انصافاً ہم شری قلید جوش ملیح آبادی کا یہ شعر ان کے کلام پر صادق آتا ہے: ۵

”ہم سے کس بات پر ہم بھینس گئے حریفانِ سخن
ہم نے اُلجھا ہوا مضمون بھی انھیں ہی انھیں“

ان تمبروں کے بعد بھی اگر بعض حریفانِ سخن کو جگر جالندھری کے یہاں ”انجھے جبرے نصاں“ کی کمی محسوس ہو تو انہیں اس پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جگر جالندھری کا تعلق قائدانہ دماغ سے ہے۔ ہاں اس شعری مجموعے کے انتخاب کے تعلق سے وہ دروازہ سے زیادہ بڑھا کر کھینچنے کی پروہکارِ عالم میں نے انہیں دوقِ غمازِ عکاسی وہ انہیں کسی سلطان سے بھی اشتراک دے، جس سے ان کے جگر جالندھری کی ہوجوں میں اضطراب پیدا ہو سکے۔
”نختِ جگر“ کی طہارت و شرافت میں خوش سیلی کے کام لیا گیا ہے۔

محمد نعیمی

ادراک، منظر و ادراک

ادارہ تحریر: محمد سلیم اللہ، ولی احمدی، سیدتیجس

قیمت: پانچ روپے فی کاپی

صفحات: ۸۰ سائز: ۲۰x۳۰

حال ہی میں شائع شدہ رسالہ ادراک ایک غیر وقفہ بند Non-

Periodical خالص معیاری ادبی رسالہ ہے۔ جو جدید و قدیم اور نظم و نثر کی بالادستی سے ادر ہے۔ اس میں مختلف رجحانات و میلانات اور یکایک فکر کے ظکاک و یو کی تعلیقات کو ایک مائتہ بیس کرنے کی کامیاب اور مستحسن سعی کی گئی ہے۔

"ادراک" کا پبلشر اول چھپوں پر مشتمل ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سب کے ضمنی عنوانات پر اداریہ کی نگاہ کے ضمنی عنوان سے منسوب ہے، جس میں محمد سلیم اللہ نے ادب میں کسی نظریاتی بالادستی یا کسی خاص مدرسہ خیال کی ترجیح کی بغیر مصحح تصور کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے کہ ادبی تعلیقات کو نظریاتی قصب سے پاک رکھا جانا چاہیے۔

"نقد و نظر" میں سات تنقیدی مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں دو مضامین محمد سلیم کے تازہ شائع شدہ اضافاتی مجموعہ "ایک دور" سے نقل رکھے ہیں۔ یہ دونوں مضامین تنقیدی کم اور تاریخی زیادہ ہیں۔ تنقید ریاض کی زبان بنیادی طور پر تنقیدی نہیں۔ اس حصے میں ڈاکٹر طاہر حسین ششاد کو معذرت "شعابول کی صلیب کا شام" لافظ مطالعہ ہے۔ انہوں نے اس معذرت میں کرات علی کرات کی شاعرانہ الفاظویت کی بھرپور نشاندہی کی ہے۔ محمد سراج الحق برق نے "بہارِ بزمی اور ضابطہ سمانت" میں ہمیں کو ایک نئی بہت سے سمجھے کی کاوش کی ہے۔ اختر کاظمی نے اپنے موضوع پر بچہ پرداز افسانوی کردار "سے انصاف کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ "سکڑا" ایک مطالعہ "ڈاکٹر فخر علی احمدی کا جاندار اور ضابطہ انگیز معجز ہے۔

"جذبہ دروں" کے تحت سات نظریاتی شاعری کی گئی ہیں: جمیدہ، ریاض کو دوڑوں نظریوں "نذر فراق" اور "خانہ کائنات" میں بلال کی شش اور ذرا ثانی کا احساس ہوتا ہے۔ افسانوی دھجی کی نظر "زوال شہرستان" طنز و مزاح پر شاعری کی بہترین مثال ہے۔ ذرا فاضل اور اسکو تحریر کی بھی شاداب، شگفتہ اور اثر انگیز ہیں۔ طاہر جونی برق کی نظر "ذرا قبائل" استاد اور فن کارانہ بصیرت کی ایک بھی مثال بھی حاصل ہے۔ "آئینہ و آئینہ" کے تحت تین اور میری شاعری کے عنوان سے ڈاکٹر مظہر الرحمن نے اپنے تخلیقی نقطہ نظر کی مکمل وضاحت کی ہے۔ گرچہ بعض جگہوں پر ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کی گنجائش ہے مگر اس کی جامعیت اور منطق سے مغرب نہیں۔ انسانوں کے حقد میں جو گندہ ریاکار "بہتات کوئی نہات" ضعیف حادید کا "بائے آسان" اور شرفی عالم قوی کا "پروہی کیس" بہترین افسانے ہیں۔ غزلیں "عصیت دل" کے ضمنی عنوان کے تابع ہیں، جن میں بایں غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ غزلوں میں بہزاد فاضلی، سلاہدیز

ملک، تھانہ آزاد، لطف الرحمن، مظہر حنفی، بشیر عبد، شمیم فاروق، مصطفیٰ، منظر، اعجاز جاوید اکرم اور ولی احمدی کی غزلیں شگفتہ اور اثر انگیز ہیں۔

سب سے آخر میں تبصروں کے لیے "بہانے" کا ضمنی عنوان مقرر کیا گیا ہے۔ ان میں تین کی کتاب لبرل پر ولی احمدی نے وسیع اور جامع تبصروں کیا ہے۔

قیمت

اڑتے لمحے (افسانے)

مصنف: ستیش بڑا

ناشر: مسکت کہانی کار۔ فرید آباد ۱۳۱۰۰۳ (۱۳۰۰/۵۲)

قیمت: ۲۵ روپے

ستیش بڑا کے افسانوں کا یہ چوتھا مجموعہ ہے۔ خاص ہے وہ طویل موصد کہانیاں گھر رہے ہیں۔ وہ افسانے میں کہانی بن، جزبات نگاری اور دل چسپ زبان میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کی کہانیاں مختلف دستور و موضوعات کا املا کرتی ہیں۔ کسی جھولے سے واقعہ عام سے کردار، پٹکے سے احساس کو سیدھے سامنے ڈھنگ سے بیان کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ نہ تو وہ بندھے ٹکے اصولوں کی پابند ہیں اور نہ نفسانہ رنگ اختیار کرتی ہیں۔ بس زندگی سے چھڑ چھاڑ، پیار، غم، غصہ، ہمدردی، کبھی بھی زندگی اور طوطا کا شہوت دے کر امانک ختم ہو جاتی ہیں۔

بہتروں رنگوں اور موادوں کو گھر بننے کی کوشش کرتے ہیں جو زندگی اپنے گھر دے دینا چاہتے ہیں اور اس پائی لطف سے کچھ لادن کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تاریک افسانہ لیتے ہیں اور اس پائی لطف سے کچھ لادن کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں وہ جذباتی ہوتے ہیں کہانی انہیں اچھوٹا دکھا کر ادھر ادھر ہو جاتی ہے۔

تیرا پھاس جذب صورت اور نکل زندگی کے خواباں ہیں۔ یہ میں کہانیاں آسانی اور دل چسپی سے پڑھی جاسکتی ہیں۔ ان میں جدیدیت یا کسی اور کم تلاش معنی ہوگی۔ ہر لے سا چہیتہ ایک ہی مبارک، باکی معنی ہے کہ یہ کتاب اس کے الی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اردو کے لیے جہاں ہر کچھ ہو قابل تہن ہے۔ اس قسم کے تعاون سے پیچھے والی کتابیں سستی پہلے جاتیں۔

ایک آنکھ والا ہرن

مصنف: ادم کرشن رات (افسانے)

ناشر: ادبی سنگم ۵۱/۵۲ فرید آباد ۱۳۱۰۰۳

قیمت: ۵ روپے

ادم کرشن رات تقریباً چالیس برس سے غزلیں اور افسانے لکھ رہے ہیں۔

ایک آنکھ لاپرواہانہ شاہد ان کا چہانسانی رویہ جو ہے، جس میں بارہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ روشنی سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کہانیاں ان کے ادبی مغرب کی کسی موزار اور دور کی نشاندہی کرتی ہیں، لیکن ان میں سے چند کہانیاں ایسی ضروری ہیں جو کچھ چند برسوں میں ہونے والی معاشرتی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں اور امدادی زندگی پر ان کے اثرات کا اظہار کرتی ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ لب پر لاسکتے ہیں۔ راستہ کی کہانیاں گہرے طنز، غم و غصہ، تہذیب و احساس اور مظلومیت کی آئینہ دار ہیں۔ انکی نگارندگی کو وہ جذباتی جوہر ہے کہ انکھ اصرار کرتے ہیں، لیکن اس پر تابو نہیں پاسکتے۔ وہ ادب ہنری سے متاثر ہونے کے باوجود اس کی نئی چیزوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ وہ ادب ہنری کی چابک دستی، اختیار پسندی اور بلائی پر گرفت تک نہیں پہنچتے۔

راستہ اور اداسی میں بیچ چند اور اندیم قاضی اور ترقی پسند تحریک کے اثرات تک محدود ہیں۔ اس کے بعد وہ اردو اداسی کے طے سے الگ ہو گئے۔ پھر بھی اُن کی کہانیاں دل چسپ، سادہ اور با مقصد ہیں۔ انہیں کبھی سماجی تقاضوں کی تکمیل کی بات کرتے ہوئے کسی حد تک صبر زدہ ہو کر ہونے گئے ہیں۔ شاید یہ مومنواری ہی ایسا ہے کہ انکھ کو جھینکے تو چھینے آتے ہیں۔

یہ کتاب بھی ہر ماہ نامہ سہیتہ انکیت کی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت مناسب بھی جاسکتی ہے۔

شروان کارورا

سات سمندر

مصنف : ذبیح الزمان خادر

قیمت : بیس روپے

ناشر : مودرن پبلشنگ ہاؤس، لاہور مارکیٹ، دہلی گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۔
زیر نظر کتاب غزلیات کا مجموعہ ہے۔ مصنف کی یہ آئینوں میں شاعری کتاب ہے۔ فلیپ پر منظر عام، ڈاکٹر عنوان، ڈاکٹر قرقر میں کی آواز میں "سات سمندر کا نام" حرمت الاہام نے۔ مقدمہ ڈاکٹر ظفر نے لکھا ہے۔ دو باب ڈاکٹر کیاں چند نے۔ بیٹن لفظ ڈاکٹر سلیمان اظہر ماریڈ نے لکھا ہے۔ سات سمندر کے نقاد بھی سات ہیں۔
بلا ناثر جو اس مجموعے کو دیکھنے سے آنکھ لٹے وہ یہ ہے کہ اس میں کلاسیکی انداز کی جھلکیاں ہیں اور جدید عالمی اور استعاراتی انداز شاعری کے مومنین نمایاں ہیں۔

مصنف کے ہاں ذات ایک شے کے لیے بھی شاہ کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ان کی نثر ایک آئینہ عکاس ہے۔ ان کا لکنا چاہا جس پر آئینے میں نظر آتا ہے۔

مجموع میں کچھ قصے ہیں۔ دو بول تراکیب ہیں۔ شاعری میں جذبات و احساسات کے نقش و نگار ہیں۔ یہاں کس سے عشق ہے۔ چھ چھوٹا ہے۔ شہوہ و شکایت ہے۔ فساد و انبسا ہے۔ عقیدت ہے۔ تنہائی ہے۔ کہیں کہیں گرم خون کی آنکھ کا احساس ہوتا ہے۔

ہے سیدل بھول ملک اس کی لاد زاروں میں
کرن کرن وہ ستاروں میں سلگتا ہے

شعور کن ترے سخن کا نقشہ کھینچے
کس سے غفلتوں میں لکھا ہے سراپا تیرا

بھول کے ساتھ و برساتے ہیں سچتر اکثر
خاور اس شہر کے لوگوں پر بھر و سدا کرد

مصنف کی غزلوں میں جدیدیت، عصری نگاہی ہے۔ کلام میں شگفتگی، جرجش اور لطافت ہے۔

رام لعل ناہوی

لیقہ : گولہ کا بھول

دیکھئے کہ کبر کس نے اُسے پسے بنا دیا اور بولی "جہاں بانی کے گھر میرے حال پر چھڑو۔ اسے لگاؤ" گھر سے میرے لال کھینچنے والے مردود کا اقد میرے جسم تک نہ پہنچے۔ مجھے میری اُس کے دل میں اس کے لیے اپنائیت جیسے سارے جذبات جھلس گئے۔

اس کے کہے سے باہر چلے جانے پودہ چوٹ چوٹ کر رونے لگی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔ "بیٹا، کو کون سی گھڑی میں آیا؟ تو بے وقت آیا۔ آج تجھے دیکھنے کے لیے تیری نانی زندہ نہیں ہے۔ تیری موی بھی نہیں ہے۔ تو اپنے بھائی ان چاکر اولاد سے۔ کتنا بے نصیب ہے تو۔" اولاد بچی بچی کے اوتھ پر ہم کی ملاوت ہوتی ہے۔ لیکن تیری ماہیت بدلے ہی انہوں نے مونہ مونہ کیا۔ اسے وہ تو بچے سمجھے۔ پھر اُنہی ہی نہیں، پھر انہیں ہے کہ تیری من موہی صورت کو دیکھ کر تو پھر ذرا نصرت ہو جائیگے۔۔۔۔۔ پھر ہم وطن۔۔۔۔۔ نہیں ہیں، ہم تینوں مکمل مل جائیں گے۔ میرے ہم کارواں، مڈاں تیرے استقبال کے لیے غرار ہے۔ گھر آتا ہیں بیٹا، میں تجھے جنم دے دانی ماں ہوں۔ تیرے پنا میں کیسے رہوں گی؟ تو میرا سہارا ہے۔ اندھ کے اقد کی لاقی ہے۔ میں تجھ پر اپنا سب کچھ بھروسہ کرتی ہوں۔ دل و جان سے تجھے پا کر ہوں۔ بڑا حال ہے کہ اولاد کمر کر گئی ہے میرا مذاق ان لوگوں میں اس کی پرواز کروں گی۔ تجھے دیکھنے کے لیے میں بے بسی ہو رہی ہوں۔ کب تیری باتیں میرے گھر میں نہیں کی گئیں گی۔۔۔۔۔ اس کی میں خطر چوں۔ اب انتظار کی گھڑیاں جنم چوں کو آتی ہیں۔ سو میرے لال سو جا۔ سوترا وقت پھر صراحتاً آئے اپنے بیٹے۔ بد کہ پھر تیری بولی وہ اپنے لال کو ملنا ہی تھی۔

بقیت بہتر

بلاخرہ یہ خصوص شمارہ چکیت کی زندگی، شخصیت ادراک کی ادنیٰ و غیری تصورات و میلانات کا بہتر عکاس ہے۔ ہم اسے صحیح سمجھیں "بہ قامت بہتر بقیت بہتر کا مصداق کہہ سکتے ہیں۔

"بقیت چکیت" کی ترتیب میں کافی واسطہ رکھنے والے کافی محنت کی ہے۔ چکیت کی نظر نگاری (پروفیسر عبدالغنی) چکیت کی شاعرانہ اہمیت (شارب ردووی) چکیت کی شعری میں منظر نگاری (فضل امام) اور چکیت کا تنقیدی شعور (عظیم حسنی) یہ تمام مضامین اپنے اپنے دلچسپ و دانشمندانہ مضامین میں چکیت کے فکری و تکنیکی اہماد و مہمات کی نشاندہی میں سعادتمندانہ ثابت ہوئے۔ دوسرے مسئولین مضامین بھی بہتر اور مفید و معلوماتی ہیں۔

بیس فرشتے میں رحمت الاکرام کی تاریخ و فطرت، جزوی شائع ہوئی ہے۔ ان کا انتقال ۶ رجزوی ۱۴۰۳ء کی صبح میں ہوا تھا۔ تدفین، رکوئل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح کو بخشے۔

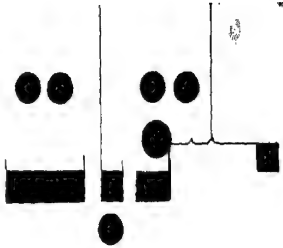
کارنامہ

پنڈت برج نرائن چکیت اردو ادب کی ایک ایسا نادر و قابل قدر سہتی تھے۔ آپ نے فن کی شاعری، فن اور شخصیت کو آگاہ کر کے اور منظر عام پر لانے میں لکھنؤ میں کارنامہ انجام دیا ہے

پروفیسر پوراشاد نارنگی اور مولانا اعتباریہ خاں قادری نے تمام جناب نعمت ابن نبی کی رابعیات چکیت کی ریاض، شارب ردووی کا آزاد سیکل چکیت کی شاعرانہ اہمیت اور جناب مالک رام کا معلوماتی معنوں مرقی چکیت خاص طور پر مجھے پسند آیا۔ امید ہے آپ اس سلسلے کو دوسرے (پروفیسر) کے لیے بھی جاری رکھیں گے۔

واقعہ نمبر

میں فراموشی آپ کا کارنامہ ہی کہوں گی۔ چکیت پر آپ نے اتنے کم صفحات میں بہت ہی دقیق اور خوبصورت تحریر شائع کر کے مجھے تازگی کے لیے آگاہ قدر رحمہ فرما رہا ہے۔ چکیت کی شاعری، شعر، اور ان کی تازہ و شگفتہ پیمتر ایموں سے بہت ہی معیاری اور جامع مضامین لکھ دیے ہیں۔ خاص طور پر یہ مضامین چکیت کی نظر نگاری (عبدالغنی) چکیت کا تنقیدی شعور (عظیم حسنی) اور چکیت کی شاعرانہ اہمیت (شارب ردووی) بہت ہی محنت اور ذوق و توجہ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اپنے منفرد انداز و اسلوب اور مطالعہ و استدلال اور اسٹیلنگ تجربے کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ سماجی نوعیت کے مضامین میں چکیت لکھنوی (مرزا جعفر حسن) چکیت اور ان کا خاندان (افغانی) لکھنوی پر



شادی مرگ

جب کسی نے بقیت چکیت (نظر) ترتیب دے کر شائع کی اور اس کا ایک نسخہ محض مالک رام صاحب کو بھیجا تو انہوں نے جواب میں لکھا تھا کہ اگر اس (بقیت) چکیت کو چکیت اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو شادی مرگ ہو جاتے۔ چکیت صدی برس نمبر دیکھ کر مراد لے بھی جاتا ہے کہ مالک رام صاحب ہی کے الفاظ ڈھیر اوروں۔ بہت سی دعا ہیں۔

کالی داس گپتا صاحب

نانہ انصافی کا ازالہ

چکیت کی طرف توجہ دے کر آپ نے ایک نثری نانہ انصافی کا ازالہ کیا ہے۔ لوگوں کے نزدیک ایسے ماسٹر ورائٹ ہیں، جنہوں نے ایم۔ اے کا کلاس لکھا، لیکن وہ مروجہ نثر اور شاعرانہ لائق سمجھنا نہیں جس نے اردو کے دامن کو غلام نثر سے لالہ مال کر دیا۔

"چکیت صدی برس نمبر" بہ قامت بہتر ہی، لیکن بقیت میں قیمت ہے۔ آپ نے اسے اس سیاق و سباق سے ترتیب دیا ہے کہ چکیت کی شخصیت اور ادبی خدمات کے مختلف پہلو کا احاطہ ہو گیا ہے۔ مضامین میں محترم مالک رام، ڈاکٹر عبدالغنی، ڈاکٹر عظیم حسنی، ڈاکٹر فضل امام اور ڈاکٹر شارب ردووی کے مضامین نے صرف معلومات فراہمیں بلکہ نثر و فکر کے ساتھ ساتھ لکھے گئے ہیں کالی داس گپتا صاحب کے دونوں مضامین اس امر کی مزید توثیق کرتے ہیں کہ انہیں چکیت پر سزا تصور کرنا چاہیے۔ نفاذ ابن نبی صاحب نے رابعیات کی فصل میں خراج عقیدت پیش کر کے کہ ایک نئی راہ نفاذ ہے۔ میں اس معیاری فکری و شاعری پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ابن خدیو، علی گڑھ

آغا علی نوری دہلی

ساتویں تاواہستہ چوٹی کا لغز س ۱۹۸۳ء کے نئی دہلی کے دیکھان بیرون میں انعقاد کے موقع پر ڈاکٹر گوپال آف انڈیا ونا ننگ اینڈ وٹرو لپسٹی مہانت سکار
 کے زیر اہتمام ایک نمائش دکھائی گئی، جس کا عنوان تھا "تاواہستہ ترکیب کا کہانی" اس نمائش کا ایک نظر



▲ مارچ ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے دگیان بیون میں بھارتی قومی ترانے کے احترام میں ایستادہ وزیراعظم شری اندرا گاندھی، ناوابستہ تحریک کے سیکرٹری جنرل جے پی این اور دیگر باکے صدر عزت کب ڈاکٹر فیمل کاسٹرو اور موجودہ جرنل میجر جی مرن نور سنگھ۔
▲ مارچ ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے دگیان بیون میں ناوابستہ تحریک کے سیکرٹری جنرل جے پی این عزت کب ڈاکٹر فیمل کاسٹرو وزیراعظم شری اندرا گاندھی کو شکریہ تحریک کی جی جی این چیرمین منتخب ہونے پر مبارکباد دے رہے ہیں۔



آج کل

۵

۱۲/۵/۳۵
۱۲/۵/۳۵

کاظم علی خاں : مطالعہ خطبات شریف

شرف — فون پو شام دہلی کلام گرمی برقی دستاویز

عزیزت علی : سفرنامہ — آزادی کے بعد

سفرنامہ نگاری لارڈ رانا لکھنوی

شعری تخلیقات : غنیمت کرمانی ، اندر و بیرون

نذیر بٹاری : کتب لکھنوی

امیر کاٹارہ افسانہ : اصلی نقل

نقشہ نقشہ کاراجہ : جام و گلاب

گوشہ امتیاز

محمد مجاہد نے ہندوستانی نژاد سکھ ۱۶ مارچ
۱۹۸۳ کو نئی دہلی میں پنجابی زبان کی
مشہور شاعرہ شرمی امرتا پریم کو، اولاد
گیاں پیٹھ ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔

۲۳ فروری ۱۹۸۳ کو نئی دہلی میں، وزیراعظم
شرمیتا اندرا گاندھی 'شرمی' انٹرنیشنل کی
مرتب کردہ کتاب 'مولانا آزاد' —
ایک سیاسی ڈائری' کا اجراء کرتے ہوئے
دائیں جانب: ڈاکٹر شرمی (بجے پیٹھ)
لیکن پارلیمنٹ کی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ▼



اُردو جازہ کیٹی اُتر پڑنے کی جانب سے جنت نشان تعلیمی مشن، مراد آباد میں منعقدہ فکشن میں فزاق گورکھ پوری کچھل سوسائٹی، جامعہ نگر، دہلی کی جانب سے پیش کیا گیا قومی یکجہی کے موضوع پر مبنی آنجہانی کرشن چندر کا ڈرامہ ”دروازے کھول دو“ کے چند مناظر

▼ ”اُس سے ہمیں :- انصاف حسین (مرزا ارشد حسین)، عبدالرشید خاں (کلن کانت)، سوز احمد (منکبت رام دال)، محمد نعیم خاں (مکرمی)، عبدالرحمن (ڈاکٹر ٹیڈ وڈ کولیو)، رئیس الاسلام (رام بھڑے)، منصور علی ریاض (نیک آف بابل)، صوفیہ خاتون (ایزابیلا کولیو)، عائشہ خاتون (شیخہ ساجدہ)، عبدالرب کاہدار (سائنس دان کریم اللہ)، عظیم حفیظی (اقبال دینی)، اشرف سعید (دوگر)، محمد علی (سکھ پڑھنی)، شبانہ اسلام، محمد نعیم (میں میاں) (مصباح الاسلام (شکورا)۔



منصوبہ کے لیے پیکیٹریکٹر کا حصہ ۹۳۹۵ کروڑ روپے کا تھا۔

صورت حال ایک جلیغ کی طرح بنی ہوئی ہے۔
 اس جلیغ کا مقابلہ، معاصر ارادہ اللہ بہرہ کالی علی باقی
 اقدامات سے کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے اہل فہم
 مال اور تربیت یافتہ اور ذہین اشخاص کی کمی نہیں۔
 کم خرچ نصیب ملک نہیں آگے بڑھ چکے ہیں۔ کوئی وجہ
 نہیں کہ ہندوستانی معیشت کے جس میں مستحکم نہ
 ہو سکے۔

ملاحظات

متحکم معیشت کی طرف

نئے سال کی آمد کے ساتھ ساتھ ہندوستان نے دنیا والوں کے سامنے ایک خاموش اور بڑا تیسرا تصور پیش کی ہے۔ ترقی پزیر ممالک میں بالخصوص برطانوی اور امریکی باہمی ہندسہ خرو و سرسبز رہا ہے۔ ہماری حیثیت پر نامساعد عمومی حالات کی گہری چھاپ کے باوجود زرعی پیداوار اچھی رہی ہے۔ اس امر کا اندازہ صرف اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ۸۰-۱۹۶۹ء میں ۱۰۹.۵ لاکھ ٹن پیداوار کے مقابلے میں ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۱۲۲.۰ لاکھ ٹن اور ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۳۲.۰ لاکھ ٹن پیداوار ہوئی۔ جو کم سے کم ترقی پسند کے باوجود ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۳۳.۰ لاکھ ٹن تک پیداوار ہوئی۔ قحط سال اور سالوں کے باوجود قلت برائے نام رہی ہے اور یہ اپنی طرح کو کم کار سماں ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ کم تر اہل سے کام نہ لیں۔ اسباب خاصوں سے اس لیے بھی ہے کہ جب ہم ۶۹-۱۹۷۸ء میں غلہ پیداوار سے اس کا موازنہ کرتے ہیں، چوں کہ وقت اپنے عروج پر تھی۔ ۸۳-۱۹۸۲ء کے لیے نشانہ ۱۱۷.۵ لاکھ ٹن تھا۔ بہر حال تاریخہ اور غیر موازنہ ملوثوں کی وجہ سے پیداوار اتنی ہی رہی جتنی کہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ہوئی تھی۔ یعنی ۱۳۳.۰ لاکھ ٹن۔

قتل کی وجہ سے ضروری ہو گیا ہے کہ اسٹھ سو کروڑ روپے کی مالیت کا چالیس لاکھ ٹن امریکی گیموں درآمد کیا جائے۔ اس گزراں قدر زربا زلہ کی بجٹ اسی صورت میں ممکن تھی، جب نومبر مہینہ ہوتا۔

بروقت فیصلہ

۱۹۸۲ء کو پیداواری سال کے طور پر نئے
حکومت کا فیصلہ اس سے زیادہ بڑھتے ہوئے
تھا۔ آئندہ جنسوں میں یہ اقدامات بارگاہ
موسم کے ہیں۔ پیداوار بڑھانے کے کافی مواقع ہیں۔

ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام
سیکڑوں میں زیادہ پیداوار کے لیے سرخوز گولگ جاس
بکلی کے سیکڑوں میں ستمبر ۱۹۸۱ء میں پلانٹ نوڈ نیسٹر
۸، ۲۳، ۲۴ فی صد تھا، جو کہ ستمبر ۱۹۸۱ء کے مقابلے میں
بہتر ہے (۲۱، ۳۱ فی صد)۔ بکلی کی قلت ۱۹۸۱ء میں
جہاں ۱۶ فی صد تھا وہاں ۱۹۸۲ء میں آٹھ فی صد
رہ گئی ہے۔ لیکن برائے نام تمام بھی معیت میں
اصل قبیل کا باعث بنی ہوئی ہے۔ دھماکیاں یہ کہ
۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۵۰ بیگ سیکڑ لونٹ اپنی صورت
۵۰ سے ۱۰ فی صد تک بکلی استعمال کر رہے تھے۔ بیگ
سیکڑوں میں نوڈوں کو کاری کر دہ ۸۰ ہستی و فتنوں میں سے
صرف آٹھ و فتنوں ہی پر وحیث کی شکل اختیار کر
پاتے تھے۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ریاستی کبجی بورڈوں
کو کل ملا کر ۶۷ کروڑ روپے کا سامانہ ہوا ہے۔ چھ

اردو کے ادبی معلقوں میں یہ خیر افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب درو اور کار کا خصلہ کائنات دہلی میں ۱۷ اپریل ۱۹۲۷ء کو بعد از قلب انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً ۳۲ برس کی تھی۔



وہ ۱۲ اگست ۱۹۱۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔
 ان کے والد وادوں کی مشورہ پر ذرائع واس کیوں کاس
 کے مالک تھے۔ وہ تعلیم فلک کے بعد ہی آگئے جس کے بعد
 یہیں مقیم ہو گئے۔ ان کا ایک بھائی مولانا محمد غلام غفر ۱۹۱۲ء
 میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں مولانا علی محمد
 علاء الدین نے کتب مجریہ رشیدیہ میں شائع ہو چکے ہیں۔
 ان کے دو بھائی رشید ادا اللہ علی کی اس طرح پوری پختگی ہے۔
 مرحوم نعلالی ہی میں پہلے ان کی شاعت کے لئے کادہ
 تعلقات حضرت مولانا نقیہیں۔ انہی کے وہ ان کی زندگی میں
 شائع ہو چکے۔ ان تعلقات کو ہم مزید نمونہ میں
 شائع کر رہے ہیں۔

کام دھسینو

خوشی کی بات ہے کہ مذہب کے کارکنوں نے علاقائی ادب کے تمام کھیلوں کا پسند فرمایا۔ ہم زیر نظر شمارے سے اس مسئلے کی ذمیت میں تبدیلی دیکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ تجزیہ ہے کہ آج کل کے مصنفات ہر کسی علاقائی زبان کے ایک اہم ادیب شاعر، ناول نگار کی متعدد تخلیقات تعارف کے ساتھ شائع کی جائیں۔ تاکہ اردو زبان میں سندھوستان کی اہم مقامات کی ادب سے کما حقہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

اس مسئلے کا آغاز ہم پنجابی زبان کی اہم شاعرہ، ادیبہ اور ناول نگار امرتا پریم سے کر رہے ہیں۔ جنہیں ہمارے ملک کی ادبی دنیا کے سب سے بڑے انعام گیلان پٹیل سے ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء میں نوازا گیا۔

۱۹۸۱ء کے لیے انہوں نے ادب کی شری تخلیق کاغذ نے کیوں "پر دیا گیا ہے۔ موصوف کو ساجیہ کا دی انعام گیلان پٹیل سے اور ان کی کتاب "مسند زمانوں بشمول اردو میں ترجمہ و شائع ہو چکی ہیں۔

انتباہ

ہمیں متعدد مقامات سے ایسے خطوط وصول ہوئے ہیں کہ کسی جملہ نامہ اپنے آپ کو "آج کل" اور "میں دوسرے سرکاری رسائل کا ایڈٹ بنا کر اپنا نامہ آج کل" کا زبلا نہ وصول کیا، جس کے نتیجے میں چند دہندگان کو رسالہ ہذا کا کوئی شمارہ نہیں ملا۔ ظاہر ہے ان حضرات کو رسالہ روانہ کرنے کی کوئی ذمہ داری ادارہ آج کل پر قطعاً عائد نہیں ہوتی۔ لہذا آج کل کے مجلہ کارکنوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ رسالہ ہذا کی وصولی کو یقینی بنانے کے لیے اس کا ذمہ سالانہ ماست جنرل منیجر پبلیکیشنز ڈورن پبلیکیشنز نئی دہلی کو ارسال کریں اور کہ وہ یہ چند مقامی طور پر کسی کو ہرگز ادارہ کریں تاکہ تنقید اس امر کی تصدیق کر سکیں کہ وصول کنندہ ہمارا مجلہ بخیریت ہے۔

ایک کر کے دی جاتی ہیں تاکہ جب ایک بھینس سوکھ جائے تو دوسری سے کام چلے جاسکے۔ پڑھنا کو سیکھنا کی جگہ سے تین ہزار روپے کا خرچ مل گیا۔ اسے ڈی آر ڈی ایس، چتر درگا سے ایک ہزار روپے کی مالی امداد بھی مل گئی۔ اس رقم سے خریدی گئی ایک بھینس خرید کر پڑھنا کے حوالے کر دی۔ اس نے دھرمی عورت کے لیے وہ دی خرمیوں سے بھر پور تھا۔

سطح غربت سے اوپر

پڑھنا بھینس کی خیر خواہی طرح ہونے پر راحت کی بھینس چار ہزار روپے دی تھی جس سے دس روپے روز کی آمدنی تھی۔ بھینس پر دو روپے روز خرچ آتا تھا۔ اس حساب سے آمدنی ملنے کے روز کی خالص آمدنی تھی۔ بھینس سے آمدنی ہونے کے باوجود بھی اس کے کنبے والے کمیت مزدور کے طور پر اپنا کام کاج کرتے رہے۔ اب گھروالوں کی آمدنی دیکھ کر ہوتی تھی۔ گھر میں اچھے پڑے اور سیکھیں اسٹین کے برتن ہوجانے کے سبب ان کے سہارے زندگی میں تیزی قابل دیدہ ہو جاتا تھا۔ جیسے بچے اب اسکول جانے کی کیفیت میں تھے۔ ان دنوں جب پڑھنا کا خاندان مطلق مزدوروں کی زندگی گزار رہا تھا، وہ لوگ اب انقدر غم نہیں کر سکتے تھے۔

پڑھنا اور اس کے خاندان کے لیے زندگی اب بڑی خوشگوار کی گئی ہے۔ تقریباً ایک ہی جگہ میں اس نے غربت کی لائن کو عبور کر لیا تھا۔

(دھرمی پڑھنا، اس کی بیارمان، تین بیٹے، ایک بیٹی اور ایک داماد ساڑھے سواڑوں چتر درگا (کرناٹک) میں واقع ملا پورہ نام کے ایک گرام گاؤں میں گھاس بھوس کی بنی ایک چھوٹی سی عید پڑی میں رہتے تھے۔ خاندان میں روزی مکنا والے عرف تین افراد تھے، جن کی وجہ سے پڑھنا کی زندگی بے تحفہ ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر ایک روز اس کی زندگی میں ایک غیر متوقع موڑ آیا جس نے اس کی زندگی رخ ہی بدل دیا۔

وہ لوگ بھینس میں مزدوروں کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ خاندان کا واحد درآمدی دن میں صرف پانچ روپے ہی کمایا تھا۔ جب کہ مزدوروں دن میں تین روپے کماتی تھیں۔ پڑھنا کو جتنا کچھ بھی حساب آتا تھا اس کی بنا پر اس کا خیال تھا کہ کل آمدنی تین ہزار روپے سالانہ سے کم ہی تھی۔ پھر ملا پورہ گاؤں کو اس روز اہمیت حاصل ہوئی جب اس گاؤں کو آئی آر ڈی پی ایچ میں لایا گیا۔ اس ایچ کے تحت معاونت کے لیے پڑھنا کی ایک کنبے کے طور پر نشاندہی کی گئی۔ سرورے اور کرڈٹ کیسوں میں اس سے کوئی ایسی کام چھنے کو کہا گیا جس کی فاصل آمدنی کا ذریعہ بن سکے تاکہ وہ اپنے کنبے کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے۔ پڑھنا نے بھینس اسکیم کو پسند کیا۔

بھینس اسکیم کے تحت اس ایچ کے فائدہ اٹھانے والے کو بھینسوں کا ایک جوڑا دیا جاتا ہے۔ بھینس ایک



مطالعہ غزلیات شرق

ہاتھوں کو دنگ کرنا پڑا ہے۔ غزلیات شرق میں ہر مگر کی ضامری مقدار چاہے کم
دہو، لیکن مہیا ضرور کم ہے۔ شرق کی نگارہ شہزادی پر اس طرح کا یہ شعر صادق آتا
ہے: ۵۔

نہیں ممکن کہ کلام فکر کئے مغرب ہے
برستہ ہے ہست نہاں، اگر مہمتے میں کم ہست ہے

شرق کا غزلیہ کلام بظاہر فکر و مہمت کی اس بلندی تک نہیں پہنچتا، جہاں قریب قریب
آتش اور موتن جیسے قدر آدل کے شاعروں نے غزل کو پہنچا دیا ہے۔ اہل عرب اول کے
غزل گو شاعروں تک تو شرق تک پہنچیں نہیں سوا بلکہ وہ قورندہ، صبا اور محتر جیسے
دوسری صفت کے شاعروں تک بھی پہنچنے کے قاصر رہے ہیں۔ ان کی ابتدائی مشق کے
کلام میں بہت سے وہ اوصاف معدوم ہیں، جن کی نشان دہی نقاد کرتے رہے ہیں۔
البتہ سنانی کے زمانے میں ان کا کلام کہیں دل نشینی اور لطیفی کی ان کیفیاتوں
سے خالی نہیں، جن پر نادہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ میرے یہ معروضات شرق
صبا اور بحر کے کلام کے مندرجہ ذیل نقاب کی معاصر پر مبنی ہیں۔

شرق: ۵۔ آزاد ہونے ہوں گے اسیرانِ ذوق و شوق

قالب سے لپٹے اور با جو تو جا سنے (دو اہل شرق میں ۱۰۰)

بحر: ۵۔ بیل چوک کے حال سے آزاد ہو گیا

لوغزلی میں بھٹسے کوئی رہا ہو تو جانے

صبا: ۵۔ چوٹے کی طرف نصیب سے شرفِ دوزخ

یہ بیل اسیر رہا ہو تو جا سنے

شرق: ۵۔ سنے ہیں نکاحی جاتے ہیں آزاد کی طرف

اس ماننے سے ہم کو شفا ہو تو جا سنے

بحر: ۵۔ مٹنی سے عاشقوں کی دوا ہو تو جا سنے

یہما بحر کو جو شفا ہو تو جا سنے

خواجہ آتش کے معروف شاگرد آغا جعفر کھنوی کے دہیاں ہیں ۱۰۱
غزلین شامل ہیں۔ غزلیات شرق پر تنقید کے ابتدائی لغوش مذکورہ ضمن معرکہ
زیبا تالیف ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئے جن کی روشنی میں شرق ملائم زبان کے ایک
ایسے خوش بچہ شاعر قرار پاتے ہیں جن کا کلام گرمی برق و صفائی بحر سے معمور ہو۔
لاکسری رام نے شرق کو ناظمِ مضمین خیال، شاعرِ جاوید و مقالِ کھلم ہے اور انہیں
مستیِ ہند و خوش فکر سلیس نگار زبان کا ایک ایسا شاعر بتایا ہے جس کے بیان میں
لطفت اور تشبیہ و استعارہ میں غنیمتِ جلوہ گر ہو اور جو فکر باریک بینی دکھاتا ہو۔
کلام شرق میں سلیس نگار، زبانِ ہند و دلِ معانی ہے مگر انہیں ہندو جڑاچھے
اشعار کی بنیاد پر مبنی ہذا خوش فکر یا فکر باریک نہیں کہنے والا شاعر قرار دیا جاتا ہے کہ
ایک ایسی نیم صداقت Hald Truth کے حال میں بھٹسا ہے جو کہیں
کبھی خاص بھٹوت ہے جی زیادہ پر غریب ہوتی ہے میرے نزدیک آغا جعفر شرق
سلیس اور نگار زبان کے شاعر و قلمرو ہیں، لیکن غور کیا جب وہ فکر کے میدان میں
قدم نہکتے ہیں تو ان کی فکر ان کی جال اور ڈھنگلے فکر و لہجہ ان کے استاد آتش کا
یہ شعر صادق آتا ہے: ۵۔

جال ہے مجھ ناتوان کی طرح بھیل کی طرح

پر قدم ہے پتھریاں رہ گیا دان رہ گشت

مرزا محمد علی کی کلام شرق میں مضمون، قریب کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ میر
نزدیک شرق کی غزلیہ سنانی میں غریب و ضرور ضرور ہیں، لیکن ان کے
اعلیٰ نمونے زیادہ نہیں۔ ان کے یہاں کہیں کہیں مین رول نہیں اشتباہ نکلتے آتے
ہیں، مگر ان بھولوں کو چھیننے کے لیے ہمیں بار بار انہیں دفعات کی خاک
چھنا چڑھنا ہے اور ایک ایک بھول کی دست پائی کے لیے دسوں کاٹوں سے

متباہ:..... سننے میں مددوں سے صبح زماں تہیں
 کچھ اپنے دردِ دل کی دوا ہو تو جانیے
 تلوہ:..... اگر کس طرحیں جو ہرے میں ہے تو ہو
 کچھ اپنے دردِ دل کی دوا ہو تو جانیے
 بحر:..... کیوں کہ یقین ہو کہ وہ پیسے ہیں یا سکہ
 ہمے جو کوئی وعدہ وفا ہو تو جانیے
 شرت:..... کس طرح اس تک اپنی رسائی کا ہو یقین
 اک دفعہ بھی قبول دُعا ہو تو جانیے
 متباہ:..... اُس ملکِ دل کے دل میں جاہلے قربا
 کندہ نگین پر حرفِ وفا ہو تو جانیے
 شرت:..... کیا جانیں آپ دردِ کسی درد مند کا
 صدر جو دُشمنوں کو ہوا ہو تو جانیے
 متباہ:..... آگاہ میری حالتِ دل سے نہیں ہیں آپ
 کچھ رنجِ دُشمنوں کو ہوا ہو تو جانیے
 شرت:..... دل بہت رہا ہے کُتھ دکر مات پر تو کیا
 مقبولِ باگِ خدا ہو تو جانیے
 بحر:..... محراب میں سمجھ کر کیے شبنم نے تو کب
 خجہ دے جو سجدہ ادا ہو تو جانیے
 متباہ:..... جو ریتاں میں سکر خدا ہو تو جانیے
 وقتِ تھنا مار ادا ہو تو جلیسنے
 ان اشار میں شرت قدم قدم پر متباہ اور کُتھ جیسے رنگے ہیں۔

یہ لہجہ موصوفہ شرت کی غزلیہ شاعری کے نمونے ہیں۔ انصاف کے زہر
 مایہ سخی نفس کے نقوش ملتے ہیں۔ انصاف میں بغیر اور دردِ دل کے آغوش
 میں پروان چڑھنے، شرت جیسے ادھوے کشتی نما زبان کے متمول نہیں
 کی زندگی میں اُس کا زور دُور دُور تک نہ تھا۔ بلکہ یہ سوال تو صبحِ طلب
 ہے کہ کچھ شرت کے یہاں انصاف کس راہ سے آیا؟ اس لئے تو کھیلنے کے لیے ہیں
 شرت کی کشتی کے اُس سلسلے پر نظر ڈالنا ہوگی جہاں تنقید تک جاتا ہے اور
 آتش کے انصاف سے چھلکے ہوئے کلام کی لہری ہی انصاف کو شرت تک پہنچاتی
 محسوس ہوتی ہے۔ آتش سے جل کر شرت تک پہنچنے والی انصاف کی ان لہروں کا
 بدبو دھندلہ تندرہ دھماکا کلام میں جذب ہو گیا تھا اور شرت تک آئے تھے انصاف
 کی ان لہروں کا دردِ کھلے ہوا تھا۔ شرت، آتش کے دورِ آئینے کا گردِ کھٹے چنچر
 تندرہ دھماکا کے مقابلے میں وہ آتش کی شاگردی کے فیض سے کم ہی مستفید ہو سکتے تھے۔
 آتش کے سربایہ انصاف کی تعظیم جیسا کہ ان کے شاگردوں میں ہوتی تو اُس کا
 توانا اور جان دار حصہ تندرہ و متباہ جیسے آتش کے نام و نشانِ گردوں میں بٹ کر

جو کچھ بچ بچ کر بد کو شرت کے ہاتھ لگا دے مقدار میں ٹکم نہ تھا، لیکن میاں میں بھی
 بلند نہ تھا۔ ان موصوفات پر تنقیدی موشگافیوں کا سبیل نکالنے سے قبل شرت کے کلام
 میں نہ صرف انصاف کی مقدار بلکہ اُس کے میاں پر بھی نظر رکھنا چاہیے۔ مطالعہ کلام
 شرت کے دورِ انصاف کے باب میں ہمیں جن اشاراتے موقوف کیا، ان میں سے
 بعض نذرِ ناظرین ہیں:۔

- ۱۔ جمالِ جلوہ دکھانا جو اسے حضورِ نہمت
 تو کچھ غریب کو گھوٹا کچھ ضرور نہمت (دولابِ شرت ص: ۹)
 - ۲۔ یہ کس کے جلوسے کی کجی روشنی مرے دل میں
 وہ کیا تھا کچھ جرت سے نور کا جلوہ نہمت (ص: ۱۰)
 - ۳۔ بُوئے غلی، ہاں جہاں، رُوحِ فنا دلِ مجھ
 تیری تیرگی کو ہر رنگ میں شامل سمجھا (ص: ۱۰)
 - ۴۔ ہر وقت وہ موجود رہا یا نہ جہاں میں
 لیکن دیکھی کہ ضعفِ تو نظر آ گیا (ص: ۱۳)
 - ۵۔ جدر نگاہ کی جلوہ ترا نظر آ گیا
 گھماں کُتھ جھے تیری آرزو سے ہوا (ص: ۱۴)
 - ۶۔ تصور سے غلّ آسا سنا ہوتا تو کیا ہوتا
 دی جانے جو وہ جلوہ نما ہوتا تو کیا ہوتا (ص: ۱۵)
 - ۷۔ روکشی کس کی یہ خدائی میں ہے
 کون مسموق بے نقاب ہوا (ص: ۱۵)
 - ۸۔ ازل سے ہے یہ دو عالم میں روکشی جس کی
 اُسی چراغ سے ہم کو لگے بیٹھے ہیں (ص: ۱۶)
 - ۹۔ سمجھتی ہوئی ہے مرے دل میں آنند تیری
 یہ غنچہ وہ ہے ہلکتی ہے جس میں بُو تیری (ص: ۲۲)
 - ۱۰۔ چاہئے والوں کو دیدار سے ترساتے ہو
 موزن چھپانے پر دم بھڑوں سے سسکا ہو کر (ص: ۱۱)
 - ۱۱۔ قیمت پر قیامت ڈھائی جس کی پردہ پوشی نے
 چوشت توں میں وہ جلوہ نما ہوتا تو کیا ہوتا (ص: ۱۲)
 - ۱۲۔ غلّ غلّ کے مقابل میں اسے پانا ہوں
 خاندانِ دل میں تری ذات دھوکہ معنی (ص: ۱۶)
- انصاف کے دوش بدیٰ غریب شرت میں اخلاقی معنائیں بھی ملتے ہیں۔
 یہ کسی نو آنا و حیثیت رکھنے ہیں اور کہیں تخیل کے لباس میں نظر آتے ہیں۔ اخلاقیات
 تشریفات شرت کے یہاں شاید اُن کے اثرات کا نتیجہ ہوئی۔ شرت کے غزلیہ
 کلام کا یہ پہلو مندرجہ ذیل اشارے روشن ہوگا:۔

- ۱- پوجھا جو منے گور غریباں کا جا کے حال
آئی یہ ترہیزوں سے صدا، کچھ نہ پڑھی (ص: ۲۶۹)
- ۲- چُپ رہتے ہیں، خدا نے جنیں دی ہے آبرو
آئی ہیں صدا سبھی سبب پر جام سے (ص: ۲۶۲)
- ۳- خون کر کے کیسی جلاد کا رتبہ بڑھا
سرخ روکس دن چٹ کو پیں کر پتھر ہوا (ص: ۳۹)
- ۴- مل گئے مٹی میں، اٹھنی بھی جہاں سے بھی
ناک تھے، خاک ہوئے خاک میں شامل ہو کر (ص: ۱۱۳)
- ۵- عالم میں محض دقت کا افس نہ رہ گیا
یوسف ہی رہ گئے نہ خرید رہی رہا (ص: ۱۵)
- ۶- دم رملت کرئی پڑھے عدم کھانے والوں سے
دیکھ لیا، لکھا اس عالم ایجاد سے کیا کیا (ص: ۶۶)
- ۷- مڑھالے کی پہلے سے خبر اس کو جو ہوئی
منہ کھینچتا اب لکٹاں میں نہ چھوٹتا (ص: ۶۲)
- ۸- برس آسمان کے باغ میں کھل جھوم جھوم کر
دوتا ہے اُن کی قبر پر اب ہر بار آج (ص: ۹۳)
- ۹- فروغی جو نہ کرتی تو رنگ کب جنت
جہاں ہی، لا ہوئی ہے سنگار کے قابل (ص: ۱۲۳)
- ۱۰- بھلا کہیں بھی گناہ ہے میری غفلت کا
جہاں کی خاک ہوں مجھ کو وہ جا نہیں ملتا (ص: ۱۶۹)
- ۱۱- خلقت میں ہماری ہے فلسفہ سازی کی عادت
تو دے دے خدا غار مغیباں نہیں کرتے (ص: ۲۲۴)
- ۱۲- شبنم تھے بھٹلے گی شب کو زمین پر
آنا فلک پر چڑھ کے نہ مٹتے قباں پھول (ص: ۱۴۹)
- ۱- غزلیات شرف میں تعلیمات کا نمایاں حصہ بنتا ہے۔ تبلیغ کے ماتحت
کلام میں اختصار کے ساتھ سخن باز و پیدا کرنے کے لیے کسی قصے شربا کجوات
کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری کو سچا اور میٹھانے میں تعلیمات نے جو
طرح طرح کے رنگ و روغن صرف کیے ہیں۔ اُن کی تفصیل شیخ متا رحیم جو پوری
کی کتاب تعلیمات میں دی گئی جاکے ہے۔ کلام شرف کے موضوعات میں تعلیمات کے
بانت جو توجہ پیدا ہو گیا ہے وہ اُن کی غزلیات شاعری کی نمایاں خصوصیت میں شمار
کیا جائے گا۔ تعلیمات کے باب میں شرف کی شاعری میں اچھے اہل برے دونوں
طرح کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً:۔
- ۲- جتو کی بہت آہنیے نے حسیروں ہو کر
سب نظر مٹے نورا سکندر نہ ہوا (ص: ۲۸)
- ۲- صورت چمک ایک کی نکلتا ہے آئینہ
حسرت یہ ہے شراف سکندر لگا سنے (ص: ۲۴۹)
- ۳- تورا گیا فقط، ترس سودا ہی رہ گئے
یوسف رہے نہ مسمک بانا رہی رہا (ص: ۱۵)
- ۴- وطن میں اب وہی ہم جو جیسے کا تو جانی گئے
نکل کر کیا آدم کو ڈالیں گے جنت میں (ص: ۱۵۹)
- ۵- سرے سے طو کے بھی نہ کچھ فائدہ ہوا
آنکھوں کو انفراد آزار ہی رہا (ص: ۱۵)
- ۶- رونا مائی کے عوض چشم سُمائی جو ہوئی
کیا گئے کار سست دیدار کا ساں ایسا (ص: ۵۱)
- ۷- (یہاں گورو کلیم کے دقتے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے)
جس سے آذر وہ ہوئے بھیجا جہنم میں اُسے
جس کو چاہا اُس کی خاطر اُن کو بخش کیا (ص: ۶۳)
- ۸- (یہ حضرت ابراہیم کے لفظ ہیں)
پڑھائی اظہر کب تیری شان ہے نیساری کا
بولندہ ترا، ایسا تھے آدم نے پہچانا (ص: ۶۲)
- ۹- (یہاں لفظ "کل" شرف نے کلیم کا بدلے ہے۔ اس وجہ سے کلام میں
کی تا نید کرتا ہے، مگر آئین کے پہاں "کلمہ" پر کلام آیا ہے اور
شرف نے بھی کلمہ پر کلام لکھا ہے، "تیری حسرت کا وہ ہو کر پڑھا ہوا"
(دیوان شرف ص: ۶۹)۔ دیکھیے خاکوں ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱

- ۱۵۔ جسے اسے جانی جان دم بہرام علی بنائے ہو
۱۶۔ اُسے مردہ جلانے کی کراست آئی جاتی ہے (ص: ۳۰۴)
۱۷۔ یہاں کہنے (افسانہ جو) اپنی سن ترائی کا
۱۸۔ زبان پر اس کی، میری بھی حکایت آئی جاتی
۱۹۔ کیا کھینچے کاشفہ ترسے آئینہ رخ کا
۲۰۔ خود سیکھے کے عالم میں ہے ہزارا بھی سے
۲۱۔ ہوتے ہیں جذب مشق سے بڑوں کے جھگڑے
۲۲۔ اک ملک شل ملک سلیمان خریدیے
۲۳۔ خاک اڑتی تھی، نہ شیریں تھی نہ زیروانی تھی
۲۴۔ لہر ہزار کے پھر رونق کھسار نہ تھی
۲۵۔ شداد کا ہوگا نہ گزر بارغ ارم میں
۲۶۔ وہ سوچا ہے کچھ، مگر قصا اور ہی کچھ ہے
۲۷۔ وادی وحشت میں اس نے کیا کچھ کھائی
۲۸۔ قیس قوسودانی، قسائل تو دیوانی نہ تھی
۲۹۔ تفتی کچھ کر کے قیس کی بی، نہ کیا ہوگا
۳۰۔ کہیں سمجھانے سے بھی بوش میں دیوار آتا ہے
۳۱۔ میرے دامن کو صدا چاک کلی ہوتی ہے
۳۲۔ نبیوں قیس کی آئین کو دیکھائی ہے
۳۳۔ نبیوں یاد دیکھے کر کے لہو روئے کا
۳۴۔ آئیے توڑے گا جو آبلہ یا میرے بعد
۳۵۔ کسی کی طاقت ہے کہ جو نبیوں کھڑکائے گا
۳۶۔ بھرتہ زنجیر کی آئے گی صدا میرے بعد
۳۷۔ بے نیازی یہ آئین نہیں ناز مرے دیکھتا
۳۸۔ سن ترائی کی نہ بھرا آئی صدا میرے بعد (ص: ۱۰۶)
۳۹۔ شرف کا یہ شعر فقیر محمد خان گویا (متوفی ۱۲۹۸ھ) کے مندرجہ ذیل شعر سے
مماثلت رکھتا ہے: ۵
موند دکھانا تو کہاں؟ ہیں نہیں اس کی ٹھیک
سن ترائی کی نہ بھرا آئی صدا میرے بعد
(دیکھیے ترجمہ حقائق البلاغت: صہبائی ص: ۱۰۲)
۴۰۔ کیا نڈبھون کرے ہیں ہوتا ہے جو سودا
تحقیق کرو قیس سے فراد سے پوچھو (ص: ۱۹۷)
۴۱۔ اندکا اکھاڑا ہے مرے شیشہ دل میں
کیا بزم ہے ایک ایک پری زاد سے پوچھو ()
- ۲۹۔ آگاہ شرف تم نہیں ان کی خفگی سے
۳۰۔ اس مرگ مقامات کو شداد سے پوچھو (ص: ۱۹۷)
۳۱۔ طلب فرشتوں سے ہے دفتر قیامت کی
۳۲۔ خانے یا دیکھا ہے گستاخوں کو (ص: ۲۰۳)
۳۳۔ شیشہ دل کی بھی اندر کے اکھاڑے سے شیا
۳۴۔ اس میں مشن آرتے ہیں پری زاد ہو کر (ص: ۱۰۹)
۳۵۔ قطع، دیدار کی آئینہ ہوئی
۳۶۔ سن ترائی تھی جو اسب ہوا (ص: ۵۳)
۳۷۔ پیش کش کرنے چلا یا ہے سکندر رام نینہ
۳۸۔ اسے شہر حسن اکھاڑا کو تو یہ نڈبھونڈا دیکھو (ص: ۲۱۲)
۳۹۔ سن ترائی دھیان میں ہرگز نہ لاس شرف کی
۴۰۔ اسے شرف پر وہ انٹ کے تو بھی گستاخانہ دیکھو ()
۴۱۔ انٹ دینے کو کہا جوں تو بریم ہوئے کہتے ہیں
۴۲۔ تھیں میرے نقاب چہرہ روشن سے کیا مطلب (ص: ۷۷)
۴۳۔ خاک ملنے کے لیے بے واسطہ چھائی نہ تھی
۴۴۔ یہ بھی اک خمیز کی دانائی تھی نادانی نہ تھی (ص: ۲۳۲)
۴۵۔ چھٹی کا دو دھ آئے گا زبان پوکی لے شیریں
۴۶۔ بے کا کوہ کن کا خون جوئے شیر سے پیسلے (ص: ۳۰۹)
۴۷۔ تہمت لگا کے ہاتھ سے برص کو کھو دیا
۴۸۔ چاہت میں ہوئی تھی زلیخا کی کیا سمجھ (ص: ۲۱۶)
۴۹۔ دم جس نے سیماکو بنایا دہن ایسا
۵۰۔ موسیٰ کو جراب ایک دیا کم سخن ایسا (ص: ۳)
۵۱۔ تعلیمات کی پیہم درج سے زیادہ شامل دیوان شرف پر ایک
سرسری سی نونکا نتیجہ ہیں۔ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ غزلیات شرف
کے موضوعی جائزے میں تعلیمات ایک ناخالی فراموش ہونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔
مگر تا قدین کلام شرف اس اہم پہلو کو کیر نظر انداز کرے رہے ہیں۔ میرے اس
معموضے کی تصدیق کو دباؤ دھنکی ہیں۔ اور دو تنقید کے دامن میں غزلیات شرف پر
جو طویل تنقیدی سرمایہ نظر آتا ہے اس کے معاملہ کے لیے صرف چند منٹ دیکار
ہوں گے اور آپ خود باسانی اس حقیقت کا اکتشاف فرمائیں گے کہ غزلیات شرف
پر سعادت خاں ناصر، لالہ سری رام، مرزا محمد عسکری، مولانا عبد السلام ندوی،
برونیسر محمد حسن اور ڈاکٹر شاہ عبد السلام کی تنقیدی تحریروں میں کلام شرف میں تعلیمات
کے باب میں کچھ خاموش ہیں۔ (دیکھیے، خوشاموگزیان، محمدناور، ص: ۲۳)
تاریخ ادب اردو، شعر الہند، طبع ہنزہ نیر (سبانی لٹریچر) حیرت ہے کہ یہ تمام

تحریریں کلامِ شرف کے اس قابلِ ذکر ہیں کہ ایک جلد بھی فراہم کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔
 حالانکہ میرے نزدیک تجلیاتِ شرف پر تنقیدی گفتگو چند قیولوں کے بجائے ایک بھرپور
 مقالے کی طالب ہے۔ میں نے مقدمہٴ انتخابِ شرف (۱) یہ برنی اردو اکادمی
 لکھنؤ میں زیرِ مباحثہ ہے، میں تجلیات کے منتقد ہوں، ایک جلد لکھا ہے وہ شاید
 اس سلسلے میں ہماری تنقید کے پاس آج تک پہلے اور آخری جیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔
 ناقدین کی اسی بے اعتنائی کے باعث کلامِ شرفِ تجلیات کے لیے مشہور ہو رہا ہے۔
 چنانچہ شیخ متاخرین جو پوری کی کتاب تجلیات بھی شاید شرف کے ذکر سے حسد کی
 روگھی۔ حالانکہ اس کتاب کے لیے دیوانِ شرف ایک مفید مآخذ ثابت ہو سکتا تھا۔
 تجلیات سے شرف کی غیر معمولی دلچسپی کے اسباب پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا
 ہے کہ شرف نے کچھوں کے استعجالِ اردو ناخوش شاعری میں تجلیات کی تنقیدیت
 کے باعث کیا ہو گا۔ مگر اس کا ایک اور خاص سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ
 شرف کو داستانِ اولیٰ اور داستانِ سحریہ وغیرہ معمولی عربیت سمجھی۔ جیسا کہ خردان کے
 کلام کی بعض افلاطونی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ شرف نے اپنے منتقدین بیان کیا ہے۔
 (الف) معلق: ہم کو کون سی پستی کا شوق تھا
 دھچپ داستان کا مزا اور ذوق سمجھا (دیوان ص: ۳۲۱)
 (ب) لہذا چمن کو ہم بھی، گھڑا تھے مکان
 سقا و علم غار کو حیرت میں تھا جہاں
 اسنا گروہ کہتے تھے دلِ چلب داستان
 پر یوں کے ہونے آئے تھے اس میں کس کا باریاں (ص: ۳۲۲)
 عجیب نہیں کہ داستانِ اولیٰ اور داستانِ سحریہ میں بھی شرف کو
 تجلیات کی دادی مل لائی ہو، تجلیات کا ایک بڑا حصہ ہر حال قصوں اور داستانوں پر
 مبنی مشتمل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آئندہ تنقیدِ کلامِ شرف کے سلسلے میں اہلِ قلم تجلیات
 کو نظر انداز نہ فرمائیں گے۔
 شرف کے بعض اشعار میں کچھوں کو ان کی علمی زندگی کے حالات کی جھلک
 بھی ملتی ہیں۔ مثلاً شرف کے غزلیہ کلام کی سند پر ذیل وافعی شہاد میں شرف کو
 سورتِ تنفس کا رعب ثابت کرتی ہیں:۔

- ۱- بارے سورتِ تنفس کی دریا پر را منی
 ہوں وہ ہمارا کہ دم ساز مسجیا ٹھہرا (دیوانِ شرف ص: ۵۱)
- ۲- اے شرف سورتِ تنفس ہے خدا کا دم بھر
 چو نا غفلت سے ہی وقت ہے ہر بشار کا (ص: ۱۱۳)
- ۳- علم نے ہی کی نہ سورتِ تنفس میں ہم دی
 یہ بھی رہا تو چند نفسِ مہیاں رہا (ص: ۳۳۰)
- ۴- تہا را بھر کے دم سورتِ تنفس میں تھا کرتا
 یہ صورت بھی کہ جو خردِ رحمت بھی ادا کرتا (ص: ۱۰۰)

یہ صورتِ ماضی نے کی مری، سورتِ تنفس میں
 کو جو دم ساز مسجیا، لکھو کہ اس ہم نے چو نا
 تہا را یا دِ رحمت ہی میں بھی کھل کھلا ہے
 بھر ہے میں نے دم سورتِ تنفس میں بھی اُفت کا
 دمِ تنفس میں ہے سورتِ تنفس سے اے شرف
 چو نا دے ہوئے کھلی وا، پسیں سے کب
 دم بھر رہا ہوں تیرا گو ہے سورتِ تنفس
 اس نے خود کیا میں بھی ہوں بشار یا بار بک
 یہ، دم ہے تنفس میں شرفِ تنفس سے ہے
 موند ہے دل و دگر لکھ کر ہے جو کھانے ہم
 دم بھر رہا جا رہا، سورتِ تنفس ہو تو ہو
 ہوں میں آ، غفلت سے رہا دے اچھی نہیں
 آنھیاں ملتی ہیں پہلے لکھ کر ہے خزاں
 فوت سے سورتِ تنفس پیشہ کیوں کر نہ ہو
 آوارہ رُوح سورتِ تنفس میں یوں ہوتی
 جس طرح سے تو اس پریشاں دُھواں ہے
 ترے خروج کو سورتِ تنفس مار ڈالے گا
 لہو خیم جگہ کا بسند کو واسے کو دم ٹھہرے (ص: ۲۹۳)
 یہ اشعار دلیرانہ شاعری کا سید ہیں، مگر ان سے یہ نکلتا ہے
 ہوتا ہے کہ شرف سورتِ تنفس کے رعب تھے۔ سوانح نگاروں نے شرف کی اس بیماری
 سے بے خبر رہے ہیں۔ منقول بالا اشعار میں سے شعر (۱) نیز (۹) دیوانِ شرف
 کے علاوہ متکرر و خوش موکرر ذیل تالیفات ۱۳۲۶ھ میں بھی موجود ہیں اس سے
 اندازہ ہوتا ہے کہ شرف ۱۸۹۶ء کے قبل ہی سے سانس چڑھنے کے مرض میں
 مبتلا ہو چکے تھے۔ شعر (۱) شرف کی اس غزل میں شامل ہے جو تمام اخراجات
 کی تحقیق کے مطابق دسمبر ۱۸۵۹ء کے آس پاس بھی لکھی تھی (دیکھیے میرا مقالہ
 ”ترجمتِ غزلیاتِ شرف“ گزشتہ نمبر ۱۸۵۹ء میں بھی سورتِ تنفس کے آزار میں
 گرفتار تھے۔ شعر (۲) دیوانِ شرف کے علاوہ گھڑا تھہرا کھنڈر سورخ
 ۱۵ جنوری ۱۸۹۰ء میں بھی موجود ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۵ جنوری
 ۱۸۹۰ء کے آس پاس بھی شرف سورتِ تنفس کے دورے سے دوچار تھے۔ اس سورتِ
 شعری گھڑا تھہرا کھنڈر سورخ ۱۰ فروری ۱۸۹۱ء (ص: ۲) میں موجود ہے
 ہے کہ فروری ۱۸۹۱ء میں بھی شرف سانس کے بھولنے کے رعب تھے۔ کئی شاعر
 کے کلام کو اس کے سوانحی و شعری کو کھٹ کر کس طرح سا کر کے ہیں شرف کے
 غزلیہ کلام میں اس کی اور مثالیں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ شرف اور دھکے شکاری
 خاندان کے ایک فرد تھے۔ ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور دھکے شکاری

وامید علی ستاد کو حضور کی کہ ادھو کے شاہی خاندان کو تباہی کے جس الناک
ساتھ سے دوچار کیا تھا۔ اس پر کھنڈیوں کو صدر مہر نافرمانی تھا۔ مگر
افترارح سلطنت ادھو کاظم خان نے والوں میں حریف کھنڈیوں کے باشندے بھ
شریک تھے۔ حیدر مرزا غالب دہلی کے تیراٹے ملازموں:

(الف) "... تباہی کی سیاست ادھو نے، آنکھ بیکار، محض
ہوں، کھجور اور کھجور انصاف دل کر دیا، بلکہ میں کہتا
ہوں کہ سخت تاالفاظ ہوں گے وہ اہل ہندو خاندان
دل نہ ہونے ہوں گے۔" (یہ نام قدر بگڑا)
(ب) "..... کھنڈیوں کا کہنا ہے وہ ہندوستان کا بلند
تھا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گڑھی، جو بے سرو پا
وہاں پہنچا امیر نہ گیا۔ اس بار کی یہ فصل خزاں ہے
....." (مکتوب غالب بنام میان دارغان پتاج)
(ج) "....." ہائے کھنڈی کچھ کہتا کہ اس ہارستان پر کیا
گزری؟ احوال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے؟ خاندان
شہناز اللہ کے کن و در کا انجام کیا ہوا؟ مجتبیٰ اللہ
کی سرگزشت کیا ہے؟ گمان کیا ہوں کہ (ب) نسبت
میرے حکم کو کچھ زیادہ آئی ہوگی۔ امید وار ہوں کہ جو
آپ پر معلوم ہے وہ حق پر چل کر رہے۔" (مکتوب غالب بنام علی مہر)

حکومت ادھو کے دال پر اگر دلی میں غالب حوالہ تھے تو کھنڈیوں بھرت
بھی شکستہ دل ہوئے ہوں گے کیوں کہ وہ خود ادھو کے شاہی خاندان سے
تھے۔ دال حکومت کے بعد و امید علی شاہ اپنے متعلقین کے ساتھ نکلے
چلے گئے۔ ادھو کے شاہی خاندان کی اس تباہی اندر بے وطنی پرسترت کو
جو دھک پہنچا کھا وہ ظاہر ہے۔ مئی ۱۸۵۰ء میں میرٹھ اور دلی میں جو فدر
ہوا اس نے کھنڈیوں کو بھی اپنی طبیعت میں لیا۔ غدر ۱۸۵۰ء کے متعلق تو شرت
نے پوری فتویٰ بھی تھی جو عسکرۃ فرنگ کے نام سے شروع ہوئی۔ انگریزی حکومت
کا اقتدار غرض میں ختم ہو گیا تھا۔ مگر انگریزوں نے جب دوبارہ کھنڈیوں پر اقتدار
پایا تو کھنڈیوں کے طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کیے گئے۔ یہ موج خون شرت
کے بھی سرے گزری تھی۔ ۱۲۰۰۰/۱۸۸۳ء میں شرت بھی کھنڈیوں سے بے وطن ہو کر
نکلے میں جا رہے تھے۔ شرت کو کھنڈیوں جو فرسٹوں صدر سردار شرت
کرتا پڑا تھا وہ ان کے متحد دانشور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کھنڈیوں میں شرت اپنے
دادا دادا علی کو کتب و ادب و شہادہ۔ کی علی عبد کے عمل و ادب مثلاً بیگ میں بیتم
ہو گئے۔ ۱۲۹۱ء میں شرت کے دادا دادا علی کو کتب نے بہ عالم شباب زہر خورانی
سے وقت و وفات پائی۔ کو کتب کی وفات کے بعد شرت کی بی بی خورانی میں جو موٹی ہوئی۔

اور شرت کے ذرا سو (مرزا قزوین حسین مؤمنہ، ۱۲۸۹ء) نیز شاہنشاہ مرزا (مؤمنہ:
۱۲۸۹ء) نے خرد سالی کی کے دوران تہی کار داغ پایا ہوگا۔ شرت کے ان تمام
سوانحی اور عصری کوائف کو ملحوظ رکھ کر مندرجہ ذیل اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو
ان میں مصنفیت کی ایک نئی دنیا باطل ہوگی:

- ۱- جتنا وقت کو بھی دھیان میں نہ لائے تھے
- ۲- برہنہ پا نہیں دیکھا، برہنہ سر دیکھا (دلیا بھرت ص: ۴۹)
- ۳- جاتے ہیں جو بڑے زندہ ہیں اس بار خجواں کے وجہ یہ ہے
- ۴- گلزار یہ جس کلف نام کہے اس بار میں وہ کلام نہیں (ص: ۶۶)
- ۵- مٹا ہے بار خجواں و لالہ زار کے باعث
- ۶- چمن پر آئی یہ آفت بہار کے باعث (ص: ۹۳)
- ۷- بمورے دیتے ہیں غنچے پر پے ستارا
- ۸- چمن پہل تھی میں میں ہزار کے باعث (")
- ۹- نیاستم چمن روزگار میں دیکھا
- ۱۰- غلوں کو چاک گریاں بہار میں دیکھا (ص: ۱۰۰)
- ۱۱- رخصت ہے گلستان سے بہار چستان
- ۱۲- شاداب جو چمن تھے وہ مرچائے ہوئے ہیں (ص: ۱۰۸)
- ۱۳- مشہور تھا جو گلشن فرسوس، جہاں میں
- ۱۴- اسے بے وطنی کوئے چرایا وطن ایب (ص: ۱۲۰)
- ۱۵- ہوں سے ہیں ترے ہوئے اس زندہ میں کو
- ۱۶- اللہ دکھائے گا تو دیکھیں گے وطن کو (ص: ۱۲۸)
- ۱۷- دلیانہ ہوں، برادر ہوں، ویرا تیش ہیں
- ۱۸- آسانش و راحت وطن آباد سے تو چھو (ص: ۱۳۹)
- ۱۹- ہیں جس اندر سالی کا حکم کے مصیبت د
- ۲۰- گزر گئے ہیں کئی سال چھپائے ہوئے (ص: ۱۴۱)
- ۲۱- جس دم خزاں سے فوج و گن بھٹے گئے
- ۲۲- فرشتہ کو کیلوں کے دلوں میں نہاں کیا (ص: ۱۵۰)
- ۲۳- دل پھٹ گیا عیات سے خوں ہو گیا جگر
- ۲۴- بیدم جہاں ابلے کوئی نہ جواں کیا (")
- ۲۵- اہلی گلشنی ایجا کا کہے مالک کو
- ۲۶- کہاں ہیں اس چمنستان کے بچوں پہل جاتے (ص: ۱۵۳)
- ۲۷- تمہاری بزم میں اس دن اسے نہ رہے، ہم
- ۲۸- سسک نہیے تھے جو پروائے سب کیا جاتے (")
- ۲۹- شرت کوئی نہیں ہوتا ہے میں جیہوں کا
- ۳۰- وہ یادگار ہوں کی آغوش میں ہیں چل جاتے (")

یہ تمام اشعار بیکار بیکار شرق کی بربادوں کی داستان سارے ہیں۔ یہاں شرق کا یہ شعر یاد آتا ہے :-

جب آنکھیں ڈیرائی ہیں تو پھر کس نہیں کہتے

جو دل میں درد بہتا ہے تو رفت آبی جاتی ہے (ص: ۲۰۰)

شرق نے یہ اشعار کس کس زمانے میں کہے ہونگے۔ اس کے تحقق ہو ورنہ سے تو کچھ عرصہ نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے لیے ہم نے ایک معاملے میں جو نوینیت کلام شرق کی جڑ سی کی ہے، اسے ملحوظ کرنے پر آپ کو شرق کی ساتھ غزلوں کے ذرا تعلق کا اندازہ ہو سکے گا۔ قوت غزلیات شرق کے سلسلے میں ہماری ان تحقیقات کو شرق کے سماج اکثر کلام شرق کا، تعلیم و تہذیب میں مساوات ثابت ہو سکے تو ہماری یہ محنت رائیگ نہ جائے گی۔

شرق میر جی میں اولاد رازوں کے سیدائی تھے۔ وہ صبح کے بیکار ہو کر ہوا بوری کے عادی تھے۔ باغوں کی گلشنیت اور قدرت کے حسین مناظر سے انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انہوں نے گلشن میں اپنے گل کر ایک حسین خانہ بنا کر آراستہ کر رکھا تھا۔ (دیوان شرق ص: ۳۲۰-۳۲۱) شرق کے غزلیہ کلام میں نالہ، رمن، گلزار یا باغ وغیرہ کاکرت سے استعمال ان کی سیر معنی سے اسی دلچسپی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے ان کی غزلوں میں کبھی کبھی واقعیت کی جگہ قدرت کی خارجی ماحول کی خوش گواری محسوس ہوتی ہے :-

۱۔ گلشن میں کون آنے کا لینے کو حب تنہ

کوسوں جبار ہے جس جو سر مو قلعہ بھول (دیوان شرق ص: ۱۳۴)

۲۔ سمجھ میں کیا یہ گرہِ غلیم کو دل لگی

ہنسنے میں کھلکھلا کے جبے اختیار بھول (")

۳۔ منک منک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ

جن میں رنگ نہ لایا مارا ہو کس کس (")

۴۔ دیکھی ہمارا داغ جگر کی نہ ایک میں

گلشن میں بھول بھول کے تھکے ہزار بھول (ص: ۳۰۰)

۵۔ جھٹلا دنت ہے بہتا ہوا دریا تھمبھرا

صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا تھمبھرا (ص: ۵۰)

۶۔ چلا رہا تھا جو شب کو چراغ میں متباد

یہ بلبلوں کا ہو تھا کہ روشن گل تھا (ص: ۷۰)

۷۔ موجد گلزار نے گلزار کی جو سیر کی

بے کمال بلبل کو دی غنچوں کو خندہ زنی کیا (ص: ۶۳)

۸۔ جہاں جہاں میں ٹپکا ہوا گلزار

نہیں تیرے شہیدوں کے یہ اثر دیکھا (ص: ۱۶۹)

۹۔

دن بھر جہاں میں خاک اُڑاتی ہے کیوں مینا

روقی ہے کس کے واسطے فلم تمام شب (گلزار شرق ص: ۱۵۰-۱۵۱)

۱۰۔

نیا سہم میں رو دکھار میں نہ دیکھا

گلشن کو چاک کر گیاں بہار میں دیکھا (ص: ۱۰)

۱۱۔

جوش و شہت میں کہاں میں نہ ہو رویا تھا

کون سی جاتی میں با باں میں جو گلزار نہ مٹی (ص: ۲۳۹)

۱۲۔

جنوں میں زون جو سوتا ہے لالہ و گل کا

تماشا ہو تو کج ہے ہم اپنے فکر کو دیکھتے ہیں (ص: ۱۸۱)

۱۳۔

شاخ گل عیون کے گلزار میں سیدی جو مٹی

سچہ گرا (اٹکھ) میں نقش زری عکس لائی کا (ص: ۲۸)

۱۴۔

گلشن میں جا کے جوں کی تلاش کی ہم نے

چھدا ہوا ہے اک لوک خار میں دیکھا (ص: ۱۰)

۱۵۔

ترجما ہے کی پہلے سے خبر اس کو جو ہوتی

فطرت مجھے سنا داب گلستان میں نہ ہوتا (ص: ۱۲۰)

۱۶۔

اگر نہ ناکے گلشن کی پری سی مشکل

کیا بات اس میں تھی جو انہیں بے زبان کیا (ص: ۱۸)

شرق کی غزلوں میں حقیقت شاعری کے نمونے موجود ہیں، مگر ان کا اثر رواجی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے بیان میں ان کی وہ سب کچھ ہی ملتی ہے جو وفا کی کائنات ہے۔ حقیقت شاعری میں عاشق، محبوب اور رقیب کی جڑ ہوتی ہے، اس سے غالب، جوش و داغ کی طرح شرق کے کم ہی فائدہ ہوا ہے۔ شرق کے بیان شعوت کے تحت حقیقت شاعری کے مضامین مشق حقیقت شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مشق مجازی کے نمونوں میں جہر و صال یا انتقام یا داغ موضوعات شرق نے غیر سے مزید دیں۔ مگر ان میں وہ زیادہ کامیاب تھا رہے۔ ان کے یہاں محبوب کے خارجی حسن کا ذکر کبھی ملتا ہے اور ان کی حلا شاعری میں جمالی اور جینی حند بھی موجود ہے، جو کہیں کہیں غم ماحولی اور چھٹی کی حدوں میں آگیا ہے، مگر خبر یہ گزری کہ یہ مٹی منفر شرق کے یہاں، زیادہ نہیں۔

آغا حشر شرق کے ہم عصر مولانا تہذیب علی حیدر نظم طباطبائی نے اپنی سہ دیوان غالب میں شرق کے کلام کے بارے میں بعض اہم نکات مشرق ہیں کے سے درج کیے ہیں۔ نقل طباطبائی کا یہاں ہے :

"... خدا نے آغا حشر شرق کو ایک دن کہنے لگے کہ میر علی اور مولانا تہذیب نے ہا میں بیتا میں صفو شریں لایا تھا جو کہ ہیں اور اس پر پڑنا ہے۔ اپنے شاگردوں کے سوا کسی کو نہیں بتاے۔ اور وصیت کر گئے کہ یہ وصیت

شرقت پر اپنی تنقید و تفل میں مولانا نظم طلبائی کے ان بیانات کو دہرا رہا ہے۔
مگر نادرین کے ان بیانات کے علو الاعظم کے فضیلت شرقت میں بعض اچھے اشعار
بھی ملے ہیں جن میں شراب، مے، ناز، سیر، چاند، جام اور ساقی کا ذکر ہے۔
یاجن میں شرقت نے واطی یا سقے کے چھڑ چھڑائی ہے یا حضرت یوسف، حضرت
عیسیٰ و حضرت سلیمان مہدی مقدس مند سہی کیسوں کو پھڑکایا ہے یا انگشتیں
ارم جیسے قابل احترام مقام پر طعنہ زنی کی ہے۔ مثلاً: ۱۔

۱۔ گلوں کو حال آیا، آبرو دیا، جام ہے چھڑکے
چین میں شانہ گل چٹ چٹ پڑی ان کے قدم (ص: ۲۳۷)

۲۔ ذہن حیران کی شرقت نے تیرے میں ہستی ہے
مزنہ نہ کی وہ کرستہ ہی لکھو کیا کیا (ص: ۳)

۳۔ کیا ہی عالی ظرف تھا ساقی ہمارا اے شرقت
جام ہم چھینکا ہوا اک سے کپڑے میں تیرا تھا (ص: ۱۹)

۴۔ اے شرقت کیفیت ہر جن میں مست ہوں
اب صدمی ہے شراب لالہ زون دکلا رہے (ص: ۲۳۲)

۵۔ مہار کو وہ بھوہو گئے شرقت تیرے خشن بازوں
صدمی میں تیرے باقرت کا چاند آتا ہے (ص: ۲۳۲)

۶۔ رہا کہتے ہیں ہر دم مست تیرے میں نیویں کے
ہم اپنے بھیک کے لاسے کو جام ہم گھمے ہیں (ص: ۱۸۵)

۷۔ نہاے گا کو چھڑکے گا گلستاں میں
بھرے ہیں خرقہ خاں دل میں کہوں سیر میاں (ص: ۱۰۳)

۸۔ حشر کی پہل کا نقد کی کسٹوں دانہ دے میں
میں فرشتان اے پر پرو ہوں تیری رفتار کا (ص: ۲۳)

۹۔ خدا پوچھے گا تجھے پیتر اے شقی کھو کو
مری تقدیر پچھنے کی تری تقدیر سے پہلے (ص: ۳۵)

۱۰۔ سمجھے ہیں تیرے کو بے غیرت فردوس
کہاں کا باغ جانا گلستاں ارم کیسا (ص: ۲۲)

۱۱۔ منت محبوب ہوئے لڑکے کوئیں میں یوسف
آبرو ہوئی اگر چاہہ زخماں موتا (ص: ۲۸)

۱۲۔ اک بات سمجھ کو جوئی حاصل مسک کو
پیسے گا کوئی آپ کے مغز سخن کو کسب (ص: ۲۳)

۱۳۔ اعجاز مسکا کو نہیں دھواں میں لاتے
دم بھرے ہیں جو لوگ تیری ناز دھاوا کا (ص: ۳)

۱۴۔ جان جان بھر وہ ہر اور رنگ کے شایاں کا
تیری خاموشی طے وہ سیلاباں موتا (ص: ۲۲)

۱۵۔

۱۶۔

سینہ بہ سینہ میرے ہی نادمہ میں رہے کسی اور کہے
سٹھائی کھوئے ہرگز نہ بتانا۔ مگر نغمے سے معلوم ہوا
کرب اس طرح کی باتیں میں کو دکھانا اور بہت نا
نہ باندا کرو۔ دکھانا اور بتانا اختیار کرو اور یہی جگہ پر
اور ننگ کے مقام پر ننگ، مرا کو میرا اور تیرا کو تیرا کو بہت
چلے ہے۔ سدا کی جگہ ہمیشہ باہو۔ پرستان ہندی لفظ ہے
کہیں ناز کا سمجھ کر اسے بھائی زون نہ لفظ کر جانا۔ لفظ خوں
میں بھی زون کا ظاہر کرنا ضرور ہے۔ شمشیر میں آئے مجھوں ہے
اسے کبھی تیر و زنجیر کے ساتھ قافیہ نہ کرنا۔ علی ہذا العین۔
کوئی کام کی بات نہیں، مگر میرے دیوان کا انھیں کو تو معلوم
ہو کہ اس باسی لفظ ایسے میں نے چھڑا دیے ہیں جسے (جسے)
لگا، جنہیں لگا پھر لگا باندا کر کے ہیں اور کوئی غزل ان کی
اس سے ظاہر نہیں رہتی۔ مثلاً: بہت و صدم و کلبا ویت خانہ
برہمن و تاقوس و نثار و نثار و واطی و تاقوس و تاقوس و
منان و منجی و ساقی و رند و میخانہ و جام و ساغر و شیشہ و
قلقل و شراب و صبا و غیرہ۔ کوئی شاعر جو اسے لکھا نہیں۔
میں نے پوچھا: آپ نے ان الفاظ کو کیوں چھڑ دیا؟ کہنے
لگے میرے رنگ کے خلاف ہیں۔ جس شعر میں میں نے
یہ الفاظ دیکھے، کبھی اس شعر نے مجھے غم نہیں دیا۔ باں
اس ناک اس شعر میں: ۱۔

چپ ہو کر کچھ کو تیرے فرماؤ خلیفہ واسطے
اوی سے بہت دن جاؤ خدا کے واسطے

کچھ عیب طرح سے مت کا لفظ لکھا ہے۔ اگر اس طرح مجھے ملے
تو میں بھی باندا جاؤں گا۔ شرقت اس کو ترک الفاظ کہتے
تھے مگر اصل میں دیکھو تو معنی غزل کی اصلاح ہے مثلاً:

دلا انظر لہما لہما نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا ہے:

۱۔ ... آغا محمد شرقت مرحوم نے شراب، ساقی، پیرستان،
میخانہ، واطی، نثار، سیر، نثار، مسجد، بہت خانہ وغیرہ

کا ذکر غزل میں ترک کر دیا تھا۔ کہتے تھے آخر اس کے معنی کیا
کہ شراب، نفرت، واطی، عقیدت اور پھر اس کی تشریف

کریں اور اس کی لذت۔ اس قسم کے شعر سراسر فحاشی ہوا
کہتے ہیں۔ مجھے اس سے کچھ لطف نہیں ملتا۔ ۲۔

غزل کی اصلاح کے لیے مولانا حلی کے معذور شعور شاعری میں جو تفصیلی بحثیں
کی ہیں، شرقت کے ان بیانات میں ان کا ابتدائی اور جمالی خاکو نظر آتا ہے۔

طاع عبدالسلام ندوی، ہر وفیر محمدی اور ڈاکٹر شاہ عبدالسلام وغیرہ کا نام

۱۲

۱۵۔ میلان بھی انگریزوں سے بدلتے تو نہ دیتا میں

جو جھگڑا ہوتا تھا اُس ہی رو کی نشانی کا (ص: ۲۰)

۱۶۔ بیاں جو کہتے تھے میرا ستر است کو

فنا نہ یوں سب کھانا کا خواہ میرا جاتا (ص: ۶۰)

یہ اشعار غزلیاتِ شرف میں استثنائی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ خاصاً جہان میں سے بعد ہاتھ آئے ہیں۔ دورِ غزلیاتِ شرف میں عام طور پر غزل والا الفاظ سے گریزی کا واضح رجحان ملتا ہے۔ کلامِ شرف، شراب نوشی، بے پرستی اور مذہبی کی آوازیں ملتیں سے تقریباً خالی ہے جو غزلیات کے ضمن میں آتی ہیں۔ مزید برآں عام طور پر غزلیاتِ شرف میں زاہد و واعظ سے بچ کر چار اور عفت سے مذہبی ہستیوں پر مبنی بھی نہیں ملتی غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب، اجتناب اور زاہد و واعظ کی عداوت کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

میں شال میں بگو یا غزلیاتِ شرف میں ذکرِ شراب سے اجتناب اور واعظ کے احترام کا غالب رجحان ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو مذکرہ غزل میں تحریر کیا گیا ہے۔

ان کی غزلوں میں اخلاقی مضامین، تنقیدات اور لطائف کی بھی کمی نہیں۔ ان کے یہاں داخل شاعری کے نمونوں سے زیادہ بارش چین، لاووسن، سیر دیال کے مناظر، خارجی شاعری سے ان کی دل چسپی کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں عشقیہ عناصر کی جانب کم توجہ دی گئی ہے اور کلامِ شرف کا یہ پہلو بیشتر بے اور سچا پتہ رہ گیا ہے۔ شرف کے بعض اشعار میں غزل کی بجائے گنگ اور دھ کے سنا ہی خاندان کی تباہی اور بے وطنی یا خود بینی پر مبنی براہِ رسد کا ذاتی احساس بھی ملتا ہے۔ ان کے داماد و حامد علی گوشت کی خزان مری نے ان کے آخری دور کے اشعار کو حزن و ملال کی کیفیتوں سے لالا لال کر دیا ہے ان کی غزلوں میں دل کو مچھ لینے اور دل میں زہرے والے اشعار غالباً خال اور غزلیاتِ شرف کا یہ مختصر ماحصلہ انہیں ادنیٰ تاریخ کے ایک گوشے میں غیر ا جگہ دلو اسکا ہے۔

غزلیاتِ شرف میں بعض انگریزی سے زیادہ قافیہ پر مبنی کے نمونے ملتے ہیں مگر قافیہ پر مبنی کے نمونوں میں بھی شرف اپنے بعض ماحصلوں میں بجا کر یا بدو کے مقابلے میں بچے رہتے ہیں اور وہ قافیہ کے غزلوں میں مقید کرنے پر آمادہ نہیں معلوم ہوتے۔ شرف کے معلوم دیوان میں دو قافیہ اور غزلے کا رجحان زیادہ نہیں۔ اس ضمن میں وہ اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دینے سے قاصر رہے ہیں۔ ان کی ماحصلوں میں بحرِ کھنڈی کے دیوان میں بہت قافیہ تک موجود ہیں۔ (راغب الساجد، بحرِ کھنڈی طبع ۱۳۸۵ھ میں ۶۹۰ تا ۶۲) مگر شرف کے یہاں دو قافیہ بھی کم ہیں۔ دیوانِ شرف میں مثال دو غزلوں میں سے بعض

یہ ہیں:- غزلیاتِ شرف: ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹،

بہ لحاظ اسلوبِ شریعت کی غزلوں میں کہیں کہیں فن کارانہ چابک دستی کے نقوش ملتے ہیں، مگر عام طور پر ان کے استاد کی جڑ سے نکلا کلام ہونے سے انکار کر کے محسوس ہوتے ہیں۔ شریعت کے یہاں تشبیہ و استعارہ کوئی دل نشین اور کہیں بے مزہ ہوتا ہے۔ بندھن کی پہنی اور روانی میں شریعت اپنے استاد اعلیٰ تک فرمایا جیسے تودہ نور تودہ متبا اور توتوت جیسے اپنے استاد صاحبانِ کلام کے بھی بارِ نظر نہیں آتے۔ اور اس لحاظ سے وہ شائع کے شاگرد بجز سے بھی پیچھے رہتے ہیں۔ رمایت لفظی شریعت کے یہاں بھی قوت اور کہیں کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ البتہ شریعت کی زبانِ سلیس، با محاورہ اور کمال ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کے استعارہ نہیں لگاتے، ہندی الفاظ کے استعمال کا گرجا مانتے ہیں۔ جو شاید ان کے استاد قاضی کے فیضِ تلمذ کا نتیجہ ہے۔ سلیس اور با محاورہ زبان اور بندش کی چٹکی کہیں کہیں شریعت کے بیان کے متن میں بھی مالدان ثابت ہوتی ہے۔ قلم ان امور کے پیش نظر شریعت میرے نزدیک سنی آفریں شاعر سے زیادہ زبانِ دیربان کے شاعر معلوم ہے۔ اور ان کی غزلیں شاعری زبانِ دیربان کے محاذ سے ضرور دبان دارمنوں کی حامل اور خمیگی مطالعے کی مستحق ثابت ہوتی ہے۔

حواشی

- ۱۔ دیوانِ شریعت : آغا جوشی شریعت کھنوی مطبع جعفری، طبع اول، مطبعہ ۲۰۔ تاریخ ۱۹۹۶ء ص ۲۲ تا ۳۲۰
- ۲۔ خوش معرکہ زبیرا : مؤلفہ سعادت خاں ناصر، مرتبہ ڈاکٹر عظیم انہوڑی کھنوی طبع جولاہی ۱۹۹۱ء ص ۶۳۔
- ۳۔ غمخانا جاوید : (جلد ہارم) لادسری رام، ہمدیم پریس دہلی، طبع ۱۹۹۳ء ص ۵۳۱ تا ۵۳۲
- ۴۔ کلیاتِ آتش : مطبع لڑل شہر کان پور طبع اپریل ۱۹۸۸ء ص ۱۳
- ۵۔ تاریخ ادب اردو : مرتبہ مرزا محمد عسکری کھنوی طبع ۱۹۹۹ء حصہ دوم ص ۲۵۱
- ۶۔ کلیاتِ تاج : مطبع لڑل شہر کھنوی طبع ۱۲۰۹ھ و دیوانِ اول ص ۲۹
- ۷۔ دیکھو : (۱) غنچہ رازو : میر ذریعہ علی صاحب کھنوی۔ مطبع محمدی کھنوی طبع اول مطبعہ ۲۵ رجب ۱۴۰۲ھ ص ۱۲۸
- (۲) انتخابِ صبا : مرتبہ کاظم علی خاں، اتر پردیش اردو اکادمی کھنوی طبع (اکتوبر ۱۹۸۲ء) ص ۶۹
- (۳) فہرست کالج گزٹین کھنوی (سائبر) بات ۸۲۔ ۱۹۸۰ء : مرتبہ کاظم علی خاں ص ۸۰
- (۴) دیوانِ آخر : فتح امدادی جگر کھنوی مطبع مصطفائی کھنوی طبع اول مطبعہ ۱۲۰۵ھ ص ۲۶۶
- ۸۔ شریعت اللہ کے شاہی خانوادے سے قربت رکھتے تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھو

۱۔ میر تقی میر مطبوعہ "آج کل" نئی دہلی ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء ص ۱۰
تفصیل کے علاوہ ہر مقامہ "مطالعہ فرمات" "آج کل" "میر تقی میر جرنل" :
کاظم علی خاں۔ ادارۃ فنون اردو کھنوی طبع تاریخ ۱۹۹۲ء ص ۲۵۹ تا ۲۶۰
۲۔ شریعت کے اس شعر پر کسی شاعر کا یہ شعر یاد آتا ہے :
گزل کی کہ کاغذ میں کہہ دے کوئی انجام کمال
بارخ عالم میں بقیت مسکرا کر انا چھوڑ دے
(روم نامتے بیت بازی : مرتبہ کاظم علی خاں۔ کھنوی طبع جولاہی ۱۹۸۲ء ص ۳۳ تا ۳۴)

۱۱۔ دیکھو : (۱) "تجلیات : فتح محمد حسین جونیوری، مہر ناز پریس، کھنوی طبع دوم مطبوعہ ۱۹۳۷ء
(۲) تجلیاتِ غالب : محمود نازی، غالب اکادمی نئی دہلی طبع جون ۱۹۸۲ء
تجلیات از مرقعہ نازی ص ۵
(۳) ترجمانِ البلاغت : مولوی امام بخش صاحبانی۔ مطبع لڑل شہر کھنوی ص ۱۰۲

۱۲۔ گلستا شریعت کھنوی مرتبہ ۵ مارچ ۱۸۹۰ء ص ۳
۱۳۔ اردو کے معنی (صدی اول) : حصہ سوم : مرتبہ مرتضیٰ امین ناضی۔ مجلس ترقی ادب لاہور طبع اپریل ۱۹۹۰ء ص ۱۳۵
۱۴۔ اردو کے معنی (حصہ اول) : مرزا غالب، اکل المطابع دہلی طبع اول، مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۸۹۶ء ص ۲۶
۱۵۔ عودِ ہندی : مرزا غالب۔ مطبع مجتبیٰ لبرٹری طبع اول مطبوعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء) ص ۱۰۱ تا ۱۰۲
۱۶۔ یہ شعر کلیاتِ آتش میں نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ اس آتش کا یہ شعر تاج اول کلام ہو۔
۱۷۔ شرح دیوانِ اردو کے غالب : علی حیدر نظم طباطبائی۔ کھنوی طبع ۱۹۹۱ء ص ۳۹۲ تا ۳۹۳

۱۸۔ خاتونِ لائبریری جرنل پٹنہ نمبر (۷) و (۸) ص ۳
۱۹۔ مقدمہ شریعت شاعری : الطاف حسین حالی جرنل اردو اکادمی کھنوی طبع ۱۹۸۲ء ص ۵۵ تا ۵۶ نیز ص ۱۱۶ تا ۱۶۷
(یہ اشاعت کتاب کے پہلے ایڈیشن طبع ۱۸۹۳ء کے کتب پر مبنی ہے)

۲۰۔ دیکھو : (۱) شعر بلند (حصہ اول) مولانا عبد السلام ندوی، اعظم گڑھ طبع ۱۹۳۹ء ص ۲۴۰ تا ۲۴۱
(۲) وحی ہمز : ڈاکٹر محمد حسن کھنوی دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۴۲ تا ۱۴۵
(۳) مطالعہ کھنوی : ڈاکٹر محمد حسن کراچی طبع ۱۹۷۹ء ص ۵۹

(۳) دہلی کی ترقی: ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، نئی دہلی، طبع دسمبر ۱۹۷۷ء

۱۳۵۰ خیرم ۲۹

۱۔ لکھنؤ: (۱) کارخانہ اسلحہ، لکھنؤ، ڈاکٹر ذوقی، جلد برقی پریس، دہلی، طبع اول مطبوعہ

۱۱ اپریل ۱۹۶۱ء ص ۳۲۱-۳۳۲

(۲) فناءِ کبریت: رجب بلبل، مسعود رشید: مسعودی ادیب، لکھنؤ

طبع ۱۹۵۷ء ص ۷۵

(۳) لکھنؤ کی ترقی و ترقی: ڈاکٹر مسعود رشید، ڈاکٹر ادیب لاہور، طبع ۱۹۵۷ء

ص ۱۰۵ خیرم ۲۹

(۴) احمد شاہ: سید حفیظ، لکھنؤ، طبع ۱۹۷۱ء ص ۱۰۳ تا ۱۰۶

ترتیب کے بعد استاذ ملا خدوہ: ۱۰

۱۔ دیوانہ بہار آئی ہے ہشیار، ہوشیار، ص ۲۲۷

۲۔ کیا درپے ہیں جوں جاں گریباں؟ نہیں کرتے

نعل چپے میں اکثر باقی آنکھ سے آنسو

چمک جاتا ہے جب لبریز ہو جاتا ہے پیانا

۳۔ نیا سہم چن روزگار میں دیکھا

مگوں کو چاک گریباں بہار میں دیکھا

۴۔ دیکھ لک کے کہیں لک بنا کہیں لالہ

چن میں رنگ نہ لایا مارا لہو کیا کیا

۵۔ چھٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا

صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

۶۔ کیا ہے قل جگہ گناہ وقت لے

خدا گواہ ہے میرا کوئی قصور نہ سنا

۷۔ اٹھا کے بزم سے غفلت میں تم کو لے جاتے

یہ سوچتے ہیں کہ اپنے پرانے بیٹھے ہیں

۸۔ شریف، میں شرف نے "اپنے پرانے" کے محاورے کو خوب مورتی

سے برکت ہے۔ یہ محاورہ قریمک، آصفی اور مہذب افغانی میں موجود ہیں۔

شرف کا یہ شخص محاورے کے وجود و صحت کے لیے اچھی منہجہ جو لغت نویسوں

کے لیے مفید مطلب ثابت ہوگی۔

بقیہ: سیدی کٹ

ادبی نئی، اور ڈاکٹر، ہمالیہ، روٹلا والی، شریعہ ہدیہ ہے۔ اب
مال بلی کی کتابوں اور شریعہ سے لے کر، تعلیم کتابیں، ازیر کرنے، جو پادش
ملیں انہیں نئے ادب سے تیز سہی حقیقت اور صورت حال کو بعد احترام قبول

آج کل کی دہلی

کوتے ملے جو ملے یقین کے ساتھ ملے ایک سولہ نشان امیر (میر)
سولہ سال۔ ایک کاسب کچھ جاتا پچھا ہم کے لباس کی طرح رنگ اند
چھوٹا ہوا ہوا ہے۔ ہوش زندگی کی پیاس سے خشک ہو جاتے ہیں۔ آسمان پر
ٹھنڈے ستارے نہیں سبب رچی کے ڈوب میں دیکھ کر دھڑکے پر نام کرتا ہوتا
تھا۔ اب انہیں پیاس ہار چھوٹے کوئی ہاتا ہے۔ اس پیاس اور فکس فکس
میں اس قدر مای ہوئی ہے، اس قدر ناگوار ہے کہ وہ اس قدر غائب ہوئی
ہے کہ راستوں میں آگ لگنے لگی ہے۔

بقیہ: سفر نامہ

ان کی خوبی یہ ہے کہ داخل سے خارج کی طرف اور خارج سے داخل کی طرف مسلسل
معروف سفر ہے۔

سفر نامے میں مزاج نگاری کا آخری اور سب سے روشن نام ایسا نشان
ہے۔ انہوں نے "آوارہ گرد کی ڈائری" "دنیا گول ہے" "چلتا ہو تو چین کو
چلیے" "ابن بطوطہ کے قنات میں" وغیرہ سفر نامے لکھے۔ ابن اثیر شہید نے تم
کے سفر نامہ نگاری میں۔ انہوں نے خدوہ قنات کیا ہے کہ انہوں نے باستان
سفر نامہ میں لکھا۔ بے شک انہوں نے سفر نامے نگاری کے اور سفر نامے دوران
اپنی آنکھیں بھی دیکھیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا اس
تأثر کو فوراً قلمبند کیا اور اشاعت کے لیے اخبار اور بیچ دیا۔ چنانچہ ان کے
سفر نامے میں ربط و تسلسل تلاش کرنا مناسب نہیں۔ ان کے یہاں مزاج حقیقت
بالذات ہے۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران جگہ کی سفر نامے بھی لکھے ہیں، جی میں
عبدالغادر، دیوبند آبادی کا سفر نامہ "سفر حجاز" حسن الدین خاتون کا "مشرق حجاز"
عزیز الرحمن کا "حجاز صادق" حکیم فکین، امین عثمانی کا "اربع حرم ملک" سید بابا کوثر
کا "پاکستان حجاز" ہیں، لیکن دو سفر نامے ایسے ہیں جن میں خدوہ قنات کی تفصیل
کی کوکھ سے اُبھرا ہے۔ میری مراد عبدالملک کے سفر نامے "حدیث دل" اور
ممتاز لغنی کا "بلیک" سفر نامہ ہے۔ یہ دونوں سفر نامے صرف اندھی
مقدیرت کا انداز نہیں کرتے بلکہ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوال اٹھا کر اس
روحانی تجربے کی داخلی واردات بھی بیان کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی
حلقوں میں ان دونوں کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

چنانچہ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں سفر نامہ دو بیانیہ
صنف ہے جو کہانیاں کی سطح پر خیالات کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
اور زندگی کے سچی زاریوں اور پہلوؤں کو زندگی کا رنگ کے ساتھ بکھاتا
جاتی ہے اور محض تذکر کے معلومات بھی فراہم کرتی ہے۔

۱۔ اس ضمن میں جناب احمد علی علیہ السلام کا سفر نامہ بھی لائق ذکر ہے۔

سفرنامہ ادب کا ایک حصہ

— آزادی کے بعد

واقعات کو دریافت کر کے تعلیمی کو زنجیر کوٹنا، تحقیق اور سچائی سے ہونے والا اس حال کی تصویر غفلتوں میں گھنچ دینا ہی سفرنامہ کہلا سکتا ہے۔

ماضی میں سفر نامے محض خبروں کی تاریخ اور تاریخی عمارت کی پیمائش تک محدود رہے ہیں۔ سیاحت کا یہ انداز ہے جس میں سیاح شہروں، عمارتوں، افراد کو "ماہر وائے" کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ یہ ایک طرح کی کیرہ رپورٹ ہوتی تھی۔ شاید اس لیے لائبریری سائنس میں علم کی حدود اور کتابوں کی درجہ بندی میں سیاحت نامے کے لیے اس شخصوں ملک سے متعلق جزئیہ کی کتابوں کے بعد جگہ تحفوں کی گئی ہے اور تخلیقی اصناف سے اس کا کوئی رشتہ نہیں جوڑا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں سیاحت ناموں کی مقبولیت کت ہیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ حالانکہ ان کی ابتدائی صورتوں کا شعرا ایک صدی تک جاگتے رہے۔ اس کے بعد سرتیبا درستی سے لے کر قاضی تعداد میں سفرنامے لکھے گئے۔

سفرنامے اور سیاحت میں کوئی خاص فرق واضح نہیں ہوتا، جس زمانے میں سفرنامہ نگاری کا آغاز ہوا تھا۔ سفرنامے اور سیاحت میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ بیشتر سیاحت کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا تھا اور بیسویں صدی کے دہائیوں کے سیاح جب غیر محاکس کی طرح گئے تھے تو ان کے بستیوں، نظریات، غیر ہم طور پر ایک مفقہد ہوتا تھا۔

ادب کی مختلف اصناف میں جس طرح تخلیقی تجربات کی کارروائی ایک اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ادب کی اہم صنف میں ایک سفرنامہ بھی ہے جو ایک تخلیقی تجربہ کا حامل ہے۔ بالفاظ دیگر سفرنامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے۔

سفرنامہ دنیا کے ہر ادب کی ایک مستقل صنف ہے۔ اس کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں، جو اے دوسری اصناف سے الگ کرتے ہیں۔ سیاحت نامے کی

سفر نقد عربی ہے۔ لغت میں اس کے معنی طے مسافت یا قطع مسافت کے ہیں۔ زائد ہو یا کم۔ سفر کی نفسہ دینی اور دنیوی حیثیت سے کارآمد ویزیشن ہے۔ امیر و گدا، عالم و دغا، سب سفر سے ہی مرتبہ کمال کو پہنچتے ہیں۔ اس کی اچھی مثال برطانوی قوم ہے۔ سفر نے اس کو گرا سے تاجر، تاجر سے کہن، بہادر اور کہن سے بہادر، قیصر سے گدا کر دیا۔ ہمارے حضور معلوم خدا نے سفر کا حکم دیا۔ زمینی و آسمانی دونوں سیر و سفر سے شرف فرمایا۔ سراج جو ایک عظیم الشان مجسمہ ہے اس کا مقدمہ بھی سیر و سفر تھا۔ علاوہ ازیں غربت، قسوت، تجارت، ادبی تعلیمی، جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور دوسری تمدنی ضروریات کے لیے بھی سفر نہایت نفع بخش اور بار بار آکر ہوا سفر ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ سفر کر کے عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ باطل اور جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ غرض پریشیت سے سفر کا کل کارآمد مفقہد ہے۔

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ سفر صرف تفریح یا زیارت کرنے ہی کی غرض سے کیا جاتا ہے؟ یا سیاح کا مقصد بھی اس سفر میں کا طریقہ ہوتا ہے بہت ماضی میں ناموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سیاح اپنی علمی استعداد اور صلاحیت کا امتیاز سے اس شہر کے نظم و نسق، طوطی، علمی، تمدنی، ثقافتی اور جغرافیائی ماحول کا جائزہ لے کر وہاں کے خیالات کو تشبیہ کر کے اپنے شہر اور عام ادبی ذوق کے آدھی کو سفر نامہ نگار کر دیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان شہر کو دوسرے شہر کے حالات و واقعات سے آگاہی نہیں دیتی ہے تو یہ مخصوص طور پر ایک ذی ہوش کو بھیج کر اس کے حالات و واقعات قلمبند کرتا ہے۔ اس کی مثال کہ پتان جیوڈیرن ہیں۔

الغرض معلوم ہوا کہ مسافر یا مفقہد ہوتا ہے اور وہاں کے حالات و

○ پروفیسر کالونی، قادری آباد، دھبہ جگ، بہار

آج کل کی دہلی

شادی کے بعد جو کچھ بیان کیا ملبے اُسے دیکھا بھی جانے لیز اس کے مطالعے سے قادیانہ کی صورت حاصل ہو جو ایک اور تریزاں کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ سفرنامہ کا انداز تحریر بے حد شگفتہ ہوتا ہے، لیکن اس کتاب اور دیگر کتب کا بھی ہرگز نہیں کہ ذہن کی گرفت میں نہ آسکے۔ البتہ قاضی کی عمر کا سفرنامہ ”عرب اقصیٰ“ مہیا سحاری بھر کے انداز بیان بھی زیادہ متاثر نہیں کرتا۔

سفر نامہ جس تیزی سے ایک منصف کے طور پر ادب میں داخل ہوا ہے ،
اس نے بہت سارے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ یہ ہیں کہ اس کے پہلے سفر نامہ کا
شمار کبھی ادب میں نہیں ہوا۔ بلکہ یہ کہ پہلے یہ صنف ادب میں مرکزی لہری حیثیت
نہیں رکھتی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے زمر اس شاعری ایک عصر سے اردو میں
موجود ہونے کے باوجود مرکزی رو سے اس کی قدر نہیں ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ
سفر نامے لکھتے یا دیکھتے تھے تو ادب میں عمومی حیثیت اختیار کر لیتے۔

یوسف خاں کب لڑائی کا سفرنامہ اور عجائبات فرنگ“ طبعہ ۱۸۳۶ء
 کو لگا کر دو کاغذی سفرنامہ شائع کیا جائے گا۔ اردو میں اس صنف ادب کی تعریف بالکل
 سوئس سال بنتی ہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں ایک ہی ایسا سفرنامہ موجود
 وجود میں نہیں آیا۔ سفرناموں کی ابتدائی نمایاں کاوشوں میں بالعموم دو اہم
 جغرافیہ نویس کی کتاب ”کلابانی“ محمد حسن آزاد کی ”سیرایران“ اور سیرت
 کی ”مافان لندن“ کا شمار کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ سفرنامے سربلندی حاصل
 بارے میں بعض نامرد عملات میں سے ہیں۔ تجیر اور تیسرے پیدا کر کے ہیں اور کسی
 مذہب خاں کو ان دیکھے عالموں کی سیر بھی آباد کرانے ہیں۔

محمود نظامی نے ”نظر نامہ“ کے دیباچہ میں ایک عمدہ بات یہ لکھی ہے کہ :-
 ”جہاں میں اس سفر میں بہت سے شہروں سے گزر رہا ہوں وہاں کی شہزادیاں
 بھی تھے جو خود میرے دل سے گزر رہی ہیں :-“

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ
سیریاں جو پورے ماحول کو اپنے دل میں جگ دے اور وہ خود کہیں ایسی
نظر نہ آئے۔ جب شہر سیر کے دل میں راہ بانٹتے ہو تو ایک حقیقی سفر نامہ
میں آ جاتا ہے۔ اور اس لمحے کے سفر نامے میں اور سیریاں دو الگ الگ کردار
نظر آتے ہیں۔ گلاب میں دی رشتہ موجود مٹا ہے تو تخلیق اور تخلیق کے درمیان
خالق اور مخلوق کے درمیان اور کسان اور زمین کے درمیان ہوتا ہے سفر نامے
میں یہ اصول پیدا ہوجاتے تو پھر سفر نامہ محض واقعات و مناظر کا سامانہ نہیں
رہتا بلکہ سیریاں کی ذہنی اور روحانی واردات میں جاتے اور ایک ایسا بابہ
تخلیق میں جاتا ہے جسے سلائیڈ پر انارٹا کی تحریک کی آنکھ سے دیکھ کر ہی دنیا پر
پیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

سفر تکثیر الباء Multidimensional سفر آرب

آج کل کی دہائی

ہے۔ مشاہدہ کی حاکماتی ہے۔ اس لیے یہ تصور زیادہ مکمل اور جاندار ہوتی ہے۔
 منشی محبوب عالم کا سادہ بیاض "سفر نامہ لوط" ۱۹۰۸ء میں چھپا تو ایک
 ہندو نوجوان کو اس نے اتنا سنا کہ وہ کہہ دیا کہ اگر یہ نقد ہے تو کہہ دیجئے کہ
 دیکھنے کے لیے مسند پارکاسٹر کے لیے بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی بی
 میں منشی محبوب عالم نے وہی کہہ بیان کیا ہے جو انہوں نے اپنی کھلی آنکھ کے
 ساتھ دیکھا اور سارے سفر نامے میں داستان والا لڑی بھیج کر جوٹ ڈھتا۔
 بات دہرائیں یہ بھی کہ لوط کی عمارتوں، مشرکوں، لوگوں کے دین میں کے طریقے
 اور ایجادات کے بیان میں اس قدر دما و دھما کہ وہ ہندو نوجوان اس حادہ
 کاپانی ذات پر آزمائے کے لیے نکل پڑا اور حادہ جانے لگی مگر بھی پھر
 والا یہ سفر واپس بھی آئے انہیں

سفرنامہ نگار اپنی چوکی کے مطابق مسکون اور شہروں کا جائزہ لیتا ہے۔
 ۱۸۹۲ء میں معزومہ دوست نام کے سفرنامے نے شمالی کی دل چاہی کا باعث
 مسلمانوں کے علمی اور ادبی نکتے، مسلمانوں کی سائنسی و فنی خوبصورت عالمی
 فنی مشق، علمیان اور شیخ الفلاح صبیحہ تحقیق ہیں تو ۱۹۰۱ء کا سفرنامہ نگار
 یورپ کے پتوں میں، مسلمانوں میں کی گئی تھی اور رائے کے کائنات
 عقل آسانی کرتی گئی تھی اور ان کے سفارت کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ قدیم سفرنامہ
 سفرکار نامہ تھا۔ سفرنامہ نگاری کی ذمہ داری ہے۔ بہر حال دو فوٹوں میں
 دل چاہی کا عنصر موجود ہے۔ قدیم سفرنامے میں دل چاہی کے وجہ سے ہر گت اسی
 کا سفرنامے کے علاوہ کوئی ایسا دلیل نہیں تھا جس سے وہ ان معلومات
 کو حاصل کر سکے۔ لہذا اردو میں سفرناموں کا ایک مخصوص مقام ہے۔ لیکن
 ادب کے اس شعبہ میں معاصر سفرناموں کی نگاہ نئی ہو چکی ہے۔

فنی طور پر سفر نامہ وہ یا نہ صرف ہے جو ایک سیاح کے دوران سفر پر انصاف
سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور ان کے اذکار و اذاعتات علمی و ادبیات سے مزین کرتا
ہے۔ اس صنف ادب کا نام مواد سفر نامے کے گرد پیش کی کیفیت سے خارج نہیں
بکھر ہوا ہوتا ہے، لیکن سفر نامہ نگار صرف خارجی امور کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا
بلکہ اپنے ملاحظہ کو جذبہ جہت، باطنی، مدلل اور دستاویزی بنانے کے لیے
بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ سفر نامہ نگار کی
نظر حسی بائیک میں ہوگی، جزئیات اسی کی تفصیل سے اس کے مشاہدے میں
میں گی۔

آزادی کے بعد بیشتر سفر نامے شریف خاں کا اشارہ کرتے ہیں کہ "چند دن دیر"۔
 ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ "عبدالرحمن صاحب نے کہا کہ "چند دن دیر"۔
 فیرم"۔ عبدالقدوس صاحبی کا سفر نامہ "چند دن دیر" مختلف مقامات کو مشرقی علاقہ نظر
 سے دیکھتے ہیں اور یہاں مذکور ہے کہ بار بار ریلوے آگیا ہوتا ہے۔

خاصاً ادبی مغزوں میں سید احتشام حسین کا ”ساحل اور سمندر“ ڈاکٹر عہادت بریلوی کا ”رض پاک سے دیا فرنگنگ“ اور وزیر شاہ کا ”لیک لیون طاقا“ بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ سید احتشام حسین نے اپنا سفر ایک تعلیمی مقصد کے تحت اختیار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کے قیام کے دوران وہ کسی مقام پر بھی اپنے نظریات کی اصلاح و ترقی کے تحت حاضر نہیں کر سکے اور ان پر شدید ترین ناہنجیا (گوشہ نشینی) کی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عہادت بریلوی کا راز اور نظریاتی مشق ہے، لیکن انہوں نے لندن کو رحمت کی نظر سے دیکھا ہے اور اس کے علمی خزینوں کو ایک ادیب کے ذرا پر نظر سے متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر شاہ نے ہندوستان کے سفر کو موضوع بنایا ہے۔ اور دنیا اور ہندی کے جذباتمندیوں سے اپنی ملاقاتوں، کتابوں اور باتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس سفر نامہ میں انکا کی کھٹکٹاں دھو دھو جھٹی بھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عرض اردو ادب میں جو سفر نامے آزادی کے بعد لکھے گئے ہیں، انہیں باسانی تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اول :- روائی سفر نامے، جن میں سفر نامہ نگار جغرافیہ اور تاریخ کے کوائف جمع کرتا ہے۔ مومنوں کا حال اور مناظر کی کیفیت پیش کرتا ہے۔ بہت اور بار بار کے آثار پر حوا کا گواہ بن جاتا ہے اور ہر بار قاری کو ایک ایسی رہ نمائیاں کتاب چٹا کر دیتا ہے، جسے ہاتھ میں لے کر وہ آسانی سے کھائی گیٹ سے اٹھ کر تاریک سفر کر سکتا ہے۔

دوم :- محرومانی سفر نامے :- جن میں سفر نامہ نگار صرف انکھیں کھلی رکھتا ہے۔ بلکہ داخل کی تیسری آنکھ کو کھینچ کر دعوت بھی دیتا ہے اور یوں معروضی حقیقت کے ساتھ موضوع حقیقت کو بھی آشنا کر دیتا ہے۔

سوم :- مزاجی سفر نامے :- اول الذکر دو اقسام کے سفر نامہ نگار حقیقت کو سدھجی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اسے سچائی سے پیش کر دیتے ہیں۔ مزاج نگار سفر کو قدرے غیر طبعی آنکھ سے دیکھتا ہے اور انداز طور پر اس کا منظر مزاجی طور پر افسانہ بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے سفر نامے زیادہ تر کالم نگاروں نے لکھے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو سفر ناموں کا۔ اردو ادب کے چند مشہور سفر ناموں کی روشنی میں تاریخ وار جائزہ پیش نظر ہے۔

احتشام حسین کا ساحل اور سمندر ۱۹۵۳ء میں سرسبز قومی پریس لکھنؤ سے طبع ہو کر شائع ہوا۔ زبیر ظفر سفر نامہ مصنف کے امریکہ اور انگلستان کے سفر سے متعلق جاننا اور خیالات کا مجموعہ ہے۔ موصوف امریکہ میں تقریباً دس مہینے۔ اور ان کی سیاحت فروری ۱۹۵۲ء میں امریکہ کے لیے شروع ہوئی۔ ان کے مطالعاتی اسکیم اور سیاحت اس سنگسار پر مبنی تھی جو سرنگا پورک سے ہوئی تھی۔ یعنی ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو عین نظر

آج کل کی دہائی

دیکھتے ہوئے ادیب، قاری اور مضمونوں کے مسائل پر تبادلہ خیال اور ادبی، تخلیقی اور اشاعت کو نظر کرنے کی تہنیر پر بندھنے کے لیے تھی۔ اور یہ سفر نامہ کامیاب بھی رہا۔

دلی سے امریکہ کی دوری بقول مصنف چالیس ہزار میل ہے۔ امریکہ کی تاریخ میں دو جدید کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوتی ہے کیوں کہ اس لڑائی کے دوران امریکہ پہلی بار اپنی جنگ کی پسند کی تحویل سے پوری طرح باہر نکلا تو اسے اپنی دولت اور سیاسی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ امریکہ کو اپنی اہمیت کا احساس بڑھتا ہی رہا۔ دولت بڑھتی رہی، قوت بڑھتی رہی، صنعت اور تجارت کے ذریعہ سیاسی اقتدار بڑھتا رہا۔ چونکہ واشنگٹن، جنرلس، ٹیکن کی دی ہوئی جمہوری روایات کا احترام باقی تھا۔ جغرافیائی اور تاریخی صورت حال نے امریکہ کو صنعت میں ایسا موقع دیا کہ باہر بازار گئے۔ چھوٹی بڑی جنگوں میں بھی مال لے کر اور ساری دنیا کی دولت سمٹ کر امریکہ میں لگے۔ امریکہ کا اقتدار اتنا بڑھا کہ وہ یورپ اور ایشیا کے آشعلوں، تانکوں میں لگا۔ اب اپنی تجارت اپنا سرمایہ اور دولت بیڑا اپنے اقتدار کو جیسے کہے اسے پاسی کو جاری رکھتا ہے۔ اس لیے اربوں ڈالر خرچ کر کے اس کی سیاسی اور معاشی بحران سے بچنا چاہتا ہے جو اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ جب جنگ کا خطرہ کم ہوتا ہے تو امریکہ میں بے روزگاری بڑھتی ہے۔ مبالغہ کم ہوتا ہے۔ اثر گھٹتا ہے۔ جب دوسرے ممالک اپنی قومی زندگی کو استوار کرنا چاہتے ہیں یا قومی جذبات کی بنا پر آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں یا اپنی ملکیتوں کو قومی بناتے ہیں تو امریکہ پر عرصہ پڑتی ہے۔ اور وہ ان کی مخالفت کرتا ہے۔ اب بھی اس کی حسرت جھٹکتی پیمانہ پر ہے۔ اگر لڑائی کا خطرہ کم ہو جائے تو اس کا مال کہاں جلتا گا۔ اس کے یہاں جو مال بنے گا وہ کوئی خریدے گا۔ بہر حال امریکہ زندگی کی اس منزل پر ہے (جہاں یا تو اسے جنگ کے شعلے بھڑکانے یا دنیا میں آزادی اور اشتراکیت کی جادو جھکڑ کو رکنا ضروری ہے)۔

عرض احتشام صاحب لکھتے ہیں کہ دوسروں کی آرزوؤں اور زندگی رہنے کی خواہشوں کا فائدہ کر کے الیکار نامی رنگ اور بے رحم افلاکی فلسفہ کی رو سے جادو جھکڑا ہے۔

بگے سید حسین علی خاں کا سفر نامہ ”آسٹریلیا کی جھلک“ جو ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔ ہے جدھر ترقی و مضبوطیت کا حامل ہے۔ آپ آسٹریلیا کے سفر سے پہلے (انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ وغیرہ کی سیاحت کر چکی ہیں۔ تیز رفتاری کے مقام مقدمہ کی بھی زیارت فرمائی ہے۔ اس سفر نامہ کو مرتب کرنے کے بعد بھی دلی چپ مضامین لکھنے کی ہیں، جن میں آپ کی وسعت نظر اور معلومات کے ثمن کا پتہ چلتا ہے۔ اس سفر نامہ کی پہلی تصویت

مئی ۱۹۸۲ء

یہ کہ یہ اردو زبان میں آسٹریلیا کا پہلا سفرنامہ ہے۔ اس سے پہلے اردو میں کسی مرد یا عورت نے کوئی سفرنامہ نہیں لکھا۔

مسٹر یسین کا سفرنامہ مختلف امور کا خزائن ہے۔ اس میں آثار قدیمہ اور مشہور مقامات کی تفصیل بھی ہے۔ سماجی، معاشرتی اور صنعتی امور کا انکشاف بھی ہو سکتا ہے۔ کھیل، تفریح کے امور بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں اس سفرنامے سے آسٹریلیا کا سفر کرنے والوں کی بہترین رہ نمائی اور رہبری ہوگی۔ یہ اتفاقاً مختصر اس کو سولیا کا سفرنامہ کہا جاسکتا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت عام فہم اور سلیس زبان ہے، مگر اس کے ساتھ دلچسپی اور دلکش شوق کے انہی ٹھٹھے بھی ہیں۔

تیسری خصوصیت اس کا اسلوب بیان ہے، جو مزید رنگ سیلے ہوئے ہے۔ اس کا پڑھنے والا ختم اور سرکراہٹ کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

مسٹر یسین نے ہندوستان اور آسٹریلیا کی حکومت کے متعلق بتا دیے کہ آسٹریلیا میں کس طرح بچوں کو نوازا جاتا ہے، ذی دماغی ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں برصغیر کے نڈر اور مانع عمل پرنسپل کو کہا جاتا ہے۔ اسے موصوفہ کی زبان میں کہتے ہیں:-

”آسٹریلیا گورنمنٹ نے یہاں کی آبادی بڑھانے کی یہ ترکیب نکالی ہے کہ ہر دوسرے بچے کو سریتھے ایک پوند اور دوسرے کو دو پونڈ اور جو بچے کو تین پوند ڈیڑھ طرح نوازا جاتا ہے، مگر یہی بچے کہ یہاں بڑھ کر نڈر اور ایکے سے منہ لفظ ہے۔ اور ایک عجیب بات یہاں دیکھتے ہیں آئی کہ ہر بچہ موروث میں ایک مورت کے چڑھاؤ کیجئے ہوئے ہیں“

”دوسرے ترکی میں“ مولانا ابوالحسن علی مدنی کا سفرنامہ جو گوشت روڈ، کھنڈو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں موصوفے نے فلسطین، انگرہ، بحرہ، حلب، ترکی، استنبول اور انقرہ کا سفر کیا اور اس ملک کو دینی، اجتماعی، اخلاقی، علمی اور تاریخی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۵۶ء میں سفرنامہ نگار کو دینی و تفریحی کی دعوت پر دمشق کا سفر کرنا پڑا تھا اور وہیں سے ترکی کا سفر کرنے کا خیال آیا۔ ترکی اور ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص کبیرے اردو پرینہ تعلقات ہیں۔ یوں بھی ترک صدر ملک اسلام اور کعبہ کے پاسان اور سعادت اسلامی کا نشانہ رہ چکے ہیں۔

خلافت کے بعد کے کچھ ترکمان آتارک کی بے دینی اور اس کے دفاع کی بے اعتدالیوں اور ناقابل اعتدالیوں نے اور کچھ سلطان مغرب کے پروپیگنڈے نے ترکوں کو بہت بدنام کر دیا تھا۔ اور یہ عقیدہ بن گیا تھا کہ ترکوں نے اپنا رشتہ اسلام سے بالکل قطع کر دیا ہے۔ اور اس ملک میں ایک عظیم انقلاب ہو گیا۔ یوں تو شریف فاروق نے ”آتارک کے دمن میں“ اپنے مشاہدات و تجربات سے ترکی کو ہم بڑی تفریق کی ہے اور وہاں کی سماجی سیاسی

آج کل کی دنیا

اقتصادی، علمی اور تمدنی اثرات پر عینی مشاہدات پیش کیے ہیں، لیکن ابوالحسن علی ندوی نے ترکی کی دینی شیعہ اور اسلام سے دغا داری کی تصویر کشی کی ہے۔

”دینی اور اس کے اطراف“ مولانا حکیم سید عبدالغنی کا سفرنامہ ہے جو ۱۹۵۸ء میں کتب خانہ انجمن ترقی اردو جمنہ دینی سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ اس گزرتے ہوئے عہد اور اس کھوئے ہوئے دور کی تصویر ہے۔ یہ نکتے بھی تصویر پر قلم کی رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے پاک۔ سفرنامے کی سطح سے جو صاحب کی دینی محبت و جوش اور ان کے دل کی درازمندی اور اثر پذیر ی کا اظہار ہو سکتا ہے۔ ان کو دینی کے چپ چاپ ہو، مسلمانوں کے عروج و زوال اور اقبال اور وارک کے تاریخی کندہ نظر آتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے عہد رفتہ کی ہر یادگار اور ان کی عظیمی مملکت و مملکت کے ہر نشان کو آنسوؤں کے لہجے بانی ہوئی آجھوں سے دیکھا اور رزقے ہوئے قلم سے اس کا حال لکھا۔

عشق تیسری کا سفرنامہ ”ایک سال لاہور گولڈن“ دسویں، ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، صرف اس لیے دل چسپ نہیں ہے کہ بارہا ادیبوں اور فنکاروں کی ٹپ کی ہے بلکہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں موصوفے کی دلکش انفرادیت جلوہ منڈے۔ ان کی نظر دنیا کی ہر چیز پر ایک خاص انداز سے پڑتی ہے اور اس چیز سے مزاحیہ ماحول کی طرح اچھے کے مطابق اظہار کرتی ہے۔ حالانکہ ان کا سفر بدیدہ طیارہ ہوا۔ تیسری صاحب بنیادی طور پر مزاح نگار کی عظمت کے کچھ پید ہوئے ہیں۔ غیر ممالک کی غریب میں انہیں عجیب عجیب مہنگے پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ اور وہ ان کو آجھ کر دے کر پتے جاتے ہیں۔ اور بچے آتے ہیں۔ ”جیلان سے ملاقات“ کی مشرقی سے سلام ہوتا ہے کہ کچھ صاحب جمال ملکوں کی دکھائی دیں گی۔ مگر بڑی ہنسی آتی ہے جبکہ جیلان کا مطلب دو مہلک صاحبان ہیں، جوبی۔ آئی۔ اسے کے ملازم ہیں۔ ”فردوسی کی ڈوکاں“ بھی اس قسم کے لطیف مزاح کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ ہر مشرقی دعوت فکر دیتی ہے۔ اور ہر محکاؤں کو ایک سے انداز سے کھلا دیتا ہے۔ نیز ”جنارہ کھنڈی کی ساریکاد“ شاید سب سے زیادہ بالآخر شہر ہے، مصنف نے اس سفرنامے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک سفرنامہ اور دوسرا سفرنامہ، اسی سفرنامہ میں ”چالیس دب“ کہے پڑے لطیف طریقے پر اس کا آج وقت اب کی دجیاں آٹا ہے جس کی پکارا ہیں ہر طرف سے سنائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

”ہندوئی اور سیاست کا لائنس آدمی کو قلم پر مجبور کرتا ہے۔ ہماری قوم ہندوئی ہیں لیکن اس نئی فزیت سے سمجھ کر کارکنوں کی پوری پیچیدگیاں کہنے پڑتی ہے۔ اس نازک وقت میں اے جی حنفی کے سوا کچھ سننا منظور نہیں پہلے ادیب و شاعر اور ایک فن کار تھا۔ پھر اسے دیا اور ادیب صرف قوم کے جیٹا بننے پر آمنا کر رہا ہے۔ اس کا ادیب کہے اور اسے ناکسٹ کسی نام سے یاد کہے گی اس کا فیصلہ تو آئندہ زمانہ میں چھوڑے۔ آئیے ہم آپ مل کر سفر لکھ کر

... چار ادب زندہ باد! اسی خصوصیت نے زندہ باد! کو زبانِ وطن زندہ باد! ...
 سفرنامہ نگار نے جو اندازِ اسلوب اختیار کیا ہے وہ کافی فخریہ ہے۔
 رچنے لخت و شکر ہے ادب میں ایک تنقیدی سہولت گواہی بخشتا ہے۔
 "نیل سے قرأت تک" محمد اقبال انصاری ایم۔ اے کا سفرنامہ
 ۱۹۹۱ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ مصنف نے اس سفرنامہ میں تاریخی مقامات
 پر ہر شام اور صبح کے حالات و مشاہدات کو قلمبند کیا ہے۔ انصاری صاحب
 ہندوستانی مجلس امور عالم کی طرف سے ان ممالک کا مطالعہ کرنے گئے تھے۔
 جنہوں نے قاہرہ، بیروت، دمشق، عمان، سعودی عرب، بغداد، آمل، ایب
 رو، شلم سے اپنے سفر پر حجاب سیدھا خرما۔ اے میرے مدینہ کو مٹھنے لگے۔
 لوط کیسے اور انہوں نے اپنے اخبار میں شائع کرنا شروع کیے۔ اس سفرنامہ میں
 نہ ملک کی پوری حکاکی یا زور دہانی ہے۔

"سفر معروضات" منتظر رحمانی حافظہ کو بیکار کرنا سفرنامہ ہے۔
 منتظر مقرر اسلامی کا قائد بن کر قہار ہو گئے تھے۔ سائنس اور جدید تمدن کے
 بار کو دھمکے کی اسلامی نقطہ نگاہ سے سوچنے کی دعوت اس کا مقصد میں
 لکھی تھی۔ ۶ مارچ ۱۹۹۳ء سے ہوا۔ اس اجلاس میں جن ممالک سے
 حاضر ہوئے تھے ان میں روس، انگلینڈ، ہنگری، فلپائن، سلوواکیا،
 ایران، بلیٹ، یوگوسلاویہ، انڈونیشیا، افغانستان، پاکستان، ازبک
 بھارت کی سطح پر بھی ملک شامل تھے۔ ہندوستان سے مولانا غلیب صاحب
 فوجد، مولانا سعید احمد، اکبر الی، ڈین نیکلین، آف تھینکون، مسلم یونیورسٹی
 گیارہ اور منتظر رحمانی نے شرکت کی۔ مینی محافظہ و القاہرہ کی عظیم عمارت
 کچھ ہال میں تمام مندوبین کی کارروائی شروع ہوئی۔

"چند دن دہلی پر فرائیں" عبدالرشید صاحب ندوی کا سفرنامہ ہے۔ لبنان،
 جم، فلسطین، بلیٹ، جرمنی اور انگلینڈ میں وقت گزارا۔ اور اپریل ۱۹۹۵ء تک
 لٹریچر میں رہے۔ یورپی کامیابی کا سہرا ان ہی کے سپہے۔ ڈاکٹر نذر امام
 سفرنامہ "سفرستان" ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ ان کی کتاب مذہبی نئے
 راہِ اودھیجات کی مدد سے ہوتی ہے۔ چھاپا چھاپڑ اور ہلکا مڑا حراج نذر امام
 تحریروں میں ملتا ہے۔ کچھ غلطی، اندک سفرنامہ "ادب و حرم تک" ۱۹۹۹ء میں
 یہ ایک ڈیپ لائوش روڈ ٹھکانے سے ہو کر شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ مقامی ماحول
 غور و محاکات پر مشتمل ہے۔ اس میں جذبات کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ یہ سفرنامہ
 ذاتی سفر پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامہ میں کشمیل صاحب جے سٹیشن مولانا صاحب
 پر بڑی ندرت اور جذبات سے بتاتے چلے جاتے ہیں۔ "تاریخ سفر ایران"
 اکثر رشید اکبر حسن رشید قادری جامعہ عثمانیہ کا سفرنامہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔
 مظفر آباد، ایران، روس کا ایک نذر نامہ ہے اور رشید کچھ کا ادبی کارنامہ بھی۔
 سید بہاء الدین اور کثرت ہائی کثرت پڑھنا کر ڈاکٹر کثرت کثرت کثرت کثرت

کالی کالی

بناک۔ یہیں کشمیر ۱۹۹۲ء میں جے کاسٹریا اور سفرنامہ "گلستانِ حجاز"
 صبح ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ اس سفرنامہ کے مطالعہ سے مناسک جے کے سارے
 ارکان سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ موصوتہ ادبی زبان میں اور دانشمندی رنگ نگار
 سے اس سفرنامہ کو بہت دل چسپ بنا دیا ہے۔ حالانکہ اہل ایمان اچھی طرح
 جانتے ہیں کہ آج کل کچھ لوگ کس نیت سے کیے جاتے ہیں اور اس کی حقیقت کیا
 رہ گئی ہے۔ مناسک جے پسہ کرنے کی غرض سے اور سرور و تفریح کے خیال سے ہی
 زیادہ تر وہاں جاتے کا ارادہ کرتے ہیں۔ حالانکہ سرور و کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
 کا پاک ارشاد ہے کہ قیامت کے قریب میری امت کے ایسے لوگ توج کھنٹی
 تفریح کے واسطے سے کریں گے اور میری امت کا متوسط طبقہ تجارت کی غرض
 سے جے کرے گا۔ اور علماء و شہرت کی وجہ سے جے کریں گے۔ اور علماء
 بھیگ مانگنے کی غرض سے جائیں گے۔

"دریائے کابل سے دریائے یروک تک" مولانا ابوالحسن علی ندوی
 کا سفرنامہ ۱۹۹۴ء میں کھینٹوئے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ چھ مسلم ممالک
 افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور اردن کی مسلمانوں پر دے۔
 غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے ہمدرد و طرفداروں میں ایک اہم ہمنام ہو رہے۔
 منتظر رحمانی کا سفرنامہ "سفرستان" میں ماضی اور ماضی کی تاریخ ایک زندہ
 کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے "نکلیہ تری فلاں میں" بالعموم اور "انڈین
 میں اجنبی" میں بالخصوص جگہ جگہ حال کر ماضی کی تاریخ سے ہی تارناک بنا دیا ہے۔
 مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ ایک ایسا سفرنامہ نگار ہے جو تاریخ کی آشکار
 ادیب کا دل بکھاتا ہے

جلیل صاحب کا سفرنامہ "سفر بے شرط" ایران، عراق اور ترکی کی سیاحت
 کا سفر پر مشتمل ہے۔ موصوتہ رات کی شاہراہوں اور ڈھکھ کی گلیوں کی گلیوں
 اہمیت دی ہے۔ جلیل صاحب کا اسلوب دلکش ہے۔
 ذوالفقار احمد تاجپش کا سفرنامہ "جزیرہ" سری لنکا کی سر کرنا ہے۔
 تاجپش نبھاوی طور پر خواب نگار اور مصوے ہے۔ ان کے سفرنامہ میں روحانی ناویہ
 بالخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔

نستانتہ کھنے والوں میں پر وین حافظ نے اپنا سفرنامہ "خوابوں کے
 جزیرے" اور سلمیٰ جیس نے "جلاوطن" لکھ کر قارئین کی توجہ کھینچ لی ہے۔
 خوابوں کے جزیرے میں بھلا، سنیا، فلپائن، ہانگ کانگ وغیرہ کی سیاحت
 کا تذکرہ ہے۔ پر وین حافظ مشرقی ممالک کو گہری تنقیدی نظر سے دیکھتی ہیں۔
 انہوں نے اپنے اخبار میں خاصی آمادہ دہنی کا مظاہرہ کیا ہے اور بعض مقامات
 پر توصیف چٹائی کی طرح ہے بگ اور شہد اور بھی نظر آتی ہیں۔

سفرنامہ میں مزاح کا ایک ناویہ کوئی کچھ محال ہے پیدا کیا ہے۔ ان کی کتاب
 "بہر سلامت روی" بیروت سے لے کر تہران تک کے سفر کا نقشہ کشی ہے۔ ان کی کتاب
 (۱) کے مطابق

تذکرہ فرح بخش — ایک قدیم مجموعہ کلام

یہ مجموعہ جارتوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک حصہ کو مولف نے ایک گلشن سے تعبیر کیا ہے گلشنِ اول میں ان شعرا کے مختصر احوال اور موزعہ کلام درج ہیں، جو نمائندہ کیفیت تک بھرپور بیان کیا گیا ہے۔ گلشنِ دوم میں ان شعرا کے حالات اور موزعہ کلام درج ہیں جو ریاست بھوپال سے منسلک تھے، لیکن زمانہ تالیف سے قبل وفات پا چکے تھے گلشنِ سوم میں ان شعرا کے احوال اور موزعہ کلام درج ہیں جو ریاست بھوپال سے منسلک تھے، لیکن بعض جردہ کی بنا پر یا تو ریاست سے الگ ہو گئے یا الگ کر دیے گئے۔

گلشنِ چہارم میں ان شعرا کے حالات اور موزعہ کلام درج ہیں، جن کا ریاست بھوپال سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا، لیکن بقول مولف ”جین کے دور سے ہندوستان نقشہ گلشن بے غار کا ہے“

گلشنِ چہارم کی ابتدا میں اگرچہ غالب کا صرف ایک شعر تبرکاً درج کیا گیا ہے، لیکن مولانا محمد عباس رفعت کی تحریر کردہ ”تاریخ وفات غالب مکتبہ درج ہے، جو بلاشبہ نااہل ذکر ہے۔

گلشنِ اول میں سب سے پہلے مولف نے شاہجہاں بیگم شہر قریبی والی بھوپال کے چند اشعار درج کیے ہیں:

موزعہ
خاق ہے عداوتِ شام و محسر ہمارا
مشہور روی نے کب نام ہمارا
دنیا میں بڑا سوز ہے شکوہ سخی کا
تیر کی جو شخص میں ہوا نام ہمارا

منشی محمد جمال الدین خان صاحب بہادر دہلوی دارالہمام ریاست بھوپال عالم فاضل فقیر اور شاعر تھے۔ گرام غفلت تھا۔ مولف نے مجموعہ میں ان کی ایک غزل شامل کی ہے۔ موزعہ کلام:

روزِ مکی رخ ہے اور اس شب ہے سایہ لعل کا
صلیب کی چھوٹ ہے گویا زمیں پر چاندنی

تذکرہ فرح بخش مطبوعہ مطبعہ نئی کان پور آج سے ایک صدی قبل مرتب مجموعہ کلام ہے، جو چھپتیس شعرا کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ ان شعرا میں سے بیشتر کا تعلق ریاست بھوپال سے تھا، اس لیے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ تذکرہ فرح بخش دراصل ریاست بھوپال سے منسلک شعرا کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس کے مولف نواب یار محمد خان سزکت ابن فوہار محمد خان رئیس بھوپال ہیں، جو خود ایک خوش فکر شاعر تھے اور جن میں مرزا غالب سے شرفِ ملتز حاصل تھا۔

کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف نے اشعار کے انتخاب میں کئی اصول کی پابندی نہیں کی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں شعری ظاہری یا معنوی محاسن کو معیار نہ بنا کر اپنی پسند کو معیار قرار دیا گیا ہے۔ نیز حاجب افراد و قریبیوں نے اس سے متعلق بعض شعرا کی دو دو تین نہیں فرمیں شامل کی ہیں اور بعض کے فقط دو تین اشعار پر ہی اکتفا کیا ہے۔ وجہ تالیف خود بیان کرتا ہے۔

”پانچ سو مجسم بیان ۱۲۸۰ء بطریق سیر باغ فرح بخش میں میرا گزریا۔
ملاحظہ فرمادہ دار و گشت و مشاہدہ آئینا قرحت انزل سے طبیعت میں است کا
اثر ہوا بسکے دل شاد ہوا ایک ایک شعر تیر یاد ہوا۔

تیر نہیں پیر تم کا بی اللہ سے نام خدا ہوا جو کچھ تو کب چاہیے
اس شعر کو مکرر پڑھا ہوا اور کارستان ہوا ہے افسانہ، دل مائل اشعار عاشقانہ
ہوا۔ قرنِ سمرت میں نے کاغذ و قلمدان طلب کیا۔ بیاض سے لیس شعرا نازک
خیال کو منتخب کیا۔ ایک شب میں یہ تذکرہ تحریر ہوا۔ منظر کاغذ گلشنِ کثیر ہوا۔
فرح بخش اس دسلے کا نام ہے ”نشاط افزا الجعیدہ سمرت“ تاریخ اختتام
۱۲۸۰ء

○ مدرسہ فیض العلوم، کبھی بنگلہ، منلیہ سٹی پور (بہار)

مولانا محمد عباس رفت مقبرہ بھوبالی ایک عالمی تربیت عارفان کی خدمت میں حاضر
 تھے۔ علم و ادب و ورثہ میں بابا تھے۔ ان کے بعد اویس مرزا بابا اجمہ خاں اور مرزا محمد علی
 خاں، شہنشاہ ایران نادر شاہ کے وزیر و وزیر کے نہیں، فوہ انیسویں اور دہائی کے
 بڑے ولی و پیر تھے۔ انہوں نے کئی محکمہ تفسیر کی ہیں۔ مؤلفہ کلام فارسی۔
 برٹن خطہ بیدہ رجم آمد فوہ ذیلے بیک روم آمد

ہے جو بے ذل ہے۔

جاں ارباب حق غالب عالی ہمت
ناظم بحر بیباں تا زولا غلغلت
رنگ نرودی و قافانی و عالی و کمال
ثانی خسرو و سعدی و خیر و شوکت
ابرمردار کمالات و فرات دانش
ماہر علم معانی و بیان حکمت
از جہاں کرد سفر سوئے ریاض رضوان
گفت عباس کو "شایان سریر حنت"
۱۲۸۵ھ

قد رکھتا ہے شمشاد پہ گیسو نہیں رکھتا
سنبل کے ہیں گیسو قد و موجو نہیں رکھتا
گر آنکھ ہے دُکھی کی یہ بنیائی نہیں رکھتا
خفچہ کا دہن ہے یہ پیہ گویائی نہیں رکھتا

مجموعی طور پر مذکورہ فرخ بخش ایک ایسا انتخاب ہے جس سے انیسویں
صدی کے بے شمار ایسے شعراء کے احوال اور ان کے اشعار سے واقفیت ہوتی ہے۔
جو تاریخ کے اوراق میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہجیت : نئی کتابیں

کتاب کے شروع میں راز صاحب کے استاد ستر جو شاہ ربوری، عرش مسلمان،
کوزر مہندرسنگھ بیدی، تخر، اندر جیت کا مدھی اور حمزہ سعیدی صاحب کی
طویل آراء کے علاوہ چترن جینیٹی صاحب کی منظوم رائے بھی شامل ہے۔
زیر مجموعہ کتاب پر رائے لکھنے والوں نے راز صاحب کی سلاست زبان،
سادگی، شیرینی اور جرسنگی کا شکر کھود پر اعتراف کیا ہے اور اس میں کوئی
شک نہیں کہ ان کے ہاں یہ صفات میسر اشعار میں پائی جاتی ہیں اور شعر کے
عص میں اصناف کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار کو روایتی فزنیہ شاعری کا قابل
مطالعہ نمونہ بناتی ہیں۔ کچھ نمونوں سے آپ بھی غلطو موٹھیجے :-

آپ سرا خیال کرتے ہیں
اور میرا خیال ہے کچھ اور

دیکھیے کچھ دیکھیے 'رہ رہ کے مجھ کو دیکھیے
مجھ کو اندازِ تلخ کامزا آجائے ہے

انجمن معارفی، نئی دہلی

لندن کے ایک اردو دان انگریز مژدہ والہ پوٹنگھٹے ہیں۔ اردو زبان
ادب سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ شعری کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل اس
مجموعہ میں شامل ہے۔ نمونہ :-

گر راست ہو قسمت ہو کبھی باعث دولت
مشہور ہے کچ پاؤں میں تیمور کی ہڈی
تائید دم سردی کا ظہر ہوئی جب سے
تق ہو گیا سچ بن گئی کاؤر کی ہڈی

مولوی سید شریف حسن فرخ آبادی جنہیں فارسی اور اردو دونوں
زبان پر عبور حاصل تھا اور دونوں زبان میں برجستہ شعر کہنے پر قادر تھے۔
نمونہ :-

آکے سو بار اُٹھایا یہ اُٹھایا نہ گیا

مولوی احمد حسن عثمانی بزاز کلاں نواب صمدی حسن خاں عالم فاضل
اور شاعر تھے۔ نوجوانی میں پڑودہ میں اشعار لکھا۔ اردو فارسی اور عربی تینوں
زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ گیارہ اشعار پر مشتمل ان کی ایک اردو
غزل شامل مجموعہ ہے۔ نمونہ :-

عشق سے چمکا سارہ رب بے ہر کا
آتشِ خورشید سے یہ رنگ جو ہوئے
سُورِ زوئی اپنی ہے لگورہ شہرِ مندی
دیہ ہر آب سے ہم عشق کو ہر ہوئے

انہیں میں تولفت نے مرزا تبر کے مرثیے کے درد مند دیکھے ہیں اور
اسی پر اپنے مجموعہ کا اختتام کیا ہے۔ ایک بند بے ذل ہے :

روادار ہے حمزہ سید بہ اردو نہیں رکھتا
ابو و مہ نور کھتا ہے یہ رو نہیں رکھتا

شرح چندہ

ہندوستان پبلکٹن دیگر ٹرانک

سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵ ڈالر ۱۲۰ پونڈ
سیسالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۵ ڈالر ۱۲۰ پونڈ
فی کاپی	ایک روپیہ	۱/۵ روپیہ	۳ سینٹ ۱۵ پنی

بہ خط شاعر

نزل

گوں میں یہ غم ناکے اور گام ہے
میری جان پہ چسپ ہی ہوگا رات ہے

نوں فزب کا دستیں لوگ اب ہم
کبھی سے ہی آج نہ تو کی رات ہے
دلسم راہ، کج کرشم بیان
آگہ کج خبر جو بیان میں سایہ رات ہے

فرہنگ کے اشک و غمناک زخم، یاد کیاں
وہ درد ان ہنر نہ قی شاع سر
جوتہ وہ راہ سے گئے آگے نہ رہا ہے

تسہم انوکھ اور بے عیار ہی
گلے لگاؤ اگر کوئی، کلم عیار ہے

تسہم کریم



تسہم کریم (موجودہ)

زندگی

مگر جو دوسرے اک مرزا رگست تھا
 عے قریب سے دیکھا اور دشت غم، محلا
 نما جاڑی، ماحول میں آداسی تھی
 دم یاس کی برسو بجتی سمجھتی تھی
 ہوا ہی ناگنی تھی لڑنے دل کے تاروں کی
 نمانی ہوئی تھی رقص گہرے ساروں کی
 دس چپ کے، جب ڈکھ کی رو میں چلتے تھے
 دن، اوس اندھروں کے پرچوں کو لیے
 و گھر، جو دیکھ میں زار تھا، حکم سمیت
 قیقتا وہ سیہ گوا حسرت دم سمیت
 جانے کون سے وقتوں کی یادگار تھی وہ
 جانے کون کی تہذیب کا مزار تھی وہ

میں تھے اس کے آداسی کی زندہ تصویریں
 جتن ریت کے خوابوں کی اوندھی تعبیریں
 مہر کاٹ چکے تھے وہ اس سہیل میں
 ی سخی خاک ہی، بس خاک اُن کے تن میں
 بن کھڑے تھے جوائی کے، غم جان تھے وہ
 بان کو دیکھتے ہوئے بھی بے زبان تھے وہ
 یہ خوف کا عالم تھا اُن کے چہروں پر
 و شراب کے زہے میں تھے دعوت بجز
 لپٹے ہوئے تھے مگر سترے مہار تھے
 زار سامنے تھے پھر بھی آشکار نہ تھے
 مجھ سے دیکھی گئی ہائے بے بسی اُن کی
 بندلیوں سے بھی بدتر تھی زندگی اُن کی

اکھ اُٹھائی ڈاک ناؤ بھی دکھائی دی
 ی جو اُس پہ بھی تھی پڑھی نہ جاتی تھی
 ناؤ تھوڑا کھنکھاتی اُن تکتیلوں کی
 ی کی چاکری پڑ جاتی اُن امیوں کی
 ی یہ خیمہ سستا اُن کے خنور کا امکان
 ی کی دھول میں تھی اُن کی گہجی کہاں
 یات اُن کی تھی مسکین وہ اُس سے ٹکے تھے
 ربارا عہد منہر شئی سلام کرتے تھے
 اب میں کس کسے سے اک حبیب صدا
 ہ اُنہی کو بجتی سب پر برس چھا جاتا
 بد احترام کی یہ ناؤ زندگی کی ہے

مگر وہ سلام کر یہ ناؤ زندگی کی ہے
 مجھ کو مدام کر یہ ناؤ زندگی کی ہے

لنگے سامنے تھا یہ ظلم پوشش رُبا
 مرا خیال مگر اُس دیار پوشش میں تھا
 اُٹھا رہا تھا جہاں یہ سوال ذہن رسا
 یہ کیا فریب ہے آخر یہ سلسلہ ہے کیا؟
 یہاں کے باسیوں کا بھی کوئی خدا ہے کیا؟
 جب اس خیال نے پست لباس غفلتوں کا
 تو اس حبیب صدا کا بھی رنگ اور ہوا
 بس اک سوال ہی چار سمیت سے اُٹھ
 کہاں سے آیا ہے تازہ ہوا کا یہ چھوٹکا
 ہماری کہنے روایت یہ کس نے وار کیا؟
 نفاٹے دھنسا دوزخ کا روپ دھار لیا
 یہاں سے سجا، نکل! دل مرا بکار اُٹھ

چلا تو یاس ہی گھٹٹی سی اک پڑی باقی
 اسے جو خور سے دیکھا تو ہمتی جلتی تھی
 شنائی دی مجھے پھر ایک دُور کی آواز
 ادھر بھی دیکھ! او درد حیات کی پرداز
 کز غم خوردہ ہوں میں بھی اسی رعایت کا
 دوا ہے جو نے مجھے آج درد کا تحفہ
 مجھے خوشی ہے کہ یہ درد ابھی سلامت ہے
 جو وہ ڈاکو سوال اس سے یہ کیا میں نے
 یہ ناؤ کیا ہے؟ مرے دوست کچھ بتاؤ گی
 جو داستان طلمات ہے! سستاؤ بھی!
 مرے سوال یہ وہ گھٹٹی اس طرح سے کھلی
 جو دیکھا سامنے اک آدمی کی صورت تھی
 اُگھوں تو یہ صدیوں پرانی عبا بھی تھی
 وہ جس نے وقت کے سحر کی ریت بھائی تھی
 برسی اُنھوں سے اب اس نے اس طرح کھولے
 سنو! یہ تازہ ہے کاغذ کی، دُور دریا سے
 یہ جاتی نہیں طوفان کس کو کہتے ہیں
 نہ اس نے موجب حوادث کے خواب دیکھے ہیں
 رہی ہے خفگیوں کی گود ہی میں جو حسرتِ رام
 مگر سنیچے ڈولے اس پر ہے الزام



نذریناری

گیبوں پر تھپی رخسار
رات کا وقت صبح کے آثار

یتیم بہ لب حسیں انکار
جیسے آمادہ وصل انکار

راست کی فکر ہے نہ دن کا خیال
اب خبر ہے خدا سے لیل و نہار

ہائے رے وقت کی اداکاری
چہرے بکاش زندگی بیمار

جب خالی ہے سیکڑے میں دہل
زندگی بھی کہیں ملے ہے ادھار

صفت مشکل میں پڑے وہ نذیر
دنگ لائی ہے نری گفتار

دن ڈھلا جائے، نام اُسے ہی گھر لے لے
ساتھ سورج کے ہمارا دل بھی ڈھلا جائے ہے

زلف شب بیل کھائے ہے کالی کشا لہر اُسے ہے
ایک ناگن دوسری ناگن کو ڈستی جائے ہے

کس کی خاطر اڑ رہی ہیں مکتوں کی شعلیں؟
کس کے استقبال میں بجلی چمکتی جائے ہے

کس کی آواز آتی ہے لہروں کا سینہ چیر کے
کیا دینا ہی کوئی نڈی پار پر ہاگائے ہے

ساتھ مل کر اڑ رہی، ہیں کالی گوری تتلیاں
موسم ٹل کے رہے کا سبق سکھائے ہے

بازری بچی تو اپنا دل بیل جاتا نذیر
مینڈکوں کی ٹر ٹر اہٹ سے گویا گھبرائے ہے

آرزو کی طرح جودل میں پلے
ساتھ وہ بھی ہمارا جھوڑ پلے

جب بھی ہولسے سنا؟ ان کا
زندگی مٹی ہے گلے سے گلے

جٹے ہیں تیرے نقش پا سے چراغ
میرے گھر بھی کبھی چسپاں بنے

نقشب پاؤں صوفی رہے دنیا
اس طرح سے جلو پتہ نہ پلے

ہے بُرائی کوئی تو مجھ میں ہے
ان کی باتیں سہلی ہیں وہ بھی بچلے

وقت کم ہے سفر طویل نذیر
آپ آجائے گا، ہم تو پلے

• پانڈے جلی، وادنی (پوٹھ)



غزلیں



پروین کمار اشک

اُس کے نیڑے پہ اُسے سر میرا
جن دیکھے تنگ تنگ میرا

میں کہاں نکالے تھماگ سکتا ہوں
بیچھا کرتی ہے اک نگر میرا

میری اُنکلی پکڑ کے چلتا ہے
راہ بھولا ہے راہ سبر میرا

تُو نے چہرے ہی سُن رکھے ہیں دُست
تُو نے دیکھا کہاں مہسّر میرا

بل پر ہی بھی نہ ہوگی قسمت میں
پانیوں میں بھی ہوگا کھسّر میرا

مجھ کو دریا ٹکٹا جائے ہے
دُور اک شخص منتظر میرا

سجیب رامش

تُوڑ پشانی کا، کاغذ کی بردا لے جائے گی
جائے کس صحرا میں یہ پاگل ہوا لے جائے گی

پہلے کچا کپنے کا بھرے حوصلے لے جائے گی
زندگی بھر در بدرے دست و پا لے جائے گی

صرف یہ بھی ہوئی آواز پا لے جائے گی
تو اگر بچڑے بھی اب مجھ سے ٹک لے جائے گی

رات اُن ہونٹوں پہ رکھ جائے گی کچھ جلتے ہیں
اور اپنا ایک ایک تارا اُسے لے جائے گی

مصلحت کب سہ لے گی خدمت نامی کا مشور
اس کی بینائی سے پہلے آئینے لے جائے گی

کیا محض تنقید سے کٹ جائیں گے سازش کے جال؟
کیا وفا کا ندھوں پہ رکھا سر پہ لے جائے گی

گھٹا ہے کہ کچھ تو کھود دیا ہے
صحرا میں گلاب بردیا ہے

پھر خون سا کیوں مہک رہا ہوں
ہاتھ اپنا تو میں نے دھو دیا ہے

مکس اس کا، مہک، غلوں سب ماند
لوگوں نے دھواں پر دو دیا ہے

وہ ریت ہے اس پہ کیا اُٹے گا
بادل نے کبے بھگد دیا ہے

کہا پا یا کسی نے بستریوں سے
صحرائے سراپ تو دیا ہے

گڑیاں جو بھر گئیں تو قسیدی
زنجیر کے ڈکھ پہ رو دیا ہے

● کرشنا اسٹریٹ، پتھان کوٹ ۱۳۵۰۰۱ (پنجاب)

● دھڑیہ پراکاش، موٹیا پانک، ابراہیم پورہ، بھوپال

مئی ۱۹۸۳ء

خزینہ

ستیفی سرو و کچی	کتور سلطانہ	قیصر صدیقی سستی پوری
ایک احسان اندھروں پہ نیا چھوڑ گیا کر کے روشن وہ زمانے میں دیا چھوڑ گیا	روح اخلاص پرستار دغا ہوں ، میں تو اسے جس کار جہاں تجھے جدا ہوں ، میں تو	عالم بے چہرگی میں کون کس کا آشنا آج کا ہر لفظ ہے مفہوم سے نا آشنا
میں تو سمجھا تھا اُسے اپنا میسا میکس وہ مرے واسطے اک درد سوا چھوڑ گیا	بڑھتے سورج کی پرستش تو بھی کرتے ہیں بے نواؤں کے لیے حربِ نوا ہوں ، میں تو	کون ہوتا ہے زمانے میں کسی کا آشنا لوگ ہونا چاہتے ہیں خود زمانہ آشنا
ہے مروت نہ زمانے میں نہ لوگوں میں غلوں تو کہاں آج مجھے میرے خدا چھوڑ گیا	پیا سی مٹی کے بے دشت تھیدہ کے لیے موسلا دھار جو برسے وہ گھٹا ہوں ، میں تو	چاٹ جاتی ہے چہنیں سورج کی پیا سی روشنی لاش ہو جانے کسی دن وہ بھی دریا آشنا
اس کے جانے پہ ہیں سرگوشیاں کیوں غفلت میں اجنبی کوئی اگر شہرِ نرا چھوڑ گیا	ماری دنیا نے مجھے سسر پہ اٹھا رکھا ہے جو ہم اتنے بے کربا بنو دغا ہوں ، میں تو	تشنگی آئی سراپوں سے گزر کر آبِ تک ساحلِ دریا مگر اب تک ہے صحرایہ آشنا
بارگشت اس کی ماسٹر کنی سنتے ہی رہے گوئی دشتِ حیدر میں کی صدا چھوڑ گیا	ہے مرا کام نغماؤں کو معطر کرنا رنگِ جوں ، پھولِ جوں ، خوشبو ہوں کجا ہوں میں تو	لاش ہو جائے تری آنکھوں پہ خوابوں کا نوبل لاش ہو جائے تار دل بھی تمت آشنا
شاعری صوفی کی ہے مثالی ستیفی اپنے شعروں میں جو اندازِ دنیا چھوڑ گیا	رات کو رات کہا دن کو کہا دن کشور شہرِ باطل میں آنا امن کی صدا ہوں ، میں تو	کون بھانے گام کو کون لڑھے صحرایہ مزاج کون ہے اپنے برا قیصر سہارا آشنا

● ستیفی لاٹیری، سرو و کچی (نام لپی) ● ۱۳۹۷ء، کراچی، کراچی پبلشرز (پرائیویٹ) ● ● لاہور، گلشن، داتا گنج بخش، مغل پورہ (پرائیویٹ)

اصلی نقلی

”ہوں گے۔ مجھے اس بات سے کیا مطلب؟ ایک بات اچھی طرح سن لو کہ آئندہ ان کا کوئی بھی نہیں جیسا ہے۔ میں نے نہایت سخت لہجے میں کہا تھا۔“

”متی، آپ اتنی تنگ نظر اور پائے خیالات کی کیوں ہیں؟ آپ اللہ وحی کی تم میں کتنا فرق ہے۔ میں نے تو آج تک نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے روی کبھی ڈانٹا ہو۔ اُسے ہر جگہ تک جانے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ روی کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہیں جیسے اس کی دولت ہوں۔ ہم غور کرو۔“

مجھے اس کی باتیں بالکل اچھی نہیں لگیں۔ میں اپنی زندگی پر کی جواب شننے کی نقلی مادی رہتی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ عقیدہ میری بات سے کس کس کرنا اپنا سن سمجھتی تھی۔ وہ اپنے کبریت زدہ معاملہ فہم، عقائد اور فادرن سمجھتی تھی۔ مجھے یہ بات سب سے زیادہ گراں گزرتی کہ وہ میرا مقابلہ روی کے ماں سے کرتے لگتی۔

ایک دن آئی اور مجھے گھر کے کام کاج میں مشغول دیکھ کر کہنے لگی، ”متی، آپ کو تو کام سے جیسے فرصت ہی نہیں ملتی۔ آپ ایسے کیوں رہتی ہیں۔ روی کے ماں دیکھتے ہیں کسی سمارٹ کتنی ہیں۔ ان کا اپنے بال سنوارنے کا ایسا انداز ہے کہ وہ دیگر عورتوں میں سے ماڈل مینسی کتنی ہیں۔ کپڑے بھی ایک سے ایک نکالتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر غلطی سے ہر عورت کی یاد آجاتی ہے۔“

”آؤ! تم کو ان ساری باتوں سے کیا مطلب؟

ہل کر دکھا تھا۔ اس خیال سے ہی بڑا دل بیٹھنے لگا تھا۔ میں روی نے ایسی بہت افزائی کی کہ میرے جم میں بھی دور لگتی۔ ہر لمحہ ایسا لگتا تھا میں اب نیچے آگئی۔ لیکن روی کی وہ راہ نے جیسے مادہ کا اثر کر دیا میں نے جب سے ہل کر دکھا یا تو ایسی کامیابیوں کو اس کا گھونٹا اب بھی کاغذ میں سنائی دے رہی ہے۔ اب شاید مجھے بھی ناسخ میں موش لہجائے۔ روی کو دیکھ کر دھتکے ہی مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے چلی گئی تھی۔“

میرا قصہ ابھی نام تھا۔ ”یہ سب ٹھیک ہے۔ میں دوا میں نے، لیکن تمہاری سستی تو جو نیچے ختم ہو چکی تھی آہستہ آہستہ گھٹنے نام لیا کر رہی تھیں؟“

روہانی پھر ٹھیکہ لے کر آیا۔ ”تمہا ج کیا کر رہی کیا؟“

روی کے اہل نے ہم لوگوں کو موبیٹھا بٹھا دیا۔ اور اپنی ریش نامی ابھی ایک نیا پتلی کھڑے، احاطہ خیز۔ وہی ہوئی میں ہم لوگوں کو مٹائی کھلانے کے لیے لے گئے۔ وہاں کی ایک مٹائی آئی تھی جو پتہ کہ آوی کھانے کھانے ٹھک جائے۔“

میری طاقات روی کے اہل سے نہیں ملتی لیکن جس قدر ان کے بارے میں دھڑا دھڑے سن ہائی تھی اس سے اس کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتی تھی۔

اور عقیدہ اس شخص کی ممانعت کو جیسے ہی دیکھی تھی۔

”بہت اچھے آدمی ہیں اہل؟“

چار نکالنے اور عقیدہ اسکل سے نہیں آئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے سوچا شاید کسی بچی کے پاس لڑکائی ہو۔ میں نے گھر کے کام میں مشغول ہو گئی۔ رستم کے سامنے گھر سے گئے اور پھر بھی وہ نہیں آئی تو میں پریشان ہو گئی۔ میں نے فوراً سینٹ ٹامیگل کول کی پرنسپل کو فون کیا۔

”اُنہوں نے جواب دیا: ”پڑھائی کے بعد سامنے دیکھ گئیں کی سستی کر رہے تھے، لیکن سستی بھی چھینے ختم ہو چکی ہے۔ آپ کی لڑکی یہاں سے گھر کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔“

مجھے یاد آیا ان دنوں عقیدہ ہر وقت روی اور اس کی ماں کے بارے میں بات کرتی رہتی ہے۔ شاید وہ اس کے گھر چلی گئی ہو۔ میرا قصہ نقطہ شروع پر تھا۔ جیسے جیسے دیر ہو رہی تھی، مجھے اس لڑکی کی اس حرکت سے جڑی ہو رہی تھی۔ میں عقیدہ کے ڈیڑی کے پاس فون کرنے جا رہی تھی کہ وہ آجسمین گھر لے کر سے داخل ہوئی۔

”آؤ! تم تک تم کہاں رہ گئی تھیں؟“

”پتہ نہیں تھا کہ کتنا گھر جا رہے؟“

وہ میری باتوں کا ذرہ برابر خیال کے بغیر چپکے لگی، ”متی، آؤ تو میں نے کہاں کر دیا۔ آج مجھے رستہ

• عزت ڈاکٹر ایم۔ کیرمناں، صوفی گج، گلیا، ۲۲۰۱۱، جبیل

بلادہ امداد بنے رہنے اور گھارے کا حاصل؟
میں نے اس کی بات کو غور انداز کر کے اس کو سن کر
”واہ! کیوں نہیں؟ وہ کہتی ہیں ایسے رہنے
سے وہ جوان نظر آتی ہیں۔ کبھی بھی تو رومی اور اس
کی ماں کو دیکھ کر ایسا کہتے جیسے دو بہنیں ہیں۔
رومی جب جا رہی ہے اپنی ماں کے ایک آپ کا سامان
استعمال کرتی ہے۔“ شکیلہ نے زور دے کر کہا۔

شکیلہ کے کہنے کا مقصد شاید یہ تھا کہ میں اسے
بھی کہیں نہیں اجازت دیتی ہوں۔

میں چاہتی تھی کہ شکیلہ کے ساتھ ایک اچھی پہلی
کڑی طرح پیش آؤں۔ لیکن میرا انداز ایسا
COMPLEX فرسٹ تھا جو مجھے ایسا کرنے سے روکتا
تھا۔ شکیلہ، جسے محض بارہ سال کی عمر تھی اور جس پر
سال کی عمر ضرورت تھی، مجھے ہر بات کا خیال رکھنا چاہیے۔
یہ میری ذمہ داری تھی کہ میں اسے اچھے برے کی نشیتر
سکھاؤں۔ بڑے کام سے روکوں اور اچھے کی جانب
راغب کروں۔

”میں سمجھتی ہوں مجھے جوان بنے رہے کا کوئی
حق نہیں اور نہ ہی انھیں اس قدر میک اپ کی ضرورت
ہے۔ جب اس کے دے دیتے آئے گا کہ ہماری ماں کسی
سے مجھے بھیج رہی تھی۔ وقت سے پہلے سر دھوئے
کیا میرا ضرورت ہے؟“

میں نے دیکھا کہ شکیلہ کے چہرے پر ناگواری
کے تاثر ہیں۔ اس نے نہایت ممکن چہرہ بناتے ہوئے
کہا۔ ”رومی کی جی اور انھیں اس کو دھیر سا رے تھکے
دیتے ہیں اور آپ کو گھر کے کام کا سب سے قسمت ہی نہیں
اور با — انہیں دفتر اور دو سونے سے کب
قسمت تھی کہ وہ میری فکر کریں؟“

”شکیلہ! تم ایسی باتیں کیسے سوچتی ہو؟
ہمارے باپ کو ایسے تم لوگوں کے بارے میں ہی
سوچتے رہنا پڑتا ہے۔ دوسرے سمجھتے ہیں اور
دوسری ذمہ داریاں بھی ہیں۔ وقت آنے پر ہمیں خود
اس اس کو کا کہنا ہے۔ پاپا ہمیں کتنا پیار کرتے ہیں؟
ایسے بھی ماں باپ اپنی سب سے بڑی اولاد کو کچھ زیادہ

بھی یاد کرتے ہیں؟

شکیلہ ڈوڑکے بھرے ہنسنے لگی۔ ”میں نے
یہ کب کہا تھا کہ آپ لوگ مجھے پیار نہیں کرتے ہیں یا
دوسری ذمہ داریاں نہیں ہیں لیکن۔۔۔“

شکیلہ اگر ذمہ داریاں رومی اور اس کی ماں کی تعریف
کرتی تھی، شکیلہ کے مطابق رومی کی ماں بہت اچھی سوشل
ورک تھیں۔ رومی کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا، پھر بھی وہ
اچھے سے اچھا کھاتی اور سستی تھی اور ایک نہایت شاندار
مکان میں رہتی تھی۔ رومی کے اکل شہر کے ایک شہر اور
مترقی بڑے میں تھے۔ ان کی شخصیت، ان کا طرز رہائش
کا ہمارے شکیلہ کے سر پر سوار تھا اور ان کے مقابلے میں
گھر میں رہنے والی عورت تھی، جس کے پاس نہ پھر شکیلہ
کچلے تھے نہ زہرات۔ میرا دائرہ عمل گھر تھا یا بچوں کی
نگہداشت یا شہر کی خوشنودی۔

اپنی اتنا طبیعت کے خلاف میرے اندر
رشتہ کی ہنگامی بھڑک رہی تھی۔ اب مجھے ہنسنا بھی
کوسہ طرح شکیلہ کے ذہن میں بیٹھے اس کی تیزی کو خیال
باز کر دلا۔ درد اس کا اگر معزز سال بھی ہو سکتا ہے۔
شکیلہ آج پھر دیر سے آئی تھی۔ میں نے اسے
جان بوجھ کر کوئی خباثت نہیں کی کیوں کہ میں جانتی تھی
کہ اس کا کوئی خطرہ تو نہ ہوگا۔ بڑا بڑا بڑا بڑا بڑا بڑا
اندر صدمہ کی کیفیت ہی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اسے کھانے
کو کہا تو اس نے کہا کہ وہ رومی کے یہاں کھا چکی ہے۔
مجھے تو ایک بات سوچ رہی تھی۔

”تم عجیب بڑا عطا رکھتی ہو کہ ان کے یہاں
خود روز کھا رہی ہو، لیکن رومی کو اپنے گھر کھانے کی کبھی
ذمہ داری نہیں دیتی ہو؟“

شکیلہ نے یوں قہقہہ کا اظہار کیا جیسے میں نے
کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ میں؟ یہاں؟ یہاں وہ
آئے گی؟ رومی کا یہاں جی گئے؟ پہلے اس کے گھر
کو دیکھ لیے۔ رومی کا مکان بالکل نیا ہے۔ بہر وقت
جگ ملک کر کافرٹش۔ بہترین لان۔ کم وہاں بالکل
آنا دہوئے ہیں۔ یہاں بے جگم سا ماحول، صادق اور
گڑیا کی موجودگی میں کیا ہو سکتا ہے؟ آپ ہی کیسے

افراد کا دن بے کار چلا جائے گا؟

”بہت اچھی بات ہے! اب تم سوچو۔ میں پھر
اس بات پر غور کروں گی۔“

میں نے دوسرے دن رومی کی ماں کو فونی فون
کیا۔ میں شکیلہ کی ماں ہوں۔ شکیلہ آپ کی اور رومی
کی بڑی عمارت ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آئے طے
افراد کے دن اور رات میں آپ لوگ میرے یہاں قیام
پزیر ہوں۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں آپ
لوگوں کے شاندار شان استقبال نہیں کر سکتی، لیکن
آپ لوگوں کے اہم کی پوری کوشش کروں گی۔ امید
ہے آپ دعوت قبول فرما کر مجھے عزت بخشیں گی۔

رومی کی ماں نے فوراً جواب دیا۔ بہت بہت
شکریہ! یہ آپ کی فزہ فزہ ہے کہ آپ نے مجھے
اس حال سمجھا۔ مجھے اور رومی کو کبھی آپ سے ملنے کا چڑا
اشتیا تھا۔ آپ کی بڑی بیانی اور مہذب ہے۔
وہ رومی سے ایسی محفل کی ہے کہ کبھی نہیں جلیں ہیں۔
مجھے میں ارادہ کیا کرتی تھی کہ آدھ آپ بڑی مار گئیں۔
میں سات بجے آپ کی آپ کے دوست خانے پر حاضر
ہو جاؤں گی۔ صاف کرنی کی کہ میں خود اپری میں
ہوں۔ مجھے ابھی ایک شینگ میں جانا ہے۔
شکریہ!۔

ان کا جواب پا کر میں بہت مطمئن تھی کہ کم از کم
مجھے ایک موقع میسر آئے گا جب میں اپنے حلقوں و
محبت کا کوئی مظاہرہ کر سکوں گی۔ عورتیں آتی ہیں تو
ایک ایک چیز پر غور کرتی ہیں، اس سے میں نے سب سے
پہلے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ بستر کی چادر، کچے
غلات اور صوفے کو لے کر ڈالا۔ اسی وقت شکیلہ
آگئی۔ اس نے چوبیس چوبیس گھر سے دیکھا وہ مطمئن
تھی۔ لیکن اس نے ذہنی زبان سے کہا۔ ”تم؟ یہ میڈیٹ
یہ تو اب نہایت بے رنگ ہو چکی ہے۔“

میں نے اس کی بات مان لی۔ اسے اچھا دیا اور
کہا۔ ”میں اس کی جگہ ایک نیا میڈیٹیشن مگر گھول
گئی۔“

اس کے چہرے پر سکون کا بخیر بخیر... خوب اچھے قسم کا ڈیزائن پسند کیا گیا۔ میں جوتی تو... لیکن مجھے تو آغا مجھرتی میں شامل ہونا ہے۔۔۔۔۔ اور حتیٰ! ذرا سادہ، صادق اور گڑبگڑی کو سمجھا دیں گی کہ وہ ملا وجہ شوق مزید نہ چاہیں۔
"بالکل مطمئن رہو۔ کوئی تم لوگوں کو پریشان نہیں کرے گا۔"

اگر کیسی کچھ خوشک سات نئے ایک خوبصورت سی سوز گارڈی سہاگ پر آگئی۔ میں نے غصہ کیا کہ اگر اور وہ بھی ان کے استقبال کو دوڑ پڑی۔ رومی ہار سے اُڑی، لیکن رومی کی ماں اور انگل نے ایک ضروری کام کا اجر میں کیا اور فرار پلٹے۔ سہاگ پر پورے گڑی باکر سادہ، صادق اور گڑبگڑی وہاں آ موجود ہوئے۔ وہ رومی کو اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے چڑیاخانے میں کوئی نئے عالم کو لایا گیا ہو وہ آپس میں کچھ باتیں بھی کر رہے تھے اور میں نے سمجھا تھا کہ میں نے آپس انھوں سے لاکھ اشارے کیے لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

تم نے رومی کو ڈراگ روڈ میں بلایا اور اپنے بچوں کو مل کر ان کے پاس بے پروا کیا۔ انہوں نے انہیں چڑیاخانہ دھکے لگا دے اور وہاں شو پر کیا کہ ایک جگہ بیٹھے رہیں گے۔ وہ فرار رومی کو بھول گئے۔ میں نے رومی کو مانٹھے کے لیے بلایا۔ وہ جیت سے میرا مونہہ دیکھنے لگی۔ مانٹھے کی تیز پڑاؤ آتے وہ چپ نہ رہ سکی۔ اتنے سویرے اور اتنی ساری چیزیں؟ چند لمحے کے لئے بعد اس نے غصہ کی جانب دھک کر کہا۔ "پڑائی مزے دار ہے۔ اتنی خوشحال کرتی ہیں! میری مٹی کو گھر پر ہانستہ بندنے کی کبھی فرصت بھی نہیں۔ وہاں تو میں پوٹل کا کام کر رہا ہوں۔"

غصہ نے فراموشی کی جین کی تہا رہی حتیٰ کہ اتنی فرصت کہاں ہے۔ انہیں اور بھی بڑے بڑے کام کرنے رہتے ہیں نا؟ اور میری مٹی کو کہا ہے، دن رات ہی کو ناہے۔ آج اتنی ہی بدولت تم اتنے آرت اسکولوں میں پڑھی ہو۔ اتنی اچھا نہاد بھی

ہو۔ اور ہر کھیل میں اول آتی ہو۔ مٹی، آپ خود دیکھیں گی کہ یہ کتنا اچھا رقص کرتی ہے۔"

رومی اپنی تعریف میں کسر شرمائی تھی، لیکن میرا چہرہ ہفتے سے لال ہوا تھا کہ میری بیٹی مجھے دھمیل کرنے پر تیار ہوئی ہے۔ میں خاموش رہی۔

رومی نے بدلے سے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ سب کچھ مٹی کی بدولت ہے، لیکن ان کے پاس تو کبھی وقت بھی نہیں کہ مٹی کبھی مجھے مقابلے میں لے جائیں یا وہاں بیٹھیں۔"

میں نے فوراً کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں اس دن تمہیں خود سے بلوں گی۔ میں تمہارا رقص منظر دور دیکھوں گی، اور بہت افراتی کروں گی۔"

اس کا چہرہ خوشی سے دھنک گیا۔ میں نے اس کی خوب خاطر فرائض کی اور دوسرے دن صبح آٹھ رخصت کرتے وقت ساتھ مٹی کئی تم کے بچان لے دیے۔ رومی نے انہیں ایک نظر دیکھا اور سکرانے لگی۔

مقابلے کی شام میں رومی کے گھر گئی۔ کال بیل بجایا تھا کہ رومی کی ماں آئیں۔ وہ کبھی بھی کھاتی نہیں جیسے جو مٹی کی دھن میں ہوں۔ مگر کبھی نہایت عالی شان تھا۔ دروازوں پر پینٹ قیمت پر دے ٹنگ لے رہے تھے۔ لیکن کبھی رونق یافتہ نام نہ تھا۔

دولت کی فراوانی ڈرتے ڈرتے سے بچ رہی تھی۔ لیکن بڑے سنگی پر طرف مونہہ مورے کبہ رہی تھی۔ یہاں کسی چیز کی کمی ہے۔ رومی کی ماں نے میں اندر بلایا اور رومی کی گارڈی۔

"میں رومی کے انکل کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ میں آئے ہی والے ہیں۔ اتنی جلدی میں ہوں کہ آپ کی کوئی خاطر بھی نہیں کر سکتی۔"

رومی نے اوپر سے آواز دی کہ وہ آرہی ہے۔ رومی کی ماں ایک بار بھیہر سنگار دان کے قریب بیٹھ گئیں۔ کبھی وہ ہم سے بات کرتیں اور کبھی اپنا میکاپ درست کرتیں۔

"میں سچ آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ لوگوں نے رومی کی ایسی خاطر کی ہے کہ دن رات

آپ کی ہی تعریف کرتی رہتی ہے۔ وہ اتوار کا دن میں نہیں بھول سکتی کہ آپ نے ہم پر کیا احسان کیا اور آج۔۔۔۔۔ اب آپ کا یہ عجیب کٹم اس وقت ایک بچہ کھانے مانے میں۔ شوہر سے الگ ہو کر رہنا تھا۔ آسان کام نہیں تھا۔ میں ملا کا فکیر ہے کہ رومی کے انکل کی نگاہ گرم ہے۔"

وہ منکر ہر مہنتی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ذرا سی ملاقات میں میرا نکلے کی چھلکے کی طرح اُڑھنے لگی تھیں۔ میں کھجور کی روٹی کرائے آؤں اسکول میں کیوں داخل کار کا رہا ہے۔ غصیل سنی خیر نظروں سے سیر سی جانب دیکھ رہی تھی۔

رومی رقص کے مقابلے میں اول آئی۔ دوسرے دن رومی کی ماں نے ہماری دعوت۔ رومی کے انکل پیش پیش تھے۔ ہمیں رخصت کرتے وقت رومی کی ماں نے سرگرمی میں مجھے کہا۔ میں آپ کے احسان سے دب گئی ہوں۔ کبھی کبھی رومی کو اپنے گھر روک لیا کیجیے۔ آپ سے کیا راز رکھوں؟

ان کے جانے کے بعد شکید نے فوراً کہا: "عجب بھونگے کے! اس حراس بہانہ باندی کی کیا ضرورت ہے؟ رومی کو جن دن ساری باتیں ملوم ہو جائیں گی وہ کتنی ڈکھی ہوگی؟"

شکید نے اب محسوس کر لیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہماری شان و شوکت اور نگینوں سے کتنی ہی خالی کیوں نہ ہو، اس میں محسوس دکھاوے کو ہمیں دخل نہیں ہے۔ جو کچھ وہ اصل ہے۔ کوئی ٹھاتا نہیں۔ کسی پردہ پوشی کی ضرورت نہیں۔ اسی دن سے غصیل نے پھر کبھی میرا مقابلہ رومی کی ماں سے نہیں کیا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اسی اور نقلی چہرے کا فرق دیکھ لیا ہے۔





فوجی ایسٹیاں کھیلوں کی بیزانی میں بھارت کو جوشا نذر کا میاں پہنچا ہے، اس نے اس سے
مستحق تارک یک پہلو دیکھنے والوں کے سامہ بندھے باطل کر دیتے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے؟
”دوا صبح مقصد اندر سسپن کے احساس کے ساتھ سخت محنت ڈ
یہ دیادگار اور فرخیں کا دھڑو ہے جو ذریعہ اعظم اندر لگاتار چلنے لے گیا
20 نکاتی پروگرام شروع کرنے وقت قوم کو دیا تھا۔
اس احساس کے ساتھ جن میں کرکام کرنے پورے ریکارڈ مدت میں عالمی شان
اسٹیڈیم تعمیر کئے اور باکمال صلاحیت کے ساتھ کھیلوں کا انتظام کیا۔
جو کچھ ہم نے ایسٹیا ڈکے لئے کر دیا
وہی کچھ باقی سالہ منصوبے اور 20 نکاتی پروگرام
کے لئے بھی کر سکتے ہیں۔



آئیے ہم سب مل جل کر اپنے
وطن کو مضبوط بنائیں

بچوں کا ادب - ترقی اردو بیورو کی کچھ اہم مطبوعات

کتاب کا نام	مفت / مترجم	صفحات	قیمت
۱۔ چار دیویش کا قصہ	نورالحسن نقوی	۹۲	۳/۲۵
۲۔ چند درویش	ہمیم لٹا / کسٹور سلطان	۲۵	۳/-
۳۔ حاتم طائی کا قصہ	مرتب نورالحسن نقوی	۱۲۰	۶/۵۰
۴۔ رابنسن کروزو	ڈیوئیل ڈیفور / م - ندیم	۸۰	۳/۴۰
۵۔ راجہ رام موہن رائے	سید مدلل کھوش / انعام الحق	۱۱۳	۳/۵۰
۶۔ سچا ناٹھ جیٹل باگھی	سشنگر / ایس ایم شاہ نواز	۳۹	۲/-
۷۔ سرستیا دریا خان (دوسرا ایڈیشن)	میر تجاوت علی / سید ابو سعید	۲۴	۱/-
۸۔ شریف زادہ	نفا ہادی رسوا / مرتب حفیظ عباس	۶۴	۲/۲۵
۹۔ عقلمند مجید اور دوسرے ڈرامے	مرتب م - ندیم	۴۸	۲/۲۰
۱۰۔ ڈپال کی کہانی	راجہ زائق راز	۶۷	۶/-
۱۱۔ گاندھی جی کے مختلف روپ	افونہ وہاہ صاحب / شکیل اختر فاروقی	۲۱۱	۳/-
۱۲۔ مشین ٹھوڑا	اطہر پرویز	۱۳۳	۵/-
۱۳۔ مولانا رام کی کہانیاں	مرتب محمد حفیظ الدین	۳۰	۲/-
۱۴۔ مہارگی	ترجمہ حفیظ الکبیر پرواز	۲۴	۳/۷۵
۱۵۔ نصور کا خواب	مرتب حفیظ عباس	۱۲۴	۳/۵۰
۱۶۔ ناگ متی	ساداتری / سلی ایگری	۲۵	۲/-
۱۷۔ نورتن کہانیاں	انتخاب اور باز گوئی / سلیم احمد	۱۹۲	۶/۵۰
۱۸۔ چری اور دوسرے ساتھی	سشنگر / پریم ناتھ	۶۱	۶/-
۱۹۔ گیمبا کی کہانی	سید شہاب الدین دسنوی	۱۲۸	۷/۵۰
۲۰۔ خط کی کہانی	غلام حیدر	۱۰۸	۳/۷۵
۲۱۔ حکمتان کی کہانیاں	مرتب امیر حسن نورانی	۷۹	۴/-
۲۲۔ بچوں کی مسکن	سستہ فرحت	۶۴	۳/- ۷۵
۲۳۔ علی پتہ کا سفر	جونا تھن سوفٹ / م - ندیم	۴۸	۲/۱۰
۲۴۔ دسویں درس کی کہانیاں	اطہر پرویز	۳۵	۲/-
۲۵۔ نسا عجائب	رجب علی بیگ سرور	۸۳	۲/۲۵

نوٹ: ہمارا سب سے بڑا رسالہ "اردو دنیا" اور سب سے کتب مفت طلب فرمائیں۔

کتابوں اور دیگر معلومات کے لیے لکھیں:-

شعبہ فروخت و نمائش، ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم و ثقافت، حکومت ہند

دیسٹ بلاک ■ آر کے پورم، نئی دہلی 110022

بادِ ڈرائنگ روم



ہم اپنے ڈرائنگ روم کا رخ ہر شام دم ملا کر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ گھر میں قدم بٹھکے ہیں، بچے ہیں اور بچوں کی نئی نئی فرمائشیں ہمارا استقبال کرتی ہیں۔ آج میں بھی ہوا۔ گھر پہنچتے ہی بچے قدموں سے لپٹ گئے۔ چہلے دل نواز مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ ہمارا دل ڈوبنے لگا۔ اس غیر متوقع موافق ہوئی ہر دہائی میں ہم کی فرمائش کی تو محسوس کر رہے تھے کہ بچوں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

لانڈری والے رامو چاچا کی دکان میں بیٹھا آگیا ہے۔ آخر ہم کب تک مفت کی ہوا لیتے رہیں گے۔ اب پڑا نامی بھی ایک کچھ ضرور ملے گا۔ ایسے میں بچہ کی خاموشی بچوں کے اصرار کو اور بھی ہوا دے رہی تھی۔

لانڈری چاچا دھو رہی ہیں (ہم نے بچوں کو تاکید کر دی ہے کہ انہیں چاچا کچا ہلانے، سمائی جانے والی اب سمھاروں کمپنیشن کانفرنسوں اور کتابوں سے نہ بولیں) میں راج کر رہے۔ لانڈری چاچا کی طرف ہمارے بچوں کے دوسرے رشتہ دار لاشیماں، تیل والے خالو اور خاں دے پچھو کا ہیں گیس، تیل، خشکا دہائی کی معمولی پانی کے لیے ان رشتوں کا ٹوٹا نامی فریڈی ہے۔ آج کل شہری زندگی قسطوں اور ان معری رشتوں کے سہارے ہوا ہے۔

بچے کی فرمائش پر ہماری سانس اٹھرتے

کا آدمی، ڈرائنگ روم یا سٹ، ثقافت اور سماج کی اصطلاحیں نہیں ہوں گی۔ اب ڈرائنگ روم کی ہوا ہمارے معاشرے کی ایک اور اصطلاح بن گئی ہے۔

اگلے وقتوں کے فک و سیر، عقید اور سچا اچھے بڑا ہوا کرتے تھے۔ وہ دل کھیل کو بھی بڑے سمجھ کر سانس لیتے اور خوب دور سے ہنستے تھے۔ ہر صحت ملی سمجھنے کے وقت دور سے سانس لیتے اور فوٹو کھینچتے وقت ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ عام حالت میں آہستہ آہستہ سانس لیتے ہیں کہ کہیں اس پر بھی ٹکس نہ لگ جائے۔

اب لوگ دروازہ بند کر کے ڈرائنگ روم میں پکے کھول دیتے ہیں۔ پکے اور صاف پکے بائرنیپ ہوا اور بائیں اگلتے ہیں۔ گفتگو کا موضوع عموماً وہ شخص ہوتا ہے جو اس وقت ڈرائنگ روم میں نہیں ہوتا۔ اس کی خوبیاں کو ہمارے تحلیل کر کے اس کی خاموشی اور برائیوں کو بیان کرتے ہیں۔

ماضی کی خاموشی اور ماضی خیر مسکراہٹ یزبان و ہوا بان کر برائیاں کھولنے کے لیے اور ہوا دیتی ہے۔ جیسے ہی ماضی میں کوئی اچھا کھاتا ہے تو صاحب خانہ اپنی تنقید کا لاشیماں دے گا تو دے، شخص کو تین دن ہیں۔ اس لیے بھی محض دوسروں کے ڈرائنگ روم کا رخ نہیں کرتے۔

مکمل آزادی کی طرح اب صاف ہوا بھی ہماری زندگی سے غائب ہو چکی ہے، لیکن صاف ہوا نہ جانے کس جنگ میں چھپ گئی ہے۔ مگر اب جنگیں ہیں کہاں؟ جنگ تو اب چو یا گھر، فلم اسٹوڈیو یا سیر اس جگہ کے سرخ فیتہ والی خانوں میں سمٹ گئے ہیں۔

کا رہنے، صنعتی ادارے اور سائنسی تجربہ گاہیں فضا کو آلودہ کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جا رہے ہیں۔ وادی پل چو یا حسین تاج محل بھی اس کثافت کی لپیٹ میں آ رہے ہیں۔ جہاں سانس کی لیے پناہ دیتے ہیں یا دیکھ کر ہنسنے سے ڈان ایں کا ایک ادا نے باڈ ڈرائنگ روم بھی فراہم کی ہے۔ ان دو ہواؤں میں فرق یہ ہے کہ اولیٰ لکڑیاں بالکل مفت، ہر جگہ دستیاب ہے اور اس کے لیے صرف ایک حد تک کی ضرورت ہے جب کہ آخری لکڑی کے لیے ایک کٹاؤدہ کمرہ اور برقی پنکھ کی ضرورت ہے۔ برقی پنکھ کی بدولت اب شہر ناواہم اور کراچی بیانی کے لیے مکانات سے اپر نیچے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیروں کی برحقا لاشیماں ہر جگہ فضا کے باعث اہلیان شہر اپنے ڈرائنگ روم تک محدود ہو گئے ہیں۔ آپ نے ڈرائنگ روم کی تنقید، ڈرائنگ روم

میکر گورنمنٹ کا بجٹ لال ہوا سکول میں لکھی ہوئی ہے۔

گئی۔ ہماری زندگیوں کی حالت کو سمجھانے ہوئے، بے گناہ نے
 فقر دیا۔ شہر میں لائبریری پر پہنچ کر بٹھا، انیسویں صدی کی
 رہی۔ جو سترے کے نام انیسویں میں نال ہو جائیے۔
 اترنے جا رہا تو پہلے لوہی ہمارا پڑھنے لگا۔
 اقاط، انیسویں، لائبریری سے غافل تھے، فرسٹ کلاس
 اور راجست جاں بھی۔ ہر کتب خانہ میں جیسے تیسے کتب کے چھک
 انیسویں میں شریک ہوئے۔ براہ مرقعہ تاریخ و وقت پر
 دکان پہنچے۔ شوکیں میں سے کچھ لیں، گو حشرت سے
 دیکھتے، بغیر ملکا اور ہم ناماد ہو کر انگریزی اخبار لے کر
 گھر آجائے۔ غیر متعلقہ طور پر انگریزی اخبار ہمارے
 ہاتھ میں دیکھ کر بچے کچھ حائل کو اس بار بھی چٹک
 ہمارے ہاتھ سے بچ لے نکلا۔ گھر کے ہر فرد کو اخبار کا
 ایک ایک صفحہ تقسیم کیا جاتا اور اس سے چٹکے کا کیا نام
 جاتا۔ ہندوستان جیسے غریب و محروم ملک میں انگریزی
 اخبارات کی کثیر اشاعت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔



شاہ کی کجبری

تھی۔ اگر کسی کے پاس کوئی دہلی تھی تو وہ صرف دقت تھا اور وقت چپ تھا۔ کسی برسوں سے چپ تھا شاہ نکلتے جتنے روپے تلیم پر بہانا اس سے کئی گنا زیادہ بہ نہیں کہاں کہاں سے پر لگا کر اس کے گھر آجاتے۔ پہلے شہر کے ایک چوٹے سے بازار میں اس کی ایک چھوٹی سی دکان تھی، لیکن اب سب بڑے بازار میں لوہے کے جھنگے والی سب سے بڑی ای کی تھی۔ گھر کی جگہ اب گرامر اسکول ہی اس کا گھر اور بڑے بڑے کھانے پیئے گھر لے اس کے کرایہ دہ تھے۔ شاہی ترخانے والے اپنے گھر کو ایک دان کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑتی تھی۔

کئی سال پہلے شاہی نے ایک دن جوروں، صبر سے شریک کو نالائکے ہونے شاہ سے کہا "اسے چاہے ہوئی میں رکھو۔ چاہے اس کے لیے تازہ جواؤ۔ باہر کی بلا ہر ہی رکھو۔ میرے گھر نہ لانا۔ وہ مجھے اپنا مومنہ دے رکھا ہے"

اندھ میں شاہی نے ان کی ایک اسکر مومنہ نہ دیکھا تھا۔ جب اس نے یہ بات بھی تھی اس کا پرانا اسکول میں پڑھتا تھا۔ اب وہ بلا لائن ہو چکا تھا، لیکن شاہی نے اس کے دیکھا تو میں آئے دیے اس نے وہی گھر میں کسی کو اس کا نام دیا۔

دیجے اس کے بیٹوں نے دکان دکان

لوگوں کو بھی پتہ تھا۔ صوبہ ہی نہیں تھا۔ ان کے لیے بات پرانی بھی ہو چکی تھی۔ شاہ کا بڑا لڑکا جو اب جا رہے لائق تھا، جب گود کا تھا تو سیٹھانی نے زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دی تھی، لیکن شاہ نے اس کے گلے میں موتوں کا بار ڈال کر اس سے کہا تھا: "شاہی نے اوہ تیرے گھر کی برکت ہے۔ میری آنکھ جو ہری کی آنکھ ہے۔ تجھے سن رکھ ہے تاکہ نیم وہ میرا ہے جو لاکھوں کو خاک کر دے اور خاک کو لاکھ بنا دے! جسے آٹھ چھ ماہ اس کے لاکھوں خاک ہو جائیں اور جسے سیدھا، اس کی خاک کے بھی لاکھ بن جائیں۔ وہ بھی میں تلیم ہے۔ ہماری دھانسی سے مل گئی ہے۔ جس دن سے ساتھ بنا ہے، مٹی میں ہاتھ ڈالنا ہوں تو مرنے جاتی ہے سونا۔"

"گھر بھی ایک دن دی اڑا دے گی۔ لاکھوں کو خاک کر دے گی۔" شاہی نے شاہ کی دہلی کے گھر میں اپنے دل کے پیچھے جیسے اپنی دہلی میں جھکا کے رکھ دیے۔

"دیکھ، مجھے تو..... جگہ دے..... کر ان کچھوں کا کیلک کلاں اگر کسی اور نے سزا بنا دکھا دیے اندھ نکل گئی تھو سے تو لاکھوں خاک ہو جائیں گے۔ شاہ نے پھر دہلی میں بیٹھ لی۔

اب شاہی کے پاس اور کوئی دہلی باقی نہ رہی

اسے اب علم کوئی نہ کہتا تھا۔ سب شاہ کی کجبری سمجھتے تھے۔

تلیم پر جانی لاہور، ہیرا منڈی کے ایک چوباسے میں پڑھی تھی، وہیں ایک ریاست کے سردار کے ہاتھوں پڑے پانچ ہزار میں اس کی شہر آتری امد اس کے شاہ کی آگ نے سارا شہر جیسے ٹھیکس کے رکھ دیا تھا اور پھر ایک دن وہ ہیرا منڈی کا سستا سا چارہ چھوڑ کر شہر کے سب سے بڑے ہوٹل نشی "میں آگئی تھی۔

شہر اب بھی وہی تھا۔ لیکن جیسے راتوں رات سب اس کا نام بھول گئے ہوں۔ سب کے مرنے میں اب یہی سنائی دیتا تھا۔ شاہ کی کجبری۔ غضب کا گواہ تھی وہ۔ کوئی گانے والی اس کی طرح مرزا کی "سدا" نہ لگا سکتی تھی۔ جی لوگ اس کا نام بھولے ہی بھول گئے تھے، لیکن اس کی آواز کو نہ بھولنے کے تھے۔ شہر میں جس کے گھر بھی گراموفون تھا اوہ اس کے دیکھا تو دمزدنریا اور جب بھی کسی کے گھر میں فرما کر پور دیکھا تو ڈھیلے جاتے تو ہر کوئی یہی کہتا: "سبھی، شاہ کی کجبری کا دیکھا لگاؤ"

کوئی دھمکی بھی بات دھمکی۔ شاہ کے گھر کے

کے گانے بھی میٹھی رکھے تھے اہل بھرگئی تھے شاہ کی کھجری والا اس کا نام بھی۔

بڑے لڑکے کی شادی تھی۔ چار مہینوں سے دوزی گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی سوڑن پر سنی کاٹھ دیا تھا۔ کوئی قتا، کوئی کداری، اندرونی دہچے پر سارے جڑا تھا۔ شاہی کے ہاتھ بھرے ہوئے تھے۔ روپوں سے بھری تھیلی نکالتی، کھولتی۔ پھر دوسری تھیلی لاتے کہے کہ منانے میں چلی جاتی۔

شاہ کے دوستوں نے اسے دوستی کا واسطہ دیا کہ بڑے لڑکے کے بیاہ پر کھجری خریدو گئے۔ دیے بات انہوں نے بڑے سیلے سے بھی ناکر شاہ کہیں تاکو نہ کھا بیٹھے۔ ویسے تو شاہ جی کی گانے ناچنے والی بہتری میں، جسے مری جو ملاؤں میں یہاں ملکر تو تم خریدو گئے۔ چاہے میرے کی ایک ہی رسد" گا جائے۔

"خیلی" چوں عام بھونوں جیسا نہیں تھا۔ وہاں زیادہ تر کھجری آتے اور بڑے تھے۔ ایک ایک کر کے سبھی سوٹ تھے اور تین تین بڑے کر کے سندھ بھی۔ ایسے ہی ایک سیٹ میں تسلیم رہتی تھی۔ شاہ نے سوچا کہ دوستوں یاروں کی بات نہ سمجھ لے دے وہ ایک دن ٹیپ کے یہاں رات کی مصلحت سمجھ لے گا۔

"یہ تو چار بے پر جانے والی بات ہوئی۔ ایک نے جو عذر پیش کیا تو سبھی بول پڑے: "تہیں شاہ جی، وہ تو صرف آپ کا حق بننا ہے۔ اتنے بڑے بیت گئے ہم نے کبھی کبھی کہا؟ اس جگہ کا نام بھی کیا؟ وہ جگہ آپ کی امانت ہے۔ ہمیں تو سمجھنے کے بیا کاکھن منانا ہے۔ خانداں گھر والوں کی طرح اُسے یہاں بٹوڑ۔ ہادی سماجی کے گھر۔"

بات شاہ کے دل کو گئی۔ وہ اپنے دوستوں یاروں کو تسلیم کا دروازہ بھی دکھانا چاہتا تھا (وہیے اس کے کانوں میں سمجھنے پڑے تھے) کہ اس کی غصہ حاضر میں کوئی نہ کوئی امیر زادہ تسلیم کے پاس آئے جانے لگا ہے) دوسرے وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ تسلیم ایک

یاد اس کے گھر اگر اس کے یہاں دولت کی ریل پیل دیکھ لے۔ لیکن وہ شاہی سے بھی ڈرتا تھا، اس لیے دوستوں کے سامنے حامی نہ بھر سکا۔

دوستوں یاروں میں سے دو ایک نے راہ نکالی۔ وہ شاہی کے پاس جا کر بولے، "سماجی، کیا لڑکے کی شادی کے گرت نہیں گواؤ گی؟ ہم تو جی سہرے خوشیاں منائیں گے۔ شاہ نے سوچا ہے کہ ایک دن یاروں کی مصلحت تسلیم کے یہاں جے۔ بات تو ٹھیک ہے پر ہزاروں روپے اڑ جائیں گے۔ آخر گھر تو تہا رہا ہے۔ پہلے اس کھجری کو کم کھلایا ہے کیا؟ سیاہی بنو اور گانے کے لیے تم ہی اسے ایک دن یہاں نکالو۔ لڑکے کے بیاہ کی خوشی بھی ہو جائے گی اور وہ بھی برباد نہ ہوگا؟

شاہی پہلے ہی بھری بھیجی تھی۔ بگڑا مٹی۔ "میں اس کھجری کے موہ نہیں لگنا چاہتی۔ لیکن جب دوسروں نے بہت سہل انداز میں کہا: "یہاں تو سماجی تہا راج ہے۔ وہ باہی بن کر نہ لگی۔ تہہ کے حکم کی بندھ ہوئی۔ تہا سے بیٹے کی شادی کی خوشی منانے کے لیے۔ پہلی تو اُسی کی ہوگی۔ تہا کا سٹوڑ ہے۔ جیسے کہیں گئے دوام میرا ہی آئے ویسے وہ"

بات شاہی کے دل میں اتر گئی۔ ویسے بھی کبھی سوئے آتھے خیال تو اُسے آتا ہی تھا۔ ایک بار دیکھو تو وہی۔ "کے کسی! اُس نے اُسے بھی دیکھا نہ تھا۔ ہاں اس کا تصور ضرور کیا تھا۔ چاہے ڈر کر۔ سمجھ کر۔ یا صرف نفرت سے۔ غصہ میں سے گزرتے ہوئے اگر کسی کھجری کو گانے میں بیٹھے دیکھتی تو نہ چاہتے ہوئے بھی سوچے گئی۔ "کیا بہت دی بڑا"

"چلو، ایک باہی بھی دیکھ لوں؟ وہ دن میں کس می گئی۔ اُسے میرا جو لگاؤ تھا لگا لگا دیا اپ اور کیا کرے گی۔ ٹیک بار دیکھ لو تو اس جھانک لو!" اور شاہی نے حامی بھردی۔ لیکن ساتھ

ہی ایک شرط بھی رکھ دی۔ "یہاں نہ شراب چلے گی نہ کباب! کھیلے گھر والے میں جس طرح گیت گائے جاتے ہیں، ویسے ہی گانا گراؤں گی۔ تم مردانگ بھی بیٹھے جانا۔ دوئے اور دھبی طرح گانا کر چلی جائے۔ میں دہی جا رہا تھے اس کی بھولی میں ہی ڈال دوں گی، جو سہرے گانے والی دوسری لاکھوں کو دوں گی! ہاں!!"

"یہ بات ابھی تو ہم کہہ رہے ہیں سماجی۔" دسے دی شربا کے دوستوں نے۔ "تہا کی شربہ گھوڑی ہے تو یہ گھر بنا اور چل رہا ہے۔ ورنہ کیا بہت کہا جوتا اور کیا نہیں؟"

وہ آئی۔ شربہ نے خود ہی بھیجی بھیجی تھی۔ گھر چھوڑنے سے کبھی کبھی گھر لگتا تھا۔ ٹیسے کرے میں سفید چادری بچھا کر آج میں دو سوکھ رکھ دی گئی تھی۔ گھر کی عورتیں بے سہرے گارے تھیں۔

بچھی دروازے پر آکر کڑی تو کھڑی آنا دلی عورتیں دوڑ کر کھڑی کی طرف لپکیں تو کچھ شیرھوں کی طرف۔

"اری بھگتی کیوں کرتی ہو؟ سہرا ج میں چھوڑ دیا۔ شاہی نے ڈانٹ مانی، لیکن اُسے اپنی آواز خود ہی دہی دہی جی جی گئی۔ جیسے اس کے دل پر کوئی دھک سی پڑی ہوگی۔

وہ شیرھاں چڑھ کر دروازے تک آتی تھی۔ شاہی نے اپنا گلا پی ساری کا پوسٹورا۔ جیسے سامنے دیکھنے کے لیے وہ ساری کے شگون والے رنگ کا سہارا لے رہی ہو۔ سامنے: وہ؟ سبز رنگ کا پتلی والا عزا رہے کھڑی تھی۔ لال رنگ کا کڑا اور سرے ڈھک کر پاؤں کو چھوٹی ہوئی ہرنے رنگ کی چڑی۔ ایک بھل سی ہوئی۔ پل بھگے کے شاہی کو لگا جیسے سارے دروازے میں ہزار رنگ بکھیر گیا ہو۔ پھر ہرے کا کئی کئی چھوڑنے کی جھنجھ میں "ہوئی۔ شاہی نے ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ ایک گورا گورا ہاتھ ایک ٹھیکے ہوئے ہاتھ کو چھو کر کہہ

”بہت بہت مبارک شادی! بہت بہت مبارک...“

رسیدی ٹکٹ

سادھوؤں کے ڈیرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ سند کے تمام تر جباروں کا گھروڑا اس کی بہن باکوبی بہن سند سے بڑی تھی اور بے حد فریضہ موت تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اپنے شوہر پلاٹنگ گودیکھ کر اس نے صد کپڑی کہ اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ گوئے پرسر سال جانے کے بجائے اس نے اپنے ہائیکے میں ایک ننہ خانہ کھدوایا اور چالیسواں کھینچ لیا۔ سادھوؤں جیسا گرو والیاں بہن لیا۔ ات کو کچھ چنے پانی میں بھگو دیتی اور دن میں کھا لیتی۔ سند نے بھی بہن کی دیکھا دیکھی گویا اس بہن لیا۔ لیکن بہن بہت دن دن زندہ نہ رہی۔ اس کی موت پر اسے لگا کر دنیا سے سچا میراگ اسے اب ہوا ہے۔ اپنے سامو کارانا سر دارا رکھ کھیلو سے وٹا میں ملی بہت بڑی حاشیدہ کو تیاگ کر سنت دیاں ہی کے ڈیرے میں جا بیٹھا۔ سنسکرت سکھی، راج ہاشا چھی، مکت سکھی اور ڈیرے میں باگ سادھو بنگلے لگا۔ بہن دنوں زندہ تھی تو ماہوں اور مانی نے امرتسری کی گھر ان میں ننہ کی سکاٹی کر دی تھی۔ سند نے سکاٹی توڑ دی اور سکاٹی بن کر شاعری کرنے لگا۔ راج بی بی نے شیعہ گزرات پاکستان کے ہنگامی گاؤں کی تعین۔ ادا بدلی میں باہمی تعین جس سے شادی ہوئی وہ فوج میں بھرتی ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ اس اور مالویس میں گورنر اور اسی

لگی ہے۔ میری ماں کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ان بچیوں ہی نے بعد میں بتایا کہ اگر ہم راج بی بی ت پر نہیں تو وہ سنا دی بیٹی کی متناظر ہرگز تھی۔ لیکن وہ اپنے ماٹری کے گھر لڑکی جاتی تھی۔ اپنی ہی طرح کی ایک لڑکی۔ یہ لڑکی ابھی تک اسی طرح چپ ہے۔ قدرت کے راز کو بند مڑوں میں لیے ہوئے ہونے کو کھانا ضرور ہے، لیکن کہتا کچھ نہیں۔ ان بچیوں نے یہ پراکھنا کیوں کی؟ اور ان کے کس وٹو اس نے ان کی سن لی؟ مجھے کچھ نہیں معلوم، لیکن یہ ضرور سچ ہے کہ سال کے اندر اندر راج بی بی راج ماں گئی تھی۔ اور اس سے بھی دس برس پہلے۔ وقت کی قبر میں سویا ہوا ایک وہ فوجاگ اٹھا ہے جب ۲۰ برس کی راج بی بی نے گورنر الزام میں سادھوؤں کے ایک ڈیرے میں اٹھا لیا تھا۔ اور اس کی نظر کچھ اپنی ہی ٹوکے ننہ نام کے ایک سادھو پر جا چڑی تھی۔ سادھو ننہ سا ہو کر رہا بیٹھا تھا۔ جب چھ بیٹے کا تھا تو ماں گشتی رہتی۔ ناتانی نے گودے لیا اور راج صاحب کرنے والی ایک عورت کے دودھ پر پال ہوس لیا۔ ننہ کے چار بڑے بھائی تھے اور ایک بہن۔ لیکن دو بھائی دیت ہو گئے تھے۔ ایک بھائی کو پلاٹنگ گھر گریسٹی جھوڑ کر سنت رانی بن گیا اور ایک حاکم سنگھ

کیا یہ قیامت کا دن ہے؟
زندگی کے کئی وہ لمحے جھون نے وقت کی لڑکھ
جنم آیا اور وقت کی قبر میں سو گئے، آج میرے سامنے
گھر سے ہیں۔
یہ سب ترس کیسے کھل گئیں؟ اور ان بڑوں
میں سے یہ سب لمے پھر بیتے جانے کیسے اٹھ کھڑے
ہوئے ہیں؟
یہ ضرور قیامت کا دن ہے۔۔۔۔
یہ ۱۹۱۰ء کی قبر میں سے نکلا ہوا ایک لمحہ
ہے۔ میرے وجود سے بھی ایک برس پہلے کا لمحہ جیسے
آج بھی بارود کھ دبی ہوں۔ پیٹھ میں سناٹا۔
میرے ماں باپ دونوں ہی بچے کھنڈ بھوڑ
کے ایک سکول میں پڑھانے تھے۔ وہاں کے کھیب
باؤ بھانگہ کی بٹیاں بھی ان سے پڑھتی تھیں۔ ان
بچیوں کو ایک دن نہ جانے کیا سوچا کہ دونوں سے
مل کر گورنر دار سے یہ کیرن کیا اور پراکھنا کھنڈ
میں یہ کہہ دیا: "اے دو جہاں کے مالک اہماست
ماٹری کے تھراک بچی بھڑکے؟"
بھری بھیاں میں پتا چلے پراکھنہ کے بول جو
مئے تو انہیں میری ہوئے والی ماں پر فحش آگیا۔ وہ
سمجھ کہ ان بچیوں نے اکی کھنا سندی سے یہ ڈھما

۱۱۰۰۲۵ کے۔ حوض خاص علی گڑھ، ۱۶-۱۱-۲۵

کے ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھانے لگیں۔ اسکول جانے سے پہلے اپنی بھائی کے ساتھ دیہاتی کے ڈیرے پر آتا تھا جیسے جایا کرتی تھیں۔ بھائی مرچکا تھا۔ یعنی بھائی بیوہ تھیں۔ دوڑوں کو اُڑا داس اور اس ایک اسکول میں پڑھائیں اور ایک ساتھ رہتیں۔ ایک دن جب دوڑوں دیال بی کے ڈیرے پر آئیں تو بارش زور سے ہونے لگی۔ دیال بی نے بارش کے غم کا پیر اپنے بالک سا دھونڈے شعر منائے کوچکا۔ دیال بی ہمیشہ انھیں بڑوں کے شعر سناتے تھے۔ لیکن اس دن جب انھیں کوئی دُکھا دیکھا کہ اُن کے ننھی آنکھیں رانی بی کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اور نظریں جیسے ٹینک دی تھیں کچھ دُورں بعد انہوں نے راج بی کی بیست بھری کہا جی اورتندے کہا: "نندیا! لوگ تمہارے لیے نہیں۔ یہ جو گلاب اس نرل کر دواور گرمست آشرم میں داخل ہوجاؤ۔"

یہی راج بی بی میری ماں بی اور نندما دھو میرے والد۔

یہ ایک اور لمحہ ہے

گھر میں تین بیٹیاں سوئی میں نانی کا راج تھا۔ سب سے پہلی بغاوت میں نے اس کے اسی راج کے خلات کی تھی۔ دیکھا کرتی تھی کہ سوئی کی ایک برہمتی پرتیں گلاس۔ دانی کے بھی پرتوں سے بالکل الگ تنگ۔ بالکل ایک کونے میں پڑے رہتے تھے۔ یہ گلاس اپنی جگہ صوف اُسی وقت اُٹا رہے جلتے تھے، جب والد صاحب کے مسلم دوست آئے اور انہیں چیلنے یا لٹی پلائی ہوئی۔ اس کے بعد انہیں ماتھو دھو کر پھیر دیں رکھ دیا جاتا۔

سوان بیٹوں گلاسوں کے ساتھ میں بھی جیسے ایک چوتھ گلاس کن بران میں کھل گئی اور پھر قسم چاروں نانی سے لڑ پڑے۔ وہ گلاس بھی باقی بڑوں کو تھوپی نہ تھے۔ میں نے بھی منڈی نہ ادا کی بہت میں نہ پائی ہوں گے نہ دودھ نہ چائے۔ نانی اُن گلاس

کو خالی رکھ سکتی تھی۔ لیکن مجھے بھوکا پیاسا نہ رکھ سکتی تھی۔ سو بات والد صاحب تک جا پہنچی۔ انہیں اس سے پہلے پتہ ہی نہ تھا کچھ گلاس اس طرح الگ رکھے جاتے ہیں۔ جب معلوم ہوا تو میری بناوٹ کام باب رہی۔ پھر نہ کوئی گلاس ہندو رہا نہ مسلمان اُس گھر نے زانی جاتی تھی نہ میں کو بڑی جگہ میں گئی ہوں تک جس شخص سے پیار کروں گی وہ اکی مذہب کا بچکا جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے رتن بھی الگ رکھ دیے جاتے تھے۔ چوٹی کا چہرہ میں نے تب سمجھا اُن کا تھا۔ لیکن اب سوچتی ہوں وہ کون کون جلتے اُس کی پر جھپٹاں تھا، جسے میں نے چپن میں دیکھا تھا۔

میرا سولہواں سال

سولہواں سال آیا۔ ایک اجنبی کی طرح۔ پاس آکر بھی ایک خاص زوری پکھڑا ہا کبھی میں چپ چاپ اس کی طرف نہ لکھتی۔ کبھی وہ مسکرا کر میری طرف دیکھ لیتا۔

گھر میں والد صاحب کے سوائے اور کسی نہ تھا والد صاحب بھی ادب تھے۔ رات بھر گاتے، لکھتے اور دن بھر سوتے رہتے۔ ماں نندہ جوتیں تو خاندان سولہواں سال کی کسی اور روپ میں آتا کسی شستا کی طرح، مہیلیوں، دوستوں کی طرح، گئے کمنڈھیل کی طرح، لیکن ماں کی عدم موجودگی کے باعث زندگی میں سے بہت کچھ غیر حاضر تھا۔ آس پاس کے اچھے بُرے اثرات سے بچانے کے لیے والد صاحب کو غاسا اسی میں میری حفاظت نظر آتی تھی کہ میری جان بچان کا کوئی بھی نہ ہو۔ نہ اسکول کی کئی لڑکی نہ چوٹ کا کوئی لڑکا۔ سولہواں سال بھی اُنکی گتھی میں شامل تھا۔ اور میرا خیال ہے اسی لیے وہ سیدھی طرح گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر نہیں آیا بلکہ چوروں کی طرح آیا تھا۔

وہ بھی کسی رات میرے سر پائے کی کھٹی کھڑکی میں سے بکر شپ چاپ میرے سینوں میں آجما، یا کبھی دن کے وقت جب والد صاحب سوئے ہوتے تو گھر کی دیوار بچا نہ کتا ماتا، اور میرے کمرے کے کونے میں

لگے ہوئے چھوٹے سے آنے میں اگر بیٹھا جاتا۔

گھر کرتا ہوں سے بھر جوا تھا۔ بہت سوا کرتا میں نہ ہی مومنات پرتھیں۔ سماجی لگے ہوئے نہیں کی طرح۔ لیکن کچھ تاریکیاں ابھی تھیں جن میں کسی بیٹھا یا اُڑتی کی آمد سے رشتوں کی سماجی ٹوٹ جاتی۔ یہ تھیں وہ کتابیں جنہیں پڑھتے وقت کسی ایک سطر میں میرا سولہواں سال آجائیک میرے سامنے آکھڑا ہوتا تھا۔ تھیں جیسے یہ بھی ایک ایسا لاکھڑا تھا جو میرے سیدھے مادے چپن کی سماجی کو توڑنے کسی بھی وقت آجائیک میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

کچھ ہیں رشتیوں کی سماجی کو توڑنے کے لیے جو ایسا نہیں آتی تھیں، اُس میں راجہ اندلی مارکشس کا بڑا بھتی۔ میرا سولہواں سال بھی یقیناً اوپر والے کی سازش اور جاگ کیوں کہ اُس نے میرے چپن کی سماجی توڑ دی تھی۔ میں نظریں کھٹے تھی، اور رطل مجھے ہر منور خراش کی طرح قحطی۔ کسی رشی کی سماجی ٹوٹ جاتے تو اسے جھٹکنے کا شڑپ لگ جاتا ہے۔ مجھے شاید "سوج" کا سنشڑپ لگ گیا تھا۔

لیکن اس سے میرا ایک عام قدرتی رشتہ نہ تھا۔ جو رشی کا رشتہ تھا، اس نے دیگر رشی طرح میرے والد صاحب کے سامنے سیم جانا اور مجھ سے دُور بیٹ کر کمری در لائے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہوجانا۔ میں بھی اُسے چھپانے کے لیے کھو پھرتے جڑوں میں رشی کی گھڑی ہوئی، اُس سے بچاؤ دیتی اور والد صاحب کے سامنے سیدھی سادی کہنا سامنے والی فرماں بردار بھی بن جاتی۔

والد صاحب کو میرے نظریں کھٹے پراعتراض نہیں تھا بلکہ خاتیرہ روایت کی بات مجھے والد صاحب ہی نے پھلانی تھی۔ اُن کا کھڑا ہونا تھا کہ مذہبی نوعیت کی نظریں کھوں اندر میں کوئی کی طرح وہی جیادھی نظریں کھاتی (خبر کے سولہواں سال کی پراعتراض والی پرتھے اس لیے جیادھی کہنا) اس دن سولہواں سال آیا اور والد صاحب خاتیرہ طور پر کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ دراصل سولہواں سال غریبی ترک کر پھڑے کی علامت کی طرح ہو گیا ہے۔ (کہتے ہوئے بیرونی کی پاش ترک نہیں ہوئی ہے۔ اُنکے (پاشے) ۱۹۸۲ء)

نظمیں

ملاقات

میں ساکت چپ چاپ کھڑی تھی
ساگر میں اک لہر اٹھی تھی
طوفانی س کون بتائے
ساگرنے پھر کیا کیا سوچا
طوفانوں کی گھڑی باندھی
اور وہ گھڑی سو نہ دی مجھ کو
میں نے دیکھا ایک کرشمہ اس ساگر کا
میں نے جانا، میں نے سوچا
صدیوں میں اک بار ہی بس ایسا ہوتا ہے
فکروں کے کتنے ہی سائے
میری پیشانی پر نہا ہے
بے خود بے دم کھڑی ہوئی میں
سوچ رہی تھی کون کون کی
اس گھڑی کو سر پہ اٹھا کر
کیسے اپنے شہر کو جاؤں
میرے شہر کی تنگ ہیں گلیاں
چیچی بچی بھٹی بھٹی سی جیتیں ہیں ساری
غازی کرتی دیواریں
میں نے سوچا میں نے جانا
دل جانے جو مجھے ہیں تو
ساگر کو چھاتی پر رکھ کر
دو دنوں کنارے بن جائیں ہم
اور اشارے کر کے جس دیں
شہر کی بچی بھٹی بھٹی ہیں

آج کل نئی دہلی

ان تنگ و تیرہ گلیوں میں
ہم تم دونوں بس سکتے ہیں
وقت کی قرآ و گھڑی تھی
تیرے تختے میں جو گزری
اپنے من کی آگ کو پی کر
ایک کنارہ بن کر بیٹھی
دور دوسرا ہوا کنارہ
دن دھننے کا سہ ہوا تو
"لوٹا دوسرا گر کو طوفان"
میرے من نے مجھ سے کہا تھا
رات ہوئی تو مجھے ملا تھا
چپ چاپ سا یوں بچھا سا
میں بھی وہاں تھی تو بھی وہاں تھا
ہم سے ساگر دور ہوا تھا
ساگر میں طوفان پھا تھا
(کاغذ اڑ گینوس سے)

ایکے واردات

تیری یاد میں جلا وطن تھیں
وہ زندہ تھیں یا مردہ تھیں
بس اک بار اک بات ہوئی تھی
دھواں دھواں کی رات ہوئی تھی
لحے کا پتہ کھڑکا تھا
برسوں کے دل دہل گئے تھے
ارماں بھی کہے سہمے تھے

تین مرتبہ مجھ کو لگا تھا
چھاتی کا دروازہ دھڑکا
ہولے ہولے پاؤں اٹھاتا
گھر کی چھت پر کوئی آیا
اور اس نے اپنے ناخن سے
اک پچھلی دیوار کریدی
تین بار ہی اٹھ کر میں نے
دروازے کی کڑی دیکھی
اندھیارے کو دروازہ نہ تھا
کبھی کبھی وہ کچھ کہتا تھا
ورنہ تبسم چپ رہتا تھا
مجھے وہ آواز کو اپنی
پھر دانتوں سے بیس رہا تھا
پھر آئی آواز کہیں سے
بھاری بھر کم 'دلکش' تازہ
کالے کوہ سے میں آئی ہوں
پہرے دار سے آنکھ بچا کر جسم چپرا کر
دامادہ سی، تھکی تھکی سی
اس نے کہا تھا علم مجھے ہے
خانہ دل آباد ہے تیرا
ہم 'پھر بھی مجھے بتا دے
تیرے دل میں میری خاطر کوئی جگہ ہے
مجھ کو تنہا ہی جگہ بہت ہے
لیکن ذکر میں نے کہا تھا
جلا وطن کی خاطر دل میں

بالکل کوئی جگہ نہیں ہے

جگہ نہیں ہے

میرے خدا کا حکم یہی ہے

قسمت میں ایسا لکھا ہے

لڑ گیا تھا گھوڑا اندھیرا

یاد بھی تھوڑی دور کھڑی تھی

لیکن جانے سے کچھ پہلے

وہ میرے نزدیک آئی تھی

اس نے بری بستی چھوٹی تھی

ایسے جیسے کوئی چھوٹے

خاک و طعن کو

(کاغذ اور کینوس سے)

ایکے اور ملاقات

برسوں کے بعد آج اپنا تک

ہم مل ہی گئے رستے میں

دو دنوں دلوں پر چھوڑوں کا لڑخہ طاری تھا

رات کھڑی تھی پر پھیلائے

آدھی نظر تھی اس کو نے میں

اور آدھی تھی اس کو نے میں

صبح سویرے دو دنوں نے تھے

جیسے دو کاغذ کے ٹکڑے

میں نے تیرے ہاتھ کو تھاما

تو نے میرے ہاتھ کو تھاما

دو دنوں ہاتھوں نے مل کر پھر

کاغذ کے ٹکڑوں کو اٹھایا

ٹھنڈی ٹھنڈی میز پر رکھا

ساری نظم پہ صبحینہ دیا خط

(کاغذ اور کینوس سے)

ایکے خط

دل کی دینیاں رہے ہیں جلوہ گر تیرے خیال

جنتیں آباد کر کے خواب کا ٹونا وصال

ابر رحمت ہیں کے آئی رات اسے جان وفاق

آج کل نئی دہلی

ہو گیا یوں تیرے وعدوں کا مکمل سلسلہ

خواب کے طعنی قطار اندر رفتار آنے رہے

تیری سانسوں کی ہلکے سے ہونٹ ہلکاتے رہے

ادھکی دیواروں سے ہو کر روشنی آئی نہیں

رات خوابوں کو بتا کرتی ہے جھٹلائی نہیں

خاموش نعرے گھنٹی ریتی ہوں نام کوئی

غم مجھے ہے اک سطر بھی کیوں تجھے یہ بھیجی نہ تھی

(سندھی سے)

عشق

کیسے بے وفا، بد ذات، ظالم

سراپا سوز توجہ یاد آئے

نہ جانے قافلے لفظوں کے کتنے

مرے سینے کی آگنی چاٹتے ہیں

بہت ہی آگ دل کی تھوکتے ہیں

مرے نازک بدن کا کس اُسدَم

بنا کرتا ہے پھر نندار مٹی

مرے سو گئے ہوئے ہونٹوں کے رستے

یہی الفاظ جھڑتے بیج بنتے

میں چپ ہوئی تھکی دھرتی کی مانند

یہ ظالم پھر مرے انگوٹے لگتے

یہ بیٹے بے حیا بھولوں کی صورت،

تو میں بھی ایک کالے کوہِ حبشی

ہلک جاتی ہلک جاتی سراسر

(کاغذ اور کینوس سے)

میرا پتہ

آج اپنے گھر کا میں نے

نمبر مٹا دیا ہے

نام و نشان مٹا دیں گا

لکھا ہوا تھا جس پر

تخت ہما دیا ہے

تم ڈھونڈ رہا ہو چا ہو

مجھ کو پھر سے جہاں میں

شہروں کے شور و غل میں

جا کر کھلی گل تم

دروازہ کھٹکھٹانا

جس گھر میں رہ رہی ہو

آزاد روں کوئی

ہاں میرا گھر وہی ہے ہاں میرا گھر وہی ہے

(کاغذ اور کینوس سے)

ققنص

لکھ دی دے تقدیر اک میرے لیے

جی رہی ہوں کہہ میں تیرے لیے

ماہتابی ہر گھڑی بقی رہی

ماہتابی ہر گھڑی بقی رہی

نورِ دودھیانے سے کیوں بنے نہیں

پھول بے موسم بھی رہتے نہیں

عشق گویا ساز بے آواز ہے

نعرہ آوازِ شکست ساز ہے

سب سے ہر لفظ میں اک درد ہے

رات کے پہلو میں انجمِ سرد ہے

غم گھٹن جارہی ہے رات دن

روح کو حڑ پارہی رات دن

آج دیکر راتِ ققنص گائے گا

روشنی میں عشق کی جل جائے گا

اسے مرے خوابوں کی تعمیر آج جا

رات باقی ہے بہت نہ جا ذرا

راکھ دیکر رات کا انجام ہے

خاک کو ققنص کی سوہ نام ہے

کھل کے ابر بارے گا جہاں

اک نیا ققنص جنم لے گا وہاں

(سندھی سے)

مترجم: اوم پرکاش بھاج

۱۳/۱۳/۱۳۸۵

نئی دہلی ۱۱۰۰۲۴

نئی کتابیں

چوری سے یاری تک (انشائیہ)

مصنف : ڈاکٹر وزیر آغا

صفحات : ۱۲۰ قیمت : ۱۸ روپے
ناشر : مولدرن پبلشنگ ہاؤس ، ۹- گولڈ مارکیٹ ، دریا گنج نئی دہلی

”چوری سے یاری تک“ ڈاکٹر وزیر آغا کے تصنیف کردہ پندرہ انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ ادب کی دوسری اصناف کی طرح ڈاکٹر وزیر آغا اس صنف میں بھی ممتاز، منفرد اور متذکر نظر آتے ہیں۔ اردو ادب میں یوں بھی نگاہیں سادہ باطن پیچیدہ اس صنف میں کم لگ اپنا اعتبار قائم نہ کر پاتے ہیں اور سلاست نگاری و شگفتگی کا وہ معیار بہت دیر تک نہیں بٹھاتا ہے، جو اس صنف کو مزاج نگاری سے الگ رکھے۔ تحریر و مزاج کی گفتگو اندازِ مزاج کے ذریعہ اس بابیک سے فرق کو قائم رکھنا کم غلاق ذہن کا مقدر نہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا جیسا غلاق اور دور بین ہیں اس صنف شیوہ طراز پر قائم پاکستان ہے۔

کامیاب انشائیہ نگار ہمارے ہی آئینے کو ہمارے چہرے کے سامنے ایسے زاویے سے پیش کر سکے کہ ہمیں اپنا چہرہ اور اپنا آئینہ دونوں مزید اپنے اور نئے عینوں ہونے لگے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان زاویوں کے لیے امتیازی نظر رکھتے ہیں، جن سے یہ نازک اور پُر شگفت کام پایا جاسکے۔

ان انشائیوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ہماری بستی کے کسی ٹیلے پر سے بستی کا منظر دکھا دیا مواد اس منظر سے جم اتے تھیرے اور غلط فہمی ہوئے ہوں اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہوں : ”تعب ہے، اب تک اپنی بستی کو کہنے دیجیے نہیں تھا۔“

انشائیہ کی مخصوص سلاست، سادگی، روانی اور اختصار کے باوصف ڈاکٹر وزیر آغا نے درخشندہ انشائیوں میں سنجیدگی، تفکر اور فلسفہ حیات پر جامع تبصرہ ایک دیریں لہری طرح سادہ ساتھ چلتا ہے، جو عام طور پر شگفتگی کے پردہ میں نہاں ہے۔ لیکن ہمیں ہمیں اپنی جگہ بھی دکھا دیتا ہے۔ مثلاً :-

”... میں نے زندگی کو تین اکم ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ دور میں میں آپ کو ترپاٹے (بلکہ اڑاتے) ہیں۔ دوسرا وہ دور میں میں آپ مرنا پاتے (بلکہ لڑاتے) ہیں۔ تیسرا وہ دور میں میں آپ طوفان پاتے اور ٹھنڈوں پر ٹوٹتے ہیں۔ اڑاتے، لڑاتے اور ٹوٹنے کے اسی تین مدارج سے یہ زندگی عبارت ہے...“

(طوفانِ پان ص ۵۵)

پ :

”... مغرب انش و دیگر وفوں ہے جس کی مدد سے سوسائٹی اپنی آواز کو دین کی بڑھاکر پیش کرتی اور یوں ان بہت سی قسمی قسمی شیریں آوازوں کو دبا دیتی ہے جو اس کے پروں کے نیچے سے نکلے ہوئے چوڑے پھیلا کرتے ہیں...“

(کچھ مغرب انش کی مخالفت میں ص ۵۷)

”... ان کی طبیعت میں جو دلآویزی، نرمی، رجاء اور شائستگی ہے، زمین اور اس کے رشتوں کو انہوں نے جس طرح پایا اور بنا لیا ہے — وہ ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔ سخت سے سخت بات کو نرم انداز میں کہنے کا یہ طرز کم ادبوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ شیطانی ہیں مگر اس سادگی سے کہ اپنی نگار کو بے نیام نہیں ہونے دیتے۔ روزمرہ کے واقعات و تاثرات کو وہ جس زاویہ سے دیکھتے ہیں، وہ انہی کی روش خاص ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں اس صنف ادب (انشائیہ) کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی تو بے جا نہ ہوگا...“

(جنتی لفظ ص ۹۹)

یہ کتاب دو کے انشائیہ ادب میں پیش ہوا اصناف ہے۔

شب چراغ (نثری)

مصنف : حسن نجفی سکندر پوری

ناشر : حسن نجفی سکندر پوری

میں کا پتر : مولدرن پبلشنگ ہاؤس ، ۹- گولڈ مارکیٹ ، دریا گنج نئی دہلی

قیمت :

”شب چراغ“ حسن نجفی سکندر پوری کی چالیس سالہ شاعری کا انتخاب

آئینہ راز (شاعری)

مصنف : راز لال چٹھی
صفحات : ۱۳۳
قیمت : ۱۵ روپے
ناشر : ماہارشان ہندوئی دہلی

”آئینہ راز“ مصنف راز لال چٹھی کی غزلیات کا مجموعہ ہے، جس کے آخر میں ”مکس ریزے“ کے عنوان سے نکعات و رباعیات اور ”مکس نامہ“ کے عنوان سے کچھ مفردات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ راز صاحب ایک جہاں دیدہ شاعر ہیں اور ان کی زندگی مختلف شہروں کے عملی تجربوں کی اونچ نیچ کے علاوہ شاعرانہ تجربات سے بھی گزری ہے اور ان کی شاعری کا رنگ شروع سے آخر تک وہی مخلصانہ، بے باک اور ”طبع رندانہ“ والی ان خصوصیات کا حامل رہا ہے، جو خصوصیات اردو شاعری میں ”داعا اسکول“ سے منسوب سمجھی جاتی ہیں۔ زبان کی چاشنی، سادگی، سلاست، خمی سمانی، برجستگی اور نرم ان کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہے۔ شاعری سے مستحق ان کا اپنا خیال ہے کہ:-

یہ دیتے ہیں اللہ کی اللہ جے دے
کچھ نکلے اہماز مہیا فی نہیں آتی
گو یا وہ فن کو کسی نہیں وہی سمجھتے ہیں۔

”آئینہ راز“ کے بیشتر اشعار شراب و جامے ”ڈبستی“ بلکہ بہت سی جگہ تو ”وابستگی“ پائی جاتی ہے، لیکن کہیں کہیں ایسا لغو فائدہ رنگ بھی چمکتا ہے:-

عشق صادق کی حقیقت سامنے آ جائے ہے
آدنی جب خود میں کھو جائے خدا پا جائے ہے
مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ یہ بچتے نظر آتے ہیں:

طبع رندانہ کو یہ کیا سوچھی
طبع دیں دار چوٹی ہوتی ہے
راز ساغر کی کھنگ مٹتا ہوں
شام حیدر چوٹی جاتی ہے

راز صاحب کی شاعری ان تمام نثر نگاروں سے کہے جہاں عوامی اور مخصوص فرائیہ شاعری کے ”محب“ اور ”سیر شدہ“ ہیں۔ اللہ راز صاحب نے ان کا استعمال اپنی امتداد طبع کے اعتبار سے کیا ہے اور شاید اسی کو تنقیدی زبان میں صاحب اسلوب بولنا چاہتے ہیں۔

ہے۔ جس میں زیادہ تر غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کے آخر میں چند نظمیں اور کچھ مفردات بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ کتاب میں شامل غزلیں عام طور پر روایتی انداز کی شاعری کی مثالیں ہیں، جو پہلی قرات میں سمجھ میں تو آ جاتی ہیں، مگر بہت مؤثر نہیں ہوتیں۔ ان کی شاعری میں کم کم تاثیر کی وجہ قطعیت اور ان کا مستطقی انداز ہے۔ جہاں جہاں قطعیت اور ”موضوعیت“ سے دامن بچا پاتے ہیں، وہاں ”شاعری“ در آتی ہے۔ مثلاً:-

امن تھا آج شہر میں شاہد
لوگ گھر آئے بچہ اداں آئے

پابندیاں لگیں جو سلام و بیدام پو
جمن میں تھی جو بوجہ مجرب ہو گئے

جو طے کا فرستہ ہو گا میرے شہر میں
میرے بسا کا یہاں تو آدمی مت ڈھونڈنا

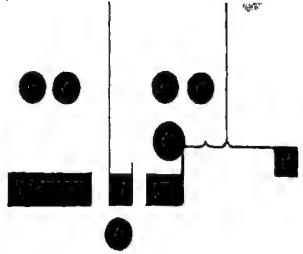
کتاب کے سرورق پر کئی محفلات کی آرا درج ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے لکھا ہے کہ:

”... ترقی پسند تحریک سے وابستگی ان کے شعور کو
نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا ہے اور اس طرح زندگی کی
ایسی چٹائیوں تک ان کی نظر پہنچی جو دوسرے شعراء کی
نگاہوں سے اوجھل تھیں۔“

پُرا ریاضا علی نظر ہے۔ نہیں معلوم کون سی ”اجھوٹی چٹائیوں“ کا تذکرہ ہے
جن تک کسی اور شاعر کی نظر نہیں پہنچی۔

سرورق پر درج مزید آراء میں سے محمود سعیدی صاحب کی رائے ممتاز
حنیف کیفی صاحب کی ”مدرسہ“ اور حکیم ہند نیر صاحب کی ”شفق“ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن کئی صاحب کی شاعری کی انفرادیت ان کے
طنز و انداز بیان میں نمایاں ہو سکتی تھی (اس حقیقت کی طرف بلکا سا اشارہ
نیر صاحب نے بھی کیا ہے) مگر یہاں بھی ایک آنکھ کی کسر و صحتی انداز کی
وجہ سے لگتی ہے۔ یوں بھی اشاریت عام طور پر شاعری کا اور خاص طور پر
غزلیہ شاعری کا جزو لا ینفک ہے۔ البتہ نظم میں یہ کمی اس لیے زیادہ محسوس
نہیں ہوتی۔ کیوں کہ نظم ”موضوعیت“ اور ”مقصدیت“ سے اس درجہ غور و خوض
نہیں ہوتی جس میں غزل۔ چنانچہ اس انتخاب میں مثال نگلیں کیفیت
ہیں۔



اچھا کام

”آج کل“ کے چکیت مدی ہر نمبر کے لیے مبارک باد قبول کیجیے۔ نہایت صاف سترا، اچھے اور معتبر معامین سے آراستہ یہ نمبر اردو واروں کے لیے ایک خوب صورت تحفہ ہے۔

چکیت پر ابھی اردو میں کام زیادہ نہیں ہوا ہے۔ چند نمبر اور کتبوں کے سوا کچھ ہے۔ البتہ مختلف اچھے برے معامین کتابوں اور رسائل میں محفوظ ہیں۔ اور چند برسوں سے محبت محرم کالی داس کی لکھا رسلہ چکیت کا حق ”چکیت ادبیاتیات چکیت“ ”کلیات چکیت“ (نظر اور مقالات چکیت) شائع کر کے اہل کارنے کی قابل سائین کو کشش کی ہے۔ البتہ ایک شکایت ہے صفحات میں کمی ہونے کی وجہ سے پراسنجی نہیں۔ جی چاہتا تھا کہ اس نمبر میں کچھ تصاویر بھی ہوتیں۔ اب تک جو کچھ چکیت پر کام چلے اس کا اشارہ بھی ہوتا تو آئندہ چکیت پر کام کرنے والوں کے لیے آسانی پیدا ہو جاتی

لیکن یہ بات اپنی جگہ سہمے کہ یہ نمبر ختم ہونے کے باوجود ہم سے اوچکیت کی تلاش میں اس سے مدد ملتی رہے گی، اس لیے میری طرف سے اس اچھے کام پر دُعا میں قبول کیجئے۔

عبدالعزیز دسوسوی

مفہیم نمبروں سے بہتر

”چکیت مدی ہر نمبر“ نعرے گزرا۔ چکیت مدی ہر نمبر کی ضخامت عام شماروں جتنی ہے۔ تاہم چکیت کی ضروری و ضروری تعلیمات، تعارف، تجزیہ تعلیم و ترقی کے سلسلے اور عقائد و اہمیت کے اعتبار سے یہ نمبر تعلیم نمبروں کا ختم جم کے اہل لوں سے بہتر ہے۔ چند ہی معامین میں، مگر نہایت جامع تفصیلات سے معمور اور چکیت کے نمایاں مسائل پر بھلا فیضی کی راہ حیات نہایت صحیح و عیسیٰ، لطیف اور اندازک احسانات کی حامل ہیں۔ انیس پر چلا اور جو محرم انسانی

درا جعفر حسین کا معنوں چکیت ”مدی“ کافی پر از معلومات ہے۔ بہت پُر تعلف ہے۔ افعال اور اشارت رد و لوی صامیان کے معامین بھی قیمتی ہیں۔ پروفیسر عبدالغنی کا معنوں ”چکیت کی نظم نگاری“ طویل ہے، لیکن واضح و معتبر ہے۔ منتفی صاحب کے معنوں میں پر بھی تنقیدی اشارے ہیں وہ صحیح سمت میں ہیں۔

جناب ہنگ نام صاحب کا معنوں درانی چکیت بڑے کام کا ہے اور دورِ شہ کے متعلق ان کا یہ ریکارڈ بالکل صحیح ہے کہ یہ درجہ نہیں ہے بلکہ مدراجہ و منتفی کی دوسری شکل ہے۔

فضل امام کالی داس لکھا رسلہ اور ٹیم تنفی کے معامین بھی چکیت کے کچھ میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

اویس احمد دوزل، درجہ شنگو

کوڑے میں دریا

دریا کو کوڑے میں بزرگ ناگوئی آپ سے کیجئے ”چکیت مدی ہر نمبر“ اپنی مثال آپ ہے۔ بلا شک یہ طلباء و اساتذہ دونوں کے لیے کارآمد اور مفید ہے۔ تیرہ سو سالوں کے لیے بھی یہ ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔

فضل امام صاحب کا مقالہ کالی جوان دار ہے۔ نظم صنفی صاحب کی بحث بھی زیر دست ہے۔ رضا صاحب بھی معلومات میں اہل کارنے ہیں۔ دیگر معامین بھی اچھے اور قابل قدر ہیں۔ لاش گزرا گوئی پر بھی قویہ روی معانی۔

چکیت کی بری آپ کا یاد رہی اس کے بہت بہت مبارک باد۔ نہ چلنے اور دل سے اس پر قویہ دینا کیوں ضروری نہیں سمجھا۔

دروازہ شامی، منظر نور

جامع نمبر

”آج کل“ کا تازہ شمارہ چکیت مدی ہر نمبر ”چکیت کی حیات اور شاعری پر ایک قیمتی دستاویز ہے۔ جہاں تک میری محدود معلومات کا تعلق ہے چکیت کی زندگی، شخصیت اور نگار و فن پر آج کل سے زیادہ مستند اور جامع تفسیر کسی رسالے نے نہیں نکالا تھا۔

ظہیر زائرہ صاحب گوئی، کلکتہ

دستاویز

”آج کل“ کا ”چکیت نمبر“ دیکھنے کو ملا۔ بہت خوب صورت اور جامع دستاویز ہے۔ چکیت پر نگار و فن کا پسے ان کا بھی ادراک ہے نظم کی شاعری میں بلور خاص ان کا اہم مقام ہے۔ انوں نے ہمارے تہذیب کی ہے۔ دوسرے اہم رسائل کو بھی چکیت پر نگار و فن کے چاہ لیں۔

محمد صفی، بھمراؤں، مراد آباد (دکنہ ص ۳۷)

مئی ۱۹۵۲ء



جامعہ مکیہ اسلامیہ، دہلی میں منعقدہ میر تقی میر سیمینار اس موضوع پر ہندوپاک میں پہلا سیمینار تھا، جو نہایت پُر وقار انداز میں ۱۹ سے ۲۱ مارچ ۱۹۸۳ تک جاری رہا۔ اس سیمینار میں ہندوستان کے مستند نامور ناقدین اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ، تخلیق کاروں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ پاکستانی سب سے پہلے محقق ڈاکٹر جمیل جالبی، ممتاز اساتذہ نگار اخبار حسن کے علاوہ لندن سے سفر شہزاد اختر عارف بھی اس سیمینار میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ایک چھ مہینوں قبل مشاعرہ بھی منعقد ہوئی، جس میں شعرا نے میر تقی میر کی زمینوں میں اپنا کلام پڑھا۔

اوپر پچھلی مشاعرہ کا ایک منظر۔ دائیں سے بائیں:- پرنس انجم قدر، جناب غلام ربانی تاجاں، پروڈیوسر آل احمد سرور، جناب ضیاء الرحمن انصاری، وزیر مملکت آبپاشی، پروڈیوسر گوپی چند نارنگ، جناب عثمان عارف نقشبندی مرکزی نائب وزیر تعمیرات و مکانات اور ڈاکٹر عزیز بدر۔



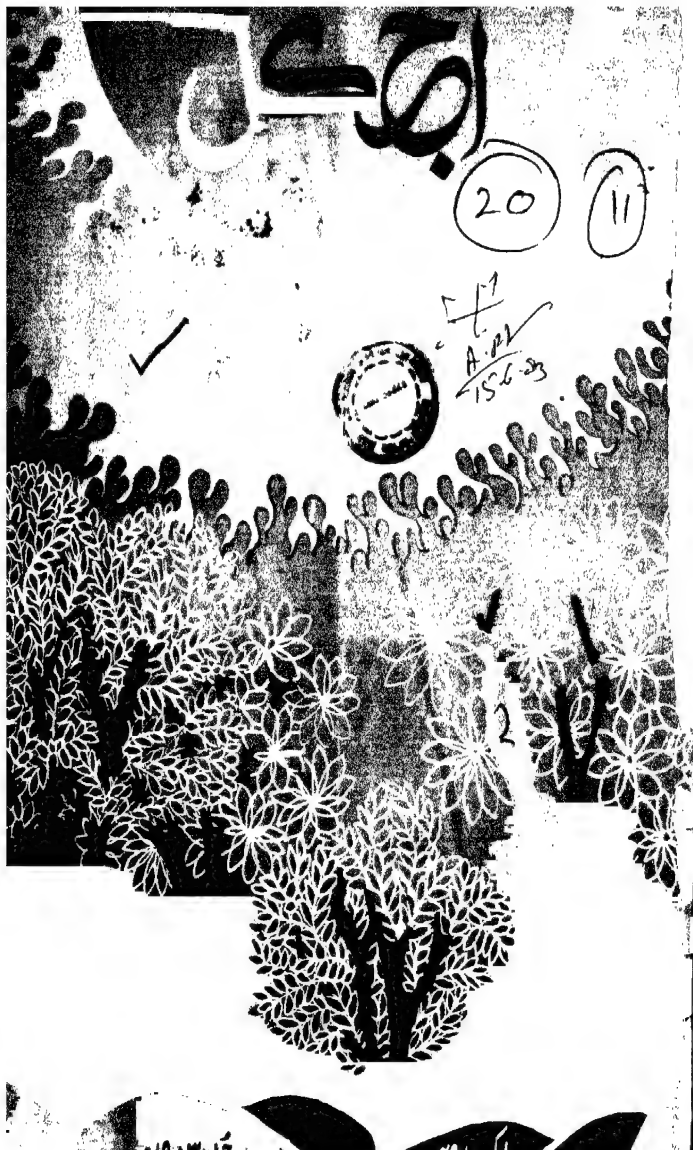
برائے حسین دو جگہن شہر گون میں غالب اکڈمی نے اس سال بھی ۱۹ فروری کو اپنی روایات اور غالب کے شایان شان ایک سیمینار منعقد کیا۔



وزیر علم و ثقافت نے ۱۵ مئی ۱۹۶۸ء کو کشمور (جیل) کے تمام پرنٹنگ پریسوں کی پروویڈنٹ فنانس کمیٹی کا افتتاح کیا



۱۴ مئی ۱۹۶۸ء کو ڈی جی ایچ کے ذریعہ اطلاعات و نشریات کے وزیر محکمہ شری انکے اہل حکمت اور علم و ثقافت کے وزیر نے ایک مشترکہ اجلاس منعقد کیا۔





غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ۳۰ مارچ ۱۹۸۳ء کو نائب صدر جمہوریہ جناب محمد علی احمد صاحب کی پہلی اور دو تصنیف "تقریر و تعمیر" کی رونمائی کا شائق و حاضر۔ (ادبی) کرنل بشیر حسین زیدی "تقریر و تعمیر" کا ایک نسخہ نائب صدر جمہوریہ کو پیش کر رہے ہیں۔ (نیچے) نائب صدر جمہوریہ مذکورہ کتاب کی ایک کاپی حکیم عبدالغیر صاحب کو پیش کر رہے ہیں۔ تصویر میں کرنل بشیر حسین زیدی اور جناب مالک رام بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔





آج کل

قلمی

ایڈیٹر :

سب ایڈیٹر :

راج نرائن راز

شونامہ

جلد : ۳۱

شمارہ : ۱۱

جون ۱۹۸۳ء

قیمت : ایک روپیہ

فون : ۳۸۰۰۶۹

جیٹھ - اساتذہ شاہد ۱۹۰۵

ترتیب

ملاحظات :

۲

اضافے :

مقالات :

۳

جہاں جاگے وہیں سویرا جاوید لطیفی

بہ خط شاعر :

۲۶

کرشن بوس

نظم و غزل :

۲۸

نوبہار مصابیر

غزلویہ :

۲۹

شاہد میر، علی احمد علی، اسعد بدایونی

۳۰

محسن آرا، محمود رائے بریلوی، رشید علی کھیل،
فتاب آفر، واحد نیکی، اختر شاہ جہاں پوری

سردق : الکائیر

زفر منیر : ایس۔ ایل۔ میوال۔ اسٹنڈرٹ نیویجور۔ ایل۔ آر۔ برہہ اسٹنڈ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

ترتیب دیکھتے :

مصارف سے حسن خط و کتابت کا پتہ :

زفر منیر : پبلی کیشنز ڈوئیرن، پیاد ہاؤس، نئی دہلی

ایڈیٹر : پبلی کیشنز ڈوئیرن، پیاد ہاؤس، نئی دہلی

ملاحظات

ہندوستانی معیشت میں نئے رجحانات

حصول آزادی کے بعد ملک کی معیشت میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ تاہم کچھ ایسے شعبے ہیں جہاں ہمیں کامیابیاں حاصل کر رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں معیشت کے بعض مسائل اور چیلنجوں سے بھی نمٹنا ہے، لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہم نے آزادی کے نظام کے ایک طویل عرصہ سے نکل آئے ہیں۔ اگر ہماری معیشت ترقی یافتہ نہیں تو ترقی پذیر ضرور ہے۔

ترقی کی شرح کو دیکھیں ۵۱۔ ۱۹۵۰ء سے ۸۱۔ ۱۹۸۰ء کے درمیان قومی آمدنی میں تقریباً ساڑھے تین فی صد اضافہ ہوا۔ اس عرصے میں زرعی پیداوار میں لگ بھگ ۲۴ فی صد کا اضافہ ہوا۔

یہ حقیقت ہے کہ ان تمام تبدیلیوں کے وجود پر غور ہی ختم نہیں کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان سب لوگوں کے لیے جو بے چلنے پر روزگار کے مواقع بننا کر پائے ہیں جو کام کرنے کے اہل بھی ہیں اور خواہش مند بھی۔ اس عدم توازن کی متعدد وجوہات ہیں۔ عوام کی اقتصادی حالت بہتر بنانے میں بڑھی ہوئی آبادی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس کی کھیت میں اداسٹ لگ بھگ ۱۱ فی صد تک سالانہ کا اضافہ ہوا ہے۔

زرعی پیداوار میں عدم استحکام سے بھی معیشت کو دھکا پہنچا ہے۔ ہر تیسرے یا چوتھے سال ملک کے کسی کسے حصے میں ناشریہ طوفان آیا یا سیلاب آیا۔ اگر اگر طوفان یا سیلاب نہیں آئے تو خشک سال یا پھل جیس کا نتیجہ پیداوار میں کمی کی شکل میں نمودار ہوا۔

منصوبے تشکیل دینے وقت اس امر کو بطور خاص ذہن میں رکھنا کہ مختلف شعبوں اور محکموں میں گہرا رابطہ مضبوط ہے۔ مگر یہ نال میل پوری طرح نہیں ہو سکا۔ بجلی کی کمی، ناقص بجلی کی پورشائی، مزدوروں میں بے چینی، چارجیٹوں کی عمل درآمد میں تاخیر نیز اس طرح کی دیگر وجوہات کی بنا پر معیشت میں تیزی سے تہری نہیں آسکی۔

معیشت میں بنیادی طور پر کئی کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ۵۱۔ ۱۹۵۰ میں زراعت اور متعلقہ شعبوں سے تقریباً ۶۰ فی صد پیداوار حاصل ہوتی تھی۔ ہند بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ اب زراعت پر معیشت کا انحصار نصف ۴۰ فی صد رہ گیا ہے۔ اگرچہ پیداوار میں تنوع آتا ہے۔ نام روزگار کے مسئلے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔

گونا گونیت

صنعتوں میں کافی حد تک گونا گونیت اور تنوع آ گیا ہے۔ نیا نیا مال اور نئی نئی اشیا تیار ہو رہی ہیں۔ روایتی صنعتوں میں تیار کی جانے والی اشیاء خوردنی اور گھریلو کی تیاری جو ۱۹۵۶ء میں ۶۲ فی صد تھی، ۱۹۸۰ء میں کم ہو کر ۳۹ فی صد رہ گئی۔ غیر روایتی صنعتیں اداروں میں تیار ہونے والا مال مرکازی شعبے کے ادارے تیار کر رہے ہیں۔ نئی شعبے میں بھی افراز و اقسام کا مال تیار ہو رہا ہے۔ ہر طرح کا مال تیار کیا جاتا اور ہر قسم کے پلانٹ لگائے جانے کی معیشت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے

کہ اگر ضرورت نہ کہ کوئی کی مدد سے مل سکا جائے تو نقصان بھی ہو جاتا ہے، لیکن ہمیں زیادہ رکھنا چاہیے کہ تبدیلی کا مکمل شروع ہو چکا ہے۔

ہمارا قریبی تجارت میں کئی اعتبار سے بدلاؤ نظر آ رہا ہے۔ ۵۱۔ ۱۹۵۰ میں ہماری ایک چوتھائی تجارت برطانیہ کے ساتھ ہوتی تھی۔ آج ہمارا مال دنیا کی بے شمار منڈیوں میں پہنچ رہا ہے۔ اب ہماری تجارت پر برطانیہ کی امداد داری نہیں ہے۔ ملک کی پیداوار کو دیکھتے ہوئے ہماری برآمد اور درآمد میں بھی بڑے ریمانٹ منظر عام پر آئے ہیں۔

۵۱۔ ۱۹۵۰ء میں ہمارے ملک سے صنعتی برآمدات ہو رہی تھیں، ان کا تقریباً نصف حصہ، یٹ میں سوئیڈن کے لیے منتقل تھا۔ یہ ہماری روایتی برآمدات بھی تھیں، لیکن اب ان کا حصہ برآمدات میں صرف ۱۵ فی صد رہ گیا ہے۔ اپنی اور برآمدات کی اشیا پر کڑی تنقیدیں برآمد کی جارہی ہیں۔ تاہم بیرونی معیشت سے متعلق درآمد کی عمل کے کچھ نامناسب اثرات بھی پڑے ہیں۔ ملک میں تیل کی تلاش اور جستجو کے لیے جو اخراجات کیے جا رہے ہیں، اسے دیکھتے ہوئے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ ہماری آئندہ کی غیر ملکی تجارت میں دور رس تبدیلیاں آئیں گی۔

زرعی شعبے میں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کے نتیجے میں فصلوں کے نظام میں بھی اہم تبدیلیاں آئی ہیں۔ آبپاشی کی سہولیات میں توسیع زیادہ سے زیادہ دیات میں کی گئی ہے، عمدہ بیجوں اور کھاد کے استعمال سے کھیتی باڑی کی پیداوار تقریباً دوگنی ہو گئی ہے۔ جب کہ جاول کی پیداوار میں تقریباً ۲۰ فی صد تک کا اضافہ ہوا ہے۔ خوراک کی پیداوار، ۵۱۔ ۱۹۵۰ء میں ۵۰ لاکھ ٹن تھی آج ۱۳۴ لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔

لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ کھیتی باڑی کا مکمل عمل ہو چکا ہے۔ ابھی آدھی سے زیادہ کھیتی باڑی کی ایسی سہولیات میں جنہیں بروئے کار نہیں کیا جاتا

ہے۔ علاوہ ازیں پیداوار کا انحصار مختلف علاقوں اور خطوں پر ہے۔ جدید کاری کا مکمل روز بروز اپنے شباب پر پہنچ رہا ہے، جو محققانہ رجحان جو ہی ہے وہ مغربی طرز پر موزوں ہے۔ بین الاقوامی ملک دستیاب نیکانہ کو جدید مغلطہ پر ڈھالنا اور اسے اپنے ملک کی ضروریات کے مطابق بنانا ہے۔ قرضوں کی فراہمی اور منڈی کی سہولیات جیسے کر کے دیے بھی ہم نے نمایاں پیش رفت حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک مربوط بنیادی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے۔

بچت اور سرمایہ کاری

بچت اور سرمایہ کاری ترقیات کے اہم جزو ہیں۔ ۵۱۔ ۱۹۵۰ء تک بچت اور سرمایہ کاری قومی آمدنی کی نصف قیادت تھی۔ منصوبوں میں فی ملکی امداد پر بھی انحصار رہا ہے۔ ۶۹۔ ۱۹۶۸ء کے سالانہ منصوبے میں اخراجات کے لیے امدادی شرح ۹ فی صد سے بڑھ کر ۱۳۔۹ فی صد تک پہنچ گئی ہے۔ چھٹے منصوبے میں اس کا اندازہ ۱۰ فی صد تک بڑھا گیا ہے۔ جنرل بچت اور سرمایہ کاری میں ۲۰ فی صد سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ملک کی معیشت کے بنیادی ڈھانچے میں ایک اہم تبدیلی ہے۔ بچت اور سرمایہ کاری میں امانت کے بادیو معیشت میں بہت زیادہ بہتری نہیں آئی۔ اس کی وجہ اقتصادی اختلال کا یہ اثر ہو رہا ہے۔ ہم نے تعلیم، معذوری، بیماریوں کی روک تھام، صحت سے متعلق سہولیات میں توسیع دینے کے پانی کی فراہمی اور اس طرح کے دیگر شعبوں میں کام پایا جس میں حاصل کی ہیں اور ان سے غریبوں کو بھی فائدہ پہنچا ہے، لیکن غریب اور بے روزگار دور کرتا نیز آمدنی اور دولت کی مساوی تقسیم میں ہماری کوششیں کم و بیش کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ حکومت سہولت فراہمی دے رہی ہے اور اقتصادی ہم مساویت فکر کرنے کے لیے اہم قدم اٹھائے ہیں۔ چھلے ترقی کے معیشت کی بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کی گئی ہے۔ سرمایہ شے کے اداروں کو تولد و معاشی نشیون کی تیاری، ہمارا سرمایہ کاری کی تیاری کا کام سونپا گیا ہے۔

ان شعبوں میں زیادہ سرمایہ کاری فرہم ہوئی ہے۔ ساتھ ہی نئی شے کو فروغ بھی حاصل ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت کی طرف سے قائم کیے گئے مالی اداروں نے قرضے دے کر نئی شے کو ترقی کئے کے مواقع بنائے ہیں۔ ہندوستانی معیشت کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں نئی شے کا غلبہ ہو، سرکاری شے کو فروغ دینے سے کوئی ترقی مقصد پر راہ نہیں ہو سکتا۔

زمینی اصلاحات

زمینی اصلاحات کے سلسلے میں دلاؤں یا کچھ لیا کا نام ایک اہم کامیابی ہے۔ تاج محل کی ملکیت کے سلسلے میں اس کے خاتمے سے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ زمین تراسوں میں مالکوں کو معاوضے سے لے کر پر کافی زمین دی گئی۔ جس سے سابقہ مالکوں کی جائداد کی بہت سی بھی تبدیلی آئی۔ کرانے داری سے متعلق اقدامات، صدیقی اور فاضل زمین کی تعمیر وغیرہ سے متعلق دیگر اصلاحات کو بنیادی تبدیلی لائے بغیر ضروری طور پر عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ عمدہ بچوں اور بڑھاپا کے استعمال کا نتیجہ ہوا کہ زرعی محاذ پر زمین مالکوں کی دھاک چھٹ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زرعی علاقوں میں اعتبارات کے توازن پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ حکومت نے غریبوں اور مفلسوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے بھی متعدد اقدامات کیے ہیں۔ ہماری اقتصادی مشکلات کا حل یہی ہے کہ معیشت کو فروغ دے کے عین مطابق ڈھالا جائے۔ اس طرح کی معیشت میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کر کے روز دروزہ جانے گا۔ آئندہ حالت کی مساوی تقسیم کے لیے ایک طویل وقت درکار ہوگا۔ ہم نئی جائداد کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہم ابھی ایسے مرحلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں جہاں نجی جائداد کو ختم کر کے اسے اقتصادی نظام میں بہتری آ سکتی ہے۔

چھوٹے چھوٹے منصوبے

جیس اپنی معیشت اور منصوبہ سازی میں ایک

نئی خان ڈالنے کے لیے بڑے بڑے منصوبوں کے بجائے چھوٹے چھوٹے منصوبوں پر توجہ مرکوز کرنا ہوگا۔ بڑے منصوبوں میں بڑے پراجیکٹوں پر سرمایہ کاری کے لیے دور دراز جاتا ہے۔

اس طرح کی سرمایہ کاری سے موجودہ سہولیات اور کارخانوں سے بہتر طور پر فائدہ اٹھانے کی کوششوں پر اثر پڑتا ہے، نیز ان سے توجہ ہٹ سکتی ہے۔ اس سے موجودہ کارخانوں اور سہولیات سے فائدہ اٹھانے پر سرمایہ کاری سے سماجی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کو بڑھا دینے کے لیے ضروری ہے کہ چھوٹے چھوٹے منصوبے مرتب کیے جائیں۔

الغرض یہ کہ منصوبہ سازی عملی اقدام کی رہبر موبی چاہئے، تفتیش میں جو منصوبے تشکیل دیے جائیں، انہیں عمل جامہ پہنایا جائے۔ جو لوگ منصوبے کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں، وہی اس کی عمل درآمد کے بھی ذمہ دار ہونے چاہئیں۔ اس طرح ان لوگوں میں پروگراموں اور منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے کے عمل میں حصہ لینے کا موقع ملے گا۔

آؤ! اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر گہرے دلکھ ساتھ بڑھی جانے کی اور دو کے مشورستان سکندر علی وقار کا ۱۹۸۳ء کو اورنگ آباد میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ موصوفہ گزشتہ پچھڑے مہینے سے طویل علے آرہے تھے۔ ان کی پیدائش ۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء کو اورنگ آباد ضلع جالوسہ ضلع میں ہوئی تھی۔

موصوفہ نے ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں پائی۔ ۱۹۳۰ء میں مول سروس کا امتحان پاس کیا اور راج مظفر پور سے ۱۹۴۳ء میں سیشن جج کے عہدے سے استعفیائی سکندر علی حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں وقار مرحوم کو پیم نثری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں وہ راجہ سہا کے ممبر بنے ہوئے۔

غالب اور ڈاکٹر ڈیوش اور ڈاکڑی انعام یافتہ سکندر علی وقار کے چاندنی چھوٹے۔ مہوش نگ، طبع تازہ، اور ان مظفر اور ماضی میں شہر میں چھوٹے چھوٹے ادارہ آج کل کے بھنگان کے کھنڈی ہو کر شریک ہے۔

جہاں جاگے وہیں سویرا

کبھی مکان کی مدد حاصل دلو اور دیکھنا کہ میں کی انٹینس جانا
کھڑکی تھیں۔ کبھی کمروں اور دلوؤں کی بے رونق
کودیکھا اور کبھی دلوؤں کی کھونٹیوں پر لگی پرکے
ہوئے سیلے اور سویدہ کپڑوں پر نظر پڑی مانی۔ سال فوٹ
الماراں، زنجی کھڑکیاں، ٹنگے دروازے، ڈوٹی
کروالی کھڑکیوں پر رکھے دو تین ہانی کے گھڑے، ادھر
ہنگی کے ایک کزنے میں مریض کا ڈرہ عجیب نقشہ
تھا میرے گھر سنا رکا۔

شادی سے پہلے تو اس گھر کی یہ حالت نہیں تھی کہنا
ساتھ ساتھ انا مول تھا۔ تمام منظر میں تھا، مگر کسی قدر
نہانا۔ آواز دھڑا!

ایک مہینہ سی عورت ایک کمرے کے دروازے
سے باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کچھ سوچ کر آگے بڑھی۔
وہ مجھے جانتی تھی اور میں بھی اُسے خوب جانتا تھا۔
پرسوں سے ہم اسی گھر میں ساتھ ساتھ رہتے ہوئے
تھے، مگر اب ایسا لگتا تھا جیسے ہم دوڑوں ایک دوسرے
کی طرف رہی ضرورت میں نہ رہ گئے ہوں۔ یہ ...
یہ میری جیوتی تھی۔ میری شریک حیات شمیم۔
ابھی کے تھیں۔
جائز کا۔

کیا سوچ رہے ہو؟
شمیم سوچا تو اب اپنا مقدر نکلا
ہے۔ جی نہ چاہتے پر سوچوں کے خباثتے دل دوانا
کے قریب آجاتے ہیں۔ اڑھانے میں باجھٹ جاتے
ہیں۔

میں نے مصنوعی منہ ہنسی کرکھا۔
نگرہ میرے جواب پر مسکرائی کبھی نہیں۔
میرے دل میں ایک بوک سی اچھی۔ پہلے تو
وہ میری بات پر ہنس پڑتی تھی جیسے کوئی بچہ
پھیلنے کی چوٹی لگے ہو۔ اور جب وہ بھی کوئی
نیا چیلنج کرتی اور میں دھڑک کر اسے اپنی باتوں میں
سمیٹ لیتا تھا۔

شمیم! قرینیں آکھیا؟
میں نے بڑے اڑس پیسے میں پوچھا۔

وہ — مہینہ کیا۔
اور پھر اس کے چہرے نے جو اس پاس بیٹنگ
رہے تھے اسے آکر گھر لیا۔
دیکھا جائے تو موتی کا طرز کچھ غلط بھی تھا۔
مگر ہم انسان ہیں۔ انسانوں کا طرز انسانوں پر برزشت
نہیں کر سکتے۔ تو پھر یہ موتی کس کھیت کی مٹی کی تھی کہ یہ
آخر ایک جانور۔ ایک کنیا ہی تو تھی۔

اجاڑا، مگر میں ایک طرے کے ہوئے فرائے کے
درنگ پر سے میرا کھنڈن چلنے والا بڑھتا نیچے آکر گیا۔
بلنگ کی بچی آگ لگ کر نہیں آڑا۔ بکڑے میں سے اس کوئی
ہوئی تو اور پھر سے پھیل کر آکر گیا جہاں غلا ہو گیا تھا اور
فرائے کے ٹکڑے گاٹھوں کی دھڑ سے آپس میں جڑے
ہوئے تھے۔ جب کبھی موتی ادھر ادھر جا کر گھر میں
دایر آتی اور اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ جاتی تو میرا کھنڈن
چلنے والا بڑھتا نہاں نہیں جیسا کہ وہ ناگھنٹا بھٹتا موتی کے
پاس پہنچتا تھا اور اس سے اور اس کے پھیلے لگتا۔
موتی یہ سنے کو قریب آتا نہ کھڑک پڑنے جاؤں یا ڈنڈا پر
کھڑکی اور میں میں کرتے لگتی۔

میں آگے کے سر پہ ایک دھوا اور پھیل دی پر
کھینے سے نیک لگا کر دیکھا کچھ سوچ رہا تھا۔ سوچ کیا
سنا تھا ابھی بے ربط اور بے ٹنگ زندگی کے سامنے ہانے لگنے
کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ کبھی گھر کے اجاڑا آگے کو تو

گھر کی پالی ہوئی کھنڈا موتی خیمہ میں
صورت بنا کر اور نہ کہ کچھ عجیب و غریب آوازوں
نکال کر مجھے دیکھنے لگی تو اس کے طرز کو کچھ کر مجھے
ذرا مت ہی محسوس ہوئی اور کچھ غصہ بھی آیا۔
کہتے کھنڈا آخر دنیا ہی تو ہوئی ہے ٹھیک
ہے اُس نے اپنے پیٹ کے دوڑنے بہاں دیاں جا کر
بھر لیا، لیکن پھر مجھے آکر یہ جھلنے کی ضرورت
کیا پڑی اس کہیں کو کر دیکھ میں تو روٹی کھا آئی ہوں۔
تمہارے گھر میں نہیں ملی تو اپنا بواہ مگر مہینہ اور نہاں
یہ میری بچے اکثر ایک دست دو دست کی کھوک کاٹے
نظر آتے ہیں تو آخر اس کا کیا علاج؟

ادھر بڑے آئے انسی بن کر
اور سے لے کر بچی کو ایک جانور ہے جانور۔
انسانوں کے مسائل اور ان کی شکلات مجھے کیا معلوم،
اے کہنت تو جو مجھ پر پڑ کر رہی ہے نہ تو اتنا سمجھتی
نہیں سمجھتی تو خود ہماری ہی بات برادری کی مانتے
ہے۔ ہم ہی سے تیری زندگی ہے اور اے احسان
فراموشی، نہ شرم تو ہم پر ہی نظر پڑتی ہے۔

اور اس کے بچے سے ٹھٹھے کے تحت جب میں نے
موتی کو ایک لکڑی جھینک کر ماری تو وہ آنکھیں چلنے
دھم دھم کچھ مکرانی ہوئی سی اپنی ٹھٹھیوں میں دھیر دھیر
اپنے اطمینان سے جیسے کچھ رہا ہو۔

نہیں آیا۔ مجھے چلا گیا ہو گا اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ۔

امین کے بارے میں انہوں نے مجھے پڑے
سہرے خواب دکھلائے۔ کہنے لگے کہ تمہارے دلدادہ دوست

سوچ رہی ہوں کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔
اور غلطی کی جڑ کہاں ہے؟



دوار کا داس شعلہ

نے ملانہ کرلیہ پر یہ شکرمیں سے رکھی تھیں؟ ایک شکرم کا کرلیہ ۲۵ روپے ماہانہ تھا۔ اس کے لیے انہوں نے بہت بڑا اصلیل اور سامیوں کا حملہ لازم رکھا۔ غرض ان کا کردار بڑا متعوی اور صنعت بخش تھا اور انہوں نے اس سے بہت دولت کمائی۔ لالہ گوپال داس کی اولاد میں ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹے کا نام نرائن داس تھا جو ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ دوار کا داس شعلہ انہیں لالہ نرائن داس کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

لالہ نرائن داس کی کشتازی لاہور کے مشہور صاحب ثروت گل خانہ دار میں لالہ گوہند رام کی جھوٹی صاحب نادی لالہ دیوی (عزت نہال دیوی) سے ہوئی۔ ان سے بڑی ایک بہن بھی تھیں۔ لالہ گوہند رام کے اولاد نریتہ کوئی بھی نہیں تھی۔

لالہ نرائن داس تیس برس کے تھے کہ ان کے والد لالہ گوپال داس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت ان کے چچا لالہ شکر داس کے ذمہ ہو گئی۔ لیکن بد قسمتی سے وہ بھی زیادہ دن نہیں رہے۔ ان کی ۱۹۰۰ء میں وفات ہو گئی۔ نرائن داس اس وقت صرف گیارہ برس کے تھے۔ تندرنا اس کے بعد ان کا تعلیم کا سلسلہ منتقل ہو گیا۔ والدہ اور بیویوں نے انہیں سیکھ مول چند کی دکان پر ملازم رکھوا دیا۔ (سیکھ مول چند ہی ہیں، جن کا نام ہی دلی کے مشہور مول چند خیراتی رام اسپتال کا ایک ڈوبے)

لالہ نرائن داس کے اس بیوی سے چار بیٹے — دوار کا داس اور گنگا گوبند رائے، چرچائی لالہ — اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دوار کا داس شہر کے روز ۱۳ اگست ۱۹۱۰ء شام کے چوتھے بجے لاہور کے کوچ بھجیاں میں پیدا ہوئے جہاں ان دنوں خانانہ کی سکونت تھی۔

یہ تقریباً پانچ برس کے تھے کہ ۱۹۱۵ء میں مولوی منڈی کی مسجد راجھان میں مولوی صاحب کے پاس تعلیم کے لیے بھیج دیے گئے۔ جہاں وہ دو ڈھائی برس

مغربی پنجاب (پاکستان) کے ضلع گوجرانوالہ میں ایک مشہور ادارہ ترقی قصبہ امین آباد ہے۔ جہاں کسی زمانے میں ہندوؤں کی خامی آبادی تھی اور یہ سب لوگ معمول اور خوشحال تھے۔ ان میں تین چار گھرنے کو چھڑ، ڈگل، نندا وغیرہ بہت نمایاں تھے۔ ان خاندانوں کے افراد باہم دم دیوان کے لقب سے پکارے جاتے تھے کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کے بزرگوں میں سے کوئی نہ کوئی کسی زمانے میں ریاست کشمیر میں دیوان (وزیر) کے عہدے پر فائز ہو چکا تھا۔ دوار کا داس شعلہ ان میں سے کوئی خاندان کے چتر و چراغ تھے۔

انیسویں صدی میں خاص طور پر ہمارے رجحیت منگو کی وفات (لاہور: ۲۰ جون ۱۸۳۹ء) کے بعد پنجاب کی سیاسی حالت میں عجیب بحران پیدا ہو گیا تھا، کچھ نراج کی کسی کیفیت تھی۔ چھوٹے قصبوں اور گانو کی رہائش بہت حد تک غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں حالات سے مجبور ہو کر کوئی خاندان کے لالہ رام داس اپنی جمع تھا میٹ کر امین آباد سے نکل مکان کر کے لاہور چلے آئے۔ یہ لالہ رام داس کو چھڑ ہی دوار کا داس شعلہ کے پردادا تھے۔

لالہ رام داس کے دو بیٹے ہوئے لالہ شکر داس اور لالہ گوپال داس۔ لالہ شکر داس گھر بھر تھوڑے۔ انہوں نے شادی اور بیوی بچوں کا کھڑاگ بالا ہی نہیں۔ لالہ گوپال داس بڑے کن بان کے آدمی تھے۔ اپنے معمول کے باعث وہ اپنے عرفت پال شاہ سے زیادہ معروف تھے۔ انہوں نے لاہور کا کرکباڑی کا (خود فروشی) کا کاروبار بڑے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ وہ علم و باہن دوایں جانے والے انگریزوں کے گھر کا سارا سامان ادا دے دینے والوں پر خرید لیتے۔ اور پھر اسے معقول قیمت پر بیچ دیتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بیس شکریں کھانے تیار کرائیں۔ یہ کرلے پر چھٹی تھیں۔ بعض ہندوستانی اور بدلتی بڑی

تک ہے۔ اس دوران میں انہوں نے کچھ اردو اور مولوی فارسی پڑھی۔ ان دنوں مسعودوں کے مکاتیب کا بھی نصاب تھا۔ طالب علم اگر تختی کی مشق کر لیتا اور صرف تہجی کھینچنے کے بعد ابتدائی نصاب کے لئے منزل کے لئے گزر جاتا تو خیال کیا جاتا تھا کہ وہ اردو پڑھ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فارسی شروع ہو جاتی تھی اور اس کی کتب المثل شیخ حسدی کی گفستان سے ہوتی تھی۔ پورے نصاب کا مجموعہ چار برس میں مکمل ہوتا تھا۔ دوا کا داس ابھی ابتدائی مرحلے پر تھے کہ ۱۹۱۸ء میں لالہ نرائن داس کسی بات پر اپنی والدہ سے لڑکر انکلی میں آکھڑے۔ یہاں بھی مکان پر آتا تھا اور وہاں رہتے ہیں کسی قسم کی تعلیم یا دشواری نہیں تھی۔ انا نکلی میں آنے سے پہلے ہی ان کی طبیعت تعلیم پر مائل تھی اور انہیں پورے اسکول میں صبح و شام تھا، لیکن وہ اس اسکول میں دینی نہیں پڑھتے تھے۔ ان کے خاندان انکلی میں آگیا۔

اب ان کا انگریزی دوسرا جانی اسکول میں داخلہ ہوا۔ اسکول مسعود کے رہنے والے ایک مسئول سسٹی دوران باسل نے قائم کیا تھا، انہیں انگریزی حکومت کی طرف سے دیوان بہادر کا خطاب بھی ملا، اور اسکول انہیں کے نام پر دیوان باسل دیو ساج ہائی اسکول کہلا گیا تھا۔

دوا کا داس نے تعلیمی اور مذہب میں پڑھی تھی، ان کا اطمینان لینے پر بڑے ہوا کہ اس کا مصلحہ چرتے رہے تک کا ہے، لہذا انہیں باپ بچوں پر دے جسے داخلہ مل گیا۔ فارسی نیز شروع ہوئی۔ انگریزی کو قریباً معین ہوتا تھا۔ ہونے کو داخلہ ہو گیا لیکن ان کے والد لالہ نرائن داس کو دیو ساج اسکول کی تعارف پسند نہیں تھی، تفصیل میں جانے کا یہ عمل نہیں، لیکن آنا کہ دینے میں بھی کوئی مصافحہ نہیں کہ دیو ساج اپنے معتقدات کے لحاظ سے تقریباً دوسرے ہیں۔ لالہ نرائن داس کو سبھی طور پر لڑنے سے تھا کہ اگر زیادہ دن اس ماحول میں رہا تو ناسک ہو جائے گا۔ آٹھویں درجے تک تو انہیں بول بول برداشت کیا۔ اس کے بعد انہوں نے دوا کا داس کو سینٹرل مڈل اسکول بھیج دیا۔ یہ سرکاری اسکول تھا اور اس زمانے میں اس کا لاہور کے بہترین اسکولوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے۔

دوا کا داس سینٹرل مڈل اسکول میں دوسری تعلیم پائی۔ ابھی دسویں کا اطمینان نہیں ہوا تھا کہ ۱۹ جون ۱۹۲۵ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بھٹوئے دن بعد یہ والدہ کے بچپن کے گھر پر دوبارہ گئے۔ وہاں پر چھ ماہوں پر غلغلہ کر داس پور چلے گئے۔ وہاں ان کے بچہ خاتون کے گھر کے گرد باؤلال کا گھروا سک رہا۔ یہ وہی باؤلال ہیں، جن کے حالات و حالات کے ساتھ مشہور رومنوف ہیں۔ داراشکوہ نے اس سے جو گفتگو کی تھی وہ قلمبند کر لی گئی تھی۔ میں نے ان کا کتبہ نسخہ (فارسی) دیکھا ہے۔ غالباً یہی ہوئی کتاب بھی موجود ہے۔

توفیر دوا کا داس اپنی والدہ کی امتحان نگاہ میں بہا کر دھواں پور چلے گئے۔ وہاں جیسا کہ گھر سے زیادہ رہے۔ ان کی غیر ملانی میں ہی لالہ نرائن داس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس دوسری بوی سوشیلا دے سے ان کے تین لڑکے

آج کل دی

(علی لال، لالہ کمار، علیان داس) اولیاد کرلی ہوئی۔ اس کے بعد دوا کا داس کی تعلیم سلسلہ ہو گیا۔

اس دوران میں لالہ نرائن داس نے دواؤں کی دکان کھولی تھی۔ اس کی ابتدا بہت عمومی عیار پر ہوئی تھی۔ لیدر اسپتال میں ایک ڈیپارٹمنٹ ڈسٹریکٹ Demonstrator تھے لالہ نرائن داس۔ وہیں ڈاکٹر اللہ ہوا بھی تھے۔ دواؤں نے نرائن داس صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر آپ دواؤں کی دکان قائم کر دیں تو یہ بہت نفع آدے گا وہاں ہوگا۔ اس پر انہوں نے (غایہ دھائی سو کے) معمولی سرمائے سے اکبری منڈی میں ایک دکان جاری کر دی۔ یہ دکان کلام کی کتب پر غور کیا گیا تو وہ لوہاری دروازے میں آکھڑے اور بالآخر انکلی میں اپنی عمارت میں منتقل ہو گئے۔ یہاں شاید بے زر کے علم بھی ہوگا کہ ۱۹۱۰ء میں اس انکلی والی دکان میں آگ لگ گئی اور عمارت بل کر ڈھیر ہو گئی تھی۔ جو عمارت ہم سے بعض ترے دیکھی ہوگی وہ اس کے بعد تعمیر ہوئی تھی۔ اس پر اس وقت تو بے زرق و برق آیا تھا۔ جو اس زمانے میں واقعی بڑی رقم تھی۔

۱۹۱۳ء میں پہلی جنگ عظیم ختم ہو گئی اور ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی۔ دکان نے ان چار برسوں میں بہت ترقی کی۔ اس کا سرمایہ بڑھا اور اس کی قربت میں اضافہ ہوا۔ دوا کا داس کی تعلیم ختم ہو گئی ۱۹۲۵ء کے اوائل میں والد نے حکم دیا کہ اب دکان پر کام کر۔ طالب علمی کے زمانے میں پانچ روپے مہینہ جیب خرچ ملتا تھا، اب دس روپے خواہ مخواہ ہوئی۔

لالہ نرائن داس بڑے ضابطے اور اصول کے آدمی تھے۔ انہوں نے خیال کیا کہ کل کو دوا کا داس اس پورے کاروبار کا مالک بننے والا ہے، اسے معلوم ہوتا چاہیے کہ یہاں کیا کام کیا ہو تب سے اور درپور کیسر طر کر گیا جاتا ہے، ناکارے طرزوں سے بھی بددروزی ہو، اور روپے کی کمی قدر۔ چنانچہ پہلے دن جب یہ دکان پہنچے تو حکم ہوا کہ اسے دکان کے فرش اور پتھر (ویز، کرسی) کی صفائی مہیا کر دئے۔ یہ سمجھنے کے کہ اس مالک دکان کا بیٹا اندر پہنچ کر ہی کام کیا! اجتماع کیا تو والد نے کہا کہ مجھے تو یہ کام کرنے میں کوئی عار نہیں، بہر حال کام میرا ہوتا ہے۔ اور اسے ٹھیک اور صاف رکھنا میرا فرض بھی ہے اور میرے لیے عقیدہ بھی۔ کیا کرے؟ حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ بندہ بھرہوہا قلمی کے شے میں تبادلوں ہو گیا جہاں شیشیاں دھوئے ان کی خدمت پر ہوئی۔ غرض ہاں تک مختلف شہیوں میں کام کرتے ہیں کوئی مالی عہدہ کا دفتر نہ پڑا گئے۔ اور ان کا عہدہ شاپ اسسٹنٹ ہو گیا۔

تخواہ وہی دس روپے ماہانہ رہی۔

نرائن داس صاحب بڑے تجربہ کار اور دم شناس آدمی تھے۔ منشا کیا کرتے تھے کہ گاہک اگر اگر تجربہ سے فیجہ پسند آجائے پھر وہ مانگے دام اور لے گا۔ مسلمان مانگے دام نہ گویا دس پلا جائے گا۔ بندہ خواہی چاہے کہ گاہک نے یہ منشا کیا چیز کے دام میں لے لے، اس کا حق ہے کہ وہ ٹھیک اور تازہ دوا لے رہے۔ یہ اسی کا

تھوڑا سا کہ وہ ۳۱ مارچ کو ڈیپٹی سیکریٹری خالی کر دیتے تھے، سب پرانی دوایں ضائع کر دی جاتی تھیں اور نیا شاک ان کی جگہ لگا دیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ دو دار کا ایک نوٹس دیا گیا کہ اگر کبھی کوئی دو دار مفت دو دو قیمت مفت دو۔ لہذا اگر کسی کو مفت دینا چاہو تو سوچئے کچھ کر کیوں کر؟ سہ تھا نا بہت مشکل ہے۔

دو دار کا داس کی ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو سٹریٹ دی ہوئی۔ ان کی بیوی کا نام وردیا ہوئی تھا اور وہ لالہ رام ناتھ نندا لاہوری، ائمہ اہل آبادی کی صاحبزادی تھیں۔ اس شادی سے متعلق کبھی ایک لطیفہ ہے۔

یہ شادی دراصل دو دار کا داس کی بیواہیں ت۔ بھی بیٹے ہو چکے تھے۔ لالہ رام ناتھ نندا نہ وہ خاندان بھی اسی اہل آراء سے تہجرت کر کے لاہور آیا تھا، جلالہ نرائن کا معضلہ لالہ رام تھا۔ دونوں میں گہرا رشتہ تھا۔ دونوں کی بیویاں — لالہ دیوی اور لالہ رام کی بیوی سوہن دیوی — بھی میں پہنچا تھا، دونوں کی شادی بھی قریب قریب ایک ہی دہائی میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی محبت اور اخلاص کو اور اس قدر نکالنے کی خاطر جہد کر لیا کہ اگر ایک کے لڑکا ہو، اور دوسری کے لڑکی تو دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ لالہ دیوی کے پہلے لڑکا ہوئی۔ جو دو تین برس بعد فوت ہوئی۔ اس کے بعد دو دار کا داس پیدا ہوئے — سوہن دیوی کے پہلے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ان کا تیسرا بچہ بھی بیٹی (یعنی دو دار دی) تھی۔ بات تو مرقوں پہلے سے ہو چکی تھی، نسبت برکتی۔ اور اب شادی کی رسم ۱۹۲۹ء میں پوری کی گئی۔

فروری ۱۹۳۲ء کو ان کے پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ نرملہ نام رکھا گیا۔ اس کے دو سال بعد چوتھی بیٹی جو دو دار دی کی پوجا ہوئی۔ اس کے بعد کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

شادی تک انہیں دو داران سے دس روپیہ شاہروہ ملتا تھا۔ شادی کے بعد لالہ نرائن داس نے بیوی کے جیب خرچہ کے لیے پانچ روپیہ ماہانہ اضافہ کر دیا۔ نرملہ پیدا ہوئی تو پانچ روپے اس کے لیے بھی مقرر ہو گئے، یعنی کلیم میں روپے ماہانہ ۱۹۲۴ء میں دو دار کا داس نے مطالبہ کیا کہ بیشک کھانا پیتا گھر پر ہوں، لیکن اتنے میں گزارہ مشکل ہے یا اس میں صحت۔ اضافہ ہونا چاہیے۔ اس پر صحتی کی گفت و شنید کے بعد، روپے کر دیے گئے۔

لالہ نرائن داس کا ۵ جولائی ۱۹۲۹ء کو انتقال ہو گیا۔ صرف ۵۰ برس کی عمر پائی۔ انہوں نے اپنے چچے خاصا پڑا کتبہ چھڑا — سات بیٹے اور تین بیٹیاں — اور بالفاظ لاکھوں کی مقبول اور غیر مقبول جائداد۔ ان کی انگریزی دواؤں کی فرم (نرائن داس، سمکھوان داس کیسٹ انارکلی) لاہور کی اس نوع کی چوٹی کی دو تین فرموں میں شمار ہوتی تھی۔ یہ فرم ۲۰-۲۵ انگریزی اور یورپی دوا سار کیپٹوں کی مول اکچونٹ اور قلم کا بیعتی — عرض بہت بڑا اور باریک تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ ساکھ۔ اس پر ان کی وفات کے

دو بیٹے کے بعد دوسری عالمی جنگ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو چھوٹ گئی، جس سے ولایتی دواؤں کی قیمتیں اس سال سے تائیں گرنے لگیں۔ ایک ایک کے تین تین بچہ پانچ پانچ ہو گئے۔

اس دوران میں دو دار کا داس نے فرم کی دو شاخیں کراچی اور دہلی میں قائم کر دیں۔ ۱۹۴۴ء میں آزادی آئی اور اسی کے ساتھ ملک بھی تقسیم ہو گیا۔ پورے خاندان کو لاہور چھوڑنا پڑا۔ خوش قسمتی سے دہلی کا ٹھکانا موجود تھا۔ کچھ خاندانی سب کو یہاں سر بھیلائے لیے جگہ مل گئی اور پوری نہ سہی آدھی کا سالانہ بھی بنایا ہو گیا۔

لیکن دہلی میں کمزور دو دار و دروہہ رشتہ خطا ہونے لگا۔ حتیٰ کہ یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو کچھ عموں میں تقسیم ہو گئی۔ دو دار کا داس نے فرم میں صاحبزادی کے حوالے کر دی اور خیر دیا ایک دو داران نرائن داس اینڈ کمپنی کے نام سے گولڈن روڈ قریب بانٹن کھول لی۔ لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی اور بالآخر ۵ جولائی ۱۹۴۶ء میں اسے فروخت کرنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی کام نہیں کیا۔

رفتہ رفتہ ان کی مالی حالت بہتر نہیں ہوئی۔ ان کی تربیت میں ماحول میں ہوئی تھی اور زندگی کا بڑا حصہ حدیث و عشرت اور اسراف سے انہوں نے بسر کیا تھا۔ اس کے پیش نظر ان کے پرانے، ملے واسلے لڑکانے آخری ایام کی حالت دیکھتے تو انہیں نہ صرف دکھ ہوتا بلکہ عرت حاصل ہوتی۔

موت پر سردسورے ۱۳ مئی ۱۹۸۱ء کو ان کا ایک ان کی بیوی کا بھائی تاجب انتقال ہو گیا۔ اب وہ بائیں تنہا رہ گئے۔ ان کی بیوی کی تعریف میں کی جا سکتی۔ یہ واقع ہے کہ ایسی لمبہ کردار خاتون کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ دیر گھر کی مٹی تھیں۔ شادی کے بعد سسرال آئیں تو یہاں بھی مائتار لاندہ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ساری عمر آرام و آسائش بلکہ عیش و عشرت کے سوانہ کو نہ دیکھا۔ لیکن جب دو دار کا داس یاد آ رہا تو انہیں سسرال کے ڈیرہ ڈال دیا تو اس نیک خاتون نے غمناک ایک حرف زبان سے نہیں نکالا۔ ان کے ساتھ شانہ نشینہ حالات کا مقابلہ کیا۔ جو روکھی سوکھی میسر آگئی، صوبہ کیسے اہل پر گزرا کر لیا۔ مجھے کم و بیش ۲۰ برس تک انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کیسی نیک اور سکون۔ کم سخن اور عظمت کا گوشہ اور اولاد پر جان بچنے والی خاتون تھیں وہاں جب تک وہ زندہ تھیں، دو دار کا داس گھر کی کھری داں پر ابھر کے مہدیان، ان کے حاسن سے واقف ہی نہیں ہوئے۔ جب وہ نہ رہیں تو اب انہیں معلوم ہو گیا کہ کتنی بڑی نعمت ہاتھ سے جاتی رہی۔ ان کے گرنے کے بعد جب ان کا خزانہ لے اور یہ اکثر بھانپتا تھا تو انہیں ڈنڈا آئیں اور آواز بھرا جاتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد انہیں زندگی سے بہت کم دل چسپی رہی تھی۔ اور وہ اکثر اپنی موت کا ذکر کرتے گئے۔ زندگی آخری آٹھ سات بیٹے دہ لڑایا کا فغان بھری گویا کتنی مٹی نرملہ کے ساتھ ہے۔ وہیں انوار مارچ ۱۹۸۳ء کے

اولین وصفتیں کے علم میں) دل کا شدید درد پڑا اور وہ چند منٹوں میں جا بقیں ہو گئے۔ طبی امداد کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ منزل مقصود پہنچ چکے تھے۔ اسی دن گیارہ بجے کے قریب اس کی آخری اور ان کے جسم غائی کو گھر کے پاس ہی لنگ روڈ کے شمسان میں سپرد ارض کر دیا گیا۔ (آٹا ٹیڈر کا تالیر راجپوت)۔

بڑی محنت ترسے بیمار کو فوت آجائے سے اب آرام ہے

لالہ نرائن داس کی تعلیم تو زیادہ نہیں تھی، لیکن ان کا اپنی ذوق مستحضر تھا۔ وہ شعر کہے اور اشعار تخلیق کرتے تھے۔ ان کی پسندیدہ چیزوں میں بھی گھر پر موجود تھیں۔ وہ ذوق نسبت کمزور تھے اور لہذا ان ذوق بالعموم ان کے مطالعے میں رہتا تھا۔ ان کا دو محبوب شاعر قطب کبریا اور دہا تھا۔ دوار کا داس کی ابتدائی تعلیم مولوی صاحب کی نگرانی میں اردو سے شروع ہوئی۔ جب انہیں شعور حاصل ہوا۔ اور انہوں نے گھر میں اپنے ارد گرد دیکھا، دیکھیں تو ندرت پر ان کے دل میں مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ لاہور میں ہے۔ ایس۔ سنت گھو پرانے کتب فروش تھے۔ یہاں مطبع نوکشمی کی مطبوعات کی کچھ بھی انہیں کے پاس تھی۔ گھر میں کتابوں کا جو مختصر ذخیرہ تھا وہ جلد ہی ختم ہو گیا تو اب دوار کا داس نے ہے۔ ایس۔ سنت گھو کی دوکان کا لڑکا کیا اور ان کے ہاں سے اپنی ابتدائی کتب خرید لے گئے۔ ان کی مطالعہ کی عادت ازخمس قائم رہی اور حقیقت ہے کہ مسلسل اور بڑی مطالعہ سے انہیں اردو کے کلاسیکی ادب پر اچھی دتس حاصل ہو گئی تھی۔

مطالعے کے بعد اعلیٰ اہل علم کا قدم ثناء کی کا تھا۔ ان کی عمر شعل سے ۱۲-۱۳ کی ہو گئی کہ وہ شعر کہنے لگے تھے۔ اب زمانے کے رواج کے مطابق کئی کوٹا دینا کلابہ ظہر۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اکثر گیس کے ملبوں میں اپنی فنی تخلیق پڑھنے کے باعث ڈال چڑھتے تھے۔ یہ وہی فلک ہیں جن کا یہ نعرہ قریباً ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

تو بھی بول فلک کو زانہ بول گیا
فلک کا ۲۱ مارچ ۱۹۹۷ء کو زانہ میں انتقال ہوا۔

دوار کا داس کھوسا دلی قدرت میں بھی ہوئی تو وہ فلک صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ میرے کلام پر اصلاح دیں تا مگر فرمایاں۔ فلک صاحب اپنی ضروریات کے لیے بھیجیں ان کی دوکان پر کیا جاتا کرتے تھے، اس لیے دونوں پہلے سے ایک دوسرے کی صحبت آشنا تھے۔ فلک صاحب کی ساری عمر عسرت اور اذلاک میں بسر ہوئی اور ستم یہ کہ وہ اس کے لیے وہ اپنی شاعری کو زمرہ دار کر دیتے تھے۔ دوار کا داس نے اپنا حیران کیا تو فلک صاحب نے جواب دیا کہ بخیر خود اشعار کہنا چھوڑ دو۔ یہ بہت سوس میسر ہے۔ اس پر دوار کا داس نے جھوٹے ہنسی پر جواب دیا کہ خود کو شعر کہتے ہیں؟ اس پر فلک نے کہا کہ تم بھی تو میرا ترسے سنا ہے کہ برباد اور

آج کی نئی دل

پریشان حال ہوں۔ قصہ کو تھابت میں میں نے کتبک صاحب کے خط پر جواب دیا کہ میں تمہارے کلام پر اصلاح کی ذمہ داری اس شرط پر قبول کر سکتا ہوں کہ اپنے والد لالہ نرائن داس سے کھراؤ کر انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لالہ نرائن داس کو دوار کا داس کی شاعری کی اس نگرانی کی بھی اور وہ اس کی بھی کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ اس صورت میں کھانا ملک صاحب کی شاعری کرنے کا ایک امکان تھا! اس سے قریب نہیں آسان تھا کہ کوئی اور اس تنازعہ میں لکھو لے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور میں، بلکہ پورے پنجاب میں حفظہ عالمگیری (ف) اور مولوی کاظمی بولتا تھا۔ ان کے گفتگو سے آگ لگ گئی تھی چڑھتوں کو انہیں لگتا ہے تھے۔ اس پر ان کا ترمیم ایسا دل کش کوئی ہے انہیں مناسبت دینے لگا۔ ان کے ایک شاگرد تھے پندرہ بری چند اختر جو لکھنؤ کی بہت مشہور ہوتے، وہ دوار کا داس کے سنے دیتے تھے۔ انہیں جب ملک سے باہر ہوئی تو ایک دن اپنی مشکل کا بیان چند اختر سے کر دیا۔ اختر انہیں ساتھ سے کہ خطبہ کی خدمت میں بھیجے گئے اور اقرار ہوا کہ ان کا شاگرد بنادیا۔

۱۹۶۶ء میں میرزا ادا علی حسین یاس علیہ السلام آبادی نہ لکھنؤ میں میرزا ناگہی جگر (ف) شب ۳/۴ فروری ۱۹۵۶ء) مولانا قیوم علی آبادی کی دعوت پر لاہور ناشرین کتب عظیمہ چند پرائیڈ منٹر کے قائم کردہ اردو کتب خانہ میں گئے۔ لاہور آئے۔ اسی زمانے میں دوار کا داس ان کے سے تعلقات پیدا ہو گئے جو بعد میں بہت یکساں تھے اور دونوں میں تبدیلی ہو گئی۔ دوار کا داس اگرچہ ناگزیر و قحطی کے لیے لیکن اس کے بعد وہ کبھی بھی لگا نہ کسی شاعر کی جیسے تھے۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ فرام نرائن داس کی جگہ ان کے کرتا دھرتیاں گئے؛ اب بہت روپیہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اس زمانے میں انہیں بہت ایڑوں، شاعروں کی سرپرستی کی۔ جوئے، قرآن، مجر، حجاز وغیرہ ان کے خاص تعلقات تھے۔ یہ اصحاب جب لاہور سے تو باہر گئے تھے انہیں کے ہاں تھے۔ کچھ لوگوں نے ان سے انما ترنوا نہ بھی حاصل کیے لیکن ان کی انفرادیت ہے۔

۱۹۵۷ء میں عظیم ملک کے بعد وہ دلی منتقل ہو گئے۔ اب وہ پہلی ہی لاہور والی بات تو نہ رہی تاہم غرض کے جیڑ پر یہاں بھی ان کا گروہ بول کر نہ مارا۔ دفعہ مالی حالت کو زبردستی گئی اور ان اصحاب کا آتما نا بھی کم ہوا چلا گیا۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ کو نور پور پبلشرنگ پریس میں چھپ کر اگست ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا اس کے علاوہ ایک شاعری کتاب تیسے مرشد شاعر ہوئی ہے۔ اس میں حضرت بالال اور اس سنے کا ذکر ہے۔

ان کے اپنے زمانے کی ملی اپنی شخصیتوں سے متعلق مضامین بہت اہم اور دلچسپ ہیں۔ یہ دراصل اس مہنگی ادبی تاریخ کا حصہ ہیں۔ دوار کا داس کی بڑا نظم جو تا بہت سلیس اور نکلنے ہے اور اس میں ملی امرا کی چاشنی اس قدر ہے بہت کلام پر ملبور رہ گیا۔ اس میں اس کی جڑیں صوفیہ قابل ذکر ہیں۔

میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کہہ کر وہ نکلا۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

آدمی نے کہا کہ نکلا، جو کبھی تک مجھے جاننا ہے کہ اسے پہلے تم نے آؤ، تو تمہیں فرماؤ

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

اب اس شخص کی طرف سے کوئی بھی شے نہ آئی۔ لیکن ان کی خدا کو یاد رہی ہے۔

بقیہ : جہاں جاگے وہیں میرا

اس کے سینے میں دل بدلتا رہا، میرا گھٹا ادا سمجھوں میں، ہنسنا کی کھنکھاہٹ ہو گئی تھی۔ اب وہ ڈکڑے دو کی باتیں کر کرکٹ دھکے دھکے جاتا تھا۔ میری جوتھوڑے دیکھ کر وہ بے ساختہ روڑی، میری چھاتی سے پٹ گئی۔ روئے گی امدیں زندہ ہوئی اور اس کے لئے سنی نہ لگا۔ یہ ملاقات سناتوڑی سے ملنے نے رہے، مگر اب تو یہ اپنے ملنے کی حالت میں کھو چکے تھے اور صرف تصور رائی میں گئے تھے۔

شادی سے قبل دانشمند دوستوں نے مجھے سیکرولیں پچھلے دانشمند شورشیں سعدی کا ایک فانی شعر سنا دیا تھا۔

خواہی کہ شوی حلال روزی

مکن درخانہ عیال بسیار

یعنی اگر تو حلال روزی چاہتا ہے تو اپنے گھر میں اولاد زیادہ پیدا کر۔ مگر جس وقت میں نے یہ شعر سنا تھا، اس کے معنی درمطلب کو سمجھ کر بھی جاساں مارا دیا تھا۔ اور نہایت غیر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اب پچھانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔

خبر ارادی طور پر نیم سیر سے پہلے میں رہی تھی، اس کے نامراد باپوں نظر کے اس کا سر میرے کان سے کان تک لگا۔

اتنے میں ایک بی بیڑوں کے گھر میں سے پورا پورے ہمارے مائے سے گزری۔ موتی نے اسے دیکھا اور کھینچی جوتھا تیری سے اس کی طرف لپکی۔ اس کے تھام پنے ایک دم گر پڑا گئے۔ میرا سنا کر گدا اور نہ لگا۔ مرفواں جیتی جوتی ادھر ادھر دوڑ گئیں۔ بی بی ایک بٹ کر ہماری سمت سے باہر کی طرف بھاگی گئی، ہم ہمارے پاس سے دوڑی جوتی گزری۔ وہ اس قدر تیزی سے گزری کہ میرا نواز ن بگولگا اور ہم کے ساتھ ہی زمین پر پھسل گیا۔

میری ہنسنے لگی۔ دیکھا تو بنگ پے کر گیا تھا۔ اتنے میں میری اتنی دھ دھنوں کرے میں آ گئیں۔

اسے یہ یہ بنگ کے نیچے بیٹھا ایک کہا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاتھ ہلا رہے، انہیں گھر والے کھنکی کی بات جیت کر نے کہے ہیں کہ کچھ شہتہ دار تجھے دیکھا بھی جا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گئی۔

تو تو یہ خواب تھا یعنی کچھ دانشمندوں کے قتل کو دیکھنے کا موقع زندگی بھر کے یہ نصیب تھا اسے فرشتے کے میں نے ایک لمبہ سنا دیا۔

یا جو یا جو یا جو

کٹ جانے پر وہ بھی میں شاید فیصلہ لیں

مجھے خبر ہو چکر ہے میں انکو اسے خدا! مجھے دیتا

چمکاؤ اگر کو کیا کروں، اعلیٰ ہیز اگر کب کروں

کچھ کر لیا ہے مہتمم ہم نے

ساتھ جب کسی کا نام ہم نے

ہیں ایک دن ڈوب جانا ہی تھا

ترسے ہاتھ سے ڈور تھامے ہر ایک

مجھے میرے دل سے ڈوبنا ہو گیا

ہاں یہ دیکھ رہے تھے مجھے ہے ایمان کی باتیں بھی

میں تو ایک صاحب دینے والے بھی آتے ہیں

حق دہی جان و دستان شہد

ہاں وہ ایک بات جوتی نہ گئی

غیب غلو کا عالم ہے دیر کب میں

کو اہل عرف بہاں بھی نہیں، وہاں بھی نہیں

اگر کوئی کبھی ناساں قہم دوروں

میں بے زان ہوں، مگر ایسا بے ناک بھی نہیں

یہ وضع حق ہے یا شہد، شامتا حال

کو نہ رہاں اسے کچھ، جو مہرباں بھی نہیں

ان کو جادے سے قلعے ہے ذہنزل کا نیز

جن کو کھنچی نہ گئی حزم سفر کی تو تسبیح

بے جا رہے غلو ہے، بہت بے قرار ہے

ایر سہاہ و باد و صاف دوساں گشت

جان بہار! اب ترسے آنے کی دیر ہے

آپ تو کہتے تھے، یہ انعام ہے

سکون کی کچھ کوئی صحت نہ کر سکے پیدا

جو نامراد تری جلوہ گاہ سے نکلے

چھوٹی سی بات ہے کہ میں تم سے تھی

ہم اس کو کیا بڑھائیں ہم انشا کو کون کریں

شہد! حوالے ہم کو کم جادواں دیا

یہ کہہ دیا تو شکر خدا کا نہ کیوں کریں

نہ تو ایک دن تو آنا گشت

ننگا کیوں خواب ہو کے رہی!



مولانا امتیاز علی خاں عرشی رام پوری

زمین میں اوبائے کرام کو بے نیاز دانا موت ہیں۔ اور اپنی فطرت سے بلند پرواز اور خود بسیر کرنے لگے ہیں اور میری تشنگی علم و آگہی کا سامان ہے۔ مولانا عرشی کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایک عظیم شخص تھے اور ان کے فرمودے اور تحریریں پس پشت کتنی محنت و دہ ریزی پر مبنی تھیں اور ان کے صرف ہوتی تھیں۔ میں کیونکر جانوں کہ میں اس میدان کا کھڑا نہیں۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ باہر غفلت و غیبت و جو جو لکھا کر پکڑنے اور بندہ فوازی ان کے کردار کا غالب عنصر تھی۔ انتہائی خلص تھے اور شگفتہ مزاج و شگفتہ گفتار و شگفتہ نویس۔ بڑے باخ و سار قسم کے بزرگ جس میں میں محض اُن کی جینین مرکزی ہوتی۔

مجھ پر مہربان تھے اور اکثر نکتہ ہائے دانش سے نوازتے مردم شناسی کا کلام کر رہا ہوتا اور دیکھتے کہ اس نکتے کی طرف سے کچھ افد کرنے کی صلاحیت تو ہے نہیں۔ اپنا وقت اور علم و دانش کیوں برباد کروں اگر وہ خود شہید جانتا ہے کہ مثال تھے۔ کوئی نور کا مستقیم پوچھنا ہو اس طرح سب کی سب کی روشنی پہنچاتا ہے۔

وہ اکثر دہلی آتے، جب بھی آتے، ملاقات سے ضرور نوازتے، دکان پر خود آتے، قانون کر کے اٹھ جاتے، قیام پر پورا لیتے، گھر پر بھی گئی مرتبہ آئے۔ بہر کیفیت جہاں بھی تھے شہر میں مفضل رہیں سکین بخش واسودہ کو منتخب اور اشتیاس دوست اکثر ان کے جلو میں ہوتے۔ کیونکہ سب کے سب شاعر ادیب اور ارباب فن ہوتے۔ (ان میں مجھے بھی ضرورت مل کر لیجئے کہ ہم بھی ہیں یا نہیں) سواروں میں سے صداقت میں بھی شامل ہوتا۔ کہ ہندی کا کاندازہ پستی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ ہندی کی وقعت اور حیثیت ہی ہستی کے دم اور اس کی نسبت سے ہے۔ ان کے گرد بارانِ کارا لگا لگا حلقہ گویا نور کا ہوتا۔ ان کے مابین گفتگو گل افشانہ گفتار کی بندیوں کو چھوٹی۔ پتے کی ہیں دانائی

۱۹۶۲ میں میں نے متاثرین صاحب سے کہا کہ اپنے اپنی سے متعلق اہم حالات اور واقعات آگاہ فرمائیں۔ جی چاہتا ہے میں آپ سے متعلق کچھ لکھوں۔ فرمایا ”گفتی درج کرنا ہے اور سب ناگفتی“ میں نے کہا ”پھر گزرتی ہی مرمت فرمادیجئے۔“ کہا ”کراتی پہنچ کر بھجوا دوں گا۔“ وہ اُن دنوں حکومت پاکستان میں فنانس سیکریٹری تھے، یا پیشل بنک آف پاکستان کے مہتمم اعلیٰ ترین۔ غالباً وہ بھول گئے یا شاید انھیں سیرمی حقائق اور مسائل کا مختصر مختصر مذاہن سے فرمایا بغرض معاملہ اس درجہ لگا کہ اس دوران میں انتقال ہو گیا اور آخر مجھے اس گزرتی کا سبب ایسا ہی جو میرے ساتھ کا دول میں محفوظ تھا۔ مولانا عرشی مردم کا معاملہ بھی بکرا ایسا ہی سے کہ اندر عرشی، میں ان سے متعلق ہر گزشتہ تفصیل موجود ہے اور گفتنی غنا۔ میرے ان کے تعلقات تو نہایت بکا نکت کے مگر اس قدر کہ اُن کے غریبی معاملات کی کہہ کرنا۔ یوں بھی مجھے دوست کی دوستی سے غرض ہوتی ہے اور اس کے نجی ذاتی، دفتری یا کاروباری معاملوں کو ٹوٹا غیر ضروری سمجھتا ہوں بلکہ فضل در معقولات۔ جیسا کہ میں نے مالک رام صاحب سے متعلق مضمون میں لکھا ہے۔

ان سے ۱۹۶۸ء تعارف کے بعد ۱۹۵۶ء تک مجھے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا مسئلہ روزگار کیلئے اور کیوں ہے اور بھی مجھے اس کا پتہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

عرشی مرحوم سے بھی جہاں تک میرا تعلق ہے۔ یہ مالک رام کی ہی دین ہے تعارف انہی کی وساطت سے ہوا۔ اور یہ پتا بھی انہی کے ایک خط سے چلا کہ عرشی صاحب رضائے تبریدی راہ پر رکھے مہتمم اعلیٰ ہیں۔ ان کے کچھ مضامین ہیں پہلے سے دیکھ چکا تھا۔ مل کر خوشی ہوئی، فرمائی کہ اب میرے دام ہر گز

کے قول، دانش کے موتی، تاریخی اہد اہل لطافت، سب وقیع و بیش بہا۔ اور اکثر کا شوق اسراف و فساد انسان۔ میں بھی بسا اویہران کو اپنے واسطہ چپکے میں سینے کی کوشش تو ضرور کرنا لیں بات وہ بھی چپکے کھڑے والی ہے۔

نندہ عرض (مطبوعہ ۱۹۶۵ء) میں مالک دام صاحب نے ان کی مختصر سوانح عجیب گشت طے کی ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کی کہ مولانا کہاں پیدا ہوئے اور کیوں! اگر سوانح نگار کسی کا ذکر اچھے عطا کیا جاتا تو میں واضح کرتا کہ وہ رامپور میں پیدا ہوئے اور مقصد ولادت دنیا کو نور علم سے فیضیاب کرنا تھا اور نور بر فضل کو ازانی دینا۔

تو وہ رامپور میں پیدا ہوئے، کم و بیش ساری زندگی وہیں بسر کر دی اور وہیں انتقال بھی ہوا۔ وہ لکھنا پٹھان تھے اور وہ بھی قبیلہ یوسف زئی سے عسائی قبیلہ۔ اپنی مرثیہ سے یہ لوگ متباہ ہوتے ہیں بہادر اور جنگجو۔ اس کے باوجود کہ یہ بزرگ کھٹے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے مگر دوست کے جاں نثار دوست ہوتے ہیں اور دشمن کے اسی نسبت اور شدت سے دشمن۔

میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ آپ اپنی اصل سے بچان ہیں مگر یہ کیونکر ہے کہ آپ کے مزاج میں نہ وہ اکھڑ ہیں نہ ڈاکڑ ہیں! جو اس قبیلے سے مخصوص ہے۔ فرمایا: کچھ تو تعلیم کا اثر، کچھ مقامی ماحول کا اور کچھ اس حقیقت کا احساس کہ انسان اپنی بنیاد سے سب و خطا کا بنیاد ہے۔ درجن کی جس خانی پر ہم انگشت نمائی کرتے ہیں اگر اپنے اندر چھائیے تو کئی خامیاں اس سے بھی زیادہ محبوب نظر آئیں گی۔ لیکن انہوں نے کیا خوب کہا ہے:

گر کیاں میں منہ ڈال کر خود تو دیکھیں
بُرائی پہ مسیہ کی نظر کرنے والے
ہر لوگ جس قبیلے سے ہیں اس کی خود داری ضرب اٹھل
ہے اور کبیر کا فقیر ہونا بھی ہمار کی روایت ہے۔ حق کی راہ میں کھٹ
مرنے کو شہادت سمجھتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا اور غور کیا بلکہ میرے بزرگوں
نے بھی کہ ہم جب کسی شخص کے افعال و حرکات کو نا زیار قرار دیتے
ہیں اور اسے گونڈ زردی سمجھاتے ہیں تو یہ فیصلہ ہمارا ہوتا ہے۔ اب اس کا
تعیین کون کرے کہ شخص نہ تو غلطی پر تھا یا ہم ہیں۔ پھر یہ بھی کہ مراد و اجزا
کا حاکم جب خدا ہے تو ہم حکم لگانے والے کون ہوتے ہیں! اس لیے کسی
بھی معاملے میں شدت تو کیوں راہ دی جائے! یہ سب اپنی جگہ برحق۔
مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جہزات پیدا ہوئے۔ میں نے ان بڑی بڑیوں
سے جن کی برائت بھی اتنی اور تجربے کا پتہ نہ ہوتی ہے، سنا ہے کہ جمعرات
کے پیدا ہونے والے بچے ہر شہزادہ سمجھاؤ گے ہوتے ہیں۔ وہ ہر معاملے
پر خندے دل و دماغ سے غور کرتے ہیں۔ معذور و گزر کے جذبے سے مزین

ہوتے ہیں اور مشکل کو خندہ پیشانی سے سلھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرے
نزدیک مولانا کے مزاج کی نرمی اور جذبہ اخلاص کی گرمی کا پتہ یہاں سے
ان کے یوم ولادت سے ہے اور یہ کسی کوشش و کاوش کی مرہون نیست
نہ تھی۔

عربی شعر کہتے تھے! اچھے شعر۔ مگر میرے نزدیک بھیت شاعران کا
دھر تہ نہیں، جو محقق اور تاریخ دان کی بھیت سے ہے۔ وہ خود بھی اپنی شعر
گوئی سے مطمئن نہیں تھے۔ ایک مرتبہ میں نے غزل کی فرمائش کی۔ فرمایا:
میں نے شعر کہا نہ ترک کر دیا۔ میں نے پوچھا: آخر کیوں؟ کہنے لگے: بھائی!
افساف بھی کوئی چیز ہے! جب میں نے دیکھا کہ جہان ان شعر کے افسار بھی
نہیں کر سکتا جن کے کلام کو بہت متعجب بنایا جاتا ہے تو فیصلہ کیا کہ اس گفت
سے کدہ کش ہونا ہی مناسب ہے۔ جب میں نے کہا حضور! کوئی شعر تو
آپ کے یہاں بھی تیر و نشر ہوتا ہے اور بھی سب متعجب، تو فرمایا۔ ہاں یہی
ہی بات ہے جیسے کسی کی خامی کا بار چوری سے غلطی سے اچھا سا نپک جاتا
ہے۔

غالب پران کا کام حرف آخر کی شان رکھتا ہے۔ جب دلی ان غالب
نسوز عریشی شاعر ہوا تو انھیں ساہتہ کا ڈمی نے اعزاز و اعلاام پیش کیا۔ یہ
ان کے کمال فن کا اعتراف بھی تھا اور سب و روز کی دیدہ ریزی کی تائید بھی۔
چونکہ تحقیق کے آدمی کبھی ایسی بات نہ کہتے جس کی صحت کے بارے
میں یقین نہ ہوتا۔ اور چونکہ علم و وسیع تھا اور معلومات مستند اگر کوئی حاضر باش
ایس بات کہتا تو غلط ہوتی تو یا تو خاموش رہتے یا یہ کہ کر معاملہ کوتاہ فرماتے۔
"آپ کے نقطہ نظر کے حق میں میرے پاس اس کے سوائے کوئی دلیل نہیں
کہ آپ ایسا فرما رہے ہیں! اگر کسی کو ایسی اساس نہ رکھتے تھے آجماں جس پر ان
کی رائے قطعی نہ ہو سکتی تو فوراً کوتاہی کا اعتراف فرماتے۔ استفسار پر اگر
انھیں کسی لفظ کے اطلاق کا شک تھا کہ بارے میں اطمینان نہ ہوتا تو کبھی فی الحال میں
اس کی صحت یا غیر صحت سے متعلق سنہ میں ہوں۔ اگر آپ جابیں تو راہ پر سے
واپس آ کر اس لیے میں معلومات حاصل کر کے آپ کو حقیقت سے آگاہ
کر دوں گا۔

ابتداءً درس رامپور میں پایا اور پھر اعلیٰ مدارج طے کرنے کے
لیے اور پٹنہ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور وہیں مرتبہ تعلیمت کو پہلے۔
ان دنوں اس مشہور زبان ادارے سے حضرت محمود خاں، ڈاکٹر طبع اور
ڈاکٹر محمد اقبال ایسے برہندان علم و فضل اساتذہ منسلک تھے۔ ان کے فہمان
سے مولانا کی تشنگی علمی شریقی کی تسکین ہوئی۔ جہان کی صلاحیتوں پر حکم
لگاؤں مگر کس رتے پر کہ خود نہ روز حکمت کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں نہ
اس فن کو پرکھنے کی جسے وہ لیے بیٹھے تھے۔ مگر وہ لوگ جو اس درجہ تک تعلیم

یہاں پر اس وقت تک کہ ان کی ساری حالت کے علاج بھی ہو گا لیکن
تجربے کے ساتھ اس میں نہ صرف یہ کہ اس کو سونے مانگتا ہے بلکہ ان میں
سب سے پہلے ہی کہ ان کی ساری حالت کے علاج بھی ہو گا لیکن

آنکھوں کی دنیا کو اس دور میں کیا تھا کہ اس سے اس دور میں
چھٹائی کو کر کے گدائی کی طرح دیکھ رہی اور تیرہ سو آسانی تھی۔ بسنے میں البتہ
تھکے تھے۔ مگر یہ کہ ان کو اندر دیکھ کر تھکے تھے اس زبان میں خوار و مشاک
رکھنے کے اور اس کو کم ہی سمجھتے تھے۔ شہزادہ کی خاصی جلد اور دل کو کچھ نہ سہ
جانتے تھے اور یہ سرسبز مٹی کی جھڑی کی مصلحت کے لیے اس کو سوئیہ لگا کر رکھا
تھیں۔ بسنے کے یہی صورت کو ان کو ابوالکلام آزاد سے متعلق تھی اور یہی علامہ
جیل ظہری کی علامہ کو لکھتے تھے۔ نیز ان کا دور جو ہم جو شہر، غلط فہمی اور
میسوں کے لیے شہزادہ اب و دانش سے متعلق۔ ایسا کہیں ہے۔

۴: روزِ مملکت کو خلیفہ خسرواں دانند
 آپ نہایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے سرخ و سفید رنگ۔ سمجھوری
 دماغی۔ جو شخص ہر گنگ بھی ہوئی۔ شرعی چہرے کے ضد خیال دلا کوڑے۔
 روکش نکلیں۔ مستواں ناگ، ہارنٹ نرم دواؤں اور متناہب۔ نوک پلک
 سے درست۔ توازن کم۔ روزِ قضا کے گریہ پیانہ افراطی کی حد تک۔
 بھرے بھرے اقد۔ انگلیاں لمبی اور غریبی جو غریبی کی علامت ہوتی ہیں۔
 خوش لباس تھے غرضت عواظ نے نیاز سے مجھے بلے نیاز نہ تھے۔ راجپوری
 قلمی ڈھلی اکثر سمجھورے رنگ کی کبھی کالی کرتا۔ تنگ ہری کاپڑا جامہ ہراتے
 ہوئے غرارہ نہ چاہا جسے کی ہند۔ اپنی اول سپر۔ ان کے لباس کے اجائے
 ترکیبی تھے۔ دو فریڈاں مجھے بھی رعایت فرمیں ایک کو کثرت استعمال کی کتاب نہ
 فاکسے منی ہو گئی اور ایک اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس کو بہت کم
 پہنتا ہوں کدو بھی بیا کی دلا کوڑے کم از کم میری زندگی تک تو دفا کرے۔

ایک دفعہ میری شامت جو آئی تھی میں نے مولانا کو علامہ کہہ کر خطا بیکار
انکسین کشادہ کر کے رکھے بولے "آپ جانتے ہیں علامہ کس کو کہتے ہیں؟" میں
نے کہا "جی ہاں! ابو الفضل کو، سعد اللہ خاں جبینی کو، یوگیا"۔ یوگیا اس کے
علامہ بھی کہہ؟" میں ان کا عندیہ بھانپ گیا کہ عرض کیا "اس کو جو کبھی آپ سے
مکڑن زادہ پڑھا لکھا ہو؟" فرمایا "نہیں۔ جو بہت پڑھا لکھا ہو"۔ میں نے
عرض کر داری "مختصر! میں سمجھ گیا، آئندہ آپ کو نیم علامہ کہا کر دوں گا یوگیا بھیا
"نیم علامہ" ہیں؟" میں نے کہا "میں پڑ گیا، ایسے ہی جیسے نیم کیم ہوتا
ہے۔ آئیہ کیا؟" آپ ہلکا کر کہنے۔

اسی نام کا واقعہ بھی ہے کہ مفتی اشیش پورہڑا دستور کھنڈی کو میں
 نے ایک خاص حال رکھا۔ پہلے میرٹ سے لڑا تھا اور تو فیروز جم بھی لڑ گیا

تم بھی سزا پا رہے ہو میں نے بے تکلف عرض کیا۔ جی ال میں بھی۔ مگر اس لیے کہ آپ بھی مجھے عطا کر دیں۔

من قرأ اربعاً مجتہد جو کلمہ اور اربعی جو
 مجھے کثرت اور ایب فی کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہے مگر یہ
 یہ مشورہ کیا کہ ان کو اپنی تعلیمات کا شدت سے احساس بھی ہوتا ہے اور اس
 کی ناشائش کا مشوق بھی۔ مگر انہی سے خاص تھا کہ وحشی صاحب کو ان دونوں کی
 غیور سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ حاضرین میں سے جو بھی ان سے مخاطب
 ہوتا اس کی بات اس تو جہ سے سننے لگا یا کوئی خوش عقیدہ مرد اپنے مشورے
 خود سے پرہیز کرنا کوشش کیا یا نہ۔

ایک اور غریبی جو عام نہیں ہے اُسے خاص سمجھا اور دوسرے کو دوسرے کی بات اور شر کو خود کو کمال، اہمیت کے لئے غرور دلاتے وقت اس بات کی پرواہ نہ کرتے کہ لوگ ان کے کام کو غور سے سمجھ رہے ہیں یا نہیں سمجھ رہے۔
فکر پر جان بوجھ کر دوسرے کو تراز رہے ہیں۔

اردو اور فارسی کے مزاج سے جس قدر وہ واقف تھے شاید اردو بولی ہوں گے مگر میری ان تنگ رسائی دینی عربی صاحب زبان کو مفصل شواہد کیلئے دیکھتے بلکہ روزمرہ میں اس کی کردار شاعری کو لازم اور یہیں سے ہے کہ وہ استاد معظم کو موم میں دو درجہ رکھتے تھے کہ باپ و دشادہ۔

شعر کا کام ہو اور ان کے نزدیک مشیدنی، تو داد میں بھی مکمل ذوق ہے۔ اور یہ کبھی کسی ستم یا خاکی کی طرف اشارہ کرنا ہوتا تو اس سادگی سے کرتے کہ بات تو متنوع کے دل پہ پہنچ جائے مگر احساسِ شعر مندگی نہ ہو۔

ایک وقت ایسا بھی آئے کہ ان کی رولٹی آگسٹ کی لیے دیے گئے تھے
 طرہ تانہ اور عظمیٰ کم گئی تھی کہ جذبہ اختیار کر کے وہ چلتی اور وہ وقت
 جب آنا کہ دو کوئی اچھا شاعر، لطیف، نایاب فکر انگیز کہ نہ تو پھر جلتے
 اور اطلاع نہ اور کبھی بہ بانگ بلند قادی کہ حسین امیر مملوکوں سے فخر تے۔ اور اس
 سے یقیناً ان کا مقصد شاعرانہ ادیب میں مزید خود اعتمادی پیدا کرنا بھی ہوتا
 اور بہتر صلاحیتوں کی دعوت بھی۔ بہتر کاوش و کوشش کے لیے یہ غیبت بھی۔
 حوصلہ افزائی کا سلیقہ عریض صاحب سے خاص تھا اور کارگر۔

اُن کو پھینٹنے کا یہ طریقہ برا بھلا سمجھو اور سوچنا کہ اس کو اتنا ہی تیار کیا دلی واقعت سے زور دیا اور بیان کر دیا جائے۔ وہ غلطیائے مضامین کو برداشت کرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ فوراً تصحیح فرماتے اور یوں کہ ان کے مصلحت کے خلاف تہ در تہ حقائق کو سطح آستانہ کرنے لگتے۔ یہی تقدیر کہ حوالے سے مثبت فرماتے۔ ان کا حافظہ قابل رشک تھا اور دستِ علم پر تھکا کہ اصلاح مقصود ہو کہ غامضی کی نشاندہی کے کام نہ لے کر بے بار و بار دیکھ برابر اندازہ اسے انہم دیتے۔ انھیں اس کا خیال نہ تھا کہ ان کی طرف بھی جی

کہا ہے اور کوئی بھی اس کی رائے صاحب ہوتی ہے اور مشورہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ ہر ملازم کو پہلو ہے۔ ہاں تو بھی آپ نے ان کے اخلاص اور یہ وہ دیکھ کے لیے ان کی محنت بھی کیا ہے وہ میں نے کہا۔ قول سے تو شاید کچھ نہیں ملے۔ وہ کل سے البتہ کہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے مجھے فائدہ ہوا تو ان کو بھی غور خواہ ہو چکا ہو کہ ”مولانا! آپ جانتے ہیں ان کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟“ فرمایا ”کیے“۔ میں نے عرض کی: یہ نہ ملائیں سعادت مند مگر اور سزا یا اخلاص دینی کی ماں ہیں جس کی ذات ہمارے لیے خوشی کا باعث تو ہے ہی، غرض کا بھی ہے۔ یسین کی میری طرف دیکھا، پھر میری کوئی کی طرف اور بولے ”واقعی یہ بڑی بات ہے، مولانا! ہماری بیٹی نہ ملا سے متعارف تھے اور چند مرتبہ اس سے مل بھی چکے تھے۔ آپ نے دستِ دعا بلند کیا اور کہا خدا اس نیک بگ کو دیر سلامت رکھے، کامران کرے اور آپ کی تسکین کا پہلو ہمیشہ آباد رہے۔“

راپور کو صحتی حلوہ مشہور ہے۔ ایک مرتبہ آپ ایک ڈر ہمارے لیے لائے۔ دہلی کے مسکریہ بھی ادا کیا اور شیریں کی خوش آہنگی کی تعریف بھی۔ آپ نے پوچھا: آپ کو پسند آیا؟ اس نے انبات میں جواب دیا۔ پھر تو یہ مولیٰ بن گیا کہ جب آتے میرے بھر حلوہ ہمارے لیے ضرور لاتے۔ دسمبر ۱۹۶۵ میں ان کے اعزاز میں ششِ عرشی منقذ ہوا۔ جب وہ پیش ہوا کتاب جو نہ دیکھی کے نام سے مشہور ہے ان کی خدمت میں پیش کی گئی ظاہر ہے کہ اس تقریب کے سلسلے میں آپ مصروف رہے ہوں گے مگر اس کے باوجود وضعدار کیا عالم کر دہ ہمارے لیے حلوہ کا تحفہ لانا نہ بھولے اور داس وقت جب دیوان غالب سنو عرشی اور خدمتِ ادب کے سلسلے میں انعام و اعزاز ہانکے بعد آپ در و دروی کے عالم میں اپنے صاحبزادے گبر علی خاں کے ہمراہ میری دکان پر ملاقات کو آئے۔ بھلیکے ہوئے، مبارک قبول کی مٹائی کا ڈپہ تھا یا، فرمایا: اندرونِ خانہ پہنچا دیجیے۔ اور ہاں میرا اسلام بھی کیے۔

عرشی صاحب کے سال میں دو تین پھر سے دہلی کے ضرور ہو جاتے تھے کسی کسی سے، کبھی محض محفلِ آرائی اور دوستِ لازمی کے لیے، قیام، قیامِ بھر لاپرستی چند صاحبِ مرتبہ غالب کے یہاں ہوتا۔ ایک وجہ تو یہ کہ ان سے مراد کچھ سے دیر نہ مرتبے اور مولانا وضعدار بزرگ یہاں ایک مرتبہ آتے، ہمیشہ وہیں اس پھر یہ بھی کہ آسانیاں لا صاحب موصوف کے یہاں میرے تھیں وہ کہیں اور کم ہاں ملیں۔ بڑی کوئی، سچے بھائے راحت بخش کرے، ٹیلیفون، موٹروں اور ملازموں کی ریل چلی۔ اور میرے یہاں سب مفقود حتیٰ کہ دھنگ کی روٹی کا اہتمام بھی تاپ نہ تھا۔ مگر وہ جب بھی آتے تشریف آوری کا شوق خود دگر دیتے۔ بہت دیر تک رکھتے، مگر میں جو کچھ موجود ہو قبول فرماتے اور رعبت سے کھاتے

کہ مجھے احساسِ کمتری نہ ہو۔ ہر بیزاری کھانا پسند فرماتے کہ ایک عرصے سے مرضِ گردہ اور عارضِ قلب میں مبتلا تھے۔ مولانا کا قیام اگر ہفتہ وار دن تک کا ہوتا تو دو ملاقاتیں لازم تھیں۔ ایک میرے یہاں اور ایک لا صاحب موصوف کے یہاں۔ ان کے یہاں جانا ہوتا تو ان کی دعوت پر۔ یہ دعوت محض کپ شپ کی نشست نہ ہوتی بلکہ کھانے، چائے اور لوازماتِ خورد و نوش کا انتظام تھا۔ ہٹے ہوتا۔ اور لحدِ امار کھلایا جاتا۔ عرشی صاحب نے بھی ہوں اور برحق چند صاحب کے یہاں کوئی دعوت ہوتی تو اکثر مجھے بھی یاد فرماتے کہ میں مقامی نیاز مند تھا اور میرا حصولِ آسان۔

ایک مرتبہ جو ششِ بلیغ آباد کی دعوت ہوئی، میں بھی مدعو تھا۔ اس شام دیکھا کہ خورد و غذا کو نوش کا اہتمام بھی وسیع پہلے نہ تھا کہ جو شش صاحب سے خاندانِ خراب کے رسیا تھے اور وہ دعوت قبول کرنے سے پہلے ہی عرشیہ اطمینان کے لیے کہ محفل میں باوجود گنگ خاطر خواہ مقدمہ میں بیٹا رہے گا تو یہاں نہایت اعلیٰ قسم کی شراب پانی کی ارازی کے لیے بہرہ رسی تھی۔ مجھے جرت ہوئی اس لیے کہ لا لائو موصوف اور ان کے افرادِ خد میں سے کوئی نہ بیٹھا تھا۔ داس سے قبل میں جتنی دھوکوں میں شامل ہوا اپنے لیے تو خیر ان کے یہاں شراب سو گھنٹے تک کے لیے بھی نہ دیکھی۔ ان دھوکوں میں گھر کے لوگوں کے علاوہ مولانا عرشی، قاضی عبدالودود، مالک دام اور عثمانیہ الدین احمد علیہ زنگانی پارسا اور زبایدک نہادت شامل ہوتے اور ان یا رانِ تقدس ماب کی خدمت میں شراب کی ششش سے ان کی توہین سے بڑھ کر باوجودِ حیات بخش کی توہین ہوتی اور شرفا تو بین انسان کی جو کہ شراب بروہ پرورد کی کبھی روا نہیں رکھتے۔

اور یقیناً یہ مولانا کی صحبت کا اثر تھا کہ لا لاپرستی چند مرتبہ و طباعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور انہی کی مسما جلیل، وایت اور غالباً تصنیع سے اپنے غالب سے متعلق تین مستند کتابیں شائع کیں، جو ان کا کتب خانے میں شامل ہوں باعثِ زینت ہیں۔ عرشی صاحب کے باعث سہی لیکن میرے تعلقات لا صاحب موصوف سے خاصے رنگت کے ہو گئے تھے۔ اگر میرے مکان یا دکان کے پاس سے گزرا ہوتا تو چند لمحوں کے لیے، ضرور مل کر جاتے۔ ایک واقعہ ان سے متعلق بیان کا مستحق ہے کیوں نہ کہہ دوں۔ اس لیے بھی کہ اس افسانے میں مولانا عرشی کا افسانہ بھی شامل ہے۔

۱۹۵۸ء میں مالک رام صاحب سلسلہ ملازمت بیرون ملک تشریف لے گئے تو اپنا کتب خانہ میرے یہاں امانت رکھوا گئے۔ ان کتابوں میں ایک سنو قلمی دیوانِ غالب کا بھی تھا۔ بوسیدہ اور کرم خوردہ گرامات کو اس فنکارانہ چابک دستی سے شفاف باریک روشنی کاغذ چہان کر کے

مضبوط کیا گیا تھا کہ بھٹی واہ۔ اور بخوبی یہ کہ اصل مسودہ کا ہر لفظ صاف نظر آتا اور بڑھا جاسکتا تھا۔ چرمی جلد میں قیمتی اور جلد بندی اس خوبی کی کہ ہر درق پور اٹھتا اور حاشیہ تک نمایاں۔ لاپرواہی غالب کے پرستار تھے اور اس پر ان دونوں کام بھی کر رہے تھے۔ مجھے سزا پین، جو سوجھا تو میں نے ان کے شوق اور وسائل کی فراوانی کے پیش نظر ایک دن اس نسخے کا ذکر کیا اور یہ اضافہ فرمایا کہ یہ غالب کے اپنے قلم سے ہے۔ انھوں نے تڑپ کر کہا۔ ابھی زیارت کر آؤ۔ میں نے کہا۔ آپ اطمینان سے کبھی تشریف لائیے، حاضر کروں گا۔ فرمایا: انتظار کی تاپ کس کو ہے ابھی موٹر میں بیٹھا اور گھر چلو (میں اس وقت اپنی قرول باغ والی دوکان پر بیٹھا تھا۔ گھر بھی قریب کی تھا) میں نے عرض کیا اور اگر میری بیوی گھر پر نہ ہوئیں اور مکان قفل ملا تو پھر؟ فرمایا: پھر کیا۔ نیچے موٹر میں بیٹھیں گے اور ان کی دلیپ تک گپ شپ ہوگی، ایلنے آؤں گے اور شرف خواہی ہوتی رہیگی۔ غرض میں ساتھ ہو گیا۔ گھر پہنچے تو وہ دیدہ عاشق کی طرح کھلا تھا۔ بیوی اور ملازم گھر ہی پر تھے۔ میں نے لالچی کو صوفے پر بٹھایا۔ وڈیا نے تپائی خود دلو شمش کے سامان سے سجائی اور میں مٹلو پہ نسیو نکال لایا۔ آپ نے کھانے پینے کی طرف قطعی توجہ نہ کی اور کتاب کو سر اٹھتے سے لٹکا یا، بکا سا بوسہ دیا اور درق گردانی کرنے لگے۔ بیوی یاد دلائی کہ کتاب بھی دیکھیے مگر کچھ کھاتے بھی جائیے۔ آپ ہوں ہاں کر کے مٹاتے رہے اور کتاب کو اس ہتھک سے محفوظ کرتے رہے گویا انھوں کی راہ اسے سینے میں اتار لیگے۔ خیر نصف گھنٹہ کے بعد جب اشتیاق دیدہ میں کچھ اعتدال آیا تو فرمایا۔ کاش یہ چیز میرے پاس ہوتی! میں نے عرض کی یہ کاش دانش گاہ کا کٹف ہے میرے پاس ہے تو آپ ہی کی دولت ہے، جب چاہیں لے جائیے۔ آپ نے اطمینان کی سانس لی اور کھانے کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھر ہلو چھا۔ کیا واقعی تم دے سکو گے؟ میں نے کہا۔ اٹھائیے اور ابھی لے جائے تو خدا تھکف کی بالکل حاجت نہیں۔ فرمایا: یوں نہیں۔ لہٰذا قسمتی چیز کیوں اٹھا لے جانے کا میں قرف نہیں رکھتا۔ میں نے کہا تو چھوڑے۔ جب جی میں آئے ایسے اور یہاں بیٹھ کر استفادہ فرمائیے۔ کہا۔ یہ بھی کون سا سامان ہے؟ یوں نہیں۔ اچھا میری مانو تو دام لے کر دو۔ میں پھر اطمینان سے لے جھاؤں گا۔ کچھ عرصے کے دلے کے بعد میں نے ایک لاکھ طلب کیے۔ آپ نے پھر کتاب کو غور سے دیکھا اور کہا۔ ٹھیک ہے۔ اگر بچاس ہزار تو ابھی دے دو۔ زیادہ لینا بھول تو ہیں کچھ سوچ لوں۔ میں نے عرض کی اس کے دام ایک لاکھ یا مفت نذر۔ درمیانی صورت معقول نہیں۔ اور پھر آپ کے اور میرے درمیان سودا بازی یوں بھی زیب نہیں دیتی۔ فرمایا: خیر میں چند دن میں پھر آؤں گا کتاب کو باہری رکھو۔ جس اتفاق سے دوسرے ہی

دن مولانا عرش تشریف لے آئے۔ وہ غالب کے ہر نقطہ سے واقف اور اس سے متعلق ان کا حکم حرف آخر۔ پر مٹی چند نے ان سے میرے یہاں کے نسخے کا ذکر کیا تو آپ نے وہیں کہ دیا کہ غالب کا اپنے قلم سے لکھا ہوا نسخہ دیوان میرے علم میں کہیں نہیں ہے۔ اور پھر شعلے پاس یہ لیا ب چیز ہوتی تو مالک رام صاحب کو علم ہونا۔ ایسا ذکر ان سے کبھی نہیں آیا۔ خیر، چلیے۔ شعلہ کے یہاں چل کر دیکھے لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ دونوں بوقت صبح چوں مردم بہ کار و بار روند بلا کثرت محبت بہ کوئے بار روند کے مصداق صبح ہی صبح میرے یہاں تشریف لے آئے۔ نسخہ طلب فرمایا میں نے حاضر کیا۔ مولانا کا غالب اس گفتگو کا علم نہ تھا جو میرے اور مالک صاحب موصوف کے درمیان ہو چکی تھی۔ انھوں نے کتاب دیکھ کر بوجھلہ آپ کو کیونکر معلوم ہے یہ غالب کے قلم سے ہے۔ میں نے فوراً جواب پھینکا۔ مجھے کیا معلوم؟ قلمی ہے اس لیے میرے خیال میں غالب کے اپنے قلم سے ہے۔ فرمایا: جن دنوں یہ معرض تحریر میں آیا قلمی نسخوں کا رواج عام تھا کہ بھاپے خانے آجی وجود میں آئے تھے۔ نسخہ مذکور کو پھر سے دیکھا اور کہا۔ غالب تو درکنار یہ کسی فنکار خوشنویس کی کتاب بھی نہیں کہ غلط پایا جاتی ہیں۔ اس پر میں کھٹکھا کر ہنسنا۔ اور بولا۔ مولانا! آپ نے تو سارا مزہ ہی کر کر کر دیا۔ یہ بچاس ہزار تو یہ اسی دن دے دیے گئے تیار تھے۔ مجھے لاکھ براہ راست۔ سودا چکنا۔ ہوسکا اور میں مغلس کا مغلس ہی رہ گیا۔ لاکھ صاحب اور وہ بھی خوب ہنسے، پھر مولانا نے کہا۔ یہ نسخہ میں نے غالب مالک رام کے یہاں دیکھا تھا۔ میں نے عرض کیا۔ جی ہاں۔ یہ انہی کے یہاں سے اڑایا گیا ہے۔

شرح چندہ

ہندوستان پکتان دیگر مالک

سالانہ	۱۰ روپے	۱۶ روپے	۳ ڈالر ۱۵۰ پونڈ
دوسالہ	۱۸ روپے	۲۸ روپے	۵۴ ڈالر ۱۶۰ پونڈ
سیالہ	۲۵ روپے	۳۸ روپے	۵۰ ڈالر ۱۵۰ پونڈ
نی کالی	ایک روپیہ ۱/۵	روپیہ ۳	سینٹ ۱۵ اپنی



منظو — فکر و فن کے چند پہلو

منظو ازل سے ہی ایک باقی طبیعت لے کر آئے تھے۔ بچپن ہی میں گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے منڈلاتے ہوئے دیکھے تھے اور یہ احساس ان کے شعور کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم، اس نے باپ کا پیار نہ مل سکا۔ محبت، شفقت اور مہربانی کے اس فقدان نے سعادت حسن کو منشو بنا دیا۔ ان کی زندگی میں جولا ابا کی، غیر معمولی انانیت اور اپنے آپ کو دوسروں پر مادی کرنے کی جو قوت ملتی تھی وہ اس کی کی تھی اور قوتی ہوئی نظر آتی ہے جو باپ کے پیار کو نہ پاسکتے کی وجہ سے ان میں پیدا ہوئی تھی۔

شریعت پورہ اہل تسر کے مسلم باپ اسکول میں داخلہ لینے کے بعد منشو کی شوقیوں اور شرارتوں میں اضافہ ہوا اور ہندو سکھ کالج میں بھی شوقیوں اور جوج پرستی کی گنجائش تھی۔ ان شوقیوں اور شرارتوں کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں کی قوت کا مرکز بن گئے تھے اور ”ماجی“ کا نام حاصل کر چکے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں مسلم لائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد عرفان خاص طور پر اس شوخ بڑے کے شرارتوں سے تنگ آچکے تھے تاہم اس کی غیر معمولی ذہانت نے معترف تھے۔ سعادت حسن منشو کو شرارتوں کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا ظاہر کر کے معافی کتب خانوں سے کتابیں اٹھا کر لے آتے تھے اور ہر کتب خانہ ہیڈ ماسٹر میں فروخت کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہیڈ ماسٹر کو کتابوں کی قیمت اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتی تھی اور منشو ان بیویوں سے شریف بیچ کر دیا کرتے اور پھر سے بچے۔ ”میں غصہ خاتم کے سگر کی بجی نہیں بیٹا“

منشو کی سرادازنی تھی۔ بچپن کے لڑکے کھاتے سے لے کر زندگی کے آخری سالوں تک انہوں نے ہر معاملے میں غیر روایتی انداز نظر اختیار کر لیا تھا اور اپنے لیے ایک منفرد راستہ بنالیا۔ یہ انفرادیت، مصنفان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں نظر آتی ہے بلکہ اس کا پورا کر ان کے ادب میں بھی ہر جگہ محسوس ہے۔ بچپن کا افلاس

اُردو میں منفرد اسٹائل کا پہلا چراغ منشی پریم چند نے روشن کیا۔ اس چراغ کی نور سجاد حیدر، پریم، نیاز فتح پوری اور دوسرے لوگوں نے بڑھائی۔ ان لوگوں کی کاوشوں سے اُردو ادب نے اس زمین کی خوشبو پیدا کر لی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔ خلاؤں میں پروا کرنے والے خیالات، مافوق الفطرت مضامین اور انسانی زندگی کی پراسرار دنیا کی جگہ عصری زندگی کے مسائل نے اس فن میں تازہ کاری پیدا کر دی۔ پریم چند نے مغرب کے فن سے شعوری اقتساب کیا۔ لیکن یہ اقتساب مغرب کی گورائے تقلید تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے فن کا راز چابک دستی کے ساتھ اپنے مطالعہ کو تازہ کیے کی بجائے پریم چند نے حضرت ڈی ڈی اور قومی موضوعات کو برتا بلکہ اپنے عصری رجحانات کی بھرپور عکاسی کی۔ حتیٰ کہ ایک روایت میں لکھا کہ اسے انگلستان کے فن کاروں کو سونپ دیا۔ اپنے آخری دور میں ”کفن“ جیسا شاہکار تخلیق کر کے انہوں نے ایک نئی منزل کی نشان دہی کی اور اُردو ادب نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

بیوس ہدی کے میسرے دہے میں جب پریم چند کا فن اپنے عروج پر تھا، تب انگلستان کے ادب نے غوردار ہونے اور ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ اُردو ادب نے اس ایک نئی جہت کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں اُردو ادب نے اپنے فن کی پختگی کے لیے چاروں طرف سے توجہ دی۔ اس میں خاص طور پر کرن چند، تیدی اور منشو قابل ذکر ہیں۔ اس تہذیب نے اُردو ادب کی تاریخ میں ایک نیا باب کھلا اور اُردو ادب نے کئی جہتوں سے آستان کیا۔ یہ اُردو ادب کی خوش بختی تھی کہ اسے پریم چند کے بعد منشو جیسا تخلیق کار ملا جس نے اپنی انفرادیت سے اسے انداز نگاہ میں نئے نعوش اُٹھا دیے۔

○ شبیر احمد، کٹر نیوٹریشی، حضرت علی، سری نگر ۱۹۰۰۰۶

والد کی موت، عزیزوں اور رشتہ داروں کی بیگانگی، دوستوں کی سرد دہری، حقوق کی تعفی — ان سب باتوں کا نفسیاتی رد عمل یہ ہوا کہ وہ ذہنی الجھنوں کے شکار ہو گئے۔ اور ان کی تعلقات کے ٹھکانے پر سے آتش چھوٹے۔ منٹو کا سترا ہے، اسے اپنے ارد گرد ایک عجیب خفا کا احساس پریشان کرتا رہا۔ اس خفا کو بڑھانے کے لیے لوگوں کی فتنہ کو مختلف طریقوں سے اپنی جانب مبذول کرتے رہے۔ اپنی زندگی اور فکر و فن میں تقلید پرستی اور روایت پسندی سے گریز کر کے انہوں نے ہر قدم پر عبثیت پسندی اور انفرادیت کا اظہار کر کے اپنے فیر معمولی تخلیقی ذہن کا عبثوت فراہم کیا۔

منٹو بچپن کے انام میں ایک بار اللہ رکھا نامی ماچا دو گڑ کے ساتھ بھوسے جمع میں بٹھے پاؤں دیکھتے ہوئے الٹا روں پر چلے گئے اور مونہ سے "اٹ، بھئی نہ کی تعفی۔ حالانکہ وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر موجود تھا، اس کی بے اللہ رکھا کی یقین دہانی کے باوجود سامنے آنے کی جرأت نہ کی تعفی۔ منٹو کے آگ پر چلنے کی یہ جرأت رندانہ ان کے کسی لمبائی جوتن کی فٹا نہ تھیں۔ اس واقعے کے بعد پشت ان کی نفسیاتی شخصیت کا فرما تھی اور اس معلوم مو تہ کے کبر واقعہ ان کی آئندہ زندگی کا ایک اہم ستارہ تھا۔ وہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے روایتی تصورات کو ترک کر کے ہمیشہ نئی باتوں کی تلاش میں رہے اور انہیں تمام عمر آگ کے صحرا میں سے گزرنا پڑا۔ ایک نیا کار کی حیثیت سے وہ زندگی بھر آگ پر چلتے رہے۔ شہرت کی بلندہ منزلیں چھوئیں اور ساتھ ہی بدنامی کے طوق بھی قبول کر لیے۔

بچپن سے منٹو نے پوشیدہ تخلیق جوہر کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتے رہے۔ انہیں انفرادیت پسندانہ کا شوق تھا۔ وہ طرح طرح کی انفرادیت پھیلاتے۔ جو دوسرے روز تھیں گھوم کر بھینس جاتیں۔ یہ انفرادیت بڑی دلچسپ اور تخیل پر مبنی کار کی تھیں۔ مثلاً:-

(۱) امریکہ والوں نے تاج محل خرید لیا ہے اور وہ اُسے بڑی بیٹنوں کے ذریعے امریکہ لے جا رہے ہیں۔

(۲) لاسٹین ٹریفک کے سامان کو برف کے ٹوٹ جیتا لے گئے ہیں۔

(۳) میرا فوٹو میں گن گھسے سینک کا بنا ہوا ہے۔

منٹو نے اپنے چند خیالات احباب کے ساتھ مل کر ایک انجمن منظم کر لی تھی۔ "انجمن امتحان" اس انجمن سے وابستہ لوگوں کا کام کامیاب وغیرہ باتوں سے لوگوں کو پریشان کرنا تھا۔ مثلاً منٹو خود کہا کرتے تھے،

"اس قلم کے متعلق آپ کی ب کیا ہے؟ اس قلم کے متعلق آپ کا کیا ہے؟"

منٹو نے جب اپنی زندگی کا آغاز کیا تو شروع سے ہی ہنگامہ بازی پر اتر آئے۔ اپنے انشائوں کے پہلے مجموعے "منٹو کے انشائے" کی اشاعت کے

وقت تا شکر کو ہامیت دی کہ وہ کتاب کا ایسا گزروشن بنے کہ منٹو اس کو دیکھتے ہی انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کہا کیا ایسی انجمن کے چارہ جات داہ واہ اور ہا ہا کر کے اور انہیں ہندو نہیں۔ ترقی پسندوں نے رحمت پسند کا لیل جیساں کر دیا اور رحمت پسندوں نے ترقی پسند اور دہریہ کہا۔ ان کے انشائے پر ان کے غلامانہ مقلد چلے گئے، اور ان کو شکرانہ گزار دیا۔ شرب خوشی سے چٹکا رادوانے کے لیے پاگل خانے بھیج دیے گئے، لیکن جب پاگل خانے سے چھوٹے تو ان کے مونہ سے یہ سننی خیر ملے اور اہوا۔

"چھوٹے پاگل خانے سے نکل کر بڑے پاگل خانے میں آگیا ہوں۔"

منٹو کی ایک بڑی قدرتی ان کی کہے باقی اور صاف گوئی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ سیاہ و سیاہ اور سفید و سفید کہا۔ اپنے نمبر کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ مرنے کے بعد کسی شخص کا کردار یا زندگی سے بدل کر آئے۔ اس بات کی وضاحت اپنے خاکوں کے مجموعے "گئے خوشے" میں یوں کرتے ہیں:

"میرے اصلاح خانے سے نکلی تندرست، کوئی شہر نہیں۔ کلا گھوڑ پیدا کرنے والی شہر ہیں۔ میں بناؤں گھوڑا کرنا نہیں جانتا۔ آتما شکر کی کھینچی آٹھ مچھے سیدھے نہیں ہو سکی۔ میرا ہی کی صلاحیت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور میں اپنے دوست شام کو مجھ کو مرنا کہہ دو ہر روز غلاموں کو سنا یاں نہ کیجئے۔"

منٹو نے منٹو کے فن کا سمجھنے۔ سمجھنے کے لیے کہ اپنی موت تک ترجموں کے طبع و انشائوں، مضامین، ڈراموں اور انشائوں تک ہر جگہ ہر سطح میں ٹیڑھے پیڑھے خطوط لکھتے ہیں۔ انہوں نے ہر میدان میں تباہی مچا دی اور اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ نفسیاتی اور مضمونی انشائوں کے انشائے لکھنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگوں نے ایسے انشائوں کو خوش اور بے کار قرار دیا تھا، ان میں انہوں نے درجہ اولوں سے بنیاد کی تھی۔ انہوں نے غصے سے آکر ایسے ہی مضمونات کو اپنے انشائوں میں لکھ دی۔ وہی وجہ کہ سرور جعفری جیسے ترقی پسند نے ان سے اختلاف کے باوجود ان کے بارے میں کہا:

"منٹو کی انشائے نگاری ہندوستان کے درمیانی طبقے کے مجموعہ نمبر کی فراہم ہے، اس لیے منٹو اردو کا سب سے زیادہ بنام انشائے نگار ہے اور وہ بنیادی جو منٹو کو نصیب ہوئی ہے، مقبولیت اور شہرت کی طرح مرنے کو کشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے نئی کاریں اعلیٰ جوہر مونا چاہیے اور منٹو کا جوہر اس کے قلم کی دلچسپی کے لیے طبع ہے۔"

منٹو کا سب سے بڑا مسلک انسان دوستی تھا۔ ان کے یہاں مصلحت اندیشی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ مذہب، دین، دھرم کے نعروں کے پس پشت صحت مندی، منافرت، تعصب اور تنگ نظری چھپی ہوئی ہے اور عوام پر سزوں نے اسے صحت ایک آڑ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ ان کا یوں اور اعلیٰ سائیز کا قطعاً نہیں کرتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں، اپنی کھائی سہانے میں نرم طرز ہیں۔

”یہ مت کہو ایک لاکھ مسلمان اور ایک لاکھ ہندو مس۔

یہ کہو دو لاکھ انڈیاں مس۔ ایک لاکھ ہندو اور مسلمان

یہ سمجھیں ہوں گے کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ

لڑھکے اور لڑھکے رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان

قتل کر کے ہندوؤں کے نعین بھائی ہوں گے کہ اسلام

ختم ہو گیا، مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔

وہ لوگ یہ وقف ہوتا ہے جو یہ سمجھے ہیں کہ ہندوؤں سے

مذہب متاثر کیا جا سکتا ہے۔ مذہب، دین، دھرم،

ایمان، نعین، عقیدت جو کچھ سمجھے، ہمارے جسم میں

نہیں ہماری جڑیں میں ہوتا ہے، جیسے چاقو یا گوئی

سے قہ نہیں ہو سکتا۔“

تقریباً ملک ان کے دور کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اس سے ان کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کو دل سے قبول نہیں کر سکتے۔ اور اگرچہ انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لی تھی وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو اس عظیم ہندوستان کا وارث سمجھتے تھے، پہاڑ انہوں نے ختم کیا تھا۔ بڑا اس کے بعد مذہب کے نام پر لڑائی کے دھیر گئے۔ بچوں کے شیعہ لڑے اور مسلمان کا نیا نام ہوا۔ منٹو پر بھڑک چلائے۔

”ہندوستان آزاد ہو گیا۔ پاکستان عالم وجود میں آئے

ہی آزاد ہو گیا، لیکن انسان ان دونوں ملکوں میں غلام

تھا۔ تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، پرانیات

اور بریت کا غلام۔“

منٹو ایک عقیم فن کار ہیں۔ ان کی خلعت اور انفرادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فن اپنے معاصرین اور متاخرین کے لیے بے حد متنازعہ و مفرح رہا ہے اور ان کے بیشتر آراء فرسے بحث و تحقیق کے دفتر کھول دیے ہیں۔ جموں ناقدوں نے ان کو کھنڈیاں لگا کر اور غرض نگار فرار دے کر روک دیا اور مصنفوں نے ان کے ہاں فن کا راز کے اعلیٰ نمونے تلاش کیے ہیں، لیکن جن بات قریب ہے کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں سماجی، ذہنی اور فکری زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اور انسانی سماج میں رہتے ہوئے انسانی پرستہ سرکہ ہے۔ یہ بات وقت کے ساتھ ہی جا سکتی ہے کہ وہ سرخ شکر لکھو

کے سب سے بڑے ترکان تھے۔ یہ سمجھے کہ مومرئی طور پر ان کے موضوعات محدود تھے، لیکن ان بات کو تسلیم کرنا ہو گا کہ ان موضوعات کو جس ہی بہتر مندی کے ساتھ انہوں نے پیش کیا وہ سب مثال ہے۔ منٹو کا فن پرمشعل ہے اور صاف کافن نہیں۔ یہ بات اس لیے بھی محسن ہے کہ جن زمانے میں منٹو جیسے وہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا اور اس دور میں کسان، مزدور طبقہ، دیو، نا براری، سرخ سویرا، پروڈا، انقلاب اور اس قبیل کے موضوعات کے گرد گھبراہٹیاں گھومتی تھیں۔ منٹو اس راتے کچھ دور چل کر اپنا ایک علیحدہ راستہ تلاش کیا اور اسی پر گامزن رہے۔ منٹو کا اسلوب بھی دوروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ وہ نثر میں شاعری کے مائل ہیں۔ وہ چھپتے الفاظ میں کفایت، الفاظ کے ساتھ نہایت احتیاط سے اپنے موضوع کی تخلیق یا زیادت کرتے ہیں۔ ان کا فن یقیناً شیعہ گری کا فن ہے۔ وہ دور کا راسخاں اور تئیںوں کا مینا کھسکاں بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں، جن کے معانی انہیں کے ضمیر کی جڑوں کا ہلا دیتے ہیں۔

منٹو مقصدی ادیب کے قائل نہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہوئے کسی اخلاقی تجربے کے تابع بھی نہیں رہتے۔ ہی سبب ہے کہ وہ سڈ ہندو تعصبات سے بچے رہے ہیں۔ وہ خیالی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے دوسرے اصناف نثر پر بھی قلم چلایا، لیکن جن تخلیقات نے ان کے چہرہ تخلیق کا لیا پنا اور ان کو عظمت بخشی، وہ ان کے افسانے ہیں اور اس صنف میں ان کی ہمہ گیر کا دعویٰ بہت کمزور ہے۔ ان کے موضوعات ان کے پیش رفتوں اور ہمہ گیر سبب سے مختلف ہیں۔ اہل خانہ، اہل خانہ کا وہ فریوہ انہوں نے نہ کہا وہ بھی منفرد ہے۔ اس طرح سے منٹو کا فن اپنی ایک روایت قائم کر سکا ہے۔ منٹو کے یہاں کوئی نظریاتی وابستگی بھی نہیں ملتی۔ حالانکہ شرفیغ شرفیغ میں انہوں نے بھی نے شدہ ماربولوں اور مشوروں میں اپنی کچا پائیاں ڈھال دی تھیں۔

ذکر ہو چکا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے بھی منٹو کے افسانے منفرد ہیں۔ وہ ایسے مشاہیر، محرمات اور جذبات بھی تخلیق کمل کے قالب میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ کہیں پر بھی تعصب کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اسلوب میں نام نہاد اخلاق کی پاسداری بھی نہیں ملتی۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی شخصیت کے نفسیاتی اور لاشعوری تجربات سے فیر فیر پر دے سرکاتے ہیں۔ اور ان تجربات اور کیفیات کو بڑی صفا کے ساتھ آئینہ گرد دیتے ہیں، جن کا متعلق انسان کی اسی سرشت ہے۔ ان کا ہندوئی موضوع طوائف اور جنس زدہ عورتیں اور مرد ہیں۔ سادیت اور فضیلت کے واسطے جیسے یہ بدعین و روادارہ عورتیں جب منٹو کی کتابوں میں دھتے ہیں قومانہ مشرتہ اس کی نئی اور بدی کا فیر پوری پائی اور اصلیت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی

آدی بانی لوک گیت

لوک گیتوں کا تہذیبی رستہ عام ہے۔ لوک گیت مکمل طور پر غیر شخصی اور اجتماعی ہوتا ہے۔ اس کے خالق کا کوئی نام نہیں ہوتا بلکہ یہ نام ہوتا ہے۔ یہ دلوں میں میرا کرنا ہے اور سینہ بسینہ نسل در نسل اپنا سفر کرتا ہے۔ اسی لیے لوک گیتوں میں مختلف فرقوں اور قبیلوں کے رسم و رواج، دین، مٹاشرقی اور تہذیبی زندگی کے سکن پائے جاتے ہیں۔

چھوٹا بڑا ہر ملک ایک ایک صورت اختیار ہے، جو ملک کی قدرتی مناظر اور معنات کی دولت سے لافال ہے۔ یہاں کے گیتے جنگلوں میں آباد مٹا قبیلے نسل اعتبار سے پورٹو آسٹریلا یا بڈ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور بانی فقط نظر سے ان کی زبان منڈاری، آسٹریک خاندان سے لگاؤ رکھتے ہیں، جو آسٹریلین ایک خاندان کی ایک بانی شاخ ہے۔ اس کا دائرہ کار وسیع ہے۔ یہ ہندوستان سے آسٹریلیا تک پھیلا ہوا ہے۔ شاید اسی بنا پر ان تمام چھوٹی چھوٹی قوموں کو ہندوستان کی جن باتیں یا آدی بانی قبیلے مختلف علاقوں میں بولتے ہیں، مٹا اصناف کا کہا جاتا ہے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری اور بانی

سروے کے مطابق یہ مٹا ہمارے علاوہ مدھیہ پردیش، آندھرا، اڑیسہ، بنگال، بھارت پر دیش، تری پورہ اور آسام میں بکبار و تیرہ کے علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ ہمارے اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد کم سے زیادہ ہے۔

آدی بانی لوک گیت میں رنج و مرمت، نرم و نرم ہمدردی، دانش، جن و شوق اور طلال و جمال کے جملہ عناصر ملوہ کر ہیں۔ سبز پتوں اور رنگین پھول سے بھرے ہوئے جنگل، پہاڑوں کی ٹراسر اور گھاٹیں لگاتے ہوئے آسٹریلین، روج کو تازگی بخشنے والی پوکی سمیت کوشا مرد و شیا مل رنگوں والی خوشبوئیں اور جنگل کے سنے کو توڑنے والی پرندوں کی آوازیں گیتوں کے لیے خام مواد تیار کرتی ہیں۔ آدی بانی کی زندگی کو سمجھنے کے لیے لوک گیتوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ لوک گیت آج بھی ان کا بیش قیمت تہذیبی اور ادبی سرمایہ ہے۔ آدی بانی لوک گیتوں کو حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ نڈر ۲۔ گائے ۳۔ اور مڈر ۴۔ کرما ۵۔ بگا ۶۔ جانی ۷۔ خیرا ۸۔ اڑندی۔
اب آئیے ان گیتوں کی بڑا بڑا نظر ڈالیں:

حدس: یہ آدی بانیوں کا سب سے قدیم اور مشہور گیت ہے۔ اسے موسم بہار کا نغمہ اور اس موقع

پر منائے جانے والے تہوار سہل کو جشن بہارا کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ تہوار موسم بہار کی آمد پر بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ جبکہ پرانی کوئیلیں بھونکتی ہیں اور مٹا کی بھونکوں سے، مٹا بھگتا ہے تو جو مٹوں پر یہ نغمہ بھلی جاتا مٹا مٹا دار و چکو، الاکن با الاکن باکا، ڈنڈا سونے

ترجمہ: نئی کوئیلوں والا درخت یا کھلا ہوا جوانی کا زمانہ اکیلے ہوئے بھول کی

یا بھیر گیت:
ہو رے سارا جرم با، بکین بک
ڈارے سے ہندے نیا پو پو کین کو پو ک

ترجمہ: راس میں کھٹکا کھیل لہرا رہا ہے۔
میں کو ناری لڑکی اسکرار رہی ہے۔

جب گٹ گٹ پھل بھلے ہوئے ہوں تو
چوڑے میں لگا لیتے اور لگے کا بارنا جیتے کو جا

ملاحظہ ہو:
ہو طارے کا تنگ ہندی با
ہے کا تنگ سونا ہندی با

دستم تارے سنگی جمیرا
ہے سنگی روپا جمبیرا
گنڈو لکائے گارنگ ہندیا
ہے گارنگ سونا ہندی با
گلنگ لکائے سنگی جمیرا
ہے سنگی روپا جمبیرا
مودے جری دو گارنگ ہندی با
گاینگ اوٹنگ
برے سٹم دو سنگی جمیرا
لکائنگ چدرنگ

دی گورے گنڈو لکائے
دی گورے مودے جری بارے جری
دی گورے گلنگ لکائے
لکائے جو گنگو بنگا سٹیا
لکائے جو گنگو بنگا سٹیا
لکائے سٹیا بنگا سٹیا
لکائے گلنگ لکائے گلنگ

اس کی وجہ سے رقص میں کچھ سہولت پیدا ہو جاتی ہے
جب سٹوڈیو دیر کے لیے رقص سکھاتا ہے تو پرم
کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔
ہوڑو تدرے لوتنا
رہل لکائے لوتنا
تین بانکائے سٹو گارنگا
انی لوتے جی کے لوتنا
جنگ سنگی تانی کے ستا
اگے جنگ لیل لٹائی
نٹنگ لکائے لکائے لکائے
او کو رتیا سٹیا سٹیا

ترجمہ :- راستے میں سونا کی مانند ہندی پھول ہے
ہے سٹیا میں (اس کو) لڑو لکائے
راستے میں چاندی کی مانند جمیرا پھول ہے
ہے سٹیا میں (اس کو) گارنگ لکائے

ترجمہ :- آدھی تھوکانی دے رہا ہے
بال کی طرح دکھائی دے رہا ہے
تین جگہ تک کا کھڑا ہے
اس کے بے دل عمل رہا ہے
دوسرے کو تو موجود تھا
صبح ہونے پر میں تلاش کرتی پھرتی ہوں
ابھی تک دکھائی نہیں دیا
بائری والا کہاں چلا گیا

ہے سٹیا میں ایک دو بار
ہے سٹیا میں گنڈو لکائے
ہے سٹیا میں ایک دو گنڈو لکائے
ہے سٹیا میں گنڈو لکائے
ہے سٹیا میں گنڈو لکائے
ہے سٹیا میں گنڈو لکائے
ہے سٹیا میں گنڈو لکائے
ہے سٹیا میں گنڈو لکائے

تلاش کا ماحول

یوں ہے :-
تربل سکم ٹوٹا لکائے
تربل سکم ٹوٹا لکائے
اوکو سٹو سٹیا ٹوٹا لکائے
چھ تربل سکم ٹوٹا لکائے
سٹیا سٹیا ٹوٹا لکائے
گرم تربل سکم ٹوٹا لکائے

نفاقت موصوفات و مہذبات سے متعلق گیت
ملے ہیں۔ جیسے جمہور وصال، دنا ہے دنائی
مہانت اور غربت وغیرہ۔ جنہیں طوالت کے خوف سے
درج نہیں کیا جا رہا ہے۔ ایسے گیتوں کی تعداد بہت
زیادہ ہے۔
گیتے سٹا :-
یہ جگہ گیت کی ہی ایک شاخ ہے۔ یہ عام
طور پر دو جگہ گیتوں کے بعد گایا جاتا ہے اس کے
مصرعے چھوٹے اور طرز آہنگ بھی ٹوٹا ہوتے ہیں۔

ترجمہ :- تمہارا گیت لکائے چتے کا طرے اور اس سٹیا
تمہارا گیت لکائے دھرتی کی مانند ٹھٹھا دوست

لے جمیل کی طرح کا ایک خوشنودار پھول
لے ایک گنڈے دار پھول

لے جلیقہ میں

ہوا اوس ساتھی کہاں چلا گیا
تھا ہوا اوس ساتھی ناچے چلا گیا
تھا راجہ موم ساتھی ناچے چلا گیا
تھا راجہ پید کا ساتھی کرما کھیلے چلا گیا

ورجیڈا :

یہ گیت بھی بھول گئیوں کی ہی ایک شاخ
ہے البتہ اس کی بندش اور موسیقی بھول گئیوں سے
پھر مختلف ہوتی ہے۔ ایک گیت سننے جہاں سوال
صحیح ہے اور جواب بھی انتہا اور اچھی اور اچھی
اور اچھی۔

ہر سانس بے لے امی جیہی ناٹنگو کنا
جڑے سہا جڑی جلن لے جیہی ناچہ کینو
آنکھ جیہی ناٹنگو کے ناٹہرے مندام آئے جنت
آنکھ جیہی ناچہ کے ناٹنگو پولا سورجان
بکاکا سینڈا ہتا تیرے مندام جیٹ تہا
بکاکا بدھی ہتا جیکارے پولا مہا تان

ترجمہ : پہل کی دولتی چھاؤں لے لڑکی کیا توہی کھڑی
صحی ؟
برگد کے حملاتے ملے میں لے لڑکی کیا توہی ٹیک لگا کر بیٹھی
صحی ؟
ہاں ! میں صحی ہاتھ کی آنکھ کھلی گئی
ہاں ! میں ہی سہی پاؤں کا چھیل پھیل گیا
ایسی عقل مند ہو کہ آنکھ کی گنگوٹھی کا بہانہ بنا رہی ہو
ایسی بھول ہو کہ پاؤں کے چھتے کا بہانہ تلاش رہی ہو

کسو گیت :

جب آسمان مرنے والوں سے ڈھکا ہوتا
ہے اور آبی پرندے فضا میں لہراتے ہیں بھیگی بھیگی
ہو میں دلوں میں کیف و شمع جاتی ہیں۔ آبیٹارہ
کاٹھیا پانی کا دم و دھن کو لذت بخشتا ہے اور زخموں
کی کسر تر تھیں پہاڑوں کو گھیر رہی ہیں۔ اس
وقت دلی بایوں کا شہر تیرا کرما بنا جاتا ہے۔

وہ تو ہم آدی ہاں لوگ گیتوں کا تعلق رقص و نمہ
سے ہے۔ لیکن کرگائیتوں کا تعلق خصوصی طور پر رقص
ہے۔ گرگائیتوں میں بہت سے دوسرے گیت بھی
شامل ہیں۔ اور انہیں کرگائیت کے علاوہ دوسری تقریبات
پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہمارے بھادوں کی کاڈی
کوڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور آڈی ہاں
اس موقع پر رنگ برنگے پردے کے ساتھ جلیوں بھی لٹکتے
ہیں۔ سرہل کی آخری شام کو کچھ کرگائیت کا کرکڑا ہوا
کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ کرگائیتوں کے بول خاصے
طویل ہوتے ہیں اور گاتے وقت یہ اور بھی زیادہ طاقت
اختیار کر لیتے ہیں۔ گاتے گاتے مار چڑھاؤ سے ان کے
انداز ایک خاص سہمی اور بے خودی پیدا ہو جاتی ہے۔
یعنی کرما تہوار ادا کیا ہے اور کرما دیوتا کی پوجا شرف
ہوتی ہے۔

کرما پینڈہ ملد لہنا، کرما اور ڈہ سال بال
کرما لونگائی دھیان دھورم تان
ہاں جلیو کا کو جوم تان
کرما دارو کو آکو لدا

ہر چار کو روڈ لدا
چن سنوری دھنا دھوب لدا
کرما لونگ پونجی او ما کوسنا
کلب کرئی کو ہجے نا، پڑو چڑو چڑو لکھا
کرما دارو کو دھوب پڑو لدا، پڑو تانا کو چرن لکھا
کبھی گڑو کا ہے تانا سا بے لے گو کرما کو کو
کرما لونگ پونجی او ما پیا

ترجمہ : کرما کا چار لونگ لیا ہے۔ کرما کے گھر میں چل رہی
ہے

(مقام) کرما دیوتا کا دھیان کر رہے ہیں
لوگوں نے گوشت کھلی کھانا چھوڑ دیا ہے
کرما کی شہزادی کے گئے ہیں
اسے آنگن میں لگا دیا ہے
آرتی سینڈر تان اور دھوب لدا تان ہو گیا ہے
کرما دیوتا دولت دے رہے ہیں

فاد کرنے والی عورتیں گئی ہیں
وہ چمک دمک والی جھوٹی کی طرح دکھائی دے رہی ہیں
وہ کرم درخت کے چاروں اور بیٹھے گئی ہیں
وہ سموت سموتی کی طرح دکھائی دے رہی ہیں
پجاری کہہ رہا ہے کہ کب لوگ کرم کی شان کو بچو
کرم دیوتا کا دھیان کرو

کرما دیوتا کی پوجا ہے ہوتی ہے اور پھر
موتلا موسم دیوتاوں میں آنگ بھر دیتا ہے۔

کچھ ہیں :-
گٹو پائو سن کرما
تیلنگی ڈنگ ساڈی
ادھورے سنگی سھائی دو رنگ سن گوتے

ترجمہ :- گٹو پائو میں ناچ اور کرم ہور رہا ہے
رات دن ناچ رہا ہے
اسے دوست جلیو ہم لوگ ناچے چلیں

یا بھیرتہ روتانی ہجو :
ڈی ڈی اوسو تھی کے تا
سھائی بیگم جیا جانا
پولا تم دونو ماننا
بزل ساڈی تان
فام کڈا تان گے

ترجمہ : تمہارے کونارسن کا وقت ہے

تم مغزور ہو رہی ہو
تمہارے پیر کا چھال بچ رہا ہے
مدر آڈا رہی ہے
لوکی کم ہنس رہی ہو

لہ گہ کا نام
تھ ایک دیوتا ڈھول

شکی چند روزہ جو لکھا

(اس لیے) ملکشی دیوی کھڑی ہے

ترجمہ: چلو پرندہ بنیں اس دیکھے چلیں
 اس میں داودا اور کرشن رکھ کر ہے میں
 اس کا تاج چمک رہا ہے
 جیسے سورج اور چاند طلوع ہو رہا ہو

ترجمہ :- اے حسینہ اسی حیرانی کے وقت
 ناچ اور گرم کھیل لو
 ورنہ بعد میں
 ناچ اور گرم بند ہو جائے گا

لیکن پُرمتر موقع پر کسی کا پرستہ پردیس میں ہوتی
کیا حال ہوتا ہے۔ ہجر میں بے قرار دل کی آواز اس
گیت میں سنیے :

ترجمہ :- سولہ سو گریباں شیوکا ناچ، ناچ رہی ہیں
چلو چلو علیو، اے سہائی دیکھنے چلیں
میرے من میں لگو گدگدی محسوس ہو رہی ہے۔

حُرگا :

یہ گیت کرنا کے بعد کلا رنگ سے لکھ کر اپنے توبہ دار
 لکھ گا یا جاتا ہے۔ مالک فضل توبہ دار ہے۔ کہیں باری
 سب کچھ دلوں کے لیے چمکا کر اہل جانا ہے تو میر
 توبہ دار مانا جاتا ہے۔ جنگ گیت مزاج کے اعتبار سے
 سکون اور صبر و شکر کے احسان کا مظہر ہے۔ دروازے
 پر کلمہ دیوی گڑھی سے لڑکی ماں کے کہتی ہے۔

ترجمہ: کرم کا حسیہ آگیا
 ہڑپا یا تا رہو گیا
 مجھے دیکھئے آئیں گے یا نہیں آئیں گے
 آج تک دکھائی نہیں دیا
 اس بات کو کوئی نہیں سوتا
 آج تک دکھائی نہیں دیا

کر مائیتوں میں مذہبی اساطیروں کو بھی گیت بند کیا گیا ہے :

دولا دولا برنڈا بیر راس لیتے
راس تیر رادھا کٹھن سنے سن
راس جو راجوئے سن

۱۰ گھڑی شرب

آج کل نئی دہلی

20

کی بھی یاد آتی ہے۔ اوسکا باپ کہتا ہے :
 ختی گاہاٹنگ
 جیسی پر جاگوڑے جبہ لگا کتا
 چٹائی چٹائی مندو مگرڑے
 تھکتا کرشی لنگ

ترجمہ : اسے باپ دیکھو تو
کون آدمی سا ہوا ہے
پہچاننے سے معلوم ہوتا ہے
کھیتی کی دیوی کھڑی ہے

حیاتی:

خسار گیت کو کہتے ہیں۔ یہ رزمیہ نغمہ ہے۔
حبیب بن باکی جنگوں میں جنگی جانوروں کے شکار
کو اپنے روایتی ہتھیاروں کے ساتھ کھلتے ہیں تو شکار
کا حصد بڑھانے کے لیے اس طرح گائیت گاتے ہیں۔

دیکھا یا نادم پسند کو دو
 جلاہری کو نذرانے کا دیکھا کو دو
 یہاں یہاں گھر کی
 مارے دھارہ لڑا لڑی، مارے دھارہ کیا
 تو یہ کچھ نہ کاہا
 مارے دھارہ جدا
 پسند کو دو دیکھ
 یہاں یہاں جدا
 کارنگ کو دو دیکھ
 مارے دھارہ جدا

ترجمہ :- پھر علی ندی کے اس پار شکار کھیلنے والے

نے
گھنی جھاڑیوں میں فکا تلاش کرتے ہوئے
یہاں پہنچا کرتے ہوئے جھاڑی میں ماروا

دھوکہ دیکھتے ہوئے ترائی میں اے مارڈالا
کیا ان لوگوں کو سب اسل گیا ہے؟
یہ یہ کہتے ہوئے شر مارے ہیں
کیا ان لوگوں کو بارہ گھاس لیا ہے
جو دھوکہ دیکھ کر چلا رہے ہیں
نہاری یہ یہ کہتے ہوئے توڑ پھاڑے ہیں
شکاری مارو دھوکہ کھاتا رہے ہیں۔

جنترا:

تیرا راور خوشی کے مواقع پر لئے دلہ لے کو
کہتے ہیں۔ اس جماعتی میں آدی ہاسی لکے اور
لڑکیاں اپنے تمام دکھوں کو کھول کر ایک دوسرے
کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ اس میں دوسرے ملک
کے آج کے ملنے والوں کا لاف بھی شریک رخصت
ہوتا ہے۔ راستے کی محسوس کو کرتے اور قدیموں میں
اور پھرتی لانے کے لیے جی جی اکیوں کا استعمال کیا جاتا
ہے۔ چونکہ جی جیوں کی تعداد کم ہے، اس لیے اس کو
دوسرے سمیت بھی گائے جاتے ہیں۔ ایک ہزار ایت
تھیے۔

نے کوئی ادوکتیا کر دو رڈنگ رڈنگ
لے کرے ہو ہو ہو
نے کوئی جی جی کر دو رڈنگ رڈنگ
لے کرے ہو ہو ہو

ترجہ: یہ عورت کہاں چلی گئی گوندلی کوٹنا باقی ہے
ہائے رے ہائے ہو ہو ہو
یہ عورت جتر اٹھ گئی اسی لیے گوندلی کوٹنا
باقی ہے
ہائے رے ہائے ہو ہو ہو

اردنڈی :-

شادی میاہ لگت کو کہتے ہیں۔ شادی کی
رہیں ہندوستان کے مختلف قبیلوں میں الگ الگ ہیں۔

لیکن بعض بنیادی چیزیں ایک جیسی ہیں۔ مثلاً لڑکی
کو دیکھنے لڑکی کے سسرال چلے جانے کے بعد گھر
میں سوئے ہیں اور ادا کی کا ماحول دیکھ کر یہ سب
ایسی باتیں ہیں جسے سب ہی سمجھتے ہیں۔ لڑکے
والے لڑکی کو دیکھتے آتے ہیں تو لڑکی اپنے ماں باپ
سے کہتی ہے :-

نکو نکو اینگ
ادو کو ہو کو کو گورس ہو کرنا

نکو نکو اینگ
چیم پر جا کو گورس جیکنا

نکو دو نا مانا، آم لیل کو بھو کرنا

ترجہ :- دیکھو دیکھو ماں، کون آدی آئے ہوئے ہیں
دیکھو دیکھو باپ، کون لگ آئے ہوئے ہیں
اے جی (بروگ) تم کو دیکھتے آئے ہیں

جب لڑکی
کو یہ سلام پہنچے کہ یہ لوگ تم کو دیکھتے آئے ہیں تو
شرم و حجاب کا اظہار وہ اس طرح کرتی ہے۔
ادو کو تائی میگا اینگ تم ٹھٹھی لے
ادو کو تانگ میں
دنک دنک میگا اینگ میر دم گڈی لے
دنک تانگ میں

ترجہ :- اے ماں مجھے مرنے کے ڈر ہے میں چھپا دو
اے باپ مجھے مرنے کے گھر میں چھپا دو

اور عروس
جب لباس عروسی میں ہوتی ہے تو خضامیں یہ نغمہ
گوتی ہے :-

بھڑا بھڑا بھڑا بھڑا
بھڑا بھڑا بھڑا بھڑا
بھڑا بھڑا بھڑا بھڑا

ترجہ: بھڑکے نیچے مگنو چمک رہا ہے
چمک رہا ہے چمک رہا ہے، جھل جھلک چمک رہا ہے
بھڑکے نیچے بڑا کھول تارنگین ساری چمک رہی ہے۔

شادی کے بعد
جب لڑکی رخصت ہو جاتی ہے تو سیکے میں اندھیرا
اور سسرال میں اجالا پھیل جاتا ہے۔ ان محسوسات کو
ایک گیت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے :-

جھٹنا دیا جھٹنا رے
سنگن رینگے دیا جھٹنا رے
مسل جنادیا مسل جنادے
نہ دیم رینگے دیا مسل جنادے
جہ جنادیا دیا نہ رے
گولنا اورہ دودر دیا ایترے جنادے

ترجہ :- چل رہا ہے چراغ چل رہا ہے
دور میں ہی چراغ چل رہا ہے
چراغ روشن ہو گیا چراغ روشن ہو گیا
اندھیرے کے ڈیر میں چراغ روشن ہو گیا
اب تہا رے گھر کا چراغ بجھ گیا
گولناے اور دروازے کا چراغ بجھ گیا

آدی ہاسی
لوگ اکیوں میں مذہبی گیتوں کا بھی خاص بڑا حصہ ہے جو
مختلف قبیلے کی اپنی مذہبی رسومات کا ادا کرنے کے وقت گاتے
ہیں ان کی سماجی تنظیمیں نفس ختم کے ساتھ ساتھ ان کا ایک
منسوب بڑا کرشمی ایک خاص مقام حاصل ہے، جو چاروں
تیار کیا جاتا ہے۔ یہ ہنگامہ دھوکہ لٹکانا ہوتا ہے اور یہ
کے بعد اس کے ایک خاص سرور حاصل ہوتا ہے۔ بڑے بڑے
ان کی کوئی تقریب نہیں کی جاتی
اس منور میں منظر پر آدی ہاسی قبیلے کی سماجی اور
مذہبی جھلکاں کو گیتوں کے ذریعے پیش کیا جاتی ہیں لیکن ان کے
ملاوہ اور بھی گیت ہیں جو ہنر و تحقیق طلب ہیں۔ ●●

لے منڈوا

لے اناج

لے اناج

بہ خطِ شاعر

شعرِ مومن

جنتا لب پہلے میں سے اُنکے میں غزل
 اب تو دُکھ پائیں بھیڑی ہے اُسے اپنے راسِ بچل جوں میں
 من کو کیا شیش کر پائے قلمِ انور
 ہم نے تو عمرِ حاضر میں پایا ہے
 چلے رہے ہیں سائب اگرچہ گردِ اسکا
 اپنا ہن ترش کش کا ہر درشن تھا
 خون ہوا ہے کہنے ہی ارمانوں کا
 اپنے گُزروں کا درخشاں ہی اک اُوگن ہے
 ہے اب کو جو پہاڑے گا، اُسکو
 جہنم جہنم کے نچو ایک زندانی کو
 کمرشنا مومن لعلِ بیلہ بندہ صحر میں
 جنتا لب نظر آتا ہے مدین میں
 اُسے اپنے راسِ بچل جوں میں
 ہم نے تو عمرِ حاضر میں پایا ہے
 چلے رہے ہیں سائب اگرچہ گردِ اسکا
 اپنا ہن ترش کش کا ہر درشن تھا
 خون ہوا ہے کہنے ہی ارمانوں کا
 اپنے گُزروں کا درخشاں ہی اک اُوگن ہے
 ہے اب کو جو پہاڑے گا، اُسکو
 جہنم جہنم کے نچو ایک زندانی کو
 کمرشنا مومن لعلِ بیلہ بندہ صحر میں

کرسن مومن

منظر نامہ



غزل

بجا وہ بھول جیسا تازہ و شاداب لگتا ہے
مگر اس شخص کے اندر کا موسم کس نے دیکھا ہے
ہن کشوں نے کر در در ناحق جھٹکتا ہے
کہ اس بی بی بابا اسب کا عالم تیرے جیسا ہے
وہ رنگ و وحشت کے دیرینہ رشتے سے نہیں واقف
جو آئندہ اٹھائے ہوں سر بانا رکھیں تیرے
بہت ہی ناگزیر اس شخص کی مجبوریاں ہوں گی
جو گھر ہوئے بھی رات بھر سڑکوں پہ بھرتا ہے
جو ہم دھڑل کوٹنے کی طرح غلے نہیں دیتا
زچانے کیا ہمارے درمیاں دیوار جیسا ہے
اُسے اب ٹوٹ آنے کے لیے آواز کیا دینا
کچھ تو کھلا کر اس جہنمی ساحل پہ اُترا ہے
یکس مونہ سے کہیں ہم اُس نگر کے رہنے والیں
جہاں پانی گراں ہے آدمی کا خون سستا ہے
کہیں ماضی کی یادیں تو نہیں اس کے نقاب میں
جو جوں ہر مونہ پر پھیلے کی جانب مڑ کے نکلتا ہے
ہو رہی ہے کہ کیا جس پیر کو صابر! جوان ہم نے
اب اُس کی چھانو پر بھی کچھ بڑے لکڑی کا بھدرا

ستارہ ستری

اک رہیں یا اس خستہ جاں مرضی
پر کشش احوال پر
مکنا کی جہارت کر رہا ہے

آمد صبح

مکراتی جھپٹی
نوعروں میں سیم تن
آ رہی ہے اٹھ کر اپنی خوابیگا ناز سے

دھتک

ذہن میں انگوٹیاں لیتا ہوا
عہد آئندہ سے وابستہ تخیل
دیدہ زیب و رنگ رنگ

کہکشاں

جگ لگاتے خواب
راہ زندگی پر عکس ریز

چاندنی رات

ہر بلند و پست ماحول نظر
برق کی امی ردا اٹھ رہے ہوئے

دھلتی شام

اک نگار گھبران
اپنے چوڑے کس روڑی کھول دی ہے
اُس کے لیے آہنسی گیسوؤں نے
ڈھک لیا ہے
اُس کو سر سے پاؤں تک

دو بتا سورت

خون میں لت
کوئی زخمی سپاہی
لے رہا ہے زندگی کے آخری دو چار سانس

نوشہ فراق

کیسری بانا بہن کو
اک جیلا راجپوت
دشمنوں کے لشکر جہاز سے لڑتا ہوا
جانی دینے پر تیار ہے

مڑا آئینہ، دھوا جہاز، پتیلہ (پنجاب)

خزینہ

شاہد میر

علی احمد جلیلی

آسعد بدایونی

یہی نہیں کہ سبھی خال و خط مٹانے تھے
دورِ خست کو تو نئے برگ و بار لانے تھے

وہی حکایتِ تم قصہ لب و گیسو
نئی زبان کے سب ذائقے پرانے تھے

ہر ایک قید تھی لاحق اُڑان بھرنے تک
بھر اس کے بعد کوئی دام تھا نہ دلفتنے

اسی مقام پہ کہیں نصب اس کی تصویریں
جہاں چمکتے ہوئے آئینے سجھانے تھے

برند بٹھے ہوئے تھے اُداس شاخوں پر
ہوائے تیز کی مٹھی میں آسٹھینے تھے

ہم اپنی پیاس چھاتے کہاں ملک شاہد
ہوا کے ساتھ گھٹاؤں کے تازیانے تھے

زندگی یوں مرے ہمراہ رہا کرتی ہے
جلے جلنے کی فقط رسم ادا کرتی ہے
جانے کیوں میری ہی دبیز نیر ہو کر اکثر
گرد و غبارِ وقتِ سخن دور کیا کرتی ہے
راہِ بردِ بیک کے چولہے ہیں آج کل مجھے
گرمی دور سے پہچان لیا کرتی ہے
ہم وہ برباد زمانہ ہیں کہ اب تو ہم سے
مشورہ گردِ غبارِ آہام کیا کرتی ہے
حق کا اظہار کروں میں تو یہ دنیا بڑھو کر
میرے ہاتھوں سے علم چھین لیا کرتی ہے
تھا مٹا ہوں میں جس امید کا دامن اکثر
زنجیرے میں مجھے چھوڑ دیا کرتی ہے
بر ملا وہ جو گزرتی ہے میری جتنی سے
نام چلے سے اچھوچھوٹ کر رہا کرتی ہے
حسرتِ عمر کی جو وقت کا ہے وہ علی
شوے فن کو نسب موڑ دیا کرتی ہے

جہاں تک نظر جائے بریا جزیروں میں پہچان رکھو
سمندر کی موجوں کو یک روز اپنا گھسبات دیکھو

سواہوں کے شکلِ جواہروں کی جانب مراؤں ہیں پیچھے
کتابوں میں کلمی عبارت کا مفہوم آسان دیکھو

مقدّر میں میرے گئے جنگلوں کی شبیں لکھ گئی ہیں
ہواؤں کی سرگوشیوں سے دفترِ کھیران دیکھو

مکانوں کے آئینے آج کل سے خالی ہیں ہر صبح پاؤں
چراغوں کی لمبی تقاریرِ برہنہ بے جا دیکھو

مغرکس لیے مجھ کو کہ بخت ہے ساکت سمندر کا یارب
میری اصل خواہش تو یہ تھی کہ میں کوئی فوٹو نہ دیکھو

کبھی تو کنول دوسلوں کی نگاہوں سے خستوں کی گھاٹ
منافق زمانے کا چہرہ کبھی تو پریشان دیکھو

• شعیبہ احمد، علی احمد سلمیٰ، علی گڑھ

• بلال منزل، سلطان پور، حیدرآباد

• رونی ڈیڈلٹ، گوشت کالج، بانسوا، لاہور

حسن آقا

چہرہ مدح کی گنجی بھی ہماری خوشی کے ساتھ
آنکھیں جھک گئی ہیں ہمیشہ ہنسی کے ساتھ
شاید ترسے خیال میں میرا گزر ہوا
دنیا کچھ بڑی مری دلیرا لگی کے ساتھ
ناکام آرزوئیں ہی مسیحا نصیب ہوا
ایسا نہ ہو ابھی مری زندگی کے ساتھ
ہم سوچتے تھے گزریں گے کیسے ہمارے دن
راتیں بھی کاٹ لی ہیں مہتاری کی کے ساتھ
ہم کامیاب ہو گے کبھی ناکام بھی رہے
لنکا کی ڈھل آئی تھی سیتا سیتی کے ساتھ
اک دل تھا اپنے پاس سو وہ بھی گنوا دیا
سودا کیا جو پیار کا اک اجنبی کے ساتھ

عمود رائے بریلوی

غم کے ارمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
دل میں پیکار نہیں تو کچھ بھی نہیں
آنسوؤں سے فسیل مڑگاں پہ
اک چراغاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
اللہ اللہ دف کی یہ شہر طیں
درد و رماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
وہ جنوں نے نہ وہ ہسار میں ہیں
اک گریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
ایسی توبہ سے کیجیے توبہ
دل پشیمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
مذہب عاشقی میں اے محمود
کشمہ ایساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

رشید عبد السمیع جلیلی

بات پوری بتا نہیں پایا
کوئی غم رسا نہیں پایا
کس طرح لوگ بھولتے ہوں گے
میں تو کچھ بھی بھٹکا نہیں پایا
میں وہی ہوں بدلتے لمحوں میں
تم کو بھی دوسرا نہیں پایا
میں ہوں یا عکس ہے مرا ہر سو
آئینہ تیرا نہیں پایا
رستہ ایسا چلا ہوں میں جس پر
کوئی اپنے سوا نہیں پایا
یوں نہ جاتے تملیل جگرش و فراق
حسن کو جاتا ہوا نہیں پایا

● ۵۸-۶-۲۳۸، ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰

● ۵۸ احمد علی آباد (پو)

● ایم۔ ڈی۔ افسر قریب لاہور، برودہ

غزل

واحد پرتی

ہر نفس ایک باب جیسا ہے
اپنا جوں کتاب جیسا ہے
جس کی تصویر وفا ہے
آج کا پیار خواب جیسا ہے
میں وہ سے فراق جوں کرجس کے لیے
زیر قاتل شراب جیسا ہے
زندگی اک گناہ ہے گمراہ
لوٹو غدا ب جیسا ہے
ہم وہ خیر حیات ہیں جن کا
ہر قدم آفتاب جیسا ہے
موسم گل کا نہیں ہے واحد
زخم دل بھی گلاب جیسا ہے

اختر شاہ جہاں پوری

جو حادث کے مقابل نہیں ہونے پاتے
میرے احباب میں شامل نہیں ہونے پاتے
تیری تصویر تو آنکھوں میں بسی۔ بتی ہے
ہم تری یاد سے فراق نہیں ہونے پاتے
ہمسفر اپنا کوئی ڈوب گیا ہے شاید
ہم جو آسودہ سافل نہیں ہونے پاتے
دیکھتی ہے ہر رنگ انہیں میری نظر
لاکھ بندے کسی حال میں ہونے پاتے
کوئی کیا دے گا میں اپنے کرم کی حیرات
ہم سے خوددار تو سائل نہیں ہونے پاتے
سبھی پیہم نے اثر اپنا دکھایا اختہ
ورنہ من عتہ مشکل نہیں ہونے پاتے

مہتاب انور

گفتار سے کردار سے انداز سخن سے
ہر شخص پریشان ہے رانے کھن سے
ہے عکس ابھی چاند کا پانی میں اوجھلا
کردار کو دیکھو گے نکلے دو جہن سے
نکلے تھے بیاں سے جو تندیب کے طالب
پھر آج ملے ہاکے اس کی دور کین سے
جو بولے تھے گل آج دی کاں رہے ہو
بے وجہ شکایت نہ کردار و من سے
اس جہد پانسیہ کا پوچھے نہ کوئی حال
پنٹا ہے کوئی ناگ ابھی اس کے بدن سے
چل دارا گریہ نہ لگائے ہو تو انوار
پتھر کا شکر نہ کردار اہل جن سے

● کاشانہ ذوق، علامہ اقبال ٹراکٹ، کراچی، ۱۱۲-۱۱۳

● مکان نمبر ۴، گٹوری، بھولپال (لاہور)

● گلستانِ مہتاب، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰

جون ۱۹۸۳ء

ایک نئی دنیا

بلات کار

اے میرے پاس کاج کی ہری چڑیوں کے دو مختلف ٹکڑے ہیں۔ یہ چھ بھی نہ جانے ایک سے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرے ٹکڑا میں نے ڈاک بنگلے کے کمرہ نمبر ۱ کے باہر سے اُٹھا یا تھا۔ مجھے چوڑیوں کے ٹکڑے جمع کرنے کا نہ تو مشوق ہے اور نہ کوئی لفظی تیار کا ہے۔ پیلا ٹکڑا میں نے — لیکن اس طرح بات شاید صاف نہ ہو۔ کیوں نہ اپنے اس سفر کی داستان ہی کہہ ڈالوں۔

میں برسوں بعد اس نادری میں آیا تھا۔ میں نے کبھی یہ بھی نہیں سوجھا تھا کہ اس موقع پر پہنچ کر کون سا جگہ کا۔ پہلی کوکھی میں کسی سرکاری دیہی ترقیاتی ادارے کا دفتر کھل گیا تھا۔ سامنے چوتھے پر جہاں صنعت بنایا ہوا کرتا تھا، اب چائے کی دوکان کھل گئی تھی۔ اگلے موڑ پر میوے میں آئے پر موجود ہو گیا۔ میں نے سببپ روکی۔

وہ جگہ جانی پہچانی تھی اور مجھے بھی میں جیپ سے نکل آیا۔ دور اونچائی پر بیٹھ مندر کے تریٹل پر دھوپ چمک رہی تھی۔ پیچھے کھل دیوی مندر کے پاؤں دھرتی مذکورہ شروہا ہی تھا، لیکن

● چھوٹا کوہ طمان، مدرسہ

ٹرک کے پارہرے بانسوں کے وہ جھنڈے اور تھکے گلابی پھولوں والی غور و غمازیوں اب نہیں تھیں۔ ایک دو منزلہ پڑواہار عمارت تن کر کھڑی تھی، جس کی تعمیر میں مغربی انداز خاص طور پر نمایاں تھا۔ کڑی کے ایک کھمبے سے تیل فون کا تار مکان تک چلا گیا تھا۔ کھمبے پر ایک پرانا الیکٹریک بوکس چسپاں تھا۔ تیل کی اکھٹہ تار اور مضبوطی کے لیے جتنکے سیورک کو دوڑ دے کو کامیاب کریں۔ "کارپائیک شکرانہ شایرے شکر کی تلاش میں بیٹھا تھا۔ مکان کی ایک کھڑکی میں، جس گیارہ سال کا ایک لڑکا سر پر دولہا ہانڈے کھڑا میری حیرت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ دوسری کھڑکی میں ایک عورت پوش خوش شکل عورت کھڑی مجھے تنگ کی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ مقامی گول نہیں تھے۔

میں برج سے نکلے جا رہا تھا، جیٹو مندر کو جانے والے راستے، جہاں ایک چھوٹا، سرسبز سا میدان بن گیا تھا۔ عمارت مندر سے کچھ گھر میں اپنے بیٹے کا کھیتی اور بوہت سی کے ساتھ رہتا تھا اور مجھے پہلی بار ڈاک بنگلے کے چوکدار شیارام کے ساتھ دیکھ کر اندازے میں بیٹھوں پر بیٹھا ملا تھا۔ چلا، لمبا گھیر کر ان بانسوں کے جھنڈے میں سے اُس کے گھر تک جانے والے راستے کا زیادہ تر حصہ اس مکان نے

جرب کر لیا تھا۔ راستے پر کڑی کا برادہ اور کچھ تپان بجھری ہوئی تھیں۔ تھن میں ہاڑے کی گول تھی۔ ایک تیز رفتاریک دھول آڑا آگڑا گیا۔ اس کے پیچھے ہانڈوں سے لڑی بس اہل بجاتی تھائی جا رہی تھی۔

مکان کی پچھلی طرف سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے یہ سب اس کی اوٹ میں ہوا ہو۔ ڈور تک خالی زمین کسی لاوارث و منشی عورت کی لاش کی طرح پڑی تھی۔ ایک آراستہ کا سلسلہ سڑک تھا۔ جگت ر دوڑ کر۔ "اگلے ٹیڈ پر کھاتا تھا۔ "کرنا ر دوڑ کر۔" پھر کاٹھی جھینوں کی آواز کے باوجود ایک تھلے کا احساس تھا۔

میں پہاڑی کے دامن تک آ گیا۔ اوپر جانے والے راستے پر سو کھینچے اور ٹھنڈاں بکھری تھیں۔ میرے اندر کھینچنے کا جوت جاتا دہڑے جوتے بتا رہا تھا۔ کھینچنے کے بار اوپر ایک شہرت کا بیڑے۔ اس کے سامنے میرا مکان تھا۔ دروازے کے باہر ناشاپاتی کا پیر سے الٹا ایک ڈی سی کالی چٹان کھینچوں پر کھینچی نظر آتی ہے۔ میں دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا۔ کھینچے چڑھنے سے اپنے ابا محسوس ہوا جیسے کھینچے چڑھنے چل رہا ہو۔ ہلک کر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ ہلک کر

میں پھیلانے لکھی تھی۔

شہوت کا وہ درخت اُداس سا کھڑا تھا۔
پتہ نہیں پتیر اُداس ہوتا ہے میں یا نہیں۔ مجھے تو ایسا
ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ دریاہ چٹان بھی اُکھلے پھرتی۔
ناشائی کا وہ پتیر نہیں تھا اور وہ مکان — صلیب تھا۔
شکستہ دیواریں، کھن گھٹے شکستہ شہتیر اور بائیں،
سلیٹوں کے ٹکڑے اور پلے میں دھنسا، بناؤ دھنسنے
کا رنگ اُلوٹوں کا چھوٹا سا مندر وہ چہرے میں تپسی اپنے
کپڑے، آئینہ، مٹی، کابل اور اسی ہی چیزیں رکھتی
تھی، میں اُس چٹان پر بیٹھ گیا، جہاں کھڑے ہو کر
ایک صبح برونے بتایا تھا۔ ادھر مرگ تک اور
ادھر تک جینگے مارے کھیت ہمارے میں کائی
سکے نیچے بازو دے چار پائی پریشنا آسمان کی نیلا چلنا
میں نہ جانے کیا دھندلا رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں میں
سگریٹ دبا ہوا تھا۔ آنکھوں میں گہری سوچ اور چہرے
پر تناؤ تھا۔ تپسی ناشائی کے پتیر نے پیچھے بھاڑی
پلودین کی پٹری میں رہی تھی جس کی خوشبو چاروں
طرف پھیلی ہوئی تھی گوری کرلا ٹیلوں میں کالج کی ہری
چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ جب اُس نے کنوئیں پر
سجوں کو ایک میٹھا دودھ یا میٹھا مٹھے دیا تو نہ جانے
کیوں مجھے کچھ کیسی ہونی پہلی یاد آئی تھی — ہری
تپسی میں بھری تھی۔ راجہ کیے باغ میں درست لہ
اڑنے لکھی تھی۔

”جانے یہ سارا سارا دن کیا سوچتی رہتی ہے“
برج نے کانشی کی طرف دیکھ کر گھر مندی سے کہا تھا۔
”مت سوچ کر رتا۔ جا اور پر مندر تک ہو اُس نہ شانت
ہو جائے گا“
”مجھے ان باتوں میں دخل اس نہیں کانشی
نہ وہ کھائی سے کہا۔

”درویش — ہیں۔ پوچھو لگی ریت یہی ہیں۔“
برج نے کسی بارے ہوئے باپ کی طرح نرمی سے کہا۔
”جائے کر سکھان سے من کا میں اور گھر کا مکھ ملگ جاکر“
”میں کیا دلیپے شکر سکھان نے؟“
”کیا نہیں رہا۔“ برج نے جتنی کی طرف دیکھے

ہوئے کہا۔ ”گھر، زمین، جائیداد، مینا، ہو۔ کیا
نہیں دیا۔“

”گھسی مرنی واسکت، پرانا باجوہ، ٹوٹی ہوئی
پتھری اور کھائی — یہ بتا ناکیوں کہوں گے۔“
”ایسی ناخوشی کی بات نہ کرو کانشی۔“ برج کا
لہجہ کسی حد تک سخت ہو گیا تھا۔

کانشی جھپٹے آٹھا۔ سگریٹ اچھال کر پھینکا
گئے میں ریشی غالی بیٹا اور ذراک شنگے کی طرف گھیزیں
میں اڑ گیا۔ تپسی کی آنکھوں میں کچھ بچھ گیا۔ ناشائی
کے پتیر کا سہارا لے لکھی وہ اُداسی سے کانشی کو کھینٹ
میں دوڑتے ابھرتے دیکھ رہی تھی۔ برج اُذر جاتے
جاتے رگ گیا۔ تپسی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیا کچھ نہیں
مناسبت ہے۔ ”میں نے آنکھیں پونچھ لیں۔“

”باپو، آپ کی کانشی کو سمجھا ہے۔ برج جھٹ
نازد کے کیرے پاس آ بیٹھا۔ وہ بہت اُداس نظر
آ رہا تھا۔ کانشی شہر جا کر کاروبار کرنا چاہتا ہے۔
کتابتہ یہ زمین، گھر، جائیداد بچ دوں — تپسی
کی بھی نہیں سنتا۔ مجھے تو بس یہ جاری کا ڈکھائے
جا رہا ہے۔ میں اسے ہی کہہ دوں گا اُسے مانگ کر
لایا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہی۔ کھائی کھجوا لائی ہیں
آکر پوچھا نہیں۔ کانشی بری سنگت میں پڑ کر
فٹے کے کپسول کھانے لگا ہے۔“

میں چُپ تھا۔ برج اور تپسی کا ڈکھ محسوس
کر رہا تھا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا۔ کانشی اُن دونوں
کی اُمید تھا، سہارا تھا۔ وہی ٹوٹا ہوا انظار آ رہا تھا
اور پتیرے سڑکوں، بجلی کی تاروں کے ذریعہ دُور
دُور تک پہنچنا۔ دولت کا کالا جادو۔

”باپو، ہم پر باد ہو جائیں گے۔“ برج
گرگڑا رہا تھا۔

”میں بات کروں گا کانشی سے۔“
تپسی نے پُر اُمید لگا ہوں سے میری طرف
دیکھا۔ برج دُور سے سنتا اور مطمئن ہو گیا تھا۔
لیکن اُس پل صبرے اند کا وہ مہذب شہری بہت
ہنسنا تھا۔

”میں نے اگلی صبح دینو کوئی کے دوکان پر اُس سے
بات بھی کی تھی۔ وہ میرے ساتھ دیوی مندر تک گیا
تھا۔ اُس نے میری تمام باتوں کا مختصر سا جواب دیا
تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ ”باپو، باپو کتا ہے۔ کیا وہی
ٹھیک ہے کیا یہ جائز ہے کہ وہ کچھ سوچ، اپنے
وجہ، اپنی پسند اپنے پتیرے رواج مجھ پر لادے۔“
”کیا اس گدھا ہوں؟“ اور وہ اس طرح مجھے لاجواب
کر کے من بیت میڈیکل اسٹور کی طرف چلا گیا۔

جٹان سے اُٹھ کر میں دیوار تک گیا۔ دیوار کے
پچھے اُن کی گھاس میں ایک گڑب گڑب کھائی تھی۔ کچھ دیوار
پر چھان چھپے کے اوپر چراغ رکھے کا طاق بنا تھا۔
دھوئیں کے نشانات اب بھی نظر آ رہے تھے۔ سپین
چراغ جلتا تھا۔ میں بیٹے لگا تو تپسی کی آواز سنائی
دی۔ ”باپو، اور پر مندر تک نہیں جاؤ گے؟“ میں
نے پٹک کو دیکھا نہیں کہنے میں کالج کی چوڑیوں کا ایک
پیر اُڑا رہا تھا۔ اندھا کرک میں نے مڑا اٹھا لیا۔
صاف کر کے جب میں چھوڑ کر آیا اور اوپر مندر

کی طرف چلا گیا۔
ایسی سخت چٹائی کر دے پھرتا تھا۔ پھتہ،
تھاڑیاں، تنہائی اور تنہا۔ پہلی بار میں برج کے
ساتھ اُڑ گیا تھا۔ پتھر کے جوڑے پر بیٹا شو مندر
چاروں طرف خاموش کھڑے درخت۔ ایک چھوٹا سا
ہراسیلاں — میں تھنڈی سیرھیوں پر بیٹھ گیا۔
دیواروں پر کائی کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔ جوڑے
پر مٹکے پتے بکھرے پڑے تھے۔ مندر اُذر اُذر
برآمدے کی چھت سے لوہے کے زنجیر دیوے کی خالی تنگ
رہی تھی۔ برج نے زنجیر کو تھام کر اُداسی سے کہا تھا۔
جانے کون یاں یا پتیل کا لونی کھانے چرائے گیا۔ اُس کا
کپس ہلکا ہلکا ہوا۔ برج نے مندر کی صفائی کی تھی۔

شید رنگ پر صل چڑھا تھا اور کچھ بتایا تھا۔ میں
پہلی بار اپنے دادا کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ وہ آخری
دم تک یہاں مل جل کھانے آتا رہا۔ اُس کے لہجہ پر لپ
اور کچھ میں یہ ریت سمجھا ہے، لیکن کانشی نہ صاف
انکار کر دیا ہے۔ مجھے ڈکھ ہوا۔ میں چاہتا ہوں وہ

مرزا ان توڑے — کچھ پل غائب رہ کر اُس نے کہا تھا: "باپو، دوشاں بڑی چیز ہے —" پھر وہ سجدے میں گر گیا تھا۔ سرخاکراکس نے ہاتھ جوڑ دیے اور جیسے احساسِ جرم سے کہا:

"صاف کرنا کھٹکان" میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ یہ کسی بے بسی تھی۔ کیا احساسِ گناہ تھا، یا کسی پر اس نے بتایا۔ اب یہاں بے ہوش ہوں، گندب اور بچے کپڑوں والے ڈھپ اور بڑی لڑکے لڑکایاں آتے ہیں۔ آج کل کے بھرتے ہیں۔ شنگ بھرتے ہیں، پیرس اور سٹیف ہیں اور....

"یہ ٹوٹ گئے اور منی بے لاء روی میں ہیں کی شادی ڈھونڈتے ہیں" میں نے کہا۔ "میکسی شادی کیسا اگلا!" "برجواہی سے بھلا۔ اس طرح سوگ کے کن سے دروازے ان پر کھل جاتے ہیں۔" "پتہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں وہ کائناتِ خلافِ احتجاج کر رہے ہیں"

"یہ تو بڑا ہے۔ انسانی ہے۔ مور کتا ہے۔ کوئی ایسا ایسا کہنے سے روکتا نہیں۔ انہیں گرفت کر کے ان سے سخت سخت کوئی چاہیے" "برجواہی بھلا، گننا سادہ تھا۔ میں نے سوچا۔ ذمہ دہنے کے آڑی کو جوٹ۔ قریب اور کھوکھوں کی روایت ضرورت نہیں ہوتی۔ کچھ دیر کھنڈی سیرھیں پر بے مطلب بھج کر میں واپس آگیا۔

میری جیب کے پاس ایک سرداری جے صبری سے میرا اتفاق کر رہے تھے۔ میں قریب پہنچا تو وہ بولے:

"آپ کو کسی سے ملنا تھا؟" "جی، برجرکان سے" "انہوں نے غیرت سے میری طرف دیکھا اور بولے "میرا خیال تھا آپ غارت یا۔" "میں تو میرا اتفاق کسی سرکاری عمارت سے نہیں کیا" آپ برجواہی کا کسی کے بدلے میں بچتا کیسے ہیں؟ "نہیں جی۔ وہ ایک دم اتفاق ہو گئے تھے۔

"یہ مکان آپ کا ہے؟"

"ہاں جی، ملکان دو دو دیس، کرناکر دو دو کرکس بھی ہمارا ہے۔ چوک میں ایک بڑا بندر ہے میں۔ سرداری نے خور سے کہا

شمالی جواس ٹھنڈ کر بھگتی تھی۔ ڈاک بنگلے کی جینی سے دھواں نکل رہا تھا۔ سرداری چلے گئے۔

ڈاک بنگلے میں ایک سرداری جیب کھڑی تھی۔ ایک مختصر سا خاندان لال میں بچا ہوا تھا۔ جائے کے برتن گھاس پر لٹا ہوا تھکے ہوئے تھے۔ کچھ خالی لگانے، کاغذ اور ایسی ہی قانونی شیار پورے لال میں بکھری تھیں۔ ابھی ٹرک ایک کنگنا مر، چہرے پر اخبار پھیلانے میز پر ٹانگیں کھینچے انہی پر میز میں لیٹا تھا۔ سفید بالوں والی ایک بزرگ عورت ٹنگ میں کھنچتی۔ تیس تیس سال کی ایک پستی لبی، غیر دل چسپی عورت کیاری کے ساتھ ساتھ ٹہل رہی تھی۔ وہ ڈاک مرز کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر چلنے لگتی۔ دس گیارہ سال کا ایک لڑکا جینے پہنے غلیل لیے بیڑوں میں چڑیاں تلاش کر رہا تھا۔ شارب کے بھری ان دن پر ڈسکو کی ٹیپ چل رہی تھی۔ شاید وہ یہ ٹیپ کئی بار سن چکے تھے، جواب اس میں جیب نہیں لے رہے تھے۔ اس کی عورت نے کیا ری سے ایک پھول توڑ لیا۔ اور اسے اپنے ذہنیہ جوڑے میں آڑس لیا۔ پھول کے باوجود اس کے چہرے کی تھکن اور بے زاری جوں کی توں تھی۔ وہ عورت مرد کے سامنے اس مذا سے سے کھڑی ہوئی کہ وہ اس کے بالوں کا پھول اور کرکنا معلوم قائم دیکھ سکے۔ جیب مرد نے چہرے سے اخبار نہیں ہٹایا تو عورت نے جسے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا۔

"اینل، کیوں بے زبان بڑیوں کو تار بلب ہے؟" مرد نے اخبار ہٹا کر اس کی طرف بے زاری سے دیکھا اور روکھائی سے کہا۔ "تم آہستہ نہیں بول سکتیں" عورت نے پھول سے بھٹی میکر لپٹ اپنے ہونٹوں پر پھیلا دی۔ مرد نے اخبار پھر سے پڑھ لیا۔

"اینل، کیوں بے زبان بڑیوں کو تار بلب ہے؟" مرد نے اخبار ہٹا کر اس کی طرف بے زاری سے دیکھا اور روکھائی سے کہا۔

"تم آہستہ نہیں بول سکتیں" عورت نے پھول سے بھٹی میکر لپٹ اپنے ہونٹوں پر پھیلا دی۔ مرد نے اخبار پھر سے پڑھ لیا۔

عورت نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میرا وجود وہاں بالکل غیر ضروری ہو۔

"نہام سروری ہے۔ واپس نہیں چلنا" "تم لوگ جاؤ۔ مجھے یہاں کام ہے" "بچوں کو ان کی جے کے ساتھ بھیج دو۔ میں یہیں رہوں گی" "نہیں، تم بھی جاؤ گی" "مروا خبر پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

"اینل، جوئے دوڑوں جاؤ اور مالان لار جیب میں رکھو اور ڈرا سٹرو لٹاؤ۔ ناؤ گو (Now GO) بزرگ عورت جیب چاپ جیب میں جا بیٹھی۔ لڑکوں نے سامان لار جیب میں رکھ دیا۔ وہ پستی عورت چند لمحوں کھڑی رہی پھر جیب کی طرف چلی گئی۔ اُس نے جوڑے کا پھول نکال کر پھینک دیا اور جیب میں بیٹھ گئی۔

ڈرائیور نے آکر جیب اشارت کر دی۔ گئی مرز جیب کے ساتھ ساتھ جاتا ہوا ٹرک تک گیا۔ ڈرائیور کو اگلی صبح نو تھ جیب لانے کے کہا۔ بچوں کو ہدایات دیں اور واپس آگیا۔

میں نے زور سے ہارن بجایا کوئی نہیں آیا۔ دوبارہ بجایا تو کچھ طرف سے ایک جوان اہلیستان سے چلتا ہوا جیب تک آگیا۔

"میںا رام کہاں ہے؟" "کون میںا رام؟" "اس کا بھر کھڑا تھا۔" "چوکیدار"

"آن کل میں چوکیدار میں اس کا پتہ نہیں" اس کے اگلا توڑ اور کھردرے بے سے سننے لگا۔ لگا گیا کہ وہ سفارتی نوکر ہے۔

"کرہ چاہیے" "پرٹ" میں سمجھ گیا۔ وہ میز پر کھیر ہے۔

میں سکڑا ہوا جب سے نیا کھڑا پانچ کاٹھ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ جٹ سے بچل گیا۔ یہ بٹھک جیب سے

پر جو نیا نام کس کو چاہتا تھا، نیا نام
 بنا کر رکھنا چاہتے تھے اسے تو کھانا دے، جو وہاں سے
 تین کوس کے فاصلے پر تھا، ارد لائی ہوئی، تب بوجھنے
 موبت سے کہا تھا۔ "صاحب، میں اپنے گھر سے گبول
 کا آٹا کوئی دھل تھری لے آیا ہوں۔ نیا نام انکو دو
 جاتے گا۔ اذھر! جوں پہلے، کھانا بھی لٹ پڑ جائے گا
 میں نے اسے دس کانٹ ڈالواؤں گے تاکہ لاری سے ہٹ
 گیا۔" "تیس صاحب، میں نے جیسوں کے لیے تو تیس
 کیا تھا۔" "تم کھانا دار نہیں ہیں۔"
 "آخر بازار سے ہی خریدتے ہو گے۔"
 "تیس صاحب، ہماری کھوئی کی تو میں ہے۔"
 "ہر جو پیسے نہیں لے گا صاحب! نیا نام نہ
 کیا۔"
 میں نے تو تیس بیس میں رکھ دیا۔ ہر جو خوش
 خوش سا چلا گیا۔ تب میرے کپے پر نیا نام ایک
 سے بول نکال لایا۔ سو ڈالنا لگا تو اس نے بتایا تھا
 کہ وہاں صرف پانی مل سکتا ہے۔ چونکہ میں جو ایک
 ٹی اشال تھا وہ بھی بند ہو چکا ہوگا۔ پھر وہ پانی
 اور گلاس لے آیا۔ اسی برآمدہ میں بیٹھے تھے
 نے تب اس سے دھڑا گلاس لانے کے لیے کہا۔
 تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ اور پانی کے تیل کا میپ
 روشن کر دیا تھا۔ تب یہاں پہنچی میں آئی تھی۔
 سبوتن گلاس، سوڈا اور رائے لے آیا۔
 اپنے لیے پیگ بنایا تو پاس ہی کھڑا تیل کو دیکھ رہا
 تھا۔ پانچ کانٹ تو کب کا ختم ہو چکا تھا اور مجھے
 وہاں رات گزارنی تھی میں نے دوسرا گلاس لانے
 کے لیے کہا تو وہ لپک کر گیا اور گلاس لے آیا۔ اسے
 بڑا پیگ دیا۔ اس نے ببول سے لگا دیا ایک ہی بار
 میں ختم کر دیا۔
 باہر سے شاید اس غارٹ آنیہر نے اسے آواز
 دی۔
 "ہو! ہو! ہو! میں اپنے آپ کا ڈر کہتے ہیں۔"
 کہا ہوا چلا گیا۔
 چند من بعد وہ آگیا۔ اس کی آنکھوں میں

پر جو نیا نام کس کو چاہتا تھا، نیا نام
 بنا کر رکھنا چاہتے تھے اسے تو کھانا دے، جو وہاں سے
 تین کوس کے فاصلے پر تھا، ارد لائی ہوئی، تب بوجھنے
 موبت سے کہا تھا۔ "صاحب، میں اپنے گھر سے گبول
 کا آٹا کوئی دھل تھری لے آیا ہوں۔ نیا نام انکو دو
 جاتے گا۔ اذھر! جوں پہلے، کھانا بھی لٹ پڑ جائے گا
 میں نے اسے دس کانٹ ڈالواؤں گے تاکہ لاری سے ہٹ
 گیا۔" "تیس صاحب، میں نے جیسوں کے لیے تو تیس
 کیا تھا۔" "تم کھانا دار نہیں ہیں۔"
 "آخر بازار سے ہی خریدتے ہو گے۔"
 "تیس صاحب، ہماری کھوئی کی تو میں ہے۔"
 "ہر جو پیسے نہیں لے گا صاحب! نیا نام نہ
 کیا۔"
 میں نے تو تیس بیس میں رکھ دیا۔ ہر جو خوش
 خوش سا چلا گیا۔ تب میرے کپے پر نیا نام ایک
 سے بول نکال لایا۔ سو ڈالنا لگا تو اس نے بتایا تھا
 کہ وہاں صرف پانی مل سکتا ہے۔ چونکہ میں جو ایک
 ٹی اشال تھا وہ بھی بند ہو چکا ہوگا۔ پھر وہ پانی
 اور گلاس لے آیا۔ اسی برآمدہ میں بیٹھے تھے
 نے تب اس سے دھڑا گلاس لانے کے لیے کہا۔
 تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ اور پانی کے تیل کا میپ
 روشن کر دیا تھا۔ تب یہاں پہنچی میں آئی تھی۔
 سبوتن گلاس، سوڈا اور رائے لے آیا۔
 اپنے لیے پیگ بنایا تو پاس ہی کھڑا تیل کو دیکھ رہا
 تھا۔ پانچ کانٹ تو کب کا ختم ہو چکا تھا اور مجھے
 وہاں رات گزارنی تھی میں نے دوسرا گلاس لانے
 کے لیے کہا تو وہ لپک کر گیا اور گلاس لے آیا۔ اسے
 بڑا پیگ دیا۔ اس نے ببول سے لگا دیا ایک ہی بار
 میں ختم کر دیا۔
 باہر سے شاید اس غارٹ آنیہر نے اسے آواز
 دی۔
 "ہو! ہو! ہو! میں اپنے آپ کا ڈر کہتے ہیں۔"
 کہا ہوا چلا گیا۔
 چند من بعد وہ آگیا۔ اس کی آنکھوں میں

ہکاساں تھے تھا۔ ببول پر مکان اور چکر پکٹ
 میں نے اسے دوسرا پیگ دیا۔
 "صاحب آپ کے بارے میں پوچھ رہے
 تھے۔ وہ مسکرایا۔
 "پھر ہ۔"
 میں نے کہا۔ "اچھے آدمی ہیں یا۔"
 "اور وہ صاحب؟" میں نے اسے تیسرا
 پیگ دیا۔
 "ٹپے اوپنے غافلان کے ہیں یا؟" میں نے
 گھونٹ بھر کر کہا۔
 "ان کے بٹے انوں ایم۔ ایل۔ اسے چنے
 گئے ہیں، جوتے دارٹ کٹر کٹر ہیں۔" جب یہ
 اچکھڑے تھے تو ان کے غلات انکو آڑی ہل بھی تھی۔
 سر کا بلی تو انکو آڑی ختم ہوئی اور ان میں سفر نیا دیا
 گیا۔ جسے دیکھ کر آدمی میں ویسے وہ ببول کو دلا رکھے
 ہیں۔
 اُسے پھر ان صاحب کا خیال آگیا اور وہ چلا گیا۔
 میں نے ان سے کہا کہ انکا کھانا لید لید کھاؤں گا کیٹ
 پر مجھے جتنا رڈ وڈ وڈ کرے وہاں سے سرداری ملے۔ ان
 کے ہاتھ میں تو تیل تھی مجھے انکو آڑی سے دیکھتے تھے
 وہ کوہر نمبر ایک طرف چلے گئے۔
 گیٹ کے سامنے بڑکی کے پار وہ کھانا دھت
 کھڑا تھا۔ اس کے تھے پرمین کی پیٹ گیٹ تھی۔
 یہ علاقہ تنگ نہایتی کھول میں سے لیا ہے۔ چونکہ
 نے کچھ ادھر جہاں تو انی اشال ہوا کر تھا اب
 دو دوکانیں تھیں۔ اسپتال بکرے کا شیش۔ جلکا۔
 اھوڑی۔ شکار کا لیٹ اور سڑکی کھدی سی
 تصویر۔ جنرل انی اشال کی چائے تو تیل ہی سی
 ہوا کرتی تھی۔ اس کا مالک مجھے سب کھٹکتی ہی کہا
 کرتے تھے۔ چل چلا آئی تھا۔ مجھے بڑا دلانے کے
 بارے میں اتنی کھانیاں یاد تھیں کہ گھٹوں بیت
 جاتے تھے۔ دوکان میں صرف دو پوتاؤں کی تصویر
 ہوا کرتی تھیں۔ ان میں ہر طرف چارٹی دوکانیں ہی
 تھیں تھیں، جن میں خوب لافٹ دھن تھی۔ پہلی



سوئی جاتی آنکھوں کا سپنا

دن کے بعد وہ گھر جا کر ہوا سے لیکر گنیش تو تین چار سوئیل دور سے شہر میں نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ نوکری تو کی ملتی، اس نے رکشا کو ہی ذرا لڑنے معاش بنالیا تھا۔ رکشا تو روزانہ چھ ماہ سے پرل سکا تھا، اصل کافی تو اس کی محنت تھی، شروع شروع میں تو یہ کام اُسے خاص مشکل معلوم ہوا تھا لیکن اب وہ اس سے کافی مطمئن تھا۔ ادھر حال اس کا کیا ہو گیا تھا۔ اب وہ حضو کو کس کے پاس چھوڑ کر آتا اور پھر شادی کے بعد تو مرد کو عورت سے بنا زندگی ادھوری معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان دوسرے مردوں کی وجہ سے اس کا ازدواجی سکون درہم برہم ہو جائے۔

اب بڑے شہرہوں میں رہنے کے لیے جگہ کہاں ملتی ہے، انٹ باغ پر تو وہ ہونے سے رہے حالانکہ بہت سے لوگوں کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ چھوٹری میں رہتا ان کے بس کی بات نہیں تھی، ایک چھوٹری کی کوئی ملی تھی، سارا دن چھوٹری کے میں باہر گزرتا بدبو دار پانی بستا کم پھیلتا زیادہ تھا۔ اس پر درخول سکینوں کی بھرمار، جھپ سے توجہ نہ ہو جی جاتا تھا لیکن باتیں میں جھوس کی جھپٹ بڑی طرے سے چلتی تھی اور پھر جھوٹے باتے شہر سے تھی درخول۔ آنے جانے کی مصیبت الگ! دراصل غلامت پسند گنیش کو چھوٹری کی زندگی سے بیز ہو گیا تھا۔

بڑی منت سمجھ کر کے گنیش اس کوٹھری میں آجسما تھا لیکن یہاں کی مشترکہ زندگی اپنے تئیں لیکے

انٹوں نہ چھوٹے برکھی بانڈی میں کاٹھ کا بچہ پلاتی، کھڑی میں رکھی گرم چائے کو پیلے سے کپڑے میں پیٹے پھونک پھونک کر پیٹے لگی۔

”آبا! لکھن بھیا! لپٹے ڈرائنگ روم میں چائے پیئے کا کیا مجاہد ہے، گنیش ڈرائنگ میں بول رہا تھا۔

”گنیش کو کی ہو گیا تھا! ابھی اُسے اور حضو کو اس ادھوٹے کھنڈر میں مکان میں آئے دو چار روزہ ہوئے تھے اور وہ اس طرے کی، پہلی، سبکی باتیں کرنے لگ گیا تھا۔

”جیسے اس پر کوئی کاٹ کچھ زیادہ ہی چھائی ہو! رام لکھن خود درجنوں کوٹھروں میں چوکیدار رہا تھا لیکن اُسے کوئی کوٹھی سے کوئی لگاؤ نہیں رہا، کچھ ہی دن پہلے جب وہ بازار سے گزر رہا تھا اُسے کچھن کا دوست گنیش رکشا چلائے ہوئے مل گیا تھا، گنیش رکشا سے اُترا، اس کے گلے لگ گیا تھا۔

اور پھر باتوں باتوں میں اس نے اپنی باتیں دکھڑا دو دیا تھا۔ وہ اور حضو چار پانچ مردوں کے بیچ محض ایک کوٹھری کے درمیان موندے تات کا پروردہ لگے سو رہتے گنیش سارا دن رکشا چلاتا اور حضو آس پاس کے گھروں میں برتن صفائی کا کام کرتی۔ اگرچہ چار پانچ ساقیوں کے ساتھ گزارہ ہو رہا تھا لیکن بچاری حضو کا دم ان پرلے مردوں کے بیچ کھٹا رہتا باقی مردوں کو آس پاس کے درمیان سے محنت مزدوری کی خاطر شہر میں آئے ہوئے تھے، ان کی کئی گاؤں چلا جاتا تو کوئی اور اس کی جگہ لے لیتا۔ بہت پندرہ

گنیش موم میں آکر لولا، کیوں لکھن سمیٹے؟
 تو ڈرائنگ روم میں چائے پیئے ہیں!“

”رام لکھن اس کی طرف دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اور سال زیر تعمیر مکانوں کی چوکیداری کرتے کرتے وہ ناشہری اصطلاحوں کو بخوبی سمجھتا تھا لیکن گنیش کی بات سے ہنسنے کے بجائے ”ڈرائنگ روم“ کا لفظ سے بوجھل سا رہا۔ اور پھر یہ کہاں کا ڈرائنگ روم! جیسے تھا کوٹھی کے نقش میں یہ جگہ ہی مقصد کے لیے مخصوص تھی لیکن کن سے تک ابھی ہوئی چار دیواری، علیٰ محنت اس کے فرش کو ڈرائنگ روم بننے سے تودہ ڈرائنگ روم نہیں بن سکتا تھا۔

وہ مسکرایا، گنیش بھی اس کے ساتھ ہنس دیا۔

”اوری حضو! گنیش نے اونچے درمیان کی وجہ سے ہندی کو پکارتے ہوئے کہا، ”تو میری اور لکھن بھیا لی چائے ڈرائنگ روم میں ہی لے آ!“

حضو دیکھتا میں چائے کی دو بنا ٹیبل دانی ہالیاں لیے کوٹھی کی پروردہ خا جگہ پر کھڑی تھی، اسے سیرس زباٹہ ملے کو آئے!“

اور وہ جلدی سے کمرے کے اوپر کھا بڑ فرشتہ برائیں بنی، ”بڑ بڑائی چار دیواری سے باہر نکلائی وہ ہم میں کی اولاد! چلائیں گے رکشا اور بچائے نہیں گے ڈرائنگ روم میں!“

”اوری حضو! تو اس تو جی میں چل آنا“

”آبا! میری تو بانڈی چل رہی ہے!“ اور وہ

تھی، ناک باردا لگا کر انھوں نے کوشی کو بٹوارہ کر لیا تھا، لیکن مردی کے نوم کی وجہ سے سب کو اندری سونا پڑتا تھا۔ جڑو لوگوں میں رہتے ہوئے اکثر ننگے گئے جیسے اورنگی گدی کا لالیاں سننے کو ملتی تھیں، اندھیرے میں بھی ان کو گمان رہتا کہ آٹھیں ناٹ کے سوراخوں میں سے انھیں جھانک رہی ہوں گی۔ یہ محسوس کر کے ان کے محسوس پر جیونیاں رنگ جاتیں، ایک رات تو اس نے پردے کے پیچھے سے کسی کے پاؤں کی انھیں کو ان کے محسوس کو مٹانے محسوس کیا تھا۔ ان ہی پریشان کن حالات میں گنیش کی ملاقات رام لکھن سے ہوئی تھی۔

”وکیلہ گنیش، ہمارے ہاں سنے کی جگہ تو بہت ہے لیکن صرف نیلی چتری کے نیچے، میرے پاس تو صرف ایک دھکا ہوا چھڑا سا گودا ہے، جہاں چری ہوئی ٹکڑی لوہے کے پائپ کو تعمیر کا دوسرا سامان ہے اور مہربانی صرف میری چار دیواری کی گلی پر ہی جگہ ہے، اب تک کام زکوہ ہے، بیگوان جانا ہے کرب چیتوں کی باری آتی ہے۔ باقی کوئی نم نہیں جہاں چاہو رہ سکتے ہو!“

”صبح! اسے واہ کھنہ بھٹا! اب تو موم کھل رہا ہے اور برسات تو ابھی بہت دیر ہے، میں شام کو ہی تمھارے پاس آ جاؤں گا، شک ہے نا!“

اور وہ ہنس کر دھنوا اور گھر کا معمولی سامان سے رکشا میں لادے شام کو پہنچ گیا تھا۔

گنیش کو یہ نیا گھر بہت ہی اچھا لگا، کشتا کر کے ان کے انصاف پر بنیادی دیواروں سے یہ کیا جاسکتا تھا۔ کوئی بیدارم تو کوئی کھانے کا کورہ، بطورہ رسوائی کو کھلی کے احاطے میں چوس گھنٹہ پانی یا صابن، چل تو اب بھی نہیں لیکن ابھی تک اس کی بھی بجائے رہائش میں اس میں سہولت کا گڑبگڑ بھی کہاں تھا، اور کافی عرصہ تک محسوس کو کوشی کے گھر کے کارخانہ لپٹا رہا، ایسے ایک نیا سینا اس کی آنکھوں کے سامنے اُترا رہا تھا، گھر کی چھت نہ تھی تو کیا ہوا! دیواروں کے چھتے انھیں میں لگا ہوا چالوں دینا، مگر کاپڑ دھوپ سے بچاؤ نہ ملان تو بیکار کیسے تھے، ان ہی کی زندگی دیواروں سے چار چار ہاتھ بھی بنی ہوئی تھیں۔ اسے اس کو کوشی سے آج کل کی

فراغت ہو گیا تھا۔

رام لکھن کے لیے یہ سودا بڑا تھا، وہ اکیلے رہتے سب سے تنگ آ گیا تھا، اب نہ صرف اسے کوئی اپنا ساتھ مل گیا تھا بلکہ اس کی غیر حاضری میں کوشی کی حفاظت بھی بنی تھی، گنیش کو رہائش کی پیشکش کرتے وقت رام لکھن کے سامنے کھانا پکانے کے کام سے نجات کے امکانات بھی تھے۔ اور پھر یہ سب کچھ اپنے آپ ہی طے پا گیا تھا، ایک انجان سا گھر تو معاہدے کسی نے لب کھولے بنائی باہمی طور پر رہا دیا تھا، دھوکے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بہت ہی لذیذ ہوتا۔

کوشی کی چار دیواری ابھی مکمل طور سے بنی تھی، سامنے والے احاطے کی دیوار میں مل لگا تھا، چوس گھنٹہ بہت زور سے پانی آنے کی وجہ سے کوئی حوض بنانے کی ضرورت پیش نہ آئی تھی، صرف پلاسٹک کا پائپ لگا کر پانی کی برمنڈیہ ٹیگر پر پہنچ جانا گنیش صبح سویرے ہی کچھ کھانے کر کشتا بنے چل جاتا۔ اس کے بعد رام لکھن نے ایک ایک کربھی دوسرا ہی گیت یا کوئی کڑی گاتا ہوا نل پر نہانے لگتا، وہ جو کم نہایت رگڑ رگڑ کر نہاتا جیسے وہ اپنی تمام میل اور گرد سے جھٹکا لاپا پاتا ہوتا ہو۔ دھوکے اکیلے رہ جانے پر بھی رام لکھن نے کسی کوئی غلط نگاہ دھڑپ نہیں ڈالی، دھنوا رسوائی کے بدلے نہٹ کر رام لکھن کے نہانے سے فارغ ہونے کے بعد باہمی اٹھانے تل پر آ کر کپڑے دھوئی، کپڑے پھیلانے کے بعد وہ باہمی گھر کی علی علی جاتی جہاں مسل خانہ بن رہا تھا، اگر چہ سقا ز بھی چھت سے بے نیاز تھا لیکن اس کی دیواریں خاصی اونچی تھی اور آس پڑوس سے کافی دور۔ اسے فضا میں آ کر کسی بے پروی کا احساس نہ ہوتا، دھوکہ یہاں اب بھی پڑوس کی کوٹھڑیوں میں برتن صفائی کا کام مل گیا تھا، وہ بھی فارغ ہو کر اپنے دھندے کی غرض سے نکل جاتی اور شام کو ہی لوٹتی۔

گنیش کو یہ کوشی بہت بڑی لگتی، وہ دھوکہ بہت غریب خاندان سے تھا جس کے دس بارہ دوستے گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ان کے پاس صرف دو کوٹھڑیاں تھیں اور اس کا بچپن اور لڑکپن ایک کوٹھڑی کے دروازے کو

میں ہی گزارا تھا۔ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں سانس نہ لے سکتا تھا، بھائی بھول کے جوتے اُسے کھینچ لیا، پاؤں پھاڑ کر لینے کی جگہ نہ ملتی تھی، ان ہی کوٹھڑیوں کا کھدروں میں بیٹھے ہوئے ہی وہ جوان رہا تھا، اندھا ہوا سا ہوش سنبھلنے ہی وہ روزی کی تلاش میں گھر کو غیرادارہ کے محل آیا تھا، ماں کے مرنے کے بعد وہاں گاؤں میں رکھا گیا تھا، اب جبکہ وہ اسی کوٹھڑی میں آیا تھا اسے لیے لگے بیسے تاروں کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ زندگی کی ہر ضرورت کے لیے علیلہ اور کشادہ جگہ موجود تھی، کوشی کے ادھورے پن کا احساس اسے اب بھی بے چین نہیں کیا، وہ اپنے پن سے ہاں کر کے کوٹھڑی کا پناہ دھوکہ رہم کرتا، کبھی کبھار کوئی رکشا ملانے والا دستہ آافت کار آگئے ملے جاتا تو اس کے لیے سرنے کا انتظام یہاں کر کے میں میں فرسٹ پر کبھی بچا کر لیا جاتا، اس نے ہم کھلی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ کسی اور کو رہائش کے لیے دعوت نہ دے گا، اس کو کوشی میں ایک شریف خاندان جو رہ رہا تھا۔

کوشی کا مالک کوئی چھوٹا موٹا کارخانہ دار تھا، بڑوس میں کچھ رقم ایسی بھنسی تھی کہ تعمیر کا کام ہی روک دینا پڑا، دیواروں کی آسمان دیواری کی بڑی ٹوکھی تھی، کچھ دیواروں میں آہنی پوکھٹ لگ چکے تھے لیکن کھڑکیاں اور دروازے لگنے کی منزل اب دوسرے دو تھک ہو چکی، جگہ جگہ یہ منہ بھاڑے سوراخ گھوکے اندرونی حصوں کو بڑی بے چارائی سے نکال کر رہتے، بڑھتی لڑائی کی وجہ سے راتوں رات آگ بھنگا سوڈا ثابت ہو رہا تھا، چارہ مالک بڑھ ہاتھ ہاتھ مارنا لیکن پیسے کے بنا یہ تعمیر چھپ پڑی تھی، وہ اکثر ہنزدہ ہفتہ میں اس کا کھنڈہ ڈال کوشی کو بڑی باس بھری نظروں سے دیکھ کر چلا جاتا۔ اس نے گنیش اور دھوکے موجودگی کا خوش بھی لیا تھا لیکن رام لکھن نے یہ بہک کر کہ وہ بھروسے کے آدمی ہیں، انے ملنے کر دیا تھا، گنیش اب دھوکے تک خوش رکھنے کی ہی جا رہی تھی، اسے کوشی کے اندر اس کے لیے لگی اندھے سے سوچ کا سہرا تھا،

میں نے اس کے لئے ایک کتب خانہ بنایا ہے جس میں
کتابوں کی فہرست ہے اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں

میں نے اس کے لئے ایک کتب خانہ بنایا ہے جس میں
کتابوں کی فہرست ہے اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں

میں نے اس کے لئے ایک کتب خانہ بنایا ہے جس میں
کتابوں کی فہرست ہے اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں

میں نے اس کے لئے ایک کتب خانہ بنایا ہے جس میں
کتابوں کی فہرست ہے اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں

میں نے اس کے لئے ایک کتب خانہ بنایا ہے جس میں
کتابوں کی فہرست ہے اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں

میں نے اس کے لئے ایک کتب خانہ بنایا ہے جس میں
کتابوں کی فہرست ہے اور ان کی قیمتیں لکھی ہیں

حقیقہ : پانچ خط

لکھا ہے کہ وہ بھی کاشی میں رہتا تھا جی ہے لیکن یہاں بڑی سی کو بہت تکلیف
ہوئی خود اپنا کام کرنے کے لائق تو وہ ہے نہیں میری خدمت کیا کرے گی
دوسری بات ہے کہ جب تم لوگوں جیسا بیٹا اور بہو دیاں ہے ہی تو وہ گھر
چھوڑ کر یہاں کیا کرنے آئی گی۔ سن چکا تو کھٹوں میں کنگا۔ وہاں پوتا بولتی
کو دیکھتی رہتی ہے۔ پوتوں کو دیکھنے کے لیے تو یہاں دل بھی جا رہا ہے لیکن
اس کی صورت ہی کیا ہے؟ جینو (ایک تقریب) ایک زندہ رہا تو اگر آتشیراوا
دے دوں گا۔

تھمارا بیٹا ہوا میں رو پیر مل گیا۔ اس سے چوں پرش فرید کر کھا رہا
ہوں۔ بھگوانی تجھیں خوش رکھیں۔ بہو کو بھی پیری دھامیں۔ اس سے کہہ دو
کہ وہ گھر کی کاشی ہے۔ تھماں دیاں جو اس سے لڑتی بھگوانی رہتی ہے تو یہ بہت
غلا کرتی ہے لیکن تجھیں تو بڑی کا مزاج معلوم ہی ہے۔ وہ ساری زندگی
بچے دکھ دیتی رہی۔ خیر اماں غلاب ہو سکتی ہے لیکن بچے کو کسی لالائی نہیں
ہونا چاہیے۔ اس کا بات پر تم پر حیرت مل کر دنا۔

دکڑی (دے دو گے۔

دیوکر کشن کی طرف سے

• غلام لا کا۔ باغ پاتو۔ پٹنہ ۸۰۰۰۸

بقیہ : بلات کار

بھوشن اس کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پہلا تو بھیا پھر کھل کر مسکرا دیا۔ عورت
کی کلائی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کسی بات پر الجھ رہے تھے۔ بھوشن اسے جھٹکے
سکڑے ہی سے لگیا

صبح جب میں میر کرنے کے خیال سے نکلا تو زمانے کیوں کو میرا کی طرف
نگاہ اٹھ گئی اور اس کا سفر ادا کیا۔ بھوشن کپن میں ٹنگنا رہا تھا۔ کمرہ نمبر ۱۰
کے باہر چلی کا ہر انڈیا پڑا تھا۔ میں نے دھڑک دھڑکا اٹھا۔
اب میرے پاس ہری چندریں کے دو کڑے ہیں۔ کیا کروں گا میں ان کا
مجھے نہیں معلوم!

بقیہ : نئی کتابیں

شاہان اندوی حالات کا جائزہ لیتے اور ان میں شرکے ملک میں اٹھانے میں ہلٹ
رکتے تھے۔ اگر ان کی نظروں کا مجموعہ ملاحظہ ہو گا تو یہ بھی یقینی ہے کہ ان کا شعری
قدار بھی بلند نظر ہے۔

پانی اور روشنی

تپائی پر بھی لاشیں کی برقانہ روشنی تارکی سے دست و گریبان تھی۔

جیت سے ٹکلتا چالیس واٹ کا بلب اپنی مصلوب روشنی کا سوگ منار ہاتھ اس کے ٹکڑے کی طرح مٹا رہی تھی۔ ان کے پاس ڈراما خان تھا۔ اپنی زمین۔ عطر پہنے غنیمت کی کچھ دکانوں پر دھڑکی اٹھیاں رک گئیں۔ پونٹوں کی قوس مالت اور دوسرے الفاظ سمجھ ہو گئے۔ اس نے اپنے تمام جوش کو اپنے کالوں میں یک جا کر کے آواز میں چھینا شروع کیا۔ سرسراہٹ کی آواز کالوں کے پردوں پر رنگ رہی تھی۔ اور اس کے دل کی دھڑکن تیز رفتاری سے جاتی تھی۔

اس نے گود میں لپکا جائزہ لیا اور سرگوشی کے انداز میں بچے کو مخاطب کیا۔ "بھیا، بھیا!" بچے نے کھٹک بولی۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے لاشیں کی مدھم روشنی میں پڑھے پڑھتے سو گئی تھا۔ "بھیا! اوجھو، سنا یہ کوئی نئی کھارہ لگیا ہے؟"

"نہی! آواز نے دریافت کم اور افراتفر زیادہ کیا۔ ملازمہ نے بے بسی "ہاں بیٹے! اور

نہیں تو کیا؟ شاید ضلعی نے کان کھلوا رکھی ہو۔" "خسبچہ بھائی! کچھ بھرتے پھرتے آپ کوئی بات کیسے یاد آگئی؟" ایک سنوئی آواز خاموشی پر کالی سنائی آئی۔

مرد کے چہرے پر ناگواری کی مگڑی نے چلنے پڑے، لیکن آواز کی طرح صرف گہری سانسیں ہی ابھریں۔ کچھ توقف کے بعد اس نے دلی آواز میں کہا۔ "صاف کرتا میں نے تم سے کچھ نہیں کہا ہے۔ میں قوس لڑکے سے مخاطب تھا۔"

"آپ اس حد پریشان کیوں ہیں۔ آپ روز روز نئے بن جاتے ہیں قوس! کیا علاج؟ کل رات سے ہی وہ نکلتی بند ہے، جس سے بچے کے نپوں میں پانی آتا ہے؟"

"نہیں تو خزاہ خزاہ ان سے شکایت دیتی ہے؟" مرد نے چڑک کہا۔

"مجھے؟ اور میں؟ کچھ کبہ رہی ہوں وہ جھوٹ ہے؟"

"جھوٹ اور کچھ کی کیا بات ہے؟ ذرا ٹھوکر ٹپ دیکھ لیتے لیکن یہی قیامت برپا ہونے کا خدشہ ہے؟"

"جاؤ بیٹا، جاؤ۔ دیکھا تو دور تھا کہ آپا خنور کی عیالوت میں غل کا اندیشہ ہے۔ پتہ نہیں انہیں کیا خوف کھائے جانتے ہے؟"

بیلہ بیلہ بان میں کنگڑا لپکا تھا۔ بادل ہوا سے آواز اٹھادی تھی۔ ہندو بھائی کھڑا تھا اس کے گونے کی آواز نے مل کر لگا دیا۔ "سیرالال!" اس ہار پانی سے اٹھ کر دوڑ پڑی۔

"ارے اس ناخلف کے چلنے کی کیا ضرورت نہیں ہو سکتا۔ زندگی میں کیا کوسہ؟ جب بیٹھ سے بنے پتھر پر تھک سے نہیں مل سکتا تو کچھ زندگی کی آواز کیجئے، اس کے قدم کیا استقلال سے اٹھیں گے؟"

اس نے راہ داری کی بجی مٹائی اور بچے کو دیکھے گی۔ اس کے انگوٹھے میں چوٹ لگی تھی اور اس سے خون نکلی رہا تھا۔

"اے اے! ادھبے بھی کوا کر رہا ہے؟"

مرد کی انگلیاں سر کے دائیں پر چڑا تیزی سے چل رہی تھیں۔ انہیں روتھیں چڑا ذرا ڈرا پل رہے تھے۔ حسرت نے کہا اس نے آواز نہیں سنی۔ اس لیے وہ بچے کی طرف سے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہاں وہ کچھ دیر کھڑی ہو کر کمرے میں گھومنے سے باز رہا۔

● حکیم حمایت کلائی، نگما (مدیر)



بے ترتیبی

بے ترتیبی میں فطرت ہے۔ اس دنیا سے آپ وینک کی سب سے بڑی ترتیب یہ ہے کہ کوئی ترتیب نہ رہ جائے۔ جس کے سب سے بڑے گواہ ہمارے ارد گرد گھر سے ہونے منظر فطرت ہیں۔ فطرت انسانی بھی تو آخر پتھر کی کے تابع ہے، جس میں نہ جانے کتنے نظام کیمی اور لاتعداد جہاں بلا کسی ترتیب کے اپنے اپنے مدار میں گردش ماہ و سال میں مصروف ہیں۔

میری نگاہوں کے سامنے لامحدود رنگوں آسمان کتاب فطرت کی طرح کھلا ہوا ہے۔ اس پر بے شمار ستارے اور سیارے انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ چمک اور چمک رہے ہیں بالکل فوج کی طرح کچھ اڑ پھیلے ہوئے۔ اس بے ترتیبی میں غلبہ شان ترتیب ہے۔ چھوٹے بڑے دور۔ قریب دھرم روشن ملک کی طرح بھڑکتے آؤں درہوئے، روشنی کی گیر ہلتے ہوئے غائب ہو جانے والے تارے۔

شام کو میری بہترین تفریح آسمانی گلیکوپ ہے۔ چار پائی پر لٹایا ہوا اپنے وجود سے بے نیاز اور بادلوں کے رنگ برنگ ٹکڑوں سے بنی مٹی تصویریں دیکھتا رہتا ہوں۔ ایک پراسا بلبل سٹ کر پھاڑا بن گیا۔ پھاڑا کا پس بڑھے ترے آؤں ہو گیا۔ جو فطرت

● ششاد افرا، پورٹ آف شیوان، ضلع شیوان (ہزار)

کے نیچے بہاؤ نظر آئے لگا۔ چو پارہ ابر چڑیا معلوم ہوا تھا، اب اچھی سے بھی بزرگ تر سیر بن بیٹھا۔ اس کی ذرا لائی جو کچھ تحلیل ہو کر پراسا انسانی چہرہ بن گئی۔ جس کے گھر سے کئی طرح لیے لیے کان خود ہونے لگے۔ سو نہ نکل آئی، جو بڑھے سے اڑ رہا ہو گا۔ اڑ رہا بڑھ کر گھر یا مال معلوم ہونے لگا۔ سمنا اور غلبہ منہار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مینار بھی کئی پھیل میں تبدیل ہو گیا۔ پھیل بہاؤوں میں روپوش ہوئی۔ نفس انسانی کی طرح ان سیماں یا ابر باروں کو قہر انہیں۔ بادل کے ٹکڑے یوں پلک پھٹنے میں بدل جاتے ہیں جیسے آدمی بات بدل دیتا ہے۔ بادل تو دھرتی کا عکس ہیں، ان میں انسانی فطرت جھلکتی ہے۔ یہ بھی باہر کے آدمی کی طرح اندر سے کچھ باہر سے کچھ۔ جیسے انسان کے دل میں کچھ ہوتا ہے، دماغ میں کچھ، موہنہ پر کچھ، پیٹھ پر کچھ، پیٹ میں کچھ، حلق میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ خیال کی طرح بادل میں بھی سرسے سے کوئی ترتیب ہی نہیں ہوتی۔ دراصل یہ بھی انسان کی طرح باطنی ترتیب سے آراستہ و سراشا ہے۔ اسی لیے ظاہر میں ان کا حق بھی چکا چوند کا رہتا ہے۔

جب بھی مجھے ہوائی جہاز سے اس جہاں گزلن کے شانہ سے کاموقع ملا تو یہ بے سچائے شاد و آباد خہر، لبیاں، سسناں میلان، ویران رنگستان،

آسمان سے باتیں کرتے سدا بنے کو، جو بڑے چمکے دریاہ ہے کواں سمندر جب سے کچھ نظر آئے گو یا ماقبل تاریخ کے زرد عجایب گھر یا پرنس میوزیم کا نظارہ کر رہے ہوں۔ ڈیڑھی ڈیڑھی کبیریں، اوچی نی قطاریں، لہریاں داروئی کی زنجیریں جولتے حصا میں طلسم ہوش و پاکی طرح غزوں اور آبادیوں کو لیے جاتی ہیں۔ غار، کھڑ، ٹھیلے، ہر شے ڈیڑھی ڈیڑھی اتری تری، دھیرے دھیرے غائب ہونے والی پھول پھولیاں، رفتہ رفتہ جس کی ہر نئے روشن اور تاریک حصوں میں تبدیلی ہو کر گھنڈ میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

جب بھی گلوب کا نظارہ کرتا ہوں تو مجھے بیشتر ممالک کے چہرے مختلف جانوروں سے مماثل نظر آتے ہیں۔ بڑا کھلم کھلم بھر انکھوں سے اس طرح گھرے ہوئے ہیں جیسے کوئی عجیب غلیظ جانور زندہ میں گھر ہوا ہو۔ ہر تہ اہم بارے ملک کے ساتھ اس کا ڈھ جھلائی نظر آتا ہے جیسے بڑے آدمی کے ساتھ اس کا مصاحب۔ آشریا کے ساتھ ٹوئی لیسٹ، ہندوستان کے ساتھ لٹکا، افریقہ کے ساتھ ڈفا مکر، یورپ کے ساتھ سسلی، کچھ ملک ماقبل تاریخ کے دیو پتھر جانوروں کی طرح بے ڈول، عجیب و غریب جیسے رہیں اور ہیں، کچھ گھریلو جانوروں کی طرح اپنے ننھے جیسے انگلیت یا سنگا پھرا دیہاتی وجہ سے ہر ملک کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ ہر ملک اس طرح

نہا ہوتا ہے جیسے کسی جانور کے کمرے کے کچھ تھلے لیے گئے ہوں۔ یا ان کے ٹرمپوں نے انہیں اس طرح کا ہوجے پر ہی شرم پڑھتے وقت پر کوئی اپنی میں پھینچے ہیں یا کباب ہو کر کمرے کو گدگدھننا نا دیتا ہے۔ اگر کھیتوں کی طرح ملکوں کی بھی ملک بندی ہو جاتی تو شاید اتنی بے ترقی نہ رہتی۔ ان ملکوں کے قومی ادب میں ان کے حدود اور جد کا ذکر خیر اتنے ثنائی دارالغلامیں ہوتا ہے اور ایسی ہی موہبی موت پر بھی کی جاتی ہے جو نقشے میں جتن سے زیادہ اعتبار سے قطع کرتی ہے۔

میرے خیال میں ترتیب جنت کی ہر شے میں ہوگی۔ اسی لیے اس کی بہترین تعریف ہی ”فردوسِ نظر“ ہے۔ ترتیب تو آسانی سے ہوتی جیسے جتن دیا میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔ انسان فطرت کا تابع ہے۔ فتنی نہ ماری۔ یہ بندہ تو خالق ہے۔ اسی ہے اس کے مزاج و مذاق میں ایک طرح کی انار کے ہے۔ انسان جس جن و طبیعت کا دعویٰ کرتا ہے، بلعقل سے مدعا مل بھی نیک اعمال پر ہی بند ہوتا ہے، و خدا کے نیک بندوں کی نیکیوں میں بھی ایسی کسمپرسی نہیں ہے کہ انہیں اس فانی دنیا میں جو شے حاصل نہ ہو سکی، کم از کم اُسے عقلمندی میں حاصل کر لیں۔

انسان کیلئے یہ شاید اس کے پارہ صفت ذہن کو کمپیوٹر تک نہیں بٹا سکتا۔ مختلف و متضاد خیالات کا مجموعہ، پرانے و جدید خیال میں اپنی مثال آپ۔ یہ آدمی اپنی بات پر کہیں کوہم جاتے کسی ایک خیال میں محو جاتے۔ سارے مذاہب اور عبادات کا زور ان ہی پر ہے ہا کہ یہ مذاہب کو بھی ان دھیان کر کے۔ مگر ان دنیا میں ڈوب کر سارا زندگی پا جائے۔ مادہ دہلے پائے والے کے حضور میں مر بسو ڈوبے۔ اگر یہ اس پر تیار بھی ہو جائے تو اچھے ذہن چند مذہب خلا سے ٹوٹا کرتا ہے۔ لیکن اس میں بھی جہاں وہ جہاں کی طرح پروردہ قدرت بے غش کی نعمت اور رحمت کی آرزو میں مر بسو ڈوبتا ہے، وہاں اس کا نفس فیضان کے کاندھوں پر

سوار چاروں کھونٹ کی خیریت میں معروف رہتا ہے۔ خود عبادت کرنے والے کا غیر صدق دل سے اس تعاد پر اطمینان میں پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نفسیات کے ایک پر ذمہ سے جو نہ صرف عالمی شہرت کے حامل بلکہ اللہ کے بھی ہیں پڑھنا: ”کیا یہ ممکن نہیں کہ عبادت کے دوران خیال اِدھر اُدھر نہ پھیلے جائے؟“

بولے: ”صاحب! نفس تو کئے کی دم ہے کہیں کئے کی دم بھی یہ بھی ہو سکتی ہے؟“

میں اپنے اندر بھی ہوتی ایک فطری کا پانی محسوس کرتا ہوں۔ ایسا لا پرواہی جس کو اپنا کیا دشمن سمجھتا ہوں۔ جو مجھے نہ معلوم کے مطابق زندگی بسر کرنے دیتی ہے، نہ سرگرم کا انداز ہونے کا موقع دیتی ہے۔ اس کے پرے زبان و قلم پر ہے ہیں اور کھو عمل تک اس کا سلسلہ دراز ہے۔ شاید یہ وہ کاٹ ہے جس کو ان ظہریں برقرار رکھنے کا، کسی حد تک سفاکش افلاطون نے بھی کی تھی کہ یہ دشمنوں اور کھوڑوں سے بچاتی ہے۔ انسان بڑی حد تک ذات کے غول میں پھونکا رہتا ہے۔ جیسے کھجور کا پانی میں عرفان ذات کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اپنی کمال میں مست اور سرفراز ہونے کے باوجود جو گوش کو شکست دے کہ کئے کے لئے ہے۔

میں روزانہ ضروری کاموں کی فہرست بناتا ہوں جس کی اس کی ترتیب ہوتی ہے کہ درانگ دوام یا کٹ پر است مکان کی طرح ہر چیز پر سے بھی سمائی، لیکن گھر سے برا کھڑے ہی کاموں کی ترتیب تاش کے چرن کی طرح بھر جاتی ہے۔ اس بے ترتیبی کا دل بھر کا حاصل وہ ترتیب ہے جو زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ بے ترقی زندگی میں ترتیب کا شعور صاف ہی ہے۔ میں کتے کو گوں کو روزانہ اس باغ دیکھتا ہوں، ان کو کوئی ترقی نہیں ہے مگر انہیں اپنی دیکھنے جب ان کے گھر کے مائے فوجرت میں پڑ جائے کہ وہ کئی باتا دہائی جاتی دوسل دھوئی، مختلف اندوڑائی نہیں زندگی گزارا ہے ہی۔

زندگی کی ساری جہت فخر، ولولہ، جوش، مجلس، تعریف اور بڑے سوسے بے ترتیبی کی سنگار جتانوں سے چھوٹے ہیں، اس لیے اس سے زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں، جس کی ابتدا کسی بھی جہت سے اس طرح شروع ہوتی ہے جیسے آفتاب کا نہ کیوں کیوں سے زندگی کے دن کی ابتدا ہوتی ہے۔

بستی: روشنی اور پانی

مکان کی کیا خاک ملے گا۔ زور مہاں کے پوجا میں گئے“
”موتے مصلح اور وسیع بخائی اور اس کے کمرے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے سارے بیہوش کو دیکھ محال لیا سارے شب کھٹے تھے۔ اس کا قیاس ٹھیک ہی تھا۔ اگلے دن اچھا ہی تھا کہ اوپر سے نذر کا دھماکا اور زلزلہ پانی پر بار ہوتا تھا۔ اللہ نے پانی جیسی نعمت اس لیے نہیں بخشی کہ اس کا بے حاشی ہو۔ آخر لوگ ایسے وقت سے نہیں نہیں ڈرتے جب پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہوگا۔ وہ اُس کے کمرے میں مصروف تھا کہ دروازہ کھٹک گیا۔ سامنے آتا اللہ تعالیٰ کا کلمہ لگا ہوا تھا۔ اس کی زبان پر اس کا ترجمہ آگیا ”بے شک اللہ تعالیٰ ممبر کرنے والوں کے ساتھ ہے“ وہ گہری غمزدگی تھا لیکن اس کی آنکھوں کے ملنے روشنی نقصان تھی۔ اس نے سوچا یہ اللہ کا کلمہ ہے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ مٹا خیال ہوا کہیں کسی نے جی تو نہیں جلادی ہے؟“ وہ چیخا تھا: ”جی ٹھیک کرو۔ یہ کس نے جلادی ہے؟“

”اللہ نے....“ طنز مگر مکرانہ نے جواب دیا۔ ”میں نے نہیں بار بار کہا تھا کہ ایک دن اللہ اپنی رحمتوں کی بات کرے گا!“
”ہاں ہاں، کیوں نہیں، اب صبح ہو چکی ہے جناب! یہ سمجھ کر کریں میں جیست کا بیسیام روشن دان سے گھس کر دے رہی ہیں!“
وہ عجیب نظروں سے روشنی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب بھی شش در شش میں تھا کہ کیا یہ سچ سچ اللہ کی رحمت کا نذر ہے یا ماہگن کے حکم کی خلاف ورزی کی لعنت و ملامت کا پیش خیمہ!

پانچ خط

تھماری یاد میں بے قرار ————— تھماری
کرتش

نوٹ: خط کسی دوسرے کو پھرنے کیلئے نہیں دینا۔ اپنے ہاتھ سے چھوڑنا۔ رات کے وقت آنکھ میں چھپا کر جانا اور پھر کسی میں گرا آنا اگر کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے۔

(۲)

بھوسکتا اسکول
پہلی جنوری ۱۹۲۹ء

پیاری!

بہت دنوں کے بعد تمہارا خط پا کر خوش ہو گیا تم نے لکھا ہے کہ ہماری پیاری بیٹی اس بار تھماری (ایک تھوڑے بڑے بھائی) پر نہیں ہر طرف تھوڑا لڑکپن کے لیے ہوتا ہے، اچھے گی۔ اس موقع کے لیے میں ایک اعلیٰ سٹیٹ سٹور میں بیچ دوں گا۔ بنگلہ اب اسکول جاتا ہے یا نہیں۔ بدعا شئی تو نہیں کرتے؟ تم نے لکھا ہے کہ چھٹی پٹی کو دانت نکل رہے۔ اس لیے اُسے دیکھ کر دوا مانگا کر دے دینا۔ اس بار کاؤں گیا تو پہلی بھی بہت کمزور دیکھا۔ زیر کا دی پاک (ایک گھر بلووا) بنا کر کھاؤ۔ چائے میں اگر صحت درست نہیں ہوئی تو دن بہ دن اور کمزور ہوئی جاؤ گی۔ وہاں پر دو دفعہ لینا شروع کر دو۔ اور روزانہ کم از کم پانچ دو دفعہ پا کر دو۔

کچھ دنوں کے لیے میں تمہیں یہاں لے آتا لیکن یہاں مکان کی بڑی تکلیف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسکول سے صرف ساٹھ پچھاپہ ہوا ملتا ہے۔ اس میں یہاں پر پانچ آدمیوں کا گزر ہونا مشکل ہے۔ تیسری بات یہ بھی ہے کہ پھر پڑوسی (اماں) کے پاس کون رہے گا۔ یہی سب سوچ کر مر رہا ہوں روز تم یہاں رہیں تو میرے لیے چھاپہ رہا۔ مجھے دو دنوں وقت خالص اور تازہ کھانا ملتا۔ بنگلہ کو بھی پڑھائی میں سہولت ہوئی۔ چھٹی پٹی سے میرا دل بھی بہل جاتا۔ مگر کیا کیا جائے...

(۱)

درجہ

پہلی جنوری ۱۹۲۹ء

میری پیاری!

تمہاری گلی ہوئی سطر میں چار سو بار پڑھیں۔ پھر بھی آسو گلی نہیں ملی۔ آجاریہ کا امتحان نزدیک ہے۔ لیکن کتاب میں ذرا بھی دل نہیں لگتا۔ ہر وقت تمہاری ہی موہنی صورت آنکھ میں ناچتی رہتی ہے۔

را دھارانی! دل چاہتا ہے کہ تمہارا گاؤں برتدھام میں جائے جہاں صرف ہم اور تم واقعہ اور کوشش کی طرح قیامت تک یہ کہتے ہیں۔ لیکن ہم لوگوں کے پنج سب بڑی بھدرا (ایک طرح کی زکات) تمہارے باپ اور چچا ہیں جنہوں نے مجھے دو چھپے بعد ہوئی کی چھی میں آنے کا حکم دیا ہے۔ ساتھ برس کے بوڑھے کو کیا کچھ آنے کا کہ ساتھ دن کی دہائی کسی ہوتی ہے۔

جاہن! تم ایک کام کرو۔ گھگھاؤس میں سورن گرن لکھتے۔ اس میں اپنی مادامی کے ساتھ سمر لکھاٹ آجائو۔ میں وہاں پہنچ کر تمہیں تلاش کر لوں گا۔ ہاں! ایک راز کی بات لکھ رہا ہوں۔ سمر لکھاٹ پہنچ کر جب عورتیں گرن لکھاٹ کرنے چلی جائیں گی تب تم کسی جہانے سے گھر میں رہ جانا۔ میرا ایک ساتھی انصویر اتارنا چاہتا ہے اس سے تمہاری تصویر کھینچاؤں گا خیال رہے کہ یہ بات کوئی جان نہ سکے۔ نہیں تو تمہارے پتا اور چچا جیسے ہیں وہ معلوم ہی ہے۔

میرے دل کی فکر! تمہیں جسے چند بار کی فرمائش کی تھی وہ میں نے فریاد کر دیا ہے۔ سمر یا میں سطر پر خاموشی سے تمہیں دے دوں گا۔ لیکن اگر اس کی خبر نہ ہو۔ میرے ہتھیار کو معلوم ہوگا تو فریاد بند کر دیں گے۔ ہاں اس خط کا جواب واپسی ڈاک سے دوں گی۔ اسی لیے خط کے ساتھ جوابی لفظ بھیج رہا ہوں۔ خط کا جواب بھیجئے میں ایک دن کی بھی دیر نہ کرنا کروں کہ تمہاری جدائی میں مجھے ہر لمحہ بہاؤ سا معلوم ہوتا ہے۔

بڑی بی بی کچھ اور سبانی ہو جاتے تو اسے بڑھی کے پاس چھوڑ کر تم اسکی ہو مگر ابھی تو کچھ چھوڑنا تمھارے لیے ممکن نہیں میں بولی کی جھٹی میں گاؤں نے کی کوشش کروں گا۔ مگر نہیں تمکا تو سنی رڈ سے رو پے بھیج دوں گا۔

تمھارا
دیوکرشن

(۳)

بھروسہ سکرٹ اسکول
پہلی جنوری ۱۹۳۶ء

پیار اور دعائیں!

تمھارا خط ملا۔ بڑھ کر بہت پریشان ہو گا۔ اس بار دھان نہیں ہوا تو سال بھر کام کیسے چلے گا؟ ماں کے شرادھ میں جو پانچ سو روپے قرض لیے ہیں ان کا سود دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ دو مہینے کے بعد منگٹ کا اقسام ہو گا۔ قریب بھکاس روپے فیس لگی۔ اگر کسی طرح پاس کر گیا تو کتاب میں بھی پکاں روپے لگ ہی جائیں گے۔ میں ای ٹکریں ہوں کیا کروں۔ یہاں ایک مہینے کی تنخواہ ایڈوائس لے چکا ہوں پھر کبھی ورو پیر اور قرض ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں مالگڈاری کے لیے باسٹھ روپے میں کہاں سے پیسوں؟ اگر میرے کو تبتا کو بیچ کر پچھلا قرض ادا کر دینا۔ پچھلا جو کھیت بٹائی پر لیے ہوئے اس میں اس بار ربع بیس ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ کوکھی (اناج کے لیے مٹی کا گودام) میں ایک مہینے کے لیے بھی چاول نہیں ہے۔ دوسری طرف بڑی بی بی سمرال سے دو مہینے کے لیے آنا چاہتی ہے۔ یہ سب جان کر میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا ہوں۔ ایک تو اس کا نوموود بچہ ہے، دیکھو اور ہیں۔ سب کو مستحالت تم سے کیسے پار لگے گا۔

اب چھوڑ کر بھی دس سال کی ہو گئی ہے۔ اس کی شادی کی الگ فکر ہے۔ ساری رات بھی سوچتا رہتا ہوں لیکن اپنے بس میں ہے ہی کیا؟ دیکھا ہے بھگوان کس طرح پار لگاتے ہیں۔

دعاگو

دیوکرشن

(۴)

بھروسہ سکرٹ اسکول
پہلی جنوری ۱۹۳۶ء

دعائیں!

میں دو مہینے سے بہت بیمار تھا۔ اس لیے خط نہیں لکھ سکا۔ تم نے لکھا ہے کہ منگٹ بیوی کو لے کر کلکتہ چلا گیا آج کل کے بیٹے بھوسے جیسے لالٹن ہوتے ہیں وہ معلوم تو تھا ہی دیکھ بھی لیا۔ میں نے اس کے لیے کیا نہیں کیا؟ کس طرح بی اے

ہنگامہ لگائی

پاس کر دیا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس کا دلر وہ اب اس طرح دے رہا ہے۔ میں نے تو اس سے ای دن سے امید کھتی چھوڑ دی تھی، جس دن سے اس نے میرے جیسے جی مونچیں کٹوائی شروع کر دیں۔ پھر ساس کے کہنے میں آکر گورنگا کی (مستقل میں شادی کے بعد کی ایک خاص رسم اکا روپہ ہم لوگوں کو دیکھنے بھی نہیں دیا۔ مگر مجھے معلوم ہوتا کہ سہو اس طرح کسے کی تو میں بھی بیٹے کی شادی دیکھنے کے علاقے میں نہیں کرنا۔ پندہ ہلنے جیزنے کر ہو گا۔ میں نے کیا ہے اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اس میں سے اب پندرہ پیر بھی نہیں بچا پھر بھی بیٹا سمجھ رہا ہے کہ پتا جی خزانہ دبا ہے ہوئے ہیں۔ وہ اب کچھ بھی نہیں دے گا۔ اور دیہی بہو تمھارے کہنے میں رہے گی۔ اس کو تو چاہیے تھا کہ ایک ساتھ رہ کر تمھاری دیکھ بھال اور خدمت کرتی۔ لیکن وہ تمھاری مرضی کے خلاف منگٹ کے ساتھ چلی گئی۔

دل منگٹ کو ڈرھ سو روپے میں اپنا خرچ بھی پورا کرنا مشکل ہو گا۔ بیوی کو کہاں سے کھلائے گا؟ ہم لوگوں نے جو کچھ تیس سال میں نہیں کیا وہ اس نے نصیحت کے بعد تین مہینے میں کر دکھا۔ خیر! کیا کرو گی ابھی نادان ہے جب بڑا ہو گا تو خود ہی کہے گا میں آجائے گی بھگوان! اُس غفل دے۔ زیادہ کیا لکھوں! کچھ تو جاہلیت کو بھی دینی کا نام نہ بھوتی (دل کا کتنا ہی بُرا ہو جائے ماں کو بُرا نہیں سوچنا چاہیے)۔

۔۔۔ دیوکرشن

نوٹ: اگر خرچ کی تکلیف ہو تو چھ کھڑ رہیں جو تمھارے نام ہے۔ اسے رہیں رکھ کر کام چلاؤ گی۔ تمھارا بار جو گردی ہے وہ اب بھگوان کی مرضی ہو گی تب ہی چھوڑے گا۔

(۵)

کاشی

پہلی جنوری ۱۹۳۶ء

نور نظر شری منگٹ! ہاؤس کے لیے میری نیک خواہشات!

یہاں شریٹ سے ہوں۔ ہاں! اس حائرے میں میرا دتر بھر اکھر گیا ہے رات رات بھر پیچھ کر کھانسا رہتا ہوں۔ کاشی و شونا تھ کب اس دنیا سے اٹھا لیے ہیں کچھ پتہ نہیں۔ میرا بھی جان نہیں چھوڑتی۔ اب ہم بیسے لوگوں کی دوا ہی کیا ہے؟

یہاں سترہ تو میری بہت خدمت کرتا ہے۔ یہ جان کر بہت انہویں ہوا کہ تمھاری ماں کو گھٹیا (چھوڑ دل کا درد) ہو گئی ہے۔ لیکن اب تدبیر ہی کیا ہے ضعیفی کی تکلیفیں تو یہی ہی پڑیں گی۔ بڑھی چلنے پھرنے کے لائق ہے یا نہیں؟ میں آکر اُسے دیکھتا لیکن آنے جانے میں میں چاہیں روپے خرچ ہو جائیں گے دوسری بات یہ ہے کہ اب سفر کرنے میں مجھے بھی کافی دشواری ہوتی ہے۔ تم نے (آگے لکھا ہے)

یہ بھی ہو کہ جن موضوعات پر جس طرح ان نظموں میں انھار غیاں کیا گیا ہے نثر میں بہتر طریقہ پر انہیں پیش کیا جاسکتا تھا لیکن یہ تسلیم کر لیں گا کہ یہ ساری خوشنویسی لائیکل گئی ہیں....“

اس سلسلے میں دو آراء کا پایا جاتا، اغلب ہے۔ کہ بہت طباعت معمولی اور اس اعتبار سے دام زیادہ ہیں۔

نام کتاب: ناصر الاسلام حاجی میاں محمد چھوٹاٹانی

مرتب: فاروق احمد چھوٹاٹانی

قیمت: دس روپے

پبلشر: انجینئر ڈاکٹر ۹، مورلینڈ ٹرورڈ ۲، وائی ایم۔ سی روڈ لاہور۔

یہ کتاب مبین برادری کے مشہور محترم ”ناصر الاسلام حاجی میاں محمد چھوٹاٹانی“ کی ملکی خدمات اور خدمات تحریک میں ان کی قربانیوں کے اعتراف کے طور پر مرتب کی گئی ہے۔

تحریک خلافت میں سرگرم حصہ لینے کے جرم میں حکومت برطانیہ نے ان کو کافی نقصان پہنچایا۔ ان کا کاروبار تباہ کرنے کی کوشش کی تو کبھی انہیں لاچ ڈیا مگر حاجی صاحب نے سب اوبھنی کے راستے کو نہیں چھوڑا۔ وہ کافی عرصے تک آن آند کیا مگر کس کئی کے انجیر بکینز بھر بھی رہے اور گاندھی جی کے معتمد علیہ بھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ”ڈسکوری آف انڈیا“ میں اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی انڈیا ڈس ڈیزم میں ان کی سب اوبھنی کا تذکرہ کیا ہے۔ حاجی میاں محمد چھوٹاٹانی کی شخصیت کے علاوہ اس کتاب میں میراں برادری کے کچھ اور قابل ذکر حضرات پر مباحث بھی شامل ہیں۔ جو کتاب کے دیگر ادوارق کی طرح مفید اور معلوماتی ہیں مگر محمد حاجی صاحب صدیق صاحب (حامیوں کی بھینی) میں مشہور عارضی قیام گاہ مسافر خانہ صاحب صدیق والے) پر نوبت صاحب کا مضمون حاضر کی چیز ہے۔ اسی مضمون میں باوجود تجدد کی اور مسات کے کثرت ناہلیت ”کی عکس جھک نظر آتی ہے، جو مضمون کی دلی چپی میں اعجاز کا باعث ہے۔“

دینار (مختصر نظیں)

شاعر: مرتضیٰ الزنگی (مراتھی)

اردو ترجمہ: بدیع الزمان خاوند

ناشر: مودرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولڈ لاکٹ، دلی گنج، نئی دہلی ۲

قیمت: دس روپے

”دینار“ جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے طبع کے ملک میں کام کرنے والے



نوائے فطرت (شاہی)

مصنف: محمد فضل الرحمن

ناشر: آڈھار پورٹی سائبر سائبر کلاسی، حیدر آباد

قیمت: ۱۰ روپے

”نوائے فطرت“ محمد فضل الرحمن صاحب کی منتخب نظموں کا مجموعہ ہے۔ جن میں طبع زاد اور تراجم مشہور نظموں شامل ہیں۔

نوکے اور منتظر طوطا نظموں کو ”دوبچ چھاؤں“ ”نفس حیات“ ”زم زمیلا“ ”مار فطرت“ اور ”دو آتش“ جیسے بانی خدمات میں تسلیم کیا گیا ہے۔ آخری کتاب کے تحت انگریزی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔

مصنف کے اس سے پہلے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، لیکن بقول مصنف ”... اب یہ سارے مجموعے بازار میں تقریباً نایاب ہیں، اس لیے اب ان کا مزید انتخاب اپنی غیر مطبوعہ نظموں اور منظوم ترجموں کے ساتھ نہ یہ نظر آیا ہے۔“ مصنف کا خیال ہے کہ ”... ان نظموں کو طبع کے بعد قارئین محوس فرمائیں گے کہ تکلیف کی حد تک اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے وہی پرلے سا پہلے جو صدیوں سے معلن ہیں تنبیہ سے رد و بدل کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ وی بی کر، دیکا قافیوں کی باندھنی اور بی اسلوب بیان ہے، لیکن وہ ضائع بدائع و رنگین بانی اور مٹی آفرینی اور وہ روشن کی کرشمہ زبان اس مجموعہ میں نہیں ملیں گی۔“

مصنف نے یہاں محکمہ طبع پر اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن ”... یہاں رنگین کلام کی جگہ سادگی بیان اور دوا کی محبت کے عوض انسان دوستی کے مضامین ہیں۔“ ”...“ سے مکمل طور پر اتفاق مشکل ہے۔ مزید برآں یہ ”رومانی محبت“ کیا چیز ہے اس کی تعریف بھی مصنف ہی پر چھوڑ دی جائے تو بہتر ہے۔

ابتدائی مسلمات میں ”پیشی نفع“ کے تحت مصنف کا کہنا ہے کہ ”... اگر

پیشی کی دہلی

ہندوستانیوں سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ان کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ وہ مختلف طریقوں کے ساتھ لکھا گیا ہے، جس میں زندگی کی ساری تصویریں اپنے مجموعہ عام پرچہ میں ہیں، جہاں وہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ قاری اور ناظر پر ظاہر ہو سکتی ہے۔

”دینار“ میں ۶۳ مختصر نظمیں شامل ہیں، جن میں اگر نہرا سے ۶۳ تک بالترتیب پڑھا جائے تو (ہر نظم پر عنوان کے بجائے نمبر ڈالے گئے ہیں، جو نظموں کی ترتیبی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں) اپنے ملک سے دیناری ملک کی طرف ہر روز سے لے کر واپسی (جو بھی ممکن ہے تو بھی ناممکن) تک مختلف جذباتی مراحل پر زبیر زبیر سائے تھے ہیں اور دھو دھونے والے کو نظموں کے مزے کے علاوہ ایک کہانی کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے اور اس طرح ان نظموں کو ۶۳ مختصر نظمیں دیکھ کر ایک طویل مسلسل نظم بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ”دینار کے گہرے پن“ نے جہاں بظاہر بہت سے گھروں کو سنبھال رکھا ہے، وہاں اس کی چمک دیکھنے سے ہی آنکھوں کو خیرہ اور بدل کر دیکھنے اور آوازوں سے بھی پرکھا ہے۔ ”دینار“ کا اصل موضوع وہ عوامل اور ردعمل ہیں، جو اپنے وطن سے دور جا کر صرف دولت کمائے کی دھن سے کہیں پر وہ کام کر رہے ہیں یا اس کے نتیجے میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک چرچا اور واقفیت ردعمل دیکھیے۔

دوسال کاٹنے کے بعد
پہلی بار ہندوستان ٹوٹ آیا تو
دب کر رہ گیا خیر مقدم کے پوچھتے

دو جوتی، پارٹیاں، تونج — منہ —
بعد میں احساس ہوا کہیں نہ کہیں ضرور کوئی خزانہ ہے
تختے میں لائی ہوئی چیزوں کے مساوی تناسب میں
انسانیت کا رشتہ بدل گیا ہے
کچھ چڑا ہے، کچھ برقرار ہے، کچھ ٹوٹ چکا ہے

دل میرا بھی ہوتا تھا وہاں ہے..... (دینار ۲۱)

ان نظموں کی واضح خصوصیت ان معصوم، ذاتی اور مشکل سے ہونے والے محنت پر فن کاری کی گنت ہے، جو ہر اس شخص کی زندگی میں پیش آتے آسکتے ہیں، جو اپنی زندگی میں ان کے لیے آسانیاں دینا کرے میں جیسا ہوا ہو اور قابلِ قدر بات یہ ہے کہ ان سب تلخ عقاق پر فن کاری نظر محدود اور طرز پر پڑتی ہے اور وہ ان کے دکھ کو پوری طرح محسوس کر کے فن کے سانچے میں ڈھالنا ہے، جس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ مصنف نے اس موضوع کا اپنی آنکھ سے مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ عناصر کی ممکن تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ البتہ فنی اعتبار سے بعض نظمیں ”جہاد و محنت“ کا شک

ہیں۔ مثلاً نظم ۵۲ کا آخری مصرع:

”لینڈنگ کے بعد گاہا ہوا پہلا دھکا“ بات ”میرا ہی چہرہ — پرانی نظر“ پر خوب صورتی کے ساتھ مکمل ہو چکی تھی۔ مگر ایسے مقامات بہت کم ہیں اور بہت سی خوبیاں کہ نہ نظر رکھتے ہوئے اس طرح کی چنداں مہیاں ناقابلِ اعتبار قرار دی جانی چاہئیں۔ یوں بھی اردو میں اس طرح کے شاعری جوئے کم شائع ہوئے ہیں کہ جو کسی ایک موضوع سے متعلق مختلف نظموں اور اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہوں۔ بدیع الزماں خاں صاحب نے ”دینار“ کا ترجمہ کر کے اس کی گولڈرگرے کی کوشش کی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک کامیاب اور خوب صورت ترجمہ ہے، جس میں اصل کا پُرکلفت اپنی اکثر جزئیات کے ساتھ موجود ہے، جن کے لیے خاں صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

متوازی سائے

مصنف: اوم پرکاش آزاد دھوا دھوری

ناشر: ماہنامہ ”شان بہار“ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت: آٹھ روپے

”متوازی سائے“ اوم پرکاش آزاد دھوا دھوری کی نظموں اور غزلوں اور منظوم تراجم کا انتخاب ہے۔ مصنف نے ابتدائی صفحات میں ”کچھ اپنے بارے میں“ کے عنوان سے اپنے حالات، زندگی اور شاعرانہ تجربے کی وضاحت کی ہے۔ ان کا بطن ہے کہ:

”قوی کچھتی، عوامی اتحاد، حمایت حقوق نسواں، تحفظ، محنت فرما اور اکیسویں کے دوسرے موضوعات سے میری پوری شاعری عبارت ہے“

جو تاثر یہ چاہیے تھا کہ ”موضوعاتی حد بندی“ آزاد کی شاعری کو غیر مناسب اور بے اثر بنا دیتی، لیکن ان کی سادگی اور اخلاص نے اس غیر ضروری مشکل مرتلے پر ان کو سنبھالے رکھا ہے۔ وردہ ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا اور اس قسم کے دیگر موضوعات صرف یہ کہ اگر خواہے حال پر استعمال ہوتے رہے ہیں بلکہ بیشتر ”موضوع“ نہ جاتا ہے۔ اور شاعری غالب ہوجاتی ہے۔ آزاد کے ان موضوعاتی حد بندی کے باوجود شاعری باوجود اس لیے باقی رہا کہ وہ موضوع نے ان کو نہیں پرانا بلکہ انہوں نے موضوع کا استعمال کیا ہے۔

آزاد بنیادی طور پر نظر کے شاعر ہیں اور اس صفت میں ان کا طبیعت کا رنگ اپنے مخصوص جوہر دکھاتا ہے۔ ”دو جوتیاں دو سیلیاں“ ”فصل“ ”مکتب“ ”ان یس امر“ اور ”بہشت“ وغیرہ اچھی لطیف شاعری کی مثالیں ہیں۔

مختصر آزاد کی شاعری کے سلسلے میں یہ کہنا ہے جائز ہوگا کہ ان کی شاعری

عشق اور بھگتی

مصنف : عمار الحسن آزاد دہلوی

صفحات : ۹۵

ناشر : مکتبہ جامعہ لطیفہ، جامعہ تکریم، دہلی

قیمت : چھ روپے

عشق کا جذبہ روزی و روزی ہے اور ابھرتا ہے گا۔ قدرت نے ہر چیز سب سے پہلے غلطی انسان کو دکھائی ہے وہ جذبہ عشق ہی تھا۔ دنیا کے وجود میں آنے سے آج تک مختلف صوفیہ اور علمی اس کی تشریح کرتے رہے ہیں۔ اناطون، ابن سینا اور مولانا روم وغیرہ نے عشق کی ماہیت و حقیقت کے بارے میں کافی دقیقہ دیکھا ہے۔ ہمیں کی ہیں۔ مگر خود بقول مولانا روم ۵

عشق را ازین پیرس پیرس از عشق پیرس

مصنف نے ذیل کے نمونے کی دو خطبات میں تفسیق مولانا روم اور شری امام کرشنا کے روحانی تجربات کی روشنی میں عشق کی ماہیت اور حقیقت کو سمجھنے کی جو کوشش کی ہے وہ بلاشبہ قابل تہنیت ہے۔ مولانا روم کے نظریہ عشق کے بارے میں تو اردو میں کافی کچھ لکھا جا چکا تھا۔ مگر اس طرح کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی جس کے مدد سے مولانا روم کے نظریہ عشق اور ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے عقیدے کی تفصیلات پر عبور ملے ہوں اور ہندوؤں میں مائلمت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ یہ کتاب اس کی کوئی حد تک پورا کرتی ہے۔

مصنف نے کافی محنت و دلچسپی سے مولانا روم اور شری امام کرشنا کے نظریات عشق کا مطالعہ کیا ہے اور اپنے خیالات کو خوب صحت و اعتبار میں بیان کیا ہے۔ جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے قرآن و حدیث اور اشعار و اقوال کے حوالے بھی دیے گئے ہیں جس سے دونوں صوفیہ کے نظریات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ عربی و فارسی میں کے ساتھ تو میں میں ان کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے، جن سے زبانوں کو نہ جاننے والوں کا بھی فہم میں نہیں کرتا۔ کتاب کی افادیت یوں ہے کہ بھی پڑھ جاتی ہے کہ اس میں ذرا سیہ صوفیہ کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے جن میں لفظ ہر کتابت مشترک نہیں دکھائی دیتی۔ علاوہ ازیں مولانا روم اور شری امام کرشنا کے زمانے میں کم و بیش جو مسائل افروختے ہیں۔ لیکن پھر بھی مصنف نے اپنی محنت و جستجو سے ان دونوں صوفیہ میں مشترک اقوال تلاش کیے۔

غالباً کتاب کی طوالت کے پیش نظر مولانا روم کے زمانے کی سیاسی و فقهی ان مسالوں کی ذرا سیہ حالی پر مولانا کے تاثرات پیش نہیں کیے گئے۔ علاوہ ازیں عشق سے قطع نظر مولانا کو لوگوں کو سمجھانے کی تعلیمیں کرتے ہیں کہ ہم کا خلق انسان کی عملی زندگی یعنی مادی زندگی سے ہے۔ اگر نہایت اختصار سے کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کو تو عشق اپنے آپ کی تعلیمیں اس لیے تھے کہ اس کو چنگیزی و غلو سے بچا

ما موعود "حیات" ہے۔ "فلسفہ حیات" نہیں اور فلسفہ ما موعود کا بنیاد نہیں ہے۔ دانشور و روحانی بنائی گئی شاعری کے مقابلے میں سیدھی سادی اور بے بھجی شاعری ہمیشہ غنیمت معلوم ہوتی ہے۔

"متوازی سلسلے" ان تار میں کے لیے لفظیاً دل چسپی کا باعث ہوگی جو "روایتی بے مزہ" شاعری کو پسند نہ کرتے ہیں۔

انجم ثنائی

اقامت و قیمت (نقصی خاکے)

مصنف : وہاب عذیب

اشاعت : پہلی پرنٹرز، رحمن مارکیٹ، لکھنؤ

قیمت : بارہ روپے

"اقامت و قیمت" وہاب عذیب کے تصنیف کردہ خاکوں کا پہلا مجموعہ ہے، جس میں کچھ بہت معروف، کچھ کم معروف ۱۳ اردو اور شاعروں کے شخصی خاکے شامل ہیں۔ بعض خاکے اپنی مخصوص انفرادیت کی وجہ سے پناہ آفرین کے حامل ہیں تو بعض گوارہ۔ البتہ ناگوار کوئی خاکہ نہیں اور یہ کم بڑی بات نہیں کہ عذیب صاحب اپنے پہلے ہی مجموعے سے خاکہ نگاری جیسی مشکل اور نازک صنف پر کام باقی حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔

اردو میں خاکہ نگاری عام طور پر اور موجودہ کھینے والوں میں خاص طور پر اپنے طرز بیان کی وجہ سے طرز و مزاج (بلکہ زیادہ تر مزاج) کی صفت میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ وہاب عذیب کے اس مجموعہ کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شگفتہ بیانی اور سلاست کے باوجود طرز و مزاجیہ صغر بہت کم ہے۔ ان کی یہ خوبی انہیں دیگر موجودہ خاکہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

"اقامت و قیمت" میں ایک اطلاق معاف اور دل چسپ چیز خود مصنف کا خاکہ ہے، جسے ممتاز اور مشہور خاکہ نگار بھیجی حسین نے "خاکہ نگار کا خاکہ" کے عنوان سے لکھا ہے۔

وہاب عذیب پر لکھے گئے مجموعی حین کے اس خاکے سے مصنف کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں اور ان کی شخصیت اور اس کی ذہنی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کی وجہ جہاں مجموعی حسین کی شرف نگاری ہے، وہاں مصنف نے ان کی ذاتی نسبت اور جان کاری کو بھی دخل ہے۔

تعلیمی جماعتوں اور مدرسوں کے اخلاقی تحکیم کے لیے جس میں ان میں جواریسی اور قومیت پرستی کا بھی، اس کا مقصد یہ ہو سکے۔ دراصل مولانا کے نظریے کی بنیاد ہی یہ عوامل ہیں۔ یہ اوس نوع کی دوسری کتابیں مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم شیریں کشیدہ ہے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔
نیرنگی جی

کلیج کا درخت

مصنف: ابوالیث جاوید

قیمت: بیس روپے

ناشر: اردو رائٹر گھڑ، الدار آباد ۳

”کلیج کا درخت“ چودہ مختصر افسانوں پر مشتمل ابوالیث جاوید کا ایک وکٹ افسانوی مجموعہ ہے۔ روایت و عدت کا حسین نمک و مراد انقلاب کی آئینہ جدید حسیت کے ساتھ ذات و کمالات کا گہرا مطالعہ، زندگی کے عجیب و غریب تجربات کا اظہار۔ ان ساری خصوصیتوں کا نام ”کلیج کا درخت“ ہے۔ شاعرانہ زبان کا لطیف علائم کی مرتب سازی، اشارات و کمالات، نقیبات و استعارات و فقرہ ایہام کا حیرتی پردہ زیب کیے کہ ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اپنی بعض نگرانیوں کے باوجود ”کلیج کا درخت“ جدید حسیت کی نمایاں علامت ہے۔

ابوالیث جاوید اپنے مزاج اور انداز نگاہ کے اعتبار سے انتہائی سے زیادہ قریب ہیں۔

ابوالیث جاوید نے سستی قدرت کے لیے تیسرے درجے کے افسانے نہیں لکھے۔ ابوالیث جاوید کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۸ء سے ہوتا ہے۔ ابتداءً دہائی افسانے لکھے۔ رعبہ، لیکن بہت جلد زندگی کے تلخ حقائق نے لوہے قلم پر اپنا قبضہ جما لیا۔ ارباب و زندگی کے سنگے پورے سہل کر اپنے افسانوں میں جگہ دینے لگے ہیں۔ اجتماعی اور انفرادی سطح پر زندگی کے رنگ و بو آجک اس کی فنی و فنی، اس کی بے لوث و بے سرو سامانی، اس کی پیچیدگی و پکار کی کائنات جس انداز سے ابوالیث جاوید پیش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اگر وہ اسی طرح لکھتے رہے تو اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک اور مستند و معتبر نام کی شہریت ناگزیر ہو جائے گی۔

ابوالیث جاوید علمائے کمال کا استعمال نہایت شاعرانہ و نرنگت کے ساتھ کرتے ہیں اور اس میں بہت حد تک کام پایا ہے۔ رومان و انقلاب کے درمیان علمائے کمال کا استعمال باوجود بیک کوئی چیز نہیں، لیکن ابوالیث جاوید کے ہاں اس کے کمالات زیادہ روشن ہیں کہ وہ بہت جلد اپنے فرائض کو زندگی کے سہل کی پیش کش میں اٹھانے کا ہی سے اور زبان و بیان کی شاعرانہ و نرنگت کے اعتبار سے ابوالیث جاوید کی شہریت ناگزیر ہو جائے گی۔ لیکن فنی اعتبار سے ان دوروں سے الگ تھلک بھی ہیں۔

”بیچ بچہ“ ”دو چار پانچ پانچ“ ”کلیج کا درخت“ ”مندا خیمین“ ”روشن کا دھماکہ“ اور اس طرح کے دوسرے افسانے اپنی علامت نگاہ کی شیریں تخلیقیت اور زندگی کے تلخ حقائق کی پیش کش کے لیے قابل قدر قابل مطالعہ ہیں۔ ”کلیج کا درخت“ مندرجہ ذیل جگہوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے:

مکتبہ جامعہ ملیہ، نئی دہلی ۲۵، دہلی ۶، ممبئی ۳، علی گڑھ ۲
بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۳، سرسری اکادمی، اسلام پورہ، مظفر پور بہار
بہار بک اسٹور، بکلی سٹریٹ، مظفر پور (بہار)

کتاب کی قیمت کمات و طباعت کے بڑھے ہوئے اخراجات کے پیش نظر کچھ زیادہ ہیں۔ ہاں اس کی قیمت کچھ اور کم ہوتی تو تمام قارئین اس سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہو سکتے تھے۔ پھر بھی ”کلیج کا درخت“ ہر قیمت پر مطالعہ کی چیز ہے۔
ابیس امام

آئینہ در آئینہ

شادان اندوری

قیمت: دس روپے

مطبعہ کاہنہ، آفتاب ملت، ۱۰۰ مومن پورہ، اندور

شادان اندوری کا تعلق نول کے اس مخصوص مزاج سے رہا ہے جس میں انداز بیان کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ فنی آہنگی اور فنی بصیرت کو اولیت حاصل رہی ہے۔ جمالیاتی احساس کو آبرو سے غزل کچھ کر اختیار کرنے کا جذبہ جس طرح روایت بن کر ہماری غزل کی کہنہ بن گیا ہے۔ اسے اختیار کرنے وقت غزل کے مخصوص قواعد کو بھی شعرا سے بھر رکھا، شادان اندوری کا نام ان شعرا میں کیا جانا چاہیے۔ ان کی غزلوں میں جو کچھ چاہیے ہے اور جس طرح چاہیے ہے۔ غزل کی کہنہ بن گیا ہے ان میں موجود ہے۔

غزل کی دھما فنی، جمالیاتی احساس، تاثیر عشق، کوششیں اور جذبہ غزل اخلاقیات آج بھی ذہن و دل کو ایک لطیف، ایک لذت بخشہ ہیں۔ ان کا انداز سے ”آئینہ در آئینہ“ کی اشاعت لائق تحسین ہے۔

پھر شادان اندوری کا قلم کی اس سرزمین سے رہا ہے، جہاں اس میں قوازل کے اشعار کی تند و تیز فیت کرنے والوں کی اکثریت ہے اور اس میں شہرہ مند شادان اندوری کی فزین، جن میں غزل کی ہندی اور اظہار کا کمال موجود ہے، ان کے دل و دماغ کو بھر دینا تو کر کے۔

”آئینہ در آئینہ“ میں شادان اندوری کی صرف دو نظمیں، اقبال کا ایک شعر اور ”آخری تیرہ“ کو شامل کیا گیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ جلد کہہ کر شادان میں غزل گوئی کا بے پناہ قوت اور بصیرت موجود تھی۔ ان کی دو غزلوں میں ملا ان کے ہے۔ انداز بیان بھی دل کو چھو رہا ہے۔ نیز محسوس ہوتا ہے کہ



لم شرمقی اندرا گاندھی نے ۲۵ مارچ ۱۹۸۳ء کو ضلع جیسلمیر کے گاؤں چٹیاں میں راجستان ہنزہ میں رجبہ کام کا سائنہ کیا۔
۱۹۸۳ء کو نئی دہلی میں وزیر اعظم شرمقی اندرا گاندھی اٹھارہ لکھیا میں سینچے والی دوسری کامیاب سمائی ہم کے اراکین کے ساتھ۔





میں نے اپنے دور میں
کئی کئی بار ملک کو دور دورہ
کے سفر پر بھیج دیا ہے۔

وزیر اعظم شری اندرا گاندھی نے ۱۹۸۲ء
میں دہلی میں امن و اقتصادی مسائل کے موضوع
پر قابضہ سماج کے وزیروں کی میٹنگ کے
برائے سکس آؤ۔



